برطانوی مظالم کی کہانی

عبدالحکیم خاں اختر شاہجہانپوری
کی زبانی

(مشعلِ راہ)

منصور حیدر راجہ

ملنے کا پتہ
فرید بُک سٹال ۳۸۔ اردو بازار، لاہور ۲

برطانوی مظالم کی کہانی

عبدالحکیم خاں اختر شاہجہانپوری
کی زبانی

(مشعلِ راہ)

ملنے کا پتہ
فرید بُک سٹال ۳۸، اردو بازار، لاہور ۲

نام کتاب ——— وزی کی زبانی
مصنف ——— عبدالحکیم خاں اختر شاہجہانپوری مظہری
کاتب ——— محمد شریف گل
ضخامت ——— ۱۸×۲۳/۸ ، ۱۰۰۸ صفحات
اشاعت ——— باراول
مطبع ——— جنرل پرنٹرز لاہور
ناشر ——— علامہ اختر شاہجہانپوری
قیمت ——— روپے

فرید بک سٹال ۰ اردو بازار لاہور

انتساب

"حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے فخرِ خاندان و نادرِ روزگار نے اپنے گھر سے جب اپنے بھتیجے مولوی اسمٰعیل کے ہاتھوں فتنۂ وہابیت کا ظہور دیکھا تو بقولِ مصنّف فریاد المسلمین فرمایا تھا کہ: "میری طرف سے کہو اُس لڑکے نامراد کو، کہ جو کتاب بمبئی سے آئی ہے میں نے بھی اُس کو دیکھا ہے اُس کے عقاید صحیح نہیں، بلکہ بے ادبی و بے نصیبی سے بھرے ہُوئے ہیں۔ میں آج کل بیمار ہُوں، اگر صحت ہوگئی تو میں اس کی تردید لکھنے کا ارادہ رکھتا ہُوں۔ تم ابھی نوجوان بچّے ہو، ناحق شور و شر برپا نہ کرو۔"

موصوف کے دُوسرے چچا شاہ عبد القادر محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بقول مولوی اشرف علی تھانوی فرمایا تھا: "بابا! ہم تو سمجھتے تھے کہ اسمٰعیل عالِم ہو گیا مگر وہ تو ایک حدیث کے معنی بھی نہیں جانتا۔"

رئیس المبتدعین صاحب کی ابتدائی کارگزاری کے تیور دیکھتے ہی شہنشاہِ اقلیمِ منطق حضرت علاّمہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے بقول مرزا حیرت دہلوی فرمایا تھا: "اسمٰعیل دین محمدی کی بیخ کنی کیے بغیر نہیں رہنے کا۔" اِس کے بعد علاّمہ خیرآبادی نے تحقیق الفتوٰی فی ابطال الطغوٰی لکھ کر اِس فتنے کو پامال کیا اور شاہ مخصوص اللہ و شاہ محمد موسیٰ پسران شاہ رفیع الدین محدث دہلوی بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہم نے معید الایمان اور الحجۃ العمل فی ابطال الجہل تصنیف کر کے اپنی گھر سے اُٹھی ہُوئی اِس پُراسرار شرارت کی بیخ کنی فرمائی۔

احقر مذکورہ حضرات کی ایمانی فراست کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہُوئے اپنی ناچیز کاوش کو اِن پانچوں بزرگوں سے منسوب کرتا ہے۔

اختر شاہجہانپوری مظہری عفی عنہ

فہرس

عنوان	صفحہ
مناجات بدرگاہِ مجیب الدعوات	۷
استغاثہ۔ بارگاہِ رسالت میں	۹
سخن ہائے گفتنی	۱۱
باب اوّل	۴۹
انگریزوں کا قبضہ اور مظالم	۵۲
مداخلت فی الدین	۷۰
۱۸۵۷ء کا ٹکراؤ اور نتائج	۷۹
ایک تاریخی مغالطے کا حل	۱۲۸
باب دوم	۱۴۹
مسلمانوں کو اسلام سے کیوں بے بہرہ کرنا پڑا؟	۱۵۱
خوارج کی تاریخ	۱۵۶
خارجی سلفی	۱۷۸
خارجی حرّانی	۱۸۰
خارجی وہابی	۱۸۹
خارجی اسمٰعیلی	۲۰۲
دیوبندیت کی ابتداء	۲۶۵
اینگلو انڈین علماء کی کھیپ	۲۶۸
دیوبند مرکز	۲۷۰
علی گڑھ مرکز	۲۸۵
ندوہ کا پُراسرار جال	۲۹۲
مرزائے قادیان	۲۹۷
باب سوم	۳۰۳
فرقہ سازی	۳۰۵
اہلحدیث فرقہ	۳۰۵
دیوبندی فرقہ	۳۰۶
نیچری فرقہ	۳۰۷
مرزائی فرقہ	۳۰۷
صلح کُلّیت و دہریت	۳۰۸
خاکسار پارٹی	۳۰۹
جماعتِ اسلامی	۳۰۹
رئیس المبتدعین مولوی اسمٰعیل دہلوی کے کارنامے	۳۱۰
ترکِ تقلید	۳۱۱
توہینِ اُلوہیت	۳۱۶

توہینِ شانِ رسالت ۳۱۸

توہینِ انبیاء کا عالمی ریکارڈ ۳۳۸

تکفیرِ مسلمین ۳۴۷

قتل و قتالِ مسلمین ۳۵۸

خوابِ نبوت ۴۱۱

مسئلہ غیبوبیت ۴۶۲

دشمنِ مصطفیٰ کی نسل منقطع ۴۷۶

کتاب التوحید و تقویۃ الایمان کی مماثلت ۴۷۸

فرقہ اہلحدیث کی تخریب کاری ۴۹۶

جماعت کا اہلحدیث نام؟ ۴۹۶

امتیازی نشانات ۴۹۷

وہابی توحید ۴۹۹

عقیدۂ رسالت ۵۰۰

انکارِ تقلید ۵۰۲

مجتہدینِ عظام پر طعن ۵۰۳

غلاظت پسندی ۵۰۶

وہابیہ کی طہارت کا پانی ۵۰۶

غیر مقلدین کی شانِ عبادت گزاری ۵۰۹

غیر مقلدین کے دیگر محبوب مشغلے ۵۱۲

وہابی خورد و نوش ۵۱۵

غیر مقلدین کی ازدواجی بے ضابطگی ۵۱۹

غیر مقلدین کی الہام بازی ۵۲۳

دیوبندی جماعت کی تخریب کاری ۵۲۸

اسمٰعیل پرستی ۵۲۹

امکانِ کذب ۵۳۳

انکارِ ختمِ نبوت ۵۳۴

تنقیصِ رسالت کی ناقابلِ فہم جسارت ۵۳۷

دیوبندیوں کی پیر پرستی ۵۴۱

علمائے دیوبند کا مخصوص تصوف ۵۵۹

بانیِ جماعتِ اسلامی کے کارنامے ۵۶۵

مودودی صاحب کا خدا ۵۶۸

انبیائے کرام پر تیر اندازی ۵۶۹

صحابۂ کرام پر نرالی کرم نوازی ۵۷۴

قرآن وحدیث پر مہربانیاں ۵۸۳

فرقہ سازی کے ذوق کی تسکین ۵۸۷

بانیٔ نیچریت کے کارنامے ۵۹۰

بانیٔ خاکسار پارٹی کے کارنامے ۶۰۳

مسٹر غلام احمد پرویز کی تخریب کاری ۶۰۹

شیعہ حضرات ۶۲۲

انکارِ قرآنِ مجید ۶۲۶

صحابۂ کرام سے دشمنی ۶۳۲

تقیہ ۶۳۵

متعہ ۶۳۸

مسلمانوں سے بغض و عداوت ۶۴۲

مرزا غلام احمد قادیانی کی تخریب کاری ۶۴۳

مخالفتِ جہاد ۶۴۵
ظلّی بروزی نبوت کا دعویٰ ۶۴۵
حقیقی نبوت کا دعویٰ ۶۴۸
مقدس بارگاہوں میں دریدہ دہنی ۶۵۳
ابن اللہ ہونے کا دعویٰ ۶۵۷
دعوئِ اُلوہیت ۶۵۸
اقبالی ڈگری ۶۵۸
مسلمانوں سے علیحدگی ۶۵۹

باب چہارم ۶۶۳
انگریز دوستی کی کہانی، انگریز دوستوں کی زبانی ۶۶۵
سید احمد بریلوی ۶۶۶
مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی ۷۱۱
مولوی محمد اسحاق دہلوی ۷۱۶
مولوی محبوب علی ۷۱۸
مولوی کرامت علی جونپوری ۷۱۸
مولوی مملوک علی نانوتوی ۷۲۰
مولوی سمیع اللہ دہلوی ۷۲۱
مولوی ڈپٹی نذیر احمد ۷۲۲
مولوی محمد احسن نانوتوی ۷۲۳
مولوی عبد الاحد دہلوی ۷۲۴
میاں نذیر حسین دہلوی ۷۲۷
مولوی محمد حسین بٹالوی ۷۳۳
مولوی نواب صدیق حسن خاں بھوپالی ۷۴۰
سرسید احمد خاں علی گڑھی ۷۴۳
علّامہ شبلی نعمانی اعظم گڑھی ۷۵۳
الطاف حسین حالی پانی پتی ۷۵۴
مولوی رشید احمد گنگوہی ۷۶۰
مولوی اشرف علی تھانوی ۷۶۹
مولوی شبیر احمد عثمانی و مولوی آزاد سبحانی ۷۷۱
مولوی محمد الیاس کاندھلوی ۷۷۳
مرزا غلام احمد قادیانی ۷۷۴
شیعہ حضرات ۷۸۰

باب پنجم ۷۸۵
وہابیہ کی زُنّار دوستی ۷۸۷
گائے کی قربانی اور گاندھوی حضرات ۷۹۷
گاندھوی شیخ الہند کے کارنامے ۸۲۲
تحریکِ خلافت ۸۳۰
جمعیۃ العلمائے ہند ۸۳۹
گاندھوی امام الہند کے کارنامے ۸۶۱
احرار پارٹی ۸۹۲
علمائے اہلسنّت کی فہمایش اور ادائے فرض ۹۰۳
نجدی وہابیہ کی بُت پرست نوازی ۹۷۲
بُت پرستوں کی پختہ زُنّاری ۹۸۸
قطعاتِ تاریخ ۹۹۴
ماخذ و مراجع ۹۹۷

مناجات

المدد اے خدا، سب کے حاجت روا، آج ایمان کی جان خطرے میں ہے
رہزنِ دین بننے لگے رہنما، حق پرستوں کا ایماں خطرے میں ہے
یوں تو آزاد ہیں، حکمرانی بھی ہے، یوں تو سکّہ کی اپنے روانی بھی ہے
درحقیقت ہیں محکوم کفّار کے، اہلِ اسلام کی آن خطرے میں ہے
جن کے زیرِ نگیں ہفت کشور ہوئے، قسمت اقوامِ عالم کی لکھتے رہے
آج ہیں کفر کے زیرِ فرماں وہی، قوم کی شوکت و شان خطرے میں ہے
تھے جو پیکر کبھی عدل وانصاف کے، تھے جو پُتلے کبھی حُسنِ اَخلاق کے
آج وُہ ہو گئے ننگِ انسانیت، اَوج کا ساز و سامان خطرے میں ہے
آج اپنی خلافت بنی خواب ہے، کشتیٔ شانِ مسلم ہی غرقاب ہے
خود ہی آپس میں دست و گریباں ہیں، جس سے ہر میر و سلطاں خطرے میں ہے
آہ کشمیر، قبرص، فلسطین ہیں یا اِری ٹیریا، رُوس اور چین میں
حق کی خاطر مسلمان کھولیں زباں، جسم خطرے میں ہے جان خطرے میں ہے
عہدِ انگریز کی سب سے لعنت بڑی، تھا جو وکٹوریہ نے بنایا نبی
اُس کے اب پیروکار اِس قدر ہو گئے، جس سے نظمِ گلستاں خطرے میں ہے
لیڈروں کے نرالے ہی اطوار ہیں، کہتے ہیں قوم کے یار و غمخوار ہیں
قومیت کو مٹاتے ہیں کچھ اِس طرح، دین کا ہر نگہباں خطرے میں ہے
ناچ گانے غضب آج محبوب ہیں، آہ اُمّ الخبائث کے مشروب ہیں
ہو رہی ہیں امیروں میں خرمستیاں، دورِ حاضر کا انسان خطرے میں ہے
رہزنوں کا ہوا گرم بازار ہے، رہنماؤں سے اب قوم بیزار ہے
غیرتِ دین و ایماں کا بیوپار ہے، آج سچا مسلمان خطرے میں ہے

کیسے تفسیر و تفہیم کے نام سے ، کیسے فکر و تدبُّر نما دام سے
یُوں مطالب بتاتے ہیں آیات کے ، جن سے مفہومِ قرآن خطرے میں ہے
مصطفیٰ کے فرامین وردِ زباں ، مصطفیٰ کی اُنھیں سے کریں کسرِ شاں
کِس غضب کی ہیں یہ شوخیاں الاماں ، تیرے پیارے کا فرمان خطرے میں ہے
اہلِ اسلام کو منتشر کر دیا ، اب تو ہر فرد ہے ایک فرقہ جُدا
دشمنانِ نبی بن گئے اَولیا ، آج سچّوں کی پہچان خطرے میں ہے
ہم نے مانا کہ بیشک خطاکار ہیں ، مالکِ دوجہاں ! ہم گنہگار ہیں
اُمّتی ہیں مگر تیرے محبوب کے ، اُمّتِ شاہِ ذیشان خطرے میں ہے
بہرِ شاہِ اُمم ہو نگاہِ کرم ، پھر ترقی کرے قوم یہ دم بدم
شان و شوکت سے اختؔر بھی چمکے تِرا ، ذوالمنن ! وہ پریشان خطرے میں ہے

اختؔر شاہجہان پوری مظہری غفرلہٗ
لاہور

استغاثہ

(بحضور سراپا نور، شافعِ یوم النشور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)

نگاہِ مرحمت، چشمِ عنایت، یا رسول اللہ
پریشاں حال ہیں ہم اہلسنّت، یا رسول اللہ
اُٹھا رکھا ہے سر ہر سمت پھر تخریب کاروں نے
بظاہر بن کے ہمدردانِ ملّت، یا رسول اللہ
وُہ، جو ہیں صاحبانِ جبّہ و دستار کہلاتے
بہ باطن آپ سے جن کو عداوت، یا رسول اللہ
وُہ، چہرہ جن کا مومن کا مگر دِل ہے ابوجہلی
ہے اُجلا جن کا تن، گندی ہے سیرت، یا رسول اللہ
زباں پر نعرۂ توحید دِل ایماں سے خالی
ہے کلمہ لب پہ اور دِل میں کدورت، یا رسول اللہ
وہ، جو ہیں آپ کی تعظیم اور تکریم کے مُنکر
وہ گُستاخانِ دربارِ رسالت، یا رسول اللہ
یہ رہزن راہبر بن کر نکل آتے ہیں میداں میں
کریں کس طرح ہم اپنی حفاظت، یا رسول اللہ
ہمارے اہلِ حق باہمدگر دست و گریباں ہیں
اِنھیں کب اپنے ہے جھگڑوں سے فرصت یا رسول اللہ
مقابل دشمنانِ دین کے جو مردِ میداں تھے
وُہ ہیں شیرِ نیستانِ سیاست یا رسول اللہ

سجا تھا جن کے تن پر جامۂ اَلْفَقْر ماضی میں
ہے اب زر کی تگ و دَو اُن کا خلعت یا رسول اللہ
کِسی کو صرف ہے درکار خوشنودی امیروں کی
کِسی کو صِرف کُرسی کی ضرورت یا رسول اللہ
اِنھیں میں سے نئے فیشن کے کچھ مفتی معاذ اللہ
مسائل میں بھی کر بیٹھے ہیں جدت یا رسول اللہ
ہمارے رہبرانِ دین وملت کی یہ حالت ہے
کہیں کِس سے ہم اپنے دِل کی حالت یا رسول اللہ
تُلے ہیں دشمنانِ دِیں اِدھر تخریب کاری پر
مکدر ہے فضائے دین و سنت یا رسول اللہ
درِ والا پہ اختر استغاثہ لے کر آیا ہے
حبیبِ حق ، شہنشاہِ رسالت یارسول اللہ
مدینے سے اُٹھے پھر ابرِ رحمت یا رسول اللہ
کرم ہو پھر بشکل اعلحضرت یارسول اللہ
(صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وصحبہٖ وسلم)

از اختر الحامدی الرضوی مدظلہ،
حیدر آباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سخن ہائے گفتنی

وہ محرکات جو اِس کتاب کی تصنیف کا باعث بنے اوّلاً اُن کا قارئین کے سامنے اظہار کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں، لیجئے وجوہات حسبِ ذیل ہیں:

۱- باری تعالیٰ شانہ، کے فضل وکرم اور اُس کے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نظرِ عنایت سے اِس ناچیز کو امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرّہٗ سے تعلق خاطر ہے اور رشتۂ عقیدت ونیاز مندی حاصل ہے۔ اِس بنا پر نہیں کہ راقم الحروف نے اعلیٰحضرت بریلوی سے براہِ راست فیض حاصل کیا تھا، کیونکہ امام موصوف کا ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء میں وصال ہو گیا تھا اور احقر کا سنِ پیدائش ۱۹۳۵ء ہے۔ امام احمد رضا کے ساتھ دُوسرا کوئی عام رشتہ بھی نہیں ہے جبکہ آپ مولداً بریلوی، نسباً پٹھان اور مشرباً قادری تھے اور راقمِ سطور مولداً شاہجہانپوری، نسباً راجپوت اور مشرباً نقشبندی مجدّدی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اگرچہ برائے نام ہی سہی۔ ہاں فاضل بریلوی کے ساتھ ایک خاص رشتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ موصوف کو عرب وعجم کے عمائدِ دین وملّت یعنی اکابر علمائے اہلسنت نے امام تسلیم کیا اور چودھویں صدی کا مجدّد بتایا تھا۔ لہٰذا اِس ناچیز کو امام احمد رضا خاں بریلوی سے بھی اُسی طرح نیاز مندانہ عقیدت ومحبّت ہے جس طرح حضرت امامِ ربّانی، مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرّہٗ اور دُوسرے بزرگانِ دین سے ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذٰلك۔ اِس تعلقِ خاطر نے مجبور کیا کہ امام احمد رضا خاں بریلوی کے تجدیدی کارنامے پر جو کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں لکھا جا سکے، لکھ کر اپنی عقیدت کا ثبوت پیش کروں کیونکہ لکھنے والوں نے ابھی تک اِس اہم ترین عنوان پر لکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی ہے۔

۲- دوسری وجہ اِس موضوع پر قلم اٹھانے کی یہ ہے کہ خطیبِ مشرق، مصنّفِ "خون کے آنسو" علّامہ مشتاق احمد نظامی مدظلہٗ، مدیر پاسبان الٰہ آباد کا یہ بیان پڑھنا نصیب ہوا کہ:

"محترم مفتی ظفر علی صاحب نعمانی پرنسپل دار العلوم امجدیہ کراچی کا مرسلہ پیکٹ جس وقت مجھے موصول ہُوا اور کتاب کے سرِورق "حیاتِ اعلیحضرت" پر نظر پڑی تو وفورِ شوق میں اوراق گردانی کرنے لگا مگر اپنی حرماں نصیبی کہ جس عنوان کا متلاشی تھا وُہ مجھے نہ مل سکا، یعنی "اعلیحضرت کی شانِ تجدید"۔ میرے خیال میں جلد اول کا سب سے اہم اور ضروری باب یہی تھا کہ اعلیٰحضرت کی مجددیت پر سیر حاصل گفتگو کی جاتی، اِس کے بعد زندگی کے دوسرے گوشوں پر روشنی ڈالی جاتی۔ ہو سکتا ہے کہ بعد کے دوسرے نسخوں میں حضرت ملک العلماء محمد ظفر الدین صاحب قبلہ پرنسپل جامعہ لطیفیہ کیٹھار نے اِس خصوصی مسئلہ پر گفتگو فرمائی ہو، لیکن اگر ایسا نہ ہو سکا تو مکتبہ کراچی کو چاہیے کہ وہ موصوف سے اِس عنوان پر ایک علمی و تحقیقی مقالہ لے کر دوسری یا تیسری جلد میں شائع کر دے، ورنہ میری نگاہ میں "حیاتِ اعلیحضرت" ایک عالم و فاضل کی تاریخ تو کہی جائے گی لیکن کسی مجدّد کی تاریخ نہ بن سکے گی۔ ضرورت ہے کہ اعلیٰحضرت کی شانِ تجدید پر محققانہ گفتگو کی جائے۔ یہ تنقید و تبصرہ نہیں بلکہ ایک ناقص رائے کا اظہار ہے۔"[1]

شاید موصوف کی یہ آواز صدائے صحرا ہو کر ہی رہ گئی تھی کہ اِس موضوع پر ابھی تک کوئی کتاب منصّۂ شہود پہ جلوہ گر نہ ہو سکی۔ راقم الحروف یہی کچھ لکھنے کی بفضلہٖ تعالیٰ جسارت کر بیٹھا تاکہ ایسے عظیم عنوان اور ایسے جلیل القدر امام و مجدّد کے تجدیدی کارنامے پر اِس بے ڈھنگی کتاب کو دیکھ کر علمائے اہلسنت میں سے کوئی صاحب جھنجلا اُٹھیں اور اِس طرح غصّے میں آ کر "اعلیٰحضرت کا تجدیدی کارنامہ" شایانِ شان طریقے سے عالمانہ اور محققانہ انداز میں لکھنے کی شاید زحمت گوارا فرمائیں۔

۳۔ تیسری وجہ مذہب اہلسنت وجماعت سے بغاوت کرنے والے اینگلو انڈین علماء اور انصاف دشمن مورخوں کی علمائے اہلسنت اور خصوصاً امام احمد رضا خاں بریلوی کے خلاف

---

[1] محمد صابر قادری نسیم بستوی، مولانا: مجدد اسلام، مطبوعہ کانپور، ۱۹۵۹ء، ص ۲۰۶، ۲۰۷

معاندانہ روش ہے۔ یہ حضرات اپنے اکابر کی انگریز دوستی اور بُت پرست نوازی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے بے جا الزامات اور واہی تباہی اعتراضات کا ایک لامتناہی سلسلہ مدتوں سے منظم طور پر جاری کیے ہُوئے ہیں۔ جن حضرات کے قدموں پر بھی کبھی انگریز دوستی کی گرد نہ پڑی اور جن کے خلوص وللّٰہیت، تقویٰ و طہارت اور دیانت و امانت کی فرشتے بھی قسم کھا سکتے ہیں، اُن علمائے کرام اور اولیائے عظّام پر انگریز دوستی کا الزام نہایت بے باکی سے لگادیتے ہیں اور اپنی اِس نازیبا حرکت، ابلیلی شرارت، اکابرِ ہند و پاک سے عداوت، تاریخ و واقعات میں خیانت کرنے پر ذرا نہیں شرماتے، آنکھیں تک نہیں جُھکاتے، مثلاً پروفیسر محمد ایّوب قادری لکھتے ہیں:

"دہلی میں دبیر الدولہ نواب فریدالدین (ف ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۸ء)، منشی زین الدین (ف ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۶ء)، مفتی صدر الدین آزردہ (ف ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء)، مولوی فضل امام خیرآبادی (ف ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۸ء)، مولوی محمد صالح خیرآبادی (برادر فضل امام خیرآبادی)، منشی فضل عظیم خیرآبادی (فرزند اکبر فضل امام خیرآبادی)، مولوی فضل حق خیرآبادی (ف ۱۲۷۶ھ/ ۱۸۶۱ء)، بدایوں میں مولوی فضل رسول (ف ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء)، مولوی علی بخش صدر الصدور (ف ۱۳۰۳ھ/ ۸۶-۱۸۸۵ء)، مراد آباد میں مولوی عبدالقادر چیف رام پُوری (ف ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۹ء)، الٰہ آباد میں مولوی اسداللہ (ف ۱۳۰۰ھ/ ۸۳-۱۸۸۲ء) و قاضی عطار سول چڑیا کوٹی، کلکتہ میں قاضی نجم الدین خاں کاکوروی (ف ۱۲۲۹ھ/ ۱۸۱۳ء) اور اِن کے صاحبزادگان، قاضی سعیدالدین (ف ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۶ء)، مولوی حکیم الدین (ف ۱۲۶۹ھ/ ۱۸۵۳ء) اور قاضی علیم الدین (ف ۱۲۵۷ھ/ ۱۸۴۱ء) وغیرہ۔ مدراس میں قاضی ارتضا علی گوپاموی (ف ۱۲۷۰ھ/ ۵۴-۱۸۵۳ء) اور وناسک میں خان بہادر مولوی عبدالفتاح مفتی وغیرہ برِّ صغیر پاک و ہند کے وہ اعاظم و افاضل ہیں جنھوں نے منصبِ افتاء، قضاء اور صدر الصدوری کے ذریعے سرکار کمپنی کے اقتدارِ حکومت

کو بحال اور مضبوط تر کیا۔"[1]

گلشن کے اِس اِک منظرِ پُرخار کے ہاتھوں
سو چاک ہیں یارو مرے دامانِ نظر میں

قادری صاحب کو مذکورہ علمائے کرام کی ملازمت تو نظر آگئی اور صرف ملازمت کے پیشِ نظر مزے لے لے کر برٹش گورنمنٹ کے خیر خواہ ہونے کا الزام عائد کر دیا۔ کاش! موصوف روزِ قیامت کا منظر اور وہاں کی بازپُرس کو مدِّ نظر رکھتے۔ الزام تراشنے اور بہتان لگانے سے پہلے مندرجہ ذیل امور پر غور فرما لیا جاتا:

۱۔ کیا اِن علمائے کرام نے کسی خلافِ اسلام منصوبے میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا؟
۲۔ کیا اِن اکابر نے کمپنی کے دباؤ یا ترغیب سے اسلامی عقائد و نظریات میں کوئی ترمیم و تنسیخ کی تھی؟
۳۔ کیا اِن بزرگوں نے حکومت کی حمایت کا کوئی ایسا اعلان کیا تھا جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا؟

ہم پُوری ذمہ داری کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ معاندین اِس قسم کا ایک بھی الزام علمائے اہلسنت پر ثابت نہیں کر سکتے۔ رہی بغض و عناد کی بات، تو یہ راستہ ہی دوسرا ہے۔ اِس راستے پر گامزن ہو کر، جو کسی کے جی میں آئے کہتا پھرے، کون کسی کا مُنہ پکڑ سکتا ہے؟ مبتدعینِ زمانہ نے تو بغض و عناد میں شہنشاہِ دوجہاں، سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں کیسے کیسے نازیبا کلمات استعمال کیے ہیں، جن کی کھلے کافروں کو بھی کبھی جرأت نہ ہُوئی بلکہ اِس سے بھی تجاوز کر کے باری تعالیٰ شانہٗ کے سبّوح و قدّوس ہونے کو داغدار کرنے کی غرض سے ذاتِ باری تعالیٰ پر امکانِ کذب کا الزام لگانے اور اُسے جھُوٹا ٹھہرانے کی باقاعدہ مہم شروع کر دی تھی۔ یہی حضرات اگر علمائے اہلسنت پر الزام تراشی کرتے ہیں تو کونسی عجیب بات ہے؟ ہاں پروفیسر محمد ایوب قادری جیسے تاریخ دوست حضرات سے ہم اتنی گزارش

---

[1] محمد ایوب قادری، حاشیہ مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۱۸

ضرور کریں گے: ؎

ہاں چاہتے ہیں کہنا کچھ اپنی لَے میں ہم بھی
نغمہ نواز رکھ دے اب سازِ لَنْ تَرَانِیْ

اِس کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت جو کچھ تحریر ہُوا ہے اگر اُسے انصاف اور دیانت داری کے ساتھ پڑھا جاتے تو کوئی وجہ نہیں کہ علمائے اہلسنت سے عناد رکھنے والوں کے وہ صاحبانِ جُبّہ و دستار جنھیں برٹش گورنمنٹ نے اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر آسمانِ علم کے شمس و قمر منوانے اور تقویٰ و طہارت میں رشکِ جنید و شبلی باور کرانے کی خاطر اپنے پروپیگنڈے کی ساری مشینری کو حرکت دی ہُوئی تھی اور تا حال بھی مصروفِ عمل ہے، کچھ اور ہی نظر نہ آنے لگیں۔ معلوم نہیں پروفیسر محمد ایوب قادری جیسے حق کے متلاشی نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر کیوں علمائے اہلسنت کو بدنام کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہُوا ہے؟: ؎

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دِن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

اسی طرح مولوی محمد سلیمان بدایونی نے سہ ماہی "العلم" کراچی، بابت مارچ ۱۹۵۸ء مطابق ۱۳۷۸ھ میں امام احمد رضا خاں بریلوی سے بغض و عناد کی بنا پر "حیات اعلیٰحضرت" مصنفہ علامہ ظفر الدین بہاری علیہ الرحمہ کے پیشِ نظر الیسی طویل طویل اور لاحاصل تنقید کی ہے جو بجائے خود محتاجِ تنقید ہے۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ پروفیسر محمد ایُّوب قادری نے اُسی تنقید کا اپنی کئی تصانیف اور تحریروں میں سہارا لیا ہُوا ہے۔ گویا جب اِن حضرات کے دریائے تحقیق میں جوش آتا ہے تو اِتنے باریک بین ہو جاتے ہیں کہ اپنے مخالفین کی آنکھوں میں فرضی تنکے بھی دیکھ لیتے ہیں لیکن جب اپنے اُن علماء کی طرف متوجّہ ہوتے ہیں جنھیں اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ بنا کر اپنے دِلوں اور دماغوں پر سوار کیا ہُوا ہے تو آنکھیں اتنی چندھیا جاتی ہیں کہ اُن حضرات کی آنکھوں کے شہتیر بھی نظر نہیں آتے۔ یہ تحقیق ہے یا دھاندلی؟ یہ انصاف ہے یا تاریخ پر ظلم؟ یہ عام مسلمانوں کی رہنمائی اور خیر خواہی ہے یا تحقیق کی آڑ میں اُنھیں غلط راستے پر گامزن کرنا اور خدا کے مقبول بندوں کے خلاف صف آرا کرنا اور ہونا؟ حقائق آپ حضرات کے بھی سامنے ہیں؛

انصاف کی ترازو ہاتھ میں ہے، کیوں ڈنڈی مار کر دیانت وامانت کا خون سرِ بازار کیا جا رہا ہے؛ کیا قیامت نہیں آئے گی؛ ہم مولوی محمد سلیمان صاحب بدایونی کو مخلصانہ اور خیر خواہانہ مشورہ دیتے ہیں کہ: ؎

رِندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تُو
تجھ کو پرائی کیا پڑی، اپنی نبیڑ تُو

اِس سلسلے کا سب سے افسوسناک پہلُو یہ ہے کہ بعض حضرات بُغضِ معاویہ میں اِتنے دُور نکل جاتے ہیں کہ سنگین سے سنگین الزام ڈنکے کی چوٹ لگاتے ہیں لیکن اُس الزام کی پُشت پر کوئی جھُوٹ مُوٹ کی دلیل یا فرضی وجعلی شہادت تک پیش کرنے سے بھی عاجز ہوتے ہیں۔ ثبوت خواہ زندگی بھر میسّر نہ آسکے لیکن بہتان تراشی میں کوتاہی کرنا جُرم سمجھتے ہیں۔ مثلاً پچھلے دنوں "آئینۂ صداقت" نامی ایک کتاب دیکھنے کا اتفاق ہُوا۔ کتاب کے مُصنّف پروفیسر الحاج محمد فیروزالدین رُوحی ہیں۔ سرِورق پر لکھا ہے کہ "بریلوی اور دیوبندی مسلک کی حقیقت تاریخ کے آئینہ میں"۔ یہ[1] سُہانا اعلان، کتاب[2] کا پیارا پیارا نام پڑھ کر اور[3] یہ معلوم کر کے کہ مُصنّف ماشاءاللہ اِسلامک سٹڈیز کے پروفیسر ہیں اور ساتھ[4] ہی الحاج بھی، نیز روحانیت[5] سے تعلق رکھنے والے تخلّص سے بھی مزیّن ہیں، یہ امید ہو چلی تھی کہ موصوف نے ضرور تاریخی انصاف سے کام لیا ہوگا، اختلافات کی تلخی کو کم کرنے کی سعی فرمائی ہو گی اور علمی انداز میں مثبت کردار ادا کیا ہو گا، لیکن کتاب کا مطالعہ کیا تو ساری کتاب رہی ایک طرف، پہلے چند صفحات ہی نے میرے خرمنِ اُمید میں ایسی آگ لگائی کہ اُس کا نام ونشان تک مٹا دیا۔ انتہائی افسوس کے ساتھ کہتا ہُوں کہ شاید محترم رُوحی صاحب مثبت انداز کے تصوّر سے بھی ناآشنا ہیں اِسی لیے موصوف نے پُوری کتاب میں منفی انداز ہی کو نبھایا اور بعض مقامات پر تو اِس سے بھی نیچے پھسلتے اور لُڑھکتے رہے۔ چونکہ "آئینۂ صداقت" نامی کتاب کے بارے میں راقم الحروف نے اپنے تاثرات کا اظہار کر دیا ہے لہٰذا اِس کا تعارف کروانا ضروری خیال کرتا ہُوں۔ موصوف رقم طراز ہیں:

"کسی سے مناظرہ مقصود نہیں ہے، نہ کسی کو سبّ وشتم کرنے کا خیال ہے، نہ ہی کسی کی بے جا طرفداری اپنا شعار ہے۔ ہر بات کا ثبوت کتاب اور حوالہ سے

موجود ہے۔ ہر شخص خدا کو حاضر و ناظر جان کر، طرف داری اور جانب داری کو چھوڑ کر، اِس کتاب کا مطالعہ کرے گا، اِنشاء اللہ حقیقت اُس پر واضح ہوجائے گی۔“[1]

آیئے رُوحی صاحب کے مذکورہ دعاوی کا جائزہ لیتے ہیں کہ اپنی اِس تصنیف میں موصوف نے کہاں تک اِن کا پاس لحاظ کیا ہے؟ یا محض قارئین کے دِل موہ لینے کی خاطر یہ خوشنما اعلان کیا ہے۔ چنانچہ موصوف لکھتے ہیں؛

”اِن کو کیا معلوم کہ ابنِ عابدین شامی نے حکومت کے اثر سے اِن غریبوں (وہابیوں) کو بدنام کیا اور اِن کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر کے اپنی دنیا سنبھالی۔ بُرا ہو اِس دنیا پرستی اور سنہرے سکوں کا، جس کے عوض شامی نے نجدیوں کو دِل کھول کر بدنام کیا۔ شامی نے یہ سب کچھ محمد علی پاشا کے حکم سے اُس کی دولت کے اثر سے لکھا ہے۔“[2]

شاید اِس گروہ نے بزرگانِ دین کی اہانت کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اسی لیے باری تعالیٰ شانہٗ اور انبیائے کرام سے لے کر علمائے کرام تک جس کو بھی اپنے خلاف دیکھتے ہیں، اُسی کی طرف اپنی توپوں کا رُخ پھیر کر دُھواں دھار بمباری شروع کر دیتے ہیں۔ رُوحی صاحب سے تو کیا کہا جائے لیکن ہم انصاف پسند قارئین سے یہ درخواست ضرور کریں گے کہ موصوف نے علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ جیسے مسلّمہ عالمِ دین، اہلسنّت کے مایہ ناز فقیہ اور اپنے دور کی یگانہ روزگار ہستی پر جو الزامات مذکورہ عبارت میں عائد کیے ہیں، اِن کا ثبوت مُصنّف نے ”آئینۂ صداقت“ میں کس جگہ دیا ہے؟ اگر ثبوت ہے تو کس صفحے پر اور اگر پہلے صفحے سے آخری تک ثبوت کے نام کا ایک لفظ بھی نہ مل سکے تو ”ہر بات کا ثبوت کتاب اور حوالہ سے موجود ہے۔“ یہ اعلان حقیقی دعویٰ ہی کہلائے گا یا فراڈ؟ کیا ایسی کتاب کا نام ”آئینۂ صداقت“ ہی رکھنا چاہیے تھا یا اور کچھ؟ کیا

---

[1] محمد فیروز الدین روحی: آئینۂ صداقت، مطبوعہ کراچی، ص ۱۱

[2] ایضاً: ص ۵۴

تاریخ کے آئینے میں اِسی طرح فیصلہ ہُوا کرتا ہے؛ معلوم ہوتا ہے کہ روحی صاحب بھی اپنے قبیلے کے جیّد اساطین کی طرح تاریخ سے انتہائی خائف ہیں، ورنہ چاہیے تو یہ تھا کہ ایسے دلائل قارئین کی خدمت میں پیش کرتے، ثبوت ٹھوس، واضح اور وزنی ہوتے تاکہ اُن کی روشنی میں ہر انصاف پسند یہی رائے قائم کرنے پر مجبور ہو جاتا جس کا اعلان موصوف نے بغیر کسی دلیل کے کیا ہُوا ہے۔ یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ بغیر دلیل کے دعویٰ کیا جاتا ہے۔ کیا یہ تاریخ کا، دیانتداری کا، اپنی علمیت کا بلکہ خود اپنی ذات کا مذاق اُڑانا نہیں ہے؟

آئیے! قارئین کی عدالت کے بعد آپ کی سپریم کورٹ سے فیصلہ کروا لیتے ہیں۔ یہ ہیں دار العلوم دیوبند کے سابق صدر، یعنی مولوی حسین احمد صاحب ٹانڈوی (اِسے گاندھوی نہ پڑھنا

سُنیے موصوف کیا فرماتے ہیں:

> "محمد بن عبد الوہاب نجدی ابتداءً تیرھویں صدی نجد سے ظاہر ہُوا اور چونکہ خیالاتِ باطلہ اور عقائدِ فاسدہ رکھتا تھا، اِس لیے اُس نے اہل سنّت والجماعت[1] سے قتل و قتال کیا اور اُن کو بالجبر اپنے خیالات کی تکلیف دیتا رہا، اُن کے اموال کو غنیمت کا مال اَور حلال سمجھا گیا اور اُن کے قتل کو باعثِ ثواب و رحمت شمار کرتا رہا اہل حرمین کو خصوصاً اور اہلِ حجاز کو عموماً اُس نے تکلیف شاقہ پہنچائیں۔ سلف صالحین اور اتباع کی شان میں نہایت گستاخی اور بے ادبی کے الفاظ استعمال کیے، بہت سے لوگوں کو اُس کی تکلیف شدیدہ کے مدینہ منورہ اَور مکہ معظمہ چھوڑنا پڑا اور ہزاروں آدمی اُس کے اَور اُس کی فوج کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ الحاصل وُہ ایک ظالم و باغی اور خونخوار فاسق شخص تھا۔"[2]

ہم رُوحی صاحب سے سوال کرتے ہیں کہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے محبوب نجدیوں کے مظالم اور عقائدِ فاسدہ بیان کیے تو وُہ آں جناب کے نزدیک دنیا پرست او

---

[1] ٹانڈوی صاحب کو چاہیے تھا کہ یہاں اہلسنت وجماعت یا اہل السنت والجماعت۔

[2] حسین احمد ٹانڈوی، مولوی: الشہاب الثاقب، مطبوعہ دیوبند، ص ۴۲

دین فروش ٹھہر گئے لیکن صدرِ دیوبند مولوی حسین احمد ٹانڈوی کے بارے میں ارشاد فرمادیا جائے کہ جناب کے نزدیک یہ بھی دنیا پرست اور دین فروش قرار پائیں گے یا نہیں؟ اب ذرا دُوسری بڑی سرکار مولوی خلیل احمد انبٹھوی کا فیصلہ بھی ملاحظہ فرمالیا جائے:

”سوال: محمد بن عبدالوہاب نجدی حلال سمجھتا تھا مسلمانوں کے خون اور اُن کے مال و آبرُو کو اَور تمام لوگوں کو منسوب کرتا تھا شرک کی جانب اور سلف کی شان میں گستاخی کرتا تھا، اُس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے اَور کیا سلف اور اہلِ قبلہ کی تکفیر کو تم جائز سمجھتے ہو، یا کیا مشرب ہے؟

جواب: ہمارے نزدیک اُس کا حکم وہی ہے جو صاحب درمختار نے فرمایا ہے اور خوارج ایک جماعت ہے شوکت والی، جنھوں نے امام پر چڑھائی کی تھی تاویل سے کہ امام کو باطل یعنی کفر یا معصیت کا مرتکب سمجھتے تھے جو قتال کو واجب کرتی ہے۔ اس تاویل سے یہ لوگ ہماری جان و مال کو حلال سمجھتے اور ہماری عورتوں کو قیدی بناتے ہیں، آگے فرماتے ہیں، اِن کا حکم باغیوں کا ہے.... اور علاّمہ شامی نے اِس کے حاشیہ میں فرمایا ہے، جیسا کہ ہمارے زمانے میں (محمد بن) عبدالوہاب کے تابعین سے سرزد ہُوا کہ نجد سے نکل کر حرمین شریفین پر متغلب ہُوئے، اپنے کو حنبلی مذہب بتاتے تھے، لیکن اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ بس وُہی مسلمان ہیں اور جو اُن کے عقیدے کے خلاف ہو، وُہ مشرک ہے اَور اِسی بنا پر اُنھوں نے اہل سنت اور علمائے اہلسنت کا قتل مباح سمجھ رکھا تھا“ ملخصاً۔[1]

اِس کتاب المہند علی المفند پر اکابر علمائے دیوبند کی تقاریظ بھی ہیں، جن میں آپ کے شیخ الہند مولوی محمود الحسن، جناب کے حکیم الامت مولوی اشرف علی تھانوی، جمعیۃ العلمائے ہند کے صدر مفتی کفایت اللہ دہلوی اور دار العلوم دیوبند کے مایہ ناز مفتی مولوی عزیز الرحمٰن بھی

---

[1] خلیل احمد انبٹھوی، مولوی: المہند علی المفند اردو، ص ۲۱، ۲۲

شامل ہیں۔ کیا رُوحی صاحب بتا سکیں گے کہ مولوی حسین احمد ٹانڈوی اور مولوی خلیل احمد انبیٹھوی نے کس کی دولت کے اثر سے نجدیوں کو بُرا بھلا کہا تھا؛ نیز اِن حضرات کی تصدیق کرنے والے اتنے سارے علمائے دیوبند کو کہاں سے دولت ملتی تھی؟ نجدیوں کو بُرا بھلا تو اکثر علمائے دیوبند نے بھی کہا ہے لیکن یہ منطق ہماری سمجھ بُوجھ سے بالا ہے کہ علّامہ شامی اگر نجدیوں کے عقائدِ فاسدہ کا ذکر کریں تو دین فروش اور دنیا پرست قرار دے دئے جاتے ہیں لیکن علمائے دیوبند جب نجدیوں کے مظالم اور غلط عقائد و نظریات کی نشان دہی کرتے ہیں تو اُنھیں علمائے حق کہا جانا ہے۔ یہ کیسا انصاف ہے، اسلامک سٹڈیز کے پروفیسر عالیجناب الحاج محمد فیروز الدین رُوحی بالقابہ نے اپنی ماڈرن صداقت کے آئینے میں قارئین کو تین ۳ مزید جملے یُوں دکھائے ہیں:

> "احمد زینی دحلان کی حقیقت بھی سُنیے۔ یہ شخص حکومت کا تنخواہ دار ایجنٹ تھا اور اُس کے حکم و اشارہ پر سب کچھ لکھتا تھا۔ چُونکہ مفتیِ مکّہ تھا اِس لیے خُوب کُھل کھیلنے کے مواقع حاصل تھے۔ تفصیلات کا موقع نہیں۔" [1]

> "مولوی فضل رسول بدایونی انگریز کے ایجنٹ اور تنخواہ دار تھے۔" [2]

> "یہاں یہ بات بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ مولانا (امام احمد رضا خاں بریلوی) نے جہاد کے معاملہ میں اپنے استاد (شیخ احمد بن زینی دحلان مکّی) کی سنّت کو پُورا پُورا نباہ کر انگریز کا ساتھ دیا ہے۔ جہاد کے سلسلے میں فتاویٰ رضویہ دیکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔" [3]

مذکورہ تینوں حضرات پر موصوف نے الزام تو اتنا سنگین لگا دیا لیکن اِس شوخی اور شرارت کی کہاں تک داد دی جائے کہ پُوری کتاب میں اِس امر کا ثبوت ایک بھی نہیں دیا جا سکا۔ معلوم نہیں یہ کیسی دیانتداری کا ریکارڈ قائم کیا جا رہا ہے؟ بزرگانِ دین پر الزام تراشی تو

---

[1] محمد فیروز الدین روحی: آئینۂ صداقت، مطبوعہ کراچی، ص ۵۵

[2] ایضاً، ص ۵۷

[3] ایضاً، ص ۵۷

ڈنکے کی چوٹ کرتے جاتے ہیں لیکن ثبوت کے نام سے بھی بدکتے اور بھاگتے چلے جاتے ہیں ، پکڑے جانے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے تو یُوں آنکھوں میں دُھول جھونکنے کی کوشش کرتے اور اُسے اپنی صداقت کے آئینے کی زینت بناتے ہیں :

"تفصیلات کا موقع نہیں۔"[1]

"یہاں پر صرف اشاروں پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔"[2]

"یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں۔"[3]

"ہم صرف اشارہ دیں گے۔"[4]

اِس فرضی آئینۂ صداقت میں یہ علمی دنیا کا مذاق اڑایا گیا ہے یا نہیں ؟ بندۂ خدا! جب آپ کے پاس اِن بزرگوں کو مطعون کرنے اور موردِ الزام ٹھہرانے کے لیے ایک دلیل بھی نہیں جسے آپ اپنے نام نہاد "آئینۂ صداقت" میں پیش کرتے تو الزام تراشی کرنے کی بجائے صاف صاف یُوں لکھ دیتے کہ "علمائے اہلسنّت کی انگریز دوستی کے بارے میں ہمیں تو کیا ہمارے بڑے بڑوں کو بھی کوئی ایک ثبوت نہیں مل سکا تھا، لیکن ہم نے اپنے اکابر کی سیاہ کاریوں پر پردہ ڈالنا ہے ، اِن حالات میں اگر علمائے اہلسنت پر گھنونے الزامات نہ لگائیں تو اپنے اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کی تخریب کاری ، انگریز دوستی اور بت پرست نوازی پر پردہ کس طرح ڈالیں ؟ لٰہذا یہ ذلیل راستہ اختیار کرنے پر مجبور رہیں کیونکہ راہِ راست ہماری طبیعتوں کے ناموافق ہے ۔ فقط والسلام

اگر صاف صاف اِس طرح لکھ دیا جاتا تو قارئین کی نظر میں اُس درجہ قابلِ نفرت تو نہ ٹھہرتے کہ علمی خیانت کرنے اور بزرگانِ دین کے مخالفوں کی فہرست میں شامل ہونے کو اپنا کارنامہ ہی سمجھتے چلے جارہے ہیں ۔ رُوحی صاحب نے یہ زہر کتنے معصومانہ انداز سے اُگلا ہے کہ:

---

[1] محمد فیروزالدین رُوحی : آئینۂ صداقت ، مطبوعہ کراچی ، ص ۵۵ ، ۱۴۵

[2] ایضاً، ص ۱۴۴

[3] ایضاً: ص ۱۴۵

[4] ایضاً، ص ۱۴۵

"جہاد کے سلسلہ میں فتاویٰ رضویہ دیکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔" بھلا اس ستم ظریفی کی داد کہاں تک دی جائے کہ صرف کتاب کا نام لکھ دیا اور جلد، عبارت اور صفحے وغیرہ کا نشان تک نہ بتایا کہ کسی نے نقل کا اصل سے مقابلہ کر کے دیکھ لیا تو سرِ بازار اِس صداقت کے آئینے کو چکنا چُور کر دے گا۔ موصوف نے حوالہ اس طرح دیا ہے گویا یہ دس بیس صفحے کی کتاب ہے لہٰذا مکمل حوالے کی کیا ضرورت؟ ہر کوئی آسانی سے مطلوبہ بیان کو تلاش کر لے گا، حالانکہ فتاویٰ رضویہ تو دنیائے اسلام کا وُہ عظیم فقہی ذخیرہ ہے جس کی چند سطریں بھی شاید رُوحی صاحب کسی کے سامنے بیٹھ کر نہ سُنا سکیں گے۔ فتاویٰ رشیدیہ اور امداد الفتاویٰ کے سائز میں اگر فتاویٰ رضویہ کو چھپوایا جائے تو اِس کی بارہ ۱۲ جلدوں کے پچیس ۲۵ ہزار سے بھی زائد صفحات بنیں گے۔ اگر روحی صاحب کی نظر میں فتاویٰ رضویہ شریف کی کوئی ایسی عبارت ہے جو اُن کے نزدیک قابلِ اعتراض اور اِسلامی تعلیمات کے خلاف ہے تو اُسے پیش کر کے، فیصلہ قارئین کے سپرد کر دیتے۔ بغیر حوالہ الزام کیسا؟

موصوف کا مندرجہ ذیل بیان اور اُس کے ذریعے جو تاثر دیا گیا ہے یہ کرشمہ اُن کی مشّاقی پر دلالت ہے۔ رُوحی صاحب نے یہاں جو چابکدستی اور ہاتھ کی صفائی دکھائی وُہ تعریف سے مستغنی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> "علمائے اسلام نے دہلی کے آخری بادشاہ ظفر شاہ کی برائے نام حکومت کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی اور اسلام کو سر بلند کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے شدید مظالم سے مجبور ہو کر دہلی میں جہاد کا فتویٰ مرتب ہُوا، جس پر علمائے دہلی اور علمائے حق پرست کی مُہریں ہُوئیں۔"[1]

یہ بالکل درست ہے کہ علمائے کرام نے ۱۸۵۷ء میں جہاد کا فتویٰ مرتب کیا۔ یہ بھی درست ہے کہ حق پرست علماء نے اُس فتوے کی تصدیق وتشہیر فرمائی۔ لیکن روحی صاحب کے کمال کی داد کہاں تک دی جائے کہ اُن علمائے کرام کے اسمائے گرامی صیغۂ راز میں رکھے۔

---

[1] محمد فیروز الدین رُوحی: آئینۂ صداقت، ص ۹۸، ۹۹

اِس طرح شرمانے اور پردہ پوشی کا تکلف فرمانے کی وجہ یہی تو ہے کہ اگر وُہ نام ظاہر کر دیتے تو موصوف کے محبوب علماء کسی اور ہی صف میں نظر آنے لگیں گے۔ لہٰذا بغیر اظہار کے تاثر یہ دیا جا رہا ہے کہ وُہ علمائے دیوبند ہی تھے جو انگریزوں کے خلاف جنگ آزما ہُوئے تھے اور یہی علمائے حق پرست ہیں۔ فتوٰی مرتب کرنے والے اور تصدیق و تشہیر کرنے والوں کے اسمائے گرامی اگر لکھ دیے جاتے تو رُوحی صاحب کا سارا منصوبہ ہی دریا بُرد ہو جاتا، اِسی لیے راز داری کا دامن پکڑ کر چلتے رہے۔ آگے موصوف نے اپنے محبوب علماء کی للّٰہیت اور انگریز دشمنی کی دلیل کیا مزے دار پیش کی ہُوئی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ”اِن مدارس (دیوبند و سہارن پور) نے نہ کبھی سرکاری امداد لینی گوارا کی اور نہ ڈپٹی انسپکٹروں کو اپنے یہاں آنے کا موقع دیا، جو اُنھیں سرکار کی وفاداری پر مائل کرتے۔“ [1]

جب دار العلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارن پور دونوں ہی دینی درسگاہیں ہیں پھر اِن کے متعلق سرکاری امداد اور ڈپٹی انسپکٹروں کے آنے یا نہ آنے کے ذکر کا یہاں کوئی موقع اور محل ہی نہیں تھا۔ یہ ہر تعلیم یافتہ آدمی جانتا ہے کہ سرکاری امداد کِن مدارس کو ملتی ہے اور ڈپٹی انسپکٹر کون سے تعلیمی اداروں میں جایا کرتے ہیں۔ چونکہ یہاں چور کی داڑھی میں تنکے والا معاملہ تھا، لہٰذا موصوف کو یہ غیر متعلق شیخی بگھارنی پڑی۔ قارئین کرام کی تسلی کے لیے ہم وُہ تِنکا بھی دکھا دینا ضروری سمجھتے ہیں، جس نے رُوحی صاحب کو یہ البیلا اور لاتعلق بیان داغنے پر مجبور کیا تھا۔

دار العلوم دیوبند اور مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کی حقیقت اَور اِن کے بانیوں اور کارکنوں کے مدلّل اور تفصیلی خدّوخال بصد شوق اِسی کتاب میں ملاحظہ فرمائے جا سکتے ہیں، یہاں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ دار العلوم دیوبند کے بانی مولوی محمد قاسم نانوتوی (المتوفی ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۷۹ء)، مولوی مملوک العلی نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۱ء) کے شاگردِ عزیز اور دہلی کالج کے تربیت یافتہ تھے۔ اِس مدرسہ کی تاسیس میں جن حضرات کا ہاتھ تھا، اُن میں سے

---

[1] محمد فیروز الدین رُوحی: آئینۂ صداقت، ص ۱۲۰

ایک مولوی محمود الحسن دیوبندی (المتوفی ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء) کے والد مولوی ذوالفقار علی دیوبندی (المتوفی ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء) تھے جو پہلے بریلی کالج کے پروفیسر اور پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے اور اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ دوسرے مولوی شبیر احمد عثمانی (المتوفی ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۴۹ء) کے والد مولوی فضل الرحمٰن (المتوفی) تھے جو بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے اور اسی عہدے پر رہتے ہوئے ملازمت ختم ہوئی۔ دار العلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس مولوی محمد یعقوب نانوتوی (المتوفی ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۴ء) دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور مولوی مملوک العلی کے صاحبزادے تھے۔ پہلے یہ اجمیر کالج میں مدرس مقرر ہوئے تھے اس کے بعد بنارس، بریلی اور سہارن پور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس بن کر رہے۔ گویا مدرسہ دیوبند کے قائم کرنے والے، پڑھانے والے، چلانے والے سب کے سب سرکاری آدمی تھے اور خاص طور پر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہی رہے تھے۔ دریں حالات یہاں ڈپٹی انسپکٹروں کے آنے کی کون سی ضرورت اور گنجائش باقی رہ گئی تھی؟

مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے مدرس اوّل مولوی محمد مظہر نانوتوی تھے۔ موصوف دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور مولوی مملوک العلی نانوتوی کے شاگرد اور عزیز تھے۔ تمام عمر سرکاری ملازمت کی اور آگرہ کالج میں تعلیمی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ریٹائر ہونے پر سہارن پور میں یہ مدرسہ قائم کر لیا۔ اِن کے معاونِ خاص، موصوف کے حقیقی بھائی مولوی محمد منیر نانوتوی تھے۔ یہ بھی دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور برٹش گورنمنٹ کے ملازم تھے۔ بریلی کالج میں تعلیمی خدمات انجام دینے پر مامور رہے۔ سرکاری ملازمت ختم کرنے کے بعد دونوں بھائیوں نے سہارن پور میں مدرسہ قائم کر لیا۔ یہ تھے اِن مدارس کے کارندے۔ کیا حکومت اِن حضرات کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتی؟ انگریزوں کو معلوم نہیں روحی صاحب نے اتنا بے وقوف کیوں سمجھ لیا کہ وہ تحصیل حاصل کی سعی کرتے۔

الحاج فیروز الدین صاحب! ایک روز ہم سب نے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ کیا ”آئینۂ صداقت“ جیسی کتاب لکھتے وقت آپ کو اُس عظیم بارگاہ کی حاضری اور قیامت جیسے دِن کی ہولناکی کا خیال تک نہ آیا؟ کسی کی خاطر اپنی عاقبت برباد کرنا کہاں کی

عقلمندی ہے؟ جن اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں، اسلام اور مسلمانوں کے خیر خواہوں پر آپ نے سنگین بہتان لگائے اور الزام عائد کیے ہیں۔ کیا بروزِ قیامت یہ بزرگ آپ کو گریبان سے پکڑ کر باری تعالیٰ شانہٗ، کی بارگاہ سے انصاف کے طلب گار نہ ہوں گے؟ کیا اُس روز یہ دھاندلی کام آجائے گی؟ ؎

جب سرِ محشر وُہ پُوچھے گا بُلا کے سامنے
کیا جوابِ جرم دو گے تم خدا کے سامنے

۴۔ اِس کتاب کے لکھنے کی چوتھی وجہ علمائے اہلسنت کی سہل پسندی اور خوش فہمی ہے۔ شعبان المعظم ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۷۱ء میں "مرکزی مجلس رضا لاہور" نے راقم الحروف کا مقالہ "اعلحضرت کا فقہی مقام" شائع کیا۔ اِس مقالے کے صفحہ ۱۹ پر ایک عبارت یُوں ہے: "کسی زندہ قوم میں اِس مرتبے کا کوئی عالم پیدا ہو جاتا تو وُہ قوم اُس کے علوم و فنون سے نہ صرف خود مستفید ہوتی بلکہ تمام دنیا کو اُس کے افکار و نظریات پڑھنے اور سمجھنے پر مجبور کر دیتی"۔

اِس عبارت پر ہمارے ایک محترم مولوی صاحب بگڑ بیٹھے اور فرمایا کہ کیا اعلحضرت قدس سرہٗ مُردہ قوم میں پیدا ہوئے تھے؟ کیا علمائے اہلسنت نے اعلحضرت پر آپ کی نظر میں کوئی قابلِ قدر کام نہیں کیا؟ فلاں کتاب میں میرا ایک مقالہ، فلاں صفحے سے فلاں صفحے تک موجود ہے، اُسے پڑھ کر رائے قائم کیجیے۔

گویا معاندین و مبتدعین نے جو امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف لاکھوں صفحات سیاہ کیے ہُوئے ہیں۔ ہمارے کرم فرما مولوی صاحب نے چند صفحے کا ایک مضمون لکھ کر مخالفین کا سارا قرضہ چکا دیا۔ اعلحضرت اور اُن کی تعلیمات کو منظرِ عام پر لے آئے، فاضل بریلوی کو ہر کہ ومہ سے امامِ زمانہ منوا دیا۔ اہلسنّت وجماعت کے سب دُکھ دُور کر دیے۔ بھلا اِس خوش فہمی اور صورتِ حالات سے چشم پوشی کی کوئی حد ہے؟ ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دِل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

۵۔ پانچویں وجہ بعض موجودہ علمائے اہلسنّت کی ستم ظریفی اور امام احمد رضا خاں بریلوی کے

ساتھ نادان دوستی ہے۔ ایسے بھی علمائے اہلسنّت ہیں جنھوں نے اپنی صلحِ کلی میں یا ناقص مطالعہ وکوتاہ فہمی سے یا مبتدعینِ زمانہ سے مرعوب ہوکر فاضلِ بریلوی قدس سرّہٗ کی بعض تحقیقات کو اِس رنگ میں پیش کرنا شروع کردیا ہے جس سے رضویت کا چہرہ تقریباً مسخ ہوکر رہ جاتا ہے۔ جب جیدّ علمائے اہلسنّت سے اپیل کی جاتی ہے کہ وُہ ایسی باتوں کا سدِّباب کریں، اِن حضرات کو سمجھائیں تو کشتیِ اہلسنّت کے یہ ناخدا کسی طرح بھی اپنی مہرِ سکوت توڑنے پر رضامند نہیں ہوتے۔ اِس افسوسناک صورتِ حال نے مجبور کیا امام احمد رضا خاں بریلوی کے علمی کارناموں کو کسی حد تک منضبط کرنے کی اپنی بساط بھر کوشش کردی جائے۔ واللہ ولی التوفیق۔

اِن وجوہات کے تحت راقم الحروف کے دِل میں یہ خیال موجزن ہُوا کہ حضرت یُوسف علیہ السلام کے خریداروں میں ایک بڑھیا سُوت کی انٹی لے کر شامل ہوسکتی ہے تو کیوں نہ حقائق کے پھُولوں کا ایک گلدستہ تیار کرکے مجدّدِ دوراں کے عقیدت مندوں میں شامل ہونے کی کوشش کروں۔ شاید یہی کاوش میرے لیے کفارۂ سیئات اور نجاتِ اُخروی کا باعث بن جائے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ تجدید کی ضرورت پیش ہی اُس وقت آتی ہے جب رہنمائی کے پردے میں رہزنی اور تخریب کاری کا بازار گرم ہوچکا ہو۔ کسی بھی مجدّد کے کارناموں کا مطالعہ کرکے دیکھ لیجیے اُس کے گرد ایسے تخریب پسندوں کا جمِّ غفیر نظر آئے گا جو رہبری کے پردے میں رہزنی کا کام کرتے ہوں گے اور اصلاح کے نام پر فساد کی جڑیں مضبوط کرنا اُن کا مشغلہ رہا ہوگا۔ چونکہ بدقسمتی سے ایسے لصوصِ دین بھی مسلمانوں کے سامنے قوم کے رہنما، دینی پیشوا اور روحانی مقتدا بن کر ہی آتے ہیں بایں وجہ کتنے ہی مسلمانوں کی قوتِ فیصلہ ایسے مواقع پر گھٹنے ٹیک دیتی ہے اور اہلِ اسلام سے کتنے ہی بدنصیب اُن کے بعض خوشنما کاموں کو دیکھ کر بِک جاتے ہیں۔

امامِ ربّانی حضرت مجدّد الفِ ثانی سرہندی قدّس سرّہٗ کے دَور میں بھی دو طبقے تخریبِ دین کا کام کرنے میں پیش پیش تھے یعنی حکومت اور نام نہاد مذہبی رہنما۔ بعینہٖ اِسی صورتِ حال سے امام احمد رضا خاں بریلوی نوّر اللہ مرقدہٗ کو دوچار ہونا پڑا۔ وہاں اکبر اور جہانگیر تھے تو یہاں اسلام دشمن انگریز۔ وہ حکومت علی الاعلان اسلام کو بدلنے اور مٹانے پر مُصِر تھی لیکن انگریزی حکومت نامعلوم اور پُراسرار طریقوں سے۔ اُس وقت کے فیض وفضل سے محروم علماء، جو دینِ محمدی کی جڑیں کھودنے میں مصروف تھے وُہ صاف نظر آتے تھے کہ اسلام دشمن حکومت کے اراکینِ سلطنت ہیں،

لہٰذا عوام الناس اُنھیں اپنا رہنما تسلیم کرنے پر کبھی راضی نہیں ہو سکتے تھے لیکن برطانوی دور کے علمائے سُوء نے ایسے نامعلوم طریقوں سے برٹش گورنمنٹ کے اسلام دشمنی والے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی منحوس کوشش کی کہ مِلّتِ اسلامیہ کے کتنے ہی بیدار مغز حضرات تک کی قوتِ فیصلہ اُن کے کھوٹ کا سراغ لگانے سے قاصر ہو کر رہ گئی۔ مذکورہ صورتِ حال کے پیشِ نظر ہمیں اِس کتاب کی پہلی جلد کا بیشتر حصّہ محض تخریب کاروں کی سراغ رسانی کے لیے وقف کرنا پڑا۔

چاروں جلدوں کے مندرجات حسبِ ذیل ہیں :

جلد اوّل مجدّدِ مائۃ حاضرہ رحمۃ اللہ علیہ کا مختصر تعارف ، انگریزوں کا تسلّط ، ذہنیت ، لوٹ کھسوٹ ، مظالم ، اسلام دشمنی کی صُورتیں ، برٹش نواز علماء خود اپنی تاریخ کے آئینے میں ، اُنھوں نے مقدس شجرِ اسلام میں کیسی کیسی غیر اسلامی قلمیں لگائیں نیز ہنود کے ہاتھوں بِک کر مسلمانوں کو ہندو اکثریت میں ضم کرنے کی کیسی کیسی چالیں چلیں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کو بر ملا ایک قوم بتایا ، حتّٰی کہ گاندھی جیسے بُت پرست کو اپنا امام بنایا۔ جملہ عنوانات پر دلائل کے انبار۔

جلد دوم امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃُ اللہ علیہ کے تجدیدی کارنامے کا نظم و نثر میں خاکہ، علمائے مبتدعین نے کون کون سے علمی محاذ کھولے ، سب کے ساتھ مقابلہ ، گھمسان کا رَن ، میدان فاضلِ بریلوی کے ہاتھ ، طرزِ استدلال کی جھلکیاں ، محاسبے کا خداداد سکّہ ، علمیت کے نمونے ، تصانیف کا معیار اور اُن کے اعداد و شمار۔

جلد سوم آپ کا جامع العلوم ہونا گوناگوں تصانیف عالیہ کی روشنی میں ، علمائے عرب و عجم کی نظر میں آپ کا مقام ، فاضلِ بریلوی کے درجۂ امامت پر سیر حاصل اور ایمان افروز بحث۔

جلد چہارم اعلٰحضرت علیہ الرحمہ کا رُوحانی درجہ ، آپ کے ملفوظات و مکتوبات وغیرہ۔

یہ کام یقیناً اتنا عظیم ہے کہ اِس کے لیے علمائے کرام کا ایک بورڈ مقرر ہوتا ، وہ حضرات متعلقہ مواد کو اکٹھا کر کے اُن سے اِس مردِ حق آگاہ کے کارناموں کو ایک لڑی میں پروتے چلے جاتے۔ لیکن افسوس ! امام احمد رضا خاں بریلوی جیسے جامع العلوم ، مرکزِ دائرۂ تحقیق اور فقیہِ اعظم پر آج تک علمائے کرام نے جو کتابیں لکھی ہیں اُنھیں دُوسروں کے سامنے پیش کرتے ہُوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ بہر حال اُن چھوٹی موٹی کتابوں کا وجود بھی اِس بے اعتنائی اور خود فراموشی

کے دَور میں غنیمت ہے۔ ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء میں احقر کو بعض نفسِ مضمون سے خاص مناسبت رکھنے والی کتابیں اَور بھی دستیاب ہوگئیں تو مجدّدِ مأتہ حاضرہ قدس سرّہٗ کا تجدیدی کارنامہ اڑھائی تین ہزار صفحات تک پھیلتا چلا گیا اور ہنوز بعض کتابوں کے دستیاب نہ ہونے کے باعث اِس میں کافی کمی محسوس کرتا ہُوں۔

بہرحال سرِدست جو کچھ تیار ہُوا ہے اُسے غنیمت شمار کر کے چاؔر جلدوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یُوں تو چاؔر کا عدد بھی کئی وجہ سے بہت مبارک ہے لیکن ممکن ہے کہ اشاعت کی جانب سے حوصلہ افزا حالات پیدا ہوجائیں یا اہلِ علم حضرات کے تعاون سے بعض نایاب کتابوں تک رسائی ہوگئی تو شاید اِس مقدّس مجموعے کی پانچ جلدیں ہوجائیں۔ باری تعالیٰ شانہٗ اپنے عاجز بندے کو اِسے مکمل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے، علمائے کرام کو علمی معاونت کا جذبہ بخشے اور کسی خوش نصیب پبلشر کو اِسے منظرِ عام پر لانے کا حوصلہ عطا فرمائے تاکہ معتقدوں کے علاوہ اُن لوگوں کے سامنے بھی امامِ زمانہ کا تذکرہ ایک شفّاف آئینے کی صورت میں آجائے جو آج تک دورِ حاضر کی اِس عدیم النظیر علمی ہستی کو محض ایک خشک مُلّا، بدعتی مولوی، جھگڑالو، پیٹ پرست اور انگریز کا ایجنٹ وغیرہ سمجھتے رہے ہیں کیونکہ بدقسمتی سے جِن علماء کو اُنھوں نے وارثِ علمِ پیمبر سمجھا ہُوا تھا، وُہ علمائے نہ تھے لصوصِ دین تھے، اُنھوں نے اپنی اسلام دشمنی پر پردہ ڈالنے کی خاطر علمائے حق کو بدنام کیا، اُن کے خلاف متعدّد محاذ کھولے اور علمائے سوٗ کی قصیدہ خوانی کرتے رہے تاکہ اُنھیں بھی مسلمانوں میں سے ہمنوائی کرنے والے مِل جائیں۔ اُن کے قائم کردہ فرقے کے شجرِ خبیثہ کی جڑیں بھی دُور تک پھیل کر مضبوط ہو جائیں۔ ایسے معاندین کو خاص طور پر دکھانا ہے کہ اے دھوکا کھانے والو! جس کا فتاوٰی جہازی سائز کے چودہ ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور تمھیں بہکانے والے علماء جس کی بعض تصانیف کو پڑھ کر سمجھ لینے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے، کیا وُہ ایک خشک مُلّا تھا یا دُنیائے اسلام کا فقیہہِ اعظم اور امامِ زمانہ، جس نے برٹش گورنمنٹ کے جملہ ایجنٹوں اور گاندھی کی شطرنج کے تمام مُہرِوں کو مات کر دیا، علم و فضل کے بلند بانگ دعاوی کے باوجود اُنھیں علمی محاذ پر شکست فاش ہی نہیں دی بلکہ سب کی ناک خاک میں رگڑ دی، کیا وُہ ایک جھگڑالو تھا یا حضرت مجدّد الف ثانی قدس سرہٗ (المتوفی ۱۰۳۴ھ) کی طرح ایک زبردست مجاہد، حقانیت کا

علمبردار اور چودھویں صدی کا مجدِّد تھا؟ جس کی کسی ایک تصنیف کا کسی مخالف سے آج تک جواب نہ لکھا جا سکا، بلکہ اُس کی کسی ایک دلیل کو بُولہبی شرارے آج تک دعویٰ سے بیگانہ ثابت نہ کر سکے بلکہ اُس کی ایک ہزار تصانیف میں سے کوئی ایک حوالہ بھی ایسا نہ دکھا سکے جو غلط ہو بلکہ اُس کے متعلق کسی سے آج تک یہ دکھایا نہیں جا سکا کہ فلاں مسئلے میں وُہ اُمتِ محمدیہ کے اکابر کی تصریحات کے خلاف ہے۔ کیا جو اوّل سے آخر تک اکابر کے دامن سے وابستہ، اُسی مقدس اسلام کا علمبردار ہو، کسی ایک شق میں بھی اُن سے سرِ مُو اختلاف کرنا روا نہ رکھے، کسی ایک مسئلے میں اُن کی تصریحات سے انحراف نہ کرے وُہ بدعتی مولوی ہے اور جنھوں نے برٹش گورنمنٹ کے وظیفوں کی شراب سے مخمور اور گاندھی وغیرہ عمائدینِ کانگرس کے جال میں پھنس کر برلا اور ٹاٹا کی تجوریوں کی جھنکار سے مسحور ہو کر نبیِ آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لائے ہوئے مقدس اسلام کا حُلیہ بدلنے، اُس کی صورت کو مسخ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا، آیا ایسے اسلام دشمن عناصر کو اُن کے خوشنما نعروں، تالیفِ قلوب کے سامانوں اور محض جبّہ و دستار یا قال اللہ و قال رسول اللہ کی گردانوں کے باعث مسلمانوں کے خیر خواہ بلکہ رہنما بلکہ ملّتِ اسلامیہ کی کشتی کے ناخدا تسلیم کر لیا جائے؟

احقر نے مشعلِ راہ کی جلد اوّل میں بھی کٹھن اور دشوار گزار وادی طے کی ہے۔ مُلک و ملّت کی خیر خواہی میں وقت کی ضرورت اور صورتِ حالات کے تحت سب سے نازک اور سب سے اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ انصاف پسند حضرات ملاحظہ فرمائیں گے کہ ہم نے کسی سے ذاتی عداوت یا دھڑے بندی کے طور پر الزام عائد نہیں کیے، بلکہ جو کچھ کہا ہے انصاف کی ترازو پر تول کر کہا ہے بلکہ وہی کچھ کہا ہے جو اُنھوں نے اپنی تصانیف کے اندر از خود لکھا ہے۔ ہم نے اُن کے اپنے ہی تیار کردہ آئینوں میں اُن کی صورتیں دکھائی ہیں۔ اگر چشمِ بینا کو واقعی وُہ چہرے بدصورت نظر آئیں تو اِس کی ایک وجہ تو یہی ہو سکتی ہے کہ وُہ چہرے ہی حقیقت میں بدنما تھے اور دُوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ جن آئینوں میں اُن کی صورتیں دکھائی گئی ہیں وہ تمام کے تمام تلف کر دینے کے قابل ہیں۔

مبتدعین حضرات اور اسلام دشمن طاقتوں کے پُر اسرار کارندوں کے بارے میں

راقم الحروف کا قلم اٹھانا اُن کے معتقدین کی دل آزاری کی خاطر نہیں بلکہ اِس حقیقت کی نقاب کشائی کا نازک فریضہ دو وجہ سے ادا کرنا پڑا۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اِس کتاب کا نفسِ مضمون چودھویں صدی کے مجدد امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا تجدیدی کارنامہ بیان کرنا ہے اور تجدید اُس وقت تک بیان کی نہیں جا سکتی جب تک اُس دور کی تخریب کاری کا مکمل نقشہ پیش نہ کر دیا جائے۔

دُوسری وجہ مسلمانوں کی خیر خواہی اور اُن کی فلاحِ دارین کا جذبہ ہے۔ یعنی جو مدعیانِ اسلام گمراہ گروں کے پیچھے لگ کر، اُن کے معتقد ہو کر گروہوں میں بٹ گئے، مسلمانوں کی چودہ سو سالہ جماعت یعنی سوادِ اعظم اہلسنت وجماعت سے علیحدہ ہو گئے ہیں، اُنھیں یہ دکھا دیا جائے کہ جن حضرات کو آپ غلط فہمی میں پیشوا اور رہنما تسلیم کر چکے ہیں، اُن کے اصلی اور حقیقی خد و خال یہ تھے۔ چنانچہ اِسی وجہ سے ہمیں بتانا پڑا کہ مسلمانوں کی جمعیت اور شیرازہ بندی کو کس نے نقصان پہنچایا؟ یہ فرقے دَورِ حاضر میں کس نے بنوائے؟ کن صاحبانِ جُبّہ و دستار سے بنوائے؟ کس مقصد کی خاطر بنوائے؟ یہ بتا کر جملہ مدعیانِ اسلام سے اپیل کروں گا کہ ایسے حضرات کے پیچھے لگ کر دنیا میں مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا جنازہ نکالنا اور آخرت میں واصلِ جہنم ہونا زیادہ مفید ہے یا اِس کے برعکس؟ یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑوں گا۔

ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات ہمارے اِس اقدام کو نظرِ استحسان سے نہ دیکھیں بلکہ غیر مسلموں کے پڑھائے ہُوئے سبق کے مطابق اپنے تاثرات کا اظہار کرنے لگ جائیں کہ کسی فرقے کے معتقدات یا اُس کے اکابر پر تنقید کرنا منفی اندازِ فکر اور فضا کو مکدّر کرنا ہے۔ ایسے تمام حضرات کی خدمت میں ہم یہ وضاحت پیش کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ مقدّس شجرِ اسلام میں غیر اسلامی عقائد و نظریات کی پیوندکاری کرنے والوں اور مسلمانوں کی اجتماعیت کو پارہ پارہ کرنے والوں کا تذکرہ کیوں ناگزیر سمجھا گیا؟

۱۔ جن حضرات کے ہم نے اسلام دشمنی کے پُراسرار اور حقیقی خد و خال پیش کیے ہیں، اُن میں سے اکثر آنجہانی ہو چکے اور اُن کا معاملہ چونکہ اب براہِ راست اپنے مالک سے ہے، لہٰذا اُن کے بارے میں ہمیں اب کوئی فیصلہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ لیکن بدقسمتی سے اُنھیں کتنے ہی مدعیانِ اسلام نے اپنا پیر اور پیشوا بنا لیا تھا اور اُن کی حقیقت کو

نہ سمجھنے کی بدولت کتنے ہی اسلام کا دعوٰی کرنے والے آج بھی بخوشی اُسی گمراہی کے گڑھے میں لڑھکتے جا رہے ہیں جس میں اُن کے پیشوا گرے تھے۔ چونکہ اُنھیں رہنما سمجھنے والے اندھا دُھند اُسی عمیق گڑھے میں گرتے جا رہے ہے جو آنکھ کھلنے پر مکمل تباہی نظر آجائے گی، لہٰذا کلمہ گوئی کا پاس لحاظ کرتے ہُوئے، اُنھیں اُخروی زیاں سے بچانے اور قعرِ جہنم سے نجات دلانے کی محض یہ ایک مدلل اپیل اور تفصیلی گزارش ہے اور بس۔

کیا یہ منفی اندازِ فکر ہے؟

۲۔ قرآنِ کریم ہی کو دیکھ لیجیے کہ اُس نے اسلام اور مسلمانوں کے دُشمنوں کا بُطلان خوب شرح و بسط کے ساتھ واضح فرمایا اور اُن کے سرغنوں کو دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے ذلیل وخوار کیا، حتیٰ کہ مسلمانی کا دم بھرنے والے اُن عناصر کی خلافِ اسلام سرگرمیوں کے راز کھول کھول کر مسلمانوں کے سامنے رکھ دیئے اور اُن کے وجود کو ملتِ اسلامیہ کے لیے کھلے کافروں سے زیادہ نقصان دہ قرار دے کر وقت آنے پر اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کو واشگاف لفظوں میں یوں حکم دیا:

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ	اے غیب کی خبریں دینے والے (نبی) کافروں
وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ[۱]	اور منافقوں سے جہاد کرو اور اُن پر سختی فرماؤ۔

اللہ تعالیٰ نے تو اُن مسلمانی کا دعوٰی کرنے والوں کے خلاف اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کو جہاد کرنے اور سختی برتنے کا حکم دیا تھا، جو اسلام کا دعوٰی کرتے ہُوئے مسلمانوں کی جڑیں کھودنے اور کافروں کے ہاتھ مضبوط کرنے میں خفیہ طور پر مصروف رہتے تھے۔

کیا اللہ تعالیٰ کے اِس حکم کو منفی اندازِ فکر کہا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ کیونکہ اسلامی تعلیم اور مثبت اندازِ فکر یہی ہے کہ غلط مدعیانِ اسلام کا محاسبہ کرنا نہایت ضروری اور اہم ترین فریضہ ہے۔

اب اِسی ارشادِ ربانی کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے کہ جن لوگوں نے برٹش گورنمنٹ

---

[۱] پ ۱۰، سورۂ التوبہ، آیت ۷۳

کے اِسلام اور مسلمانوں کی دشمنی پر مبنی منصوبے اور اُنھیں متحدہ ہندوستان میں ایک عضوِ معطّل بنا دینے والی سکیم کو مسلمانوں کے رہنما، پیشوا، ناخدا کشتیِ مِلّت اور مسیحائے قوم وغیرہ بن کر کامیاب کیا، یا وُہ لوگ جنھوں نے بایں جبہ و دستار گاندھی جیسے مِلّتِ اسلامیہ کے دشمن اور ٹھیٹ بُت پرست کی کُٹیا پر رات دن ناصیہ فرسائی کی، اِسلام اور ہندومت کا فرق مٹاتے، باپو کی جے مناتے رہے، مسلمانوں کا رُخ حرم سے سومنات کی جانب پھیرتے رہے، کیا ایسے لوگوں کی خلافِ اسلام، ظاہر اور پوشیدہ کارگزاریوں کو ظاہر کرنا حُکمِ خداوندی کی تعمیل اور قرآنِ کریم کی تعلیم ہے یا منفی اندازِ فکر؟

۳ ـ وقت آنے پر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایسے منافقوں کو نام لے لے کر مسجدِ نبوی سے باہر نکال دیا، اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ نے منافقوں کی تعمیر کردہ مسجدِ ضرار کو مسمار کروا دیا، اُن کی مسجد کو از رُوئے شرع مسجد قرار نہیں دیا گیا، اُن کی نمازِ جنازہ پڑھنے اور اُن کے لیے بخشش کی دُعا کرنے سے آپ کو منع فرما دیا گیا۔ معلوم نہیں اسلامی رواداری کے نام نہاد علمبردار نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور خود اللہ جلّ شانہٗ کے اِن احکام کے بارے میں کیا فتویٰ صادر فرمائیں گے؟

۴ ـ عہدِ رسالت کے فوراً بعد منکرینِ زکوٰۃ اور مسیلمہ کذّاب اور اسود عنسی وغیرہ مدعیانِ نبوّت منظرِ عام پر آئے، جو مسلمان ہونے کا دعوٰی بھی برابر کرتے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے برحق خلیفۂ اوّل، امیر المومنین سیّدنا ابوبکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جملہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے باتفاقِ رائے نہ صرف اُن سے جہاد کیا بلکہ اِن فتنوں کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ کر پھینک دیا، حالانکہ مِلّتِ اِسلامیہ اُن دنوں انتہائی نامساعد حالات سے دوچار تھی۔ یہ ہے سیّد المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تیار کردہ عدیم النظیر افراد کا طرزِ عمل جو مسلمانوں کے لیے قیامت تک روشنی کے مینار کا کام دیتا رہے گا۔ صحابۂ کرام کے تقوٰی و طہارت اور اصابتِ رائے سے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اِس درجہ مطمئن تھے کہ اپنی بارگاہ کے ان تربیت یافتہ افراد کی پیروی کرنے کا بعد والوں کو یُوں حکم دیا:

اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّہِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ۔ [1]

میرے تمام صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔ اِن میں سے جس کی اقتدا کرو گے ہدایت پاؤ گے۔

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی نے نہیں بلکہ خود اللہ جل شانہٗ نے صحابہ کرام کو معیارِ حق قرار دیتے ہوئے اپنے کلام معجز نظام میں واضح طور پر اور واشگاف لفظوں میں یہ اعلان فرمایا:

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِہٖ فَقَدِ اھْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا ھُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۝ [2]

پھر اگر وہ بھی اِسی طرح ایمان لائے جیسا تم لائے، جب تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر منہ پھیریں تو وہ نِری ضِد میں ہیں۔

جُملہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، خواہ وہ مہاجر ہوں یا انصار، اللہ ربُّ العزّت نے سب کو ایمان کی حقیقی دولت سے مالا مال قرار دیا اور اُن کی مغفرت کا عام اعلان فرمایا ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ط لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ ۝ [3]

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں لڑے اور جنھوں نے جگہ دی اور مدد کی، وہی سچے ایمان والے ہیں۔ ان کے لیے بخشش ہے اور عزت کی روزی۔

تمام صحابۂ کرام کی مغفرت اور اُن میں سے بھی جنھیں عظیم الشان اور عدیم النظیر درجے مرحمت ہوئے اُن کے بارے میں منعمِ حقیقی عزّ شانہٗ نے فرمایا ہے:

لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ط اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَۃً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ط وَکُلًّا

تم میں برابر نہیں وہ جنھوں نے فتح مکّہ سے پہلے مال خرچ کیا اور جہاد کیا۔ وہ مرتبے میں اُن سے بڑے ہیں جنھوں نے بعد فتح کے خرچ اور جہاد کیا اور اِن سب (پہلے خرچ اور جہاد کرنیوالوں

---

[1] مرأۃ شرح مشکوٰۃ، جلد ہشتم، ص ۳۴۵

[2] پ ۱، سورۂ البقرہ، آیت ۱۳۷

[3] پ ۱۰، سورۂ الانفال، آیت ۴

وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۔ [1]

اور بعد میں) سے اللہ جنّت کا وعدہ فرما چکا ۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مقدس گروہ ہمیشہ اللہ جل شانہ، اور اُس کے آخری پیغامبر کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر تن من دھن کی بازی لگائے رکھتا تھا ۔ قرآنِ کریم نے وضاحت فرما دی ہے کہ وہ حضرات، قدسی صفات اپنی منزلِ مقصود کو پا چکے تھے، اُن کی قربانیاں بارگاہِ خداوندی میں شرفِ قبولیت حاصل کر چکی تھیں اور اللہ ربّ العزّت نے اُنھیں اپنی رضامندی کا یُوں مژدہ سُنا دیا تھا:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ
الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ
اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ
عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ
الْعَظِيْمُ ۝ [2]

اور سب میں پہلے مہاجرین وانصار میں سے اور
جو بھلائی کے ساتھ اُن کے پیرو ہوئے اللہ
اُن سب سے راضی ہے اور وہ اللہ سے
راضی ہیں اور اُن کے لیے باغ تیار کر رکھے
ہیں، جن کے نیچے نہریں رواں ہیں، اُن میں
وُہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

مہاجر و انصار کے اوّلین گروہ اور باقی اُن کا اتباع کرنیوالے، جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہے اور دنیا میں ہی جنھیں جنّت کا مژدہ سُنا دیا گیا، کیا انبیائے کرام کے بعد بنی نوعِ انسان کے اِس افضل ترین گروہ سے بہتر کوئی اسلامی تعلیمات کو سمجھ سکتا تھا؛ کیا اِس کامیاب ترین جماعت کے طرزِ عمل کو منفی انداز قرار دینے والے اسلامی زاویۂ نظر رکھنے والے سمجھے جائیں یا غیر اسلامی نظریات کے حامل اور صحابۂ کرام کے اتباع سے عاری؛ حالانکہ قرآنِ کریم کی رُو سے ایمان وہی معتبر جو صحابۂ کرام کی طرح ہو، اعمال وہی مقبول ہوں گے جو اُن حضرات کے اتباع میں ہوں، اِسلامی نظریات و تعلیمات کی وہی تعبیریں معقول اور قابلِ تسلیم ہیں جو اُن حضرات سے منقول ہیں۔ یہی مقدس گروہ قصرِ اسلام کی بنیاد تھا۔ جو عمارت اِس بنیاد پر تعمیر

---

[1] پ ، سورۂ الحدید ، آیت ۱۰

[2] پ ۱۱ ، سورۂ التوبہ ، آیت ۱۰۰

ہوگی وہ اسلامی اور اُن سے ہٹ کر جو عمارت بھی بنائی جائے گی، خواہ اُس کی بنیاد قرآنِ کریم پر بتائی جائے یا احادیثِ مقدسہ پر، توحید پر مبنی ٹھہرائی جائے یا تصوّف پر، سراسر غیر اسلامی اور عند اللہ ناقابل قبول ہوگی کیونکہ صحابہ ہی حقانیت کا معیار اور کتاب وسنّت کے عملی مفہوم و معانی کا وہ زندہ ثبوت ہیں جن کی نظیر چشمِ فلکِ کہن نے نہ آج تک دیکھی ہے اور نہ دیکھی جا سکتی ہے۔ خود اللہ ربّ العزّت نے اپنے اُن مقبول ترین بندوں اور عظیم الشان گروہ کی توصیف فرمائی، اُنھیں سندِ قبولیت بخشی، کامیابی و کامرانی اور رحمت و رضوان کا مژدہ سُنایا اور اُنھیں ہمیشہ باغ و بہشت اور آرام و راحت میں رکھنے کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ ارشادِ ربّانی ہے:

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَهَاجَرُوۡا وَجَاهَدُوۡا
فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ
اَعۡظَمُ دَرَجَةً عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ ۝ یُبَشِّرُهُمۡ رَبُّهُمۡ
بِرَحۡمَةٍ مِّنۡهُ وَرِضۡوَانٍ وَّجَنّٰتٍ
لَّهُمۡ فِیۡهَا نَعِیۡمٌ مُّقِیۡمٌ ۝ خٰلِدِیۡنَ
فِیۡهَاۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنۡدَهٗۤ
اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ۝ [1]

وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مال و جان سے اللہ کی راہ میں لڑے، اللہ کے یہاں اُن کا بڑا درجہ ہے اور وہی مراد کو پہنچے۔ اُن کا رب اُنھیں اپنی رحمت اور اپنی رضا کا مژدہ سناتا ہے اور ایسے باغوں کا جو دائمی نعمت ہیں، ہمیشہ ہمیشہ اُن میں رہیں گے بے شک اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔

اللہ جلّ شانہٗ نے دُوسرے مقام پر اسی وعدے کو یوں دُہرایا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ
جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ
خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً
فِیۡ جَنّٰتِ عَدۡنٍ ؕ وَرِضۡوَانٌ

اللہ نے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں سے جنّتوں کا وعدہ کیا ہے، جن کے نیچے نہریں رواں ہیں، اُن میں ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ مکانوں کا جو جنتِ عدن میں ہیں اور اللہ کی

---

[1] پ ۱۰، سورۂ التوبہ، آیت ۲۰

مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ   رضا جو سب سے بڑی (نعمت) ہے۔ یہ ہے
الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ [1]   سب سے بڑی کامیابی۔

اسی مقام پر چند آیات کے بعد پروردگارِ عالم نے صحابۂ کرام کی قربانیوں کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے انھیں اپنی نوازشات کا ان لفظوں میں بھی مژدہ سنایا ہے:

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا   لیکن رسول اور جو ان کے ساتھ ایمان لائے ،
مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ   انھوں نے اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد
وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَیْرٰتُ ۫ وَاُولٰٓئِكَ   کیا اور انھیں کے لیے بھلائیاں ہیں اور یہی
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ   مراد کو پہنچے۔ اللہ نے ان کے لیے تیار کر رکھی
جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ   ہیں ایسی بہشتیں جن کے نیچے نہریں رواں ہیں،
خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ [2]   ہمیشہ اُن میں رہیں گے، یہی بڑی مراد ملنی ہے۔

یہ ہے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کا مقدس گروہ، جن کے اعمال مقبول، جن کا ایمان باقی اُمتِ محمدیہ کے لیے نمونہ، جو دنیا ہی میں رضائے الٰہی اور وعدۂ جنت کی بشارتوں سے نوازے گئے اُن کا طرزِ عمل اور اللہ و رسول (جل جلالہٗ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی تعلیمات کے تحت اندازِ فکر یہ ہے کہ جو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے اگر وہ اور اُس کے متبعین اِس انتہائی تلبیس سے باز نہ آئیں تو صحابۂ کرام نے اُنھیں موت کے گھاٹ اتار دینے کے علاوہ کوئی اور سلوک تجویز ہی نہیں کیا۔ اِس کے ساتھ ہی جن لوگوں نے اسلامی فرائض میں سے صرف ایک زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کیا اور زکوٰۃ ادا کرنے سے جواب دے بیٹھے خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ مقدس میں صحابۂ کرام نے باتفاقِ رائے اُن لوگوں سے بھی جہاد کیا اور اُن کے دعویٰ مسلمانی کو ایک پرِ کاہ کے برابر حیثیت نہ دی۔

---

[1] پ ۱۰، سورۂ التوبہ، آیت ۲،

[2] پ ۱۰، سورۂ التوبہ، آیت ۸۹

اب کیا فرماتے ہیں آج کے مدعیانِ علم و دانش کہ اگر اسلامی حکومت ہوتی تو دورِ حاضر کے دجّال اور اُس کے پیروکاروں کے ساتھ از رُوئے شرع کیا سلُوک ہوتا؟ صحابۂ کرام نے تو ایک ہی فرض کے انکار کرنے والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا لیکن جو آج اکثر فرائض کے منکر ہیں اور جن کے نزدیک صرف اسلام کا دعوٰی کر لینا ہی اُن کے مسلمان ہونے کے لیے کافی ہے، ایسے مدعیانِ اسلام اور اُن صاحبانِ جُبّہ و دستار کے ساتھ اسلامی حکومت کیا سلوک کرتی جنھوں نے برٹش گورنمنٹ اور ہنود بے بہبود کے ایماء پر، اُن کے وظائف کے تحت، مقدس شجرِ اسلام میں غیر اسلامی عقائد و نظریات کی قلمیں لگائیں، اسلام کے اینگلو انڈین ایڈیشن تیار کیے، بعض اسلام اور عیسائیت کا فرق مٹاتے رہے تو کتنے ہی مسلمانوں اور ہندوؤں کو شیر و شکر بناتے اور سب کو اپنے گاندھی مہاراج کے قدموں میں جُھکانے کی خاطر تن من دھن کی بازی لگائے ہُوئے تھے، ایسے اسلام دشمن عناصر کا اسلامی حکومت کے ہاتھوں کیا حشر ہوتا؟ اگر بدقسمتی سے آج کہیں بھی ایسی اسلامی حکومت نہیں تو ایسے افراد کی نشان دہی جُرم کون سے اسلام کے تحت ہوگئی؟ کیا مسلمانوں کو ازراہِ ہمدردی غلط کار لوگوں سے خبردار کرنا منفی اندازِ فکر ہے؟ کیا آج کل کے اسلام میں رہزنوں کو رہنما اور بدخواہوں کو خیر خواہ ماننا اور منوانا مثبت اندازِ فکر قرار دیا گیا ہے؟

۵- اللہ تعالٰی ہر صدی میں مجدّد بھیجتا ہی اِسی لیے ہے کہ تخریب کاروں نے جو دینِ متین میں غتربود کر رکھی ہو، اُس کا تجزیہ کریں، صحیح و غلط اور حق و باطل میں اپنی خداداد قوتِ فیصلہ اور ہمّتِ مردانہ سے تمیز کر دکھائیں، دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی کر دیں۔ مثلاً امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۵۰۵ھ) نے فلاسفہ، معتزلہ اور زنادقہ کے عمائدین و سرغنوں کو ہر میدان میں علمی محاذ پر شکست دی۔ مباحثہ و مناظرہ اور تقریر و تحریر میں عمر بھر اُن کا محاسبہ کرتے رہے اور اپنے اِس علمی کارنامے کے باعث اُمتِ محمدیہ میں حجۃ الاسلام کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں حالانکہ امام موصوف کے مخالف علماء کا دعوٰی بھی دورِ حاضر کے مبتدعین کی طرح یہی تھا کہ اصلی اسلام کے حقیقی علمبردار وہی ہیں۔

اِسی طرح حضرت مجددِ الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۰۳۴ھ) نے اکبری دور

کے پیدا کردہ غلط کار علماء اور صوفیہ کا زبردست تعاقب کیا اور اسلامی خطوط سے ہٹی ہوئی حکومت کو تائیدِ ایزدی اور ہمتِ مردانہ سے راہِ راست پر گامزن کر دیا۔ کیا اُس دَور کے بے فیض و فضل یعنی نام نہاد ابوالفضل و فیضی اور غلط کار علماء و صوفیہ مسلمان ہونے کے دعویدار نہیں تھے؟ اُن کے دعوئِ اسلام کے باوجود اُنھیں آج بھی غلط کار اور سرہندی مردِ حق آگاہ کو گیارھویں صدی کا مجدِّد تسلیم کیا جاتا ہے۔

لیکن حالات کی اِس ستم ظریفی کو سمجھنے سے ہم یقیناً بڑی حد تک اپنے آپ کو "قاصر" ہی سمجھیں گے کہ پچھلے تخریب کاروں یعنی رہنمائی کے بھیس میں رہزنی کرنے والوں کو رہزن ہی مانا جاتا ہے مگر برٹش گورنمنٹ جیسی اسلام دشمن طاقت اور ہنود و بے یہود جیسے مسلمانوں کے ازلی دشمنوں نے جن "جُبّہ قُبّہ" والوں کو خریدا، اُن سے رہنمائی کے پردے میں رہزنی کا کام لیا، ایسے لصوصِ دین اور بدخواہانِ اسلام و مسلمین کی نشان دہی کرنے اور مسلمانوں کو اُن کے شر سے بچانے کو منفی اندازِ فکر کون سے اسلام کے تحت قرار دیا جاتا ہے؟

۶۔ ہر حکومت امنِ عامّہ اور لوگوں کے مال و جان کی حفاظت کے پیشِ نظر جرائم پیشہ افراد پر کڑی نظر رکھتی، اِرتکاب جُرم کی پاداشں میں اُنھیں سزائیں دیتی ہے تاکہ اُنھیں عبرت ہو اور آئندہ لوگوں کو جانی اور مالی نقصان نہ پہنچا سکیں۔ کیا حکومت کا یہ اقدام فضا کو مکدّر کرنا ہے یا اپنی رعیّت کی خیر خواہی کا ثبوت؟ نیز جو حضرات ایسے عناصر کی نشان دہی کریں تاکہ ذمہ دار حضرات اُن سے باخبر ہو کر مناسب قدم اٹھا سکیں تو نشان دہی کرنے والوں کو خطاکار کہا جائے گا یا ملک و ملّت کا خیرخواہ؟

۷۔ ہر حکومت کا ایک آئین ہوتا ہے، جسے وُہ ملک میں نافذ کر کے تمام باشندوں کو اُس کی پابندی کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اگر کوئی ایک شخص یا جماعت اُس آئین کو تسلیم کرتے ہُوئے اپنے گھر میں بیٹھ کر اُس آئین میں ترمیم کرے اور کچھ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا کر اُنھیں اِس ترمیمی آئین پر عمل کرنے کی ترغیب دے، بلکہ اِس ترمیمی آئین ہی کو حکومت کا اصل آئین بتایا جائے تو اِن حالات میں حکومتِ وقت ایسے فرد یا جماعت کو اپنا خیرخواہ سمجھے گی یا باغی شمار کر کے اُس کے دماغ کو سیدھا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی؟ جو ایسے

پُراسرار باغیوں کی نشان دہی کرے وہ غلط کار لوگوں کی نظر میں تو واقعی کھٹکے گا لیکن کیا حکومتِ وقت اُس نشان دہی کرنے والے کو بُرا سمجھے گی ؟ کیا عقلاء کے نزدیک اُس کا یہ اقدام ملک و ملّت کی خیر خواہی شمار ہوگا یا قابلِ ملامت و نفرت ؟ جب دنیاوی حکومت کے پُراسرار باغیوں کی نشان دہی کرنا (جیسا کہ حکومت کی منشا اور تنخواہ کے تحت سیکیورٹی فورس کرتی ہے) پسندیدہ اور قابلِ تحسین فعل ہے تو حکومتِ الٰہیہ کے ایسے پُراسرار باغیوں کی نشان دہی کرنا منفی اندازِ فکر کہاں سے ہوگیا ؟

٨ - کیا جو حضرات اُن اکابر صحابۂ کرام کو گالیاں دینا ثواب شمار کریں جن کے تقویٰ و طہارت کی فرشتے بھی قسم کھا سکتے ہیں اور انبیائے کرام علیہم السلام کے علاوہ چشمِ فلکِ کہن نے جن کی نظیر ہرگز نہیں دیکھی، علاوہ بریں ماسوائے چند اصحاب کے باقی اُس سارے مقدس گروہ کو مرتد شمار کریں، کلامِ الٰہی جس میں کوئی ایک لفظ کی کمی بیشی کر سکا ہے نہ کر سکے، اُسے محرّف بلکہ اوّل سے آخر تک گھڑی ہوئی کتاب بتائیں، انجیل موجودہ کو غیر محرّف ٹھہرائیں، مجاہد بن کر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلیں، اُن کے مال و جان کو اپنے لیے مباح اور اُن کی آبرو ریزی کرنے کو کارِ ثواب بتائیں، بلکہ مسلمانوں کے قتل کو کھلے کافروں، ٹھیٹ بُت پرستوں کے قتل سے زیادہ باعثِ ثواب شمار کریں، اپنے مہدی ہونے بلکہ صاحبِ وحی و عصمت ہونے کے راگ الاپیں اور یُوں اپنی جعلی نبوّت کے پُراسرار سانگ بھریں، اپنے بڑوں سے ایسی کرامتیں منسوب کریں کہ انبیائے کرام کے معجزے بھی پیچھے رہ جائیں، اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے بلکہ مصافحہ کرنے کا جھوٹا دعویٰ کریں تاکہ سید الانبیا علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام کی تخصیص مٹائیں، اپنا کلمہ پڑھوانے کی تلقین کریں بلکہ اپنی ذات پر درود پڑھوائیں، سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پیدائش پر مسرت کرنے کو کنھیا کا سانگ گِنائیں، نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جیسے آپ کے زمانے میں چھ مثیل و نظیر اور سنائیں، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا علم شیطان لعین کے علم سے کم بتائیں۔ محیط زمین کے علم کا فخرِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے انکار کر کے بلکہ شرک بتا کر اسی علم کو شیطان مردود کے لیے نصوص سے ثابت سنائیں، یُوں نصوص سے شیطان کو خدا کا شریک ہونا ثابت ٹھہرائیں،

سرورِ کون ومکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علومِ غیبیہ کثیرہ عظیمہ وافرہ کو بچوں، پاگلوں اور جانوروں کی معلومات کے برابر سُنائیں اور ذرا نہ شرمائیں، نبیِ آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے کو جہلاء کا خیال اور فضل وکمال سے خالی بلکہ قرآنِ کریم کا انکار بتائیں اور مرتبی کے نام سے تیرھویں صدی میں نئی خاتمیت گھڑیں اور اُسے آپ کے شایانِ شان گنائیں یوں برٹش گورنمنٹ جن سے دعوئِ نبوّت کرواتی اُن کے لیے چور دروازے بنائیں، احادیثِ مطہرہ کے دفاتر کو مَن گھڑت پلندے ٹھہرائیں، پیشانی پر قشقہ کھینچ کر ہنُود کی جے کے نعرے لگائیں، اُن کی ارتھیاں اُٹھائیں، سمادھیوں پر پھُولوں کی چادریں چڑھائیں، گاندھی کو نہ صرف اپنا پیشوا اور امام علی الاطلاق بنائیں بلکہ اُس ٹھیٹ مشرک، کھُلے بُت پرست کو نبوّت کا اہل سُنائیں، باری تعالیٰ شانہٗ کو مجسّم ٹھہرا کر حادث بنائیں بلکہ اُس کا جھُوٹا ہو جانا ممکن بتا کر کاذب بالفعل تک ٹھہرائیں بلکہ وقوعِ کذب کے معنی درست ہو جانا تک سُنا کر اپنا مُنکرِ اُلوہیت ٹھیٹ دہریہ ہونا دکھائیں، کیا ایسے حضرات کو محض اُن کے جُبّہ ودستار کی بنا پر یا مولوی، مولانا، مفتی، حضرت جی، امام الہند، شیخ الاسلام، شیخ الہند، امامِ ربّانی، قطب الاقطاب، فقیہہ النفس، مسیحائے قوم، شاعرِ ملّت، مصلح، ریفارمر، حکیم الامّت، مفسّر، محدّث، نابغۂ عصر، شمس العلماء، مجدّد، شیخ الکل اور امیر المومنین وغیرہ کہلانے کے باعث ہی مسلمانوں کے رہنما، ملّتِ اسلامیہ کے پیشوا اور اسلام کے خیر خواہ شمار کر لیا جائے؟ بھلا کون سا مسلمان اُنھیں اپنا پیشوا مان سکتا ہے؟ کیا کسی صاحبِ عقل ودانش کو زیب دیتا ہے کہ وُہ رہنماؤں کو چھوڑ کر لصوصِ دین کو رہنما تسلیم کریں؟ ایسے حالات میں شیطان، منافقینِ مدینہ، یزید پلید اور دُوسرے ملّتِ اسلامیہ کے دشمنوں کی طرح اِن حضرات کے سیاہ کارناموں سے مدعیانِ اسلام کو باخبر کرنا ایک اخلاقی اور دینی فریضے کی ادائیگی ہے۔ کیا ایمان کے لٹیروں سے لوگوں کو خبردار کرنا منفی اندازِ فکر ہے؟

۹- پاکستان کو معرضِ وجود میں آتے ہُوئے اٹھائیس سال کا عرصہ گزر چکا لیکن تاحال تحریکِ پاکستان کی کوئی شایانِ شان تاریخ منظرِ عام پر نہیں آسکی اور نہ ابھی تک نظریۂ پاکستان کو

اُجاگر کرنے کی ضرورت محسوس فرمائی گئی بلکہ اندرونِ خانہ اِسے مٹانے اور بے راہروی کو فروغ دینے کی کوشش ہی ہوتی رہی ہے جبکہ پاکستان کا مطلب لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ بتایا جاتا تھا۔ گویا: ؎

ہم بدلنا چاہتے تھے نظمِ میخانہ تمام
آپ نے بدلا ہے لیکن صرف میخانے کا نام

اگر کوئی بھی حکومت تحریکِ پاکستان کی تاریخ مرتّب کرواتی اور اُسے اسکولوں کالجوں میں رائج کرتی نیز نظریۂ پاکستان کے تحت پاکستان کی انتظامی مشینری چلائی جاتی تو یقیناً اِس مملکتِ خداداد کا نقشہ پہلے کی نسبت بہت وسیع ہو چکا ہوتا لیکن اِس ستم ظریفی کی داد بھلا کون دے سکتا ہے کہ دنیا کی اِس سب سے بڑی اور نظریاتی مملکت میں پاکستان بنانے والوں اور اِس کی مخالفت میں سر دھڑ کی بازی لگا دینے والوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا گیا بلکہ پاکستان کی خاطر ہر قسم کی قربانیاں دینے والوں کو پامال اور اِس کے دشمنوں کو مالا مال کیا گیا۔ جب بدخواہوں کو سرِ آنکھوں پر جگہ ملی تو اُنھوں نے نظریۂ پاکستان کو دِلوں اور دماغوں سے نکال دینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اِس افسوسناک صورتِ حال کا المناک نتیجہ نگاہوں کے سامنے ہے کہ کشمیر کا مسئلہ صرف سلامتی کونسل کے کاغذات کی زینت بن کر رہ گیا اور ملک کا ایک بازو کٹ چکا۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت اور نظریاتی ملک کا نقشہ سمٹ سکڑ کر رہ گیا۔ (انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون) ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دِل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

جب پاکستان کے پُراسرار دشمنوں یعنی اِسی ملک میں رہ کر اِس کی جڑیں اکھیڑنے والوں نے یہ دِن دکھا دیا تو جِن حضرات نے برطانوی اور گاندھوی دَور سے دینِ متین پر اپنی مخصوص عنایات کی بارش کا برسانا شروع کیا ہُوا ہے اُنھوں نے کیا گُل نہیں کھِلائے؟ کسی اہلِ نظر سے پُوچھیے کہ اسلامی اقدار و شعائر کا کیا حشر کیا جا رہا ہے؟ کیا رہنمائی کے بھیس میں یوُں رہزنی کرنے والوں کی نشان دہی اچھّی بات نہیں ہے؟ کیا لٹیروں کو رہنما بنا لینے میں دارین

کی بھلائی ہے؟ افسوس! ؎

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خُوں ریز ہے ساقی

۱۰۔ یزید پلید تختِ خلافت پر متمکن بھی ہُوا، اِس کے باوجود ہر مسلمان اُسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے، بلکہ کوئی مسلمان اُس کے نام پر اپنے کسی بچّے کا نام رکھنا پسند نہیں کرتا لیکن اِس کے باوجود شاہِ گلگوں قبا، سیّد الشہداء، حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں ہمیشہ خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا رہا ہے اور لاکھوں مسلمان اپنے بچّوں کا نام محمد حسین، علی حسین، غلام حسین اور غلام شبّیر وغیرہ رکھ کر امام عالی مقام سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

سلطان محمود غزنوی اور سلطان ٹیپو شہید کی بارگاہوں میں ہر پڑھا لکھا مسلمان تحسین و آفرین کے پھُول نچھاور کرتا ہے لیکن جعفرِ بنگال و صادقِ دکن نفرت و حقارت کی نگاہوں سے ہی دیکھے جاتے رہے ہیں جیسا کہ شاعرِ مشرق، ڈاکٹر اقبال مرحوم نے فرمایا ہے: ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ ملّت، ننگِ دیں، ننگِ وطن

کیا علّامہ اقبال مرحوم کا یہ اندازِ فکر منفی ہے؟ ہمارے کرم فرما ناصحین کی تلقین کا ماحصل یہی ہوگا کہ سیّدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور یزید پلید اینڈ کمپنی کو ایک ہی نظر سے دیکھا جائے۔ حضرت مجدّدِ الف ثانی قدس سرہٗ اور ابوالفضل و فیضی کو یکساں حیثیت دی جائے۔ سلطان فتح علی ٹیپو اور میر صادق جیسے مِلّت فروش میں کوئی فرق روا نہ رکھا جاتے۔ نواب سراج الدولہ اور علی ویردی خاں کو میر جعفر کے برابر ہی بٹھایا جائے۔ فخرِ ایشیا، فاتحِ سومنات، سلطان محمود غزنوی سے ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، عبدالکریم چھاگلہ، مولوی حسین احمد ٹانڈوی، مولوی احمد سعید دہلوی، مولوی حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری، مولوی داؤد غزنوی، عبدالغفار خاں سرحدی گاندھی اور شیخ عبداللہ کشمیری جیسے مِلّت فروشوں کو فروتر نہ سمجھا جائے۔

لیکن ہمارے ناصحین حضرات کو یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک دنیا میں ایک بھی ذی ہوش اور انصاف پسند باقی رہے گا اُس وقت تک حضرت امام حسین، حضرت مجدّد الف ثانی، سلطان محمود غزنوی، سلطان فتح علی ٹیپو اور نواب سراج الدولہ وغیرہ کو علیٰ قدرِ مراتب ادب و احترام کی نگاہوں سے ہی دیکھا جائے گا لیکن یزید پلید، فیضی، ابوالفضل، میر جعفر، میر صادق اَور اُن کی معنوی ذُرّیّت کے نام سے بھی گھِن آتی رہے گی۔ حق و باطل میں تمیز ہوتی رہے گی اَور انھیں شیر و شکر نہیں کیا جا سکے گا، کیونکہ: ع

جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر، لہُو پکارے گا آستیں کا

دریں حالات جن صاحبانِ جُبّہ و دستار نے برٹش گورنمنٹ کی جڑیں پاتال تک پہنچانے اَور گاندھی جیسے اسلام دشمن بُت پرست کو اپنا امام اور پیشوا بنا کر اسلام کو ہندومت میں مدغم کرنے اَور ہندو مسلم کا فرق مٹانے بلکہ دونوں کی ایک مشترکہ قوم بنانے کی خاطر اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر ڈالیں، ملّتِ اسلامیہ کا رُخ مکّہ معظّمہ اور مدینہ منوّرہ کی جانب سے لندن اور دوار کا کی طرف پھیرنے کی سر توڑ کوشش کی اور اِس طرح مسلمانوں کی ایمانی دولت کو لُوٹ کر، اُن کی اجتماعی قوت کو منتشر کر کے اِسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتے رہے، آخر ایسے حضرات کا اسلامیانِ پاک و ہند کے پُراسرار بدخواہوں سے کیا رشتہ ہے؟ ایسے رہزنوں سے عقیدت رکھنے میں بھلا دنیا و آخرت کی کون سی بھلائی کا راز پنہاں ہے؟ آخر اُنھیں ظاہر کرنے سے روکا کیوں جاتا ہے؟ ے

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

۱۱۔ اگر تخریب کاروں کی نشان دہی ناپسندیدہ امر ہے تو ہر ایک حکومت میں سی، آئی، ڈی کے محکمے کا مقصد کیا ہے؟ پولیس کس لیے رکھی جاتی ہے؟ فوج میں سیکیورٹی کا عملہ اور ایم، پی کا کام کیا ہے؟ آخر ہر حکومت اِس اقدام پر کیوں مجبور رہتی ہے؟ عدالتی نظام کا مقصد کیا ہے؟ ملزموں کا ریکارڈ رکھ کر اُن کی اَور اُن کے لواحقین کی دل آزاری کیوں کی جاتی ہے؟ کیا ناصحین حضرات بتا سکتے ہیں کہ حکومت کا یہ نظام غلط ہے یا ملک اور قوم کی خیر خواہی کا

جذبہ ہی اِس کے پیچھے کارفرما ہے؟

یقیناً ہر عاقل اِن انتظامی اُمور کو ضروری قرار دے گا کیونکہ یہ اقدام ملک اور قوم کی بہتری اُور لوگوں کے مال وجان کی حفاظت کے لیے ناگزیر ہیں۔ جب اِس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر چارۂ کار نہیں تو اِس جانب سے آنکھیں کیوں بند کرلی جاتی ہیں کہ جان اور مال سے ایمان تو لاکھوں گُنا عزیز ہے۔ جان و مال کے دشمنوں کی نسبت ایمان کے دشمنوں اُور رہزنوں کا محاسبہ بدرجہا ضروری ہے۔ اِسلامی حکومت جو ایسے افراد کا محاسبہ کیا کرتی تھیں کیا اُن کا اندازِ فکر منفی تھا۔ آج حکومت اگر اسلامی ہونے کا ثبوت دینے سے محروم ہوجاتی ہیں تو ملک وملّت سے ہمدردی رکھنے والا کوئی فرد جب صرف مسلمانوں کی ہمدردی کے تحت ایسے رہزنوں کی نشان دہی کے فریضہ کی ادائیگی کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اُس کا اندازِ فکر کس طرح منفی قرار دے دیا جاتا ہے؟

کیا ایسے ناصحین حضرات حکومت کو یہ مشورہ دینے کے لیے تیار ہیں کہ وہ ملزموں کا ریکارڈ نہ رکھے، غلط کار اور جرائم پیشہ افراد کو سزائیں نہ دے کیونکہ ایسا کرنا ناصحین کی اصطلاح کے مطابق اُن مجرموں اور اُن کے لواحقین کی دلآزاری کا باعث ہے۔ کیا حکومت عدالتیں توڑ دے، پولیس، سی۔ آئی۔ ڈی اور سکیورٹی وغیرہ کے محکمے ختم کر دے؟ کیا ایسا کرنے سے نظامِ سلطنت درہم برہم نہ ہو جائے گا؟ کیا ایسا کرنے سے لوگوں کے مال وجان محفوظ رہ سکیں گے؟ ہرگز نہیں۔ لہٰذا یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ دینی معاملات میں کھرے کھوٹے کی پہچان کرنا اِس سے بھی ضروری اور اہم ترین فریضہ ہے۔ اِسے منفی اندازِ فکر قرار دینا کھوٹے سکّوں پر پردہ ڈالنا اور خود اپنے بھی کھوٹ کو چھپانے کا ایک حربہ نہیں تو اَور کیا ہے؟

مملکتِ خداداد پاکستان میں اِس ستم ظریفی کا سلسلہ روزِ اوّل ہی سے چلا آ رہا ہے کہ محکمۂ تعلیم نے اسکولوں اور کالجوں کی نصابی کتب میں ایسے ہی علماء اُور لیڈروں کو ملّتِ اِسلامیہ کے رہنماؤں میں شمار کیا ہے جنھوں نے پُراسرار طریقے پر قوم کو اپنے پیچھے لگا کر برٹش گورنمنٹ کی جڑیں مضبوط کیں یا گاندھی کو اپنا پیشوا بنا کر ملّتِ اسلامیہ کو اُس کے قدموں میں جھکانے اور ہندو مسلم فرق مٹا کر، دونوں کو ملا کر ایک قوم بنانے پر اپنی عمرِ عزیز

برباد کرتے رہے۔ اِس کے ساتھ ہی برٹش گورنمنٹ کے عہد میں جو علمائے کرام مسلمانانِ پاک و ہند کی ناخدائی کا فریضہ ادا کرتے رہے، پُورے نصاب میں ابتدائی جماعتوں کی کتابوں سے لے کر انتہائی جماعتوں کی کتب میں بھی اُن حضرات کے بارے میں ایک ٹوٹا پھوٹا لفظ تک نہیں ملتا۔ کیا انگریزوں اور ہندوؤں کے چہیتے لیڈر اور علماء کو اُن کی تمام تر سیاہ کاریوں اور رہزنی کے باوجود مسلمانوں کا رہنما بتانا اور بچّے بچّے کو یہی رٹانا منفی اندازِ فکر اور مسلمانانِ پاکستان کو گمراہ کرنا نہیں ہے؟ آخر ملک و مِلّت کے بدخواہوں کو خیر خواہ اور رہزنوں کو رہبر بتانے میں دنیا اور آخرت کا کون سا نفع متوقّع ہے؟ کیا خود اپنی قوم کو یُوں اندھیرے میں رکھنا اور لصوصِ دین کا معتقد بنانا ایک قومی المیّہ ہے یا نہیں؟

اے صاحبانِ عقل و دانش! انصاف سے کام لیجیے، کھرے کھوٹے میں تمیز کیجیے۔ رہزنوں کو رہنما اور رہنماؤں کو رہزن بتانے کا مشغلہ ملک و ملّت سے غدّاری اور دارین کی بربادی کا باعث ہے۔ خدارا خود اپنی اور دُوسروں کی عاقبت برباد نہ کیجیے۔ آخر- اِس تخریب کاری کا پُراسرار جال بچھانے والا انگریز بوریا بستر لے کر بھاگ گیا اور اپنے جزیرے میں اوندھے منہ جا پڑا ہے۔ برٹش گورنمنٹ اور کانگرس کے وظیفے بند ہو گئے۔ وظیفہ خوار آنجہانی ہو چکے۔ اب اُن کا معاملہ براہِ راست اپنے پروردگار سے ہے۔ اُنھوں نے جیسے درخت بوئے تھے اُن کے پھل کھا رہے ہوں گے۔ اُنھوں نے اپنی عاقبت محض دُنیا سنبھالنے کے لیے بیچی تھی لیکن اُن کے معتقدین و متبعین جو شعوری یا غیر شعوری طور پر اُنھیں رہنما تسلیم کر بیٹھے۔ اِن بیچاروں کو نہ دنیاوی نفع نہ اُخروی یعنی نہ وظیفے نہ ثواب۔ صرف نسبی یا علمی نسبت کی لاٹھی پکڑ کر، کسی نہ کسی اندھے کے پیچھے اپنی آنکھیں بند کر کے چلے جا رہے ہیں اور یکے بعد دیگرے کنوئیں میں گر رہے ہیں، لیکن اُن کی لاٹھی چھوڑنے یا آنکھیں کھولنے کی آن بلکہ سمجھانے والے مسلمانوں پر واہی تباہی بہتان۔ بھلا اِس نرالی عقلمندی اور دانشوری کا کوئی ٹھکانا ہے؟

جملہ مدعیانِ اسلام سے اپیل ہے کہ وُہ کھرے اور کھوٹے کا ازرُوئے انصاف فیصلہ کریں۔ اگر کسی کی محبّت یا نفرت پہلے سے دِل میں جاگزیں ہے تو تھوڑی دیر کے لیے اُسے

بالائے طاق رکھ دیجیے۔ غیر جانبدار ہو کر اور تنقیدی نظر سے اِس کتاب کا مطالعہ کیجیے۔ یہ ایک شفاف آئینہ ہے۔ احقر نے بساط بھر یہی کوشش کی ہے کہ یہ آئینہ انصاف اور دیانتداری سے تیار ہو جائے۔ جن کتابوں سے اِسے مرتّب کیا ہے وُہ خود مبتدعین حضرات کی ہیں۔ فیصلہ ہر قاری کی دیانت پر منحصر ہے۔ اگر موجودہ مبتدعین کا دِل بھی بے ساختہ شہادت دینے لگے کہ جن حضرات کو اُنھوں نے پیشوا بنایا ہُوا تھا وُہ ہرگز پیشوا نہیں تھے تو جانِ برادر! ناجی گروہ میں آ ملنے، مسلمانوں کی جس حقیقی جماعت یعنی اہلسنّت وجماعت سے آپ یا آپ کے بڑے بُوڑھے کسی کے بہلانے پھُسلانے پر علیحدہ ہو گئے تھے، اُسی میں شامل ہو جانے سے کون سا نقصان پہنچ جائیگا؟ کیا یہ دارین کی بھلائی کا ذریعہ نہ ہوگا؟ آئیے! اپنے قدیم مرکز پر جمع ہو جائیے تاکہ سارے بھائی بھائی بن کر گلے لگ جائیں اور مسلمانوں کی اجتماعی قوت بڑھ جائے۔ ایک مرکز پہ جمع ہو جانے میں ہی دارین کی کامیابی و کامرانی ہے۔ ع

اے کاش ترے دِل میں اُتر جائے مِری بات

جن حضرات کو پیش کردہ حوالوں میں سے کسی حوالے کی صحت کے بارے میں شک گزرے یا اِس کے برعکس حوالے اُن کے پیشِ نظر ہوں اور وُہ افہام وتفہیم کے طور پر گفتگو کرنا چاہیں تو مکتبہ حامدیہ، گنج بخش روڈ، لاہور کی معرفت بصد شوق تحریری گفتگو کر سکتے ہیں۔ علمائے اہلسنت کے پاس اگر کوئی ایسی کتاب ہو جو مبتدعین کی تاریخ یا مجدِّدِ مأتہ حاضرہ قدّس سرّہٗ کے تجدیدی کارنامے میں معین و مددگار ثابت ہو سکتی ہے تو مذکورہ پتے پر ارسال فرمائیں۔ استفادہ کے بعد فوراً بصد شکریہ واپس کر دی جائے گی۔ اُمید ہے کہ علمائے کرام تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی کے تحت راقم الحروف کو فراموش نہیں کریں گے۔ اِس سلسلے میں مولانا انوار الاسلام صاحب سے ملنا، اُنھیں کوئی کتاب مرحمت فرمانا احقر ہی کو عطا فرمانا سمجھا جائیگا۔

مجدّد مأتہ حاضرہ امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تجدیدی کارنامے کو بیان کرنے کے سلسلے میں جتنی کتابوں کا موجود ہونا ضروری تھا وُہ یقیناً ہمارے پاس ساری نہیں ہیں اور نہ ہم اتنی کتابیں فراہم کر ہی سکتے ہیں۔ اپنی اِس تنگدامانی کے باعث جلد اوّل سرِ دست پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں، جو ہمارے نزدیک نامکمل ہوتے ہُوئے بھی اپنے موضوع کی جملہ تصانیف سے بڑھ کر

مواد سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ محض علمائے کرام کی نظرِ کرم اور اُن بزرگوں کی دُعاؤں کا نتیجہ ہے۔ اہلِ علم حضرات سے ہم اعلٰحضرت قدس سرہٗ کی خاطر تعاون کی پھر اپیل کرتے ہیں کہ کتابوں کے ذریعے ہمیں زیادہ سے زیادہ نوازیں تاکہ مشعلِ راہ کی بقیہ جلدیں ترمیم و اضافوں کے ساتھ شایانِ شان طریقے سے منصّۂ شہود پر جلوہ گر ہوں۔ نیز فاضل بریلوی رحمۃُ اللہ علیہ کی جتنی بھی تصانیف کی فہرست ملے اور آپ کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ خطوط کی نقل مرحمت فرمائیں جن کے نام المجمل المعدّد اور سوانح اعلٰحضرت میں درج نہ ہوں۔

اِس مجموعے کی تدوین میں جن حضرات نے بعض کتابیں عنایت فرما کر اپنے قیمتی مشوروں سے ہماری مدد کی، احقر اُن کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے۔ حوصلہ افزائی کرنے والے قدردانوں کا بھی شکرگزار اور ممنون ہُوں۔ اپنے مخدوم و محترم عالیجناب محمد مسعود احمد صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج مٹھی ضلع تھرپارکر (صوبہ سندھ) کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس ایسے الفاظ کہاں؟ یقین جانیے کہ موصوف کی ہدایات نے راقم الحروف کو مشعلِ راہ کا کام دیا۔ اِس عظیم و ضخیم مجموعے کو منظرِ عام پر لانے والے مولانا انوار الاسلام قادری رضوی جیسے عاشقِ رضویت کا احقر کیا شکریہ ادا کر سکتا ہے؟ باری تعالیٰ شانہٗ اُنھیں اِس خلوص و محبّت اور جذبۂ صادقہ کا آخرت میں بہترین صلہ دے اور اِس دنیا میں اُنھیں اِس سے بدرجہا زیادہ مذہب مہذّب اہلسنّت وجماعت کی خدمت کا حوصلہ اور مواقع عطا فرمائے۔ (آمین)

اہلِ علم حضرات کو اِس میں جس قدر خامیاں نظر آئیں، اُنھیں اِس ناچیز کی کوتاہ علمی پر محمول کرتے ہوئے مطلع فرمائیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں اصلاح ہو سکے۔ جو کام کی باتیں نظر آئیں، اُنھیں اِس ناکارہ کے ولیِ نعمت، مرشدِ برحق، مفتیِ اعظم دہلی، حضرت شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی رحمۃُ اللہ علیہ کی نظرِ کرم اور فیضِ رضا کا کرشمہ شمار کیا جائے۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّ الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ۔ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

باب اوّل

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا ۔ قارئین کرام! زیرِ نظر رسالے میں چودھویں صدی کے تجدیدی کارنامے کو پیش کرنا ہمارا موضوعِ سخن ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ تجدید کی ضرورت اُسی وقت پیش آتی ہے جب تخریب اپنے عالمِ شباب میں ہو۔ تخریب کاری جب تک اپنے نقطۂ عروج پر نہ پہنچ جائے تجدید کب منظرِ عام پر آتی ہے؟ کیونکہ سلسلۂ نبوّت کے ختم ہو جانے کے بعد اب تجدید ہی اصلاح کا نقطۂ عروج ہے۔ ظاہر ہُوا کہ تجدید سے پہلے انتہائی تخریب کا پایا جانا ضروری ہے ۔ اِس حقیقت کے پیشِ نظر ہمیں امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہٗ کے تجدیدی کارنامے پر بحث کرنے سے پہلے اُن افراد و عناصر کو ضرور دیکھنا ہوگا جنھوں نے تیرھویں صدی کے آخر اور چودھویں صدی میں اصلاح کے نام پر اسلام کا حُلیہ بگاڑنے کی جسارت کی، اُمتِ محمدیہ کے تیرہ سو سالہ اجماعی اور مسلّمہ عقاید و نظریات سے انحراف کر کے غیر اسلامی نظریات کی مقدس شجرِ اسلام میں پیوند کاری کی اور اس طرح اِن مبتدعینِ زمانہ نے اپنے اپنے انداز میں تخریبِ دین کا ناپاک فریضہ انجام دیا ۔ سب سے پہلے تصویر کا یہ رُخ دِکھانا ضروری ہے۔ ؎

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

جن حضرات نے سابقہ مجدّدین کے حالات پڑھے اور اُن بزرگوں کے تجدیدی کارناموں کا گہرا مطالعہ کیا ہے، وُہ بخوبی جانتے ہیں کہ جب تک اُن خرابیوں کا ذکر نہ کیا جائے جن پر مذہبی رنگ روغن چڑھا کر، اسلامی لیبل لگا کر دین میں شامل کیا جا رہا ہو، اُس وقت تک یہ واضح کیا ہی نہیں جا سکتا کہ فلاں مجدِّد نے کیا کارنامہ سر انجام دیا تھا۔ مثلاً اکبری دَور کی اسلام دشمنی اور "دینِ الٰہی" کی فتنہ سامانی کا تذکرہ نہ کیا جائے تو امامِ ربّانی حضرت مجدّدِ الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء) کا، کیا کارنامہ پیش کیا جا سکتا ہے؟ اِسی ضرورت کے تحت مبتدعینِ زمانہ کی تخریبی کارروائی کا پیش کرنا لازم آیا ورنہ ہمیں اِس گندگی کو کُریدنے، اِس سنڈاس میں جھانکنے اور اِس گُوڑی کو اُدلنے بدلنے کی ضرورت کیا پڑی تھی؟ خدا گواہ ہے

اُس کا حبیب شاہد ہے کہ کسی کی محبّت یا نفرت کو درمیان میں حائل کیے بغیر، مبتدعین کی صورتیں، تخریب کاروں کے چہرے، خود اُنھیں کے آئینوں میں دکھائے ہیں۔ راقم الحروف نے اِس سلسلے میں بغرضِ خیر خواہی صرف یہی کیا ہے کہ جن اپنے آئینوں کو اِنھوں نے منتشر کر کے گھروں میں چھپایا ہُوا تھا، اُنھیں جمع کر کے قارئین کرام کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اَب ہر چشمِ بینا خود ہی دیکھ لے گی کہ انکے ہی آئینوں میں مبتدعینِ زمانہ کی صورتیں کیسی نظر آتی ہیں؟

اُنھیں کی محفل سنوارتا ہُوں، چراغ میرا ہے رات اُن کی
اُنھیں کے مطلب کی کہہ رہا ہُوں، زبان میری ہے بات اُن کی

انگریزوں کا قبضہ اور مظالم

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

دُوسری یورپین اقوام کی دیکھا دیکھی انگریزوں کو بھی متحدہ ہندوستان میں تجارت کرنے کا شوق دامنگیر ہُوا۔ ملکہ الزبتھ سے بعض انگریز تاجروں نے اجازت لے کر ۱۶۰۰ء میں بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی۔ ۱۶۴۴ء میں باٹن نامی ایک انگریز ڈاکٹر نے مغل فرمانروا شاہجہان کی بڑی لڑکی جہاں آراء بیگم کا علاج کر کے کمپنی کے لیئے مزید مراعات حاصل کیں۔ قلاّش ملک کے باشندوں نے سرزمینِ پاک و ہند کو سونے کی چڑیا دیکھا تو چوری چھپے دونوں ہاتھوں سے لُوٹنے اور ہمہ وقت یہاں اپنے پیر مضبوط کرنے میں کوشاں اور سرگرمِ عمل رہنے لگے۔

سلطان محی الدین اورنگ زیب کے زمانے میں اِنھوں نے چند سرکاری جہازوں کو لُوٹ لیا۔ بادشاہ کے حکم سے اِن کی کوٹھیوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ مکر و فریب کی اِن زندہ تصویروں نے سترہ ہزار پونڈ جرمانہ ادا کر کے رحم دل بادشاہ سے معافی حاصل کر لی۔ بنگال کا صُوبیدار علی وردی خاں ایک بیدار مغز اَور مردم شناس حاکم تھا۔ انگریزوں کی فطرت اَور خفیہ چالوں کو بھانپ کر وُہ اِن عیاروں پر کڑی نظر رکھا کرتا تھا۔ موصوف نے اپنے جانشین اور نواسے سراج الدولہ کو بھی انگریزوں کی فطرت اور کارگزاریوں سے باخبر رکھتے ہُوئے

اِن کے بارے میں سخت ہدایت کر رکھی تھی۔

علی وِیردی خاں کی وفات کے بعد ۱۷۵۶ء میں سراجِ الدولہ بنگال کا نواب بنا تو انگریزوں نے علی ویردی خاں مرحوم کے دُوسرے نواسے شوکت جنگ کو گانٹھ کر قلعہ بندیاں شروع کر دِیں۔ اِس پر فوراً تادیبی انداز میں نواب سراجِ الدولہ نے قاسم بازار اور کلکتہ کی انگریزی کوٹھیوں پر قبضہ کر کے اُن کا انتظام مانک چند نامی ایک ہندو افسر کے سپرد کر دیا۔ لارڈ کلائیو مدراس سے فوج لا کر کلکتہ پر حملہ آور ہُوا، لیکن مانک چند اِس حملے کی اطلاع مِلتے ہی انتظام چھوڑ کر بھاگ گیا تو کلائیو نے بغیر کسی مزاحمت کے آسانی سے کلکتہ اور ہگلی پر قبضہ کر لیا۔ اِس واقعے سے اُس کی جُرأت یہاں تک بڑھی کہ سات روز تک کلکتہ میں لُوٹ مار کا بازار گرم رکھا۔ نواب سراج الدولہ نے اِن کے استیصال کی ٹھان لی اور ایک لشکرِ جرّار لے کر انگریزوں پر ہلّہ بول دیا تھا تاکہ یہ آئے دِن کا جھگڑا ایک روز مٹا ہی دیا جائے۔ کلائیو نے مقابلے کی تاب نہ دیکھتے ہُوئے صلح کی پیشکش کر دی اور عہد نامہ مدراس کی رُو سے صلح ہو گئی۔

یہ صلح کلائیو نے محض اِس لیے چاہی تھی کہ نواب کی عظیم طاقت کو سازشوں کے جال میں اُلجھا کر کمزور کرنے کے لیے کچھ وقت مِل جائے۔ سراج الدولہ کے سپہ سالارِ لشکر اور علی ویردی خاں کے بہنوئی یعنی میر جعفر کو گانٹھ لیا نیز نواب کی فوج کے دُو جرنیل راج ورلبھ اور مانک چند بھی خرید لیے گئے۔ اِن غدّاروں کا ہاتھ میں آنا ہُوا اور کلائیو نے زیادہ مہلت دیے بغیر ۱۷۵۷ء میں عہد نامہ مدراس کی دھجّیاں اڑا کر پھینک دِیں اور پلاسی کے میدان میں نواب سراجِ الدولہ کے خلاف جنگ آزمائی کے لیے صف آراء ہو گیا۔

انگریزوں سے نواب کی فوجی قوت اگرچہ کئی گنا تھی لیکن گھر کے بھیدی لنکا ڈھا رہے تھے اس لیے اپنوں کی بدولت شکست کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ اپنی غدّاری کے سرٹیفکیٹ پر مُہرِ تصدیق ثبت کرتے ہُوئے میر جعفر کے لڑکے میرن نامی نے نواب شجاع الدولہ کو اپنے ہاتھوں شہید کر دیا۔

دوستوں سے اِس قدر صدمے ہُوئے ہیں جان پر
دِل سے دشمن کی عداوت کا گِلہ جاتا رہا

شجاع الدولہ کی جگہ کلائیو نے اپنے محسن اور چہیتے لیکن ننگِ ملک و ملّت یعنی میر جعفر کو بنگال کا نواب مقرر کر دیا۔ میر جعفر نے ازراہِ تشکر و امتنان انگریزوں کے لیے قومی خزانے کا مُنہ چوپٹ کھول دیا۔ قوم کی گاڑھے خُون پسینے کی کمائی کو انتہائی بے دردی سے اپنے آقاؤں پر نچھاور کرنا شروع کر دیا۔ کلائیو کو اِس خوشی میں دو لاکھ چونتیس ہزار پونڈ نقد اور چوبیس پرگنے جاگیر میں دیے۔ کونسل کے ممبروں کو بڑی بڑی بھاری رقمیں دیں۔ کپتان سے نچلے درجے کے ہر افسر کو تین تین ہزار پونڈ انعام ملا۔ اِسی لیے تو بنگال کے لوگ میر جعفر کو "کلائیو کا گدھا" کہا کرتے تھے۔ انگریزوں کو خوش رکھنے کے لیے میر جعفر نے انعامات و تحائف کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری رکھا لیکن ایک روز خزانہ بھی اُسی طرح خالی ہو گیا جس طرح میر جعفر کا سینہ ملک و ملّت کے درد سے خالی تھا۔ انگریز صاحب بہادروں کی یہ حالت دیکھ کر موڈ خراب ہو گیا۔ میر جعفر کو برطرف کر کے اُس کے داماد میر قاسم کو نواب مقرر کر دیا گیا۔

میر قاسم بیدار مغز اور عوام کا خیر خواہ تھا۔ کمپنی کی لُوٹ کھسوٹ اور بنگال جیسے خوشحال ترین صوبے کی بدحالی اُس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ شروع میں تو مصلحتاً میر جعفر کی سُنّت کو ادا کرنا پڑا لیکن کچھ عرصے بعد برطانوی لٹیروں کے مطالبات ماننے اور اُنھیں پُورا کرنے سے اپنے مجبور و معذور ہونے کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ انگریزوں نے ناراض ہو کر اپنے اصلی پٹھو میر جعفر کے دوبارہ نواب ہونے کا اعلان کر دیا، تو اِس موقع پر میر قاسم اور انگریزوں میں ٹھن گئی۔ ۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر ایک فیصلہ کُن لڑائی ہُوئی، جس میں میر قاسم کو افسوسناک شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اِس جنگ سے کیا نتائج برآمد ہُوئے؟ اِس کا جواب میاں محمد شفیع کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

> "بکسر کی لڑائی (۱۷۶۴ء) نے ہندوستان کی کمر توڑ دی اور انگریز کی ریڑھ کے مُہرے مضبوط ہو گئے جو ابھی تک لرزتے رہتے تھے۔ شجاع[۱] الدولہ کو

---

[۱] میاں صاحب بھول گئے یہاں سراج الدولہ کے بجائے میر قاسم لکھنا چاہیے تھا۔ نواب سراج الدولہ تو بکسر کی لڑائی سے چھ سات سال پہلے پلاسی کی جنگ میں جامِ شہادت نوش کر چکا تھا۔ پلاسی کی جنگ ۱۷۵۷ء میں ہوئی تھی۔

بالکل دب کر صلح کرنی پڑی۔ الٰہ آباد کے ساتھ کئی علاقے انگریزوں نے دبا لیے۔ غنیمت ہُوا کہ ریاست مِل گئی اور ہندو مسلمان کی چند روز زندگی نکل آئی۔ بنگال کے انگریز بلا شرکتِ غیرے مالک بن گئے۔ دولت اُن کی لونڈی ہو گئی، اِس لیے کہ صرف بنگال سے اُنھوں نے تین کروڑ ستائیس لاکھ ستر ہزار آٹھ سو تینتیس پونڈ وصول کیے۔ خاص نوابوں کی جیب سے جو رقم نکالی، اکیس لاکھ انہتر ہزار چھ سو پینسٹھ پونڈ تھی۔ اِن رقموں کے علاوہ اور بہت کچھ دیگر ذرائع سے وصول کیا گیا، جس کے ساتھ عوام و خواص کی رگوں تک کا خُون کھینچ کر لندن چلا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ بنگال کا رزق اُنھیں دنوں ختم ہو گیا اور اِس امیر صوبے پر ہمیشہ کے لیے افلاس دوڑ گیا۔"[1]

جناب غلام رسول مہرؔ نے انگریزوں کی اِن عیاریوں کا تذکرہ اپنے لفظوں میں یُوں کیا ہے:

"۱۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ کا اصل ناظم سراج الدولہ تھا۔ اُس سے جھگڑا پیدا کیا پھر صلح کر لی اور باہم معاہدہ ہو گیا، بایں ہمہ امیروں اور درباریوں خصوصاً میر جعفر سے خفیہ ساز باز کر کے سراج الدولہ کو ختم کر دینے کا بندوبست کیا گیا۔

۲۔ میر جعفر نے نظامت کی خاطر اپنے آقا سے غدّاری کی اور انگریزوں کے لیے کامیابی کا دروازہ کھولا، اُسے نظامت ضرور دی گئی لیکن بے اندازہ رقمیں وصول کی گئیں بلکہ مالی مطالبوں کا ایک لا متناہی سلسلہ جاری ہو گیا۔ میر جعفر تنگ آ گیا تو اُسے مسند سے اتار کر اُس کے داماد میر قاسم کو ناظم بنا دیا گیا۔

۳۔ میر قاسم بھی لُوٹ کا سلسلہ زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکا تو اُس سے جنگ ہُوئی اور دوبارہ میر جعفر کو گدّی پہ بٹھایا گیا۔

۴۔ اِسی اثنا میں بادشاہ دہلی سے چھبیس لاکھ سالانہ دینے کے وعدے پر

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، بار اوّل، ۱۹۵۷ء، ص ۵۰

> بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی لی گئی۔ بالآخر بادشاہ کے چھبیس لاکھ بھی ضبط کیے اور اُس کے مملوکہ علاقے بھی دُوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیئے گویا سراج الدولہ سے وفا کی نہ میر قاسم یا میر جعفر سے اور نہ بادشاہِ دہلی سے۔ جس سے فائدہ اٹھانے کا موقع نکلا، فائدہ اُٹھایا، پھر اُسے بے مصرف سمجھ کر پھینک دیا۔"[1]

ریاست ٹونک کے بہادر حکمران، نواب امیر خاں نے بھی انگریزوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ لارڈ وارن ہیسٹنگ نے بہ مجاذ حسب تصریحات مولوی محمد جعفر تھانیسری اور مرزا حیرت دہلوی وغیرہ کے سید احمد صاحب (المتوفی ۱۲۴۶ھ) کے ذریعے فتح کیا، جس کا مفصل اور مدلل ذکر آگے آئے گا۔ موصوف نے بڑی رازداری اور نمک حلالی کے ساتھ اِس بپھرے ہوئے شیر کو انگریزوں کے شیطانی پنجرے میں گرفتار کیا تھا، اپنے مہربان آقاؤں کے آہنی پنجرے میں بند کروایا اور اِس طرح اپنی مہربان، بے رو ریا اور غیر متعصب سرکار کی حدودِ مملکت کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں پُورا پُورا ہاتھ بٹایا کیونکہ اِس انگریزی عملداری کو موصوف فخریہ طور پہ اپنی ہی عملداری سمجھا کرتے تھے اور لارڈ وارن ہیسٹنگ بھی سید احمد صاحب کے ایسے کارناموں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا اور اِن پر اعتماد رکھتا تھا۔ وسط ہند کے نواب امیر خاں، سرحد کے مسلمانوں اور پنجاب کی سکھ حکومت کے خلاف جو کچھ برٹش گورنمنٹ کرنا چاہتی تھی وہ خود پردے میں رہ کر سید احمد صاحب سے ہی کروایا گیا۔ نظام حیدرآباد کے بعد اگر مسلمانوں میں سے کسی نے سب سے بڑھ کر برٹش گورنمنٹ کے قیام واستحکام میں مدد دی تو وہ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی ہے لیکن اِن صاحبانِ جُبّہ و دستار نے اپنے ملک و ملّت سے غدّاری کے کارناموں پر اصلاح[1]، جہاد[2] اور سکھوں[3] کے مظالم کا توڑ وغیرہ ایسے ایسے خوشنما لیبل لگا کر قوم کے سامنے پیش کیے کہ عوام الناس کی کافی تعداد اِس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہی۔ آئندہ صفحات میں ہم تفصیلی طور پر حقائق پیش کر کے قارئین کرام سے فیصلہ چاہیں گے کہ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی نے

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، ص ۱۴

دین کی اصلاح وتجدید کا بیڑا اٹھایا تھا یا تخریبِ دین اور افتراق بین المسلمین کا؛ موصوف فی سبیل اللہ انگریزوں سے جہاد کرنے نکلے تھے یا انگریزوں کی عملداری کو وُسعت دینے کی خاطر انگریزی امداد کے سہارے سرحد کے مسلمانوں اور پنجاب کے سکھوں کا زور توڑنے کیلئے بھیجے گئے تھے؟ وُہ مجاہد بننا چاہتے تھے یا اُنھیں بادشاہت اور نبوت کا سودا سمایا ہوا تھا؛

وارن ہیسٹنگز ۱۷۷۲ء سے ۱۷۸۵ء تک گورنر جنرل رہا۔ حق یہ ہے کہ جس طرح اِس ظالم حکمران نے دیسی عوام وخواص کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لینے کی اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو پُوری کر دکھائی اِسی طرح جعفرِ بنگال اور صادقِ دکن جیسے ملت فروشوں سے جس جس شعبے میں جو کمی رہ گئی تھی وُہ سیّد احمد صاحب اینڈ کمپنی نے پُوری کر دکھائی اور ایسی راز داری سے کہ پُوری قوم آج تک اُسی بحران میں مُبتلا چلی آرہی ہے۔ موصوف کی تخریب کاری کے اثرات متعدی مرض کی طرح پھیلے اور آج تک پھیلتے ہی جارہے ہیں کیونکہ اُس پر جو خوشنما لیبل لگایا گیا تھا اُس کے پیشِ نظر کتنے ہی مسلمانوں نے اِسے مرض کے بجائے شفا اور بدخواہی کی جگہ خیر خواہی سمجھ لیا۔ لارڈ وارن ہیسٹنگز کی ظالمانہ روش کا میاں محمد شفیع نے یُوں نقشہ کھینچا ہے:

> "وارن ہیسٹنگز نے ہندوستان آکر انگریزی اخلاق کی تکمیل کر دی۔ کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو اُس نے نہ کیا ہو اور کوئی بدعہدی ایسی نہ تھی جو عمل میں نہ لایا ہو۔ ملک گیری کی ہوسناکیوں اور زرکشی کی حرص پرستیوں کو آخری حد پر پہنچا دیا۔ اُس کے بعض مظالم تو ایسے دردناک ہیں کہ لکھتے وقت قلم کانپ جاتا ہے اور ایسے شرمناک ہیں کہ غیرت اذنِ تحریر نہیں دیتی۔"[۱]

حیدر علی نے میسور کی پہلی اور خصوصاً دوسری لڑائی میں انگریزوں کی فوجی طاقت کا جنازہ نکال دیا تھا۔ دوسری لڑائی میں انگریزوں کے مایۂ ناز اور تجربہ کار جرنیلوں یعنی کرنل بیلی اور منرو جیسوں کی شیخی کرکری کر کے اُنھیں عبرت ناک شکست دی تھی۔ حیدر علی کا اگرچہ دورانِ جنگ ہی انتقال ہو گیا تھا لیکن اُس کے جانشین سلطان فتح علی ٹیپو نے اپنے والد

---

[۱]

کی طرح الیسی کامیابی سے دو سال تک متواتر جنگ جاری رکھی کہ وارن ہیسٹنگز کو مجبور ہو کر صلح کی پیشکش کرنی پڑی۔ معاہدے کی رُو سے ایک دُوسرے کے مفتوحہ علاقے اور جنگی قیدی واپس کر دیے گئے۔ آئندہ باہم نہ لڑنے اور دوستی کا عہد و پیمان ہو گیا، لیکن انگریز اور بدعہدی سگے بھائی بہن ہیں۔

وارن ہیسٹنگز کے بعد ۱۷۸۵ء سے ۱۷۹۵ء تک لارڈ کارنوالس گورنر جنرل رہا۔ اُس نے آتے ہی نظام اور مرہٹوں کو یہ جھانسہ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا کہ آئندہ جو علاقے فتح کیے جائینگے اُن میں تینوں طاقتیں حصہ دار ہوں گی اور تینوں ایک دوسرے کی مدد کرنے کے پابند رہیں گے یہ اتحادِ ثلاثہ یا تثلیث انگریزوں نے اپنی فوجی قوت کو کمزور دیکھ کر کیا تھا۔ نظام کی نالائقی تو مشہور تھی لیکن اس موقع پر مرہٹے بھی دھوکا کھا گئے کیونکہ اُن کا مشہور اور مدبّر سیاستدان، نانا فرنویس مر چکا تھا۔ مرہٹوں نے اسلام دشمنی تو مدِّ نظر رکھی لیکن غلامی کی جن ظالمانہ اور عیارانہ زنجیروں میں پورا ملک جکڑا جا رہا تھا، اُن کی طرف مرہٹوں کی نظر ہی نہ گئی۔

میسور کی دُوسری لڑائی کے خاتمے پر انگریزوں نے جو سلطان فتح علی ٹیپو سے نہ لڑنے اور ایک دُوسرے کی مدد کرنے کا معاہدہ کیا تھا، اُسے پس پُشت ڈالتے ہُوئے، ٹرانکور کے راجہ کی مدد کے بہانے سے، لارڈ کارنوالس نے نظام اور مرہٹوں کو ساتھ لے کر سلطنتِ میسور پر حملہ کر دیا۔ ایک سال تک ٹیپو سلطان مردانہ وار مقابلہ کرتا رہا لیکن رسد کی کمی اور دشمن فوجوں کی کثرت کے پیشِ نظر سلطان کو دب کر صلح کرنی پڑ گئی۔ تین کروڑ تاوانِ جنگ دینا پڑا اور ریاست میسور کے تقریباً نصف حصّے سے دستبردار ہو کر باقی آدھی ریاست کو بچانا پڑا۔ مفتوحہ نصف علاقے کو انگریزوں، مرہٹوں اور نظام نے آپس میں بانٹ لیا۔

کارنوالس کے بعد ولزلی آیا جو ۱۷۹۵ء سے ۱۸۰۵ء تک گورنر جنرل رہا۔ ولزلی کو ملک گیری کی ہوس اپنے پیشرو سے بھی زیادہ تھی۔ سلطان نے فوراً اس خطرے کو محسوس کیا۔ نظام اور مرہٹوں کو سارے نشیب و فراز سمجھائے، لیکن تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ اِن سے مایوس ہو کر فرانس، ترکی اور افغانستان کی حکومتوں کے پاس اپنے سفیر بھیج کر مدد طلب کی۔ فرانس اور ترکی اُن دنوں اپنے ہی مسائل میں اُلجھے ہُوئے تھے اِس لیے بروقت کوئی مدد

نہیں کر سکتے تھے۔ زمان شاہ والیِ افغانستان نے اِس اپیل کا خیر مقدم کیا اور سلطان فتح علی ٹیپو کی امداد کے لیے ایک لشکرِ جرّار لے کر فوراً روانہ ہو گیا۔ زمان شاہ ابھی پنجاب سے ہی گزر رہا تھا کہ افغانستان میں اپنے بھائی کے باغی ہو جانے کی خبر سُن کر اُس کی سرکوبی کرنے کی غرض سے مجبوراً واپس لوٹنا پڑا۔

بیرونی امداد سے سلطان یُوں محروم رہ گیا اور اندرونی طور پر ولزلی نے سازش کا ایسا جال پھیلایا کہ میسور کے اراکینِ سلطنت میں سے میر صادق، میر غلام علی اور پورنیا جیسے انگریزوں کے ہاتھوں بِک گئے، سلطنتِ میسور کو چند روزہ زندگی کے آرام کے بدلے بیچنے اور متحدہ ہندوستان کو انگریزوں کا غلام بنانے پر تُل گئے۔ اِس موقع پر کمپنی نے نظام اور مرہٹوں کو ساتھ لے کر بغیر کسی خوف و خطر کے تین اطراف سے حملہ کر دیا۔ انگریزوں اور اُن کے ساتھیوں کی فوجیں، میر صادق وغیرہ کی بدولت بغیر کسی روک ٹوک کے سرنگاپٹم تک پہنچ گئیں۔ انیسویں صدی کا ہنوز آغاز بھی نہیں ہُوا تھا کہ مسلمانانِ پاک و ہند کی امیدوں کا آخری چراغ بھی ۱۷۹۹ء میں بجھ گیا، اُن کی تلوار ٹوٹ گئی۔ سلطان حیدر علی والیِ میسور جیسے شیر دل سپاہی، مدبّر جرنیل اور اسلامی غیرت کے نشان کا مایۂ ناز فرزند اور لائق ترین جانشین یعنی سلطان فتح علی ٹیپو بھی سرنگاپٹم کے قلعے میں غدّاروں کی بدولت اِس طرح محصور ہو گیا جیسے شیر آہنی پنجرے میں۔ اِن نامساعد حالات میں بھی وُہ مردِ مومن، شیر دل مجاہد اور مسلمانانِ پاک و ہند کی عظمت کا نشان، آخری وقت تک لڑتا رہا۔ جان دے دی لیکن اسلامی آن پر دھبّہ نہ لگنے دیا۔ انگریزوں کے سامنے گردن نہ جھکائی اور شہیدانِ کربلا کا سچّا غلام ہونا ثابت کر گیا۔

زندگی کے اِس نازک موڑ پر بھی عظمتِ اسلام کا یہ بیباک نقیب اپنوں اور بیگانوں کے سامنے یہ تاریخی اعلان کرتا ہے کہ "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے"۔ بہادر سلطان موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مردانہ وار لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ سلطان کی لاش کو تڑپتے ہُوئے دیکھ کر فرطِ انبساط میں جنرل ہیرس کے منہ سے بے ساختہ نکلتا ہے:

"آج سے ہندوستان ہمارا ہے"۔ یہ کسی مجنون کی بڑ نہیں بلکہ ایک حقیقت کا اظہار تھا۔

انگلینڈ میں اِس فتح کی خوشی میں جشن منایا گیا، چراغاں ہُوا۔ برطانوی حکومت نے ولزلی

جیسے ننگِ انسانیت کو مارکوئس کا خطاب دیا اور جنرل ہیرس کو لارڈ بنا دیا گیا۔ شہیدانِ کربلا کی سنّت کو زندہ کر دکھانے والے عظیم سلطان کے متعلق ہر غیرت مند اور حریّت پسند مسلمان کے مُنہ سے یہ الفاظ دلی خلوص اور عظمت و عقیدت کے جذبات کے ساتھ دُعائیہ انداز میں جاری ہو جاتے ہیں: ؎

ابرِ رحمت تیرے مرقد پر گہر باری کرے
حشر میں شانِ کریمی ناز برداری کرے

وہ سلطان ٹیپو شہید جس سے انگریز ہر وقت خائف رہتے تھے۔ لارڈ وارن ہیسٹنگز اور لارڈ کارنوالس کو جس کے ملک کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی جُرأت نہ ہوتی تھی، کیا لارڈ ولزلی اپنی طاقت کے بل بوتے پر اُس کی ریاست میں داخل ہو گیا تھا؟ سلطان ٹیپو جیسے مدبّر اور بیدار مغز حکمران کو خبر نہ ہُوئی اور انگریزی فوج اپنے اتحادیوں سمیت سلطنتِ میسور کا جگر چیرتی ہُوئی سرنگاپٹم تک جا پہنچی، یہ ناممکن امر کیا ایسٹ انڈیا کمپنی کی طاقت سے ممکن ہو گیا تھا؟ نہیں، بلکہ یہ اِسی گھر کے ایک منحوس چراغ قابلِ صد ہزار نفرت و حقارت کا کارنامہ ہے۔ خود میر صادق نے ہی اپنے ہاتھوں اِس گھر کو آگ لگائی تھی۔ اُسی ناآشنائے دردِ ملّت نے پاک و ہند کے باشندوں کو برطانوی ڈاکوؤں کا غلام بنانے کا ناپاک فریضہ انجام دے کر تاریخ میں اپنے لیے بدترین مقام پسند کر لیا تھا۔ اِسی لیے تو ڈاکٹر اقبال نے کہا تھا: ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ ملّت، ننگِ دیں، ننگِ وطن

سلطان حیدر علی اور اُس کے فرزندِ نامدار کی فراست، تدبر اور باریک بینی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہُوئے نظام اور مرہٹوں کی کوتاہ اندیشی کا غلام رسول مہر نے یُوں رونا رویا ہے:

> ”دیسی حکمرانوں میں سے میسور کا فرماں روا حیدر علی پہلا شخص تھا جس نے انگریزوں کی فطرت کا صحیح اندازہ کیا۔ اُس کی دُوررس نگاہ نے بھانپ لیا تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان میں قدم جمانے کا موقع مِل گیا تو ملک خوفناک

> آفات کا ہدف بن جائے گا۔ طاقت کا مقابلہ طاقت سے کیا جا سکتا ہے... حیدر علی کی تمام کوششیں انگریزوں کو ختم کر دینے کے لیے وقف رہیں.... حیدر علی، نظام، مرہٹوں اور ناظمِ کرناٹک کو بھی بار بار آگاہ کرتا رہا۔ اُس کے فرزند ٹیپو سلطان نے بھی زندگی اِسی مقصد کی نذر کر دی لیکن نظام اور مرہٹے کوئی بھی شایان کام نہ کر سکے، صرف اِسی وہم میں مبتلا رہے کہ انگریزوں کے ساتھ ہو کر سلطنتِ میسور کو ختم کر دیں۔ وُہ ختم ہو گئی تو انگریزوں نے نظام کو اِس درجہ بے دست و پا بنا دیا کہ اُس کا عدم اور وجود برابر ہو گیا اور مرہٹوں کا نشان تک باقی نہ چھوڑا... غرض سلطنتِ میسور کی تباہی انگریزوں کی جنگی قوت کا کارنامہ نہ تھی بلکہ دیسی حکمرانوں خصوصاً نظام اور مرہٹوں کی نالائقی، کوتہ اندیشی اور تفرقے کا نتیجہ تھی۔“[1]

سلطان ٹیپو کی شہادت اور سلطنتِ میسور کی تباہی کے بعد حسبِ منشا کُھل کر کھیلنے کے لیے ولزلی کا راستہ صاف ہو گیا تھا۔ بعض ریاستیں تو پہلے ہی انگریزوں کی باج گزار ہو گئی تھیں، اب ولزلی نے باقی دیسی حکمرانوں کو مجبور کرنا شروع کیا کہ وُہ اپنی اپنی ریاست میں انگریزوں کی امدادی فوج رکھیں اور اُس کے اخراجات برداشت کریں۔ جن ریاستوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا اُن پر فوج کشی کر کے یکے بعد دیگرے قبضہ کر لیا گیا لیکن جن حکمرانوں نے اپنی اپنی ریاستوں میں انگریزی فوج رکھنا منظور کر لیا تھا اُن کا انجام بھی دُوسروں سے چنداں مختلف نہیں رہا۔ کسی سے بڑھتی ہُوئی فوج کے اخراجات پُورے نہ ہو سکے، کوئی بساط سے باہر خراج ادا کرنے سے قاصر رہ گیا اور کسی سے انگریزی عملداری کے مطالبات پُورے نہ ہو سکے تو اِس کمی کو پُورا کرنے کی غرض سے اُس ریاست کا ایک حصّہ خرید لیا جاتا، دِل چاہتا تو ایسے حکمران کو ہٹا کر کسی اپنے نمک خوار کو گدّی نشین کر دیتے اور اُس کے ذریعے اُس ریاست کے عوام کے خون کا آخری قطرہ تک چُوس لینے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتے اور

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۵

آخر کار اُس علاقے کو ہڑپ کرنے پر جاکر ہی وُہ قضیہ ختم ہوتا۔ انگریزوں کی اِس پالیسی کا ولیم ہووِٹ نے یُوں تجزیہ کیا ہے:

"جو رئیس اور حکمران انگریزوں کی دوستی کے جادُو سے مسحور ہُوئے اُن کے لیے یہ دوستی انجام کار مہلک ثابت ہُوئی۔ اُن میں سے ہر ایک کو تختِ حکومت سے اُترنا پڑا یا وُہ اُس طاقت کے ہاتھ میں بے جان کھلونے بن کر رہ گئے جو اپنی مرضی پُوری کرنے پر تُلی بیٹھی تھی۔ اُن حکمرانوں نے دوستی کی راہ اختیار کی یا دشمنی کی، نتیجہ دونوں حالتوں کا یکساں نکلا۔ اگر اُنھوں نے غاصب انگریزوں سے دوستانہ تعلقات گوارا نہ کیے تو اُن پر ارادہ ہائے بد کا الزام لگاکر حملہ کر دیا گیا اور اُن کے علاقے مسخر ہو گئے۔ اگر اُنھوں نے پیش کردہ دوستی قبول کر لی، تو وہ ڈپلومیسی کے جال میں اِس طرح اُلجھ گئے کہ اپنی عزّت اور موروثی مقبوضات سے محروم ہُوئے بغیر نجات نہ پا سکے۔ حق یہ ہے کہ وُہ لوگ جہاں حکومت کرتے رہے تھے وہاں قیدی بن کر رہ گئے تھے۔"[1]

انگریز جو تاجر کے رُوپ میں آئے تھے لیکن ایک بلائے ناگہانی بن کر متحدہ ہندوستان کے اکثر حصّے پر قبضہ جما بیٹھے کتنی ہی ریاستوں کو کمالِ عیّاری سے ہضم کر چکے تھے۔ عیّاری کا کوئی گُر ایسا نہ تھا، جو انگریزوں نے آزما کر نہ دیکھا ہو، لُوٹ کھسوٹ کی کوئی ترکیب ایسی باقی نہ رہی تھی جو اُنھوں نے جاری نہ کی ہو۔ کیا پنجاب کی سِکّھ ریاستوں نے اِس خطرے سے بچنے کی کوئی تدبیر اختیار کی یا اُسی طرح آنکھیں بند کر لی تھیں جیسے بلّی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کر لیا کرتا ہے؟ مہر صاحب نے اِس حقیقت کے چہرے کو یُوں بے نقاب کیا ہے:

"مغلیہ سلطنت کے دورِ زوال میں سِکھوں نے ستلج اور جمنا کے درمیان چند مسلیں قائم کر لی تھیں، جنھیں سکھ ریاستوں کا آغاز سمجھنا چاہیے اور ستلج کے شمال میں بھی اُن کی چند مسلیں تھیں، جن میں سے انجام کار رنجیت سنگھ نے

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۲

خاصی شہرت حاصل کی۔ اگر وہ ذرا دُور اندیشی سے کام لیتا تو تمام سِکھوں کو متحد کر کے ایک پائیدار حکومت کا انتظام کر سکتا تھا لیکن اُس نے ذاتی برتری کے جنون میں ستلج اور جمنا کے درمیان کی سکھ مسلوں کو بدظن کر دیا اور وہ بھی انگریزوں کی آغوش میں چلی گئیں۔ رنجیت سنگھ کو پھر بھی ہوش نہ آیا۔ اُس نے اپنوں کو غیروں کے قبضے سے نکال کر اپنے ساتھ ملانے کے بجائے انگریزوں سے (۱۸۰۹ء میں) معاہدہ کر کے ستلج کو اپنی اور انگریزی سلطنت کے درمیان حدِّ فاصل بنا لیا، گویا سِکھوں کی نصف قوت انگریزوں کے پاس چلی گئی، باقی نصف کا رئیس رنجیت سنگھ اِس بنا پر خوش ہو گیا کہ اب کسی خلش اور خدشے کے بغیر شمال اور مغرب میں اپنے حدود بڑھا سکے گا۔ اگرچہ حقیقتِ حال کے اعتبار سے اُس نے سِکھوں کے مستقبل پر سب سے کاری ضرب لگائی تھی۔

اُس نے ایک طرف سِکھوں کے دو ٹکڑے کیے، دُوسری طرف اپنے دائرۂ حکومت کی توسیع کے لیے ایسی کوتاہ اندیشی کی پالیسی اختیار کی کہ ہر گرُوہ غیر مطمئن ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب انگریز ہندوستان کے معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق طے کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ایک ہی جست میں دریائے ستلج سے پشاور جا پہنچے۔ سکھوں کی حکومت کا نشان تک باقی نہ رہا اور ایک بھی آنکھ سِکھوں کی تباہی پر اشک باری کے لیے نہ مل سکی۔ آخر میں سِکھوں کے لیے فخر کی صرف ایک دستاویز باقی رہ گئی کہ اُنھوں نے انگریزوں کا ساتھ دے کر پُورے ملک کو غلامی کی زنجیریں پہنائیں۔ پچاس ساٹھ سال تک وہ اِسی سرمایۂ فخر کے سہارے انگریزوں کی نظر میں معتمد علیہ بنے رہے“۔[1]

دیکھنا یہ ہے کہ جب انگریز متحدہ ہندوستان کے اکثر علاقوں پر قبضہ جما چکے تھے۔ کتنی ہی چھوٹی بڑی ریاستوں کا حسرت ناک انجام سامنے تھا، اُن دنوں امیرانِ سندھ نے

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۶

سکھوں جیسی بداندیشی اور خود فریبی سے ہی کام لیا تھا یا کوئی قابلِ قدر ایسا بھی اقدام کیا جو حریت پسندی اور عاقبت اندیشی کے تحت کرنا پڑتا ہے۔ اِس سوال کا جواب بھی مہر صاحب کے لفظوں میں ہی پیشِ خدمت ہے:

”سندھ کی مثال سب سے بڑھ کر دردناک ہے۔ وہاں کے امیر ایک طرف انگریزوں سے بدکتے تھے اور دُوسری طرف اُنھیں سکھوں کی پیش قدمی کا خطرہ پریشان کر رہا تھا۔ انگریزوں نے معمول کے مطابق فریب کاری سے کام لیا، وُہ سکھوں کی پیش قدمی کے خطرے کو زیادہ سے زیادہ بھیانک صورت میں پیش کر کے امیروں پر اثر ڈالتے اور اپنے قدم جماتے رہے۔ نہ رنجیت سنگھ میں اِتنی وسعتِ قلب اور وُسعتِ نظر تھی کہ وہ امیروں کو پورا اطمینان دلا کر انگریزی اثرات کو دُور رکھتا اور نہ امیروں میں اِتنی ہوشمندی تھی کہ وُہ سکھوں کے خطرے کی روک تھام کے لیے کسی دُوسری تدبیر سے کام لیتے اور انگریزوں سے بچے رہتے جو تقریباً بیسیوں دیسی حکومتوں کو ہضم کر چکے تھے۔

امیروں سے حتمی معاہدہ تھا کہ فوج اُن کے علاقے میں سے نہ گزاری جائے گی لیکن پہلی جنگِ افغانستان میں انگریزوں نے اِس شرط کی خلاف ورزی کی بلکہ شاہ شجاع کو امیروں سے روپیہ بھی دِلوایا۔ جنگِ افغانستان ختم ہوگئی تو انگریزوں نے امیروں کو دبانا شروع کیا کہ تم نے تو ہماری مشکلات کے وقت دوستی کا حق ادا نہ کیا تھا، اب نیا معاہدہ کرو، مجوزہ معاہدہ امیروں کے استقلال کو ختم کرتا تھا۔ وُہ بیچارے تذبذب میں پڑے اور اُن پر حملہ کر دیا۔“[2]

متحدہ ہندوستان کی جس ریاست پر بھی انگریزوں نے قبضہ کیا اُسے دوستی کے چکر میں

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۶

[2] ایضاً: ص ۱۷

پھنسایا یا دُوسروں کو ساتھ لے کر، اُسے دشمن ٹھہرا کر حملہ آور ہُوئے اور قبضہ کر لیا۔ کیٹی نے انگریزوں کی اِس چالبازی پر یُوں تبصرہ کیا ہے:

> "کہا جاتا ہے کہ امیرانِ سندھ نے معاہدوں کی خلاف ورزی کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومتِ برطانیہ نے معاہدے توڑنے کا حق اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ اگر معاہدوں کو توڑنے کا نتیجہ لازماً یہ ہوتا کہ علاقے چھن جاتے تو آج حکومتِ برطانیہ کے پاس دریائے برہم پتر اور دریائے سندھ کے درمیان ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی باقی نہ رہتا۔"[۱]

پنجاب، ناگپور اور ستارہ پر انگریزوں نے کس طرح قبضہ کیا؟ یہاں کس قسم کا جال پھیلا کر اپنی توسیع پسندی کی ہوس اور سرزمینِ پاک و ہند کے چپّے چپّے کو غلام بنا کر لوٹنے کی خواہش پوری کی، ملاحظہ ہو:

"۱۔ ہارڈنگ نے سِکھوں کی حکومت کا صرف ایک حصّہ چھینا تھا اور کشمیر کو گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کیا تھا، ڈلہوزی نے پُورا پنجاب لے لیا اور دلیپ سنگھ کو معزول کر کے فتح گڑھ (یو۔پی) پہنچایا۔ اُس نے عیسائیت قبول کر لی، شاید اِسی لیے کہ تختِ حکومت حاصل کرنا سہل ہو جائے گا لیکن عیسائیت اُسے انگریزوں کے قریب تر نہ لا سکی۔ اَور آخری دَور میں اُس سے جو بدسلوکیاں ہُوئیں وُہ بڑی ہی درد انگیز اور عبرت افزا تھیں۔

۲۔ ستارہ کی چھوٹی سی ریاست سیواجی کے خاندان کے لیے رکھی گئی تھی۔ معاہدہ یہ ہُوا تھا کہ وُہ دواماً قائم رہے گی۔ اپریل ۱۸۴۸ء میں ستارہ کے راجہ نے وفات پائی۔ اُس کے اولاد نہ تھی۔ لیکن ہندو دھرم کے رواج کے مطابق اُس نے ایک لڑکے کو متبنّیٰ بنا لیا تھا۔ ڈلہوزی نے

---

[۱] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۷

> متبنّٰی کو راجہ بنانا منظور نہ کیا اور ریاست ضبط کر لی۔
>
> ۳- ۱۸۵۳ء میں رگھوجی بھونسلا والیِ ناگپور فوت ہُوا۔ اُس کے بھی کوئی اولاد نہ تھی اور غالباً اِس خیال سے اُس نے کسی کو متبنّٰی نہ بنایا تھا کہ عوام اُسے اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم سمجھ لیں گے، تاہم ملک کے رواج اور ہندو دھرم کے مطابق اُس کی بیوہ متبنّٰی تجویز کر سکتی تھی۔ ڈلہوزی نے وُہ ریاست بھی بے تکلّف سنبھال لی، پھر محلّات کا سارا اسباب انتہائی بے دردی سے برسرِ عام نیلام کرایا، یہاں تک کہ ایک رانی بدسلوکی پر خفگی کے جوش میں پُورے محل کو آگ لگوا دینے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔"[1]

یہ ہے برطانوی لٹیروں کے متحدہ ہندوستان پر قابض ہونے کی مختصر سی کہانی اور نہ ماننے والوں کی خود اپنی زبانی، اِس کے باوجود یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ بعض مُبتدعینِ زمانہ اور لصوصِ دین نے برٹش گورنمنٹ کی قصیدہ خوانی میں زمین آسمان کے قلابے ملائے اور اِس کے باوجود انگریزوں کے اُن نمک خواروں، ملک وملّت کے غدّاروں کو آج تک مسیحائے قوم، مصلح، رہنما، ریفارمر اور معلوم نہیں کیا کیا منوانے کی مہم برابر جاری ہے۔ ایسے بیانات اِسی کتاب کے باب چہارم کے اندر ملاحظہ فرمائے جا سکتے ہیں۔ اب بانیِ علی گڑھ کالج سر سیّد احمد خاں کا انگریزوں کے متعلق ایک بیان ملاحظہ ہو کیونکہ پاکستان کا ایک طبقہ موصوف کو پاکستان کا معمارِ اوّل منوانے پر بضد ہے:

> "اُن (سر سیّد) کی نہایت پختہ رائے تھی کہ ہندوستان کے لیے انگلش گورنمنٹ سے بہتر، گو کہ اُس میں کچھ نقص بھی ہوں، کوئی گورنمنٹ نہیں ہو سکتی اور اگر امن و امان کے ساتھ ہندوستان کچھ ترقی کر سکتا ہے تو انگلش گورنمنٹ ہی کے ماتحت رہ کر کر سکتا ہے۔ وُہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گو ہندوستان

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۳

کی حکومت کرنے میں انگریزوں کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر درحقیقت نہ اُنھوں نے یہاں کی حکومت بہ زور حاصل کی اور نہ مکروفریب سے ، بلکہ درحقیقت ہندوستان کو کسی حاکم کی اصلی معنوں میں ضرورت تھی ، سو اُسی ضرورت نے ہندوستان کو اُن کا محکوم بنا دیا۔“ [1]

موصوف کے ہر لفظ سے کس طرح انگریزوں کی محبت کے دریا رواں ہیں ، عقیدت و احترام کے کیسے کیسے چشمے پھوٹ رہے ہیں اور ساتھ ہی دردمندانِ ملک و ملّت کی آنکھوں میں دھول جھونک کر قوم کو کیسا خوشنما دھوکا دیا جا رہا ہے کیونکہ مسیحائے قوم اور ناخدائے کشتیِ ملّت جو ٹھہرے ۔ اکبر الٰہ آبادی نے اِسی لیے تو کہا تھا : ؎

یورپ نے دکھا کر رنگ اپنا ، سیّد کو مرید بنا ہی لیا
سب پیروں سے تو بچ نکلے ، اِس پیر کے آگے کچھ نہ چلی

ایک طرف انگریز اپنی مخصوص پالیسی کے ذریعے دیسی ریاستوں پر یکے بعد دیگرے قبضہ جماتے گئے اور دُوسری طرف اُس متحدہ ہندوستان کو ، جو کبھی سونے کی چڑیا مشہور تھا اور جسے اپنی بعض مصنوعات پر بجا طور پر ناز تھا ، اُسے صنعتی لحاظ سے مفلوج کرنے میں بھی برطانوی لٹیروں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا ۔ برطانوی لوگوں کے تاثرات ہمارے سُوتی کپڑے کی صنعت کے بارے میں اُس وقت یہ تھے : (بقول میاں محمد شفیع)

”ہندوستان کی جس چیز نے سب سے زیادہ تباہی مچائی ہُوئی ہے وُہ سُوتی کپڑا ہے ۔ ہمارا (برطانوی) اُونی کپڑا اُس کے سامنے بے قدر ہو گیا ہے ۔ افسوس ہے کہ ہندوستانی دولت لُوٹ رہے ہیں لیکن عیسائی برباد ہو رہے ہیں ، کیا انجام ہوگا ؟ یہی کہ ہندوستانی دولتمند ہو جائیں گے اور ہم مفلس کے مفلس ۔“ [2]

یہی میاں صاحب ہماری ریشمی صنعت کے بارے میں مسٹر شیلڈن کا ایک بیان یوں

---

[1] الطاف حسین حالؔی : حیاتِ جاوید ، ص ۶۸۲

[2] محمد شفیع میاں : ۱۸۵۷ء ، مطبوعہ لاہور ، بار اول ، ۱۹۵۷ ، ص ۱۰۱

نقل کرتے ہیں :

"انگلستان میں جو ریشمی کپڑا فرانس اور اٹلی سے درآمد ہوتا تھا وہ بالکل بند ہو گیا ہے، اِس لیے کہ بنگال کا ریشمی کپڑا فرانس اور اٹلی کے ریشمی کپڑوں سے آدھی قیمت پر انگلستان پہنچ جاتا ہے اور دونوں سے بہتر ہے۔" [۱]

اِس سونے کی چڑیا پر قابض ہونے سے پہلے برطانیہ انتہائی پس ماندہ اور غریب ملک تھا۔ سرزمینِ پاک و ہند کو لُوٹ کر انگریزوں نے اپنے ملک کو صنعتی بنا لیا اور صفِ اوّل کے خوشحال ملکوں میں انگلستان کا شمار ہونے لگا۔ میاں محمد شفیع اِس حقیقت کے بارے میں یُوں رقمطراز ہیں:

"ہندوستان پر تصرف حاصل کرنے سے پہلے انگلستان کی حیثیت نہایت معمولی تھی۔ یہ سونے کی چڑیا ہاتھ لگی۔ پُشت ہا پُشت کی نسلوں کے خزانے انگلینڈ پہنچے تو کارخانوں کی بنیادیں شروع ہو گئیں۔ جہاں سرسبز چراگاہیں، تروتازہ مرغزار تھے وہاں چمنیاں دُھواں اُگلنے لگیں۔ . . . ۱۷۸۵ء سے ہندوستان کی صنعت رُو بہ زوال ہُوئی اور انگلستان میں کپڑا بُننے کی دیگر صنعتی آسانیاں پیدا ہو گئیں، کلیں نکل آئیں، گھنٹوں کے کام منٹوں میں ہونے لگے۔ سستے مال ہندوستان کی بندرگاہوں میں پہنچے۔ ہندوستان کے ہاتھ سُست پڑ کر پُرانے ڈھچر پر چلتے رہے۔" [۲]

جب انگریزوں نے یہاں کی دولت کے ذریعے اپنے ملک کو صنعتی بنانا شروع کیا تو چونکہ بنگال کے سُوتی اور ریشمی کپڑوں نے فرانس اور اٹلی کی صنعتوں کو ناکارہ بنا کے رکھ دیا تھا، اِسی خطرے سے بچنے اور اپنی مصنوعات کو ترقی دینے اور کامیاب بنانے کی غرض سے انگریزوں نے متحدہ ہندوستان کی صنعتِ پارچہ بافی کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر

---

[۱] محمد شفیع میاں : ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۰۱

[۲] ایضاً : ص ۱۰۲

اُٹھا نہ رکھی۔ اِس سلسلے میں میاں صاحب نے مسٹر بورڈس کا ایک بیان یُوں نقل کیا ہے:

> "پارچہ بافوں پر جرمانے کیے جاتے تھے، قید کی سزائیں دی جاتی تھیں، کوڑے لگاتے جاتے تھے۔ اُن سے جبراً تجارتی عہد ناموں پر دستخط کرائے جاتے تھے۔ اِس سے مصنوعات ناپید ہوگئی ہیں اور ہَیں تو سخت گراں ہیں۔ عہدِ مغلیہ میں اور علی ویردی خاں کے زمانے میں یہ پارچہ باف نہایت خوش تھے اور اب بالکل تباہ ہوگئے ہیں۔" [۱]

دیسی صنعتوں کو اِس طرح تباہ کرنے کا معاملہ کہاں جا کر ختم ہُوا، یہ بھی میاں صاحب کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

> "۱۸۵۰ء تک مکمل طور پر انگریزوں نے یہاں کی صنعت و تجارت کو ٹھکانے لگا دیا اور ہندوستان سُوئی تک کے لیے وہاں (انگلستان) کا محتاج ہو کر بیٹھ گیا۔ نہ تجارت رہی نہ جہاز رہے۔ روٹی کے بھی لالے پڑ گئے۔ سلطنت، جائدادیں، عزّتیں، یہ سب تو جا ہی چکی تھیں، صنّاعوں اور کارخانہ داروں کے طبقے کی تباہی نے قوم کی شومیِ قسمت کی داستان کو مکمل کر کے دلوں کے لیے ایک اور مسلسل جراحت کا سامان مہیّا کر دیا۔" [۲]

جب انگریز اپنی کمال عیّاری سے ملک پر قبضہ کر رہے تھے، دونوں ہاتھوں سے یہاں کی دولت کو لُوٹ رہے تھے، ہندوستان کی وہ صنعتیں جنھوں نے یورپ کی مصنوعات و پارچہ جات کو مقابلے میں بالکل ردّی ثابت کر دیا تھا، اِن ظالموں نے اُنھیں ٹھکانے لگا کر یہاں کے پارچہ بافوں اور صنعت کاروں کو محتاج بنا دیا۔ تجارت ختم کر دی اور ہر طرح تباہ و برباد کر کے سُوئی تک کے لیے انگلستان کا اِس خطّے کو محتاج بنا دیا تھا۔ اُن دنوں بھی انگریزوں کے دیسی نمک خوار وکیلِ صفائی بن کر اپنے آقاؤں کی یُوں قصیدہ خوانی کر رہے تھے:

---

[۱] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۰۵

[۲] ایضاً: ص ۱۰۸

"غرض ان (قاضی شوکانی) کی گواہی سے بخوبی معلوم ہوا کہ درستیِ ملک اور صفائیِ راہ اور رفاہِ عوام اور امنِ خلائق اور امانِ مخلوق اور راحتِ رسائیِ رعیت اور آرام دہیِ بریت میں حکّامِ فرنگ کا مثل اور نظیر اس وقت میں بلکہ اکثر اوقات میں ہرگز نہیں۔ اگرچہ ہر وقت کے مُلّا اور مفتی خوشامد کی راہ سے باتیں بناتے ہیں اور ہر کسی کو اچھا بتاتے ہیں، مگر میری نظر میں جو راجح اور صحیح معلوم ہوا، وہ لکھ دیا اور قبول و ہدایت اللہ کے ہاتھ ہے۔"[۱]

شاید اکبر الٰہ آبادی نے ایسے ہی انگریز کے مدّاحوں کی فوج کو دیکھ کر یہ شعر موزوں کیا تھا:

؎ ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تُلے ہوئے
لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے

مداخلت فی الدین:[۲] جب انگریز دیسی ریاستوں پر قبضہ جماتے جا رہے تھے، ملک کی دولت کو طرح طرح کے حربوں سے لُوٹ رہے تھے، یہاں کی صنعتوں کو تباہ و برباد کر کے اور اپنے ملک کو صنعتی بنا کر پاک و ہند کے باشندوں کو انگلستان کا دستِ نگر بنا رہے تھے تو اہلِ ملک کی عزیز ترین متاع یعنی دولتِ دین و ایمان کو لُوٹ لینے کی طرف سے بھی غافل نہیں تھے۔ اِس سلسلے میں انگریزوں کا پہلا منصوبہ یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خرچ پر انگلینڈ سے پادری بُلائے جاتے، وُہ متحدہ ہندوستان میں آکر دُوسرے مذاہب پر اعتراضات کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیتے اور اپنی حقانیت جتانے کی غرض سے جگہ جگہ مناظروں کا چیلنج بھی دے دیا کرتے۔ اِس کے ساتھ ہی عیسائیت کی حمایت میں بے شمار کتابیں شائع کروا کر مفت تقسیم کرنے لگے۔ چنانچہ علّامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بیان مولوی عبدالرشید ارشد نے یُوں نقل کیا ہے:

"انگریزوں نے تمام باشندگانِ ہند کو عیسائی بنانے کی اسکیم بنائی تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو کوئی مددگار اور معاون نصیب نہ ہو سکے گا"

---

[۱] صدیق حسن خاں بھوپالی، نواب: ترجمانِ وہابیہ، مطبوعہ امرتسر، ص ۳۴

اِس لیے انقیاد و اطاعت سے سرتابی کی جُرأت نہ ہو سکے گی۔ انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں کا باشندوں سے اختلاف، تسلّط و قبضے کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہوگا۔ اِس لیے پُوری جانفشانی اور تندہی کے ساتھ مذہب و ملک کو مٹانے کے لیے طرح طرح کے مکر و حیلے سے کام لینا شروع کیا اُنھوں نے بچوں کو نافہموں کو اپنی زبان اور دین کی تلقین کے لیے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے اور پچھلے علوم و معارف کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔[1]

خود مولوی عبد الرشید ارشد نے انگریزوں کی اِس ظالمانہ روش کا تذکرہ اِن لفظوں میں کیا ہے:

"ہندوستان میں انگریزی حکومت کے دَور میں عدل و انصاف اور رعایا پروری کے بجائے جبر و استبداد، لوٹ کھسوٹ کا عام دَور دورہ تھا۔ مسلمان چھ سو برس سے ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے مگر اُنھوں نے غیر مسلموں کے مذہبی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی۔ ہندو مسلمان باہم دگر شیر و شکر کی طرح رہتے تھے مگر انگریزی عملداری میں ہندوستان کو عیسائی بنانے کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ پادریوں کو نہ صرف تبلیغ کی عام اجازت تھی بلکہ انگریزی حکّام اُن کی پُشت پناہی کرتے۔ اسکولوں اور کالجوں کے مدرسین عموماً پادری ہوتے تھے۔ انجیل کا درس ضروری کر دیا گیا تھا۔ پادری عام مجمعوں میں نہ صرف عیسائیت کی تبلیغ ہی کرتے بلکہ ہندو اور مسلمانوں پر بے محابا جارحانہ حملے کیے جاتے۔ چونکہ انگریز کی نظر میں اُس کا اصل مدِ مقابل مسلمان تھا اور اُسی کو وہ اپنا سیاسی حریف سمجھتا تھا۔ اِسی لیے انگریزوں کا خیال تھا کہ جب تک مسلمانوں کو پست اور ناکارہ نہ بنا دیا جائے گا اُس وقت تک حکومت اور سربلندی کا نشہ ان کے دماغوں سے نہیں نکلے گا۔ اِس لیے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ ظلم و جَور اور تبلیغِ عیسائیت کا نشانہ بنایا گیا۔"[2]

---

[1] عبد الرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، ص ۹۴

[2] ایضاً، ص ۹۴

اِس منصوبے کے تحت بے شمار عیسائی پورے ملک میں پھیل گئے۔ اِن میں پادری فنڈر کی سرگرمیاں سب سے نمایاں تھیں۔ ہر جگہ اسلام پر اعتراضات کی بوچھاڑ اور مناظرے کا چیلنج دیتا پھر رہا تھا۔ اہلسنّت وجماعت کے مایۂ ناز عالمِ دین یعنی پایۂ حرمین مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے آگرہ کے تاریخی مناظرے میں اُسے وہ شکستِ فاش دے کر ساکت و صامت کیا کہ انگلستان کی طرف بھاگتے ہی بنی۔ غلام رسول مہر نے اِس امر کا تذکرہ یوں سپردِ قلم کیا ہے:

> "اِس ضمن میں پادری فنڈر کا ذکر ضروری ہے جو ۱۸۵۴ء میں یہاں آیا تھا اور آتے ہی اِسلام پر اعتراضات کا لا متناہی سلسلہ جاری کر دیا تھا۔ اُسے عربی اور فارسی سے خوب واقفیت تھی۔ اسلامی علوم کی کتابیں بھی دیکھ چکا تھا سادہ لوح علماء جنھیں عیسائیت سے چنداں واقفیت نہ تھی۔ فنڈر کے اعتراضات کا جواب نہ دے سکتے تھے۔ آخر مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں نے بمقام آگرہ فنڈر سے مناظرہ کیا۔ موضوعِ مناظرہ یہ تھا کہ توریت و انجیل میں تحریف ہوئی یا نہ ہوئی؛ فنڈر نے شکست کھائی اور وہ واپس چلا گیا تاہم یہ حقیقت پھر ایک مرتبہ واضح ہو گئی کہ پادریوں کو دُور دراز کے سفر کر کے یہاں آنے اور لوگوں کے عقائد بگاڑنے کی کوشش کرنے کا حوصلہ کیوں ہوا۔"[1]

پروفیسر محمد ایوب قادری نے بھی اِس مناظرے کا ذکر اِن لفظوں میں کیا ہے:

> "مولوی رحمت اللہ بن خلیل اللہ عثمانی ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ کیرانہ ضلع مظفر نگر وطن ہے۔ مفتی سعد اللہ مراد آبادی، مولوی محمد حیات اور مولوی امام بخش صہبائی وغیرہ سے تحصیلِ علم کی۔ ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۴ء میں آگرہ میں پادری فنڈر سے مناظرہ کیا۔ فنڈر نے راہِ فرار اختیار کی۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں بڑے زور کے ساتھ حصّہ لیا، جس کے نتیجہ میں جائیداد و

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، ص ۳۰

املاک ضبط ہو گئی اور مکہ معظمہ کو ہجرت کرنی پڑی۔ مکہ معظمہ میں صولت النساء بیگم کی استعانت و امداد سے مدرسہ صولتیہ قائم کیا۔ عیسائیت کے رد میں بڑا کام کیا ہے۔ ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں انتقال ہُوا۔[1]

میدانِ مناظرہ میں اپنی ناکامی کو دیکھتے ہُوئے حکومت نے سرکاری سطح پر دُوسرا رنگ بدل لیا۔ تمام ملازموں کے نام عیسائیت قبول کر لینے کے پادری ایڈمنڈ سے خطوط لکھوائے گئے۔ انگریزوں کی اِس شرمناک کارگزاری کا تذکرہ غلام رسول مہر نے اپنے لفظوں میں یُوں کیا ہے:

”۱۸۵۵ء میں پادری ایڈمنڈ نے کلکتہ سے ایک طویل خط ملک کے تمام تعلیم یافتہ آدمیوں، خصوصاً معزز سرکاری ملازموں کے پاس بھیجا، جس کا مضمون یہ تھا: ”اُب ہندوستان میں ایک عملداری ہو گئی، تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہو گئی، ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمدورفت ایک ہو گئی، مذہب بھی ایک چاہیے۔ اِس لیے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔“ اِن تمام باتوں کا نتیجہ اِس کے سِوا کیا ہو سکتا تھا کہ لوگوں کو یقین ہو جاتا، اب حکومت نے عیسائیت کو فروغ دینے اور سابقہ مذاہب کو مٹا دینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے۔“[2]

میاں محمد شفیع نے پادری ایڈمنڈ کے مذکورہ خطوط کا تذکرہ اپنے لفظوں میں یُوں کیا ہے:

”چلتے چلتے سُلگتی آگ پر پادری ایڈمنڈ نے کلکتے سے ۱۸۵۵ء میں تمام دفاتر اور اہم اداروں میں ذیل کا اعلان بھیج کر تیل چھڑک دیا۔ جو شک میں تھے اُنھیں بھی یقین ہو گیا کہ انگریز ہمیں مذہب سے بھی محروم کر دیں گے۔ مسلمان ہوں یا ہندو، دونوں پر اِس کا یکساں اثر پڑا اور دونوں تپ گئے۔“[3]

---

[1] محمد ایوب قادری، پروفیسر، تذکرہ علمائے ہند اُردو، مطبوعہ کراچی، ص ۵۷۰

[2] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۹

[3] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، بار اوّل، ۱۹۵۷ء، ص ۱۱۷

پادریوں کی اِن شرمناک سرگرمیوں میں حکومت کا ہاتھ تھا یا نہیں؟ میاں صاحب کا جواب ملاحظہ ہو:

> ”حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ پادریوں کی تحریک و تبلیغ میں خود گورنر شامل رہے ہیں۔ مبلّغینِ عیسائیت کو باقاعدہ امداد دیا بلکہ تنخواہیں دی جاتی تھیں اور بعض گورنر تبلیغ میں خاصی دلچسپی اور جوش و سرگرمی رکھتے تھے۔“ [1]

برٹش گورنمنٹ کا نظریہ و منصوبہ پادریوں کی سرگرمیوں سے واضح تھا۔ آخر ہزاروں میل دُور سے یہاں آکر، اتنا خرچ برداشت کر کے پادریوں کو یہاں تبلیغ کرنے، دوسروں کے مذاہب پر اعتراضات جڑنے کی آخر کون سی ضرورت پڑی تھی؟ ضرورت بھی تسلیم کی جائے تو آمد و خرچ کے اتنے مصارف ایک مذہبی مبلّغ کے پاس کہاں سے آئے؟ اگر مصارف ہوں بھی تو ہزاروں روپے خرچ کر کے یہاں آکر تبلیغ کرنے کے بجائے ایک کوڑی خرچ کیے بغیر اپنے ملک میں عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت میں سرگرم رہ سکتے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ پادریوں کو ہزاروں میل دُور سے یہاں آنے کی قطعاً نہ کوئی ضرورت تھی اور نہ کسی عام آدمی میں استطاعت، پادریوں کی ضرورت تھی تو برٹش گورنمنٹ کو اور اُنھیں یہاں لانے، اُن کے سارے اخراجات برداشت کرنے کی استطاعت تھی تو ایسٹ انڈیا کمپنی میں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ساری کارگزاری انگریزی حکومت کی تھی۔ اِس حقیقت کے باوجود یہاں کے ایک علی گڑھی وکیلِ نامدار، اپنی سرکارِ ابد قرار کی صفائی میں یُوں گُہر بار ہوتے تھے:

> ”اوّل یہ ہے کہ کلکتے کے بعض پادریوں نے اپنے حسبِ عادت، مذہب و ملّت کے بارے میں مناظرے اور مباحثے کے طریقے پہ ایک اعلان چھپوا کر عام طور پر ہندوستانیوں کے پاس بھیجا ہے اور ہندوستانیوں نے یہ سمجھا ہے کہ اِس قسم کے مضامین ابد پائدار گورنمنٹ کے اشارے سے بھیجے گئے ہیں۔ حالانکہ گورنمنٹ کو اِس کی مطلقاً خبر نہیں ہے اور سرکارِ عالی مقدار کی یہ شان

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، بار اول، ۱۹۵۷ء، ص ۱۲۰

> ہرگز نہیں ہے کہ وُہ اپنی رعایا کو اپنے دین و مذہب کی ترغیب و تحریص دے۔ صاف ظاہر ہے کہ اِس ملک میں ہر مذہب و ملّت کے لوگ ہیں جو الگ الگ آئین رکھتے ہیں اور اُن کا علاقہ اِس سرکار والا اقتدار کے ماتحت ہے۔ گورنمنٹ اِن پر لُطف و کرم کی یکساں نظر رکھتی ہے۔ اقتدار کو اِتنی مدّت ہو چکی ہے، کبھی کسی سے مذہب و ملّت کے بارے میں تعرّض نہیں کیا گیا، اِس میں اسلام ہوں یا دُوسرے مذاہب و ملل؟ [1]

ایسے آلہ کاروں کی صفائی کے باوجود گورنمنٹ کے خلاف نفرت کے عام جذبات بھڑکنے لگے، پادریوں کی اِن سرگرمیوں کی ذمّہ داری ہر کوئی حکومت پر ڈالتا تھا، اِن سب سے قطع نظر علمائے دین کے مقابلے میں پادریوں کی شکستیں اور ذلّت و ناکامی کے واقعات نے حکومت پر واضح کر دیا کہ اہلِ ہند اور خصوصاً مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی تجویز نہایت ٹیڑھی کھیر ثابت ہو کر رہے گی، اِس حقیقت و تجربے کی روشنی میں جو کام پادریوں سے لینا تھا وہ حکومت نے اپنے کالے پادریوں سے لینا شروع کر دیا اور یورپین تعلیم و تہذیب کی قدردانی و حوصلہ افزائی شروع کر کے دینی علوم اور علومِ شرقیہ کی تحصیل کرنے والوں کو عضوِ معطّل بنا دینے کی ٹھان لی۔

مہر صاحب لکھتے ہیں:

> "ابتداء میں مدرسوں اور کالجوں کے اندر تعلیم کا دُوسرا طریقہ تھا۔ وُہ تمام السنہ و علوم پڑھائے جاتے تھے جن کا پہلے رواج تھا، مثلاً عربی، فارسی، سنسکرت، فقہ، حدیث، ہندو دھرم کی کتابیں وغیرہ، اِن کے ساتھ انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ بعدازاں عربی اور فارسی کی تعلیم بہت کم ہو گئی۔ فقہ، حدیث اور دُوسری مذہبی کتابیں بند کر دی گئیں۔ اُردو اور انگریزی کا زور ہُوا۔ مذہبی علوم کی تعلیم ختم ہونے پر تشویش تھی ہی، اچانک حکومت نے اشتہار دے دیا کہ جو شخص سرکاری سکولوں اور کالجوں کا تعلیم یافتہ ہو گا یا فلاں فلاں علوم اور

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۲۰

انگریزی میں امتحان دے کر سند حاصل کرے گا اُسے دوسروں کے مقابلے میں ملازمت کے لیے ترجیح دی جائے گی۔ اِس طرح تعلیم کے متعلق بھی سوءِ ظن پیدا ہوگا۔" [1]

جب انگریزی حکومت نے مذہبی تعلیم اسکولوں اور کالجوں سے خارج کر دی اور اُس کی جگہ انگریزی زبان و علوم کو دے کر ملازمت کے سلسلے میں انگریزی تعلیم کو فوقیت اور اولیت دے کر مشرقی اور مذہبی علوم کو پامال کرنا شروع کیا تو اِسی پر اکتفا نہ کی بلکہ ملازمت کے سلسلہ میں اپنے مقرر کردہ ڈپٹی انسپکٹروں کے سرٹیفکیٹ کو لازمی قرار دیا۔ یہ امر متحدہ ہندوستان کے باشندوں کی نظر میں زخم پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھا کیونکہ ہندو ہوں یا مسلمان سب ہی اُس وقت ڈپٹی انسپکٹروں کو اپنے ملک اور اپنی اپنی قوم کے غدار انگریزوں کے ایجنٹ سمجھتے تھے اور اُنھیں کالا پادری کہا کرتے تھے۔ سرسید احمد خاں نے اِس امر کا یُوں اظہار کیا ہے:

> "دفعتاً پیشگاہِ گورنمنٹ سے اشتہار جاری ہُوا کہ جو شخص مدرسے کا تعلیم یافتہ ہوگا اور فلاں فلاں علوم اور زبان انگریزی میں امتحان دے کر سند یافتہ ہوگا، وُہ نوکری میں سب سے مقدم سمجھا جائے گا۔ اِس طرح چھوٹی چھوٹی نوکریاں بھی ڈپٹی انسپکٹروں کے سارٹیفکیٹ پر، جن کو ابھی تک سب لوگ کالا پادری سمجھتے تھے، منحصر ہوگئیں اور اِن غلط خیالات کے سبب لوگوں کے دِلوں پر ایک غم کا بوجھ پڑ گیا اور سب کے دل میں ہماری گورنمنٹ سے ناراضی پیدا ہوگئی۔ اور لوگ یہ سمجھے کہ ہندوستان کو ہر طرح بے معاش اور محتاج کیا جاتا ہے کہ تا مجبور ہو کر رفتہ رفتہ اِن لوگوں کی مذہبی باتوں میں تغیّر و تبدّل ہو جائیگا۔" [2]

سرسید احمد خاں صاحب بہادر نے اپنی سرکار نامدار، ابد پائدار کی صفائی پیش کرتے ہُوئے اور ملک و ملّت کے دین و ایمان کی تباہی و بربادی کی اسکیموں کی تائید و تصدیق کرتے ہُوئے

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷، مطبوعہ لاہور، ص: ۳۰

[2] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷، مطبوعہ لاہور، ص ۱۲۷

اپنی انگریز دوستی اور اقتدار پرستی کا ایسا کُھل کر ثبوت دیا کہ دین فروشوں کیلئے علی الاعلان حکومت کی حمایت اور ملک و قوم کے خلاف بولنے کا دروازہ کھول دیا۔ چنانچہ موصوف اُس وقت خود ساختہ منصف بن کر یُوں بیان داغتے ہیں:

> "چوتھی بات یہ ہے کہ ہمارے عادل کانوں تک یہ خبر پہنچی ہے کہ اِس ملک کے رہنے والے علوم و فنون اور انگریزی زبان حاصل کرنے کے اسکولوں کو اپنے مذہب و ملّت کی تبدیلی کا سبب جانتے ہیں، اِسی وجہ سے لوگ تحصیلِ علم و تکمیلِ فنون میں سستی کرتے ہیں، بچّوں کو اسکولوں میں نہیں بھیجتے، یہ سب خیالات بدعقلی و کج فہمی کی وجہ سے ہیں۔" [1]

انگریزی حکومت کی چال یہ تھی کہ جب اپنے کسی تخریبی منصوبے پر عمل کرنا منظور ہوتا تو اپنے دیسی ایجنٹوں سے اُس کے بارے میں تجویزیں پیش کروادی جاتی تھیں اُس کے بعد حکومت یہ کہہ کر احکامات جاری کر دیتی کہ ملک کے بعض اہل الرائے کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہم یہ حکم نافذ کر رہے ہیں۔ اِسی طرح جب حکومت نے سررشتۂ تعلیم کے ذریعے مشرقی علوم و السنہ کی تعلیم کو اسکولوں اور کالجوں میں برائے نام باقی رکھا ہُوا تھا تو عالیجناب، معلّی القاب سر سید احمد خاں صاحب نے یوں تجویز پیش کی تھی:

> "سررشتۂ تعلیم جو چند سال سے جاری ہے، وہ تربیت کے لیے ناکافی ہی نہیں بلکہ خراب کرنے والا تربیت اہلِ ہند کا ہے۔ اُردو زبان جس کے وسیلے سے اکثر جگہ تعلیم جاری ہے، اِس کی حالت ایسی نہیں جس سے تعلیم ہونا ممکن ہو . . . میری صاف رائے ہے کہ اگر گورنمنٹ اپنی شرکت دیسی زبان میں تعلیم دینے سے بالکل اٹھادے اور صرف انگریزی مدرسے اور اسکول جاری رکھے تو بلاشبہ یہ بدگمانی جو رعایا کو گورنمنٹ کی طرف سے ہے، جاتی رہے، صاف صاف لوگ جان لیں کہ سرکار انگریزی زبان کے وسیلے سے تربیت کرتی ہے

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، بار اول، ص ۱۲۲

اور انگریزی زبان بلاشبہ ایسی ہے کہ انسان کی ہر طرح کی علمی ترقی اِس میں ہو سکتی ہے“۔ [1]

بعض حضرات آج تک یہ کہتے ہُوئے نہیں تھکتے کہ سرسیّد احمد خاں صاحب اُردو زبان کے بہت بڑے حامی تھے اور آپ نے اِس زبان کی بڑی خدمت کی تھی، ایسے حضرات ذرا آنکھیں کھول کر حیاتِ جاوید کے اِس حوالے کو پڑھیں اور انصاف کو مدِّنظر رکھیں۔ مسلمان قوم کو بدلنے، اِسلام سے ناآشنا کرنے اور نئی نسل کو دین سے ناواقف محض رکھ کر انگریزی خوان اور بے راہ رَو بنانے اور بنوانے میں کہیں برٹش گورنمنٹ کے ساتھ موصوف بھی پورے شریکِ کار تو نہیں تھے؟ یہ فیصلہ کرنا قارئین کرام کا کام ہے: ؎

وہ یہ کہتے ہیں، بسایا ہے بیاباں ہم نے
ہم یہ کہتے ہیں، اُجاڑا تھا گلستاں کس نے؟

جب مذہبی تعلیم کو اسکولوں اور کالجوں سے قطعاً خارج کر دیا گیا تو دینی علوم حاصل کرنے والے مسلمان ملازمتوں سے محروم رہ کر دربدر کی ٹھوکریں کھانے لگے یا قوم کے رحم و کرم پر پلنے کے لیے کسی مسجد میں اڈّہ جما کر بیٹھ جاتے۔ اِس کے برعکس جس نے انگریزی پڑھی ہوتی، اُسے کالے پادریوں (ڈپٹی انسپکٹروں) سے ملازمت کے لیے سرٹیفکیٹ مل جاتے اور خاصی گزربسر کرتے نظر آتے۔ اِن حالات میں کون سا والد ہے جو اپنے بچّوں کو بے روزگار دیکھنا چاہتا ہو، اُنھیں دربدر کی ٹھوکریں کھاتے ہُوئے دیکھنا پسند کرتا ہو، اگرچہ دُوسری طرف ایمانی غیرت اور دینی حمیت دامن جھٹکتی تھی لیکن اولاد کی خوشحالی اور بدحالی کے جو مناظر روزانہ نگاہوں کے سامنے آ رہے تھے اُن کے پیشِ نظر اکثر حضرات نے اپنے بچّوں کے لیے اسکولوں اور کالجوں کا راستہ ہی اختیار کیا جیسا کہ آزاد ہونے کے بعد سے مملکتِ خداداد پاکستان میں بھی کمال سعادت مندی اور فرمانبرداری کے ساتھ انگریزوں کی اِسی اسلام دشمن پالیسی پر متواتر پچیس سال سے آج تک عمل ہوتا آ رہا ہے۔

---

[1] الطاف حسین حالی: حیاتِ جاوید، ص ۱۴۴

بہر حال یہ راستہ اختیار کر کے ملازمت تو مل جاتی تھی۔ یہ تعلیم معاش کا ایک ذریعہ ضرور ہو گئی تھی لیکن جب یہ نونہال اسکولوں اور کالجوں کی چار دیواری سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے تھے تو وہی کچھ بن کر نکلتے تھے جو انگریز اُنھیں بنانا چاہتے تھے۔ اگرچہ مسلمان عیسائی بننے پر تو آمادہ نہ ہُوئے اور انگریز اپنے اِس مقصد میں واقعی ناکام رہے لیکن حکومت نے اپنا مقصود دُوسری طرح حاصل کر لیا کہ اِن کی تعلیم حاصل کرنے والی نئی نسل کی اِس انداز سے ہنی تربیت شروع کر دی، گفتار و کردار اور غور و فکر کے زاویے اِس طرح بدل دیے کہ وعاتے مسلمانی کے علاوہ اُن کے مسلمان ہونے کا ثبوت شاید ہی کوئی ملتا تھا۔ گویا عیسائی بنے تو حقیقی مسلمان بھی نہ رہنے دیا۔ یہ تھا برطانوی منصوبہ جو متحدہ ہندوستان کے باشندوں رخصوصاً مسلمانوں کو اُن کے دین سے ہٹانے اور اسلام کے عدیم النظیر فیوض و برکات سے روم رکھنے کے لیے بنایا گیا تھا۔

۱۸۵ء کا ٹکراؤ: انگریز جس طرح ملک کے بلا شرکتِ غیر حاکم بنے، دولت لوٹی، اں کی صنعتیں تباہ کیں، پاک و ہند کے باشندوں کی پشت ہا پشت کے گاڑھے خون سینے کی کمائی سے جس طرح اپنے قلاش ملک انگلستان کو خوشحال اور صنعتی بنا دیا، اِن میں سے خم دُوسرے سے گہرا تھا۔ اہلِ ملک کو تڑپانے کے لیے اِن میں سے ایک ظلم بھی کافی تھا، ن پلے در پلے مظالم کے پہاڑ ڈھائے جا رہے تھے اور خُون کا گھونٹ پی کر مظلوم سہتے رہے تھے۔ مگر جب پاک و ہند کے باشندوں کو عیسائی بنانے کے پروگرام پر عمل شروع ا تو مظلوم بلبلانے لگے۔ حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات اپنے نقطۂ عروج پر پہنچے۔ اِس ستم بالائے ستم نے غیظ و غضب کی ایک لہر دوڑا دی، پُورا ملک ایک آتش فشاں ڑ بن گیا صرف کسی خاص بہانے کی ضرورت تھی کہ چربی والے کارتُوسوں نے جلتی پر تیل چھڑکنے کا کیا۔ فوجیوں کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کو جو کارتوس دیے جاتے ہیں اُن پر خنزیر کی چربی اور ووں کو دیے جانے والے کارتوسوں پر گائے کی چربی لگائی جاتی ہے۔ چونکہ یہ کارتوس ن سے لگائے بغیر چل نہیں سکتے تھے لہٰذا ہندو اور مسلمان فوجیوں کا یہی خیال تھا کہ اِس قے سے حکومت اُن کے دھرم اور ایمان کو خراب کرنا چاہتی ہے اور اُن کے جذبات کو

ٹھیس پہنچا رہی ہے۔ میرٹھ چھاؤنی کے بعض سپاہیوں نے وہ کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا تو اُنھیں اطمینان دِلانے کے بجائے نشۂ اقتدار میں بدمست رہنے والے افسروں نے اُن کے ساتھ انتہائی ظالمانہ سلوک کیا۔ اِس امر کا تذکرہ جناب غلام رسول مہر نے مؤرّخانہ انداز میں یُوں کیا ہے:

> "۹ مئی کی صبح طلوع ہُوئی۔ دیسی رسالے کو پیدل پریڈ کے میدان میں آنے کا حکم مِل گیا۔ یورپی فوج کو اور توپ خانے کو اِس طرح کھڑا کیا گیا کہ اگر کوئی سپاہی مزاحمت کی خفیف سی بھی حرکت کرے تو توپوں کے مُنہ کھول دیے جائیں اور سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ پچاسی مجرموں کو (جنھوں نے میرٹھ چھاؤنی میں ۲۴ر اپریل ۱۸۵۷ء کو چربی والے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا اور جنھیں انگریز سزائے موت کا حکم سُنا چکے تھے) پہرے میں لایا گیا۔ پریڈ کے میدان میں پہلے اُن کی وردیاں اُتاری گئیں، پھر لوہاروں کو حکم دیا گیا کہ اِن مجرموں کو بیڑیاں پہنائی جائیں۔ چنانچہ اِس پر عمل ہُوا۔ کیٹی نے لکھا ہے: "یہ منظر بڑا دردناک تھا۔ اُن بدنصیب آدمیوں کے یاس انگیز اشارے دیکھ کر بہت سے لوگوں کے دِل میں ہمدردی کے جذبات متحرک ہو گئے۔ اُن میں ایسے بھی تھے جو فوج کے گُلِ سرسبد سمجھے جاتے تھے۔ وُہ سپاہی جنھوں نے حد درجہ امتحانی حالات اور اجنبی مقامات میں حکومت برطانیہ کی خدمات انجام دی تھیں اور اُن کی وفاداری میں کبھی تزلزل نہ آیا تھا۔ قیدی ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور بلند آواز کے ساتھ جرنیل سے التجائیں کر رہے تھے کہ ہم پر رحم کیجیے اور ایسی ذلت خیز سزا نہ دیجیے۔ جب اُنھیں اُمید کی کوئی بھی کرن نظر نہ آئی تو وُہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بُرا بھلا کہنے لگے کہ کیوں چُپ چاپ کھڑے ہمیں ذلّت کا نشانہ بنتے دیکھ رہے ہو۔"

ظاہر ہے کہ گردوپیش توپیں لگی ہُوئی تھیں اور اُن کی امداد کے لیے ایک بھی حرکت سب کی یقینی موت کا باعث بن سکتی تھی۔ لہٰذا اگرچہ دلوں میں غیظ و غضب کا

طوفان متلاطم تھا، تاہم صبر وضبط کے سوا چارہ نہ تھا۔ ذمہ دار انگریزوں نے بھی اعتراف کیا ہے کہ یہ فعل سراسر احمقانہ تھا اور اِس درجہ احمقانہ جو تصور میں نہیں آسکتا۔" [1]

موصوف نے اُس جرنیل کے اِسی احمقانہ فعل کے بارے میں فارسٹ جلد اول صفحہ ۳۴ کے حوالے سے اُس وقت کے انگریز گورنر جنرل کے تاثرات یُوں پیش کیے ہیں:

> "آدمیوں کو پریڈ میں بیڑیاں پہنانا جس میں کئی گھنٹے صرف ہُوئے اور اُن لوگوں کی موجودگی میں سب کچھ کرنا جن میں سے بہتیروں کی طبیعتیں برگشتہ تھیں اور وُہ کارتوسوں کی داستان کو درست سمجھتے تھے، یقین ہے کہ اِس سے پریڈ کے دِل پر سخت ضرب لگی ہوگی۔ فوج کے مزاج اور اُن لوگوں کے جُرم کو پیشِ نظر رکھتے ہُوئے اُنھیں ایسی رسم کی بجا آوری کے بعد محض دیسی گارد کی حفاظت میں جیل بھیجنا ناقابلِ تصور حماقت تھی۔" [2]

یہ ہیں گورنر جنرل کے تاثرات۔ جب حکومت ایسی عیّار اور ظالم ہو تو لاوا کیوں نہ پکتا۔ میرٹھ چھاؤنی میں مذکورہ برطانوی جرنیل نے فوجیوں پر وُہ قیامت خیز ظلم ڈھایا کہ مظلوموں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ ابتدا میرٹھ چھاؤنی سے ہُوئی۔ ۱۰ مئی، ۱۸۵۷ء کو وہاں فوج نے بغاوت کر دی۔ انگریزوں کی فوج سے تصادم ہُوا۔ جنگل کی ہوا کی طرح یہ خبر دُوسری چھاؤنیوں میں پہنچی اور وہاں بھی دیسی اور پردیسی فوجیں باہم دست و گریباں ہُوئیں۔ فوجوں کی طرف دیکھ کر بھڑکے ہُوئے عوام بھی اپنے غصّے کی آگ کو ٹھنڈا کرنے اور ظالم حکمرانوں سے بدلہ لینے میں شریکِ کار ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ پُورا ملک میدانِ کارزار بن گیا۔ دیسی اور پردیسی، محکوم اور حاکم، مظلوم اور ظالم آپس میں اِس طرح ٹکرا گئے کہ ایک فریق کی مکمل تباہی یقینی تھی۔

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۶۸

[2] ایضاً: ص ۶۹

اِس مسلح اور بھرپور تصادم کا نتیجہ صاف نظر آ رہا تھا کہ پاک و ہند کی سرزمین پر حکومت کرنے کا انگریزی کارنامہ چند روز میں حرفِ غلط کی طرح مٹنے والا تھا کتنے ہی مقامات پر دیسی فوجوں کا قبضہ ہو گیا اور انگریزوں کا کسی شہر پر قبضہ باقی رہ جانا تو دُور کی بات ہے یہ معلوم ہونے لگا تھا کہ شاید ایک بھی انگریز واپس برطانیہ جانے کے لیے زندہ و سلامت نہ بچ سکے گا لیکن بعض ملک دشمن اور ملّت فروش عناصر نے تن من دھن کی بازی لگا کر اپنے آقاؤں کی بگڑی بنا دی، اُکھڑی ہوئی حکومت پھر جما دی اور اِس طرح ہزاروں برادرانِ جعفر و صادق نے اپنے عمل سے ملّت فروش ہونے پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی ۔

صُوبہ یوپی سے انگریزی اقتدار کا جنازہ سب سے پہلے نکالا گیا اور جگہ جگہ قومی پرچم لہرا دیے گئے، لیکن اُن حرماں نصیبوں کو کیا معلوم تھا کہ انگریزوں کے بعض بہی خواہ، چند سِکّوں پر بِک جانیوالے ملک دشمن اور ملّت فروش عناصر اِس خوشی کو پھر مایُوسی میں تبدیل کر دیں گے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک نوّے ۹۰ سال کے لیے انگریزوں کو پاک و ہند کی قسمت کے مالک بنائے رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے ۔ انگریزوں کی حمایت میں خود اپنے بھائیوں کا خون اِس جُرم کی پاداش میں اپنے ہاتھوں بہائیں گے کہ وُہ ایک غیر ملکی ظالم قوم کی غلامی سے آزاد ہونا چاہتے تھے ۔ میاں محمد شفیع نے صُوبہ یُوپی کے حالات کا نقشہ اپنے الفاظ میں یُوں کھینچا ہے :

> ”حقیقت یہ ہے کہ اِس ساری تحریک کا مرکز یُوپی تھا، جس کا کونا کونا سلگ اُٹھا، جس کے ایک ایک دِل سے انگریزوں کے خلاف لاوا پھُوٹ بہا۔ جس نے ملک اور دین کے لیے جان و مال، عزّت و آبرُو، محبّت، شفقت، دنیا طلبی، حرص، لالچ، مآل اندیشی، بہتری، بہبود، ہر چیز کی بازی لگا دی۔ نہ ماضی کی شان کو دیکھا، نہ مستقبل کی تباہی کو سوچا، نہ جاگیروں پر نظر گئی، نہ دولت کا خیال آیا، شہر شہر، قصبہ قصبہ، گاؤں گاؤں آزادی خواہی میں بھڑک گیا۔ آبادیوں اور جنگلوں میں آگ لگ گئی۔“ [1]

---

[1] محمد شفیع میاں : ۱۸۵۷ء ، مطبوعہ لاہور ، ص ۱۹۵

جنرل بخت خاں، خان بہادر خاں اور دیگر مجاہدین جنگِ آزادی نے جس دانش مندی اور جرأت سے بریلی شہر کو سب سے پہلے انگریزی تسلط سے آزاد کروایا، وہ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ بریلی کی اِس شاندار اور جرأت مندانہ معرکہ آرائی کے بارے میں میاں محمد شفیع صاحب نے اپنے تاثرات کا ان لفظوں میں اظہار کیا ہے:

"آفریں ہے روہیلکھنڈ کے اُن مجاہدین پر جنھوں نے بریلی کے میدان میں شجاعت اور قربانی کی مثال قائم کی تھی اور بتا دیا تھا کہ مسلمان بیچارگی میں شیرِ نیستاں اور پیلِ دماں ہے۔ جب وہ اللہ کے نام پر تلوار اُٹھاتا ہے تو وہ کائنات کو ٹھکرا کر موت سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ باطل کا ہجوم اُس کے ضمیر کو زیر نہیں کر سکتا۔ طاقت و جبروت کے سینے میں پنجے ڈال دیتا ہے۔"[1]

خان بہادر خاں صاحب نے بریلی کو فتح مندی سے ہمکنار کرنے کے بعد دیگر اضلاع اور خصوصاً دہلی میں بادشاہ کے پاس عرضداشت بھیجی۔ پاک و ہند کے باشندوں کو آزادی کی دولت حاصل کرنے کے لیے گرمایا اور سر توڑ کوشش کرنے کی ترغیب دلائی۔ میاں صاحب نے اس امر کا تذکرہ یوں کیا ہے:

"یہ ساری کوشش خان بہادر خاں اور اُس کے کارکنوں کی تھی کہ اِتنی آسانی سے بیک وقت روہیلکھنڈ کا صُوبہ آزاد ہو گیا۔ پھر اُس نے خود ایک عرضداشت بادشاہ کے پاس اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجی اور روہیلکھنڈ کے تمام اضلاع میں بھی شائع کی: "ہندوستان کے رہنے والو! بڑے انتظار کے بعد ہماری آزادی واپس آگئی ہے۔ اب بتاؤ تم اِسے قبول کرتے ہو یا رد کرنا چاہتے ہو؟ تم اِس مبارک موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے یا اپنے ہاتھوں سے دے دینے پر تیار ہو اور فائدے کے خواہشمند نہیں؟"[2]

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۹۷

[2] ایضاً: ص ۳۰۶

بریلی اور اُس کے گرد و نواح کو انگریزی تسلّط سے پاک کرنے کے بعد وہاں کا انتظام خان بہادر خاں کے سپرد کیا گیا اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا ممتاز مجاہد و مدبّر، جنرل بخت خاں عازم دہلی ہُوا۔ فوج، خزانہ اور سامانِ حرب و ضرب ساتھ تھا تاکہ بادشاہِ دہلی کی مدد کر کے مُغلیہ حکومت میں جان ڈالی جاتے۔ بریلی سے لاؤ لشکر سمیت بخت خاں کا جانا خود ظاہر کرتا ہے کہ انگریزی حکومت میں کسی جگہ روکنے یا ٹکرانے کی سکت نہیں تھی۔ انگریزی طاقت چھوٹے چھوٹے اجزاء میں منتشر ہوئی پڑی تھی۔ لیکن اِس مجاہدِ ملّت کی اُمنگیں اور آرزوئیں کامیاب ہوتے ہوتے ناکام ہو کر رہ گئیں۔ غلام رسُول مہر نے اِن حقائق کو یُوں بیان کیا ہے:

”جنرل بخت خاں اواخر جُون میں پہنچا۔ وُہ اپنے ساتھ منظم فوج لایا تھا اور اُسے چھ مہینے کی تنخواہ پہلے ادا کر دی تھی۔ ساز و سامان بھی لایا تھا اور روپیہ بھی خزانۂ سرکار میں جمع کیا تھا۔ اُس میں جنگی اور انتظامی دونوں قسم کی صلاحیتیں موجود تھیں، لیکن اُس کے پہنچنے سے پیشتر شہزادے تمام امور اپنے قبضے میں لے چکے تھے۔ بادشاہ نے اگرچہ بخت خاں کو پُورے اختیارات دے دیے تھے لیکن شہزادوں کو کب منظور تھا اور کوئی اور شخص دہلی میں مختار بن جائے۔ وُہ ہر کام میں روڑے اٹکاتے رہے یہاں تک کہ انتظام درست ہو ہی نہ سکا۔“[1]

جنرل بخت خاں کی قابلیت کو میاں محمد شفیع صاحب نے یُوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

”بخت خاں میں دو باتیں جمع تھیں، اوّل تو وہ روہیلہ تھا، جو شجاعت و جانبازی کا سبب ہے، پھر یہ کہ اُس میں بادشاہی خُون بھی تھا، جس نے تحمل، شائستگی اور مزید شرافت کی خُوبیوں سے آراستہ کر دیا تھا۔ باقی طبعی خوبیاں بھی اِس اچھے روہیلے میں کسی سے کم نہ تھیں ۔۔۔ انگریز نے اِس کی دانائی اور فوجی شعور دیکھ کر تمام دیسی توپ خانہ اُس کے ماتحت کر دیا۔ جس بٹری کا یہ سردار تھا وہ کارگزاری میں سب پر سبقت لے گئی تھی۔ غدر کے

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۲۱

قریب یہ لائق صوبیدار بدل کر اپنے باپ دادوں کے اصل وطن بریلی میں آ چکا تھا اور اس کی شہرت دُور دُور تک پہنچ چکی تھی۔ بادشاہ بھی اس سے بے خبر نہ تھا۔ ۳۱؍جون کو جب بریلی میں انگریزوں کا صفایا ہو گیا تو بخت خاں جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، سات ہزار باقاعدہ سوار اور پیدلوں کی رجمنٹیں اور کئی ہزار مجاہد لے کر مع سامانِ حرب ۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو دہلی پہنچا۔" [1]

مولانا احمد اللہ شہید مدراسی رحمۃ اللہ علیہ ایک متبحر عالمِ دین اور صاحبِ اجازت تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں آپ نے عدیم النظیر جنگی کارنامے سر انجام دیے۔ جس فنی مہارت کے ساتھ مولانا نے انگریزوں کے مایۂ ناز اور پختہ کار جرنیلوں کو پے در پے شکستیں دیں اور اُن کے جنگی منصوبوں کو خاک میں ملایا، وُہ تاریخِ عالم کے جنگ آزما جرنیلوں کی تاریخ کا ایک سنہرا اور تابناک ورق ہے۔ اِس سلسلے میں میاں محمد شفیع یُوں رقمطراز ہیں:

> "۷؍مئی ۱۸۵۸ء کو خان بہادر خاں اور باقی لیڈر بریلی سے نکل گئے (کیوں کہ انگریزوں نے حریت پسندوں کو شکست دے کر دوبارہ بریلی پر قبضہ کر لیا تھا) مولوی احمد اللہ شہید پھر شاہجہان پور پہنچے۔ اِن کی تیز نظر نے بھانپ لیا تھا کہ انگریز وہاں تھوڑی سی فوج چھوڑ کر بریلی پر آئے ہیں۔ اُنھوں نے وہاں پہنچ کر اُس تھوڑی سی فوج کو مار بھگایا اور بریلی کی شکست کی تلافی کر لی۔ جنرل ہیل کو سخت ہزیمت دی ۔ ۔ ۔ ۔ اب لڑائی کا رنگ یہ ہو گیا کہ سر کومن اودھ کو فتح کرتا تھا تو مولوی صاحب روہیلکھنڈ پر قبضہ جما لیتے تھے۔ وُہ روہیلکھنڈ (بریلی) کو لیتا تھا تو یہ اودھ کو فتح کر لیتے تھے۔ اِس پریشانی میں انگریز نے طے کیا کہ اِس آہنی ہاتھ کو شل کر دینا چاہیے۔ اِس بے مثل مجاہد سے جب تک پیچھا نہ چھڑایا جائے گا اُس وقت تک ساری کوشش بیکار ہے، اِس کے سوا اور کوئی ایسا خطرہ نہیں، پھر بھی لڑائی میں قابو

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۳۱۰

> پانا یا اِس کو زیر کرنا مشکل تھا، اِس لیے سوچ لیا کہ یہ کام غدار اچھی طرح کر سکیں گے۔"[1]

انگریزوں نے "پاون" نامی ایک ہندو راجہ سے ساز باز کی جس نے پچاس ہزار روپے انعام پانے کے بدلے، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ہیرو اور حریت پسندوں کے عدیم النظیر جرنیل کو شہید کر کے، پاک و ہند کی غلامی کے محضر پر دستخط کر دیے۔ میاں صاحب نے مولانا احمد اللہ شہید رحمۃ اللہ علیہ کو اُن کے محیر العقول کارناموں کے پیشِ نظر یُوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

> "آخر کار قوم اور دین کا سب سے بڑا مجاہد، ملک کی آزادی کا عظیم ترین حامی، شجاعت کا شیرِ نیستاں، اُس آخری وقت کا سہارا، عقل و تدبر کا نمونہ، جنگی چالوں میں انگریز کے جگر کو پگھلانے والا، عزم و استقلال کی چٹان، اسلام اور مسلمانوں کا فخر، انقلابیوں کے ٹوٹے ہُوئے دل کی جان، آزادی خواہوں کی امیدوں کا روشن آفتاب، اِس طرح اپنے ہی ایک غدّار کے ہاتھ سے موت کی وادی میں غروب ہو گیا۔"[2]

مولانا احمد اللہ شہید نے شاہجہان پور کے معرکے میں جس فراست، تجربہ کاری اور عزم و استقلال سے انگریزوں کے ایک مایۂ ناز سپہ سالار "جنرل ہیل" کو شکست فاش دی اور اُس کے سارے جنگی منصوبوں کو خاک میں ملایا تھا، مولانا کی اِس مہارت اور نرالی کارکردگی پر میلیسن کے تبصرے کو میاں صاحب نے یُوں نقل کیا ہے:

> "مولوی کا یہ حملہ بالکل اچھوتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی یورپ کا جنرل لڑ رہا ہے۔"[3]

مولانا احمد اللہ شہید کی شہادت کا علم ہونے پر جوشِ مسرت میں "ہومز" نے اپنے خیالات کا

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۸

[2] ایضاً: ص ۲۵۹

[3] ایضاً، ص ۲۰۸

یُوں اظہار کیا:

”شمالی ہندوستان میں ہمارا سب سے بڑا دشمن، سب سے خطرناک انقلابی ختم ہو گیا ہے۔“ [1]

اودھ کے علاقے میں مدتوں لڑائی کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن وہاں جس استقامت اور پامردی کے ساتھ حریت پسندوں نے آزادی کی دولت حاصل کرنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگائی اور ہر قسم کی تکالیف برداشت کر کے جنگ جاری رکھی، اُس پر خود میلیسن نے یُوں تبصرہ کیا تھا:

”اودھ کے لوگ اپنے سپاہی بھائیوں کے شریکِ کار ہو گئے اور ملک کی آزادی کے لیے جانیں دے دیں۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اُنھوں نے کس عزم و ارادہ اور سرفروشی کے ساتھ ہم سے جنگ آزمائی کی، اصل یہ ہے کہ ہندوستان کے کسی حصے میں ایسی طویل اور استقامت آمیز جنگ نہیں ہُوئی۔ اِن تمام معرکوں میں اُس ظلم کی داستان (واجد علی شاہ کی معزولی) آگ لگاتی رہی جو ہم نے ۱۸۵۶ء میں کیا تھا۔ یہی خیال، یہی رُوح تھی جس نے اُن کے دِلوں کو فولاد سے زیادہ مضبوط کر دیا تھا۔۔۔۔ شکستوں پر بھی اُن کا یہ حال تھا کہ بھُوکوں مر جانے کو ہماری اطاعت پر ترجیح دیتے تھے اور اُن تمام طبقوں نے اُس آخری وقت میں خاموشی اختیار کی جب دنیا میں اُن کے لیے کوئی چارہ نہ رہا۔“ [2]

اودھ کے معزول حکمران واجد علی شاہ کی بیگم، حضرت محل، جس نے میدانِ جنگ تو کیا زندگی بھر محل سے باہر کی فضا بھی نہیں دیکھی تھی، چونکہ برطانوی مظالم سے سینہ فگار تھی، اِسی لیے جب اِس خاتون نے شمعِ حریت کے پروانوں کو سینہ سپر دیکھا، تو خاموش نہ بیٹھ سکی، برجیس قدر کی سرپرست بن کر، رعایا میں نئی رُوح بن کر میدانِ کارزار میں انگریزی فوجوں سے

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۸

[2] ایضاً: ص ۲۸۶

مصروفِ پیکار ہو گئی۔ میاں صاحب نے یُوں اِس امر کی وضاحت کی ہے:

”خیر اِس بادشاہ کی کوتاہیوں کو اُس کی ایک بیگم، حضرت محل نے اِس طرح پُورا کیا کہ انتقام کی آگ میں اگر دشمنوں کو نہ جلا سکی تو کیا، خود اُس میں جل کر قوم کو سُرخرو کر گئی اور جو کچھ بادشاہ کو کرنا چاہیے تھا، اُس کی لکھنؤ میں رہ جانے والی اِس بیگم نے ہر طرح کی قربانی دے کر حق ادا کیا، حالانکہ لکشمی بائی (جھانسی کی رانی) کی طرح نہ آزاد فضا کی پلی ہُوئی تھی، نہ اُس نے تیر و تفنگ کا استعمال سیکھا تھا، نہ مردوں کے دوش بدوش رہی تھی، وُہ تو شاہی محلوں کی پردہ نشین خاتون تھی...

اِس لائق بیگم نے اپنے بیٹے برجیس قدر کی سرپرستی لے کر محبوب علی کو نیابت دی اور سب سے پہلے بادشاہِ دہلی کو آزادیِ اودھ کی مبارک باد دے کر علاقے کے زمینداروں، جاگیرداروں، نوابوں اور راجاؤں کو خطوط لکھے۔ سب نے اطاعت میں تلوار اٹھا لی اور سینہ سپر ہو گئے۔“ [1]

تیموری خون کا امین، شہزادہ فیروز شاہ اِن انتہائی بگڑے ہُوئے اور ناسازگار حالات میں بابر اور اورنگ زیب کی یادگار ثابت ہُوا۔ دہلی سے گوالیار تک کے اکثر معرکوں میں حریت پسندوں کی مختلف جماعتوں میں شامل ہو کر مردانہ وار لڑتا اور شمعِ حریت کے پروانوں کو غاصب انگریزوں سے لڑاتا رہا۔ اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر گیا کہ بابر کی شجاعت اور اورنگ زیب کی ایمانی فراست کا کم از کم ایک امین، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وقت مُغلیہ خاندان میں ضرور موجود تھا۔ اِس عظیم شہزادے کو میاں صاحب نے یُوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

”جس وقت غدر ہُوا، اُس سے پہلے ہی فیروز شاہ حج کے لیے گیا ہوا تھا۔ جب واپس آیا تو ساحل پر قدم رکھتے ہی انقلاب کی خبر کانوں میں پڑی اور یہ جوانمرد شہزادہ دہلی پہنچ کر ہنگامۂ دار و گیر میں کُود پڑا، دادِ شجاعت دی اور جب دہلی پر انگریز قابض ہو گئے تو نہایت احتیاط کے ساتھ مشرقی دروازے سے

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷، مطبوعہ لاہور، ص ۳۱۶

نکل کر بریلی کی طرف آ گیا۔ بریلی کی جنگ کا خونریز معرکہ ختم ہُوا تو راؤ صاحب کے پاس جا پہنچا اور جب تانتیا توپی ناگپور سے دوبارہ گوالیار آیا ہے تو یہ اور نواب باندہ بھی اُس سے جنگلوں میں آ ملے تھے۔ وہ (تانتیا توپی) بھی گرفتار ہو کر پھانسی چڑھ گیا تو فیروز شاہ کچھ دنوں اِدھر اُدھر بھٹک بھٹکا کر خوش قسمتی یا ہوشیاری سے بچ نکلا اور مکے چلا گیا۔ کہتے ہیں کہ وہیں باقی زندگی فقیرانہ حالت میں گزار کر دُنیا کو رخصت کیا۔ رحمت ہو اُس باہمت شہزادے پر۔" [1]

جھانسی کی رانی، لکشمی بائی نے، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں عورت ہونے کے باوجود جس طرح مردانہ وار حصّہ لیا اور اپنی حریت پسندی کا لوہا منوایا اُس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے:

> "لکشمی بائی بھی حضرت محل کی طرح محل کی راحتوں کو چھوڑ کر باہر نکل آئی، ورنہ انگریز کے قدموں پر سر جھکا دیتی تو اُس کی زندگی کی راحتوں میں ذرا سا بھی تنک نہ آتا۔ اُس نے جھانسی سے غاصب انگریز کو نکال دیا۔ اُس کے انقلابیوں نے ساگر، نوگاؤں، باندہ، بانا پور، شاہ گڑھ اور کرکی سے انگریزوں کا نام نشان مٹا دیا۔ رانی نے اِس کے بعد امن و امان اور انتظام کی وہ لیاقت دکھائی کہ لوگ حیران رہ گئے۔" [2]

تانتیا توپی برہمن نے جس شجاعت اور جوانمردی سے اِس جنگِ آزادی میں حصّہ لیا وہ بھی حریت پسندوں کی تاریخ میں ایک امتیازی مقام رکھتا ہے۔ نامساعد حالات میں بھی مختلف انقلابی لیڈروں کے ساتھ مل کر اور تنہا انگریزوں سے اِس طرح مقابلہ کرتا رہا کہ ستم پیشہ انگریزوں کو ناک چنے چبوا دیے۔ مولانا احمد اللہ شہید کے بعد تانتیا توپی کی رزم آرائیاں، فنونِ حرب و ضرب کے لحاظ سے کسی بھی دُوسرے انقلابی لیڈر سے کم حیرت انگیز نہیں۔ اِس محبِ وطن برہمن کے کارناموں کا کرشمہ ملاحظہ ہو:

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۳۱۹

[2] ایضاً: ص ۲۷۴

> "جنرل ونڈھم جس نے یورپ میں اپنی لیاقت دکھائی تھی، اُس وقت کان پور کی فوجوں کا کمانڈر تھا۔ تانتیا برہمن نے جو کبھی نانا صاحب کا کلرک اور اب جنرل تھا، سوچ لیا کہ اب کان پور میں تھوڑی سی فوج ہے، جنرل ونڈھم پر ضرب لگانی چاہیے اور اپنی بے قاعدہ فوج لے کر جنرل ونڈھم کے مقابلے پر آگیا...... باقاعدہ سخت گولہ باری شروع ہُوئی۔ تانتیا نے اپنی فوج کو نیم دائرے کی شکل میں ترتیب دے کر بڑھنا شروع کیا۔ ونڈھم نے حلقہ توڑنے کی کوشش کی لیکن تانتیا کی توپوں نے معذور کر دیا...... تانتیا کے دائرے نے گرفت کو زیادہ مضبوط کر لیا۔ شام کے چھ بجے تک انگریزی فوج نے پُورے طور پر حوصلہ ہار دیا اور بہت سا سامانِ جنگ انقلابیوں کے ہاتھ آیا...... دن نکلتے ہی لڑائی شروع ہوگئی اور انقلابیوں نے دونوں پہلوؤں پر گولہ باری شروع کر دی۔ دایاں بازو بالکل اُڑا دیا۔ برگیڈیر ولسن، کیپٹن ایم کری مارفی، میجر سٹرلنگ، میجر گبن سب مارے گئے۔ تیسرے دن انقلابیوں کو مکمل فتح حاصل ہُوئی۔ انگریزی فوج بالکل تباہ ہوگئی۔ اُس دن تانتیا کا پُورے کانپور پر قبضہ ہو گیا۔"[1]

متعدد بار حوصلہ شکن حالات سے بھی دوچار ہونا پڑا کیونکہ غداروں کی سرگرمیوں کے باعث ملکی حالات میں نشیب و فراز آتے رہے لیکن واہ رے بہادر برہمن! جو جذبۂ حب الوطنی سے سرشار اور آزادیِ وطن کا والہانہ طلبگار تھا، بے سروسامانی کی حالت میں بھی اُس کے عزائم متزلزل نہ ہُوئے۔ مثلاً:

> "تانتیا رانی جھانسی کے ساتھ مل کر انگریزوں سے لڑتا رہا اور جب یہ بہادر رانی جنگِ آزادی میں ماری گئی تو اکیلا رہ گیا اور نانا صاحب سے بھی ساتھ چھوٹ گیا۔ نہ کوئی فوج تھی، نہ سامان تھا، پھر بھی پوری ہمت سے راؤ صاحب رپیشوا کو ساتھ لے کر سر متھورا (متوسط ہندوستان) میں جا بیٹھا اور غداروں کو

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۷۰

لُوٹ کر کچھ سامان مہیا کر لیا۔“[1]

تانتیا، راؤ اور شہزادہ فیروز شاہ، جنھوں نے اپنی حریت پسندی اور جوانمردی کا زندہ ثبوت اپنے عمل سے گھر میں بیٹھ کر نہیں، موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مہیا کر دیا تھا، اُن بہادروں کا انجام ملاحظہ ہو:

> ”۲۵ دسمبر، ۱۸۵۸ء کی رات کو دونوں نے میجر لاک کی فوج پر سخت شبخون مارا اور بالکل تباہ کر کے جنگل سے نکل گئے۔ شہزادہ فیروز شاہ بھی اپنی فوجوں سے آملا اور یہ سب اندر گڑھ میں جمع ہو گئے۔ انگریزوں نے ہر طرف سے گھیرا ڈال لیا۔۔۔ جب یہ لوگ جنگل میں چھپے ہوئے تھے تو انگریز عیّار نے مان سنگھ سے جو اِس تمام دوڑ دھوپ میں اُس (تانتیا) کا ساتھی تھا سازش کر لی اور اُس غدار نے جنگِ آزادی کے اِس ہیرو کو گرفتار کرا دیا۔ ۷ اپریل کو تانتیا انگریزوں کے ہاتھ میں آگیا۔ تین دن مقدمے کی کارروائی ہوئی، پھر ۱۸ اپریل ۱۸۵۸ء کو پھانسی دے دی گئی۔ آخر وقت جب یہ بہادر تختے کے پاس پہنچا اور پھانسی دینے والے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لیے بڑھے تو اُس نے مسکرا کر کہا: ”اِس تکلّف کی کیا ضرورت ہے؟“ اُچھل کر خود پھندا گلے میں ڈال لیا اور لٹک گیا۔ راؤ صاحب ۲۱ اگست کو جنگلوں سے گرفتار ہوا اور پھانسی دی گئی۔ شہزادہ فیروز شاہ بچ کر نکل گیا اور مکّے جا پہنچا۔“[2]

جب انگریزوں نے اپنے زرخرید غلاموں اور حلیفوں یعنی ملک دشمنوں اور ملّت فروشوں کے سہارے انقلابیوں کا زور توڑ دیا اور تقریباً تمام بڑے بڑے شہروں پر دوبارہ قبضہ کر لیا، تو انقلابیوں کے چھوٹے چھوٹے باقی ماندہ جتھے ایک جگہ جمع ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ انگریزوں نے اُنھیں پسپا کرتے ہوئے نیپال کی ترائی میں دھکیل دیا۔ اُن بہادروں نے اِس

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷، مطبوعہ لاہور، ص ۲۷۱

[2] ایضاً: ص ۲۷۳

بیچارگی اور کس مپرسی کی حالت میں بھی اپنے خون سے مادرِ وطن کی سرزمین کو لالہ زار تو کر دیا لیکن برطانوی لٹیروں کے سامنے گردن نہ جھکائی۔ میاں صاحب اِس امر کی یہ وضاحت فرماتے ہیں:

> "نیپال کی ترائی اُن بہادروں کے خُون سے رنگین ہوگئی، جنھوں نے اپنے ملک کی آزادی کے لیے ہر عزیز سے عزیز چیز کی بازی لگا کر ڈھائی سال تک انگریزوں کی طاقت کو ہلکان کیا تھا۔ بے سروسامانی اور بدنظمی میں انتہائی معذوری، مجبوری اور بے بسی میں بھی اپنے ملک کی عزّت کو بلند رکھ کر جانیں قربان کیں۔ ہر طرف سے مایُوسی کے بادل سر پہ منڈلاتے دیکھے۔ اہلِ ملک کی غدّاری سے سارے سہارے ٹوٹ گئے۔ موت کے سوا کوئی آس نگاہوں کے سامنے نہ رہی، پھر بھی تلوار ہاتھ سے نہ رکھی اور غاصب، ظالم انگریز کے سامنے سر نہ جھکایا۔ یہاں تک کہ ہمالیہ کے دامن میں آخری حملے کر کے خون میں نہائے اور زمین پر گر کر آنے والی نسلوں کو سعیِ آزادی کا پیغام دے گئے۔"[1]

قارئین کرام! یہ تھا ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی کا ایک رُخ۔ اب اِسی تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ فرما لیا جائے تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ ۱۸۵۷ء میں لاکھوں حریت پسندوں کا خون کن منحوس چہروں کی وجہ سے رائیگاں گیا۔ وُہ کون سے وطن دشمن اور ملت فروش عناصر تھے جن کے باعث مٹھی بھر پردیسی پاک و ہند کے کروڑوں باشندوں کو دوبارہ طاقت کے ذریعے غلام بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ مرزا الٰہی بخش کا کارنامہ ملاحظہ ہو:

> "یہ (مرزا الٰہی بخش) شاہی خاندان کا بوڑھا، سمجھ دار آدمی، بادشاہ کا رشتے میں چچا اور سمدھی تھا۔ بہادر شاہ اِس سے تمام معاملات میں مشورہ لیتا تھا۔ اِس ظالم کو ملک و مذہب سے تو کیا ہمدردی ہوتی، خاندان کی بہتری سے بھی بے بہرہ نکلا۔ انگریزوں کا پٹھو بن کر ٹمٹماتا دیا بھی بُجھا دیا۔ ذرا ذرا سی خبریں پہنچائیں، زینت محل کو سبز باغ دکھا کر ہم رائے کر لیا۔ حکیم احسن اللہ خاں پر بھی ڈورے

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۸۶

ڈالے اور انقلابیوں کو بدنام کرتا رہا۔ ہر معاملے میں اُنھیں غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کی تاکہ اُس کا انعام نہ مارا جائے۔

سب سے بڑا کارنامہ جو اُس نے کیا وُہ یہ تھا کہ بادشاہ کو بخت خاں کے ساتھ جانے سے روکا، پھر اپنی زندگی میں بادشاہ کو پکڑوا دیا اور شہزادوں کی گرفتاری کے وقت بھی پہنچ کر اُن کو تسلّیاں دیں اور ذبح کرا دیا۔ چالاک اِتنا تھا کہ سب پر شبہے کیے گئے اور گرفتیں ہُوئیں اور شور مچے لیکن یہ ہر طرح محفوظ رہا۔ نہایت چرب زبان اور سُلجھا ہوا تھا۔ ایک اور ظلم اِس نے یہ کیا تھا کہ جمنا کا پُل تڑوا دیا، جس کی وجہ سے انقلابیوں کی مشرقی رسد رسانی بند ہو گئی۔ انگریز نے بھی پیٹ بھر کے انعام دیے۔ دربار میں پہلی کرسی مقرر ہُوئی۔ ۲۲۸۳۰ روپے سالانہ پنشن دی جو نسل در نسل تھی۔ بیوی کی الگ، لڑکوں اور لڑکیوں کی الگ، عزیزوں کی ان کے علاوہ۔ بعد میں مختلف تقریبوں پر اضافے ہوتے رہے۔ یہ ننگِ خلف اپنے خاندان کی درگاہ حضرت سلطان جی میں رہا اور ۱۸۷۵ء میں مرا۔"[1]

بہادر شاہ ظفر کے معتمد اور مشیر یعنی حکیم احسن اللہ خاں کی محسن کشی اور ملک دشمنی ملاحظہ ہو:

> "بہت سمجھدار، تعلیم یافتہ اور معاملات میں بصیرت رکھنے والا آدمی تھا لیکن جس پر رجب علی اور الٰہی بخش کا جادو چلے، وُہ غداری نہ کرے یہ کیونکر ہو سکتا تھا؟ افسوس تو یہ ہے کہ جس پر بادشاہ اور عوام کو پُورا اعتماد ہو، عزت سے وقت بھی گزر رہا ہو، ہر طرح کی دلجوئی بھی ہوتی ہو، وُہ ملک اور قوم اور اپنے ولی نعمت سے بے وفائی برتے؟ ..... بادشاہ کے خلاف گواہی دی، اِس سے زیادہ اُور کیا کرتا؟"[2]

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷، مطبوعہ لاہور، ص ۳۲۵

[2] ایضاً: ص ۳۲۷

مولوی ذکاء اللہ صاحب نے منشی رجب علی جگرانوی کے بارے میں اُس کی ملّت فروشی اور انگریز دوستی کے پیشِ نظر، یُوں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

"سرکار انگریزی کے جو ایجنٹ اِس مخبری کے لیے کہ دشمن کیا حرکتیں کرتا ہے دہلی میں رہتے تھے اُن سب کے سردار، منشی رجب علی تھے۔ جاسوسی کے لیے جو اعلیٰ درجے کی لیاقتیں چاہییں وُہ اُن میں تھیں۔ انگریز منتظموں کو اِن پر پُورا اعتماد تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے کارفرماؤں کے ساتھ راست باز رہے، سچی بات دریافت کر لینے کی عجیب قابلیت و استعداد اور فراست و کیاست رکھتے تھے۔"[1]

موصوف کی ملّت فروشی اور انگریزوں کا ایجنٹ ہونے پر میاں صاحب نے یُوں تبصرہ کیا ہے:

"یہ مولوی یا منشی، انگریز کا ارسطو جاہ، جسے علمِ ارسطو کی ہوا بھی نہ لگی تھی، جگراؤں ضلع لدھیانے کا رہنے والا تھا۔ دہلی کالج کا ذہین طالب علم، ملک و ملّت کے درد سے بالکل بیگانہ تھا..... والسرائے کا میر منشی بھی رہا۔ بڑا کام یہ کیا کہ دہلی کے بڑے قوم فروش الٰہی بخش وغیرہ کو اپنے ساتھ ملا لیا اور ایسے کام کرائے کہ رہتی دنیا تک دونوں کی پیشانی پر کلنگ کے ٹیکے ثبت رہیں گے۔"[2]

۱۸۵۷ء کی اِس جنگِ آزادی کو ناکام بنانے اور مُٹھی بھر انگریزوں کو مزید نوّے سال کے لیے اپنے ملک و قوم پر مسلّط کر لینے میں کون کون سی طاقتوں کا ہاتھ تھا اُن کی نشان دہی یُوں کی گئی ہے:

"فرنگی کی یہی وُہ کامیابی تھی جس نے ملک کی آزادی کو سَو سال پیچھے پھینک دیا۔ ہندوستانی سپاہی نہ ملتے، فوجیں مہیّا نہ ہوتیں، تو اُس کا تدبر کام نہ آتا، نہ ساز و سامان مدد دیتا، بیک بینی و دوگوش اپنے جزیرے میں جا بیٹھتا۔ وُہ جو شہری غدار اور خانسامے بَیرے اُسے چمٹے ہُوئے تھے کب تک بچا لیتے؛

---

[1] ذکاء اللہ مولوی: عروج عہد انگلشیہ، ص ۶۴۰

[2] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۳۲۶

وہ نکال دیا گیا تھا اور نکال دیا جاتا۔

بھلا ہو میاں والی اور عیسیٰ خیلی والوں کا، بھلا ہو پنجاب کے پھلنے پھولنے والے زمینداروں کا، بھلا ہو ریاست ہائے پھلکیاں کا اور سب سے زیادہ بھلا ہو سکھ قوم کا، جس نے صرف روٹی کے لیے انگریز کی غلامی کا پٹّا گلے میں ڈال کر بڑی خوشی اور انتہائی مسرت و شادمانی کے ساتھ اُس کی جڑیں پاتال تک پہنچا دیں اور ملک کے آزادی خواہوں کے سینے چھلنی کر کے شہروں، قصبوں اور گاؤں کو لوٹ کر ہندوستان (پاک و ہند) کی پیشانی پر ہمیشہ کے لیے کلنگ کا ٹیکہ لگا دیا"۔[1]

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں صوبہ پنجاب نے جس طرح حصہ لیا اُس کے متعلق سر جان لارنس کی رپورٹ کا ایک اقتباس اور میاں صاحب کے اپنے تاثرات اور تحقیق ملاحظہ ہو:

"انگریز یُوپی میں بے دست و پا ہو گیا تھا لیکن پنجاب اُس کے اثر میں تھا۔ پنجاب کے سکھ اور مسلمان فوج میں بھرتی کر لیے گئے تھے اور اُنھیں کے ذریعے وہاں کے جن اضلاع میں ہندوستانی فوجوں نے بغاوت کی اُن کو سختی سے "تباہ" کر دیا گیا۔ اب دہلی کا مرحلہ درپیش تھا اور اُس کے بعد ہندوستان کے اکثر حصوں میں اِس آگ (تحریکِ آزادی) کو بجھانا تھا۔ بڑے پیمانے پر بھرتی شروع کی گئی اور لوگ بہت خوشی کے ساتھ انگریز کے دست و بازو بن کر ہندوستان کی طرف چل پڑے۔ اُن کی کیا نیت اور کیا ارادے تھے، کس خیال پر اِتنی آسانی سے شرکت کی؟ سر جان لارنس کی زبانی سُنیے، وہ غدر کی رپورٹ میں لکھتا ہے: "پنجابی ہمارے ساتھ ہو گئے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ہندوستانیوں سے نفرت کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کو اپنی برتری کا احساس تھا اور پنجابی خیال کرتے تھے کہ ہم اُن سے بہتر ثابت ہوں گے۔ اِسی بنا پر خیال کرتے تھے

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۲۹۷

> کہ جس روٹی کو ہندوستانیوں نے ٹھکرا دیا ہے، وہ اب ہمارے حصّے میں آئیگی، اُس کے ہم مالک بنیں گے۔“ [1]

جنگِ آزادی، ۱۸۵۷ء میں صوبہ پنجاب کے مسلمانوں اور سِکھوں نے حریت پسندوں کا ساتھ دے کر انگریز کی غلامی کا جُوا اتار پھینکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اِس کے برعکس جب اکثر شہروں اور علاقوں سے برٹش اقتدار کا جنازہ نکل چکا تھا، تو صوبہ پنجاب کے باشندوں نے چند سکوں اور انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر برطانوی ڈاکوؤں کے دست و بازو بن کر حریت پسندوں کو کچلنے اور انگریزی اقتدار دوبارہ بحال کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اِس صُوبے کا کارنامہ یُوں بیان کیا گیا ہے:

> ”پنجاب کی عدم شرکت کا ایک عذر یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ سِکھوں کے ظلم نے اِس قابل نہ چھوڑا تھا کہ بغاوت میں حصّہ لیتے۔ اُن کا ملکی و قومی شعور مُردہ کر دیا تھا۔ شاید یہ صحیح ہو، کیونکہ دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ جب انگریز نے بھرتی کی تحریک شروع کی تو سب لبیک کہہ کر دوڑ پڑے تاکہ لُوٹ میں شریک ہو کر ہندوستانیوں سے بدلہ لیں۔ پھر انگریز کے دست بدست اُن کے سب مظالم میں حصّہ لیا اور کسی بُرے سے بُرے فعل سے بھی اجتناب نہ کیا اور نہ شرم محسوس کی اور نہ دِل میں یہ خیال گزرا کہ اُن بھائیوں پر یہ سب کچھ کر رہے ہیں جو اپنے لیے نہیں، اپنی قوم اور مذہب کے لیے ایک غیر قوم سے لڑ رہے ہیں۔“ [2]

پنجاب کے مشہور ٹوانہ خاندان نے جنگِ آزادی، ۱۸۵۷ء میں خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا پارٹ ادا کیا تھا۔ لیکن میاں محمد شفیع نے اپنی ذاتی تحقیق کی بنا پر یہ رائے پیش کی ہے:

> ”مئی، ۱۸۵۷ء میں تین سو سواروں کا دستہ بھرتی کر کے جہلم میں پلٹن نمبر ۱۴

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۹۸

[2] ایضاً: ص ۱۹۹

کے باغیوں سے لڑا پھر ظالم کوپر کے ساتھ مل کر نمبر ۲۶ کے باغیوں سے چالبازی کی اور اُن کو گرفتار کرایا اور اجنالے کا کنواں آزادی خواہوں کی لاشوں سے پاٹنے میں اِس کا ہاتھ تھا۔ اِس کے بعد مختلف علاقوں میں بہت کارگزاریاں کیں۔ تانتیا کے مقابلے میں کالپی کا میدان انقلابیوں کے خون سے رنگین کیا اور وہاں سے جنرل نیپئر کے ساتھ وسطی ہند کے جھگڑے نمٹائے۔

پنجاب میں واپس آکر خان بہادری کا خطاب، چار سو اَسی ۴۸۰ روپے کی پنشن اور بارہ سو ۱۲۰۰ روپے سالانہ کی جاگیر ملی۔ اپنی محنت اور جستجو سے بہت سی زمین حاصل کر کے دریائے جہلم سے نہر تک کھدوائی۔ گھوڑوں کی نسل کو قابلِ رشک ترقی دی۔ خاندانی جھگڑوں سے الگ تھلگ رہا، عزت پائی اور اے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا اور آخر میں تمام جائداد ملا کر ایک اچھی خاصی ریاست ہوگئی اور صرف تدبیر سے شاہ پور کا نہیں بلکہ پنجاب کا ایک رئیسِ اعظم بن گیا۔ بارے محبّانِ وطن اور جاں نثارانِ دین و ملّت کے خون کی سیاہی کہاں جاسکتی ہے؟"[1]

لاہور کے قزلباش خاندان کے بارے میں بھی میاں صاحب کی ایسی ہی تحقیق ہے۔ معلوم نہیں اُن کے پاس کیسے دلائل تھے؟ اُن دلائل میں کتنا وزن ہے؟ بہر حال اُنھوں نے لکھا ہے:

"علی رضا خاں قزلباش۔ اِس نے غدر میں دہلی کے قریب ایک رسالہ بھرتی کیا اور جائداد بیچ کر خرچ بھرا۔ اُس میں اِس کے چاروں بھتیجے (بلکہ پانچوں) عبداللہ خاں، محمد حسن خاں، محمد زمان خاں، غلام حسین خاں اور شیر محمد خاں بھی تھے۔ اِس فوج نے نکلسن کی نمایاں خدمات انجام دیں اور بہت شجاعت دکھائی۔ محمد رضا خاں اِس کا بھائی بہت دلیر تھا۔ مالوے اور شمس آباد میں

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷، مطبوعہ لاہور، ص ۳۳۰۔

دو مرتبہ زخمی ہُوا اور دو گھوڑے مرے۔ سخت معرکوں میں بے محابا گھُس جاتا تھا، اِس لیے "آرڈر آف میرٹ" حاصل کیا۔ سردار بہادری کا خطاب اور دو سَو ۲۰۰ روپے پنشن علی الدوام ملی۔ علی رضا خاں کو بہڑائچ اور اودھ میں تعلقداری ملی، خان بہادر کا خطاب پایا اور تمام بھائیوں کو خان بہادری کے خطاب ملے۔ ۱۸۶۴ء میں علی رضا خاں کو نوابی کی عزت بخشی گئی۔ اِس کے بڑے بیٹے نوازش علی خاں کو مختلف اعزاز بخشے گئے اور باپ کے بعد نوابی کا خطاب ملا۔ دُوسرے بیٹے ناصر علی خاں کو بعد میں اسسٹنٹ کمشنر بنایا گیا۔ نوازش علی خاں نے خدمتِ خلق سے بڑی عزت پائی اور لاہور کا سب سے بڑا آدمی ہُوا، بلکہ پنجاب کے چوٹی کے رئیسوں میں شمار ہونے لگا۔ سی۔ آئی۔ ای کا خطاب بھی پایا۔ بعد میں چھوٹا بھائی ناصرِ علی خاں نواب ہوا اور عزت سے کارگزاریاں دکھا کر ۱۸۹۶ء میں مرا۔ فتح علی خاں نے اُس کی جگہ لی، جو بھتیجا تھا۔ یہ نواب بھی اطاعت و فرماں برداری سے انگریز کے نزدیک سربلند و باوقار رہا۔"[1]

شاید ایسے ہی کارہائے نمایاں سے متاثر ہو کر دیوبندیوں کے امیرِ شریعت اور شعلہ بیان خطیب یعنی مولوی عطاءُ اللہ شاہ بخاری (المتوفی ۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۱ء) نے بقول علّامہ خالد محمود صاحب سرزمینِ پنجاب کی یُوں منظوم تعریف فرمائی ہے:

ندیدم کشورے مردود و مرتاب　　بہ شوی ہائے کفر آباد پنجاب
چہ ملکے ننگ و عارے ہفت کشور　　ز شرق و غرب بادش خاک بر سر
خمیرِ طینتش مردم کشی ہا　　ز قتلِ مسلمش باشد خوشی ہا
چہ پیرانش مریدانِ فرنگی　　لقب کافور و ذاتِ پاک زنگی
ز نوّاب و رئیسانش چہ پُرسی　　سگ و سگ زادگان کرسی بہ کرسی
چناں فرزند ناہموار زاید　　کہ از خر قیمتش برتر نیاید

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۳۳۴

چکد از لالہ اش خونِ مسلماں — ازو نالاں حجاز و مصر و ایراں
جوانانش غلامانِ فرنگی — پناہِ شاں بدامانِ فرنگی
چہ پنجاب آں فرنگی را معسکر — معسکر را غلام احمد پیمبر
ضلالت را پیمبر ہست پنجاب — فرنگی را معسکر ہست پنجاب
فضائش کفر ریز و کفر بیز است — بہ آئینِ الٰہی در ستیز است

زمینِ فتنہ زائے فتنہ خیزے
کہ شیطاں پیشِ پائش سجدہ ریزے [1]

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کو کہاں کہاں سے بھرتی کرنے کے لیے جوان ملے، جن کے بل بوتے پر حریت پسندوں کو بُری طرح کُچل کر برٹش گورنمنٹ کو دوبارہ استحکام نصیب ہُوا تھا، ملاحظہ ہو:

"یکم اپریل ۱۸۵۸ء تک انگریزی فوج کی تعداد چھیانوے ہزار تک پہنچ گئی۔ سکھ، پٹھان اور پنجابی مسلمان بھرتی ہو ہو کر آ گئے۔ راجاؤں اور نوابوں نے بھی اپنی فوجیں بھیج دیں۔ اِس طرح بے شمار فوج جمع ہو گئی اور چاروں طرف پھیل کر انقلابیوں کا صفایا بول دیا۔ لیوگارڈ اور ڈگلس، بہار کی طرف چلے گئے۔ سر ہنری لارنس نے نیپال سے شروع ہی میں مدد منگا لی تھی اور جنگ بہادر غدّار نہایت خلوص اور پابوسی سے پانچ ہزار گورکھوں کے ساتھ لکھنؤ پہنچ گیا۔" [2]

مشرقی پنجاب میں پٹیالہ، نابھہ اور جیند وغیرہ سکھوں کی ریاستیں تھیں۔ یہ ریاستیں آزادئ وطن کی تہِ دل سے دشمن نکلیں۔ انگریزوں کی حمایت میں حریت پسندوں کے خلاف بڑھ چڑھ کر کارنامے دکھائے۔ انقلابیوں پر دل کھول کر ضربیں لگائیں اور انگریزوں سے

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، ص ۸۸۱

[2] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۵

بھی بڑھ کر مظالم کے پہاڑ ڈھاتے۔ اِن کے کارہائے نمایاں کی کہانی پنجاب کے مشہور مورخ جناب غلام رسول مہر کی زبانی سماعت فرمائیے:

"اِن ریاستوں کو موقع حاصل تھا کہ انقلاب کی بنیادیں مستحکم کر دیتیں یا اِسے ختم کر ڈالتیں۔ یہ انبالہ اور دہلی کے درمیان واقع تھیں اور اِن کی امداد کے بغیر انگریزوں کا عقب حفاظت سے بالکل محروم تھا۔ اگر یہ ریاستیں خاموش بھی بیٹھی رہتیں تو اِس حالت میں بھی انقلاب کی کامیابی کے خاصے امکانات موجود تھے لیکن جب پٹیالہ، نابھہ اور جیند نے انقلاب پر انگریزوں سے بھی زیادہ بے دردی کے ساتھ ضربیں لگانی شروع کیں تو دہلی اور پنجاب کے درمیان تعلقات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اِن ریاستوں نے شہنشاہِ دہلی کی دعوت ٹھکرائی، جو سوار پیغام لے کر آئے تھے اُنھیں قتل کر دیا۔ اپنے خزانے انگریزوں پر نثار کیے، اپنی فوجیں جمع کیں، جن علاقوں میں سے انگریزوں کو گزرنا تھا اُنھیں بچائے رکھا، پھر انگریزوں کے ساتھ ہو کر دہلی پر حملہ کیا۔" [1]

اِن ریاستوں کی مذکورہ کارکردگی پر موصوف نے یُوں تبصرہ کیا ہے:

"جیند، نابھہ اور پٹیالہ کے علاقے ایسی جگہ واقع تھے کہ اگر وہاں کے رئیس ذرا صبر کرتے تو دہلی سے ستلج کا پُورا علاقہ انگریزوں کے لیے غیر محفوظ ہو جاتا اور انبالہ بھی خطرے میں پڑ جاتا۔ اگر وُہ قومی آزادی کی جنگ میں معاون بن جاتے تو انگریزوں کے چھوٹے چھوٹے دستے بکھرے رہتے اور اُن کے لیے اکٹھے ہونے یا آپس میں سلسلۂ مخابرت قائم کر لینے کی کوئی صُورت نہ تھی اور وُہ یقیناً مارے جاتے۔ اِس کے بعد انگریز انگلستان سے بڑی فوج لا کر ہندوستان کو ازسرِ نو فتح کرنے کے لیے اگر کوئی قدم اٹھاتے تو یقیناً اُس میں کامیاب ہونا آسان نہ رہتا، لیکن اِن سکھ ریاستوں کی انگریز دوستی اور

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷، مطبوعہ لاہور، ص ۱۰۰

وطن دشمنی نے صورت بگاڑ دی۔" [1]

سکھوں کی وطن دشمنی اور انگریز دوستی، جو اس موقع پر واضح ہوئی وہ قومی لحاظ سے پاک و ہند کی تاریخ میں ایک امتیازی کارنامہ ہے کیونکہ پوری سکھ قوم انگریزوں کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو بچا کر کنارے پر لگانے کی غرض سے آزادی چاہنے والے مسلمانوں اور ہندوؤں کے خلاف صف آراء ہو گئی، مثلاً:

> "سکھوں نے اِس اہم موقع پر جبکہ مذہب و ملّت کے درد نے ہر ہندوستانی کے دل کو آگ بگولہ بنا دیا تھا، خاص طور پر خلوص کے ساتھ انگریز کی غلامی کو راحت سمجھ کر گلے میں ڈالا اور دست و بازو بن کر ہندوستان کے دِل پر ضربیں لگائیں، جیسے خاص اِسی کام کے لیے پیدا ہُوئے تھے، اَور تو اَور اپنی رانی مائی جنداں کا بھی انگریزوں کے لیے مقابلہ کیا۔ دہلی میں آ کر تو گویا حقِ نمک ادا کر دیا۔ بڑی بڑی قربانیاں دیں اور باغیوں کو ذاتی دشمن سمجھ کر لڑے۔" [2]

انگریزوں نے سکھّوں کو حرّیت پسندوں کو کچلوانے اور خاص طور پر ان سے تختِ دہلی اور مسلمانوں کو نیست و نابود کروانے کی غرض سے عیارانہ طریقے پر اشتعال انگیزی کی، اُس چالبازی کا ذکر میاں صاحب کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

> "انگریزوں نے سِکھّوں کو بھڑکانے کے لیے ایک عجیب چال چلی۔ وُہ یہ کہ بادشاہِ دہلی کی طرف سے ایک جھُوٹا اعلان چھپوا دیا کہ سب کاموں سے پہلے باغیوں کا یہ فرض ہے کہ سکھّوں کو تباہ کر دیں۔ سِکھ پہلے ہی وطن پرستی سے خالی تھے، اِس تحریک سے کوئی ہمدردی نہ تھی، اِس اعلان سے اَور بضد ہو ہو کر بھرتی ہُوئے تاکہ دہلی اور دہلی والوں سے خوب بدلہ لیں۔" [3]

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷، مطبوعہ لاہور، ص ۹۹

[2] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷، مطبوعہ لاہور، ص ۲۰۳

[3] ایضاً: ص ۱۹۸

پاک و ہند کے مختلف گوشوں میں پنجاب کے مُسلمانوں اور سکھوں نے جو کارنامے انجام دیے اُن کی ایک جھلک پیش کی جا چکی۔ پنجاب کے اندر جو دُوسرے صُوبوں کے فوجی مختلف چھاؤنیوں میں تھے، جب اُنھوں نے برٹش گورنمنٹ کے خلاف عَلمِ جہاد بلند کیا تو اُن مسلح حریّت پسندوں کے ساتھ پنجاب میں جو سلوک ہُوا وُہ ملاحظہ فرمائیے:

"پنجاب میں بھی فتح کے بعد پُوربیوں ہی کی پلٹنیں پشاور تک پھیلی پڑی تھیں وہ ہر جگہ بگڑیں لیکن انگریز یہاں معذور و مجبور نہ تھا۔ ملک (پنجاب) کے لوگ اُس کے دست و بازو تھے۔ ہر جگہ اُن کو کچل دیا گیا۔ باقی مقامات سے پلٹنیں پہنچتی رہیں، فیروز پور سے بھی قریب ہونے کی وجہ سے پہنچیں۔" [1]

نواب احمد علی خاں منڈل نے اِس جنگِ آزادی میں جو کارنامہ انجام دیا اُس کی ایک جھلک بھی ملاحظہ ہو:

"منڈل خاندان کا نواب (احمد علی خاں) جس کی خدمات کی تعریفیں لارڈ کیننگ تک نے کیں۔ سالانہ پانچ سو روپے لگان کے ادا کرتا تھا، وہ ہمیشہ کے لیے معاف کر دیا گیا، اِس لیے کہ اُس نے غدر میں انگریز کی ایسی مخلصانہ مدد کی کہ ملکہ وکٹوریہ کا بیٹا بھی نہ کرتا۔" [2]

جن حضرات کی انگریز دوستی اور ملک دشمنی کی طرف سطور بالا میں اشارات کیے گئے۔ اِن سے مقصود کسی پر کیچڑ اُچھالنا یا کسی کو بدنام کرنا نہیں، بلکہ اِن حضرات کا ذکر ضمناً اِس وجہ سے آگیا ہے کہ مٹھی بھر انگریزوں نے جس طرح سرزمینِ پاک و ہند پر قبضہ جمایا، مدتوں یہاں کے باشندوں پر حکومت کرتے رہے، کتنے ہی اہم ترین مواقع پر ناممکن کو ممکن کر دکھانے کی اُن کے اندر جو صلاحیت تھی اُس صلاحیت کے دو جز ہیں، ایک یہ کہ اُن کے اندر ایجنٹ تلاش کرنے اور اُن کے ذریعے سازشوں کا جال پھیلانے کی بڑی مہارت تھی اور دُوسرا

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷، مطبوعہ لاہور، ص ۱۸۶

[2] ایضاً: ص ۳۲۷

جُز یہ ہے کہ ملک کے اندر ایسے حضرات کی کوئی کمی نہیں تھی جو انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ہر بڑی سے بڑی چیز قربان کر دیا کرتے تھے۔ برٹش گورنمنٹ کی ساری کامیابیوں کا راز دراصل اِن حضرات کی ملک دشمنی، پیٹ پرستی اور ملت فروشی کی مرہُون منت ہے۔ یہاں صرف اُن حضرات کا تعارف منظور تھا جن کی بدولت برطانوی یہاں اپنی حکومت قائم کرنے اور مُٹھی بھر ہونے کے باوجود اپنا قبضہ و اقتدار ایسے وسیع و عریض ملک پر برقرار رکھنے میں کامیاب و کامران رہے۔ ملک اور قوم کا اپنے ذاتی اور گھٹیا مفاد پر سودا کرنیوالوں کی نشان دہی کر دینا بھی انگریزوں کی عیّاری اور مظالم کے ساتھ لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی ؎

لاؤ تو قتل نامہ ذرا ہم بھی دیکھ لیں
کِس کِس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہُوئی

اِس تحریکِ آزادی کے دوران اور دوبارہ غلبہ پا لینے کے بعد انگریزوں نے اہلِ ہند کے ساتھ عموماً اور مسلمانوں کے ساتھ خصوصاً کیسے کیسے ظلم و ستم روا رکھے اور تاریخِ عالم کے بے رحم ترین حکمرانوں کو بھی شرمندہ کر کے کس طرح امتیازی مقام حاصل کیا؟ اِس کے ثبوت میں چند ننگِ انسانیت اور وحشیانہ مظالم کے واقعات پیش کرتا ہُوں۔ جب مرزا الٰہی بخش نے مغل شہزادوں کو ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کروا دیا، تو جنرل ہوڈسن نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا:

> "شہزادے رتھ پر سوار اور سواروں کے حلقے میں چلے آ رہے تھے۔ جیل خانہ کے قریب پہنچے تو ہوڈسن نے سامنے بُلوا کر، کپڑے اُتروا کر، پھر اُسی رتھ پر سوار کیا اور اپنے ہاتھ سے تین تین گولیاں مقامِ قلب پر ماریں اور شہ رگ کو سنگین سے چیر دیا اور اُسی طرح چبوترۂ کوتوالی میں جا کر نعشوں کو زمین پر ڈال دیا۔"[1]

شہزادوں کے ساتھ یہ ظالمانہ اور بہیمیت کا سلوک روا رکھنے کی، خود ہوڈسن نے یہ وجہ بتائی تھی:

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷، مطبوعہ لاہور، ص ۱۵۳

> "میں بے درد نہیں لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اُن بدبختوں (تین شہزادوں) کے وجود سے زمین کو پاک کر دینے کا موقع ہاتھ آنے پر مجھے خوشی حاصل ہُوئی۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ اِنھیں پھانسی پر لٹکاؤں گا، لیکن جب حالات نے یہ صورت اختیار کر لی کہ وُہ رہیں گے یا ہم، تو میرے پاس سوچنے کا وقت نہ تھا۔"[1]

ہو سکتا ہے ہوڈسن کا یہ بیان انگریزوں یا دُوسرے انصاف پسند دشمنوں کو مطمئن کر گیا ہو۔ لیکن اصل سوال تو اپنی جگہ پر علیٰ حالہٖ قائم ہے۔ بتانا تو یہ تھا کہ شہزادوں کو یہ کِس جُرم کی سزا دی جا رہی تھی؛ متحدہ ہندوستان کے شاہی خاندان کو ختم کرنے کا برطانوی لٹیروں کو کہاں سے پرمٹ ملا تھا؛ کون سا ضابطۂ اخلاق اِنھیں اِس سفاکی کی اجازت دے رہا تھا؛ شہزادے کون سی ناپاکی پھیلا رہے تھے جس کے پیشِ نظر ہوڈسن جیسے پاکباز کو اِن کے وجود سے زمین کو پاک کرنا پڑا؛ کیا انگریزوں کے پاس اِن مظالم کے جواز کا کوئی ثبوت ہے؛ اِن کے علاوہ دیگر مغل شہزادوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک روا رکھا گیا اُس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے:

> "دِلّی کے آس پاس جتنے شہزادے ملے، پکڑے گئے۔ اُن کی تعداد انتیس بیان کی جاتی ہے۔ اُن میں بُوڑھے، لنگڑے، بیمار سب کے سب پھانسی میں لٹکائے گئے۔ سب سے زیادہ بوڑھا قیصر مرزا (ابن شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ کا بھائی تھا اور مرزا محمود شاہ، اکبر شاہ کا پوتا وجعِ مفاصل میں مبتلا تھا۔ اُن کی لاش پھانسی میں گو لا لاٹھی لگی ہُوئی لٹکتی تھی .... شہزادے بے تمیزی کے ساتھ پھانسی پاتے تھے۔"[2]

پھانسی دینے سے پہلے شہزادوں کو تڑپانے کی غرض سے جیل خانے میں رکھ کر، اُن سے مشقّت لی جاتی، مارا پیٹا جاتا تھا۔ آخر اِس سلوک کی وجہ؛ کِس جُرم کی یہ پاداش تھی۔ جناب غلام رسول مہر کی زبانی شہزادوں کا یہ قصور تھا:

---

[1] غلام رسول مہرؔ: ۱۸۵۷، مطبوعہ لاہور، ص ۱۵۰

[2] ذکاء اللہ مولوی: عروج عہدِ انگلشیہ، ص ۷۰۸

"جن شہزادوں کو قید کی سزا دی گئی اُن سے عام دستور کے مطابق مشقت لی جاتی تھی، وہ بیچارے مشقت کیا کرسکتے تھے! اُن سے چکّی پسوائی جاتی تھی، پیس نہ سکتے تو کوڑوں کی مار پڑتی، یہاں تک کہ وہ بیچارے چند روز میں مر جاتے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اِس طرح کتنے مرے، اُن کا قصور اِس کے سوا کیا تھا کہ بہادر شاہ کے خاندان سے تھے۔"[1]

کیا چشمِ فلکِ کہن نے ایسے مناظر دیکھے ہوں گے کہ کسی قوم نے حکمران خاندان کو چُن چُن کر پھانسی پر لٹکایا ہو، جب گدھ اُن کی لاشوں کو نوچ نوچ کر کھا گئے ہوں تو ڈھانچے دریا میں پھنکوائے گئے ہوں۔ اگر کسی نے ایسا نہیں کیا تو نہ سہی، انگریزوں نے متحدہ ہندوستان میں شاہی خاندان کے افراد سے ۱۸۵۷ء میں یہ سلوک کرکے اپنی برتری کا لوہا منوایا۔ ونائک ساورکر نے اِن بہیمانہ مظالم پر یُوں تبصرہ کیا ہے:

"جب گدھ کچھ مدت تک اُن کا گوشت نوچ چکے تو سڑے ہُوئے جسدوں کو کھنچوا کر دریا میں ڈلوا دیا گیا۔ آہ زمانے تیرے انقلابات! شہنشاہِ اکبرِ اعظم کی اولاد پر نمازِ جنازہ ادا کرنے اور اُنھیں آغوشِ زمین میں سُلانے والا بھی کوئی نہ تھا۔"[2]

مغل شہزادوں پر تو یہ ظلم کے پہاڑ ڈھائے گئے لیکن جب متحدہ ہندوستان کے پایۂ تخت دہلی میں انگریز فاتحانہ طور پر داخل ہُوئے تو باشندگانِ دہلی پر جو قیامت برپا کی وُہ مولوی ذکاء اللہ صاحب کی زبانی سُنیے:

"سپاہِ شہر کشا نے شہر میں قدم رکھا تو اُس کے سامنے جو مرد آیا اُس کو وُہ گولی مارتے۔ اُس وقت دوست دشمن، مجرم و غیر مجرم میں تمیز نہیں ہو سکتی تھی۔ اِس میں کچھ ہندو مسلمان کی تخصیص نہ تھی۔"[3]

---

[1] غلام رسول مہرؔ: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۵۶

[2] ونائک ساورکرؔ: ساورکر، طبع اوّل، ص ۲۸۰

[3] ذکاءُ اللہ مولوی: عروجِ عہدِ انگلشیہ، ص ۷۰۵

دہلی میں انگریزی سپاہ اور سکھوں کے جیش جب فاتحانہ انداز میں داخل ہو گئے تو بچے کھچے باشندوں کے ساتھ اُنھوں نے انسانی ہمدردی کا کہاں تک ثبوت دیا تھا۔ یہ جناب مہر صاحب کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

> "کرنل برن شہر کا فوجی گورنر مقرر ہُوا، جس نے قطب الدین سوداگر کی کوٹھی میں اپنا مرکز بنایا۔ یہ کوٹھی چاندنی چوک میں تھی۔ شہر میں تھوڑی سی آبادی رہ گئی تھی۔ لشکریوں کے جیش مقرر ہو گئے جو بازاروں، گلیوں کے چکر لگاتے، جہاں کسی گھر کو آباد پاتے، مردوں، عورتوں، بچّوں سب کو پکڑ کر برن کے پاس لے آتے اوڑھنے بچھونے کے پشتارے مردوں کے سروں پر ہوتے۔ تلاشی میں جو چیز قیمتی ہوتی نکال لی جاتی اور جس اسباب کو کوڑی میں کوئی نہ خریدتا اُسے واپس دے کر لاہوری دروازے سے باہر نکال دیتے کہ جہاں سینگ سمائیں، چلے جائیں۔ اِس طرح باقی شہر بھی خالی کرا لیا گیا۔" [1]

۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی کے لال قلعے پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تھا۔ ۲۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو جب رابرٹس کان پور جانے لگا تو اُس نے دہلی کو بھی گھوم پھر کر دیکھا۔ شاہجہان آباد کی بربادی کا نقشہ رابرٹس نے یُوں کھینچا تھا:

> "صبح کی ابتدائی روشنی میں دہلی سے کوچ کا وُہ مرحلہ بڑا ہی دردناک تھا۔ لاہوری دروازہ سے نکل کر ہم چاندنی چوک میں سے گزرے۔ دہلی حقیقتاً شہرِ خموشاں معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے اپنے گھوڑوں کے سُموں کی آواز کے سوا کوئی آواز کسی سمت سے نہ آتی تھی۔ ایک بھی زندہ مخلوق ہماری نظر سے نہ گزری۔ ہر طرف نعشیں بکھری پڑی تھیں۔ ہر نعش پر وُہ حالت طاری تھی جو موت کی کشمکش نے طاری کر دی تھی۔ ہر نعش تجزیہ و تحلیل کے مختلف مراحل میں تھی۔ ہم چپ چاپ چلے جا رہے تھے یا سمجھ لیجئے کہ بے ارادہ زیرِ لب باتیں کر رہے تھے تاکہ انسانیت کے

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷، مطبوعہ لاہور، ص ۱۶۱

اِن دردناک باقیات کی استراحت میں خلل نہ پڑ جائے۔ جن مناظر سے ہماری آنکھیں دوچار ہُوئیں وُہ بڑے ہی خوفناک اور انتہا درجہ رنج افزا تھے۔

کہیں کوئی کُتّا کسی نعش کا برہنہ عضو جھنجھوڑ کر کھا رہا تھا۔ کہیں کوئی گدھ ہمارے قریب پہنچنے پر اپنی گھناؤنی غذا چھوڑ کر پھڑپھڑاتے پروں سے ذرا دُور چلا جاتا تھا لیکن اُس کا پیٹ اِتنا بھر چکا تھا کہ اُڑ نہ سکتا تھا۔ اکثر حالتوں میں مرے ہُوئے زندہ معلوم ہوتے تھے۔ کسی کے ہاتھ اُوپر اُٹھے ہُوئے تھے جیسے کسی کو اشارہ کر رہا ہو۔ دراصل یہ پُورا منظر اِس درجہ ہیبت ناک اور وحشت انگیز تھا کہ بیان میں نہیں آ سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے ہماری طرح گھوڑوں پر بھی خوف طاری تھا، اِس لیے وُہ بھی بدک رہے تھے اور نتھنے پھلا رہے تھے۔ پُوری فضا ناقابلِ تصور حد تک بھیانک تھی، جو بڑی مضر اور بیماری آور بدبُو سے لبریز تھی"۔[1]

باشندوں کے ساتھ یہ سلوک کرنے پر لُوٹ مار کا جس طرح بازار گرم کیا گیا وہ مہر صاحب کی زبانی سُنیے:۔

"فتح کے ساتھ ہی فوج کو تین دِن کے لیے لُوٹ کی اجازت دے دی گئی تھی۔ باسورتھ سمتھ نے لکھا ہے کہ اجازت نہ بھی دی جاتی تو سپاہ اِس حالت میں بھی باز نہ رہتی۔ سکھوں اور دُوسرے لوگوں کو معلوم تھا کہ دہلی میں اعلیٰ قیمتی سامان، جواہرات، سونے چاندی کے برتنوں اور روپے کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ . . شکاری کتّوں کی طرح جھولی ڈال وُہ گلی گلی اور بازار بازار پھر نکلے۔ ایک بے آباد گھر کے بعد دُوسرے میں داخل ہوتے۔ ہُنرمندوں کی طرح آہستہ آہستہ دیواروں اور تختوں پر تھپکیاں مارتے، فرش پہ پانی ڈالتے اور دیکھتے رہتے کہ کہاں جلد مرتا ہے، پھر عقاب کی آنکھ یا سُرخ ہندوستانی کے کان یا شکاری کتّے کی ناک سے کام لے کر سیدھے گڑھے یا تہہ خانے یا

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷، مطبوعہ لاہور، ص ۱۶۰

زمین میں دبے ہُوئے برتن نکال لیتے، جن میں عمر بھر یا پشتوں کی بچائی ہُوئی پُونجی موجود ہوتی۔"[1]

دہلی میں مسلمانوں اور مغلیہ خاندان سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ انگریزوں نے جو سلوک روا رکھا اُس کا تصوّر بھی انتہائی دردناک اور وحشت انگیز ہے۔ سیّد کمال الدین حیدر نے اس کا اجمالی تذکرہ یُوں کیا ہے:

"ستائیس ہزار اہلِ اسلام نے پھانسی پائی۔ سات دن برابر قتلِ عام رہا اُس کا حساب نہیں۔ اپنے نزدیک گویا نسلِ تیموریہ کو نہ رکھا، مٹا دیا، بچوں تک کو مار ڈالا، عورات سے جو سلوک کیا بیان سے باہر ہے، جس کے تصوّر سے دل دہل جاتا ہے۔"[2]

عبادت گاہیں ہر مذہب و ملّت کے نزدیک قابلِ احترام ہیں اور مساجد تو پھر مساجد ہیں، لیکن انگریزوں نے نہ انسانی اور اخلاقی ضابطوں کو مدِّ نظر رکھا اور نہ اپنے عیسائی ہونے کے دعوے کا کوئی پاس لحاظ کیا۔ مُسلم کُشی کے جذبے نے اُنھیں اِتنا اندھا کر دیا تھا کہ دہلی کی مشہور و معروف جامع مسجد کو سِکھ فوج کا ہیڈ کوارٹر مقرر کر دیا گیا۔ سِکھوں نے بھی انسانی اور اخلاقی کسی زاویے سے اِس حرکت پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہ کی، بلکہ اُس خانۂ خدا میں وہ نازیبا اور شرمناک کام کیے جو اُن کی قومی ذہنیت کا ایک جز بن کر رہ گئے۔ مولوی ذکاءُاللہ لکھتے ہیں:

"جامع مسجد جو شہر کی کل مساجد کی ناک تھی اُس کو یُوں نکّٹا بنایا کہ سکھ سپاہ کی بارک اُس کو بنایا۔ اُس میں بول و براز کرنے سے کچھ پرہیز اُنھوں نے نہیں کیا۔ سِکھوں نے اپنے کڑہاتے حلوے کے سُرخ مینار کے نیچے خوب چڑھائے سؤر ذبح کر کر کے پکائے۔ کُتّے جو انگریزوں کے ساتھ تھے وہ درگاہ شریف میں پڑے پھرتے تھے۔"[3]

جب دہلی کے باشندوں کو خاک و خون میں مِلا دیا، بچے کھچے افراد کو شہر سے بھگا دیا، اپنے نزدیک

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷، مطبوعہ لاہور، ص ۱۶۲

[2] کمال الدین حیدر، سیّد: قیصر التواریخ، جلد دوم، ص ۴۵۴

[3] ذکاءاللہ، مولوی: عروجِ عہدِ انگلشیہ، ص ۷۱۹

تیموریہ خاندان کو مٹا دیا تو صرف دو چیزیں باقی رہ گئی تھیں، ایک مُغلوں کی آخری نشانی ضعیف العمر اور حرماں نصیب بادشاہ بہادر شاہ ظفر، جو انگریزوں کی قید میں تھا اور دُوسری چیز دہلی کی نوحہ کناں خالی عمارتیں۔ اِن کے بارے میں انگریزوں کا روزنامہ کرانیکل لاہور، اکتوبر ۱۸۵۷ء کی اشاعت میں یہ سوال کرتا ہے:

> ”دہلی کو اب تک کیوں تباہ نہیں کیا گیا؟ بادشاہ اب تک کیوں زندہ ہے؟ اِس کا جواب اختصار سے دے دینا چاہیے۔ شہر دہلی اور بادشاہ کا وجود دفتری حکومت کا ممنون ہے۔ دفتری حکومت نے ہمارے سالاروں کے ہاتھ باندھ دیئے۔“ [1]

یہی مطالبہ لاہور کے دُوسرے انگریزی اخبار ”پنجابی“ نے ماہِ نومبر میں اپنی حکومت سے ان لفظوں میں کیا:

> ”دہلی مسلمانوں کا یروشلم ہے، کیوں اب تک اِسے زمین کے برابر نہیں کیا گیا؟ بادشاہ مسلمانوں کی محبت و عقیدت کے بتکدے کا پروہت ہے، کیوں اب تک اُسے پھانسی نہیں دی گئی یا گولی نہیں ماری گئی؟“ [2]

جن کے خون پسینے کی کمائی سے انگریز پھلے پھولے تھے، جن کی پشت ہا پشت کی پُونجی کو لُوٹ کر انگلستان جیسے غریب اور پسماندہ ملک کو صنعتی، مالدار اور ترقی یافتہ بنا بیٹھے تھے۔ آزادی اور دولت چھین لینے، اُن کے مذاہب میں مداخلت کرنے پر ہی بس نہ کی بلکہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی پاداش اور آزادی چاہنے کے جُرم میں وُہ مظالم اِن غریبوں پر ڈھائے کہ جن کے ذکر سے کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ دِلّی میں جو کچھ کیا اُس کی جھلک پیش کی جا چکی۔ باقی ملک میں، شہروں اور دیہات میں، اِس بدنصیب ملک کے باشندوں سے کیسا سلوک کیا گیا ملاحظہ ہو:

”نیل نے الٰہ آباد اور اُس کے گرد و نواح میں ظلم و جَور کی بھٹیاں دہکا رکھی تھیں۔

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۳۶۱

[2] ایضاً: ص ۳۶۱

اِس اثناء میں اُس کی جگہ ہنری ہیوے لاک کو سپہ سالار بنا دیا گیا اور ہیوے ۳۰؍ جون کو الٰہ آباد پہنچ گیا۔ نیل جتنا کام انجام دے چکا تھا، اُس کی تفصیلات بیان کیں نیز بتایا کہ رینا ؤ کو ہراول کے طور پر بھیجتے وقت اُس نے کیا کیا ہدایات دیں؛ ہیوے لاک نے اِن تمام ہدایات پر تحسین کا اظہار کرتے ہُوئے اُن کی تصدیق کر دی۔ گویا ظلم و جوَر اور بے پناہ تشدّد محض نیل ہی کو پسند نہ تھا، تمام انگریز جرنیل ایسے ہی طور طریقوں کو پسند کرتے تھے۔"[1]

رینا ؤ جس کو کرنل نیل مذکور نے ہراول کے طور پر آگے بھیجا ہُوا تھا۔ اہلِ ملک کے ساتھ اُس کے سنگین مظالِم، جن کی کوئی با اخلاق آدمی ہرگز جرأت نہ کر سکتا تھا، انگریزی ذہنیت کے پُوری طرح آئینہ دار ہیں:

"دو روز میں بیالیس آدمیوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ بارہ آدمیوں کے ایک گروہ کو اِس بنا پر موت کی سزا دی گئی کہ جب کالم کوچ کرتا ہُوا اُن کے پاس سے گزرا تو اُنھوں نے مُنہ پھیر رکھے تھے۔ رینا ؤ جب پڑاؤ ڈالتا تو سامنے کے تمام دیہات کو آگ لگوا دیتا۔"[2]

کرنل نیل نے ایک مکان کے اندر فرش پر علیحدہ علیحدہ گائے اور سؤر کے خُون کا چھڑکاؤ کرایا ہُوا تھا۔ جو حریت پسند گرفتار ہو کر اُس کے سامنے پیش کیا جاتا اُسے پھانسی دینے سے پہلے یہ تعذیب دی جاتی کہ اگر مسلمان ہے کہ اُس مکان میں اپنے حصّے کا سؤر کا خون زبان سے چاٹ کر فرش کو صاف کرے اور اگر قیدی ہندو ہے تو اُس سے گائے کے خون والی جگہ کا ایک قطعہ اِسی طرح صاف کروایا جاتا۔ جو انکار یا حیل و حجت کرتا تو دُرّے لگتے۔ انکار کی صورت میں دُرّے مار مار کر اُسے ختم کر دیا جاتا ورنہ صاف کرنے کے بعد پھانسی پر لٹکا دیا جاتا اور اِس طرح موت سے پہلے چند منٹ زندہ رہنے کی مہلت مل جاتی۔ یہ

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۵

[2] ایضاً: ص ۲۵۶

طریقہ کار نیل نے ۲۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو جاری کیا تھا۔ اِس طریقۂ تعذیب کو میلی سن جلد دوم ص ۲۰۰ سے یُوں نقل کیا گیا ہے:

”بریگیڈیر جنرل نیل کا عزمِ مصمّم ہے کہ بے گناہوں کے خُون کا ہر دھبّا اِن بدمعاشوں (حریت پسندوں) سے قبل از نفاذ سزائے موت صاف کرایا اور دُھلوایا جائے جو آئندہ غدر میں سرگرم حصّہ لینے کی بنا پر گرفتار ہوں۔ اُنھیں حیثیت، ذات اَور درجۂ جُرم کی بنا پر اِس کام کے لیے منتخب کیا جائے۔ ہر بدمعاش کو موت کی سزا کا حکم سُن لینے کے بعد پہرے کے ساتھ متعلقہ مکان میں لے جایا جائیگا، اور مجبور کیا جائے گا کہ وُہ دھبّوں کا ایک حصّہ صاف کرے۔ یہ کام زیادہ سے زیادہ کراہت انگیز بنا دینا چاہیے۔ اگر مجرم کام پُورا نہ کرے تو فوجی کوتوال تازیانے لگوائے۔ اپنے حصّے کا کام کر چکنے کے بعد مجُرم کو پھانسی دے دی جائے۔ اِس غرض سے پھانسی پاس ہی نصب کی جائے گی۔“ [لہ]

نیل نے اپنی اِس تجویز پر دل کھول کر عمل کیا لیکن ہنرِی ہیوے لاک جسے نیل کی جگہ الٰہ آباد کے علاقے کا فوجی افسر مقرر کیا گیا تھا، اس نے بھی ۳۰ جون ۱۸۵۷ء سے جو سلوک برِّ صغیر پاک و ہند کے باشندوں کے ساتھ روا رکھا، وُہ ایک انگریز سِول افسر کی زبانی میلی سن جلد دوم صفحہ ۲۷۷ سے یُوں منقول ہے:

”راستے کے بہت سے گاؤں جلا دیے گئے تھے اور انسان وہاں قطعاً نظر نہ آتا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف دلدل تھی، جلی ہُوئی جھونپڑیوں کے سیاہ کھنڈر تھے، جنھیں موسم کے اثرات نے اَور زیادہ بدوضع بنا دیا تھا۔ ایک بھی صدا نہ سُنی جاتی تھی جو کسی انسان کے وجود کا پتہ دیتی یا معلوم ہو سکتا کہ آدمی کام کاج میں لگے ہُوتے ہیں۔ ایسی صداؤں کی جگہ مینڈکوں کے ٹرّانے کا شور تھا یا ٹڈیوں کی تلخ و تیز بانسریاں بج رہی تھیں یا ہزاروں پَردار

[لہ] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۶۱

کیڑے دھیمے غنغنا رہے تھے جو نمی اور گرمی کے باعث پیدا ہو گئے تھے، پھر نیم کے درختوں کی ناخوشگوار بُو بھی وقتاً فوقتاً لٹکی ہُوئی نعشوں کی بدبو ہوا خراب کر رہی تھی، جنھیں ہماری آنکھوں کے سامنے مکروہ سؤر مزے سے کھا رہے تھے۔ یہ سب چیزیں ہمارے مختلف حواس پر اثر انداز ہو رہی تھیں اور مل کر بربادی، تباہی اور رنج و ماتم کا ایسا مرقع تیار کر رہی تھیں جو میرے نزدیک موجود لوگوں میں سے کسی کو عمر بھر فراموش نہ ہوگا۔“[1]

لیفٹیننٹ رابرٹس نے ۲۱ر جُون ۱۸۵۷ء کو جہلم سے اپنی والدہ کے نام ایک خط انگلستان بھیجا۔ اُس میں اپنی قوم کے عزائم اور متحدہ ہندوستان کے باشندوں کو اذیت ناک سزائیں دینا اور توپ سے اُڑانا جس فخریہ انداز میں لکھا وُہ انگریزوں کی ذہنیت کی صحیح تصویر ہے۔ اُس خط کا ایک اقتباس مولانا غلام رسول مہر کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

”سزائے موت کی سب سے زیادہ موثر صورت یہ ہے کہ مجرم کو توپ سے اُڑا دیا جائے۔ یہ بڑا ہی خوفناک نظارہ ہوتا ہے لیکن موجودہ وقت میں ہم احتیاط پر کاربند نہیں ہو سکتے . . . . . ہمارا مقصد اِن بدمعاش مسلمانوں پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کی مدد سے انگریز اب بھی ہندوستان کے مالک رہیں گے۔“[2]

جو ظلم و ستم دہلی میں ڈھایا گیا اُسی طرح دیگر شہروں اور دیہات میں غالب آنے کے بعد انتقام کی بھٹیاں گرم کی گئیں۔ نیل، ہیوے لاک اور ریناڈ کے جو مظالم بیان ہُوئے، پُورے ملک میں یہی کُچھ کیا گیا۔ اِس کے بعد فوجی عدالتیں بچے کھچے باشندوں کے لیے قائم کر دی گئیں، اُن کا عدیم المثال انصاف ملاحظہ ہو:

”ملزموں کو گرفتار کر کے مقدمات کی چھان بین کے لیے فوجی کمیشن کے سربراہ کے رُوبرُو پیش کر دیا جاتا تھا۔ یہ کام بڑی تیزی سے ہوتا تھا۔ موت کے سِوا

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۹

[2] ایضاً: ص ۳۴۶

کوئی سزا نہ تھی اور اثباتِ جُرم کے سِوا کسی مقدمے کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا تھا۔ جن اصحاب کا کام ملزموں کے جُرم کی چھان بین تھا وُہ نرمی کے چنداں روادار نہ تھے۔" [1]

انگریزوں کا مقصد اِس فوجی نظامِ عدالت سے یہ تھا کہ بچے کھچے باشندوں کو مزید ایسی عبرت ناک سزائیں دی جائیں کہ بعد میں کوئی سر اُٹھانے کا تصوّر بھی دل میں نہ لانے پائے۔ اکثر کو ماخوذ کرلینے کے بعد سزائے موت کی سزا ہی دی جاتی تھی۔ طریقہ ہائے اذیت ایسے وحشت ناک اور غیر انسانی تھے کہ بعض انگریز بھی اُن پر اظہارِ ملامت کیے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ ٹامپسن ص۴۷ سے ایک انگریز کا بیان یُوں منقول ہے:

"ہندوستانیوں کے لیے تعذیبات، یہ مسلمانوں کو (پھانسی دینے سے پہلے) سؤروں کے چمڑوں میں سِینا یا اُن کے جسموں پر سؤروں کی چربی ملنا اور اُن کے جسموں کو جلانا یا ہندوؤں کو بھرسٹ ہونے پر مجبور کرنا، یہ تمام حرکات سراسر منتقمانہ اور غیر مسیحی ہیں اور ہمارے لیے باعثِ بےعزّتی ہے۔ انجام کار یہ ہم پر مصیبت بن کر گریں گی۔ اِن روحانی اور ذہنی تعذیبات کے بعد یورپ والوں کو مُنہ دکھانے کے قابل (ہم) نہیں رہ سکتے۔" [2]

فتح دہلی کے دو ماہ بعد لارڈ لارنس نے دہلی میں فوجی کمانڈر کے نام ایک آرڈر بھیجا، جس کا ایک اقتباس ولیم میور کی کتاب جلد اوّل صفحہ ۲۴۹ سے یُوں نقل کیا گیا ہے:

"مجھے یقین ہے کہ ہم نے جس طریق پر بلا امتیاز تمام طبقوں کو لُوٹا ہے اُس کے لیے ہم پر ہمیشہ لعنت بھیجی جائے گی اور یہ فعل بالکل حق بجانب ہوگا۔ بہرحال دو مہینے کی لُوٹ کو کافی سمجھنا چاہیے۔ میرے پاس اِس بارے میں بمبئی سے بھی شکایتیں پہنچ رہی ہیں ...... مَیں نے یہ بھی سُنا ہے، اگرچہ یقین نہیں آتا

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷، مطبوعہ لاہور، ص ۱۷۴

[2] ایضاً: ص ۳۴۹

> کہ افسر باہر نکل کر دیسی باشندوں کو بیدردی سے قتل کر رہے ہیں.... اگر ہمارے سامنے بلند اصول نہ بھی ہوں جب بھی عام مصلحتوں کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اپنے ہم وطنوں کو اِس قسم کی چیرہ دستیوں سے باز رکھیں باغیوں اور قاتلوں کو پھانسی پر لٹکانے یا گولی سے اڑانے کے لیے مجھ سے زیادہ کوئی مستعد نہ ہوگا، لیکن ہمیں دوست دشمن میں امتیاز کرنا چاہیے۔ موجودہ صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام طبقے ہمارے خلاف متحد ہو جائیں اور چپاولی جنگ شروع ہو جائے، ملک آہستہ آہستہ ویرانی کی منزل پر پہنچ جائے۔ پھر ہمارے لیے یہاں ٹھہرنا ہی ممکن نہ رہے۔" [1]

سکھوں نے بھی انگریزوں کے دوش بدوش حریت پسندوں کو بلا امتیاز ہندو مسلم کے جسمانی اور رُوحانی اذیت پہنچانے، دونوں قوموں کو برٹش گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔ اِس سلسلے میں ایک واقعہ پیشِ خدمت ہے، جو موبرے ٹامس نے ہنری کاٹن کو بتایا اور ٹامپسن صفحہ ۴۸ سے جناب غلام رسول مہر نے اپنے لفظوں میں اُسے یُوں بیان کیا ہے:

> "اندھیرا ہو چکا تھا، ایک سکھ اردلی میرے خیمے میں آیا اور سلام کرنے کے بعد بولا کہ ہم نے قیدیوں سے جو سلوک کیا ہے، میں سمجھتا ہُوں آپ اُسے دیکھنا پسند کریں گے۔ مجھے (ہنری کاٹن کو) شُبہ ہوا۔ فوراً اُٹھا اور حوالات میں گیا۔ کیا دیکھتا ہُوں کہ بدبخت مسلمان آخری دموں پر ہیں۔ اُن کی مُشکیں کسی ہُوئی ہیں، کپڑے اُترے ہُوئے ہیں اور تانبے کے پیسے گرم کر کر کے اُن کے جسموں کو سر سے پاؤں تک داغا جا چکا ہے۔ مَیں نے خود اُنھیں گولیوں سے ہلاک کر دیا، تاکہ اُن کی اذیتیں ختم ہوں۔" [2]

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷، مطبوعہ لاہور، ص ۱۷۲

[2] ایضاً: ص ۳۴۸

اِسی سِکھ ذہنیت کا مظاہرہ ہندوؤں کے بارے میں بھی ملاحظہ ہو کہ اجنالے میں کیسا مظاہرہ کیا:

"اجنالے کے اردگرد پہرے کھڑے کر دیے گئے تاکہ کوئی آدمی تھانے کی طرف نہ آنے پاتے۔ دس دس کے جتھوں میں قیدیوں کو باہر لایا جاتا، اُن کے نام اور پتے لکھے جاتے اور اُس جگہ بھیج دیا جاتا جہاں سکھ سپاہی اُنھیں گولیاں مارنے کے لیے متعین تھے۔ کوپر نے خود لکھا ہے کہ اُنھیں قتل گاہ کی طرف بھیجا جاتا تو وہ غصّے اور جوش کی حالت میں مجھ سے کہتے کہ ٹھہرو! تمھارے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا۔ کبھی سکھوں کو طعنہ دیتے، کبھی گنگا جی کو مدد کے لیے پکارتے۔"[1]

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں بعض انگریز افسروں نے جو بہیمیت اور درندگی کا ثبوت دیا اہلِ ملک کے ساتھ محض اِس وجہ سے غیر انسانی برتاؤ کیا کہ اُنھوں نے آزادی حاصل کرنے کا تصوّر بھی کیوں کیا؟ انگریزوں کو دُوسروں کے ملک پر قبضہ جما لینے، وہاں کی دولت لُوٹنے، صنعتیں تباہ کرنے، اِس کی دولت سے انگلستان کو صنعتی اور ترقی یافتہ بنانے کا اخلاقی اور انسانی حق حاصل تھا لیکن دیسی باشندوں کا کوئی حق نہیں تھا کہ جب اُن کا ملک اُجاڑا جا رہا تھا تو اُنھوں نے اُف کیوں کی؟ صنعتیں تباہ کی جا رہی تھیں تو کیوں بلبلائے؟ عیسائی بنانے کی سر توڑ کوشش کر کے اگر انگریزوں نے اُن کے دلوں پر آرے چلائے تو دیسیوں کے مُنہ سے سِی سِی کی آواز کیوں نکلی؟ یہ تھی متحدہ ہندوستان میں بسنے والوں کے جرائم کی فرد۔ کیا انگریزوں کے نزدیک یہ جرم قابلِ معافی تھے؟ لیکن اخلاق اور انسانیت کی رُو سے دیسی مجرم تھے یا انگریز؟ اہلِ خانہ اپنے گھر کو بچانا چاہتے تھے تو مجرم ٹھہرے لیکن ڈاکو اُسی گھر کو نہ صرف متواتر لُوٹنا چاہتے تھے بلکہ اُس پر قبضہ جمائے رکھنے پر مُصر تھے اور ایسا کرنا اُن کی نظر میں نہ جرم تھا نہ معیوب۔ یہ المیہ نہیں تو اور کیا ہے کہ انگریزوں کے جن جنرلوں اور دیگر

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۳۳۹

فوجی افسروں نے زیادہ سے زیادہ درندگی کا ثبوت دیا، سفاکی، وحشت اور بربریت کے اگلے پچھلے سب ریکارڈ ۱۸۵۷ء میں متحدہ ہندوستان کے اندر توڑ دکھائے اُنھیں ہیرو قرار دیا گیا، اُنھیں اور اُن کی اولاد کو پنشنوں اور جاگیروں سے نوازا گیا، انگلستان کی تاریخ میں اُن ننگِ انسانیت افراد کو نمایاں کر کے دکھایا گیا۔ گویا پوری برطانوی قوم کی ذہنیت ڈاکوؤں جیسی اور ڈاکو نواز بن کر رہ گئی تھی۔ انگریزوں کی اِسی ذہنیت اور ۱۸۵۷ء میں اُنھوں نے جس درندگی کا مظاہرہ کیا، اُس کے پیشِ نظر جناب غلام رسول مہر کیسا پیارا سوال کرتے اور باشندگانِ پاک و ہند کے ضمیر کو جھنجھوڑتے ہیں:

> "اب سوچیے کہ جس کے دل میں ۱۸۵۷ء کے واقعاتِ محزنہ کی یاد تازہ ہو گی، کیا اُس میں انگریزوں کے لیے کسی بھی خوشگوار خیال کی گنجائش باقی رہے گی؟ شعلوں کو کون پھول سمجھتا ہے اور خارزار کو کون حریر و پرنیاں کا فرش قرار دیتا ہے؟ تاریخ قوموں کے اعمال کا مرقع ہے۔ انگریز جب اُس میں اپنا نامۂ اعمال دیکھیں گے اور اُس کے اوراق پر ۱۸۵۷ء کے خونِ ناحق کا دھارا متلاطم نظر آئے گا، تو اُن کی حالت کیا ہو گی؟ وہ نیل، نکلسن، ہوڈسن یا اُن جیسے دُوسرے لوگوں کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے؟ اِس دنیا کا ہر ذرّہ ذرّہ پکار کر کہے گا کہ انگریزوں نے وُہ حرکتیں کیں جو انسانیت ہی نہیں بلکہ جنگلی درندوں کے لیے بھی باعثِ ننگ تھیں۔"[1]

مولانا غلام رسول مہر کے مذکورہ بالا سوال اور وضاحت سے ہمیں پورا پورا اتفاق ہے۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں حریت پسندوں اور خاموش رہنے والوں کے ساتھ، بغیر کسی امتیاز کے مردوں، عورتوں اور بچوں کے اُوپر مظالم کے پہاڑ ڈھائے، اندھا دُھند گولیاں چلائیں، دیہات جلوائے، گولا لاٹھی لگا کر درختوں سے اُلٹے لٹکاتے، سؤر اور گائے کا خُون فرشِ زمین سے چاٹ کر صاف کروایا، توپ سے اُڑایا، اسباب چھینا، گھر بار سے

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷، مطبوعہ لاہور، ص ۳۵۱

نکالا، جائدادیں ضبط کیں، کالے پانی کی سزائیں دیں، ایسے بے شمار طُرقِ مظالم ایجاد کیے جن کے پیشِ نظر کوئی انصاف پسند اُنھیں پھُول نہیں بلکہ شُعلہ سمجھنے پر مجبور ہوگا، اُن کی ظاہری عنایات کو حریر و پرنیاں کا فرش نہیں بلکہ خارزار ہی قرار دے گا۔ خود بعض انگریز مورّخوں اور انصاف پسند افسروں نے اپنی قوم کے اِن مظالم کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا اور اُن سے اپنی برأت کا اظہار کیا ہے۔

اِس باب کے گزشتہ اوراق میں ہم نے متحدہ ہندوستان پر انگریزوں کے تسلّط، لُوٹ مار اور جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں اُنھوں نے بربریت کے جو المناک مناظر پیش کیے، اُن کو بیان کیا، جس کی محض یہی وجہ ہے کہ ایک طرف انگریزوں کے مظالم پیش کیے جائیں اور دوسری طرف بعض صاحبانِ جُبّہ و دستار اور علم پیر کے ابین کہلانے والوں کے اس مشعلِ راہ کتاب کے بابِ چہارم میں ایسے بیانات و اعلانات بھی قارئین کرام کے سامنے رکھے جائیں، جن میں اُنھوں نے انگریز کو خار نہیں بلکہ پھُول بتایا ہے۔ ظالم نہیں بلکہ عادل ٹھہرایا ہے، اُنھیں اپنا پشت پناہ اور حامی و ناصر بنایا ہے۔ ایسے بیانات اور حوالے پیش کر کے ہم قارئین کرام سے انصاف چاہیں گے اور فیصلے کے طلب گار رہوں گے۔

ولانا غلام رسول مہر کا سوال اپنی جگہ پر بجا ہے لیکن یہ یقین نہیں آتا کہ ایسے وسیع النظر ورخ سے وُہ تاریخی چہرے پنہاں ہوں جنھوں نے انگریزوں کو خار نہیں بلکہ پھُول بتایا ہے یقیناً اُنھیں خبر ہوگی اور اُن جیسے کتنے ہی اہلِ علم اِس حقیقت سے آگاہ ہیں، لیکن یہ راز سمجھنے سے ہم آج تک قاصر رہے کہ ایسے حضرات خار کو پھُول بتانے والوں کے گرویدہ کیوں بنے رہتے ہیں؟

علمائے کرام اور جنگِ آزادی : آخر میں چند اُن علمائے کرام کا ذکرِ خیر کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں سرگرم حصّہ لیا تھا۔ مولانا احمد اللہ شہید جنھوں نے بریلی اور شاہجہان پور وغیرہ کے معرکوں میں انگریزوں کے نامی گرامی جرنیلوں کو بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا اور حریت پسندوں میں نئی رُوح پھونک کر اُس لاقے سے انگریزوں کے قدم اُکھاڑ دیے تھے۔ اِن کے جنگی کارناموں کی ایک جھلک

گزشتہ صفحات میں دکھائی جا چکی ہے۔ موصوف ۱۸۴۰ء سے برطانوی اقتدار کے خاتمے اور اسلامی حکومت کے قیام کی خاطر سرگرمِ عمل تھے۔ چنانچہ موصوف کے بارے میں مفتی انتظام اللہ شہابی یوں رقمطراز ہیں:

> "۱۸۴۰ء میں مولانا احمد اللہ شاہ دلاور جنگ بن محمد علی، نواب چیپا پٹن، جے پور میں میر قربان علی، گوالیار میں محراب شاہ قلندر سے بیعتِ جہاد کرتے ہوئے دِلّی گئے۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ کے مشورہ سے آگرہ آئے۔ مفتی انعام اللہ خاں بہادر کے یہاں مقیم ہوئے۔ مجلسِ علماء کی تشکیل کی اور بیعتِ جہاد کا سلسلہ شروع کر دیا۔" [1]

مولانا فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۸ھ) جو ۱۸۵۷ء میں فتویٰ جہاد کے محرک اور جاری کرنے والے تھے، اُن کے بارے میں زمانۂ حال کے قابلِ فخر مورّخ جن
پروفیسر محمد ایوب قادری یُوں رقمطراز ہیں:

> "جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے مردانہ وار حصّہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خاں کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ آخر میں گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا، لبعبور دریائے شور کی سزا ہوئی، جزیرۂ انڈمان بھیجے گئے اور وہیں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء میں انتقال ہوا۔" [2]

مفتی انتظام اللہ شہابی نے اِس سلسلے میں فتویٰ جہاد اور علّامہ کی حریت پسندان
سرگرمیوں کا ذرا وضاحت کے ساتھ اپنے لفظوں میں یُوں تذکرہ کیا ہے:

> "کمپنی کے عمّال کی بدعہدی، خودغرضی اور بدنیتی نے فرنگیوں کو بالکل بے نقاب کر دیا تھا۔ عوام اعراض کرنے لگے تھے تو خواص کا کیا عالم ہوگا؟ دیسی

---

[1] انتظام اللہ شہابی، مفتی: مولوی فضل حق خیرآبادی اور پہلی جنگِ آزادی، مطبوعہ کراچی، ص

[2] محمد ایوب قادری، پروفیسر: ترجمہ اُردو تذکرہ علمائے ہند، مطبوعہ کراچی، ص ۳۸۳

بدلیسی کی کشمکش کی یہ زبردست ٹکر بالکل فطری تھی اور آخر ۱۰؍ مئی، ۱۸۵۷ء کو دل کا غبار آتش فشاں بن کر پھوٹ نکلا۔ عوام کی اِس بے چینی کا اثر مولانا (فضل حق خیرآبادی) پر بھی پڑے بغیر نہ رہا۔ وُہ دہلی آتے ہی قلعہ میں گئے۔ بہادر شاہ سے اگلی راہ و رسم تھی۔ بادشاہ اِن کو دیکھ کر بہت خوش ہُوئے۔ اِنھوں نے ایک اشرفی نذر کی، موجودہ صورتِ حال کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی، بادشاہ کی اُمنگیں ختم تھیں، دُوسرے شہزادوں کی لوٹ کھسوٹ اور تختِ شاہی کی تمنائیں باہمی رقابت کا میدان گرم کیے ہُوئے تھیں۔ مولانا نے دیکھا کہ عمائدِ شہر میں بھی دُو گروہ تھے، ایک بادشاہ کا ہمنوا، دُوسرا حکومتِ کمپنی کا بہی خواہ۔ فوجوں کا جائزہ لیا۔ حریت پسندوں کی دُو جماعتیں ایسی بھی تھیں جو ایک مقصد کو لیے ہُوئے جان پر کھیل رہی تھیں۔ ایک جماعت مجاہدین کی تھی، دوسری جماعت روہیلوں کی۔ یہ لوگ جنرل بخت خاں سردارِ روہیلہ کی زیرِ کمان تھا۔ مولانا کی خبر سُن کر جنرل بخت خاں ملنے آئے۔

چنانچہ مولانا نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ جمعہ کے روز جامع مسجد میں علماء کے سامنے تقریر کی اور استفتاء پیش کیا۔ مفتی صدرالدین خاں جزبز ہُوئے۔ مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولوی فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی، سید مبارک شاہ رامپوری وغیرہ نے دستخط کر دیے، مگر مفتی صاحب (مفتی صدرالدین آزردہ) بالخیر کو بالجبر لکھ گئے۔ اِس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ دہلی میں نوّے ہزار سپاہ جمع ہوگئی تھی۔"[1]

علامہ فضل حق خیرآبادی (المتوفی ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء) معقولات کے امام و مجتہد، فنِ مناظرہ میں لاثانی، متبحر عالمِ دین اور ماہرِ قانون تھے کیونکہ سر رشتہ دار سے صدر الصدوری تک کے فرائض

---

[1] انتظام اللہ شہابی، مفتی: مولوی فضل حق خیرآبادی اور جنگِ آزادی، ص ۳۵

امتیازی شان سے ادا کر چکے تھے۔ جب علاّمہ گرفتار ہو گئے اور مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تو لُطف کی بات یہ ہے کہ کسی وکیل کی خدمات حاصل نہیں کیں بلکہ آپ سرکاری وکیل سے خود بحث کرتے تھے۔ برطانوی قانون کے شکنجے کو آپ تارِ عنکبوت کی طرح توڑ کر عدالت کو رہائی پر مجبور کر دیتے تھے۔ سرکاری وکیل کو ہر بار لاجواب کر کے آپ اِس طرح کِھلا رہے تھے جیسے بلّی کسی چُوہے کو مُنہ میں دبا کر بعض اوقات ڈھیلا کر دیتی ہے۔ مثلاً:

> ”سیرۃ العلماء“ میں ہے کہ ۱۸۵۹ء میں سلطنتِ مغلیہ کی وفاداری یا فتویٰ جہاد کی پاداش میں مولانا موصوف (فضل حق خیر آبادی) ماخوذ ہو کر سیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے، مقدمہ چلا، مولانا موصوف کے فیصلے کے لیے جیوری بیٹھی۔ ایک اسیسر نے واقعات سُن کر بالکل چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ وکیلِ سرکار کے مقابل خود مولانا بحث کرتے تھے، بلکہ لطف یہ تھا کہ چند الزام اپنے اوپر خود قائم کرتے اور خود ہی مثلِ تارِ عنکبوت عقلی و قانونی بحث سے توڑ دیتے تھے۔ جج یہ رنگ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ جج نے صدر الصدوری کے عہد میں مولانا سے کچھ عرصہ کام بھی سیکھا تھا، وُہ مولانا کی عظمت اور تبحر سے واقف بھی تھا، وُہ دل سے چاہتا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں، اُسے بیحد ہمدردی تھی۔ اُس وقت تک صورت بھی یہ تھی کہ مولانا پر جُرم ثابت نہیں ہو رہا تھا اور اُمید تھی کہ بری ہو جائینگے وکیل لاجواب تھے۔“ [1]

ماہرِ قانون اور امامِ عقلیات ہونے کی بنا پر سرکاری وکیل کو لاجواب تو کر دیا، قانون کی رُو سے عدالت جُرم ثابت نہیں کر پاتی لیکن حقیقت تو اپنی جگہ ہے کہ فتویٰ جہاد آپ ہی کا جاری کردہ تھا۔ بہادر شاہ ظفر، جنرل بخت خاں، مولانا احمد اللہ شہید اور حضرت محل کو جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں اہم مشورے، جنگی تیاریوں، مقابلے کی صورتوں اور اپنی خامیوں کو پُورا کرنے کے بارے میں تجویزیں پیش کرتے رہے۔ علماء کا جو بورڈ تشکیل دیا گیا تھا اُس میں آپ بھی شامل تھے۔ لکھنؤ سے دہلی آتے ہُوئے راستے میں شہروں اور دیہات میں انگریزوں کے خلاف

---

[1] انتظام اللہ شہابی، مفتی: مولوی فضل حق خیر آبادی اور پہلی جنگِ آزادی، ص ۳۷

جہاد کرنے کے لیے کمربستہ ہو جانے کی تلقین کرتے ہُوئے آئے تھے۔ اگر قانون کے ذریعے عدالت اِن میں سے کسی امر کو بھی گواہوں کے ذریعے ثابت نہ کر سکی تو نہ سہی لیکن اِس سے حقیقت تو نہیں بدل گئی تھی۔ اِس حق پسندی اور صداقت کی داد کہاں تک دی جائے کہ قانون کو لاجواب کر دینے کے باوجود، بری ہونے کے نزدیک پہنچ کر خود اعلان کرتے ہیں کہ فتوٰی میرا تھا، علمأ نے میرے کہنے سے اُس کی تصدیق و تائید کی تھی۔ اِس اقرار کا نتیجہ صاف ظاہر تھا لیکن علامہ نے ثابت کر دکھایا کہ مَیں نے قانون کے شکنجے کو توڑ دیا ہے لیکن جس کام کو شریعت کا تقاضا سمجھ کر کیا ہے، آج اُس کا اظہار نہ کر کے، خدا کے اِس انعام اور اپنے شرعی فریضے کی ادائیگی کا انکار کر کے عظیم اخروی سعادت سے خود کو محروم کیوں قرار دُوں؟ علامہ کے اِس تاریخی فیصلے نے اُنھیں اہلِ عزیمت کی صف میں امتیازی مقام پر کھڑا کر دیا ہے۔ چنانچہ مفتی صاحب موصوف لکھتے ہیں:

> "دُوسرا دن آخری دن تھا۔ مولانا نے اپنے اُوپر کے بقیہ الزام رد کر دیے۔ پھر پلٹا کھایا اور کہا: جس مخبر نے فتوٰی کی خبر کی اُس کے بیان کی اب میں توثیق و تصدیق کرتا ہُوں، میرا ہی لکھا ہُوا ہے اور میرے ہی مشورہ سے علمأ نے دستخط کیے۔ پہلے اُس گواہ نے سچ رپورٹ لکھوائی تھی مگر اب عدالت کے سامنے میری صورت سے مرعوب ہو کر جھوٹ بولا ہے۔ مجھے خدا کے حضور میں جانا ہے غلط بات مذہب کے مسئلہ میں نہیں بول سکتا۔ جج اِس بیان سے حیران ہو گیا گھڑی گھڑی مولانا کو روکتا تھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ رنگ دُوسرا ہو چکا تھا جج کو رعایت کی (اقبالِ جرم کی قانونی صورت میں) کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ بصد رنج و غم حبسِ دوام کا حکم سُنایا۔ مولانا نے بڑی مسرت سے حکم کو منظور کیا..... آخرش مولانا انڈمان روانہ ہو گئے۔"[1]

مولانا کی اِس عزیمت کی قدر اہلِ کمال ہی کر سکتے ہیں۔ قانونی طور پر رہائی یقینی ہو چکی ہے،

---

[1] انتظام اللہ شہابی، مفتی: مولوی فضل حق خیر آبادی اور پہلی جنگِ آزادی، ص ۳۹

جس جرأت و استقلال سے فتویٰ جاری کیا ، اُسی عزم و استقامت سے تمام قانونی شکنجوں کو توڑ کر ، وکیلِ سرکار کو لاجواب کر کے خود اقرار کرتے ہیں ۔ اِس اقرار کے نتائج سامنے ہیں ، قانونی سزا معلوم ہے مگر دنیا کی زندگی میں ہر تکلیف اٹھانے اور ہر سخت سے سخت سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اگرچہ دنیاوی راحتیں جواب بھی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ قانونی رہائی کے پسِ پردہ علامہ کے استقبال کے لیے تیار کھڑی تھیں ، آپ کی قدم بوسی کی منتظر تھیں لیکن آفرین ہے اِس جرأتِ رندانہ پر کہ ایسی رہائی اور دنیاوی تمام راحتوں کو پائے استحقار سے ٹھکرا اپنے عظیم کارنامے فتویٰ جہاد کا ، جو حریت پسندوں کے لیے صورِ اسرافیل اور فرنگی اقتدار پر صاعقہ تھا ، خود اقرار کر لیتے ہیں اور ہر دنیاوی سختی کو خندہ پیشانی کے ساتھ سہنے کے لیے از خود تیار ہو جاتے ہیں ۔ قافلۂ سالارِ عشق سیدالشہداء امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صبر و استقامت کی اِس آخری زمانے میں جھلک دکھا دینے والے اور امامِ ربّانی حضرت مجدد الف ثانی سرہندی قدس سرہٗ کی جرأتِ رندانہ کی یاد پھر تازہ کر دکھانے والے اِس خیر آبادی مردِ قلندر کو باری تعالیٰ اپنی خاص نعمتوں سے نوازے ، اِسلام اور مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر دے ۔ آمین یا اللہ العالمین ؎

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

جب علّامہ کو بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی ، جزیرہ انڈمان بھیجے گئے تو اِس شاہانہ زندگی گزارنے والے ، ناز و نعم میں پلنے اور پروان چڑھنے والے ، کہ دولت جس کی لونڈی ، ہاتھی اور پالکی کی سواری میسّر ، درباروں اور سرکاروں میں راہ و رسم تھی ، اُس علّامہ سے انڈمان میں کیا کام لیا جاتا تھا ؟ یہ مفتی صاحب مذکور سے پُوچھیے :

”مولانا کو انڈیمان میں خدمت بہت ذلیل سپرد کی گئی تھی ، بارکوں کی صفائی کیا کرتے تھے ۔“ [1]

---

[1] انتظام اللہ شہابی ، مفتی : مولوی فضل حق خیر آبادی اور پہلی جنگِ آزادی ، ص ۴۱

مولانا فیض احمد بدایونی بھی، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مردانہ وار حصّہ لینے والے علمائے کرام میں سے ایک ہیں۔ موصوف کے بارے میں پروفیسر محمّد ایوب قادری یُوں رقمطراز ہیں:

> "مولانا فیض احمد، مولوی عبدالقادر (بدایونی بن مولانا فضل رسول) کے پھوپھی زاد بھائی اور بہنوئی تھے۔ مولانا فیض احمد نے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مردانہ وار حصّہ لیا۔"[1]

مولانا فیض احمد بدایُونی کے متعلق دُوسری جگہ موصوف نے یُوں تفصیلی وضاحت کی ہے:

> "مولانا فیض احمد بدایونی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے نامور مجاہدین میں ہیں۔ مولوی رحمت اللہ کیرانوی اور پادری فنڈر کے درمیان جو مناظرہ ۱۰ر اپریل ۱۸۵۴ء کو آگرہ میں ہوا، اُس میں بھی مولانا فیض احمد بدایونی کی سرگرمیوں کو دخل تھا۔ مولانا اُس زمانہ میں وہاں بورڈ آف ریونیو میں سررشتہ دار تھے ..... جب جنگِ آزادی کا آغاز ہوا تو ڈاکٹر وزیر خاں کے ہمراہ سیدھے دہلی پہنچے اور بادشاہِ دہلی کی طرف سے ذمہ دار عہدوں پر سرفراز رہے۔ سقوطِ دہلی کے بعد روہیل کھنڈ کا رُخ کیا۔ بدایُوں (گکرالہ) اور بریلی وغیرہ میں انگریزوں سے مقابلہ کیا۔ اِس کے بعد اودھ کی طرف نکل گئے اور پتہ نہیں چلا کہ کہاں گئے اور کیا حشر ہوا۔"[2]

مولانا کفایت علی کافی مرادآبادی جو اہلسنت وجماعت کے جیّد عالمِ دین اور سچّے عاشقِ رسول تھے، اِنھوں نے بھی ۱۸۵۷ء میں پُوری سرگرمی اور جوش وخروش کے ساتھ حصّہ لیا تھا۔ اِسی جُرم کی پاداش میں آپ گرفتار ہوتے، سزائے موت کا حکم مِلا اور پھانسی دی گئی۔ پروفیسر موصوف نے آپ کے کارناموں کا یُوں اعتراف کیا ہے:

> "مولانا کفایت علی نام، کافی تخلص تھا، مرادآباد کے رہنے والے تھے۔

---

[1] محمد ایوّب قادری : تذکرہ علمائے ہند اردو ، مطبوعہ کراچی، ص ۴۵

[2] ایضاً : ص ۳۸۶

> تحصیلِ علم بدایوں، رامپور اور لکھنؤ میں کی۔ مفتی ظہور اللہ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مردانہ وار حصّہ لیا۔ مراد آباد کے صدر الشریعتہ بنائے گئے۔ مراد آباد پر جب انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو مئی ۱۸۵۸ء میں اِن کو پھانسی دی گئی۔ قبر عقبِ جیل ہنوز موجود ہے۔ ہمیشہ نعت لکھتے تھے۔ شرحِ شمائل ترمذی کا نظم میں ترجمہ کیا۔ مولانا کفایت علی کافی کے ہاتھ کا تحریر کردہ شمائل ترمذی کا پہلا مسوّدہ خاکسار مترجم کے پاس محفوظ ہے۔“ ۱؎

مفتی صدر الدّین خاں آزردہ (المتوفی ۱۲۸۵ھ / ۱۸۷۰ء) دہلی میں صدر الصدوری کے عہدے پر فائز تھے۔ ۱۸۵۷ء میں فتاویٰ جہاد کی تصدیق و تائید کی اور آپ کی وجہ سے اُس فتوے کی خوب نشر و اشاعت ہوئی۔ جب حریّت پسند ناکام رہے اور فرنگی دوبارہ غالب آئے تو اُنھوں نے موصوف کے ساتھ جو سلوک کیا، ملاحظہ ہو:

> ”۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء میں غدر کے زمانہ میں فتویٰ جہاد کے اتہام میں منصب اور جائداد منقولہ و غیر منقولہ اِن سے چھین لی گئی۔ چند مہینے نظر بند بھی رہے۔ تحقیقات کے بعد رہا ہوئے۔ جائداد غیر منقولہ واپس مل گئی اور جائداد منقولہ جو نیلام ہو چکی تھی نہ مِلی۔“ ۲؎

مفتی صاحب موصوف کے بارے میں یہی پروفیسر محمد ایوب قادری آگے یوں وضاحت فرماتے ہیں:

> ”جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں فتویٰ جہاد پر دستخط کیے۔ اُس کی وجہ سے گرفتاری، عزلِ منصب اور ضبطیِ جائداد کی نوبت پہنچی۔ چند ماہ کے بعد رہائی ہوئی۔ نصف جائداد واگزاشت ہوئی۔ ..... تین لاکھ روپے کی مالیت کا کتب خانہ ۱۸۵۷ء میں ضبط ہوگیا، اُس کے حصول کے لیے لارڈ لارنس کے پاس

۱؎ محمد ایوب قادری : تذکرہ علمائے ہند اردو ، ص ۲۴۳ ، ۲۴۴

۲؎ ایضاً : ص ۲۴۷

لاہور پہنچے، مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔"[1]

مفتی عنایت احمد کاکوروی (المتوفی ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۳ء) بھی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف مردانہ وار لڑے، فتویٰ جہاد کی تشہیر کی اور لوگوں کو انگریزوں کے خلاف خوب اُبھارتے رہے۔ کالے پانی کی سزا ملی اور جزیرۂ انڈمان بھیجے گئے۔ مفتی صاحب کے بارے میں قادری صاحب نے ضمناً لکھا ہے:

> "مفتی لطف اللہ ولد شیخ اسد اللہ ۔۔۔۔۔ پندرہ برس کی عمر کے بعد مفتی عنایت احمد کاکوروی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مفتی صاحب (مفتی عنایت احمد کاکوروی) اُس زمانہ میں مفتی و منصف تھے، عہدۂ افتاء کے ساتھ مفتی عنایت احمد صاحب سلسلۂ درس و تدریس بھی جاری رکھتے تھے۔ جب مفتی عنایت احمد صاحب کا تبادلہ بحیثیت صدر امین علی گڑھ سے بریلی ہوا تو مولوی لطف اللہ صاحب بھی مفتی صاحب کے ہمراہ پہنچے۔ وہاں جملہ کتب درسیہ کی تحصیل سے فراغت حاصل کی۔ بعد فراغ مفتی صاحب نے اپنے ہی اجلاس کا سررشتہ دار مقرر کر لیا۔ اُسی زمانہ میں جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہو گیا۔ ۔۔۔۔۔ جب مفتی عنایت احمد انڈمان سے واپس آئے تو مدرسہ فیض عام کانپور میں اُنھوں نے مولوی لطف اللہ صاحب کو مدرس دوم رکھ لیا، پھر مدرس اوّل ہو گئے۔"[2]

مفتی عنایت احمد کاکوروی علیہ الرحمہ، بریلی میں خان بہادر خاں کے مشیر اور جنرل بخت خاں کے ہمراہ رہے تھے۔ مولانا احمد اللہ شہید نے علماء کی جو جہاد کمیٹی بنائی تھی آپ بھی اُن حضرات میں شامل تھے۔ بعبور دریائے شور کی سزا ملی اور جزیرہ انڈمان بھیجے گئے تھے لیکن ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۱ء میں وہاں سے رہا کر دیے گئے اور واپس گھر آپہنچے۔ جب آپ حجِ بیت اللہ

---

[1] محمد ایوب قادری: تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۲۴۸

[2] ایضاً: ص ۴۵۱

اور زیارتِ روضۂ مطہرہ کی غرض سے جا رہے تھے تو جدّہ کے قریب اُن کا جہاز کسی چٹان سے ٹکرایا اور نماز پڑھتے ہوتے، ۲۷ر شوال ۱۲۷۹ھ / ۱۷ر اپریل ۱۸۶۳ء کو مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ انّا لِلّٰہ و انّا الیہ راجعون۔

مولانا رسول بخش کاکوروی شروع میں نواب واجد علی شاہ والیٔ اودھ کی فوج میں ملازم تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے موقع پر آپ نے کاکوری اور اُس کے نواح میں تقریریں کر کے انگریزوں کے خلاف ایک لشکرِ جرّار تیار کر لیا تھا۔ اودھ کے فوجیوں کا کافی حصّہ آپ کے جھنڈے تلے آ کر جمع ہو گیا تھا۔ تیاریاں جب مکمل ہو گئیں اور حملہ کرنے کی تجویزیں کی جا رہی تھیں، تو انگریزوں نے اِس عظیم مجاہد کو اُس کے سترہ ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا اور شاہ پیر محمد کے ٹیلے پر اِن جملہ مجاہدینِ جنگِ آزادی کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون۔

مولانا رضا علی خاں بریلوی، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وقت عمر کی اڑتالیس منزل طے کر چکے تھے۔ آپ خان بہادر خاں کے نہ صرف مشیر بلکہ سرپرست بن کر رہے۔ جنرل بخت خاں کی ہدایات کے بموجب خان بہادر خاں کبھی مولانا رضا علی خاں کی ہدایت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ موصوف کا وصال ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء میں ہوا۔ اِنّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون۔

مولانا نقی علی خاں (المتوفی ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء) ابن مولانا رضا علی خاں بریلوی رحمۃ اللّٰہ علیہما جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے وقت آپ خان بہادر خاں کے دستِ راست بن کر رہے۔ جنرل بخت خاں اور مولانا احمد اللّٰہ شہید نے علماء کی جو "جہاد کمیٹی" بنائی تھی اُس میں مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی اور مولانا رضا علی خاں بریلوی سرِ فہرست تھے۔ مولانا نقی علی خاں بریلوی کی ڈیوٹی مجاہدین کے لیے رسد کا انتظام کرنا تھا۔

مولانا وہّاج الدین مرادآبادی رحمۃ اللّٰہ علیہ اپنے علاقہ مرادآباد میں امیر المجاہدین اور مولانا کفایت علی کافی رامپوری اِن کے دستِ راست تھے۔ ان بزرگوں نے مرادآباد سے انگریزی تسلّط کا خاتمہ کر دیا تھا۔ مولانا وہّاج الدین نے جنرل بخت خاں اور صوبیدار بریلی خان بہادر خاں سے مکمل رابطہ رکھا ہوا تھا۔ شہزادہ فیروز شاہ کی معیت میں مرادآباد کے آخری معرکے میں شکست کھائی، روپوشی کی حالت میں انگریزوں کے ہاتھوں شہید ہوتے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ان حضرات کے علاوہ مولانا معین الدین اجمیری، مولانا ارشاد حسین رامپوری، مولانا ہدایت الرسول، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا امام بخش صہبائی، مولانا تراب علی خواجہ، مفتی ریاض الدین، مولانا غلام جیلانی، مولانا کریم اللہ، مولانا غلام احمد شہید، مفتی عبدالوہاب گوپامئوی، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی، مفتی انعام اللہ خاں، مولانا سرفراز علی شاہجہان پوری، مولانا لیاقت علی الہ آبادی، مولانا اعتقاد علی بیگ، مولانا نورالحسن، مولانا رضی الدین بدایونی اور دیگر سیکڑوں علمائے دین نے سرگرم حصہ لیا۔ بعض میدان جنگ میں مارے گئے تو بعض کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ کتنے ہی تھے جو پھانسی پر لٹکائے گئے اور کئی حضرات کو بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔

یہاں ایک حقیقت کا اظہار کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا غلام رسول مہر نے اپنی تصنیف ۱۸۵۷ء کے صفحہ ۲۰۵ پر مولانا احمد اللہ شہید اور جنرل بخت خاں کو وہابی بتا کر ان حضرات کی روحوں کو تڑپانے کی مذموم سعی کی ہے حالانکہ یہ مولانا شہید تو سید قربان علی شاہ جے پوری علیہ الرحمہ کے مرید تھے اور خرقۂ خلافت آپ نے پیر محراب شاہ قلندر گوالیاری رحمۃ اللہ علیہ سے پایا تھا۔ جب علامہ فضل حق خیرآبادی دہلی پہنچے تو جنرل بخت خاں اُن سے خود ملنے آئے تھے۔ جنرل بخت خاں کے قلب و دماغ میں اگر وہابیت کا ادنیٰ شائبہ بھی ہوتا تو علامہ خیرآبادی جیسے دشمنِ خارجیت و وہابیت سے ملنا کب گوارہ کیا جاتا بلکہ دہلی میں وہابی علماء بھی موجود تھے لیکن کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ بخت خاں اُن کے پاس گئے ہوں یا وہ حضرات خود آئے ہوں اور اپنی حمایت کا یقین دلایا ہو۔ ان سب باتوں پر طرہ یہ کہ مولانا احمد اللہ شہید اور جنرل بخت خاں نے جو علماء کی "جہاد کمیٹی" بنائی تھی اُس کے سرخیل علامہ فضل حق خیرآبادی (المتوفی ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء)، مفتی عنایت احمد کاکوروی (المتوفی ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء)، مولانا رضا علی خاں بریلوی (المتوفی ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء) اور مولانا فیض احمد بدایونی (المتوفی ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء) تھے۔ اگر یہ حضرات وہابی ہوتے تو جہاد کمیٹی کے سربراہ علمائے اہلسنت کیوں بنائے جاتے، کیا وہابی علماء پر مشتمل "جہاد کمیٹی" نہ بنائی جاتی؛ معلوم کچھ ایسا ہوتا ہے کہ وہابیوں میں شاید

جھُوٹ بولنے کو عیب شمار نہیں کیا جاتا، یا ہو سکتا ہے کہ یہ امکانِ کذبِ باری تعالیٰ کے عقیدے کا اثر ہو کہ جب وُہ اپنے معبود کو جھُوٹا مانتے ہیں تو خود جھُوٹ سے کیوں پرہیز کریں؟ ہو سکتا ہے کہ مولانا غلام رسول مہر جیسے بھاری بھر کم مورّخ نے اِسی وجہ سے یہ پہاڑ جتنا جھُوٹ بولنا کوئی عیب یا تاریخ پر ظلم نہ شمار کیا ہو۔

ایک تاریخی مغالطے کا حل

اِسی سلسلے میں ایک اور تاریخی مغالطے کا ازالہ بھی از حد ضروری نظر آتا ہے۔ وہ یہ کہ بعض علماء کے بارے میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک یہی بتایا جاتا رہا، اُنھوں نے خود بھی کہا کہ ہم برٹش گورنمنٹ کے ہرگز ہرگز خلاف نہیں ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں اُنھوں نے مطلقاً حریت پسندوں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ اگر کسی سے ہو سکا تو خفیہ یا اعلانیہ انگریزوں کی نصرت ضرور کی ورنہ خاموش رہے۔ ۱۹۴۷ء میں نوّے سال بعد جب انگریز یہاں سے دوڑ گئے، تو بعض حضرات نے اپنے قلم کا زور اِس امر پہ صَرف کرنا شروع کیا کہ ہمارے وُہ علماء تو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ہیرو بلکہ انگریزوں کے اصلی بھگانے والے اور ملک کو آزادی کی نعمت سے مالا مال کرنے والے تھے۔ اِس سلسلے میں ہم اُن علماء کے بارے میں دونوں قسم کے بیانات پیش کرتے ہیں تاکہ قارئینِ کرام اِس تصویر کے دونوں رُخ دیکھ کر آسانی سے فیصلہ کر سکیں:

تصویر کا ایک رُخ

۱۔ "مولانا رشید احمد گنگوہی ۶ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۹ء میں گنگوہ ضلع سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام شیخ ہدایت احمد ولد پیر بخش[۱] ہے ...... حضرت حاجی امداد اللہ کے مرید

---

[۱] پیر بخش نام رکھنا تو تقویۃ الایمان، فتاویٰ رشیدیہ اور بہشتی زیور حصّہ اول وغیرہ کتابوں میں شرک لکھا ہے۔ یہ فقہی مسئلہ تو علمائے دیوبند ہی حل فرما سکتے ہیں کہ دادا جان کے مشرک ہونے سے اولاد کے نسب میں تو کوئی فرق نہ آئے گا؟

ہوئے۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں معرکہ شاملی میں شریک ہوئے۔ جس کے نتیجے میں چھ ماہ قید و بند کے شدید مصائب جھیلے۔ دارالعلوم اسلامیہ دیوبند کے بانیوں اور سرپرستوں میں رہے۔ ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا۔"[1]

مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کے پہلے صدر مدرس اور شیخ الحدیث یعنی مولانا محمد مظہر نانوتوی (المتوفی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء) کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری یوں تحریر فرماتے ہیں:

۲۔ "مولوی محمد مظہر نانوتوی بن حافظ لطف علی ۱۸۲۳ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اور حفظِ قرآن اپنے والد سے کیا۔ پھر مولانا مملوک علی سے علوم مروّجہ کی تحصیل کی (یعنی دہلی کالج میں)۔ علمِ حدیث شاہ عبدالغنی سے حاصل کیا۔ تحصیلِ علم کے بعد اجمیر کالج میں ملازم ہو گئے۔ وہاں سے آگرہ کالج تبادلہ ہوا۔ جنگِ آزادی میں مردانہ وار حصّہ لیا۔ جہاد شاملی میں شریک ہوئے۔ پیر میں گولی لگی۔ کچھ دنوں بریلی رہے، معافی عام پر رہا ہوتے۔"[2]

مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری نے اِس واقعے کو تفصیل سے مولانا حسین احمد فیض آبادی سابق صدر دارالعلوم دیوبند کی تصریح کے مطابق "نقشِ حیات" جلد ثانی کے صفحہ ۴۲ تا ۴۴ کے حوالے سے یوں نقل کیا ہے:

۳۔ "جب انقلاب ۱۸۵۷ء کی تحریک اطراف و جوانب ہند خصوصاً اطرافِ دہلی میں چلنی شروع ہوئی تو اِن حضرات کے جوش و خروش میں نئی حرکت پیدا ہوئی۔ اِن بزرگوں نے محسوس کیا کہ اِس انقلاب میں حصّہ لینا فرض اور لازم ہے۔ وُہ انگریزوں کے افعالِ ماضیہ اور احوالِ حاضرہ پر بخوبی مطلع تھے۔ اِس تمام جماعت میں حضرت شاہ ضامن صاحب قدس سرہ العزیز زیادہ

---

[1] محمد ایوب قادری: تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۵۰۰

[2] ایضاً: ص ۵۰۳

پیش پیش تھے ۔ حاجی امداد اللہ صاحب تحریکِ انقلاب میں حافظ صاحب کے ہمنوا ضرور تھے مگر پیش پیش اور اُس قدر جوش میں نہ تھے . . . . . بدقسمتی سے مولانا (شیخ محمد تھانوی) کی رائے یہ تھی کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں ۔

اِس اختلاف اور فتوٰی کی بنا پر حضرت مولانا رشید احمد صاحب اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو اُن کے اوطان سے دونوں حضرت نے بلوا لیا . . . . . حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو امام مقرر کیا گیا اور حضرت مولانا محمد قاسم کو سپہ سالارِ افواج قرار دیا گیا اور مولانا رشید احمد صاحب کو قاضی بنایا گیا اور مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی کو میمنہ ، میسرہ کا افسر قرار دیا گیا ۔ چونکہ اطراف و جوانب میں مذکورہ بالا حضرات کے تقوٰی ، علم و تصوّف اور تشرع کا بہت زیادہ شہرہ تھا . . . . . اُس وقت تک ہتھیاروں پر پابندی نہ تھی ، عموماً لوگوں کے پاس ہتھیار تھے جن کو رکھنا اور سیکھنا مسلمان ضروری سمجھتے ، مگر یہ ہتھیار پُرانی وضع کے تھے ۔ بندوقیں توڑے دار تھیں ، کارتوسی رائفلیں نہ تھیں ، یہ صرف انگریزی فوجوں کے پاس تھیں ۔ مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے اور تھانہ بھون اور اطراف میں اسلامی حکومت قائم کر لی گئی اور انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دیے گئے . . . . . جب پلٹن مع توپ خانہ باغ کے سامنے سے گزری تو سب نے یکدم فَیر کیا ۔ پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی ہوں جو یہاں چھپے ہُوئے ہیں ۔ توپ خانہ چھوڑ کر سب بھاگ گئے ۔ حضرت گنگوہی صاحب نے توپ خانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحب کے سامنے لاکر ڈال دیا ۔ اِس سے اِن حضرات کی . . . . . ہر قسم کی قابلیت کا سکّہ بیٹھ گیا ۔

شاملی اُس زمانہ میں مرکزی مقام تھا ، ضلع سہارنپور سے متعلق تھا ۔ وہاں تحصیل بھی تھی اور فوجی طاقت بھی وہاں رہتی تھی ۔ قرار پایا کہ اُس پر حملہ

کیا جائے۔ چنانچہ چڑھائی ہوئی اور قبضہ کر لیا گیا۔ جو غافت پولیس اور فوج کی وہاں تھی مغلوب ہو گئی۔

حضرت حافظ ضامن صاحب اسی معرکہ میں شہید ہو گئے۔ حضرت حافظ ضامن صاحب کا شہید ہونا تھا کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔"[1]

پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب نے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے میں اضافہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

۴۔ "جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون اور اس کے قرب وجوار کے مسلمانوں نے حضرت حاجی صاحب کو امیرِ جہاد مقرر کر کے شاملی ضلع مظفر نگر میں انگریزوں سے سخت مقابلہ کیا، جس میں حافظ محمد ضامن صاحب شہید ہوئے۔ اس معرکۂ جہاد میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی اور قاضی عنایت علی تھانوی وغیرہ حضرات شریک تھے۔ جنگِ آزادی کا فیصلہ انگریزوں کے حق میں ہوا۔ حاجی امداد اللہ ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء میں مکہ معظمہ ہجرت کر گئے اور اپنی سرگرمیوں کا مرکز مکہ معظمہ کو بنا لیا۔ مکہ معظمہ ہی میں ۱۲۔ جمادی الآخر، ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء میں انتقال ہوا۔"[2]

قارئینِ کرام! مذکورۃ الصدر علماء کے بارے میں تصویر کا ایک رنگ پیش کر دیا ہے کہ ان حضرات نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصّہ لیا تھا۔ بہر حال اس دعوے کو سامنے رکھیے اور اسی تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیے۔

اسی تصویر کا دوسرا رخ

مولوی محمد احسن نانوتوی جو ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء سے بنارس کالج میں فارسی کے مدرس اوّل رہے اور ۱۲۶۷ھ

---

[1] عزیز الرحمٰن بجنوری، مفتی: تذکرہ مشائخ دیوبند، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۷۶ تا ۸۰

[2] محمد ایوب قادری، تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۱۲۳

۱۸۵۱ء میں تبدیل ہو کر بریلی کالج آ گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وقت بھی برٹش گورنمنٹ کے وفادار اور خیر خواہ رہے جیسا کہ پروفیسر محمد ایوب قادری تصریح فرماتے ہیں:

۵۔ "۲۲؍ مئی (۱۸۵۷ء) کو نمازِ جمعہ کے بعد مولانا محمد احسن صاحب نے بریلی کی مسجد نو محلہ میں مسلمانوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اُس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلافِ قانون ہے۔ نواب بہادر خاں، کمشنر بریلی مسٹر الیگزینڈر کے بظاہر مددگار تھے اور نواب صاحب پر کمشنر بریلی کو پورا اعتماد تھا، اِس سلسلے میں ایک انگریز مورّخ رقمطراز ہے: "پچھلے صدی کے ۔۔۔۔۔۔ محافظ (حافظ رحمت خاں) کے پوتے خاں بہادر نے کمشنر (بریلی) کی کوششوں کی پُوری پوری تائید کی اور (بریلی) کالج سے منسلک ایک مولوی (محمد احسن نانوتوی) نے مسجد میں تقریر کی اور اُس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلافِ شرع ہے۔"[1]

موصوف کی اِس تقریر نے بریلی کے مسلمانوں میں آگ لگا کر رکھ دی۔ مولانا محمد احسن نانوتوی کے خلاف غیظ و غضب کا ایک طوفان اُمڈ آیا کیونکہ یہ مسلمانوں کے جذبۂ حریت کے لیے کھلا ہُوا چیلنج، اُن کی دینی غیرت کو للکارنا اور تعلیماتِ الٰہیہ کو بازیچۂ اطفال بنانا تھا۔ چنانچہ قادری صاحب لکھتے ہیں:

۶۔ "اِس تقریر نے بریلی میں ایک آگ لگا دی اور تمام مسلمان مولانا محمد احسن نانوتوی کے خلاف ہو گئے۔ اگر کوتوالِ شہر شیخ بدر الدین کی فہمائش پر مولانا بریلی نہ چھوڑتے تو اُن کی جان کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اِس تقریر کا ردِّ عمل یہ بھی ہُوا کہ ۲۵ مئی ۱۸۵۷ء کو بروز عید نو محلہ کی مسجد میں مولوی رحیم اللہ خاں نے انگریزوں کے خلاف سخت تقریر کی اور اُس موقع پر بخت خاں بھی موجود تھے، مسلمانوں میں بہت جوش پیدا ہو گیا تھا مگر کوتوالِ شہر

---

[1] محمد ایوب قادری: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، بار اول ۱۹۶۶ء، ص ۵۰

نے اپنی حکمتِ عملی سے اِس جوش کو ٹھنڈا کر دیا۔“ [۱]

۱۸۵ء کی جنگِ آزادی کے وقت بعض علماء و عمائدِ دیوبند کا ایک ہنگامی اجلاس ہوتا ہے۔ ِ آزادی کے بارے میں غور کیا گیا۔ گفتگو کیا ہوئی، ملاحظہ فرمائیے:

”تھانہ بھون میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حافظ محمد ضامن، مولانا شیخ محمد تھانوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور قاضی عنایت علی وغیرہ نے مجلسِ مشاورت منعقد کی۔ اِس مجلس میں مولانا محمد احسن بھی شریک ہوئے (جنھوں نے ۲۲ مئی، ۱۸۵۷ء کو بریلی میں تقریر کرتے ہوئے برٹش گورنمنٹ کی مخالفت کو خلافِ شرع بتایا تھا) مولانا شیخ محمد تھانوی نے جہاد کے خلاف رائے دی اور فرمایا: جب قاضی عنایت علی جنگ کے دوران خاموش رہے اور حاضرینِ مجلس میں سے بھی اُس وقت کسی نے اُس کو جہاد سمجھ کر اُس (جنگِ آزادی) میں حصہ نہیں لیا تو اِس وقت جبکہ انتقام کا جذبہ کارفرما ہے، اِس لڑائی کو جہاد کیسے کہا جا سکتا ہے؟ بعض روایات میں ہے کہ مسلمانوں کی کمزوری اور بے سرو سامانی کو عدمِ جہاد کا سبب قرار دیا گیا۔“ [۲]

ا اشرف علی تھانوی جو جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے چھ سال بعد ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء میں ئے تھے اُنھوں نے بھی جب اِس جنگِ آزادی کے جملہ حالات و کوائف پر نظر ی تو یہی فیصلہ صادر فرمایا تھا کہ یہ محض ایک لڑائی تھی، اِسے جہاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔

قادری صاحب لکھتے ہیں:

”مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے۔“ نیت کا حال تو خدا ہی جانتا ہے بظاہر تو اُس (جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء) کو جہاد کا درجہ

یوب قادری: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۵۱

ضاً: ص ۵۴

نہیں دیا جا سکتا"۔[1]

بعض علمائے دیوبند نے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کو امیر المومنین مقرر کر کے اپنے علاقے میں اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ حکومت اس لیے قائم کی گئی تھی کہ انگریزی اقتدار کا مختلف و متعدد مقامات سے جنازہ نکل گیا تھا۔ اپنے موافقین کو حکومت نے مطلع کر دیا کہ اب تمھیں اپنی حفاظت خود کرنی پڑے گی کیونکہ حکومت تو آپ ہی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ چنانچہ تھانہ بھون کے گردو نواح میں علمائے دیوبند نے حریت پسندوں کی یلغار سے خود کو محفوظ رکھنے کی غرض سے اپنی ایک تنظیم قائم کر لی تھی۔ اس حقیقت کو مشہور دیوبندی عالم اور مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ) کے سوانح نگار مولوی عاشق الٰہی میرٹھی نے بیان کر کے یوں حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹایا ہوا ہے:

۹۔ "اس بدامنی کی حالت میں جس کو قصہ کی اصلیت ظاہر کرنے کے لیے مختصر الفاظ میں حاشیہ پر درج کر دیا گیا ہے۔ عام باشندگانِ قصبہ کی یہ حالت ہوئی گویا ان کا مربی و منتظم بادشاہ (برٹش گورنمنٹ) سر سے اٹھ گیا اور شرعی و طبعی ضروریات و مخصمات میں بھی کوئی خبر گیر نہ رہا، جس کی رائے پر عمل کریں۔ پس یہ لوگ اعلیحضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ بلا کسی حاکم کی سرپرستی کے گزران دشوار ہے۔ گورنمنٹ نے باغیوں کی بغاوت کے باعث اپنا امن اٹھا لیا اور بذریعۂ اشتہار عام اطلاع دے دی ہے کہ اپنی اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہیے۔ اس لیے آپ چونکہ ہمارے دینی سردار ہیں، اس لیے دنیاوی نظمِ حکومت کا بھی بار اپنے سر پر رکھیں اور امیر المومنین بن کر ہمارے باہمی قضیے چکا دیا کریں۔ اس میں شک نہیں کہ اعلحضرت کو ان کی درخواست کے موافق ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا۔ آپ نے دیوانی و فوجداری کے جملہ مقدمات شرعی فیصلہ کے موافق چند روز تک

---

[1] محمد ایوب قادری: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۵۴ حاشیہ

قاضی شرع بن کر فیصل بھی فرمائے۔ اِسی قصّہ نے مفسدوں میں شریک ہونیکی راہ چلائی اور مخبروں کو جھوٹی سچی مخبری کا موقع دیا"۔ [1]

انگریز کی حکومت اُٹھ جانے اور برٹش گورنمنٹ کے اعلان پر عمل کرنے کی غرض سے علمائے دیوبند نے جو سیلف گورنمنٹ قائم کر لی تھی اور حریت پسندوں کی یلغار سے خائف ہو کر منظم ہوتے تھے کیونکہ حریت پسند اُن اشخاص کو عموماً مجبور کرتے یا لُوٹ لیا کرتے تھے جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے موقع پر انگریزوں کی حمایت کرتے یا تحریکِ آزادی میں حریت پسندوں کا ہاتھ نہ بٹاتے تھے۔ علمائے دیوبند کا ایک مرتبہ حریت پسندوں سے مقابلہ بھی ہو گیا تھا، جس کو بعد والوں نے تو مختلف رنگوں میں پیش کیا ہے لیکن مولوی عاشق الٰہی میرٹھی یُوں تصریح کرتے ہیں:

۱۰۔ "ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی) اپنے رفیق جانی مولانا قاسم العلوم (مولانا محمد قاسم نانوتوی اور طبیبِ روحانی اعلیٰحضرت حاجی صاحب و نیز ضامن صاحب کے ہمراہ تھے کہ بندوقچیوں سے مقابلہ ہو گیا۔ یہ نبرد آزما جتھا اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا، اِسی لیے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جاں نثاری کے لیے تیار ہو گیا۔ اللہ رے شجاعت و جوانمردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتّہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جائے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جمِ غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ چنانچہ آپ پر فیریں ہوئیں اور حضرت ضامن صاحب زیر ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے"۔ [2]

انگریزوں نے جب دوبارہ غلبہ پا لیا تو مخبروں نے مولانا رشید احمد گنگوہی پر برٹش گورنمنٹ کے باغی ہونے اور دیوبندی اصطلاح کے مفسدوں یعنی حریت پسندوں کی معاونت کرنے کی تہمت لگا دی، جس کا اُن کے سوانح نگار نے یُوں شکوہ کیا ہے:

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا: تذکرۃ الرشید، جلد اوّل، ص ۴،

[2] ایضاً: ص ۵،

۱۱۔ "شروع ۱۲۷۶ ہجری نبوی / ۱۸۵۹ء وہ سال تھا جس میں حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی) قدس سرہٗ پر اپنی سرکار (برٹش گورنمنٹ) سے باغی ہونے کا الزام لگایا گیا اور مفسدوں میں شریک رہنے کی تہمت باندھی گئی۔"[1]

موصوف نے آگے اِس الزام تراشی پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے یہ وضاحت بھی فرمائی ہے:

۱۲۔ "جب بغاوت و فساد کا قصہ فرو ہوا اور رحم دل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پا کر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اِس کے اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی سچی تہمتوں اور مخبری کے پیشہ سے سرکاری خیرخواہ اپنے کو ظاہر کریں اُنھوں نے اپنا رنگ جمایا اور اِن گوشہ نشین حضرات (علمائے دیوبند) پر بغاوت کا الزام لگایا اور یہ مخبری کی کہ تھانہ کے فساد میں اصل الاصول یہی لوگ تھے۔"[2]

مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) پر ۱۸۵۷ء میں حکومت کے باغیوں کا ساتھ دینے یا خود بغاوت کرنے کا جس شخص نے پاک و ہند میں سے الزام لگایا، وہ واحد شخص قاضی محبوب علی خاں تھے۔ اگرچہ آج اُن پر یہی الزام عائد کرنے والے کتنے ہی حضرات ہیں اور وہ مولانا گنگوہی پر الزام تراشی کر کے اُن کے متبع ہونے کا دم بھرتے اور اِس کے باوجود اپنا شمار موصوف کے عقیدت مندوں میں کرتے ہیں، حالانکہ گنگوہی صاحب کے سوانح نگار نے لکھا ہے:

۱۳۔ "حاکم کے انتظام کا اٹھنا تھا کہ باہم رعایا میں برسوں کی دبی ہوئی عداوت نکلنے اور خدا جانے کس کس زمانہ کے انتقام لینے کا وقت آگیا کہ جدھر دیکھو مار پیٹ اور جس محل پر نظر کرو معرکہ آرائی و جنگ۔ اِسی بلاخیز قصہ میں تھانہ بھون کا وہ فساد واقع ہوا، جس میں قاضی محبوب علی خاں کی مخبری سے حضرت مولانا (رشید احمد

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا: تذکرۃ الرشید، جلد اوّل، ص ۷۳۔

[2] ایضاً: ص ۷۶۔

گنگوہی) پر مقدمہ قائم ہوا۔" [1]

جب مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) کو گرفتار کر لیا گیا اور اُن پر مقدمہ چلنا شروع ہُوا تو عدالتی کارروائی کس مزے کی ہُوئی یہ موصوف کے زبردست متبع و معتقد مفتی عزیز الرحمٰن نہٹوروی کی زبانی سُنیئے:

۱۴۔ "حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی) اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے نام وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے... آپ (گنگوہی صاحب) اپنی دادھیال رامپور تشریف لے گئے لیکن مخبر کی خبر رسانی سے آپ وہاں حکیم ضیاءُ الدین کے مکان سے گرفتار کر لیے گئے۔ یہ زمانہ ۱۲۷۵ھ یا ۱۲۷۶ھ کا تھا۔ گرفتار کرنے کے بعد آپ کو سہارنپور جیل کی کال کوٹھری میں رکھا گیا اور حالات اور واقعات کی تفتیش ہوتی رہی، مقدمہ چلتا رہا۔ حاکم نے آپ سے سوال کیا کہ آپ کے پاس ہتھیار ہیں؟ آپ نے تسبیح دکھلا کر فرمایا: "ہمارے پاس یہ ہتھیار ہے"۔ سہارن پور جیل سے آپ کو مظفر نگر جیل منتقل کیا گیا۔ بالآخر جب گورنمنٹ کو ثبوت نہ مل سکا، رہا کر دیا گیا"۔ [2]

مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) اینڈ کمپنی نے ۱۸۵۷ء میں حریت پسندوں کا ساتھ دیا اور اپنے گروہ کی زبانی مفسدوں میں شریک رہے تھے یا حکومت کے خیرخواہ رہے؟ اس سوال کے جواب میں خود گنگوہی صاحب کے سوانح نگار، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے یُوں جواب دیا ہے:

۱۵۔ "جیسا کہ آپ حضرات (گنگوہی و نانوتوی صاحبان) اپنی مہربان سرکار کے دلی خیرخواہ تھے تازیست خیرخواہ ہی ثابت رہے"۔ [3]

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا: تذکرۃ الرشید، جلد اول، ص ۷۴،

[2] عزیز الرحمٰن نہٹوروی، مفتی: تذکرہ مشائخ دیوبند، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۱۱۷

[3] عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا: تذکرۃ الرشید، جلد اول، ص ۷۹

مولانا رشید احمد گنگوہی نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حریت پسندوں کا ساتھ دیا یا حکومت کا، آپ عمر بھر گورنمنٹ کے وفادار رہے یا ملک و ملت کے؟ اِس کا جواب خود گنگوہی صاحب کی زبانی ملاحظہ ہو:

۱۶۔ "میں (گنگوہی صاحب) حقیقت میں سرکار کا فرماں بردار ہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکا نہ ہوگا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے، اُسے اختیار ہے جو چاہے کرے"۔[1]

؎ مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

قارئین کرام! یہ مندرجہ بالا سولہ بیانات و عبارات علمائے دیوبند کی تصانیف سے ہی پیشِ خدمت ہیں۔ اختصار کے پیشِ نظر اِن پر اکتفا کرنا کافی سمجھا گیا ہے۔ فیصلہ کرنا تو قارئین حضرات کا کام ہے، لیکن بغرضِ سہولت ہم مذکورہ عبارتوں کا مفاد اور جہاں متضاد باتیں ہیں اُن کی مطابقت پیش کرتے ہیں۔ وباللہ التوفیق:

۱۔ جب گنگوہی صاحب خود اعلان فرما رہے تھے کہ میں برٹش گورنمنٹ کا وفادار ہوں، ۱۸۵۷ء کی لڑائی کے وقت بھی وفادار رہا تھا اور انگریزوں کے خلاف کوئی قدم نہیں اُٹھایا تھا، اِس کے باوجود بھی جو یہ کہتا ہے کہ اُنھوں نے انگریز سے بغاوت یا اس سے لڑائی کی تھی وہ موصوف پر جھوٹا الزام لگاتا ہے۔ آپ کی اِس ذاتی تصریح کے بعد جیسا کہ آخری عبارت سے معلوم ہو رہا ہے، کسی کا دعویٰ کہ گنگوہی صاحب نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصّہ لیا تھا سراسر بے معنیٰ اور خلافِ واقعہ ہو کر رہ جاتا ہے یا نہیں؟

۲۔ گنگوہی صاحب کے اِس ذاتی بیان سے پہلی چاروں عبارتیں غلط اور اُن کے دعوے بے بنیاد ثابت ہو کر رہ گئے۔ گنگوہی صاحب کے انکار کے سامنے کسی دوسرے کا بیان کہاں قابلِ قبول ہے؟

۳۔ تذکرۃ الرشید کتاب، جو مولانا رشید احمد گنگوہی کی سوانح حیات ہے وہ موصوف

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا: تذکرۃ الرشید، جلد اول، ص ۸۰

کی زندگی میں ہی لکھی گئی، اُن[۲] کے خاص معتمد و معتقد نے لکھی، جو[۳] دیوبندی جماعت کے ایک جید عالم بھی تھے اور یہ کتاب[۴] پہلی مرتبہ میرٹھ سے ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں چھپی۔ کسی[۵] دیوبندی عالم نے اِس کے مندرجات پر تنقید نہیں کی بلکہ بسر و چشم تسلیم کرتے آئے۔ دریں[۶] حالات ۱۹۶۱ء میں چھپنے والے "تذکرہ علمائے ہند اردو" میں اگر تذکرۃ الرشید کی طباعت کے چھپن[۵۶] سال بعد اپنے اکابر کی حقیقت کو بدل کر پیش کیا جائے، اِس طرح کہ رات کو دن اور دِن کو رات کہنے اور کہلوانے کی مہم شروع کر دی جائے، اِس سے اگرچہ حقیقت نفس الامری تو نہ بدل سکے گی لیکن جس جماعت کا اپنے روزِ اوّل سے طریقہ و دستور ہی یہی ہو کہ "جمنا گئے تو جمنا داس، گنگا گئے تو گنگا رام" اگر وہی جماعت انگریزوں کے چلے جانے کے بعد اپنے اکابر کی تاریخ میں ادل بدل نہ کرے تو آخر دنیا والوں کو مُنہ کیسے دکھائے؟

۴- مولانا عاشق الٰہی میرٹھی جب ۱۹۰۵ء میں علی الاعلان لکھ رہے تھے کہ اکابر دیوبند تمام عمر برٹش گورنمنٹ کے خیر خواہ رہے، کسی دیوبندی عالم نے اس خیال کی تردید نہیں کی جیسا کہ عبارت ۱۵ سے ظاہر ہے۔ دریں حالات اُن پر برٹش گورنمنٹ سے لڑنے یا اُس کی بدخواہی کا دعویٰ کرنا سراسر الزام ہے یا نہیں؟

۵- جب علمائے دیوبند کے نزدیک ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انگریزوں سے لڑنے والے باغی اور مفسد ہیں جیسا کہ عبارت نمبر ۱۰ اور نمبر ۱۱ سے ظاہر ہے تو معلوم نہیں آجکل کے دیوبندی علماء کیوں اپنے اکابر کی توہین کے مرتکب ہونے لگے کہ اُن حضرات کو باغیوں اور مفسدوں کی فہرست میں شامل کرنے پر بضد ہیں۔

۶- جب علمائے دیوبند کے نزدیک یہ جنگِ آزادی شرعی نقطۂ نظر سے جہاد نہ تھا، جیسا کہ عبارت ۵، ۷ اور ۸ میں ہے، دیوبندیوں کے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کا بھی یہی فیصلہ ہے جیسا کہ عبارت نمبر ۸ سے ظاہر ہے اِن حالات و حقائق کے پیشِ نظر عبارت نمبر ۴ میں اِس لڑائی کو معرکۂ جہاد کہنا کس وجہ سے ضروری سمجھا گیا؟

۷- اگر علمائے دیوبند نے باغ میں بیٹھے ہوئے انگریزی فوج سے لڑائی کی تھی، توپ خانہ بھی

چھینا تھا اور شاملی قصبے سے بھی انگریزی فوج کو مار پیٹ کر بھگا دیا تھا، بلکہ بقول مولانا حسین احمد فیض آبادی انگریزی توپ خانے کو کھینچ کر حاجی صاحب کے پاس پہنچانے والے خود گنگوہی صاحب تھے جیسا کہ عبارت نمبر ۳ میں ہے تو عبارت نمبر ۱۴ ملاحظہ فرمائیے کہ یہاں گنگوہی صاحب عدالت کو تسبیح دکھا کر فرما رہے ہیں کہ حضور! ہمارے پاس تو صرف یہ ہتھیار ہے بلکہ آگے تصریح موجود ہے کہ گورنمنٹ کو کوئی ثبوت اس بات کا نہ مل سکا کہ گنگوہی صاحب نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حکومت کے خلاف کوئی حصّہ لیا تھا اور اسی وجہ سے مجبور ہو کر رہا کرنے پڑے تھے لیکن پوری ایک صدی گزر جانے کے بعد آج اُن کے معتقدین کو کہاں سے ثبوت مل گیا کہ موصوف بھی انگریزوں سے معرکہ آرا ہوئے تھے؟

۸۔ اگر واقعی علمائے دیوبند اور عالیجناب گنگوہی صاحب نے انگریزی فوج سے باغ میں چھُپ کر اور قصبہ شاملی میں لڑائی کی ہوتی، بلکہ توپ خانہ تک چھینا ہوتا تو انگریزی عدالت کے پاس سیکڑوں گواہ اِس امر کی شہادت دیتے، توپ خانہ جیسی چیز چھِن جانے پر بھی حکومت کو ثبوت نہ ملنا، ایک ایسی عبارت ہے جو کسی ذی ہوش کی سمجھ میں مشکل ہی سے آسکتی ہے نیز گنگوہی صاحب پر ہی کیا منحصر اگر علمائے دیوبند نے باغ میں اور شاملی قصبے کے اندر یہی کچھ کیا ہوتا تو ۱۸۵۷ء میں ہی انگریزوں نے کتنے ہی علمائے دیوبند کو پھانسی دے دی ہوتی لیکن انگریزوں نے تو ۱۸۵۹ء تک اُن سے یہ بھی نہ کہا کہ اے ہمارا توپ خانہ چھیننے والو! اے قصبہ شاملی سے ہماری فوج کو بھگا دینے والے روحانی پیشواؤ! ہمارا توپ خانہ واپس کرو اور پھانسی پر لٹکنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آخر ایسا کیوں نہ کہا گیا؟

۹۔ ۱۸۵۹ء میں جب بعض حضرات کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے تو ساری دیوبندی جمعیت میں سے اور پورے پاک دہند کو انگریزی اقتدار سے بزعمِ خود نجات دینے اور دلانے والوں کے لشکرِ جرار کے ایک راس مجاہد، نام رشید احمد، ساکن قصبہ گنگوہ کو تسبیح سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ وُہ بھی از خود نہیں بلکہ قاضی محبوب علی خاں کی مخبری پر گرفتار ہوئے

ورنہ اِس تکلّف کی بھی حکومت کو کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اگر اِن حضرات نے اِس جنگ میں واقعی انگریزوں کے خلاف کوئی حصّہ لیا ہوتا، جس طرح کہ پہلی چاروں عبارتوں میں تاثر دیا گیا ہے تو، ۱۸۵۷ء کے آخر سے ۱۸۵۹ء تک اِن حضرات کو مہلت کیوں دی جاتی، کیا حکومت اپنے باغیوں کو اِتنی مہلت دے سکتی تھی؟

۱۰۔ اِن حضرات کو مجاہد بنانے کی عمارت جنگِ شاملی کی بنیاد پر اُٹھائی گئی ہے۔ اِس لڑائی کا تذکرہ، پیش کردہ عبارت ب۱، ب۲، ب۳، ب۴ اور ن۱ میں موجود ہے۔ پہلی چاروں عبارتوں کا نقطۂ نظر عبارت ن۱ کے خلاف ہے۔ یہاں علمائے دیوبند کی مذکورہ پانچوں عبارتوں میں تطبیق دینا ضروری ہے تاکہ صحیح صورتِ حال سامنے آجائے۔

۱۱۔ عبارت ب۳، ب۴ اور ن۱ میں ایک بات مشترک ہے کہ حافظ محمد ضامن صاحب جنگِ شاملی میں مقابلہ کرتے ہُوئے شہید ہو گئے تھے۔ صرف یہی جانی نقصان ہُوا تھا اور باقی سب خیریت ہے۔

۱۲۔ باقی رہا یہ تعین کہ جنگِ شاملی کہاں ہُوئی تھی، عبارت ن۱ جو تذکرۃ الرشید کی ہے اُس میں تو یہی تصریح کی گئی ہے کہ شاملی کے نزدیک جب یہ حضرات باغ میں چھپے ہُوئے تھے اور اُس وقت قصداً یا اتفاقیہ جو لڑائی ہو گئی یا لڑنا پڑ گیا، اُسی کا نام جنگِ شاملی ہے، اور اِسی باغ والے معرکے میں حافظ ضامن صاحب شہید ہُوئے تھے لیکن مولانا حسین احمد فیض آبادی اور پروفیسر محمد ایوب قادری صاحبان فرماتے ہیں کہ باغ کی معرکہ آرائی کے بعد یہ روحانی گروہ قصبہ شاملی میں انگریزی فوج سے بھی جا کر لڑا تھا، وہاں سے انگریزی فوج کو بھگا کر اپنا قبضہ بھی جمایا تھا اور اِس آخری معرکے میں جو شاملی قصبے کے اندر ہوا، حافظ ضامن صاحب شہید ہُوئے تھے۔ حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اور اُس کی عطا سے پھر اُس کا محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ لیکن ہمیں تو یُوں محسوس ہوتا ہے کہ تذکرۃ الرشید کا بیان ہی درست ہے کیونکہ مولانا حسین احمد فیض آبادی اور پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب کے بیانات سے صریحًا بناوٹ کی بُو آ رہی ہے۔ اگر غیر جانب داری سے ذرا بھی دماغ پر زور دیا جائے تو معاملے کی تہہ تک پہنچ جانا

قطعاً مشکل نہیں رہتا۔ مثلاً :

۱۳۔ اگر باغ کی لڑائی کے علاوہ اِن حضرات نے شاملی قصبے میں جاکر انگریزی فوج کو بھگایا ہوتا تو غلبہ پانے کے بعد انگریز فوراً اِن حضرات کو گولی کا نشانہ بنا دیتے یا پھانسی پر لٹکا دیتے کیونکہ اِس حالت میں گواہوں کی کمی رہتی نہ ثبوت کی۔ لیکن اِن حضرات کے ساتھ حکومت نے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ اِس سے ثابت ہُوا کہ علمائے دیوبند شاملی قصبے میں جاکر ہرگز انگریزوں سے نہیں لڑے بلکہ صرف باغ والی لڑائی کا واقعہ ہی درپیش آیا تھا اور حافظ ضامن صاحب باغ والے معرکے میں شہید ہُوئے تھے۔

۱۴۔ عبارت ع۳ میں فیض آبادی صاحب نے یہ اقرار بھی کیا ہے کہ شاملی قصبے کے معرکے میں حافظ ضامن صاحب شہید ہُوئے تھے۔ لیکن تذکرۃ الرشید کی عبارت ع۱۰ میں باغ والے معرکے کو شاملی کی لڑائی بتایا اور اِسی میں حافظ ضامن صاحب کا شہید ہونا لکھا ہے۔ لہٰذا معلوم یہی ہوتا ہے کہ لڑائی صرف باغ والی ہُوئی، یہیں حافظ صاحب شہید ہُوئے اور اِسی کو مولانا حسین احمد صاحب نے شاملی قصبہ تک بغیر کسی ثبوت کے محض اپنے جوشِ عقیدت سے پھیلا دیا، پھر دُوسرے حضرات نے اِسی فرضی بنیاد پر ہوائی قلعہ تعمیر کرنا شروع کر دیا ہے۔

۱۵۔ اِس سلسلے میں یہ بات تصفیہ طلب رہ گئی کہ لڑائی تو صرف باغ میں چھپ کر ہُوئی تھی لیکن وُہ لڑائی کِس سے لڑی گئی؟ انگریزی فوج سے یا حریت پسندوں سے؟ عبارت ع۱ اور ر۲ اشارۃً اور عبارت ع۳ اور ر۴ صراحتاً یہ بتا رہی ہیں کہ اِن حضرات نے انگریزوں سے لڑائی کی تھی، جن میں سے تین بیانات قیامِ پاکستان سے بعد کے ہیں یعنی ۱۹۷۱ء کے اور صرف ایک بیان ایسا ہے جو قیامِ پاکستان سے شاید پہلے دیا ہو ۹ لیکن کانگرس کی ہمنوائی اور گاندھی کی پیشوائی کا سہارا لے کر انگریز دشمنی کا اعلان کیا گیا کہ نہ صرف ہم اپنے ہندو بزرگوں اور بھائیوں کے زیرِ سایہ انگریزوں سے لڑنے کو تیار ہیں بلکہ ہمارے تو اکابر بھی برٹش گورنمنٹ سے برسرِ پیکار رہے تھے۔ مقصد صرف ہنود کا اعتماد حاصل کرنا معلوم ہوتا ہے ورنہ حقیقت میں اگر اِن حضرات نے انگریزوں سے

لڑائی کی ہوتی تو کم از کم دس بیس بڑے بڑوں کو ضرور انگریزوں نے پھانسی پر لٹکا دیا ہوتا لیکن معاملہ برعکس ہے کہ تقریباً ڈیڑھ سال بعد صرف ایک مولانا رشید احمد گنگوہی کو پکڑا گیا اور چھ ماہ کے بعد وُہ بھی رہا کر دیئے گئے کہ اُن کی انگریز دشمنی کوئی معمولی سا بھی ثبوت خود حکومت کو نہ مل سکا۔ اِن حقائق کے پیشِ نظر عبارت ع۱۰ درست معلوم ہوتی ہے کہ یہ حضرات برٹش گورنمنٹ کی حمایت میں حریت پسندوں سے لڑے تھے اور حکومت کے باغیوں کا قلع قمع کرنے کی غرض سے باغ میں چھپے ہُوئے تھے۔

۱۶۔ ہو سکتا ہے یہاں کوئی صاحب یہ سوال کر دیں کہ اگر علمائے دیوبند حریت پسندوں سے لڑے تھے تو مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) کو گرفتار کیوں کیا گیا تھا؟ نیز اعلیٰحضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (المتوفی ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء) اور مولانا محمد قاسم نانوتوی (المتوفی ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۷۹ء) کے وارنٹ گرفتاری کیوں جاری ہُوئے تھے؟ معلوم تو کچھ ایسا ہوتا ہے کہ وارنٹ گرفتاری جاری ہونے کا قصّہ ہی من گھڑت ہے اور اگر اس میں کچھ حقیقت ہے تو شاید ایسا ہُوا ہوگا کہ حکومت کے پاس اِن حضرات کے خلاف جتنا ریکارڈ تھا جس کی بنا پر وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے تھے، اُس سارے ریکارڈ اور وارنٹ گرفتاری کے جملہ حروف علمائے دیوبند کی عظیم روحانی طاقت نے مٹا دیے ہوں گے اور خالی کاغذات کو دیکھ کر حکومت کے کارندے کوئی انتقامی کارروائی کرنے سے عاجز رہ گئے ہوں گے۔ اِس شبہے کو یُوں بھی تقویت پہنچتی ہے کہ قبلہ حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ تو چھپ چھپا کر مکہ معظمہ کی طرف نکل گئے تھے لیکن مولانا محمد قاسم نانوتوی تو ۱۸۵۷ء سے ۱۸۷۹ء تک متحدہ ہندوستان میں ہی رہے اور دار العلوم دیوبند کے بانی کی حیثیت بھی اختیار کر گئے تھے لیکن اِن بائیس سالوں میں بھی حکومت کے جاری کردہ وارنٹ گرفتاری مولانا کی رُوحانیت سے خائف ہو کر اُن پر اثر انداز ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

باقی رہا مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) کی گرفتاری والا معاملہ۔ تو اِس سلسلے میں گزارش یہی ہے کہ موصوف کو اِس بنا پر ہرگز گرفتار نہیں کیا گیا

کہ اُنھوں نے انگریزوں سے ۱۸۵۷ء میں کوئی لڑائی بھڑائی کی تھی بلکہ اُنھیں تو تقریباً ڈیڑھ سال بعد محض مخبروں کی تسکینِ خاطر کی غرض سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں حکومت نے اعلان کر دیا تھا کہ وُہ کسی کے مال جان کی ذمہ دار نہیں ہے بلکہ حالات ایسے موڑ پر آ پہنچے ہیں کہ اب ہر کوئی اپنی حفاظت آپ کرے۔ اِس اعلان کے پیشِ نظر تھانہ بھون اور اُس کے گرد و نواح میں اپنے انتظامی امور سر انجام دینے کی غرض سے ایک انتظامیہ کمیٹی بنا لی گئی تھی۔ اِس کمیٹی کی بِنا پر بعض حاسدوں نے انگریزی حکّام کے کان بھرے تو اُنھیں مطمئن کرنے کی غرض سے پُورے علاقے میں سے ایک مولانا رشید احمد گنگوہی کو گرفتار کر لیا گیا اور چھ ماہ کے بعد حکومت نے موصوف کو اپنا سچا وفادار تسلیم کر کے صاف بری کر دیا۔ اِن جملہ حقایق کو پیش کردہ عبارت ۹ میں ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے، اُسی عبارت کا یہ آخری جملہ کتنا معنی خیز ہے۔ "اِسی قصّہ نے مفسدوں میں شریک ہونے کی راہ چلائی اور مخبروں کو جھوٹی سچی مخبری کا موقع دیا۔"

۱۷۔ عبارت ۳ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ باغ میں چھپ کر جب اِن بانکے جانثاروں نے حریت پسندوں پر فائرنگ کی تھی اُس وقت شاید رات تھی جیسا کہ اِن الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ "جب پلٹن مع توپ خانہ باغ کے سامنے سے گزری تو سب نے بکدم فیر کیا، پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی ہوں، جو یہاں چھپے ہوئے ہیں۔" اگر یہ رات کا وقت نہیں تھا تو یہ صورت رہی ہوگی کہ باغ میں سے چھپ کر ہی فائر کرتے رہے ہوں گے سامنے مقابلے پر نہیں آتے ہوں گے جس سے اِن کی تعداد کے بارے میں کوئی اندازہ لگایا جا سکتا۔

۱۸۔ عبارت ۱۰ سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ یہ صرف چند حضرات تھے، ہاتھوں میں تلواریں لیے پھر رہے تھے کیونکہ اپنے علاقے کے حاکم بن بیٹھے تھے کہ حریت پسندوں سے کم از کم اپنی حکمرانی کو محفوظ رکھیں۔ حریت پسندوں یعنی اپنی انگریزی سرکار کے باغیوں کو دیکھ کر اِن حضرات کے جذبۂ جاں نثاری نے جوش مارا اور اُن سے بِھڑ گئے۔

۱۹۔ جہاں تک اِن حضرات کی جوانمردی و شجاعت کا تعلق ہے تو وُہ ہر قسم کے شک و شبہ سے

بالاتر ہے۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کے یہ الفاظ ترجمانی کے لیے کافی ہیں۔ "بندوقچیوں سے مقابلہ ہوگیا۔ یہ نبرد آزما جتھا اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا، اِسی لیے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جاں نثاری کے لیے تیار ہوگیا۔ اللہ رے شجاعت و جوانمردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پِتّہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہوجاتے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جمِ غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔"
اِس عبارت کا ایک ایک لفظ اِن حضرات اکابرِ دیوبند کے اقوال و افعال کی ترجمانی کا واقعی پُورا پُورا حق ادا کر رہا ہے۔ اپنے اکابر کی شجاعت و جوانمردی اور برٹش گورنمنٹ پر جاں نثاری کے جذبے کی اِس سے بہتر شاید کوئی بھی دیوبندی عالم الفاظ کے آئینے میں تصویر نہ دکھا سکا ہوگا۔ ہر منصف مزاج اِن لفظوں کو دیکھ کر پکار اُٹھتا ہے: ع

کشش لفظوں میں ایسی ہے کہ ہم بھی صاد کرتے ہیں

۲۰۔ عبارت ۳ تو بتا رہی ہے کہ اِن حضرات کے جھنڈے تلے ہزاروں مجاہد جمع ہوگئے تھے لیکن عبارت ۱ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اپنی طرز کے مجاہدوں میں یہی چند فقیر (علمائے دیوبند) تھے۔ بہرحال تعداد کچھ بھی سہی اِتنا ضرور ہے کہ حافظ ضامن صاحب کے شہید ہونے سے پہلے اِن حضرات نے گورنمنٹ کی مخالفت یا حمایت میں کوئی لڑائی نہیں لڑی اور جس معرکے میں حافظ صاحب شہید ہُوئے تھے اُس کے بعد باقی مجاہد خواہ وُہ ہزاروں کی تعداد میں تھے یا کم و بیش، لیکن سب کی شجاعت و جوانمردی کا تلاطم خیز طوفان تھم گیا تھا اور صرف ایک آدمی کے شہید ہوجانے کی وجہ سے باقی سب نے خاموشی اختیار کر لی، عملاً غیر جانب دار ہو کر معتکف ہو بیٹھے تھے۔ اِس حقیقت کو مولانا حسین احمد ٹانڈوی صاحب (المتوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء) نے کیسے حسرت و یاس کے الفاظ میں بیان کر کے اِن حضرات کے مجاہدانہ عزائم اور شجاعت و دلیری کا سِکّہ بٹھا دیا ہے۔ "حضرت حافظ ضامن صاحب کا شہید ہونا تھا کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔" موصوف کا اِس طرح آہِ سرد بھرنا صُورتِ حال کی پُوری پُوری

غمازی کر رہا ہے۔

۲۱۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ علمائے دیوبند برٹش گورنمنٹ کے ہرگز مخالف نہیں تھے بلکہ ضرورت پڑنے پر جاں نثار سپاہی بھی بن جاتے تھے کیونکہ یہ پودا ابھی انگریزی حکومت کا خودکاشتہ تھا اور اِسے اپنی پرورش کے لیے سخت ضرورت تھی کہ حکومت اپنا دستِ شفقت اِس کے سر پر رکھے۔ ۱۸۵۷ء میں اِس نوزائیدہ گروہ نے پورا پورا ثبوت اپنی انگریز دوستی کا فراہم کر دیا تھا۔ نہ[۱] انھوں نے فتوٰی جہاد پر دستخط کیے اور نہ[۲] ایسا کوئی فتوٰی خود جاری کیا۔ نہ[۳] بادشاہ کی حمایت کا کوئی اعلان کیا اور نہ[۴] انگریزوں کے خلاف ایک لفظ کسی دیوبندی عالم نے منہ سے نکالا۔ نہ یہ[۵] حضرات جنرل بخت خاں، مولانا احمد اللہ شہید یا کسی بھی دُوسرے حریت پسند کی زیرِ کمان انگریزوں سے لڑے اور نہ[۶] کسی بھی مرحلے پر اُن سے رابطہ قائم کر کے اُنھیں اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ جو حضرات گاندھی کو پیشوا مان بیٹھے اُنھوں نے ترنگے جھنڈے کے زیرِ سایہ ہندوؤں کی ہمنوائی میں انگریزوں کے خلاف ضرور لب کشائی شروع کی باقی جملہ علمائے دیوبند نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو ہمیشہ غدر کہا، حریت پسندوں کو باغی اور مفسد ہی ٹھہراتے رہے۔ یہ وُہ امور ہیں جو تاریخ سے ثابت ہیں، کوئی دیوبندی عالم اِس کے برعکس آج تک ثابت نہیں کر سکا ہے، اگرچہ پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب بعض اوقات اکابر دیوبند کو محض تجاہلِ عارفانہ کے بطور اور علمائے دیوبند کو خوش کرنے کی غرض سے مجاہدینِ جنگِ آزادی لکھ دیا کرتے ہیں ویسے حقیقت میں اُن کے نزدیک بھی علمائے دیوبند وہی کچھ ہیں جو کچھ وُہ حضرات تھے اور جو کچھ ۱۹۴۷ء سے پہلے خود اُن کے متعلق کہا جاتا رہا۔ باری تعالیٰ شانہٗ کی حکمت نرالی ہے۔ جس محمد ایوب قادری صاحب کے بل بوتے پر آج علمائے دیوبند اپنے اکابر کو جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے مجاہد منوانے کی مہم چلا رہے ہیں۔ آں موصوف کے قلم سے ہی قدرت نے وُہ الفاظ لکھوا دیے جن کے آئینے میں علمائے دیوبند کی حقیقی تصویر نظر آ رہی ہے اور کم از کم احقر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ موصوف کی اِس عبارت کا ہر جملہ معنی خیز اور حقیقت کی مُنہ بولتی تصویر ہے۔ گزشتہ صفحات

میں اگرچہ عبارت نمبر ۷ کے تحت موصوف کے وُہ خیالات پیش کیے جا چکے ہیں لیکن ہماری نظر میں بھی چونکہ علمائے دیوبند کی پوزیشن یہی کچھ ہے جو محمد ایوب قادری صاحب نے اِس عبارت میں پیش کی ہے۔ لہٰذا اِس عبارت کو آخر میں فیصلہ کن بیان کے طور پر پھر نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

”تھانہ بھون میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حافظ محمد ضامن، مولانا شیخ محمد تھانوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور قاضی عنایت علی وغیرہ نے مجلسِ مشاورت منعقد کی۔ اِس مجلس میں مولانا محمد احسن بھی شریک ہُوئے۔ مولانا شیخ محمد تھانوی نے جہاد کے خلاف رائے دی اور فرمایا: ”جب قاضی عنایت علی، جنگ کے دوران خاموش رہے اور حاضرینِ مجلس میں سے بھی اُس وقت کسی نے اُس کو جہاد سمجھ کر اُس میں حصّہ نہیں لیا تو اِس وقت جبکہ انتقام کا جذبہ کارفرما ہے، اِس لڑائی کو جہاد کیسے کہا جا سکتا ہے؛ بعض روایات میں ہے کہ مسلمانوں کی کمزوری اور بے سروسامانی کو عدمِ جہاد کا سبب قرار دیا گیا۔“ [1]

حقیقت چھُپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے
کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے

ضروری وضاحت

بعض حضرات یہاں یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ مجددِ مأتہ حاضرہ، امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہٗ کا تجدیدی کارنامہ بیان کرتے ہُوئے انگریزوں کا ذکر کس غرض سے کیا گیا اور اِس کا یہاں کیا جوڑ تھا؛ احقر یہ گزارش کرے گا کہ تجدید کی ضرورت تخریب کے وقت پیش آتی ہے۔ انگریز نے جس عیّاری اور فن کاری سے پاک و ہند پر قبضہ جمایا، اُسی طرح مقدس اسلام کو مٹانے میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ چونکہ دین میں تخریب کاری انگریزوں نے براہِ راست نہیں کی بلکہ اپنے زر خرید علمائ سے

---

[1] محمد ایوب قادری: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۴۵

یہ خدمت لی تھی، لہٰذا اِس راز کو سمجھنے کے لیے انگریزوں کے اُن کارناموں کا مجملاً اظہار ضروری سمجھا گیا جن سے انگریزوں کی ذہنیت کا اندازہ ہو سکے۔ چونکہ اگلے ابواب میں تخریب کار علماء کا بیان ہے بایں وجہ پہلے انگریزوں کی فطرت پر قلم اٹھانا پڑا۔ یعنی: ؎

حافظ بخود نہ پوشید ایں جامۂ مے آلود
اے شیخ پاک دامن! معذور دار ما را

باب دوم

ارمغانِ حجاز

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید؟
(علّامہ اقبال)

لُٹنی شروع ہوگئی۔ جس ایمان کو بچانے کی خاطر یہی مسلمان سب کچھ لُٹا دیا کرتے تھے۔ وُہ ایسے مسحور ہوئے کہ چند روزہ زندگی کے راحت و آرام کے بدلے ایمان جیسی دولت لُٹانی شروع کر دی۔ دُوسری طرف دینِ اسلام میں خود علمائے دین کے ہاتھوں وُہ عملِ جراحی اور اصلاح کے نام پر شریعتِ مطہرہ میں اِس طرح ترمیم و اضافہ کروایا گیا کہ اپنی طرف سے اُن سرکاری علمائے نے اسلام کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ الغرض کتابِ اسلام کے مختلف ماڈرن ایڈیشن ایسی آب و تاب اور نظر فریب دلکشی کے ساتھ شائع ہوئے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اِسلام اِن برطانوی اِسلاموں کے نرغے میں گِھر گیا۔ نئے نئے اور چمکیلے اسلاموں کی ظاہری چمک دمک نے ناواقفوں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا تو اصل دین کی اصلیت اُن کی نگاہوں میں مشکوک ہو کر رہ گئی۔ جب عوام کی نظروں سے اصل اور نقل، حقیقی اور جعلی کا فرق اوجھل ہونا شروع ہُوا تو ہر کوئی اپنی پسند کا اسلام چُن کر اُس کا پیروکار بننا شروع ہو گیا۔ یُوں مسلمانوں کی جمعیت پریشان ہو گئی، وہ فرقوں میں بٹ گئے اور انگریزوں کا مقصد، جسے وہ حاصل کرنے سے عاجز تھے، بعض صاحبانِ جبّہ و دستار کی بدولت پُورا ہو گیا۔

ایسا کر گزرنے سے برٹش گورنمنٹ کی مراد دُو طرح بر آئی، اوّلاً: جماعتوں اور فرقوں میں مسلمانوں کو اِس طرح بانٹ دیا اور اختلافات کی خلیج اتنی وسیع کروا دی کہ یہ سوال ہی مِٹ گیا کہ کبھی متحدہ ہندوستان کے مسلمان متحد ہو کر حکومت کے لیے دردِ سر کا باعث ہو سکتے ہیں یا انگریزی اقتدار کے لیے کسی خطرے کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ثانیاً: اسلامی تعلیمات سے ایک کثیر تعداد کو نابلد رکھ کر اور جعلی اسلاموں کا پیروکار بنا کر بھی حکومت نے اطمینان کا سانس لینا شروع کر دیا کیونکہ اسلام کے حقیقی فیوض و برکات سے بڑی حد تک مسلمانانِ پاک و ہند خود کو محروم کر چکے تھے۔ ایمانی قوت کمزور ہو گئی، شوقِ جہاد اور جوشِ عمل کا رُخ حکومت کی وفاداری کی طرف پھر گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد اگر اِنھوں نے بہادری بھی دکھائی تو بھی برٹش گورنمنٹ کی رِیڑھ کی ہڈّی کو مضبوط کرتے رہے یا ہندوؤں کے معاون بن کر اُن کے مقاصد کو تقویت پہنچاتے رہے۔ سب سے بڑی جوانمردی بس اِتنی

میدان میں جب ناکامی کا سامنا ہُوا تو مسلمانانِ پاک و ہند کی آئندہ نسلوں کو اسلامی تعلیمات سے محروم رکھنے اور اِن کی جمعیت و قوت کو منتشر و پریشان کرنے کی غرض سے فرقہ بازی کا بیج بونے کی ٹھان لی۔ یہ تخریبی منصوبہ عیسائی بنانے والے منصوبے سے بھی بدتر، دُور رس نتائج کا حامل اور ضرر رساں تھا، کیونکہ مسلمانوں کی اکثریت اِس تخریب کو تعمیر، بگاڑ کو بناؤ، دشمنی کو دوستی، بیخ کنی کو رواداری، فساد کو اصلاح اور مداخلت فی الدین کو عدمِ مداخلت سمجھتے آ رہے ہیں اور انگریزوں کے اِس تخریبی منصوبے پر کاربند ہو کر مسلمانانِ پاک و ہند اپنے مِلّی خصائص اور قوتِ ایمانی کو مٹانے میں ایک آٹومیٹک مشین کی طرح آج تک سرگرمِ عمل چلے آ رہے ہیں۔

اِس منصوبے کے تحت حکومت نے اپنے جاری کردہ اسکولوں اور کالجوں سے دینی تعلیمات کو خارج از نصاب کر کے رعیت کا ذاتی معاملہ قرار دے دیا۔ ملازمتیں انگریزی اسکول کی تعلیم پر منحصر ہو کر رہ گئیں تو نتیجہ ظاہر ہے کہ دینی مدارس ویران ہونے لگے۔ اشک شوئی کے لیے اسکولوں میں برائے نام دینیات کو شامل رکھا، جس میں چند بزرگوں کی کہانیاں پڑھائی جاتی تھیں یا اُن اینگلو انڈین علمائے کے فضائل و مناقب ذہن نشین کروائے جاتے تھے جو برٹش گورنمنٹ کے اِس تخریبی منصوبے کو بڑی ہوشیاری، رازداری اور کمال نمک حلالی سے پروان چڑھا رہے تھے۔ رہبری کے پردے میں قوم کی جڑیں کاٹنے میں مصروف تھے، لیکن جن حضرات نے مِلّتِ اسلامیہ کی پاک و ہند میں حقیقی خدمات انجام دیں اُن مجاہدوں، بادشاہوں، شہیدوں اور رہنماؤں کو زینتِ طاقِ نسیاں بنوا دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے اسکولوں اور کالجوں سے فارغ التحصیل ہونے والے حضرات کی اکثریت کا یہی عالم ہونا تھا اور آج بھی ہے کہ حقیقی اسلام سے بڑی حد تک ناآشنا، نئے نئے اسلاموں کے ماننے والے، اینگلو انڈین علمائے کے معتقد اور مغربی تہذیب کے دلدادہ۔ اِن بظاہر پڑھے لکھے مسلمانوں کی حقیقی حالتِ زار پر، اِسلامی عینک سے دیکھنے والی آنکھیں یُوں اشکبار ہوتی ہیں: ؎

یُوں قتل سے بچّوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سُوجھی

اِسلامی تعلیمات سے بے بہرہ ہو جانے کے باعث، حبِ ایمان جیسی متاعِ عزیز

لُٹنی شروع ہوگئی۔ جس ایمان کو بچانے کی خاطر یہی مسلمان سب کچھ لُٹا دیا کرتے تھے۔ وُہ ایسے مسحور ہُوئے کہ چند روزہ زندگی کے راحت و آرام کے بدلے ایمان جیسی دولت لُٹانی شروع کر دی۔ دُوسری طرف دینِ اسلام میں خود علمائے دین کے ہاتھوں وُہ عملِ جراحی اور اصلاح کے نام پر شریعتِ مطہرہ میں اِس طرح ترمیم و اضافہ کروایا گیا کہ اپنی طرف سے اُن سرکاری علمائے نے اسلام کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ الغرض کتابِ اسلام کے مختلف ماڈرن ایڈیشن ایسی آب و تاب اور نظر فریب دلکشی کے ساتھ شائع ہُوئے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اِسلام اِن برطانوی اِسلاموں کے نرغے میں گِھر گیا۔ نئے نئے اور چمکیلے اسلاموں کی ظاہری چمک دمک نے ناواقفوں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا تو اصل دین کی اصلیت اُن کی نگاہوں میں مشکوک ہو کر رہ گئی۔ جب عوام کی نظروں سے اصل اور نقل، حقیقی اور جعلی کا فرق اوجھل ہونا شروع ہُوا تو ہر کوئی اپنی پسند کا اسلام چُن کر اُس کا پیروکار بننا شروع ہو گیا۔ یُوں مسلمانوں کی جمعیت پریشان ہو گئی، وہ فرقوں میں بٹ گئے اور انگریزوں کا مقصد، جسے وہ حاصل کرنے سے عاجز تھے، بعض صاحبانِ جبہ و دستار کی بدولت پُورا ہو گیا۔

ایسا کر گزرنے سے برٹش گورنمنٹ کی مراد دُو طرح بر آئی، اوّلاً: جماعتوں اور فرقوں میں مسلمانوں کو اِس طرح بانٹ دیا اور اختلافات کی خلیج اتنی وسیع کروا دی کہ یہ سوال ہی مِٹ گیا کہ کبھی متحدہ ہندوستان کے مسلمان متحد ہو کر حکومت کے لیے دردِ سر کا باعث ہو سکتے ہیں یا انگریزی اقتدار کے لیے کسی خطرے کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ثانیاً: اسلامی تعلیمات سے ایک کثیر تعداد کو نابلد رکھ کر اور جعلی اسلاموں کا پیروکار بنا کر بھی حکومت نے اطمینان کا سانس لینا شروع کر دیا کیونکہ اسلام کے حقیقی فیوض و برکات سے بڑی حد تک مسلمانانِ پاک و ہند خود کو محروم کر چکے تھے۔ ایمانی قوت کمزور ہو گئی، شوقِ جہاد اور جوشِ عمل کا رُخ حکومت کی وفاداری کی طرف پھر گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد اگر اِنھوں نے بہادری بھی دکھائی تو بھی برٹش گورنمنٹ کی رِیڑھ کی ہڈّی کو مضبوط کرتے رہے یا ہندوؤں کے معاون بن کر اُن کے مقاصد کو تقویت پہنچاتے رہے۔ سب سے بڑی جوانمردی بس اِتنی

دکھائی جاسکی کہ اسلام کا نام لے کر غریب مسلمانوں کے ووٹوں سے پاکستان بنا لیا لیکن جس قسم کی اسلام درزی انگریز سکھا گئے تھے اُس نے اپنا پُورا رنگ دکھایا کہ چوتھائی صدی گزر گئی لیکن کوئی حکومت پاکستان میں اسلامی قانون رائج کرنے کی جرأت نہ کرسکی بلکہ پُورا زور متواتر اِس پر صرف کیا جاتا ہے کہ حقیقی اسلام کو محبوس رکھا جائے یا ملک بدر کر دیا جائے رغرضیکہ انگریزوں سے جو کمی رہ گئی تھی اُسے اب مسلمان خود پُورا کر رہے ہیں۔ اِس بے راہ روی کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑ رہا ہے۔ عذابِ الٰہی سروں پر مسلط ہے لیکن کیا مجال کہ ہمارے دانشور اور اصحابِ اقتدار قوم کو اِس غلط روش سے ہٹانے کی ضرورت بھی محسوس کریں۔ باری تعالیٰ شانہٗ اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے طفیل ہمیں راہِ راست پر چلائے اور ہماری غلطیوں سے درگزر فرمائے۔ آمین۔

اِس باب میں چونکہ فرقہ بازی کے بارے میں تاریخی طور پر کچھ پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ انگریزوں کی دُوررس نگاہوں نے دہلی کے مایۂ ناز علمی و دینی گھرانے کے ایک منچلے، جوشیلے اور نوجوان عالمِ دین کو تاڑ لیا، یعنی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (ف ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) کو اور پاک و ہند کی سرزمین میں فرقہ سازی کا سنگِ بنیاد موصوف سے رکھوایا گیا۔ فرقہ بازی کے پاک و ہند میں جو فلک بوس محل نظر آ رہے ہیں اُن کی بنیاد رکھنے کا سہرا آں موصوف ہی کے سر ہے۔ آپ شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی (المتوفی ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء) کے پوتے، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء)، شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۴۲ھ/ ۱۸۲۷ء) و شاہ رفیع الدین محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۷ء) رحمۃ اللہ علیہم کے بھتیجے اور شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزند تھے۔ منچلے پن نے خُوب گُل کھِلایا، علمی میدان میں بازی ہار گئے تو انگریزوں کے کہنے پر سکھوں کا نام لے کر سرحد کے مسلمانوں کے خُون سے ہولی جا کھیلے، اُنھیں ملعونین اشرار، کلاب النار اور مستحل الدم ٹھہراتے رہے۔ اُن کے ننگ و ناموس پر دست درازی کرتے رہے۔ پٹھانوں نے آخرکار مجبور ہو کر میزبانی سے ہاتھ اٹھایا اور اِس جمعیت کے اکثر افراد کو اُن کے اصلی مقام پر پہنچایا۔ ایک ہی رات کے اندر جتنے ہاتھ آسکے سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، جو باقی رہے

اُنھیں سکھوں نے آدبوچا اور جو چند اشخاص بھاگ سکے اُن کے علاوہ سب کو بالاکوٹ کے مقام پر ۲۶؍ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء کو دنیا کے اس المناک ڈرامے کا پہلا پارٹ ختم کردیا۔

تیرھویں صدی میں خارجیت نے نجد کی سرزمین سے سر اُٹھایا تھا۔ محمد بن عبدالوہاب نجدی (المتوفی ۱۲۰۶ھ) اِس بلائے ناگہانی کے ٹھیکدار بنے تھے۔ جب وہابیت کے فتنے کو اُس زمینِ مقدس میں قدم جمانے کی جگہ مل گئی تو اِسی گمراہی کو دہلی پہنچایا گیا۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے اِس مشن کو دل و جان سے قبول کرلیا اور اِس کی تبلیغ و اشاعت میں کوشاں رہنے لگے۔

چونکہ حقیقت میں یہ وہی خارجی فرقہ ہے جس کی خبر مخبرِ صادق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پہلے ہی دی تھی کہ قیامت تک یہ فرقہ مختلف ناموں سے ظاہر ہوتا رہے گا اور اِس کا آخری گروہ دجّال کے ساتھ ہوگا۔ لہٰذا موصوف کی کارگزاری پر گفت گو کرنے سے پہلے، جن جن رنگوں میں خوارج آج تک نمایاں طور پر ظاہر ہوتے رہے ہیں، اُن کے بارے میں اختصار سے کچھ تاریخی طور پر عرض کردیا جاتے تاکہ ایک منصف مزاج کے لیے صورتِ حال کو سمجھنے میں کوئی دقّت یا پیچیدگی باقی نہ رَہ جائے۔

انگریزی دور سے چونکہ یہ دھاندلی جاری ہے کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک نیا ہی مکتبۂ فکر گھڑا ہُوا ہے اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی چونکہ حضرت شاہ صاحب مذکور کے پوتے ہیں لہٰذا اِنھیں ولی اللّٰہی مکتبۂ فکر کا ایک عظیم علمبردار ٹھہرا دیا جاتا ہے حالانکہ یہ دونوں دعوے محض گھڑنت اور فرضی ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ کا کوئی اپنا مکتبۂ فکر نہیں بلکہ وُہ سُنّی حنفی عالمِ دین اور صوفی منش بزرگ تھے۔ شاہ صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے دینی عقائد میں بعد المشرقین ہے کیونکہ مولانا نے نہ صرف وہابیت قبول کی تھی بلکہ سرزمینِ پاک و ہند میں وہابیت کا سنگِ بنیاد رکھنے والے اَور اِس کے بانی آپ اور صرف آپ ہیں۔ موصوف کا اپنے خاندان سے دینی و مذہبی انقطاع بھی اُسی طرح ہے جس طرح نجد کے بانیِٔ وہابیت کا دینی سلسلہ اپنے خاندان سے حتّٰی کہ اپنے والدِ ماجد مولانا عبدالوہاب (المتوفی ۱۱۵۳ھ/ ۱۷۴۰ء) سے نہیں ملتا۔ کیا محض حسب و نسب کو سامنے رکھ کر کنعان کا دینی و مذہبی رشتہ نُوح علیہ السّلام سے جوڑا جا سکتا ہے؟ ہرگز

نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کا مذہب اختیار کیا تھا، محمد بن عبدالوہاب نجدی (المتوفی ۱۲۰۶ھ/۱۷۸۷ء) نے ابن تیمیہ حرّانی کا مذہب اپنایا، ابنِ تیمیہ حرّانی (المتوفی ۷۲۸ھ) نے ابُویعلیٰ وغیرہ سلفی حضرات کا مذہب قبول کیا تھا اور ابویعلیٰ قاضی وغیرہ نے مسلکِ خوارج کو اپنا دین ٹھہرایا تھا۔

خوارج

اب راقم الحروف اپنے مسلمان بھائیوں کی خیر خواہی میں یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ آخری رسول، نبی الانبیاء، فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خوارج کے بارے میں مسلمانوں کو کیا ہدایت فرمائی ہے۔ یہ ناچیز جو سب سے زیادہ اپنے آقا و مولیٰ، سرورِ کون و مکاں، شفیعِ انس و جاں، نبیِ مختار، حبیبِ پرور دگار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت کا محتاج ہے یہاں ایسے لوگوں کے بارے میں پیارے نبی کے چند پیارے پیارے کلمات پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ شاید کوئی خوش نصیب یہ سوچ سکے کہ جس نبی کا کلمہ پڑھتے اور جس کے اُمّتی ہونے کا دم بھرتے ہیں، جب خود اُس آقا کی نگاہوں میں یہ جماعتیں ایسی ہیں تو بعض علماء کے جُبّہ و دستار پر کیوں جائیں؟ بہتر یہی ہے کہ آقائے دو جہاں کے قدموں سے لگ جائیں۔ اگر ایک بھی خوش نصیب راہِ راست پر آگیا تو الحمدُ للہ، احقر کی محنت ٹھکانے لگی۔ اب پیارے مصطفیٰ کے پیارے ارشادات کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھیے، سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجئے کہ پیشگوئی کس پر صادق آتی ہے:

سمعت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم باذنی و رأیتہ بعینی اتی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بمال فقسمہ فاعطی من عن یمینہ ومن عن شمالہ ولم	سُنا میں (ابو برزہ اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اپنے کانوں سے اور دیکھا میں نے اپنی آنکھوں سے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں کچھ مال حاضر کیا گیا، آپ نے تقسیم فرمایا۔ دائیں اور بائیں طرف والوں کو عطا فرمایا اور پیچھے والے کو نہ دیا۔ تو پیچھے والوں میں سے ایک

يعط من ورائه شئ فقام رجل من ورائه فقال يا محمد ما عدلت فی القسمة۔ رجل اسود مطموم الشعر وعليه ثوبان ابيضان فغضب رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم غضباً شديداً۔ قال والله لا تجدون بعدی رجلاً هو اعدل منی ثم قال يخرج فی آخر الزمان قوم كان هذا منهم يقرؤن القرآن لا يجاوز تراقيهم يمرقون من الاسلام كما يمرق السهم من الرمية سيماهم التحليق لا يزالون يخرجون حتى يخرج آخرهم مع المسيح الدجال فاذا لقيتموهم شر الخلق و الخليقة۔

(نسائی۔ مشکوٰۃ، باب قتل اہل الردۃ)

آدمی کھڑا ہو کر کہنے لگا: اے محمد! آپ نے تقسیم میں انصاف نہیں کیا۔ وہ آدمی سیاہ رنگ اور منڈے ہوئے سر والا تھا۔ اُس نے بالکل سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا: خدا کی قسم، میرے بعد تم مجھ سے زیادہ انصاف کرنے والا کسی کو نہ پاؤ گے۔ مزید فرمایا: آخری زمانے میں ایک قوم نکلے گی، گویا یہ بھی اُسی قوم کا ایک فرد ہے، وہ قرآن بہت پڑھیں گے لیکن قرآن کا اثر اُن کے دلوں کی طرف نہیں جائیگا، اسلام سے وہ ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے۔ سر منڈانا اُن لوگوں کی نشانی ہوگی۔ وہ ہر دور میں ظاہر ہوتے رہیں گے، یہاں تک کہ اُن کی آخری جماعت دجّال کی ساتھی ہوگی۔ جب تم اُن لوگوں کو پاؤ تو سمجھ لینا کہ وہ بدترین مخلوق ہیں۔ (نعوذ باللہ من شرورھم)

آخری زمانے کی جس قوم کا اِس حدیث میں ذکر فرمایا گیا ہے اُس کے بارے میں یہ تو معلوم ہوگیا کہ مدعیِ اسلام ہونے کے باوجود وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہوگی اور سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُن لوگوں کو بدترین مخلوق قرار دیا تھا۔ اِس کے ساتھ ہی اُس گروہ کی چار نشانیاں بھی ہمیں بتا دی ہیں:

۱۔ وہ شانِ رسالت میں گستاخانہ کلمات استعمال کیا کریں گے۔

۲۔ زیادہ تر سر منڈائیں گے۔

۳۔ قرآن خوب پڑھیں گے لیکن اُن گستاخانِ رسول کے دِلوں پر قرآن کا اثر نہیں ہوگا۔

۴۔ وُہ قوم ہر دور میں کافروں کی معین و مددگار بن کر رہے گی حتّٰی کہ دجّال کا ساتھ بھی یہی لوگ دیں گے۔

قارئین کرام! شانِ رسالت میں گستاخانہ عبارتیں لکھنے والے بالکل ظاہر ہیں۔ حتّٰی کہ ایسے نازیبا الفاظ بھی سیّد الانبیاء علیہ افضل الصّلوٰۃ والتسلیم کی شان میں جاری کر دیے جن کی کبھی بدترین دشمنوں اور کھُلے کافروں کو بھی جرأت نہ ہُوئی تھی۔ اِسی طرح وُہ جماعت یا قوم بھی بالکل ظاہر ہے جو اپنی اور بُت پرستوں کی ایک قوم بناتی اور متحدہ قومیت کا گیت گاتی رہی ہے۔ کیا اِس فرمانِ رسالت کے مطابق کھرے اور کھوٹے کو پہچاننے میں کوئی شبہ رہ جاتا ہے؟ ہرگز نہیں رہتا۔ اب دُوسرا ارشادِ گرامی ملاحظہ ہو:

عن ابی سعید الخدری رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال بینما نحن عند رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم ولیقسم قسماً اتاہ ذوالخویصرۃ وھو رجل من بنی تمیم فقال یارسول اللّٰہ اعدل فقال ویلك فمن یعدل اذلم اعدل قد خبت وخسرت ان لم اکن اعدل فقال عمر ائذن لی اضرب عنقه فقال دعه فان له اصحابا یحقر احدکم صلاته مع صلاتهم وصیامه مع صیامهم یقرؤن

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وُہ فرماتے ہیں کہ ہم رسُولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ بیکس پناہ میں حاضر تھے اور آپ اُس وقت مال تقسیم فرما رہے تھے۔ اُسی اثناء میں ذوالخویصرہ آیا جو بنی تمیم سے تھا، اُس نے کہا: اے اللہ کے رسول! انصاف کرو۔ آپ نے فرمایا: کمبخت! اگر میں انصاف نہیں کرتا تو اور کون انصاف کرے گا؟ تیرے اس گمان کی وجہ سے کہ میں بھی عدل نہیں کرتا، تو صریح زیاں کار ہو گیا۔ حضرت عمر نے عرض کیا: یارسول اللہ! اجازت دیجیے مَیں اس کی گردن اُڑا دوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا: اِسے جانے دو، اِس کے ساتھی بہت ہیں،

القرآن لا يجاوز تراقيهم يمرقون من الدين كما يمرق السهم من الرمية۔ (مشکوٰۃ، باب المعجزات)

تم اپنی نمازوں کو اِن کی نمازوں کے مقابلے میں اور اپنے روزوں کو اِن کے روزوں کے مقابلے میں حقیر جانو گے۔ یہ قرآن پڑھیں گے مگر وہ اِن کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا۔ (ادعائے اسلام کے باوجود) یہ لوگ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔

یہی واقعہ دُوسری روایت میں یُوں مذکور ہُوا ہے:

اقبل رجل غائر العينين ناتی الجبهة كث اللحيه مشرف الوجنتين محلوق الراس فقال يا محمد اتق الله فقال فمن يطع الله اذا عصيته فيامنني الله على اهل الارض ولا تامنوني فسأل رجل قتله فمنعه فلما ولّى قال ان من ضئضئ هذا قوم يقرؤن القرآن ولا يجاوز حناجرهم يمرقون عن الاسلام مروق السهم من الرمية فيقتلون اهل الاسلام و يدعون اهل الاوثان، لئن ادركتهم لاقتلنهم قتل عاد۔ (ایضاً)

ایک شخص آیا جس کی آنکھیں دھنسی ہُوئی، پیشانی اُٹھی ہُوئی، داڑھی گھنی، رخسار اُونچے اور سر منڈا ہُوا تھا۔ وُہ کہنے لگا: اے محمد! اللہ سے ڈرو۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اگر بقول تمھارے، میں بھی خدا کی نافرمانی کرتا ہُوں تو کون ہے جو اُس کے احکام کی اطاعت کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے مجھے اہلِ زمین پر امین بنایا ہے اور تم مجھے امین نہیں مانتے۔ ایک مرد نے اُس کو قتل کرنے کی اجازت مانگی لیکن اُسے منع کر دیا گیا۔ جب وُہ گستاخ واپس لوٹ گیا تو سرکار نے ارشاد فرمایا: اِس کی اصل سے ایک قوم ہوگی، وُہ لوگ قرآن پڑھیں گے مگر قرآن اُن کے نرخروں سے نیچے نہ اُترے گا۔ جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے وہ اِس طرح اِسلام سے نکل جائیں گے۔ وُہ بت پرستوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کو قتل کریں گے۔ اگر میں اُس قوم کو

پاتا تو اُنھیں اِس طرح ہلاک کر دیتا جیسے قومِ عاد کی گئی۔

قارئین کرام! اِن دونوں روایتوں میں مذکورہ گستاخ ٹولے کی مزید نشانیاں بیان فرمائی گئی ہیں تاکہ اُمتِ محمدیہ اُنھیں پہچان کر خبردار ہوجائے، اُن کی باتیں سُننا یا اُن کے گروہ میں اُنھیں مسلمان سمجھ کر رل جانا تو دُور کی بات ہے، مسلمان اُن کے سائے سے بھی بچیں۔ اُن کے ظاہری حال اور ادّعائے مسلمانی پر نہ جائیں۔ پہلی روایت کے تحت چار نشانیاں نمبروار پیش کر دیں، مزید ملاحظہ ہوں:

۵۔ پابندی اور ادائیگی نماز روزہ وغیرہ عبادات میں یہ اصلی مسلمانوں سے بڑھ چڑھ کر نظر آئیں گے۔

۶۔ مختلف حیلے بہانے تراش کر مسلمانوں کو قتل کرنا ان کی مردانگی ہوگی۔

۷۔ بُت پرستوں سے بگاڑیں گے نہیں بلکہ اُن کے یار و مددگار بن کر رہیں گے۔

مسلمانو! سچے خدا کے سچے نبی نے (جلّ جلالہٗ، وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم) جس گروہ کی یہ سات نشانیاں بیان فرمائی ہیں، کیا اِن نشانیوں کے ذریعے آپ اُس گروہ کو پہچان نہیں سکیں گے؟ یہ گروہ دورِ حیدری سے شروع ہوگیا تھا، ہر دَور میں مختلف رنگ بدل کر ظاہر ہوتا رہے گا، یہاں تک کہ اِس گروہ کی آخری جماعت دجّال کی معین و مددگار ہوگی۔ کیا اُسی جماعت کو آپ نے ماضی قریب میں چھوٹے دجّالوں کے ساتھ نہیں دیکھا؟ کیا مسلمانوں کے مفادات پر وہ آج بھی ضربیں نہیں لگا رہے ہے؟ کیا اب اُنھوں نے چھوٹے دجّالوں کو دجّال مان کر اُس روش سے کنارہ کر لیا ہے؟ آیئے اب دیکھیں کہ پیارے مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نگاہِ انور میں اِس گروہ کی قدر و قیمت اور شرعی پوزیشن کیا ہے:

۱۔ یہ گروہ اسلام سے خارج ہے جیسا کہ تینوں مذکورہ روایتوں میں ہے:

۲۔ یہ بدترین مخلوق ہیں — جیسا کہ پہلی روایت میں ہے۔

۳۔ اللہ کا رسول اِن سے سخت ناراض ہے — پہلی روایت

۴۔ رسولِ خدا کے نزدیک یہ گروہ زیاں کار ہے ـــــ دوسری روایت

۵۔ صحابۂ کرام کے نزدیک یہ لوگ قابلِ گردن زدنی ہیں جیسا کہ حضرت عمر کی درخواست سے واضح ہے ـــــ دُوسری روایت

۶۔ یہ قومِ عاد کی طرح ہیں اَور اُسی کی طرح ہلاک کیے جانے کے سزاوار ـــــ تیسری روایت

۷۔ اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اِنھیں پاتے تو اِن کے خلاف جہاد فرماتے ـــــ تیسری روایت

مسلمان بھائیو! کلمہ طیبہ کے ہمراہیو! اللہ تعالیٰ کے آخری رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلے ہُوئے پیارے پیارے الفاظ پیش کر کے خوارج کی جملہ جماعتوں کی سات نشانیاں اَور اِن کے بارے میں سات احکام اِن روایتوں سے ہی اخذ کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیے۔ یہ کسی مولوی کا فتویٰ نہیں، کسی مخالف جماعت کی کھینچ تان نہیں، اُسی آقا کے ارشادات ہیں جس کا کلمہ یہ حضرات بھی پڑھتے ہیں، جن کے اُمتی ہونے کا یہ لوگ بھی دم بھرتے ہیں، دیکھیے اِن ارشادات کو سُن کر کس کروٹ گرتے ہیں؟ یا جس گھر سے نکل کر بھاگے تھے پھر اُسی کا رُخ کرتے ہیں؟ اے میرے رب! اے ساری کائنات کے رب! ہدایت فرما کہ یہ لوگ بھی اندھیرے کو چھوڑ کر اسلام کے اجالے میں آئیں اور اپنی عاقبت کو برباد ہونے سے بچائیں۔ آمین یا اللہ العالمین بحق سید المرسلین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہٖ محمد وآلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔

خوارج باقاعدہ جماعتی شکل میں پہلے پہل مولائے کائنات، امیرِ شش جہات، تاجدارِ ولایت امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں جنگِ صفین کے بعد ظاہر ہُوئے۔ قبل ازیں یہ آپ کے ساتھی اور متبع تھے لیکن مسئلہ تحکیم کی آڑ میں بگڑے اور اپنا اصلی رنگ رُوپ ظاہر کرنے لگے۔ پروفیسر ابوزہرہ مصری لکھتے ہیں:

> "عجیب بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے حضرت علی کو تحکیم کے قبول کرنے پر مجبور کیا اور پھر ایک خاص حکم مقرر کرنے پر تُل گئے، جلد ہی اپنے خیالات سے منحرف ہو گئے اور تحکیم کو ایک جرم قرار دینے لگے۔ حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

کے سامنے یہ مطالبہ پیش کیا کہ جس طرح ہم نے تحکیم کو قبول کر کے اِرتکابِ کفر کیا تھا اور پھر اُس سے تائب ہُوئے آپ بھی اپنے کفر کا اقرار کر کے توبہ کا اعلان کریں۔ عرب کے بدّو بھی اُن کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہ کے نعرہ کو اپنا شعار بنایا اور حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے خلاف لڑائی کا آغاز کر دیا۔" [1]

خوارج کے گروہ کی یہ اپنے روزِ اوّل سے ہی فطرت چلی آتی ہے کہ جو حضرات اسلام کا مکمل نمونہ پیش کر رہے تھے، جو بابِ مدینۃ العلم تھے اور جن حضرات، قدسی صفات سے بہتر اسلام کی مکمل عملی تفسیریں چشمِ فلکِ کہن نے بھی آج تک غیر انبیاء کے گروہوں میں نہیں دیکھی تھیں، خوارج نے اُن حضرات کو بھی اِسلام سے خارج ٹھہرانے اور کافر بتانے بلکہ اُن کے ساتھ برسرِ پیکار رہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی تھی۔ اِن لوگوں کی اکابر دشمنی پر مزید تبصرہ کرتے ہُوئے پروفیسر ابوزہرہ مصری مزید یُوں وضاحت کرتے ہیں:

"لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہ کے الفاظ ہر آن اُن کے پیشِ نظر رہتے۔ یہی اُن کا دین تھا، جس سے مخالفین پر آوازے کستے اور ہر بات کو ختم کر کے رکھ دیتے۔ جب حضرت علی (کرم اللہ وجہہ) کو مصروفِ گفتگو دیکھتے یہی نعرہ لگاتے۔ حضرت عثمان و علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) اور ظالم حکام سے اظہار بیداری کا خیال اُن پر حاوی رہتا تھا۔ یہ چیز اُن کے قلب و دماغ پر چھا گئی۔ اُن کے لیے حق تک رسائی حاصل کرنے کے سب دروازے بند کر دیے تھے۔ عثمان و علی، طلحہ اور زبیر (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) اور ظالمینِ بنی اُمیّہ سے برأت کا اظہار کرنے والے کو اپنے زمرہ میں شامل کر لیتے تھے اور بعض دُوسرے اصول و مبادی میں نسبتاً اِس سے نرم سلوک کرتے، حالانکہ وُہ مسائل اِن سے اہم ہوتے اَور اُن میں مخالفت کا ارتکاب کرنے سے وُہ اِن سے

---

[1] غلام احمد حریری، پروفیسر: اسلامی مذاہب، مطبوعہ لاہور، بار دوم، ١٩٧٠ء، ص ٨٤

> زیادہ دُور جا پڑتے، مگر اظہارِ برأت کی مخالفت میں یہ خطرہ نہ تھا۔۔۔۔ برأت کا خیال اُن کے اعصاب پر بُری طرح سوار تھا اور جمہور مسلمانوں کی جماعت میں داخل ہونے سے مانع تھا۔"[1]

جس طرح یہود کی خواہ گردن اُڑا دی جائے لیکن وُہ موت کی تمنّا نہیں کرے گا اِسی طرح خارجیوں کی خواہ جان جاتی رہے لیکن مسلمانوں اور اُن کے اکابر کو مشرک اور خارج عن الاسلام کہنے سے نہ کبھی باز آئے اور نہ تا قیامت باز آئیں گے۔ یہی سلوک اِن بدبختوں نے اپنے اوّلین زمانہ میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کو مسلمان شمار کرنے والوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔ حضرت حیدرِ کرار رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کے دیگر ساتھیوں نے اپنے عمل سے پُوری اُمتِ محمدیہ کو یہ دکھا دیا تھا کہ خوارج اُن کے نزدیک واجب القتل ہیں کیونکہ خود ارشاداتِ نبوی اِس پر شاہد ہیں۔ اِس سلسلے میں فاضل ابو زہرہ مصری لکھتے ہیں:

> "یہی حال خوارج کا تھا، بے محابا علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو اُن کے خطبوں بلکہ نماز میں تنگ کرتے تھے۔ یہ حضرت عثمان و علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کی پیروی کی وجہ سے مسلمانوں کو چیلنج کرتے اور اُنھیں مشرک قرار دیتے تھے۔ اِن لوگوں نے جب عبداللہ بن خبّاب الارت (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو قتل کیا اور اُن کی لونڈی کا پیٹ پھاڑ ڈالا تو حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اُن سے کہا: "عبداللہ بن خبّاب کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کر دو۔" خوارج نے جواب دیا: "عبداللہ بن خبّاب کو ہم سب نے قتل کیا ہے۔" آخر حضرت علی (کرم اللہ وجہہ) کو اُن سے لڑنا پڑا، یہاں تک کہ اُن کا تقریباً قلع قمع ہی کر دیا، تاہم جو بچ نکلے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے طریقہ سے ہٹے نہیں بلکہ پُوری دلیری اور شجاعت کے ساتھ اپنی دعوت میں مصروف رہے۔"[2]

---

[1] غلام احمد حریری: اسلامی مذاہب، ص ۸۵

[2] ایضاً: ص ۸۶

خارجی حضرات اپنے روزِ اوّل سے ہی نرالا تدیّن و اخلاص پیش کرتے آئے ہیں لیکن یہ ہمیشہ دوسروں کی آنکھوں میں تنکے ہی دیکھتے رہتے ہیں اپنی آنکھوں کے شہتیروں کو دیکھنے کی یہ حضرات کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کیا کرتے۔ خوارج کی اوّلین جماعت نے اپنی اِس مخصوص فطرت کا ایک یہ ثبوت بھی پیش کیا تھا:

> "فہمِ دین کی کوتاہی نے اخلاص کے باوجود اُنھیں گمراہ کر دیا اور یہ اسلام کے جوہر اور رُوح کو پامال کرنے لگے۔ اِنھوں نے عبداللہ بن خبّاب (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو محض اس لیے قتل کر دیا تھا کہ وُہ حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو مشرک تصوّر نہیں کرتے تھے مگر قیمت ادا کیے بغیر ایک عیسائی کی کھجوریں لینے سے انکار کر دیا تھا۔"[1]

دوسرے پر تنقید و نکتہ چینی کرنے کی بیماری تو عام ہے لیکن بعض اوقات انسان غیر شعوری طور پر یا کسی گمراہ پارٹی سے اپنا خلافِ واقعہ اختلاف دکھانے اور اُس سے اپنی برأت کا نام نہاد اظہار کرنے کی خاطر، خود اپنے ہی عقاید و نظریات پر تنقید کر جاتا ہے۔ زمانۂ حال کے خارجیوں اور وہابیوں میں سے کبھی کبھی بعض حضرات بھی یہی طرزِ عمل اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ مشہور دیوبندی عالم مولوی بدر عالم میرٹھی نے خوارج کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> "اُن (خوارج) کے اقوال و عقاید دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہایت موٹی عقل اور سطحی علم کے مالک تھے۔ درکِ مقاصد، فہمِ معانی، استنباط و استنتاج کا اُن میں کوئی ملکہ نہ تھا۔ قرآن شریف پڑھنے کا اُنھیں شوق ضرور تھا مگر اِس کے معانی کی اُنھیں کوئی اہمیت نہ تھی۔ طوطے کی طرح قرآن اُن کی زبانوں پر تھا مگر اُن کے قلوب اِس کی صحیح ہدایات اور لطیف مضامین سے قطعًا خالی تھے۔ اُن کی اِس علمی بے مائیگی کی طرف حدیث کے الفاظِ ذیل میں اشارہ کیا گیا ہے: "یقرؤن القراٰن لا یجاوز حناجرھم"۔

---

[1] غلام احمد حریری: اسلامی مذاہب، ص ۸۶، ۸۷

یعنی وہ قرآن تو بہت تلاوت کریں گے مگر قرآن صرف اُن کی زبانوں پر ہوگا ، اُن کے قلوب میں علم و فہم کا کوئی ذرّہ نہ ہوگا۔

دوسری علامت اُن کے علم نما جہل کی یہ بتائی گئی ہے کہ : " یقتلون اھل الاسلام و یدعون اھل الاوثان "۔ بُت پرستوں کو چھوڑ کر اہلِ اسلام کو قتل کریں گے۔ کچھ یہ تجربہ بھی ہے کہ سطحی علم کے ساتھ مزاج میں شدّت اور نفس میں تقشّف پیدا ہونا لازم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب اِن سے مناظرہ کے لیے پہنچے ہیں تو جو پہلا فقرہ اُنھوں نے فرمایا ہے، وُہ یہ تھا ، میں ایسی جماعت کے پاس سے آرہا ہُوں جس میں یہ قرآن اُترا ہے اور جو براہِ راست آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھنے والی ہے۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ تم قرآن خواں ضرور ہو مگر قرآن داں نہیں۔ اگر انصاف کرتے تو یہ فیصلہ آسان تھا کہ قرآن کی صحیح مراد وُہ لوگ زیادہ جانتے تھے جن میں سب سے پہلے قرآن اُترا اور جنھوں نے براہِ راست صاحب کتاب سے اِس کی مرادیں سمجھیں اور اپنی آنکھوں سے اِس پر عمل کا طریقہ دیکھا "۔[1]

کاش ! موصوف یا اُن کے ہم خیال علماء بھی مذکورہ تصریحات کی روشنی میں اپنے دائیں بائیں دیکھنے کی زحمت گوارا کر لیتے کہ قرآن کو طوطے کی طرح پڑھنے والے ، اِس کی سچی ہدایات اور لطیف مضامین سے محروم رہنے والے ، کہیں آجکل وُہ حضرات ہی تو نہیں ہیں جو قرآنِ کریم سے پروردگارِ عالم کو جھُوٹا بتانے اور اُس کے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی توہین وتنقیص کے دلائل فراہم کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اوّلین خوارج بنے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مشرک اور اسلام سے خارج کہا تھا لیکن موجودہ خوارج کے ہدفِ تحقیق سے تو نہ انبیائے کرام ہی بچے اور نہ خالقِ کائنات۔ اِس کے ساتھ ہی اُن جماعتوں یا افراد کو بھی دیکھ لیتے جو علی الاعلان بُت پرستوں کا ساتھ دیتے رہے ہیں ، مسلم مفادات کی

---

[1] بدرِ عالم میرٹھی ، مولوی : ترجمان السنہ ، جلد اول ، مطبوعہ دہلی ، بار اول ۱۹۴۸ء ، ص ۳۴

مخالفت کرنا ہمیشہ شیوہ رہا ہے اور مسلمانوں کے خون کے دھبے ابھی تک جن کے دامنوں پر صاف نظر آرہے ہیں۔ اگر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پہ ایمان ہے، اُن کے ارشاداتِ عالیہ کو درست تسلیم کرتے ہیں، تو پیارے نبی کے اِس پیارے اعلان پر عمل کرتے "یقتلون اھل الاسلام ویدعون اھل الاوثان" کے جن کو مصداق پاتے، بغیر کسی رُورعایت کے اُنھیں خوارجِ زمانہ تسلیم کرتے اور اُن سے کنارہ کش ہوجاتے۔ کیا خوارج پر اِن تنقید کرنے والوں نے حق و باطل میں تمیز کرنے کی ایسی زحمت برداشت کی؟ تاریخ اِس کا جواب نفی میں دے رہی ہے کیونکہ مخبرِ صادق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے "ثم لا یعودون" بھی تو فرمادیا تھا۔ ایسے حضرات سب کچھ کہہ جاتے ہیں لیکن حق کی طرف آنے کی آن، باطل پر ڈٹے رہنے کے ارمان، واللہ، ھوالمستعان۔

وجہ یہ ہے کہ موجودہ حضرات کی طرح خوارج کی ہمیشہ ہی یہ کیفیت رہی ہے کہ تصویر کا جو رُخ اُن کے سامنے ہوتا اُسی کو دیکھتے اور دُوسری طرف نظر دوڑانا بھی معیوب سمجھتے تھے۔ اپنے نظریات کو غلطی سے قطعاً مبرّا اور دُوسروں کے عقاید کو سراسر غلط ماننا گویا خارجیت کی اوّلین شرط ہے اَور اِس سے ذرا اِدھر اُدھر ہٹ جانا اُن کے نزدیک دین سے نکل جانے اور جہنّم میں گر جانے کے مترادف رہا ہے۔ پروفیسر ابُوزہرہ مصری اِس حقیقت کو یُوں بیان کرتے ہیں:

> "یہ حقیقت ہے کہ خوارج کے مناظرات و مناقشات پر تعصب کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ وُہ کبھی نہ خصم کی دلیل کو تسلیم کرتے ہیں نہ اُس کے نظریات کی صحت کا اعتراف کرتے، وُہ حق سے کسی قدر بھی قریب کیوں نہ ہو۔ مخالف جس قدر زیادہ قوی دلیل پیش کرتا اُسی قدر یہ اپنے عقیدے پر زیادہ راسخ ہوجاتے اور اپنی تائید میں دلیلیں دیتے۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے افکار اُن کے نفوس پر چھائے رہتے تھے اَور اُن کے نظریات و معتقدات اُن کے قلوب کی گہرائی تک جاگزیں ہوچکے تھے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اُن کی قوتِ فکر ونظر کی تمام راہیں مسدود ہوکر رہ گئیں اور اُن کے ادراکات و احساسات

ہیں قبولِ حق کی کوئی صلاحیت باقی نہ رہی۔ بایں ہمہ خوارج میں شدتِ نزع و خصومت کا جذبہ کارفرما رہتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ اسباب تھے جن کی بنا پر خوارج کے افکار میں بڑی تنگ نظری پیدا ہو گئی تھی۔ وُہ اُن کی جانب صرف ایک ہی آنکھ سے دیکھا کرتے تھے اور دوسروں کے نظریات کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔"[1]

خوارج قرآن کریم کے مفہوم و مطالب کو جس طرح اخذ کیا کرتے تھے اُس کے بارے میں موصوف یُوں تصریح کرتے ہیں:

> "خوارج ظواہر قرآن سے تمسک کرتے تھے اور اُس کے معانی و مفہوم کی گہرائی میں اُترنے کی کوشش نہ کرتے۔ نصوص پر سطحی قسم کی نگاہ ڈالنے سے جو سرسری مفہوم ذہن میں بیٹھ جاتا بس اُسی کے ہو رہتے اور اُس سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر سرکنا گوارا نہ کرتے۔"[2]

خوارج میں موصوف کے نزدیک وضعِ احادیث کا مرض بھی سرایت کیے ہُوئے تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> "مذہب و مسلک کی اندھا دھند تائید کا جذبہ بعض اوقات خوارج کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر دروغ گوئی کرنے پر مجبور کر دیتا۔ ایک خارجی جس نے اِس عقیدہ سے توبہ کر لی تھی، علماء سے کہا کرتا تھا کہ احادیثِ نبویہ کی اچھی طرح چھان بین کریں کیونکہ خوارج کو جب کوئی دلیل نہ ملتی تو وُہ خود ساختہ کلام کو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔"[3]

خوارج کے نظریات و عقائد چونکہ تعصب، تنگ نظری اور کج فہمی پر مبنی تھے یہی وجہ ہے کہ طبائع کے اختلاف کی بنا پر مختلف فرقوں میں بٹ گئے لیکن ازارقہ کہلانے والے خارجی

---

[1] غلام احمد حریری: اسلامی مذاہب، ص ۹۹، ۱۰۰

[2] ایضاً: ص ۱۰۰

[3] ایضاً: ص ۱۰۰

باقی سب سے تعداد میں زیادہ اور مضبوط تھے۔ پروفیسر ابوزہرہ مصری نے دیگر خوارج سے اِن کے چھ امتیازی عقاید کا ذکر کیا ہے، جن میں سے چار یہ ہیں:

"(الف) یہ اپنے مخالفین کو صرف خارج از ایمان ہی قرار نہیں دیتے بلکہ اُن کو مشرک اور دائمی جہنمی تصوّر کرتے ہیں، اُن کا قتل و قتال بھی اُن کے نزدیک روا ہے۔

(ب) غیر خوارج مسلمان کا ملک دارالحرب ہوتا ہے اور وہاں پر ہر وُہ کام مباح ہے جو دارالحرب میں مباح ہوتا ہے مخالفین کے بچّوں اور عورتوں کو قتل کرنا اور اُنھیں لونڈی غلام بنانا جائز ہے۔ جنگ سے جی چُرانے والوں (قتلِ مسلم سے پرہیز کرنے والے خارجیوں) کو قتل کرنا روا ہے۔

(ج) مخالفین کے بچّے بھی مشرک ہیں اور ابدی جہنمی ہیں۔ اِس سے اُن کا مقصود یہ تھا کہ مخالفین کا کفر صرف اُن کی ذات تک محدود نہیں رہے گا بلکہ اُن کے بچّوں تک بھی پہنچ جائے گا، باوجودیکہ اُنھوں نے اِس جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ خوارج کا یہ نقطۂ نظر ایک عظیم فکری انحراف کی آئینہ داری کرتا ہے۔

(د) گناہِ صغیرہ یا کبیرہ کا ارتکاب انبیاؑ سے بھی ہو سکتا ہے۔"[1]

ازارقہ خوارج کے موخرالذکر عقیدے کے بارے میں موصوف نے اپنے تاثرات کا یوں اظہار کیا ہے:

"اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوارج کے اقوال میں تناقض پایا جاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ کبائر کا ارتکاب کرنے والوں کو کافر قرار دیتے اور دُوسری جانب انبیاؑ سے بھی اُن کا صدور جائز سمجھتے ہیں۔ گویا اُن کے خیال میں انبیاؑ کفر کا ارتکاب کر کے توبہ کر لیا کرتے ہیں۔"[2]

---

[1] غلام احمد حریری: اسلامی مذاہب، ص ۱۰۳

[2] ایضاً: ص ۱۰۳

خوارج کے بارے میں بحیثیت مجموعی پروفیسر صاحب مذکور اپنے خیالات یوں ظاہر کرتے ہیں:

"دراصل خارجی مذہب کی بنیاد تشدّد اور غلو پر ہے۔ دین اور فہمِ دین کے معاملہ میں یہ لوگ بہت زیادہ غالی اور متشدد تھے۔ اِس چیز نے اُنھیں گمراہی کے راستے پر لا ڈالا تھا اور عامۂ مسلمین کو بھی گمراہ کرنے کے درپے رہتے تھے۔"[1]

موجودہ زمانے کے خارجی حضرات باوجود اتمامِ حجّت کے اور دلائل کے میدان میں عاجز رہ جانے پر بھی اپنے عقاید و نظریات سے ایک انچ بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہوتے لیکن یہ حیرت اُس وقت دُور ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اِن حضرات کی اوّلین جماعت پر خود امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے یوں اتمامِ حجّت فرمائی:

"ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ہم عصر خوارج کے مزعومات کے دندان شکن اور مدلّل جواب دیے۔ اُن کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"اگر تمھارا خیال یہ ہے کہ میں خطاوار ہوں اور گمراہ ہوں تو میری گمراہی اور غلطی کی سزا اُمتِ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کیوں دیتے ہو؟ تم نے اپنے کندھوں پر تلواریں لٹکا رکھی ہیں اور اُنھیں موقع بے موقع بے نیام کر لیتے ہو۔ تم یہ نہیں دیکھتے کہ گنہگار کون ہے اور بے گناہ کون؟ دونوں کو تم نے ایک ساتھ ملا رکھا ہے۔

تم اچھی طرح جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شادی شدہ زانی کو سنگسار کیا، پھر اُس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھائی، اُس کے اہلِ خانہ کو اُس کا وارث بھی تسلیم کیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) نے قاتل کو جرمِ قتل میں قتل کیا لیکن اُس کے اہل کو اُس کی میراث سے محروم نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے چور کے ہاتھ کاٹے اور غیر شادی شدہ زانی کو دُرّے مارے لیکن دونوں کو مالِ غنیمت

---

[1] غلام احمد حریری: اسلامی مذاہب، ص ۱۰۸

میں سے حصہ بھی دیا۔ آپ نے گنہگاروں کے مابین اللہ تعالیٰ کا حکم قائم کیا، لیکن اسلام نے مسلمانوں کو جو حصہ دیا تھا اُس سے اُن گناہ گاروں کو محروم نہیں کیا، نہ اُن کا نام دائرۂ اسلام سے خارج کیا۔“ [1]

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اِس اتمامِ حجت کے بارے میں پروفیسر ابوزہرہ مصری نے یُوں لکھا ہے:

”حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی اِس مدلّل اور عمدہ تقریر کا خوارج کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اُس موقع پر کتابِ الٰہی سے دلیل لانے کے بجائے عملِ رسول سے دلیل پیش کی، کیونکہ عمل کی تاویل نہیں ہو سکتی، اِس کو درست طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے اور جس میں خوارج کے سطحی نظریات اور فکرِ خام کے لیے کوئی گنجائش نہ نکل سکتی تھی۔ سطحی فکر تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھتا ہے۔ اُس کی نظر ایک جزئیے پر ہوتی ہے اور فہمِ عبادات و اسالیب میں جزئی میلان سے گمراہی تو حاصل ہو سکتی ہے، مقصد تک پہنچنا مشکل ہے۔ امورِ کلیہ پر نظر رکھنے سے حق کا ادراک کیا جا سکتا ہے اور درست فیصلہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ نظربریں حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے آنحضرت (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا عمل پیش کیا تاکہ اُن پر تاویل کے دروازے بند کر دیے جائیں، بغیر اِس کے کہ اُن کی تلبیساتِ فاسدہ کے لیے حیرت و اضطراب کا کوئی رخنہ باقی نہ رہنے دیا جائے۔“ [2]

امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے خوارج کو راہِ راست کی طرف بُلانے اور اتمامِ حجت کی غرض سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو اُن کے پاس بھیجا۔ آپ کی

---

[1] غلام احمد حریری، پروفیسر: اسلامی مذاہب، ص ۹۴

[2] ایضاً: ص ۹۵

خوارج سے جو گفتگو ہُوئی اُسے حافظ ابن عبد البر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۴۶۳ھ) کے حوالے سے مولوی بدر عالم میرٹھی دیوبندی نے یُوں بیان کیا ہے:

"جب خوارج حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) پر چڑھائی کر کے آئے تو لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور عرض کی کہ اے امیر المومنین! دیکھیے یہ جاہل لوگ آپ کے مقابلے میں آمادۂ پیکار کھڑے ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ پہلے اِنھیں جنگ کر لینے دو۔

حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نے عرض کیا کہ آج ذرا تاخیر سے نماز ادا کیجیے، مَیں اُن لوگوں (خوارج) سے گفتگو کر لُوں۔ وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بھیڑ لگ رہی ہے۔ شب بیداری کی وجہ سے اُن کے چہرے سیاہی مائل ہیں۔ سجدوں کے نشان پیشانیوں پر ہیں اور کہنیوں میں اُونٹ کے گھٹنوں کی طرح ٹھیکیں پڑ گئی ہیں۔ دُھلی ہُوئی قمیص پہنے ہُوئے ہیں۔ حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کو دیکھا تو بولے: ابنِ عباس! کیسے آئے اور یہ حُلّہ کیسا پہن رکھا ہے؟ حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کہتے ہیں، میں نے جواب دیا: تمھیں اِس حُلّہ پر کیا اعتراض ہے؟ میں نے خود آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جسم پر اچھے اچھے یمنی کپڑے دیکھے ہیں۔ اِس کے بعد قرآنِ کریم کی یہ آیت تلاوت کی: "قل من حرم زینة اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق"۔ آپ کہہ دیجیے کہ یہ زینت اور اچھی اچھی غذائیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے بنائی ہیں، کس نے حرام کیں؟ پھر اُنھوں نے دریافت کیا: کہو کیوں آئے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ میں آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور جن میں قرآن نازل ہوا تھا اور تم میں کوئی شخص ایسا نہیں، جس نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا ہو۔ میری آمد کا

مقصد یہ ہے کہ اُن کی باتیں تم تک اور تمھاری باتیں اُن تک پہنچا دُوں۔ اُنھوں نے آپس میں کہا: اِن سے بات مت کرو کیونکہ یہ قریشی ہیں اور اِن کے حق میں قرآن کہتا ہے: "بل ھم قوم خصمون"۔ بلکہ یہ لوگ جھگڑالو ہیں۔

بعض نے کہا کہ ہم ضرور گفتگو کریں گے۔ اِس کے بعد اُن میں سے دو تین شخص سامنے آئے۔ میں نے پُوچھا کہ حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) پر تمھیں کیا اعتراض ہے؟ اُنھوں نے کہا: تین اعتراض ہیں۔ میں نے کہا، بتاؤ۔ اُنھوں نے کہا، پہلی بات تو یہ ہے کہ اُنھوں نے دین کے معاملہ میں انسانوں کو حَکَم بنایا، حالانکہ قرآن کریم میں ہے: "انّ الحکم الا للہ"۔ فیصلہ صرف خدا کا ہے۔ میں نے کہا، چلو ایک بات ہُوئی، اور بولو۔ کہنے لگے، حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے حضرت عائشہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سے جنگ کی، پھر نہ کسی کو قید کیا اور نہ مالِ غنیمت لوٹا۔ اب اگر اُن کی جماعت مسلمان تھی تو اُن سے جنگ کیوں کی اور اگر کافر تھی تو جس طرح اُن کے ساتھ جنگ درست تھی، قید کرنا بھی درست تھا۔ میں نے کہا، اچھا! اور کچھ؟ بولے تیسری بات یہ ہے کہ اُنھوں (امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اپنا نام امارت سے کیسے مٹایا؟ اِس لیے اگر وُہ مومنین کے امیر نہیں تو یقیناً کافروں کے امیر ہُوئے۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

میں نے کہا اگر میں اِن سب باتوں کا تمھیں خود قرآن و سنّت سے ہی جواب دے دوں تو کیا واپس چلے جاؤ گے؟ اُنھوں نے کہا: کیوں نہیں۔ اِس پر میں نے کہا، اچھا تو سُنو۔ پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن ہی میں دُوسروں کو حَکَم مقرر کرنے کا حُکم موجود ہے چنانچہ حالتِ احرام میں کوئی شخص شکار کرے تو اللہ تعالیٰ نے اُس پر جزا مقرر کی ہے اور اُس کا فیصلہ دو منصف مسلمانوں پر رکھا ہے، جو وُہ کہہ دیں گے وہی قابلِ تسلیم ہو جائے گا۔ اِسی طرح خلع میں طرفین کے دو شخص بلا کر فیصلہ اُن کی رائے

پر رکھ دیا ہے۔ اب تم ہی انصاف کرو کہ جب جانوروں اور عورتوں تک کے معاملات میں مسلمانوں کا فیصلہ قابلِ تسلیم سمجھا گیا ہے تو مسلمانوں کے جانی معاملات میں کیوں تسلیم نہیں ہوگا؟ اب بتاؤ تمہارا اعتراض جاتا رہا یا نہیں؟ کہنے لگے: جی ہاں۔

دُوسری بات کا جواب یہ ہے کہ بتاؤ حضرت عائشہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) تمھاری ماں تھیں یا نہیں؟ اگر انکار کرتے ہو تو کافر ہوتے ہو اور اقرار کرتے ہو تو کیا قید کرنے کے بعد اُن کے ساتھ وہ سب معاملات درست رکھو گے جو دُوسرے قیدیوں کے ساتھ جائز ہوتے ہیں؟ اگر اِس کا اقرار کرتے ہو، تو بھی کافر ہو، کہو اِس پر تمہارا کوئی اعتراض ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں۔

میں نے کہا: اب تیسری بات کا جواب سنو۔ صلح حدیبیہ میں اُبوسفیان وسہیل کے اصرار پر کیا آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے نام سے رسول اللہ کا لفظ محو کرنے کا امر نہیں فرمایا تھا؟ پھر اگر حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اپنا نام امارت سے علیحدہ کر دیا تو کیا ہوا؟ سوال و جواب کے بعد اُن میں دو ہزار اشخاص تو واپس ہو گئے اور جو رہ گئے وُہ قتل کر دیے گئے''۔[1]

مذکورہ بالا طویل حوالہ ہم نے اِس غرض سے نقل کیا ہے تاکہ خوارج کے عقاید، ذہنیت اور اُن کے ساتھ صحابۂ کرام کا سلوک وغیرہ بہت سے گوشے قارئین کرام کے سامنے آجائیں۔ احادیث میں اُن کی جو نشانیاں مذکور ہوئیں وہی مشاہدہ میں آئیں مثلاً:

۱۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسی ہستی کو توحید کا مخالف ٹھہرانا اور ہر اُس مسلمان کو کافر و مشرک قرار دینا جو حضرت امیر المومنین کو مشرک نہ کہے اور اُن سے اپنی براٴت کا

---

[1] بدرِ عالم میرٹھی، مولوی: ترجمان السنۃ، جلد اول، مطبوعہ دہلی، ص ۴۲

اظہار نہ کرے۔

۲۔ صحابۂ کرام کے نزدیک خوارج کا عقیدۂ توحید جیسا کہ اُنھوں نے اُس کی پیشِ خویش حدود متعین کی ہُوئی تھیں، قرآن وسنّت کے خلاف اور اسلامی توحید کے منافی تھا۔

۳۔ بات بات میں قرآن سے استدلال کرنا خوارج کا طرۂ امتیاز تھا لیکن قصورِ فہم کے باعث قرآنی آیات کو اپنے مخصوص عقاید و نظریات کا تابع رکھنے کے عادی تھے۔

۴۔ عبادت گزاری اور شب بیداری میں یہ مسلمانوں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔

۵ اپنے فیصلے کے رُوبرُو یہ خدا اور رسول (جل جلالہٗ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کے فیصلے کی پروا بھی نہیں کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت اور اُن کا جنتی ہونا خود قرآنِ کریم سے ثابت، حضور رجانِ نور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُنھیں عشرہ مبشرہ میں شامل فرمایا، اہلِ بیت میں ٹھہرایا اور آپ کے ایسے ایسے فضائل و خصائص بتائے جن میں آپ منفرد بھی ہیں اور اپنے گوناں گوں فضائل وکمالات کی بِنا پر اُمتِ محمدیہ میں آپ کو ہمیشہ انتہائی عقیدت اور احترام کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اِسی طرح دیگر صحابۂ کرام کے فضائل قرآن وسنّت سے ثابت لیکن خوارج نے اپنی ساختہ توحید کا اِن حضرات کو دشمن ٹھہرایا، باری تعالیٰ شانہٗ اور اُس کے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فیصلے کو اپنے توحیدی جوش میں پسِ پشت پھینک کر، اسلام کے علمبرداروں اور اُمتِ مرحومہ کے سرداروں کو بھی مشرک قرار دینے میں کوئی جھجک محسوس نہ کی۔ موجودہ زمانے کے خوارج بھی اپنی ساختہ توحید کی ایسی ہی حدود متعین کیے ہوئے ہیں، جن کے پیشِ نظر اُمتِ مرحومہ کا کوئی فرد موحّد نہیں ثابت کیا جاسکتا بلکہ اِن کی اصطلاح میں مشرک ہی قرار پاتا ہے اور اِس طرح یہ اُمتِ مرحومہ گویا مشرکوں کا ایک گروہ یا اُمتِ ملعونہ بن کر رہ جاتی ہے (نعوذ باللہ من شرورہم)

۶۔ جو خارجی اپنی ساختہ توحید سے تائب ہو کر حقیقی اسلام کے پیروکار نہ بنیں وہ صحابۂ کرام کے نزدیک مستحل الدم ہیں جیسا کہ خوارج کا حشر امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا۔

۷۔ خارجی صرف خود کو اسلام کا صحیح متبع مان سکتے ہیں، اِس کے علاوہ کسی بڑی سے بڑی ہستی پر تنقید کرنے، اُس کی شان میں کیڑے نکالنے، اُسے خوفِ خدا سے عاری یا سنتِ رسول کا مخالف کہتے ہُوئے اِنھیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حُلّے پر اعتراض کیا تھا۔

اِس کے علاوہ اَور جتنے گوشے ہیں وہ مذکورہ بالا عبارت سے خود ہی واضح ہیں۔

جب خوارج کا تشدّد حد سے بڑھا تو ذوالفقارِ حیدری نیام سے باہر نکل آئی۔ مسلمانوں نے خوارج کا زور توڑ کر رکھ دیا۔ چُن چُن کر اُنھیں قتل کیا۔ بہت تھوڑے بچ سکے ورنہ سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ نہ اُنھیں کلمہ گو شمار کیا نہ اہلِ قبلہ، نہ صحابۂ کرام و تابعین حضرات نے اُن کے جُبّوں قُبّوں کو دیکھا اور نہ اُن کے ظاہری تدیّن کو، نہ اُن کا مثالی قاری ہونا اُنھیں مسلمان ثابت کر سکا اور نہ پیشانیوں پر پڑے ہُوئے سجدوں کے نشان اُن کے اہلِ اسلام ہونے کی دلیل بن سکے، نہ شب بیداری نے اُنھیں کُفریہ عقاید سے بچایا اور نہ خانہ ساز توحید نے۔ وُہ صحابۂ کرام و تابعینِ عظام کے ہاتھوں قتل ہُوئے۔ نہ صرف محاربین کو اُن اکابر نے تہِ تیغ کیا بلکہ اِس ناپاک گروہ کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکنے کی خاطر، اِس ساختہ توحید کے علمبرداروں کو چُن چُن کر ذبح کیا اور ملکِ عدم کی سیر کرائی۔ کذٰلک العذابُ ولعذاب الاٰخرۃ اکبرُ لو کانوا یعلمون ٥

خوارج کے غیر اسلامی عقاید و نظریات کا مرکزی نقطۂ نظر یہی تھا کہ وُہ اپنا ذوقِ تکفیر پُورا کرنے کی غرض سے، اُن آیات کو جو بُتوں اَور بُت پرستوں کے بارے میں نازل ہُوئی ہیں اُنھیں بزرگانِ دین پر چسپاں کر کے مسلمانوں کو انبیائے کرام و اولیائے عظام کی عقیدت و محبت کے باعث مشرک قرار دیتے تھے اور آج تک یہی کچھ مظاہرہ کیا جا رہا ہے خوارج کی اِس عادت کا مشہور دیوبندی عالم، مولوی بدرِ عالم میرٹھی نے یُوں تذکرہ کیا ہے:

> ”خوارج کا نقطۂ ضلالت یہی تھا کہ جو آیات کفار کی شان میں نازل ہُوئی تھیں اُنھیں وہ مسلمانوں کے حق میں سمجھ کر اُنھیں کافر قرار دیتے، پھر اِس جاہلانہ بنیاد پر اُن سے آمادۂ جنگ ہوجاتے تھے“۔[1]

---

[1] بدر عالم میرٹھی، مولوی: ترجمان السنۃ، جلد اول، ص ۴۴

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ خوارج کے بارے میں اُس مردِ حق آگاہ کی رائے گرامی کا اظہار بھی کر دُوں، جو علم کی وافر دولت سے ہی مالا مال نہ تھے بلکہ روحانیت کے لحاظ سے اولیائے کرام میں اپنی مثال آپ ہُوئے۔ میری مراد شہنشاہِ بغداد، قطب الاقطاب، غوث الاعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرّہٗ سے ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

”وقد وصفهم النبی صلی اللہ علیه وسلم بانهم یمرقون من الدین کما یمرق السهم من الرمیة ثم لا یعودون فیه فهم الذین مرقوا من الدین والاسلام وفارقوا الملّة وشردوا عنها وعن الجماعة وضلوا عن سوآء الهدیٰ والسبیل وخرجوا عن السلطان وسلّوا السیف علی الائمة واستحلوا دمائهم واموالهم وکفروا من خالفهم یشتمون اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم واصهاره ویتبرون منهم ویرمونهم بالکفر والعظائم ویرمون خلافهم ولا یؤمنون بعذاب القبر ولا الحوض ولا الشفاعة ولا یخرجون احدا من النار ویقولون من کذب کذبة او اتی صغیرة

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُن کے بارے میں فرمایا ہے کہ وُہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے، اور پھر دین میں واپس نہیں آئیں گے۔ پس یہ وہی لوگ ہیں کہ دینِ اسلام سے خارج ہو گئے۔ ملتِ اسلامیہ میں تفریق کی اور اُس سے بھاگے اور مسلمانوں کی جماعت سے کٹ کر رہ گئے۔ ہدایت کے سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔ سلطان وقت کے باغی ہُوئے اور ائمۂ مطہرین پر تلوار اٹھائی اور اُن حضرات کا خون بہانا اور مال لُوٹنا حلال ٹھہرایا۔ اپنے مخالفوں کو کافر کہتے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اصحاب اور خسروں کو گالیاں دیتے، اُن پر تبرّا بازی کرتے اور اُن حضرات پر کفر اور کبیرہ گناہوں کی تہمت لگاتے اور غیر خوارج کو متہم کرتے۔ یہ عذابِ قبر، حوضِ کوثر، شفاعت اور دوزخ سے کسی کے نکالے جانے کا انکار کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے جس نے ایک دفعہ جھوٹ بولا یا گناہِ صغیرہ

او كبيرة من الذنوب فمات من غير توبة فهو كافر وفي النار مخلد۔[1]	یا کبیرہ کیا اور بغیر توبہ کیے مرگیا، تو ایسا آدمی کافر ہے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

حضرت غوث صمدانی، محبوب سبحانی، سیدنا عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۵۶۱ھ) نے آگے خوارج کے پندرہ ۱۵ فرقے، اُن کے بانیوں کے نام اور ہر فرقے کے مخصوص عقائد کا ذکر کر کے آخر میں جملہ خوارج کی قدر مشترک یعنی ایسے دو غیر اسلامی معتقدات تحریر فرمائے ہیں، جن پر نجدات کے سوا سب خارجیوں کا اتفاق ہے۔ فرماتے ہیں:

واتفقت جميع الخوارج على كفر علي رضي الله عنه لاجل التحكيم وعلى كفر مرتكب الكبيرة الا النجدات فانها لم يوافقهم على ذلك۔[2]	خوارج کے تمام فرقوں کا بوجہ مسئلۂ تحکیم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کفر اور کبیرہ گناہ کے مرتکب کو کافر سمجھنے پر اتفاق ہے، ماسوائے نجدات فرقے کے کیونکہ اِس بارے میں وہ دیگر خوارج سے متفق نہیں ہے۔

امام الائمہ حضرت سیدنا ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۱۵۰ھ) نے جو بلاشبہ امام المسلمین ہیں، صحابۂ کرام کے بارے میں اپنا اور جمہور مسلمین کا عقیدہ نیز مرتکبِ کبائر کا شرعی حکم یُوں بیان فرمایا ہے:

افضل الناس بعد النبيين عليهم الصلوٰة والسلام ابوبكر الصديق ثم عمر بن الخطاب الفاروق ثم عثمان بن عفان ذو النورين ثم علي ابن ابي طالب المرتضىٰ رضوان الله تعالىٰ عليهم اجمعين	جملہ انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد تمام اِنسانوں میں افضل ترین حضرت ابوبکر صدیق، ان کے بعد حضرت عمر فاروق، پھر ان کے بعد حضرت عثمان بن عفان ذوالنورین پھر ان کے بعد حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین ہیں۔ یہ سب عبادت گزار، حق پر گامزن اور

---

[1] عبدالقادر جیلانی، غوثِ اعظم: غنیۃ الطالبین، شائع کردہ مکتبہ سعودیہ کراچی، ص ۳۱۰، ۳۱۱

[2] ایضاً: ص ۳۱۵، ۳۱۶

عابدين على الحق ومع الحق نوليهم جميعا ولا نذكر احدا من اصحاب رسول الله (صلى الله عليه وسلم) الا بخير ولا نكفر مسلما بذنب من الذنوب وان كان كبيرة اذا لم نستحلها ولا نزيل عنه اسم الايمان ونسميه مومنا حقيقة ۔ [1]

حق کے ساتھ تھے ۔ ہم اِن سب سے محبت رکھتے ہیں اور ہم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تمام اصحاب (صحابۂ کرام) کو بھلائی کے ساتھ ہی یاد کرتے ہیں اور ہم کسی مسلمان کو کسی بھی گناہ کی وجہ سے اگرچہ وہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہو، کافر نہیں کہتے، جب تک کہ وہ اُس کو حلال نہ سمجھے اور ہم اُس کو ایمان کے وصف سے نہیں نکال لیتے بلکہ بلحاظِ حقیقت اُسے مومن ہی گردانتے ہیں ۔

خارجی سلفی

چوتھی صدی ہجری میں اتباعِ سلف کا دعویٰ کرتے ہوئے بعض حضرات نمودار ہوئے جو خود کو امام احمد ابن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۱۴۲ھ) کا پیروکار کہتے اور دینِ حق کا علمبردار ٹھہرا کر مسلمانوں کو اسلام سے خارج بتایا کرتے تھے ۔ حقیقت میں یہ خارجیت کے علمبردار تھے ۔ پروفیسر ابوزہرہ مصری لکھتے ہیں:

”اتباعِ سلف سے مراد ہمارے نزدیک وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو سلفی المشرب کہتے تھے اگرچہ ہم ان کے بعض عقائد و افکار کی نسبت اسلاف کی جانب صحیح نہیں سمجھتے ۔ یہ لوگ حنابلہ سے تعلق رکھتے تھے ۔ یہ چوتھی صدی ہجری میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے ۔ اِن کا دعویٰ ہے کہ اُن کے تمام اقوال و آراء امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے ماخوذ ہیں ۔ جنہوں نے عقائدِ سلف کو حیاتِ نو بخشی اور اُن کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے مخالفین کے سامنے سینہ سپر رہے

---

[1] نعمان ابن ثابت، امام اعظم : الفقہ الاکبر، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ص ۳۴، ۳۵

"..... یہ حنابلہ مسئلہ توحید اور قبروں سے اُن کے ربط و تعلق پر گفتگو کرتے تھے۔ آیاتِ تاویل و تشبیہہ کا مسئلہ بھی اِن کے یہاں اکثر زیرِ بحث آتا۔ اِن کا ظہور چوتھی صدی ہجری میں ہُوا۔ یہ اپنے عقائد و افکار کو امام احمد بن حنبل (رحمۃ اللہ علیہ) کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ بعض حنابلہ (جو حقیقت میں حنبلی تھے) اِن عقائد کی نسبت امام احمد کی جانب درست نہیں سمجھتے، اِس ضمن میں اِن سے جدل آزما ہوتے تھے۔"[۱]

سلفی حضرات نے جب خارجیت کو دوبارہ زندہ کرنا چاہا اور مسلمانوں کو دھوکا دینے کی غرض سے اپنے عقاید فاسدہ کی نسبت امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۲۴۱ھ) کی طرف کرنے لگے تو علمائے اہلسنّت کے ساتھ ہی وُہ حنبلی علمائے کرام بھی سلفیوں کی تردید میں انتہائی سرگرمی دکھانے لگے جو حقیقت میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے متبع تھے۔ امام ابن جوزی حنبلی نے اِن کا سب سے بڑھ کر تعاقب کیا تھا۔ مثلاً:

> "حنابلہ نے چوتھی صدی ہجری میں بعینہٖ اِنہی خیالات کا اظہار کیا تھا اور اُنھیں سلف کی جانب منسوب کیا۔ علماء اُن کے خلاف اُٹھ کھڑے ہُوئے اَور کہا کہ اِس سے خدا کی تجسیم و تشبیہہ (خدا کا مخلوقات کی طرح جسم دار ہونا) لازم آتی ہے۔ وجہِ لزوم یہ ہے کہ جب خدا کی جانب حسّی اشارہ کیا جا سکتا ہے تو وُہ ضرور مجسم ہوگا۔ حنابلہ کے اِنہی نظریات کی بنا پر مشہور حنبلی فقیہہ (خطیب ابن جوزی اُن کی مخالفت پر تُل گئے۔ اِنھوں نے کہا: امام احمد بن حنبل (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) یہ افکار و آراء نہیں رکھتے تھے۔"[۲]

علّامہ ابن جوزی حنبلی کی سرگرمیوں کے بارے میں موصوف نے کچھ آگے یوں وضاحت کی ہے:

---

[۱] غلام احمد حریری: اسلامی مذاہب، ص ۲۵۶

[۲] ایضاً؛ ص ۲۶۴

”ابن الجوزی نے اقوالِ حنابلہ (یعنی سلفی حضرات) کے ابطال میں شرح و بسط سے کام لیا ہے۔ ابن جوزی نے جن اقوال کی تردید پر قلم اٹھایا، اُن کے قائل مشہور حنبلی فقیہہ (سلفی)، قاضی ابویعلیٰ (المتوفی ۴۵۷ھ) ہیں۔ قاضی موصوف اُس دور میں شدید نقد و جرح کا نشانہ بنے تھے، یہانتک کہ بعض حنابلہ کو کہنا پڑا: وقد شان ابو یعلیٰ الحنابلہ شینا لا یغسلہ ماء البحار۔“ ابویعلیٰ نے حنابلہ کو اس قدر داغدار کر دیا ہے کہ سمندروں کا پانی بھی اُن دھبّوں کو دُور نہیں کر سکتا۔ فقیہہ ابن زاغونی حنبلی (المتوفی ۵۲۷ھ) سے بھی قاضی ابویعلیٰ کے بارے میں اسی قسم کا قول منقول ہے۔ بعض حنابلہ کا قول ہے: ان فی قولہ غرائب التشبیہ ما یحار النبیہ۔“ ابویعلیٰ کے اقوال میں تشبیہ و تجسیم کے اِس قدر نوادر پائے جاتے ہیں کہ ایک دانشمند آدمی اُن کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔“[1]

جب علمائے اہلسنت یعنی حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنبلیہ نے اِن خوارجِ زمانہ کا پُوری سرگرمی سے تعاقب جاری رکھا تو یہ فتنہ دب گیا اور دو سَو سال تک پھر یہ آواز کہیں سے نہ اُٹھی۔ چنانچہ ابوزہرہ مصری نے لکھا ہے:

”چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں حنابلہ نے اِن رجحانات کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا، اِسی وجہ سے حنبلی مسلک (سلفی حنابلہ) نظروں سے اوجھل ہو گیا۔“[2]

خارجی حرّانی

پانچویں صدی ہجری میں یہ خارجی سلفی فتنہ مکمل طور پر ختم ہو گیا تھا لیکن جس جماعت نے

---

[1] غلام احمد حریری، پروفیسر: اسلامی مذاہب، ص ۲۶۶

[2] ایضاً، ص ۲۶۶

دجّال کے لشکر میں شامل ہونے کا شرف حاصل کرنا ہے اُسے بھلا کون مٹا سکتا ہے، چنانچہ ساتویں صدی ہجری میں اِس فتنے نے پھر سر نکال لیا۔ اِس دفعہ علاّمہ ابن تیمیہ حرّانی (المتوفی ۷۲۸ھ) کی سرکردگی میں خارجیت کے جراثیم پھیلانے کی مہم شروع ہُوئی۔ اپنی تیز طبیعت سے علاّمہ ابن تیمیہ نے کتابِ خارجیت کے موجودہ ایڈیشن میں چند اضافے کر کے، جو پہلے ہی کریلا تھا اُسے اور نیم پر چڑھا دیا۔ اِس بارے میں پروفیسر ابُوزہرہ مصری نے یُوں وضاحت کی ہے:

> ”ساتویں صدی ہجری میں یہ لوگ ایک مرتبہ پھر معرضِ ظہور میں آئے۔ یہ حیاتِ نو اِن کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے باعث حاصل ہُوئی جو سلفیت کے سرگرم داعی تھے۔ ابنِ تیمیہ نے بعض دیگر مسائل کی دعوت و تبلیغ کا بھی بیڑا اُٹھایا جو آپ کے عصر و عہد کی پیداوار تھے۔“[1]

علاّمہ ابن تیمیہ حرّانی (المتوفی ۷۲۸ھ) نے خارجیت کے متن پر وُہ بے نظیر حاشیہ لکھا، توحید کے مسئلہ کی حدود ایسی وضع کر دیں کہ گزشتہ سات صدیوں کے مسلمانوں میں سے کسی ایک فرد کو موحّد ثابت کر دکھانا ناممکن ہو کر رہ گیا۔ جناب ابوزہرہ مصری نے اِس بارے میں یُوں وضاحت فرمائی ہے:

> ”سلفیہ کی رائے میں مسئلہ توحید اساسِ اسلام ہے۔ یہ بات حق ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی مجال نہیں۔ سلفیہ مسئلۂ توحید کی جو تشریح و توضیح کرتے ہیں وُہ جمہور اہلِ اسلام کے نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہے مگر وُہ چند امور کو منافیِ توحید سمجھتے ہیں جو جمہور مسلمانوں کے نزدیک توحید سے متعارض و متصادم نہیں۔ سلفیہ کے وہ مخصوص مسائل یہ ہیں:
>
> ۱۔ فوت شدگان سے توسل کرنا وحدانیتِ خداوندی کے منافی ہے۔
>
> ۲۔ روضۂ نبوی کے رُو برُو ہو کر اُس کی زیارت کرنا توحید کے خلاف ہے۔

---

[1] غلام احمد حریری: اسلامی مذاہب، ص ۲۵۶

۳ - روضۂ نبوی کے اِردگرد دینی شعائر و احکام (مثلاً طواف) کا بجالانا توحید کے منافی ہے ۔

۴ - کسی نبی یا ولی کی قبر کے اُوپر خدا سے دعا مانگنا ، خلافِ توحید ہے ۔

۵ - سلف صالحین کا مذہب یہی تھا ، اِس کی خلاف ورزی کرنیوالے بدعات کے مرتکب اور توحید کے مخالف ہیں "۔ [1]

وہ محبوب پروردگار جو باعثِ ایجادِ کائنات اور وجہِ قیامِ مخلوقات ہے ، اُن کے روضۂ مطہرہ کی زیارت کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ حرانی (المتوفی ۷۲۸ھ) مبلغِ خارجیت کے نظریئے کو مزید یوں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے :

" ابن تیمیہ اسی لیے فرماتے ہیں کہ از راہِ تبرک روضۂ نبوی کی زیارت جائز نہیں ، اِس لیے کہ آنحضور نے اپنی قبر کو مسجد بنانے سے روک دیا تھا ، جس سے آپ کا مقصود یہ تھا کہ آپ کا روضہ زیارت گاہِ خلائق نہ بن جائے "۔ [2]

پروفیسر ابُوزہرہ مصری نے موصوف کے اِس نظریہ کے بارے میں یُوں اپنا عندیہ ظاہر کیا ہے :

" مسئلہ زیرِ نظر (زیارتِ روضۂ انور) میں امام ابن تیمیہ کا موقف جمہور اہلِ اسلام کے خلاف ہے بلکہ اُن کے نظریات کے خلاف ایک زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے ۔ قبورِ صلحا اور اُن کی منت و زیارت کے مسئلہ میں ہم کسی حد تک ابن تیمیہ کے ہمنوا ہیں مگر روضۂ نبوی کی زیارت کے مسئلہ میں ہم اُن کی شدید مخالفت کرتے ہیں "۔ [3]

موصوف کی اِس کتاب کے مترجم یعنی لائلپور زرعی یونیورسٹی کے عربی اور اسلامیات کے

---

[1] غلام احمد حریری ، پروفیسر : اسلامی مذاہب ، ص ۲۶۰

[2] ایضاً : ص ۲۸۲

[3] ایضاً : ص ۲۸۲ ، ۲۸۳

پروفیسر، جناب غلام احمد حریری نے روضۂ نبوی کی زیارت کے بارے میں علاّمہ ابن تیمیہ حرّانی (المتوفی ۷۲۸ھ) کے نظریے کی حمایت اور پروفیسر ابوزہرہ مصری کے موقف پر، جیساکہ مذکورہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے، چیں بجبیں ہو کر یُوں تنقید کی اور دھاندلی مچائی ہے:

> "مصنّف کا یہ قول مبالغہ آمیزی پر مبنی ہے (یعنی جمہور اہلِ اسلام کے خلاف بتانا)۔ حدیثِ نبوی "لا تشدوا الرحال"، کے پیشِ نظر محدثین کی اکثریت امام ابن تیمیہ کی ہمنوا ہے اور تبرک و تیمن کے نقطۂ نظر سے روضۂ نبوی کی زیارت کو جائز نہیں سمجھتی۔"[1]

چونکہ برٹش گورنمنٹ کے عہدِ اقتدار سے آج تک مدعیانِ اسلام کو ایسی آزادیِ رائے حاصل ہے کہ خدائی کے دعویدار بن بیٹھو یا نبوت کے مدعی ہو جاؤ، باری تعالیٰ شانہ، کو جھوٹا ٹھہراؤ یا انبیائے کرام کو چمار سے بھی ذلیل کہتے پھرو۔ سرورِ کون و مکاں اور عالمِ علومِ اولین و آخرین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نماز میں خیال لانا گدھے بیل کے تصور میں سراپا ڈوب جانے سے بدتر اور شرک بتاؤ یا اُن کے کثیرہ، وافرہ، مختصہ علومِ غیبیہ کو بچوں، پاگلوں اور جانوروں کے معلومات کے برابر ٹھہراؤ، نبیِ آخرالزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بلحاظِ زمانہ آخری نبی ہونے کا انکار کرتے پھرو یا اُن کے جملہ اقوال و افعال پر خطِ تنسیخ کھینچ کر، سرے سے اُن کے قابلِ حجت یا لائقِ استناد ہونے ہی کا انکار کر بیٹھو، پُوچھنے والا بھلا کون ہے؟ عظمتِ خداوندی اور شانِ مصطفوی کا دفاع کرنے کی کسی صاحبِ اقتدار و قدرت کو ضرورت ہی کیا پڑی تھی؟ ایسے پُرفتن دَور میں کون کسی کی زبان پر پہرہ بٹھا سکتا ہے؟ ہاں جس وقت قرآن و حدیث سے غیر اسلامی عقائد و نظریات کو اسلامی عقائد کا جامہ پہنایا جائے گا، وہاں دلائل کے میدان میں ایسی دھاندلی کا راز فاش کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور علمائے اسلام نے ایسا دفاع ہر دَور میں مثالی طور پر کیا ہے۔

پروفیسر غلام احمد حریری نے چونکہ یہاں حدیث "لا تشدوا الرحال" سے استناد

---

[1] غلام احمد حریری، پروفیسر: اسلامی مذاہب، ص ۲۸۲

کر کے ایک بہت بڑا دعوٰی کر دیا ہے جو سراسر محتاجِ دلیل ہے۔ موصوف نے دعوٰی تو کر دیا ہے کہ محدثین کی اکثریت علّامہ ابن تیمیہ (المتوفی ۷۲۸ھ) کی ہمنوا ہے اور اس غرض سے روضۂ نبوی کی زیارت کو جائز نہیں سمجھتی۔ لیکن ہمیں فاضل مترجم کے اِس دعوٰی سے اختلاف ہے کیونکہ اِس حدیث کے پیشِ نظر محدثین نے روضۂ نبوی کی زیارت کو ہرگز ناجائز نہیں کہا اور نہ علّامہ ابن تیمیہ حرّانی کی قطعاً ہمنوائی کی۔ موصوف اگرچہ محدثین کی ہمنوائی کا دعوٰی کر رہے ہیں لیکن ہماری گزارش یہ ہے کہ اُنھیں دلائل کے میدان میں محدثین کے مبارک طبقہ میں سے کوئی ایک بھی قابلِ ذکر ہستی ایسی نہ ملے گی جس نے علّامہ ابن تیمیہ کی ہمنوائی کی ہو ماسوائے گروہِ خوارج کے جو اسلامی عقاید و نظریات کے لیے ہمیشہ ایک چیلنج ثابت ہوتا رہا ہے۔

مقابرِ بزرگانِ دین کی زیارت اور اُن کے توسّل کے بارے میں علّامہ ابن تیمیہ حرّانی کا نظریہ یہ تھا:

"جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ قبروں کی منّتیں قضائے حاجات کا ذریعہ ہیں، اُن سے ازالۂ تکلیفات ہوتا، رزق کے دروازے کھُلتے اور شہر مامون و محفوظ رہتا ہے، وُہ مشرک ہونے کی وجہ سے واجب القتل ہے"۔[1]

موصوف کے اِس نظریہ کے بارے میں پاکستان کے مشہور اہلِ قلم اور حق و انصاف کے عظیم علمبردار، سیدی و سندی و مرشدی حضرت مفتیِ اعظم ہند شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء) کی زندہ یادگار، مخدومی و مکرّمی پروفیسر محمد مسعود احمد زید مجدہٗ یُوں رقمطراز ہیں:

"ابنِ تیمیہ نے ۷۱۰ھ/۱۳۱۰ء میں اولیاء و انبیاء کے مزارات پر حاضری کے خلاف ایک رسالہ بھی لکھا تھا جس کی پاداش میں کافی عرصہ بعد ۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء میں سلطانِ وقت نے اِن کو قید کیا اور اُسی قید و بند میں انتقال ہوا

---

[1] غلام احمد حریری: اسلامی مذاہب، ص ۱۸۲

ابنِ تیمیہ مزارات پر حاضری کے علاوہ استغاثہ کے بھی خلاف تھے۔ چنانچہ یوسف النبہانی نے اپنی کتاب "شواھد الحق فی الاستغاثہ بسید الخلق" میں ابنِ تیمیہ کے اِس عقیدے کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔"[1]

سلفی حضرات کا طرزِ عمل تو یہ تھا کہ وہ خود کو حنبلی ظاہر کر کے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے عقائد و نظریات کی نشر و اشاعت کو اپنا نصب العین بتا کر خارجیت کو پھیلانے میں مصروف رہا کرتے اور فقہاء و محدثین و متکلمین اُمتِ محمدیہ پر تنقید کرنے سے باز رہتے تھے۔ علامہ ابن تیمیہ حرانی (المتوفی ۷۲۸ھ) پہلے مبلغ خارجیت ہیں جنھوں نے گروہِ اکابر کے بڑے بڑے علمائے کرام و علمائے عظام، حتّٰی کہ ائمۂ دین تک کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، کسی بڑی سے بڑی اور مسلّمہ ہستی کی شہرت کو داغدار کرنے اور چھلنی بنانے میں قطعاً کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ علامہ ابنِ تیمیہ کی اِس روش کے بارے میں جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب یوں وضاحت کرتے ہیں:

> "ابن تیمیہ صوفیائے کرام اور متکلمین سے بھی نالاں معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ اِنھوں نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں (المنقد من الضلال اور احیاء العلوم الدین) پر بڑی جرح کی ہے۔ یہ وہی امام غزالی ہیں، جن کی شان میں شیخ ابوالفضل نے گستاخانہ کلمات کہے تھے تو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فوراً اُس کی مجلس سے اُٹھ کر چلے آئے تھے اور معلوم ہے کہ مجدد الف ثانی کون بزرگ تھے؟ یہ وہی بزرگ ہیں جن کے متعلق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کہا ہے: ع
>
> وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
>
> جب تک فیضی نے معافی نہیں مانگ لی، آپ اُس کی مجلس میں تشریف نہیں لے گئے۔ اُنھیں امام غزالی اور دوسرے صوفیہ کرام کے متعلق ابن تیمیہ کہتے ہیں

---

[1] محمد مسعود احمد، پروفیسر: مواعظ مظہری، مطبوعہ کراچی، بار اول، ۱۹۷۰ء، ص ۶۷

"صوفی اور متکلمین ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔"[1]

علامہ ابن تیمیہ حرانی (المتوفی ۷۲۸ھ) کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے موصوف نے یوں اُن کی سوانح حیات بیان کی ہے:

"مگر ایک زمانہ وُہ آتا ہے جب اختلافِ رائے ایک خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے اور علمائے کرام کے طبقے سے ایسے افراد پیدا ہوتے ہیں جن کے افکار و خیالات ملتِ اسلامیہ میں غیر مختتم تفریق کا باعث ہوئے۔ اِس سلسلے میں ہم ایک عالِم کا ذکر کریں گے یعنی تقی الدین ابوالعباس احمد بن شہاب الدین عبدالحلیم المعروف بہ ابن تیمیہ الحرانی الحنبلی (۶۶۱ھ-۷۲۸ھ) یہ عالِم بلا کے ذہین و فطین تھے۔ سترہ برس کی عمر میں فتوٰی نویسی کا آغاز کیا تقریباً پانچ سو کتابوں کے مصنف ہوئے۔ جب ابن تیمیہ نے مناظروں میں اپنے افکار و خیالات کا آزادانہ اظہار کیا تو راسخ العقیدہ علمائے اہلسنت وجماعت میں غم و غصّہ کی لہر دوڑ گئی اور وُہ اِن کے سخت مخالف ہو گئے۔ یہاں تک کہ اِن پر کفر کا فتوٰی لگایا گیا اور بعض علماء نے تو یہ تک فرما دیا کہ جو ابن تیمیہ کو ملحد نہ سمجھے وُہ خود ملحد ہے۔"[2]

علّامہ ابن تیمیہ کی تنقید کا نشانہ صرف ائمۂ دین ہی نہیں بنے بلکہ حضرت عمر فاروق اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے اکابر و اعاظم بھی اِس اندھا دُھند تیر اندازی و ناوک فگنی سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چنانچہ موصوف لکھتے ہیں:

"ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالِم ابنِ تیمیہ کے متعلق لکھا ہے کہ اُنھوں نے الصالحیۃ الجبل کی مسجد میں منبر پر کھڑے ہو کر کہا "حضرت عمر بن الخطاب نے بہت سی غلطیاں کیں"۔ اِسی طرح ایک روایت یہ بھی ہے

---

[1] محمد مسعود احمد، پروفیسر: مواعظ مظہری، ص ۶۷

[2] ایضاً: ص ۶۶

کہ اُنھوں نے کہا: ”علی بن ابی طالب نے تین سو غلطیاں کیں۔“[1]

ابن تیمیہ حرّانی کے عقائد و نظریات کی تردید تو کتنے ہی اکابر اہلسنّت نے کی اور متاخرین علمائے اہلسنّت نے اُن کے نظریات سے ہمیشہ برأت کا اعلان ہی کیا اور اُنھیں دین و ایمان کی موت قرار دے کر مسلمانوں کو ہمیشہ اُن عقاید سے بچنے کی تلقین ہی کرتے رہے۔ اہلسنّت کے مایۂ ناز محدّث شیخ احمد شہاب الدین ابن حجر ہیتمی مکی رحمۃ اللہ علیہ نے علّامہ ابن تیمیہ حرانی (المتوفی ۷۲۸ھ) کے مخصوص عقاید و نظریات کے پیشِ نظر، شرعی فیصلہ یوں صادر فرمایا ہے:

”ابن تيمية عبد خذله الله واضلّه واعماه واصمّه واذلّه وبذلك صرح الائمة الذين بينوا فساد احواله وكذب اقواله ومن اراد ذلك فعليه بمطالعة كلام الامام المجتهد المتفق على امامته وجلالته وبلوغه مرتبة الاجتهاد ابي الحسن السبكي وولده التاج وشيخ الامام العز ابن جماعه واهل عصرهم وغيرهم من الشافعيه والمالكيه والحنفيه ولم يقصر اعتراضه علىٰ متاخري الصوفية بل اعتراض علىٰ مثل عمر بن الخطاب وعلي بن ابي طالب رضي الله عنهما كما يأتي والحاصل

ابن تیمیہ ایک ایسا شخص ہے جس کو خدا نے رسوا کیا، گمراہ کیا، اندھا کیا، بہرا کیا اور ذلیل کیا۔ اِسی لیے ائمۂ دین نے اِس امر کی صراحت کی اور اُس کے فسادِ احوال اور جھوٹے اقوال کو بیان کیا۔ جو تصدیق کا ارادہ رکھتا ہے اُسے چاہیے کہ اُس امام و مجتہد کی تصانیف کا مطالعہ کرے جن کی امامت، جلالت اور مرتبۂ اجتہاد تک رسائی پر سب کا اتفاق ہے یعنی شیخ ابوالحسن سبکی نیز اُن کے فرزندِ ارجمند علامہ تاج الدین سبکی اور اماموں کے شیخ حضرت عزبن جماعہ اور اُن کے معاصرین اور دیگر علمائے شافعیہ مالکیہ اور حنفیہ وغیرہ کی۔ ابن تیمیہ نے صوفیہ متاخرین پر اعتراض کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اُس نے حضرت عمر بن خطاب اور علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے اکابر صحابہ پر بھی اعتراضات کیے جیسا کہ آئندہ مذکور ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ اُس کا

---

[1] محمد مسعود احمد پروفیسر: مواعظ مظہری، ص ۶۴

ان لا يقام لكلامه وزن بل يرمى في كل وعر وحزن و يعتقد فيه انه مبتدع ضال ومضل جاهل غال عامله الله بعدله واجارنا من مثل طريقته وعقيدته وفعله آمين"۔[1]

کلام کوئی وزن نہیں رکھتا بلکہ ویرانے میں پھینکنے کے لائق ہے۔ ابن تیمیہ کے بارے میں عقیدہ رکھنا چاہیے کہ وُہ بدعتی، گمراہ، گمراہ کن، جاہل اور حد سے نکل جانے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس کے ساتھ اپنے عمل سے معاملہ کرے اور ہمیں اُس کے جیسے طریقے اور عقیدے سے بچائے۔ آمین۔

یہی حضرت فخر المحدثین آگے چل کر ابن تیمیہ، اُن کی تصانیف اور اُن کے متبعین کے بارے میں مسلمانوں کو اُن کی خیرخواہی کے پیشِ نظر یُوں فہمائش کرتے اور حکمِ شرح بیان فرماتے ہیں:

"وایاك ان تصغى الى ما فى كتب ابن تيمية وتلميذه ابن القيم الجوزية وغيرهما من اتخذ الٰهه هواه واضله الله على علم وختم على سمعه وقلبه وجعل على بصره غشاوة فمن يهديه من بعد الله وكيف تجاوز هٰؤلاء الملحدون الحدود وتعدوا الرسوم وخرقوا سياج الشريعة والحقيقة فظنّوا بذالك انهم على هدى من ربهم وليسوا كذالك بل هم على اسوأ الضلال واقبح

ابن تیمیہ اور اُس کے شاگرد ابن قیم جوزی وغیرہ کی کتابوں پر کان رکھنے سے بچو کیونکہ اُنھوں نے اپنی خواہشِ نفسانی کو معبود بنا لیا تھا اور خدا نے اُس کو علم کے ذریعے گمراہ کیا اور اُس کے کان اور دل پر مُہر کی اور اُس کی آنکھ پر پردہ ڈالا۔ پس کون ہے جو اِس کے باوجود اسے ہدایت دے۔ اِن ملحدوں نے کس طرح اِسلامی حدود سے تجاوز اور رسوم سے تعدّی کی اور شریعت وحقیقت کی چادر کو پھاڑ کر بھی گمان کیا وہ اپنے رب کی طرف سے راہِ راست پر ہیں حالانکہ وُہ راہِ راست پر نہیں ہیں بلکہ وُہ بدترین گمراہی اور قبیح ترین خصائل اور انتہائی بدنصیبی"

---

[1] احمد شہاب الدین بن حجر مکی، امام: فتاوٰی حدیثیہ، ص ۹۹

الخصال و ابلغ المقط و الخسران
وانهى الكذب و
البهتان فخذ الله متبعهم وطهر
الارض من امثالهم "۔[1]

خسارے اور جھوٹ بہتان میں مبتلا ہیں۔
اللہ اُن کے پیروکاروں کو رُسوا کرے اور
اُن جیسے عقیدے رکھنے والوں سے زمین کو
پاک کر دے۔

خارجی وہابی

ساتویں صدی میں اٹھا ہُوا یہ خارجیت کا فتنہ آخر کار علمائے اہلسنت شکر اللہ سعیھم کی مساعیِ جمیلہ سے ختم ہو کر رہ گیا۔ علاّمہ ابن تیمیہ اور اُن کے شاگرد ابن قیم وغیرہ کی تصانیف ایک حد تک نا پید ہو گئیں۔ بارھویں صدی میں یہ ناسُور پھر چوتھی دفعہ اُبھر آیا۔ نجد میں محمد بن عبد الوہاب نامی ایک عالِم نے خوارج کے مذہب کو ابن تیمیہ کی تصانیف سے حاصل کر کے اُس کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی۔ پروفیسر ابو زہرہ مصری اِس سلسلے میں یُوں وضاحت کرتے ہیں:

> "اتباعِ محمد بن عبد الوہاب نے مسلکِ ابن تیمیہ کو از سرِ نو زندگی بخشی۔ اِس تحریک کے بانی و موسس محمد بن عبد الوہاب تھے جن کی وفات ۱۷۸۷ء میں ہُوئی۔ محمد بن عبد الوہاب تصانیفِ ابنِ تیمیہ سے مستفید ہو چکے تھے۔ اِنھوں نے بنظرِ غائر اُن کتب کا مطالعہ کیا اور اُن کو فکر و نظر کی حدود سے نکال کر عمل کے دائرہ میں داخل کیا۔ جہاں تک عقاید کا تعلق ہے اِنھوں نے عقاید ابنِ تیمیہ پر ذرّہ بھر اضافہ نہ کیا اور اُن کو جُوں کا تُوں اپنا لیا، البتّہ اِنھوں نے امام ابن تیمیہ کی نسبت زیادہ تشدّد سے کام لیا اور ایسے عملی امور کو ترتیب دیا، جن سے ابن تیمیہ نے تعرّض نہیں کیا تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وُہ امور اُن کے عصر و عہد میں مشہور نہ تھے۔"[2]

---

[1] احمد شہاب الدین بن حجر مکی، محدّث: فتاوٰی حدیثیہ، ص ۱۴۴

[2] غلام احمد حریری: اسلامی مذاہب، ص ۲۸۸

ہوتے تھے۔ جن دنوں وہابیہ صحرا نشین تھے ان کی تبلیغ و دعوت سے چنداں خطرہ نہ تھا، جب سعودی خاندان بلادِ عرب میں برسرِ اقتدار ہُوا تو اِن کو دُوسرے لوگوں سے ملنے جلنے کے مواقع میسر آئے، جس سے خطرہ بڑھ گیا۔" ۱؎

وہابیہ کو قبہ شکنی میں بڑا مزہ آتا تھا اور اِس شرمناک حرکت کو وُہ دین کی اہم ترین خدمت، توحید کا تحفظ اور اپنا عظیم کارنامہ شمار کرتے تھے۔ پروفیسر ابوزہرہ مصری نے اُن کے اِس مشغلے کا ذکر یُوں کیا ہے:

> "شہر ہو یا دیہات، جہاں ان لوگوں کا بس چلتا وہاں پہنچتے اور قبّے گرا دیتے۔ اِس کی حد یہ کہ بعض یورپین مصنفین اِن کو "معبد شکن" کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ لقب مبالغہ پر محمول ہے۔ اِس لیے کہ قبہ جات کو معبد کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ غالباً یہ لوگ اُن مساجد کو مسمار کر دیتے تھے، جن میں قبّے ہُوا کرتے تھے۔" ۲؎

وہابیہ نے اِسی پر بس نہیں کر دی تھی، بلکہ صحابۂ کرام اور دیگر بزرگانِ دین کے مزارات کو مسمار کرنے کی خدمت بھی اُنھوں نے بڑے ذوق و شوق سے انجام دی۔ شعائر اللہ کی اِس طرح پامالی کو وُہ اپنی ساختہ توحید کی معجون کا جزوِ اعظم سمجھتے تھے اور اپنے اِس کارنامے پر وُہ نازاں تھے کہ دنیا سے کفر و شرک کا نام و نشان مٹا رہے ہیں حالانکہ جس بلا سے وہ دوسروں کو بچانا چاہتے تھے وُہ خود اُن پر ہی مسلّط تھی لیکن خوارج کی فطرت شروع سے ہی یہ چلی آ رہی تھی کہ وہ دُوسروں کی آنکھوں میں تنکے تلاش کرنے کی کھوج میں لگے رہتے ہیں اور اپنی آنکھوں کے شہتیر دیکھنے سے وُہ ہمیشہ ہی قاصر رہے اور تا حال قاصر ہیں۔ مثلاً:

> "وہابیہ کے تشدد کی یہ (قبہ شکنی) آخری حد تک نہ تھی بلکہ اِس سے

۱؎ غلام احمد حریری، پروفیسر: اسلامی مذاہب، ص ۲۹۰، ۲۹۱

۲؎ ایضاً: ص ۲۸۹، ۲۹۰

ایک قدم آگے بڑھ کر اُنھوں نے مقبروں کو مسمار کر دیا۔ جب دیارِ عرب میں وُہ برسرِ اقتدار آئے تو صحابہ کے مقبرے گرا کر اُن کو زمین کے برابر کر دیا۔ اب صرف اشارات باقی رہ گئے جن کی مدد سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فلاں صحابی کی قبر ہے۔ قبروں کو زمین سے ہموار کرنے کے بعد اُنھوں نے اِس پابندی کے ساتھ اُن کی زیارت کی اجازت دے دی کہ زائر صرف السلام علیکم کہے اور بس"۔ [1]

وہابیوں کی قبہ شکنی اور مقابر کی پامالی کے سلسلے میں پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نے بعض مورخین کے حوالے سے، مورخانہ انداز میں اس حقیقت کا اظہار اِن لفظوں میں کیا ہے:

> "ابن عبد الوہاب اور اُن کے متبعین نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے جان و مال کو اپنے لیے حلال کیا بلکہ مرحومین صحابہ اور صلحائے امت رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قبّوں کو بے دریغ مسمار کیا۔ چنانچہ ابنِ عبد الوہاب نے اُن قبّوں کو منہدم کرنے میں سرگرمی سے حصّہ لیا جو مسلمانوں کی عقیدت و محبّت کے نشان تھے۔ مثلاً: مقامِ جبلیہ پر حضرت زید بن خطاب (جو جنگِ یمامہ میں شہید ہوئے تھے) کے قبہ شریف پر اپنے ہاتھ سے کدال مارا اور دھڑا دھڑ گرا کر زمین کے ہموار کر دیا"۔

اِسی طرح جب ۸ محرم ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء کو سعود بن عبد العزیز فاتحانہ انداز سے مکّہ مکرمہ میں داخل ہوا تو "اہلِ نواحی قبّوں اور شرکیہ مشاہد (؟) کے انہدام پر مامور کیے گئے۔ سعود نے بیس دن مکّہ مکرمہ قیام کیا اور اِس دوران مسلمان (متبعین ابن عبد الوہاب) قبّوں کو گراتے رہے تا آنکہ مکہ مکرمہ کے تمام مشاہد اور قبّے برابر کر دیے گئے"۔

---

[1] غلام احمد حریری، پروفیسر: اسلامی مذاہب، ص ۲۹۰

"کعبے کے جواہر اور قیمتی ذخیرے فاتحین میں تقسیم کر دیے گئے، قبّے گرائے گئے اور بعض مجاور قتل بھی کیے گئے۔" بلکہ ایک دِل ہلا دینے والی خبر ولفرڈ بلنٹ کی کتاب فیوچر آف اسلام میں ملتی ہے۔ مصنف لکھتا ہے: "ہر جگہ قبّے مسمار کر دیے گئے اور سرزمینِ حجاز کے مقدس مقامات اُس (ابن عبدالوہاب) کے متبعین کے قبضے میں آ گئے تو صوفیہ و اولیاء کے قبّے، حجّاج کرام جن کی صدیوں سے عزّت و احترام کرتے چلے آئے تھے زمین کے برابر کر دیے گئے... ..... اِن حرکتوں سے عالمِ اسلام میں غم و غصّہ کی لہر دوڑ گئی اور وہابیوں کی قسمت کا ستارہ گردش میں آ گیا۔"[1]

خوارج کی فطرت، زبانِ رسالت سے "یقتلون اھل الاسلام و یدعون اھل الاوثان" بیان ہوئی تھی کہ وہ بت پرستوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کو قتل کیا کریں گے۔ وہابیوں نے بھی اپنی خارجیت کا مکمل ثبوت پیش کرتے ہوئے مسلم کشی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور کبھی اُن بانکے جوانمردوں کی تلوار غیر مسلموں کے خلاف نہ اُٹھنے پائی۔ تاریخ اقوام کے اعمال کا مرقع ہے، زمانے سے بڑھ کر کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں۔ ہر شخص اِس ارشادِ نبوی اور عملِ وہابیہ کو سامنے رکھ کر خود فیصلہ کر سکتا ہے۔ اگر آج فیصلہ نہیں کرتا تو کل بروزِ قیامت خود ہی فیصلہ ہو جائے گا۔ خیر وہابیہ جب مسلمانوں کی جان و مال اور ننگ و ناموس سے خوب کھیل رہے تھے اور اُس کی تاویل یُوں بیان کیا کرتے تھے:

"جب عالم و عامی نے ابنِ عبدالوہاب پر یہ الزام لگایا کہ وہ مسلمانوں کا قتلِ عام کر رہے ہیں اور اُن کا مال و دولت لُوٹ رہے ہیں تو اُن کے متبعین نے جواب دیا کہ حاشا و کلّا، ہم مسلمانوں کا قتلِ عام نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہم تو اُن مسلمانوں کو تہِ تیغ کر رہے ہیں جو اعمال و افکار کی وجہ سے مشرک و کافر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اِس طرح صفائی پیش کی گئی...... "شیخ رحمہ اللہ نے

---

[1] محمد مسعود احمد، پروفیسر: مواعظ مظہری، ص ۷۴، ۷۵

صرف اُن صنم پرستوں کی تکفیر کی جو اولیاء اور نیکو کار بندوں سے مرادیں مانگتے ہیں جنھوں نے حجّت کے ثبوت اور طریقِ حق کی وضاحت کے بعد بھی شرک کا ارتکاب اور اللہ کا شریک ٹھہرایا اور پھر اُنھوں نے قتال میں بھی پیش قدمی کی، تب شیخ نے اُن سے قتال کیا اور اُن کا خون بہایا اور اُن کا مال لوٹا۔ اگر مسلمانوں کے اعمال کا اتنی سختی سے محاسبہ کیا جائے تو پھر ہم میں کتنے لوگ ہیں جو زندہ رہنے کے قابل ہیں؟ شاید لاکھوں میں معدودے چند ہوں تو ہوں۔"[1]

وہابیہ چونکہ اپنے سوا جملہ مدعیانِ اسلام کو کافر و مشرک کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وُہ اپنے اصطلاحی مشرکوں کا خُون بڑے ذوق و شوق سے بہایا کرتے تھے۔ چنانچہ الدرر السنیہ اور ردالمحتار کے حوالے سے پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نے اِن حضرات کی فطرت اور خصلتِ مسلم کشی کو یُوں لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے:

> "ابنِ عبدالوہاب اپنے متبعین کے علاوہ اِس آسمان کی نیلی چھت کے نیچے اُن تمام مسلمانوں کو علی الاطلاق کافر و مشرک سمجھتے تھے جو اُن کی اطاعت و پیروی سے گریز کرتے تھے۔ اِس لیے اُن کا خون بہانے میں دریغ نہیں کرتے تھے۔ یہ بات نبی کو زیب دیتی ہے مگر کسی مصلح کی یہ کیفیت کم علمی اور کم فہمی کا نتیجہ ہے۔"[2]

وہابیہ کی تلوار مسلمانوں کے خلاف کیوں اُٹھتی رہی؟ اِس کا سب سے بہتر جواب تو خود فرامینِ رسالت میں موجود ہے لیکن اِس المناک طرزِ عمل پر ایک فکر انگیز اور اچھوتا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے:

> "تاریخِ اسلام میں اِس قسم کے بہت سے رُوح فرسا مناظر سامنے آتے ہیں جبکہ مسلمانوں نے آپس میں ایک دُوسرے کا خون بہایا ہے مگر یہاں

---

[1] محمد مسعود احمد، پروفیسر: مواعظ مظہری، ص ۳،

[2] ایضاً: ص ۴،

ذکر اُس شخص کا ہے جو پیغمبرانہ آن بان کے ساتھ توحید و رسالت کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ کم از کم ایسی شخصیت میں پیغمبرانہ صفات کو تلاش کیا جائے اور اُسی معیار سے پرکھا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر کفّار و مشرکین اور یہود و نصارٰی کے خلاف آمادۂ پیکار رہے، مگر یہاں جو کچھ ہے مسلمانوں کے خلاف ہے[1] محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک کے متعلق دعوٰی تو یہی تھا کہ شرک و بدعت کے خا لیکن حقیقت کچھ اور ہی نظر آتی ہے۔ وہابیوں کا طرزِ عمل اصلاح کی بجائے برعکس ثبوت پیش کرتا ہے۔ اصلاح کی جگہ فساد کیا، مسلمانوں کو اِن سے کوئی تقویت پہنچنے کی بجائے افرا و انتشار ملا۔ مسلمانوں کا خُون اِن کے ہاتھوں بہا، ننگ و ناموس اور مال و دولت پر دست درازی ہوئی۔ غرضیکہ اِس گروہ کا وجود گویا ڈاکوؤں اور لٹیروں کا جمگھٹا ہو کر رہ جس سے مسلمانانِ عالم کے جذبات اِن لوگوں کے خلاف بھڑک اُٹھے اور یہ قدرتی و فط بات تھی۔ وہابیوں نے قوت حاصل کرنے کی ہر ممکن اور گھٹیا سے گھٹیا تدبیر اختیار کرتے وق بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ مثلاً:

"ابن عبدالوہاب نے جن مسائل کے متعلق آواز اٹھائی اُن میں سے بعض یہ ہیں۔ امکانِ کذب، امکان نظیر، استغاثہ، استعانت، علم غیب، الحلف لغیر اللہ، زیارت القبور وغیرہ۔ ظاہر یہ کیا گیا کہ یہ تحریک مروّجہ بدعات اور اعمالِ شرکیہ کے خلاف ایک مخلصانہ کوشش ہے مگر بعض تاریخی واقعات کی روشنی میں باطن، ظاہر سے کچھ مختلف نظر آتا ہے۔ مثلاً جب ابن عبدالوہاب نے امیر عیینہ کو اپنی تحریک میں شمولیت کی دعوت دی تو اِن الفاظ میں "انی ارجوا ان انت قمت بنصر لا اِلٰه الّا اللّٰه ان يظهرك اللّٰه تعالٰی وتملك نجدا وعرابها۔" اگر تم لا الٰہ الّا اللّٰہ کی امداد کے لیے

---

[1] محمد مسعود احمد، پروفیسر: مواعظ مظہری، ص ۷۳، ۷۴

آمادہ ہو جاؤ تو میں اُمید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمھیں غالب کرے گا اور نجد اور اہلِ نجد کی باگ تمھارے ہاتھ میں ہوگی۔ حیرت اس بات پر ہے کہ کارِ خیر کی طرف بلایا جا رہا ہے تو یہ لالچ کیوں دی جا رہی ہے کہ نجد اور اہلِ نجد کی باگ تمھارے ہاتھ میں ہوگی؟ حالانکہ اُس وقت اِن علاقوں پر کوئی مشرک و کافر حکمران نہ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ابن عبد الوہاب اپنے مخالفین کو کافر اور واجب القتل تصوّر کرتے تھے۔ اعلائے کلمۃ الحق کے لیے تحریص و ترغیب کا یہ انداز مومنانہ نہیں۔"[1]

جب محمد بن عبد الوہاب نجدی (المتوفی ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۲ء) نے درعیہ کے امیر یعنی محمد سعود کو اپنی تحریک کا ساتھ دینے کی دعوت دی تو اُس نے دو شرطیں عائد کی تھیں، دُوسری یہ تھی کہ مَیں اہلِ درعیہ سے فصل کے وقت کچھ مقررہ محصول وصول کیا کرتا ہوں، آپ اِس سے نہیں روکیں گے۔ علمبردارِ توحید و سنّت اور ماحیٔ شرک و بدعت ہونے کا دعویٰ کرنے والے محمد بن عبد الوہاب نجدی نے اِس کا جو جواب دیا وُہ تبصرہ کے ساتھ پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب سے سُنیے:

> "رہی دُوسری شرط، سو انشاء اللہ تمھیں فتوحات اور غنیمتوں میں اتنا کچھ مل جائے گا کہ اِس خراج کا خیال بھی دل میں نہ آئے گا۔"

کِس پر فتوحات؟ کیسی غنیمت؟ اُنھیں مسلمانوں پر فتوحات اور اُنھیں مسلمانوں کی دولت جن کو مشرکین و کفّار کے زمرے میں شمار کرکے اُن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے۔ ستم رسیدہ مسلمانوں کی متاعِ عزیز کو غنیمت سمجھ کر کھانا اور کھلانا کیسی ستم ظریفی ہے؟ یہی نہیں بلکہ جب ابن عبد الوہاب کو ذرا قوت حاصل ہو گئی تو پھر رنگ کچھ اور ہو گیا۔ چنانچہ جب حاکمِ ریاض، دہام بن دواس نے ابن عبد الوہاب کے پیرؤوں کے معتقدات سے

---

[1] محمد مسعود احمد، پروفیسر: مواعظ مظہری، ص ۶۹، ۷۰۔

تنگ آکر اِن پر سختی کی تو ابن عبد الوہاب نے فوراً جدال و قتال کا حکم صادر فرمایا، بس پھر کیا تھا، مسلمانوں کے کشتوں کے پشتے لگ گئے۔"[۱]

تحریکِ وہابیت کے نتائج پر بحث کرتے ہوئے موصوف کیا پتے کی بات کہہ گئے ہیں:

"ضمناً ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کرتا چلوں اور وہ یہ کہ تحریکِ وہابیت نے بعض مسلمانوں کو اکابرینِ ملّت کی جناب میں بہت بیباک بنا دیا ہے حیرت و تعجب اِس بات پر ہے کہ اکابرین اور صلحائے امت پر اعتراضات اور تنقیدات اُن حضرات کی جانب سے ہوتی ہے جن کی نظر سطحیت کی غماز ہے اور اعتراض اِس انداز سے کرتے ہیں گویا نظر ہے تو بس اُنھیں کے پاس۔"[۲]

محمد بن عبد الوہاب نجدی (المتوفی ۱۲۰۶ھ) کے بارے میں اہلسنّت و جماعت کے مایۂ ناز فقیہہ علامہ محمد امین ابن عابدین شامی (المتوفی ۱۲۵۲ھ) رحمۃ اللہ علیہ یوں رقمطراز ہیں:

"کما وقع فی زماننا فی اتباع عبد الوھاب الذین خرجوا من نجد وتغلبوا علی الحرمین وکانوا ینتحلون مذھب الحنابلۃ لکنّھم اعتقدوا انھم ھم المسلمون و انّ من خالف اعتقادھم مشرکون واستباحوا بذٰلک قتل اھل السنۃ وقتل علماءھم حتّی کسر اللہ شوکتھم وخرب بلادھم وظفر بھم عساکر

جیسا کہ ہمارے زمانے میں (ابن) عبد الوہاب کے متبعین میں واقع ہُوا، جو نجد سے نکل کر حرمین شریفین پر قابض ہوئے۔ اپنے آپ کو حنبلی مذہب کا پیرو کار ظاہر کرتے تھے، حالانکہ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ مسلمان بس وہی ہیں اور اُن کے عقاید سے اختلاف رکھنے والے سب مشرک ہیں۔ اِسی لیے اُنھوں نے اہلسنت و جماعت اور اُن کے علماء کو قتل کرنا مباح ٹھہرایا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی طاقت توڑ دی، مسلمانوں کے لشکروں کو

---

[۱] محمد مسعود احمد، پروفیسر: مواعظ مظہری، ص ۷۱

[۲] ایضاً: ص ۷۸

المسلمین عام ثلٰث وثلٰثین ومأتین   اُن پر فتح دی یعنی ۱۲۳۳ھ میں۔

والف "[1]

وہابیہ کے بارے میں دیوبندیوں کے بہت بڑے عالِم، براہینِ قاطعہ جیسی کتاب کے مصنف مولوی خلیل احمد انبٹھوی (المتوفی ۱۳۴۵ھ/ ۱۹۲۷ء) نے سوال و جواب کے طور پر اپنا اور اپنی جماعت کا موقّف یُوں بیان کیا ہے:

"**سوال** : محمد بن عبدالوہاب نجدی حلال سمجھتا تھا مسلمانوں کے خُون اور اُن کے مال و آبرو کو اور تمام لوگوں کو منسوب کرتا تھا شرک کی جانب اور سلف کی شان میں گستاخی کرتا تھا۔ اُس کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ اور کیا سلف اور اہلِ قبلہ کی تکفیر کو تم جائز سمجھتے ہو، یا کیا مشرب ہے؟

جواب : ہمارے نزدیک اُس کا حکم وہی ہے جو صاحبِ درمختار نے فرمایا ہے اور خوارج ایک جماعت ہے شوکت والی، جنھوں نے امام پر چڑھائی کی تھی تاویل سے، کہ امام کو باطل یعنی کفر یا ایسی معصیت کا مرتکب سمجھتے تھے جو قتال کو واجب کرتی ہے۔ اِس تاویل سے یہ لوگ ہماری جان و مال کو حلال سمجھتے اور ہماری عورتوں کو قیدی بناتے ہیں۔ آگے فرماتے ہیں، اُن کا حکم باغیوں کا ہے۔ پھر یہ بھی فرمایا ہے کہ ہم اُن کی تکفیر صرف اِس لیے نہیں کرتے کہ یہ فعل تاویل سے ہے، اگرچہ باطل ہی سہی۔ اور علّامہ شامی نے اِس کے حاشیہ میں فرمایا ہے، جیساکہ (مثلِ خوارج) ہمارے زمانے میں عبدالوہاب کے تابعین سے سرزد ہُوا کہ نجد سے نکل کر حرمین شریفین پر متغلب ہُوئے اپنے کو حنبلی مذہب بتلاتے تھے لیکن اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ بس وہی مسلمان ہیں اور جو اُن کے عقیدہ کے خلاف ہو، وُہ مشرک ہے۔ اور اِسی بنا پر اُنھوں نے اہلسنت اور علمائے اہلسنت کا قتل مباح سمجھ رکھا تھا۔ یہاں تک کہ اللّٰہ تعالیٰ نے

مد امین ابن عابدین شامی، فقیہہ : ردالمختار، جلد سوم، ص ۳۱۹

اُن کی شوکت توڑ دی۔"[1]

دیوبندی جماعت کے دُوسرے جیّد عالِم، دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر یعنی مولوی حسین احمد ٹانڈوی (المتوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) نے وہابیوں کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار اِس انداز سے کیا ہے:

"صاحبو! محمد بن عبدالوہاب نجدی ابتدائے تیرھویں صدی نجد سے ظاہر ہُوا اور چونکہ یہ خیالاتِ باطلہ اور عقائدِ فاسدہ رکھتا تھا، اِس لیے اُس نے اہلِ سنت[2] والجماعت سے قتل وقتال کیا، اُن کو بالجبر اپنے خیالات کی تکلیف دیتا رہا، اُن کے اموال کو غنیمت کا مال اور حلال سمجھا گیا، اُن کے قتل کرنے کو باعثِ ثواب ورحمت شمار کرتا رہا۔ اہلِ حرمین کو خصوصاً اور اہلِ حجاز کو عموماً اُس نے تکلیف شاقہ پہنچائیں۔ سلف صالحین اور اتباع کی شان میں نہایت گستاخی اور بے ادبی کے الفاظ استعمال کیے۔ بہت سے لوگوں کو بوجہ اُس کی تکلیفِ شدیدہ کے مدینہ منوّرہ اور مکہ معظمہ چھوڑنا پڑا اور ہزاروں آدمی اُس کے اور اُس کی فوج کے ہاتھوں شہید ہوگئے۔ الحاصل وُہ ایک ظالِم وباغی، خونخوار، فاسق شخص تھا۔"[3]

دیوبندیوں کے مشہور فاضل، علّامہ انور شاہ کشمیری (المتوفی ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۴ء) جو مولوی حسین احمد ٹانڈوی سے پہلے دارالعلوم دیوبند کے صدر بھی تھے، اُنھوں نے محمد ب عبدالوہاب نجدی کے بارے میں یُوں لکھا ہے:

اما محمد بن عبدالوهاب	محمد بن عبدالوہاب نجدی جو تھا، وُہ تو ایک
النجدی فانه کان رجلا	کوتاہ فہم اور کم علم انسان تھا، اِسی لیے
بلیداً قلیل العلم فکان یسارع	کفر کا حکم لگانے میں بڑا چُست وچالاک تھا۔
الی الحکم بالکفر۔[4]	

---

[1] خلیل احمد انبیٹھوی، مولوی: المہند علی المفنّد اردو، مطبوعہ کراچی، ۲۱، ۲۲

[2] ٹانڈوی صاحب نے توجہ سے کام نہیں لیا، یہاں اہل السنت والجماعت یا اہلسنت وجماعت لکھنا

[3] حسین احمد ٹانڈوی، مولوی: الشہاب الثاقب، ص ۴۲

[4] انور شاہ کشمیری، مولوی: فیض الباری، ج ۱، ص ۱۷۱

مولوی حسین احمد ٹانڈوی (المتوفی ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء) نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تکفیر بازی اور مسلمانوں کے مال و جان کا دشمن ہونے کے بارے میں مزید یوں وضاحت بھی کی ہے:

> "محمد بن عبدالوہاب کا عقیدہ تھا کہ جملہ اہلِ عالم و تمام مسلمانانِ دیار مشرک و کافر ہیں اور اُن سے قتل و قتال کرنا، اُن کے اموال کو اُن سے چھین لینا حلال اور جائز بلکہ واجب ہے۔"[1]

وہابیوں نے جہاں وہ قابض ہوئے مسلمانوں کے ساتھ یہی کچھ عملی طور پر کرکے دکھا دیا تھا۔ آج بھی اُن کے اِس طرزِ عمل کو سراہنے والے بلکہ اُنھیں مصلح اور ریفارمر بتانے والے موجود ہیں، لیکن ایسے حضرات تھوڑی دیر کے لیے اگر تعصّب کی عینک کو اتار کر دیکھیں کہ جن مسلمانوں کو یہ حضرات کافر و مشرک قرار دے کر قتل کرتے رہے اور آج تک شجرِ وہابیت کی جملہ شاخیں مشرک و کافر ہی قرار دے رہی ہیں اگر اُن کے اِن اصطلاحی مشرکوں کا وجود نہ ہوتا تو ہند و پاک کے مٹھی بھر وہابیوں کو تو ہندو شروع میں ہی کچے چبا گئے ہوتے اور نجدی وہابیوں کی تو عیسائی دنیا کے حصّے میں ایک ایک بوٹی بھی نہ آتی۔ مسلمانوں کے دم قدم سے قائم رہ کر اُنھیں کو کافر و مشرک بتانا اور بس چلے تو اُن کے خون سے ہولی کھیل لینا، محسن کشی کی المناک مثال ہے یا نہیں؟

اِس سے قطع نظر، وہابی حضرات کو سوچنا چاہیے تھا کہ علمائے اہلسنّت نے وہابیہ کے متعلق جو کچھ آج تک کہا، زبان اور قلم سے کہا ہے، اگر مسلمانانِ عالم بھی وہابیوں کو تیغ و تبر کے ساتھ اپنے مذہب کی دعوت دینا شروع کر دیتے یا اب ایسا کرنے لگیں تو نتیجہ کیا سامنے آئے گا؟ ہتھیار تو غیر مسلموں کے خلاف استعمال کرنے کی اجازت ہے، جس کی وہابیہ کو اپنے روزِ اوّل سے کبھی توفیق ملی ہی نہیں، رہے مدعیانِ اسلام کے باہمی اختلافات، تو اُنھیں خلوصِ دل کے ساتھ افہام و تفہیم کے ذریعے ختم کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] حسین احمد ٹانڈوی، مولوی: الشہاب الثاقب، مطبوعہ دیوبند، ص ۴۳

خارجی اسمٰعیلی

یہی خارجی تحریک نجد سے چل کر متحدہ ہندوستان میں وارد ہوئی۔ کسے خبر تھی کہ دہلی کا جو خاندان دینِ برحق کی خدمت میں کارہائے نمایاں سرانجام دے رہا ہے، اسلام میں تخریب اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کا مشغلہ بھی اُسی خاندان کا ایک فرد اختیار کرے گا اور پاک و ہند میں تخریب کاری کا ایسا پودا لگا جاتے گا جس کی شاخیں پُورے ملک میں پھیل جائیں گی اور بھولے بھالے مسلمان ایسے چکّر میں پھنس کر رہ جائیں گے کہ اصل اور نقل میں تمیز کرنا بھی مشکل ہو کر رہ جائے گا۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے مسلک کو محمد بن عبدالوہاب نجدی کی وہابیت و خارجیت سے کوئی مماثلت ہے یا نہیں؟ مرزا حیرت دہلوی اِس سلسلے میں یُوں وضاحت کرتے ہیں:

> "وہ پیارا شہید (محمد اسمٰعیل دہلوی) تھا جس نے ہندوستان میں (ابن) عبدالوہاب کی طرح شریعتِ محمدی کا ٹھنڈا خوشگوار شربت ہندوستانی مسلمانوں کو پلایا۔"[1]

ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب نے نجدی اور ہندی وہابیت کے تعلق پر یُوں اظہارِ خیال فرمایا ہے:

> "ہندوستان میں ابن عبدالوہاب کے عقاید کی اشاعت بعض حضرات کے ذریعے سے ہوئی، اِس سلسلے میں مولانا اسمٰعیل دہلوی (م ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) اور مولانا سیّد احمد بریلوی (م ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) نے اہم کردار ادا کیا۔ مولانا سیّد احمد بریلوی نے تحریکِ وہابیت کے قریبی زمانے (۱۲۳۶ھ/ ۱۲۳۹ھ) میں سفرِ حجاز بھی کیا تھا، اِس لیے ظاہر ہے کہ وہ کیا کچھ خیالات وجذبات لے کر آئے ہوں گے۔"[2]

---

[1] حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۴۶

[2] محمد مسعود احمد، پروفیسر: مواعظ مظہری، ص ۸۲

کچھ آگے چل کر موصوف نے اِسی تعلق کی یُوں وضاحت فرمائی ہے:

"ابن عبد الوہاب کی تحریک اور اِن دونوں حضرات کی سیاسی اور مذہبی کوششوں میں کئی مناسبتیں نظر آتی ہیں۔ ابن عبد الوہاب پر یہ الزام تھا کہ وہ بلاوجہ مسلمانوں کو بے دریغ قتل کرتے ہیں اور اُن کے مال و متاع کو اپنے لیے مباح سمجھتے ہیں۔ اِس قسم کے واقعات مولوی سید احمد اور مولانا اسمٰعیل کی زندگی میں بھی نظر آئیں گے۔"[1]

ڈاکٹر صاحب نے آگے چند واقعات اِن حضرات کی مسلم کشی کے پیش کیے ہیں لیکن اِس موضوع پر ہم نے آگے تفصیلی بحث کرنی ہے لہٰذا اُنھیں یہاں پیش نہیں کرتے۔ اِس کے بعد موصوف نے دونوں تحریکوں کے عقائد کے بارے میں یُوں لکھا ہے:

"جہاں تک اِن حضرات (سید احمد و اسمٰعیل دہلوی صاحبان) کے معتقدات کا تعلق ہے وہ سختی و درشتی میں ابن عبد الوہاب سے کسی طرح کم نہیں۔"[2]

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) نے جب اپنے اکابر کے مسلک اور مسلکِ اہلِ سنّت وجماعت سے بغاوت کی تو اپنا علیحدہ جتھا بنانے میں مصروف ہوگئے اور اُس کا نام "محمدی گروہ" رکھا گیا۔ چنانچہ اِس سلسلے میں مشہور وہابی مؤرخ اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے سوانح نگار، مرزا حیرت دہلوی یُوں لکھتے ہیں:

"پیارے شہید نے ہزاروں بلکہ لاکھوں کی زبان سے یہ نکلوا دیا کہ ہم محمدی ہیں۔ چاروں طرف سے آوازیں بلند ہو رہی تھیں کہ اِس ضلع میں اِتنے محمدی آباد ہیں اور اُس ضلع میں، اِتنی تعداد اِسلامیوں کی ہے۔"[3]

یہی نہیں بلکہ مولانا محمد اسمٰعیل دہلوی کے پیر یعنی سید احمد صاحب (المتوفی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) نے پیری مریدی کا سلسلہ شروع کیا تو مسلمانوں کے جملہ روحانی سلسلوں سے منقطع

---

[1] محمد مسعود احمد، پروفیسر: مواعظ مظہری، ص ۸۲

[2] ایضاً: ص ۸۳

[3] حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۳۸

ہوکر اپنا سلسلہ نیا "محمدی طریقہ" گھڑ لیا۔ اُس کے قواعد اور آداب و اشغال بھی ایسے وضع کیے کہ طریقت کا ایک ابجد خوان بھی اِس بازیگری کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ "طریقۂ محمدی" کے بارے میں پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر قیام الدین احمد لکھتے ہیں:

> "اُس زمانہ میں تصوّف کے چار متعارف و مستقل طریقے رائج تھے، چشتیہ، سُہروردیہ اور نقشبندیہ۔[1] سیّد احمد بریلوی بیعت لینے کی ایک جدید ترکیب پر کاربند تھے۔ پہلے مذکورہ طریقوں پر، پھر محمدی طریقے پر، جو اُنھوں نے خود مقرر کیا تھا، بیعت لیا کرتے تھے۔ وُہ اِس کی تشریح یُوں کیا کرتے کہ شریعت کے دُو پہلو ہیں: ظاہری اور باطنی۔ باطنی پہلو روحانی راحت کے حصول کیلئے روح کی تربیت و تادیب سے تعلق رکھتا ہے اور مذکورہ صوفی طریقے ہی اِس مقصد کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ ظاہری پہلو انسان کی روزمرہ زندگی میں صحیح اور دینی کردار بجالانا، اور محمّدی طریقہ اِسی کی نگہداشت کرتا ہے۔"[2]

"طریقۂ محمدی" کی موصوف نے آگے تشریح کرتے ہُوئے اُسے جو امتیازی مقام بخشا ہے وُہ ملاحظہ فرمائیے:

> "اِس انوکھے طریقۂ بیعت کی تشریح یُوں بھی ہوسکتی ہے کہ صوفیانہ طریقے اگر ابتدا کی سرمستی و سرشاری سے معرّا ہو چکے تھے پھر بھی عام دماغوں میں اُن کی جڑیں گہری تھیں۔ لوگ اُنھیں طریقوں پر بیعت کے خُوگر تھے۔ اُن کا یک بیک ترکِ کامل ایک غیر عملی یا اَن ہونی سی بات ہوتی۔ طریقِ محمدی میں جو صحیح طرزِ معاشرت ملحوظ رکھا گیا تھا، اُس کی تفصیلات خود صراطِ مستقیم اور مختلف وہابی تحریروں میں کافی شرح و بسط سے درج ہیں۔ اُن میں سے دُو

---

[1] ڈاکٹر صاحب نے طریقے چار بتائے لیکن گنائے تین۔ معلوم ہوتا ہے وُہ سلسلہ عالیہ قادریہ سے کچھ زیادہ ہی ناراض تھے۔

[2] محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر: ہندوستان میں وہابی تحریک، ص ۵۰

اصول بہت نمایاں ہیں۔ باری تعالیٰ پر جس کی صفات اشارۃً بھی کسی مخلوق سے منسوب نہیں کی جا سکتی ہیں، سختی سے بلا شرط و قید ایمان رکھنا اور اپنی شخصی زندگی میں عملی اخلاق پہ کاربند رہنا۔"[1]

جب مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے اپنا محمدی گروہ مسلمانانِ اہلسنت و جماعت سے جُدا بنانا شروع کر دیا۔ اپنے خاندانی بزرگوں کے مسلک کو بھی خیر باد کہہ دیا بلکہ اُس طریقے پر چلنے والوں کو ہر مقام پر مشرک اور بدعتی کہنا شروع کر دیا تو مسلمانوں کے جذبات کا بھڑکنا اور لڑائی جھگڑے تک نوبت آجانا ایک قدرتی امر تھا۔ چنانچہ متعدد مقامات پہ تصادم بھی ہوئے۔ اِس حقیقت کو مرزا حیرت دہلوی نے اُلٹ پھیر کے ساتھ یُوں بیان کیا ہے:

> "جب بدعتیوں کو پے در پے یہ فاش شکستیں ملیں تو اب اُنھوں نے مخالفت کا دُوسرا پہلو بدلا اور وُہ پہلو یہ تھا کہ ہر گلی کے نکڑ پر ایک مُلانا کھڑا کر دیا کہ وُہ مولانا شہید کو کافر بتائے اور گمراہ کہے۔ غرض سوائے تبرّے کے اور کچھ نہ کہے۔ جب اِس قسم کے وعظ ہونے لگے تو دو چار جگہ لاٹھی بھی چل گئی، کیونکہ اب محمدیوں کا گروہ بھی بڑھتا جاتا تھا۔"[2]

انصاف والے ذرا اِس حوالے کو غور سے پڑھیں۔ وہابی حضرات خود کو قدیمی جماعت بتاتے اور ولی اللّٰہی تعلیمات کا علمبردار ٹھہراتے ہُوئے نہیں تھکتے لیکن یہ محمدی گروہ کس نے بنایا تھا؟ جدید گروہ اور اہلسنّت سے جُدا ہونے والا گروہ کِس کا ہے؟ غور فرمائیے اہلسنت و جماعت سے کٹ کر علیحدہ اپنا گروہ بنانے والے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی ہیں یا مولانا احمد رضا خاں بریلوی، جو اِن واقعات کے تقریباً چالیس سال بعد پیدا ہوتے ہیں۔

بہر حال جب لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچنے لگی تو بانیِ وہابیت نے بدمعاشوں اور غنڈوں کا اپنی حفاظت کے لیے ایک محافظ دستہ تیار کیا۔ ہادیٔ اکبر، نبیِ آخر الزماں صلی اللہ

---

[1] محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر: ہندوستان میں وہابی تحریک، ص ۵۰

[2] حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۹۹

تعالیٰ علیہ وسلم کا اُسوۂ حسنہ کائنات کے سامنے روشن ترین مثال ہے۔ جب آپ نے بھولے بھٹکے انسانوں کو راہِ راست کی طرف بلانا شروع کیا تو اکثر مخاطبین دشمنی پر تُل گئے لیکن آپ نے مخالفوں کی پروا کیے بغیر، اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر حق و صداقت کی تبلیغ جاری رکھی اور ایک ایسی جماعت تیار کرنے میں شب و روز منہمک رہے جو بجا طور پر پُوری اُمت کے پیشواؤں کے بھی پیشوا کہلانے کے حق دار ہیں۔ بعد میں بزرگوں، مصلحوں اور ریفارمروں نے ہمیشہ نیک لوگوں کی دین کے پھیلانے میں مدد لی لیکن معلوم نہیں مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کس قسم کے مصلح تھے اور کیسی اصلاح کرنا چاہتے تھے جس کے پیشِ نظر اُنھوں نے خدا پر توکل اور نیک بندوں کی اعانت حاصل کرنے کے بجائے معاشرے کے گھٹیا افراد کی خدمات حاصل کیں۔ اِس سلسلے میں موصوف کے سوانح نگار یعنی مرزا حیرت دہلوی، حقیقت کے چہرے سے یُوں پردہ اٹھاتے ہیں:

> ”مولانا شہید نے خطرہ کے وزن کو پہچان لیا تھا اور گو ابھی عمائد و اعیانِ شہر اِس طرف رجوع نہ ہُوئے تھے اور نہ ابھی مولوی فضل حق صاحب کی مخالفانہ کارروائی شروع ہُوئی تھی، پھر بھی عقلمندی یہ تھی کہ ہر طرح سے بندوبست کیا جائے اور ایسا نہ ہو کہ مخالف غافل پاکے کوئی جسمانی مضرت پہنچائیں۔ آپ نے پہلے چند بڑے بڑے بدمعاشوں کے سرغنوں کو اپنی جادو بھری تقریر سُنا کے مُرید کیا اور اُنھیں اپنا ایسا معتقد بنایا کہ وُہ اپنی جان قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ مصلحت اِس کی مقتضی تھی کہ یہ کارروائی کی جائے کیونکہ دن بدن مخالفت کی آگ بھڑکتی جاتی تھی۔“ [1]

جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی جگہ جگہ مسلمانوں کو مشرک اور بدعتی ٹھہرانے لگے، اُن کے مذہبی عقائد کو کافرانہ بتانے لگے تو چاروں طرف سے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ) کے پاس شکایتیں پہنچنی شروع ہو گئیں کہ حضرت! آپ کے بھتیجے آج یُوں کہہ رہے ہیں اور کل اُنھوں نے یہ کہا تھا۔ مرزا حیرت دہلوی نے شکایات

---

[1] حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۵۸

کے معاملے کو اِس عجیب انداز میں سپردِ قلم کیا ہے :

> "بڑے بڑے رئیس جو شاہ عبدالعزیز صاحب کے معتقدین میں سے تھے ، خواہ شیعہ ہوں یا سُنّی ، آ آ کے سمجھانے لگے آپ اپنے بھتیجے کو روکیے ، یہ بڑی بدنامی کی بات ہے ۔ شاہ صاحب سب کو یہی جواب دیتے تھے ، جب تک اسمٰعیل سے خلافِ شریعت عمل سرزد نہ ہو ، میں کیونکر اسے روک سکتا ہوں ۔ وہ کوئی فساد انگیز تقریر نہیں کرتا کہ اُس پر میں معترض ہوں ۔ آخر کوئی معقول وجہ بھی تو ہونی چاہیے جس سے میں اُس کی کارروائی میں دست اندازی کرسکوں ۔ جب اعیانِ شہر شاہ عبدالعزیز صاحب سے یہ جواب پاتے تھے تو اپنا سا منہ لے کے چلے جاتے ۔" [1]

انسان جب کسی کی ناجائز عقیدت یا نفرت کا شکار ہو جاتا ہے تو اُس کی خُوبیاں یا خامیاں بیان کرتے وقت انصاف کے تقاضوں کو مدّنظر رکھنے سے قاصر رہ جاتا ہے اور بعض اوقات ایسے ایسے بیانات دینے پر مجبور ہو جاتا ہے جو بڑے مضحکہ خیز ہوتے ہیں ۔ مرزا حیرت دہلوی کے دل و دماغ میں مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی عقیدت و محبّت کے جذبات کچھ اِس طرح رچے بسے معلوم ہو رہے ہیں کہ اُنھوں نے اپنے اِس بیان کے سامانِ تضحیک بننے کی بھی مطلقاً پروانہ کی ۔ نہ کسی صفائی پیش کرنا تھی ، عقیدت کا اظہار کرنا تھا ۔ یہ دُوسری بات ہے کہ ایسے بیانات سے مرزا صاحب خود بھی ایک تماشا بن کر رہ گئے ۔ مثلاً چند متعلقہ باتیں قابلِ غور ہیں :

۱۔ جب بڑے بڑے رئیس شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے شکایتیں کر رہے تھے اور وہ بھی ایسے حضرات جو حضرت شاہ صاحب کے معتقد تھے ، اگر مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا مسلک حضرت شاہ صاحب کے مسلک سے ہٹا ہُوا نہیں تھا تو اُن سے شکایت کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟

حیرت دہلوی مرزا : حیاتِ طیبہ ، مطبوعہ لاہور ، ص ۹۲

۲۔ اگر موصوف کے خیالات میں کوئی بات خلافِ شرع اور فساد انگیز نہیں تھی تو شکایت کرنے والے بدنامی کی بات خود شاہ صاحب کے رُوبرو کس چیز کو بتا رہے تھے،

۳۔ اگر اعتراض کرنے کی بقول مرزا صاحب کوئی معقول وجہ نہیں تھی تو کیا شکایت کرنیوالو ک دماغ خراب ہوگیا تھا کہ شکایت کرنے والے آتے ہی رہتے اور اپنا سا منہ لے کر چلے جاتے۔ آخر آنے کی وجہ ؟

۴۔ کیا شکایتیں صرف رؤسا ہی کر رہے تھے۔ اُن کی تصنیف "حیاتِ طیبہ" بھی یہی بتا ر کہ عوام و خواص یعنی اَن پڑھ مسلمان سے لے کر علمائے کرام تک سب بلبلا اُٹھے تھ اور شاہ صاحب جیسے نابغۂ عصر سے شکایتیں کر رہے تھے کہ حضرت کیا یہ خاندا اب دینِ برحق کی خدمت سے اُکتا گیا ہے جو تخریبِ دین و اضلالِ مسلمین کا کام خود ہی سنبھال لیا۔ مرزا صاحب یہاں شکایت کرنے والے صرف رئیس حضرات بتا رہے ہیں گویا باقی سب خیریت تھی۔

۵۔ علمائے کرام کی جگہ بڑے بڑے رئیس لکھ کر مرزا صاحب شاید یہی تاثر دینا چاہتے ہو کہ مذہبی لحاظ سے اُن کے محبوب رہنما کے خیالات و نظریات بالکل درست، خاندا مسلک کے مطابق اور جمہور اہلسنّت کی آواز تھے، بس رئیسوں کو کچھ شکایتیں ا اُن کی اصلاحی تقریروں سے ہوگئی تھیں لیکن یہ عجیب معاملہ ہے کہ اِسی کتاب کے م صفحات اُن کے اِس بیان کی تکذیب و تردید کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اِس سلسلے میں فریقِ ثانی کے متعدد علمائے کرام نے اِن شکا کا تذکرہ جس انداز میں کیا اور حضرت شاہ صاحب نے جو جواب مرحمت فرمایا، اگر تنقید سے غیر جانب دار ہو کر دیکھا جائے تو اُن کے بیانات حقیقت کی صحیح ترجمانی کرتے ہو نظر آتے ہیں مثلاً قاضی فضل احمد لدھیانوی نے فریاد المسلمین کے حوالے سے یہ واقعہ بیان کیا ہے:

"اُنھیں دنوں ایک کتاب شیخ (ابن) عبدالوہاب نجدی کی تصنیفات کا انتخاب بمبئی سے دہلی میں آئی۔ چونکہ عبدالوہاب مسطور ملک عرب کا باشندہ زبان دان تھا

مولوی اسمٰعیل اُن کی فصاحت و بلاغت پر فریفتہ ہوگئے۔ اُس کے کچھ مسائل انتخاب و اخذ کر کے علمائے دہلی حنفی مذہب سے چھیڑ چھاڑ کرنی شروع کر دی اُنھوں نے اِس کو خورد سال، خام خیال سمجھ کر اِن سے بحث نہ کی مگر مولانا عبدالعزیز (رحمۃ اللہ علیہ) سے اِن کی بے اعتدالی کے شاکی ہُوئے۔ مولانا موصوف نے کچھ رنجیدہ خاطر ہو کر مولوی اسمٰعیل کو پیغام بھیجا کہ میری طرف سے کہو اُس لڑکے نامراد کو کہ جو کتاب بمبئی سے آئی ہے، مَیں نے بھی اُس کو دیکھا ہے۔ اُس کے عقائد صحیح نہیں بلکہ بے ادبی و بے نصیبی سے بھرے ہُوئے ہیں۔ میں آجکل بیمار ہُوں اگر صحت ہوگئی تو میں اُس کی تردید لکھنے کا ارادہ رکھتا ہُوں۔ تم ابھی نوجوان بچے ہو، ناحق شور و شر برپا نہ کرو۔"[1]

مذکورہ بالا عبارت نے کئی غلط فہمیوں کو دُور کر دیا اور صورتِ حال کا اُس کی اصلی شکل میں اظہار کر دیا۔ مولوی اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) نے اِسی خاندانی مسلک سے اختلاف کا ایک واقعہ یُوں بیان کیا ہے:

"اِس کے متعلق مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خُوب جواب دیا تھا۔ مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اُن سے جہر بالتامین کے متعلق کہا تھا کہ حضرت آمین بالجہر سنت ہے اور یہ سنّت مُردہ ہو چکی ہے اِس لیے اِس کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب نے فرمایا کہ یہ حدیث اس سنّت کے باب میں ہے، جس کے مقابل بدعت ہو اور جہاں سنّت کے مقابل سنت ہو وہاں یہ نہیں اور آمین بالسر بھی سنت ہے تو اِس کا وجود بھی سنّت کی حیات ہے۔ مولانا شہید نے کچھ جواب نہیں دیا۔"[2]

یہی مولوی اشرف علی تھانوی ایک واقعہ اور بیان کرتے ہیں، جس سے واضح ہوتا ہے

---

[1] فضل احمد قاضی: انوار آفتاب صداقت، ج ۱، ص ۵۱۶

[2] : افاضات الیومیہ، ج ۳، ص ۱۶۰

کہ اِن بزرگوں کی زندگی میں اُن کی پروا کیے بغیر مولوی محمد اسمٰعیل نے وہابیت کی کسی قدر ترو
و اشاعت جاری کر دی تھی:

"شاہ عبدالقادر صاحب نے مولوی محمد یعقوب کی معرفت مولوی اسمٰعیل صاحب سے کہہ دیا تھا کہ تم رفع یدین چھوڑ دو، اِس سے خواہ مخواہ فتنہ ہوگا۔ جب مولوی محمد یعقوب صاحب نے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب سے کہا تو اُنھوں نے جواب دیا کہ اگر عوام کے فتنہ کا خیال کیا جائے تو پھر اِس حدیث کے کیا معنی ہوں گے "من تمسك بسنتي عند فساد امتي فله اجر مأته شهيد" کیونکہ جو کوئی سنّت متروکہ کو اختیار کرے گا عوام میں ضرور شورش ہوگی۔ مولوی محمد یعقوب صاحب نے عبدالقادر صاحب سے اُس کا جواب بیان کیا۔ اُس کو سُن کر شاہ عبدالقادر صاحب نے فرمایا: بابا ہم تو سمجھتے تھے کہ اِسمٰعیل عالم ہوگیا مگر وُہ تو ایک حدیث کے معنی بھی نہیں سمجھتا۔ یہ حکم تو اُس وقت ہے جبکہ سنّت کے مقابل خلافِ سنّت ہو اور ما نحن فیہ میں سنّت کا مقابل خلاف سنّت نہیں بلکہ دُوسری سنّت ہے۔"[1]

پروفیسر محمد مسعود صاحب نے ایسے ہی واقعات کے پیشِ نظر یُوں وضاحت فرمائی ہے:

"مولانا اسمٰعیل تو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کے پوتے اور حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے تھے۔ اِن کے دونوں چچا (کیونکہ تیسرے چچا شاہ رفیع الدین علیہ الرحمہ کا ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء میں انتقال ہوگیا تھا) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور حضرت شاہ عبدالقادر صاحب اِن پر بڑی شفقت فرمایا کرتے تھے، مگر جب زورِ علم نے بیباک بنا دیا تو بات یہاں تک پہنچی کہ ایک مرتبہ حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مجلس مبارکہ سے اِن کو اٹھا دیا۔ آخر میں دونوں چچا اِن سے ناراض ہوگئے تھے لیکن سوانح نگار صرف ابتدائی دور کا

---

[1] اشرف علی تھانوی، مولوی: بوادر النوادر، مطبوعہ دیوبند، ص ۴۶۹

ذکر کرتے ہیں، مجلس سے اُٹھانے کا واقعہ تو شاید مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی بوادر النوادر میں تحریر فرمایا ہے۔"[1]

سیف اللہ المسلول، مولانا شاہ فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) نے جو مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کے معاصر اور دیگر علمائے اہلسنت وجماعت کی طرح ہندی وہابیوں کی حرکاتِ قبیحہ کے عینی گواہ اور علمائے اہلسنّت میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ اُنھوں نے ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں محمد اسمٰعیل دہلوی اور اُن کے معتقدوں کی تردید کی اور اِس تخریب کاری کے چہرے سے یُوں پردہ اُٹھایا:

> "اُس مذہب کو پسند کیا اور تقویۃ الایمان تصنیف کی، گویا اُسی کتاب التوحید کی شرح ہے۔ اِس دین کی بڑی شہرت ہُوئی اور عوام الناس بہت اِس بلا میں پھنسے۔ توہین وتحقیرِ انبیاء واولیاء کی اور تکفیر تمام امت سلف وخلف کی خوب جاری ہُوئی۔ دین دار اہلِ علم جہاں تھے اُن کے فیضِ صحبت سے جو بچا سو بچا ورنہ اوّل وہلہ میں اکثروں کو اِس طرف میل آگیا، بسبب شہرت اُن کے خاندان کے اور ناواقفی کے فنِ سیرت اور حدیث سے۔ جب نوبت دِلّی میں پہنچی ہزاروں ہزار آدمی کہ شاگرد ومرید اور دیکھنے والے صحبت یافتہ شاہ عبد العزیز صاحب اور مولوی رفیع الدین صاحب (رحمۃ اللہ علیہما) کے اور علم میں اُن سے زائد لوگ موجود تھے، مولوی اسمٰعیل اور مولوی عبد الحی سے دست وگریباں ہُوئے اور خواص نے فہمائش کی کہ اِس سفر میں یہ نیا دین کیسا نکال لائے کہ اُس کی رُو سے تمہارے استادوں سے لے کر صحابہ تک کوئی کفر وشرک سے نہیں بچا اور قبل اِس سفر کے تم بھی اُسی طریقہ پر تھے اور ویسا ہی وعظ کہتے تھے اور فتوٰی لکھتے تھے، جس کو اب شرک کہتے ہو۔ یہ دین میں فساد ڈالنا اور قرآن وحدیث میں تحریف کرنا اور خلائق کو گمراہ کرنا، بہت

---

[1] محمد مسعود احمد، پروفیسر، مواعظ مظہری، ص ۸۲

بُرا ہے۔ ہر چند نصیحت کی، کچھ سُود مند نہ ہُوئی، لاچار ہوکر سب نے اُن کا رد و ابطال کیا۔ مولوی مخصوص اللہ صاحب اور مولوی موسیٰ صاحب، مولوی رفیع الدین صاحب کے صاحبزادوں نے فتوے اور رسالے اُن کے رد میں لکھے، نوبت تکفیر تک پہنچائی۔ مولوی فضل حق خیر آبادی نے جزاہ اللہ خیراً کہ علم وفضل میں مولوی اسمٰعیل وغیرہ کو اُن سے کچھ نسبت نہیں... ہر طرح مولوی اسمٰعیل کے رُو برُو اُن کا رد و ابطال کیا اور تکفیر کی نوبت تحریر میں آئی۔ مسئلہ شفاعت میں مولوی اسمٰعیل نے حرکت مذبوحی کچھ جواب میں کی آخر کو عاجز وساکت ہوگئے اور "تحقیق الفتوٰی فی رد اھل الطغوٰی" کمال شرح وبسط سے مولوی فضل الحق (رحمۃ اللہ علیہ) صاحب نے لکھا"۔ [1]

مفتی صدر الدین آزردہ رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) نے بھی مولوی اسمٰعیل دہلوی کو خوب سمجھایا کہ دین میں تخریب کرنا اور اپنے خاندان کی عظیم الشان مذہبی خدمات پر پانی پھیرنا عقلمندی نہیں ہے۔ موصوف نے اقرار بھی کر لیا تھا لیکن معلوم نہیں اندریں خانہ کیا مجبوری پیش آگئی کہ پرنالہ وہیں رہا۔ مثلاً:

> "مفتی صاحب (مفتی صدر الدین آزردہ) اسمٰعیل کو فہمائش کر کے راہِ راست پر لائے اور اُن سے اقرار کرا لیا کہ اب ہم نے تحقیق کی اور افراط و تفریط کو چھوڑا، سوادِ اعظم کے تخالف سے منہ موڑا اور یہ بات خاص و عام پر جامع مسجد میں شائع وذائع ہوگئی"۔ [2]

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) کے نامور فیض یافتہ مولانا رشید الدین خاں صاحب علیہ الرحمہ نے بھی فہمائش کا فریضہ ادا کیا۔ چنانچہ

---

[1] فضلِ رسول بدایونی، مولانا: سیف الجبار، مطبوعہ کانپور، ص ۵۸، ۵۹

[2] فضل احمد قاضی، مولانا: انوارِ آفتابِ صداقت، ج ۱، ص ۵۱۴

قاضی فضل احمد صاحب یُوں تصریح کرتے ہیں :

"مولانا رشید الدین خاں صاحب نے تخلیہ میں بذریعہ و بلا ذریعہ اسمٰعیل کو بہت سمجھایا کہ دین میں فتنہ ڈالنا اور جماعت میں تفرقہ پیدا کرنا قبیح ہے اور واجب الترک اور مفروض الاجتناب۔ اگر دِل میں کچھ خلش ہے (یعنی شک و شبہ) تو آؤ ما و شما و دیگر علماء و صلحاء متفق ہو کر کُتبِ دین کی طرف رجوع کریں اور احقاقِ حق قبول کر لیں اور شقاق و نفاق کو جماعتِ مومنین سے استیصال کریں اور نوائے اعانت و اشاعت کا راہِ راست پر کہ اتباعِ سوادِ اعظم ہے بلند کریں اور خاص و عام کو حق سے آگاہ کریں۔ مولوی عبد الحی اور مولوی اسمٰعیل اِس خوف سے کہ ہمارے عقائد فاسدہ طشت از بام نہ ہو جائیں رُوبراہ نہ لائے"۔[1]

جب مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے خاندانی بزرگ سمجھا بجھا کر تھک گئے، اُس خاندان کے فیض یافتہ علمائے کرام نے فہمائش کا فریضہ ادا کر لیا اور دیگر علمائے اہلسنت اِنھیں سمجھاتے، راہِ راست پر لاتے اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے سے روکتے تھے تو موصوف کا پارہ رچڑھ گیا، خارجیت و نجدیت کا اصلی رنگ موصوف کی تقریر و تحریر سے ظاہر ہونے لگا۔ ت بات پر مسلمانوں کو ٹھیٹ مشرک بتانا شروع کر دیا۔

حضرات علمائے کرام نے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی سے یہی تو کہا تھا کہ مسلمانوں میں تفریق پیدا نہ کریں متحدہ ہندوستان کے مسلمانانِ اہلسنت و جماعت کو مشرک بنا کر تیرہ صدیوں کے مسلمانوں کو جہنم کا ایندھن قرار نہ دیں، خود شاہ عبد القادر اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہما نے سمجھا بجھا کر اور ڈرا دھمکا کر دیکھ لیا اور موصوف کسی کے کہنے کو خاطر میں لائے ہی نہیں تو مجبور ہو کر مسلمانانِ اہلسنت و جماعت نے قانون کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ اُس وقت مولانا فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء)

---

[1] فضل احمد قاضی، مولانا : انوار آفتابِ ہدایت، ج ۱، ص ۱۵۴

نے اس فتنے کے متعلق جو ریمارک دیا وہ اُن کی انتہائی وسیع النظری کا بیّن ثبوت ہے ۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے سوانح نگار یعنی مرزا حیرت دہلوی نے اُس موقعے کے جملہ حالات کو بیان تو کیا ہے لیکن اس طرح کہ اپنے محبوب رہنما کی آن پر حرف نہ آئے ۔ واقعات تو بیان کر دیے لیکن انصاف کا خون کر کے ۔ قارئین کرام مندرجہ ذیل بیان کو پڑھیں اور حقائق کی روشنی میں تجزیہ کریں :

> "یہ زمانہ گویا مولانا شہید کی ریفارمیشن کا آغاز تھا اور یہی زمانہ اُس تلخ تر دشمنی کا تھا جو خواہ مخواہ حاسد مولانا سے کرتے تھے ۔ جب مختلف مضامین پر وعظ ہُوئے تو لوگوں میں جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں ایک شورش سی پھیل گئی اور چاروں طرف ایک دُند مچ گیا ۔ بھلا وُہ تو مدّت سے مختلف پیروں ، شہیدوں ، سینلا ماتا کے پُوجنے کے عادی تھے ، اُنھیں اکیلے خدا کی پرستش کاہے کو اچھی معلوم ہوتی ۔ وہ بھڑکتے بھڑکتے مولانا شہید کے فقیری وعظ سے پورے بھڑک اُٹھے اور اب اُنھوں نے عدالت کی طرف رجوع کرنا شروع کر دیا کیونکہ اکبر شاہ (بادشاہِ دہلی) کی طرف سے تو صاف جواب مِل چکا تھا ، مگر عدالت میں جانے سے پہلے اُنھیں ضرور ہوا کہ وُہ مولوی فضل حق صاحب سے مشورہ کر لیں کہ کیا تدبیر کرنی چاہیے ۔ مولوی منطقی صاحب (علاّمہ فضل حق خیرآبادی) رزیڈنٹ کے بڑے مُنہ چڑھے اور معتبر تھے اور وُہ اُن ہی کے کہنے پر زیادہ چلتا تھا ۔ جب یہ لوگ سررشتہ دار (علاّمہ خیرآبادی) کے پاس پہنچے اور ساری کیفیت عرض کی تو وہ آبدیدہ ہو کے کہنے لگے کہ " اسمٰعیل دینِ محمدی کی بیخ کنی کیے بغیر نہیں رہنے کا " یہ مولوی منطقی صاحب کا پہلا جُملہ تھا جو اُنھوں نے پیارے شہید کی نسبت استعمال کیا ۔"[1]

بہرحال قانونی چارہ جوئی سے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا وعظ بند کروا دیا گیا ۔ اس

---

[1] حیرت دہلوی مرزا : حیاتِ طیبہ ، مطبوعہ لاہور ، ص ۹۰

بندش کے دوران میں معلوم نہیں اعلیٰ انگریزی حکام کے ساتھ مل کر کیا کھچڑی پکائی گئی کہ ریزیڈنٹ نے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کے وعظ پر جو پابندی لگائی تھی اُسے منسوخ کر دیا گیا۔ منسوخی کا حکم متوقع وقت پر نہ پہنچا تو موصوف اپنے معتمد ساتھیوں کے ہمراہ ریزیڈنٹ کے پاس تشریف لے جاتے ہیں۔ ریزیڈنٹ نے جو موصوف کا معنی خیز اور خلافِ توقع اعزاز واکرام کیا یا وُہ ایسا کرنے پر مجبور ہو گیا تھا، اُس نے اہلِ نظر علمائے اہلسنت کی آنکھیں کھول دیں۔ یہ واقعہ بھی مرزا حیرت دہلوی کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

> ”آپ نے خارجی طور پر دریافت کر کے کہ فلاں وقت ملنے ملانے اور فرصت کا ہوتا ہے، سیدھے کوٹھی پر پہنچے۔ ساتھ میں صرف مولوی عبد الصمد بنگالی اور مولوی عبد الرحیم محدث تھے اور ایک آپ کا منشی ہیرالال تھا اور ایک خدمت گار تھا۔ پہلے آپ نے جا کے اطلاع کرائی۔ جُونہی رزیڈنٹ نے سُنا کہ شاہ اسمٰعیل آئے ہیں، فوراً باہر نکل آیا اور باہر برانڈے سے آ کے لے گیا۔ حد سے زیادہ عزت کی اور بار بار یہ کہا، آپ نے بڑا ہی سرفراز کیا۔ معمولی مزاج پُرسی کے بعد رزیڈنٹ نے خود یہ الفاظ کہے، مولوی صاحب! ہمارے سررشتہ دار (علامہ فضل حق خیر آبادیؒ) کی غلطی سے آپ کے وعظ بند کرنے کا مَیں نے حکم جاری کر دیا تھا، لیکن جب آپ نے واجبی اور معقول وجہیں لکھیں تو مَیں نے اُسی وقت حکم ثانی لکھوا دیا تھا کہ وعظ قدیمی طور پہ جاری کیا جائے اور کوئی مزاحم نہ ہو۔“ [1]

زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا تھا کہ وعظ پر جو پابندی لگا دی گئی تھی اُسے اُٹھا لیا جاتا، دوبارہ وعظ کرنے کی اجازت دے دی جاتی لیکن ”قدیمی طور پر جاری کیا جائے“ کے الفاظ کچھ اور ہی غمازی کر رہے ہیں اور ”کوئی مزاحم نہ ہو“ کا آرڈیننس اُس خدشے کو مزید تقویت پہنچاتا ہے۔ ان باتوں سے قطع نظر مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی نظر میں مسلمان تو سب کے سب

---

[1] حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۹۴

مشرک ہی تھے لیکن ایک ظاہر بُت پرست اور ٹھیٹ مشرک یعنی ہیرا لال کو کس عقیدت، محبت یا یگانگت کے تحت منشی (پرسنل سیکرٹری) رکھا ہُوا تھا، جو راز داری کے مواقع پر بھی سائے کی طرح ساتھ ہونا ضروری تھا۔ حالانکہ ارشادِ باری تعالیٰ تو یہ ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ۔ اے ایمان والو! غیر مسلموں کو اپنا راز دار نہ بنانا۔ لیکن یہ نرالے ریفارمر صاحب ہیں کہ ہیرا لال ہندو کو منشی رکھتے ہیں اور عجیب و غریب مجاہد ہیں کہ راجہ رام ہندو راجپوت کو توپچی رکھتے ہیں۔ کہیں یہ میراثِ خوارج سے بہرہ وری اور "یقتلون اھل الاسلام ویدعون اھل الاوثان" کی جلوہ گری تو نہیں۔ اِسی منشی ہیرا لال کے متعلق مرزا حیرت دہلوی نے یہ بھی لکھا ہے:

> "ہمیں افسوس ہے کہ ہم شاہ صاحب (محمد اسمٰعیل دہلوی) کا وعظ بلفظہٖ نقل نہیں کر سکتے، اِس لیے کہ جو کاغذات منشی ہیرا لال کے ہاتھ کے لکھے ہُوئے ہمیں ملے ہیں وُہ علاوہ پارہ پارہ ہونے کے ایسے بدخط لکھے ہُوئے ہیں کہ ہم بلفظہٖ نقل کرنے کا فخر حاصل نہ کر سکے۔"[1]

جب فہمائش سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہُوا، قانونی چارہ جوئی نے کچھ اور ہی نظارہ دکھایا کہ چودہ طبق روشن ہو کر رہ گئے تو یقین ہو گیا کہ جس راستے پر موصوف گامزن ہو چکے ہیں اُس سے ہٹنا اور اپنے بزرگوں کے مسلک کی پیروی کرنا اب اِن کے بس سے باہر ہے۔ یہ اپنی مرضی کھو چکے، کسی کی مرضی کے پابند ہو چکے ہیں تو علمائے کرام نے طے کیا اب فرض کی ادائیگی کا یہی اور صرف یہی طریقہ باقی رہ گیا ہے کہ موصوف سے بحث مباحثہ کر کے اِنھیں مسلک سے ہٹا ہوا اور مذہب اہلسنت وجماعت سے کٹ کر خارجیت و وہابیت کا علمبردار ثابت کیا جائے تاکہ عوام الناس اِن کے دامِ فریب میں گرفتار ہو کر اپنی عاقبت برباد کرنے سے محفوظ و مامون رہ سکیں۔ چنانچہ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) کے خلفاء اور مولوی محمد اسمٰعیل کے چچا زاد بھائیوں نے اُن سے جامع مسجد دہلی میں ایک

---

[1] حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۸۴

فیصلہ کن مباحثہ کیا، جو پاک و ہند کی سرزمین میں حنفیت و وہابیت کا سب سے پہلا مناظرہ تھا۔ اِس مباحثے کی روئداد حضرت فضلِ رسول بدایونی قدس سرہٗ نے ۱۲۴۰ھ میں موصوف کے حینِ حیات یعنی اُن کے قتل ہونے سے پانچ چھ سال پہلے یُوں بیان فرمائی اور کسی نے ایک لفظ کی تغلیط ثابت نہ کی۔ لکھا ہے:

"مجلسِ جامع مسجد کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے ایک استفتاء مرتب ہُوا، بمہرِ دستخط مولوی رشید الدین خاں صاحب و مولوی فضل حق صاحب و مولوی مخصوص اللہ صاحب و مولوی موسیٰ صاحب و مولوی محمد شریف صاحب و مولوی عبد اللہ صاحب و آخون شیر محمد صاحب، صبح کے وقت منگل کے دن انتیسویں ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ کو، کہ مولوی عبد الحی جامع مسجد میں وعظ کہہ رہے تھے۔ مولوی رشید الدین خاں صاحب و مولوی مخصوص اللہ صاحب و مولوی مُوسیٰ صاحب، مولوی رفیع الدین صاحب مرحوم کے صاحبزادے اور مولوی محمد شریف صاحب وغیرہ علماء و طلبہ، خاص و عام، حوض پر مجتمع ہُوئے جب مولوی عبد الحی وعظ کہہ چکے، عبید اللہ طالب علم نے استفتاء پیش کیا کہ اپنی مہر اِس پر کر دیجئے۔ مولوی عبد الحی نے کہا، میں نہیں مُہر کرتا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ اُس نے کہا: یہی لکھ دیجئے اور اصرار کیا تو مولوی عبد الحی نے انکار کیا اور ملال ظاہر کرنے لگے۔

مفتی شجاع الدین علی خاں صاحب نے کہا کہ اِس کا تصفیہ ضرور ہے کہ بڑا اختلاف پڑ گیا ہے۔ مرزا غلام حیدر شاہزادے اہلِ علم کی تکرار سے رنجیدہ ہُوئے اور مولوی عبد الحی وغیرہ کو مجمعِ علماء میں واسطے مناظرہ لائے۔ مجمع بے شمار خاص و عام، امیر و فقیر کا ہو گیا۔ کوتوال بھی واسطے بندوبست کے آ پہنچا۔ مولوی عبد الحی نے فاضلوں سے پُوچھا کہ تم کیوں آئے ہو؟ کسی نے کہا کہ آپ کے بُلانے کے موافق کہ ہر روز کہا کرتے تھے کہ جس کو تاب مناظرہ کی ہو ہمارے سامنے آوے۔ سُن کر چُپ ہُوئے۔ مولوی مخصوص اللہ (شاہ رفیع الدین محدث

دہلوی علیہ الرحمہ کے صاحبزادے) نے کہا کہ ہم بموجب حکم خدا کے آئے ہیں کہ حق ظاہر ہوجائے مولوی موسیٰ (شاہ رفیع الدین محدث دہلوی علیہ الرحمۃ کے صاحبزادے) نے کہا کہ تم ہمارے استادوں کو (شاہ عبدالعزیز و شاہ عبدالقادر و دیگر علماءِ اہلسنت کو) بُرا کہتے ہو۔ بولے کہ میں نہیں کہتا۔ مولوی موسیٰ نے کہا کہ یہ ایسے مسئلے نئے بناتے ہیں کہ اُن سے بُرائی استادوں کی ثابت ہوتی ہے۔ پُوچھا وُہ کیا ہے؟ کہا کہ مثلاً قبر کے بوسے کو شرک کہتے ہو اور ہمارے اکابر (شاہ عبدالعزیز و شاہ ولی اللہ وغیرہ) اُس کے مباشر ہوتے تھے۔ مولوی عبدالحی نے انکار کیا۔ کسی نے کہا کہ لکھ دو تاکہ تمہارے اُوپر جھوٹ باندھنے کی تکذیب کی جاوے۔ مولوی عبدالحی نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے لکھ دیا، بوسہ دہندہ مشرک نیست۔

مولوی رشید الدین خاں صاحب کے ہاتھ میں فتویٰ دیا گیا اور قریب مولوی عبدالحی کے آبیٹھے۔ مولوی عبدالحی نے گلہ شکوہ اُن سے شروع کیا کہ خانصاحب مجھے آپ کی خدمت میں دوستی تھی، تم برملا مجھے ذلیل کرتے ہو۔ خانصاحب نے فرمایا کہ ہم تمہارے اعزاز و اظہارِ کمال کے واسطے آئے ہیں لوگوں نے مشہور کیا ہے کہ تم مسئلے خلاف سلف کے کہتے ہو، اِس سبب سے تم سے خلق کو وحشت ہے۔ ایسے مجمع میں مفتریوں کی تکذیب ہو جاوے گی۔ مولوی عبدالحی شکوے ہی کی پریشان باتیں کرتے رہے۔ خانصاحب نے فرمایا کہ تمہارے لوگ (مبلّغ وہابیت و نجدیت مثل شاہ اسمٰعیل) کہتے ہیں کہ عبدالعزیز کی راہ، راہ جہنّم کی ہے (نعوذ باللہ) اُسی وقت گواہی سے یہ بات ثابت ہوگئی، لوگ بُرا کہنے لگے۔ مولوی عبدالحی نے بھی تبرّا کیا باآوازِ بلند اور مولوی رشید الدین خاں صاحب سے کہا کہ مولانا عبدالعزیزؒ کی محبت اور اعتقاد، علم و بزرگی میں، میں مثل تمہارے ہی، طحاوی اور کرخی کے برابر جانتا ہُوں۔ پھر استفسار شروع ہُوا۔ ہر مسئلے کا جواب دیا کہ چنداں مخالف جمہور کے نہ تھا۔

مولوی اسمٰعیل نے پہلے ہی استفسار سے ارادہ کیا۔ اُٹھ جانے کا۔

مولوی رحمت اللہ صاحب نے کہا : ذرا تشریف رکھیے کہ جناب کے بھی دستخط اِس تحریر پر ضرور رہیں۔ مولوی اسمٰعیل نے کہا کہ "میں کسی کے باپ کا نوکر نہیں، میرے واسطے محتسب لا، اے مردود، میرے ساتھ سختی کرتا ہے" اُنھوں نے کہا کہ حضرت! میں سختی نہیں کرتا، عرض کرتا ہوں۔ پھر مولوی اسمٰعیل نے کہا کہ میرے رسالے کا جواب لکھ۔ مولوی رحمت اللہ صاحب نے کہا کہ رسالہ آپ کا میری بغل میں ہے اگر فرمائیے، اِسی مجمع میں جواب عرض کروں۔ غصّہ کھا کر کچھ نہ کہا، پھر مولوی رحمت اللہ نے کہا کہ جواب عقلی لکھوں یا نقلی۔ کہا جیسا چاہیے۔ پھر مولوی رحمت اللہ نے کہا ردِّ جواب اس کا لکھو گے؟ کہا کہ میں محکوم کسی کا نہیں ہوں۔ مولوی رحمت اللہ نے کہا کہ نئے عقیدے اپنے دل کے بنائے ہوئے کسی سے نہ فرمائیے اور نہیں تو ابھی بحث کر لیجئے۔ مولوی اسمٰعیل اُٹھ بھاگے اور چلتے ہُوئے۔

رشید الدین خاں صاحب مولوی عبدالحی سے پوچھا کیے، وہ جواب دیتے تھے، ایسے کہ قدماء کے خلاف نہ تھے۔ تیرھویں سوال میں کہ بدعت کی بحث تھی مولوی عبدالحی نے کہا کہ میرے نزدیک بدعت حسنہ بھی ہے، گو اصل ہر بدعت کی بد ہے مگر سبب نیکی کا اُس میں ہو تو حسنہ ہو جاتی ہے و اِلّا فلا۔ مولوی رشید الدین خاں صاحب نے کہا کہ اصل ہر بدعت کی بد نہیں ہے بموجب حدیث "من سن سنة حسنة و من سن سنة سيئة" (الحديث) کے اور حدیث "من احدث فی امرنا هٰذا ما ليس منه" اور حدیث "من ابتدع بدعة ضلالة لا يرضاها الله" کہ ان تینوں حدیثوں سے ثابت ہُوا کہ نیا طریقہ نیک بھی ہوتا ہے، بد بھی اور خدا اور رسول کی مرضی کے موافق بھی، مخالف بھی، گمراہ بھی، غیر گمراہ بھی۔ اِسی سبب سے علماء نے کہا ہے کہ بعض بدعت واجب، مندوب و مباح بعضے حرام، مکروہ۔

مولوی مخصوص اللہ صاحب (ابن شاہ رفیع الدین) نے کہا، جس بدعت کی وجہِ حُسن و قُبح ظاہر نہ ہو وُہ کیا ہے؟ مولوی عبدالحی نے کہا: سیئہ۔ اُنھوں نے کہا: اِس تقدیر پر بدعت و مباح میں کیا فرق ہے؟ مولوی

عبدالحی ساکت ہو گئے۔ کسی نے کہا کہ احکامِ خمسہ میں سے ایک حکم کم ہو گیا۔
پھر مولوی عبدالحی نے کہا کہ ہر بدعت کو بُرا اِس واسطے کہتا ہوں کہ "کل بدعۃ"
کا کلیہ ظاہر پر ہے اور مخصوص نہ ہو جاوے۔ خانصاحب نے کہا کہ تخصیص سے
کیا قباحت لازم آتی ہے؟ اور عمومات میں تخصیص مشہور ہے۔ مولوی محمد شریف
نے پڑھا "ما من عام الا وقد خصّ منه البعض" خانصاحب نے کہا
کہ تینوں حدیثیں مذکورہ بالا تخصیص کو چاہتی ہیں، پس تخصیص ضرور ہُوئی۔
مولوی عبدالحی نے کہا کہ اصل ہر بدعت کی قبیح بعض علماء کا مذہب ہے۔
خانصاحب نے کہا کہ یہ قول حضرت مجدّد (قدس سرہٗ) کا ہے مگر تمہارے
مذہب (خارجیت و وہابیت) سے نہایت دُور کہ اُن کے مذہب میں جس
کی اصل شرع میں پائی جاوے وُہ سنّت ہے، بدعت وہی ہے جس کی اصل
نہ پائی جائے۔ پھر مولوی عبدالحی نے غوطہ میں جا کر کہا کہ یہ قول نووی کا ہے،
فتح المبین میں لکھا ہے۔ اُسی وقت فتح المبین شرح اربعین امام نووی کی
پیش کی گئی۔ عبارت اُس مقام کی باوازِ بلند مع ترجمہ پڑھی گئی۔ پھر تو مولوی
عبدالحی اچھی طرح سے قائلِ معقول ہو گئے۔

پھر اذان میں بعد دفن کے کلام ہُوا۔ بعد کسی قدر تکرار کے کہا کہ میں کسی
کو منع نہیں کرتا۔ پھر کلام ہُوا، سوم کے فاتحہ میں۔ بعد قیل وقال کے کہا
کہ اگر اُس دن میں ثواب زیادہ جانتا ہے ممنوع ہے اور اگر ثواب زائد
نہیں جانتا اور برعایت مصلحت کے کرتا ہے تو منع نہیں ہے۔

تمام ہُوا خلاصہ نقل مجلس کا۔ پھر تو یہ حال ہُوا کہ ہر ایک مسئلہ میں
ادنیٰ ادنیٰ آدمی سے قائل (ساکت) ہونے لگے اور اطراف وجوانب میں بھی
یہ تقریریں اور تحریریں جا بجا پھیل پڑیں۔ سب پر ظاہر ہو گیا کہ مولوی اسمٰعیل کا
طریقہ مخالف ہے تمام سلف صالح کے اور اپنے خاندان کے بھی مخالف ہیں اور
سبب اعتبار کا وہی نسبت خاندان کی تھی۔ جب اُس کے بھی خلاف ٹھہرے

تو کچھ اعتبار نہ رہا اور ساری قلعی کھل گئی اور ہر جگہ جو اہل علم تھے متوجہ ہوئے اِن کی بے دینی کے اظہار اور اُس کے رد لکھنے پر۔ ایسے سببوں سے آگ اُن کے فتنے کی ٹھنڈی ہوگئی اور نئے دین والے بھی زبان دبا کر بات کرنے لگے"۔[1]

قارئین کرام! یہ تھا وہابیت کا سنگِ بنیاد جو دہلی میں رکھا گیا اور ولی اللّٰہی خاندان سے مولوی ـمد اسمٰعیل صاحب نے جس نجدی شجر کی آبیاری کا کام بڑی تندہی سے کیا۔ علمائے اہلسنت ـے اپنی بساط بھر اس فتنے کا مقابلہ کیا۔ خاندانی بزرگوں اور دیگر علمائے اہلسنت نے سمجھایا، ـونی چارہ جوئی کی، بحث و مناظرہ کی محفلیں گرم کی گئیں، لیکن مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور ـلوی عبدالحی دہلوی (المتوفی ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ء) تھے کہ اپنے جدید مذہب سے کسی طرح ـہٹے، مغلوب ہوئے مگر ڈٹے رہے، اپنے اکابر سے روگرداں ہوئے، خاندان سے رشتہ ـا، دہلی مرکز سے رابطہ چھوٹا تو جہاد کا چکر چلایا، سیّد احمد صاحب کو صاحبِ وحی و عصمت ـر بنایا، اُن کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے اور سابقہ روسیاہی کا داغ ـونے کی خاطر، اِس خوشنما جال میں بھولے بھالے مسلمان پھنسائے۔ نجدیت کی پوری معلومات ـل کرنے، نجدیوں سے فتنہ و فساد کے گُر سیکھنے کی خاطر، حجِ بیت اللّٰہ کا بہانہ کر کے ایک ـے گئے، وہاں کیوں گئے اور کیا وہاں سے لائے؟ جتنے منہ اُتنی باتیں، حقیقت کا حال ـعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اور اُس کی عطا سے اُس کے برگزیدہ بندے۔ باقی تو صرف عقل و ـکی باتیں ہیں۔ اِس دورۂ حج کے بارے میں پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر قیام الدین احمد ـب نے بعض مورخین کے خیالات یوں نقل کیے ہیں:

> "حضرت سیّد احمد صاحب کا شاندار سفرِ حج اُن کی زندگی کا ایک اہم اور فیصلہ کن واقعہ تھا۔ بعض انگریز مصنفوں نے زور دیا ہے کہ سیّد احمد کا سفرِ حج اُن کی زندگی کا ایک انقلابی واقعہ تھا۔ اُن کے خیال میں اِسی دورانِ سفر میں اُن کو عربی وہابیت سے زیادہ قریب کا رابطہ ہوا، اُس کے عقائد سے بہت

---

[1] ـل رسول بدایونی، مولانا: سیف الجبار، مطبوعہ کانپور، ص ۶۱ تا ۶۴

متاثر ہوئے اور ہندوستان میں اُن کی اشاعت کی۔ ایسا ہی ایک مصنف فلبی لکھتا ہے: "یہی زمانہ تھا جبکہ ایک شخص سیّد احمد بریلوی مکّہ کے سفر سے ہندوستان کو وُہ بیج لے گیا جس نے......... ۱۸۳۲ء میں اُن کی شہادت کے بعد وہابیوں کو کوہِ سیاہ کا ردِّ عمل بخشا اور اطراف تک اُس کی گونج یا جھٹکا پہنچا دیا۔"

ہندوستانی وہابیت پر ایک اور مشہور تر مصنف، ہنٹر لکھتا ہے:

"سیّد احمد کے قیامِ مکّہ کے دوران میں وہاں کے حکّام کی توجّہ، اُن کی تعلیمات کی اُن بدو قبائلوں کے خیالات سے مماثلت کی طرف منعطف ہُوئی، جن کے ہاتھوں مکّہ کے مقدس شہر نے اتنے مصائب اٹھائے تھے۔ علانیہ طور پر اُن کی تحقیر کی گئی اور شہر بدر کر دیے گئے۔ اِس جور و تعدّی کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وُہ ہندوستان آئے تو ایک مذہبی خواب بیں اور مشرکانہ بداعمالیوں کے مصلح کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ محمد بن عبد الوہاب کے معتقد و مرید کی حیثیت سے۔"[1]

ڈاکٹر قیام الدین احمد صاحب اِن مصنفوں سے اتفاق رائے نہیں رکھتے لیکن موصوف ک اِس امر کا اعتراف کیے بغیر کوئی چارہ کار نظر نہیں آیا کہ نجدی اور ہندی وہابیت اصل میں ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں۔ شراب وُہی ہے لیبل جُدا جُدا ہیں۔ موصوف کی تصریح اُن کے اپنے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

"حقیقت یہ ہے کہ چونکہ دونوں تحریکوں کا مخرج و مبداء ایک ہی ہے، قرآن وحدیث۔ دونوں کے درمیان کچھ مماثلتیں ضرور ہیں۔ اِن دونوں تحریکوں (نجدی اور ہندی تحریکِ وہابیت) کے ظہور کے وقت دونوں ملکوں میں ایک قسم کے حالات و کوائف درپیش تھے اور دونوں اسلام کے اصل اصول کو دوبارہ رائج و شائع کرنے کی ضرورت پر مصر تھے، جن میں بنیادی چیز توحید

---

[1] محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر: ہندوستان میں وہابی تحریک، مطبوعہ کراچی، ص ۵۳

اور ترکِ بدعات پر زور دینا تھا۔ محمد بن عبدالوہاب کی التوحید (کتاب التوحید) اور شاہ اسمٰعیل کی تقویۃ الایمان اِن بنیادی امُور پر زور دینے میں متفق الخیال ہیں۔"[1]

غنیمت ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ہندی اور نجدی وہابیت کی مماثلت تقسیم کرلی، باقی رہا اُن کا دعوٰی کہ دونوں تحریکیں اپنا مبداء اور مخرج قرآن و حدیث کو ٹھہراتی ہیں اور توحید و ترکِ بدعات پر زور دیتی ہیں تو اِس سلسلے میں ہماری رائے تو یہی ہے کہ آج تک ایسا کون سا بدمذہب گروہ کھڑا ہُوا ہے جس نے اپنے مخصوص نظریات کا مخرج، قرآن و حدیث کو نہ ٹھہرایا ہو؟ رہی توحید والی بات، تو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اِسی پیمانۂ توحید سے ناپ کر تو اوّلین ارج نے امیرالمومنین حضرت علی رضی اللہ تعالٰی عنہ اور اُنھیں مسلمان جاننے والے حابۂ کرام اور تابعینِ عظام کو مشرک اور اِسلام سے خارج ٹھہرایا تھا، اگر اسی ساختہ حید کو لے کر محمد بن عبدالوہاب نجدی اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) ی بارہ صدیوں کے مسلمانوں کو مشرک بتا کر جہنم کا ایندھن ٹھہرائیں، ساری اُمتِ محمدیہ کو ترکوں کا جمگھٹا بتائیں تو اتنی بات پر متفق ہونے کی وجہ سے یہ دونوں حضرات اس ساختہ توحید یمان رکھنے والوں کے نزدیک کیوں نہ مصلح اور ریفارمر قرار پائیں؟ ڈاکٹر صاحب نے ون تحریکوں میں دو[2] اختلافی امور بھی ذکر کیے ہیں، جن میں سے امرِ دوم اور موصوف کا لہ ملاحظہ ہو:

> "ہندوستانی وہابیت کا دُوسرا طرّۂ امتیاز ایک مرحلے پر مہدوی تحریک سے اُس کا اتفاق تھا۔ مہدی موعود کے ظہور کے عقیدے پر ہندوستانی وہابیوں نے کثیر لٹریچر فراہم کرلیا تھا۔ اِسی کے بعد سیّد احمد نے رحلت کی۔ مہدوی تحریکات سے یہ اتفاق و تماثل عرب میں کبھی رُونما نہ ہوا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ دونوں تحریکوں میں ظاہری تشابہ ایک مشترک ماخذِ استفاضہ اور یکساں حالات و

سلم عظیم آبادی، پروفیسر: ہندوستان میں وہابی تحریک، ص ۵۷

کوائف کی موجودگی کا نتیجہ تھا، نہ کہ ایک دُوسرے کے تتبع و تقلید کا۔" [1]

پروفیسر الحاج فیروز الدین روحی اس سلسلے میں اپنی تحقیقاتِ عالیہ یُوں پیش فرماتے ہیں:

"اتفاق کی بات اُسی زمانہ میں عرب میں بھی وہاں کی مذہبی و سماجی خرابیوں کی بنا پر تجدید و اصلاحِ دین کی تحریک شروع ہُوئی، جس کے قائد شیخ محمد بن عبدالوہاب تھے، ترکی کا اُس وقت عرب پر اقتدار تھا، لہٰذا ترکی کو نقصان اٹھانا پڑا، پھر اِس تحریک کو مصر کے بادشاہ محمد علی پاشا نے ہوا دی اور یہ دونوں ملک انگریز کے دوست تھے، وہاں اِس تحریک کو وہابی کے لقب سے موسوم کیا گیا۔ لہٰذا ہندوستان میں بھی سیّد احمد شہید کی تحریک کو شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی شاخ اور تتمہ بنایا، بلکہ بعض انگریز مصنفین نے یہاں تک لکھ مارا کہ حضرت سیّد احمد شہید جب حج کو گئے تو شیخ محمد بن عبدالوہاب سے پڑھ کر آئے، حالانکہ سیّد احمد کی پیدائش ۱۷۸۶ء کی ہے اور شیخ کا انتقال ۱۷۸۷ء میں ہو جاتا ہے، یہ اتفاق کی بات ہے کہ دونوں تحریکیں ایک ہی جذبہ اور ایک ہی مقصد کے لیے وجود میں آئی تھیں، اور اُس وقت کے ماحول کے اعتبار سے کم و بیش ایک ہی طریقۂ کار دونوں نے اختیار کیا۔" [2]

حیران ہُوں کہ پروفیسر فیروز الدین روحی صاحب کی اِس عبارت اور اُن کی اِس ساری کتاب کو دیکھ کر کوئی موصوف کو کس مضمون کا پروفیسر تصوّر کرے گا۔ اُردو، عربی، تاریخ اور اِسلامیات میں کیسے کیسے گُل کھلائے ہیں۔ اُردو کی ادبی شان تو ہر جملے سے نمایاں، عربی دیکھیے تو ساری کتاب میں ایسی کوئی عربی عبارت نظر آئے گی جو صحیح نقل کر سکے ہوں، اسلامیات سے مراد صرف وہابیت کی قصیدہ خوانی ہو کر رہ گئی اور وُہ بھی ثبوت کی محتاج اور تاریخ دانی کے لیے یہی عبارت کافی رہے گی۔ مزید اور ملاحظہ فرمائیے کہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا سنِ وفات یہاں ۱۷۸۷ء لکھا ہے لیکن دُوسری جگہ:

---

[1] محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر: ہندوستان میں وہابی تحریک، ص ۵۷، ۵۸

[2] فیروز الدین روحی، پروفیسر: آئینۂ صداقت، مطبوعہ کراچی، ص ۴۵، ۴۶

"شیخ نے مسلسل پچاس سال دعوت و تبلیغ کے بعد شوال یا ذیقعدہ ۱۲۰۶ھ مطابق جولائی ۱۷۹۲ء میں رحلت کی۔ شیخ نے چار لڑکے اور ہزار ہا شاگرد چھوڑے۔"[1]

ع ناطقہ سر بگریباں ہے اِسے کیا کہیے!

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کے سوانح نگار یعنی مرزا حیرت دہلوی نے اِس سلسلے میں اپنی تحقیق کا نقارہ کچھ عجیب انداز میں بجایا ہے۔ ذرا کان لگا کر سماعت رمالیجیے:

"مولوی اسمٰعیل جو ہندوستان میں فرقہ موحّدیہ کا بانی ہے، کبھی کسی نجدی شیخ سے نہیں ملا اور نہ اِس نے اُن کی کوئی کتاب دیکھی۔ اِس نے وہی تعلیم دی جو کتاب اللہ اور حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بتاتی ہے۔ محمد بن عبدالوہاب کی پیدائش سے پہلے محمدیت کی بِنا اِس کے خاندان میں پڑ چکی تھی اور جو کچھ اِس نے اور اِس کے خاندان نے حاصل کیا وُہ اپنے ہی باپ داداؤں سے۔ اِسلامی دنیا میں ایک ہی خاندان ہے جسے غیر کے شاگرد بننے کا افتخار حاصل نہیں ہُوا۔ یورپنیس کا یہ لکھنا کہ محمد بن عبدالوہاب نے ہندوستان تک اپنے مذہبی اصول کے خیالات پھیلائے محض لغو اور بے سر و پا بات ہے۔ جس بُرے پیرایہ میں محمدیوں کو، جنھیں سخت غلطی سے وہابی کہا ہے، انگریز مصنفوں نے گورنمنٹ کو دکھایا ہے، سخت حقارت انگیز کارروائی ہے۔ گورنمنٹ خود جانتی ہے کہ اُس کی سلطنت کی برکتوں کو فرقہ اہل حدیث نے کس قدر تسلیم کرلیا ہے اور اُس کے کیسے فرماں بردار، مطیع اِس گروہ کے لوگ ہیں۔ اِن پر کیا، ہندوستان کے کُل مسلمان اپنی گورنمنٹ کا ساتھ دیتے ہیں اور کبھی اُن کارروائیوں میں شریک نہیں ہوتے جو گورنمنٹ کے خلاف سمجھی

فیروزالدین روحی، پروفیسر، آئینۂ صداقت، مطبوعہ کراچی، ص ۵۲

جاتی ہیں۔"[1]

موصوف کے یہاں تین دعوے مذکور ہُوئے ہیں جنھیں ہم نمبروار بیان کیے دیتے ہیں:

۱۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کی کوئی کتاب نہیں دیکھی تھی۔ موصوف کا یہ دعوٰی کسی سنّی یا وہابی تک کو بھی تسلیم نہیں ہو سکتا۔ باب سوم میں ہم کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان کی مطابقت دکھائیں گے۔ انشاء اللہ تعالٰی۔

۲۔ دُوسرا دعوٰی کہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا مذہب اپنے خاندان کے مطابق تھا اور اِس محمدی مذہب کی بنا پہلے ہی اِن کے خاندان میں پڑ چکی تھی۔ یہ دعوٰی سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ گزشتہ صفحات میں قدرے وضاحت کی جا چکی ہے۔

۳۔ تیسرا دعوٰی یہ ہے کہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے پیرَو، جو پہلے محمّدی اور بعد میں اہلحدیث کہلائے، وہ برٹش گورنمنٹ کو بابرکت تسلیم کرتے اور اُس کے پُورے پُورے فرمانبردار اور مطیع ہیں۔ یہ دعوٰی اُنھوں نے جس عاجزانہ اور دلیرانہ انداز میں کیا ہے، اُن کے پیشِ نظر ہر کوئی کہہ اُٹھے گا کہ: ع

کشش لفظوں کی ایسی ہے کہ ہم بھی صاد کرتے ہیں

حقیقت کچھ اِس طرح معلوم ہوتی ہے کہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) نے کتاب التوحید کو دیکھا یا یہ کتاب اُنھیں دکھائی گئی۔ موصوف نے دل جان سے اِس کے مندرجات کو قبول کیا اور اِس کے خیالات و نظریات کی ڈھکے چھُپے لفظوں میں تبلیغ شروع کر دی، شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) اور شاہ عبدالقادر علیہ الرحمہ (المتوفی ۱۲۴۲ھ/ ۱۸۲۷ء) تک شکایتیں پہنچیں۔ دونوں حضرات نے بالواسطہ اور بلاواسطہ سمجھایا بجھایا لیکن پرنالہ وہیں رہا۔ یہ دونوں بزرگ وفات پا گئے تو موصوف کی باگیں ڈھیلی ہو گئیں۔ خُوب کُھل کر کھیلنے لگے۔ قانونی طور پر نقضِ امن کے پیشِ نظر پابندی لگوائی تو نزالا ہی انکشاف ہُوا، حکومت کی پشت پناہی صاف نظر آنے لگی۔ آخر کار دلائل کے

---

[1] حیرت دہلوی، مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۶۶، ۲۶۷۔

ذریعے علمائے کرام نے محاسبہ شروع کیا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں اور بھتیجوں نے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور مولوی عبد الحی دہلوی کا محاسبہ شروع کر دیا۔ ایک طرف یہ دونوں حضرات تھے اور دوسری طرف سارے ملک کے علمائے اہلسنت اور پورا خاندان ولی اللّٰہی۔ جب دلائل کے میدان میں ان حضرات کا بھید کھلنا شروع ہو گیا تو جو بھولے بھالے مسلمان ان حضرات کے دلکش الفاظ کے چکر میں پھنس گئے تھے وہ ان سے علیحدہ ہو گئے اور جو تھوڑی بہت جمعیت فراہم کی تھی وہ بھی منتشر ہو گئی۔

ان حالات میں دوسرا منصوبہ تیار کیا گیا جو پہلے کی سراسر ضد ہے۔ برٹش گورنمنٹ نے سکھوں کے خلاف جہاد کا دلکش نعرہ سجھایا تو بادشاہی کا دماغوں میں سودا سما گیا اور لبیک کہہ کر قبول کر لیا۔ اب فکر لاحق ہوئی لاؤ لشکر کی، اس کے لیے جہاد کے فضائل اور سکھوں کے مظالم پوری دلسوزی سے بیان کیے جانے لگے، ساتھ ہی سید احمد صاحب بریلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) کی وہ شان بیان کی جانے لگی کہ لوگوں کی عقلیں حیران رہ جاتیں۔ جملہ اولیائے کرام سے انھیں بڑھایا گیا بلکہ صاحبِ عصمت و وحی ٹھہرا کر انبیاء کی صف میں بٹھایا گیا۔ سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مشابہ اور باری تعالیٰ شانہٗ سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہونا سنایا گیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ تک صعود اور اس سے مصافحہ ولین دین کی کہانیاں گھڑ کر سنائی گئیں، صراط المستقیم کتاب لکھ کر اس میں یہ جملہ فضائل وکمالات درج کر کے، متبعین کے دلوں اور دماغوں میں سید احمد صاحب کی شانِ یکتائی کا تصور پیدا کر کے ان کا پجاری بنایا گیا۔

۔ سید احمد صاحب نے بھی اپنے منصب کا پوری طرح لحاظ رکھا۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور مولوی عبد الحی دہلوی ان کی جو صفات بیان کرتے، جس مقام پر انھیں بٹھاتے جاتے، یہ کمال دانشمندی سے اس کے مطابق پیشین گوئیاں اور بشارتیں داغتے رہتے۔ مکانوں اور سمندروں کی روحیں موصوف سے اسی لیے باتیں کرنے لگ جاتیں، جنات حاضر ہوتے، اولیائے متقدمین تشریف لا کر نوازتے، انبیائے کرام بشارتیں سنانے آتے، مقدس

ہستیاں آکر غسل دیتیں اور کپڑے پہنانے کی خدمات انجام دے جاتیں۔ پنجاب کا بادشاہ بننے کی خوشخبری بھی سُناتے نیز افغانستان کا نفاق، چین کا کفر اور ہندوستان کا شرک اپنی زندگی میں مٹانے کی بشارت بھی بالہامِ خداوندی سُناتے اور اُس پر حلف اٹھاتے تھے۔ غرضیکہ تالیفِ قلوب اور اجتماعِ جمعیت کا وُہ کون ساخانہ ساز روحانی حربہ تھا جو کام میں لایا نہ گیا ہو۔ علمی باتوں پر ٹوکا جاسکتا ہے۔ دلیل اور ثبوت کا مطالبہ سخت دشواری میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن روحانی معاملات کا چکّر، ایک پنتھ دو کاج، جمعیت حاضر اور ثبوت خارج از بحث۔ یعنی آم کے آم گٹھلیوں کے دام، ہلدی لگی نہ پھٹکڑی، حکومت نے ولایت و نبوت چپکے سے عطا کر دی۔ بس تدریجی مراحل طے کرنے تھے اور ہر مقام کے حصول کا مرزا غلام احمد قادیانی (المتوفی ۱۹۰۸ء) کی طرح بتدریج اعلان کرتے جا رہے تھے لیکن منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پہلے راستے میں ہی بالاکوٹ کا ایسا مقام آگیا کہ یہ منصوبہ وہیں دفن ہو کر رہ گیا اور مرزا غلام احمد صاحب ہی وُہ فردِ واحد نکلے جو برٹش گورنمنٹ کے اِس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے ورنہ کتنے ہی سید احمد صاحب جیسے خواہشمند حضرات منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی راہیِ ملکِ عدم ہوتے رہے۔

سیّد احمد صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کے دونوں منصوبے ایک دُوسرے کے سراسر خلاف ہیں۔ پہلی تحریک جو شرک و بدعت کے خلاف بتائی جاتی ہے اُس کی وجہ یہی ظاہر کی گئی کہ مسلمان اکابر پرستی اور شرک میں گرفتار تھے۔ لیکن اِن مصلح کہلانے والوں نے دُوسری تحریک میں سید احمد صاحب کی پرستش کا وُہ اہتمام کیا جس کی نظیر اُن کے اصطلاحی مشرکوں میں بھی نہیں پائی جاتی تھی۔ سیّد احمد صاحب کو صاحبِ وحی عصمت بتایا جا رہا تھا باری تعالیٰ شانہ، تک صعود اور اُس کی ہمکلامی کے شرف سے موصوف کو مشرف بتایا جاتا تھا۔ حالانکہ شریعتِ مطہرہ کی رُو سے کسی کے بارے میں ایسی باتوں کا عقیدہ رکھنا، اُسے نبی ماننے کا مترادف ہے۔ اِن حضرات کے پہلے منصوبے کی ترجمان "تقویۃ الایمان" ہے اور دُوسرے منصوبے کا صحیفہ "صراط المستقیم" کو بنایا گیا۔ یہ دونوں کتابیں اگر انصاف کی نظر سے دیکھی جائیں تو صاف دکھائی دے گا کہ دونوں ایک دُوسرے کے خلاف ہیں۔

دوسرا منصوبہ تو مکمل طور پر ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں دفن ہوگیا، کیونکہ جب نبی بننے والا ہی نہ رہا تو آگے بات کیسے چلتی۔ پہلے منصوبے کے اثرات تقویۃ الایمان کتاب کی بدولت باقی رہ گئے کہ مٹتے مٹاتے بھی موصوف اِس فتنے کی چنگاری دہلی و کلکتہ میں چھوڑ ہی گئے۔ تقویۃ الایمان کے سنِ تالیف کے بارے میں غلام رسول مہر کی تحقیق یہ ہے:

"یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ تقویۃ الایمان کس زمانے میں لکھی گئی۔ اِس میں ایک مقام پر کعبہ مقدسہ کے صحن کا منظر پیش کیا گیا ہے، جس سے دل پر اثر پڑتا ہے کہ یہ منظرِ چشم دید ہے، لہٰذا سمجھا جاسکتا ہے کہ کتاب سفرِ حج سے واپس آکر لکھی گئی۔ مُلّا صاحب بغدادی نے بعض اصحاب کی انگیخت سے تقویۃ الایمان پر کچھ اعتراضات کیے تھے۔ شاہ شہید نے اُس کے جواب میں ایک خط کانپور سے لکھا تھا، جس پر ۱۲۴۰ھ درج ہے۔ اِس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب سفرِ حج سے مراجعت پر ۱۲۴۰ھ کے اوائل میں لکھی گئی۔ اُس زمانے میں شاہ شہید ہمہ تن دعوتِ تنظیم و جہاد کے لیے وقف ہوچکے تھے اور ۷ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۱ھ کو وہ جہاد کے لیے روانہ ہوگئے۔"[1]

کیا ہی اچھا ہوتا کہ جناب غلام رسول مہر سنِ تصنیف کے بارے میں یوں تصریح کرتے کہ ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ کو جامع مسجد دہلی میں سارے ولی اللّٰہی خاندان اور شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) کے خوشہ چین علمائے دہلی نے علمبردارانِ وہابیت و خارجیت سے جو مناظرہ و مباحثہ کیا تھا، تقویۃ الایمان اُس سب سے پہلے حنفی وہابی مناظرے سے کچھ عرصہ پہلے لکھی گئی تھی کیونکہ دورانِ مباحثہ اِس رسالے کا ذکر بھی آیا تھا۔ لیکن موصوف ایسی تصریح کرنے سے جملہ وہابی مورّخین و علماء کی طرح کیوں گریز نہ کرتے جبکہ اُنھوں نے اِس خارجیت کے ڈانڈے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء) نیز شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/

---

[1] غلام رسول مہر: مقدمہ تقویۃ الایمان، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ص ۲۱، ۲۲

۱۶۲۴ء) بلکہ حضرت امامِ ربّانی شیخ احمد سرہندی قدس سرّہٗ (المتوفی ۱۰۳۴ھ/ ۱۶۲۴ء) سے ملانے کی دھاندلی بڑے اہتمام سے مچائی ہے۔ اِس کی اشاعت کے بارے میں موصوف یُوں رقمطراز ہیں:

"تقویۃ الایمان جس کے نئے ایڈیشن کے تعارف میں یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں، پہلی مرتبہ ۱۲۴۳ھ/ ۲۷-۱۸۲۶ء) میں چھپی تھی، جب شاہِ شہید، امیرالمومنین سیّد احمد بریلوی اور جماعت مجاہدین کے ہمراہ وطنِ مالوف سے ہجرت کر کے جا چکے تھے اور ہندوستان کی آزادی و تطہیر کے لیے جہاد بالسیف کا آغاز ہو چکا تھا۔"[1]

واقعی غلام رسول مہرؔ صاحب بڑی دُور کی کوڑی لائے ہیں کیونکہ ہندوستان کی آزادی و تطہیر کے لیے اِس طرح کا جہاد بالسیف تو نظام اور مرہٹے بھی کر چکے تھے۔ جب وُہ انگریزوں کے دست و بازو بن کر کئی دفعہ شیرِ دکن سلطان فتح علی ٹیپو شہید پر چڑھ دوڑے تھے۔ اِس تحریکِ جہاد کی حقیقت اِسی کتاب کے تیسرے اور چوتھے باب میں ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہے۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی حکمتِ عملی بھی دیدنی ہے کہ جب تک دہلی میں رہے تو وہابیت کے لیے میدان ہموار کرتے رہے اور جب جہاد کے نام سے مغربی ہند کی سرحد پر پہنچ گئے اُس وقت تقویۃ الایمان کو شائع کروایا گیا، تاکہ اِس کی اشاعت سے جو آگ بھڑکتی ہے وُہ عدم موجودگی میں بھڑکے اور مصنف مواخذے سے محفوظ رہے۔ مولوی عبدالشاہد خاں شروانی نے تقویۃ الایمان کی تفریط کے بارے میں اپنے خیالات یُوں ظاہر کیے:

"مسلمانوں کی شدّتِ مخالفت کی بنا پر قدرتی طور پر شاہ صاحب کا جذبۂ اصلاح غلو کی شکل اختیار کر گیا۔ ایک طرف تفریط تھی تو دُوسری جانب افراط۔ شاہ اسمٰعیل صاحب نے مسلمانوں کی ہر غلط روی کو شرک سے تعبیر کرنا شروع کیا ..... وعظ و تبلیغ کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔

---

[1] غلام رسول مہرؔ، مقدمہ تقویۃ الایمان، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ص ۱۶

۱۰۲۴ء) بلکہ حضرت امامِ ربانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ (المتوفی ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء) سے ملانے کی دھاندلی بڑے اہتمام سے مچائی ہے۔ اِس کی اشاعت کے بارے میں موصوف یُوں رقمطراز ہیں:

> ”تقویۃ الایمان جس کے نئے ایڈیشن کے تعارف میں یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں، پہلی مرتبہ ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۶-۲۷ء) میں چھپی تھی، جب شاہِ شہید، امیرالمومنین سید احمد بریلوی اور جماعت مجاہدین کے ہمراہ وطنِ مالوف سے ہجرت کر کے جا چکے تھے اور ہندوستان کی آزادی و تطہیر کے لیے جہاد بالسیف کا آغاز ہو چکا تھا۔“[1]

واقعی غلام رسول مہر صاحب بڑی دُور کی کوڑی لائے ہیں کیونکہ ہندوستان کی آزادی و تطہیر کے لیے اِس طرح کا جہاد بالسیف تو نظام اور مرہٹے بھی کر چکے تھے۔ جب وُہ انگریزوں کے دست و بازو بن کر کئی دفعہ شیرِ دکن سلطان فتح علی ٹیپو شہید پر چڑھ دوڑے تھے۔ اِس تحریکِ جہاد کی حقیقت اِسی کتاب کے تیسرے اور چوتھے باب میں ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہے۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی حکمتِ عملی بھی دیدنی ہے کہ جب تک دہلی میں رہے تو وہابیت کے لیے میدان ہموار کرتے رہے اور جب جہاد کے نام سے مغربی ہند کی سرحد پر پہنچ گئے اُس وقت تقویۃ الایمان کو شائع کروایا گیا، تاکہ اِس کی اشاعت سے جو آگ بھڑکتی ہے وُہ عدم موجودگی میں بھڑکے اور مصنف مواخذے سے محفوظ رہے۔ مولوی عبدالشاہد خاں شروانی نے تقویۃ الایمان کی تفریط کے بارے میں اپنے خیالات یُوں ظاہر کیے:

> ”مسلمانوں کی شدّتِ مخالفت کی بنا پر قدرتی طور پر شاہ صاحب کا جذبۂ اصلاح غلو کی شکل اختیار کر گیا۔ ایک طرف تفریط تھی تو دُوسری جانب افراط۔ شاہ اسمٰعیل صاحب نے مسلمانوں کی ہر غلط روی کو شرک سے تعبیر کرنا شروع کیا ...... وعظ و تبلیغ کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔

---

[1] غلام رسول مہر، مقدمہ تقویۃ الایمان، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ص ۱۶

پہلے عربی میں، پھر اُردو میں تقویۃ الایمان لکھی۔ اُس میں حدِّ اعتدال سے تجاوز کیا گیا۔ اِس کا خود مصنّف کو بھی احساس تھا۔"[1]

مولانا وکیل احمد سکندرپوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی   ) نے مصنف تقویۃ الایمان کے بارے میں اپنے تاثرات یوں قلمبند کیے:

"جب سے اِسلام ہندوستان میں آیا، قریب ہزار برس ہُوئے، کبھی ایسا ترکِ تقلید وجدال فی الدین کا چرچا نہ تھا۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی یہ بلا دینِ اسلام پر لائے۔"[2]

مولانا مفتی سیّد عبدالفتاح، اشرف علی گلشن آبادی نے تقویۃ الایمان کی پہلی اشاعت کے سنِ طباعت وغیرہ کے ساتھ تقویۃ پر یوں تبصرہ کیا ہے:

"کتاب تقویۃ الایمان مؤلفہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی، شہر کلکتہ میں مطبع احمدی باہتمام سیّد عبداللہ بن سیّد بہادر علی ۱۲۴۲ھ میں مطبوع ہوئی ہے۔ مضمونِ شرک و بدعت کے دُور کرنے کے واسطے جو آیات بُتوں کی شان میں اَور بُت پرستوں کے واسطے نازل ہُوئی ہیں، سو انبیاء و اولیاء کی شان میں لکھیں اور مسلمانانِ اہلسنّت وجماعت و مقلدینِ ائمۂ اربعہ، عام وخاص سب کو مشرک و بدعتی کہہ دیا اور فاتحۂ اموات و زیارت، دہم، چہلم، نذر و نیاز کو باطل کہا اور اعتقاد میں اہلِ سنّت و جماعت کے بہت سی بدعتیں داخل کردیں اور (ابنِ) عبدالوہاب نجدی کی کتاب التوحید کا سارا ترجمہ شرح و بسط سے کیا۔ غیب اضافی کو غیب مطلق بنایا اور اہانت و حقارتِ انبیاء و اولیاء بدرجۂ کمال پہنچایا۔ ۱۲۵۱ھ میں شہر مدراس کے نواب والاجاہ کے حضور میں مجمعِ علماء کے درمیان مفتی صبغۃ اللہ

---

[1] عبدالشاہد خاں شروانی، مولوی: باغی ہندوستان، ص ۱۱۴

[2] وکیل احمد سکندرپوری، مولانا: وسیلہ جلیلہ، مطبع مصطفائی، ۱۳۰۱ھ، ص ۱۰۴

"قاضی الملک اور افضل العلماء محمد ارتضا علی خاں مفتیِ صدر عدالت سرکار مدراس نے مولوی محمد علی رامپوری خلیفۂ سیّد احمد سے کتاب مذکور میں چند مقامات پر مباحثہ کیا اور معتقد مذکور کو کافر ثابت کر دیا اور اُس مباحثے کی حقیقت اور استفتاء "تحفہ محمدیہ" کے صفحہ ۱۵ میں مرقوم ہے۔"[1]

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی تو سکھوں سے جہاد کرنے کا نام نہاد اعلان کرتے ہوئے ۱۲۴۱ھ میں صوبہ سرحد کی طرف چلے گئے۔ موصوف کی عدم موجودگی میں تقویۃ الایمان کا انگریز کی راجدھانی یعنی شہر کلکتہ سے ۱۲۴۲ھ میں شائع ہونا بلکہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے لاکھوں کی تعداد میں انگریزوں نے تقویۃ الایمان شائع کی اور پورے ہندوستان میں جہاں تک انگریز اُسے پہنچا سکتے تھے وہاں تک مفت پہنچاتے رہے۔ کیا یہ افسوسناک صورتِ حال اہلِ فکر و نظر کے لیے لمحۂ فکریہ نہیں ہے؟ دہلی کے ایک نیم مولوی کی تصنیف اور اُس کی نشر و اشاعت ایسٹ انڈیا کمپنی کرے، آخر کیوں؟ قاضی احسان الحق نعیمی مرحوم نے متحدہ ہندوستان میں اِس خارجیت کی تخم ریزی کے بارے میں لکھا ہے:

"یہ وبا سرزمینِ نجد سے اُٹھی۔ صحیح بخاری شریف کی حدیث میں حضورِ سیدِ انبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صدہا سال پہلے اِس کی خبر دی تھی۔ وُہ آگ بھڑکی، وہ فتنہ پیدا ہُوا اور عبد الوہاب نجدی کے گھر سے نکل کر عرب کے بعض مقامات میں پہنچا، وہیں سے ردّ کیا گیا۔ کسی سرزمین نے اِسے قبول نہ کیا۔ حجاز میں اِس کے قدم نہ جمے، عراق و یمن نے اِس کو جگہ نہ دی، کُوفہ و بصرہ میں، مصر و شام میں، ترکی و ایران میں، غرض دنیا کے کسی مقام میں، کسی قلمرو اور کسی ولایت میں اِس فتنہ کو دخل نہ ہُوا اور اِس تلخ تخم کو کسی سرزمین نے قبول نہ کیا۔ نجد کے چھوٹے اور خشک اور بے رونق خطہ کے چند خشک دماغ، درندہ صفت انسانوں کے دماغ میں وہابیت کا

---

[1] عبد الفتاح اشرف علی گلشن آبادی، مفتی: جامع الفتاویٰ، جلد دوم، ص ۶۱

تخیل گھومتا رہا۔ مگر افسوس کہ جو چیز دنیا کے ہر خطہ نے ٹھکرا دی تھی اُس کو ہندوستان میں جگہ ملی، اُس کا تخم دلّی میں لگایا گیا اور وُہ جب کچھ پھُوٹا تو اُس کو دیوبند میں تربیت کیا گیا۔ وہاں وہ اِس قدر بڑھا کہ اُس کی شاخیں ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئیں اور اُن سے اِس ملک کی فضا مسموم ہوگئی اور اُس کے زہریلے اثر نے ملک کے بہت سے نونہالوں کو برباد کر دیا اور فساد کی آگ لگا دی۔ زمانے گزر گئے مگر یہ فتنہ دفع نہ ہُوا۔"[1]

موافقین یا مخالفین کی آراء پیش کرنے کے بجائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ خود مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے اپنے تاثرات تقویۃ الایمان کے بارے میں پیش کر دیے جائیں۔ چنانچہ موصوف کا ایک بیان یُوں نقل کیا گیا ہے:

"میں جانتا ہُوں کہ اِس (تقویۃ الایمان) میں بعض جگہ ذرا تیز الفاظ بھی آگئے ہیں، بعض جگہ تشدد بھی ہوگیا ہے مثلاً اُن امُور کو جو شرک خفی ہیں، شرک جلی لکھ دیا ہے۔ اِن وجوہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ شورش ضرور پھیلے گی۔"[2]

دیوبندی حضرات کے حکیم الامت یعنی مولوی اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی مصنف تقویۃ الایمان کے بارے میں یُوں وضاحت کرتے ہیں:

"مولوی اسمٰعیل شہید موحّد (وہابی غیر مقلّد) تھے۔ چونکہ محقق تھے، چند مسائل میں اختلاف کیا اور مسلکِ پیرانِ خود مثل شیخ ولی اللہ وغیرہ پر انکار فرمایا۔"[3]

---

[1] ماہنامہ السواد الاعظم، مراد آباد: بابت شعبان ۱۳۴۹ھ، ص ۱۴، ۱۵

[2] عبد الشاہد خاں شروانی، مولوی: باغی ہندوستان، ص ۱۵۱

[3] اشرف علی تھانوی، مولوی: امداد المشتاق، ص ۹۷

قارئین کرام! آپ نے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا اعتراف ملاحظہ فرمایا کہ موصوف نے شرکِ خفی کو شرکِ جلی ٹھہرایا تھا۔ آخر کیوں؟ کیا یہ مداخلت فی الدین نہیں؟ کیا کوئی شرعی احکام کی حقیقت بدلنے کا مجاز ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے ایسا کیوں کیا تھا، اِس کا صاف سیدھا جواب یہی ہے کہ موصوف نے خوارج کے مذہب کو قبول کر لیا تھا اور خارجیت کا خاصہ یہی ہے کہ خارجی و نجدی عینک لگا کر دیکھنے سے سارا جہان مشرک ہی مشرک نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی تھانوی صاحب کی تصریح بھی ملاحظہ فرمائی کہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا مسلک اپنے خاندانی بزرگوں یعنی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی و شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہما کے مسلک کے خلاف تھا، لیکن کہاں تک داد دی جائے اُن حضرات کے دین و دیانت کی، جو مصنّف تقویۃ الایمان اور اُن کے متبعین کو ولی اللّٰہی مکتبۂ فکر والے بتاتے ہیں۔ چنانچہ وہابی مفکّر ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

> ”شاہ ولی اللہ صاحب کی وفات پر پُوری نصف صدی بھی نہ گزری تھی کہ ہندوستان میں ایک تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی جس کا نصب العین وہی تھا جو شاہ صاحب نگاہوں کے سامنے روشن کر کے رکھ گئے تھے۔ سیّد صاحب کے خطوط اور ملفوظات اور شاہ اسمٰعیل شہید کی منصبِ امامت، عبقات، تقویۃ الایمان اور دُوسری تحریریں دیکھیے۔ دونوں جگہ وہی شاہ ولی اللہ صاحب کی زبان بولتی نظر آتی ہے۔“[1]

جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، جو کسی کے مقلد ہونے کے روادار نہیں بلکہ اپنی تحقیق کی بنیاد پر عقاید و نظریات کی عمارت تعمیر کیا کرتے ہیں۔ جو محقق، مفکّرِ اسلام، نابغۂ عصر اور عبقریِ اسلام تک مشہور کیے جاتے ہیں لیکن یہاں آ کر اُن کی تحقیق و عبقریت کیوں لیلیٰ نجد کے مزار کی بھینٹ چڑھ گئی؟ کیا واقعی سیّد احمد صاحب کے خطوط کی طرح شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کو پھنسانے کے لیے جھوٹی پیشگوئیاں سنائی تھیں؟ کیا

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی: تجدید احیائے دین، بار ہشتم، ص ۱۱۴

صراط المستقیم کتاب کے مندرجات کی طرح شاہ صاحب نے بھی وحی و عصمت کا دعویٰ کیا تھا، یا خدا تک صعود اور اُس سے ہمکلام ہونے، مصافحہ کرنے اور لین دین کرنے کے مدعی ہُوئے تھے؟ کیا شاہ صاحب نے اپنی تصانیف میں شرکِ خفی کو شرکِ جلی ٹھہرا کر مسلمانوں کو مشرک بتانے کی مہم چلائی تھی؟ اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو ہم مؤدبانہ عرض کرتے ہیں کہ ایسے بیانات سے حقیقت ہرگز نہ بدل سکے گی۔ دنیائے دنی میں آپ حضرات پروپیگنڈے کے زور پر اگر مسلمانوں کی اکثریت سے ایسا ہی منوا بھی لیں تو حاصل کیا ہوا؟ کیا جب بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہو کر جواب دینا پڑے گا اُس وقت یہ حربے کام آسکیں گے؟ کیا یہ دھاندلی وہاں بھی چل سکے گی؟ موصوف آگے اِن ساختہ مصلحین کے بارے ہیں یوں رقمطراز ہیں:

> "سیّد صاحب اور شاہ اسمٰعیل صاحب دونوں روحاً و معناً ایک وجود رکھتے ہیں اور اِس وجود متحد کو میں مستقل بالذات مجدّد نہیں سمجھتا، بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تجدید کا تتمہ سمجھتا ہُوں۔"[1]

سمجھنے کو مودودی صاحب جو چاہیں سمجھیں لیکن اتنی وضاحت کرنے کا حق ہمیں بھی از روئے ترعِ حاصل ہے کہ مسلمانوں کے دین کی تجدید کرنے والے کا گروہ اہلسنت و جماعت سے ہونا ضروری ہے کیونکہ مَا اَنَا عَلَیْهِ وَ اَصْحَابِیْ کی مصداق یہی جماعت ہے اور اِتَّبِعُوا لسَّوَادُ الْاَعْظَمَ اِسی کے متعلق فرمایا گیا تھا اور اِس سے جُدا ہونے والوں کے حق میں انَّهٗ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ سنایا گیا ہے۔ دریں حالات مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی جو ارجیت کے مبلّغ اور زمرۂ اہلسنت و جماعت سے علیحدہ ہو گئے تھے وہ مسلمانانِ اہلسنّت جماعت کے مجدّد ہرگز نہیں ہو سکتے، ہاں اپنی جماعت میں وُہ مرزا غلام احمد قادیانی کی رح مجدّد بنائے جائیں یا نبی، مسلمانوں کا اُن کی تجدید سے کوئی علاقہ نہیں کیونکہ موصوف نے پنے آبا و اجداد کے مذہب اور ناجی گروہ سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا۔ یہ اُن کا اپنا

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا: تجدید و احیائے دین، بار ہشتم، ص ۱۱۵

فیصلہ تھا اور خود وُہ ناجی گروہ سے علیحدہ ہُوئے تھے۔

بہر حال مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے جب اِس خارجیت یعنی محمد ابن عبد الوہاب نجدی کی وہابیت کو تقویۃ الایمان کے ذریعے اَور اِس منظرِ عام پر آنے سے پہلے تقاریر میں اِس کے بعض مضامین بیان کرنے شروع کیے تو علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) نے جملہ علمائے کرام کے دوش بدوش بلکہ پُوری سرگرمی سے موصوف کا محاسبہ کرنا شروع کیا، تاکہ یہ فتنہ یہیں دب جائے اور مسلمانانِ اہلسنت وجماعت اِس بلائے ناگہانی سے محفوظ رہیں۔ اِسی لیے علمی میدان میں آپ نے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا ناطقہ بند کر دیا۔

مولانا نسیم احمد امروہی اِس سلسلے میں یُوں لکھتے ہیں:

> "مولانا خیر آبادی نے ایک رسالہ اِس سلسلے میں لکھا اور ایک معقولی عالم کی حیثیت سے معقول انداز میں تقویۃ الایمان کے بعض مضامین پر اعتراضات کیے۔ اُس رسالے میں نہ تو ذوقِ کفر سازی کی تسکین تھی، نہ سبّ وشتم، صرف اپنے تاثرات کو پیش کیا گیا تھا۔"[1]

کاش! موصوف نے جوشِ عقیدت میں حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کی ہوتی۔ آخر بھولے بھالے مسلمانوں کو صحیح صورتِ حال سے بے خبر رکھنا بلکہ واقعات کو اُن کے برخلاف دکھانے میں دین کی کون سی خدمت اور آخرت کے مفاد کا کون سا راز مضمر ہے۔ علّامہ فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمہ نے جن لفظوں میں مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے بارے میں حکمِ شرع بیان فرمایا وُہ تین سوالوں کے مندرجہ ذیل جوابات سے واضح ہے:

> "جواب سوالِ اوّل ایں است کہ کلامِ قائل مذکور سرتا پا کذب و زور و فریب و غرور است۔ چہ اُو نفی سبب بُودن شفاعت برائے نجاتِ گنہگاراں و نفی شفاعتِ وجاہت و شفاعتِ محبت از آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم و حضرات سائرِ انبیاء و ملائکہ و اصفیا میکنند، ایں اعتقادِ اُو

---

[1] ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ: بابت رمضان المبارک، ۱۳۶۷ھ، ص ۵

خلافِ کتابِ مبین و احادیث سید المرسلین و اجماعِ مسلمین است کما اثبت فی مقام الاوّل مفصّلا وقد بان بطلان بعض کلماته فی المقام الثانی معلّلا۔

جواب سوالِ دوم این است کہ کلامِ اُو بلا تردّد و اشتباہ بر استخفافِ منزلت و جاہ آں سرور، مقربان بارگاہِ حضرتِ الٰہ و انتقاص شانِ سائرِ انبیاء و ملائکہ و اصفیا و شیوخ و اولیاء، اشتمال و دلالت دارد۔ چنانچہ در مقامِ ثالث مذکور و فیما سبق مبرہن و مسطور است۔

جواب سوالِ ثالث این است کہ قائل این کلامِ لاطائل از روئے شرعِ مبین بلاشبہ کافر و بے دین ست، ہرگز مومن و مسلمان نیست و حُکم اُو شرعاً قتل و تکفیر است و ہر کہ در کفرِ اُو شک آرد یا تردّد دارد یا این استخفاف را سہل انگارد، کافر و بے دین و نامسلمان و لعین است، الّا در کفر و بے دینی کمتر ہست۔ از کسیکہ این کلام را از عقائدِ ضروریۂ دین شمارد، آنکس در کفر با قائل ہمسر بلکہ در استخفاف از و بالاتر است۔" ملخصاً (از تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ)[1]

قارئین کرام کی معلومات کے لیے یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہُوں کہ مولانا فضل حق یرآبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء) کی جلالتِ علمی کا کچھ تذکرہ کر دیا جائے۔ نانچہ موصوف کے بارے میں سر سیّد احمد خاں صاحب لکھتے ہیں:

"مستجمع کمالاتِ صوری و معنوی، جامعِ فضائل ظاہری و باطنی، بنّاءِ بناءِ فضل و افضال، بہار آرائے چمنستانِ کمال۔ متکئ اصابت رائے، مسند نشینِ دیوانِ افکار رسائے، صاحبِ خُلقِ محمدی، موردِ سعادت ازلی و ابدی، حاکمِ محاکمِ مناظرات، فرمانروائے کشورِ محاکمات، عکسِ آئینۂ

---

[1] ضلِ رسول بدایونی، مولانا: سیف الجبّار، مطبوعہ کانپور، ص ۵۹، ۶۰

صافی ضمیری، ثالثِ اثنین بدیعی و حریری، المعیِ وقت و موزعیِ اوان، فرزوقِ عہد و لبیدِ دوران، مُبطلِ باطل و محققِ حق، مولانا محمد فضل حق۔ یہ حضرت خلف الرشید ہیں جناب مستطاب مولانا فضل امام غفر اللہ لہٗ المنعام کے اَور تحصیلِ علومِ عقلیہ اَور نقلیہ کی اپنے والدِ ماجد کی خدمت بابرکت میں کی ہے۔ زبانِ قلم نے اِن کے کمالات پر نظر کر کے فخرِ خاندان لکھا اور فکرِ دقیق نے جب سرکار کو دریافت کیا، فخرِ جہاں پایا۔

جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا انھیں کی فکرِ عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علمائے عصر بلکہ فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اِس گروہِ اہلِ کمال کے حضور میں بساطِ مناظرہ آراستہ کر سکیں۔ بارہا دیکھا گیا کہ جو لوگ آپ کو یگانۂ فن سمجھتے تھے، جب اِن کی زبان سے ایک حرف سُنا، دعویٰ کمال کو فراموش کر کے نسبتِ شاگردی کو اپنا فخر سمجھتے۔ بایں ہمہ کمالاتِ علم و ادب میں ایسا عَلَمِ سرفرازی بلند کیا کہ فصاحت کے واسطے اِن کی عبارت شُستہ محضرِ عروجِ معارج ہے اور بلاغت کے واسطے اِن کی طبعِ رسا وسناویزِ بلندیٔ معارج ہے۔ سحبان کو اِن کی فصاحت سے سرمایۂ خوش بیانی اور امراء القیس کو اِن کے افکارِ بلند سے دستگاہِ عروج۔ معانیٔ الفاظ پاکیزہ اِن کے رشکِ گوہرِ خوش آب اور معانیٔ رنگین اِن کے غیرتِ لعل ناب۔ سرو اِن کی سطورِ عبارت کے آگے پابہ گِل اور گُل اِن کی عبارت رنگین کے سامنے خجل۔“ [1]

مولانا رحمٰن علی مصنف تذکرہ علمائے ہند نے علّامہ فضل حق خیر آبادی کے تذکرہ میں یہ بھی لکھا

”در علومِ منطق و حکمت و فلسفہ و ادب و کلام و اصول و شعر فائق الاقران و استحضارے فوق البیان داشت۔“ [2]

---

[1] سر سیّد احمد خاں: آثار الصنادید، ص ۵۶۲، ۵۶۳

[2] رحمٰن علی، مولانا: تذکرہ علمائے ہند فارسی، ص ۱۶۴

اِس عبارت کا ترجمہ پروفیسر محمد ایّوب قادری نے یُوں کیا ہے:

"علومِ منطق، حکمت، فلسفہ، ادب، کلام، اصول اور شاعری میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔"[1]

پروفیسر صاحب مذکور اِسی کے حاشیے میں علّامہ مرحوم کے بارے میں یُوں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

"مولانا فضلِ حق خیرآبادی علومِ معقول کے امام تھے ...... جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضلِ حق نے مردانہ وار حصّہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خاں کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ آخر میں گرفتار ہُوئے، مقدمہ چلا، بعبور دریائے شور کی سزا ہُوئی۔ جزیرہ انڈمان بھیجے گئے۔ وہیں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء میں انتقال ہُوا۔"[2]

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے چچازاد بھائی یعنی مولانا مخصوص اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۵ء) بن شاہ رفیع الدین محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء) نے مصنفِ تقویۃ الایمان کا ڈٹ کر ردّ کیا۔ جامع مسجد دہلی کے تاریخی مباحثے میں پُرزور حصّہ لیا اور وہاں بھی اسمٰعیل صاحب سے برملا کہا کہ آپ نے جو اپنے خاندانی مذہب کے خلاف یہاں محمد بن عبدالوہاب نجدی کی بے دینی کو رائج کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے، اس حرکتِ قبیحہ سے باز آجانا چاہیے، کیوں اپنے اکابر کے کارناموں پر پانی پھیرنے اور ننگِ خاندان بننے کی ٹھان لی ہے؟ لیکن مصنفِ تقویۃ الایمان موقع پر اُدھر اقرار کرلیتے مگر پرنالہ اُس کی جگہ سے ذرا نہیں ہٹاتے تھے۔

چونکہ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) نے فرمایا تھا کہ میں ضعفِ بصارت سے معذور ہُوں ورنہ "کتاب التوحید" کا ردّ اُسی شرح وبسط سے

---

[1] محمد ایوب قادری، پروفیسر: تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۳۸۲

[2] ایضاً: ص ۳۸۳

لکھنا چاہتا ہوں جس طرح روافض کے ردّ میں کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" لکھی ہے۔ شاہ صاحب تو کتاب التوحید کا ردّ نہ لکھ سکے کیونکہ بصارت ہی جواب دے گئی تھی اور اِس کے بعد پیغامِ اجل آپہنچا تھا، لیکن سفرِ آخرت سے پہلے اِتنا ضرور کر گئے کہ مصنّفِ "تقویۃ الایمان" کو اپنی وراثت و خلافت سے محروم کر گئے تھے۔ آپ کی آنکھیں بند ہوئی تھیں کہ "کتاب التوحید" نے "تقویۃ الایمان" کا رُوپ دھار لیا اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش کو اُن کے دُوسرے بھتیجے شاہ مخصوص اللہ بن شاہ رفیع الدین نے اِس طرح پُورا کیا کہ تقویۃ الایمان کے ردّ میں "مُعید الایمان" شرح و بسط سے لکھی اور تقویۃ الایمان کے مندرجات کو اسلام کے خلاف اور اپنے خاندانی معتقدات و مسلک اہلسنت و جماعت کے خلاف ایک چیلنج ثابت کیا۔ علمائے خاندانِ دہلی اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی وارثوں نے "معید الایمان" کی تصدیق و تائید کر کے تقویۃ الایمان کے نظریات سے اپنی براُت کا اظہار کیا تھا۔ مولانا بدر الدین احمد صاحب نے مولانا شاہ مخصوص اللہ دہلوی علیہ الرحمہ کی اِن کاوشوں کا یُوں تذکرہ کیا ہے:

> "شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی کے بھتیجے اور شاگرد، مولانا شاہ مخصوص اللہ محدّث دہلوی اور مولانا شاہ محمد مُوسیٰ دہلوی، جو مولانا شاہ رفیع الدین کے صاحبزادے اور شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کے پوتے اور خود مولوی اسمٰعیل دہلوی کے چچازاد بھائی تھے، اُٹھ کھڑے ہُوئے اور مولوی اسمٰعیل کے عقائدِ باطلہ اور اُن کی وہابیتِ فاسدہ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مولوی اسمٰعیل کے ردّ میں فتاوٰی اور رسالے مرتب کیے جن میں مولوی اسمٰعیل کو ان کے عقائد باطلہ کے باعث گمراہ اور کافر قرار دیا اور حق آشکارا کرنے میں رشتۂ خاندانی کا کوئی پاس و لحاظ نہ کیا۔ حضرت مولانا شاہ مخصوص اللہ محدث دہلوی نے خاص تقویۃ الایمان کے رد میں "مُعید الایمان" لکھ کر واضح کر دیا کہ مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کا علمی و نسبی گھرانہ وہابیت نیز تقویۃ الایمان سے متنفر و بیزار ہے"[1]

---

[1] بدر الدین احمد، مولانا: سوانح اعلیٰحضرت، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۹۶۳ء، ص ۱۳۸، ۱۳۹

مولانا فضلِ رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) نے مولانا مخصوص اللہ دہلوی بن شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہما کی خدمت میں ایک خط ارسال کیا کہ اپنے چچازاد بھائی محمد اسمٰعیل دہلوی اور اُن کی تصنیف "تقویۃ الایمان" کے بارے میں کیا خیال ہے؟ یہ کتاب آپ کے خاندانی معتقدات کے مطابق ہے یا مخالف؟ اپنے سات سوالات اور مولانا مخصوص اللہ دہلوی علیہ الرحمٰن کے جواب کو موصوف نے اپنی کتاب "تحقیق الحقیقت" کے صفحہ ۲۴ پر درج کیا اور اُسے ۱۲۶۷ھ میں بمبئی سے شائع کروایا۔ مولانا مخصوص اللہ دہلوی اِس کتاب کی اشاعت کے بعد پانچ چھ سال بحیات رہے لیکن مولانا فضلِ رسول بدایونی نے اُن کے جوابات کو جن لفظوں میں شائع کیا تھا، اُن کے بارے میں مطلقاً کوئی بات ایسی منظرِ عام پر نہیں آئی کہ موصوف پر الفاظ میں کمی یا بیشی کرنے کا الزام لگایا گیا ہو۔ دریں حالات یہ جوابات شاہ مخصوص اللہ علیہ الرحمہ کی طرف منسوب ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہا۔ ہم وہ سوالات اور اُن کے جوابات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیے دیتے ہیں:

عریضہ

"بعد گزارش آداب تسلیمات کے عرض ہے کہ تقویۃ الایمان کے مشہور ہونے کے عرض ہے کہ تقویۃ الایمان کے مشہور ہونے کے وقت سے لوگوں میں بڑی نزاع ہے۔ مخالفین کہتے ہیں کہ وہ کتاب، خلاف ہے تمام سلف صالح اور سوادِ اعظم کے اور مخالف مصنّف کے خاندان کے اور اِس کتاب کی رُو سے اُن کے استادوں سے لے کر صحابہ تک کوئی کفر و شرک سے نہیں بچتا اور اُن کے مخالف لوگ کہتے ہیں کہ وہ کتاب موافق سلف صالح اور اُن کے خاندان کے ہے۔ چونکہ اِس بات کو جیسا آپ جانتے ہوں گے، غالب کہ دوسرا نہ جانتا ہوگا، اہل البیت ادری ما فی البیت۔ اِس خیال سے چند باتیں معروض ہیں۔ امید کہ جواب باصواب مرحمت ہو:

پہلا سوال: تقویۃ الایمان آپ کے خاندان کے موافق ہے یا مخالف؟

دوسرا سوال: لوگ کہتے ہیں کہ اِس میں انبیاء و اولیاء کے ساتھ بے ادبی

کی ہے ۔ اِس کا کیا حال ہے؟

تیسرا سوال: شرعاً اِس کے مصنّف کا کیا حکم ہے؟

چوتھا سوال: لوگ کہتے ہیں کہ عرب میں وہابی پیدا ہُوا تھا۔ اُس نے یہ نیا مذہب بنایا تھا۔ علمائے عرب نے اُس کی تکفیر کی۔ کیا تقویۃ الایمان اُس کے مطابق ہے؟

پانچواں سوال: وُہ کتاب التوحید جب ہندوستان آئی، آپ کے حضرت عمّ بزرگوار اور حضرت والد ماجد نے اُسے دیکھ کر کیا فرمایا تھا؟

چھٹا سوال: مشہور ہے کہ جب اِس مذہب کی نئی شہرت ہُوئی تو آپ جامع مسجد میں تشریف لے گئے اور مولوی رشید الدین خانصاحب وغیرہ تمام اہلِ علم آپ کے ساتھ تھے اور مجمعِ خاص وعام میں مولوی اسمٰعیل صاحب اور مولوی عبد الحی کو ساکت اور عاجز کیا۔ اِس کا کیا حال ہے؟

ساتواں سوال: اُس وقت آپ کے خاندان کے شاگرد اور مرید، اُن (اسمٰعیل دہلوی) کے طور پر تھے یا آپ کے موافق؟ اُمید ہے کہ جواب اِن سب مراتب کا صاف صاف مرحمت ہو کہ سبب ہدایت ناواقفوں کا ہے۔

جواب

پہلے بات کا جواب یہ ہے کہ تقویۃ الایمان کہ مَیں نے اس کا نام تفویۃ الایمان ساتھ فاء کے رکھا ہے۔ اُس کے ردّ میں جو رسالہ مَیں نے لکھا ہے اُس کا نام "مُعیدُ الایمان" رکھا ہے۔ اسمٰعیل کا رسالہ موافق ہمارے خاندان کے کیا کہ تمام انبیاء اور رسولوں کی توحید کے خلاف ہے کیونکہ پیغمبر سب توحید کے سکھانے کو اور اپنے راہ پر چلانے کو بھیجے گئے تھے۔ اُس کے رسالہ (تقویۃ الایمان) میں اِس توحید کا اور پیغمبروں کی سنّت کا پتہ بھی نہیں ہے۔ اُس میں شرک اور بدعت کی افراد گِن کر جو لوگوں کو سکھاتا ہے، کسی رسول اور اُن کے خلیفہ نے کسی کا نام لے کر شرک یا بدعت لکھا ہو،

اگر کہیں ہو تو اُس کے پیروؤں سے کہو کہ ہم کو بھی دکھاؤ۔

دُوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ شرک کے معنی ایسے کہتے ہیں کہ اُس کی رُو سے فرشتے اَور رسولِ خدا شرک کا حکم دینے والا ٹھہرتا ہے اور وُہ شریک کہ شرک سے راضی ہو وہ مبغوضِ خدا ہوتا ہے۔ محبوب کو مبغوض بنانا اور کہوانا ادب ہے یا بے ادبی ہے اور بدعت کے معنی وُہ بنائے پھیلائے ہیں کہ اصفیاء اولیا بدعتی ٹھہرتے ہیں۔ یہ ادب ہے یا بے ادبی ہے؟

تیسرے مطلب کا جواب یہ ہے کہ پہلے دونوں جوابوں سے دیندار اور سمجھنے والے کو ابھی کُھل جائے گا کہ جس رسالہ سے اَور اُس کے بنانے والے سے لوگوں میں بُرائی اور بگاڑ پھیلے اور خلاف سب انبیاء و اولیاء کے ہو، وُہ گمراہ کرنے والا ہو گا یا ہدایت کرنے والا ہو گا؟ میرے نزدیک اُس کا رسالہ عمل نامہ بُرائی اور بگاڑ کا ہے اور بنانے والا (یعنی مصنّف) فتنہ گر اَور مفسد اور خادی اور مُغوی ہے۔ سچ اور سچ یہ ہے کہ ہمارے خاندان سے دُو شخص ایسے پیدا ہُوئے کہ دونوں کو امتیاز اور فرقِ نیتوں اور حیثیتوں اَور اعتقادوں اَور اقراروں کا اور نسبتوں اور اضافتوں کا نہ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی بے پروائی سے سب چِھن گیا تھا۔ مانند قول مشہور کے "چوں فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی" ...... ایسے ہی ہو گئے۔

چوتھی بات کا جواب یہ ہے کہ وہابی (محمد بن عبدالوہاب نجدی) کا رسالہ (کتاب التوحید) متن تھا، یہ شخص (اسمٰعیل دہلوی) اُس کی شرح (بنام تقویۃ الایمان) کرنے والا ہو گیا۔

پانچویں بات کا جواب یہ ہے کہ بڑے عمِ بزرگوار (یعنی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ) کہ وُہ بینائی سے معذور ہو گئے تھے، اُس (کتاب التوحید) کو سُنا، یہ فرمایا کہ میں اگر بیماریوں سے معذور نہ ہوتا تو "تحفۂ اثناعشریہ" سا جواب، اِس کے ردّ میں بھی لکھتا۔ اس کریم کی بخشش سے .....

اِس بے اعتبار نے شرح (تقویۃ الایمان) کا ردّ لکھا، متن (کتاب التوحید) کا مقصد بھی نابود ہو گیا۔ ہمارے والد ماجد نے اُس (کتاب التوحید) کو دیکھا نہ تھا (کیونکہ ۱۲۳۳ھ میں وصال ہو گیا تھا) بڑے حضرت (شاہ عبد العزیز علیہ الرحمہ) کے فرمانے سے کُھل گیا کہ جب اُس کو گمراہ جان لیا تب اُس کا رد لکھنا فرمایا۔

چھٹی تحقیق کا جواب یہ ہے کہ یہ بات تحقیق اور سچ ہے کہ میں نے مشورت کی راہ سے کہا تھا کہ تم (اسمٰعیل دہلوی) نے سب سے جدا ہو کر تحقیقِ دین میں کی ہے، وہ لکھو۔ کچھ ظاہر نہ کیا۔ ہماری طرف سے جو سوال ہُوئے تھے (مباحثہ جامع مسجد دہلی میں)، اُس کے جواب میں ہاں جی، ہاں جی، کر کے مسجد سے چلے گئے۔

ساتویں بات کا جواب یہ ہے کہ اُس مجلس تک سب ہمارے طور پر تھے پھر اُن کا جھوٹ سُن کر کچے کچے آدمی آہستہ آہستہ پھرنے لگے اور ہمارے والد کے شاگردوں اور مریدوں میں سے بہت نکل رہے، شاید کوئی نادر پھرا ہو (وہابی بنا ہو) تو مجھے اُس کی خبر نہیں۔" انتہیٰ بلفظہٖ۔[1]

مولانا محمد مخصوص اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حقیقت کے پیشِ نظر فرمایا کہ میں تقویۃ الایمان کتاب کو تفویۃ الایمان ہی کہتا اور لکھتا ہُوں لیکن قاضی فضل احمد صاحب نقشبندی لدھیانوی نے تاریخ وہابیہ دیوبندیہ، مطبوعہ کلیمی پریس کلکتہ ۱۳۴۴ھ صفحہ، ۳ مرتبہ مولانا منشی محمد لعل خان مدراسی رضوی علیہ الرحمہ سے اُن کے اُستادِ گرامی، قاضی محمود منگیری نور اللہ مرقدہٗ کا ایک بیان، بلکہ حیرت انگیز بیان یُوں نقل کیا ہے:

"مولوی اسمٰعیل دہلوی کے ہاتھ کے مسودے دیکھے تو تقویۃ الایمان کی جائے تفویۃ الایمان، بجائے قاف کے ف لکھا ہوا تھا، خداوندِ عالم نے اُس کے

---

[1] فضل احمد قاضی، مولانا: انوارِ آفتابِ صداقت، ج ۱، ص ۵۲۸ تا ۵۳۰

ہاتھ سے لکھایا تھا۔ سچ ہے یہ کتاب ایمان کو فوت کرنے والی ہے۔" ۱

مولانا مخصوص اللہ کی طرح شاہ رفیع الدین محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء) کے دُوسرے صاحبزادے یعنی شاہ محمد مُوسیٰ دہلوی علیہ الرحمہ نے بھی اپنے چچا زاد بھائی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے ردّ میں پُوری طرح اپنا فریضہ ادا کیا۔ جامع مسجد دہلی کے تاریخی مباحثے میں دورانِ گفتگو بھی پُوری طرح حصّہ لیا اور اپنے اکابر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (المتوفی ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء) اور شاہ عبدالعزیز و شاہ رفیع الدین و شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہم کے مسلک کی روشنی میں مولوی عبدالحی دہلوی اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے معتقدات کی تردید کی اور اُنھیں اپنے بزرگوں کے مسلک سے بغاوت کرنے والے ثابت کرکے دکھا دیا تھا۔ شاہ محمد مُوسیٰ نے اپنے اِس عظیم کارنامے کو کتابی شکل میں "حجۃ العمل فی ابطال الحیل" کے نام سے جمع کردیا تھا۔ پروفیسر محمد ایوب قادری نے اِس کتاب کے بارے میں یُوں ذرا شرماتے ہُوئے، مصنّفِ تقویۃ الایمان کو چھپاتے ہُوئے، وضاحت فرمائی ہے:

> "مولوی محمد موسیٰ کی تصنیف سے ایک قلمی فارسی کتاب "حجۃ العمل فی ابطال الجہل" ہماری نظر سے گزری ہے۔ یہ کتاب ہفدہم ربیع الاوّل ۱۲۴۲ھ/ ۱۸۲۶ء میں اتمام کو پہنچی۔ یہ کتاب ساٹھ اوراق (۱۲۰ صفحات) پر مشتمل ہے۔ کتاب کا مضمون ردِّ وہابیت ہے۔" ۲

اِسی طرح شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) ے شاگردوں، بھتیجوں اور خوشہ چین علمائے کرام نے مصنّفِ تقویۃ الایمان کے ردّ میں ی پوری سرگرمی دکھائی۔ مولانا رشیدالدین خاں اور مفتی صدرالدین آزردہ ہر طرح پیش پیش ے، جن کا کچھ ذکر ہوچکا اور باقی تصانیف کے ضمن میں کیا جائے گا۔ مولانا ابوالکلام آزاد

سل احمد قاضی، مولانا: انوارِ آفتابِ صداقت، ج ۱، ص ۵۳۱

مدایوب قادری، پروفیسر: تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۵۹۱، ۵۹۲

(المتوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء) کے والدِ ماجد کے نانا جان یعنی مولانا منور الدین دہلوی رحمۃ الل
علیہ بھی شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ کے شاگرد اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے ہم سبق تھے، انھو
نے تقویۃ الایمان کے ردّ میں ایک مبسوط کتاب لکھی تھی، جس کے بارے میں جناب ابوالکلا
آزاد کی تصریح ملاحظہ ہو:

”اِس میں تقویۃ الایمان کے تیس مسئلے ما بہ النزاع منتخب کیے ہیں اور پھر
تیس بابوں میں اُن کا ردّ کیا ہے۔ ایک رسالہ اس باب میں ہے کہ مولانا
اسمٰعیل شہید کے عقائد کا ردّ خود اُن ہی کے خاندان اور اساتذہ کی کتب سے
کیا جائے۔ چنانچہ اِس میں ہر مسئلے کے ردّ میں شاہ عبدالرحیم، شاہ ولی اللہ،
شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے اقوال سے اپنے نزدیک ردکیا ہے۔“[1]

کیا کسی انصاف پسند کے لیے اِس کے بعد بھی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ تقوی
کی تعلیمات کے ڈانڈے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۱۷۶ھ/۶۲
سے ملائے اور تقویۃ الایمانی دھرم والوں کو ولی اللّٰہی مکتبۂ فکر کے علمبردار ٹھہرانے کی جرأ
کرے۔ مولانا منور الدین دہلوی نے مصنّفِ تقویۃ الایمان کو پہلے خوب سمجھایا بجھایا کہ دین
تفرقہ بازی اور فتنہ پردازی ایک ظُلمِ عظیم ہے اِس سے اجتناب کرنا چاہیے لیکن خارجیت اُ
دِل و دماغ میں کچھ اِس طرح سما گئی تھی کہ اُن کی فہمائش کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہُوا
مجبوراً مولانا منوّر الدین کو اُن کی تردید میں کمرِ ہمّت باندھنی پڑی۔ مولانا منوّر الدین
ردِّ وہابیت میں جس طرح سرگرمی دکھائی اُس کا تذکرہ جناب ابوالکلام آزاد نے یُوں کیا

”مولانا اسمٰعیل شہید مولانا منور الدین کے ہم درس تھے۔ شاہ عبدالعزیز
(رحمۃ اللہ علیہ) کے انتقال کے بعد جب اُنھوں (مولوی اسمٰعیل) نے تقویۃ
الایمان اور جلاء العینین لکھی اور اُن کے اِس مسلک کا چرچا ہُوا تو علماء میں
ہلچل پڑ گئی۔ اِن کے ردّ میں سب سے زیادہ سرگرمی بلکہ سربراہی مولانا منورالدین

---

[1] ابوالکلام آزاد، مولانا: آزاد کی کہانی، ص ۵۰

نے دکھائی۔ متعدد کتابیں لکھیں اور ۱۲۴۰ھ والا مشہور مباحثہ جامع مسجد میں کیا۔ تمام علمائے ہند سے فتویٰ مرتب کرایا پھر حرمین سے فتویٰ منگوایا۔ اِن کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ابتدا میں مولانا اسمٰعیل اور اُن کے رفیق یعنی شاہ عبد العزیز صاحب کے داماد مولانا عبد الحی کو بہت کچھ فہمائش کی اور ہر طرح سمجھایا، لیکن جب ناکامی ہُوئی تو بحث و رد میں سرگرم ہُوئے اور جامع مسجد (دہلی) کا شہرۂ آفاق مناظرہ ترتیب دیا، جس میں ایک طرف مولانا اسمٰعیل اور مولانا عبد الحی تھے اور دُوسری طرف مولانا منور الدّین اور تمام علمائے دہلی۔"[1]

یہ بیان کسی ایسے عالم کا نہیں جس کو بریلوی بتا کر اُس کی بات ناقابلِ توجہ ٹھہرا دی جائے۔ یہ وہابیوں کے امام الہند کا بیان ہے۔ کیا اِس سے صاف اور صریح طور پر واضح نہیں ہو رہا ہے کہ مصنفِ تقویۃ الایمان نے اپنے آبائی مسلک سے، مذہب اہلسنت وجماعت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ سرزمینِ پاک وہند میں فرقہ بازی کا سنگِ بنیاد رکھا اور یہاں محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دین کی جگہ محمد بن عبد الوہاب نجدی کے خارجی مذہب کو رائج کرنے کی سرتوڑ کوشش کی تھی۔ پسِ پشت کوئی ایسی طاقت کام کر رہی تھی جو کسی کی فہمائش کا کوئی اثر نہیں ہونے دیتی تھی۔ گھر بار خلاف، سارا خاندان خلاف، متحدہ ہندوستان کے تمام علمائے کرام مخالفت پر کمربستہ، لیکن کسی کی پروا نہیں کی۔ نہ خاندان کو خاطر میں لائے، نہ اپنے بزرگوں کا کوئی پاس لحاظ کیا اور نہ علمائے کرام کے محاسبے اور اُن سے بار بار زک اٹھانے لاجواب رہنے پر کوئی ندامت محسوس ہوتی تھی۔ بس تفریق بین المسلمین کی دُھن تھی کہ پوری تندہی سے اُس میں لگے رہے اور کسی بھی رُکاوٹ کو خاطر میں نہ لائے۔ آخر کیوں؟ کیا یہ حقانیت پر تھے اور پاک وہند کے سارے علمائے کرام سب مشرک وکافر تھے؟ کیا ولی اللّٰہی خاندان کے اکابر شرک وکفر کی تعلیم ہی دیتے رہے تھے اور یہ اُن کی اصلاح

---

[1] ابوالکلام آزاد، مولانا: آزاد کی کہانی، ص ۵۶

کرنے کو اُٹھ کھڑے ہُوئے تھے؟ آخر یہ اصلاح ہو رہی تھی یا تخریب، مسلمانوں کو ملایا جا رہا تھا
یا توڑنے اور منتشر کرنے کی سعیِ نامحمود تھی؟ اگر جوڑنے کا پروگرام تھا، تو یہ بات ناقابلِ یقین
کیونکہ اُس وقت مسلمان ٹوٹے ہُوئے اور فرقوں میں بٹے ہُوئے کب تھے کہ اُنھیں جوڑ
کی ضرورت پڑتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ بعض سماجی خرابیاں اُن کے مذہب و معمولات میں داخل
ہو چکی تھیں، اُن کی اصلاح مدِ نظر تھی۔ اِس سلسلے میں یہی عرض کروں گا کہ کاش! موصوف
ارادے یہی کچھ ہوتے تو یہ تحریک قابلِ احترام اور لائقِ ستائش قرار پاتی لیکن افسوس!
کچھ ایسا ہی لگایا گیا مگر ساتھ ہی اسلامی عقائد و نظریات پر عملِ جرّاحی کی اِس طرح مشق کی
کہ سچّے اور پکّے مسلمانوں کو بھی خوارج کی طرح بیک جنبشِ قلم مشرک و کافر ٹھہرا دیا۔ بعض
عقائد کو غیر اسلامی اور کتنے ہی غیر اسلامی اور صریح کافرانہ نظریات کو اسلامی عقائد منوانے
مہم پُورے زور شور سے شروع کر دی گئی۔ آخر سماجی خرابیاں دُور کرنے ہی کا ارادہ تھا
مسلمانوں کو خارجی بنانے کی مہم چلانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟ کیا مسلمانوں کے لیے
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا دین، اُن کی نجات کے لیے کافی نہیں تھا؟ کیا نجات کا ذریعہ محمد
عبدالوہاب نجدی کا دین ہے؟

مولوی ابوالکلام آزاد کے والد ماجد، مولانا خیرالدین جالندھری رحمۃ اللہ علیہ (المتو
۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء) اپنے نانا، مولوی منورالدین دہلوی اور مفتی صدرالدین آزردہ (المتو
۱۲۵۸ھ/ ۱۸۴۱ء) کے نامور شاگرد تھے۔ ردِّ وہابیت میں آپ نے بھی انتہائی سرگرمی د
کہ کسی طرح یہ فتنہ جڑ پکڑنے سے پہلے ہی ختم ہو جائے اور مسلمان اپنا دین و ایمان برباد
سے محفوظ ہو سکیں۔ موصوف کے ایسے کارناموں کو اُن کے فرزند مولوی ابوالکلام نے

بادلِ ناخواستہ بیان کیا ہے:

”اُسی زمانے میں علمائے مکّہ نے والد مرحوم سے کہا کہ وہابی عقائد (وہابیانِ ہند
کی کتابیں اُردو میں ہیں جنھیں وہ سمجھ نہیں سکتے نیز نجدی عقائد کا بھی ردّ کافی طور
نہیں ہُوا ہے۔ شیخ احمد دحلان نے اِس بارے میں خاص طور پر زور دیا اور
اِس طرح والد مرحوم نے ایک کتاب نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھی، جو

اِن کی تصانیف میں سب سے بڑی ہے۔ اُس کا نام ”نجم الرجم الشیاطین“ ہے۔ یہ دس جلدوں میں ختم ہوئی ہے اور ہر جلد بہت ضخیم ہے۔ اِس کی ترتیب اِس طور پر ہوئی ہے کہ ایک سو۱۱۴ چودہ مسئلے ما بہ النزاع منتخب کیے ہیں۔ اتنی تعداد جزئی جزئی اختلافات کے استقصاء کی وجہ سے ہوگئی ہے۔ ہر مسئلے کے لیے ایک باب قائم کیا ہے۔ اُس میں پہلے قرآن سے، پھر احادیث سے، پھر اقوالِ علماءؒ سے ردّ کا التزام کیا ہے۔ اِس طرح کتاب ایک سو چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ایک جلد صرف مقدمہ میں ہے اور چونکہ وُہ اُن مسائل کے متعلق نہیں ہے، اِس لیے معلومات کے اعتبار سے بکار آمد ہے۔ اِس میں اصولی طور پر عقائدِ اہلسنّت پر بحث کی ہے اور ہر طرح کے اختلافات کو ختم کر کے اپنے مسلک کو بہت شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے۔“[1]

اب ہم ذیل میں چند اُن علمائے کرام کا ذکر کریں گے جنھوں نے تقویۃ الایمان کے فتنے کو دفع کرنے کی غرض سے اس کے کُلی یا جزئی ردّ لکھے۔ اگرچہ ایسی تصانیف کا شمار حدِ حساب سے باہر ہے لیکن ہم تیرھویں صدی میں لکھی جانے والی بعض اُن تصانیف کے نام پیش کرتے ہیں جو ”گریہ گشتن روزِ اوّل“ کے بطور لکھی گئی تھیں۔ علاّمہ فضل حق خیر آبادیؒ[1]، شاہ مخصوص اللہ دہلویؒ[2]، شاہ محمد مُوسیٰ دہلویؒ[3]، مولانا منور الدینؒ[4] دہلوی اور مولانا خیر الدینؒ[5] جالندھری رحمۃ اللہ علیہم کا ذکر پیچھے گزر چکا۔ اب بفضلہٖ تعالیٰ بعض دیگر علمائے اہلسنت اور اُن کی کاوشوں کا تذکرہ کرتے ہیں و باللہ التوفیق:

۶۔ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) کے نامور شاگرد مولانا رشید الدین خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء) نے مصنّفِ تقویۃ الایمان کو خوب فہمائش کی۔ مباحثہ جامع مسجد دہلی میں علمائے دہلی کی سربراہی کی اور مولوی عبد الحی (المتوفی ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۸ء) سے سوالات

---

[1] ابو الکلام آزاد، مولوی: آزاد کی کہانی، ص ۹۰

کرتے رہے۔ آپ نے شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہما سے بھی تحصیلِ علم کی تھی۔ مفتی صدرالدین آزردہ کے رشتہ دار تھے۔ تعلیم و تعلّم میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور اِسی وجہ سے شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے منظورِ نظر تھے۔ روافض کا ردّ کرتے رہے اور آخر میں ردِّ وہابیت میں سرگرمی دکھاتے رہے۔

۷۔ مفتی صدرالدین آزردہ (المتوفی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء)، شاہ عبدالقادر محدّث دہلوی (المتوفی ۱۲۴۲ھ/ ۱۸۲۷ء) اور مولانا فضل امام خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہم (المتوفی ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ء) وغیرہ سے تحصیلِ علم کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصّہ لیا اور فتویٰ جہاد کی تصدیق کی، جس کی پاداش میں منصبِ صدرالصدوری سے معزول ہُوئے اور جائداد منقولہ و غیرمنقولہ چھین لی گئی۔ وہابیہ کے ردّ میں "منتہی المقال فی شرحِ حدیث لاتشدو الرحال" کتاب لکھی۔ آپ کا کتب خانہ جو ۱۸۵۷ء میں حکومت نے ضبط کیا تقریباً تین لاکھ کی مالیت کا تھا۔

۸۔ مولانا فضلِ رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) نے تحصیلِ علم بحرالعلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی (المتوفی ۱۲۳۵ھ/ ۱۸۱۹ء) کے شاگردِ رشید، مولانا نورالحق فرنگی محلی (المتوفی ۱۲۳۸ھ/ ۱۸۲۲ء) سے کی۔ مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا سخاوت علی جون پوری، مفتی اسداللہ الٰہ آبادی، مولانا شاہ احمد سعید رامپوری اور مولانا عنایت رسول چریاکوٹی جیسے مشاہیر علماء کو آپ کی شاگردی کا شرف حاصل ہُوا۔ آپ نے وہابیہ کے ردّ میں مثالی کارنامہ انجام دیا۔ "بوارق محمدیہ" اُن کے ردّ میں شرح و بسط سے لکھی، جس کا ترجمہ مولانا غلام قادر بھیروی نے اردو میں "شوارق صمدیہ" کے نام سے کیا۔ یہ کتاب ۱۲۶۵ھ میں لکھی گئی۔ اِس کے علاوہ "احقاقِ حق" اور "تصحیح المسائل" کے ذریعے اُن کے باطل مذہب کا ردّ کیا۔ "سیف الجبار" بھی ۱۲۶۵ھ کی تصنیف ہے اور اِس میں نجدی اور ہندی وہابیوں کے

مکائد و مظالم، اُن کی تاریخ اور کتاب التوحید و تقویۃ الایمان کے مضامین میں باہم مطابقت دکھا کر مبرہن کیا ہے کہ حقیقت میں یہ دونوں مذاہب ایک ہیں۔ مولانا نے عقائدِ اہلسنّت و جماعت کو ایک عربی تصنیف "المعتقد المنتقد" میں منضبط فرمایا اور اِس کتاب کے ذریعے بھی ضمنی طور پر وہابی عقائد و نظریات کی تردید ہوتی ہے۔ یہ تصنیفِ لطیف علّامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) کی مصدقہ ہے۔ یہی وہ مبارک تصنیف ہے جس پر امامِ اہلسنت اعلیحضرت احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہٗ (المتوفی ۱۲۴۰ھ/۱۹۲۱ء) نے "المعتمد المستند" کے نام سے حاشیہ لکھا اور اُس میں گمراہ گروں کے پانچ سرغنوں کی تکفیر کا شرعی فریضہ ادا کیا تھا۔

۹۔ مولانا کرامت علی جون پوری (المتوفی ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳-۷۴ء) یہ سیّد احمد بریلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کے مُرید اور خلیفہ تھے لیکن مکائد ظاہر ہونے پر دوبارہ زمرۂ اہلسنّت میں واپس آگئے۔ وہابیہ کی "تقویۃ الایمان" کے ردّ میں "قوۃ الایمان" لکھی، اِس کے علاوہ اُن مبتدعین کی تردید میں اور متعدد رسائل لکھے۔

۱۰۔ مولانا سیّد جلال الدین برہان پوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء) عرف اللہ والے صاحب، یہ شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ تقوٰی و طہارت اور علوم حدیثیہ میں درجۂ کمال پر فائز تھے۔ اِنھوں نے تقویۃ الایمانی عقائد و نظریات کے ردّ میں رسالہ "صاعقہ رابیہ در ردِّ عقائدِ وہابیہ" لکھا۔

۱۱۔ مولانا تراب علی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء) نے "سبیل النجاح الی تحصیل الفلاح" کے نام سے تقویۃ الایمان کا ردّ لکھا ہے۔

۱۲۔ مولانا برہان الدین رحمۃ اللہ علیہ ساکن دیوہ، مشہور فقیہہ اور محدّث ہو گزرے ہیں۔ ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ کو جامع مسجد دہلی میں جو حنفی وہابی اختلاف پر سب سے پہلا اور تاریخی مناظرہ ہوا تھا۔ موصوف نے "محاکمہ" کے نام سے اُس مباحثے کی مکمّل روئیداد درج کر کے وہابیہ کے دلائل کا ردّ کیا ہے۔

۱۳۔ مولانا محمد سعید اسلمی مدراسی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۵ء) نے تقویۃ الایمان

کے ردّ میں "سفینۃ النجات" نامی کتاب لکھی اور تحفہ اثنا عشریہ مصنفہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔

۱۴۔ مولانا خلیل الرحمٰن مصطفیٰ آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان کے ردّ میں کتاب "رسم الخیرات" لکھی جو ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں ممبئی سے شائع ہوئی تھی۔

۱۵۔ مولانا محمد عبد اللہ خراسانی بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۸ء) نے مصنفِ تقویۃ الایمان کا "السیوف البارقہ علیٰ رؤس الفاسقہ" کتاب لکھ کر ردّ کیا۔ یہ کتاب مطبع قیصریہ سے ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ مکہ مکرمہ کے سرتاج العلماء، مفتی شافعیہ، سیّد احمد دحلان مکّی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۱ء) سے موصوف نے تفسیر، حدیث اور فقہ کی سندیں حاصل کی تھیں۔ مذکورہ کتاب "السیوف البارقہ" بھی حضرت مفتی شافعیہ کی مصدقہ ہے۔ مصنّفِ تقویۃ الایمان کے بارے میں موصوف یوں اُس میں رقمطراز ہیں:

فان قیل ان الملحد الہندی	اگر کوئی یہ کہے کہ ملحد ہندی اسمٰعیل
اسمٰعیل الدھلوی کان من	دہلوی جبکہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی
تلامذۃ مولانا الشاہ عبدالعزیز	رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے تو وہ
رحمۃ اللہ علیہ فکیف یرتد	اپنے دین اسلام سے کس طرح
عن دینہ وقلت لخبث الباطن	پھر سکتے تھے؛ میں کہتا ہوں کہ سابقہ
وحب الریاسۃ کالمرتدین	مرتدوں کی طرح باطنی خباثت اور ہوسِ
الاوّلین کانوا یحضرون مع	ریاست کے باعث ایسا ہُوا، حالانکہ
النبی صلی اللہ علیہ وسلم	وہ لوگ بھی تو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
فی الحج والجھاد والصوم	کے ساتھ حج، جہاد، روزہ اور نماز
والصّلوٰۃ۔	میں شرکت کیا کرتے تھے۔

۱۶۔ مولانا کریم اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء) شاہ عبدالعزیز محدث

دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) اور مولانا رشید الدین خاں علیہ الرحمہ (المتوفی ۱۲۴۹ھ/ ۱۸۳۳ء) وغیرہ سے تحصیلِ علوم کی۔ سیّد آلِ احمد عرف اچھے میاں مارہروی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۵ھ/ ۱۸۱۹ء) سے شرفِ ارادت اور اجازت و خلافت حاصل تھی۔ وہابیہ کے ردّ میں آپ نے "ہادی المضلین" کتاب لکھی۔

۱۷۔ مولانا سیّد عبدالفتاح المعروف بہ مفتی اشرف علی گلشن آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے تحصیلِ علوم مولانا فضلِ رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) اور کئی دیگر علمائے کرام سے کی۔ مصنّفِ تقویۃ الایمان کے ردّ میں اور اُن کے مکائد کا ردّ کرتے ہُوئے ایک کتاب "تحفہ محمدیہ فی ردّ وہابیہ" شرح و بسط سے لکھی۔ دُوسری "تائید الحق" جو ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۸ء میں بمبئی سے شائع ہُوئی۔

۱۸۔ مولانا محمد احسن واعظ پشاوری المعروف بہ حافظ دراز رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء) ایک مشہور بزرگ اور متبحر عالم ہو گزرے ہیں۔ ساری عمر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزاری۔ بخاری شریف کی "منہج الباری" کے نام سے فارسی میں شرح لکھی اور شرحِ قاضی مبارک پر فاضلانہ حواشی لکھے۔ انھوں نے مصنّفِ "تقویۃ الایمان" کو بارہا فہمائش کی اور علمی گفتگو کے ذریعے اُنھیں تقلید اور رفع یدین وغیرہ مسائل میں لاجواب کرتے رہے۔ جب اِن کے فاضلانہ و محققانہ دلائل کے سامنے موصوف کی کسی طرح پیش نہ گئی تو موصوف نے خارجیت کا پرنالہ وہیں رکھا لیکن رفع یدین کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اِن وہابیانِ ہند سے پنجتار میں جو علمائے اہلسنت نے شہرۂ آفاق مناظرہ کیا تھا اُس میں آپ بھی موجود تھے۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اُس مناظرے میں ہر موضوع پر ساکت و صامت ہُوئے اور خارجیت و نجدیت سے تائب ہونے کا اعلان کر دیا تھا، لیکن فوراً بعد ہی بعض وہابی علمآ نے کہنا شروع کر دیا کہ مصنّفِ تقویۃ الایمان نے وہابیت و خارجیت سے توبہ کرنے کا کوئی اعلان نہیں کیا تھا، یہ اُن پر بہتان ہے۔ قربان جائیں اعلیٰحضرت امام احمد رضا خاں بریلوی کے محتاط قلم پر کہ آپ نے اِسی شہرتِ توبہ کی بنا پر مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی

۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) کی تکفیر سے اجتناب کیا حالانکہ اُن کی تصانیف میں کتنی ہی عبارتیں صریح کفریہ ہیں جن کی آج تک کوئی اسلامی تاویل نہیں کی جا سکی۔ حالانکہ اِس واقعے سے چھ سال پہلے علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء) نے ۱۲۴۰ھ میں ”تحقیق الفتویٰ“ کے اندر مصنفِ تقویۃ الایمان کی جامع مسجد دہلی میں تکفیر کی اور ولی اللّٰہی خاندان کے علماء، شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) کے علمی فرزندوں، دیگر علمائے دہلی اور علمائے شاہجہان پور نے اُس فتوے کی تصدیق و تائید مُہری و دستخطی فرمائی تھی۔ مولانا محمد احسن پشاوری نے دیکھا کہ یہ لوگ بعینہٖ خوارج کی طرح توحید اور شرک کو آپس میں گڈمڈ کر رہے ہیں لہٰذا اِن کی تردید میں کتاب ”تحقیق توحید و شرک“ تصنیف فرمائی تھی۔

۱۹۔ مولانا محمد صبغۃ اللہ مدراسی رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان کے ردّ میں ”گلزارِ ہدایت“ نامی کتاب لکھی جو مطبع کشن راج مدراس سے ۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھی۔

۲۰۔ مولانا محمد خلیل الرحمٰن مصطفیٰ آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان کے ردّ میں ”رسم الخیرات“ کتاب لکھی اور اُسے ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۲ء میں بمبئی سے شائع کروایا تھا۔

۲۱۔ مولانا محمد حیدر علی لکھنوی ثم حیدر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۱ء) نے تحصیلِ علم شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، شاہ رفیع الدین محدث دہلوی اور مولانا رشید الدین خاں رحمۃ اللہ علیہم سے کی۔ فنِ مناظرہ اور علمِ کلام میں درجۂ کمال رکھتے تھے۔ روافض سے مناظرہ کرنے میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ حیدر آباد دکن میں قاضی القضاۃ رہے۔ ”ردّ تقویۃ الایمان“ کتاب بڑی کاوش و جستجو سے لکھی، جس کے آخر میں ”صراط المستقیم“ کتاب کے بارے میں علمائے دہلی و لکھنؤ کے فتوے بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۳ء میں لکھی گئی۔

۲۲۔ مولانا سیّد معین الدین رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء) سجادہ نشین احمد آباد نارہ نے وہابیہ کے ردّ میں ”ہدایت المومنین الیٰ سلسلۃ الصالحین“ کے نام سے کتاب لکھی اور اُسے مطبع نولکشور لکھنؤ سے ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۹ء میں شائع

کروایا گیا۔

۲۳۔ مولانا محی الدین بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۴ء) نے علومِ عقلیہ ونقلیہ کی تحصیل اپنے والدِ ماجد مولانا شاہ فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) سے کی اور اپنے جدّ امجد مولانا عبد المجید بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۶ء) سے شرفِ ارادت حاصل کیا۔ مولانا فضلِ رسول بدایونی کی کتاب ”احقاقِ حق“ کا کسی وہابی نے ”سراج الایمان“ کے نام سے جواب لکھا تھا۔ آپ نے اُس ”سراج الایمان“ نامی کتاب کا قلم توڑ جواب ”شمس الایمان“ کے نام سے لکھا اور ۱۲۶۶ھ/ ۱۸۴۹ء میں اُردو اخبار پریس دہلی سے شائع کروایا۔

۲۴۔ مولانا نقی علی خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) جو امام اہلسنت، مجدد مائتہ حاضرہ، مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) کے والد ماجد ہیں، آپ نے تقویۃ الایمان کے ردّ میں ”تزکیۃ الایقان فی ردّ تقویۃ الایمان“ کتاب لکھی۔ آپ کے زمانہ میں حنفیت کا دعوٰی کرنیوالے وہابیوں کا ظہور ہو چکا تھا، اُن کے ردّ میں متعدد کتابیں لکھ کر مذہب اہلسنت کا دفاع کیا۔ تین چیزیں آپ کی تصانیف میں بہت نمایاں ہیں: (۱) درسِ عشقِ رسول، (۲) مذہب اہلسنت وجماعت کا دفاع، (۳) بد مذہبوں کا ردّ، خصوصاً دیوبندیوں اور نیچریوں کی تخریب کاری کا سدِّباب۔

۲۵۔ مولانا قاضی ارتضا علی خاں گوپاموی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۵۱ھ/ ۱۸۳۵ء) اور بقول بعض ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۳ء) نے جو مدراس کے قاضی القضاۃ تھے اور صدر اور مُلّا جلال وغیرہ کے حواشی اور شروح لکھ چکے تھے، اُنھوں نے ”خطبۃ الحاقیہ“ کے نام سے وہابیہ کے ردّ میں کتاب لکھی۔

۲۶۔ مولانا سید بدر الدین حیدر آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے وہابیہ کے ردّ میں رسالہ ”احقاق الحق“ تصنیف کیا۔

۲۷۔ مولانا محمد عمر رامپوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء) نے وہابی عالم،

محمد رحیم بخش پنجابی کا ردّ کیا تھا۔ موصوف تقویۃ الایمان کے حامی تھے اور آپ نے اُن کے جُملہ مزعومہ دلائل کے تار پود بکھیر کر رکھ دیے۔ اِس کے علاوہ مولوی محمد حسین بٹالوی، وکیلِ غیر مقلداں کے بارہ۱۲ سوالات کا مسکت جواب دیتے ہُوئے ایک رسالہ مرتب کیا جس کا نام "عشرہ مبشرہ" ہے۔ یہ کتاب اُن کے تبحر علمی کی دلیل اور نہایت بلند پایہ ہے۔ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء میں ریاض ہند پریس امرتسر میں طبع ہُوئی۔ اوّل الذکر کتاب کا نام "فتح الاسلام فی ردّ اضغاث الاحلام" ہے اور وہ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء میں نامی پریس لکھنؤ سے طبع ہوئی تھی۔

۲۸۔ مولانا فضلِ رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) نے مصنّفِ تقویۃ الایمان کے ردّ میں ایک پُرلطف کتاب "فیوضِ ارواح القدس" کے نام سے بھی لکھی تھی اور اُس میں یہ التزام کیا تھا کہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کے عقائد و نظریات کو اُن کے خاندانی بزرگوں یعنی شاہ عبدالرحیم دہلوی (المتوفی ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء)، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (المتوفی ۱۷۶۲ھ/۱۱۷۶ء)، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء)، شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۷ء) اور شاہ رفیع الدین محدّث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء) رحمۃ اللہ علیہم کے عقائد و نظریات کے خلاف ثابت کر کے دکھایا ہے۔

۲۹۔ مولانا ہدایت اللہ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے وہابیہ کے ردّ میں "سبیل النجاح فی تحصیل الفلاح" کتاب لکھی۔

۳۰۔ مولانا قاضی محمد حسین کوفی رحمۃ اللہ علیہ نے وہابیہ کے ردّ میں "ہدایت المسلمین الیٰ طریق الحق والیقین" کے نام سے کتاب لکھی جو ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء میں بمبئی سے طبع ہُوئی تھی۔

۳۱۔ مولانا شاہ عبدالمجید بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۶ء) جن کو شرفِ ارادت شاہ آلِ احمد مارہروی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء) سے حاصل تھا۔ آپ کی بیعت کے واقعہ کو مولانا رحمٰن علی مرحوم نے تذکرہ علمائے ہند میں یوں بیان کیا ہے[1]

"علم سے فراغ حاصل کرنے کے بعد مرشد کامل کا خیال پیدا ہُوا اور ہر طرف شیخ کامل کی تلاش شروع کی۔ چونکہ بہت سے مشائخ وقت (کامل طور سے) شریعت کا اتباع نہیں کرتے تھے اِس لیے اُس گروہ سے نفرت شروع ہو گئی۔ قسمت یاور تھی۔ خواب میں دیکھا کہ حضرت ہادی المضلین، سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مجلس میں جناب محبوب سبحانی، غوثِ صمدانی، شیخ عبد القادر جیلانی۔ مخدوم الانام، کانِ نمک گنج شکر شیخ فرید الدین نیز دُوسرے اولیاء (رحمۃ اللہ علیہم) موجود ہیں۔ حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اشارہ سے جنابِ غوث الاعظم نے صاحبِ ترجمہ (مولوی عبد المجید بدایونی) کا ہاتھ، شاہ آل احمد مارہروی کے ہاتھ میں دے دیا۔ جب وُہ بیدار ہوئے تو مارہرہ کا راستہ لیا اور اپنے پیر کی خدمت میں حاضر ہُوئے۔ زہد و تقوٰی اور اتباعِ شریعت کو کامل طور سے پایا، اُن کے مرید ہُوئے، خلافت سے سرفراز ہُوئے، اپنے مرشد سے "عین الحق" کا لقب پایا۔" [۱]

آپ مولانا شاہ فضلِ رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) جیسے نابغۂ عصر کے والدِ ماجد اور حضرت آلِ رسول مارہروی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۷۹ء) جیسے گوہرِ یکتا کے استاد تھے۔ آپ نے مبتدعینِ زمانہ کے ردّ میں "رسالہ ردّ وہابیہ" تصنیف فرمایا تھا۔

۳۲۔ مولانا فخر الدین احمد الٰہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۵ء) نے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی بانیِ وہابیت کی تردید میں "رسالہ ازالۃ الشکوک والاوہام بجواب تقویۃ الایمان" شرح و بسط سے لکھا۔

---

[۱] محمد ایوب قادری، پروفیسر: تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۳۲۳

۳۳۔ مولانا سیّد حیدر شاہ حنفی قادری رحمۃ اللہ علیہ متوطن کچھ بھوج المعروف پیر بھرال
مبتدعینِ جدید کے ردّ میں "ذوالفقار الحیدریہ علی اعناق الوھابیۃ"
کتاب لکھی۔

۳۴۔ علمائے دہلی و علمائے حرمین کے فتاویٰ کا مجموعہ بنام تنبیہہ الضالین وھدایۃ
الصالحین" جس میں مولوی محمد اسمٰعیل اور مولوی محمد اسحٰق دہلوی کے نجدی عقائد
خلافِ اہلسنّت مسائل کی تردید ہے۔

۳۵۔ مولانا سیّد جلال الدین برہان پوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء)۔
شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) کے شاگرد
اِنھوں نے وہابیانِ ہند کے عقائد کی تردید میں رسالہ "صاعقہ رابیہ در ردِّ عقائد
وھابیہ" لکھا، جو قلمی صورت میں موجود ہے۔

۳۶۔ مولانا حافظ محمد عبداللہ بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۸ء)۔ آپ حضر
فضل حق خیرآبادی (المتوفی ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) اور مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتو
۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۵ء) کے شاگرد تھے۔ مفتی شافعیہ و مدرس مدرسہ بیت الحرام
سیّد احمد دحلان رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۱ء) سے تفسیر، حدیث اور
کی سند حاصل کی۔ وہابیہ کے ردّ میں "رسائل ردِّ وہابیہ" کتاب لکھی۔

۳۷۔ علمائے بریلی نے تقویۃ الایمان کے ردّ میں "صحیح الایمان در ردِّ تقویۃ الایمان" ک
نام سے ایک متفقہ کتاب شائع کروائی۔

۳۸۔ مدراس کے پینتیس[۳۵] علمائے اہلسنّت نے تقویۃ الایمان کے عقائد و نظریات
غیر اسلامی اور کفریہ بتایا اور ۱۲۵۱ھ/ ۱۸۳۵ء میں وُہ مجموعہ شائع ہُوا۔
علمائے کرام نے اپنے فتووں میں ادلّہ ثلاثہ سے ثابت کیا ہے کہ تقویۃ الایما
عقائد و نظریات، اسلامی عقائد کے خلاف اور اشاعتِ کفر و خارجیت ہیں۔ جو
کتاب کو اِسلامی سمجھیں اور اِس کے پیش کردہ عقائد کو درست جانیں وُہ اسلام
انحراف کرنے والے ہیں۔

۳۹۔ مولانا معین الحق رحمۃ اللہ علیہ پہلے وہابیوں کے فریب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ مطلع ہونے پر تقویۃ الایمان اور صراط المستقیم کے ردّ میں رسالہ "جواہر منظومہ" لکھا، جو مطبع جعفریہ سے ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء میں طبع ہُوا۔

۴۰۔ علمائے حیدر آباد دکن نے تقویۃ الایمان کے غیر اسلامی نظریات کا ردّ کرتے ہُوئے اپنے فتووں کا ایک مجموعہ "ردّ تقویۃ الایمان" کے نام سے شائع کروایا۔

۴۱۔ مولانا سید ابو السعود مفتی مدینہ منورہ رحمۃ اللہ علیہ کی مہری دستخطی تصدیق کے ساتھ وہابیانِ ہند کے ردّ میں اور اُن کے متعلق شرعی حکم بیان کرتے ہُوئے علمائے حرمین شریفین کے فتاویٰ کا مجموعہ "فتویٰ حرمین شریفین" کے نام سے ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں بمبئی سے شائع ہُوا۔ اِس میں تقویۃ الایمان اور اُس کے مصنّف کا ردّ ہے۔

۴۲۔ مولانا فیض اللہ رحمۃ اللہ علیہ پنجابی نے ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں مصنّفِ تقویۃ الایمان کے ردّ میں "طریقۃ المسلمین، مذہب سنیہ ردّ وہابیہ" بمبئی سے شائع کروایا۔

۴۳۔ مولانا جمال الدین فرنگی محلی ثم مدراسی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء) نے جدید فرقہ وہابی اور اُن کے تقویۃ الایمانی نظریات کے ردّ میں ایک کتاب "جمال الملت والدین" کے نام سے ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں بمبئی سے شائع کروائی۔ آپ نے مختلف درسی کتب پر حواشی لکھے اور نواب غلام غوث خاں، رئیسِ کرناٹک کے آپ اُستاد تھے۔ تبحرِ علمی اور سخاوت میں مشہور تھے۔

۴۴۔ مولانا احمد علی خلیفہ شیخ عبد الغفور عرف حضرت اخوند رحمۃ اللہ علیہما نے وہابیوں کے ردّ میں ایک عربی کتاب ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۵ء میں مطبع حیدری بمبئی سے بنام "برہان المومنین علیٰ عقائد المضلین" شائع کروائی۔

۴۵۔ مولانا عبد السبحان پشاوری مدراسی رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان کے ردّ میں علمائے حرمین شریفین سے فتوے حاصل کیے۔ آپ نے اُن کا مجموعہ مع اردو ترجمہ مطبع ہاشمی مدراس سے ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء میں شائع کروایا۔

۴۶۔ مولانا محمد عبد السبحان احمد آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء) نے

وہابیوں کے ردّ میں "[۱] دلائلِ قاطعہ در تحقیق فرقہ ناجیہ، [۲] خیر المقالہ فی ازالۃ المجالہ اور [۳] التہدید فی وجوب التقلید" وغیرہ کتب و رسائل لکھے۔

۴۷۔ علمائے قاہرہ و مصر نے ہندوستانی زندیقوں کے بارے میں حکمِ شرع بیان کرتے ہو فتوے جاری کیے، اُن کا مجموعہ بنام "رسالہ زندیقیہ" بمبئی سے شائع ہُوا۔

۴۸۔ مولانا محمد عمر رامپوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء) نے وہابیہ کے ردّ "رجوماً للشیاطین ودافع وساوس الخناس" لکھا، جو ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء لکھنؤ سے شائع ہوا۔

۴۹۔ مولانا عبد الرحمٰن سلہٹی رحمۃ اللہ علیہ نے وہابیوں کے ردّ میں "سیف الابرار المس علی الکفار" کے نام سے ایک کتاب ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء میں مطبع نظامی کان پو سے شائع کروائی۔

۵۰۔ مولانا جلال الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مبتدعینِ ہند کے ردّ میں "شواہد الحق" کتا لکھی اور ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء میں چھپی۔

۵۱۔ مولانا مخلص الرحمٰن چاٹگامی علیہ الرحمہ نے تقویۃ الایمان کے ردّ میں "شرح الصد فی دفع الشرود" کتاب لکھی۔

۵۲۔ مولانا سیّد لطف الحق بن مولانا سیّد خلیل الحق قادری بٹالوی رحمۃ اللہ علیہما نے مسلمانوں کو خارجیت کے شر سے بچانے کی غرض سے "صلاح المومنین فی قطع الخارجین" کتاب لکھی، جو قلمی نسخہ کی صورت میں موجود ہے۔

۵۳۔ مولانا محمد عبد اللہ سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلۂ شفاعت و استمداد و تصر میں تقویۃ الایمانی نظریے کا بالغ ردّ کرتے ہُوئے کتاب "تحفۃ المسلمین فی حیات سیّد المرسلین" لکھی۔ یہ بھی قلمی موجود ہے۔

۵۴۔ مولانا معلم ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۶ء) خطیب جامع مس بمبئی نے نجدی عقائد کی روک تھام کے پیشِ نظر کتاب "نعم الانتباہ لد الاشتباہ" لکھی۔

۵۵۔ مولانا خیر الدین مدراسی رحمۃ اللہ علیہ نے وہابیہ کی تردید میں "خیر الزاد لیوم المیعاد" نامی کتاب لکھی۔

۵۶۔ مولانا خادم احمد فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۱ھ/ ۱۸۵۵ء)۔ آپ شرح وقایہ کے شارح بھی ہیں۔ اِنھوں نے منکرین تقلید کے رد میں "ھدایت الانام فی اثبات تقلید الائمۃ الکرام" کتاب لکھی۔

۵۷۔ مولانا سلامت اللہ بدایونی کان پوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۰۱ھ/ ۱۸۶۴ء)۔ آپ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) اور شاہ رفیع الدین محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۷ء) رحمۃ اللہ علیہما کے نامور شاگرد تھے۔ موصوف کو اِن بزرگوں سے تفسیر و حدیث اور خاندان ولی اللّٰہی کی اکثر تصانیف کی سند و اجازت حاصل تھی۔ اِنھوں نے وہابیانِ ہند کے ردّ میں رسالہ "اشباع الکلام فی اثبات المولد والقیام" اور رسالہ "در تحقیق جواز مصافحہ و معانقہ عیدین" لکھا۔ آپ ایک متبحر عالمِ دین اور سیکڑوں علماء و فضلاءِ دہر کے استاد ہو گزرے ہیں۔

۵۸۔ مولانا عبد القادر بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء)۔ آپ اہلسنّت کے مایۂ ناز عالمِ دین و بزرگ مولانا فضلِ رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) کے فرزندِ ارجمند اور امامِ معقولات و جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے مجاہدِ اعظم و ناشرِ فتویٰ جہاد، اسیرِ انڈمان، حضرت علّامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے مایۂ ناز اور سرمایۂ روزگار شاگرد ہو گزرے ہیں۔ برٹش گورنمنٹ کی سرپرستی میں جب ندوۃ العلماء کی تحریک کا چکر چلایا گیا تو آپ نے سرگرمی سے اُس کی مخالفت کی۔ وہابیہ کے ردّ میں "[1] احسن الکلام فی تحقیق عقائد الاسلام (عربی)، [2] سیف الاسلام المسلول علی المناع بعمل المولد والقیام (فارسی)، [3] حقیقۃ الشفاعہ اور [4] شفاعۃ السائل وغیرہ کتب و رسائل آپ کے تبحر علمی اور حق پسندی کے روشن دلائل ہیں۔

۵۹۔ نواب قطب الدین خان دہلوی (المتوفی ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۲ء)۔ آپ نے مشکوٰۃ

المصابیح کی اُردو میں "مظاہرِ حق" کے نام سے شرح لکھی۔ آپ نے غیر مقلدین کے ردّ میں
"تنویر الحق"، توفیر الحق اور تحفۃ العرب والعجم" وغیرہ رسائل لکھے۔ انتقال مکہ معظمہ میں
ہوا تھا۔ آپ غیر مقلدین کے خلاف اور مقلد وہابی تھے۔

۶۰۔ مولانا محمد حیات سندھی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۱۶۳ھ/ ۱۷۴۹ء) نے عالمِ جوانی میں
مدینہ منورہ کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں وہابیہ کے ردّ میں رسالہ "حیات النبی"
عربی زبان میں لکھا تھا۔

۶۱۔ مولانا مفتی ولی اللہ فرخ آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۴۹ھ/ ۱۸۳۲ء)۔ فاضلِ اجل
اور مفسرِ قرآن تھے۔ وہابیہ کے ردّ میں "حزب التوسل الیٰ جناب سید الانبیاء
والرسل" کتاب لکھی۔

۶۲۔ مولانا مفتی ارشاد حسین رام پوری نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۱۱ھ/ ۱۸۹۳
اہلِ علم میں آپ کی ذات محتاجِ تعارف نہیں۔ سرگروہِ غیر مقلداں، میاں نذیر حسین دہلو
(المتوفی ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ء) کی کتاب "معیار الحق" کا ایسا وسیع النظری سے
فاضلانہ ردّ "انتصار الحق" کے نام سے لکھا کہ کسی غیر مقلد کو انتصار الحق کا جوا
لکھنے کی آج تک جرأت نہیں ہوئی۔ اِس کتاب کے ۴۱۶ صفحات ہیں۔

۶۳۔ مولانا وکیل احمد سکندر پوری رحمۃ اللہ علیہ مشہور عالمِ دین اور صاحبِ تصانیف
کثیرہ ہیں۔ ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء سے حیدر آباد دکن، سرکار آصفیہ کی ملازمت
رہے۔ وہابیہ کے ردّ میں "ارشاد العنود الیٰ طریق آداب عمل المولود" نا
کتاب لکھی۔

۶۴۔ مولانا محمد شوکت علی صدیقی سندیلوی رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ مشہور عالم اور بزرگ ہو
ہیں۔ اِنھوں نے مولوی محمد اسحاق دہلوی کی مأتہ مسائل کے غلط دلائل و ما
راز کھولنے اور اُن کی خفیہ وہابیت کا راز افشاء کرنے کی غرض سے "افہام الم
بجواب مأتہ مسائل" لکھی اور "علم الیقین فی مسائل الاربعین" بھی آپ کی قا
تصنیف ہے۔

۶۵۔ مولانا عبدالکریم درویش رحمۃ اللہ علیہ نے شفاعت کے بارے میں تقویۃ الایمانی نظریات کے ردّ میں بنام "جواہر الایقان فی شفاعۃ رسول الانس والجان" تصنیف فرمائی۔

۶۶۔ مولانا حیدر علی رام پوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء)۔ آپ نے شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) سے حدیث کی سند حاصل کی۔ وہابیہ کے ردّ میں "افہام الغافل در تفہیم المسائل" کتاب لکھی۔

۶۷۔ مولانا عبدالغفور خاں نساح رحمۃ اللہ علیہ نے نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی (المتوفی ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء) وغیرہ غیر مقلدین کے ردّ میں "نصرۃ المسلمین، الرد علیٰ غیر المقلدین" کے نام سے کتاب لکھی جو ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء میں مطبع حامی الاسلام دہلی سے باہتمام فیض الحسن خان صاحب طبع ہوئی۔

۶۸۔ مولانا صبغۃ اللہ مدراسی رحمۃ اللہ علیہ نے منکرینِ حیاتِ انبیاء کے ردّ میں "تنبیہ الاغبیاء فی حیات الانبیاء" نامی کتاب لکھ کر ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء میں مدراس سے شائع کروائی۔

۶۹۔ مولانا بشیر الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مقلد و غیر مقلد وہابیوں کی گمراہی و گمراہ گری کے بارے میں ایک فتویٰ لکھا اور تمام علمائے دہلی نے اُس کی تائید و تصدیق میں مُہر و دستخط کیے۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ازراہِ تقیہ اور اُن دنوں اپنی جماعت کا وجود و عدم برابر دیکھتے ہُوئے غیر مقلدوں کے شیخ الکل اور سرپرست میاں نذیر حسین دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) نے بھی اِس فتویٰ کی تائید کرتے ہُوئے مُہر و دستخط کیے ہُوئے ہیں۔ یہ مبارک فتویٰ مطبع سید الاخبار سے ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء میں طبع ہوا۔

۷۰۔ مولانا محمد شاہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے میاں نذیر حسین دہلوی کی کتاب "معیار الحق" کے ردّ میں مبسوط کتاب "مدار الحق فی ردِّ معیار الحق" لکھی، جو مطبع حسنی دہلی سے ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں طبع ہُوئی۔ صفحات ۴۸۰ ہیں۔

۷۱۔ مولانا منصور علی بن مولانا محمد حسن مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہما نے غیر مقلدین کے ردّ میں "فتح المبین فی کشف مکائد غیر مقلدین" کے نام سے ایک مبسوط کتاب لکھی

اور اُس کا ضمیمہ "تنبیہہ الوہابیین" کے نام سے لکھا۔ کتاب ۵۲۴ صفحات پر مشتمل ہے،
اِس پر دہلی، حیدرآباد اور بریلی کے ۳۳ علمائے کرام کے دستخط ہیں۔ ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء
میں یہ کتاب مطبع دارالعلوم فرنگی محل لکھنؤ سے باہتمام مولانا محمد یعقوب طبع ہوئی۔

۷۲۔ مولانا محمد امیرالدین اکبرآبادی علیہ الرحمہ نے غیر مقلدین کے بہتر سوالات کے مسکت
جواب "انوارِ محمدی" کے نام سے لکھے اور وُہ کتاب مطبع نولکشور لکھنؤ سے ۱۲۹۲ھ/
۱۸۷۵ء میں طبع ہوئی۔

۷۳۔ مولانا حافظ محمد یعقوب دہلوی علیہ الرحمہ نے مسئلۂ شفاعت میں وہابیہ کے نظریات کا
رد کرتے ہوئے کتاب "افضل البضاعہ فی حقیقۃ الشفاعہ" لکھی۔

۷۴۔ مولانا محمد عظیم علیہ الرحمہ نے غیر مقلدین کی فہمائش کے لیے "اثبات وجوبِ تقلید
شخصی بالقرآن والاحادیث النبوی" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو احسن المطابع پٹنہ
سے ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء میں چھپی۔

۷۵۔ مولانا محمد عبدالرشید بن مولانا محمد عبدالحکیم دہلوی رحمۃ اللہ علیہما نے منکرینِ تقلید کے رد
میں "القول الرشید فی اثبات التقلید" کتاب لکھی جو مطبع احمد قلندر معسکر بنگلور سے
۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء میں چھپی۔

۷۶۔ مولانا محمد مجیدالدین سہارنپوری علیہ الرحمہ نے وہابیہ کے رد میں "اعانۃ المسلمین فی
امور الدین" کتاب لکھی۔

۷۷۔ مولانا زین الدین حنفی مدراسی علیہ الرحمہ نے "القول المتین" کتاب لکھ کر وہابیہ ک
رد کیا اور اُسے مطبع مظہر العجائب مدراس سے ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء میں طبع کروایا۔

۷۸۔ مولانا قادر علی قادرپوری رحمۃ اللہ علیہ نے "دلیل الیقین فی رد المنکرین" کتاب وہابیہ
رد میں لکھی۔ یہ مطبع قادریہ کلکتہ سے ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء میں طبع ہوئی۔

۷۹۔ مولانا احمد حسن کانپوری رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ
(المتوفی ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء) کے اجل خلفاء میں سے ہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی
تقویۃ الایمان میں کنایۃً اور یکروزی میں صراحۃً جو امکانِ کذب کا غیر اسلامی

خلافِ اسلام نظریہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا اُس کے ردّ میں اور جملہ حمایت کرنے والوں کی تردید کرتے ہُوئے کتاب "تنزیہ الرحمٰن عن شائبۃ الکذب و النقصان" لکھی۔

۸۰۔ مولانا عبدالسبحان ہسوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۶ء) - آپ حضرت شاہ احمد سعید مجددی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء) کے خلیفہ تھے۔ منکرینِ تقلید کے ردّ میں ایک کتاب "التہدید فی وجوب التقلید" کے نام سے لکھی۔

اسی طرح دیگر کتنے ہی علمائے اہلسنّت اور عمائدِ دین وملّت نے وہابیہ کی تردید میں مختلف کتب ورسائل لکھے اور "گربہ کشتن روزِ اوّل" پر عمل کرتے ہُوئے اِس نجدی پودے کو پروان چڑھنے سے پہلے بیخ وبُن سے اُکھاڑ پھینکنے پر تُل گئے، تقریر وتحریر کے ہر میدان میں اِن کا ناطقہ بند کرنا شروع کر دیا۔ خود ولی اللّٰہی خاندان کے علمائے کرام اور شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) کے خوشہ چین حضرات یعنی علمی و روحانی فرزندوں نے بڑھ چڑھ کر اِن خارجیت کے علمبرداروں کا محاسبہ کرنا شروع کر دیا تو مصنفِ تقویۃ الایمان کا رشتہ اپنے خاندان اور دہلی مرکز سے ٹوٹ کر رہ گیا۔ متبعین بھی ٹوٹنے شروع ہو گئے، مسلمانانِ اہلسنت وجماعت سے کٹ کر جو اپنا "محمدی گروہ" بنانا شروع کیا تھا، بہت سے مسلمان خبردار ہونے پر اِس سے علیحدگی اختیار کرنے لگے اور اِس طرح برٹش گورنمنٹ کا پہلا تخریبی منصوبہ ناکام ہو کر رہ گیا۔

دیوبندیت کی ابتدا: دُوسرے منصوبے کے دوران، مولوی محبوب علی کی اِس تحریک سے علیحدگی بلکہ مخالفت کے بعد جب سیّد احمد صاحب کے پاس امدادی سامان ورقوم کی ترسیل کا سلسلہ اور نئی بھرتی کر کے افرادی امداد بھیجنے کا معاملہ تقریباً بند ہو کر رہ گیا، تو مرکز سے تعلق قائم کرنے کی کوشش کی گئی، اُدھر مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء) جانشینِ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی رحمۃُ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) بھی دولت کی اِدھر فراوانی دیکھ کر کسی قدر مائل ہو چکے تھے، لہٰذا جلد ہی اِن کے ساتھ رابطہ قائم ہو گیا یا قائم کر دیا گیا۔ مولوی محمد اسحاق دہلوی بڑی حد تک صلح کُل اور خاموش طبع عالِم تھے۔ اِس خارجی ٹولے کے ساتھ بھی

کسی قدر ہاں میں ہاں ملانی شروع کر دی لیکن ایسے انداز میں کہ وہابیوں کی جو رُسوائی ہو رہی تھی اُس سے بچنا اور علمائے اہلسنّت کی نگاہوں میں اپنا وقار بھی بحال رکھنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تقویۃ الایمان میں جن امور کو کفر و شرک ٹھہرایا گیا ہے۔ آپ نے اپنی تصنیف "مائۃ مسائل" میں، اُن میں سے بعض باتوں کو حرام اور بعض کو ناجائز یا مکروہ لکھا ہے۔ موصوف کی یہ دوغلی پالیسی بھی اُن کے وقار کو قائم رکھنے میں کارگر ثابت نہ ہو سکی۔ علمائے اہلسنت کی نگاہوں میں وہ گرنے شروع ہو گئے تو شرمندگی سے بچنے کی خاطر ۱۲۵۷ھ/ ۱۸۴۱ء میں حجاز مقدس کو ہجرت کر گئے۔ موصوف کی اِس دوغلی روش کے بارے میں جناب ابوالکلام آزاد نے یُوں وضاحت پیش کی ہے:

"اُنھوں (مولانا ابوالکلام کے والد مولانا خیرالدین) نے وہابیت کو دُو اصولی قسموں میں بانٹ دیا تھا۔ کہتے تھے، دُو فرقے ہیں، ایک اسمٰعیلیہ ہے دُوسرا اسحاقیہ۔ اسمٰعیلیہ سے مقصود وُہ فرقہ تھا جو رسوم و بدعات کی مخالفت کے ساتھ تقلید شخصی کا بھی تارک (یعنی غیر مقلد وہابی) ہو، جیسا کہ مولانا اسمٰعیل شہید نے تقویۃ الایمان اور جلاء العینین وغیرہ میں لکھا ہے۔

اسحاقیہ سے مقصود وُہ فرقہ ہے، جو حنفیت و تقلید سے تو انکار نہیں کرتا لیکن بدعات و رسوم کا مخالف (مقلد وہابی) ہے۔ اِس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ شاہ اسحاق نے مائۃ مسائل میں بدعات و رسوم سے اختلاف کیا ہے مگر تقلید و حنفیت کے خلاف کوئی بات نہیں کہی ہے۔ وہ (مولانا خیرالدین جالندھری) کہتے تھے کہ جب اسمٰعیلیہ غیر مقبول ہو گئی تو وہابیت نے اپنے مکائد کی اشاعت کے لیے راہِ تقیہ اختیار کر لی اور حنفیت کی آڑ قائم کر کے اپنے دیگر عقائد کی اشاعت کرنے لگے۔"[1]

مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۵ء) اصل میں اُس وہابی گروہ کے

---

[1] ابوالکلام آزاد، مولوی: آزاد کی کہانی، ص ۱۶۵

بانی ہیں جو مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی پیدا کردہ جماعت یعنی محمدی[۱] یا موحد[۲] یا اہلحدیث[۳] جماعت کے ناکام رہ جانے کے بعد پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہابیت کے لیبل سے بچنے اور سُنّیوں میں بھرم رکھنے کی خاطر موصوف ہجرت کر گئے اور جاتے وقت اپنے نئے گروہ کے مفادات کا تحفظ کرنے کی خاطر مولوی مملوک علی نانوتوی کی قیادت میں ایک بورڈ کی تشکیل کر گئے۔ پروفیسر محمد ایوب قادری نے اِس امر کا تذکرہ یُوں کیا ہے:

"مولانا عبیداللہ سندھی کا خیال ہے کہ جب ۱۲۵۷ء میں شاہ اسحاق حجاز مقدس کو ہجرت کر گئے تو تحریک (ماڈرن وہابیت) کی نگرانی کے لیے ایک بورڈ بنایا گیا، جس کے صدر مولانا مملوک العلی اور تین رکن، مولانا نواب قطب الدین (ف ۱۲۸۹ھ)، مولانا مظفر حسین کاندھلوی (ف ۱۰ محرم ۱۲۸۳ھ، م ۲۵ مئی ۱۸۶۶ء) اور مولانا شاہ عبدالغنی دہلوی (ف ۶ محرم ۱۲۹۵ھ) تھے۔"[1]

مولانا عبیداللہ سندھی (المتوفی ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۴ء) کے اِس سلسلے میں جو تاثرات تھے، بہتر یہی نظر آتا ہے کہ اُنھیں خود مولانا سندھی کے لفظوں میں ہی بیان کر دیا جائے۔ چنانچہ موصوف یُوں وضاحت کرتے ہیں:

"مولانا محمد اسحاق مکّہ معظمہ میں اپنے بھائی مولانا محمد یعقوب دہلوی کو اپنے ساتھ لے گئے اور دہلی میں مولانا مملوک علی کی صدارت میں مولانا قطب الدین دہلوی اور مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور مولانا عبدالغنی دہلوی کو ملا کر ایک بورڈ بنا دیا، جو اِس نئے پروگرام (یعنی وہابیت کی جدید تشکیل) کی اشاعت کر کے نئے سِرے سے جماعتی نظام پیدا کرے اور یہی جماعت ہے جو آگے چل کر دیوبندی نظام چلاتی ہے۔"[2]

---

[1] محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۱۷۸

[2] عبیداللہ سندھی، مولوی: شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک، ص ۱۱۰

مولوی مملوک علی نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء)

اینگلو انڈین علماء کی کھیپ: جو وہابیوں کی نئی جماعت کے سرپرست مقرر کیے گئے تھے۔ وہ دہلی کالج میں شعبۂ عربی کے صدر مدرس تھے۔ تجویز یہی ہوئی ہو گی کہ جماعت میں عام لوگوں کی باقاعدہ بھرتی کرنے سے پہلے ایسے علماء تیار کیے جائیں، جو گورنمنٹ کے پروردہ اور وہابیتِ جدیدہ کے دلدادہ ہوں۔ چنانچہ خاموشی اور مستعدی سے اینگلو انڈین علماء کی کھیپ دہلی کالج میں تیار کی جانے لگی۔ مولوی مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:

> ”نانوتہ کے لیے تعلیمی راہ کا دروازہ مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے کھل چکا تھا۔ وہ دہلی میں مقیم تھے اور دہلی کی سب سے بڑی مرکزی درسگاہ، دہلی کالج کے اُستاد تھے۔ نہ صرف نانوتہ بلکہ عثمانی شیوخ کی برادری اطراف وجوانب کے جن قصبات میں پھیلی ہوئی تھی وہاں تک کے بچے مولانا مملوک العلی کے اِن خاص حالات سے کافی استفادہ کر رہے تھے۔“ [1]

دہلی کالج سے جس قسم کے علماء کی کھیپ تیار کی جا رہی تھی، وہ گورنمنٹ کے منظورِ نظر بن کر نکلتے تھے اور وہی انگریز جو مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھانے میں قطعاً کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے، وہ اِس کالج کے تیار کردہ علماء کو دوڑ کر سینے سے لگاتے اور جلد از جلد اُنھیں برسرِ روزگار کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ قادری صاحب رقمطراز ہیں:

> ”مولانا مملوک العلی دہلی کالج کے شعبۂ عربی کے صدر مدرس تھے اس لیے نانوتہ اور دیوبند کے حضرات اِن کی وجہ سے کالج کے تعلیمی وظائف اور دوسری سہولتوں سے بھی مستفید ہوئے ہوں گے اور دہلی کالج کے فارغ التحصیل ہونے کی وجہ سے سرکاری اداروں میں منسلک ہونے میں بھی آسانی رہی ہو گی۔ بلکہ اِن حضرات کے سرکاری اداروں میں تقرر کے لیے دہلی کالج میں تعلیم حاصل کرنے کو بھی ایک قسم کی سند خیال کیا گیا اور یہ سمجھا

---

[1] مناظر احسن گیلانی، مولوی: سوانح قاسمی، ج ۱، ص ۲۱۰۔

گیا ہوگا کہ یہ حضرات دہلی کالج کے ذریعے طریقۂ تعلیم وغیرہ سے واقف ہو چکے ہیں، ورنہ اتنی آسانی سے قدیم طرز کے فارغ التحصیل علماء کو گورنمنٹ، سرکاری اسکولوں، کالجوں اور محکمۂ تعلیم کے ذمہ دار عہدوں پر مقرر نہیں کر سکتی تھی۔“[1]

زمانے کی نیرنگیاں عجیب ہیں، ایک وقت تھا کہ مولوی مملوک علی نانوتوی اہلسنت و جماعت میں شامل تھے اور ہندی وہابیت کے سنگِ بنیاد یعنی تقویۃ الایمان کو تفویۃ الایمان (ایمان کو ختم کرنے والی کتاب) کہا کرتے تھے[2] لیکن ایک وہ وقت آیا کہ وہابیہ کے جدید بیڑے کا امیر البحر بننا بھی منظور کر لیا۔ مولوی مملوک علی نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) نے مطلوبہ علماء کی جو کھیپ تیار کی اُن میں سے چند حضرات کے نام یہ ہیں:

”مولانا مملوک العلی کے تلامذہ کی تعداد کا استحضار ناممکن ہے۔ اُن کے شاگردوں میں بڑے بڑے علماء مثل مولانا مظہر نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی، مولوی کریم الدین پانی پتی، منشی جمال الدین مدار المہام بھوپال، شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین ایل۔ ایل۔ ڈی، مولوی عالم علی مرادآبادی (ف ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء)، مولوی سمیع اللہ دہلوی، مولانا عبدالرحمٰن پانی پتی وغیرہ کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔“[2]

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی پیدا کردہ جماعت، جو آجکل اہلحدیث کے نام سے متعارف ہے جب متحدہ ہندوستان میں غیر مقبول ہو کر راندی گئی تو مولوی مملوک علی کی سرپرستی میں دوسری جماعت بنانے کی سکیم تیار کی گئی پہلے اُس کے چلانے والے علماء تیار کیے گئے،

---

[1] محمد ایوب قادری: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۲۷

[2] محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۱۰۳

اِس کے بعد برٹش گورنمنٹ نے اپنے اُن منظورِ نظر علماء کو کس طرح اور کہاں کہاں مسلمانوں پر مسلّط کیا، ایک دہلی کالج کی کتنی برانچیں اور ذیلی شاخیں قائم کی گئیں، اِس سلسلے میں مشہور دیوبندی عالم، مولوی عبید اللہ سندھی (المتوفی ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۴ء) یُوں رقمطراز ہیں:

> "۱۸۵۷ء میں اِس جماعت کی مرکزی قوت میں سلطانِ دہلی کی طرفداری اور غیر جانبداری کی بنا پر ایک اختلاف رُونما ہُوا اور یہ جماعت دو حصّوں میں تقسیم ہوگئی۔ بعد میں اِس جماعت کے دہلی کے ایک مرکز کی بجائے دیوبند اور علی گڑھ دو مرکز بن گئے۔ مولانا محمد قاسم، دہلی کالج کے عربی حصہ کو دیوبند لے گئے اور سرسیّد احمد خاں نے کالج کے انگریزی حصہ کو علی گڑھ پہنچا دیا۔"[1]

نئے مراکز یعنی دیوبند اور علی گڑھ کا برٹش گورنمنٹ کے بارے میں کیا نظریہ تھا، مولوی عبدالخالق قدوسی کی زبانی سُنیے:

> "دل کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے بظاہر علی گڑھ فریق اور دیوبندی جماعت گورنمنٹ کے معاملہ میں قدم سے قدم ملاتے نظر آتے ہیں۔ دونوں کا مقصد علمی میدان میں مسلمان قوم کو آگے بڑھانا ہے، حصولِ مقصد کے لیے انگریز سے کامل وفاداری کو دونوں ہی ذریعہ سمجھتے ہیں۔"[2]

دیوبند مرکز بظاہر معلوم یہی ہوتا ہے کہ مسلمانانِ پاک و ہند میں سے سرکاری تعلیم حاصل کرنے والوں کو علی گڑھ میں تربیت دینے اور دینی علوم سے دلچسپی رکھنے والوں کو مدرسہ دیوبند میں مخصوص انداز پر ڈھالنے کی مہم چلائی گئی۔ لبعض وہ مسلمان تھے جو دہلی کالج کی انگریزی تعلیمات سے کتراتے تھے تو دُوسرے دینی علوم سے جان چراتے تھے، دونوں قسم کے حضرات کو پابندِ سلاسل رکھنے کی خاطر ایک مرکز کے علیحدہ علیحدہ مرکز بنا دیے گئے۔ جہاں تک مقاصد کا تعلق ہے وہ قطعی طور پر واضح ہے کہ حکومت

---

[1] عبید اللہ سندھی، مولوی: شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک، ص ۱۱۲

[2] ہفت روزہ الاعتصام، لاہور۔ بابت ۹ر اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۶

فرماں برداری کرنے اَور اِس طرح حکومت کا اعتماد حاصل کر کے زیادہ سے زیادہ مراعات و عنایات کی بھیک مانگ کر پھلنے پھُولنے کے مواقع حاصل کرتا تھا اور قوم کے انگریزی خوان یا مولویانہ ذہن رکھنے والوں کو اِسی غلامانہ ذہنیت کی افیون کھِلا کر اپنے اپنے دائرۂ کار میں کھُل کھیلنے کے مواقع فراہم کرتے تھے۔ دونوں مراکز کے راستے الگ الگ لیکن منزلِ مقصود ایک تھی۔

انسانی فطرت کی یہ کمزوری کون سی ڈھکی چھپی بات ہے کہ وُہ کوئی غلط اقدام کرے یا ایسا کرنے پر مجبور کیا جائے تو بسا اوقات وہ تاویلات کا سہارا لیتا ہے اَور اُس غلط حرکت کو درست منوانے کی اِس انداز سے سر توڑ کوشش کرتا ہے کہ گویا دُوسروں کا اُس کی صحت پر ایمان لانا ہی اوّلین فریضہ اَور اُن کا مقصدِ حیات ہو۔ اِس مرحلے پر خواہ زاویۂ نظر کتنا ہی خلافِ دین و دیانت ہو جائے اُس کی کم ہی پروا کی جاتی ہے۔ ایسے واقعات کا مظاہرہ اگر ایک فرد سے سرزد ہو اُس کی سنگینی کا عالم اَور ہے لیکن یہی طرزِ عمل اگر جماعتی طور پر اختیار کر لیا جائے تو اُس کی مضرت کا ایسے حالات میں اندازہ لگانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

دہلی کالج کو علی گڑھ اور دیوبند کے مراکز میں تبدیل کرنے کی وجہ بالکل صاف اور سیدھی سادی بات تھی لیکن حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ افسانہ نویسی میں بات کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہے۔ مدرسہ دیوبند کے موجودہ مہتمم قاری محمد طیب صاحب فرماتے ہیں:

> "اچانک چند نفوسِ قدسیہ نے بالہامِ خداوندی اپنے دل میں ایک خلش اور کسک محسوس کی۔ یہ خلش علومِ نبوت کے تحفّظ، دین کو بچانے اَور اِس کے راستے سے ستم رسیدہ مسلمانوں کو بچانے کی تھی۔ وقت کے یہ اولیاءاللہ (چشم بددُور) ایک جگہ جمع ہُوئے اور اِس بارہ میں اپنی اپنی قلبی واردات کا تذکرہ کیا جو اُس پر مجتمع تھیں۔"[1]

موصوف اِسی سلسلے میں مزید یُوں وضاحت فرماتے اور قارئین کو خواب آور گولیاں کھِلاتے ہیں:

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولانا: بیس بڑے مسلمان، ص ۲۴

> "اِس سے جہاں یہ واضح ہے کہ اُس وقت کے ہندوستان میں یہ تجویز کوئی رسمی تجویز نہ تھی بلکہ الہامی تھی، وہیں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اِس تجویز کے پردہ میں مُلک گیر اصلاح کی سپرٹ چھپی ہُوئی تھی۔" [1]

اگر انبیائے کرام کے علوم و معارف کا ذکر آجائے تو علمائے دیوبند کی برداشت کا پیما نہ صرف لبریز ہو جاتا ہے بلکہ اکثر اوقات اِس طرح چھلک اٹھتا ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر کفر و شرک کا فتویٰ جڑ دینا گویا تکیۂ کلام بن جاتا ہے۔ لیکن یہی حضرات جب اپنے مولویوں کا ذکر کرتے ہی تو سُننے اور پڑھنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جو دروازے اِن کے بقول انبیائے کرا پر بھی بند تھے وہ علمائے دیوبند کے لیے کس طرح اور کس نے کھول دیے؟ اور پھر وُہ ی خلش محسوس کیے بغیر نہیں رہتا کہ جن باتوں کے حصول کا یہ حضرات انبیائے کرام تک کے لی انکار کرتے ہیں، وُہی باتیں اپنے علماء کے لیے کیوں ثابت کرتے رہتے ہیں؟ آخر یہ اپنے علماء کا مقام انبیائے کرام سے بھی اُونچا دکھانے میں کیوں کوشاں رہتے ہیں؟ آئیے، قار محمد طیب صاحب کا ایک بیان اور ملاحظہ فرمائیے:

> "حضرت سیّد احمد شہید رائے بریلوی دیوبند سے گزرتے ہُوئے جب اُس مقام پر پہنچے تھے، جہاں دارالعلوم کی عمارت کھڑی ہُوئی ہے تو فرمایا تھا کہ مجھے اِس جگہ سے عِلم کی بُو آتی ہے۔" [2]

جب مدرسہ دیوبند کی بنیاد رکھی گئی تو جھونپڑیوں میں کام شروع کیا گیا تھا۔ ذرا ابلاغ کی ہمہ گیری نے آج تو اعلان اور پروپیگنڈے کے انداز ہی بدل دیے۔ لیکن جب ذرائع حاصل نہ تھے اُس وقت بھی آخر تبلیغ اور پروپیگنڈے کے پسندیدہ طریقے موجود مگر کارکنانِ دارالعلوم دیوبند نے اُس وقت بھی اپنے پروپیگنڈے کی بنیاد کشف و کراما پر رکھی جو وہابیت و دیوبندیت کی ضد ہے۔ چنانچہ مفتی عزیز الرحمٰن نٹھوری لکھتے ہیں کہ:

---

[1] عبدالرشید، مولانا: بیس بڑے مسلمان، ص ۲۵

[2] ایضاً: ص ۲۹

"جس وقت دیوبند کے مدرسہ میں چھپر پڑے ہوئے تھے، آپ (مولانا محمد یعقوب صاحب) نے خواب میں دیکھا کہ جنت میں مکان کچے ہیں اور اُن پر چھپر پڑے ہیں۔ جب بیدار ہوئے تو فرمایا کہ الحمدُ للہ، مدرسہ کے یہ مکانات مقبول ہیں۔"[1]

مدرسہ دیوبند کے قائم کرنے کی ضرورت کس کو پیش آئی تھی؟ اِس کے بانی، مدرس اور چلانے والے کون حضرات تھے؟ اِس سلسلے میں جماعت اہلحدیث کے مشہور عالم، مولوی عبدالخالق قدوسی یُوں لکھتے ہیں:

"ایسے میں چند ایسے حضرات میدان میں آئے جن کی پُوری تربیت گورنمنٹ کے تعلیمی اداروں میں ہُوئی تھی اور سرکاری ملازمت میں رہ کر وہ اپنے آپ کو گورنمنٹ کے مکمل وفادار ثابت کر چکے تھے۔ انھوں نے دیوبند میں ایک عربی دینی مدرسہ "دار العلوم" کی بنیاد رکھ دی۔ اُوپر کے بیان کردہ پس منظر میں دیکھا جائے تو دینی تعلیم کا یہ اہتمام، گورنمنٹ انگریزی کی منشا اور پالیسی کے مطابق تھا اور چونکہ اِس پہلے دینی مدرسہ کے یہ بانی اور صدر مدرس، دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور سرکاری ملازمت میں رہ کر گورنمنٹ کا مکمل اعتماد حاصل کر چکے تھے، نیز یہ حضرات ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے سے ریٹائر ہُوئے تھے، اِس لیے قدرتاً انگریزی گورنمنٹ نے اُن کی حوصلہ افزائی فرمائی، بلکہ انگریزی ڈپلومیسی کی روشنی میں دیکھا جائے تو کوئی بعید نہیں کہ اِسی مدرسہ کے قیام میں اُس (حکومت) کا کسی طرح کا ایماء شامل ہو۔"[2]

قاری محمد طیب صاحب نے دارالعلوم دیوبند کے بانی، مؤسس، اراکینِ مجلس اور معاونین کا تذکرہ یُوں کیا ہے:

"اِس بنا میں خصوصیت سے حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب قدس سرہٗ،

---

[1] عزیز الرحمٰن نہٹوروی، مفتی: تذکرہ مشائخ دیوبند، ص ۱۷۷

[2] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، بابت ۲۳ر اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۶

حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب قدس سرہٗ اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ قابلِ ذکر ہیں، جن کا ہاتھ ابتداء ہی سے تاسیسِ مدرسہ میں تھا۔ یہ حضرات خصوصیت سے حضرت نانوتوی صاحب قدس سرہٗ (مولانا محمد قاسم) کے دست و بازو رہے ہیں اور بنا کے بعد بھی اِس کی ذمہ دار مجلس کے رکنِ رکین کی حیثیت سے مدرسہ کے تمام امور میں عملاً شریک رہے ہیں۔"[1]

دارالعلوم دیوبند کا سب سے پہلا صدر المدرسین کون مقرر کیا گیا؟ پروفیسر محمد ایوب قادری یُوں جواب دیتے ہیں:

> "جب ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ کو مدرسہ اسلامیہ دیوبند قائم ہوا، تو مولانا محمد یعقوب صدر مدرس مقرر ہُوئے۔ اُس وقت مولانا محمد یعقوب سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔"[2]

مولوی عبدالخالق قدوسی نے موصوف کی تقرری کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار یُوں کیا ہے:

> "قیامِ مدرسہ کے بعد سب سے پہلے صدر مدرس کی حیثیت سے جس شخص کا تقرر ہُوا وُہ مولانا مملوک العلیؒ کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوبؒ نانوتوی تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ بزرگ بھی بانیانِ مدرسہ کی طرح ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدہ سے ریٹائر ہُوئے تھے۔ یہ بزرگ بھی ۱۸۵۷ء کے وقت اِسی عہدہ پر فائز تھے۔"[3]

بانیانِ مدرسہ اور اُس کی مجلس کے خاص اراکین میں سے مولوی ذوالفقار علی دیوبندی اور مولوی فضل الرحمٰن دیوبندی نیز اِس مدرسہ کے اوّلین صدر مدرس یعنی مولوی محمد یعقوب نانوتو کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری نے لکھتے ہُوئے اِن حضرات کی ملازمتوں کا اظہار

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، ص ۲۶

[2] محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۱۹۲

[3] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، بابت ۹ ر اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۶

کر کے ایک بہت بڑی الجھن کو سلجھا دیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں :

> "دہلی کالج کے فاضل مدرس، مولانا مملوک العلی کے وطن و برادری کے جن حضرات نے مولانا کی سرپرستی میں تعلیم پائی وہ حضرات بھی تعلیمی نظام میں منسلک نظر آتے ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی اور مولانا ذوالفقار علی دیوبندی ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے۔ مولانا مملوک العلی کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نانوتوی اجمیر کالج میں مدرس مقرر ہوئے پھر بنارس، بریلی اور سہارنپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے۔" [1]

مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کے بارے میں ایک جگہ موصوف نے یوں مزید وضاحت فرمائی ہے :

> "شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے والد مولانا ذوالفقار علی دیوبندی بریلی کالج میں پروفیسر تھے۔ مولانا ذوالفقار علی کا بریلی میں کئی سال قیام رہا۔" [2]

مدرسہ دیوبند کے اوّلین صدر مدرس مولوی محمد یعقوب نانوتوی اور مولوی فضل الرحمٰن دیوبندی کے بارے میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے :

> "مولانا محمد یعقوب بھی بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے۔ مولانا محمد احسن کی بیاض سے معلوم ہوتا ہے کہ شعبان ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی بریلی میں تھے۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی بھی ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء میں بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ جب مولانا محمد احسن نے انقلاب ۱۸۵۷ء میں بریلی کو چھوڑا تو بعض معاملات و انتظامات ضروری مولانا فضل الرحمٰن ہی کے سپرد کیے تھے۔" [3]

---

[1] محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۳۸

[2] ایضاً، ص ۴۵

[3] ایضاً: ص ۴۶

اگر پروفیسر فیروز الدین رُوحی ناراض نہ ہوں اور ہمیں اِس جسارت پر معذور سمجھتے ہُوئے فرمادیں تو ہم اُن کی خدمت میں یہ التجا بصد ادب کرتے ہیں کہ وُہ اپنے ممدوحین علمائے دیو یعنی برٹش گورنمنٹ کے پروردہ اور ریڈی میڈ نہیں، بلکہ تیار کردہ اینگلو انڈین علما بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب کا یہ بیان پڑھیں اور اِسے اپنی تصنیف جس کا غلطی سے "آئینۂ صدافت" نام لکھ بیٹھے ہیں، درج فرمالیں، کیونکہ درجِ ذیل د بیان اگر "آئینۂ صداقت" کے اگلے ایڈیشن میں ایڈ کرلیے جائیں تو اِن کے پڑھ لین بہتوں کا بھلا ہوگا۔ لیجیے پہلا بیان موصوف کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

"مولانا مملوک العلی کے صدر مدرس ہونے کی وجہ سے بھی دہلی کالج کی تعلیمی سرگرمیاں یقینی آگے بڑھیں اور مسلمانوں (اینگلو انڈین علماء) کی ایک ایسی کھیپ تیار ہُوئی کہ جس نے نئے نظامِ تعلیم میں منسلک ہوکر خاطر خواہ خدمات انجام دیں۔ مولانا محمد مظہر (مدرس آگرہ کالج)، مولانا محمد منیر (مدرس بریلی کالج)، مولانا محمد احسن (مدرس بنارس و بریلی کالج)، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (مدرس بریلی کالج و ڈپٹی انسپکٹر مدارس)، مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی (ڈپٹی انسپکٹر مدارس)، تو خاص اِن کے اعزّہ واحباب ہیں۔ اِن کے علاوہ شمس العلماء شیخ ضیاءُ الدین ایل۔ ایل۔ ڈی، شمس العلماء مولوی ذکاءُ اللہ، شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد (ف ۱۹۱۲ء)، شمس العلماء محمد حسین آزاد (ف ۱۹۱۰ء)، پیرزادہ محمد حسین (سشن جج)، خواجہ محمد شفیع (جج)، خان بہادر میر ناصر علی (ف ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء)، مولوی کریم الدین پانی پتی (ف ۱۸۷۹ء)، مولوی جعفر علی (ف ۱۳۱۴ھ) وغیرہ بہت سے ایسے حضرات ہیں کہ جو اِسی دہلی کالج کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ ہیں اور کم و بیش اِن تمام حضرات نے نئے تعلیمی نظام میں منسلک ہوکر نمایاں خدمات انجام دیں اور گورنمنٹ نے بھی اِن کی خدمات کو سراہا اور حُسنِ صلہ سے نوازا۔"[۱]

---

[۱] محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۱۷۷

جس مقصد کی خاطر برٹش گورنمنٹ نے مدرسہ دیوبند قائم کرنے کا اِن حضرات کو الہام کیا تھا، حکومت کا وُہ مقصد کہاں تک پُورا ہو رہا تھا؟ حکومت نے اِس امر کا خفیہ طور پر جائزہ لیا۔ پڑتال کرنے والے انگریز افسر کے تاثرات یہ تھے:

"اِس مدرسہ نے یومًا فیومًا ترقی کی۔ ۳۱؍ جنوری ۱۸۷۵ء بروز یکشنبہ لیفٹیننٹ گورنر کے ایک خفیہ معتمد انگریز مسمّٰی پامر نے اِس مدرسہ کو دیکھا تو اُس نے نہایت اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ اُس کے معائنہ کی چند سطور درجِ ذیل ہیں: "جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپے کے صرف سے ہوتا ہے وُہ یہاں کوڑیوں میں ہو رہا ہے۔ جو کام پرنسپل ہزاروں روپیہ تنخواہ لے کر کرتا ہے وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپیہ ماہانہ پر کر رہا ہے۔ یہ مدرسہ خلافِ سرکار نہیں بلکہ ممد و معاونِ سرکار ہے۔ یہاں کے تعلیم یافتہ لوگ ایسے آزاد اور نیک چلن (سلیم الطبع) ہیں کہ ایک کو دوسرے سے کچھ واسطہ نہیں۔ کوئی فن ضروری ایسا نہیں جو یہاں تعلیم نہ ہوتا ہو۔ صاحب مسلمانوں کے لیے تو اِس سے بہتر کوئی تعلیم اور تعلیم گاہ نہیں ہو سکتی اور میں تو یہ بھی کہہ سکتا ہُوں کہ غیر مسلمان بھی یہاں تعلیم پاوے تو خالی نفع سے نہیں۔ اے صاحب! سُنا کرتے تھے کہ ولایتِ انگلستان میں اندھوں کا مدرسہ ہے، یہاں آنکھوں سے دیکھا کہ دو اندھے تحریرِ اقلیدس کی شکلیں کفِ دست پر ایسی ثابت کرتے ہیں کہ باید و شاید۔"[1]

مولوی عبدالخالق قدوسی نے اِس معائنہ پر جو تبصرہ کیا ہے، سرِدست وُہ بھی ملاحظہ فرما لیا جائے۔ چنانچہ موصوف نے مذکورہ واقعہ نقل کرنے کے بعد یُوں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے:

"معائنہ کرنے والے انگریز نے اپنی رپورٹ کے اِس ٹکڑے میں دارالعلوم

---

[1] محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۲۱۷

دیو بند کی دو خصوصیات بتائی ہیں۔ (۱) موافقِ سرکار (۲) ممد و معاونِ سرکار۔ پہلی خصوصیت تو واضح ہے کہ اس مدرسہ میں کام کرنے والے لوگ سرکار انگریزی کے پورے پورے وفادار ہیں اور یہاں کسی قسم کی بغاوت کے جراثیم موجود نہیں، لیکن دوسری خصوصیت کہ یہ مدرسہ سرکار کا معاون بھی ہے، غور طلب ہے، سوال یہ ہے کہ ایک چھوٹا سا مدرسہ جس میں چند درویش منش بزرگ صبح و شام عموماً قال قال ابو حنیفہ کی تعلیم دیتے ہوں، برطانیہ جیسی عظیم سلطنت سے کیا تعاون کر سکتے تھے؟"[1]

مولوی عبد الخالق قدوسی کو مسٹر پامر کی اس رپورٹ پر کہ یہ مدرسہ ممد و معاون سرکار حیرانگی تھی کہ چند ملاؤں کا جمگھٹا، برطانیہ جیسی عظیم سلطنت کی کیا مدد کر سکتا تھا؟ لیکن موصو اس رابطے کے منکر نہیں ہیں بلکہ اس امداد و اعانت کے بارے میں وہ خود یوں رقمطراز ہی

> "یہ تو ہم نہیں کہتے کہ یہ لوگ ۱۸۵۷ء کے بعد میدانِ جنگ میں انگریزی فوج کے شانہ بشانہ مجاہدین کے خلاف لڑے تھے اور نہ ہی ہمارے پاس کسی قسم کے مادی تعاون کا کوئی ثبوت ہے، ہاں اس میں شک نہیں کہ ۱۸۶۵ء میں بننے والے اس دینی مدرسہ نے جذبۂ جہاد کو سرد کرنے کے لیے بڑا اہم کردار ادا کیا اور ہماری رائے میں یہی وہ خدمتِ جلیلہ ہے جسے مسٹر پامر اپنے الفاظ میں کہہ رہے ہیں، کہ یہ مدرسہ ممد و معاونِ سرکار ہے۔"[2]

مدرسہ دیو بند کے چھ ماہ بعد اسی دہلی کالج کے پروردہ اور مولوی مملوک علی نانوتوی (المتو ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۱ء) کے شاگردوں نے "مظاہر العلوم" کے نام سے سہارنپور میں د مدرسہ بھی قائم کر لیا۔ قدوسی صاحب لکھتے ہیں:

"اسی پُر سکون ماحول میں علمائے احناف (وہابی دیو بندی علماء) نے ۱۸۶۷ء

---

[1] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، بابت ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۵

[2] ایضاً، ص ۶

کو دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی اور اس سے صرف چھ ماہ بعد مظاہرالعلوم (سہارن پور) کا قیام عمل میں آیا۔ ان مدارس نے حیرت انگیز حد تک ترقی کی۔ اوّل الذکر مدرسہ کو بجا طور پر ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی درسگاہ کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ دونوں مدرسے ۱۸۶۷ء میں قائم ہوئے لیکن اِن کا تصور ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد بعض ذہنوں میں آ چکا تھا، بلکہ مولانا عبیداللہ سندھی تو دارالعلوم دیوبند کو دہلی کالج کا ہی ایک حصّہ قرار دیتے تھے"۔[1]

اینگلو انڈین علماء کی دُوسری دینی درسگاہ یعنی مدرسہ مظاہرالعلوم سہارن پور کس نے قائم کیا؟ صدر مدرس اور پہلے شیخ الحدیث کون مقرر ہُوئے؟ اِس بارے میں پروفیسر محمد ایّوب قادری یُوں وضاحت فرماتے ہیں:

"رجب ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۷ء میں مولوی سعادت علی سہارن پوری نے ایک مدرسہ سہارن پور میں جاری کیا۔ مولوی سخاوت علی انبیٹھوی، مولوی عنایت علی اور حافظ قمرالدین مدرس مقرر ہُوئے۔ تین مہینے کے بعد شوال ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۷ء میں مولانا محمد مظہر نانوتوی اس مدرسہ کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس مقرر ہُوئے۔ جب مدرسہ کو ترقی ہُوئی تو حافظ فضلِ حق نے اپنے مکان کو مدرسہ کے لیے وقف کر دیا۔ مکان کی عمارت توڑ کر مدرسہ کی عمارت تعمیر کی گئی۔ حافظ فضلِ حق (ف ۱۳۰۲ھ) مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے مرید اور مولانا محمد مظہر صاحب کے مخلص دوست تھے۔ مدرسہ تعمیر ہونے کے بعد مدرسہ کا نام "مظاہرالعلوم" تجویز ہُوا۔ مولانا احمد علی محدث سہارن پوری بھی اِس مدرسہ کے معین و مددگار رہے تھے۔ مدرسہ مظاہرالعلوم ہندوستان کی مشہور اسلامی درسگاہ ہے۔ اِس نے مذہب و علومِ اسلامی کی بڑی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ بڑے بڑے

---

[1] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، بابت ۹ر اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۶

نامور علماء اِس درسگاہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے اور برّصغیر پاک وہند میں دین وملّت کی خدمات میں مصروف ہیں۔"[1]

مدرسہ مظاہر العلوم کے صدر مدرس مولانا محمد مظہر نانوتوی (المتوفی ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء) کون تھے اور کہاں کے فیض یافتہ تھے؟ اِس سوال کا جواب پروفیسر محمد ایّوب قادری یوں رقم فرماتے ہیں:

"مولانا محمد احسن نانوتوی کے حقیقی بڑے بھائی تھے۔ ۱۸۲۳ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وحفظِ قرآن اپنے والد حافظ لطف علی سے کیا۔ "دہلی کالج" میں تعلیم حاصل کی۔ مولانا مملوک العلی نانوتوی کے سامنے زانوئے ادب طے کیا۔ حدیث کی سند حضرت شاہ محمد اسحاق سے حاصل کی۔۔۔۔ مولانا محمد مظہر تحصیلِ علم کے بعد اجمیر کالج میں ملازم ہو گئے، وہاں سے آگرہ کالج تبادلہ ہوا۔"[2]

مولوی محمد مظہر نانوتوی (المتوفی ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء) کے دُوسرے بھائی مولوی محمد احس نانوتوی (المتوفی ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء) بھی مولوی مملوک العلی کے شاگرد اور دہلی کالج کے پروردہ تھے۔ تحصیلِ علم کے بعد موصوف بنارس کالج اور بریلی کالج میں تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ چنانچہ اِس سلسلے میں قادری صاحب نے یُوں وضاحت فرمائی ہے:

"اِسی طرح مولوی مملوک العلی کے عزیز وتلمیذ مولانا محمد احسن جب تعلیم سے فارغ ہُوئے تو ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء میں بنارس کالج میں بحیثیت مدرس اوّل فارسی اِن کا تقرر ہُوا۔"[3]

"بنارس میں مولانا ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء میں پہنچے اور جمادی الاول ۱۲۶۷ھ مطابق مارچ ۱۸۵۱ء میں مولانا محمد احسن کا تعلق بنارس سے یقیناً ختم ہو چکا تھا

---

[1] محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۱۵۵

[2] ایضاً: ص ۱۵۴

[3] ایضاً: ص ۳۸

کیونکہ یہی زمانہ بریلی میں آنے کا ہے۔"[1]

"مولانا محمد احسن صاحب فارسی شعبہ کے صدر مقرر ہوئے اور مولانا بنارس سے جمادی الاوّل ۱۲۶۷ھ مطابق مارچ ۱۸۵۱ء میں تبدیل ہو کر بریلی پہنچے۔ مولانا محمد احسن بریلی کالج میں شعبۂ فارسی کے صدر مقرر ہُوئے۔ جب عربی کا اجراء ہُوا، تو دونوں شعبوں کی صدارت اِن ہی کو تفویض ہوگئی۔"[2]

مولوی محمد مظہر نانوتوی کے سب سے چھوٹے بھائی مولوی محمد منیر نانوتوی بھی دہلی کالج کے پروردہ اور مولوی مملوک علی نانوتوی کے تلمیذ تھے۔ موصوف دو سال دارالعلوم دیوبند کے مہتمم بھی رہے تھے۔ قادری صاحب یُوں لکھتے ہیں:

"مولانا محمد احسن نانوتوی کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۸۳۱ء میں نانوتہ میں پیدا ہُوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد حافظ لطف علی سے حاصل کی۔ پھر دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی ...... ۱۳ مئی ۱۸۶۱ء میں بریلی کالج میں ملازم ہو گئے۔ مطبع صدیقی بریلی کے مہتمم رہے اور اُس کا نظم ونسق زیادہ تر اِن ہی سے متعلق رہا۔ بریلی سے پنشن پائی۔ ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء کے بعد بریلی سے تعلق ختم ہو گیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی سے بہت گہرے تعلقات اور دونوں بچپن کے ساتھی تھے مولانا محمد منیر صاحب قریب دو سال دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے۔ ایمانداری و دیانتداری میں جواب نہیں رکھتے تھے۔"[3]

قارئین کرام! یہ تھے دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کی بنیادیں رکھنے والے، وہاں پڑھانے والے اور اُنھیں چلانے والے۔ مذکورہ بالا حوالوں سے صاف واضح ہے کہ پہلے اِن حضرات کو دہلی کالج میں گورنمنٹ نے اپنے ڈھب پر تربیت دی۔

---

[1] محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۳۹

[2] ایضاً: ص ۴۳

[3] ایضاً: ص ۱۵۷، ۱۵۸

اِس کے بعد بڑھاپے تک اُنھیں سرکاری ملازمت میں رکھ کر اچھی طرح اُن کی وفاداری کا سونا تایا گیا۔ بعض حضرات کو کالجوں میں پروفیسر رکھا گیا اور دُوسرے ڈپٹی انسپکٹر مدارس (کالے پادری) بنا کر رکھے گئے۔ جب یہ صاحبان نازک سے نازک مواقع پر بھی اپنی مہربان حکومت کے وفادار ہی ثابت ہُوئے تو ریٹائر ہونے کے بعد اِن کی طرف الہام کر دیا جاتا تھا کہ اب آپ دین کے نام پر مسلمانوں کے دیندار طبقے کی رہنمائی کریں یعنی مسلمان آپ حضرات سے دین بصد شوق حاصل کریں لیکن حکومت کے مکمل وفادار اور بہی خواہ رہنے کی تربیت دینی ہوگی اور اُنھیں اُسی رنگ میں رنگنا ہوگا، جس میں آپ لوگوں کو رنگا گیا ہے۔

حکومت تو اِن مدارس کی اندرونِ خانہ سرپرستی کر ہی رہی تھی اور یہ ساری مشینری اِسی دستِ غیب سے چل رہی تھی۔ دُوسری طرف مسلمانوں کو اِدھر مائل کرنے کی غرض سے دیوبندیوں نے کارکنانِ دارالعلوم دیوبند کے زہد و تقویٰ، خلوص و للّٰہیت اور کشف و کرامت کے ایسے افسانے گھڑنے شروع کر دیے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے بھی کان کاٹ لیے اور بھولے بھالے مسلمان اِن کے جال میں پھنسنے شروع ہو گئے۔ یہ جال ایسا طلسماتی بنایا گیا کہ اُس وقت اِس چکر کو کیا سمجھ سکتے جبکہ پاک و ہند کے کتنے ہی مدعیانِ اسلام آج تک اِس کی تعلیمات کے زہرِ ہلاہل کو اُس کی ظاہری خوشنمائی کے پیشِ نظر سمجھ نہیں پائے اور اِس زہر کو تریاق سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

وہابیت کا اصلی اور پہلا ایڈیشن مکمل طور پر ناکام ہُوا۔ رہی سہی کسر معرکۂ بالاکوٹ نے نکال دی۔ علمائے کرام کا اِس کی تردید اور بیخ کنی میں سرگرم ہو جانا اور عوام الناس کا اِس نئے مذہب والوں سے نفرت کرنا، ایسے امور تھے جن کی بنا پر یہ گروہ بڑھنے کی بجائے مزید سکڑ کر رہ گیا اور ڈیڑھ صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی، یہ شروع میں محمدی گروہ پھر موحدین اور آجکل اہلحدیث کہلانے والے ہندوپاک میں انگلیوں پر گِنے جا سکتے ہیں۔ آخر اِس گروہ نے گورنمنٹ کی سرپرستی کے باوجود ترقی کیوں نہ کی؟ بات دراصل یہ ہے کہ جب کتاب وہابیت کا دُوسرا ایڈیشن دیوبندیت کے نام سے دارالعلوم دیوبند سے شائع ہونے لگا تو یہ اتنا میٹھا اور خوشنما زہر تھا کہ عوام الناس اِس کی مضرت کو

محسوس نہ کر سکے اور اِس کثرت سے اِس زہرِ ہلاہل کے طلبگار ہونے شروع ہو گئے کہ حکومت بھی ہزار جان سے اِس کی بلائیں لینے لگی اور اہلحدیث جماعت پر جو خصوصی نظر تھی وُہ مع اضافہ دارالعلوم دیوبند پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔

چند علمأ نے دیوبندی قسم کی روش اختیار کر کے' دہلی کالج سے تربیت پا کر ، یہ مشن جاری کیا، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یہ درخت پروان چڑھا، پھلا پھُولا اور اِس کی شاخیں پاک و ہند کے گوشے گوشے میں پھیل گئیں کیونکہ بعض بھولے بھالے مسلمان اِن حضرات کے زبردست پروپیگنڈے کے باعث اِنھیں خطرناک ترین وہابی نہیں بلکہ مُصلح سمجھ بیٹھتے تھے۔ یہ اسلامی عقائد میں اِس غیر محسوس طریقے سے کفریہ عقائد و نظریات کی آمیزش کر کے مسلمانوں کے دین و ایمان کو برباد کرتے رہے ہیں کہ مارے خوشی کے انگریزی حکّام بھی پھڑک اُٹھتے تھے اور عنایات و نوازشات کا اندرونِ خانہ وُہ اہتمام کیا کہ جس جماعت کی تعداد پانچ دس ہزار سے زائد نہ تھی اُن کا مدرسۂ دیوبند، چھپّروں اور جھونپڑیوں سے ترقی کرتا ہُوا، جامع ازہر کے بعد دنیا کی سب سے بڑی مذہبی درس گاہ بن گیا۔

دارالعلوم دیوبند اور دیوبندی گروہ کی ترقی گویا اہلحدیث حضرات کی تنزّلی کا پروانہ تھا۔ اِس کی ترقی کے ساتھ ہی یہ حضرات یتیمی اور کس مپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ اِس دوران میں اِس محمدی یا اہلحدیث گروہ کا دوچار مقامات پر انگریزوں سے ٹکراؤ بھی ہُوا، لیکن حاصل کچھ نہ ہوا بلکہ نقصان ہی اٹھاتے رہے اور آخر کار یہ لوگ بھی اپنی اکثریت کے ساتھ متفق ہو کر حکومت کی وفاداری اور بہی خواہی پر ایمان لے آئے۔ میاں نذیر حسین دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ء)، نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی (المتوفی ۱۳۰۷/ ۱۸۸۹ء) اور مولانا محمد حسین بٹالوی وغیرہ حضرات کی سرکردگی میں ساری جماعت ہی حکومت کے قدم چُومنے پر متفق ہو گئی۔ اِس جماعت کی زندگی کے یہ تین ادوار ہیں یعنی پہلے دَور میں گورنمنٹ کے منظورِ نظر، دُوسرے دَور میں اکثریت وفادار اور بعض حکومت کے خلاف اور تیسرے دَور میں سب حکومت کے بہی خواہ اور منتظرِ نظرِ کرم۔

دارالعلوم دیوبند جو دہلی کالج کی شاخ اور وہابی حضرات کا دوسرا مرکز بنا، اِس پر بھی

دو دَور گزرے ہیں اور دونوں ایک دُوسرے سے مختلف۔ ابتدائی ایام اور پہلے دَور میں انگریزوں کی مکمل سرپرستی اور تائید وحمایت حاصل رہی۔ خوب جی بھر کر عنایتِ سرکار کے مزے لُوٹے۔ دُوسرا دَور وُہ ہے جب متحدہ ہندوستان کی سرزمین میں گاندھی کی آندھی چلی۔ ہنود نے خفیہ منصوبے کے تحت حکومت کے ہر محکمے میں، فوج اور پولیس میں اپنے آدمی کثیر تعداد میں شامل کر لیے۔ تجارت وملازمت اور صنعت وحرفت کے ذریعے خوشحال ہونے لگے تو ہمدردیوں کے جال بچھا کر سُود در سُود کے چکّر میں مسلمانوں کی جائدادوں پر قابض ہونے شروع ہو گئے۔ غرضیکہ ہر قسم کی طاقت وقوت حاصل کر لینے کے بعد ہندوؤں نے حصولِ آزادی کی خاطر انگریزوں سے سرد جنگ جاری رکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اِس دَور میں علمائے دیوبند نے محسوس کیا کہ ہنود کی بے پناہ تیاریوں کے مقابلے میں اب انگریز زیادہ عرصہ ہندوستان پر قابض نہیں رہ سکتے اور وُہ دِن دُور نہیں کہ ہندوستان کی فضاؤں میں اوم کا ترنگا جھنڈا لہرا رہا ہوگا۔ صورتِ حالات کا اِس طرح تجزیہ کرنے کے بعد علمائے دیوبند نے اپنے سرپرستوں اور محسنوں کو الوداعی سلام کیے بغیر متوقع حکمرانوں کے در کی گدائی شروع کر دی۔ کانگرس نے اِن حضرات کی ناز برداری اور تالیفِ قلب کا پُورا پورا خیال رکھا اور انگریزوں سے بھی بڑھ چڑھ کر اِنھیں نوازتے رہے۔ اِس دَور میں یہ حضرات مکمل طور پر ہندو مفادات کی خاطر اپنا تن من دھن سب کچھ لٹانے کے لیے تیار بیٹھے رہتے تھے۔ اِس وقت یہ حضرات ہندوؤں پر کچھ اِس طرح پروانہ وار نثار اور گاندھی جی کے پُجاری ہو کر رہ گئے کہ ہندوؤں نے اِنھیں انگریز کی گولیوں کا نشانہ بننے کی ترغیب دی تو یہ لبیک کہہ کر سوراج کے دیوتا پر بھینٹ بن کر چڑھنے کے لیے تیار ہو جاتے اور ایسی موت کو شہادتِ عظمیٰ سے کسی طرح کم ماننے پر تیار نہ ہوتے اور اگر گاندھی جی یا پنڈت جواہر لال نہرو نے اِنھیں مسلم مفادات پر کاری ضربیں لگانے کا حکم دیا یا ترغیب ہی دلائی تو یہ حضرات اپنے اصطلاحی مشرکوں اور بدعتیوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا کرتے تھے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانانِ پاک وہند کے مفادات کو جتنا نقصان اِس تحریک وہابیت نے پہنچایا ہے اِتنا مشرکینِ ہند بھی آج تک نہیں پہنچا سکے ہیں۔ اپنے دُوسرے دَور میں دیوبندی حضرات واقعی انگریزوں کے

مخالف بن کر بھی رہے لیکن ہندو مفادات کی خاطر مسلم مفادات کے لیے اِن حضرات کا وجود جملہ خوارج کی طرح ہمیشہ ایک چیلنج بن کر ہی رہا ہے۔ باری تعالیٰ شانہٗ ابنائے زمانہ کو سچی ہدایت نصیب فرمائے اور ہم سب کا خاتمہ ایمان پر ہو۔ آمین۔

علی گڑھ مرکز

بقول مولوی عبید اللہ سندھی (المتوفی ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء) دہلی کالج کا انگریزی حصہ، اِسی کالج کے تربیت یافتہ سرسید احمد خاں علی گڑھ لے گئے۔ گویا پہلے جو وہابی حضرات کا ماڈرن اور پُراسرار مرکز، دہلی کالج مقرر ہُوا تھا، آگے چل کر اُس کے دو حصے یا دو مراکز بن گئے، ایک دیوبند اور دُوسرا علی گڑھ۔ اِس دُوسرے مرکز علی گڑھ کو مغربی تعلیم و تہذیب کے دلدادگان کا مرکز قرار دیا گیا اور آہستہ آہستہ پُورے ملک میں اِس کی برانچیں قائم کر دی گئیں جو مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مستقل مراکز کی حیثیت حاصل کرتی چلی گئیں۔ اِس طرح پُورے ملک میں مغربی علوم اور مغربی تہذیب چھا گئی اور یہ دونوں چیزیں اِس طرح پاک و ہند کے باشندوں کے دماغ و اعصاب پر سوار ہُوئیں کہ انگریزوں کو ہمارے ملک سے گئے ہُوئے چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے لیکن اِن مغربی لعنتوں سے چھٹکارا حاصل کرنا تو دُور کی بات ہے، خود مسلمان کہلانے والوں نے اِنھیں اِس طرح اپنا ضابطۂ حیات اور لائحۂ عمل بنایا ہُوا ہے، جیسے مسلمانوں کی کامیابی و کامرانی کا راز قرآن و سنت کے احکام کی پیروی میں مضمر نہیں بلکہ مغربی لعنتوں میں ہے۔ باری تعالیٰ شانہٗ ہمیں سوچنے اور سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

علی گڑھ کالج کے بارے میں عرض کرنے سے پہلے اِس حقیقت کا اظہار کر دینا ضروری نظر آتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد برٹش گورنمنٹ نے جو پالیسی وضع کی اُس کو مولوی عبد الخالق قدوسی کے لفظوں میں بیان کر دیا جائے:

> "بات دراصل یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے تلخ تجربہ کے بعد انگریز سرکار اِس قدر حسّاس ہو چکی تھی کہ وہ جب بھی ہندوستانیوں خصوصًا مسلمانوں میں کسی قسم کے اضطراب و اشتعال کے آثار محسوس کرتی تو قبل اِس کے کہ حالات خطرناک صورت اختیار کر جائیں، مسلمان قوم کے سامنے کوئی نئی چیز مسلمان لیڈروں

کے ہی ذریعے پیش کر دیتی، جس سے مشتعل قوم کا رُخ خود بخود دوسری طرف پھر جاتا۔"[1]

علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی کی تحریک کیوں چلائی گئی؟ مولوی سید سلیمان ندوی (المتوفی ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء) نے اس پُراسرار حقیقت کے چہرے سے یُوں پردہ ہٹایا تھا:

"واقعہ یہ ہے کہ اُس زمانہ میں طرابلس اور بلقان کے ہنگاموں کے سبب سے مسلمانوں میں بے حد جوش وخروش تھا اور انگریزوں کی طرف سے دِلوں میں بے حد ناراضی اور نفرت پھیلی تھی اور اُن کی ذرا ذرا سی بات سے مسلمانوں کو چڑ ہوتی تھی۔ حکّام کے سامنے اِن ناخوشگوار حالات کا تدارک از بس ضروری تھا۔ اِس لیے بہترین تدبیر یہ تھی کہ ملک میں کوئی ایسی عالمگیر تحریک شروع کر دی جائے جو مسلمانوں کے رُخ کو اِدھر سے اُدھر پھیر دے۔ یہ چیز ایک مسلم یونیورسٹی کا تخیّل تھا، جس کو لے کر ہز ہائنس سر آغا خاں، جو اُس وقت کے مسلم قومی راہنما اور انگریزوں کے معتمد تھے، آگے بڑھے۔"[2]

علی گڑھ کالج کے اصل کرتا دھرتا سر سید احمد خاں تھے۔ دہلی کالج سے تحریف شدہ مذہب یعنی وہابیت کو بشکلِ دیوبندیت لے کر آئے تھے لیکن علی گڑھ میں آکر کریلا اور نیم پر چڑھ گیا، موصوف نیچریت کے بانی بن گئے اور اِس طرح مسلمانوں کی خیر خواہی و اصلاح کے نام پر ساتھ ساتھ مقدس اسلام کی بیخ کنی کا فریضہ، جو حکومت کی طرف سے عائد ہوا تھا سرانجام دے کر گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل کرتے رہے۔ مسلمانوں کی خیر خواہی معیوب نہیں، اُنھیں تباہ کن حرکتوں کے نتائج سے خبردار کرنا دشمنی نہیں، دولت، علم و فن اور اخلاق و کردار میں مسلم قوم کو آگے بڑھانے کی کوشش کرنا بدخواہی نہیں بلکہ یہ امور تو مستحسن ہیں۔ اگر واقعی یہ مُصلح اور ریفارمر بننے والے بھی کچھ کرنا چاہتے تھے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ

---

[1] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، بابت ۲۳/ اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۵

[2] سلیمان ندوی، مولوی: حیاتِ شبلی، ص ۵۳۱

علیہ وسلم کے دین پر عملِ جرّاحی کی مشق کس غرض سے فرمائی گئی تھی؟ مسلمانوں کے دین وایمان کو تباہ و برباد کرنے والا کیا اُن کی حقیقی خیر خواہی کے تصوّر سے بھی آشنا ہو سکتا ہے؟

نیچریت پر گفتگو، ہم انشاءاللہ تعالیٰ باب سوم میں کریں گے۔ دہلی کالج کا انگریزی حصّہ علی گڑھ لایا گیا تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ علی گڑھ سے کہاں تک پھیلا۔ بریلی اور میرٹھ کی درس گاہوں کے بارے میں ملاحظہ ہو:

> "بریلی کی یہ درس گاہ اور میرٹھ اسکول، دہلی کالج کی شاخ قرار پائے۔ ۱۸۴۰ء تک بریلی اسکول میں کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ ۱۸۵۰ء میں بریلی کا اسکول، کالج بنا دیا گیا۔" [1]

ڈھاکہ یونیورسٹی کے قیام کی وجہ مولوی سیّد سلیمان ندوی (۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۳ء) نے یہ بتائی ہے:

> "گورنمنٹ نے مسلمانوں کے اِس زخم پر رکھنے کے لیے جو مرہم تجویز کیا اُس کا نام ڈھاکہ یونیورسٹی ہے۔ اِس یونیورسٹی کی تجویز اور خاکہ بنانے میں اُن لوگوں کو بھی شریک کیا جو احرار کے سرگروہ سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ نئے تعلیم یافتوں میں سے محمد علی مرحوم اور علماء میں سے مولانا شبلی کے نام اُس سب کمیٹی میں داخل ہوئے جو اسلامک سٹڈیز کے لیے بنی تھی۔" [2]

وُہ زخم کیا تھا، جس پر ڈھاکہ یونیورسٹی کے قیام کا مرہم لگایا گیا؟ اِس کا جواب مولوی عبدالخالق قدوسی کی زبانی سُنیے:

> "اِسی طرح ۱۹۱۰ء میں جب تقسیمِ بنگال کی تنسیخ کا فیصلہ ہُوا تو مسلمانوں میں سخت اشتعال پیدا ہُوا اور ایک اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہوگیا۔ گورنمنٹ نے اِس کا علاج جو تجویز کیا، وُہ ڈھاکہ یونیورسٹی کا قیام تھا۔" [3]

---

[1] محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۴۳

[2] سلیمان ندوی، مولوی: حیاتِ شبلی، ص ۵۲۰

[3] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، بابت ۲۳ر اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۵

یونیورسٹیوں کا قائم ہونا تھا کہ برِّصغیر پاک و ہند میں انگریزی اسکولوں اور کالجوں کا جال پھیلا دیا گیا اور انگریز نے اِن کے ذریعے جس مقصد کو حاصل کرنا تھا وہ بڑی آسانی سے حاصل ہوگیا۔ انگریزی زبان کا سیکھنا اور سکھانا بُرا نہیں، یہ بھی دُوسری زبانوں کی طرح ایک زبان ہے اور اِس کا سیکھنا کسی طرح معیوب نہیں ہوسکتا۔ اِن انگریزی کالجوں اور اسکولوں کی دو باتیں معیوب تھیں جو سنتِ نصارٰی کے طور پر آج تک کمال عقیدت کے ساتھ اپنائی ہُوئی ہیں اور مسلمان کہلانے والے بھی اُن معائب کو دُور کرکے اپنی درس گاہوں کو باعثِ خیروبرکت کر دکھانے اور اِنھیں دنیا و عقبٰی کی کامیابی و کامرانی کا ذریعہ بنانے سے کتراتے رہتے ہیں۔ اِن سرکاری درسگاہوں کی دونوں خرابیوں میں سے ایک یہ ہے کہ یہ ادارے مغربی تہذیب و تمدّن سکھانے کی تربیت گاہیں بنائے گئے ہیں اور دُوسری خرابی یہ کہ اسلامی علوم و معارف سے طلبہ کو علمی اور عملی طور پر، بڑی حد تک دُور ہی رکھا جاتا ہے۔ انگریز تو مسلمانوں کو اور خصوصاً اُن کے پڑھے لکھے طبقے کو دین سے ناواقف دیکھنا اور رکھنا چاہتا تھا لیکن پاکستان کی کسی حکومت نے آج تک یہ وضاحت کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ وہ اپنی درسگاہوں سے اسلام کو باہر نکال کر، مسلمانوں کی موجودہ نسل کو دین سے ناواقف رکھ کر کون سا مقدس مقصد حاصل کرنے کے درپے ہے؟

پاک و ہند میں انگریزی درس گاہوں کے محرک بننے کا جس ہستی کو حکومتِ وقت نے شرف بخشا تھا، وُہ سرسیّد احمد خاں تھے۔ موصوف کے بارے میں شیخ اکرام صاحب اِسی تعلیم سے متعلق یُوں وضاحت کرتے ہیں:

> ”خود سرسیّد ۱۸۹۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں: ”تعجب یہ ہے کہ جو تعلیم پاتے جاتے ہیں اور جن سے قومی بھلائی کی اُمید تھی وہ خود شیطان اور بدترین قوم ہوتے جاتے ہیں۔“ [1]

اصل بات یہ ہے کہ اِن درس گاہوں کے ذریعے حکومت یہی چاہتی تھی کہ مسلمان اپنے اسلاف

---

[1] محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، مطبوعہ فیروز سنز لاہور، بارِ ہشتم، ۱۹۶۸ء، ص ۲۲۸

رشتہ منقطع کرلیں اور حکومتِ وقت کے مکمل وفادار بن جائیں۔ شیخ اکرام صاحب نے اِس حقیقت کو یُوں بیان کیا ہے:

> "علی گڑھ تحریک کے راہنماؤں میں ذہنی آزادی کی کمی نہ تھی۔ قوم کو سلف کی کورانہ تقلید سے آزاد کرانے اور اِس تقلید کے حمایتیوں کی مخالفت برداشت کرنے کے لیے بڑی جرأت اور صحیح آزاد خیالی کی ضرورت ہے اور سرسید، حالی اور اُن کے رفقاء میں یہ آزاد خیالی پُوری طرح موجود تھی، لیکن اِس کے باوجود اِن بزرگوں کی تصانیف پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ اِنھیں مغرب سے ایک قسم کا حُسنِ ظن تھا اور مغربی تعلیم، مغربی ادب اور مغربی علوم و فنون سے اُنھیں ایسی توقعات تھیں جو زیادہ تر عقیدت یا ناواقفیت پر مبنی تھیں۔ مغرب سے اِن بزرگوں کو تو فقط ایک حُسنِ ظن تھا لیکن جن لوگوں نے انگریزی کالجوں میں تعلیم پائی، اُن میں غلامانہ ذہنیت بُری طرح جلوہ گر تھی۔ اُن کے نزدیک مغرب کی ہر ایک چیز اچھی تھی اور مشرق کی ہر ایک چیز بُری۔"[1]

علی گڑھی تحریک نے مغربی علوم و فنون کو متحدہ ہندوستان میں رائج کرنے اور مسلمانوں کو اُن کے دین و مذہب سے بے بہرہ رکھنے کی جس برطانوی پالیسی کی بیل منڈھے چڑھائی اُس کے بدترین نتائج آج بھی پُوری قوم کو بھگتنے پڑ رہے ہیں اور اب وہی لوگ قوم کی قسمت کے مالک اور اِن کی کشتی کے ناخدا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد، جس اسلام کے نام پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے اُسی سے پاکستان کی ہر حکومت اِس طرح ڈرتی اور بدکتی آئی ہے جیسے سگ گزیدہ پانی سے ڈرتا ہے اور اِسی خطرے کو ٹالنے کی خاطر اسلام کے رہے سہے نشانات کو مٹانے کی اِس طرح سے مسلسل کوشش کی جاتی رہی ہے کہ گویا اسلام دشمنی میں انگریز بھی اِن کے شاگرد ہی تھے۔ اِن درسگاہوں کی مضرت کا پہلو اہلِ نظر کو بروقت بھی نظر آرہا تھا۔ شیخ محمد اکرام صاحب نے بھی اِس حقیقت کا

---

[1] محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، ص ۲۸۰

اِن لفظوں میں اعتراف کیا ہے:

> "اگر آپ اُن بزرگوں کا معاملہ اُن کے ضمیر اور احساسِ فرض پر چھوڑیں اور ارکانِ مذہب کی ظاہری پابندی کو بھی ایک لمحے کے لیے نظر انداز کر دیں تب بھی علی گڑھ کی فضا میں اندر ہی اندر ایک عام ایمانی کمزوری اور روحانی کم ہمتی کا سراغ ملے گا۔"[1]

اِس قدر تسلیم کر لینے کے بعد بھی آج تک کالج اُسی ڈگر پر چلائے جا رہے ہیں، خود علامہ شبلی نعمانی اور حالی پانی پتی بھی اِسی نتیجے پر پہنچے تھے۔ اِن دونوں حضرات کے متعلق یُوں مذکور ہے:

> "علی گڑھ کی علمی پستی سے مولانا (شبلی) کو جو شکایت تھی وُہ بجا ہے اور ہم اِس پر گزشتہ اوراق میں تفصیلی تذکرہ کر چکے ہیں۔ کالج کی یہ کوتاہی اِس قدر افسوسناک تھی کہ اُس نے حالی جیسے فرشتہ خصلت انسان کو بدل کر دیا۔ وہ سرسید کا ذکر کرتے ہُوئے لکھتے ہیں: "چھبیس برس کے تجربے سے اُن کو اِس قدر ضرور معلوم ہو گیا ہو گا کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہو سکتی ہے جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمّی، فضول اور اصلی لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔""[2]

مسلم یونیورسٹی کے قیام، اسکولوں اور کالجوں کے اجراء اور اِن کے ذریعے مغربی علوم و فنون اور تہذیب سے مسلمانانِ ہند کو بہرہ ور کرنے نیز اسلام سے کورا رکھنے کی جو سرسید احمد خاں صاحب اور حکومتِ وقت نے کوشش کی تھی، اُس میں کہاں تک کامیابی ہُوئی؟ اِس حقیقت کے چہرے پر آج تو مطلقاً کوئی پردہ ہی نہیں ہے۔ ہر صاحبِ نظر اپنی آنکھوں سے نونہالانِ قوم کی حالتِ زار دیکھ کر خُون کے آنسو رونا ہے کہ یہ ہے قوم کی

---

[1] محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، ص ۱۵۱

[2] ایضاً: ص ۲۸۸

وہ متاعِ گراں مایہ جن کے ہاتھوں میں کل ملّت کی تقدیر ہو گی۔ جس قوم کی قسمت کے مالک یہ نونہال ہوں گے اُس کا مقدّر اندھیری رات میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ مغربی علوم و فنون سے فیض یاب ہونے والوں کی یہ افسوس ناک حالت پہلے ہی روز سے دکھائی دینے لگی تھی۔ چنانچہ مولوی ابوالکلام آزاد (المتوفی ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء) کے شریکِ کار، فضل الدین احمد صاحب کا ایک بیان یُوں منقول ہے:

> "یہ بات عام طور پر مسلّم ہو چکی تھی کہ نئی تعلیم یافتہ جماعت کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں اور اسکول اور کالج کی تعلیم اور مذہبی زندگی، دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ترکی ٹوپی اوڑھے ہُوئے، نماز پڑھتا ہوا نظر آجاتا یا قرآن شریف کی کوئی آیت اُس کی زبان و قلم سے نکل جاتی تو لوگوں کو ایک نہایت تعجب انگیز اور غیر معمولی واقعہ معلوم ہوتا۔ ایک خاص واقعے کی طرح اُس کا ذکر کیا جاتا کہ فلاں شخص نے کالج میں تعلیم پائی ہے اور ساتھ ہی نماز بھی پڑھ لیا کرتا ہے۔"[1]

یہ تھے اینگلو انڈین علماء کے قائم کردہ دو مراکز جو دیوبند اور علی گڑھ میں قائم ہُوئے۔ اول الذکر مراکز کے کارکنوں نے خود کو دینی تعلیم کی کمی دُور کرنے اور مسلمانوں کو علومِ دینیہ سے مالا مال کر دینے والے ٹھیکیداروں کی صورت میں ظاہر کرنا شروع کیا اور موخر الذکر نے ملتِ اسلامیہ کو بتانا شروع کیا کہ ہم تو آپ کی مادّی حالت کو سنوار کر مسلمان قوم کو ترقی کی منزلوں پر لے جانا چاہتے ہیں لیکن ساتھ ہی دونوں مراکز سے وہابیت کے دو نئے ایڈیشن بھی شائع ہُوئے اور وہ مستقل فرقوں کی شکل میں منصّۂ شہود پر جلوہ گر ہو کر مسلمانوں میں تفریق و تشتّت کا بیج بو گئے۔ دونوں مراکز کے ظاہری طور طریقے اگرچہ ایک دُوسرے کی ضد تھے لیکن بہر صورت دونوں میں اشتراکِ عمل کا جذبہ موجود تھا۔ مثلاً:

"علی گڑھ اور دیوبند کے اختلافات اصولی تھے اور کسی بُغض و عناد یا رشک و

---

[1] محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، ص ۲۷۹

حسد پر مبنی نہ تھے۔ اِس لیے اِن میں تلخی کبھی نہیں آئی۔ اِس کے علاوہ چونکہ دیوبند اور علی گڑھ قوم کی دو مختلف ضروریات (دینی اور دنیوی تعلیم) کو پُورا کرتے تھے، اِس لیے ایک وقت ایسا بھی آیا جب اِنھوں نے تقسیمِ کار کا اصول اختیار کیا اور اپنے مختلف مقاصد کے حصول کے لیے ایک دُوسرے سے اشتراکِ عمل کیا۔" [1]

اہلسنت وجماعت کے ناجی گروہ میں سے مسلمانوں کو اغوا کر کے جو فرقے بنائے جارہے تھے اُن کی تعداد یہاں آکر تین ہو گئی تھی جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ اہلحدیث ——— بانی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی

۲۔ دیوبندی ——— بانی مولوی محمد اسحاق دہلوی

۳۔ نیچری ——— بانی سر سیّد احمد خاں علی گڑھی

اہلحدیث جماعت کی ترقی تو کس مپرسی کے باعث جامد ہو کر رہ گئی تھی مگر دین سے دلچسپی رکھنے والے بعض مسلمان دیوبندی گروہ کے جال میں پھنستے رہے، پھر بھی ایک دو مدرسے پورے ملک کے عوام پر کیا اثر انداز ہو سکتے تھے؟ لیکن جب سے اِن حضرات نے اپنے تبلیغی رضاکاروں کو اِس امر پر مامور کر دیا کہ وہ اہلسنت کے عوام کو اغوا کریں اُس وقت سے اِس جماعت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہونے لگا ہے۔ نیچری مذہب خود تو ختم ہو گیا لیکن مرنے سے پہلے دو وارث چھوڑ گیا:

۱۔ منکرینِ حدیث

۲۔ مرزائی

نیچریت سے بھی زیادہ نقصان، ملتِ اسلامیہ کو سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی **ندوہ** تعلیم نے پہنچایا، جس کے باعث اکثر پڑھے لکھے صرف نام کے مسلمان رہ گئے اور بعض تو نرے ننگِ دین و ملّت ہی ثابت ہُوئے ہیں اور قوم کو ذہنی آوارگی اور پراگندہ خیا

---

[1] محمد اکرام شیخ، موجِ کوثر، ص ۲۴۹

کی تربیت دینے کا یہ سلسلہ ہنوز اُسی طرح جاری ہے۔ نونہالانِ ملّت اِن دونوں چکروں میں پھنستے جارہے تھے اور اَن پڑھ مسلمان بھی، اِن دونوں جماعتوں کی کامیابی کے راستے میں علمائے اہلسنت ہی مزاحم تھے لہٰذا اِن حضرات پر قابو پانے کی غرض سے ندوۃ العلماء کا جال بچھایا گیا۔ لیکن کیسی مزیدار ڈپلومیسی کے ذریعے یہ جال پھیلایا، مندرجہ ذیل حوالے کی تہہ میں جھانک کر اُس کا اندازہ کیجیے:

"اِس عمدہ خیال (قیامِ ندوہ) کے محرک مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلکٹر تھے، مگر اِس کی تکمیل مولوی سید محمد علی کانپوری خلیفۂ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے مبارک ہاتھوں سے ہُوئی، جو اِس کے بانی اور ناظمِ اوّل تھے۔ مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق دہلوی صاحبِ تفسیرِ حقانی نے اِس کے قواعد وضوابط مرتب کیے۔ اکابرِ قوم مثلاً سرسید، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک نے بھی اِس کے اغراض ومقاصد کو پسند کیا اور تحریر وتقریر کے ذریعے سے اِس کا خیر مقدم کیا۔ ۱۸۹۸ء میں دارالعلوم کے کچھ ابتدائی درجے کھولے گئے اور ۱۸۹۹ء میں رؤساء شاہجہان پور کی فیاضی سے کچھ زمینداری بطور وقف ندوۃ العلماء کو حاصل ہُوئی۔ ایک عظیم الشان کتب خانہ کی بنیاد بھی ڈالی گئی۔"[۱]

وہ کون سی ضرورت یا مصلحت تھی جس کے تحت "ندوۃ العلماء" کا قیام عمل میں آیا؟ اس بارے میں جناب شیخ محمد اکرام ایم۔ اے نے اپنے خیالات کا ان لفظوں میں اظہار فرمایا ہے:

"جدید علم الکلام بالعموم اُن شخصوں نے ترتیب دیا، جو عربی اور فارسی کے فاضل تھے لیکن عام علماء کی جماعت سے اُنھیں کوئی تعلق نہ تھا اور بالعموم علمائے نے اُن کی مخالفت کی۔ مگر آہستہ آہستہ علماء میں بھی کچھ لوگ ایسے

---

[۱] محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، ص ۱۸۷، ۱۸۸

پیدا ہو گئے جنھیں اِس ضرورت کا احساس ہُوا کہ اسلامی مدارس کا نصاب ضروریاتِ زمانہ کے مطابق بنایا جائے اور قدیم علماء اور علی گڑھ پارٹی کے بین بین ایک تعلیمی اور مذہبی طریقۂ کار قائم ہو۔ چنانچہ اِس مقصد کیلیے ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء قائم ہُوا۔“[1]

ندوہ کے بارے میں دیوبندی جماعت کے حکیم الامت مولوی اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) نے اپنے تاثرات کا مشاہدے کی روشنی میں اِس طرح اظہار کیا ہے:

”خود ندوہ کا جو حشر ہُوا سب کو معلوم ہے کہ وُہ ایسوں کے ہاتھ میں مدت تک رہا جن کی طبیعت میں بالکل نیچریت تھی۔ وہی سرسیّد احمد خاں کے قدم بقدم اُن کی رفتار رہی۔ وہی جذبات، وہی خیالات، کوئی فرق نہ تھا۔“[2]

یہ ندوی حضرات کے عقائد و نظریات کی بات تھی۔ مناسب نظر آتا ہے کہ علی گڑھ اور دیوبند کی خرابیوں کا ازالہ کرنے کا بیڑا اٹھانے والے، قوم کے دُکھوں کا علاج کرنے والے، مسلمانوں کی کشتی کو بھنور سے نکال کر ساحل پر پہنچا دینے کا اعلان کرنے والے ندوی علماء کے زہد و تقوٰی، خلوص و للّٰہیت اور خیر خواہیِ اسلام و مسلمین کی روحانیت سے لبریز اور سنسنی خیز کہانی مولوی ابوالکلام آزاد (المتوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء) کی زبانی پیش کر دی جائے۔ ملاحظہ ہو:

”ندوۃ العلماء کے اجتماع سے مجھے روشن علماء کی جو حالت منکشف ہُوئی کیونکہ منتسبینِ ندوہ کی طرف میرا ایسا ہی حُسنِ ظن تھا، اُس سے طبیعت کو اور زیادہ مایوسی اور طبقۂ علماء کی طرف سے سخت وحشت پیدا ہو گئی۔ مخالفینِ ندوہ وہاں جو کچھ کہہ رہے تھے اُن کی نسبت تو خیال تھا کہ یہ روشن خیال نہیں ہیں

---

[1] محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، ص ۱۸۷

[2] ملفوظاتِ تھانوی صاحب: الافاضات الیومیہ، جلد ۵، ص ۱۱۰

لیکن جو لوگ ندوہ کے لیے سرگرم تھے اُن کی بھی عجیب حالت نظر آتی تھی۔ چونکہ پانچ چھ مہینے تک اِن سرگرمیوں کو بالکل قریب سے دیکھتا رہا، اِس لیے اندرونی حالت بالکل میرے سامنے تھی۔ میں نے دیکھا کہ بالکل چالاک دنیاداروں کی سی کارروائیاں کی جا رہی ہیں اور وُہ تمام وسائل بے دریغ عمل میں لائے جاتے ہیں جو اپنی کامیابی کے لیے ایک شاطر سے شاطر اور عیار سے عیار جماعت کر سکتی ہے۔ لوگوں کو شامل کرنے کے لیے ہر طرح کی عیاریاں کی جاتی تھیں۔

میرے سامنے ایک واعظ نے ندوے کے ایک سرگرم ایجنٹ سے مشورہ کیا کہ مجلسِ وعظ میں کیونکر اُن کو اظہارِ جوش و خروش کرنا چاہیے اور کیونکر آخر میں نالہ و بکا شروع کر دینا چاہیے۔ چنانچہ تجویز پختہ ہو گئی۔ اِس کے بعد واعظ نے جونہی مثنوی کی ایک حکایت شروع کی دُوسرے صاحب نے معاً کھڑے ہو کر حال بازوں کی طرح حرکتیں شروع کر دیں۔ اِس سے مجلسِ وعظ میں بڑی رقت ہو گئی اور اِس قدر آہ و بُکا ہُوا کہ اِس پر وعظ ختم کر دیا گیا۔ اِس طرح کی بیسیوں باتیں روز میں دیکھتا تھا اور میرے دل میں اِس طبقے کی طرف سے وحشت بڑھتی جاتی تھی۔"[1]

ندوۃ العلماء کی وسیع عمارت کا سنگِ بنیاد کِس بزرگ نے رکھا تھا، یہ بھی ملاحظہ فرما لیا جائے:

"ندوہ کی تاریخ میں ۱۹۰۸ء کا سال ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اِس سال صوبہ (یُو۔پی) کے گورنر نے دارالعلوم کی وسیع عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا اور حکومت کی طرف سے ندوہ کو بعض مقاصد کے لیے پانچ سو روپے ماہوار امداد ملنی شروع ہُوئی۔"[2]

جب ندوۃ العلماء کی وسیع عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا جا رہا تھا، اُس وقت رنگ برنگے

---

[1] آزاد کی کہانی، ص ۲۱۷، ۲۱۸

[2] شیخ محمد اکرام، شبلی نامہ، ص ۱۷۸

حاضرین کا مجمع، ندوہ کے کرتا دھرتا، علامہ شبلی نعمانی (المتوفی ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء) کی روحانیت کو کس طرح مسرور کر رہا تھا، اِس کا اندازہ خود علامہ شبلی کے مندرجہ ذیل فخریہ بیان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

> "یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ترکی ٹوپیاں اور عمامے دوش بدوش نظر آتے تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مقدس علماء عیسائی فرمانروا کے سامنے دلی شکر گزاری کے ساتھ ادب سے خم تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ شیعہ و سُنّی ایک مذہبی درس گاہ کی رسم ادا کرنے میں برابر کے شریک تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی درس گاہ کا سنگِ بنیاد ایک غیر مذہب (یعنی انگریز) کے ہاتھ سے رکھا جا رہا تھا۔ غرض یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی سقف کے نیچے نصرانی، مسلمان، شیعہ، سُنّی، حنفی، وہابی، رند، زاہد، صوفی، واعظ، خرقہ پوش اور کجکلاہ سب جمع تھے۔"[1]

جس مقصد کی خاطر ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں لایا گیا تھا، سعیِ بسیار کے باوجود وہ مقصد حاصل نہ کیا جا سکا۔ علمائے اہلسنّت اِس پُرفریب جال سے دُور ہی رہے۔ بعض سادہ لوح علماء جو بروقت صحیح اندازہ نہ لگا سکے وہ صورتِ حال کے سامنے آتے ہی مجتنب ہو گئے۔ شروع میں ندوہ ہر قسم کی بدمذہبی کا معجون مرکب رہا اور نیچریت اس کا جزوِ اعظم تھا۔ یہ معجون صلح کلیت کے زہریلے قوام سے تیار کی گئی تھی۔ علامہ سید سلیمان ندوی (المتوفی ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۳ء) کے آخری دور میں یہ ادارہ "دارالعلوم دیوبند" کی ایک شاخ ہی شمار کیا جانے لگا تھا۔

علامہ شبلی نعمانی (المتوفی ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء) اپنے آخری ایّام میں کچھ دہریت کی طرف مائل ہوتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں جیسا کہ اُن کی تصنیف "الکلام" کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔ رہی موصوف کی ایجاد کردہ صلح کلیت، تو اس کے بعد گاندھویت کی بلاخیز آندھی

---

[1] شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ، ص ۱۴۰

ایسی ہمہ گیر بن کر چڑھی تھی کہ اِس کے عظیم نقصانات کے سامنے صلح کلیت کے بگولے کی مضرتوں کا چرچا بھی عام زبانوں سے اُتر جانا قدرتی امر تھا۔ گاندھویت اور گاندھوی علمائ کے کارناموں کی جھلک باب پنجم میں ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہے۔

مرزائے قادیان

انگریزوں نے جب برّصغیر پاک و ہند میں اپنے قدم جما لیے اور سارے ملک پر قابض ہو جانے کے اُنھیں امکانات بھی نظر آنے لگے تو اُنھوں نے اپنے بعض پادریوں کو اِس امر کا جائزہ لینے کی دعوت دی کہ مسلمانانِ ہند کے اندر، داخلی طور پر، مستقل اور پائدار انتشار و افتراق کس طریقے سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ پادری حضرات نے جائزہ لے کر جو رپورٹ پیش کی، وہ علاّمہ خالد محمود سیالکوٹی کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

> ”یہاں کے باشندوں کی ایک بہت بڑی اکثریت پیری مریدی کے رجحانات کی حامل ہے۔ اگر اِس وقت ہم کسی ایسے غدّار کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں جو ظلّی نبوّت کا دعوٰی کرنے کو تیار ہو جائے تو اُس کے حلقۂ نبوت میں ہزاروں لوگ جوق در جوق شامل ہو جائیں گے، لیکن مسلمانوں میں اس قسم کے دعوٰی کے لیے کسی کو تیار کرنا ہی بنیادی کام ہے۔ یہ مشکل حل ہو جائے تو اُس کی نبوت کو حکومت کے زیرِ سایہ پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔ ہم اِس سے پہلے برّصغیر کی تمام حکومتوں کو غدّار تلاش کرنے کی حکمت عملی سے شکست دے چکے ہیں۔ وہ مرحلہ اور تھا۔ اُس وقت فوجی نقطۂ نظر سے غدّاروں کی تلاش کی گئی تھی، لیکن اب جبکہ ہم برّصغیر کے چپّہ چپّہ پر حکمران ہو چکے ہیں اور ہر طرف امن و امان بھی بحال ہو گیا ہے تو اِن حالات میں ہمیں کسی ایسے منصوبے پر عمل کرنا چاہیے جو یہاں کے باشندوں کے داخلی انتشار کا باعث ہو۔“[1]

---

[1] عبدالرشید ارشد: بیس بڑے مسلمان، ص ۶

اِس رپورٹ کے بعد یا اِس سے بھی پہلے انگریزوں نے یہ منصوبہ ضرور بنایا ہوگا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ "صراط المستقیم" کتاب سیّد احمد صاحب بریلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کے دعوئ نبوت کی تمہید ہی تھی، جس میں وحی باطنی، عصمت، باری تعالیٰ شانہ، تک صعود اور اُس سے ہمکلامی تک کے دعاوی بھرے پڑے ہیں لیکن دستِ قضا نے اُنھیں منزلِ مقصود پر پہنچنے کی مُہلت نہ دی۔ اِس کے بعد "تحذیر الناس" کتاب بھی کچھ ایسے ہی منصوبے کی تکمیل کا ساتھ دیتی ہُوئی نظر آ رہی ہے لیکن اِس کے مصنّف مولوی محمد قاسم نانوتوی (المتوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء) بھی اِس بنیاد پر عمارت تعمیر کرنے یا تعمیر کروانے سے پہلے ہی راہیِ ملکِ عدم ہو گئے اور مرزا غلام احمد قادیانی (المتوفی ۱۹۰۸ء) ہی ایسے نکلے جو برٹش گورنمنٹ کے اِس ناپاک منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔ مرزا صاحب کے مذہبی خیالات و رجحانات کے بارے میں شیخ محمد اکرام صاحب کا خیال یہ ہے:

> "مولوی چراغ علی صاحب سے مرزا صاحب کی خط و کتابت تھی اور جہاد کے متعلق وہ مولوی صاحب کے ہم خیال تھے۔ اِسی طرح حضرت عیسٰی کے متعلق اُنھوں نے بیشتر سر سیّد کے خیالات کی پیروی کی لیکن باوجودیکہ اُن کی تعلیمات میں کئی باتیں نو معتزلہ خیالات سے قریب تھیں، وہ اکثر اصولی باتوں میں قدامت پسند تھے اور عام مسلمانوں سے اُن کے معتقدین بالخصوص قادیانی گروہ کا اختلاف بیشتر مرزا صاحب کے اپنے دعاوی کے متعلق ہے۔ اُنھوں نے مسیح موعود، مہدی منتظر اور کرشن اوتار ہونے کا دعوٰی کیا اور یہ ایسے دعوے ہیں، جن کو عام مسلمان غلط سمجھتے ہیں۔ نبوت کا دعوٰی کرکے اور ایک نیا فرقہ کھڑا کر کے اُنھوں نے مسلمانوں میں جو اختلاف پیدا کیا اُسے بھی اکثر مسلمان ناپسند کرتے ہیں۔"[1]

مرزا غلام احمد قادیانی، جہاں سر سیّد احمد خاں اور اُن کے دستِ راست مولوی

---

[1] محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، ص ۱۷۸

چراغ علی صاحب کے متبع یا ہم خیال تھے وہاں اُنھیں مولوی رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) سے بھی بڑی عقیدت تھی، چنانچہ دیوبندی عالم مولوی عبدالرشید ارشد نے اِس سلسلے میں یُوں وضاحت کی ہے:

> "مرزا غلام احمد قادیانی جس زمانے میں براہین لکھ رہے تھے اور اُن کا اخبارات میں چرچا ہو رہا تھا، اُس وقت اُن کو حضرت امام ربانی (یعنی گنگوہی صاحب) سے عقیدت تھی۔ اُس طرف جانے والوں کو پُوچھا کرتے تھے کہ حضرت مولانا اچھی طرح ہیں؟ اور دہلی سے گنگوہ کتنے فاصلے پر ہے؟ راستہ کیسا ہے وغیرہ۔
>
> اُسی زمانہ میں حضرت نے ایک دفعہ یُوں فرمایا تھا کہ "کام تو یہ شخص اچھا کر رہا ہے مگر پیر کی ضرورت ہے ورنہ گمراہی کا احتمال ہے"۔ [1]

بہرحال یہ راز و نیاز کی باتیں ہیں جنھیں ہمارے جیسے نااہل افراد سمجھ ہی نہیں سکتے کہ مرزا صاحب کو مولوی رشید احمد گنگوہی سے عقیدت کیوں ہُوئی؟ گنگوہی صاحب نے مرزا صاحب کو مردِ صالح کیوں قرار دیا تھا اور اُن کے کاموں کو کِس بِنا پر سراہا جا رہا تھا؟ نہیں معلوم کہ موصوف کو مرزا صاحب کے بے پیر رہنے اور پیر کی ضرورت ہونے کا کس طرح علم ہوا، یا خود اُن کے پیر ہونے کا شرف حاصل کرنے کے خواہشمند تھے؟ ہم یہ عقدہ بھی حل کرنے سے عاجز ہیں کہ اِدھر تو گنگوہی صاحب اپنی روحانیت سے قادیان کے ایک فرد کی گمراہی کا احتمال بھی دیکھ لیا کرتے تھے لیکن دُوسری طرف اُنھیں وُہ لوگ بھی نظر نہیں آتے تھے جو گنگوہ، انبٹھہ، سہارن پور اور دیوبند میں بیٹھ کر باری تعالیٰ شانہٗ کو جھُوٹا بتاتے رہتے تھے۔ اِس راز کو دیوبندی حضرات تو یقیناً سمجھتے ہوں گے۔

پروفیسر ابو زہرہ مصری نے مرزا غلام احمد قادیانی کا تعارف یُوں کروایا ہے:

> "انگریز جو مغربی تہذیب و ثقافت کو دیارِ ہند میں لائے تھے، مغربی تہذیب کے دلدادہ مسلمانوں سے بڑا لگاؤ رکھتے، اُنھیں تقربِ بارگاہ سے مشرف کرتے

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، ص ۲۲۳

> اور بڑے بڑے عہدوں سے نوازتے تھے۔ اس قسم کے مسلمان حاکم اُن دیار میں مسلمانوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ یہی وجوہات تھے جن کی بنا پر سرزمینِ ہند گمراہ فرقوں کی قرارگاہ بن گئی۔ غالباً قلتِ تعداد کے علی الرغم اُن فرقوں میں زیادہ نمایاں، قوی تر اور ترقی یافتہ قادیانی گروہ تھا۔ قادیانی فرقہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ اِس کے بانی و موسس مرزا غلام احمد قادیانی تھے، جن کی وفات ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء میں ہوئی۔ اُس کی نسبت قادیان کی طرف ہے جو ایک قصبہ ہے اور لاہور سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ مرزا غلام احمد وہاں مدفون ہیں۔ اُن کی قبر پر "مرزا غلام احمد موعود" کے الفاظ مرقوم ہیں۔ موعود سے مراد یہ ہے کہ مرزا صاحب وہی مہدی ہیں جن کا انتظار کیا جاتا تھا کہ وُہ آکر شریعت کی احیاء و تجدید کریں گے۔"[1]

مرزا غلام احمد قادیانی کی تعلیمات کے بارے میں مذکورہ مصری فاضل کی رائے قابلِ غور ہے، فرماتے ہیں:

> "حق بات یہ ہے کہ آپ کا قریبی تعلق ائمہ شیعہ سے ہے۔ شیعہ کا یہ دعویٰ ہے کہ اُن کے ائمہ معصوم و ملہم ہیں اور اُن کے ہاتھوں معجزات کا صدور ہوتا ہے تاہم وُہ یہ نہیں کہتے کہ اُن پر وحی نازل ہوتی ہے یا وُہ خدا سے شرفِ ہمکلامی حاصل کرتے ہیں۔ بہرحال مرزا صاحب کی تعلیمات کا اسلام سے کوئی سروکار نہیں۔"[2]

قارئین کرام! جن حضرات کے ذریعے برٹش گورنمنٹ نے تخریبِ دین اور افتراق بین المسلمین کا منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچایا تھا، اُن میں سے بعض حضرات کا گزشتہ سطور میں مختصر سا تذکرہ کر دیا ہے۔ یہی تھے وُہ حضرات جنھیں پُراسرار طریقے پر، پروپیگنڈا مشینری کے بل بوتے پر

---

[1] غلام احمد حریری، پروفیسر: اسلامی مذاہب، ص ۳۰۵

[2] ایضاً: ص ۳۱۵

پُورے برطانوی دور میں مسلمانوں کے رہنما منوایا جاتا رہا اور آج تک انگریزوں کی اُسی سنّت پر کمال سعادت مندی سمجھ کر عمل کیا جا رہا ہے۔ حقیقت تو ہر چشمِ بینا کے سامنے واضح ہے لیکن حالات کی ستم ظریفی نے اُلٹی گنگا بہائی ہُوئی ہے یعنی: ؎

راہزن خضرِ رَہ کی قبا چھین کر
رہنما بن گئے، دیکھتے دیکھتے

باب سوم

اعلانِ حق

غلامم جز رضائے تو نجویم
جز آں راہے کہ فرمودی نہ پویم
ولیکن گر بایں ناداں بگوئی
خرے را اسپ تازی گو ، نہ گویم

(علامہ اقبالؒ)

فرقہ سازی

قارئین کرام! گزشتہ باب میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ برٹش گورنمنٹ نے انتہائی رازداری کے ساتھ کن کن علماء کے ذریعے سچّے اسلام کو بدلنے اور مسلمانوں کی جمعیت کو منتشر و پریشان کرنے کا کام لیا۔ کہاں کہاں اُن کے مراکز قائم کیے۔ حکومت اور اُس کے کارندے اِس منصوبے میں یہاں تک کامیاب ہُوتے کہ اہلسنت میں سے جن لوگوں کو اغواکر کے مختلف جماعتیں علیٰحدہ علیٰحدہ قائم کرلیں، اُن جماعتوں کو کافروں اور مشرکوں سے مقابلہ کرنے کی تو آجتک توفیق نصیب نہیں ہُوئی لیکن اُن کے نمائندے اور کارندے مسلمانانِ اہلسنت و جماعت سے آج تک برسرِ پیکار چلے آتے ہیں، جو برطانوی منصوبے کی منزلِ مقصود تھی۔ مسلمانوں کی سابقہ جماعت سے علیٰحدہ یُوں تو کتنی ہی ٹولیاں بنائی گئیں لیکن برّصغیر پاک و ہند میں آج اُن میں سے پانچ قابلِ ذکر اور مستقل فرقے موجود ہیں، جو مذکورہ برطانوی منصوبے پر اب بھی آٹو میٹک مشین کی طرح سرگرمِ عمل ہیں۔ وُہ سارے جدید فرقے یہ ہیں:

۱۔ اہلحدیث فرقہ اِس گروہ کے بانی بلکہ برّصغیر پاک و ہند میں جتنے بھی فرقے برٹش گورنمنٹ کے منحوس دَور میں پیدا ہُوئے اُن سب کے مورثِ اعلیٰ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) ہیں۔ سب جماعتوں کا سلسلۂ نسب یہاں آکر ہی ملتا ہے جبکہ موصوف کی اصل جماعت وہی تھی جو آج فرقہ اہلحدیث کے نام سے متعارف ہے۔ شروع ایّام میں یہ فرقہ "محمدی گروہ" کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ جب مسلمانانِ اہلسنّت وجماعت نے کہنا شروع کر دیا کہ واقعی یہ محمدی ہیں کیونکہ محمد بن عبد الوہاب نجدی کے پیرِدکار جو ہیں۔ اِس نشان دہی سے بچنے کی خاطر اِن حضرات نے اپنا سابقہ لیبل ہٹا کر خود کو موحّد کہنا شروع کر دیا۔ علمائے اہلسنت کہنے لگے کہ یہ حضرات چونکہ عقیدۂ رسالت کے ایسے انداز میں قائل ہیں جو انکارِ رسالت سے چنداں مختلف نہیں، لہٰذا منکرِ رسالت ہونے کی صورت میں سکھوں کی طرح نِرے موحّد ہی تو رہ گئے، اگرچہ اِن کا عقیدہ توحید بھی خانہ ساز یا خوارج والا ہے۔

آخر اِس لیبل سے بھی یہ فرقہ بدکنے اور کترانے لگا۔ اِن حالات میں مولوی محمد حسین بٹالوی نے اِس جماعت کا نام اپنی مہربان سرکار سے اہلحدیث منظور کروایا، سرکاری کاغذات میں لکھوایا اور ملک کے ہر گوشے میں برٹش گورنمنٹ نے یہ حکم پہنچایا کہ آئندہ اِس جماعت کو اہلحدیث کے نام سے موسوم کیا جائے۔ چند سال محمدی اور موحّد کہلانے کے بعد ۱۸۸۸ء سے یہ فرقہ اہلحدیث کے نام سے موسوم چلا آرہا ہے۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے تقویۃ الایمان کے ذریعے خارجیت اور صراط المستقیم کتاب سے رفض پھیلایا تھا۔ اہلحدیث حضرات نے موصوف کے رفض کو چھوڑ کر اُن کی خارجیت وظاہریت کو اپنے دین کی بنیاد بنا رکھا ہے۔ اِس حقیقت کے پیشِ نظر دیکھا جائے تو یہ حضرات اب محمد بن عبدالوہاب نجدی کے بالکل نزدیک اور رفض چھوڑنے کے باعث مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی سے کافی دُور ہو چکے ہیں۔

یہ فرقہ بھی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا متبع اور موصوف کا عاشقِ زار ہے۔

۲۔ دیوبندی فرقہ

اِس فرقے کے جماعت اہلحدیث سے جُدا ہونے کی وجہ اور علیحدہ تشخص کی ضرورت اِن کی مخصوص ذہنیت اور سابقہ جماعت کی ناکامی سے سبق حاصل کرنا ہے۔ اِس جماعت کا سنگِ بنیاد مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء) نے رکھا۔ اِس گاڑی کو باقاعدگی سے چلانے کی غرض سے علماء کی کھیپ مولوی مملوک علی نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) نے دہلی کالج میں تیار کی۔ جب مدرسہ دیوبند قائم ہو گیا، اُسے مرکز قرار دے کر علیحدہ جماعت کی تشکیل ہونے لگی تو اِس نوزائیدہ گروہ کے مولوی رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) اور مولوی محمد قاسم نانوتوی (المتوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء) سرگروہ قرار پائے۔ وہابیوں کا یہ ٹولہ خود کو سُنّی حنفی ظاہر کر کے انتہائی دلفریب انداز میں بھولے بھالے اور حقیقتِ حال سے بے خبر سُنّیوں کو رات دن اغوا کرنے میں مصروف ہے۔ یہ گروہ اِس لحاظ سے وہابیوں کی جملہ جماعتوں سے خطرناک ہے کہ اِن کے وہابی ہونے کا عوام تو اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔ علاوہ بریں اِس جماعت کے بقچی بند تبلیغی رضاکار اِس درجہ تالیفِ قلوب اور دلفریبی کے ساز و سامان سے مسلّح ہو کر سُنّیوں کو اغوا کرنے اور اپنی جماعت میں ملانے کی خاطر نکلتے اور ملک کے کونے کونے میں پھیلتے ہیں کہ اِس پُر اسرار جال ہے

خوش نصیب مسلمان ہی بچتے ہیں ورنہ کتنے ہی اِس ظاہری دلفریبی سے دھوکا کھاکر خود اِس جال میں پھنسنے کے لیے تیار بیٹھے رہتے ہیں۔

۳۔ نیچری فرقہ یہ بھی محمدی گروہ کی ایک شاخ اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے معتقدین ومتبعین کا ایک مخصوص ٹولہ ہے۔ اِس کا سنگِ بنیاد سر سیّد احمد خاں علی گڑھی نے رکھا تھا۔ اِس کا مرکز علی گڑھ کالج قرار پایا۔ موصوف کے معاونین میں سر آغا خاں، خواجہ الطاف حسین حالی، علاّمہ شبلی نعمانی اور مولانا سمیع اللہ خاں دہلوی وغیرہ حضرات تھے۔

مذہبی معاملات میں اِن کے مِشن کو مولوی چراغ علی (المتوفی ۱۸۹۵ء)، رائٹ آنریبل سیّد امیر علی چنسوری (المتوفی)، وقار الملک (نواب مشتاق حسین)، محسن الملک (سیّد مہدی علی خاں) اور ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ نے پروان چڑھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا بلکہ ہمہ وقت نیا مذہب گھڑنے اور مقدس اسلام کو ذبح کرنے میں مصروف رہے۔

جب عبد اللہ چکڑالوی، مولوی محمد اسلم جیراجپوری اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے ہاتھوں میں نیچری مذہب پہنچا تو اِس نے چکڑالویت کی شکل اختیار کر لی۔ یہ فرقہ عقیدۂ رسالت اور احادیث مطہرہ کے خلاف ایک چیلنج ہے۔ قرآنی تعلیمات کے علمبردار ہونے کا مدعی لیکن کلامِ الٰہی کے خلاف پُراسرار سازش ہے۔ دعوٰی مسلمان ہونے کا ہے لیکن اِن کے نظریات اسلامی تعلیمات کو مسخ کرتے ہیں۔ آج کل اِس فرقے کے سربراہ، پروفیسر غلام احمد پرویز ہیں۔ موصوف نے چکڑالویت میں کمیونزم اور سوشلزم کو بھی شامل کر کے ایک طلسمی معجون تیار کی ہوئی ہے جو پرویزیت کے نام سے متعارف اور ۲۵ بی گلبرگ لاہور سے دستیاب ہے۔

۴۔ مرزائی فرقہ اِس فرقے کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی (المتوفی ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء) ہیں۔ موصوف نے دعوٰیِ نبوت کر کے اپنے متبعین کے دائرۂ اسلام میں رہنے یا مسلمان کہلاتے جانے کا سوال ہی ختم کر دیا۔ مرزا صاحب شروع ایام میں نیچریت کی طرف مائل تھے۔ دیوبندیت سے کسی قدر پیار اور مولوی رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) کے بھی درپردہ عاشقِ زار تھے۔ شیعہ حضرات کی صحبت، بہائیت کے مطالعے اور گورنمنٹ کی حوصلہ افزائی سے نبوت کا دعوٰی کر بیٹھے، جس کی جسارت

کوئی مسلمان کہلانے والا ہرگز نہیں کرسکتا۔ موصوف کی جماعت بھی دو گروہوں میں بٹ گئی ہے: (۱) قادیانی (۲) احمدی لاہوری

قادیانی حضرات مرزا صاحب کو نبی مانتے ہیں اور لاہوری پارٹی والے موصوف کے دعوٰیِ نبوت کی تاویلیں کرکے اُنھیں چودھویں صدی کا مجدّد قرار دیتے ہیں۔ نبیِ آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں دیکھا جائے تو آپ کے بعد نبوت کا دعوٰی کرنے والے حضرات کو سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نبی، مجدّد یا محض ایک مسلمان بھی نہیں بلکہ دجّال ٹھہرایا ہے اور ایسے دجاجلہ کی فہرست کا اعلان فرماتے ہوئے اُن کی تعداد بھی تئیس بتائی ہوئی ہے۔ چونکہ قادیانی اور لاہوری مرزائی خود کو مسلمان ہی کہتے ہیں، لہٰذا ہماری دُعا ہے کہ باری تعالیٰ شانہ' اِن حضرات کو مسلمان ہی بنا دے اور ہمیں اسلام پر قائم رکھے۔ آمین

مذکورہ چاروں فرقوں کے علاوہ، جو برٹش گورنمنٹ کے منحوس دور کی زندہ یادگاریں ہیں، اَور بھی چند فرقوں کا سنگِ بنیاد رکھا گیا، جن کا یہاں ذکر کر دینا بے جا نہ ہوگا۔ وہ یہ ہیں:

۵۔ صلح کلیّت و دہریت

جب دیوبند اور علی گڑھ کے مراکز قائم ہوئے تو ایک بالکل دینی اور دُوسرا سراسر دنیاوی معلوم ہوتا تھا، لہٰذا بعض حضرات کی رائے ہُوئی کہ ایک اِن کے مابین راستہ قائم کیا جائے۔ اِس خیال کے پیشِ نظر ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا۔ علاّمہ شبلی نعمانی (المتوفی ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۱۴ء) اِس کے کرتا دھرتا تھے۔ موصوف نے اپنی مخصوص ذہنیت و خیالات کے تحت ندوے سے تین فائدے حاصل کرنا چاہا ہے:

۱۔ علمائے اہلسنت کو برٹش گورنمنٹ کے جال میں پھنسانا۔

۲۔ صلح کلیت کی تبلیغ کہ ہر کلمہ گو مسلمان ہے، خواہ وہ خدا کا انکار کرے یا رسالت کا منکر ہی کیوں نہ ہو۔ صحابۂ کرام کو گالیاں دے یا نبوت کا دعوٰی کرے، قرآن و سنت کا منکر ہو یا عقائدِ اسلامیہ سے منحرف، کسی حالت اور کسی صورت میں اُس کے

مسلمان ہونے پر کوئی حرف نہیں آتا۔

۳۔ دہریت کا پرچار

مؤخر الذکر نظریہ چونکہ دیوبندی حضرات نے ٹھکرا دیا تھا لہٰذا علی گڑھی حضرات بھی دب گئے۔ علمائے اہلسنت کو اِس جال میں پھنسانے کی اسکیم بھی ناکام رہی، لہٰذا باقی رہ گئی صرف صلح کلیت، جس کو تحریکِ خلافت نے اپنا امتیازی عَلَم بنا کر گاندھی صاحب کی چوٹی پر بصد عقیدت لہرا دیا۔ جب یہ عَلَم بھی دیوبندی حضرات کے ہاتھوں میں آگیا تو علامہ سلیمان ندوی کے دَور سے ندوۃ العلماء ایک دیوبندی ادارہ ہو کر ہی رہ گیا۔ ندویوں نے رنگ تو بہت سے بدلے لیکن خدا کا شکر ہے کہ کوئی نیا فرقہ بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

۶۔ خاکسار پارٹی اِس فرقے کے بانی علامہ عنایت اللہ مشرقی (المتوفی ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء) تھے۔ یہ فرقہ اِس صدی کے اوائل میں آندھی کی طرح اُٹھا تھا لیکن نصف صدی ہی گزرنے پائی تھی کہ بُلبلے کی طرح بیٹھ گیا۔ اِس جماعت کا نام تو موجود ہے لیکن وجود اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے برائے نام ہی رہ گیا۔

۷۔ جماعتِ اسلامی اِس گروہ کے بانی مبانی جناب ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔ یہ جماعت دینی کم اور سیاسی زیادہ ہے۔ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے سیاسی عزائم اِس جماعت کی منزلِ مقصود ہے۔ دینی لحاظ سے بھی اس فرقے کا ذہن مخصوص ہے جو اہلحدیث اور دیوبندی حضرات میں سے کسی کے ساتھ مکمل اتفاق اور مطابقت نہیں رکھتا۔ چونکہ اِس جماعت کا سیاسی اور مذہبی مزاج مودودی صاحب کی ذات کے گرد گھومتا ہوا نظر آتا ہے، دریں حالات امید یہی ہے کہ اِس فرقے کا حشر بھی خاکسار پارٹی سے چنداں مختلف نہیں ہوگا۔ اگر مودودی صاحب کے بعد یہ جماعت باقی رہی بھی تو محض ایک سیاسی جماعت کے طور پر باقی رہے گی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مذکورہ فرقوں کی اصل وہابیت اور اُس کا سنگِ بنیاد رکھنے والے، متحدہ ہندوستان میں اس کی نشر و اشاعت کرنے والے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) ہیں۔ اِس باب کے اندر ہم نے اِسی امر کی وضاحت پیش کرنی ہے کہ دہلوی صاحب موصوف

اور دیگر فرقوں کے بانیوں نے نبی آخر الزماں صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے مقدس دین پر عملِ جرّاحی کی مشقیں کر کے، اِن کے نزدیک دین میں خدا اور اُس کے آخری رسول سے جو غلطیاں ہوگئی تھیں اُن کی اصلاح کر کے، جو نئے نئے اسلام گھڑے تھے وہ تعلیمات ونظریات کیا ہیں جو محمد عربی صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے دین سے متصادم اور رُوحِ اسلام کے سراسر منافی ہیں۔ وباللہ التوفیق وبہ الوصول الی ذری التحقیق اللّٰھم ارنا الحق حقا والباطل باطلا والحقنا بالصالحین آمین یا ارحم الراحمین بحق سید المرسلین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ محمد وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین الیٰ یوم الدین۔

رئیس المبتدعین مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی تخریب کاری

جیسا کہ قبل ازیں وضاحت کی جاچکی ہے کہ متحدہ ہندوستان میں فرقہ بازی کا سنگِ بنیاد مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) نے رکھا۔ موصوف نے اپنی رسوائے زمانہ اور ایمان سوز کتاب تقویۃ الایمان کے ذریعے خارجیت کی تبلیغ کی۔ اِس کے ساتھ ہی داؤد ظاہری کے انکارِ تقلید اور معتزلہ کے مزدار یہ فرقہ سے امکانِ کذب کا عقیدہ لے کر سب کو تقویۃ الایمان میں اکٹھا کیا گویا تقویۃ الایمان کی اصل بنیاد تو محمد بن عبدالوہاب نجدی کی کتاب التوحید پر رکھی گئی لیکن اُس میں ظاہری المذہب اور اعتزال کی قباحتوں کے لیے بھی پوری پوری گنجائش رکھی گئی۔ دُوسری طرف "صراط المستقیم" کتاب کے ذریعے "رفض" کی بھی کھل کر اشاعت کی۔ شیعہ حضرات جو اپنے ائمہ کی شان بیان کیا کرتے ہیں، اُنھیں صاحبِ وحی وعصمت اور انبیائے کرام سے بھی افضل بتاتے ہیں، موصوف نے یہ تمام صفات اپنے پیر جی میں بتادیں بلکہ اُنھیں اتنا بڑھایا چڑھایا کہ اگرچہ دعویٰ نہیں کیا مگر ہر قدم پر سیّد المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھی افضل واعلیٰ ہی منوانے کی کوشش کی۔ یہ امر "صراط المستقیم" کتاب سے بخوبی واضح ہوتا ہے اِس کا روشن بیان عنقریب آنے والا ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔ موصوف کے کارہائے نمایاں کے چند اہم گوشے ملاحظہ ہوں:

۱۔ ترکِ تقلید انکارِ تقلید کی طرف مولوی محمد اسمٰعیل کیوں راغب ہوئے جبکہ اُن کے پیشوا نجدی وہابی بھی تقلید کے منکر نہیں بلکہ حنبلی ہونے کے مدعی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقلیدِ ائمۂ دین ہی ایک ایسی چیز ہے جو مسلمانوں میں فرقہ بازی اور دین میں فتنہ و فساد برپا کرنے والوں کے راستے میں دیوارِ چین کی طرح حائل ہو جاتی تھی۔ حکومت نے محسوس کیا کہ تخریب کاروں کے راستے کی اِس رکاوٹ کا سب سے پہلے دُور ہونا ازبس ضروری ہے تاکہ اِن کے بعد جس پر بھی محقق، مصلح، ریفارمر اور شمس العلماء کا لیبل لگا کر کھڑا کیا جائے، اسلاف سے انکارِ تقلید کی بدولت رابطہ منقطع ہونے کی وجہ سے، بہت سے مسلمان اُن کے پیچھے لگ جائیں گے۔ چونکہ ہر مصلح و ریفارمر کی تعلیم جُدا ہو گی لہٰذا جتنے ریفارمر کھڑے کیے جائیں گے اُتنے ہی فرقے بآسانی بن سکیں گے۔ اِس برطانوی منصوبے کے تحت موصوف نے مسلمانوں کا رشتہ اکابر سے منقطع کرنے اور فرقہ سازی کے لیے دروازہ کھولنے کی غرض سے تقلید کو شرک اور گیارہ سو سالہ مسلمانوں اور اُمتِ محمدیہ کو مشرک و جہنمی ٹھہراتے ہوئے صاف صاف مشرک کہہ دیا اور اپنے خاندانی اکابر کو بھی دوزخ سے بچانے کی پروا نہ کرتے ہوئے لکھ دیا:

لیت شعری کیف یجوز التزام	یعنی میں کیسے جانوں کہ ایک شخص کی تقلید
تقلید شخص معین مع تمکن الرجوع	کو لیے رہنا کیونکر حلال ہو گا جبکہ اپنے
الی الروایات المنقولۃ عن النبی	امام کے مذہب کے خلاف صریح حدیثیں
صلی اللّٰہ علیہ وسلم الصریحۃ الدالۃ	پا سکے۔ اِس پر بھی امام کا قول نہ چھوڑے
علی خلاف قول الامام فان لم یترک	تو اِس میں شرک کا میل ہے۔
قول امامہ ففیہ شائبۃ من الشرک[1]	(نعوذ باللّٰہ من ذٰلک)

مشرک کہنے کے ساتھ موصوف نے مقلدین کو نرالی جرأت مندی سے نصرانی بھی ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تنویر العینین، ص ۲۷

اتباع شخص معين بحيث يتمسك بقوله وان ثبت على خلافه دلائل من السنة والكتاب ويأول الى قوله شوب من النصرانية وحظ من الشرك والعجب من القوم لا يخافون من مثل هذا الاتباع بل يخيفون تاركه ۔ [1]

یعنی ایک امام کی پیروی کہ اُس کی بات کی سند پکڑے اگرچہ اُس کے خلاف کتاب و سنت سے ثابت ہو اور اُنھیں (آیات و احادیث کو) اُس قول کی طرف پھیرے ۔ یہ نصرانی ہونے کا میل اور شرک کا حصّہ ہے اور تعجب ہے کہ وہ لوگ خود تو اِس تقلید سے ڈرتے نہیں بلکہ اِس کے چھوڑنے والے کو ڈراتے ہیں ۔

ائمۂ مجتہدین و اکابر اسلاف سے مسلمانوں کو رشتۂ تعلق منقطع کرنے کی موصوف نے کنایۃً تلقین کرتے ہُوئے تقلید کے بارے میں اپنے خیالات کا یُوں اظہار کیا ہے :

” اِس زمانہ میں دین کی بات میں لوگ کتنی راہیں چلتے ہیں ، کتنے پہلوں کی رسموں کو پکڑتے ہیں ، کتنے قصّے بزرگوں کے دیکھتے ہیں اور کتنے مولویوں کی باتوں کو جو اُنھوں نے اپنے ذہن کی تیزی سے نکالی ہیں سند پکڑتے ہیں اور کوئی اپنی عقل کو دخل دیتے ہیں ۔ اِن سب سے بہتر راہ یہ ہے کہ اللہ اور رسول کے کلام کو اصل رکھیے ، اُس کی سند پکڑیئے ۔“ [2]

یہ بالکل بجا کہ اللہ و رسول کا کلام اصل ہے ، سند بھی اُسی کی پکڑنی چاہیے ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اللہ و رسول کے کلام کو سند کون پکڑے ؟ عالم یا جاہل ؟ جاہل تو اللہ و رسول کے کلام کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا ۔ یقیناً وہ علمائے کرام کی طرف ہی رجوع کرے گا یا تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہے تو بزرگوں کی آسان تصانیف سے دین سمجھنے کی کوشش کرے گا

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی ، مولوی : تنویر العینین

[2] محمد اسمٰعیل دہلوی ، مولوی : تقویۃ الایمان ، مطبوعہ اشرف پریس لاہور ، ص ۲۵ ، ۲۶

اُن بزرگوں کی تصانیف سے جن پر اُمتِ محمدیہ کا اعتماد رہا ہے لیکن دہلوی صاحب فرماتے ہیں کہ خواہ تم قرآن وحدیث کا ایک لفظ نہیں جانتے، اُس زبان سے مطلقاً ناواقف ہو لیکن پہلے بزرگوں کی باتیں مت مانو، وہ تو اُنھوں نے اپنے ذہن کی تیزی سے نکال کر کھڑی کر دی تھیں، بس قرآن وحدیث کی سند پکڑو۔ لیکن یہ نکتہ نہیں سمجھایا کہ وہ ناواقف کس طرح قرآن وحدیث کی سند پکڑیں؟ نیز جب پہلے بزرگ اور مولوی سب ناقابلِ یقین ہیں تو خود یہ حضرتِ ناصح کہاں سے قابلِ اعتماد بن کر آگئے تھے اور خود لوگوں کو کیوں تلقین کرنے اور تقویۃ الایمان و دیگر تصانیف پڑھنے کی اور اپنی تقریریں سُننے کی تلقین فرمانے لگے تھے؟ کیا موصوف کے ارشادات کا نام کتاب وسنّت ہے؟

عوام الناس کو اکابر سلف سے رشتہ منقطع کرنے کا درس دینے اور براہِ راست قرآن و حدیث سے استفادہ کرنے کی تلقین فرما تو دی لیکن کھٹکا ہوا کہ کہاں متحدہ ہندوستان کے مسلمان اور کہاں قرآن وحدیث کی تعلیمات۔ یہ بیچارے تو عربی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے۔ ضرور وہ عرض کریں گے کہ حضرت! ہم قرآن وحدیث سے براہِ راست کس طرح ہدایت حاصل کریں؟ جب اسلاف کی تعلیمات پر کان ہی نہیں دھرنا تو موجودہ علماء میں ہی کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ یہ اپنے ذہن کی تیزی سے باتیں نہ نکالیں گے یا خدا نے اِن کے ماتھے پر لکھ دیا ہے کہ یہ ضرور کتاب وسنّت کے حقیقی ترجمان ہیں۔ لہٰذا گزشتہ و موجودہ علماء کو چھوڑا، سب سے منہ موڑا، لیکن ہم تو قرآن وحدیث میں الف کے نام ب نہیں جانتے۔ اب بتائیے دین کیسے حاصل کریں؟ موصوف اِسی خدشے کے پیشِ نظر یُوں تلقین کرتے ہیں:

> "یہ جو عوام الناس میں مشہور ہے کہ اللہ ورسول کا کلام سمجھنا بہت مشکل ہے، اِس کو بڑا علم چاہیے۔ ہم کو وہ طاقت کہاں کہ اُن کا کلام سمجھیں۔ اُس راہ پر چلنا بڑے بزرگوں کا کام ہے، ہماری کیا طاقت کہ اس کے موافق چلیں، بلکہ ہم کو یہی باتیں کفایت کرتی ہیں جن پر چلے جاتے ہیں۔ سو یہ بات بہت غلط ہے۔ اِس واسطے کہ اللہ صاحب نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں باتیں بہت صاف وصریح ہیں، ان کا سمجھنا مشکل نہیں۔"[1]

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ٢٦

ناخواندہ مسلمانوں کے سوال کا موصوف کے پلّے جواب تو کوئی نہیں تھا لیکن چونکہ اُنھیں اِسی راستے پر لگانا مقصود تھا لہٰذا حوصلہ دینا پڑا کہ چاہے ایک لفظ کا بھی پتہ نہ چلے لیکن بات قرآن وحدیث سے کرو۔ یہ خطرہ نزدیک بھی نہ آنے دو کہ ہم بے علم ہیں۔ بس اتنا سمجھ لو کہ قرآن وحدیث کو سمجھنے کے لیے علم کی ضرورت ہی کب ہے؟ اور قرآن وحدیث کے سمجھنے میں الجھن ہی کہاں ہے جو تم ڈرتے پھر رہے ہو؟ اللہ کا نام لے کر خود کو مفسّر اور محدّث سمجھنا شروع کر دو۔ آگے یُوں تسلّی دے دی ہے:

> "اللہ ورسول کا کلام سمجھنے کو بہت علم نہیں چاہیے کہ پیغمبر تو نادانوں کے راہ بتانے کو، جاہلوں کے سمجھانے کو اور بے علموں کے علم سکھانے کو آئے تھے۔"[1]

آگے سورۂ جمعہ کی آیت ۶۲ پیش کر کے، قرآنی تحریف کے مرتکب ہو کر یُوں ایٹمی حکم سُنا دیا:

> "جو کوئی یہ آیت سُن کر پھر یُوں کہنے لگے کہ پیغمبر کی بات سوائے عالموں کے کوئی نہیں سمجھ سکتا اور اُن کی راہ پر سوائے بزرگوں کے کوئی نہیں چل سکتا، سو اُس نے اِس آیت کا انکار کیا اور اِس نعمت کی قدر نہ سمجھی۔"[2]

ہمیں اپنی اِس کوتاہ علمی کا اعتراف کرتے ہُوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کیونکہ باوجود سعیِ بسیار کے یہ معلوم کرنے سے ہم آج تک قاصر رہے ہے کہ دہلوی صاحب موصوف کی اصطلاح میں عالِم اور بزرگ کی تعریف کیا ہے؟ آخر یہ منکرِ قرآن ہونے کا حکم کس دلیل سے ہے؟ ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ مذکورہ آیت میں جس حقیقت کا واضح ثبوت ہے اُسی کی ضد پر دہلوی صاحب اِسے دلیل بنا لائے ہیں۔ یعنی آیۂ کریمہ میں ہے تین امور کا تذکرہ ہے کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مشاغل یہ ہیں:

۱۔ لوگوں پر قرآن پڑھنا

۲۔ انسانوں کا تزکیۂ نفوس کر کے اُنھیں پاک کر دینا۔

۳۔ اُنھیں کتاب وحکمت سکھانا۔

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۲۶

[2] ایضاً: ص ۲۷

آپ کے بعد یہ فرائض علمائے کرام و اولیائے عظام کے سپرد ہیں۔ لوگوں کو قرآن کریم نے ترغیب دی ہے کہ وہ کتاب و حکمت سیکھنے کے لیے علمائے کرام کی طرف اور تزکیۂ نفوس کے لیے اولیائے عظام سے رجوع کریں۔ چنانچہ حکمِ خداوندی ہے:

فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ [1]

جو کچھ تم نہیں جانتے وہ اہل علم (علماء) سے دریافت کرو۔

دُوسرے مقام پر بزرگانِ دین کے اتباع کے بارے میں یُوں واشگاف لفظوں میں فرما دیا گیا ہے:

وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ۔ [2]

اُس کا اتباع کرو جو میری طرف رجوع لایا۔

لیکن مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت باری تعالیٰ شانہٗ کے حریف بن کر کھڑے ہو گئے کہ وُہ مسلمانوں کو علمائے کرام اور اولیائے عظام کی طرف رجوع کرنے کا حکم فرماتا ہے تو موصوف اُس کے احکام کو قرآن کے خلاف اور انکارِ آیاتِ الٰہیہ بنا کر علماء و اولیاء سے کنارہ کش ہو کر خود قرآن و حدیث کو سمجھنے کی تلقین فرماتے ہیں حالانکہ جب تک علمائے کرام کی طرف رجوع نہ کیا جائے قرآن و حدیث کا ایک لفظ بھی کوئی جان نہیں سکتا۔ دہلوی صاحب کی اِس تلقین سے جو نتائج برآمد ہُوئے وُہ حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ انکارِ تقلید کی وجہ سے فرقہ بازی و فتنہ پردازی کا دروازہ کُھل گیا۔

۲۔ قرآن و حدیث کے علوم حاصل کرنے کی غرض سے وہابی حضرات اپنے علماء کی طرف تو رجوع کرتے ہیں لیکن تیرہ ۱۳ صدیوں کے اکابر سے اِن حضرات نے اپنا رشتہ حقیقتاً منقطع کر لیا ہے۔ تعلق کا صرف نام باقی ہے۔

۳۔ تزکیۂ نفس کے لفظ سے یہ لوگ آشنا ہوتے ہیں، لیکن اُس کی حقیقت اِن کے لیے

---

[1] سورہ النحل، آیت ۴۳

[2] سورہ لقمان، آیت ۱۵

عنقا ہو کر رہ گئی ہے۔

۲۔ توہینِ اُلوہیت

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے معتقدین بھی ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ جب دنیا شرک کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی تو موصوف نے مسلمانوں کو توحید سے آگاہ کیا اور شرک و کفر سے بچایا، لیکن حقیقت اِس کے بالکل برعکس نظر آتی ہے۔ جب وُہ خارجیت کا عَلَم لے کر کھڑے ہُوئے تو باری تعالیٰ شانہٗ کو کس طرح معاف کر سکتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے باری تعالیٰ شانہٗ کو جھُوٹا بتانے اور منوانے کی خاطر یُوں اپنی منطق دانی کا اظہار کیا ہے:

"لانسلم کہ کذب مذکور محال بمعنی مسطور باشد چہ عقد قضیۂ غیر مطابقہ للواقع و القائے آں بر ملائکہ و انبیاء خارج از قدرت الٰہیہ نیست و الّا لازم آید کہ قدرت انسانی ازید از قدرتِ ربّانی باشد۔"[۱]

اِسی سلسلے میں موصوف نے مزید یُوں کھُل کر وضاحت کی ہُوئی ہے:

"عدم کذب را از کمالاتِ حضرت حق سُبحانہٗ می شمارند و اُو را جلّ شانہٗ باں مدح میکنند برخلاف اخرس و جماد و صفتِ کمال ہمیں است کہ شخصے قدرت بر تکلم بکلامِ کاذب دارد و بنا بر رعایتِ مصلحت و مقتضائے حکمت بتنزہ از شوب کذب تکلم بکلامِ کاذب ننماید، ہماں شخص ممدوح می گردد وبخلاف کسے کہ لسانِ اُو ماؤف شدہ یا ہرگاہ ارادۂ تکلم بکلامِ کاذب نماید آواز بند گردد یا کسے دہن اُو را بند نماید، ایں اشخاص نزدِ عقلاء قابلِ مدح نیستند۔ بالجملہ عدمِ تکلم بکلام کاذب ترفعاً عن عیب الکذب و تنزہاً عن التلوث بہ از صفاتِ مدح است۔"[۲]

اِس مسئلے کے بارے میں چونکہ اِسی مجموعے کے اندر ایک مستقل عنوان کے تحت بحث

---

[۱] محمد اسماعیل دہلوی، مولوی: یک روزہ، مطبوعہ صدیقیہ پریس ملتان، ص ۱۷

[۲] ایضاً: ص ۱۷، ۱۸

موجود ہے لہٰذا یہاں کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ یہ ناپاک نظریہ ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے اندر دفن ہو گیا تھا لیکن اٹھاون سال بعد برٹش گورنمنٹ کے ایما و اشارے پر ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۷ء میں گنگوہ سے پھر ظہور پذیر ہُوا اور "براہین قاطعہ" جیسی شرمناک کتاب کے صفحات پر چہل قدمی کرتا ہُوا دیکھا گیا۔

موصوف صرف خدا کو جھُوٹا ہی نہیں جانتے تھے بلکہ اُسے مجسّم مانتے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ جو شخص خدا کو زمان و مکان و جہت سے پاک جانتا اُس کی رویت بغیر جہت و محاذات کے مانتا تو ایسے شخص کو بدعتِ حقیقیہ کا مرتکب یعنی کافر ٹھہراتے تھے۔ چنانچہ اِن امور کی تصریح موصوف نے یُوں کی ہے:

> "تنزیہ اُو تعالیٰ از زمان و مکان و جہت و اثباتِ رویت بلاجہت و محاذات ..... ہمہ از قبیلِ بدعاتِ حقیقیہ است، اگر صاحب آں اعتقاداتِ مذکورہ را از جنسِ عقائدِ دینیہ می شمارد" ملخصاً [1]

موصوف کی اِس تصریح سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ جب مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے نزدیک اللہ تعالیٰ زمان و مکان میں گھِرا ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ کے بارے میں وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ کیسے کہا جا سکے گا؟ اِس طرح تو زمان و مکان کو ہر چیز پر محیط ماننا لازم آتا ہے، جن کے احاطے سے خالق بھی باہر نہ رہا۔

۲۔ اِس صورت میں اللہ اکبر کہنا کس طرح درست قرار پائے گا، جبکہ زمان و مکان اللہ تعالیٰ پر بھی محیط بنا دیئے اور تسلیم نہ کرنے پر بدعت حقیقیہ کا خطرہ سُنا دیا۔

۳۔ اوّلاً جو زمان و مکان میں گھِرا ہُوا ہے، ثانیاً جس کا دیدار بغیر جہت و محاذات کے نہ ہو سکے، یقیناً وُہ مجسّم قرار پاتا ہے اور ہر مجسّم فانی ہے اور جو فانی ہو وُہ الوہیت کے لائق نہیں۔ اب کیا فرماتے ہیں توحید کا فرضی ڈھول بجا کر مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے والے

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: ایضاح الحق، مطبوعہ دیو بند، ص ۴۴، ۴۵

علماء، کہ اُن کے امام نے الوہیت کا خاتمہ اور وجود باری تعالیٰ شانہٗ کے انکار کی یہ بنیاد کس خوشی میں رکھی تھی؟

دہلوی صاحب موصوف نے اپنی نرالی توحید کی ترنگ میں باری تعالیٰ شانہٗ کا عالم الغیب ہونا اپنے مخصوص اندازِ فکر سے اِس طرح بیان کیا ہے:

> "ظاہر کی چیزوں کو دریافت کرنا لوگوں کے اختیار میں ہے، جب چاہیں کریں، جب چاہیں نہ کریں۔ سو اِسی طرح غیب کا دریافت کرنا اپنے اختیار میں ہو، جب چاہے کر لیجیے، یہ اللہ صاحب ہی کی شان ہے۔"[۱]

یہ عبارت بالکل آسان اُردو میں ہے۔ ہر معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی بخوبی اِس کا مطلب سمجھ سکتا ہے۔ کوئی مشکل یا غیر ملکی زبان کی فلسفیانہ عبارت تو ہے نہیں، جس کا مفہوم و مطلب بآسانی معلوم نہ کیا جا سکے۔ موصوف نے اِس دوسطری عبارت میں کئی قسم کا زہر گھولا ہے، لیکن یہاں اظہار کرنا صرف اِس امر کا مقصود ہے کہ اُنھوں نے اپنے اللہ صاحب کی علمی شان کس قسم کی بیان کی ہے۔ اِس عبارت سے جو کچھ ہم سمجھ سکے، وُہ یہ ہے:

۱۔ دہلوی صاحب کے نزدیک اُن کا خالق عَالِمُ الْغَیْبِ نہیں اور نہ اُس کے متعلق وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ہی کہنا درست ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ غیب پر اُس کا کنٹرول ہے۔ جب چاہتا ہے کسی خفیہ بات یا جملہ مغیبات سے باخبر ہو بیٹھتا ہے، نہ چاہے تو دنیا و مافیہا سے آنکھیں بند کر کے ایک مجذوب کی طرح پڑا رہتا ہے۔

۲۔ موصوف کے نزدیک علمِ الٰہی قدیم اور واجب نہیں۔ اسی لیے تو دریافت کرنا پڑتا ہے۔

۳۔ اُن کے نزدیک باری تعالیٰ شانہٗ کا جہل ممکن ہے، نہ صرف ممکن بلکہ شانِ الٰہی کا ایک جزو ہے۔ کیونکہ جس بات کو دریافت کرتا ہے، قبل ازیں اُس سے بے خبر ہوگا، اسی لیے تو دریافت کرے گا۔ (نعوذ باللہ من ذٰلک۔ وما قدروا اللہ حق قدرہٖ)

۳۔ توہینِ شانِ رسالت

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کا محبوب ترین مشغلہ توہین و تنقیص شانِ رسالت تھا۔

---

[۱] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۵۳

موصوف اِس میدان کے ایسے البیلے شہسوار تھے کہ اگلے پچھلے سارے گستاخوں کے کان کتر لیے، سب سے اُستادی کا لوہا منوا لیا۔ قرآنِ کریم سامنے رکھ لیجیے۔ انبیائے کرام کی شان میں منکروں اور گستاخوں نے جو بیہودہ کلمات استعمال کیے اُنھیں لکھ لیجیے۔ پھر احادیثِ نبوی کے ذخائر اور کتبِ تواریخ و سِیَر سے گستاخوں کے سارے نازیبا کلمات نکال کر اِسی فہرست میں شامل کر لیجیے۔ اب اِس مجموعۂ خرافات کا تقویۃ الایمانی مغلّظات سے مقابلہ کیجیے۔ اگر دل میں انبیائے کرام کی عظمت و رفعت کا تصوّر موجود ہے اور کسی بے دین کے پیچھے لگ کر یہ رُوحِ ایمان ضائع نہیں کی ہے تو ہر منصف مزاج ذی علم اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک شانِ رسالت میں جتنے گستاخانہ کلمات استعمال کیے گئے ہیں، مصنّفِ تقویۃ الایمان اُن سب پر سبقت لے گیا اور موصوف نے اِس میدان کی بین الاقوامی چیمپئن شِپ جیت لی ہے۔ اُن نازیبا کلمات کے نقل کرنے سے دل دہلتا اور قلم شق ہوتا ہے لیکن حالات کی ستم ظریفی اور نقلِ کفر کفر نباشد کے پیشِ نظر، اہلِ اسلام کی خیر خواہی کی غرض سے چند عبارتیں کلیجے پر پتھر رکھ کر نقل کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

بمقتضائے ظلمت بعضہا فوق بعض، از وسوسۂ زنا خیالِ مجامعتِ زوجۂ خود بہتر ست و صرفِ ہمت بسوئے شیخ و امثالِ آں از معظمین گو جناب رسالتمآب باشند، بچندیں مرتبہ بدتر از استغراق در صورتِ گاؤ خر خود ست، کہ خیالِ آں بتعظیم و اجلال بسویدائے دِل انسان می چسپد، بخلاف خیالِ گاؤ خر کہ نہ آں قدر چسپیدگی می بود و نہ تعظیم بلکہ مہان و محقر بود و ایں تعظیم و اجلالِ غیر کہ در نماز ملحوظ و مقصود می شود بشرک می کشد"۔[1]

بمقتضائے ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ زنا کے وسوسے سے اپنی بی بی کی مجامعت کا خیال بہتر ہے اور شیخ یا اُسی جیسے بزرگوں کی طرف خواہ جنابِ رسالتمآب ہی ہوں، اپنی ہمت کو لگا دینا، اپنے بیل اور گدھے کی صورت میں مستغرق ہونے سے زیادہ بُرا ہے۔ کیونکہ شیخ کا خیال تو تعظیم اور بزرگی کے ساتھ انسان کے دِل میں چمٹ جاتا ہے اور بیل اور گدھے کے خیال کو نہ تو اس قدر چسپیدگی ہوتی ہے اور نہ تعظیم، بلکہ حقیر اور ذلیل ہوتا ہے اور

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی : صراط المستقیم، ص ۹۵

غیر کی یہ تعظیم اور بزرگی جو نماز میں ملحوظ ہو
وُہ شرک کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے۔"[1]

مذکورہ بالا عبارت کا مفہوم کتنا ایمان سوز، عبارت کا ہر تیور کتنا کفر بیز و کفر ریز ہے۔

قرآن کریم کو اوّل سے آخر تک پڑھیے، انبیائے کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین کے مبارک تذکروں سے بھرا ہُوا ہے۔ اُن مقدس ہستیوں کا ذکر اُن کے خالق و مالک نے انتہائی پیارے انداز میں کیا، وُہ تذکرے اُمتِ محمدیہ کی ترغیب و تشویق کی خاطر اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر نازل فرمائے، اُن محبت بھرے بیانات، تعظیم و اجلال کے اعلانات کا نمازوں میں بھی پڑھنا مسلمانوں کے لیے لازمی قرار دیا گیا۔ جو اُن بزرگوں کے خطبے، زبانِ الٰہی میں نمازوں کے اندر نہ پڑھے، اُن کے کمالاتِ عالیہ عین حالتِ نماز میں بیان نہ کرے، اُن کے گُن نہ گائے اُس کی نماز ہرگز نماز ہی نہیں ہے۔ اِسی طرح ہر نماز میں محبوبِ پروردگار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہِ عالی میں ہدیۂ سلام پیش کرنا ہوتا ہے۔ آپ پر اور آپ کی آل پر جب تک صلوٰۃ و تسلیم کے پھول نچھاور نہ کیے جائیں نماز مکمل نہیں ہوتی۔ یہی وُہ مبارک طریقہ ہے جو تیرہ سو سال سے اُمتِ محمدیہ میں جاری تھا اور انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک جاری رہے گا۔ امام اہلسنت علیہ الرحمہ نے ایسے حضرات کو یُوں فہمائش کی تھی؛ ؎

ذکرِ خدا جو اُن سے جدا چاہو نجدیو!
واللہ ذکرِ حق نہیں، کنجی سقر کی ہے

دہلوی صاحب موصوف کے اِس اصطلاحی شرک سے وُہ آدمی بچ سکتا ہے جو نمازوں میں قرآن کریم کی تلاوت کے نزدیک بھی نہ جائے۔ نمازوں میں درودِ پاک پڑھنے، تشہد میں عرضِ سلام کرنے سے پرہیز کرے ورنہ آنجناب کے نزدیک وہ شرک کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جائے گا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موصوف کے اِس اصطلاحی شرک سے مسلمان رہتے ہُوئے بچنے کا کون سا راستہ ہے؟

---

[1] صراطِ مستقیم اردو، مطبوعہ نامی پریس لاہور، ص ۲۰۱

یہ اجلال وتعظیم جب نماز میں شرک ٹھہرائی تو دوسری عبادتوں میں یہی شرک جزوِ ایمان تو نہیں بن جائے گا، وہاں جائز کیسے ہوجائے گا؟ کیا خدا کو صرف نماز کی حالت کا شرک ہی ناپسند اور باقی عبادتوں میں مقبول وپسندیدہ ہے؟ ہرگز نہیں، جو امر نماز میں شرک ہے دوسری عبادتوں کے درمیان اگر اُس کا ارتکاب کیا گیا تو وہاں بھی شرک ہی ٹھہرے گا۔ پس جس نے کلمہ طیبہ پڑھتے ہُوئے محمد رسول اللہ کہا وُہ بھی شرک کے سمندر میں گرا۔ درودِ پاک کا تو ہر لفظ گلے میں شرک کا پھندا ڈالے گا۔ اذان واقامت کے وقت بھی یہی ماجرا پیش آئے گا۔ قرآن کریم کی تلاوت کرنے بیٹھے تو ہر آیت شرک ساگر میں غوطہ دے گی۔ اِس وبائی شرک سے بچنے کا اِس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں کہ جملہ عبادتوں بلکہ اسلام ہی کو خیر باد کہہ کر، بیک بینی و دوگوش شہرِ خموشاں کا مکیں ہوجائے (نعوذ باللہ من ذٰلک) اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایسے باطل نظریات اور گمراہ گردوں کے شر سے محفوظ ومامون رکھے۔ آمین

انبیائے کرام واولیائے عظام کا تصوّر لانے، دل میں خیال جمانے کے بارے میں موصوف کا نظریہ پیش کر دیا گیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اُن مقدس ہستیوں کے علوم مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی نظر میں کیا تھے؟ چنانچہ وُہ لکھتے ہیں:

> ”جو کچھ اللہ اپنے بندوں سے معاملہ کرے گا، خواہ دنیا میں، خواہ قبر میں، خواہ آخرت میں، سو اُس کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں۔ نہ نبی کو، نہ ولی کو، نہ اپنا حال، نہ دُوسرے کا۔“ [1]

دُوسرے مقام پر موصوف نے یُوں وضاحت کی ہُوئی ہے:

> ”اِسی طرح کچھ اِس بات میں بھی اُن کو بڑائی نہیں ہے کہ اللہ صاحب نے غیب دانی اُن کے اختیار میں دے دی ہو کہ جس کے دل کا احوال جب چاہیں معلوم کرلیں، یا جس غائب کا احوال جب چاہیں معلوم کرلیں کہ وُہ جیتا ہے کہ مرگیا، یا کس شہر میں ہے، یا کس حال میں، یا جس آئندہ بات کو جب ارادہ کریں

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۶۲

تو دریافت کرلیں کہ فلانے کے ہاں اولاد ہوگی یا نہ ہوگی، یا اِس سوداگری میں اُس کو فائدہ ہوگا یا نہ ہوگا، یا اِس لڑائی میں فتح پائے گا یا شکست، کہ اِن باتوں میں بھی بندے بڑے ہوں یا چھوٹے سب یکساں بے خبر ہیں اور نادان۔"[1]

ایک اور جگہ اِسی رُسوائے عالَم کتاب میں اِس طرح تصریح کی گئی ہے:

> کوئی شخص کسی سے کہے کہ فلانے کے دل میں کیا ہے، یا فلانے کی شادی کب ہوگی، یا فلانے درخت کے کتنے پتّے ہیں، یا آسمان میں کتنے تارے ہیں، تو اِس کے جواب میں یہ نہ کہے کہ اللہ و رسول ہی جانے، کیونکہ غیب کی بات اللہ ہی جانتا ہے، رسول کو کیا خبر؟"[2]

منافقینِ مدینہ نے سرورِ کون و مکاں، عالِمِ علومِ اوّلین و آخرین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں ایک مرتبہ کہا تھا "مَا یُدْرِیْہِ بِالْغَیْبِ"۔ موصوف نے اُن دشمنانِ دین وایمان کے ساتھ پُورے طور پر موافقت کرتے ہُوئے، اُن کا وُہی نازیبا فقرہ اپنی زبان میں یوں دُہرا دیا کہ "غیب کی بات اللہ ہی جانتا ہے، رسول کو کیا خبر؟" نیز اولیائے کرام و انبیاء علیہم السلام کو دنیا و آخرت میں اپنے اور دوسروں کے حال سے بے خبر بتا دیا، جرأت و جسارت کی حد کرتے ہُوئے نادان تک لکھ دیا (نعوذ باللہ منہا)، رسول دشمنی کا رنگ اور چڑھا تو درختوں کے پتّے اور آسمان کے تارے بھی غیب ہو کر رہ گئے۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ رسول کسی درخت کے پتّوں کی گنتی جانتے ہیں تو دہلوی صاحب کے نزدیک اُس شخص نے رسول کو خدا بنا دیا۔ موصوف نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علومِ غیبیہ کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے:

> "کسی نبی اور ولی کو، جنّ اور فرشتے کو، پیر اور شہید کو، امام اور امام زادہ کو، بھوت اور پری کو اللہ صاحب نے یہ طاقت نہیں بخشی کہ جب وُہ چاہیں غیب

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۵۹

[2] ایضاً: ص ۱۰۷، ۱۰۸

کی بات معلوم کرلیں ، بلکہ اللہ صاحب اپنے ارادہ سے کبھی کسی کو جتنی بات چاہتا ہے خبر کر دیتا ہے۔ سو یہ اپنے ارادہ کے موافق ، نہ اُن کی خواہش پر۔ چنانچہ حضرت پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بارہا ایسا اتفاق ہُوا ہے کہ بعضی بات دریافت کرنے کی خواہش ہوئی اور وُہ بات معلوم نہ ہُوئی۔ پھر جب اللہ صاحب کا ارادہ ہُوا تو ایک آن میں بتادی۔“ [1]

یہ تصویر کا ایک رُخ تھا کہ انبیائے کرام و اولیائے عظام غیب سے قطعًا بے خبر بتادئے ، ایک چیز کا علم بھی وُہ اپنی مرضی اور اپنے ارادے سے نہیں جان سکتے کیونکہ موصوف کے نزدیک نورِ نبوت میں بھی اتنی نورانیت نہیں کہ ایک درخت کے پتّے تک معلوم کرسکیں۔ اب اِسی تصویر کا دُوسرا رُخ ملاحظہ ہو کہ دہلوی صاحب کے خارجی گروہ میں شامل ہونے والے ، انبیائے کرام کے گستاخوں میں اپنا نام لکھوا لینے والوں کی حالت کیا ہو جاتی تھی اور موصوف اپنے متبعین کو کس طرح عرش و فرش اور جنّت و دوزخ کی سیر کروایا کرتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

”برائے انکشاف حالتِ سمٰوات و ملاقاتِ ارواح و ملائکہ و سیرِ جنت و نار و اطلاع بر حقائقِ آں مقام و دریافت امکنہ آنجا و انکشاف امرے از لوحِ محفوظ ، ذکر یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ ست۔“ [2]

وہابی حضرات نے اپنے امام کی اِس عبارت کا ترجمہ یُوں کیا ہے:

”آسمانوں کے حالات کے انکشاف اور مقاماتِ ارواح اور ملائکہ اور بہشت و دوزخ کی سیر اَور اُس مقام کے حقائق پر اطلاع اَور اُس جگہ کے مکانوں کے دریافت اور لوحِ محفوظ سے کسی امر کے انکشاف کے لیے یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ کا ذکر کیا جاتا ہے۔“ [3]

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی ، مولوی : تقویۃ الایمان ، ص ۵۴

[2] محمد اسمٰعیل دہلوی ، مولوی : صراطِ مستقیم ، ص ۱۲۴

[3] صراطِ مستقیم اُردو ، مطبوعہ لاہور ، ص ۲۶۱

دُوسرے مقام پر موصوف نے اِسی بات کو اَور کُھل کر یُوں بیان کیا ہُوا ہے:

"برائے کشفِ ارواح و ملائکہ و مقاماتِ آنہا و سیرِ امکنۂ زمین و آسمان و جنت ونار و اطلاع بر لوحِ محفوظ شغل دورہ کند و باستعانت ہمہ شغل بہر مقامیکہ از زمین و آسمان و بہشت و دوزخ خواہد متوجہ شدہ بسیرِ آں مقام احوال آنجا دریافت کند و باہل آں مقام ملاقات سازد۔" [1]

اِس عبارت کا ترجمہ خود وہابی حضرات نے یُوں کیا ہے:

"کشفِ ارواح اور ملائکہ اور اُن کے مقامات اور زمین و آسمان اور جنت و نار کی سیر اور لوحِ محفوظ پر مطلع ہونے کے لیے دورے کا شغل کرے پس زمین و آسمان اور بہشت و دوزخ کے جس مقام کی طرف متوجہ ہو، اسی شغل کی مدد سے وہاں کی سَیر کرے اَور اُس جگہ کے حالات دریافت کرے، وہاں کے رہنے والوں سے ملاقات کرے۔" [2]

قارئینِ کرام! یہ ہیں اِس تصویر کے دونوں رُخ کہ دہلوی صاحب کے نزدیک انبیائے کرام کو اپنے یا کسی کے خاتمے تک کا پتہ نہیں، آئندہ کی ہر بات سے اُنھیں بے خبر اور نادان بتا دیا، حتّٰی کہ سیّد الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے متعلق بھی کہہ دیا کہ اگر وُہ کسی ایک بات کو معلوم بھی کرنا چاہتے تو معلوم نہ کر سکتے تھے کیونکہ اُن کے نزدیک باری تعالیٰ شانہٗ نے اپنے محبوب کو ایسی کوئی طاقت نہ دی تھی اور اِس قسم کا کوئی طریقہ نہیں سکھایا تھا، جس کے ذریعے وُہ کسی بات کو معلوم کر لیا کرتے لیکن دُوسری طرف مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے اپنے محبین و معتقدین کو ایسے عملیات سکھا دیے اور شائع فرما دیے تھے کہ اُن کے عامل جب چاہیں انبیاء و ملائکہ سے ملاقات کر سکتے تھے، جنّت اور دوزخ کی سیر کر سکتے تھے۔ جس گزشتہ یا آئندہ واقعے کو معلوم کرنا چاہتے، اپنے یا کسی اور کے خاتمے کا حال معلوم کرنا منظور ہوتا تو لوحِ محفوظ سے پڑھ

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۱۲۸

[2] صراطِ مستقیم اُردو، مطبوعہ لاہور: ص ۲۷۰

سکتے تھے۔ گویا باری تعالیٰ شانہٗ، تو انبیائے کرام بلکہ سیّد الانبیاء کو بھی اس طرح معلوم کر لینے کا کوئی طریقہ نہیں بتا سکا لیکن مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے اپنے خدمت گزاروں پر چودہ طبق روشن کر کے دکھا دیے۔ یعنی جو کام اللہ تعالیٰ سے بھی نہ ہو سکا تو وہ دہلوی صاحب موصوف نے کر دکھایا اور جن علوم کے دروازے انبیائے کرام پر بھی بند رہے وُہ دہلی کے ایک عالِم نے اپنے معتقدین کے لیے چوپٹ کھول کر دکھا دیے۔ اندر کی طرح باہر کی آنکھیں بھی بند کرواتے اور چند لمحات میں دنیا و ما فیہا کے جلوے دکھا دیا کرتے تھے۔ یہ فیصلہ اب قارئین ہی کر سکتے ہیں کہ علوم عطا کرنے میں دہلوی صاحب نے خود کو خدا سے کمتر بتایا ہے یا ذاتِ باری سے بھی اپنے آپ کو بڑھا کر دکھایا ہے، نیز موصوف کی تصریحات کے پیشِ نظر، علومِ غیبیہ پانے میں انبیائے کرام بڑھ کر رہے یا دہلوی صاحب کے خُدّام بھی اُن حضرات سے ہزاروں گنا سبقت لے گئے؟

پیارے قارئین! سُنا تو یہی ہے کہ کسی تصویر کے زیادہ سے زیادہ دو۲ رُخ ہو سکتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ معلّمِ خارجیت اِس قید سے بھی آزاد تھے۔ موصوف کے پاس بعض ایسی تصویریں بھی تھیں جن کے بے شمار رُخ تھے۔ زیرِ بحث تصویر کے آپ نے دو رُخ ملاحظہ فرما لیے دُوسرا رُخ یہ تھا کہ دہلوی صاحب نے اپنے معتقدین کو ایسے عملیات بھی بنا دیے تھے کہ اُن کی مدد سے جب وُہ چاہتے تو ارواح و ملائکہ سے ملاقات کر لیتے، جنت و دوزخ کی سیر فرما سکتے، لوحِ محفوظ سے گزشتہ و آئندہ کے واقعات اور ساری کائنات کے حوادث اور تقدیریں پڑھ لیتے، ہر مقام کا اُن کے لیے کشف ہو جانا اور ہر جگہ پر وہ بنفسِ نفیس پہنچ سکتے تھے۔ اب اِسی تصویر کا صرف تیسرا مزیدار رُخ ملاحظہ ہو:

> "اِس آیت (۶/۵۹) سے معلوم ہوا کہ جو کوئی یہ دعویٰ کرے کہ میرے پاس ایسا کچھ علم ہے کہ جب چاہوں اِس سے غیب کی بات دریافت کر لُوں اور آئندہ باتوں کا معلوم کر لینا میرے قابو میں ہے، سو وُہ بڑا جھوٹا ہے کہ دعوٰی خدائی کا رکھتا ہے۔"[1]

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۵۴

دُوسرے مقام پر اپنے عملیاتی چکّر اور دعویٰ کشف کے بارے میں خود یُوں فیصلہ صادر فرمایا ہے:

"اِس آیت (۳۱/۳۴) سے معلوم ہُوا کہ یہ سب جو غیب دانی کا دعویٰ کرتے ہیں، کوئی کشف کا دعویٰ رکھتا ہے، کوئی استخارہ کے عمل سکھاتا ہے، کوئی تقویم اور پتر انکالتا ہے، کوئی رمل اور قرعہ پھینکتا ہے، کوئی فالنامہ لیے پھرتا ہے، یہ سب جُھوٹے ہیں اور دغاباز۔ اِن کے جال میں ہرگز نہ پھنسنا چاہیے۔"[1]

اُدھر تو موصوف نے اپنے معتقدین پر چوٗدہ طبق روشن کر دیئے ہیں لیکن اِدھر فرما رہے ہیں کہ کشف کا دعویٰ رکھنے والے سب جھوٹے اور دغاباز ہیں، اِن کے جال میں ہرگز نہیں پھنسنا چاہیے کیونکہ ایسا دعویٰ کرنے والا خدائی کا دعویٰ رکھتا ہے۔ وہابی حضرات اپنے امام کی اِن تصریحات پر غور کریں، حق و باطل میں تمیز کریں اور کسی کی بے جا محبت و طرفداری میں ایمان جیسی متاعِ عزیز کو گنوانا کون سا نفع بخش سودا اور کہاں کی عقلمندی ہے؟ اگر آج فیصلہ نہیں کرتے تو کل بروزِ قیامت خود فیصلہ ہو جائے گا۔ حقیقت کا بھید کھلنے پر اُس وقت کفِ افسوس ملنا کیا کام آئے گا؟ ہم نے اپنا فرضِ تبلیغ ادا کر دیا، باری تعالیٰ شانہ، قبول فرمائے اور یہ دعا ہے کہ:

ے اے خدا راہِ ہدایت اُس مسلماں کو دکھا
لذّتِ ایماں کی دولت سے جو محروم ہے

اب قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں کہ اولیائے عظام و انبیائے کرام بلکہ سیّد الانبیاء والمرسلین علیہ وعلیہم الصّلوٰۃ والسّلام کے خداداد تصرفات کے بارے میں مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کا نظریہ کیا تھا؟ باری تعالیٰ شانہ، نے جس محبوب کو اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ اور وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا کے مژدے سُنائے اُسی مالکِ تسنیم و کوثر اور باری تعالیٰ شانہ، کے خلیفہ اعظم و تاجدارِ دوجہاں کے بارے میں موصوف یُوں رقمطراز ہیں:

"جس کا نام محمد یا علی ہے وہ کسی چیز کا مختار نہیں۔"[2]

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۵۶

[2] ایضاً: ص ۸۲

اختیار و تصرّف کے مسئلے سے قطع نظر، اِس طرزِ تکلّم کے تیور تو ملاحظہ ہوں۔ کیا اِن الفاظ سے کوئی ادنیٰ سا اشارہ بھی اِس امر کا ملتا ہے کہ اِن الفاظ کا لکھنے والا، نبی آخرالزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اُمتی ہو۔ خالق و مالک جلّ جلالہٗ نے اپنے جس بے مثل بندے کو پورے قرآنِ کریم میں ایک مرتبہ بھی نام لے کر مخاطب نہ کیا، جس کی آواز سے کوئی اپنی آواز بلند کرے تو اُسے سارے اعمال کے ضائع ہو جانے کی وعید سُنا دی ہو، بزرگانِ دین نے جس مولائے کائنات کے ادب کی یُوں تلقین فرمائی ہو: ؎

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گُم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

اُسی ہستی کا تذکرہ اِس عامیانہ انداز میں! اگر گولڑ میں بسنے والا جُھنگا فضا کی وسعتوں کو دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتا، ایک چمگادڑ مہرِ درخشاں کی تابانیوں کا نظارہ نہیں کر سکتا، جوہڑ کا مینڈک محیطِ بیکراں کی وسعتوں سے قطعاً نا آشنا ہے تو اِس سے فضا کی وسعتوں، سورج کی تابانیوں اور سمندر کی بیکرانی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ یہ تو خود جُھنگے کی کوتاہ نظری، چمگادڑ کی محرومی اور جوہڑ کے مینڈک کی تنگ دامانی ہے۔

یہاں بعض حضرات یُوں مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ موصوف نے یہاں اختیارِ ذاتی کے بارے میں ایسا لکھا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ ذاتی اختیار ہی کے متعلق نہیں بلکہ موصوف عطائی اختیار بھی ناپسند ہی کرتے رہے تھے ورنہ ضرور تصریح فرما دیتے، اِس صورت میں لب و لہجہ کے علاوہ نفسِ مسئلہ میں اُن سے اختلاف ہی کیوں ہوتا؟ علاوہ بریں ایسی تاویلوں کی دہلوی صاحب نے خود یُوں جڑ کاٹی ہُوئی ہے:

”اللہ صاحب نے کسی کو عالم میں تصرف کرنے کی قدرت نہیں دی۔“ [1]

ایک اور مقام پر موصوف خُوب کُھلے ہیں اَور وہاں اِسی امر کی تسریح کرتے ہُوئے یُوں اپنے دِل کی لگی بُجھائی ہے:

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ٣٢

> اس آیت ($\frac{۲۳}{۸۸-۸۹}$) سے معلوم ہوا کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے کافر بھی اس بات کے قائل تھے کہ کوئی اللہ کے برابر نہیں اور اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، مگر اپنے بتوں کو اس کی جناب میں وکیل سمجھ کر مانتے تھے، اسی سے کافر ہو گئے۔ سو اب بھی جو کوئی کسی مخلوق کا عالم میں تصرف ثابت کرے اور اپنا وکیل ہی سمجھ کر اس کو مانے، سو اس پر شرک ثابت ہو جاتا ہے گو کہ اللہ کے برابر نہ سمجھے اور اس کے مقابل کی طاقت اس کو ثابت نہ کرے۔" [۱]

مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے کی دُھن میں موصوف خارجیت کے سیلاب میں بہتے ہوئے حقانیت سے کتنی دور نکل گئے کہ انھیں اللہ جل شانہ، کے خلیفۂ اعظم اور اینٹ پتھر کی مورتیوں کے اختیارات میں کوئی فرق نظر نہ آیا۔ انبیائے کرام اور نبی الانبیاء علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کی تو بات ہی اور ہے ایک جاہل مطلق اور معمولی سمجھ دار آدمی بھی زید و عمرو اور اینٹ پتھروں کے اختیارات کو اپنے مشاہدے کی بنا پر کبھی ایک جیسا ماننے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ زید و عمرو کتنے ہی بے اختیار سہی لیکن پھر بھی قدرت نے انھیں بہت سے اختیارات دیے ہوئے ہیں لیکن اینٹ پتھر محض بے اختیار و بے حس۔ اس کے باوجود کیا کہنا ہے اُن علماء کی بے بصری کا جنھیں اللہ تبارک و تعالیٰ کے خلیفۂ اعظم اور اینٹ پتھروں کے اختیارات و تصرفات میں کوئی فرق ہی نظر نہیں آتا۔ ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ اس کے باوجود ایسے نین سُکھ حضرات کو مسلمانوں کے مُصلح اور ریفارمر وغیرہ منوانے پر ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے تاکہ اس گئے گزرے زمانے میں مسلمانوں کی اگر کوئی ایک آدھ آنکھ کھلی ہوئی ہے تو اسے بھی پٹم کر دیا جائے اور اپنے اسی کارنامے پر نازاں ہیں کہ وہ اسلام کی بے مثال خدمت کر رہے ہیں، ایمان کا نور پھیلا رہے ہیں۔ کاش! یہ حضرات کبھی تنہائی میں سوچیں اور اپنی روش پر نظر ثانی کریں۔

موصوف نے انبیائے کرام حتیٰ کہ سید الانبیاء علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کے خداداد تصرفات و اختیار کا یوں کھل کر انکار کر دیا لیکن اہلِ انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ اپنے

---

[۱] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۶۳، ۶۴

پیرجی وغیرہ کی شان یُوں بیان کی ہے:

"ارباب ایں مناصبِ رفیعہ ماذون مطلق در تصرف عالمِ مثال و شہادت می باشند۔ ایں کبار اولی الایدی والابصار رامی رسد کہ تمامی کلیات را بسوئے خود نسبت نمایند۔ مثلاً ایشاں رامی رسد کہ بگویند کہ از عرش تا فرش سلطنتِ ماست۔"[1]

اب اِسی عبارت کا ترجمہ وہابی حضرات کے لفظوں میں ملاحظہ فرمایا جائے:

"اِسی طرح اِن مراتبِ عالیہ اور مناصبِ رفیعہ کے صاحبان عالمِ مثال و شہادت میں تصرف کرنے کے مطلق ماذون و مجاز ہوتے ہیں اور اِن بزرگواروں کو پہنچتا ہے کہ تمام کلیات کو اپنی طرف نسبت کریں۔ مثلاً اِن کو جائز ہے کہ کہیں، عرش سے فرش تک ہماری سلطنت ہے۔"[2]

کیا اِس ستم ظریفی کی داد کوئی دے سکتا ہے کہ اُدھر یہ حکم کہ "جس کا نام محمّد یا علی ہے وُہ کسی چیز کا مختار نہیں" لیکن پیر جی وغیرہ کو دنیا و ما فیہا کے اختیارات حاصل ہیں اور وُہ کہہ سکتے ہیں کہ "عرش سے فرش تک ہماری سلطنت ہے"۔ مقربینِ بارگاہِ الٰہیہ کا معاملہ تھا تو بتایا کہ "اللہ صاحب نے کسی کو عالم میں تصرف کرنے کی قدرت نہیں دی" اور پیر جی وغیرہ کی شان بیان کرنے کا وقت آیا تو بتا دیا کہ یہ "عالمِ مثال و شہادت میں تصرف کرنے کے مطلق ماذون و مجاز ہوتے ہیں"۔

وہابی صاحبو! کیا قیامت نہیں آئے گی؟ کیا حساب و کتاب نہیں ہوگا؟ تمام انبیائے کرام کے خداداد اختیارات و تصرفات کا اِس طرح انکار کر کے اپنے پیر جی کے خطبے پڑھنا، اُنھیں انبیائے کرام سے بھی ہزاروں درجہ بڑھا چڑھا کر دکھانا، یہ پیر جی کی نبوت کی بنیادیں اُٹھانا تھا یا اِس میں کوئی اور ہی راز پنہاں ہے؟ آخر بتایئے تو سہی، یہ تماشا ہے کیا؟ نیز انبیائے کرام

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، مطبوعہ مطبع ضیائی، ۱۲۸۵ھ، ص ۱۱۲

[2] صراطِ مستقیم اردو، مطبوعہ نامی پریس لاہور، ص ۲۳۴

کے لیے یہ تصرفات ماننے پر شرک کا خطرہ بار بار سُنایا ہوا ہے لیکن اپنے پیر جی وغیرہ کو کس مصلحت یا منفعت کے تحت خدا کا شریک بنا کر دکھایا ہُوا ہے ؟

ع پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

مقربینِ بارگاہِ الٰہیہ کے خداداد تصرفات و اختیارات کے پیشِ نظر اگر کوئی مسلمان اُن سے استعانت و استمداد کرتا ہے یا ذوق و شوق میں ندائیہ کلمات استعمال کرتا ہے تو جملہ خوارج کی طرح مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے نزدیک ایسا شخص مسلمان ہی نہیں رہتا بلکہ مشرک ہو جاتا کیونکہ موصوف کے نزدیک اینٹ پتھروں کو پکارنا اور انبیاء و اولیاء کو پکارنا ایک ہی جیسا ہے اور اُن کا مشاہدہ یہی بتاتا تھا کہ بُتوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے مقبول ترین بندے بھی بے حس و حرکت اور نفع و نقصان پہنچانے سے عاجز ہوتے ہیں۔ چنانچہ وُہ لکھتے ہیں:

”اکثر لوگ جو دعوٰی ایمان کا رکھتے ہیں سو وُہ شرک میں گرفتار ہیں۔ اگر کوئی سمجھانے والا اُن لوگوں کو کہے کہ تم دعوٰی ایمان کا رکھتے ہو اور افعالِ شرک کے کرتے ہو، سو یہ دونوں راہیں کیوں ملائے دیتے ہو؟ اُس کو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو شرک نہیں کرتے، بلکہ اپنا عقیدہ انبیاء اور اولیاء کی جناب میں ظاہر کرتے ہیں۔ شرک جب ہوتا کہ ہم اُن اولیاء انبیاء کو، پیروں شہیدوں کو، اللہ کے برابر سمجھتے بلکہ ہم اُن کو اللہ ہی کا بندہ جانتے ہیں اور اُسی کا مخلوق، یہ قدرت تصرف کی اُسی نے اِن کو بخشی ہے۔ اُس کی مرضی سے عالم میں تصرف کرتے ہیں۔ اِن کا پکارنا عین اللہ ہی کا پکارنا ہے۔ اِن سے مدد مانگنی عین اُسی سے مدد مانگنی ہے۔ وہ لوگ اللہ کے پیارے ہیں، جو چاہیں سو کریں۔ اُس کی جناب میں ہمارے سفارشی ہیں اور وکیل۔ اِن کے مِلنے سے خدا ملتا ہے اَور اِن کے پکارنے سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے اَور جتنا ہم اِن کو مانتے ہیں، اُتنا اللہ سے ہم نزدیک ہوتے ہیں۔ اِسی طرح کی خرافات بکتے ہیں۔“[1]

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۰

کسی کو اللہ تعالیٰ جیسا جاننا یا باری تعالیٰ جیسی صفات یا کسی صفتِ مختصہ کا حامل ماننا شرک ہوتا ہے۔ لیکن موصوف کی سینہ زوری اور ستم ظریفی کا اندازہ کون کرسکتا ہے جبکہ مسلمان کہتے ہیں کہ ہم انبیائے کرام و اولیائے عظام کو اللہ تعالیٰ کے بندے اور اُسی کی مخلوق جانتے ہیں۔ اِن بزرگوں کے تصرفات کو باری تعالیٰ شانہٗ کا انعام و عطیہ مانتے ہیں، جس کا صدور نبی سے ہو تو معجزہ اور ولی سے ہو تو کرامت کہلاتا ہے۔ اِس کے باوجود موصوف اِسے شرک قرار دیتے اور اسلامی و ایمانی وضاحت کو خرافات بکنا ٹھہراتے ہیں۔ جب مسلمان اپنے بزرگوں کو نہ خدا جیسا یا اُس کے برابر مانتے ہیں اور نہ خدا کی صفاتِ مختصہ کا حامل جانتے ہیں پھر شرک کہاں سے آگیا؟ اگر مثبتین کے دلائل موصوف کے نزدیک ناقابلِ یقین تھے تو وُہ اِس عقیدے کو زیادہ سے زیادہ غیر ثابت کہہ سکتے تھے، دلائل کو کمزور ٹھہرا سکتے تھے لیکن جب مسلمان اپنے بزرگوں کو خدا کی ذات وصفات میں شریک نہیں کرتے تو معلوم ہُوا کہ دہلوی صاحب نے ہی مسلمانوں کو مشرک قرار دے کر اپنا شوقِ تکفیر پُورا کرنے کی غرض سے اللہ تعالیٰ کو مقامِ اُلوہیت سے اُتار کر بندوں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ آخر وُہ بھی مخلوق میں شامل ہو اور اُس کے تصرفات بھی کسی کے عطا فرمودہ ہوں تب ہی انبیائے کرام و اولیائے عظام کے تصرفات سے مطابقت ہوگی اور شرک لازم آسکے گا۔ لیکن اِس شرک کو ثابت کرنے سے پہلے اُلوہیت سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق اور اُس کے اختیارات کو عطائی ماننا لازم آتا ہے ورنہ شرک کا حکم صادر فرمانا محض ایک خیالِ خام، نرا تحکم اور سینہ زوری کے سوا اور کچھ نہیں۔ موصوف مزید لکھتے ہیں:

> ”جن کو لوگ پکارتے ہیں اُن کو اللہ نے کچھ قدرت نہیں دی، نہ فائدہ پہنچانے کی، نہ نقصان کرنے کی۔ اور جو کہتے ہیں، یہ لوگ ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے پاس۔ سو یہ بات اللہ نے تو نہیں بتائی۔ پھر کیا تم اللہ سے زیادہ خبردار ہو؟ سو اُس کو بناتے ہو جو وُہ نہیں جانتا۔ اِس آیت (۱۰/۱۸) سے معلوم ہُوا کہ تمام آسمان و زمین میں کوئی کسی کا ایسا سفارشی نہیں کہ اُس کو مانیے اور اُس کو پکاریئے تو کچھ فائدہ یا نقصان پہنچے۔“[1]

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۱

وہابی صاحبو! آخر قیامت نے آکر رہنا ہے۔ حساب و کتاب ضرور ہوگا۔ بھلا یہ ستم ظریفی کس بِرتے پر ہے کہ آیت پیش کردہ میں لفظ (یَعْبُدُوْنَ) موجود، خود اِس کا ترجمہ کیا پوجتے ہیں، اِس کے باوجود تشریح کرتے وقت لکھ دیا کہ "جن کو لوگ پکارتے ہیں"۔ کیا یعبدون یعنی پُوجنے کا مطلب پکارنا ہے؟ آخر اِتنی دیدہ دلیری سے قرآنی آیات کے مفہوم و مطالب میں دن دہاڑے یہ معنوی تحریف کس بِرتے پر ہے؟ اگر آپ حضرات خوفِ خدا سے عاری نہیں ہوگئے اور صبحِ قیامت کے منکر نہیں تو خدا کے لیے اِن امور پر غور تو فرمائیے:

۱۔ اِس آیت کے کون سے لفظ کا یہ مطلب ہے کہ انبیاء و اولیاء نفع و نقصان کی قدرت نہیں رکھتے؟

۲۔ آیت میں کون سا لفظ اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انبیاء و اولیاء مسلمانوں کے سفارشی نہیں ہیں؟

۳۔ یہ کہاں سے معلوم ہُوا کہ آسمان و زمین میں کوئی کسی کا سفارشی نہیں ہے؟

۴۔ آیت تو بُتوں کے بارے میں ہے لیکن آپ کے امام کو کہاں سے معلوم ہُوا کہ انبیاء و اولیاء بھی بُتوں کی طرح اینٹ پتھر ہیں؟

قارئین کرام! پہلے سورۂ یونس کی زیرِ بحث آیت کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں تاکہ مفہوم سمجھنے میں آسانی رہے:

"وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ
هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ
وَلَا فِي الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝"

خود مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) نے اِس کا ترجمہ یُوں کیا ہے:

"اور پُوجتے ہیں ورے اللہ کے ایسی چیزوں کو کہ نہ کچھ فائدہ دیں اُن کو، نہ کچھ نقصان۔ اَور کہتے ہیں، یہ لوگ سفارشی ہیں اللہ کے پاس۔ کہہ، کیا بتاتے ہو تم اللہ کو جو نہیں جانتا وہ آسمانوں میں اَور نہ زمین میں؟ سو وہ نرالا ہے اُن سب سے جن کو یہ شریک بناتے ہیں۔"[1]

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۱

یہ آیت بُت پرستوں کے حق میں نازل ہُوئی۔ جملہ مفسرین نے مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ سے بُت مراد لیے ہیں۔ علاوہ بریں تفسیرِ قرآن بالقرآن سب سے مقدم و اعلیٰ ہے۔ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ کی تفسیر خود اِس آیت میں مَا لَا یَنۡفَعُهُمۡ وَلَا یَضُرُّهُمۡ سے باری تعالیٰ شانہٗ نے کی ہُوئی ہے۔ نفع و نقصان پہنچانے میں بُت ہی مجبورِ محض ہیں۔ انسان کو مجبورِ محض ٹھہرانا، ایمان کے ساتھ ہی عقل کی آنکھ پر ٹھیکری رکھنا نہیں تو اَور کیا ہے؟ انسانوں میں زید و عمرو سے لے کر اولیائے کرام و انبیائے کرام علیہم السلام تک سب کو باری تعالیٰ شانہٗ نے علیٰ قدرِ مراتب نفع و نقصان پہنچانے کی طاقت دی ہے۔

دہلوی صاحب موصوف نے یہاں ہاتھ کی صفائی کا جو کرتب دکھایا وُہ محیر العقول ہے۔ آنجناب کو بُت[1] پرستوں کا نہ تو برضا و رغبت کفر میں پڑے رہنا کفر نظر آیا، نہ[2] اُن کا بُتوں کو پُوجنا دہلوی سرکار میں کفر ٹھہرا، اُن[3] کا کفر بس یہی بتایا کہ وُہ بُتوں کو اپنا سفارشی مانتے تھے۔ موصوف کی نظر صرف اِس آخری کفر پر کیوں پہنچی اَور پہلے دونوں کفریات سے کیوں نظریں بچا گئے؟ وجہ یہ ہے کہ وُہ انبیائے کرام کی عداوت میں اِتنے مغلوب الحال ہو چکے تھے کہ مقربینِ بارگاہِ الٰہیہ کو مجبورِ محض ثابت کرنے کی تلاش میں رہتے تھے۔ خوارج کو اِس کے سوا اور چارہٗ کار ہی نہیں کہ وُہ تسکینِ خاطر کے لیے جو آیات بُتوں کے بارے میں نازل ہُوئی ہیں اُنھیں انبیاء و اولیاء پر چسپاں کر کے، اِس طرح بزرگوں کو بُتوں کی طرح مجبورِ محض ٹھہرا کر اپنے دِل کی لگی بجھا لیا کریں اور مسلمانوں پر شرک و کفر کی توپ داغتے رہیں۔ موصوف نے ایک مقام پر انبیائے کرام کو بُتوں کی طرح مجبورِ محض ٹھہرا کر، دین و ایمان کے ساتھ شرافت کی حد بھی توڑ دی۔ مسلمانوں سے التماس ہے کہ وُہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اُمتی کی حیثیت سے اِس عبارت پر غور کریں:

> "اللہ سے زبردست کے ہوتے ہوُئے ایسے عاجز لوگوں کو پُکارنا کہ کچھ فائدہ اور نقصان نہیں پہنچا سکتے، محض بے انصافی ہے کہ ایسے بڑے شخص کا مرتبہ ایسے ناکارہ لوگوں کو ثابت کیجے۔"[1]

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۶۵

اے مدعیِ اسلام، اے کلمۂ طیبہ کے ہمراہی! کیا انبیائے کرام تک کے لیے "عاجز لوگوں اور ناکارہ لوگوں" سُننا تجھے گوارا ہے؟ خدا نہ کرے کہ تیرا جواب اثبات میں ہو، تعظیمِ رسالت جو جانِ ایمان ہے، جس کے بارے میں تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ ارشادِ رحمٰن ہے۔ کیا اپنے نبی کو عاجز اور ناکارہ کہنا تعظیم و توقیر ہے یا توہین و تنقیص؟ کیا اُس سرکارِ ابدقرار کی توہین کرنے والا دولتِ ایمان سے محروم ہو جاتا ہے یا مسلمانوں کا رہبر، پیشوا، مصلح اور ریفارمر بن جاتا ہے؟ جانِ برادر! شانِ رسالت کی توہین کر کے بیجا تاویلوں کا سہارا تلاش کرنا غضبِ الٰہی کو اَور جوش میں لانا ہے۔ اِس سے بھی زیادہ توہین آمیز الفاظ اَور ملاحظہ فرمائے جا سکتے ہیں، چنانچہ موصوف نے لکھا ہے:

"ہمارا جب خالق اللہ ہے اَور اُسی نے ہم کو پیدا کیا تو ہم کو بھی چاہیے کہ اپنے کاموں پر اُسی کو پکاریں اور کسی سے ہم کو کیا کام؟ جیسے جو کوئی ایک بادشاہ کا غلام ہو چکا تو وُہ اپنے ہر کام کا علاقہ اُسی سے رکھتا ہے، دُوسرے بادشاہ سے نہیں رکھتا اور کسی چُوہڑے چمار کا تو کیا ذکر؟"[1]

وہابی صاحبو! انبیائے کرام کو بارگاہِ الٰہیہ کے چُوہڑے چمار کہتے ہُوئے کوئی شرم تو محسوس نہیں ہُوتی ہوگی؟ مانا کہ آپ مقربینِ بارگاہِ الٰہیہ سے استمداد کرنے کے منکر ہیں، لیکن اُمتی ہونے سے تو کُھل کر انکار نہیں کیا ہے۔ اِس کے باوجود یہ ننگی گالی کس عقیدت کے تحت دی ہے؟ اِس کی صحت ثابت کرنا کون سی دین کی خدمت ہے؟ کیا آپ صاحبان کو کلمہ گوئی کا بھی کوئی لحاظ نہیں؟ آخر انبیائے کرام و اولیائے عظام نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو اِس درجہ گرے ہوئے الفاظ اُن کی شان میں جاری کیے جاتے ہیں؟ کیا دین و دیانت کی طرح شرافت و اخلاق بھی آپ کے نزدیک بے معنی چیزیں ہیں؟ معلوم نہیں کہ ایمان آپ نے کس جانور کا نام رکھا ہوا ہے!

اب موصوف کا ایک عجیب و غریب اور اسلام دشمنی کا ایٹمی فتویٰ ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں:

"پیغمبرِ خدا کے وقت میں بھی کافر اپنے بتوں کو اللہ کے برابر نہیں جانتے تھے

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۵۰، ۵۱

بلکہ اُسی کا مخلوق اور اُسی کا بندہ سمجھتے تھے اور اُن کو اُس کے مقابل کی طاقت ثابت نہیں کرتے تھے مگر یہی پکارنا، منتیں ماننی، نذر و نیاز کرنی، اُن کو اپنا وکیل اور سفارشی سمجھنا، یہی اُن کا کفر و شرک تھا۔ سو جو کوئی کسی سے یہ معاملہ کرے، گو اُس کو اللہ کا بندہ اور مخلوق ہی سمجھے، سو ابو جہل اور وُہ شرک میں برابر ہیں۔''[1]

معلوم ہوتا ہے کہ موصوف انبیائے کرام کی دشمنی میں اِتنے مغلوب الحال ہو چکے تھے کہ اُن کے نزدیک صرف وہی امور کفر و شرک ہو کر رہ گئے تھے جن سے عظمتِ انبیاء کا اظہار ہوتا ہو۔ مذکورہ عبارت میں دہلوی صاحب کو نہ تو کفّار کا کافر رہنا کفر نظر آیا، نہ اُن کا بُتوں کو پُوجنا ہی موصوف کی توحید کے خلاف تھا بلکہ وُہ لوگ جو اپنے بُتوں کو مدد کے لیے پکارتے، اُن کی منتیں مانتے، نذر و نیاز چڑھاتے اور اُنھیں اپنا وکیل و سفارشی سمجھتے، اُن کے کفر کا صرف اِسی میں حصر کرتے ہوئے صاف لکھ دیا کہ ''یہی اُن کا کفر و شرک تھا''۔ مانا کہ بُتوں کے ساتھ یہ معاملہ رکھنا یقیناً کفر و شرک ہے کیونکہ نہ اُن کے اندر نفع و نقصان پہنچانے کی صلاحیت اور نہ خدا نے اُنھیں کسی کا وکیل و سفارشی بنایا۔ لیکن بُتوں کے مجبورِ محض اور مبغوض ہونے کو انبیاء و اولیاء پر چسپاں کر کے یہ اپنی خارجیت پر مُہرِ تصدیق ہی کی ہے۔ وہابی علماء عوام الناس میں اپنا بھرم رکھنے کی غرض سے لکھ دیا کرتے ہیں کہ ہم ہرگز شفاعت کے منکر نہیں بلکہ انبیاء و اولیاء کی شفاعت کے قائل اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو شفیع المذنبین مانتے ہیں۔ لیکن دہلوی صاحب بتا رہے ہیں کہ جو کسی کو اپنا سفارشی سمجھے وُہ ابو جہل جیسا مشرک ہے۔ کیا وہابی حضرات کے لیے اپنے امام کے فتوے سے بچنے، خارجی یا ابو جہل جیسا ہو جانے سے بچاؤ کا کوئی راستہ ہے؟ تسلّی کے لیے مزید عبارتیں ملاحظہ فرمالیجیے:

''کوئی کسی کی حمایت نہیں کر سکتا۔''[2]

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۳-۳۴

[2] ایضاً، ص ۳۲

"کوئی کسی کا وکیل اور حمایتی نہیں بننے والا۔"[۱]

آپ حضرات کی مزید تسلی کے لیے موصوف نے خود زبانِ رسالت سے اعلان کروا دیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"میں آپ ہی ڈرتا ہوں اور اللہ سے ورے اپنا کوئی بچاؤ نہیں جانتا، سو دوسرے کو کیا بچا سکوں گا۔"[۲]

"اللہ کے ہاں کا معاملہ میرے اختیار سے باہر ہے وہاں میں کسی کی حمایت نہیں کر سکتا اور کسی کا وکیل نہیں بن سکتا۔"[۳]

آگے موصوف نے سورۂ زمر کی ایک آیت پیش کر کے یوں اپنا ایٹمی فتویٰ داغ دیا ہے، ملاحظہ ہو:

"اس آیت ($\frac{۳۹}{۳}$) سے معلوم ہوا کہ جو کوئی کسی کو اپنا حمایتی سمجھے، گو یہی جان کر کہ اس کے سبب سے خدا کی نزدیکی حاصل ہوتی ہے، سو وہ بھی مشرک ہے اور جھوٹا اور اللہ کا ناشکر۔"[۴]

قارئین کرام حیران ہوں گے کہ مصنفِ تقویۃ الایمان نے انبیائے کرام کی شفاعت کو برحق جاننا کیوں شرک ٹھہرایا؟ شفیع المذنبین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت کا یقین رکھنے والوں کو ابوجہل جیسا مشرک کیوں بنایا؟ وجہ یہ ہے کہ وہابی حضرات کو شفاعت کی ان کے گمان کے مطابق ضرورت ہی نہیں رہی تھی، کیونکہ ان کے رب (معلوم نہیں وہ ہندی تھا یا برطانوی!) نے اس سارے نوزائیدہ گروہ کی بخشش کا وعدہ کر لیا تھا۔ موصوف خود یوں رقمطراز ہیں:

"ازاں طرف حکم شد کہ ہر کہ بر دستِ تو بیعت خواہد کرد گو لکھوکھا باشند ہر یک را کفایت خواہم کرد۔"[۵]

---

[۱] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۴ [۲] ایضاً: ص ۶۴

[۳] ایضاً: ص ۷۶ [۴] ایضاً: ص ۳۲

[۵] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۱۷۵

مذکورہ بالا عبارت کا وہابی حضرات نے خود یُوں ترجمہ کیا ہے:

> "جو شخص تیرے (سیّد احمد صاحب کے) ہاتھ پر بیعت کرے گا اگرچہ وہ لکھوکھا ہی کیوں نہ ہوں ہم ہر ایک کو کفایت کریں گے۔"[۱]

قارئین حضرات اب اِس تصویر کے دونوں رُخ اپنے سامنے رکھ کر غور فرمائیں کہ دہلوی صاحب نے انبیائے کرام کو شفیع و حمایتی ماننا شرک بتایا، ایسے لوگوں کو ابوجہل کے برابر مشرک ٹھہرایا اور سیّد الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک کے حق میں تصریح فرما دی کہ وُہ قیامت میں اپنی بیٹی فاطمہ تک کے کام نہ آسکیں گے۔ یہ جملہ انبیائے کرام کی شان ہے دوسری طرف دہلوی صاحب کے پیر و مرشد سید احمد رائے بریلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) ہیں کہ اُنھوں نے دنیا میں ہی اپنے سارے متبعین کو بخشوا لیا۔ معلوم نہیں انبیائے کرام اور سیّد الانبیاء علیہ وعلیہم السلام کا رُتبہ اُونچا رہا یا سیّد احمد صاحب رائے بریلوی کا؟ وہابی حضرات اپنے امام کی تصریحات کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ تو کریں۔ اب اِسی تصویرِ شفاعت کا خارجی فلم اسٹوڈیو میں تیسرا رُخ جو دکھایا گیا وُہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

> "وہ تو بادشاہ کا امیر ہے، نہ چوروں کا تھانگی، جو چور کا حمایتی بن کر اُس کی سفارش کرتا ہے تو آپ ہی چور ہو جاتا ہے۔ اِس کو شفاعت بالاذن کہتے ہیں۔"[۲]

معلوم نہیں اپنے سارے مریدین کو بخشوانے والے سیّد احمد صاحب کیوں خدا کے شریک بن بیٹھے تھے اور دُوسری طرف کیوں چور یا چوروں کا تھانگی بننے کا شوق پُورا کیا۔ اگر کوئی وہابی عالِم یہ فرمائیں کہ سیّد احمد صاحب نے سفارش نہیں کی بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی کرم نوازی سے ایسا وعدہ فرمایا تھا، تو اِس سلسلے میں ہماری درجِ ذیل گزارشات پر غور فرما لیا جائے:

۱۔ اگر آپ حضرات یہ فرمائیں کہ مریدین میں سے کسی نے سیّد احمد صاحب سے سفارش

---

[۱] صراطِ مستقیم اُردو، مطبوعہ لاہور، ص ۳۱

[۲] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۶۹-۷۰

کرنے کی درخواست نہیں کی تھی کہ مشرک قرار پاتا، سیّد احمد صاحب نے بھی اپنے مریدین کی بخشش کے لیے سفارش نہیں کی تھی تاکہ یہ کہا جاسکے کہ وُہ خدا کے شریک بن بیٹھے بلکہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے یہ بخشش کا مژدہ سُنایا تھا اور سیّد صاحب کی بیعت سے منسلک کردیا تھا۔ تو ہم عرض کریں گے کہ کیا آپ کے نزدیک باری تعالیٰ شانہٗ اپنا شریک بنالیا کرتا ہے؟

۲۔ یہ وعدۂ بخشش یا مژدۂ کفایت سیّد احمد صاحب کی بیعت پر ہی کیوں منحصر کیا گیا؟

۳۔ بقول دہلوی صاحب اُدھر تو سیّد الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی لختِ جگر فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تک کے بارے میں ایسا مژدہ نہ سنایا گیا لیکن اِدھر سیّد صاحب کے جمیع مریدین کے متعلق یہ خوشخبری سُنائی گئی، تو اِن حالات میں خاتونِ جنت سے سیّد احمد صاحب کے ہر مرید کی شان آپ حضرات کی نظر میں زیادہ ہُوئی یا نہیں؟

۴۔ دہلوی صاحب کے نزدیک شفیع المذنبین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی صاحبزادی تک کو نہ بخشوا سکے بلکہ قیامت میں بھی نہ بچا سکیں گے لیکن سیّد احمد صاحب نے اپنے جملہ مریدین کو دنیا میں ہی بخشوا لیا۔ اِن حالات میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مرتبہ اونچا رہا یا سیّد احمد صاحب کا؟

۵۔ دہلوی صاحب کی تصریحات کے تحت حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام، شفیع المذنبین ہُوئے یا سیّد احمد صاحب؟

۶۔ سیّد احمد صاحب تو چور یا چوروں کے ٹھانگی نہ بنے لیکن اُن کے رب نے اُنھیں چور اور چوروں کا ٹھانگی بنا دیا یا نہیں؟

۷ اے چشمِ اشک بار ذرا دیکھ تو سہی!
یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

توہینِ انبیاء کا عالمی ریکارڈ

موصوف اپنے نبی کو افضل الرسل ضرور کہتے ہیں لیکن اُس کے خصائص کے قائل نہیں، بلکہ دیگر رسولوں کے مقام پر رکھتے تھے، چنانچہ اُنھوں نے خود یُوں تصریح کرتے ہُوئے اپنے

نبی کے دوسرے مقام کا ذکر کیا ہے:

"جو خوبیاں اور کمالات اللہ نے مجھ کو بخشے ہیں، سو بیان کرو، وہ سب رسول کہہ دینے میں آجاتے ہیں، کیونکہ بشر کے حق میں رسالت سے بڑا کوئی مرتبہ نہیں۔"[1]

یہ درست ہے کہ آدمی کے حق میں رسالت سب سے بڑا مرتبہ ہے لیکن قرآنِ کریم کی تصریح کے مطابق تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم افضل الرسل اور نبی الانبیاء ہیں۔ آپ کو بعض ایسے کمالات سے بھی نوازا گیا ہے جو دوسرے رسولوں کو نہیں ملے۔ اگر آپ کے سارے کمالات رسول کہہ دینے میں آسکتے تو یقیناً آپ کے مخصوص کمالات دیگر انبیاء کو بھی ملے ہوتے لیکن ایسا نہیں ہے۔ آپ کی جملہ خوبیوں کو رسول کہہ دینے میں محصور بتانا، خصائصِ مصطفیٰ سے چشم پوشی کا مرض ہے، جو خارجیت کا خاصہ ہے۔ موصوف دوسرے مقام پر یوں تصریح کرتے ہیں:

"اُس شہنشاہ کی تو یہ شان ہے کہ ایک آن میں ایک حکم کُن سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی، جِن اور فرشتے، جبرائیل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر پیدا کر ڈالے۔"[2]

قدرتِ خداوندی کے انکار کی کسے مجال، لیکن امکانِ نظیر کا یہ نظریہ، خصائصِ مصطفیٰ کا انکار کرنے کی غرض سے گھڑا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جیسے ایک آن میں کروڑوں پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ یہ عقیدہ چونکہ سراسر غیر اسلامی ہے اور خصائصِ مصطفیٰ کے انکار کا مترادف ہے اسی لیے علمائے اہلسنّت کو اس سے اختلاف رہا۔ جب موصوف نے دہلی میں اس نظریے کا پرچار کرنا شروع کیا تو علمائے کرام نے اُن کا محاسبہ شروع کر دیا تھا۔ اِس سلسلے میں احقر چند معروضات پیش کرتا ہے:

۱۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو باری تعالیٰ شانہٗ نے آخری نبی بنایا اور قرآنِ کریم میں

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۱۱۳

[2] "ایضاً": ص ۶۷، ۶۸

اِس امر کا واضح اعلان فرمایا ہے۔ بقول دہلوی صاحب اگر آپ کے کروڑوں ہمسروں میں سے ایک بھی پیدا فرما دیا جاتے تو آخری نبی ہمارے آقا رہیں گے یا آنے والا نبی؟ اگر آنیوالا آخری نبی نہیں ہوگا تو ہمسر کہاں ہوا؟ اگر وہی آخری نبی ہوگا تو یہ کلامِ الٰہی کی تکذیب ہوگی جو محال ہے۔ دریں حالات آپ کا مثل کیسے پیدا ہوگا؟

۲۔ حبیبِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو رحمۃ للعلمین بنایا گیا اور کلامِ الٰہی میں اعلان فرمایا گیا ہے، عالمین کے دائرے میں ساری مخلوق آتی ہے۔ جو پیدا ہو چکے اور پیدا ہوں گے، اُن میں سے ایک فرد بھی اِس زمرے سے باہر نہیں۔ آپ کے ہمسر بن کر آنے والے نبی بھی اِس زمرہ سے باہر نہیں ہوں گے، وُہ بھی ہمارے آقا کی رحمت کے محتاج ہوں گے، پھر برابری کہاں ہُوئی؟ اگر اُس آنے والے کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے بھی رحمۃ للعلمین بنایا گیا تو فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رحمۃ للعلمین نہ رہے بلکہ اُس آنے والے کی رحمۃ للعلمینی کے محتاج ہو گئے اور یہ صورت بھی کلامِ الٰہی کی تکذیب پر منتج ہوگی۔ پھر ہمسر کیسے آئے گا؟

۳۔ اِسی طرح بے شمار خصائص موجود جن میں دُوسرے کی شرکت محال ہے مثلاً آپ یومِ میثاق سب سے پہلے بلیٰ فرمانے والے، سب سے پہلے آپ کا نور پیدا ہُوا، آپ باعثِ ایجادِ عالم ہیں۔ بھلا دُوسرے کو یہ اوصاف اب کیسے حاصل ہوں گے؟ اِسی طرح آپ کا دین آخری دین، آپ کی شریعت آخری شریعت، قرآنِ کریم آخری کتاب، دُوسرا آئے تو کلامِ الٰہی کی تکذیب اور اُلوہیت کا خاتمہ ہُوا اور یہ محال۔ پھر کروڑوں کہاں سے پیدا ہوں گے؟ اِسی طرح نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بروزِ حشر سب سے پہلے اُٹھیں گے، لواء الحمد آپ کے مبارک ہاتھوں میں ہوگا، جملہ نبی آپ کے جھنڈے تلے ہوں گے، مقامِ محمود پر آپ رونق افروز ہوں گے، پلصراط سے سب سے پہلے آپ گزریں گے، آپ سے پہلے شفاعت کی کوئی بھی جرأت نہ کر سکے گا اور سب سے پہلے آپ جنت میں داخل ہوں گے وغیرہ بہت سے کمالات ایسے ہیں جو صرف آپ کو عطا ہوں گے لیکن باری تعالیٰ نے اُن کا اعلان اپنے حبیب

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے کروادیا ہے۔ اگر کسی دُوسرے کو یہ صفات دی جائیں تو خدا اور رسول کا جھوٹا ہونا لازم آئے گا اور دُوسرے کو اگر یہ کمالات نہ دیے گئے تو وہ آپ جیسا کہاں ہُوا؟ گویا: ؎

رُخِ مصطفیٰ ہے وُہ آئینہ نہیں جس کے رنگ کا دُوسرا
نہ کسی کے وہم وگمان میں، نہ دُکانِ آئینہ ساز میں

قارئین کرام کا شاید یہ گمان ہوگا کہ دہلوی صاحب صرف اپنے نبی کے خصائص سے چڑتے تھے لیکن دُوسرے رسولوں کے برابر اُن کا مرتبہ ضرور مانتے ہوں گے۔ لیکن صورتِ حال یہ بھی نہیں ہے۔ جب خصائص ویکتائی کی کرسی سے اُتار کر عام رسولوں والی دوسری کرسی پر بٹھایا ہے تو اعزاز واکرام کے لیے کبھی ایسا نہیں کیا جاتا۔ موصوف یہاں سے بھی اٹھا کر اپنے نبی کو ایسے انبیاء والی تیسری کرسی پر بٹھا گئے، جن پر ایمان لانا ضروری نہیں، جن کو ماننا محض خبط ہے۔ آئیے اِس منصب کی کہانی خود موصوف کی زبانی ہی سُن لیجیے:

”جتنے پیغمبر آئے سو وُہ اللہ کی طرف سے یہی حکم لائے کہ اللہ کو مانیے اور اُس کے سوا کسی کو نہ مانیے۔“ [1]

”میرے سوا کسی کو حاکم ومالک نہ جانیو اور کسی کو میرے سوا نہ مانیو۔“ [2]

”اللہ کے سوا کسی کو نہ مان۔“ [3]

”اوروں کو ماننا محض خبط ہے۔“ [4]

”آدمی کتنا ہی گناہوں میں ڈوب جائے، محض بے حیا ہی بن جائے، پرایا مال کھانے میں کچھ قصور نہ کرے اور کچھ بھلائی برائی کا امتیاز نہ کرے مگر تو بھی شرک کرنے سے اور اللہ کے سوائے اور کسی کو ماننے سے بہتر ہے۔“ [5]

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۴۳
[2] ایضاً: ص ۴۷
[3] ایضاً: ص ۴۹
[4] ایضاً: ص ۳۲
[5] ایضاً: ص ۸۹

یہ تھی وہ تیسری کُرسی جس پر دہلوی صاحب نے اپنے نبی کو بٹھایا کہ وہ نبی تو ضرور ہیں لیکن اُن پر ایمان لانا نہ صرف غیر ضروری اور نِرا خبط ہے بلکہ شرک کی طرح قابلِ اجتناب اور محض بے حیا بن جانے سے بھی بدتر ہے۔ کوئی پُوچھے کہ اِن حالات میں دہلوی صاحب کے نبی کی شرعی حیثیت کیا ہے؛ شرعی حیثیت بنانے کی غرض سے موصوف نے اپنے نبی کو وہاں سے بھی اُٹھا کر چوتھی کُرسی پر بٹھا دیا اور اُس کے بیٹھنے والے کی شان یہ بتائی ہے:

> "انبیاء و اولیاء کو جو اللہ نے سب لوگوں سے بڑا بنایا ہے سو اُن میں یہی بڑائی ہے کہ اللہ کی راہ بتاتے ہیں اور بُرے بھلے کاموں سے واقف ہیں، سو لوگوں کو سکھلاتے ہیں۔"[1]

دہلوی صاحب نے خود اپنے نبی کی زبان سے بھی یہی اعلان کروادیا تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے:

> "سب لوگوں سے امتیاز مجھ کو یہی ہے کہ اللہ کے احکام سے میں واقف ہوں۔ اور لوگ غافل، سو اُن کو اللہ کا دین مجھ سے سیکھا چاہیے۔"[2]

چوتھی کُرسی پر بٹھا کر دہلوی صاحب نے اپنے نبی کا تعارف یُوں کروایا ہے کہ وُہ بھلے بُرے کام سے واقف تھے اور لوگوں کو سکھایا کرتے تھے یعنی ایک مولوی صاحب ہی سمجھ لیجیے۔ اگرچہ عمل والا معاملہ یہاں زیرِ بحث نہیں کہ دین کی جو واقفیت تھی اُس کے مطابق وُہ خود بھی عمل کرتے تھے یا نہیں۔ یہاں پہنچا کر بھی مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی تسکین نہ ہُوئی کیونکہ مولوی صاحبان کا منصب بھی کسی قدر قابلِ احترام ہے، لہٰذا موصوف نے اپنے نبی کو یہاں سے اٹھا کر پانچویں کرسی پر بٹھایا اور ذرا لاگ لپیٹ کے ساتھ اپنے نبی کا تعارف یُوں کروایا:

> "جیسا ہر قوم کا چودھری اور گاؤں کا زمیندار، سو اِن معنوں کو ہر پیغمبر اپنی اُمت کا سردار۔"[3]

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۵۸ [2] ایضاً: ص ۱۱۹

[3] ایضاً: ص ۱۱۵

موصوف نے سمجھا دیا کہ ہمارے نبی کا احترام محض اِسی طرح کا ہے جیسے گاؤں کے چودھریوں اور زمینداروں کا ہوتا ہے۔ گویا دہلوی صاحب کے نبی اپنی اُمت کے چودھری صاحب تھے۔ اِس کُرسی پر بٹھا کر بھی موصوف کو پچھتانا پڑا کہ شرعی حیثیت نہ سہی لیکن نبی صاحب دنیاوی لحاظ سے تو اب بھی معظّم رہ گئے۔ ہمّت کر کے اپنے نبی کو یہاں سے بھی اُٹھا کر چھٹی کُرسی پر بٹھا دیا اور یُوں اُن کا تعارف کروانا شروع کیا:

> "انسان آپس میں سب بھائی ہیں، جو بڑا بزرگ ہو وہ بڑا بھائی ہے۔ سو اُس کی بڑے بھائی کی سی تعظیم کیجیے۔"[1]

> "جتنے اللہ کے مقرب بندے ہیں، وُہ سب انسان ہی ہیں اور بندے عاجز اور ہمارے بھائی۔"[2]

موصوف کو انبیائے کرام کی بڑائی سے تو خاص چِڑ تھی۔ پہلی عبارت میں بُھول کر اپنے نبی کو بڑا بھائی، ساری اُمت کا بڑا بھائی اور بڑے بھائی کی سی تعظیم کے لائق کہہ بیٹھے تھے لیکن فوراً سنبھل گئے اور اگلی عبارت میں بتا دیا کہ بڑے چھوٹے کی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں بس اِتنا یاد رکھو کہ ہمارے یہ نبی صاحب ہمارے بھائی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد اِس پر بھی تلملا اُٹھے کیونکہ موصوف دہلی کے مشہور و معروف خاندان کے ایک فرد تھے۔ کسی کو اپنے برابر سمجھیں یہ ذرا مشکل بات تھی۔ لہٰذا فوراً اپنے نبی صاحب کو یہاں سے بھی اٹھایا اور ساتویں کُرسی پر بٹھا کر اُن کے منصب و مرتبے کا لحاظ رکھنے کی یُوں تلقین کرنی شروع کر دی:

> "کسی بزرگ کی شان میں زبان سنبھال کر بولو اور جو بشر کی سی تعریف ہو، سو ہی کرو، سو اُس میں بھی اختصار ہی کرو۔"[3]

یعنی اپنے نبی کا مقام مطلق بشر جیسا بتایا، ہر اَیرا غیرا نتھو خیرا جتنی تعریف کا مستحق ٹھہرتا ہے بس اُتنی کا حقدار بتایا جو ایک عام انسان سے بھی کم ہو۔ اِتنے پر بھی دہلوی صاحب کے دل کو تسکین نہ ہُوئی کیونکہ عام انسان بھی آخر اشرف مخلوق کا ایک فرد ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنے

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۱۱۱
[2] ایضاً: ص ۱۱۱
[3] ایضاً: ص ۱۱۵

نبی کو آٹھویں کرسی پر بٹھا کر یُوں اعلان کیا گیا:

”اِس بات میں اولیاء اور انبیاء، جن اور شیطان میں، بھُوت اور پری میں کچھ فرق نہیں۔“[1]

”خواہ یہ عقیدہ انبیاء اور اولیاء سے رکھے، خواہ پیر اور شہید سے، خواہ امام اور امام زادے سے، خواہ بھُوت اور پری سے۔“[2]

”کسی انبیاء و اولیاء کی، پیر شہید کی، بھُوت پری کی یہ شان نہیں۔“[3]

”پھر جو کوئی کہ انبیاء و اولیاء کی، اماموں شہیدوں کی، بھُوت پری کی، اِس قسم کی تعظیم کرے..... سو اِن سب باتوں سے شرک ثابت ہوتا ہے۔“[4]

”جو کوئی کسی نبی اور ولی کو یا جِنّ اور فرشتہ کو یا امام اور امام زادہ کو یا پیر اور شہید کو یا نجومی اور رمّال کو یا جفّار کو یا فال دیکھنے والے کو یا برہمن اشٹی کو یا بھُوت اور پری کو ایسا جانے اور اُس کے حق میں یہ عقیدہ رکھے، سو وُہ مشرک ہو جاتا ہے اور اِس آیت ($\frac{۶}{۵۹}$) سے منکر۔“[5]

”جو لوگ پہلے اور پچھلے، آدمی اور جِنّ بھی سب مل کر جبرائیل اور پیغمبر ہی سے ہو جائیں تو اِس مالک الملک کی سلطنت میں اُن کے سبب کچھ رونق نہ بڑھ جائے گی اور جو سب لوگ مل کر شیطان اور دجّال ہی سے ہو جائیں تو اُس کی رونق گھٹنے کی نہیں۔“[6]

موصوف نے اعلان فرما دیا کہ ہمارے نبی صاحب علم و اختیار میں جِنّ، بھُوت اور پری جیسے ہیں۔ تعظیم و توقیر کے لحاظ سے اِنھیں جِنّ و بھُوت و پری کے زمرے میں ہی رکھا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اِن کے وجود سے خدا کی بادشاہت میں کوئی رونق نہیں ہے۔ لیکن

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۳

[2] ایضاً: ص ۳۶

[3] ایضاً: ص ۳۶

[4] ایضاً: ص ۳۸، ۳۹

[5] ایضاً: ص ۵۴

[6] ایضاً: ص ۶۸

موصوف کی تسلی اِس پر بھی نہ ہُوئی۔ اپنے نبی صاحب کو یہاں سے اٹھا کر نویں کرسی پر بٹھایا جاتا ہے اور اُن کا ایسا مرتبہ بتایا جاتا ہے جس سے کم رُتبے کی کوئی چیز کائنات میں نہیں مل سکتی۔ مثلاً:

”سب انبیاء اور اولیاء اُس کے رُوبرو ایک ذرۂ ناچیز سے بھی کم تر ہیں۔“[1]

”اور یہ یقین جان لینا چاہیے کہ ہر مخلوق بڑا ہو یا چھوٹا وُہ اللہ کی شان کے آگے چمار سے بھی ذلیل ہے۔“[2]

یہ ہے دہلوی صاحب کے نبی کی آخری شان، امتیازی مقام کہ اگر اُسے ایک ذرۂ ناچیز کے ساتھ موصوف بارگاہِ خداوندی میں پیش کرتے ہیں، تو اُن کا جھوٹا خدا، اُن کے البیلے نبی کو اُس ذرۂ ناچیز سے بھی کم تر شمار کرتا ہے اور دوسری دفعہ جب وُہ اپنے نبی کو ساری مخلوق سمیت بارگاہِ خداوندی میں مقابلے کے لیے حاضر کرتے ہیں، تو زمرۂ مخلوق سے الگ دہلوی صاحب کا دریافت کردہ کوئی چمار بھی ہے، وُہ بھی حاضر ہو جاتا ہے۔ خدا سے موصوف مقابلہ کرواتے ہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اِس مقابلے کا نتیجہ خود یُوں سُناتے ہیں کہ خدا کے مقابلے میں چمار اتنا ذلیل نہیں ہے جس قدر ساری مخلوق اور موصوف کا خیالی نبی ذلیل ہے۔ (نعوذ باللہ منہا)

یہ تھا مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) اور اُن کے جملہ تتبعین و معتقدین کا نبی۔ لیکن ہمارے نبی وُہ ہیں جو صرف ہمارے ہی نہیں بلکہ ساری کائنات حتیٰ کہ سارے نبیوں کے نبی اور جملہ رسولوں کے سردار و سرور ہیں۔ دونوں جہانوں میں جس کو جو نعمت، رحمت، عظمت، فضیلت ملی یا ملے گی وُہ اُنہی کے صدقے، اُنہی کے ہاتھوں ملی اور ملے گی کیوں کہ باری تعالیٰ شانہٗ نے اُنہیں رحمۃ للعٰلمین اور اپنی نعمتوں کا تقسیم کرنے والا بنایا ہے۔ اُنہیں اپنا خلیفۂ اعظم و نائبِ اکبر بنایا اور ساری کائنات کو اُسی محبوب کی خاطر وجود کا لباس پہنایا ہے۔

ہمارے خالق و مالک نے اپنے فضل و کرم سے ہمارے پیارے نبی کو کونین کا آقا و مولیٰ، ملجا و ماوٰی اور دونوں جہانوں کا تاجدار بنا کر، متاعِ کُل و حاکمِ کُل و مالکِ کُل اور ماذون و مختار و

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۱۰۴

[2] ایضاً: ص ۴۳

مجاز بنا دیا ہے۔ یعنی ؎

خالقِ کُل نے آپ کو مالکِ کُل بنا دیا
دونوں جہاں ہیں آپ کے قبضہ و اختیار میں

ہمارا نبی، ہمارا اور ساری کائنات کا دو جگ میں سہارا ہے۔ ہمارا نبی وہ ہے جو ہم جیسے تمام گنہگاروں کی اَنَا لَہَا کہہ کر اُس روز شفاعت فرمائے گا۔ جب جلالِ خداوندی کو دیکھ کر جملہ انبیائے کرام نفسی نفسی پکار رہے ہوں گے۔ ہمارے نبی نے شَفَاعَتِیْ لِاَھْلِ الْکَبَائِرِ کا جاں بخش و روح پرور مژدہ سنا کر، ہم جیسے گناہگاروں اور سیاہ کاروں کے مردہ جسموں میں جان ڈالی ہُوئی ہے۔ وہی اوّل شافع، اوّل مشفع، ساقیِ کوثر و تسنیم اور صاحبِ مقامِ محمود ہے۔ بروزِ حشر اوّلین و آخرین سب اِن کی تعریف میں رطب اللسان ہوں گے، سب اِن کا مُنہ تکیں گے، اُنھیں کا سہارا تلاش کریں گے۔ اُس روز لواء الحمد ہمارے پیارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے مبارک ہاتھوں میں ہوگا۔ جب سورج سوا نیزے پر ہوگا، زمین تپ کر تانبے کی طرح ہوگئی ہوگی، اُس روز اِس جھنڈے کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ جس کو پناہ ملی اِسی جھنڈے کے نیچے مل سکے گی۔ جو اِن سے پھرا وُہ خدا سے پھرا، جو اِن سے مستغنی ہوا وُہ خدا سے مستغنی ہُوا۔ اِن کی گستاخی تو دور کی بات جو اِن کی آواز سے اپنی آواز کو اونچا کر دے اُس کے بھی ساری زندگی کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔

ہمارے پیارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نہ ماننے والا مسلمان ہی نہیں۔ ایمان اِنھیں ماننے، اِنھیں جاننے اور اِن کی تعظیم و توقیر کرنے ہی کا نام ہے۔ اِن کی محبت جانِ ایمان، اِن کا ذکر راحتِ جان، اِن کی فرمانبرداری بخشش کا سامان، اِن کی پیاری پیاری اداؤں کو اپنا لائحۂ عمل اور ضابطۂ حیات بنانے والے پکّا مسلمان، دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران۔ ہمارا نبی دستِ قدرت کے کمال کا شاہکار ہے۔ اِن جیسا نہ آج تک کوئی ہُوا ہے نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔ سب کے کمالات اِس جانِ جہان میں موجود ہیں لیکن اِن کے مخصوص کمالات کسی کو بھی نہیں ملے۔ ہمارا نبی ساری کائنات میں سب سے معزّز و مکرم ہے۔ اِنھیں باری تعالیٰ شانہٗ نے کارخانۂ ہستی کا شاہد بنایا، اِنھیں اوّلین و آخرین کا علم عطا فرمایا، مَاکَانَ وَمَایَکُوْنُ

اِنھیں دکھایا اور بتایا ہے۔ لوح وقلم کے علوم ہمارے آقا کے معلومات کا ایک حصّہ اور اسی بحر کی ایک لہر ہیں۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ وسلّم۔

تکفیرِ مسلمین

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) نے علّامہ ابنِ تیمیہ حرّانی (المتوفی ۷۲۸ھ/۱۳۲۸ء) اور محمد بن عبدالوہاب نجدی (المتوفی ۱۲۰۶ھ) سے بھی چار قدم آگے بڑھ کر اِس بے دردی سے مسلمانوں کی تکفیر کی کہ ساری اُمتِ محمدیہ کو مشرک وکافر بتانے میں ذرہ برابر جھجک محسوس نہیں کی۔ چنانچہ اپنے مخصوص پروگرام کے تحت مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے کی بنیاد یوں رکھی تھی:

> "سُننا چاہیے کہ شرک لوگوں میں بہت پھیل رہا ہے اور اصل توحید نایاب۔ لیکن اکثر لوگ شرک و توحید کے معنی نہیں سمجھتے۔ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں، حالانکہ شرک میں گرفتار ہیں۔"[1]

موصوف نے چونکہ ایمان کا دعویٰ رکھنے والوں کو مشرک بنانا تھا، اِسی لیے عوام کے ذہنوں کو تیار کرنے کی خاطر یہ شگوفہ چھوڑ دیا کہ "شرک لوگوں میں بہت پھیل رہا ہے اور اصل توحید نایاب"۔ اب اپنے شرکیات کی فہرست یوں شروع کرتے ہیں:

> "اکثر لوگ پیروں کو، پیغمبروں کو، اماموں کو، شہیدوں کو، فرشتوں کو، پریوں کو مشکل کے وقت پکارتے ہیں۔ اُن سے مرادیں مانگتے ہیں، اُن کی مَنّتیں مانتے ہیں۔ حاجت برآنے کے لیے اُن کی نذر ونیاز کرتے ہیں۔ بلا کے ٹالنے کے لیے اپنے بیٹوں کو اُن کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ کوئی اپنے بیٹے کا نام عبدالنبی رکھتا ہے، کوئی علی بخش، کوئی حسین بخش، کوئی پیر بخش، کوئی مدار بخش، کوئی سالار بخش، کوئی غلام محی الدین۔ اُن کے جینے کے لیے کوئی کسی کے نام کی چوٹی رکھتا ہے، کوئی کسی کے نام کی بدھی پہناتا ہے۔ کوئی کسی کے نام کے کپڑے پہناتا ہے، کوئی کسی کے نام کی بیڑی ڈالتا ہے۔ کوئی کسی کے نام کے جانور کرتا ہے۔ کوئی مشکل کے وقت

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۲۹

دُہائی دیتا ہے، کوئی اپنی باتوں میں کسی کے نام کی قسم کھاتا ہے۔ غرض جو کچھ ہندو اپنے بتوں سے کرتے ہیں، وہ سب کچھ یہ جھوٹے مسلمان انبیاء اور اولیاء سے، اماموں اور شہیدوں سے، فرشتوں اور پریوں سے کر گزرتے ہیں اور دعویٰ مسلمانی کا کیے جاتے ہیں۔ سبحان اللہ! یہ مُنہ اور یہ دعویٰ"۔ [1]

موصوف کے یہ شرکیات یاد رکھیے اب دُوسری فہرست ملاحظہ ہو:

"شرک کے معنی یہ ہیں کہ جو چیزیں اللہ نے اپنے واسطے خاص کی ہیں اور اپنے بندوں کے ذمہ نشان بندگی کے ٹھہرائے ہیں، وہ چیزیں اور کسی کے واسطے کرنی۔ جیسے سجدہ کرنا، اُس کے نام کا جانور کرنا، اُس کی منّت ماننی، مشکل کے وقت پکارنا، ہر جگہ حاضر و ناظر سمجھنا اور قدرت تصرف کی ثابت کرنی، سو اِن باتوں سے شرک ثابت ہو جاتا ہے۔ گو کہ پھر اللہ سے چھوٹا ہی سمجھے اور اُسی کا مخلوق اور اُسی کا بندہ"۔ [2]

اب مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کے شرکیات کی تیسری فہرست ملاحظہ ہو:

"جو کوئی کسی کا نام اُٹھتے بیٹھتے لیا کرے، دُور نزدیک سے پکارا کرے، بلا کے مقابلے میں اُس کی دُہائی دے اور دشمن پر اُس کا نام لے کر حملہ کرے، اُس کے نام کا ختم پڑھے یا شغل کرے یا اُس کی صورت کا خیال باندھے اور یُوں سمجھے کہ جب مَیں اُس کا نام لیتا ہُوں، زبان سے یا دِل سے، یا اُس کی صورت کا، یا اُس کی قبر کا خیال باندھتا ہُوں تو وہیں اُس کو خبر ہو جاتی ہے۔ اُس سے میری کوئی بات چھُپی نہیں رہ سکتی اور جو مجھ پر احوال گزرتے ہیں جیسے بیماری اور تندرستی، کشائش اور تنگی، مرنا اور جینا، غم اور خوشی، سب کی ہر وقت اُسے خبر ہے۔

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۲۹

[2] ایضاً: ص ۳۳

جو بات میرے منہ سے نکلتی ہے وہ سب سُن لیتا ہے اور جو خیال و وہم میرے دل میں گزرتا ہے، وہ سب سے واقف ہے۔ سو اِن باتوں سے مشرک ہوجاتا ہے۔"[1]

موصوف کے بتائے ہُوئے مشرکوں میں مندرجہ ذیل امور کے قائلوں کا بھی شمار کر لیا جائے:

"جو کوئی کسی اور کو ایسا تصرف ثابت کرے، اُس سے مراد مانگے، اِس توقع پر نذر نیاز کرے، اُس کی منتیں مانے، مصیبت کے وقت اُس کو پکارے، سو مشرک ہو جاتا ہے۔"[2]

موصوف کے اصطلاحی مشرکوں کی فہرست تو کافی طویل ہے۔ لہٰذا اِسی فہرست میں مزید اضافہ یُوں بھی کیا ہے:

"بعضے کام تعظیم کے لیے اللہ نے اپنے لیے خاص کیے ہیں کہ اُن کو عبادت کہتے ہیں۔ جیسے سجدہ اور رکوع اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، اُس کے نام پر مال خرچ کرنا، اُس کے نام کا روزہ رکھنا، اُس کے گھر کی طرف دُور دُور سے قصد کر کے سفر کرنا اور ایسی صورت بنا کر چلنا کہ ہر کوئی جان لے یہ لوگ اُس کے گھر کی زیارت کو جاتے ہیں اور رستے میں اُس مالک کا نام پکارنا، نامعقول باتیں کرنے سے اور شکار سے بچنا اور اُسی قید سے جا کر طواف کرنا، اُسکے گھر کی طرف سجدہ کرنا، اُس کی طرف جانور لے جانے، وہاں منتیں ماننی، اُس پر غلاف ڈالنا، اُس کی چوکھٹ کے آگے کھڑے ہو کر دُعا مانگنی، التجا کرنی اور دین و دنیا کی مرادیں مانگنی، ایک پتھر کو بوسہ دینا، اُس کی دیوار سے اپنا منہ اور چھاتی ملنی، اُس کا غلاف پکڑ کر دُعا کرنی، اُس کے گرد روشنی کرنی، اُس کا مجاور بن کر اُس کی خدمت میں مشغول رہنا، جیسے جھاڑو دینی، روشنی کرنی، فرش بچھانا، پانی

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۵، ۳۶

[2] ایضاً، ص ۳۶

پلانا، وضو غسل کا لوگوں کے لیے سامان درست کرنا، اُس کے کنوئیں کے پانی کو تبرک سمجھ کر پینا، بدن پر پانی ڈالنا، آپس میں بانٹنا، غائبوں کے واسطے لیجانا، رخصت ہوتے وقت اُلٹے پاؤں چلنا، اُس کے گردو پیش کے جنگل کا ادب کرنا، یعنی وہاں شکار نہ کرنا، درخت نہ کاٹنا، گھاس نہ اُکھاڑنا، مویشی نہ چُگانا، یہ سب کام اللہ نے اپنی عبادت کے لیے اپنے بندوں کو بتائے ہیں۔

پھر جو کوئی کسی پیر پیغمبر کو، یا بھوت پری کو، یا کسی کی سچی یا جھوٹی قبر کو، یا کسی کے تھان کو، یا کسی کے چلّے کو، یا کسی کے مکان کو، یا کسی کے تبرک یا نشان یا تابوت کو، سجدہ کرے، یا رکوع کرے یا اُس کے نام کا روزہ رکھے یا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو، یا جانور چڑھائے، یا ایسے مکان میں دُور دُور سے قصد کر کے جاوے، یا وہاں روشنی کرے، غلاف ڈالے، چادر چڑھائے، اُن کے نام کی چھڑی کرے، اُن کی قبر کو بوسہ دے، مورچھل جھلے، اُس پر شامیانہ کھڑا کرے، چوکھٹ کو بوسہ دے، ہاتھ باندھ کر التجا کرے، مراد مانگے، مجاور بن کر بیٹھ رہے، رخصت ہوتے وقت اُلٹے پاؤں چلے، وہاں کے گردو پیش کے جنگل کا ادب کرے اور اسی قسم کی باتیں کرے، سو اُس پر شرک ثابت ہوتا ہے۔"[1]

دہلوی صاحب کے شرکیات کا دریا اپنی پُوری طغیانیوں پر تھا، لہٰذا تھمنا کہاں؟ وہابیت کی گنگا میں جمنا کہاں؟ قارئین ابھی نہ اُکتائیں۔ مسلمانوں کو مشرک بتانے کی دہلوی صاحب نے جو فہرست تیار کی اُس میں یہ بھی شامل ہیں:

"جو کوئی کہ انبیاء و اولیاء کی، اماموں شہیدوں کی، بھوت پری کی اِس قسم کی تعظیم کرے، جیسے آڑے کام پر اُن کی نذر ماننے، مشکل کے وقت اُن کو پکارے، بسم اللہ کی جگہ اُن کا نام لے، جب اولاد ہو اُن کی نذر نیاز کرے، اپنی اولاد کا نام عبدالنبی، امام بخش، پیر بخش رکھے۔ کھیت اور باغ میں اُنکا

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۶، ۳۷

حقہ لگائے ۔ جو کھیتی باڑی سے آئے پہلے اُن کی نیاز کرے جب اپنے کام میں لائے ، دھن اور ریوڑ میں سے اُن کے نام کے جانور ٹھہرائے ، پھر اُن جانوروں کا ادب کرے ، پانی دانے پر سے نہ ہانکے ، لکڑی پتّھر سے نہ مارے ، کھانے پینے پہننے میں رسموں کی سند پکڑے کہ فلانے لوگوں کو چاہیے فلانا کھانا نہ کھائیں ، فلانا کپڑا نہ پہنیں ، حضرت بی بی کی صحنک مرد نہ کھائیں ، لونڈی نہ کھائے ، جس عورت نے دوسرا خصم کیا ہو وُہ نہ کھائے ، شاہ عبدالحق کا توشہ حقہ پینے والا نہ کھائے ، برائی اور بھلائی جو دنیا میں پیش آتی ہے اُس کو اُن کی طرف نسبت کرے کہ فلانا اُن کی پھٹکار میں آکر دیوانہ ہو گیا ، فلانے کو اُنھوں نے راندا تو محتاج ہو گیا ، فلانے کو نوازا تو اُس کو فتح و اقبال مل گیا ، قحط فلانے ستارے کے سبب سے پڑا ، فلانا کام جو فلانے دن شروع کیا تھا یا فلانی ساعت میں سو پورا نہ ہُوا ، یا یُوں کہیں کہ اللہ و رسول چاہے گا تو میں آؤں گا ، یا پیر چاہے گا تو یہ بات ہو جائے گی ، یا اُس کے تئیں بولنے میں یا معبود ، داتا ، بے پروا ، خداوندِ خدائیگاں ، مالک الملک ، شہنشاہ بولے ، یا جب حاجت قسم کھانے کی پڑے تو پیغمبر کی ، یا علی کی ، یا امام کی ، یا پیر کی یا انکی قبروں کی قسم کھائے ۔ سو اِن سب باتوں سے شرک ثابت ہوتا ہے ۔"[1]

اب ذرا سجدہ تعظیمی کے بارے میں آنجناب کی تحقیقِ انیق ملاحظہ فرما لی جائے ۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

"اِس آیت (۴۱/۳۷) سے معلوم ہوا کہ ہمارے دین میں یُوں ہی فرمایا ہے : سجدہ کرنا حق خالق ہی کا ہے سو کسی مخلوق کو نہ کیا جائے کہ مخلوق ہونے میں چاند اور سورج ، نبی اور ولی برابر ہیں ۔ جو کوئی یہ بات کہے کہ اگلے دینوں میں کسی کسی مخلوق کو بھی سجدہ کرتے تھے ، جیسے فرشتوں نے حضرت آدم کو کیا اور حضرت

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی ، مولوی : تقویۃ الایمان ، ص ۳۸ ، ۳۹

یعقوب نے حضرت یوسف کو، تو ہم بھی اگر کسی بزرگ کو کرلیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ سو یہ بات غلط ہے۔ آدم کے وقت کے لوگ اپنی بہنوں سے نکاح کرلیتے تھے، چاہیے یہ لوگ ایسی ایسی حجتیں لانے والے اپنی بہنوں سے نکاح کرلیں۔ اصل بات یہی ہے کہ بندے کو اللہ کا حکم ماننا چاہیے جب اُس نے جو حکم فرمایا اُس کو جان و دل سے قبول کرلینا چاہیے اور حجت نہ نکالے کہ اگلے لوگوں پر تو یہ حکم نہ تھا، ہم پر کیوں ہُوا؟ ایسی حجتیں لانے سے آدمی کافر ہوجاتا ہے۔" [۱]

بزرگوں کے سامنے ادب سے کھڑا ہونا بھی شرک ہے۔ لیجیے موصوف کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

"اِس آیت ($\frac{۷۲}{۱۹}$) سے معلوم ہُوا کہ ادب سے کھڑا ہونا، اُس کو پکارنا اور اُس کا نام جپنا، اِنھیں کاموں میں سے ہے کہ اللہ صاحب نے خاص اپنی تعظیم کے لیے ٹھہرائے ہیں اور کسی سے یہ معاملہ کرنا شرک ہے۔" [۲]

دہلوی صاحب اپنے اصطلاحی مشرکوں کی فہرست پیش کرتے ہُوئے آگے یُوں وضاحت فرماتے ہیں:

"اِس قسم کے کام کسی اَور کی تعظیم کے لیے نہ کیا چاہئیں۔ کسی کی قبر یا چلّے پر، یا کسی کے تھان پر دُور دُور سے قصد کرنا، سفر کی رنج و تکلیف اٹھاکر، میلے کچیلے ہوکر وہاں پہنچنا، وہاں جاکر جانور چڑھانے، منّتیں پُوری کرنی، کسی کی قبر یا مکان کا طواف کرنا، اُس کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کرنا یعنی وہاں شکار نہ کرنا، درخت نہ کاٹنا، گھاس نہ اُکھاڑنا اور اِسی قسم کے کام کرنے اَور اُن سے کچھ دین و دنیا کے فائدہ کی توقع رکھنا۔ یہ سب شرک کی باتیں ہیں، اِن سے بچنا چاہیے۔" [۳]

اِسی سلسلۂ شرکیاتِ وہابیہ کی آخری عبارت پیشِ خدمت ہے۔ اِس کے شرکیات عجیب سے عجیب تر ہیں:

---

[۱] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۷۸

[۲] ایضاً: ص ۷۹

[۳] ایضاً: ص ۸۰

"اِس آیت ($\frac{۶}{۱۴۵}$) سے معلوم ہوا کہ جانور کسی مخلوق کے نام کا نہ ٹھہرائیے اور وُہ جانور حرام اور ناپاک۔ اِس آیت میں کچھ اِس بات کا مذکور نہیں کہ اُس جانور کے ذبح کرنے کے وقت کسی مخلوق کا نام لیجیے جب حرام ہو۔ بلکہ اتنی ہی بات کا ذکر ہے کہ کسی مخلوق کے نام پر جہاں کوئی جانور مشہور کیا کہ یہ گائے سید احمد کبیر کی ہے، یا یہ بکرا شیخ سدّو کا ہے، سو وہ حرام ہو جاتا ہے، پھر کوئی جانور ہو، مرغی یا اُونٹ، کسی مخلوق کے نام کا کر دیجیے، ولی کا یا نبی کا، باپ کا یا دادے کا، بھوت کا یا پری کا، وُہ سب حرام ہے اور ناپاک، اَور کرنے والے پر شرک ثابت ہو جاتا ہے۔"[۱]

مناسب نظر آتا ہے کہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) نے جن جن کاموں کے کرنے والوں کو مشرک بتایا اُن کی مذکورہ عبارات کی روشنی میں ایک فہرست پیش کر دی جائے جو اس طرح بنتی ہے:

۱ —— جس نے مشکل کے وقت کسی نبی یا ولی کو پکارا تو مشرک۔

۲ —— اُن کی منتیں مانیں تو مشرک۔

۳ —— اُن کی نذر و نیاز دی تو مشرک۔

۴ —— بلا ٹلنے کے لیے اپنے کسی بیٹے کو اُن کی طرف منسوب کیا تو مشرک۔

۵ —— اپنے کسی بیٹے کا نام عبد النبی، علی بخش، حسین بخش، پیر بخش، مدار بخش یا غلام محی الدین وغیرہ رکھا تو مشرک۔

۶ —— کسی بزرگ کے نام کے غریبوں کو کپڑے پہنائے، کھانا کھلایا تو مشرک۔

۷ —— کسی بزرگ کے نام کا جانور ذبح کیا تو مشرک۔

۸ —— کسی بزرگ کے نام کی قسم کھائی تو مشرک۔

۹ —— کسی کو سجدہ تعظیمی کیا تو مشرک۔

۱۰ —— کسی کو اللہ کا بندہ سمجھ کر لعطائے الٰہی حاضر و ناظر سمجھا تو مشرک۔

---

[۱] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۱۸

۱۱ —— کسی بزرگ کو خدا کی عطا سے تصرف کی قدرت مانی تب بھی مشرک۔

۱۲ —— اُٹھتے بیٹھتے وقت کسی بزرگ کا نام لیا جیسے کلمہ یا درود کا ورد کرتا رہے تو مشرک۔

۱۳ —— دُور سے کسی بزرگ کو پکارا تو مشرک۔

۱۴ —— نزدیک سے کسی بزرگ کو پکارا تب بھی مشرک۔

۱۵ —— مصیبت کے وقت کسی بزرگ کی دہائی دی تو مشرک۔

۱۶ —— کسی بزرگ کا نام لے کر دشمن پر حملہ کیا جیسے عموماً مجاہدین یا علیؑ کہہ کر حملہ کرتے
تو مشرک۔

۱۷ —— کسی بزرگ کے نام کا ختم پڑھا، جیسا کہ تمام سلاسل میں صدہا سال سے مروج
تو مشرک۔

۱۸ —— اپنے پیر یا کسی بزرگ کا شغل کیا، جیسا کہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی
قدس سرہٗ نے خاص طور پر تعلیم دی ہے، تو مشرک۔

۱۹ —— کسی بزرگ کی صورت کا خیال کیا تو مشرک۔

۲۰ —— کسی بزرگ کو اپنے حالات سے خبردار مانا، جیسے کہ مولوی رشید احمد گنگوہی
(المتوفی ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) نے پیروں کی شان بتائی ہے، تو مشرک۔

۲۱ —— جو کسی بزرگ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوا، وہ مشرک۔

۲۲ —— جس نے کسی بزرگ کے نام پر مال خرچ کیا، وہ مشرک۔

۲۳ —— جو کسی بزرگ کے گھر کی طرف سفر کر کے گیا، تو مشرک۔

۲۴ —— جو کسی بزرگ کی طرف جاتے ہوئے نامعقول باتیں کرتے ہوئے نہ گیا، وہ مشرک

۲۵ —— جو بزرگ کی طرف جاتے وقت شکار کرتا ہوا نہ گیا، وہ مشرک۔

۲۶ —— کسی بزرگ کے لیے جانور لے گیا، تو مشرک۔

۲۷ —— کسی بزرگ کے مزار پر چادر ڈالی، تو مشرک ہو گیا کیونکہ چادر تو دہلوی صاحب
خدا کے مزار پر ڈالنی چاہیے تھی۔

۲۸ —— کسی بزرگ کے آستانے پر جا کر خدا سے دعا مانگی تو مشرک۔

۲۹ —— کسی کے مزار پر جا کر اللہ تعالیٰ سے دین و دنیا کی مرادیں مانگیں تو مشرک۔

۳۰ —— کسی بزرگ کے آستانے کی کسی دیوار سے اپنا منہ لگایا یا چھاتی ملی تو مشرک۔

۳۱ —— کسی بزرگ کے مزار کا غلاف پکڑ کر خدا سے دُعا مانگی تو مشرک۔

۳۲ —— کسی مزار پر روشنی کی، تو مشرک۔

۳۳ —— جس نے کسی مزار کے پاس فرش بچھایا تو مشرک۔

۳۴ —— جس نے مزار کا مجاور بن کر کسی کو پانی پلایا تو مشرک۔

۳۵ —— جس نے مزار پر آنے جانے والوں کی خاطر وضو و غسل کے پانی کا خیال رکھا، تو مشرک۔

۳۶ —— جس نے مزار کا خدمت گار بن کر وہاں جھاڑو دی، وُہ مشرک۔

۳۷ —— جس نے کسی بزرگ کے کنوئیں کے پانی کو برکت والا سمجھا تو مشرک۔

۳۸ —— وُہ پانی بدن پر ڈالا تو مشرک۔

۳۹ —— اُسے آپس میں بانٹا تو مشرک۔

۴۰ —— اُسے غائبوں کے واسطے لے گیا تو مشرک۔

۴۱ —— کسی بزرگ یا مزار سے لوٹتے وقت اگر اُس کی طرف پیٹھ نہ کی تو مشرک۔

۴۲ —— کسی بزرگ کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کیا تو مشرک۔ جیسا کہ از روئے احادیث مسلمان مدینہ طیبہ اور اس کے گرد و پیش کو حرم مانتے اور اُن مقامات کا ادب کرتے ہیں، ایسا ادب کرنے والے موصوف کے نزدیک سب مشرک۔

۴۳ —— وہاں شکار نہ کیا تو مشرک۔

۴۴ —— وہاں کے درخت نہ کاٹے تو مشرک۔

۴۵ —— وہاں کی گھاس نہ اکھاڑی تو مشرک۔

۴۶ —— وہاں مویشی نہ چگائے تو مشرک۔

۴۷ —— کسی بزرگ کی قبر کو بوسہ دیا تو مشرک۔

۴۸ —— مورچھل جھلا تو مشرک، کیونکہ یہ کام بھی موصوف کے خدا نے اپنے لیے خاص کیا ہُوا ہے کہ اُسی پر مورچھل جھلا جائے۔

۴۹ —— کسی بزرگ کے مزار پر شامیانہ کھڑا کر دیا کہ آنے والوں کو دھوپ کی تکلیف نہ ہو

تو مشرک، کیونکہ یہ کام بھی موصوف کے خدانے اپنے ساتھ خاص کیا ہوا ہے۔

۵۰ —— جس نے اپنے کھیت یا باغ میں کسی بزرگ کا ازراہِ عقیدت و خدمت حصّہ رکھ لیا، وہ مشرک۔

۵۱ —— کھیتی باڑی میں سے جو حصّہ آتے اُس میں سے پہلے کچھ کسی بزرگ کی نذر کردیا، تو مشرک۔

۵۲ —— دھن اور ریوڑ میں سے اُن کے نام کا جانور ٹھہرادیا، تو مشرک۔

۵۳ —— ایسے جانور کا کوئی ادب لحاظ کیا، تو مشرک۔

۵۴ —— اُس جانور کو پانی پینے سے نہ روکا، تو مشرک۔

۵۵ —— اگر اُس جانور کو لکڑی یا پتھر سے نہ مارا تو مشرک۔

۵۶ —— کھانے پینے میں رسم ورواج کی سند پکڑی، تو مشرک۔

۵۷ —— اگر کھانے یا پہننے پر کسی قسم کی مصلحتاً بھی پابندی عائد کی، تو مشرک۔

۵۸ —— اگر بی بی کی صحنک کا کھانا، شاہ ولی اللہ و شاہ عبدالعزیز اور اُن کے سارے خانوادے کی طرح مردوں کو نہ کھلایا، تو مشرک۔

۵۹ —— یہی کھانا اگر دُوسرا خاوند کرنے والی عورت کو نہ کھلایا تو مشرک۔

۶۰ —— شاہ عبدالحق کا توشہ اگر حقّہ پینے والے کو نہ کھلایا، تو مشرک۔

۶۱ —— اگر کسی نے یہ کہا کہ یہ آدمی فلاں بزرگ کی گستاخی کرنے کی وجہ سے دیوانہ ہوا ہے، تو ایسا کہنے والا مشرک۔

۶۲ —— اگر کسی کی محتاجی کا سبب اُس کا بزرگوں کی بارگاہ میں گستاخ ہونا بتایا، تو مشرک۔

۶۳ —— اگر کہے کہ فلاں شخص کو کسی ولی یا نبی نے نوازا تھا، تو ایسا کہنے والا مشرک۔

۶۴ —— کسی ساعت کو نحس ماننا، تو مشرک۔

۶۵ —— اگر کہا کہ اللہ و رسول چاہے گا تو میں آؤں گا، یا فلاں کام کرسکوں گا، تو ایسا کہنے والا بھی مشرک۔

۶۶ —— اگر خدا کے سوا کسی کو داتا کہا، تو مشرک۔

۶۷ ـــــ اگر خدا کے سوا کسی کو بے پروا کہہ دیا، تب بھی مشرک ۔

۶۸ ـــــ اگر کسی انسان کو شہنشاہ کہہ دیا، تو مشرک ۔

۶۹ ـــــ کسی بزرگ کے نام کی قسم کھائی، تو مشرک ۔

۷۰ ـــــ اگر سجدہ تعظیمی کو شرک نہ سمجھا تو اس کے خلاف قرآن و حدیث سے دلائل پیش کرنے لگا، تو کافر ۔

۷۱ ـــــ اگر کسی بزرگ کے سامنے بے ادبی کے انداز میں کھڑا نہ ہوا، تو مشرک ۔

۷۲ ـــــ اگر کسی بزرگ کے پاس میلے کچیلے کپڑوں سے پہنچا، تو مشرک ۔

۷۳ ـــــ اگر کوئی کہے کہ یہ گائے سید احمد کبیر کی ہے، وہ مشرک ۔

۷۴ ـــــ کہے کہ یہ بکرا شیخ سدو کا ہے، تو مشرک ۔

۷۵ ـــــ اگر کہہ دیا کہ یہ مرغی میری بیوی کی ہے، تو مشرک ۔

۷۶ ـــــ کہہ بیٹھا کہ یہ اونٹ میرے لڑکے کا ہے، تو مشرک ۔

۷۷ ـــــ کہہ دیا کہ یہ بھیڑ میرے والد محترم کی ہے، تو مشرک ۔

۷۸ ـــــ اگر کہا کہ یہ بھینس میرے دادا جان کی ہے، تو مشرک ۔

۷۹ ـــــ جو حرمت کے لیے بوقتِ ذبح غیر خدا کا نام لینا مراد لے، وہ مشرک ۔

۸۰ ـــــ جو ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام اور ناپاک تسلیم نہ کرے، وہ مشرک ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم ۔

؎ آہ یہ ظالم تلخ حقیقت جتنے سفینے غرق ہوئے
اکثر اپنی موج میں ڈوبے، طوفاں سے ٹکرائے کم

قارئین کرام! یہ تھا مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کا ایک سوچے سمجھے اور سیکھے سکھائے منصوبے کے تحت مسلمانوں کو کافر و مشرک ٹھہرانے کا زبانی جمع خرچ۔ اس فہرست کو سامنے رکھیے، تقویۃ الایمان سے مطابقت کر کے سوچیے! اگر تعلیماتِ قرآن و حدیث اور تصانیفِ علمائے دین پر نظر ہے تو بتائیے کیا موصوف کے اس خانہ ساز شرک سے امتِ محمدیہ کا کوئی ایک فرد بھی بچ سکا ہے؟ بات دراصل یہ تھی کہ موصوف نے محمد بن عبدالوہاب

(المتوفی ۱۲۰۶ھ) کی طرح مسلمانوں کو کافر و مشرک ٹھہرا کر اپنے خارجی ہونے کا عملی ثبوت بھی پیش کرنا تھا۔ مسلمانوں سے قتل و قتال کر کے اپنی ہوسِ ملک گیری کو تسکین دینی تھی۔

قتل وقتالِ مسلمین

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) نے حصولِ سلطنت کی خاطر مسلمانوں کو کافر و مشرک ٹھہرانے کے لیے تقویۃ الایمان کتاب لکھی، تاکہ برٹش گورنمنٹ کے حکم کے مطابق پنجاب کے سکھوں اور سرحد کے مسلمانوں کو زیر کیا جائے اور جس طرح محمد بن عبدالوہاب نجدی نے مسلمانوں کے خُون سے ہولی کھیل کر آلِ سعود کے سہارے خارجی حکومت قائم کی تھی، متحدہ ہندوستان میں بھی اُسی طرح انگریزوں کے سہارے اپنی سلطنت قائم کرنے کا شوق دامنگیر ہوا۔ سکھّوں سے لڑنے کی خاطر پنجاب و سرحد کے خوانین و رؤسا کا تعاون ضروری تھا۔ جب یہ حضرات اپنی جمعیت سمیت نواحِ پشاور میں پہنچے تو جن خوانین کو آپ کی اطلاع ہوتی گئی وہ بڑی خوشی سے دستِ تعاون بڑھاتے چلے گئے کیونکہ ابتداءً وُہ اِنھیں رحمتِ خداوندی شمار کرتے تھے۔

۱۲ ربیع الثانی ۱۲۴۲ھ کو ہنڈ کے مقام پر مجمعِ عوام و خواص یعنی خوانین و رعایا نے سید احمد صاحب کے ہاتھ پر امامت کی بیعت کی۔ آپ کو امیر المؤمنین مان لیا، جمعہ میں آپ کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ سید صاحب کی مُہر اِسْمُہٗ اَحْمَدُ اور آپ کے مشیرِ خاص وسپہ سالا افواج یعنی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی مُہر وَاذْکُرْ فِی الْکِتَابِ اِسْمٰعِیْل مقرر ہُوئی۔ عمّال اور قاضی مقرر کیے گئے، علاقے کا انتظام سنبھال لیا، زکوٰۃ و عشر کا وصول کرنا شروع کیا۔ مقدمات کی سماعت کرنے لگے تو جن مسلمانوں نے اِنھیں تالیفِ قلوب کے سارے اسباب سے لیس دیکھ کر رحمتِ خداوندی سمجھا تھا، اُنھیں چند روز میں ہی معلوم ہونے لگا کہ ظلم وست کے اصل بانی نیز ہلاکو اور چنگیز خاں کے اصلی جانشین یہی ہیں۔ اِس کے ساتھ ہی اُن پر حقیقت بھی منکشف ہوگئی کہ مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھانے اور اُن کی آبروریزی کا سلسل اِس لیے جاری ہے کہ یہ البیلے مجاہد خارجیت کے مرض میں گرفتار اور مسلمانوں کو مشرکین وکفا سمجھتے ہیں۔ برطانوی ڈپلومیسی میں پُورے ماہر ہیں کہ جو امیر اِن سے تعاون کا اعلان کرتا اُس کا علاقہ زیرِ نگیں و خزانہ زیرِ تصرف۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر جو رئیس ذرا پیچھے ہٹا، اُ

باغی اور منافق قرار دے کر واجب القتل ٹھہرا دیا۔ موقع ملنے پر حملہ کر دیا، مسلمانوں کے خون سے خوب ہولی کھیلی، قیدیوں کو لونڈی غلام بنایا اور جو مال ہاتھ لگا وہ کافروں کا مال ٹھہرا کر، مالِ غنیمت شمار کیا اور خمس نکال کر باقی فوج میں تقسیم کر دیا جاتا۔

یار محمد خاں حاکمِ یاغستان نے اِس بھبڑ چال کو دیکھا تو آثار اچھے نظر نہ آئے کہ اِن سودائیوں کے ساتھ لگ کر سکھوں کی منظم قوم کی دشمنی مول لی جائے اور مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو خطرے میں ڈالا جائے۔ لہٰذا وُہ پیچھے ہٹنے لگا تو خارجیت کی پیشانی پر بل آ گئے، وہابیت کے تیور بدل گئے اور مسلم کشی کا دریا جوش میں آ گیا۔ یار محمد خاں کے بارے میں مختلف خطوط میں وضاحت کی گئی، سیّد احمد صاحب نے مختلف لوگوں کو اُس کا کافر، منافق، دشمنِ اسلام، کافروں کا یار و رازدار، فریبی، مکّار وغیرہ ہونا بتایا اور اپنے ارادۂ مسلم کشی کے لیے راہ ہموار کرتے رہے۔ سوانح احمدی کا تیسرا مکتوب جو اعلام ہے، اُس میں سید احمد صاحب نے یہی وضاحت کرتے ہُوئے کہا ہے:

> "سردار مذکور نے اگرچہ اِس نور کے ظہور کے آغاز کے وقت ہی اپنے حسد بھرے دل میں مخالفت کا ارادہ رکھا تھا اور اپنے سینۂ پُر کینہ میں لڑائی جھگڑے کا تخم بویا تھا۔ آخر کار ایسے وقت میں جبکہ دشمن کے مقابلہ میں لڑائی کا سمندر موجیں مار رہا تھا اور توپ و بندوق کی گرجدار آواز یں معرکہ و جدال کی داد دے رہی تھیں، بدبختی اور جھگڑے کی بنیاد پڑ گئی اور اُس نے مسلمانوں کی فوج کو تتّر بتّر کر دیا اور جہاد کے معاملہ کو لیت و لعل میں ڈال دیا اور دغا و مکر کی چال چلی اور اپنے زعم میں کفر و فساد کی جڑیں مضبوط کر دیں اور اسلام و جہاد کی بنیاد متزلزل کر دی۔ اِس طرح ایک جھوٹی باطل حکومت کی تنظیم کی اور سچی امامت میں خلل ڈال دیا۔ اِس کے علاوہ اِس خاکسار کی ہلاکت اور اِس ناچیز کو برباد کرنے میں سخت جدّ و جہد کرتا رہا اور سعیِ ناکام میں مصروف رہا۔"[1]

---

[1] سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ٣٣

یار محمد خاں حاکمِ یاغستان ذی شعور آدمی تھا، حکمتِ عملی کے ساتھ سکھوں سے نباہ کر کے اِسلامی علاقوں کو اُن کی دست بُرد سے بچائے ہُوئے تھا کیونکہ خوانین بھی آپس میں متفق و متحد نہیں تھے۔ شروع میں تو دیگر بعض خوانین کی طرح موصوف نے بھی بیعت کر لی لیکن صورتِ حال سے آگاہ ہونے پر وہ شرعی اور سیاسی لحاظ سے تعاون نہ کرنے پر مجبور تھا۔ جس کے وجوہ حسبِ ذیل ہیں:

١۔ اِس بیعت کی شرعی حیثیت وہی تھی جیسے کوئی بے خبر مسلمان اپنے وقت کے کسی ابنِ تیمیہ حرانی یا محمد بن عبدالوہاب نجدی یا مرزا غلام احمد قادیانی کے ہاتھ پر بیعت کر بیٹھتا۔

٢۔ موصوف کو جب آگاہی ہُوئی کہ وہ لشکرِ علی المرتضیٰ کے قلب میں خوارج کو جگہ دے بیٹھے، محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بھیڑوں کے ریوڑ میں محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیرو بھیڑیوں کو داخل کر چکے، مسلمانوں کو کافر و مشرک جاننے والوں کو اُنھوں نے اپنی گردنوں پر مسلط کر لیا۔ تو حکمتِ عملی سے چھٹکارے کی صورت نکالتی اور اِس بلائے ناگہانی سے بچنے کی تدابیر اختیار کرنا شرعی اعتبار سے ضروری ہو گیا تھا۔

٣۔ یہ معلوم ہونے پر کہ سیّد احمد صاحب اینڈ کمپنی تو انگریزوں کی فوج کا ہراول دستہ ہے، اُنھوں نے محسوس کیا کہ اِس جمگھٹے کی جتنی بھی مدد کی جائے گی اُس کا فائدہ براہِ راست انگریزوں ہی کو پہنچے گا، کیونکہ سیّد احمد صاحب کی کامیابی انگریزوں کو ایک ہی جست میں ستلج سے کابل و قندھار تک پہنچا دے گی۔

٤۔ پانچ سو علماء و مشائخ نے پنجتار کے مقام پر جمع ہو کر اِن حضرات کو فہمائش کی کہ وہ [١] اپنے غیر اسلامی عقائد و نظریات ترک کر دیں، تاکہ مسلمان دل کھول کر اُن کی مدد کریں اور سکھوں سے بڑی آسانی کے ساتھ نبٹ سکیں، نیز [٢] انگریزوں کے آلۂ کار بننے سے باز آجائیں لیکن یہ دونوں باتیں نامنظور ہُوئیں۔

یار محمد خاں نے پیچھے ہٹنے کی جو وجہ بتائی اُسے اِسی اعلام کے اندر یُوں بیان کیا گیا ہے:

"اُس کافرِ رُوسیاہ (یار محمد خاں) کا عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہے۔ کہتا یہ ہے کہ کافرِ ملعون سے دوستی محض شعائرِ دین کی حفاظت کے واسطے ہے، مسلمانوں کے مقاصد اور جان و مال بچانے کے لیے ہے، یہ بھی مذہب اسلام کی

خدمت گزاری کا ایک طریقہ اور سنتِ سید الانام کے پاس و لحاظ کا ایک ذریعہ ہے۔ غرض یہ صریح مکر و فریب اور گمراہی اور اپنے عیب کو چھپانے کا حیلہ ہے۔ دین کے احکام کی پاسداری کا دعویٰ بھی خوب ہے یہ تو اللہ کا نہیں اُس کا اپنا دین ہے۔"[1]

وقت سے بڑا منصف کون ہے؟ ایک صدی بھی گزرنے نہیں پائی تھی کہ سید احمد صاحب کے متبعین کے فتوے، ایک ٹھینٹ مشرک، پکے بُت پرست، یعنی گاندھی جی کی جنبشِ لب کے ساتھ گردش کرنے لگ گئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد مسلمانوں کو ہنود کی دست بُرد سے بچانے اور اِسلامی اصولوں کے تحت زندگی بسر کرنے کی خاطر "پاکستان" کا نعرہ بلند ہُوا، تو ان حضرات نے سوراج (اکھنڈ بھارت) کی تائید اور مشرکینِ ہند کو اپنا اَن داتا بنائے رکھنے کی حمایت میں قیامِ پاکستان کی اتنی سر توڑ مخالفت کی جتنی ہنود کو بھی نصیب نہ ہو سکی۔ یار محمد خاں حاکمِ یاغستان کے بارے میں سید احمد صاحب کے اِس ریمارک کو سامنے رکھتے ہُوئے کیا فیصلہ ہے موصوف کے معتقدین کا، کیا فیصلہ ہے کانگرسی اور زُنّار دوست، گاندھوی علماء کے بارے میں؟ اِن کے متعلق دیوبندی مولوی ظفر علی خاں تو یُوں مرثیہ خواں تھے:

رسول اللہ کے گھر میں یہ کیسا انقلاب آیا
کہ گاندھی جی کی کٹیا عالمانِ دیں کا ڈیرا ہے

بہر حال، یار محمد خاں کے بارے میں سید احمد صاحب نے جو فیصلہ کر لیا تھا، اُنھیں کی زبانی ملاحظہ ہو:

"سردار مذکور کی منافقت اِس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ہر عقلمند، ہوشیار، تجربہ کار کی رائے میں جہاد قائم رکھنا بغیر ایسے فتنہ برپا کرنے والوں کے استیصال کے ممکن نہیں۔ اِن حالات کے تحت لکھا جاتا ہے کہ اُس کے ساتھ قتل و جدال اور اُس کی بیخ کنی بھی ایک صورت ہے ازالۂ فساد کی۔ اُن لوگوں کی

---

[1] سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۳۴-۳۵

> توہین اور بیخ کنی اقامتِ جہاد میں شامل ہے۔ جہاد کے نفاذ اور اُن کے مقابلہ کے لیے ہم مامور ہیں اور اُن سے ہاتھاپائی کرنا ہمارے لیے باعثِ ثواب ہے۔ ہماری فوج کا ہر مبارز غازی ہے اور اللہ تعالیٰ کی فوج کا سپاہی ہے اور اُن کے لشکر کا مقتول گنہگار ہے اور ہمارا شہید اللہ کے پاس مقبول اور مومن ہے اور اُن کا مقتول مردود و ملعون۔ اور یہ حکم اسلام کے چاروں مقررہ اصولوں یعنی کتاب و سنّت، اجماع اور قیاس سے ثابت ہے۔ لیکن قرآن کی رُو سے پھر یہ کہتا ہوں کہ سردار مذکور منافقین کی ایک قسم میں شامل ہے اور اُن کے قتال پر خلاقِ جہاں جلّ شانہٗ کی آیات بلحاظ استحقاق ناطق ہیں۔ بلا شبہ وُہ منافقین میں سے ہے۔ کفّار بد انجام کے ساتھ موالات اور بدبخت فاجروں سے بھائی چارہ وُہ اِس حد تک رکھتا ہے کہ اُس کے آثار روزِ روشن کی طرح ظاہر ہیں اور اُن سے باہم دوستی ہی نفاق کی علامت ہے۔"[1]

کیا سیّد احمد صاحب کے اِسی فیصلے کی رُو سے ہندوؤں سے نہ صرف موالات کرنے والے بلکہ اُن کے بندۂ بے دام بننے والے حضرات بھی منافق قرار پائیں گے یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو اُس کی وجہ؟ کیا سید احمد صاحب کے متبعین پر قرآن و حدیث اور اجماع و قیاس کا کوئی حکم اثر انداز ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا؟ تعصب کو بالائے طاق رکھتے ہُوئے غور تو فرمائیے کہ سکھوں سے دوستی رکھنے کا یار محمد خاں پر الزام لگا کر اُسے منافق بتایا گیا اور اُس پر فوج کشی کی گئی۔ اُسے شکست ہُوئی تو اُس کی ساری فوج کو لشکرِ کفّار سمجھ کر اُن کے جنگی قیدیوں کو غلام بنایا گیا، اُن کا مال، غنیمت کا مال شمار ہُوا۔ لیکن جب یہی خارجی ٹولہ گاندھی صاحب کا علی الاعلان نعلین بردار، ہنود کا یار و غمخوار اور مسلمانوں سے بیزار و برسرِ پیکار تھا کیا اُن دنوں مسلمانوں کو بھی یہ حق حاصل تھا یا نہیں کہ وُہ سیّد احمد صاحب کے اِن فتووں پر عمل کرتے ہُوئے ہندو نواز حضرات کو منافق اور واجب القتل قرار دے کر، قرآن و حدیث

---

[1] سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۳۵۔۳۶

اور اجماع و قیاس کے بناتے ہُوئے اصولوں پر عمل کرنا شروع کر دیتے، جس طرح کہ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی نے یار محمد خاں حاکمِ یاغستان کے خلاف عمل کرکے دکھایا تھا؟ داد دیجیے مسلمانوں کے حوصلے کی اور فیصلہ کیجیے کہ کون مفسد ہے اور مصلح کون ہے؟

سید احمد صاحب نے اپنے فتوے پر عمل کیا۔ یار محمد خاں پر لشکر کشی کی اور اُس سے شکست ہُوئی۔ اِس سلسلے میں مولوی عاشق الٰہی میرٹھی کی مندرجہ ذیل وضاحت بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ موصوف لکھتے ہیں:

> ”مولوی عبدالحیؒ صاحب لکھنوی، مولوی محمد اسمٰعیل صاحب دہلوی اور مولوی محمد حسن صاحب رامپوری بھی ہمراہ تھے۔ یہ سب حضرات سید صاحب کے ہمراہ جہاد میں شریک تھے۔ سیّد صاحب نے پہلا جہاد مسمّٰی یار محمد خاں حاکمِ یاغستان سے کیا۔“[1]

یہ تو میرٹھی صاحب کی تاریخ دانی اور صحتِ بیانی کا ادنیٰ کرشمہ ہے کہ کہاں مولوی عبدالحی صاحب لکھنوی اور کہاں سید احمد صاحب کی یہ رزم آرائیاں؟ لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ موصوف کے نزدیک سیّد صاحب کا پہلا جہاد یہی تھا کیونکہ اِس میں مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگے گئے تھے، اِس سے پہلے جو لڑائیاں ہُوئیں، شاید وہ موصوف کے نزدیک جہاد نہ تھیں۔

خادیخان حاکمِ ہنڈ اور یار محمد خاں حاکمِ یاغستان اور دیگر خوانین و رؤسا کو کافر و مشرک اور مرتد واجب القتل ٹھہرانے کے سلسلے میں مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا عجیب و غریب اور سنسنی خیز بیان ملاحظہ ہو:

> ”اِس موقع پر ذرا تامل سے کام لینا چاہیے کیونکہ یہاں دو معاملے درپیش ہیں، ایک تو مفسدوں اور مخالفوں کے ارتداد کا ثابت کرنا اور قتل و خون کے جواز کی صورت نکالنا اور اُن کے اموال کو جائز قرار دینا، اس بات سے

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی: مولوی: تذکرۃ الرشید جلد دوم، ص ۲۷۰

قطع نظر کہ وُہ اُن کے ارتداد پر یا اُن کی بغاوت پر مبنی ہے۔ دُوسرے یہ کہ اِس کا آیا کوئی سبب ہے یا کچھ اَور ہے، جبکہ بعض اشخاص کے مقابلہ میں اُن کا مرتد ہونا ثابت ہو چکا ہے اور بعض کے متعلق بغاوت یا اِس کا کوئی اور سبب۔ اگرچہ کہ پہلا طریقہ ہمارے پاس وہی یعنی تحقیق اور تفتیش کرنا ہے کیونکہ ہم ان فتنہ پردازوں کو فی الحقیقت مرتدوں بلکہ اصل کافروں میں شمار کرتے ہیں اور اِن کو اہلِ کتاب کے مثل جانتے ہیں۔" [1]

مسلمانوں کے قتل وخون اور اُن کے اموال کا جواز نکال کر دہلوی صاحب موصوف نے پیر شاہ علی کو یُوں مطلع کیا تھا:

"جنابِ والا (سید احمد صاحب) کی اطاعت تمام مسلمانوں پر لازم ہُوئی۔ جو شخص جناب والا کی امامت کو ابتداء میں قبول نہ کرے یا قبول کرنے کے بعد اِس سے انکار کر دے، تو یہ سمجھ لیجیے کہ وہ باغی، مکّار اور فریبی ہے۔ اُس کا قتل کرنا کافروں کے قتل کی طرح عین جہاد ہے اَور اُس کی ہتک کرنا تمام فساد کرنے والوں کی ہتک کرنے کے مماثل ہے اور پروردگار کی عین مرضی پر مبنی ہے۔ اِن اشخاص کی مثال حدیثِ متواتر کی رُو سے کتّوں کی سی ہے اور یہ تمام ملعون شریر النفس ہیں۔ اِس عاجز کا مذہب اِس معاملہ میں یہی ہے۔ پس معترضین کے جوابات اِس خصوص میں اِس عاجز کے پاس تو اُن کو تلوار کے گھاٹ اتارنا ہے، نہ کہ تحریر اور تقریر ہے۔" [2]

سیّد صاحب کے سوانح نگار مولوی ابوالحسن علی ندوی نے دہلوی صاحب کا یہ فتوٰی یُوں ادیبانہ رنگ میں نقل کیا ہے:

"پس آپ (سید احمد صاحب) کی اطاعت تمام مسلمانوں پر واجب ہُوئی۔ جو

---

[1] سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوباتِ سید احمد شہید، ص ۲۴۱

[2] ایضاً: ص ۱۰۵

آپ کی امامت سرے سے تسلیم ہی نہ کرے یا تسلیم کرنے سے انکار کر دے ، وُہ باغی مستحل الدم ہے اور اُس کا قتل کفار کے قتل کی طرح عین جہاد اور اُس کی بے عزّتی تمام اہلِ فساد کی طرح خدا کی عین مرضی ہے۔ اِس لیے کہ ایسے لوگ بحکمِ احادیثِ متواترہ ، کلاب النار اور ملعونین اشرار ہیں۔ اِس مسئلے میں اِس ضعیف کا یہی مذہب ہے اور معترضین کے اعتراضات کا جواب تلوار ہے نہ کہ تحریر و تقریر۔"[1]

مولوی محبوب علی صاحب بھی مسلمانوں کے کفر پر مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور دُوسرے وہابی حضرات کی طرح متفق تھے۔ موصوف نے فتوٰی بھی جاری کیا تھا ، جس کا خلاصہ مرزا حیرت دہلوی نے یُوں نقل کیا ہے :

"سکھوں سے زیادہ اِن کلمہ گو کافروں پر جہاد فرض ہے۔"[2]

وہابی حضرات کی طرف سے یار محمد خاں پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وُہ اپنی فوجوں کے ساتھ جنگِ شیدو میں شامل ہُوا۔ اپنے بھائیوں اور دیگر خوانین کو بھی ساتھ لایا لیکن تماشا دیکھتا رہا ، لڑائی میں عملاً کوئی حصّہ نہیں لیا اور اِس فعل کو اُس کی غدّاری پر محمول کیا جاتا ہے ، مثلاً غلام رسول مہر لکھتے ہیں :

"اِس مدّت (دورانِ جنگ) میں یار محمد خاں اپنی سپاہ کے ساتھ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ نہ یورش میں شریک ہُوا ، نہ لڑائی میں حصّہ لیا۔"[3]

سید احمد صاحب کے جملہ سوانح نگار وضاحت کرتے ہیں کہ یار محمد خاں جنگِ شیدو کے دوران اُن کے مجاہدوں کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گیا تھا اور جملہ وہابی حضرات کا یہی فیصلہ ہے کہ یار محمد خاں کا یہ اقدام اُس کی منافقت ، سِکھ دوستی ، مسلمان دشمنی اور غدّاری ہے لیکن اِن حضرات کی خدمت میں ہماری ایک دردمندانہ التماس ہے کہ فیصلہ تو آپ صادر فرما چکے لیکن

---

[1] ابوالحسن علی ندوی ، مولوی : سیرت سیّد احمد شہید ، جلد اول ، ص ۴۰۵

[2] حیرت دہلوی مرزا : حیاتِ طیبہ ، مطبوعہ لاہور ، ص ۲۱۸

[3] غلام رسول مہر : سیّد احمد شہید ، مطبوعہ لاہور ، ص ۳۷۰

اگر نظرثانی کی گنجائش باقی ہو، تو اپنے ہی مرزا حیرت دہلوی کا یہ بیان ملاحظہ فرمایئے:

"مولانا شہید (اسمٰعیل دہلوی) نے پہلے سکھوں کے خونخوار حملہ کو روکا مگر جب دیکھا کہ سید صاحب تو بیہوش پڑے ہوئے ہیں اور اُن کا ہاتھی جنبش نہیں کھاتا اور وہ عنقریب سکھوں کے قبضہ میں آنے کو ہیں۔ آپ نے میدان سکھوں کے ہاتھ سونپ کے سید صاحب کو سنبھالا اور بمشکل کئی آدمیوں کی مدد سے آپ گھوڑے پر بٹھا کے صاف میدانِ جنگ سے نکل آئے۔ جب مجاہدین نے سید صاحب اور مولانا شہید کو اپنے میں نہ پایا، اُن کے پیر بھی اُکھڑ گئے۔ نہ کوئی کمانڈر تھا، نہ اُنھیں کوئی خالد جیسا لڑانے والا اور نہ کوئی مثنیٰ جیسا حملہ آوروں کے پنجہ سے نکالنے والا تھا۔ جدھر اُن کا سینگ سمایا سراسیمہ ہو کے بھاگے۔ سکھوں نے تعاقب کیا اور مظلوم مسلمانوں کو نہایت بے بسی کی حالت میں قتل کیا۔ اُن کا سامان لُٹ رہا تھا اور اُن کی جانیں ضائع ہو رہی تھیں۔ اِدھر سید صاحب کے لینے کے دینے پڑ رہے تھے اور اُدھر مجاہدین کی جانوں پر بن رہی تھی۔ بہت سے مسلمان سکھوں نے قید کر کے لاہور روانہ کیے جہاں وُہ نہایت بے رحمی سے قتل کیے گئے۔"[1]

جناب غلام رسول مہر نے اِس لڑائی کے بارے میں ابتدائی فتح کی وضاحت بھی یُوں فرمائی ہے:

"جو سکھ نالے کے مورچے چھوڑ کر بھاگے تھے وُہ پیچھے ہٹ کر ایک اور جگہ اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔ سمہ کے غازیوں نے اِس اوٹ پر بھی ہلّہ بول دیا اور دشمن کو جاروب کی طرح صاف کرتے ہوئے سکھ لشکر گاہ کی سنگھر کے پاس پہنچ گئے۔ اِس اثنا میں گودڑی شہزادہ اپنے مجاہدوں کو لے کر گاؤں سے نکلا اور ہر رکاوٹ بہ زور ہٹاتا ہُوا سکھ لشکر گاہ میں گھُس گیا۔ غازیانِ سمہ

---

[1] حیرت دہلوی مرزا؛ حیاتِ طیبہ، ص ۲۱۴-۲۱۵

> اور گودڑی شہزادے کی یورش نے سکھوں میں ہل چل مچا دی اور اُن کی توپیں بھی بند ہو گئیں۔ اب نظر بہ ظاہر اسلامیوں کی فتح میں شبہ باقی نہیں رہا تھا، بلکہ ایک شخص نے سید صاحب کو فتح کی مبارک باد بھی دے دی۔"[1]

لیکن یہاں یہ بات بھی تو جائے غور ہے کہ جس لشکر کی حالت یہ دیکھی جا رہی ہے کہ اُس کا سپہ سالار تیمارداری کرتا پھر رہا ہے۔ یہ نہیں کیا کہ سید صاحب کو بعض اشخاص کے ذریعے کسی محفوظ مقام پر پہنچا کر ہزاروں مسلمانوں کی جانوں کا خیال کرتے اور لشکر کو جنگی تدابیر کے مطابق دشمن سے لڑاتے بلکہ پیر و مرشد کو لے کر میدانِ جنگ سے فرار ہو گئے اور ہزاروں مسلمانوں کو جنگ کی بھٹی میں جھونک گئے، موت کے منہ میں ڈال دیا۔ کیا اِس مزے کی سپہ سالاری اور ایسی قیادت رُوئے زمین پر کہیں اور بھی نظر آتی ہے؟

اِس کے باوجود یہ حضرات بھگوڑے اور مسلمانوں کے بدخواہ نہیں بلکہ اِس ڈوبتی کشتی کے ناخدا ہی رہے لیکن جن حضرات نے اِن کی ملائیت کا کرشمہ اور جنگی سُوجھ بُوجھ کا بچشمِ خود معائنہ کر کے اپنے ساتھی مسلمانوں کو بچانے کی تدبیر کی وہ غدار، باغی، منافق، مرتد اور اصل کافر قرار پا گئے۔ کیا سپہ سالار کے بھاگ جانے کے بعد کسی فوجی یا اُس جنگ میں حصہ لینے والوں میں سے کسی جان بچانے والے کو از رُوئے شرع سپہ سالار سے زیادہ ملزم یا گناہگار ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ غضب تو یہ ہے کہ بھاگتے وقت کسی کو اپنا قائم مقام بھی مقرر نہیں کیا۔ سرداروں کی کوئی مجلسِ مشورہ بھی چند منٹ کے لیے نہ بلائی گئی کہ صورتِ حال سے کس طرح نبٹا جائے گا۔ بس خرابی نظر آئی تو یار محمد خاں کی، کہ اُس نے اپنے ساتھیوں کو بچایا کیوں؟ گاجر مُولی کی طرح سکھوں کے ہاتھوں کٹوا کر برطانوی امیر المومنین سے خوشنودی کا سرٹیفکیٹ کیوں حاصل نہ کیا؟ بہرحال اِسی جُرم کی سزا یار محمد خاں کو یہ ملی کہ جنگِ زیدہ میں شکست کھائی اور ستمبر ۱۸۲۹ء میں اِن حضرات کے ہاتھوں قتل کیا گیا۔ ہنڈ کے سردار خادی خاں کو یار محمد خاں سے بھی پہلے اگست ۱۸۲۹ء میں اِن کے قلعے کے اندر شہید کر دیا تھا۔ حالانکہ خادی خاں تو حضرت آخون صاحب کا

---

[1] غلام رسول مہر، سید احمد شہید، ص ۳۷۰، ۳۷۱

مرید اور سچا مسلمان تھا۔ لیکن پیر و مرشد نے ان حضرات کی خارجیت کو بھانپ لیا تھا، پہلے فہمائش کی، باز نہ آئے تو تعاون سے ہاتھ کھینچ لیا اور خادی خان کو بھی علیحدگی کا حکم دیا۔ بانکے مجاہدوں نے حقیقی اسلام قبول کرنے کے بجائے خادی خان کو بھی موت کے گھاٹ اتار کر جشنِ فتح منا لیا۔

خادی خان سردارِ ہنڈ کو ان حضرات نے کس درجے کا کافر سمجھا، یہ واقعات کی روشنی میں ملاحظہ ہو:

"میں (مولانا اسمٰعیل دہلوی) یہ کہتا ہوں کہ خادیخان نے امیر المومنین کے ہاتھ پر اعلان کے بعد بیعت کی تھی کیونکہ وہ صاحب ممدوح کی امامت سے منحرف ہو گیا ہے اور اپنے محفوظ مکان پر، جس سے مراد قلعہ ہنڈ ہے بھروسہ کیا اور کافروں سے امداد طلب کر کے حضرت امام کی مخالفت پر کمر باندھ لی، اس لیے حضرت موصوف نے اس کو کیفرِ کردار کو پہنچایا اور اس کا مال تقسیم کر دیا، بلکہ اس کے ہتھیاروں اور گھوڑوں کو بھی ضرورت کے وقت استعمال فرمایا اور اس کے دوسرے مال کو ضبط کر کے حفاظت کی خاطر مجاہدین پر تقسیم فرما دیا۔" [1]

یار محمد خاں حاکمِ باغستان، اس کے ساتھیوں اور ان کے اموال کے بارے میں موصوف کا فتویٰ یہ تھا، جس پر ان حضرات نے عمل کر کے دُرّانیوں کے سینوں میں خنجر گھونپ دیئے تھے:

"یار محمد خاں بلا شک وشبہ اس معاملہ میں ظلم و تعدی کا رہبر تھا۔ ایسے رہبر کا قتل اور اُس کا مال ضبط کرنا بلکہ اس ظالم رہبر کی فوج کا قتلِ عام اور اس کی فوج کے تمام مال پر ہر قسم کا تصرف کرنا، یعنی اُس کی فروخت اور تقسیم حسبِ شرع جائز ہے۔" [2]

---

[1] سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۲۴۴

[2] ایضاً: ص ۲۴۵

ہر سمجھدار آدمی کے ذہن میں یہاں یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ سید احمد صاحب جب دُور دراز کا سفر کر کے وہاں پہنچے تو آپس میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں اُنھیں دُور کرنے کی مخلصانہ کوشش کیوں نہ کی گئی اور حالات پر قابو پا کر اتفاق و اتحاد کی فضا کیوں پیدا نہ کی گئی؟ یا خوانین و رؤسا ہی بدنیت تھے کہ وُہ کسی طرح اتحاد پر آمادہ نہیں ہوتے تھے، یا اُن کی کوئی فاسد غرض تھی؟ اِس سلسلے میں خود سید صاحب کا یہ ارشاد قابلِ غور ہے:

> ”میں نے ہرگز ہرگز منافقوں کے ساتھ کوئی مصالحت نہیں کی ہے اور نہ کبھی اِن سے موافقت کی کوئی راہ نکالی ہے۔“ [1]

خادی خان اور یار محمد خان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا، اُس نے نواحِ پشاور کے عام مسلمانوں کے کان بھی کھول دیے اور وُہ سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے کہ کون سی بُری گھڑی میں اِس بلائے ناگہانی کو اپنے گھر میں بٹھا لیا۔ لیکن خانہ جنگی سے بچتے ہُوئے نباہ کرتے چلے گئے۔ صرف سلطان محمد خان نے ایک دفعہ اِن سے ٹکر لی مگر شکست کھائی۔ علمائے سرحد کے نام اپنے مکتوب میں سیّد احمد صاحب نے اپنی جماعت کے متعلق بعض شکایات یُوں کی ہیں:

> ”اِن بہتان لگانے والوں کے الزامات کے منجملہ ایک الزام یہ ہے کہ نہ صرف اِس فقیر کو بلکہ مجاہدین کے گروہ کو وہ ملحد و زندیق کہتے ہیں۔ یعنی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اِن مسافروں کی جماعت کا کوئی مذہب ہی نہیں ہے اور نہ اِن کا کوئی مسلک ہے بلکہ یہ لوگ اپنی نفسانی خواہشات کے غلام ہیں اور کسی نہ کسی طرح لذتِ جسمانی کے جویاں رہتے ہیں، خواہ وُہ کتاب اللہ کے مطابق ہو یا نہ ہو۔“ [2]

> ”اُن افترا پردازوں کا یہ اتہام بھی ہے کہ میں ظلم و ستم ڈھاتا ہوں کہ یہ فقیر بلاوجہ مسلمان کی جان و مال پر دست درازی کرتا ہے اور اِس خصوص

---

[1] سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۲۰۱

[2] ایضاً: ص ۲۲۶

ہیں چرب زبانی اور حیلہ سازی سے کام لیتا ہے۔ سبحانک ھٰذا بہتان عظیم۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو کچھ تنبیہہ اَور سزا اُس بادشاہِ جبار کی طرف سے اِس ذرّہ ناچیز کے ہاتھ سے بعض مرتدوں، اشرار اور بدخصلت منافقوں کو پہنچی ہے، اُن کو مَیں اپنے لیے بہت بڑی سعادت سمجھتا ہُوں اور اپنی مقبولیت کے آثار اپنے میں پاتا ہُوں بلکہ دین کی اعانت کی غیرت اور دشمنوں کی اہانت کی طرف رغبت تو ایمان کا لوازمہ ہے۔"[1]

"جو کچھ خدائے قادرِ مطلق کی جانب سے اِس فقیر کے ذریعہ خادی خان اور یار محمد خان کی داروگیر ہُوئی ہے، اُس کی وجہ سے اِن مجاہدین اور مہاجرین کو ظلم و ستم کرنے کا ملزم سمجھتے ہیں اور اُن باغیوں اور فتنہ پردازوں کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔"[2]

مذکورہ اعلانات کے تحت علمائے اہلسنّت اکٹھے ہو کر آئے۔ اِن حضرات سے بالمشافہ گفتگو کی، مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے عقائد کو غیر اسلامی ثابت کر کے اُنھیں توبہ پر مجبور کیا۔ موصوف نے دفع الوقتی کے لیے توبہ کر لی لیکن بعد میں پرنالہ اُسی جگہ رکھا۔ اِس مناظرے کا تذکرہ محمد جعفر تھانیسری نے یُوں کیا ہے:

"صدہا مولوی اور عالم، کابل، قندھار اور سمرقند اور ماوراالنہر وغیرہ کے جمع ہو کر بمقام پنجتار مسئلہ وجوب تقلید میں آپ سے بحث کرنے کو آئے تھے چنانچہ ایک ہفتہ تک یہ بحث رہی۔ آخر کار وہ سب مولوی لاجواب ہو کر عدمِ وجوب تقلید شخصی کے قائل ہو گئے اور کہنے لگے کہ یہ شخص تو قرآن و حدیث کا حافظ اور محقق اور اِس میں غوطہ لگائے ہُوئے ہے، اِس سے کون جیت سکتا ہے۔ لیکن اِس فتح یابی کے باوجود سیّد صاحب نے مولوی محمد اسمٰعیل

---

[1] سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۲۲۷

[2] ایضاً: ص ۲۲۸

صاحب سے فرمایا کہ یہ وقت ترکِ تقلید کا نہیں ہے۔ ہم کو اِس وقت کفار سے جہاد کرنا ہے، تقلید کا جھگڑا اُٹھا کر اپنے اندر تفرقہ ڈالنا بہتر نہیں ہے۔"[1]

سیّد احمد صاحب کی فہمائش بجا اور برموقع لیکن مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اِس مناظرے کا جو فیصلہ سُنایا ہے وُہ سمجھ بُوجھ سے بالاتر ہے۔ اگر وُہ صدہا علماء لاجواب ہو گئے ہوتے تو یقیناً اُن میں سے کتنے ہی دہلوی صاحب کی طرح منکرِ تقلید ہو جاتے۔ ہزاروں دُرّانی اور پٹھان وہابیت قبول کر لیتے، اصلی اختلاف مٹ جاتا اور جنگ و جدل والا معاملہ ہی کچھ اور ہوتا لیکن ایسا نہیں ہُوا۔ اِس سے معلوم یہی ہوتا ہے کہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی مغلوب اور تائب ہُوئے۔ توبہ کرنا دفع الوقتی تھی ورنہ مذہب اہلسنّت قبول کرنا مرتے وقت تک بھی منظور نہ ہُوا تھا۔ اِس کے ساتھ ہی دُرّانیوں اور پٹھانوں نے ہرگز ہرگز اِن کی خارجیت و وہابیت کو قبول نہ کیا بلکہ نفرت کی نگاہوں سے ہی دیکھتے رہے۔ اِسی لیے جناب ابوالاعلیٰ مودودی کو یُوں مرثیہ خوانی کرنا پڑی:

> "یہی وجہ ہے کہ آج صوبہ سرحد میں اِن دونوں شہیدوں کا اور اِن کے کام کا کوئی اثر ڈھونڈے نہیں ملتا، حتّٰی کہ وہاں کے لوگ اِن کے ناموں سے اب کچھ اُردو لٹریچر کی بدولت واقف ہونے لگے ہیں۔"[2]

غیرتِ ایمانی کچھ عجیب ہی خدائی عطیہ ہے، حالانکہ سید احمد صاحب نے خادی خان کے وارثوں کو یُوں تحریص دلائی تھی:

> "نیز اُس (خادی خان) کے ورثا کو بھی اِس کی ترغیب دی، اگر وُہ آئیں اور اطاعت قبول کر لیں، تاکہ تمھارے مورث کا مال تم کو دے دیا جائے لیکن اُن اشقیاء نے امام کی اطاعت پر ہرگز سرِ تسلیم خم نہ کیا بلکہ اُنھوں نے بغاوت اور فساد کے معاملہ میں اُن باغیوں کی تقلید کی۔"[3]

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیاتِ سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۳۱۱

[2] سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۲۴۴

[3] ایضاً: ص ۲۴۴

یار محمد خاں کے ورثا، ساتھیوں اور فوجیوں کو تحریص دلانے میں کوئی کمی نہ کی، لیکن یہ جانتے ہوئے کہ اُن کے غیر اسلامی نظریات نہ صرف عوام بلکہ اجلّہ علمائے کرام تک پر واضح ہو چکے ہیں اور وہ سب اِنھیں خارجی المذہب شمار کرتے ہیں۔ اِس کے باوجود مذہب اہلسنت قبول کرنے یا مصلحت کی کوئی راہ تلاش کرنے کی بجائے سیاسی رشوت ہر کسی کے سامنے پیش کرنے لگے۔ چنانچہ سیّد صاحب نے دُرّانیوں کو اپنے خط میں یوں لکھا:

"بعض کلمہ گو منافقین نے کفّار کی محبّت اور خیر خواہی کو اپنے منافقت بھرے دل میں جگہ دی ہے اور تمام مسلمانوں کی بدخواہی کو عام طور پر اور خاص کر بڑے بڑے علماء کے دِل میں مہاجرین اور مجاہدین کے حق میں اِس قدر عداوت پیدا کر دی ہے کہ اُن کی نقصان رسانی کافروں کے نقصان پہنچانے کے مقابلہ میں بہت زائد اور بے انتہا ہے اور اُن کی عداوت اِس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ایمان والوں کو جہاد قائم رکھنے سے باز رکھا ہے۔ لہٰذا جس شخص کو اپنا ایمان عزیز ہے اور دین اسلام کو اپنا فخر سمجھتا ہے اور حضرت محمد رسول اللہ کو اپنا پیشوا جانتا ہے اور قیامت میں آنحضرت کی شفاعت کا امیدوار ہے، اُس پر لازم ہے کہ وُہ خود کو مجاہدین کی صف میں شریک کر دے اور غیرتِ ایمانی اور اسلامی حمایت کو کام میں لائے اور کافروں کی خیر خواہی اور منافقوں کا ساتھ دینا چھوڑ دے اور اپنے دل سے اِن دونوں بدبخت جماعتوں کی محبت کو نکال دے اور مجاہدین کے لشکر میں منسلک ہو جائے اور جو کچھ کافروں اور منافقوں کی رفاقت میں اُس کو دنیوی فائدہ حاصل ہُوا ہے اُس سے کہیں زائد مراتب اللہ تعالیٰ نے چاہا تو اُس کو حاصل ہوں گے اور دنیا و آخرت میں اُس کو بزرگی اور سرخروئی حاصل ہو گی۔ غرض جو شخص ایمان والوں کی شرکت کا ارادہ رکھتا ہے اُس پر لازم ہے کہ وُہ اس عاجز کو اِس سے اطلاع کر دے تاکہ صُورتِ حال کا جائزہ لے کر اُس کی گزر بسر کا تعیّن کر دیا جائے۔"[1]

---

[1] سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سیّد احمد شہید، ص ۲۱۵

پشاور اور اُس کے گرد و نواح کے مسلمانوں نے اِن حضرات کی موافقت سے منہ موڑ لیا، اُن کے نزدیک یہ اعلاءِ کلمۃ الحق کی خاطر نہیں بلکہ اپنی مہربان سرکار کی مملکت کی حدود کو وسیع کرنے آئے تھے، مجاہد نہیں بلکہ مفسد نظر آ رہے تھے، مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں بلکہ مسلم کشی کا ریکارڈ قائم کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا سید صاحب بھی علی الاعلان اُنھیں منافق اور واجب القتل قرار دے کر اُن کے استیصال کی کوششوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ اسی مقصد کی خاطر رئیسِ قلات خان خاناں خلجائی کے نام اپنے مکتوب میں سید احمد صاحب نے یُوں تحریر کیا تھا:

> "بالخصوص جہاد کے نفاذ اور بغاوت و فساد کے فرو کرنے کے متعلق نیز اور بھی محبت و خلوص کی باتیں جو آپ نے تحریر فرمائی ہیں اُن کو پڑھ کر دل کو بیحد سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہُوا...... اگر اُس طرف جناب اپنا فاتحانہ قدم اٹھائیں گے تو منافقین اور مفسدین فتنہ و فساد برپا کر دیں گے۔ لہٰذا نہایت مناسب اور مصلحت یہ ہے کہ ایسا کیا جائے کہ سب سے پہلے تو منافقوں کے استیصال کے متعلق انتہائی کوشش کی جائے اور جب جنابِ والا کے قرب و جوار کے علاقہ میں اِن بدکردار منافقین کا قصہ پاک ہو جائے تو پھر اطمینانِ خاطر اور دل جمعی کے ساتھ اصل مقصد کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔ اِس لیے مصلحتِ وقت یہی ہے کہ پہلے تو منافقین کے فتنہ و فساد کے دفعیہ کے لیے سخت کوشش فرمائیں۔
>
> اِن منافقین کے ساتھ جنگ کرنے اور فساد کو دُور کرنے کی تدابیر کے متعلق خود جنابِ والا خوب جانتے ہیں اور لشکر کشی اور کشور کشائی کے فن میں بھی آپ کو کمال مہارت حاصل ہے، لیکن میری رائے میں مصلحت یہ معلوم ہوتی ہے کہ گو آپ کا دل ہیبت و جلال کا مرکز ہے۔ آپ اِس بڑی مہم کے انجام دینے کے لیے بغیر کسی کی اعانت کے قدم نہ اٹھائیں۔ اگر منافقین کے استیصال میں جناب کی پیش قدمی سے فتنہ و فساد اور شورش کے بڑھ جانے کا اندیشہ نہیں ہے تو پھر کسی کی امداد کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی فوج اور قبیلہ کو جمع کر کے جنابِ والا خود غزنین کے نواح میں منافقین پر چھاپے مارنا شروع کر دیں اور اپنے ساتھیوں

میں سے بعض کو قبائل اور فوج کی کثیر تعداد کے ساتھ کابل کے اطراف مقرر فرمائیں تاکہ یہ بھی منافقین پر شب خون مار کر اُس مقام کو تاخت و تاراج کر دیں اور میں بھی اِدھر سے پشاور کے منافقوں کی طرف متوجہ ہوتا ہُوں۔ جب منافقین بدکار کی موجودگی سے وُہ مقام پاک ہو جائے تو میں جلال آباد پہنچ جاؤں گا اور اِسی طرح پھر وہاں سے کابل جاؤں گا۔ اِس طرح مردود منافقین جو پشاور سے قندھار تک پھیلے ہُوئے ہیں اُن کے پاؤں ایسے اُکھڑ جائیں گے اور ہر شخص جو اپنے خیال میں خود گرفتار رہے، بے دست و پا ہو کر آپس میں ایک دوسرے کی مدد نہیں کر سکے گا اور اُن کا باہم اتحاد اور اجتماع دشوار ہو جائے گا۔ اگر جنابِ والا اِس سلسلے میں اپنے استقلال کو شورش اور فساد کا باعث تصور فرمائیں اور یہ گمان ہو کہ دُرّانی قوم اپنی قومیت و ریاست باہمی کے اتحاد کی وجہ سے اپنے قبائل کے ساتھ جمع اور جناب سے مقابلہ پر متحد ہو جائے گی، تو پھر اِس بات کی ضرورت ہوگی کہ اُن کے سرداروں کو اپنے ساتھ شریک کر لیا جائے اور اربابِ سلطنت سے امداد بھی طلب کر لینی چاہیے۔"[۱]

ایک مسلمان حکمران کو دوسرے مسلمانوں کے خلاف کس جوش و جذبے سے ابھارا جا رہا ہے! مسلم کشی کا بھوت کس بُری طرح سوار ہے کہ خان قلات جو اِن حضرات کے ماڈرن اسلام سے بے خبر اور اِنھیں اسلام و مسلمین کا خیر خواہ سمجھ بیٹھا تھا۔ موصوف نے اِس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے اُس کی آنکھوں میں یُوں جھوٹے الہاموں اور تحریص کی دُھول جھونکی ہے:

"ہم پر لازم ہے کہ جان و مال، بھائی بندوں اور اوطان کی محبت کو پسِ پشت ڈال کر حق تعالیٰ کی رضا مندی کو اپنی ہمت کا قبلہ بنائیں اور دینِ متین کی فتح کی نیت سے پروردگارِ عالم کے کلمہ کی اشاعت کے لیے کمرِ ہمت باندھیں اور اُس کے لشکر میں شامل ہو کر معرکۂ جنگ و قتال میں خود کو دھکیل دیں۔ انشاء اللہ

---

[۱] سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۴۷، ۴۸

تعالیٰ اُس سلسلے میں بموجب کلامِ الٰہی جس کا وعدہ پکا ہے، فتوحات کے دروازے کھل جائیں گے اور اِن اشرار و کفّار منافقین کے بے شمار خزانوں، ملک و مال اور شہروں پر ضرور بالضرور قبضہ حاصل ہو جائے گا۔ لیکن اِن تمام دنیاوی چیزوں اور مادی منافع پر جہاد کا ہرگز دارومدار نہیں ہونا چاہیے، بلکہ جہاد کے لیے بلند ہمتی سے کام لینا چاہیے۔ پس جس وقت آپ اِس نیت پاک سے خود کو مجاہدین کی جماعت میں منسلک کر لیں گے تو بلاشبہ اللہ کے لشکر میں آپ کا شمار ہو گا اور اللہ کے سچّے وعدے کے مطابق فتح و نصرت حاصل ہو گی۔ اِس کے علاوہ عرض یہ ہے کہ اِس فقیر کو بارہا پردۂ غیب سے وارد ہونے والی روحانی باتوں اور ربانی الہام کے ذریعہ جہاد کے نافذ کرنے اور کفر و فساد کے دفعیہ کے لیے صاف اور صریح اشاروں کے ساتھ مامور کیا گیا ہے اور فتح و کامیابی کی سچی بشارتوں کی خبر دی گئی ہے اور چونکہ الہامی وعدے اُس بادشاہِ حقیقی کے کلام کے مطابق ہوا کرتے ہیں اِس لیے اِن کو ضرور مان لینا چاہیے اور اِن پر عمل کرنا چاہیے۔"[1]

یہ اعلان سیّد صاحب اور اُن کے متبعین نے الہام کے نام سے بارہا کیا۔ اِن الہاموں اور فتح کی بشارتوں کا جو انجام ہوا، وُہ سب پر ظاہر ہے کہ فتح و نصرت کے بجائے آپ کو شکست اور عبرت ناک ہزیمت کے سوا اور کچھ نصیب نہ ہو سکا۔ اوّل سے آخر تک سارے الہامات جھوٹے ثابت ہونے گئے۔ موصوف کے سچّے ہونے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ جملہ دعاوی و الہامات اور بزرگی و کرامات سے دست بردار ہو کر صاف طور پر اقرار کر لیا جائے کہ یہ الہامات خدا کی طرف سے نہیں بلکہ برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ہو رہے تھے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اِن حضرات کے لیے حقیقت کا تسلیم کر لینا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ کتنے ہی دعاوی و الہامات جھوٹے ثابت ہُوئے لیکن بزرگی پر حرف نہ آیا، مسلمانوں ہی کو کچلنے گئے تھے لیکن اُنھیں

---

[1] سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سیّد احمد شہید، ص ۴۹، ۵۰

مسیحائے قوم بنانا اور منوانا شروع کر دیا۔ چنانچہ اِسی منصوبے کے تحت سید احمد صاحب نے فولاد جنگ بہادر کے نام اپنے خط میں لکھا تھا:

"آپ اپنے ایک فاتح لشکر کو اِس طرف روانہ فرمائیں اور مجاہدین کی اعانت کے لیے کمرِ ہمت باندھ کر خزانہ کھول دیں تاکہ جنابِ والا کی شرکت پروردگارِ عالم کے دین کا پرچم بلند کرنے، کافروں اور اتہام لگانے والوں کا استیصال کرنے کے متعلق اچھی طرح منظرِ عام پر آجائے اور آیتِ کریمہ فضل اللّٰہ المجاھدین باموالھم وانفسھم علی القاعدین کی بے حد لذت اور مرتبہ آپ کو حاصل ہو جائے، جس طرح کہ اِس دنیا کی ریاست اور امارت میں بنی نوعِ انسان ممتاز ہیں، اِسی طرح جنتِ نعیم کے مدارجِ عالیہ اور مقامِ صدق پر اُس صاحبِ بخشش وکرم کے سایہ میں آپ کو فخر و ناز ہو۔ اللّٰہ نے چاہا تو کلامِ الٰہی کے سچے وعدوں کے مطابق کہ فرمایا ہے" کان حقا علینا نصرالمومنین ـــــ وان تنصرا اللّٰہ ینصرکم ویثبت اقدامکم نیز غیبی اشاروں اور بشارتوں کے بموجب، جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں، جس کی اِس فقیر کو بشارت دی گئی ہے۔ عنقریب فتح ونصرت ظہور پذیر ہو گی اور بے شمار خزانے ذلیل وخوار کافروں (مسلمانوں) کے شہروں سے لے کر دریائے ستلج تک نیک لوگوں کے قبضہ میں آجائیں گے۔"[1]

یار محمد خاں کے معتمد ومتوسل یعنی احمد خاں ابن لشکر خاں کے نام سید صاحب نے اپنے مکتوب میں لکھا ہے:

"جب تک اِن (مسلمانوں) کا ملیا میٹ کرنا متحقق نہ ہو اُس وقت تک کافروں اور دشمنوں کے خلاف جہاد کی کوئی صورت نہیں اِس بنا پر اِس عاجز، خاکسار، ذرۂ بے مقدار نے چند نیک مہاجرین کے ساتھ بموجب حکمِ خداوندی یا ایہا

---

[1] سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۲۱۲، ۲۱۳

النبی جاھد الکفار و المنافقین الخ جو قابلِ تعمیل ہے ہم نے کمر باندھ لی ہے اور موضع پنجتار تک پہنچ گئے۔ اللہ نے چاہا تو اُس بادشاہ جبار اور مالک و قہار کے دبدبہ و قوت سے اِن تمام بدکردار منافقوں کی شان و شوکت آسانی سے تھوڑے ہی عرصہ میں خاک میں مل جائے گی انشاء اللہ آپ اُس قادرِ مطلق کی قدرت کا تماشا ملاحظہ فرمائیں اور منافقوں کے ساتھ رواداری کو پروردگارِ عالم کی خاطر اور رضا جوئی پر قربان کر دیں۔ جو کچھ اِس زمانہ کے سردار دنیوی فائدوں کے حاصل کرنے کی توقع رکھتے ہیں اُس سے دُگنی توقع اُس شہنشاہِ حقیقی سے، جو اِس جہان کا خالق ہے، توقع رکھنی چاہیے۔ بارگاہِ الٰہی سے قوی امید ہے کہ آپ دِل جمعی کے ساتھ یکسو ہو کر دینِ متین کے معاونین میں منسلک ہو جائیں گے تو آپ کو دنیاوی فوائد بھی اِس قدر حاصل ہوں گے جو وہم و خیال میں بھی نہیں آ سکتے۔"[1]

جہاں مقصود اعلاءِ کلمۃ الحق ہوتا ہے وہاں مادّی ترغیب و تحریص کا ایسا سیاسی جال بچھانے کی ہرگز کوشش نہیں کی جاتی۔ سید صاحب نے جس قسم کا جال مسلمانوں کے خلاف بچھایا اور خود مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو قتل کروانے کی کوشش کرتے رہے اور اِس طرح ترغیب و تشویقِ دنیائے دنی سے اپنی حمایت کا دم بھرنے والوں کو مسلم کشی پر ابھارنے کی نظیر محمد بن عبدالوہاب نجدی کے علاوہ اور کہیں نظر نہیں آتی۔ چنانچہ نجدی صاحب نے امیرِ عیینہ کو اپنی تحریکِ وہابیت میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہوئے کہا تھا:

"اگر تم لا الہ الا اللہ کی امداد کے لیے آمادہ ہو جاؤ تو میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمھیں غالب کرے گا اور نجد اور اہلِ نجد کی باگ تمھارے ہاتھ میں ہو گی۔"[2]

اِسی طرح محمد بن سعود امیرِ درعیہ کو تحریکِ وہابیت کا معاونِ کار بننے کی دعوت دی تو امیر

---

[1] سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوباتِ سید احمد شہید، ص ١٤١

[2] مسعود عالم ندوی: محمد بن عبدالوہاب نجدی، ص ٣٣

مذکور نے دو شرطیں عائد کیں۔ پہلی شرط یہ تھی کہ فتح کے بعد آپ ہمارا ساتھ نہ چھوڑنا اور دوسری شرط یہ تھی کہ اہلِ درعیہ سے وُہ فصل کے وقت کچھ محصول لیا کرتے تھے اُس سے نہ روکا جائے۔ ابن عبدالوہاب نے دونوں شرطیں منظور کیں۔ دُوسری شرط کو اُس نے جن لفظوں میں منظور کیا اُن کا ترجمہ یُوں منقول ہے:

> ”رہی دوسری شرط، سو اِنشاء اللہ تمھیں فتوحات اور غنیمتوں میں اِتنا کچھ مل جائیگا کہ اُس خراج کا خیال بھی دل میں نہ آئے گا۔“ [1]

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی یہ تحریکِ جہاد وہابیت کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اُسی کے زیرِ اثر شروع کی گئی تھی۔ اِن حضرات نے بھی مسلمانوں کو مشرک اور منافق ٹھہرا کر اُنھیں مستحل الدم قرار دیا، اُن کے قتل و قتال سے لطف و لذت حاصل کرتے رہے، اُن کے مال کو غنیمت کا مال سمجھ کر لوٹتے رہے، جس طرح اِن سے پہلے محمد بن عبدالوہاب نجدی کرتا رہا تھا۔ اگر اِن برطانوی مجاہدوں سے کوئی کہتا کہ آپ مسلمانوں کو کیوں قتل کر رہے ہیں تو جواب یہی دیا جاتا کہ ہم تو مشرکوں اور منافقوں کو قتل کرتے ہیں، مسلمانوں کی جان و مال میں تو ہم ذرا بھی دست اندازی کرنا گناہِ عظیم سمجھتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں سے اُن کی مراد اُن کے ہم عقیدہ خارجی لوگ تھے یا وُہ حضرات جو اس جنگ جوئی میں اُن کے معاون و مددگار بن گئے تھے۔ ابن عبدالوہاب پر جب مسلم کشی کا الزام لگایا جاتا تھا، تو وہ بھی یہی جواب دیا کرتا تھا۔ مخدومی پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نے ہندی و نجدی خوارج کے اِس مفسدانہ طرزِ عمل کے بارے میں کیسی پتے کی بات کہی ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

> ”اگر مسلمانوں کے اعمال کا اِتنی سختی سے محاسبہ کیا جائے تو پھر ہم میں کتنے لوگ ہیں جو زندہ رہنے کے قابل ہیں؟ شاید لاکھوں میں معدودے چند ہوں تو ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ تاریخِ اسلام میں اِس قسم کے بہت سے رُوح فرسا مناظر سامنے آتے ہیں جبکہ مسلمانوں نے آپس میں ایک دُوسرے کا خون بہایا ہے۔“

---

[1] محمد مسعود احمد، پروفیسر: مواعظ مظہری، مطبوعہ کراچی، ص ۱،

مگر یہاں ذکر اُس شخص کا ہے جو پیغمبرانہ آن بان کے ساتھ توحید و رسالت کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ کم از کم ایسی شخصیّت میں پیغمبرانہ صفات کو تلاش کیا جائے اور اُسی معیار سے پرکھا جائے تو بیجا نہ ہو گا۔ مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم زندگی بھر کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے خلاف آمادۂ پیکار رہے مگر یہاں جو کچھ ہے مسلمانوں کے خلاف ہے۔[1]

اِن برطانوی مجاہدوں کا منصوبہ یہی نہیں تھا کہ مسلمان خوانین و رؤسا سے دوسرے مسلمانوں کی گردنیں کٹوائی جائیں اور اِس طرح مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو ختم کروایا جائے بلکہ یہ حضرات خود بھی پشاور اور اُس کے گرد و نواح کے اہلِ اسلام کو ختم کرنے کا عزم بالجزم کر چکے تھے، چنانچہ سیّد صاحب نے شہزادہ کامران کو خط لکھتے ہُوئے وضاحت کر دی تھی کہ:

”چونکہ منافقوں اور فساد برپا کرنے والوں نے سرکش کفار کی حمایت پر کمر باندھ لی ہے اور مجاہدین سے دشمنی برت رہے ہیں، اِس لیے اُن کی گوشمالی اور کفر و فساد کے خلاف جہاد کی مہم کا چلانا ضروری ہے، اِسی بِناء پر مَیں نے تمام مجاہدین کو منافقین کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی ترغیب دی ہے۔“[2]

۶، محرم ۱۲۴۳ھ کے مکتوب بنام ملک فیض اللہ خاں میں سیّد صاحب نے یُوں وضاحت کی تھی:

”جناب والا جیسے روشن دماغ پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ عزمِ نہانی کا اشارہ اِس عاجز کی پشاور آمد کی طرف ہے تاکہ مجاہدین ہندوستان کو منافقین کے گرد و غبار سے اور دشمنوں اور شقی صفت اشخاص کے روڑوں اور کانٹوں سے پاک صاف کر دیں اور یہ معاملہ تو ہرگز کوئی ایسا پوشیدہ راز نہیں ہے بلکہ میں نے تو اِس کو ملا میرِ عالم اخوندزادہ سردار سلطان محمد خاں کے وکیل کے دو بدو علی الاعلان

---

[1] محمد مسعود احمد، پروفیسر: مواعظ مظہری، مطبوعہ کراچی، ص ۴۷، ۴۸

[2] سخاوت مرزا، ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۵۶

کہا ہے اور اِس معاملہ سے متعلق نہ تو کوئی بات پوشیدہ کہی اور نہ جناب کے مہربانی نامہ کے جواب میں اشارتاً کچھ کہا۔ البتہ میں نے کوئی مدت مقرر نہیں کی ہے، یعنی یہ کہ کس وقت اِس مہم کو سرانجام دیا جائے گا اور اِس عبادت کی کس لمحہ اور گھڑی کوشش کی جائے گی، کیونکہ ہر کام کا تعلق اُس قادرِ مطلق کے ہاتھ ہے۔ بہر حال میں کچھ ایسا ہی ارادہ رکھتا ہوں۔"[1]

سردار امیر عالم خاں باجوڑی کو مطلع کرتے ہُوتے سیّد صاحب نے اپنے ایک مکتوب میں یُوں تحریر فرمایا تھا:

"اب صورت یہ ہے کہ منافقین کے ساتھ جہاد کرنا بحکم مقدمۃ الواجب، ایک واجب معاملہ ہے۔ اِس لیے خاکسار سچے مسلمانوں کے ساتھ شہر پشاور اور قُرب وجوار سے بدکردار منافقوں کی گندگی کو پاک کرنے کا مصمم ارادہ کر کے موضع پنجتار تک پہنچ گیا ہے اور اُس زبردست حاکم برحق کے فرمان عالی شان کے بموجب جس کا ذکر کلام موثق یعنی کلام اللہ میں ہے کہ جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیہم۔ ہم نے کمرِ ہمت باندھ لی ہے ...... شہر مذکور کی طرف چل پڑے ...... سرکش کفار، منافقین اور خسارہ اٹھانے والوں کے استیصال کی حتی الوسع جد وجہد کریں گے۔"[2]

اپنے ایک خط میں سیّد صاحب شاہ کاشغر کو مسلم کشی کی اطلاع دیتے ہیں اور اُس صورتِ حال سے بے خبر حکمران کو اِس حرکتِ قبیحہ میں شمولیت کی کیسے پُراسرار انداز میں ترغیب و تشویق دیتے ہیں اور اُس کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کی غرض سے یُوں وضاحت کرتے ہیں:

"اِس مختصر عرصہ میں ضلع سوات، نبیر و مہمند، خلیل، علجائی اور دُرّانی کے تمام مسلمان اور پشاور کے رہنے والے اور اِس شہر کے اُمراء کے تمام فوجی سپاہیوں

---

[1] سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۱۰۳

[2] ایضاً: ص ۱۳۵، ۱۳۶

نے اِس بات پر اتفاق کر لیا ہے کہ پائندہ قبیلے کی دولت اور اُن کی شان و شوکت کو پامال کیے بغیر ہرگز ہرگز جہاد کا دروازہ کُھلنے والا نہیں ہے۔ اُنھوں نے اِس فقیر کو اِسی بات کی ترغیب دی ہے کہ ماہِ رمضان المبارک گزر جانے کے بعد بدبخت منافقوں کے استیصال کی طرف توجہ کریں، یعنی شہر پشاور کو اِن منافقوں کی گندگی سے پاک کرنے کا بیڑا اٹھائیں۔ چنانچہ اِس بات کو اس فقیر نے نیز تمام ایمان والوں نے بہت پسند کیا۔ لہٰذا رمضان شریف کے گزر جانے کے انتظار میں ہم سوات میں بیٹھے ہُوئے ہیں۔ جونہی مبارک ماہ مذکور ختم ہو جائے گا تو غازیوں کی تیاری کا وقت پہنچ جائے گا۔ اِس معاملہ میں بظاہر ملاقات جسمانی کے لیے فی الحال بعض اعتراضات مانع تھے لیکن ایک وجہ سے ملاقات کا بیحد اشتیاق پیدا ہو گیا۔ کیونکہ اِس فقیر کے پُرخلوص دل کا منشاء تھا کہ آپ جیسے برادرِ عزیز کو بھی دونوں جہان کی دولت اور ہمیشہ کی سعادت میں اپنا شریکِ حال بناؤں اور آپ کو بھی طرح طرح کی ترغیب اور تحریص دلا کر اِس عظیم الشّان مہم کو انجام دینے کے لیے کشاں کشاں لے آؤں، تاکہ اگر آپ اس عظیم مہم میں بنفسِ نفیس شریک ہو جائیں تو اِس سے بڑھ کر آپ کی کیا سعادت ہو سکتی ہے۔ البتہ چار و ناچار آپ کو اِس بات پر آمادہ کرتا ہُوں کہ اپنے لشکر ظفر پیکر سے تھوڑی فوج اور مجاہدین کے لیے اپنے حسبِ استطاعت کچھ مصارف اِس عاجز کے پاس بھجوا دیں۔"[1]

مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے کیا کسی ہستی نے مصلح کا روپ دھار کر مسلمانوں کو ختم کرنے اور اُن کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے کی اتنی منظم کوشش کبھی کی تھی؟ یقیناً تاریخ اِس کا جواب نفی میں دیتی ہے۔ مسلم کشی کی غرض سے اور مسلمانوں کے شہروں پر قبضہ کرنے کی خاطر خود مسلمان حکمرانوں کو ایک دوسرے کے خلاف کر کے، ایک کو غازی و مجاہد

---

[1] سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۲۶۸، ۲۶۹

اور دُوسرے کو مشرک و منافق ٹھہرا کر، اُن میں کشت و خون کرانے کا پارٹ اِس انداز میں کسی اَور نے بھی ادا کیا تھا؟ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے علاوہ اِس میدان میں اِن حضرات کا حریف کوئی نہیں لیکن جہاں مزارات کے منہدم کرنے اور قبہ شکنی میں ابنِ عبدالوہاب کا نظیر کوئی نہیں اِسی طرح مسلم کشی میں اِن حضرات نے ایک نیا ہی عالمی ریکارڈ قائم کر دکھایا تھا۔ کاش! مسلمانوں کو مشرک اور منافق قرار دے کر، اُنھیں بہ مستحل الدم ٹھہرانے والے، اُن کے جان و مال اور ننگ و ناموس سے کھیلنے والے کبھی اپنے گریبان میں بھی جھانک کر دیکھ لیتے کہ: ؎

بُت توڑنا تو فرض ہے، لیکن یہ شرط ہے
دِل میں بھی جھانک، اِس میں کوئی بُت چھپا نہ ہو

اِن حضرات کے جہاد کی کہانی تو کچھ اِسی قسم کی ہے لیکن بُرا ہو سیاسی مصالح اور بعض ہستیوں کو اربابًا من دون اللہ بنا لینے کا، کہ بعض ایسے حضرات جو تحقیق کے علمبردار کہلاتے ہیں اور کسی بڑی سے بڑی ہستی کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتے، جب وُہ اپنے اکابر کی طرف نظر دوڑاتے ہیں تو اُن کی ہر بھونڈی ادا، ہر گندے سے گندا فعل، ہر بُرے سے بُرا عقیدہ، ہر مضر سے مضر اقدام بھی دل موہ لینے والا قرار پاتا ہے۔ سید صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی تحریکِ جہاد کے بارے میں جناب ابوالاعلیٰ مودودی یوں رقمطراز ہیں:

> "اِنھوں نے اِتنے وسیع پیمانے پر، جو اُنیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ہندوستان جیسے بر سرِ تنزّل ملک میں بمشکل ہی ممکن ہو سکتا تھا، جہاد کی تیاری کی اور اِس تیاری میں اپنی تنظیمی قابلیت کا کمال ظاہر کر دیا۔ پھر غایت تدبّر کے ساتھ آغازِ کار کے لیے شمال مغربی ہندوستان کو منتخب کیا، جو ظاہر ہے کہ جغرافی و سیاسی حیثیت سے اِس کام کے لیے موزوں ترین خطہ ہو سکتا تھا۔ پھر اِس جہاد میں ٹھیک وہی اصولِ اخلاق اور قوانینِ جنگ استعمال کیے جن سے ایک دنیا پرست جنگ آزما کے مقابلہ میں ایک مجاہد فی سبیل اللہ ممتاز ہوتا ہے اور اِس طرح اُنھوں نے دنیا کے سامنے پھر ایک مرتبہ صحیح معنوں میں رُوحِ اسلامی کا مظاہرہ کر دیا۔ اُن کی جنگ، ملک و مال، یا قومی عصبیت، یا کسی دنیوی غرض

کے لیے نہ تھی بلکہ خالص فی سبیل اللہ تھی۔ اُن کے سامنے کوئی مقصد اِس کے سوا نہ تھا کہ خلق اللہ کو جاہلیت کی حکومت سے نکالیں اور وُہ نظامِ حکومت قائم کریں جو خالق اور مالک الملک کے منشاء کے مطابق ہے۔ اِس غرض کے لیے جب وُہ لڑے تو حسبِ قاعدہ اسلام یا جزیہ کی طرف پہلے دعوت دی اور پھر اتمامِ حجت کر کے تلوار اٹھائی، اور جب تلوار اٹھائی تو جنگ کے اُس مہذب قانون کی پوری پابندی کی جو اسلام نے سکھایا ہے۔ کوئی ظالمانہ اور وحشیانہ فعل اُن سے سرزد نہیں ہُوا۔ جس بستی میں داخل ہُوتے مُصلح کی حیثیت سے داخل ہُوتے نہ کہ مفسد کی حیثیت سے۔"[1]

موصوف کے یہ جملہ دعادی اُن کی اسمٰعیل پرستی کی بنا پر بغیر کسی تحقیق وثبوت کے ہیں۔ سید صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا طرزِ عمل اور خود وہابی حضرات کی تاریخیں موصوف کے اِن بیانات کی تائید و تصدیق کرنے سے قاصر ہیں۔ اِن حالات میں راقم الحروف انصاف کا اِس طرح خُون کرنے والوں کے متعلق یہی کہہ سکتا ہے کہ: ؎

بنے کیونکر کہ ہے سب کار اُلٹا
ہم اُلٹے، بات اُلٹی، یار اُلٹا

یہاں تک بیان اِس امر کا تھا کہ اِن حضرات نے مسلمانوں کے شہروں پر قبضہ کرنے اور اُنھیں مستحل الدم قرار دینے کی غرض سے کیسے کیسے غیر اسلامی اور چنگیز خانی بہانے تلاش کیے۔ اب اِن لوگوں کی مسلم کشی کے چند واقعات پیش کرتا ہُوں۔ قلعہ ہنڈ پر قبضہ کرنے اور خادی خاں کے خون سے ہاتھ رنگنے کے بارے میں مرزا حیرت دہلوی نے یُوں تصریح کی ہے:

"ابھی صبح کی پَو پھٹی تھی کہ آپ (مولانا محمد اسمٰعیل دہلوی) قلعہ ہنڈ کی دیواروں کے نیچے جا پہنچے۔ کل ڈیڑھ سو آدمی ساتھ تھے اور باقی ماندہ (ساڑھے پانچسو) پیچھے رہ گئے تھے۔ آپ نے خاموشی سے بارہ بندوقچیوں کو بھیج دیا کہ تم دروازہ

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی ولیڈر: تجدید واحیائے دین، ص ۱۱۵، ۱۱۶

کے پاس اُس ٹیلہ کے پیچھے چُھپ کے کھڑے ہو جاؤ۔ جونہی دروازہ کھول کر قلعہ میں سے لوگ نکلیں اور شہر کی طرف جانے لگیں، تم فوراً قلعہ میں گُھس جانا اور اُنھیں گولیاں مار دینا۔ بھاگتے ہوؤں کو روکنا نہیں، مقابلہ کرنے والے کو تہِ تیغ کرنا۔ ابھی بہت روشنی نہ ہُوئی تھی، نسیمِ سحری طفلانہ اٹکھیلیاں کرتی ہُوئی چل رہی تھی اور خادی خاں کو خبر دے رہی تھی کہ تیرا یہ خوابِ نوشیں زہر آلود ہے، مگر وُہ کچھ اپنے قلعہ کی مضبوطی میں ایسا مخمور تھا کہ اُسے نسیمِ سحری کے جھوکوں کی اطلاع کی بھی ذرا خبر نہ تھی۔ جونہی مولانا شہید نے بندوقوں کی آواز سنی، آپ بھی فوراً بندوق چھتیاتے ہُوئے معہ ہمراہیوں کے داخلِ قلعہ ہُوئے، ہتھیار اُٹھانے کی بھی فرصت نہ دی اور سب کو خوف دے کر باہر نکال دیا۔ قلعہ کے دوسرے حصّہ میں خادی خاں سوتا تھا۔ ٹھائیں ٹھائیں بندوقوں کی آواز ہُوئی اور لوگوں کا غل سُنائی دیا تو بے خبر رئیس بڑبڑا کے اٹھا اور پریشان باہر نکل آیا۔ دیکھا تو گُل ہی اَور کِھلا ہوا ہے۔ فوج کے سرداروں کو ڈراؤنی صدا میں پکارا۔ وہاں کسی کا بھی پتہ نہ تھا۔ پھر وُہ اپنے کمرہ کے زینہ سے قلعہ کی چھت پر چڑھ گیا اور وہاں سے غل و شور مچانا شروع کیا۔ سراسیمہ اِدھر اُدھر بھاگا پھرتا تھا۔ آخر ایک مسلمان کی گولی نے اُسے تخل بیڑے سے بھٹایا۔"[1]

یار محمد خاں حاکمِ یاغستان سے معرکہ آرائی کے بارے میں مرزا حیرت دہلوی یُوں رقمطراز ہیں:

"مولانا شہید گھوڑے پر سوار تھے اور دُو سو آدمی اَور بھی آپ کے ساتھ قدم بقدم علاوہ چار سو پیدلوں کے آ رہے تھے۔ مولانا شہید کی پہلی نظریں توپوں پر لگ رہی تھیں، آپ سب سے پہلے اُن ہی پر جا پڑے۔ گولہ انداز نے مہتابی کو روشن کر کے چاہا کہ پہلے مولانا کو اُڑا دُوں کہ مولانا نے تلوار کا پھُرتی سے وار کر کے اُس کی گردن اُڑا دی۔ دُوسرا توپچی بھی یُوں مارا گیا۔ مولانا شہید نے فوراً وُہ دونوں توپیں دُرّانیوں کی طرف پھیر کے فَیر کرنے شروع کیے۔ ایک

---

[1] حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ٢٣٢، ٢٣٣

وفادار ہندو، جو مولانا شہید پر فریفتہ تھا (راجہ رام) گولہ اندازی پر مقرر ہوا۔ اُس نے اِس قدر پھُرتی سے گولہ اندازی کی کہ دُرّانیوں کے پَیر اُکھڑ گئے۔ اُدھر مولانا شہید اُن پر گِر پڑے۔ تکبیروں کی آوازیں خوب زور شور سے بلند ہو رہی تھیں۔ بھلا اب دُرّانی کیونکر میدان میں ٹھہر سکتے تھے؟ اپنا کُل سامان چھوڑ کے بھاگے۔ جب وُہ فرار ہو رہے تھے، سیّد صاحب بھی اُن پر آ پڑے۔ جتنے درّانی مارے گئے ان کی تعداد ٹھیک معلوم نہیں، ہاں جن مُردوں کو وُہ میدان میں چھوڑ گئے تھے، وُہ چار سو سے زیادہ شمار میں تھے۔ مولانا شہید کی فوج کا ایک آدمی بھی زخمی نہ ہوا۔“ [1]

یار محمد خاں کی فوج کے جتنے مال کو مالِ غنیمت قرار دے کر اِن برطانوی مجاہدوں نے ہضم کیا اُس کی مکمل تفصیل تو کسی سوانح نگار نے بیان نہیں کی۔ بعض اشیاء کی فہرست جناب غلام رسول مہر کی زبانی ملاحظہ ہو:

”مولانا نے مالِ غنیمت جمع کرایا تو مندرجہ ذیل چیزیں تھیں۔ ایک ہاتھی، ساٹھ ستّر اُونٹ، کچھ کم تین سو گھوڑے، چھ توپیں، پندرہ سولہ شاہینیں، تلواروں اور بندوقوں کا شمار نہ تھا۔ ملکی لوگ جو مال اٹھائے لیے جا رہے تھے اُسے حُسنِ تدبیر سے واپس لیا۔ بستر اور خیمے سب محفوظ پڑے تھے۔ اکثر لوگ جُوتے بھی چھوڑ گئے تھے۔ پلاؤ کی دیگیں تیار پڑی تھیں۔ منوں خشک میوہ موجود تھا۔“ [2]

خادی خاں اور یار محمد خاں کو ٹھکانے لگانے کے بعد مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے رازداری کے ساتھ مسلمانانِ سمّہ کو بزورِ شمشیر زیر کرنے کا ایک پروگرام بنایا اور سید احمد صاحب سے منظوری لے کر اُس پر یُوں عمل کیا گیا:

”پائندہ خاں سے مصالحت کی صورت پیدا ہو گئی تو قاضی سیّد محمد جان نے یہ

---

[1] حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۲۷

[2] غلام رسول مہر: سیّد احمد شہید، ص ۵۲۷

تجویز پیش کی کہ علاقہ ستمہ میں سرکشی کے آثار نمودار ہیں۔ جن لوگوں نے خود بخود ادائے عشر کا اقرار کیا تھا، وُہ بھی بے پروا ہو رہے ہیں۔ اگر آپ کچھ لشکر میرے ہمراہ کر دیں تو میں وعظ و نصیحت سے سارے اہلِ ستمہ کو حلقہ بگوش بنا دُوں۔ جو نہ مانیں اُنھیں بزور راضی کروں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مجھے اُس لشکر کا امیر بنا کر پُورے اختیارات دے دیے جائیں، اِس لیے کہ میں مقامی آدمی ہُوں اور اپنے اہلِ وطن کی طبیعت و مزاج کو خُوب جانتا ہُوں، ایسا آدمی یہاں کوئی اور نہیں۔ مولانا شاہ اسمٰعیل کو میرے ساتھ کر دیں تاکہ اگر مجھ سے نادانستہ کوئی فعل خدا اور رسول کی رضا کے خلاف سرزد ہونے لگے تو مولانا روک دیں۔ سیّد صاحب کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔"[1]

اِس پروگرام کے مطابق سب سے پہلے موضع کھلاوٹ پر فوج کشی کی گئی۔ جناب غلام رسول مہر نے یہ کارنامہ یُوں بیان کیا ہے:

"کھلابٹ سے ایک کوس پر نمازِ ظہر ادا کی۔ جب بستی پاؤ کوس پر رہ گئی تو قاضی صاحب نے حکم دیا کہ سب ٹھہر جائیں۔ پھر رسالدار عبدالحمید خاں سے کہا کہ آپ یہاں تیار کھڑے ہیں، ہم پیادوں کو لے کر آگے بڑھتے ہیں، جب ہماری طرف سے بندوق چلے تو فوراً باگیں اُٹھا کر بستی کی جنوبی سمت سے حملہ کر دیں۔ قاضی صاحب نے شمالی سمت میں ایک ٹیلے پر زنبورک لگا کر گولہ باری شروع کر دی۔ اِس اثنا میں رسالے کے ایک سوار کو پیشاب کی حاجت ہُوئی، وُہ اپنے ساتھیوں سے آگے بڑھا، گھوڑے کی باگ پاؤں کے نیچے دبا کر پیشاب کے لیے بیٹھ گیا۔ دفعتہً گھوڑا بدکا اور اُس کی باگ پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ وُہ گاؤں کی طرف بھاگا۔ رسالدار نے آواز دی کہ لینا جانے نہ پائے۔ دو دو، چار چار سوار اُس کے تعاقب میں نکلنے لگے

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، ص ۵۹۶

قاضی صاحب نے سمجھا کہ سواروں نے ہلّہ بول دیا، چنانچہ اُنھوں نے بھی گولہ باری چھوڑ کر حملہ کر دیا۔ اِس طرح ایک معمولی سا واقعہ کامیاب یورش کی شکل اختیار کر گیا۔ پیادہ فوج بستی میں داخل ہوگئی۔ سرداروں کا مقابلہ صرف دو آدمیوں نے کیا اور دونوں مارے گئے۔ غازیوں میں سے کسی کے چرکہ بھی نہ لگا اور کھلابٹ فتح ہوگیا۔ لعد میں معلوم ہوا کہ وہاں مقابلے کے لیے پانچہزار آدمی فراہم تھے۔"[1]

اِس کے بعد مرغز، ٹھنڈ کوٹی، کدا اور پنج پیر پرجوشِ ملک گیری میں اپنی فتح کے جھنڈے گاڑے گئے۔ اِن سرگرمیوں کی کہانی وہابیوں کے مورّخِ نامدار، عالیجناب غلام رسول مہر کی زبانی ہی ملاحظہ فرمائیے:

"کھلابٹ کے اصلی خان (یعنی سردار) ابراہیم خاں اور اسمٰعیل خاں تھے۔ قاضی صاحب نے ابراہیم خاں کو خانی کی مسند پر بٹھایا، چار سوار اُس کی حفاظت کے لیے مقرر کیے۔ اسمٰعیل خاں کو اپنے ساتھ رکھا اور مرغز پہنچے، جو کھلابٹ سے ایک میل پر تھا۔ مرغز کے لوگ مجاہدین کے آنے کی خبر سُنتے ہی مطیع ہو گئے۔ وہاں جس غاصب نے خانی پر قبضہ کر رکھا تھا، وہ بھاگ گیا۔ قاضی صاحب نے مرغز کو وہاں کے اصلی خاں، سرفراز خاں کے حوالے کر دیا۔ چار سوار اُس کی حفاظت کے لیے بھی چھوڑے اور خود ٹھنڈ کوٹی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹھنڈ کوٹی اور اُس کے بعد کدا میں بھی مرغز کی سی صورت پیش آئی، یعنی دونوں بستیوں کے لوگوں نے بے چون وچرا فرمانبرداری کا عہد کر لیا۔ مغرب کی نماز قاضی صاحب نے زیدہ اور کدا کے درمیان ایک نالے پر ادا کی اور وہیں مع لشکر ٹھہر گئے۔ اِسی جگہ پنج پیر کے خان نے خود آ کر اطاعت کا اقرار کیا۔ اِس طرح ایک دِن میں کھلابٹ، مرغز، ٹھنڈ کوٹی، کدا اور پنج پیر زیرِ فرمان آ گئے۔"[2]

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، ص ۵۹۸، ۵۹۹

[2] ایضاً: ص ۵۹۹

اب قلعۂ ہنڈ کی فتح کی تفصیلات ملاحظہ ہوں :

”ہنڈ وہاں سے قریباً تین کوس کے فاصلے پر تھا۔ رسالدار عبدالحمید خاں نے قاضی صاحب سے کہا کہ آپ اجازت دیں تو میں اپنے سوار اور چار ضرب زنبورک لے کر ہنڈ چلا جاؤں۔ اگر حالات سازگار دیکھوں گا تو وہیں ٹھہر جاؤں گا۔ صبح کے وقت آپ بھی پیادوں کو لے کر آجائیں۔ اگر دیکھوں گا کہ ٹھہرنا مناسب نہیں تو چلا آؤں گا۔ دونوں اور قاضی صاحب دونوں نے اِس تجویز کو پسند فرمایا چنانچہ رسالدار بے توقف اُدھر روانہ ہو گیا۔ جب ہنڈ ایک گولی کے فاصلے پر رہ گیا تو چند گھوڑے زور سے ہنہنائے۔ تھوڑی دیر بعد قلعے کے چاروں بُرجوں پر اتنی روشنی ہُوئی کہ اردگرد کی ہر شے دُور دُور تک صاف نظر آنے لگی۔ رسالدار نے سواروں کو وہیں روک دیا پھر آہستہ آہستہ اُنھیں جنوبی سمت میں تالاب کے کنارے کی اوٹ میں پہنچا دیا۔ وہاں زنبورک لگا کر قلعے پر چار پانچ گولے پھینکے۔ بعدازاں سارے سوار قاضی صاحب کے پاس لشکر گاہ میں پہنچ گئے۔ صبح صادق نمودار ہُوئی تو دو آدمیوں نے آکر یہ خوشخبری سُنائی کہ ہنڈ خالی پڑا ہے، آپ قلعے کے انتظام کے لیے وہاں تشریف لے چلیں، پھر ایک مُلا آیا اور اُس سے ہنڈ کے تخلیے کی تصدیق ہو گئی۔“ [1]

اب ہوتی مردان کی فتح کی کہانی، جناب غلام رسول مہر کی زبانی سُنیے اور اِس جہاد کا رنگ رُوپ دیکھیے :

”ہوتی مردان کے رئیس احمد خاں کو بھی بُلایا گیا۔ اُس کی طرف سے جواب آیا کہ آٹھویں روز ملاقات کروں گا۔ قاضی صاحب نے سمجھا کہ شاید اُسے کوئی ضروری کام ہوگا۔ اِس اثناء میں گوجر گڑھی کے ایک غازی اخوند خیرالدین آئے اور بتایا کہ احمد خاں اپنے بھائی رسول خاں کو نائب بنا کر خود دُرانیوں سے

---

[1] غلام رسول مہر: سیّد احمد شہید، ص ۵۹۹، ۶۰۰

فوجی مدد لینے کے لیے پشاور چلا گیا ہے۔ دو تین روز میں پے در پے اِس خبر کی تصدیق ہوتی رہی۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ اِن حالات میں مردان کو بزور مسخر کر لینے کے سِوا چارہ نہیں۔ چنانچہ سب کے مشورے سے مردان پر پیش قدمی کا فیصلہ ہو گیا۔“[1]

”مردان پر حملے کے لیے تیاری کا حکم دینے کے بعد قاضی سیّد محمد حبّان نے دو ملکی آدمیوں کو صحیح حالات معلوم کرنے کے لیے بھیج دیا۔ وُہ خبر لائے کہ ہوتی کی گڑھی میں بیس پچیس اور مردان کی گڑھی میں تیس چالیس آدمی ہوں گے رسول خاں موجود ہے اور احمد خاں پشاور گیا ہُوا ہے۔ حملے کا اِس سے بہتر موقع اَور کیا ہو سکتا تھا؟ اگر انتظار کیا جاتا تو درّانیوں کا لشکر آ جاتا۔“[2]

”رہبروں کو آگے بھیج دیا تاکہ وُہ پُورے حالات دیکھ کر مزید خبر لائیں اور بسم اللہ کہہ کر قدم آگے بڑھانے کا حکم دے دیا۔ جب ہوتی آدھ کوس پر رہ گیا تو مخبروں کا انتظار کرنے لگے۔ بستی میں نقارہ زور سے بج رہا تھا۔ لوگوں کا شور وغل بھی سُنائی دیتا تھا۔ غازیوں کے گھوڑے بدستور ہنہنا رہے تھے۔ اِس اثنا میں مخبر خبر لائے کہ ہوتی کی گڑھی سے گولی کی زد کے فاصلے پر بہ سمتِ جنوب کھلیان ہیں، وہاں چالیس پچاس آدمی بندوقیں لیے بیٹھے ہیں۔ بستی کے دروازے پر بھی کافی جمعیت ہے۔ البتہ گڑھی سے مغربی سمت کا میدان خالی ہے اور شمالی سمت میں بھی کوئی نظر نہیں آتا۔ قاضی صاحب نے مولوی مظہر علی عظیم آبادی سے کہا کہ آپ حبیش کو لے کر کھلیانوں کی طرف جائیں۔ رسالدار عبدالحمید خاں کو حکم دیا کہ سواروں کو لے کر مغربی جانب کے میدان میں پہنچ جائیں۔ جب کھلیانوں کی سمت سے بندوقوں کی آواز آئے تو نقارہ بجاتے ہُوئے بستی پر

---

[1] غلام رسول مہر، سید احمد شہید، ص ۶۰۱، ۶۰۲

[2] ایضاً: ص ۶۰۴

> حملہ کر دیں۔ خود دروازے کا قصد کیا، جہاں دشمن کی بھاری جمعیت کی اطلاع ملی تھی۔ ملکیوں کو قاضی صاحب نے صفِ اوّل میں رکھا اور ہندوستانیوں کو صفِ دوم میں۔ دُعا کے بعد تینوں جیش اپنے اپنے مقامات کی طرف روانہ ہو گئے۔"[1]

> "مولانا نے رسالدار عبدالحمید خاں کو حکم دیا کہ چالیس پچاس سواروں کو بستی میں بھیج دیجیے۔ وُہ گھوڑے چھوڑ دیں۔ شاہینیں لے کر پیدل چلیں اور شاہینوں سے گڑھی کے بُرجوں کو خالی کرائیں۔ یہ تدبیر کارگر ہُوئی۔ گڑھی مردان کے چھ برج تھے سب پر گولہ باری شروع ہو گئی۔ دو شاہینیں صرف اُس بُرج کے خلاف لگائی گئیں جس کی گولیوں سے قاضی سیّد حبّان اور دُوسرے غازی شہید ہوئے تھے۔ بہرحال شاہینوں نے دشمن کا عزمِ مزاحمت مضمحل کر کے رکھ دیا۔ گڑھی کے پانچ بُرجوں پر خاموشی چھا گئی، صرف ایک باقی رہ گیا، جس سے گولیاں آ رہی تھیں۔ اِس اثنا میں لعل محمد قندھاری اُس بُرج کے نیچے پہنچ گئے اور بآوازِ بلند پشتو میں پکارے: "اندر پائی راوڑا —— اندر پائی راوڑا۔" یعنی سیڑھی لاؤ، سیڑھی لاؤ۔ حالانکہ کوئی سیڑھی پاس نہ تھی۔ یہ سُن کر بُرج والوں پر ہراس طاری ہو گیا اور اُنھوں نے حوالگی کی درخواست پیش کر دی۔ قرارداد کے مطابق پہلے ہتھیار نیچے پھینک دیئے، پھر ایک ایک کر کے اُتر آئے۔"[2]

جنگ مایار کے بعد بعض دُرّانی ہوتی مردان میں جمع ہو گئے تھے جن کی وجہ سے عارضی طور پر سیّد احمد صاحب اینڈ کمپنی کا وہاں سے قبضہ اٹھ گیا تھا۔ بھلا یہ حضرات اپنے جیتے جی کس طرح یہ صورتِ حال برداشت کر سکتے تھے؛ چنانچہ فوراً مسلمانوں پر فوج کشی کر کے اپنے جذبۂ جہاد کو تسکین پہنچانے کا سامان فراہم کیا۔ مثلاً:

> "غرض مولانا ہوتی کے قریب پہنچے تو وہاں کی گڑھی سے گولیاں آئیں۔ اِس پر

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، ص ۶۰۴، ۶۰۵

[2] ایضاً: ص ۶۰۷

مولانا (محمد اسمٰعیل دہلوی) نے حکم دے دیا کہ ہر غازی اپنے چاروں طرف چار چار قدم کا فاصلہ چھوڑ کر چلے۔ پھر گڑھی کے جنوبی دروازے کے پاس سے ہوتے ہوئے آگے بڑھے۔ مردان سے باہر مغربی سمت میں ایک باغ تھا، جس میں بڑے بڑے درخت تھے اور اُس کی زمین ذرا نشیبی تھی، اُس میں جا بیٹھے۔ گڑھی مردان کے برجوں سے گولیاں آنے لگیں، لیکن مولانا نے بیٹھنے کے لیے ایسی جگہ تجویز فرمائی تھی کہ کسی غازی کو نقصان کا اندیشہ نہ تھا۔ ایک گھڑی کے بعد گولیاں مدھم پڑ گئیں اور چند مُلّا صاحبان حاضر ہو کر مولانا کی خدمت میں عرض پرداز ہُوئے کہ حکم ہو تو کھانا لائیں۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ لوگوں کا ارادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ باقی غازیوں کو زہر آلود کھانا کھلا کر ختم کر دیں۔ خبردار ہو جائیے، جو توپیں دُرّانیوں سے غنیمت میں ملی ہیں، اُنھیں ابھی منگا لیتا ہُوں۔ اُن کے آتے ہی گڑھی کو مسمار کر ڈالوں گا۔ ملاؤں نے معذرت کی اور کہا کہ یہ احمد خاں کے آدمیوں کا کام ہے، جو جاہل ہیں۔ اُنھیں یہ اندیشہ لاحق ہُوا کہ لڑائی کے بغیر گڑھی حوالے کر دی تو خان، نمک حرامی کا طعنہ دے گا۔ اُدھر مولانا نے سیّد صاحب کے پاس آدمی بھیج کر شاہینیں منگا لیں۔ اِدھر جب بستی والوں کو معلوم ہُوا کہ توپیں آ رہی ہیں تو بے تابانہ صلح کے خواستگار ہُوئے۔ احمد خان کے بھائی رسول خاں نے پیغام بھیجا کہ میں فرمانبردار ہُوں، البتہ دُرّانیوں کی آمد کے باعث بے بس ہو گیا تھا۔"[1]

پائندہ خاں رئیسِ آنب سے لڑائی کر کے اُس کا قلعہ چھینا اور مسلمانوں کا کشت و خون کیا گیا۔ یہاں فوج کشی کی ابتدا کیوں اور کس طرف سے ہُوئی، یہ مولوی محمد جعفر تھانیسری کی زبانی سُنیے:

"ملکیوں کی زبانی معلوم ہُوا کہ پائندہ خاں اپنے ملک میں جنگ کی تیاری

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، ص ۶۴۱

کر رہا ہے ، اِس واسطے سیّد صاحبؒ کے لیے بھی لازم ہو گیا کہ ایک لشکرِ اسلام اِس طرف روانہ کریں ..... اِس مہم کا مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ کو امیر مقرر کر کے بجانب آنب روانہ کر دیا ..... یہ لشکر دو ۲ حصّے ہو کر ، ایک حصّہ زیرِ حکم سید احمد علی ہمشیر زادہ سیّد صاحبؒ کے عشرہ کو گیا اور ایک حصّہ مولانا محمد اسماعیل صاحب کے ساتھ فروسہ میں پہنچا اور خود سیّد صاحب بھی پنجتار سے روانہ ہو کر اِسی نواح کے لوگوں کو لشکرِ اسلام کی تائید کے واسطے آمادہ کرتے تھے۔" [1]

جناب غلام رسول مہر نے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی اِس موقع کی جنگی سکیم کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے :

"آپ غور فرمائیں کہ مولانا کی جنگی سکیم کتنی عمدہ تھی ؛ اگر پائندہ خان عشرہ کی جانب بڑھتا تو مولانا گلنگڑی کے راستے امب پہنچ سکتے تھے۔ اگر وُہ خود گلنگڑی کے راستے فروسہ پر پیش قدمی کرتا تو ستھانہ کی فوج عشرہ اور امب پر قابض ہو جاتی۔ اگر وُہ امب میں بیٹھا رہتا تو مولانا جنوب اور شمال مغرب دونوں سے امب پر بڑھتے۔" [2]

لیکن پائندہ خاں نے اِن لوگوں کی جنگی اسکیم کو ناکام بنا دیا ، جس پر مہر صاحب یوں نوحہ کناں ہوئے:

"پائندہ خاں کو کنیرڑی پر غازیوں کے قبضے کی اطلاع ملی تو اُسے معلوم ہو گیا کہ اب اِن کی دوہری زد سے بچنا مشکل ہے۔ گھبرا کر اُس نے صلح کا جال پھیلایا۔ ...... غرض پائندہ خاں کے فریبِ صلح کے باعث غازیوں کے ہر جنبش کی ساری جنگی تدابیر معطل ہو گئیں۔" [3]

"پائندہ خاں اب تک عشرہ میں تھا اور اپنے آدمیوں کو للکار للکار کر لڑائی کا

---

[1] محمد جعفر تھانیسری : حیات سید احمد شہید ، ص ۲۵۰ ، ۲۵۱

[2] غلام رسول مہر : سید احمد شہید ، مطبوعہ لاہور ، ص ۵۵۳

[3] ایضاً : ص ۵۵۴

حوصلہ دلا رہا تھا۔ سواروں اور پیادوں کو بھاگتے دیکھا تو خود بھی عشرہ کو چھوڑ کر امب کی جانب روانہ ہو گیا۔“ [1]

”شیخ ولی محمد کوٹلہ سے پہاڑ کے اوپر اوپر امب کے قریب پہنچ گئے۔ پایندہ خاں انھیں دیکھتے ہی امب کو چھوڑ کر چھتر بائی چلا گیا، جو چند میل شمال میں تھا۔ شیخ ولی محمد گولیوں کی آواز سن کر کنیر ڑی کی طرف آئے تھے۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف غازیانِ کنیر ڑی کو شدید مخمصے سے نجات ملی بلکہ عشرہ اور کوٹلہ پر بھی قبضہ ہو گیا۔“ [2]

چھتر بائی کی گڑھی پر جو معرکہ آرائی ہوئی وہ غلام رسول مہر نے اِس طرح بیان کی ہے:

”امب سے چھتر بائی کے دو راستے تھے: ایک زیریں راستہ جو دریا کے کنارے کنارے جاتا تھا، دوسرا پہاڑی راستہ۔ رسالدار عبدالحمید خاں پہاڑی راستے سے گئے۔ مولانا نے زیریں راستہ اختیار کیا۔ گڑھی سے ایک گولی کے فاصلے پر دروازے کے بالمقابل ٹھہر گئے اور دریا کی سمت چھوڑ کر گڑھی کے تینوں جانب مورچے بنا لینے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ جا بجا آٹھ مورچے بنا لیے گئے: تین شمال و مغربی کونے میں، تین جنوبی و مغربی کونے میں، دو جنوبی سمت میں جدھر گڑھی کا دروازہ تھا۔ محاصرہ اگرچہ بڑا سخت تھا لیکن گڑھی کے فتح ہونے کی کوئی صورت نہیں بنتی تھی۔ مولانا نے امب سے توپ منگا کر گولہ باری بھی کی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ آخر یہ سارے حالات سید صاحب کو لکھ بھیجے کہ آپ امب پہنچ جائیں اور گڑھی کو مسخر کرنے کی کوئی تدبیر فرمائیں۔ سید صاحب نے امب پہنچ کر فیصلہ کیا کہ چھتر بائی پر حملے کے لیے پنجتار سے توپیں منگا لینی چاہییں۔ چنانچہ آپ نے شیخ بلند بخت دیوبندی کو پچیس تیس

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۵۵۷

[2] ایضاً: ص ۵۵۷

غازیوں کے ساتھ چھتر بائی سے بلا لیا اور ضروری ہدایتیں دے کر پنجتار بھیج دیا۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ پنجتار پہنچ کر دفن شدہ توپیں نکلوائیں۔ دکھاڑا سے قوی اونٹ منگائے۔ توپیں لاد کر امب لے گئے۔ سید صاحب کے حکم سے میرزا حسین بیگ، شیخ ہمدانی اور شیخ مولا بخش نے اُنھیں چرخوں پر چڑھا کر گڑھی کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اِس اثنا میں رن گڑھ تیار کرانے کا بھی حکم ہو گیا۔" [1]

"سید صاحب نے اس حادثے کے بعد حکم بھیجا کہ غازی چھتر بائی کا محاصرہ چھوڑ کر کھبل بائی پہنچ جائیں اور وہاں قیام کریں۔ مولانا نے پہلے اڑھائی سو غازیوں کو مورچوں میں چھوڑا، باقی اصحاب کو کھبل بائی بھیج دیا، پھر خود باقی غازیوں کو لے کر اُس طرف روانہ ہوئے کہ دشمن ہجوم نہ کر سکے۔ پایندہ خاں کے آدمی دریا پار سے بھی گولیاں چلا رہے تھے۔ گڑھی کی فوج بھی حوصلہ پا کر یورش پر آمادہ تھی۔" [2]

اِن حضرات کی اسلام دشمنی و مسلم کشی کے پے در پے واقعات سے تنگ آ کر سلطان محمد خاں برادر یار محمد خاں حاکمِ پشاور نے اِن سے فیصلہ کن جنگ لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ مایار کے مقام پر لڑائی ہوئی لیکن قسمت نے یاوری نہ کی اور سلطان محمد خاں نے شکست کھائی۔ فریقین کے نقصان کا اندازہ محمد جعفر تھانیسری نے یوں پیش کیا ہے:

"درّانیوں کی لاشوں سے میدان بھر گیا اور غازیوں کا بہت ہی تھوڑا نقصان ہوا۔ جب کئی ہزار درّانی مارے گئے تو اُنھوں نے سخت ہزیمت اٹھا کر پسپائی شروع کی۔ اُس وقت غازیوں نے توپوں پر جا کر قبضہ کر لیا اور اُنھیں توپوں سے بھاگتے ہوئے دشمن پر گولہ باری کر کے اُن پر قیامت برپا کر دی۔ قریب تین ہزار درّانی مقتول و مجروح ہوئے اور اُن کے بڑے بڑے سردار

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، ص ۵۵۹

[2] ایضاً: ص ۵۶۱

اور شجاع اور پہلوان اُس دن مارے گئے۔ غازیوں کے صرف بیس آدمی شہید ہُوئے اور اِسی قدر مجروح ہُوئے۔ میدان غازیوں کے ہاتھ رہا اور توپیں اور شاہین اور بندوقیں اور گھوڑے اور خیمے اور ظروف وغیرہ مالِ غنیمت غازیوں کے ہاتھ آیا۔ فتح کے بعد ظہر اور عصر کی نماز سید صاحب نے اُس میدان میں ادا کی اور مغرب کی نماز سے پہلے سید صاحب مالِ غنیمت کو ساتھ لے کر مظفر ومنصور موضع مہیار میں پہنچے اور وہیں شب باش ہُوئے۔"[1]

قارئین کرام! یہ تھا اِن حضرات کے جہاد کا اصلی رُخ، اب اِن کی اخلاقی حالت پیش کرنے سے پہلے جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا نظریہ اُن کی تحقیق کی روشنی میں پیش کرتا ہوں کہ موصوف نے سید احمد صاحب کے رفقاء کو اُن کے کردار کی روشنی میں کیا کچھ پایا؛ چنانچہ موصوف رقمطراز ہیں:

"اِنھوں (سید احمد و محمد اسمٰعیل صاحبان) نے عامۂ خلائق کے دین، اخلاق اور معاملات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور جہاں جہاں اِن کے اثرات پہنچ سکے، وہاں زندگیوں میں ایسا زبردست انقلاب رونما ہُوا کہ صحابۂ کرام کے دور کی یاد تازہ ہوگئی۔"[2]

مودودی صاحب کی عقیدت کے اِن مرکزوں کا دین وایمان کچھ اسی فصل کی گزشتہ سطور میں پیش کیا جا چکا ہے، کچھ چند صفحات کے بعد پیش کیا جائے گا، نیز اِسی کتاب میں اکثر جگہ اِن حضرات کے دین ہی کی توضیح موجود ہے۔ معاملات کی صفائی، اِن کی مسلم کُشی اور انگریز دوستی سے عیاں ہے۔ رہا اخلاق والا معاملہ تو اُس کا بیان چند سطور میں پیش ہونے والا ہے۔ پہلے موصوف کا ایک بیان اور ملاحظہ فرما لیا جائے۔ لکھتے ہیں:

"اِن کو ایک چھوٹے سے علاقہ میں حکومت کرنے کا جو تھوڑا سا موقع ملا۔ اِنھوں نے ٹھیک اُسی طرز کی حکومت قائم کی جس کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا گیا ہے۔

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، ص ۲۶۸، ۲۶۹

[2] ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی: تجدید واحیائے دین، بار ہشتم، ص ۱۱۵

> وہی فقیرانہ امارت، وہی مساوات، وہی شوریٰ، وہی عدل، وہی انصاف، وہی حدودِ شرعیہ، وہی مال کو حق کے ساتھ لینا اور حق کے مطابق صرف کرنا، وہی مظلوم کی حمایت اگرچہ ضعیف ہو اور ظالم کی مخالفت اگرچہ قوی ہو، وہی خدا سے ڈر کر حکومت کرنا اور اخلاقِ صالحہ کی بنیاد پر سیاست چلانا۔ غرض ہر پہلو میں اُنھوں نے اُس حکمرانی کا نمونہ ایک مرتبہ پھر تازہ کر دیا، جو صدیقؓ و فاروقؓ نے کی تھی۔"[1]

معلوم کچھ ایسا ہوتا ہے کہ عالیجناب مودودی صاحب کی نظر میں کسی بہتر سے بہتر حکومت و امارت میں جو اوصاف ہونے چاہییں وہ اُنھوں نے لکھ لیے، اُن کا ایک خوشنما ہار بنایا، پھر اپنی عقیدت کے مندر میں تشریف لے گئے اور وہ ہار اپنے ہُبل (اسمٰعیل دہلوی) کے گلے میں لٹکا دیا۔ اِس چنگیز خانی و ہلاکو خانی کو صدیق و فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مقدس دور جیسا بتانے کی جرأت بھی ویسا ہی شخص کر سکتا ہے، جن کی بخشش کا سید احمد صاحب نے اپنے خدا سے وعدہ لے لیا تھا۔ آئیے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے عاشقِ زار و سوانح نگار یعنی مرزا حیرت دہلوی سے پُوچھتے ہیں کہ سیّد احمد صاحب کے ساتھی اور اُن کے مقرر کردہ عُمّال کیسے تھے؛ موصوف بتاتے ہیں:

> "مجاہدین میں سب طرح کے آدمی تھے، بُرے بھی اور بھلے بھی۔ بلکہ یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ بُرے زیادہ اور بھلے کم تھے۔ کبھی علانیہ طور پر سیّد صاحب کے کسی ساتھی کو سزا نہیں دی گئی، حالانکہ اکثر ناجائز افعال اُن سے سرزد ہُوا کرتے تھے۔"[2]

اِن حضرات کو چند سال تک جو ایک مختصر سے علاقے پر جہانبانی و جہانداری کا موقع ملا، وہاں آئینِ سلطنت کیا تھا؛ شانِ حکمرانی کیا تھی؛ اِس کا اندازہ مرزا حیرت دہلوی کے اِس حیرت انگیز بیان سے کیا جا سکتا ہے:

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی: تجدید و احیائے دین، بار ہشتم، ص ۱۱۶، ۱۱۷

[2] حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۴۲

"ایک ایک چھوٹے ضلع، قصبہ، گاؤں میں ایک ایک عمّال سیّد صاحب کی طرف سے مقرر ہُوا تھا۔ وُہ بیچارہ جہانداری کیا خاک کر سکتا، اُلٹے سیدھے شریعت کی آڑ میں نئے نئے احکام بیچارے غریب کسانوں پر جاری کرتا تھا اور وُہ اُف نہ کر سکتے تھے۔ کھانا پینا، بیٹھنا اٹھنا، شادی بیاہ کرنا سب کچھ اُن پر حرام ہو گیا تھا۔ نہ کوئی منتظم تھا، نہ کوئی دادرس تھا۔ معمولی باتوں پر کفر کا فتویٰ ہو جانا کچھ بات ہی نہ تھا..... ذرا کسی کی لبیں بڑھی ہُوئی دیکھیں، اُس کے لب کتروا دیے۔ ٹخنوں سے نیچے تہ بند دیکھی، ٹخنہ اُڑوا دیا۔ تمام ملک پشاور پر آفت چھا رہی تھی۔ انتظامِ سلطنت اُن مسجد کے ملّاؤں کے ہاتھ میں تھا، جن کا جلیس سوائے مسجد کے دیوار و رسن کے کبھی کچھ نہ رہا تھا اور اب اُن کو منتظمِ امورِ سلطنت بنا دیا گیا تھا، اور پھر غضب یہ تھا کہ اُن پر کوئی حاکم مقرر نہ تھا کہ پبلک اُن کی اپیل اعلیٰ حکام کے آگے پیش کرے۔ اِن ہی بے دماغوں کے فیصلے ناطق سمجھے جاتے تھے اور تسلیم کر لیا جاتا تھا کہ جو کچھ اُنھوں نے لکھا ہے اُس میں کوئی بات بھی قابلِ تنسیخ اور ترمیم نہیں ہے۔ کیسا ہی پیچیدہ مقدمہ ہوتا تھا، اُس کی گھڑی بھر بھی تحقیق نہ کی جاتی تھی، نہ اُس پر غور کیا جاتا تھا، بس مُلّاں جی کے سامنے گیا اور اُنھوں نے جھٹ سے فیصلہ دے دیا۔ کون جھک جھک کرے اور کون تحقیق کی تکلیف برداشت کرے؟ سیّد صاحب کی خدمت میں شکایتوں کی عرضیاں گزر رہی تھیں، مگر وہاں کچھ بھی پرسش نہ ہوتی تھی۔"[1]

شاید عالیجناب ابوالاعلیٰ مودودی کی نظر میں یہ صحابۂ کرام کی یاد تازہ کی جا رہی تھی اور حضرت ابوبکر صدیق و عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا انتظامِ سلطنت موصوف کی نظر میں ایسا ہی ہوگا، اہلحدیث اور دیوبندی حضرات تو اپنے اپنے روزِ اوّل سے ہی اِن حضرات کو اربابًا من

---

[1] حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۴۳

دُونِ اللہِ بنائے ہُوئے ہیں۔ وہ اگر ایسے بیانات داغتے رہے ہیں تو کیا جائے شکایت ہے! لیکن مودودی صاحب، جو محقّق ہونے کے مدعی ہیں اور خود تحقیق کیے بغیر کسی بڑی سے بڑی ہستی کے بھی فیصلے کو تسلیم کرنے کے عادی نہیں، جب راقم الحروف نے موصوف کی زبانی "تجدید و احیائے دین" کتاب کے صفحات پر اِس قسم کی اسمٰعیل پرستی دیکھی تو حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا نہ رہی کہ برِّعظیم پاک و ہند میں ایک ایسا غیر مرئی "ہبل" بھی ہے جس کی عقیدت میں مبتلا ہوجانے کے بعد بڑے بڑے مدعیانِ تحقیق و تدقیق کو بھی یہ جرأت نہیں ہوتی یا توفیق نہیں ملتی کہ وہ نظر اٹھا کر اِتنا ہی دیکھ سکیں کہ جس کے حضور میں وُہ جھکے ہُوئے ہیں وہ عقیدتوں کا مرکز، محض ایک پتھر کی مورتی ہے یا کسی سامریِ وقت کے ہاتھوں کا گھڑا ہُوا سنہری بچھڑا!

مودودی صاحب جیسے مدعیِ عبقریت و نابغۂ عصر کہلانے والے کی بارگاہ میں اگر ہمارے جیسی ارضی مخلوق کو بھی اِذنِ لب کشائی حاصل ہے تو یہ ناچیز عرض کرنے کی جسارت کرے گا کہ جنابِ والا! اگر طبعِ مبارک پر گراں نہ گزرے تو ذرا اپنے اِن بڑوں کے دین و دیانت اور تقویٰ و طہارت کی کہانی، خود اپنوں کی زبانی سُن لیجیے:

"سید صاحب نے صدہا غازیوں کو مختلف عہدوں پر مقرر فرمایا تھا کہ وہ شرعِ محمدی کے موافق عملدرآمد کریں، مگر اُن کی بے اعتدالیاں حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ وُہ بعض اوقات نوجوان خواتین کو مجبور کرتے تھے کہ اُن سے نکاح کرلیں اور بعض اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر دو تین دوشیزہ لڑکیاں جارہی ہیں، مجاہدین میں سے کسی نے اُنھیں پکڑا اور زبردستی مسجد میں لے جاکر نکاح پڑھا لیا۔"[1]

کیا فرماتے ہیں علمائے اہلحدیث و مفتیانِ دارالعلوم دیوبند و سہارنپور اور محققینِ جماعتِ اسلامی اِس بارے میں کہ راستہ چلتے ہُوئے کسی کی نوجوان لڑکی کو زبردستی پکڑ کر نکاح کرلینے سے جبکہ اُس لڑکی کی قطعاً رضامندی نہ ہو، اُس کے ولی کی اجازت نہ ہو، بلکہ ولی کو خبر تک نہ ہو کیا ایسا جبری نکاح شرعاً جائز ہے یا زنا محض؟ ایسے نکاح سے جو اولاد پیدا ہوگی اُس کا

---

[1] حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۴۲

شرعی حکم کیا ہے؟ اِس طرح مسلمانوں کی نوجوان لڑکیوں کو جبراً اپنے گھروں میں ڈال لینے والے، اُن کی عصمتوں پر ڈاکہ ڈالنے والے، صحابۂ کرام کی یاد تازہ کر رہے تھے یا بدکاری کا دنیا میں نرالا ریکارڈ قائم کر رہے تھے؟ یہ صدیق و فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے دَور کا نمونہ پیش کیا جا رہا تھا یا یزید پلید سے لے کر آج تک کے مسلمان کہلانے والے جملہ بدچلن اور بدقماش حکمرانوں کے اگلے پچھلے سب ریکارڈ توڑ کر بین الاقوامی چیمپئن شپ حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی؟ ؎

خار کو گُل اَور گل کو خار جو چاہے کرے
تُونے جو چاہا کیا، اے یار جو چاہے کرے

اِسی سلسلے میں تسکینِ خاطر و اطمینانِ قلب کی غرض سے ذرا یہ عبارت بھی ملاحظہ فرمالی جائے:

> "ایک نوجوان خاتون نہیں چاہتی کہ میرا نکاحِ ثانی ہو مگر مجاہد صاحب زور دے رہے ہیں، نہیں، ہونا چاہیے۔ آخر ماں باپ اپنی نوجوان لڑکی کو حوالۂ مجاہد کرتے تھے اَور اُن کو کچھ چارہ نہ تھا۔" [1]

اگر مودودی صاحب اور دیگر وہابی علماء کی طبعِ نازک پر گراں نہ گزرے تو اس طرزِ عمل پہ مرزا حیرت دہلوی کا تبصرہ بھی ملاحظہ فرمالیا جائے:

> "یہ محض ناممکن تھا کہ نوجوان عورت رانڈ ہو کے عدّت کی مدّت گزر جانے پر بے خاوند بیٹھی رہے۔ اُس کا جبراً نکاح کیا جاتا تھا، خواہ اُس کی مرضی ہو یا نہ ہو۔ پشاور میں بڑے بڑے سرداروں میں نکاحِ ثانی کی رسم نہ تھی اور اُسے سخت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ مانا کہ نکاحِ ثانی قرآنی حکم ہے، مگر جس ناگوار طریقہ سے وُہ پبلک کے آگے پیش کیا گیا تھا، وُہ ناقابلِ برداشت تھا۔" [2]

یہ بیانات کسی تعارف و تبصرہ کے محتاج نہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہابی

---

[1] حیرت دہلوی مرزا، حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۴۲

[2] ایضاً: ص ۲۴۲

حضرات کی خدمت میں اُن کے برطانوی صدیقوں اور فاروقوں کا طرزِ عمل بھی اِس سلسلے میں پیش کر دیا جائے۔ مرزا حیرت دہلوی نے اپنے مَٹھ مندر کے پروہتوں کو بچاتے ہوئے، لیپا پوتی سے کام لیتے ہُوئے، اُن کے بارے میں یُوں وضاحت کی ہے:

"بد قسمتی سے ایک نیا گُل کھلا۔ گُل کیا کِھلا، گویا غازیوں یا مجاہدوں کی زندگی کے شیرازے کو اُس نے پراگندہ کر دیا۔ باہم یہاں کے کُل عُمّال نے جن کی تعداد ہزار سے بھی زیادہ بڑھی ہُوئی تھی، ایک فتوٰی مرتب کیا اور اُسے پوشیدہ مولوی اسمٰعیل کی خدمت میں بھیج دیا۔ فتوٰی کا مضمون یہ تھا کہ بیوہ کا نکاح ثانی فرض ہے یا نہیں؛ مولانا شہید کیا واقف تھے کہ ملک پشاور میں یہ آگ پھیل رہی ہے اور اِس وقت اِس فتوٰی کی اشاعت سخت غضبناک ہوگی۔ آپ نے سادہ طور پر، اُس پر اپنی مُہر کر دی اور سیّد صاحب کی بھی اُس پر مُہر ہوگئی اور پھر وُہ فتوٰی قاضیِ شہرِ پشاور، سیّد مظہر علی صاحب غازی کو بھیج دیا گیا۔ اُنھوں نے اِس فتوٰی کی اشاعت ہی پر قناعت نہ کی بلکہ یہ اعلان دے دیا کہ تین دن کے عرصہ میں، ملک پشاور میں جتنی رانڈیں ہیں، سب کے نکاح ہو جانے ضرور ہیں، ورنہ اگر کسی گھر میں بے نکاح رانڈ رہ گئی، تو اُس گھر کو آگ لگا دی جائے گی"[1]

سیّد احمد صاحب نے اپنے ساتھیوں کے پاسِ خاطر سے، صدیق و فاروق رضی اللہ تعالٰی عنہما کے دور کی جناب ابوالاعلٰی مودودی کی نظر میں یاد تازہ کرنے کی غرض سے، کیسے کیسے کالے قانون رائج کیے۔ اِس امر کا اندازہ کرنے کے لیے مذکورہ فتوٰی ہی کون سا کم ہے لیکن مزید تسلّی کی خاطر اِن کے خانہ ساز امیر المومنین کا ایک اعلانِ عام پیش کرتے ہیں۔ کسی یورپین مورّخ کا بیان ہے، جِسے مرزا حیرت دہلوی نے اپنے لفظوں میں یُوں نقل کیا ہے:

"آپ کے ساتھی غریب الوطن تھے اور اب اُنھیں جوروؤں کی بھی خواہش تھی، تو آپ (سیّد صاحب) نے ایک فرمان جاری کیا کہ جتنی کنواری لڑکیاں ہیں وہ سب

---

[1] حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۴۳، ۲۴۴

ہمارے لیفٹیننٹ کی خدمت میں مجاہدین کے لیے حاضر کی جائیں گی، اگر اُن کی شادی بارہ دن میں نہ کر دی گئی۔ قوم کی قوم اِس اعلان سے بھڑک اُٹھی"۔[1]

سرحد کے مسلمانوں نے طوعاً و کرہاً اِن حضرات کے ہر ظلم کو برداشت کیا۔ مجبوراً اِن کے جور و ستم کی چکی میں پستے رہے لیکن آئے دن اُن کے ننگ و ناموس سے جو کھیلا جا رہا تھا یہ معاملہ ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا۔ لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا اور کسی بھی مقام سے پھٹنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ لیکن پھٹنے کا موقع آیا تو زبین ہی کھل گئی۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا فتویٰ جاری ہو گیا کہ بیوہ کا نکاح ثانی فرض ہے۔ قاضی مظہر علی نے پورے ملک میں اِس فتوے کو مشتہر کر کے اعلان کر دیا کہ تین دن میں جملہ بیوگان کے نکاح ہو جانے ضروری ہیں ورنہ جس گھر میں کوئی بیوہ پائی گئی، اُس گھر کو آگ لگا دی جائے گی، خود سید صاحب یوں گرجے کہ علاقے کی ساری کنواری لڑکیاں مجاہدین کے لیے ہمارے پاس پہنچا دینی چاہییں، بارہ روز کی مہلت ہے۔

یہ ہے اِن حضرات کے دین و دیانت اور تقویٰ و طہارت کی کہانی۔ معلوم نہیں مودودی صاحب اور دیگر جملہ وہابی علماء و مورخین اپنے اِس اینگلو انڈین بدچلن گروہ کے اخلاقیات کو کون سے پیمانے سے ناپ کر صحابہ کی یادگار بتا دیا کرتے ہیں؟ آخر قیامت ایک روز ضرور آ کر رہے گی۔ اگر حق و باطل کا فیصلہ کرنا یہاں منظور نہیں، بلکہ اِن حضرات کو یہاں اِس دھاندلی میں فائدہ نظر آتا ہے، رات کو دن اور دن کو رات بتانے میں ہی کوئی منفعت دکھائی دیتی ہے، تو اِن حضرات کی زبان اور قلم پر پہرہ کون بٹھا سکتا ہے؟ لیکن کیا بروزِ قیامت بھی یہ دھاندلی، یہ چمکیلے بیانات، یہ خوشنما اعلانات، یہ سمجھانے والوں پر بہتانات کچھ کام آ سکیں گے؟ یہ چرب زبانی و رنگِ تقریر اور یہ زورِ قلم و سلیقۂ تحریر کیا بوقتِ حساب کچھ کام آ جائے گا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔

اس طرزِ عمل نے، اِس بے غیرتی و بداندیشی نے جو رنگ دکھانا تھا وہی سامنے آیا۔ جو خیال و خواب میں بھی نہیں تھا وُہ دن دیکھنا پڑا۔ اقتدار کی بدمستی میں فکرِ انجام سے بے خبر ہو کر جو سیاہ کاریاں کی جا رہی تھیں وہ رنگ لائیں۔ دنیا میں ہی روزِ حساب آیا۔ وحی و عصمت اور

---

[1] حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص، ۲۴

کشف و کرامت کے سارے جھوٹے دعوے رفو چکر ہو گئے ، خدا کی لاٹھی بے آواز ہے، اُس کی پکڑ سے چھڑانے والا کون ؟ ہُوا کیا ؟ ملاحظہ فرمائیے :

”اِس اعلان کا شائع ہونا تھا تمام ملک مجاہدین کے خلاف شمشیر بدست ہو گیا۔ بہت دھوم دھام سے سازشیں ہونے لگیں اور ایک عام کہرام تمام ملک پشاور میں مچ گیا۔ بڑے بڑے خوانین جو اپنی رانڈ لڑکیوں کا نکاح کرنا سخت عیب خیال کرتے تھے بڑے برافروختہ ہُوئے اور اُنھوں نے باہم یہ مشورہ کیا کہ تین دن کی مدت میں اِن سب کو یہیں تہِ تیغ کر ڈالو۔ مجاہدین نے بھی آخر وقت میں جا کے، جب سب سامان ہو چکا تھا، اُن کے تیور پہچانے اور اب وہ خائف ہو کر سید صاحب کو لکھنے لگے کہ یہاں یہ کیفیت نظر آتی ہے۔ سید صاحب کچھ ایسے بے پروا ہو گئے تھے کہ اُنھوں نے کچھ بھی خیال نہ کیا، نہ مُخبروں کی خبروں پر کچھ توجہ کی، جو دم بدم یہ پرچہ گزار رہے تھے کہ آپ جلد فوج لے کر اِس طرف روانہ ہوں، ورنہ خاتمہ ہی ہوا چاہتا ہے۔ سید صاحب نے مطلق توجہ نہیں کی۔ آخر نتیجہ یہ ہُوا کہ حاکمِ اعلیٰ مولوی سید مظفر علی صاحب، جو اِس آتش فشاں فتوے کے بانی مبانی اور اشاعت دہندہ تھے اور جنھیں سید صاحب نے بڑے اعتبار اور بھروسہ سے مقرر کیا تھا، سلطان محمد حاکمِ پشاور کے دربار میں مع ساتھیوں کے بلائے گئے اور فوراً اُن کا سر قلم کیا گیا اور عام حکم دے دیا گیا کہ ایک ایک مجاہد قتل کیا جائے۔ ساری رات میں کُل مجاہدوں کی، جو بطور منتظم مختلف حصص میں متعین تھے، گردنیں اڑا دی گئیں اور نہایت بے کسی کی حالت میں، اُن میں سے اکثر سڑکوں پر بکروں کی طرح لٹا کر ذبح کیے گئے۔“[1]

لڑکیوں کو زبردستی چھیننا، زبردستی نکاح کا ڈھونگ رچا کر اپنی شیطنت پالنا تو ایک طرف رہا، جن مسلمانوں کو واجب القتل، مستحل الدم قرار دیا گیا، جنھیں اصل کافر اور اہلِ کتاب

---

[1] حیرت دہلوی مرزا : حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۴۴

ٹھہرایا گیا، جن کے مال کو غنیمت کا مال سمجھ کر لُوٹتے رہے، جنھیں کلاب النار اور ملعونین اشرار تک بنایا گیا، آخر اُن سے اور کسی سلوک کی توقع کس بنا پر رکھی جا سکتی تھی؟ کشتی کو بھنور میں پھنسا کر آنکھیں بند کر لینے سے طوفان ٹل نہیں جاتا، ظلم وستم کی آندھی جب چڑھتی ہے تو اُس کی ہولناکی کتنے ہی دلوں کو ہلا دیتی اور کئی ہرے بھرے اور تنومند درختوں کو بھی بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکتی ہے لیکن چند ساعتیں گزرنے کے بعد کہیں اُس کا نام ونشان بھی نظر نہیں آتا۔ یہ حضرات مسلمانوں پر ظلم وستم کی آندھی بن کر چھا تو گئے لیکن ساحرِ برطانیہ نے اِنھیں کس درجہ مسحور کیا تھا، اِس کا اندازہ لگانے کے لیے یہی حقیقت کافی ہے، کہ انبیائے کرام سے بھی آگے بڑھ کر جو قدم قدم پر الہاموں کے دعوے کر رہے تھے، وُہ اپنے افعال وکردار پر مطلع ہونے کے باوجود تازیست نوشتۂ دیوار پڑھنے سے عاجز رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب عذابِ الٰہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو طاقت وجمعیت ہونے کے باوجود، ہمت جواب دے گئی، اوسان خطا ہو گئے، سارے وسائل حرفِ غلط کی طرح بے معنی نظر آنے لگ گئے۔ اُس وقت اِن حضرات کی جو حالت تھی، اُس کی منظرکشی یُوں کی گئی ہے:

> ”یہ خُونی خبرِ وحشتناک آگ کی طرح، پنجتار میں سیّد صاحب کے گوشِ حقیقت نیوش میں بھی پہنچی۔ آپ یہ خبر گوش گزار فرما کے خون کے آنسو روئے اور ایسا صدمہ ہُوا کہ کُل ارادے پست ہو گئے اور ایسی مایوسی چھائی کہ انتقام کی بھی ہمت نہ رہی۔ پیارے شہید کا دل سب سے زیادہ ٹوٹ گیا تھا اور وُہ سخت حرمانی کی بھری ہُوئی نظروں سے چاروں طرف تکنے لگے۔ اب کیا تھا، کمر ٹوٹ چکی تھی اور پیروں کے نیچے سے زمین نکل چکی تھی۔ ظاہر تھا کہ کئی برس خُون پسینہ ایک کر کے پنجاب کے بڑے حصّہ پر سکّہ بٹھایا تھا اور وُہ آناً فاناً میں یُوں خیرباد ہو گیا۔ کثیر التعداد مجاہدین کا مارا جانا بھی قہرناک تھا اور پشاور کا ملک چھن جانا تو سب سے ہی زیادہ خونی اثر پیدا کرنے والا تھا۔ اِن تمام ناگفتہ بہ غمناک صورتوں نے مولانا شہید کو بٹھا دیا اور پھر اِس شیر میں بھی یہ اولوالعزمی نہ رہی کہ وُہ اپنے دوستوں کا عوض لیتا۔ اب اُس نے اپنی شکستہ دلی

انسان اپنی یا کسی کی غلطی کو محسوس کرے تو اُس سے بچنا ممکن رہتا ہے لیکن جب غلطی کی صحت پر اُسے اصرار ہو تو یہ اصلاح کے مسدود و مفقود ہو جانے کا مقام ہوتا ہے اور اِسے جہلِ مرکب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ محمد جعفر تھانیسری اور خصوصاً مہر صاحب کی نظر میں سراسر قصور وار ہیں تو مسلمانانِ سمّہ اور خاص طور پر سلطان محمد خاں۔ چنانچہ جنابِ غلام رسول مہر تو اپنی مورّخانہ اور ادیبانہ شان کے ساتھ سوال کرتے ہیں کہ بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ یعنی یہ جماعت کس جرم کی پاداش میں قتل کی گئی ؟ لیکن اگر موصوف سے کوئی سوال کرتا کہ ہزاروں مسلمانوں کو اِن حضرات نے کس جرم کی پاداش میں قتل کیا تھا اور اِنھیں جھوٹے الہاموں کا سہارا لے کر مسلمانوں کا امیر المومنین بن بیٹھنے اور بیعت سے انکار کرنے پر اُنھیں واجب القتل ٹھہرانے کا حق کون سی شریعت نے دیا تھا، تو یہ حمایتی حضرات اِس جہان میں یا خدا کی بارگاہ میں کیا جواب دیں گے ؟ اِس بارے میں اپنی عقیدت کو برقرار رکھنے کی خاطر سیّد صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کو بزورِ قلم بچاتے ہوئے مرزا حیرت دہلوی نے یُوں حقیقت بیان کی ہے:

> "مولانا شہید نے تو اِس محنت اور جانکاہی سے ملک پنجاب کے اتنے بڑے حصّہ کو مسلمانوں کے لیے صاف کر دیا تھا اور ناتجربہ کاروں نے چند بے اعتدالیوں سے اپنی جانیں بھی کھوئیں اور مفتوحہ ملک چھنوا دیا، ایسا کہ تسمہ تک لگا ہوا باقی نہ چھوڑا۔ وہ عظیم الشان بہادر جس نے رنجیت سنگھ جیسے شیرِ پنجاب کے خونخوار پنجوں سے اتنا بڑا ملک چھین لیا تھا، خر دماغ ملّانوں نے اِس آسانی سے اپنی جانوں کے ساتھ اُسے بھی کھو دیا۔"[1]

موصوف نے اِن حضرات کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر اِن لفظوں میں بھی تبصرہ کیا ہے:

> "حقیقت میں یہ صحیح ہے کہ ناتجربہ کاروں کی ہمراہی ایک مدبّرِ اعلیٰ کی لائقہ تدابیر کو بدنما لباس پہنا دیتی ہے۔ جو کچھ پیارے شہید نے کیا، اُس کے کاموں کا بہت سا حصّہ ہر عیب و خطا سے پاک ہے، ہاں بعض بعض امور ملکی میں اُس سے

---

[1] حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۴۸

سخت غلطیاں سرزد ہوئیں، لیکن پھر بھی اُن غلطیوں کا اثر اُسی کی ذات تک رہا، دوسرے اُس کے ساتھیوں پر نہ پڑا۔ مگر حیف صد حیف، اُس کے ہمراہیوں نے تو لذائذ نفسانیہ اور اپنی خر دماغی سے لٹیا ہی ڈبو دی اور ایسا ستیاناس کر دیا کہ اُسے ملک پنجاب چھوڑتے ہی بن پڑا۔"[1]

مرزا حیرت دہلوی نے اہلحدیث ہونے کی بنا پر اپنے ممدوحین کی خارجیت اور اُن کے نئے مذہب کا تو ذکر نہیں کیا لیکن جن سیاسی امور کا تذکرہ کیا ہے، اُن میں اِس جماعت کے غلط طرزِ عمل کا حقیقت پسندی کے ساتھ اعتراف کیا ہے کیونکہ یہی چیز تو تھی جو ان کی تباہی کا باعث بنی، جبکہ غلام رسول مہر نے محض سخن سازی کے ذریعے حقیقت کو غتر بود کرنے کی کوشش ہی کی ہے۔ قارئین کرام سے التماس کروں گا کہ اِس کتاب میں مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور سیّد احمد صاحب کے بارے میں راقم الحروف کی گزارشات کو سامنے رکھیں، جو دلائل اُن کی تصانیف یا اُن کے بارے میں دیگر کتابوں سے نقل کیے گئے ہیں، وہ مدنظر رہیں اور پھر حاکمِ پشاور، سلطان محمد خاں کے اِس بیان کو پڑھیں جو اُس نے سیّد احمد صاحب کے ایک مکتوب کے جواب میں تحریر کیا تھا:

> "جہاد کی باتیں ابلہ فریبی کا کرشمہ ہیں۔ تم لوگوں کا عقیدہ بُرا اور نیت فاسدہ ہے۔ بظاہر فقیر بنے بیٹھے ہو، دل میں امارت کی ہوس ہے۔ ہم نے خدا کے نام پر کمر باندھ لی ہے کہ تمھیں قتل کریں، تاکہ زمین تمہارے وجود سے پاک ہو جائے۔"[2]

جنگِ مایار میں سلطان محمد خاں نے شکست کھائی، مصالحت ہونے پر حاکمِ پشاور نے بوقتِ ملاقات سید صاحب کو ہندوستانی علماء کا ایک محضر بنا دیا۔ اُس میں کیا درج تھا؟ یہ جناب غلام رسول مہر کی زبانی سُنیے:

> "اِس ملاقات میں سلطان محمد خاں نے ایک فتویٰ یا محضر خریطے سے نکال کر سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ اُس پر بہت سی مُہریں ثبت تھیں۔ محضر

---

[1] حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۴۷

[2] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۶۱۴

میں خوانینِ ستّہ سے خطاب تھا۔ مضمون یہ تھا کہ سید احمد چند عالموں کو اپنے ساتھ ملا کر، تھوڑی سی جمعیت کے ہمراہ افغانستان گئے ہیں۔ وہ بظاہر جہاد فی سبیل اللہ کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن یہ اُن کا فریب ہے۔ وہ ہمارے اور تمھارے مذہب کے مخالف ہیں۔ ایک نیا دین اُنھوں نے نکالا ہے۔ کسی ولی یا بزرگ کو نہیں مانتے، سب کو بُرا کہتے ہیں۔ انگریزوں نے اُنھیں تمھارے ملک کا حال معلوم کرنے کی غرض سے جاسوس بنا کر بھیجا ہے۔ اُن کی باتوں میں نہ آنا۔ عجب نہیں تمھارا ملک چھنوا دیں۔ جس طرح بھی ہو سکے، اُنھیں تباہ کرو۔ اگر اِس باب میں غفلت اور سُستی برتو گے تو پچھتاؤ گے اور ندامت کے سوا کچھ نہ پاؤ گے۔"[1]

اِس محضر کی، جو مہر صاحب کے لفظوں میں نقل کیا گیا ہے، مندرجہ ذیل باتیں قابلِ غور ہیں:

۱۔ علمائے ہند نے سید احمد صاحب اینڈ کمپنی کے دعویٰ جہاد کو فریب کیوں بتایا؟

۲۔ اُن علمائے نے اِس جماعت کا مذہب ہندوستانی اور سرحدی مسلمانوں کے مذہب کے خلاف بتایا۔

۳۔ اِن جہاد کا دعویٰ کرنے والوں کے متعلق کہا کہ اِنھوں نے نیا دین رائج کیا ہے۔

۴۔ سید احمد صاحب اور اُن کے رفقاء کو انگریزوں کے ایجنٹ قرار دیا۔

اگر یہ الزامات محض بے بنیاد تھے تو اِس سے زیادہ سنگین الزام کسی مسلمان کہلانے والے پر اور کیا لگایا جا سکتا ہے؟ چاہیے تھا کہ جناب غلام رسول مہر جیسا بال کی کھال نکالنے والا مورخ، دلائل کی روشنی میں اِن دعاوی کو بے بنیاد ثابت کر دکھاتا۔ لیکن موصوف نے اپنی ضخیم تصنیف میں بھان متی کا کنبہ جوڑنے اور اپنے ممدوح کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے تو ملانے کی خوب کوشش کی لیکن اِن الزامات کو بے بنیاد ثابت کرنے کے نام ہی سے دل دہلنے لگتا ہوگا، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہوگا۔ خیر جانے دیجیے، یہ ہندوستانی علمائ کے خیالات تھے۔ علمائے پشاور کے سامنے اِن حضرات کی گزشتہ تاریخ نہیں تھی۔ وہ اِن لوگوں کے سابقہ کردار

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۶۱۴

اور حالاتِ زندگی سے بے خبر تھے۔ پشاوری علماء نے ان حضرات کے بارے میں جو رائے قائم کی وہ عین الیقین اور مشاہدات کی بنا پر قائم کی، علماءِ پشاور کے تاثرات ان حضرات کے بارے میں کیا تھے مہر صاحب کی زبانی سُنیئے:

”شاہ اسمٰعیل کے مجموعہ مکاتیب میں دو مکتوب ایسے ہیں جو پشاور کے دس علماء کے نام بھیجے گئے۔ پہلا ربیع الثانی ۱۲۴۵ھ (۲۰ر اکتوبر ۱۸۲۹ء) کو دُوسرا ۷ر شوال ۱۲۴۵ھ (۱۱ر اپریل ۱۸۳۰ء) کو۔ اِن سے ظاہر ہے کہ اُن علماء کی طرف سے سیّد صاحب اور آپ کے رفقاء پر کئی الزام لگائے گئے تھے۔ مثلاً:

۱۔ سیّد صاحب اور آپ کے رفقاء الحاد و زندقہ میں مبتلا ہیں۔ اِن کا کوئی مذہب و مسلک نہیں نفسانیت کے پیرو ہیں اور لذتِ جسمانی کے جویا۔

۲۔ وہ ظلم و تعدّی کے خوگر ہیں۔

۳۔ بلاوجہ شرعی مسلمانوں کے اموال و نفوس پر دست درازی کرتے ہیں۔

۴۔ سیّد صاحب انگریزی رسالے میں ملازم تھے۔ مولانا اسمٰعیل اور بعض دُوسرے لوگوں نے اُنھیں مہدی موعود قرار دیا۔ انگریزوں نے اُنھیں ملک سے نکال دیا۔

۵۔ وہ مکّہ معظمہ پہنچے وہاں سے براہِ مسقط و بلوچستان قندھار گئے۔

۶۔ خادے خاں کو مُلّا عبدالغفور (اخوند سوات) کے ذریعے سے صلح کے بہانے بلایا اور قتل کرا دیا۔

۷۔ وہ افغانوں کی لڑکیوں کو جبراً جدید الاسلام ہندوستانیوں کے حوالے کرتے ہیں۔“ [1]

معلوم یہ ہوتا ہے کہ مہر صاحب نے اِن الزامات کو اپنے پسندیدہ الفاظ کا جامہ پہنایا ہے تاکہ وُہ از خود ہی غلط نظر آنے لگ جائیں مثلاً —— ”انگریزوں نے اُنھیں ملک سے نکال دیا ہے“۔ یا مکہ معظمہ سے قندھار پہنچنا یا خادی خاں کو بلا کر قتل کرانا وغیرہ۔ موصوف نے اِن الزامات کے

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۴۵۹، ۴۶۰

بارے میں اپنا فیصلہ یوں صادر فرمایا ہے:

"اِن الزامات کی تردید میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، اِس لیے کہ سراسر بے اصل ہیں ممکن ہے یہ الزامات بھی اُسی محضر سے ماخوذ ہوں، جو سلطان محمد خاں نے پیش کیا۔"[1]

اگر مہر صاحب ذرا صاف گوئی سے کام لیتے اور الزامات کو پڑھ کر لرزہ طاری نہ ہو جاتا، تو اِس طرح بھی لکھ سکتے تھے کہ: "علمائے سرحد کے الزامات کی تردید کرنے کی ہمارے کسی بڑے سے بڑے میں ہمت نہیں۔ اِس لیے کہ الزامات حقیقت کے عین مطابق ہیں۔" اگر موصوف صرف اتنا لکھنے کی ہمت کر لیتے تو یہ ایک فقرہ اُن کی سولہ[۱۶] سالہ کاوش یعنی کتاب سید احمد شہید سے سولہ گنا بڑا کارنامہ ہوتا، لیکن مقدّر نے یاوری نہ کی اور ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ موجودہ وہابی علماء و مورّخین علمائے سرحد کے الزامات پر حقائق کی روشنی میں غور و فکر کریں اور دیکھیں: ؎

اسپِ تازی شدہ مجروح بہ زیرِ پالان
طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خر می بینم

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۶۶۰

خوابِ نبوت

جناب غلام رسول مہر کی تحقیق کے مطابق سید احمد صاحب کی پیدائش تکیہ رائے بریلی کے مشہور سادات خاندان میں، ۶ صفر ۱۲۰۱ھ / ۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء کو ہوئی۔ جب چار سال، چار ماہ، چار دن کے ہوئے تو پڑھنے کے لیے مکتب میں بٹھائے گئے۔ ابتدائی تعلیمی حالت یہ تھی:

> "کوششوں کے باوجود سیّد صاحب کی طبیعت تحصیلِ علم کی طرف مائل نہ ہوئی۔ مخزن احمدی کا بیان ہے کہ تین برس تک برابر مکتب جاتے رہے لیکن اس مدت میں قرآنِ پاک کی چند سُورتیں حفظ کر سکے اور مفرد حروف کے سوا کچھ لکھنا نہ آیا۔ آپ کے بڑے بھائی سیّد ابراہیم اور سیّد اسحاق بار بار لکھنے پڑھنے کی تاکید کرتے رہتے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ والد بزرگوار اِس تاکید کو بالکل بے سُود سمجھ چکے تھے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: اِس کا معاملہ خدا پر چھوڑ دو، جو کچھ اس کے لیے مستحسن اور اولیٰ ہوگا، ظہور میں آجائے گا۔ ظاہراً تاکید مفید نظر نہیں آتی۔"[1]

مولانا محمد جعفر تھانیسری نے آپ کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں یُوں وضاحت کی ہے:

> "تین برس آپ مکتب میں رہے مگر سوائے قرآن کی چند سُورتوں کے آپ کو کچھ بھی یاد نہ ہُوا۔"[2]

مرزا حیرت دہلوی نے سیّد صاحب کی تحصیل علم کے بارے میں اپنی تحقیق یُوں پیش کی ہے:

> "یہ تعجب سے نظر کیا جاتا ہے کہ بزرگ سیّد بچپن میں اپنے غیر معمولی سکوت کی وجہ سے پرلے درجے کا غبی مشہور ہو گیا تھا اور لوگوں کا خیال تھا، اِسے تعلیم دینا بے سُود ہے، کبھی کچھ آئے جائے گا نہیں۔ میں ذہن کی بابت کوئی رائے قایم نہیں کر سکتا، صرف اِس قدر لکھنا کافی سمجھتا ہوں کہ سیّد کی بچپن میں کیا پوری عنفوانِ جوانی میں بھی لکھنے پڑھنے کی طرف طبیعت رجوع نہ تھی۔"[3]

---

[1] غلام رسول مہر: سیّد احمد شہید، ص ۶۱

[2] محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، ص ۵۳

[3] حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۳۴

موصوف نے سیّد صاحب کے ذہن کے بارے میں اپنی کوئی رائے تو ظاہر نہیں کی لیکن سیّد صاحب کے علم سے کورے رہنے اور اُن کے ذہن کی کیفیت و تیزی ضرور بیان کر دی ہے۔ مثلاً وہ تصریح کرتے ہیں؛

"یہ نہیں تھا کہ پیارا اور واجب الاحترام سیّدؒ سبق کے یاد کرنے میں محنت نہ کرتا ہو اور شرارت سے ڈھیٹ بنا خاموش بیٹھا رہتا ہو۔ نہیں، وہ بخوبی محنت بھی کرتا تھا۔ میاں جی کے کہنے کے موافق مکتب کے وقت کی بھی پابندی کرتا تھا، اِس پر بھی اُسے یاد نہ ہوتا تھا۔ اُس کے ذہن اور یادداشت کا یہ آتار چڑھاؤ دیکھ کے یہ خیال آتا تھا کہ جیسے چلتی گاڑی میں کوئی رُوڑا اٹکا دیتا ہے اور پھر وہ بیلوں کی طاقت سے بھی نہیں چلتی، سوائے اِس کے کہ اُس پر انتہا درجے کا زور لگایا جائے تو پہیّہ دو چار انچ زمین سے رگڑ کھاتا ہُوا بمشکل آگے بڑھے گا۔ یہی کیفیت بعینہٖ بزرگ سیّد کی تھی۔ جب وہ ایک ایک جملہ کو گھنٹوں جپے جاتا تھا، تب کہیں کسی قدر یاد ہوتا تھا اور دوسرے دن تماشا یہ تھا کہ وُہ بھی چوپٹ۔ جب یہ کیفیت ہُوئی تو والدین اور میاں جی کی تنبیہ بڑھنے لگی اور گھُرکی، جھڑکی، آنکھیں نکالنے سے گزر کے مار پیٹ تک نوبت پہنچ گئی۔ اِس سے بھی والدین کی آرزو پُوری نہ ہُوئی۔ جب اُنھوں نے یہ دیکھا کہ قدرتی طور پر اِس کے دماغ میں قفل لگ گیا ہے اور یہ کسی طرح کی تنبیہ سے بھی نہیں پڑھ سکتا تو ناچار ہو کے پڑھنے سے اُٹھا لیا اور زیادہ جبر کر کے معصوم جان کو گھُلنے نہ دیا۔" [1]

جناب غلام رسول مہر نے سیّد صاحب کی نوجوانی کے دَور میں ذہنی اور تعلیمی حالت کے بارے میں جبکہ وُہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) کے پاس تھے، یُوں وضاحت کی ہے؛

"مولوی عبدالقیوم کا بیان ہے، اثنائے تحصیلِ علم میں سیّد صاحب کی یہ کیفیت

---

[1] حیرت دہلوی مرزا، حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۳۳۶

ہوئی کہ جب کتاب کو دیکھتے تو حروف اُن کی نظروں سے غائب ہو جاتے۔ خیال ہوا کہ شاید کوئی بیماری ہو گئی ہے۔ طبیبوں سے رجوع کیا گیا، مگر یہ کیفیت زائل نہ ہوئی۔ شاہ عبد العزیز تک یہ بات پہنچی تو اُنھوں نے فرمایا: جالی وغیرہ باریک چیزوں پر نظر جماؤ اور دیکھو کہ وہ بھی نظروں سے غائب ہوتی ہیں یا نہیں؟ کوئی باریک سے باریک چیز غائب نہ ہُوئی، تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ پڑھنا چھوڑ دو۔ جب کسی نیاز مند نے اس حکم کا سبب پوچھا تو فرمایا: اگر اور باریک چیزیں غائب نہیں ہوتیں تو معلوم ہوا کہ یہ مرض نہیں۔ ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم ظاہری اِن کی قسمت میں نہیں۔"[1]

اِن تصریحات کی روشنی میں مرزا حیرت دہلوی کا بیان بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ سیّد صاحب بچپن تو کیا جوانی میں بھی علم کی دولت سے محروم رہے کیونکہ اُن کے دماغ میں قُفل لگا ہُوا تھا۔ بائیس تئیس سال کی عمر تک یہی تعلیمی کیفیت اور ذہنی حالت رہی۔ باقی عمر میں علم کے نزدیک تک جانے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ چونکہ حالت نیم مجذوبانہ تھی، اِسی لیے ادعائے نبوت کے لیے کسی کی نگاہوں میں جچ گئے۔ انگریزوں سے ملاقاتیں شروع ہو گئی ہوں گی کہ نواب امیر خاں کی ملازمت کے دوران ہی الہامات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اُدھر کسی انگریز حاکم کی طرف سے رازداری کی بات ہوتی، اُسے خدا کی طرف منسوب کر کے، الہام کے نام سے مشتہر کرنا شروع کر دیا جاتا تھا۔ اُدھر مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے صراطِ مستقیم کتاب لکھ کر موصوف کے اندر نبوت کے تمام اوصاف بدرجہ کمال بتا دیے بلکہ سیّد الانبیا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مماثل ثابت کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا تھا۔ جب سوانح نگاروں اور حاشیہ برداروں کی باری آئی تو اُنھوں نے سیّد صاحب کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات و واقعات میں ایسا رنگ بھرنا شروع کر دیا کہ اگر اُنھیں کوئی، بعد از خدا بزرگ تُوئی، کے منصب پر سرفراز نہ بھی سمجھے تو سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے برابر مانے بغیر تو چارہ نہ رہے۔ سیّد احمد صاحب ابھی

---

[1] غلام رسول مہر: سیّد احمد شہید

شکمِ مادر میں تھے کہ اُس وقت بھی اُن کا وجود نورِ مصطفوی جیسا نظر آیا۔ چنانچہ یہی کچھ منوانے کی خاطر غلام رسول مہر نے وقائع احمدی کی ایک گھڑنت یُوں مشتہر کی ہوئی ہے:

> "سیّد صاحب جب والدہ کے پیٹ میں تھے تو اُس محترمہ نے ایک روز خواب دیکھا کہ میرے خون سے ایک کاغذ لکھا گیا ہے جو تمام عالم میں اڑتا پھرتا ہے۔ اِس پر متشوّش ہُوئیں۔ یہ خواب اُن کے داماد عبد السبحان نے سُنا تو کہا کہ تشویش کی ضرورت نہیں۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ جو کچھ آپ کے پیٹ میں ہے، وہ دنیا میں بہت نامور ہوگا۔ ایامِ حمل تکمیل کے قریب پہنچے تو یکایک حمل کے ظاہری آثار میں کمی آگئی۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ وضع کا زمانہ ابھی دور ہے۔ تھوڑے دن بعد سو کر اُٹھیں تو پھر پُورے آثار نمودار ہو گئے۔ صفر کی چھٹی تاریخ کو سیّد صاحب پیدا ہُوئے۔"[1]

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی والدۂ ماجدہ کا خواب ہیں تو سید صاحب کو یہ حضرات کیسے پیچھے رہ جانے دیتے۔ لہٰذا خواب تیار کر لیا۔ لیکن یہ حضرات اگر فنِ تعبیر سے مس رکھتے تو اِس خواب کو جس طرح فخریہ مشتہر کر رہے ہیں، اِس سے زیادہ چھپانے کی کوشش کرتے، کیونکہ اِس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ وارد ہونے والا کسبِ رزق کے بعض ناجائز ذرائع کا مروّج و موجد ہوگا، اِس لیے کہ قرآن کریم میں جن چار اشیاء کی حرمت یکجا مذکور ہے، اُن میں سے ایک (وَالدَّمَ) یعنی خون ہے۔ علاوہ بریں آنے والا یُفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ یعنی فتنہ و فساد اور قتل و خونریزی میں شہرت و ناموری حاصل کرے گا۔ یہ ہے اِس خواب کی تعبیر، جس میں سے صرف شہرت و ناموری کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔

اب بیانِ مذکورہ کا دوسرا حصہ ملاحظہ فرمائیے۔ حقیقتِ محمدیہ چونکہ نور بلکہ جانِ نور ہے۔ اِسی وجہ سے جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم شکمِ مادر میں تھے تو ظاہری آثار کم ہی محسوس ہُوئے اور ایامِ حمل کی تکالیف و ثقل وغیرہ میں سے کچھ نہ تھا۔ اگر سیّد صاحب کے بارے میں کوئی ایسی گھڑنت نہ کی جاتی تو فخرِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حقیقی مرتبے سے اِن کا بناوٹی رتبہ کم رہ جاتا۔ اِسی لیے

---

[1] غلام رسول مہر، سیّد احمد شہید، ص ۶۰

قبل از وقت اِس صفت و معجزے کا انتظام یُوں کیا گیا:

"ہر چند آپ (سیّد صاحب) کے اُستاد اور باپ بھائی، آپ کی تحصیلِ علم کے واسطے کوشش کرتے تھے مگر آپ پر اِس کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ آثارِ اُمیت، نبی اُمّی کے مثل، جو بطور میراث آپ کی جبلّت میں امانت تھے روز بروز ظاہر ہونے لگے۔"[1]

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اُمّی ہونا، آپ کا معجزہ اور خصائص میں سے ہے۔ غیر انبیاء کا ان پڑھ رہنا نقص اور محرومی ہے۔ سید صاحب کی محرومی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے اُن کی اُمیت کا ڈھونگ رچانا ایک بدترین جسارت ہے۔ اگر محبوبِ پروردگار سے اس طرح مثلیت قائم کی جانے لگے تو دنیا کے کون سے جاہل اجڈ کو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نظیر منوانے کی کوشش نہ کی جا سکے گی؟ کیا زید و عمر کو آپ جیسا بتانے کی قیامت برپا نہ ہونے لگے گی؟ محمد جعفر تھانیسری نے اُمیت کا افسانہ خود نہیں گھڑا بلکہ مولانا محمد اسمٰعیل دہلوی نے ہی اِس طائفہ کو یہ سبق پڑھایا ہے:

> از بسکہ نفس عالی حضرت ایشاں بر کمال مشابہت جناب رسالتمآب علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات در بدو فطرت مخلوق شدہ بناء علیہ لوحِ فطرت ایشاں از نقوش علومِ رسمیہ و راہ دانشمندان کلام و تحریر و تقریر مصفّٰی ماندہ بود۔[2]

> چونکہ آپ (سید صاحب) کی ذات والاصفات ابتدائے فطرت سے جناب رسالتمآب علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات کی کمال مشابہت پر پیدا کی گئی تھی، اِس لیے آپ کی لوحِ فطرت، علومِ رسمیہ کے نقش اور تحریر کے دانشمندوں کی راہ وروش سے خالی تھی۔[3]

سیّد صاحب ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۶ء میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے جب حضرت شاہ صاحب نے موصوف کو ابتدائی مشاغل کی تعلیم و تربیت دینی شروع کی اور

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولانا: حیاتِ سیّد احمد شہید، ص ۵۳

[2] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، مطبع ضیائی ۱۲۸۵ھ، ص ۴

[3] صراطِ مستقیم اردو، مطبوعہ لاہور، ص ۸۸

تصورِ شیخ کی تعلیم فرمانے لگے تو سیّد صاحب کو آسمان پہ بٹھانے کی غرض سے اُن کے سر ایک عجیب و غریب واقعہ منڈھ دیا گیا۔ مثلاً محمد جعفر تھانیسری کیسی سیدھی سادی بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنا کر یوں دکھاتے ہیں؛

”اِس کے بعد شغلِ برزخ کہ جس میں تصوّرِ شیخ کا مراقبہ کرتے ہیں، آپ کو تعلیم دینی چاہی، اُس وقت سیّد صاحبؒ نے بہت ادب اور عاجزی سے مولاناؒ سے عرض کیا کہ اِس شغل میں اور بُت پرستی میں کیا فرق ہے؟ اُس میں صورت سنگی یا قرطاسی ہوتی ہے اور اِس میں صورت خیالی، جو تہہِ دل میں جگہ پکڑتی ہے، تعظیم کی جاتی یا پوجی جاتی ہے۔ تب مولانا نے یہ شعر حافظ شیرازی کا پڑھا: ؎

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

تب سیّد صاحبؒ نے عرض کیا کہ اگر حکم مے نوشی کا جو گناہِ کبیرہ ہے، کیجیے تو اُس کی تعمیل کو بھی حاضر ہوں مگر یہ عمل تصوّر تصویرِ شیخ کا، خصوصاً غلیبت شیخ میں اُس تصویر سے توجہ اور استعانت چاہنا جو بعینہٖ بُت پرستی اور شرک صریح ہے، مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ اگر اِس کے جواز کے واسطے کوئی سند قرآن و حدیث یا اجماعِ اُمت کی موجود ہو تو بھی مضائقہ نہیں ہے۔ اِس تقریر کے سُننے اور سمجھنے کے بعد مولانا صاحبؒ نے سید صاحبؒ کو اپنی بغل میں لے کر اور آپ کے رخسار اور پیشانی کو بوسہ دے کر فرمایا کہ اے فرزند دلبند! حضرت حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل و انعام سے ولایتِ اولیاء اور ولایت انبیاء کی، جو افضل ولایتوں کی ہے، تم کو عطا کی ہے۔ اُس وقت سیّد صاحبؒ نے مولانا ممدوح سے عرض کی کہ ولایتِ اولیاء اور ولایتِ انبیاء میں فرق کیا ہے؟“ [1]

جناب غلام رسول مہر نے اس واقعے کو اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے؛

---

[1] جعفر تھانیسری، حیات سیّد احمد شہید، ص ۶۰، ۶۱

''پھر شغلِ برزخ کا حکم ہوا، جس میں صورتِ شیخ کا تصوّر صوفیہ میں مروج تھا، تصوّر صورتِ شیخ کا حکم سُنا تو سید صاحبؒ نے ادب سے عرض کیا کہ حضرت! اِس شغل اور بُت پرستی میں کیا فرق ہوا؟ مفصّل ارشاد ہو۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے جواب میں خواجہ حافظ کا یہ مشہور شعر پڑھا: ؎

بہ مے سجادہ رنگیں کُن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا

سیّد صاحب نے دوبارہ عرض کیا کہ میں بہرحال فرماں بردار ہوں، اِس لیے کہ کسبِ فیض کی غرض سے آیا ہُوں، لیکن تصوّرِ شیخ تو صریح بت پرستی معلوم ہوتا ہے۔ اِس خدشے کو زائل کرنے کے لیے قرآن و حدیث سے کوئی دلیل پیش فرما دیں، ورنہ اِس عاجز کو ایسے شغل سے معاف رکھیں۔ شاہ صاحب نے یہ سُنتے ہی سیّد صاحب کو سینے سے لگا لیا، رخساروں اور پیشانی پر بوسے دیے اور فرمایا: اے فرزندِ ارجمند! خدائے برتر نے اپنے فضل و رحمت سے تجھے ولایتِ انبیاء عطا فرمائی ہے۔''[1]

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے پروپیگنڈے کو مخزنِ احمدی اور وقائعِ احمدی میں محفوظ کیا گیا۔ وہابی علماء و مورخین نے اُن بیانات کو وحیِ الٰہی سمجھ کر، راہِ طریقت سے ناآشنا ہونے کی بِنا پر، بعینہٖ نقل کرنا، ماننا اور منوانا شروع کر دیا۔ اِن تحریروں سے واضح ہو رہا ہے کہ سید احمد صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے جملہ معتقدین، بیعت، شغلِ برزخ، کسبِ فیض، ولایتِ اولیاء اور ولایتِ انبیاء کے معانی و مفہوم سے مطلقاً ناواقف ہیں اور جن حضرات کو اِس سلسلے میں کچھ معلومات حاصل ہیں وہ اپنے بڑوں کی بے راہ روی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے رہتے ہیں۔ بھلا کہاں تصوّر اور کہاں یہ قیل و قال؟ وہاں تو کسی فنا فی اللہ کے ہاتھ پر بکنا ہے بکنا نہیں۔ یہ مکالمہ محض اِسی غرض سے گھڑا گیا ہے کہ اِن بزرگانِ دین

---

[1] غلام رسول مہر، سیّد احمد شہید، ص ۷۹-۸۰

اور خلاصۂ روزگار ہستیوں سے سید صاحب کو ممتاز ثابت کیا جائے۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ولایت، خاص قُربِ خداوندی کو کہتے ہیں۔ یہ دو قسم کی ہے۔ ایک وہ جو انبیائے کرام کو اعلانِ نبوت سے پہلے اور نبوت کے ساتھ حاصل ہے، اِسے ولایتِ انبیاء کہتے ہیں اور دوسری جو غیر انبیاء کو حاصل ہوتی ہے، اُسے ولایتِ اولیاء کہا جاتا ہے۔ سیّد صاحب کے لیے ولایتِ انبیاء ثابت کرنا اور وُہ بھی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی "چہ دلاور است دُزدے بکف چراغ دارد" والا معاملہ ہے۔ یہ محض اپنی بدنیتی کے لیے حضرت شاہ صاحب کی آڑ لی گئی ہے۔

سب سے دل چھیلنے والی ادا کہ تصورِ شیخ کو سیّد صاحب نے صریح شرک اور بُت پرستی بتا کر گویا سارے خاندانِ عزیزی دہلوی کو، اُن کے جُملہ پیرانِ عظام کو، حتیٰ کہ حضرات مجدّد الف ثانی قدس سرہٗ تک کو صریح مشرک و بُت پرست ٹھہرا دیا، لیکن کسی سوانح نگار نے یہ تصفیہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ اِس گھڑنت کے بموجب حضرت شیخ مجدّد سرہندی سے لے کر شاہ ولی اللہ و شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم تک کو مشرک اور بُت پرست ٹھہرایا جائے یا سیّد احمد صاحب و مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی سے آج تک کے وہابیوں کو اکابر اہلسنت کا مخالف، ولی اللّٰہی خاندان کو مشرک و بُت پرست سمجھنے والے اور تصوّف کی ابجد سے بھی بے بہرہ مانا جائے؟ بہر حال جس شغلِ برزخ کو شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء) نے القول الجمیل میں قُربِ خداوندی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بتایا، اُسی کے حاشیہ میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اِس کو سب سے سیدھا راستہ بتایا، حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندی فاروقی قدس سرہٗ (المتوفی ۱۰۳۴ھ/ ۱۶۲۴ء) نے اپنے ایک مرید کو اِس کی مشق ہو جانے پر تحریر فرمایا تھا کہ یہ دولت خوش نصیب لوگوں کو حاصل ہوتی ہے، اُسی کو اگر کوئی ازراہِ بے خبری شرک و بُت پرستی بتاتا ہے تو ایسے حضرات سے سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ: ؎

لُطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاھد!
ہائے کم بخت! تُو نے پی ہی نہیں

غلام رسول مہر نے اس معاملے کو سلجھانے کی غرض سے کچھ سخن سازی سے کام لینے کی کوشش ضرور کی ہے، لیکن جس طرح ایک فلسفی جتنا عقلی دلائل سے ڈور کو سلجھانا چاہتا ہے اُسی قدر الٰہیات کی ڈور اور اُلجھتی چلی جاتی ہے۔ یہی معاملہ مہر صاحب کو درپیش آیا، وہ سلجھانے بیٹھے لیکن سرا تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی، یا مل نہ سکا، اسی لیے ڈور کو مزید اُلجھاتے ہی گئے۔ مثلاً اِس سلسلے میں اُنھوں نے وضاحت کی ہے کہ:

> "ممکن ہے اِس سے کسی صاحب کو وسوسہ پیدا ہو کہ شاہ عبدالعزیز جیسا یگانہ عالمِ دین اِس حقیقت سے ناواقف تھا کہ تصورِ صورتِ شیخ کے لیے قرآن وحدیث میں کوئی سند موجود نہیں یا اس تصور کو عام صنم پرستی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس بارے میں تحقیقی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خیال یہ ہے کہ صوفیہ نے طالب کی توجہ جمانے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے، اُن میں سے ایک طریقہ تصورِ صورتِ شیخ کا بھی تھا، جس سے یہ بزرگ کام لیتے رہے۔ سید صاحب کی طبیعت اتنی پاک ومنزّہ تھی کہ اِسے قبول نہ کر سکی۔ شاہ صاحب چونکہ طبیب حاذق تھے، اس لیے سمجھ گئے کہ یہ دوا سیّد کے مزاج کے لیے سازگار نہ ہوگی، لہٰذا اسے چھوڑ دیا۔ جب یہ مقصود دوسرے طریقوں سے بروجہ احسن حاصل ہو سکتا تھا تو تصورِ شیخ پر اصرار کی ضرورت نہ تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ جس عمل کے لیے کتاب وسنّت میں کوئی مبنیٰ موجود نہ ہو، ہر مدعیِ اسلام کے نزدیک لازماً ناقابلِ قبول ہونا چاہیے، کیونکہ دین کا ماخذ کتاب وسنّت ہیں، نہ کہ کسی طبقے کا عمل۔"[1]

قطع نظر اِس کے کہ شغلِ برزخ کا ثبوت کتاب وسنّت میں ہے یا نہیں، وہابی مورخین کی تصریحات کے مطابق اس صنم پرستی کی زد میں سب سے زیادہ امام ربّانی حضرت مجدد الف ثانی قدس سرّہٗ آتے ہیں، جنھوں نے تصورِ شیخ کو باقاعدہ طور پر اپنی تعلیمات کا ایک جزو بنایا اور اِس میں مہارت

---

[1] غلام رسول مہر: سیّد احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۸۰

حاصل کر لینے والوں کو خوش نصیب بتاتے رہے۔ اِس نشانے پر آتے ہیں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے جملہ مشایخ جن سے آپ نے یہ شغل سیکھا، اپنے مریدوں کو سکھایا اور اپنی کتاب "القول الجمیل" میں اِسے قربِ الٰہی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ٹھہرایا۔ اِس کی زد میں آتے ہیں شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جو اِسے قربِ خداوندی حاصل کرنے کا سب سے سیدھا اور آسان راستہ بتاتے تھے اور عمر بھر اس کے عامل و مبلّغ رہے۔ مہر صاحب بتاتے ہیں کہ سیّد صاحب کی طبیعت اتنی پاک اور مزکّٰی تھی کہ شغلِ برزخ کو قبول نہ کر سکی۔ گویا حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ و شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہم کی طبیعتیں ناپاک اور گندی تھیں کہ اِس بُت پرستی کو وہ حضرات قبول کرتے رہے۔ لاحول ولا قوّۃ اِلاّ باللہ العلی العظیم۔ حقیقت یہ ہے کہ وہابی حضرات خواہ مخواہ تصوّف کے معاملات میں ٹانگ اڑا بیٹھتے ہیں جبکہ وہابیت اور تصوّف دونوں متضاد چیزیں ہیں۔ مہر صاحب نے اپنے بارے میں ذرا جرأت سے کام لے کر یُوں اعتراف بھی کیا ہے:

> "اِن تمام اُمور یا شغلِ برزخ کے متعلق اِس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا، اِس لیے کہ خود اِس کوچہ سے نابلد ہُوں"۔[1]

جملہ حالات و کوائف کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بعد معلوم کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اِس سارے ڈرامے کی ابتدا مولوی عبد الحي دہلوی (المتوفی ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۸ء) سے ہُوئی۔ حقیقت کا حال تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، ویسے اِس قسم کے سازشی معاملے کاموں سے ہی پہچانے جاتے ہیں ورنہ جعفر و صادق کو کس نے انگریزوں سے معاہدہ کرتے دیکھا تھا اور کون سا تحریری ثبوت اُن کی انگریز دوستی اور ملک و ملّت فروشی کا دیا جا سکتا ہے، موصوف سے سر ڈیوڈ آکٹر لونی وغیرہ نے تعلقات پیدا کر کے آمادہ کیا ہوگا۔ اِنھوں نے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) کو تیار کیا۔ موصوف نجد کے محمد بن عبد الوہاب اور بنگال کے حاجی شریعت اللہ کی تحریکوں سے متاثر تھے یا متاثر ہو گئے۔ سیّد احمد صاحب شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۷۹

کے دستِ حق پرست پر بیعت ہو گئے تھے۔ انگریزوں نے اِن کی نیم مجذوبانہ حالت دیکھی تو اِس ڈرامے کا اہم ترین پارٹ ادا کرنے کے لیے وہ بڑے موزوں نظر آئے ہوں گے۔ مولوی عبدالحی و محمد اسمٰعیل صاحبان نے اِنھیں بسر آنکھوں پر جگہ دے کر رغبت دلائی ہو گی کہ وہ ایک اصلاحی تنظیم بنانا اور مہم چلانا چاہتے ہیں۔ موصوف کے رضامند ہونے پر تثلیث قایم ہو گئی۔

سید احمد صاحب چونکہ غیر معروف تھے لیکن شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت سے کچھ فیضیاب ہونے لگے ہوں گے کہ اِس چکر میں پھنس گئے۔ یار لوگوں نے حضرت شاہ صاحب کے فیضان کا نام کر کے اپنی مقصد برآری کے لیے سید صاحب کو آسمان پر بٹھانا شروع کر دیا۔ اُن کے ہر معمولی واقعے کو کرامت اور معجزہ بنا کر دکھایا جاتا۔ اُن کی پالکی کے پیچھے پیچھے دوڑنا اپنی سعادت بتاتے، موصوف کے آگے خود دم نہ مارتے۔ جب علماء کو یہ کچھ کرتے دیکھا گیا تو بہت سے لوگ عقیدت کے جال میں پھنسنے لگے اور خاصی شہرت حاصل ہو گئی۔

سید احمد صاحب کو آسمان پر بٹھانے اور اُن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا کر جمعیت فراہم کرنے کی غرض سے اُن کے ملفوظات کا بہانہ کر کے مولوی عبدالحی و مولوی محمد اسمٰعیل صاحبان نے صراطِ مستقیم کتاب گھڑی اور اُس میں بڑی رازداری کے ساتھ اپنے پیر کو انبیاءِ کرام کی صف میں کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی۔ دعویٰ صرف امامت کا تھا لیکن صفاتِ نبوت کی ثابت کی جا رہی تھیں۔ مثلاً ایک عبارت ملاحظہ ہو:

صدیق من وجہ مقلدِ انبیاء می باشند و
من وجہ محقق در شرائع۔ پس اگر
صدیق زکی القلب ست رضا و
کراہیت حضرتِ حق در افعال و
اقوالِ مخصوصہ وصحت وبطلان در
عقایدِ خاصہ ومحمودیت ومذمومیت در
اخلاق وملکاتِ شخصیہ بنورِ جبلی خود دریافت
می نماید۔[1]

صدیق من وجہ انبیاء کا پیرو اور من وجہ
شریعت کا محقق ہوتا ہے۔ پس اگر
صدیق زکی القلب ہو گا تو وہ مخصوص
اقوال اور افعال میں خدائے تعالیٰ
کی خوشنودی اور نارضامندی کو
اور مخصوص عقائد کے صحیح اور غلط ہونے
اور خاص لوگوں کے عادات اور استعدادوں
کے بھلا بُرا ہونے ... کو اپنی طبیعت

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۳۸

کے نور سے معلوم کر لیتا ہے۔ ؎۱

ذرا آگے چل کر اسی امر کو تفصیل سے بیان کیا اور یوں دن دہاڑے قیامت ڈھائی ہوئی ہے:

پس احکام ایں امور مذکورہ اُورا بدو وجہ معلوم می شود، یکے بشہادتِ قلبِ خود خصوصاً و دیگر بسبب اندراجِ اُو در کلیاتِ شرع عموماً۔ و علم کہ بوجہ اول حاصل شدہ تحقیقی ست و ثانی تقلیدی۔ و اگر زکی العقل ست نور جبلی اُو بسوئے کلیات اُورا رہنمونی می فرماید۔ پس علوم کلیہ شرعیہ و حکم و احکامِ ملت اُورا شاگرد انبیاء ہم می تواں گفت و ہم استاد انبیاء ہم۔ و نیز طریق اخذ آنہم شعبہ ایست از شعبِ وحی کہ آں را در عرفِ شرع نبفث فی الردع تعبیر می فرمایند و بعضے اہلِ کمال آنرا بوحی باطنی می نامند۔ ؎۲

پس اِن امور مذکورہ کے احکام اُن کو دو وجہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک تو دِل کی شہادت سے جو خاص کر اِن امور سے متعلق ہے۔ دوم عام طور پر کلیاتِ شرع ہیں اُن کے مندرج ہونے کے سبب سے۔ اور جو علم کہ پہلے طریق سے اُس کو حاصل ہُوا ہے وہ تحقیقی ہے اور جو علم کہ دوسرے طریق سے حاصل ہُوا ہے وہ تقلیدی ہے۔ اور وہ صدیق زکی العقل ہے تو اُس کے طبعی نور کی اِن کلیات حقہ، کی طرف رہنمائی کی جاتی ہے۔۔۔۔ پس کلیاتِ شریعت اور احکامِ دین میں اُس کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا شاگرد بھی کہہ سکتے ہیں اور اُن کا ہم اُستاد بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور نیز اِس کے اخذ کا طریق بھی وحی کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے، جس کو

؎۱ صراطِ مستقیم اردو، ص ۸۸

؎۲ محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۳۹

> شریعت کی اصطلاح میں نفث فی
> الروع کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اور
> بعض اہلِ کمال اِس کو وحی باطنی
> کہتے ہیں۔ [1]

مذکورہ دونوں عبارتوں میں موصوف نے تصریح کر دی کہ ایسے افراد کو نبی کا مقلد اور انبیاء[1] کی تقلید سے آزاد بھی کہہ سکتے ہیں۔ اُسے[2] اپنے نورِ جبلّی سے کتاب وسنّت کے بغیر خود بھی باری تعالیٰ کی رضامندی و ناراضگی اور عقاید و افعال و اقوال کا اچھا یا بُرا ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔ چونکہ بعض علوم اِن حضرات کو انبیائے کرام کی وساطت کے بغیر ہی اپنے قلب کی شہادت سے حاصل ہو جاتے ہیں اِسی[3] لیے جہاں اِنھیں انبیائے کرام کا شاگرد کہا جا سکتا ہے وہاں انبیاء[4] کا ہم استاد بھی کہہ سکتے ہیں۔ براہِ راست[5] شریعت حاصل کرنے کے اِس شعبے کو نفث فی الروع اور وحی باطنی کہا جاتا ہے۔ موصوف کی یہ تصریحات عقاید اہلسنّت وجماعت کے سراسر خلاف، غیر انبیاء کو نبی بتانا اور روافض کا مذہب قبول کرنا ہے۔ موصوف کی اصطلاح میں اخذِ علومِ شرعیہ کے اِس طریقے کو حکمت کہتے اور اِس مرتبے کو امامت و وصایت سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ آگے لکھتے ہیں:

> ہمیں معنی را بامامت و وصایت تعبیر
> می کنند و علم ایشاں راکہ بعینہٖ علم
> انبیاءست لیکن وحی ظاہری
> متلقی نشدہ بہ حکمت می نامند۔ [2]

> اِس معنی کو امامت اور وصایت کے
> ساتھ تعبیر کیا کرتے ہیں اور اُن کے
> علم کو جو بعینہٖ پیغمبروں کا علم ہے، لیکن
> ظاہری وحی سے حاصل نہیں ہوئے لہٰذا
> حکمت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ [3]

---

[1] صراطِ مستقیم، اردو: ص ۸۹

[2] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۴۰

[3] صراطِ مستقیم اردو، مطبوعہ لاہور، ص ۹۱

کیا فرماتے ہیں دیوبندی، اہلحدیث اور جماعت اسلامی کے مفتی صاحبان و محقق حضرات اور حقانیت کے علم بردار بننے والے! اگر مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی محبّت آپ حضرات کے دلوں میں گوسالۂ سامری کی طرح سما نہیں گئی ہے اور آپ حضرات نے محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقدس دین پر دہلوی موصوف کے دین کو ترجیح نہیں دے دی ہے تو کیا مذکورہ بیانات و اعلانات کے خلافِ اسلام ہونے میں کوئی شک و شبہ ہے؟ کیا یہ غیر انبیاء کو مقامِ نبوت پر فائز کرنا نہیں ہے؟ کیا روافض کے علاوہ کوئی گمراہ سے گمراہ فرقہ بھی اِن تصریحات کی تائید کرے گا؟ یہ آپ کی دینداری کے امتحان کا موقع ہے کہ آپ خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں یا اپنے نبوت بانٹنے والے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی ہی آپ کی نظر میں سب کچھ ہیں۔ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ تو اِس بارے میں یہ ہے:

معرفتِ احکامِ شرعیہ بدوں توسیطِ نبی ممکن نیست۔ [1]	احکامِ شرعیہ کا معلوم ہونا، نبی کی وساطت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اہلسنّت وجماعت کے مایۂ ناز محقق علامہ عبدالغنی نابلسی علیہ الرحمہ یُوں فرماتے ہیں:

ھذا القول کفر لا محالۃ بالاجماع من وجوہ منہا دعوٰی تلقی الاحکام الشرعیۃ من اللہ تعالیٰ بلا واسطۃ نبی وذٰلک دعوٰی نبوۃ۔ ملخصًا۔ [2]	یہ قول باجماعِ اُمت کئی طرح کفر ہے۔ اُن میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اِس میں نبی کی وساطت کے بغیر اللہ تعالیٰ سے شرعی احکام معلوم کر لینے کا ادعا ہے اور یہ نبوت کا دعوٰی کرنا ہے۔

دہلوی موصوف نے اِسی پر بس نہیں کی بلکہ اپنے ممدوحین کو اُنھوں نے وحی باطنی سے سرفراز کر کے پیغمبروں کی طرح معصوم بھی بنا دیا تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے خود یُوں وضاحت کی ہُوئی ہے:

---

[1] عبدالعزیز محدّث دہلوی، مجدّد: تفسیر عزیزی، جلد اوّل، ص ۲۴۴

[2] عبدالغنی نابلسی، امام: حدیقہ ندیہ، ص ۲۱۱

لابد اُو را بمحافظتے مثل محافظتِ انبیاءؑ که مسمیٰ به عصمت است فائز می کنند[1]	پس وہ ضرور انبیاء کی اُس محافظت جیسی نگہبانی کے ساتھ کامیاب ہوتا ہے جس کو عصمت کہا جاتا ہے۔[2]

اِسی وحی باطنی اور انبیائے کرام جیسی عصمت کو پُراسرار طریقے سے اپنے پیر سیّد احمد صاحب تک پہنچانے کی خاطر مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے ایسے حضرات کی موجودگی کا یُوں صراحت سے بیان داغا تھا:

ندانی که اثبات وحی باطن و حکمت و وجاہت و عصمت مر غیر انبیاء را مخالف سنّت و از جنسِ اختراع بدعت است . . . . . و ندانی که ارباب ایں کمال از عالم منقطع شدہ اند[3]	یہ نہ سمجھنا کہ باطنی وحی اور حکمت اور وجاہت اور عصمت کو غیر انبیاء کے واسطے ثابت کرنا خلافِ سنّت اور اختراعِ بدعت کی جنس سے ہے . . . . . اور یہ مت سمجھنا کہ اِس کمال والے لوگ جہان سے منقطع ہو چکے ہیں[4]

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے اپنے پیر جی کے لیے وحی و عصمت وغیرہ نبوت کے تمام لوازمات تو جمع کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ایسی کرامتیں گھڑ کر سُنانی شروع کر دی تھیں کہ معجزات کو بھی پیچھے چھوڑتی جا رہی تھیں۔ ان حالات میں ایک خدشہ ضرور تنگ کرتا تھا کہ ابھی تک سارا معاملہ زبانی جمع خرچ تک محدود تھا اور حقیقت کے میدان میں اُس کا کوئی شائبہ بھی نظر نہیں آ سکتا تھا، دریں حالات یہ تصور پریشان ضرور کرتا ہوگا کہ اگر کسی نے آجکل میں ایسی کرامت کا مطالبہ کر دیا جس کی صحت کا آنکھوں سے مشاہدہ کیا جا سکے یا امیرِ سلطنت بننے کے بعد جب نبوّت کا دعوٰی کیا جائے گا تو اُس وقت معجزہ طلب کرنے والے کو طاقت استعمال کرنے کے علاوہ اور کیا جواب دیا جا سکتا ہے؟ چنانچہ قبل از وقت اُس کی پیش بندی یُوں

---

[1] محمد اسمٰعیل، مولوی: صراطِ مستقیم فارسی، ص ۴۱ [2] صراطِ مستقیم اردو: ص ۹۳

[3] محمد اسمٰعیل، مولوی: صراطِ مستقیم ، ص ۴۲ [4] صراطِ مستقیم اردو: ص ۹۴، ۹۵

غیظ و غضب کے عالم میں فرمائی جاتی ہے؛

"اور جس شخص سے معجزہ و کرامت نہ ہو اُس کو پیغمبر اور ولی نہ سمجھنا وغیرہ یہ ہزاروں رسمیں اور عادتیں سب یہود اور نصارٰی اور مجوس اور منافقوں کی اور مکّہ والے اگلے مشرکوں کی ہیں اور سوا اِس کے اور ہزاروں رسمیں ہندوؤں کی ہیں کہ لوگوں نے اپنے یہاں رائج کرلیں کہ پیغمبر خدا ایسی باتوں کے مٹانے، ایسی ہی رسموں کے دفع کرنے کے لیے آئے اور قرآن نازل ہُوا۔ پھر جو شخص ایسی رسمیں اور عادتیں اختیار کرے اور مسلمانوں میں جاری کرے تو وہ شخص اِس حدیث کے بموجب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغضوب ہے، راندا گیا، خدا کے غضب میں گرفتار اور خدا کے دشمنوں میں شمار۔"[1]

اپنے امام کی اس ستم ظریفی پر وہابی حضرات داد تو خوب دیتے ہوں گے کہ جس شخص سے کوئی کرامت ظاہر نہ ہو اُسے ولی اور جو معجزہ نہ دکھائے اُسے نبی ماننے سے لوگ انکار کریں تو یہ منجملہ اُن باتوں کے ہے جن سے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بقول دہلوی صاحب منع فرما دیا تھا۔ کیا وہابی حضرات ہمیں سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا وہ ارشادِ گرامی دکھانے کی زحمت گوارا کرلیں گے جس میں آپ نے فرمایا ہو کہ میرے بعد جب کوئی نبی آئے اور وہ تمھیں معجزہ نہ دکھائے تو اُس کی نبوّت کا انکار نہ کرنا۔ اگر رُوئے زمین کا کوئی وہابی، کوئی مولوی اسمٰعیل دہلوی کا عقیدت مند ہمیں ایسی ایک ہی حدیث دکھا دے تو ہم اُس کے بیحد ممنون ہوں گے فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ط

مثل مشہور ہے کہ ایک جھوٹ کو چھپانے کی خاطر سیکڑوں جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ اِس کی واضح مثال دہلوی صاحب کی مذکورہ بالا عبارت بھی ہے، جس میں ادّعائے نبوت کے فراڈ کو چھپانے کی خاطر بیسیوں جھوٹ بولنے پڑے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک مسلمان کو ایسی عادتِ بد سے محفوظ و مامون رکھے۔ (آمین)۔ معراج ہمارے آقا و مولیٰ سیّدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] سلطان خاں، مولوی: تذکیر الاخوان اُردو، مطبوعہ لاہور، ص ۲۳، ۲۴

تعالیٰ علیہ وسلم کے عظیم معجزات سے ہے۔ معراج شریف میں جہاں تک آپ کی رسائی ہوئی وہاں تک کسی دوسرے نبی تو کیا کلیم و خلیل علیہما السلام جیسے جلیل القدر اور اللہ تعالیٰ کے لاڈلے پیغمبروں کو بھی نہ ہوئی۔ لیکن وہابیت ہی کیا ہوئی جو حبیبِ خدا سے اپنے پیر جی کو بڑھا کر نہ دکھاتے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن کریم بتاتا ہے کہ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى لیکن اپنے پیر جی کے متعلق مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے لکھا ہے:

نسبت پیر خود تا اینکہ روزے حضرت	ایک دن حضرتِ حق جلّ و علا نے
جلّ و علا دستِ راست ایشاں را	آپ کا داہنا ہاتھ خاص اپنے
بدستِ قدرت خاص خود گرفتہ و چیزے	دستِ قدرت میں پکڑ لیا اور کوئی چیز
را از امور قدسیہ کہ بس رفیع و بدیع	امورِ قدسیہ سے کہ نہایت رفیع اور
بود پیش روئے حضرت ایشاں کردہ	بدیع تھی، آپ کے سامنے کر کے
فرمود کہ ترا ایں چنیں دادہ ام و چیز ہائے	فرمایا کہ ہم نے تجھے ایسی چیز عنایت
دیگر خواہم داد۔ [1]	کی ہے اور اور چیزیں بھی عطا کرینگے۔ [2]

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی اِسی گھڑنت کو موصوف کے اوّلین سوانح نگار یعنی مولوی محمد جعفر تھانیسری نے سوانح احمدی میں بھی خوب مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ اُن کی یہ کتاب کراچی سے حیات سیّد احمد شہید کے نام سے شایع ہوئی ہے، جس کا مقدمہ پروفیسر محمد ایّوب قادری نے لکھا ہے۔ مذکورہ بیان اُس کتاب مطبوعہ کراچی کے صفحہ ۶۴ پر ملاحظہ فرمایا جاسکتا ہے۔ یہاں میں علمائے دین کہلانے والے اُن حضرات کی توجہ اِس عبارت کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں جو مولوی اسمٰعیل دہلوی کی محبّت و عقیدت میں شرعی حدود کو توڑ کر بہت دُور جا چکے ہیں کہ یہ اللہ جلّ شانہٗ سے مصافحہ کرنا اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر لین دین کا شرف خلاصۂ نوعِ انسانی یعنی حضرات انبیائے کرام علیہم السلام میں سے بھی کسی کو حاصل

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۱۷۵

[2] صراطِ مستقیم اُردو: ص ۳۷۰

ہُوا تھا؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اُس کا ثبوت کیا ہے؟ بصورتِ دیگر انبیائے کرام علیہم السلام بلکہ سیّد المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سید احمد صاحب کا درجہ کونسی دیانت داری کے تحت بلند و بالا دکھایا جا رہا ہے؟ کیا روزِ محشر کسی فرضی قصّے کہانی کا نام ہے؟ کیا باری تعالیٰ جہاں آفرین کی بارگاہ میں مرنے کے بعد ایک روز حاضری اور باز پرس نہ ہو گی؟

پند ہا دادیم و حاصل شد فراغ
مَا عَلَیْنَا یَا اَخِیْ اِلَّا الْبَلَاغ

قرآنِ کریم میں فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں یہ تصریح موجود ہے کہ جب ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی کی وہ رفعت حاصل ہوئی جو کائنات میں سے کسی فرد کو حاصل ہوئی نہ حاصل ہو سکتی ہے تو دہلوی صاحب کو سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی یہ انفرادیت ایک آنکھ نہ بھائی اور اپنے نیم مجذوب پیر، سیّد احمد صاحب کا اللہ جلّ شانہ، سے مصافحہ اور لین دین جا کروایا۔ اُدھر حبیبِ محبوبِ پروردگار کو دَنٰی کی گودی میں لے کر فنا کے لنگر اٹھائے جا رہے تھے تو فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی کا عدیم النظیر منصب مرحمت ہوا۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے سوچا کہ ساری کائنات میں سے یہ منصب اگرچہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوا لیکن پیر جی کے لیے یہ مقام ثابت نہ کیا تو افترا کی جو مشین لارڈ وارن ہیسٹنگ سے ملی ہے وہ اور کس کام آئے گی؟ لہٰذا صاف لکھ دیا کہ:

مکالمہ و مسامرہ بدست می آید۔ [1]   ہم کلامی اور سرگوشی کے سروپا ہاتھ آتے ہیں۔ [2]

دوسرے مقام پر حقیقی ہمکلامی کی موصوف نے یُوں تصریح کی ہُوئی ہے اور وُہ بھی ایک آدھ بار نہیں بلکہ بار بار:

گاہے کلامِ حقیقی ہم میشود۔ [3]   اور کبھی کلامِ حقیقی بھی ہو جایا کرتا ہے۔ [4]

---

[1] محمد اسمٰعیل، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۱۳
[2] صراطِ مستقیم، اردو: ص ۳۶
[3] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی، صراطِ مستقیم، ص ۱۵۴
[4] صراطِ مستقیم اردو: ص ۳۲۴

حالانکہ مسلمانوں کے نزدیک یہ باتیں کسی غیر نبی کے لیے ثابت کرنا کفر ہیں جس پر اُمتِ محمدیہ کا اجماع ہے۔ چنانچہ ملّتِ اسلامیہ کے اِس اجماعی عقیدے کو محدث کبیر حضرت قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں بیان کیا ہے:

فذالك كفر باجماع المسلمين	یہ باجماعِ مسلمین کفر ہے اور اِسی
وكذالك من ادعىٰ مجالسته	طرح جو اللہ تعالیٰ سے ہم نشینی، اُس
اللہ تعالیٰ والعروج اليه	تک صعود و عروج اور اُس سے
ومكالمته - ملخصًا[1]	باتیں کرنے کا مدّعی ہو (یہ باتیں بھی
	اُسی طرح کفر ہیں)

اگر مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اِس مقام پر اتنی سی وضاحت فرمانے کی زحمت گوارا کر لیتے کہ پیرجی کا یہ مصافحہ ولین دین اور صعود و کلام حقیقی کے واقعات پروردگار عالم کی بارگاہ سے متعلق نہیں ہیں بلکہ یہ حالات تو اُن کے مجازی خداوندِ نعمت یعنی لارڈ وارن ہیسٹنگز کی سرکار میں پیش آیا کرتے تھے، تو اُن کی اِس کرم نوازی سے پاک وہند کے مسلمان اِس دَور کی ایک المناک اور پُراسرار الجھن میں پھنسنے سے محفوظ رہ جاتے۔ لیکن بُرا ہو اِس حرص وہوا کا جو کیسے کیسے خاندانوں کے افراد کو نہ صرف گمراہ کر دیتی ہے بلکہ گمراہ گری کی ایسی مشین بنا دیتی ہے جس میں مدّتوں تک کتنے ہی گمراہ ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا۔

تمام وہابیہ کا متفقہ عقیدہ ہے کہ انبیائے کرام واولیائے عظام کو غیب کا علم قطعاً نہیں ہوتا۔ دیوبندی حضرات تو سرورِ کون ومکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ترجمانی اِن لفظوں میں کر دیتے ہیں کہ واللہ لا ادری ما یفعل بی ولا بکم[2] (الحدیث) اور شیخ عبد الحق روایت کرتے ہیں کہ مجھ کو دیوار کے پیچھے کا بھی علم نہیں۔ اِس عقیدہ کو اُن حضرات کے امام علی الاطلاق، یعنی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے اپنے مخصوص انداز میں تکیہ کلام سمیت یوں بیان کیا ہے:

---

[1] قاضی عیاض، محدث: کتاب الشفاء، ص ۳۶۰

[2] خلیل احمد انبٹھوی، مولوی: براہینِ قاطعہ، مطبوعہ دیوبند، ص ۵۵

"کسی نبی اور ولی کو، جن اور فرشتے کو، پیر اور شہید کو، امام اور امام زادہ کو، بھوت اور پری کو اللہ صاحب نے یہ طاقت نہیں بخشی کہ جب وہ چاہیں غیب کی بات معلوم کر لیں۔" [1]

لیکن اِس ستم ظریفی کی داد کون دے کہ جو دروازے موصوف نے اولیائے عظام بلکہ انبیائے کرام علیہم السلام تک کے لیے بند کر دیے تھے، جن کا کسی کے لیے کھولنا عقیدۂ توحید سے بغاوت اور کفر و شرک تھا، وہی دروازے موصوف نے بڑی فیاضی اور دلیری سے پیر جی کے لیے اِس طرح کھول کر دکھا دیے کہ گویا تمام خزائن الٰہیہ کے وزیرِ خزانہ بلکہ مجاز و مختار ہی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی تھے۔ چنانچہ آنجناب نے اِس بارے میں لکھا ہے:

"برائے انکشاف حالاتِ سمٰوٰت و ملاقات ارواح و ملائکہ و سیر جنت و نار و اطلاع بر حقایق آں مقام و دریافت امکنہ آنجا و انکشاف امرے از لوح محفوظ ذکر یا حیّ یا قیوم است۔" [2]

آسمانوں کے حالات کے انکشاف اور ملاقاتِ ارواح اور ملائکہ اور بہشت و دوزخ کی سیر اور اُس مقام کے حقایق پر اطلاع اور اُس جگہ کے مکانوں کے دریافت اور لوحِ محفوظ سے کسی امر کے انکشاف کے لیے یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ [3]

دوسرے مقام پر موصوف نے اپنی اِس فیاضی کے دریا یُوں بہائے ہیں:

برائے کشفِ ارواح و ملائکہ و مقامات

کشفِ ارواح و ملائکہ اور اُنکے مقامات

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ص ۵۴

[2] محمد اسمٰعیل، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۱۲۴

[3] ایضاً: ص ۲۶۱

آنہا و سیر امکنۂ زمین و آسمان و
جنت و نار و اطلاع بر لوحِ محفوظ شغل
دورہ کند و باستعانت ہماں شغل بہر
مقامے کہ از زمین و آسمان و بہشت
و دوزخ خواہد متوجہ شدہ بسیر آں مقام
احوال آنجا دریافت کند و با اہل آں
مقام ملاقات سازد۔ [1]

اور زمین و آسمان اور جنت و نار کی
سیر اور لوحِ محفوظ پر مطلع ہونے کے لیے
دورے کا شغل کرے۔۔۔۔۔ پس
زمین و آسمان اور بہشت و دوزخ کے
جس مقام کی طرف متوجہ ہو، اسی شغل
کی مدد سے وہاں کی سیر کرے اور اُس
جگہ کے حالات دریافت کر کے وہاں
کے رہنے والوں سے ملاقات کرے۔ [2]

معلوم نہیں وہابی حضرات اپنے اس دین و ایمان پر کتنے نازاں ہوں گے کہ ایک جانب وہ سیّد المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک میں بعطائے الٰہی ایسی کوئی طاقت تسلیم کرنے کے لیے قطعاً تیار نہیں، جس کے ذریعے وہ حضرات چھُپی ہُوئی چیزوں (غیب) کو معلوم کر سکیں، لیکن دوسری جانب امام الوہابیہ صاحب نے اپنے متبعین کو شغلِ دورہ کا ایسا پیٹینٹ نسخہ بتا دیا جس کے ذریعے جملہ غیوب، تمام چھپی ہُوئی چیزوں کا خود بخود انکشاف ہوتا چلا جائے۔ اس کے ذریعے جس وہابی کا جب دِل چاہے جنت اور دوزخ میں گشت کر آئے، زمین و آسمان میں جس جگہ چاہے جا دھمکے، جب چاہے لوحِ محفوظ سے اپنا یا غیروں کا ریکارڈ نوٹ کر کے لے آئے۔ آخر یہ کیا شعبدہ بازی ہے؟ یہ کیسی کرشمہ کاری ہے؟

کیا انصاف اور دین و دیانت اِسی کا نام ہے کہ سیّد الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پسِ دیوار سے بے خبر بتایا جائے اور اپنے مُلّاؤں پر چودہ طبق روشن دکھائے جائیں۔ اگر عقیدہ یہی درست ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک کو ایسی طاقت نہیں ملی تو وہابی مُلّاؤں کو پُوری کائنات کے مشاہدے کی طاقت کہاں سے مِل جاتی ہے؟ کیا آپ حضرات کے نزدیک

---

[1] محمد اسمٰعیل، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۱۲۸

[2] صراطِ مستقیم اردو: ص ۲۷۰

دورے کا شغل حصولِ کمال میں کوئی نبوت سے بھی بلند و بالا مقام ہے؟ آخر یہ اپنے مُلّاؤں کو سیّد المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کونسی دیانت داری کے تحت بڑھایا گیا ہے؟ بصورتِ دیگر اگر واقعی اُن مُلّاؤں کا مقام یہی ہے تو فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا علم تو آپ حضرات کی تصریحات کے مطابق اِن مُلّاؤں کے مقابلے پر نہ ہونے کے برابر ہی رہ جاتا ہے۔ کیا یہی ہے آپ کا رسول پر ایمان لانا؟ کیا اُمتی کا عقیدہ یہی ہونا چاہیے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اِس درجہ شان گھٹانے والے اُمتی ہی کہلاتے اور جنّت میں جانے کے واقعی حقدار رہ جاتے ہیں؟

افسوس! سیّد احمد صاحب کو نبی منوانے کی خاطر کیسے کیسے پُر اسرار طریقوں سے زمین ہموار کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یعنی کُند ذہن ہونا، لکھنے پڑھنے سے رغبت نہ رکھنا، کما کر کھانے سے عاری ہونا، حقوق العباد سے بے اعتنائی برتنا، علومِ شرعیہ سے کورے رہ کر جینا، تصوّف کے ابجد سے بھی ناواقف رہنا، یہ تمام امور ایسے ہیں جو اُن کی ذات میں جمع ہو کر بزرگی کا ساز و سامان قرار پا جاتے ہیں۔ اگرچہ دوسروں کے حق میں ان کا عیب ہونا سب کے نزدیک مسلّمہ ہے، لیکن سیّد احمد صاحب کی ذات میں اِن باتوں کا پایا جانا معلوم نہیں کس طرح ایسی ولایت کی سند ہے جو منصبِ نبوت کو بھی شرما رہی ہے۔ آخر یہ شعبدہ بازی کیا ہے کہ: ؎

تمہاری زلف میں آئی تو حُسن کہلائی
وہی تیرگی جو مرے نامۂ سیاہ میں ہے

جب آپ اپنا نظریہ یا کوئی مسئلہ بیان کریں تو اُس کے دلائل کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن خوابوں کا پورا باب ایسا ہے جس کا ثبوت کوئی نہیں ہوتا، ماسوائے اِس کے کہ سچے خواب کا کتاب و سنّت کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ غلط کار لوگوں نے جب بھی اپنی بزرگی کا جال بچھانا چاہا تو ہمیشہ فرضی خوابوں اور جھوٹے الہاموں کا سہارا ہی حاصل کیا، کیونکہ اِن کا قرآن و حدیث سے ثبوت پیش نہیں کرنا پڑتا۔ کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ قرآنِ کریم میں دکھا دیجیے کہ واقعی آپ نے یہ خواب دیکھا ہے؟ نیز یہ کوئی نہیں کہے گا کہ واقعی آپ کو یہ الہام ہوا ہے اِس کا حدیث سے ثبوت پیش کیجئے۔ اِسی لیے لصوصِ دین کی ساری بزرگی کا دار و مدار جھوٹے خوابوں اور فرضی الہاموں ہی کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ اب ہم سیّد احمد صاحب کی مخصوص بزرگی کے بارے

میں چند ایسے ہی خواب پیش کرنے کی جسارت کر کے انصاف پسند حضرات کو دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں۔

موصوف کے اوّلین سوانح نگار مولوی محمد جعفر تھانیسری نے لکھا ہے:

> "جب تہائی رات باقی رہ گئی تو اُس وقت دو آدمیوں نے آ کر آپ کا ہاتھ پکڑ کر جگایا۔ آپ نے خواب ہی میں دیکھا کہ آپ کے داہنے طرف رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور بائیں طرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیٹھے ہیں اور آپ سے فرما رہے ہیں کہ اے احمد! جلد اُٹھ اور غسل کر۔ سیّد صاحب ان دونوں بزرگوں کو دیکھ کر نہایت شرم کے ساتھ دوڑے ہُوئے حوضِ مسجد کی طرف چلے گئے۔ اِس کے باوجود کہ موسمِ سرما کی وجہ سے حوض کا پانی اُس وقت یخ ہو رہا تھا مگر اُس سرد پانی سے آپ غُسل کرنے لگے اور اثنائے غسل میں حضرتؐ کو اور حضرت ابوبکرؓ کو اُسی جگہ پر بیٹھا ہُوا دیکھ رہے تھے۔ آپ بہت جلد غسل سے فارغ ہو کر اُن حضرات کے حضور میں حاضر ہو گئے۔ حضرت نے فرمایا کہ اے فرزند! آج شبِ قدر ہے، تو یادِ الٰہی میں مشغول ہو جا اور دعا و مناجات کرتا رہ۔ اِس ارشاد اور تلقین کے بعد دونوں حضرات تشریف لے گئے۔"[1]

اُس رات سیّد احمد صاحب نے کیا دیکھا؟ یہ بھی مولوی محمد جعفر تھانیسری کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمائیے:

> "صاحبِ مخزن لکھتے ہیں کہ سیّد صاحب بارہا فرمایا کرتے تھے کہ اُس رات میں بفضلِ الٰہی وارداتِ عجیب اور وارداتِ غریب میرے دیکھنے میں آئے کہ تمامی درخت اور پتھر وغیرہ اشیاء، دنیا کی سجدے میں سر رکھے ہُوئے تحمید و تہلیل و تسبیح میں مصروف تھے۔ مگر طرفہ یہ کہ ان ظاہری آنکھوں سے ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر کھڑی ہُوئی معلوم ہوتی تھی، مگر چشمِ قلب سے سجدے میں پڑی ہُوئی دکھائی دیتی تھی۔ اُس وقت میں بھی سجدے میں سر رکھ کر شکرِ الٰہی کا بجا لایا اور دُعا د

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیاتِ سیّد احمد شہید، ص ۹۳

مناجات مناسب وقت کرنا شروع کیا۔ اُس وقت فنا گئی اور استغراق کامل مجھے حاصل ہُوا اور اُسی حالت میں صبح تک سجدے میں پڑا رہا۔“[1]

قارئین کرام! ذرا یہ تصریح مدِ نظر رہے کہ سیّد احمد صاحب کی باری آئی تو وہابی علماء و مورخ بڑی خوشی سے چشمِ قلب کا وجود بھی تسلیم کر لیتے ہیں اور سید احمد صاحب کے لیے چشمِ قلب تو ایسی بینا تسلیم کی ہے کہ ایک ہی وقت میں تمام دنیا کی اشیاء اور جملہ اشجار و احجار کارات بھر معاینہ فرماتی رہی کہ یہ تمام چیزیں سجدے میں پڑی ہُوئی ہیں اور موصوف کے لیے بڑی مسرت کے ساتھ ایسے کان بھی تسلیم کر لیے گئے جو دنیا کی تمام چیزوں کی تحمید و تحلیل و تسبیح کو سُنتے رہے اور وُہ بھی ایسی حالت میں جبکہ اُن کی آواز بھی نہیں نکل رہی۔ گھر کی بات آئی تو مشرق و مغرب اور شمال و جنوب تک دُوری نزدیکی کا سوال اُٹھ گیا۔ دیکھنا اور سُننا سب امرِ واقعہ ہو کر کمال بن گیا۔ لیکن اِس ستم ظریفی کی کوئی حد بھی ہے کہ جو قلم سیّد احمد صاحب اینڈ کمپنی کے لیے ایسے علوم و اختیارات بڑی فیاضی کے ساتھ تقسیم کرتے نظر آتے ہیں اور بڑے فخر کے ساتھ اُن کی تشہیر کرتے ہیں لیکن جب غیروں کا تذکرہ آئے یعنی انبیائے کرام و اولیائے عظام کے بارے میں لکھنا پڑے تو یہی قلم یکسر خشک ہو جاتے ہیں۔ اُن سے فیاضی کی جگہ اِس طرح بخیلی ٹپکنے لگتی ہے کہ دین و دیانت کا دن دہاڑے خون ہو کر رہ جاتا ہے۔ عقل و خرد اپنا سر پیٹ کر رہ جاتی ہے۔ اِس بخیلی کا جائزہ لینے کی خاطر سارے وہابی بیڑے کے ناخدا مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے:

> ”ہر چیز کی خبر برابر ہر وقت رکھنی، دُور ہو یا نزدیک، چُھپی ہو یا کُھلی، اندھیرے میں ہو یا اُجالے میں، آسمانوں میں ہو یا زمینوں میں، پہاڑوں کی چوٹی پر ہو یا سمندر کی تہہ میں، یہ اللہ ہی کی شان ہے اور کسی کی یہ شان نہیں۔“[2]

یہ موصوف نے اپنا عقیدہ اور قاعدہ کلیہ بیان کر دیا ہے جو سید احمد صاحب پر قطعاً لاگو ہوتا ہوا نظر نہیں آ رہا۔ اب اِس کُلیّہ کی روشنی میں تصویر کا دُوسرا رُخ یعنی انبیائے کرام علیہم السّلام کا

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی؛ حیات سیّد احمد شہید، ص ۶۳

[2] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی؛ تقویۃ الایمان، ص ۳۵

ذکرِ خیر سُنیے، وُہ لکھتے ہیں:

> "غیب کا دریافت کرنا اپنے اختیار میں ہو، جب چاہیے کر لیجیے، یہ اللہ صاحب ہی کی شان ہے، کسی نبی اور ولی کو، جنّ اور فرشتے کو، پیر اور شہید کو، امام اور امام زادہ کو، بھوت اور پری کو اللہ صاحب نے یہ طاقت نہیں بخشی کہ جب وُہ چاہیں غیب کی بات معلوم کر لیں۔" [1]

قارئینِ کرام! ابھی آپ نے صراطِ مستقیم کتاب سے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی وہ عبارتیں ملاحظہ فرمائی ہیں جن میں اُنھوں نے اپنے پیر جی کے بتائے ہُوئے شُغلِ دورہ کا ذکر کیا اور اُس کا اثر یہ بتایا تھا کہ اِس شُغل کی مدد سے جب چاہے کوئی بھی وہابی زمین و آسمان کی جس جگہ کے چاہے حالات معلوم کر سکتا ہے۔ جنت و دوزخ کی سیر میسر آسکتی ہے، فرشتوں اور روحوں سے ملاقات کی جا سکتی ہے، لوحِ محفوظ سے جس امر کو دریافت کرنا مطلوب ہو اُس کا بچشمِ خود مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کیا ستم ظریفی اور کیسا عقیدہ ہے کہ علم کے جو دروازے انبیائے کرام اور اولیائے عظام کے لیے قطعًا بند کیے ہُوئے تھے اور اُنھیں خدا کے لیے خاص بتایا ہے، وہی دروازے ہر وہابی کے لیے چوپٹ کھولے ہُوئے ہیں۔ آخر یہ دین و مذہب کو بازیچۂ اطفال بنانے کے سوا اور کیا ہے؛ اِس ستم ظریفی کی انتہا تو یہ ہے کہ سیّد المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک کے لیے علم کا یہ دروازہ قطعًا بند بتایا گیا ہے۔ وہاں بھی چشمِ قلب کا کوئی تصوّر تک نہیں آتا جو پیر جی کے لیے مسلّم ہے۔ چنانچہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے صاف صاف لکھ دیا،

> "چنانچہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کہ بارہا ایسا اتفاق ہُوا کہ بعضی بات دریافت کرنے کی خواہش ہُوئی اور وہ بات معلوم نہ ہُوئی۔ پھر جب اللہ صاحب کا ارادہ ہُوا تو ایک آن میں بتا دی۔ چنانچہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں منافقوں نے حضرت عائشہ رض پر تہمت کی اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اِس سے بڑا رنج ہُوا کئی دن تک بہت تحقیق کیا پر کچھ حقیقت معلوم نہ ہُوئی اور بہت فکر و غم میں رہے،

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی: تقویۃ الایمان، ص ۵۳، ۵۴

پھر جب اللہ صاحب کا ارادہ ہُوا تو بتا دیا کہ منافق جھُوٹے ہیں اور عائشہ رضؓ پاک ہیں۔[1]

قطعِ نظر اِس کے کہ امام الوہابیہ نے منافقین مدینہ کی ہمنوائی کرتے ہُوئے واقعے کو قطعاً غلط رنگ دیا ہے ، ہم یہاں اپنے موضوع کی مناسبت کے لحاظ سے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی ان نرالے موحّدوں کی نظر میں کسی بات کو معلوم نہیں کر سکتے تھے ، بجز وحی کے ، کیونکہ نہ اُن کے پاس سیّد احمد صاحب کی طرح چشمِ قلب تھی اور نہ اُنھیں وہابی کشتی کے ہر سوار کی طرح دورے کا شغل آتا تھا ، جس کی مدد سے عرش و فرش اور جنت و دوزخ تک کی خبریں معلوم کر لیا کرتے یا لوحِ محفوظ سے پڑھ کر معلوم کر لیا کرتے۔ معلوم نہیں اس کے باوجود نبیِ آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو زبانی طور پر کس طرح ساری کائنات کا سردار اور "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" کا مصداق ٹھہراتے ہیں جبکہ وہابیوں کا ایک مُلّا جی بھی اُن کے نزدیک علم و اختیار میں سیّد الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بڑھا ہوا ہے اور سیّد احمد صاحب کی شان کا تو کہنا ہی کیا ؟ وہابی حضرات کی تصریحات کے مطابق تو علم و اختیار کی رُو سے سیّد صاحب ہی بعد از خدا بزرگ نظر آنے لگ جاتے ہیں ۔ اِسی ستم ظریفی کی مزید حد کرتے ہُوئے موصوف نے یہ بھی لکھا ہے :

> "کوئی شخص کسی سے کہے کہ فلانے کے دِل میں کیا ہے یا فلانے کی شادی کب ہو گی یا فلانے درخت کے کتنے پتّے ہیں یا آسمان میں کتنے تارے ہیں تو اِس کے جواب میں یہ نہ کہے کہ اللہ و رسولؐ ہی جانے ۔ کیونکہ غیب کی بات اللہ ہی جانتا ہے ' رسولؐ کو کیا خبر ؟"[2]

اِدھر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کسی ایک درخت کے پتّوں کی تعداد بتانے سے اور آسمان کے تاروں کا شمار جاننے سے بے خبر بتایا جا رہا ہے کہ معاملہ غیروں کا ہے لیکن اُدھر سیّد احمد صاحب کو رُوئے زمین کی تمام اشیاء ، دنیا کے سارے اشجار و احجار سے خبر دار

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی : تقویۃ الایمان ، ص ۵۴

[2] محمد اسمٰعیل دہلوی ، مولوی : تقویۃ الایمان ، ص ۱۰۷

اور اُن کی تسبیح و تہلیل وغیرہ کا سامع بتایا گیا ہے، کیونکہ یہ معاملہ اپنوں کا ہے۔ کیا وہابی حضرات اپنے امام علی الاطلاق کے بتائے ہوئے اس نظریہ پر کبھی نظرِ ثانی کی زحمت گوارا کریں گے کہ ایک درخت کے پتے جاننے کو غیب دانی شمار کرکے دہلوی صاحب اُن کی گنتی سے سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بے خبر ٹھہراتے اور اُن کے لیے اتنا سا علم ثابت کرنا بھی توحید کی جان پر چھُری بتاتے ہیں، لیکن سید احمد صاحب کو دنیا و ما فیہا سے خبردار ٹھہرانا کیوں شرک نہ ٹھہرا؟ اس طرح وہابی حضرات کی نظر میں سید احمد صاحب کی علمیت اور وقعت کم رہی یا زیادہ؟

ہوسکتا ہے کہ بعض وہابی مناظر یہ کہنے لگیں کہ دہلوی صاحب اُس علم کو شرک ٹھہرا رہے ہیں جو ہمیشہ حاصل رہے جبکہ سید صاحب کا معاملہ صرف ایک رات کی بات ہے۔ تو ایسے حضرات کے اس موقف کا مطلب یہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لیے کسی کو اپنا شریک نہیں بناتا ہاں ایک رات کے لیے بنا لیا کرتا ہے۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔

قارئینِ کرام! آپ نے ملاحظہ فرما لیا کہ سید احمد صاحب کو کیسی رازداری اور غیر محسوس طریقے پر جملہ مقربینِ بارگاہِ الٰہیہ بلکہ نبی الانبیاء سیدنا و شفیعنا محمد رسول اللہ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھی زیادہ علوم و اختیارات والا دکھایا جا رہا ہے۔ اِس کرتوت سے نہ اِن حضرات کے عقیدۂ توحید میں فرق آتا ہے اور نہ اُمتی ہونے میں۔ بہرحال ذکر تھا سید صاحب کا کہ وہ رات بھر کائنات کی جملہ اشیاء کو اُن کی باطنی حالت میں چشمِ قلب سے دیکھتے رہے اور جس خاموش زبان میں بھی تمام اشیاء تسبیح و تہلیل بیان کر رہی تھیں اُسے سید صاحب رات بھر سماعت فرماتے رہے۔ اب اِسی ڈرامے کا اگلا پارٹ بھی ملاحظہ ہو:

> ”جب بعد ادائے اشراق بخدمت مولانا صاحب (شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ) کے حاضر ہو کر سلام علیک کہا تو بہت مسرور اور محفوظ ہو کر آپ نے فرمایا کہ باری تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آپ آج کی شب اپنی مراد کو پہنچ گئے۔ پس اُس روز کے بعد سے آناً فاناً آثارِ ترقیات و علو درجات و معاملات عجیب و وارداتِ غریب آپ پر ظاہر ہونے لگیں۔“[1]

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیات سید احمد شہید، ص ۶۴

جائے تعجب ہے کہ جو دروازے انبیائے کرام علیہم السلام تک کے لیے وہابی حضرات کے امام علی الاطلاق نے بند بتائے ہیں تو وہی دروازے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے لیے اُنھوں نے کس طرح کُھلا ہُوا تسلیم کر لیا؟ آخر یہ عقدہ کوئی تو حل کرتا کہ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کو کیسے معلوم ہُوا کہ سیّد احمد صاحب آج اپنی مراد کو پہنچ گئے ہیں؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اِن حضرات نے اپنی ہی اصطلاح کے مطابق عَلِیمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ بھی مان لیا اور اِس کے باوجود نہ صرف شرک کی زد سے بچے رہے بلکہ توحید کے ٹھیکیدار بھی بن گئے۔ اب اِسی المناک سلسلے کا ایک ایسا خواب بھی ملاحظہ فرمائیے جو مسلمانوں کے قلب وجگر کو چھلنی کر دیتا ہے۔ لکھا ہے،

> "اِس معاملہ عجیبہ کے بعد صاحبِ مخزن نے بحوالہ صراطِ مستقیم لکھا ہے کہ ایک خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چھوہارے اپنے دستِ مبارک سے سیّد صاحب کے مُنہ میں ایک دوسرے کے بعد رکھ کر بہت پیار اور محبت سے کھلائے اور جب آپ بیدار ہُوئے تو اُن چھوہاروں کی شیرینی آپ کے ظاہر و باطن سے ہویدا تھی۔ اِس کے بعد ایک دن حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور جناب سیّدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو سیّد صاحب نے خواب میں دیکھا۔ اُس رات کو حضرت علیؓ نے اپنے دستِ مبارک سے آپ کو نہلایا اور حضرت فاطمہؓ نے ایک لباس اپنے ہاتھ سے آپ کو پہنایا۔ اِن واقعات کے بعد کمالاتِ طریقۂ نبوت کے غایت آب وتاب کے ساتھ آپ پر جلوہ گر ہونے لگے۔"[1]

احقر کم از کم یہ نہیں سمجھ سکا کہ کسی چالیس سالہ جیتے جاگتے آدمی کو نہلانے کا مطلب کیا ہے؟ کاش! مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا قلم اِس خواب کو گھڑ کر سپردِ قلم کرنے سے پہلے خشک ہو گیا ہوتا۔ خاتونِ جنت رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سیّد احمد صاحب کو اپنے ہاتھ سے کپڑے پہنائے، خدا نہ کرے کہ کوئی وہابی شرم وحیا کو اِس درجہ گھول کر پی گئے ہوں کہ اُنھیں اِن لفظوں کے صریح گالی تسلیم کر لینے میں کسی قسم کا تامل ہو۔ تامل کرنے والے سے، خواہ وہ بڑے سے بڑے

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیاتِ سیّد احمد شہید، ص ۶۴

علّامۂ زماں ہو، کہا جا سکتا ہے کہ حضورِ والا! آج رات جب میں غسل کر کے فارغ ہُوا تو آنجناب کی والدۂ محترمہ یا حضورِ والا کی بیگم صاحبہ یا حضرت جی کی صاحبزادی صاحبہ نے مجھے اپنے ہاتھ سے کپڑے پہنائے تھے۔ اِس کے بعد دیکھنا کہ علّامہ صاحب کیا جواب دیتے ہیں۔ مارے غصّے کے آپے سے باہر ہوتے ہیں یا نہیں؟ کیسے کیسے سانپ کی طرح بل کھائیں گے۔ آخر غصّہ کیوں نہ آئے کہ اُن کی عزّت پر حملہ کیا ہے۔ لیکن یہی بات جب امام حسن و امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی والدۂ محترمہ، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زوجۂ مطہرہ اور سیّد المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی لاڈلی صاحبزادی بلکہ جگر کے ٹکڑے کے لیے کہی جائے تو کیا یہ کُھلی گالی نہیں ہے؟

ے میں اِس عارفانہ تجاہل کے صدقے
ہر اِک دِل کو چھیدا مِرا دل سمجھ کے

جب سیّد احمد صاحب بیعت کا کاروبار شروع کرتے ہیں تو براہِ راست اپنے پروردگار سے اُس کی مرضی پُوچھتے ہیں اور اُدھر سے جواب بھی مرحمت فرما دیا جاتا ہے۔ اولین سوانح نگار کے لفظوں میں یہ واقعہ ملاحظہ فرمایا جائے اور مفہوم و معانی کے سمندر میں تقویۃ الایمان سامنے رکھ کر غوطہ لگایا جائے۔ وہ بڑے فخر و غرور کے ساتھ اپنے کفیل و شفیع المذنبین سیّد احمد صاحب کا تذکرہ یُوں کرتے ہیں:

"پس اِس معاملۂ اخذِ بیعت میں تیری کیا مرضی ہے؟ جنابِ باری سے حکم ہُوا کہ جو کوئی تیرے ہاتھ پر بیعت کرے گا، خواہ وہ لاکھوں ہوں، ہر ایک کی کفایت کروں گا۔"[1]

بہرحال یہ تو سیّد احمد صاحب کی اُس شفیع المذنبینی کا تذکرہ تھا جو وہابی حضرات کے نزدیک ہر طرح مسلّمہ ہے اگرچہ اُن کے نزدیک سیّد المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی یہ منصب حاصل نہیں کیونکہ یہاں بغیر استدعا کیے تمام مریدانِ سیّد صاحب کی مغفرت کا وعدہ ہو گیا۔ اِسی سلسلے میں دُوسرے مقام پر یُوں لکھا ہے:

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیاتِ سیّد احمد شہید، ص ۶۵

"قصبہ مجھاون میں قیام کے دوران وہاں ایک عجیب واردات ظہور میں آئی۔ ایک روز حضرت سید صاحب بعد نماز فجر کے مراقب بیٹھے رہے۔۔۔۔ حمد و ثنا کے بعد آپ سجدے میں گر پڑے اور سجدے سے سر اٹھا کر مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا کہ آج ہاتفِ غیب نے مجھے بشارت دی ہے کہ اِس وقت تجھ کو اور تیرے کُل ہمراہیوں کو میں نے بخش دیا اور اِس ندا کے بعد ایک ہاتھ غیب سے ظاہر ہُوا۔ اُس ہاتھ نے اِس مسجد کو جنت الماویٰ میں لے جا کر داخل کر دیا۔ اُس وقت آپ نے فرمایا کہ اِس مسجد میں جس قدر آدمی موجود ہیں اِن سب کے نام ایک کاغذ پر لکھ لو اور اِن کو اصحابِ بدر کی طرح بارگاہِ ایزدی کے مقبول و منظور تصوّر کرو۔"[1]

بھلا جب مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی لگاتار کوشش کی جائے کہ سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو اپنی صاحبزادی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھی کام نہیں آئیں گے۔ آپ اللہؐ کے یہاں اُن کی ذمہ داری اُٹھانے، بخشش کروانے سے بھی جواب دے بیٹھے تھے لیکن سید احمد صاحب کے ساتھ لگنے سے بغیر کسی عرض معروض ہی کے مغفرت کی بشارت مِل جاتی ہے تو اُدھر جانے کے بجائے کیوں نہ اِدھر آئیں گے کہ دنیا ہی میں بخشش سے نواز دیے جائیں۔ کیا تالیفِ قلوب کے اِس جال اور شعبدہ بازی کے کمال کا کوئی جواب ہے؟ مسجد تو جنت الماویٰ میں داخل ہو گئی لیکن بیٹھے بٹھائے سید صاحب کے ہمراہی اصحابِ بدر کی طرح بارگاہِ ایزدی کے مقبول و منظور کس طرح ہو گئے جبکہ یہ خصوصیت پُوری اُمّتِ محمدیہ میں سے دیگر صحابہؓ کرام تک کو حاصل نہ ہو سکی؟ آخر یہ سید احمد صاحب کو بعد از خدا بزرگ منوانے کا منصوبہ تھا یا اور کچھ؟ مزید لکھا ہے:

"اِس بستی (فتحپور) میں جو نمازِ عصر کے بعد آپ مراقب بیٹھے تو نمازِ مغرب کے قریب سر اُٹھا کر فرمایا کہ خداوند تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج اُس رب العزت نے تمام اولیاء مقبولین سلف سے مجھ کو ممتاز کر کے ارشاد فرمایا کہ جو کوئی تیرے

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیات سید احمد شہید، ص ۱۲۶

ہاتھ پر بیعت کرے گا اُس کو تمام مکروہاتِ دنیا و آخرت سے محفوظ رکھ کر اپنی رضامندی اور انعام سے سرفراز کروں گا (اِس بشارت میں آپ کے خلیفوں اور خلیفوں کے خلیفوں کی بیعت بھی شامل ہے)۔ اُس وقت میں نے عرض کیا کہ اے کریم و رحیم! میرے آبا و اجداد کو بھی میری بیعت سے مشرف کر، تاکہ وُہ بھی اِس وعدۂ مغفرت میں شامل ہو جائیں۔ کئی روز اِس آخری دُعا کی قبولیت میں توقف رہا۔ اِس عرصہ میں سیّد صاحب وطن میں واپس پہنچ گئے۔ وطن میں پہنچ کر اِس دعا کی قبولیت کے واسطے آپ بہت گڑگڑائے۔ آخر اُس کریم و رحیم نے اپنے فضلِ عمیم سے اِس دعا کو قبول فرمایا اور حکم دیا کہ سید محمد (مولف مخزن احمدی) کو اپنے آبا و اجداد کی طرف سے وکیل کر کے اُن کی طرف سے اِن سے بیعت لے لے"۔[1]

اِس عبارت میں بھی سیّد احمد صاحب کو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اُونچا دکھانے کا جذبہ ہی کارفرما نظر آرہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے والدینِ کریمین کو زندہ کر کے اپنی اُمّت میں شامل فرمایا تھا تو سیّد صاحب نے سارے آبا و اجداد کو اپنی بیعت سے مشرف کر کے وعدۂ مغفرت میں شامل کروالیا۔ بات کی ہوا تو باندھ دی لیکن سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تو اپنے والدینِ کریمین کو دوبارہ زندہ کر کے مشرف باسلام کیا تھا۔ یہ ایسا مرحلہ نظر آیا جہاں زبانی جمع خرچ سے کام چل نہیں سکتا تھا، لہٰذا مؤلّفِ مخزنِ احمدی کو وکیل قرار دینے کی راہ نکال لی۔ رہے سیّد صاحب کے مرید تو وہ سلسلہ در سلسلہ اور نسلوں کی نسلیں بخشی جا رہی تھیں۔ تھوک کے حساب سے مغفرت لُٹ رہی تھی جبکہ سیّد الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اُمتی بننے سے پرچون کے حسابوں بھی وعدۂ مغفرت کا وہابی حضرات قحط بتاتے رہتے ہیں۔ امام الوہابیہ نے خود لکھا ہے:

"اِس آیت سے معلوم ہُوا کہ تمام آسمان و زمین میں کوئی کسی کا ایسا سفارشی نہیں کہ اُس کو مانیے اور اُس کو پُکاریئے تو کچھ فائدہ یا نقصان پہنچے"۔[2]

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیات سیّد احمد شہید، ص ۱۲۶

[2] محمد اسمٰعیل دہلوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۱

انبیائے کرام اور اولیائے عظام کا ماننا تو نفع نقصان سے خالی بتایا لیکن سیّد احمد صاحب کے ساتھ لگنا کتنا فائدہ مند کہ فوراً وعدۂ مغفرت و اصحابِ بدر کا درجہ حاصل کیا۔ کیا یہ مسلمانوں کا رُخ مقربینِ بارگاہِ الٰہیہ کی طرف سے اپنے برطانوی امیر المومنین کی جانب پھیرنے کا طاغوتی منصوبہ نہیں تھا؟ دہلوی صاحب نے مزید لکھا ہے:

> ”اِس آیت سے معلوم ہُوا کہ جو کوئی کسی کو اپنا حمایتی سمجھے گو یہی جان کر کہ اِس کے سبب سے خدا کی نزدیکی حاصل ہوتی ہے، سو وہ بھی مشرک ہے اور جھوٹا اور اللہ کا ناشکرا۔“[1]

اگر بندگانِ خدا کسی کی قطعاً حمایت نہیں کر سکتے تو سیّد احمد صاحب جو اپنے ساتھیوں کی حمایت ہر قدم پر کرتے اور انھیں جنت و مغفرت کی بشارتیں سناتے رہے اُنھیں کیوں دروغگو شمار نہ کیا؟ اگر بزرگوں کے سبب سے خدا کی نزدیکی حاصل نہیں ہوتی تو سیّد احمد صاحب کے پیچھے اتنا بڑا لاؤ لشکر کیا سیر و تفریح کرنے کے لیے اکٹھا ہُوا تھا اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے پیچھے وہابیانِ پاک و ہند کس خوشی میں لگے ہُوئے ہیں؟ موصوف نے مزید لکھا ہے:

> ”اِس آیت سے معلوم ہُوا کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے کافر بھی اِس بات کے قائل تھے کہ کوئی اللہ کے برابر نہیں اور اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مگر اپنے بُتوں کو اُس کی جناب میں وکیل سمجھ کر مانتے تھے۔ اِسی سے کافر ہو گئے۔ سو اب بھی جو کوئی کسی مخلوق کا عالم میں تصرف ثابت کرے اور اپنا وکیل ہی سمجھ کر اُس کو مانے سو اُس پر شرک ثابت ہو جاتا ہے۔ گو کہ اللہ کے برابر نہ سمجھے اور اُس کے مقابل کی طاقت اُس کو ثابت نہ کرے۔“[2]

قطع نظر اِس کے کہ بُتوں کو اللہ کی بارگاہ میں اپنا وکیل سمجھنے کے باعث مشرکینِ مکّہ کافر ہُوئے تھے یا اِس کی اور بھی بے شمار وجوہات تھیں۔ غرض یہ کرنا ہے کہ انبیائے کرام اور

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۲

[2] ایضاً: ص ۶۳، ۶۴

اولیائے عظام کو تصرف ثابت کرنا اور وکیل ماننا شرک سہی لیکن امام الوہابیہ کی اِس خانہ ساز شریعت کے احکام کا سیّد احمد صاحب پر کیوں اطلاق نہیں ہوتا؟ سید صاحب کے لیے تصرف قدم قدم پر ثابت کیا جا رہا ہے، انھیں وکیل اور حمایتی مانا جا رہا ہے لیکن کوئی وہابی یہ نہیں کہتا کہ ہم شرک کے سمندر میں غوطے لگا رہے ہیں۔ انبیاء و اولیاء کے خلاف محاذ بنا کر سید احمد صاحب اینڈ کمپنی کو اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ بنا رہے ہیں۔ ذرا مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی یہ ابلیسی تصریح بھی ملاحظہ ہو:

”اللہ صاحب نے اپنے پیغمبر کو حکم کیا کہ لوگوں کو سُنا دیویں کہ میں تمہارے نفع و نقصان کا کچھ مالک نہیں اور تم جو مجھ پہ ایمان لائے اور میری اُمت میں داخل ہوئے سو اِس پر مغرور ہو کر حد سے مت بڑھنا کہ ہمارا پایہ بڑا مضبوط ہے اور ہمارا وکیل زبردست اور ہمارا شفیع بڑا محبوب ہے۔ ہم جو چاہیں سو کریں۔ وہ ہم کو اللہ سے بچا لے گا۔ کیونکہ یہ بات محض غلط ہے، اِس واسطے کہ میں آپ ہی ڈرتا ہوں اور اللہ سے ورے اپنا کوئی بچاؤ نہیں جانتا، سو دوسروں کو کیا بچا سکوں۔“[1]

چلیے یونہی سہی! گویا پیغمبرِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو خود ہی ڈرتے رہے اور اُنھیں بچاؤ کے لیے کوئی جگہ نہ مل سکی لہٰذا دُوسرے کا بچاؤ اِن حالات میں وُہ کر بھی کیا سکیں گے؟ لیکن خیر سے آپ کے سیّد احمد صاحب تو نہ صرف دنیا میں ہی مغفرت سے نوازے گئے بلکہ اُن کے ساتھیوں کو بخش دیا گیا تھا بلکہ جو اُن کے خلفاء اور خلفاء کے خلفاء سے بیعت ہو جائے وُہ بھی بخشا گیا تھا۔ اِن حالات میں صاف نظر آ رہا ہے کہ سیّد احمد صاحب پر اللہ تعالیٰ کی جتنی نظرِ کرم ہے، اِتنی تو اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر بھی نہیں۔ ان حالات میں، وہابی حضرات کیا ہمیں بھی یہ بتانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ اُنھوں نے محبوبیت میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سیّد احمد صاحب کو بڑھا کر اپنے برطانوی امیر المومنین کو مقامِ ربوبیت پر بٹھایا تھا یا سیّد احمد صاحب سے علوم و اختیارات میں سرورِ کون و مکاں صلی اللہ

---

[1] محمد اسمٰعیل، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۶۴

تعالیٰ علیہ وسلم کو کم بتا کر حبیبِ پروردگار، شافعِ روزِ شمار کے خلاف پُراسرار محاذ بنایا ہُوا ہے؛ کیونکہ جن کاموں کی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے زبانِ رسالت سے نفی کروائی ہے اُن سارے کاموں کو سرانجام دیتے ہُوئے سیّد احمد صاحب کو دکھایا جا رہا ہے۔ آخر یہ کیسا دین ہے؛ یہ کیا تماشہ ہے؟

خیر یہ تو باتیں تھیں سیّد احمد صاحب کی بین الاقوامی ولایت کی، جس کے باعث وہ کارساز، مشکل کشا، شفیع المذنبین اور کیا کچھ نظر نہیں آتے تھے۔ اب سیّد صاحب کے کسبِ فیض و حصولِ منصب کے بارے میں جہالت آمیز و مضحکہ خیز بیان مولوی محمد جعفر تھانیسری کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

> "اِس کے بعد ایک روز ارواحِ مقدس، جناب غوث الثقلین سیّد عبدالقادر گیلانی رح و حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند رح متوجہ حال سیّد صاحب ہُوئیں اور قریب ایک ماہ تک کسی قدر تنازعہ اِن دونوں رُوحوں کے درمیان رہا۔ ہر ایک رُوح اِن دونوں رُوحوں میں سے سیّد صاحب کو اپنی طرف جذب کرنا چاہتی تھی۔ آخر بعد انقضائے ایامِ تنازعہ کے دونوں رُوحوں کی بالاشتراک جذب کرنے پر صُلح ہو گئی۔ اب دونوں ارواحِ مقدسہ نے بالاشتراک آپ پر جلوہ گر ہو کر ایک پہر تک بنفسِ نفیس محوِ توجہ قوی اور تاثیر زور آور فرمائی کہ اُس ایک پہر میں نسبت اِن دونوں خاندانوں کی آپ کو حاصل ہو گئی۔"[1]

اسی قسم کا ایک مضحکہ خیز بیان اور پیش کیا جاتا ہے، جس سے اِن حضرات کی سلوک و تصوّف سے ناواقفیت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے اور صاحبِ فہم و فراست پر اِن کی دروغگوئی اور کذب بیانی پورے طور پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ لیجیے وُہ بیان بھی ملاحظہ فرمائیے:

> "اِس کے بعد ایک روز سیّد صاحب رح حضرت خواجۂ خواجگان خواجہ بختیار کاکی قدس سرہٗ کے مرقد مبارک پر مراقبہ میں بیٹھے تھے اور اُس وقت رُوح پُر فتوح

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیاتِ سیّد احمد شہید، ص ۶۵

خواجہ صاحب مرحوم سے آپ کی ملاقات ہُوئی تو اُس مقدس رُوح نے آپ کے اوپر توجہ فرمائی۔ اُسی وقت نسبت خاندان چشتیہ کی بھی حاصل ہوگئی اور اس کے بعد نسبت مجددیہ، شاذلیہ وغیرہ غرض کُل مشہور خاندانوں کی نسبت خود بخود آپ کو حاصل ہوگئی۔

بعد تکمیل اِن دونوں سلوکوں کے ایک روز عالمِ مراقبہ میں آپ کی ملاقات روح پُرفتوح بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ سے ہُوئی۔ اُس وقت سید صاحب نے دیکھا کہ ایک چتر نور مقدس کا خواجہ صاحب ممدوح کے سر پر سایہ کر رہا ہے۔ پھر اُسی وقت یہ بھی آپ کو دکھائی دیا کہ آپ کے سر پر دو چتر نورِ مقدس کے سایہ کر رہے ہیں۔ چونکہ سید صاحب اپنے کو کمترین مریدانِ خواجہ سے شمار کرتے تھے۔ یہ معاملہ معکوس دیکھ کر آپ کو بہت شرم آئی اور فوراً مراقبہ سے باہر آکر لرزاں و ترساں مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور نہایت خوف اور شرمندگی سے اس کو مولانا صاحبؒ کی خدمت میں عرض کیا۔ حضرت مولانا صاحب نے نہایت فرحاں وخنداں اس کے جواب میں فرمایا، اے فرزند! جائے تعجب نہیں ہے، ولایتِ نبوت کے ایسے ہی آثار ہوتے ہیں۔ اے عزیز! ابھی تو اس کی ابتداء ہے اور مشتے از خروار اور ایک قطرہ از بحرِ ناپیدا کنار تم پر ظاہر ہوا ہے۔ آئندہ اس سے بڑھ چڑھ کر ہزارہا اِس قسم کی باتیں تم پر ظاہر ہوا کریں گی"۔[1]

ولایت نبوت تو اُسے کہتے ہیں جو نبی کو اعلانِ نبوت سے قبل حاصل ہُوا کرتی ہے لیکن سید صاحب کے لیے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی اس کا اعلان کروانا ظاہر کر رہا ہے کہ اندرونِ خانہ اعلانِ نبوت کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی جس کی خاطر وحی وعصمت کے دعوے کیے جا رہے تھے اور وقت آنے پر سید صاحب کی مُہر اِسْمُہٗ اَحْمَدُ مقرر ہُوئی تھی۔

تمام باتوں سے قطع نظر اِن مذکورہ بالا دونوں بیانات کو پھر ملاحظہ فرمائیے۔ پہلے واقعے

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیات سید احمد شہید، ص ۶۵

میں حضور سیّدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق غوث الثقلین کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی جنوں اور انسانوں کی فریاد کو پہنچنے والے ۔ کیا یہ تقویۃ الایمانی دھرم میں ٹھیٹ شرک و کفر تو نہیں ؟ یا تقویۃ الایمان کے ایٹمی کُلیے صرف مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے کی غرض سے گھڑے گئے تھے ؟ یہ بزرگوں میں جھگڑا دکھانا ، بیٹھے بٹھائے نسبتوں کا حاصل ہو جانا ، رُتبے میں سلطان الہند خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ سے اونچے بننا ، کیا اِس میں حقیقت کا کسی عاقل کو ادنیٰ سا شائبہ بھی نظر آتا ہے ؟ اب وصایا وزیری کے حوالے سے یہ واقعہ بھی ملاحظہ ہو :

"ایک روز اپنے حجرے میں لیٹے ہوئے سیّد صاحب کے خیال مبارک میں گزرا کہ نامعلوم اِس جہاں کے قطب الاقطابِ جہاں کون بزرگ ہیں ؟ یہ خیال کر کے جناب باری تعالیٰ میں دعا کی کہ اُس بزرگ کا مجھ پر حال کھول دیں اور اُن کی زیارت سے مجھ کو مشرف کر ۔ یہ دُعا قبول ہوئی اور اُسی دم اللہ رب العزت نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ہوا کو حکم دیا کہ آپ کو معہ بستر آناً فاناً اُس بزرگ قطب الاقطاب کے مسکن پر پہنچا دے ۔ چنانچہ آپ بہت سے ممالک اور پہاڑوں اور جنگلوں کا تماشا دیکھتے ہوئے ایک دم میں ملکِ شام میں پہنچ گئے ۔ آپ نے اُس بزرگ سے کہا کہ مجھ کو تمھاری ملاقات سے حصولِ رضامندی باری تعالیٰ کے باوجود اور کچھ مقصود نہیں ہے ۔ مگر اِس کے باوجود بھی وہ بزرگ کچھ متوجہ نہ ہوئے ..... اُس گھڑی چالیس اشخاص غیبی مؤکل کی حیثیت سے ، دنیا کی نظروں سے پوشیدہ اور آپ کے سامنے عیاں ، آپ کی خدمت میں تعینات ہو گئے اور یہ اشخاص غیبی اُس شخص کے ساتھ تعینات رہتے ہیں جس کو مرتبہ قطب الاقطاب کا عنایت ہوتا ہے ۔ خیر اِس انعامِ تازہ کے بعد جس طرح رب العزت آپ کو وہاں لے گیا تھا اُسی طرح واپس لے آیا ..... جب اِس وقوعہ کے چند سال بعد سیّد صاحب ملک خراسان کو تشریف لے گئے تو اُن پہاڑوں اور میدانوں کو دیکھ کر آپ فرمایا کرتے تھے کہ اِنھیں پہاڑوں اور میدانوں کے اُوپر سے اِس ملک شام میں میرا سفر ہوا تھا ۔"[1]

---

[1] محمد جعفر تھانیسری ، مولوی : حیاتِ سید احمد شہید ، ص ۸۳

جن خوش نصیب حضرات نے تصوف سے تھوڑا بہت حصّہ بھی پایا ہو وہ بخوبی جان سکتے ہیں کہ یہ واقعہ محض گھڑنت اور فضاؤں میں محل تعمیر کرنے والوں کا تیار کردہ عقلی ڈھکوسلا ہے۔ عبارت کا ہر فقرہ اِس شعبدہ بازی کی زبانِ حال سے گواہی دے رہا ہے۔ جیسے سیّد صاحب کو زبانی جمع خرچ سے قطب الاقطاب تو بنالیا، لہذا کیسے ممکن ہے کہ اپنے پیر و مرشد سے اُونچے ہونے کا اعلان نہ کرتے۔ اس سلسلے میں پہلے یہ بیان ملاحظہ ہو:

> ”مولانا (مرتضیٰ خاں صاحب) لکھتے ہیں کہ سیّد صاحب نے مجھ سے اپنا ایک روز کا حال اِس طرح بیان کیا کہ میں ایک دن مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے دولت خانے پر حاضر ہُوا۔ اُس وقت آپ کے پاس مولوی رشید الدین صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں بہت دیر انتظارِ تخلیہ، دالان میں ٹہلتا رہا کہ جب یہ صاحب تشریف لے جائیں تو میں مولانا سے کچھ عرض کروں۔ اِس ٹہلنے کی حالت میں مجھ کو یہ الہام ہُوا کہ اگر تو بندوں کی طرف التجا کرے گا تو ہم تیری دستگیری نہ کریں گے۔“ [1]

واقعہ کچھ یُوں معلوم ہوتا ہے کہ سیّد صاحب کو وہاں کسی انگریز نے دیکھ لیا ہوگا۔ اُسے یقیناً یہ بات ناگوار گزری ہوگی اور صاف کہہ دیا ہوگا کہ اگر تم نے شاہ صاحب سے رابطہ رکھا تو ہمارا تمھارا نِبھاؤ نہیں ہوگا اور ہماری نظرِ کرم تمھاری جانب سے ہٹ جائے گی۔ بہرحال اِس واقعے کو مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح الہام کا رنگ دے کر بزرگی کی سند بنا دیا گیا۔ اب اس واقعے کے متن پر یار لوگوں کی حاشیہ آرائی بھی دیدنی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ”یہ قصہ لکھنے کے بعد مولوی مرتضیٰ خاں صاحب اپنی رائے اور اپنے اجتہاد سے یہ لکھتے ہیں کہ اِس الہام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن ایّام میں سیّد صاحب کا درجہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب سے بڑھا ہُوا تھا۔ جامع لکھتا ہے کہ یہ بات تو میں نے بہت لوگوں سے سُنی ہے کہ جب سیّد صاحب حج کو تشریف لے گئے تو اُس وقت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کو سیّد صاحب کی علوِ مرتبت کا حال

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیات سیّد احمد شہید، ص ۱۲۱

غیب سے معلوم ہوا۔ اُس وقت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ سیّد صاحب کی واپسی کے بعد میں اُن کے ہاتھ پر بیعت کر کے ، وُہ شرف جس کا وعدہ ہے ، ضرور حاصل کروں گا۔ مگر افسوس کہ مولانا کی اُمید بر نہ آئی کیونکہ سیّد صاحب کے دوبارہ دہلی آنے سے پہلے مولانا صاحب کا وصال ہو گیا تھا“۔[1]

جس ذہن نے یہ واقعات گھڑے اور جس قلم نے کاغذ کے سینے پر انھیں جڑا ، اُس کی ستم ظریفی کا اندازہ بھلا کون کر سکتا ہے ، جس نے اس شعبدہ بازی کو ایسا خوشنما رنگ دے دیا کہ پڑھے لکھے لوگوں کو بھی اس کی حقیقت تک پہنچنے کا راستہ نہیں ملتا۔ وہ جال کی خوشنمائی تو دیکھتے ہیں لیکن جال کی حقیقت کو دیکھنے سے عاجز رہ جاتے ہیں۔ ایسے پُر اسرار چکّر کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ : ؎

چوں قلم در دست غدّارے بود
لاجرم منصور بر دارے بود

ابھی سیّد احمد صاحب کی البیلی ولایت جو منصبِ نبوت کو بھی شرما رہی ہے ، اُس کا ایک پہلو قارئین کرام اور ملاحظہ فرمالیں کہ اگر سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فراق میں اُستنِ حنانہ رو یا تھا تو سیّد احمد صاحب کو وہابی حضرات کس طرح کم رہ جانے دیتے ؛ اِس کمی کو اُنھوں نے یُوں پُورا کیا ہے :

”جس فجر کو آپ روانہ بریلی ہونے والے تھے ، اُس رات کو آپ کے نئے مکان کی رُوح بہ ہیئتِ انسانی ظاہر ہوئی اور آپ کی جُدائی میں بہت رنج و ملال ظاہر کر کے ایک دوسری مخلوقِ الٰہی سے ، جو وہاں حاضر تھی ، مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ کل ہمارا آقائے نامدار ہم کو چھوڑ کر چلا جائے گا۔ یہ کہہ کر ایسا زار و قطار رونا شروع کیا ، اِس گریہ وزاری کا اثر سیّد صاحب پر بھی ہو گیا اور آپ بھی رونے لگے اور چونکہ اُس وقت سیّد صاحب کو خود کچھ حضوری الٰہی ہو رہی تھی ،

---

[1] محمد جعفر تھانیسری : حیاتِ سیّد احمد شہید ، ص ۱۲۱

آپ نے اللہ رب العزّت سے عرض کیا کہ یہ سب تیرا فضل و کرم ہے، اِس روح کی یہ اُلفت تیرے ہی انعام کے سبب سے ہے ورنہ میرے جیسے ہزار ہا آدمی اپنے اپنے مکانات کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، کبھی کوئی مکان اُس کے واسطے رنج و ملال نہیں کرتا۔ سوائے رب! تُو ہی اپنے فضل سے اِس مکان کو تسکین دے، اُسی وقت جنابِ باری سے حکم ہوا کہ اِس مکان کو بھی ہم جنّت میں داخل کریں گے، یہ خطاب اُس روح مکان نے خود بھی سنا اور میں نے بھی بہ تعمیلِ حکمِ الٰہی اُس کو یہ بات سنا دی، تب اس مکان نے خوش و خرم ہو کر تسلی پائی[1]

ایک جانب سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا سیّد احمد صاحب کو مدِّ مقابل دکھانا اور دُوسری طرف اللہ جلّ شانہٗ سے بالمشافہ کلام کرنے کا دعویٰ کرنا جبکہ یہ خصوصیت موسیٰ علیہ السّلام اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے علاوہ دُوسرے انبیائے کرام کو بھی حاصل نہ ہُوئی لیکن یار لوگوں نے ستم ظریفی سے سیّد صاحب کو زبان زوری سے اُسی منصب پر فائز کر دیا۔ اِسی قسم کا ایک حیرت انگیز واقعہ اور ملاحظہ فرما لیا جائے۔ لکھا ہے:

"یہاں ایک عجیب و غریب واقعہ ظہور میں آیا اور وُہ یہ کہ سمندر کی روحانیت ایک ہیبت ناک صورت بن کر حضرت کے سامنے آئی اور بہت غرور اور تکبّر سے بولی کہ تُو اپنی جان سے سیر ہو کر، ایسی جسارت کر کے، میرے اندر ہلاک ہونے کو کیوں آیا ہے؟ تُو نہیں جانتا کہ میں سمندر ہُوں، جس نے ایک لمحہ میں فرعونوں کو ہلاک کر ڈالا تھا اور مَیں وُہ ہُوں کہ ہزاروں جہاز اور کشتیاں ہر سال میرے سامنے تباہ ہوتی ہیں اور مَیں وہ بحرِ محیط ہُوں کہ ساری زمین کو مع ساکنانِ زمین کے گھیرے ہُوئے ہوں۔ اگر میں چاہُوں تو ایک لمحہ میں سارے ساکنانِ زمین کو غرقِ آب کر دُوں۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ تُو اپنی جان سے بیزار ہو گیا ہے، مگر اپنے ساتھ اتنی خلقت کو کیوں ہلاک کرنا چاہتا ہے؟

سیّد صاحب نے جب یہ کلمات نخوت آمیز سمندر سے سُنے تو اُسی

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیات سیّد احمد شہید، ص ۱۲۸

وقت آپ کو یہ الہام ہوا کہ تُو سمندر سے کہہ دے کہ تُو کیسی غرور اور تکبّر کی بات کرتا ہے، مَیں اور تُو دونوں غلامانِ غلام اُس جبّار و قہّار کے ہیں، تُو اللہ سے ڈر اور میرے رُوبرو اس قدر شیخی نہ بگھار۔ تیرا کیا اختیار ہے کہ تُو کسی کو غرق کرے،؟ ۱؎

اہلِ علم و دانش پر بخوبی آشکار ہے کہ یہ واقعہ محض گھڑنت اور اندھی عقیدت کی کرشمہ سازی ہے، جس نے عقل و فہم سے کام لینے کا موقع بھی نہ دیا۔ مقربینِ بارگاہِ الٰہیہ کے حضور سرکشوں کے سوا کون ہے جو دم مارے؟ سمندر یا اُس جیسی کس چیز کی مجال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں سے اس طرح کی گفت گو کرے؟ لیکن جعلی ولایت کے لیے اصلی کرامتیں کہاں سے آئیں؟ اسی طرح فرضی قصّے کہانیوں کو کرامت کا رنگ دے کر بھان متی کا کنبہ جوڑا جاتا ہے۔ اسی طرح کا ایک فرضی قصّہ تیمارداری کے سلسلے میں ملاحظہ فرمائیے:

> "اس رات کو اثنائے راہ میں سیّد صاحب نے رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ حضرت بمعیت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہٗ اور حضرت خاتونِ جنت اور حسنین رضی اللہ عنہم اجمعین کے آپ کی عیادت کے واسطے تشریف لائے اور ہر ایک بزرگ نے حضرت سیّد صاحب کے سینہ مبارک پر ہاتھ رکھ کر تسلّی و تشفّی کی اور آپ کو بہت سی بشارتیں دیں۔" ۲؎

جب پانچوں حضرات کی تشریف آوری کا ذکر کر کے لکھ دیا کہ ہر ایک بزرگ نے سیّد صاحب کے سینے پر ہاتھ رکھا تو مطلب یہی ہُوا کہ حضرت خاتونِ جنّت، جگر گوشۂ رسول، زہرہ بتول رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھی سیّد صاحب کے سینے پر اپنا دستِ مبارک رکھا ہوگا۔ وہابی صاحبو! کیا قیامت نہیں آئے گی؟ باز پرس نہ ہوگی؟ یہ کس کی والدہ، کس کی زوجۂ مطہرہ، کس کی لختِ جگر کے بارے میں یہ بیہودہ الفاظ سپردِ قلم کیے ہیں؟ کیا اپنے ملّاؤں کی سامری کے بچھڑے کی طرح پرستش کرنا اور بزرگوں کے ننگ و ناموس سے کھیلنا ہی آپ حضرات کے دین کا رکنِ اعظم

۱؎ محمد جعفر تھانیسری: حیات سیّد احمد شہید، ص ۱۴۷

۲؎ ایضاً: ص ۱۵۷

اور توحید کی سند ہو کر رہ گیا ہے؟ آخر یہ کیا قیامت ہے؟

ع شرم تم کو مگر نہیں آتی

سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو وصال کے روزے رکھنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا تھا: ابیت عند ربی یطعمنی ویسقینی۔ یعنی میں اپنے رب کے حضور رات گزارتا ہوں، وہی مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ بلکہ شمعِ رسالت نے اپنے اُن بے مثل پروانوں سے فرما دیا تھا کہ: اَیُّکُمْ مِثْلِیْ یعنی تم میں مجھ جیسا کون ہے؟ صحابۂ کرام تو اپنے دل و دماغ کے کسی گوشے میں اُس سرکار سے مثلیت کا تصور بھی نہیں لا سکتے تھے لیکن وہابیوں نے اپنے سید صاحب کو کھینچ کھچیڑ کر فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بالمقابل کھڑا کر ہی دیا، کیونکہ جب ناچنے ہی کو نکلے تو گھونگھٹ کیسا؟ چنانچہ لکھا ہے:

> "آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو کچھ مجھ کو حاصل ہوا، وہ سب تہجد کی نماز کی برکت سے ہوا۔ اور تیرنے کی بھی آپ کو ایسی مشق تھی کہ آپ غوطہ مار کر تہہِ دریا میں دو رکعت نفل پڑھ لیتے تھے اور باایں تن و توش و شجاعت کے آپ کھانا بہت کم کھاتے تھے، بلکہ ایک روز آپ نے فرمایا کہ بھائیو! یہ مت سمجھو کہ میری حیات کا باعث کھانا پینا ہے بلکہ ایسا ہرگز نہیں ہے میری حیات کا سبب فقط یادِ الٰہی ہے۔ اگر یادِ الٰہی سے ذرا بھی غافل ہو جاؤں تو میرا دم نکل جائے۔"[1]

جب سید صاحب غوطہ مار کر تہہِ دریا میں دو نفل پڑھ لیا کرتے تھے تو معرکۂ بالاکوٹ کے اندر دلدل میں چھلانگیں لگاتے وقت تو زمین پر دوبارہ قدم لگنے سے پہلے فضاؤں میں ہی پانچ سات نفل تو ضرور پڑھ لیا کرتے ہوں گے؟ معلوم نہیں ان خدا کے بندوں نے دین و دیانت کے ساتھ ہی عقل و دانش سے بھی کیوں دشمنی گانٹھ لی؟ چند روزہ زندگی کے آرام و راحت کی خاطر ایسے پُراسرار ڈھونگ؟ اِس پر بھی متبعین حضرات آج تک خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے اور اُن کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہی چلے جاتے ہیں۔ وہابی حضرات کی غایت کوشش یہی نظر آتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیاتِ سید احمد شہید، ص ۱۱۷

علیہ وسلم کو جو فضائل و کمالات اور خصوصیات حاصل ہیں وہ سیّد احمد صاحب میں ضرور دکھائی جائیں تاکہ آسانی سے مسلمانوں کا رُخ اُدھر سے اِدھر پھیرا جا سکے۔ فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں جنّات حاضر ہو کر مشرف با سلام ہُوا کرتے تھے جس پر قرآن کریم کی سُورۃ جِنّ بھی شاہد ہے۔ اب سیّد احمد صاحب کے بارے میں وہابی علماء و مورخین کے خیالات ملاحظہ ہوں:

> ”معتبر راویوں کا بیان ہے کہ اِس سفر (روانگی از جدّہ) میں بہت سے جِنّوں اور شاہِ جنّات کو مثل اپنے جدِّ امجد حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آپ نے ہدایت کی اور لاکھوں جِنّ آپ کی بیعت سے فیضیاب ہُوئے۔“ [1]

اولیائے کرام کے دشمن جب اپنے پیرو مرشد کو ولی کامل بنانے پر آئے تو کسی قسم کی کمی کیوں رہنے دیتے، اب سیّد احمد صاحب سے فیضیاب ہونے والے جنّات کا عالم الغیب ہونا اور سارے وہابیوں کا اُن پر صدقِ دل سے ایمان رکھنا اور اِسے سیّد صاحب کے کمالات میں گننا ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:

> ”اور یہ بھی آپ (سیّد احمد صاحب) فرمایا کرتے تھے کہ اِس جماعتِ قدسیہ (رجال الغیب و ارواح و جنّات) کا دوسرا حال یہ ہے کہ ہمارے مقام کے وقت یہ جماعت ہمارے لشکر سے تھوڑے فاصلے پر اُترتی ہے اور جب ارادۂ الٰہی ہمارے کسی طرف کوچ کرنے کا ہوتا ہے تو یہ جماعت اُس طرف کو چلنے لگ جاتی ہے، تب اُن کی روانگی کو دیکھ کر میں بھی خود بخود اُس طرف کو چل پڑتا ہوں اور یہی وجہ تھی کہ آپ بعض جگہ مہینوں تک ٹھہرے رہتے تھے اور پھر یک بیک چل دیتے تھے۔“ [2]

یہ بھید تو وہابی حضرات ہی کو معلوم ہوگا کہ سیّد صاحب کی جماعتِ قدسیہ کو ارادۂ الٰہی کس طرح معلوم ہو جاتا تھا، انبیائے کرام علیہم السلام کے لیے علمِ غیب کا انکار کرنے والے

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیات سیّد احمد شہید، ص ۱۶۰

[2] ایضاً: ص ۱۷۳

جنوں کی غیب دانی پر ایمان معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت لے آئے؟ اور اس سے اُن حضرات کی ساختہ توحید کے علمبردار ہونے پر کوئی حرف تو نہیں آیا؟ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مماثل اپنے سید صاحب کو دکھانے کی خاطر یہ سارا ڈھونگ رچایا گیا تھا، چنانچہ اپنے اِسی قلبی راز کا اظہار متعدد جگہ پر وہابی قلم کاروں نے کیا ہُوا بھی ہے۔ ایک مقام پر لکھا ہے:

> "سید صاحب کی تعلیمات بھی مثل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت سیدھی سادی تھیں، جن سے عالم و جاہل دونوں برابر مستفید ہوتے تھے۔" [1]

اِس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ سید صاحب مبلّغِ اسلام نہیں تھے بلکہ اُنھوں نے خود ایک مذہب وضع کیا اور اُسی کی نشر و اشاعت مقصود تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ سید صاحب کی دینی تعلیمات بھی وہابی حضرات کے نزدیک سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات کی طرح سیدھی سادی تھیں۔ مسلمانوں کے فقہی لحاظ سے حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی چار مذاہب ہیں اور بلحاظِ طریقت بھی چار مشہور سلسلے نقشبندی، قادری، چشتی اور سُہروردی ہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے اہلسنّت وجماعت سے علیحدہ اپنی جماعت تشکیل دی اور اُس کا نام محمدی گروہ رکھا۔ سید صاحب نے چاروں مشہور سلاسل سے الگ اپنا محمدی طریقہ وضع کیا، جس میں فرضی کرامتوں کے افسانے تو ضرور تھے لیکن تصوّف سے دُور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ سید صاحب نے مسلمانوں کے چاروں فقہی مذاہب اور طریقت کے چاروں سلاسل کے بارے میں یہ تاثرات پھیلائے تھے:

> "یہ چاروں فقہاء کے مذاہب میں کون سا مذہب آپ کو پسند ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ اِن میں سے کوئی مذہب بھی مجھ کو پسند نہیں ہے اور فرمایا کہ ان میں کوئی مذہب میرے طور اور طریقے پر نہیں ہے، سب سے افراط و تفریط ہو گئی ہے۔"
>
> آپ نے عرض کیا کہ اِن مشہور طریقِ اولیاء اللہ میں کون سا طریقہ حضور کے طور پر ہے؟ جناب امیر نے فرمایا کہ اِن میں بھی کوئی طریقہ میرے طور پر نہیں ہے۔

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، ص ۱۷۷

> ہر ہر طریقے میں کچھ کچھ چیزیں میری مرضی کے خلاف لوگوں نے ایجاد کر لی ہیں اور اِس وجہ سے سب کے سب ہمارے طَور اور طریقے سے دُور جا پڑے ہیں۔“ [1]

لیجیے صاحب! مجتہدین عظام کے فقہی مذاہب افراط و تفریط کا شکار، اکابر اولیاء اللہ کے چاروں سلاسل بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے طَور طریقے سے دُور کہ اُن میں لوگوں کی ایجادات شامل ہوگئیں، مسلمانوں کی جگہ تو محمدی گروہ (وہابی) مقبولِ بارگاہِ خداوندی ہو گیا، فقہی مذاہب کی جگہ خارجیت کو شرفِ قبولیت حاصل ہو گیا اور طُرقِ اکابر طریقۂ محمدیہ کے سامنے حرفِ غلط ہو گئے کیونکہ برٹش گورنمنٹ نے منصب و مقام ہی ایسا پاک صاف اور بلند و بالا مرحمت فرما دیا تھا کہ اُس کے مقابلے پر دُوسری کسی بڑی سے بڑی ہستی کا وزن ہی کچھ نہ رہا تھا! بہتر ہو گا کہ سیّد احمد صاحب کا اِس بارے میں اپنا نظریہ اور معمول بھی ملاحظہ فرما لیا جائے۔ لکھا ہے:

> ”آپ کا دستور تھا کہ بآوازِ بلند طریقۂ چشتیہ اور قادریہ و نقشبندیہ و مجدّدیہ میں اوّل بیعت لے کر پھر طریقۂ محمدیہ میں بیعت لیتے تھے ...... اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چہار مشہور طریقِ طریقت میں آپ کا اوّل بیعت لینا اور توجّہ دینا محض بطورِ حکمت خلائق کو رجوع کرنے کے لیے تھی ورنہ آپ کی اصل تعلیم اور دلی دعوت طرف طریقہ محمدیہ کے تھی، جس کی سب سے آخر میں آپ بیعت لیتے تھے۔“ [2]

اگر وہابی حضرات کی بارگاہوں میں ہمیں بھی اذنِ لب کشائی ہے تو ہم صرف اِتنا ہی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ حضرات! آپ کے امیر المومنین کا رائج فرمودہ طریقۂ تصوّف بنام طریقۂ محمدیہ آج کہاں ہے؟ کیا اِس وسیع دنیا کے کسی گوشے میں اُس کا کہیں نام و نشان موجود ہے؟ قرآنی اور ایمانی فیصلہ تو یہی ہے کہ جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیات سیّد احمد شہید، ص ۱۵۳، ۱۵۴

[2] ایضاً: ص ۸۷

کان زھوقا۔ جب حق آتا ہے تو باطل مٹ جاتا ہے کیونکہ باطل مٹنے کے لیے ہے۔ اگر طریقہ محمدیہ حق تھا اور مسلمانوں کے چاروں طریقے باطل تھے تو طریقۂ محمدیہ کو باقی رہنا تھا اور مسلمانوں کے چاروں طُرق کو مٹ جانا چاہیے تھا۔ لیکن معاملہ برعکس سامنے آیا کہ مسلمانوں کے چاروں طریقے پوری آب و تاب سے موجود ہیں۔ لیکن طریقۂ محمدیہ کا روئے زمین سے حرفِ غلط کی طرح نام و نشان مٹ چکا ہے۔ وہابی حضرات ذرا تھوڑی دیر کے لیے غصّے کو تھوک دیں، دلوں پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں کہ طریقۂ محمدیہ کا مٹنا اُن کے نزدیک حق کا مٹنا ہے یا باطل کا؟ یہ حضرات جو چاہیں فیصلہ کرسکتے ہیں لیکن اتنا یاد رہے کہ یہی فیصلہ قبر میں بھی اُن کے ساتھ کیا جائے گا، حشر و نشر میں اُن کے ساتھ رہے گا اور اُن کے نامۂ اعمال میں مرقوم ہوگا۔ اگر ہم سے پوچھنا چاہیں تو مجدد مائۃ حاضرہ امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہٗ نے اِس کا قاعدہ کلیہ اِن لفظوں میں بیان فرمایا ہے: ؎

مِٹ گئے، مِٹتے ہیں، مِٹ جائیں گے اعدا تیرے
نہ مِٹا ہے نہ مٹے گا کبھی چرچا تیرا

وہابی علماء و مورخین نے بتایا کہ سید احمد صاحب کی تعلیم نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جیسی سیدھی سادی، سید صاحب کے ساتھی اصحابِ بدر کی طرح مقبولِ بارگاہِ خداوندی، لیکن جو حضرات اِس پُراسرار برطانوی گاڑی کو چلانے میں پہیّوں کا کام دے رہے تھے، اُنھیں اپنے پروردگاروں کی جانب سے کیا منصب ملا تھا؟ اِس بارے میں لکھا ہے:

”آپ کے بڑے ساتھیوں میں مولوی محمد اسمٰعیل اور مولوی عبد الحی صاحب ہیں۔ یہ دونوں بزرگ بمنزلہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے آپ کے خلفائے راشدین سے تھے۔ مولوی عبد الحی صاحب کا مزاج بوجہ بردباری اور وقار حضرت ابوبکرؓ سے اور حضرت مولانا شہید کی طبیعت بوجہ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ و فجار حضرت عمرؓ سے زیادہ تر مشابہ تھی۔“[1]

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۴

یہ حضرات تو سیّد احمد صاحب کے خلفائے راشدین تھے اور حضرت ابوبکر صدیق و حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مشابہ لیکن خود سیّد صاحب اپنی تمام تر علمی بے مائیگی یعنی ناخواندگی کے باوجود، جیسا کہ خود اُن کے سوانح نگاروں نے بتایا ہے، کس کے مشابہ تھے؟ اِس کا مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے یُوں جواب دیا ہے:

ازبسکہ نفس عالی حضرت ایشاں بر
کمال مشابہت جناب رسالتمآب
علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات در
بدو فطرت مخلوق شدہ بناء علیہ
لوحِ فطرت ایشاں از نقوشِ
علومِ رسمیہ وراہِ دانشمندانِ کلام و
تحریر و تقریر مصفّٰی ماندہ بود۔"[1]

چونکہ آپ کی ذات والاصفات ابتدا
فطرت سے جناب رسالت مآب
علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات کی
کمال مشابہت پر پیدا کی گئی تھی،
اِس لیے آپ کی لوحِ فطرت علوم
رسمیہ کے نقش اور تحریر کے دانشمندوں
کی راہ وروش سے خالی تھی۔[2]

اِس ستم ظریفی کا جواب تو مل رہا ہوگا کہ سرورِ کون ومکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اُمی ہونا تو معجزہ ہے لیکن عوام کا علم سے کورا رہنا کمال نہیں بلکہ نقص ہے۔ اِس نقص کو اُس کمال کے برابر درجہ دینا اور دونوں کو مشابہ ٹھہرانا وُہ جرأتِ باغیانہ ہے جس کا ایک اُمتی کہلانے والا تصوّر بھی نہیں کرسکتا۔ آخر یہ ساری کارگزاری سیّد احمد صاحب کو منصبِ نبوت پر بٹھانے کے لیے نہیں تھی تو اور کس غرض سے تھی۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح یہ دعوئ نبوت کے لیے راہ ہموار کی جا رہی تھی، جس کی خاطر ابھی امامت اور مہدیت کے دعوے تک ہی پہنچے تھے جیسا کہ مشہور دیوبندی عالم مولوی عبید اللہ سندھی (المتوفی سنہ ۱۳ھ/ سنہ ۱۹۴۴ء) کا بیان منقول ہے:

"مولانا سندھی نے ایک دفعہ بڑے دُکھ سے فرمایا، حضرت سیّد احمد شہید

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۴

[2] صراطِ مستقیم اردو، ص ۱۶

کتنے بڑے بزرگ تھے لیکن دیکھو! وہ بھی اِسی رَو میں بہہ گئے۔ بجائے اِس کے کہ وہ افغان نمائندوں پر مشتمل ایک جمہوری نمائندہ حکومت بناتے، وہ خود امام اور مہدی بن گئے اور اِس طرح سارا معاملہ غتربود ہو گیا۔"[1]

یہی مولوی عبیداللہ سندھی دُوسرے مقام پر سیّد صاحب کی مہدیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"سیّد صاحب جیسی خوبیوں کا آدمی ملنا مشکل ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے امام و مہدی بننے سے اِتنی اچھی تحریک کس طرح تباہ ہُوئی۔"[2]

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سابق استاد جناب محمد سرور صاحب نے سیّد احمد صاحب کی امامت و مہدیت کے دعاوی اور اِن کے نتائج پر بحث کرتے ہُوئے اپنے تاثرات کو اِن لفظوں میں قلمبند کیا ہے:

"مولانا کے نزدیک سیّد احمد شہید کی جماعت نے سرحد میں جو شکل اختیار کی وُہ منشائے حقیقی کے خلاف تھی۔ اِن کی حکومتِ موقتہ (یعنی عارضی اور PROVISIONAL) تھی۔ اصل مرکز دہلی تھا۔ بدقسمتی یہ ہُوئی کہ سیّد صاحب نے امامت اور مہدیت کے دعوے کر دیے۔ اِس سے خواہ مخواہ سرحد کے امراء و خوانین میں بدمزگی پیدا ہُوئی۔ دوسری طرف امامت اور مہدیت کے بعد جماعتی فیصلوں کی اہمیت نہ رہی۔ اِس سے عوام پٹھان بھی بگڑ گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سیّد صاحب شہید ہو گئے۔ طبعاً مہدی اور امام کی شہادت سے اُن کے متبعین کے دِل ٹوٹ گئے اور اُن سے منتسب تحریک، اہلحدیث رفع یدین تک محدود ہو کر رہ گئی۔"[3]

سیّد احمد صاحب کی مہدیت تو بالاکوٹ میں دفن ہو گئی یا بقول اُن کے متبعین غائب ہو گئی لیکن یہی جھوٹا دعوٰی مرزا غلام احمد قادیانی کے لیے راستہ صاف کر گیا۔ اِس سے معلوم

---

[1] محمد سرور: افاداتِ و ملفوظاتِ سندھی، مطبوعہ لاہور، بار اوّل ۱۹۷۲ء، ص ۱۶۶

[2]، [3] ایضاً: ص ۳۴۹

ہوتا ہے کہ مرزا غلام احمد والے جملہ مراحل سیّد احمد صاحب ہی نے طے کرنے ہوں گے لیکن بخت نے یاوری نہ کی اور موت نے مہلت نہ دی۔ جس کے باعث لعنت کا اتنا بڑا طوق مرزائے قادیان کو زیبِ گلو کرنا پڑا۔ سندھی صاحب نے خود فرمایا تھا:

"اِس قسم کے روایاتی ماحول اور امام مہدی کے انتظار کی فضا میں مرزا غلام احمد نے مہدی کے آنے اور نزولِ مسیح کے عقیدے پر بحث کی۔ اب بجائے اس کے کہ وہ سرسیّد کی طرح اُن روایات کو موضوع قرار دیتے، جیسی کہ وُہ ہیں، وُہ خود مہدی اور مسیح بن گئے اور اِس طرح ایک لغویت کی جگہ دوسری لغویت پیدا ہوگئی۔"[1]

جو لغویت بالاکوٹ میں دفن ہو جانے کے باوجود برٹش گورنمنٹ نے پھر قادیان سے پیدا کر دکھائی تھی، اُس خشتِ اوّل کے بارے میں سیّد احمد صاحب کے ایک عاشقِ زار یعنی پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر قیام الدین احمد صاحب نجدی اور ہندی وہابیت کا نقطۂ اختلاف بیان کرتے ہُوئے رقمطراز ہیں:

"ہندوستانی وہابیت کا دوسرا طرۂ امتیاز ایک مرحلے پر مہدوی تحریک سے اِس کا اتفاق تھا۔ مہدی موعود کے ظہور کے عقیدے پر ہندوستانی وہابیوں نے کثیر لٹریچر فراہم کر لیا تھا۔ اِسی کے بعد سیّد احمد صاحب نے رحلت کی۔ مہدوی تحریکات سے یہ اتفاق و تماثل عرب میں کبھی رونما نہ ہوا۔"[2]

سیّد احمد صاحب کی اِس تحریکِ مہدیت کے بارے میں اِسی نام نہاد جماعتِ مجاہدین کے ایک سرگرم کارکن اور مشہور غیر مقلد عالم مولوی عنایت اللہ اثری وزیر آبادی نے ایک عجیب و غریب انکشاف کیا ہے۔ قارئین کرام ذرا انصاف کی رُو سے حالات کی تہہ میں جھانکنے اور حقیقت تک پہنچنے کی سعی فرمائیں۔ اُنھوں نے لکھا ہے:

"اوائل میں ایک دفعہ میں نے سیّد احمد صاحب کو شہید بتایا تو آپ

---

[1] محمد سرور: افادات و ملفوظاتِ سندھی، ص ۴۵۱

[2] محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر: ہندوستان میں وہابی تحریک، مطبوعہ کراچی، ص ۵۷

(مولوی فضل الٰہی صاحب) سخت ناراض ہوئے اور مجھے دھکا دے کر چارپائی سے نیچے گرا دیا اور فرمایا کہ وہ زندہ اور غائب ہیں، عنقریب ظاہر ہوں گے۔ نیز آپ نے اُس جماعت کا شایع کردہ رسالہ بنام خلاصہ مجھے دکھایا، جس میں یہ حدیث تھی:

اذ مضت الف و مائتان و اربعون سنة بعث الله المهدی فیبایع علیٰ یدہٖ خلق کثیر ثم یغیبه الله تعالیٰ فیرتدون الیٰ دین اٰباءھم الا من اتبع کتاب الله و سنة نبیه۔ مگر یہ روایت کسی حدیث کی کتاب میں بھی نہیں بلکہ جو ذخیرہ موضوعات کے نام سے علمائے کرام نے جمع فرمایا ہے، یہ روایت اُس میں بھی نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کی شہادت کے بعد اسے وضع کیا گیا ہے اور ایک روایت یُوں بھی بیان کی ہے:

فیقاتل کفرة لاھور۔ اور اِس قسم کے بے سروپا حکایات و قصے سوانح احمدی (جو کراچی سے حیات سید احمد شہید کے نام سے شایع ہوئی ہے) میں بھی درج ہیں، مگر تقسیم ہند کے بعد مولوی صاحب مرکز چمرقند سے اپنے وطن میں واپس تشریف لائے تو میرے رُوبرو کئی بار آپ نے سیّد صاحب کو شہید بتایا اور میری مار مفت میں ٹھہری۔ اچھا خیر استادوں کی مار بھی دراصل پیار اور عمر سدھار ہے۔[1]

مولوی عنایت اللہ اثری وزیر آبادی صاحب کے پیش کردہ مذکورہ حوالے اور اُس میں درج شدہ دونوں جعلی وضعی روایات سے صاف ظاہر ہے کہ سیّد صاحب نے اپنے مہدی ہونے کا بڑی شد و مد سے دعوٰی کر رکھا تھا۔ جو اُن کی تحریک کو ناکامی کے گڑھے میں پھینکنے کا باعث بنی۔ اِس کے ساتھ ہی جس قسم کی کرامتوں اور الہاموں کی تشہیر کی گئی، جن کا حقیقت سے قطعاً کوئی رابطہ ثابت نہیں ہوتا نیز وحی و عصمت کے جو دعاوی کیے گئے اُن سے صاف ظاہر یہی ہوتا ہے کہ موصوف کی منزلِ مقصود وہی تھی جہاں مرزا غلام احمد قادیانی

---

[1] عنایت اللہ اثری، مولوی: مکاتیب العجابیہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۸۵، ۸۶

نے پہنچ کر دم لیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ سید صاحب کی عمر نے ساتھ نہ دیا اور وہ اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف بصد حسرت و یاس یہ کہتے ہوئے سدھار گئے ہوں گے : ؎

قسمت تو دیکھیے کہاں پہ ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا

قارئینِ کرام نے سید احمد صاحب کے کشف و کرامت سے متعلق کتنے ہی واقعات پڑھے، اُن کی وحی و عصمت کے بارے میں بیانات ملاحظہ فرمائے۔ ہو سکتا ہے کہ وہابی حضرات پر ہمارے تاثرات شاق گزریں اور اُن کی طبعِ نازک ہمارے بے لاگ اور خیر خواہانہ تبصرے کی متحمل نہ ہو سکے تو ہم مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے سوانح نگار اور میدانِ وہابیت کے شہسوار جناب مرزا حیرت دہلوی کے تاثرات پیش کر دیتے ہیں۔ موصوف نے لکھا ہے :

> "چند سوانح نویسوں نے افسوس ہے کہ سید صاحب کی وہ باتیں بیان کی ہیں جن سے اُن کی اصلی شان بھی مٹ گئی۔ اُن کے سوانح کا دیکھنے والا کبھی کسی انسان صفت پر خیال نہیں جما سکتا۔ کہیں تو اِس پارسا نیک مرد کو نعوذ باللہ نبی بنا دیا ہے کہیں اُس کی تمام حرکات و سکنات کو مافوق الفطرت کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ کہیں اُن میں وہ قوت بخشی گئی ہے جو ایک دیو میں بھی نہیں ہو سکتی۔ کہیں اُن کے بول سے ایک عظیم الشان کھیت کو جلایا گیا ہے۔ کہیں اُن کے لیے آسمانوں سے حلوے کا طباق اتروایا گیا ہے۔ کہیں میلۂ ہنود میں لے جا کے اُنھیں بیہوش کیا گیا ہے۔
>
> اگر خود سوانح نویس خیال کر لیتے اور دینِ اسلام کے واجب الاعتصام بانی کے اُنھیں سوانح عمری یاد ہوتے تو وہ کبھی ایسی مضحکہ خیز اور طفلانہ باتیں اِس بزرگ سید پر عاید کر کے اُس کی اصلی ذاتی لیاقت اور اصلی جوہر کو نہ مٹا دیتے۔"[1]

موصوف نے اِس ستم ظریفی کے پیشِ نظر سید صاحب کے سوانح نگاروں اور اُن کے تحریر کردہ حالات و واقعات پر یقین رکھنے والوں کے ضمیروں کو دوسری مرتبہ یوں جھنجھوڑا ہے :

---

[1] مرزا حیرت دہلوی : حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء، ص ۳۵۱، ۳۵۲

"میں کہتا ہوں کہ سیّد احمد صاحب کے سوانح عمری میں صرف اُن مذکورۃ الصدر باتوں کا تذکرہ ہو جن سے نبی آخر الزماں کی ذاتِ مقدس بہت مستبعد تھی ، تو پڑھنے والا سیّد احمد صاحب کو کیا سمجھے ؟ کیا خیال کرے ؟ آیا اُنھیں قطب سمجھے ، غوث جانے یا نبی کہے ؟"۔[1]

آگے موصوف مرزا نے مذکورہ واقعات کے بارے میں اپنی واضح رائے یُوں ظاہر فرمائی ہے :

"اُن کے سوانح نویسوں اور بعض سادہ لوح ساتھیوں نے ناحق بزرگ سیّد کی ذات پر یہ گھڑی ہُوئی باتیں عائد کیں اور بے فائدہ اپنی تراشی ہُوئی گپّیں اُس کے سر چپکیں ۔"[2]

جہاں تک سیّد احمد صاحب کی بزرگی کے واقعات کے بارے میں بیانات کا گھڑی ہُوئی باتیں اور گپّیں ہونے کا تعلق ہے تو مرزا حیرت دہلوی کی اس رائے سے ہم بھی اتفاق کرتے ہیں لیکن اسے سوانح نویسوں اور سادہ لوح ساتھیوں کے سر تھوپنا کسی مرحلے پر بھی حقیقت قرار نہیں پاسکتا کیونکہ اوّل سے آخر تک یہ ساری کارگزاری خود سیّد احمد صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے سرانجام دی ۔ سیّد صاحب کے مکتوبات اور صراطِ مستقیم کتاب اس بات پر شاہد ہیں ، جن سے کتنے ہی بیانات اور اقتباسات پیچھے مذکور ہُوئے اور بعض عبارتیں آگے ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں ۔ سوانح نگاروں نے تو لکیر کے فقیر بن کر مکھّی پر مکھّی ماری ہے اور برٹش گورنمنٹ کی تیار کردہ سازش کو کامیابی سے ہمکنار کروانے میں اِن حضرات کا اِتنا ہاتھ بٹایا ہے کہ سازش کو مٹنے اور ظاہر نہ ہونے دیا ، یہاں تک کہ اُس کی سرپرستی کا بارِ گراں مرزا غلام احمد قادیانی نے اُٹھا لیا ۔ اُمید ہے کہ وہابی حضرات ہماری حق گوئی سے ناراض ہوتے وقت مرزا حیرت دہلوی جیسے حضرات کا خیال ضرور رکھا کریں گے : ؎

یوں نظر دوڑے نہ برچھی تان کر
اپنا بیگانہ ذرا پہچان کر

---

[1] مرزا حیرت دہلوی : حیاتِ طیبہ ، ص ۲۵۲

[2] ایضاً : ص ۲۵۳

مسئلہ غیبوبیت سیّد احمد صاحب اور اُن کے دستِ راست یعنی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی جب بالاکوٹ میں کھیت رہے۔ وحی و عصمت کے تمام دعوے جھوٹے ثابت گئے۔ پیشگوئیاں فراڈ ثابت ہو کر رہیں تو موصوف کے خلفاء نے یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ ہمارے امیر المؤمنین مرے نہیں ہیں بلکہ زندہ سلامت ہیں اور اُنھیں اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے غائب رہنے کا حکم ملا ہے۔ کبھی مناسب وقت پر دوبارہ تشریف فرما ہو کر اپنے کیے ہُوئے وعدوں، سُنائے ہُوئے الہاموں کو سچّا ثابت کر کے دکھائیں گے۔ غرضیکہ اسی طرح جھُوٹ بولتے اور دُنیا کو بہکاتے ہُوئے قریباً ڈیڑھ صدی گزرنے والی ہے لیکن وہابی حضرات ہیں کہ اپنے اکابر کی دروغگوئی کا سیدھی طرح اعتراف کرنے کی جانب آتے ہی نہیں۔ بہر حال غیبوبیت کے بارے میں محمد جعفر تھانیسری نے لکھا تھا:

> "میدان صاف کرنے کے بعد سیّد صاحب مثل شیر کے اپنی جماعت میں کھڑے تھے کہ یک بیک آپ نظروں سے غائب ہو گئے۔ مولوی جعفر علی نقوی جو آپ کا باڈی گارڈ تھا اور کندھے سے کندھا ملائے کھڑا تھا لکھتا ہے کہ "جناب حضرت امیر المؤمنین در ہمہ جماعت از نظرِ من غائب شدند"۔ یہ واقعہ جگر سوز ۲۴ ذیقعد ۱۲۴۶ھ کو واقع ہُوا۔ اُس وقت آپ کے غائب ہو جانے کی وجہ سے سارے لشکرِ اسلام میں ہل چل سی مچ گئی"۔ [1]

اِس واقعہ کے ساٹھ سال بعد تک لوگوں کی رائے غیبوبیت کے بارے میں کیا رہی، اِس سلسلے میں بھی مولوی محمد جعفر تھانیسری نے یُوں وہابی حضرات کی آراء کا تذکرہ کر دیا ہے:

> "ایسی بھی بہت سی روایتیں ہیں کہ اِس واقعۂ بالاکوٹ کے بعد متعدد لوگوں نے سیّد صاحب اور اُن کے رفیقوں کو دیکھا۔ اِس میں شک نہیں کہ آپ کی شہادت اور غیبوبیت میں روزِ اول سے اختلاف ہے، مگر اب ساٹھ برس سے بھی زاید زمانہ گزر جانے کے بعد خیالِ غیبوبیت خود بخود لوگوں کے

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیاتِ سید احمد شہید، ص ۲۸۸

دلوں سے محو ہوتا جاتا ہے۔ سید صاحب کی چھوٹی بیوی صاحبہ، جن سے معرکۂ بالاکوٹ سے سید صاحب نے اپنی غیبوبیت کی پیشگوئی کی تھی اور سید صاحب کے اکثر اقرباء اور اہلِ قافلہ آپ کی غیبوبیت کے قائل تھے۔'' [1]

موصوف کا یہ بیان بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں، کیونکہ جو جعفر علی نقوی غیبوبیت کے ڈھنڈورچی تھے اور سید صاحب کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے تھے، وہی از نظرِ من غائب شدند کہنے والے کا بیان یہاں برعکس ہے۔ علاوہ بریں اس عبارت میں سید صاحب کے دو ساتھیوں کا غائب ہونا بھی لکھا ہے۔ چنانچہ مرقوم ہے:

> ''مولوی جعفر علی نقوی یہ بھی لکھتے ہیں کہ بعد میں لوگوں کی زبانی اس امر کی بھی تصدیق ہوئی ہے کہ سید احمد صاحب کی ٹانگ پر ایک گولی کا زخم بھی لگا تھا۔ اس زخم کے لگنے کے بعد آپ ایک پتھر پر بیٹھے ہوئے رُو بقبلہ دعا مانگ رہے تھے کہ اُسی پتھر سے غائب ہو گئے۔
>
> یہ بھی اسی مولف کا بیان ہے کہ موضع شملئی میں پہنچ کر ہم کو یہ بھی معلوم ہوا کہ سید صاحب موضع مٹی کوٹ میں (جو گوجروں کا گاؤں میدانِ جنگ بالاکوٹ سے ملا ہوا تھا) گوجروں کے گھر میں زندہ موجود ہیں اور اُس پتھر پر سے جہاں آپ دعا مانگ رہے تھے، گوجر لوگ آپ کو اٹھا کر اپنے گاؤں میں لے گئے تھے اور بعض لوگوں کا یہ بھی بیان ہے کہ مولوی نظام الدین چشتی کاندھلوی جو بخارا اور کشمیر اور کاغان کے سفیر ہو کر گئے تھے اور مولوی عبداللہ صاحب دونوں شخص میدانِ جنگ سے سید صاحب کے ساتھ ہی غائب ہو کر آپ کے رفیقِ غیبوبیت ہو گئے۔ مولوی جعفر علی نقوی پلّۂ شہادت کو غلبہ دیتے ہیں۔'' [2]

اب اسی غیبوبیت کے طلسم کی کہانی مشہور وہابی مورخ اور سید صاحب کے سوانح نگار،

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، ص ۲۹۰۔

[2] ایضاً: ۲۸۹

غلام رسول مہر (المتوفی ۱۳۹۱ھ / ۱۹۷۱ء) کی زبانی سُنیے کہ وہابی علماء و مورّخین کے فراڈ کا رونا کس طرح روتے ہیں، اُنھوں نے لکھا ہے:

"سیّد صاحب کی شہادت کے بعد نیاز مندوں کے ایک گروہ نے اُن کی غیبوبیت کا مسئلہ کھڑا دیا اور مدّت تک اِس عقیدے کی اشاعت پُورے اہتمام سے جاری رکھی۔ عوام کے ایسے معتقدات بحث و نظر کے محتاج نہیں ہوتے۔ اُن کے دل و دماغ ہر وقت عجائب کاریوں کی تلاش و جستجو میں سرگرم رہتے ہیں اور وہ کسی واقعے کے قبول و پذیرائی میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں کرتے، جب تک اُسے باعتبارِ وقوع مروجہ اصول و ہنجار سے صریح منحرف نہ پائیں۔ لیکن حیرت ہے کہ سیّد صاحب کے بعض اکابر خلفاء نے بھی اِسے قبول کیا۔ نہ محض قبول کیا بلکہ اِسے مدّت تک دعوتِ اتحاد کا مرکز بنائے رکھا۔"[1]

سید صاحب کے تربیت یافتہ اور اُن کے خاص متوسلین کی غیبوبت کے بارے میں جھوٹی شہادتیں، عوام الناس کو چھلنے اور پیٹ پرستی کی خاطر جھوٹے بیانات جناب غلام رسول مہر کی زبانی سُن لیجیے:

"سرحد کے بعض اکابر کہہ رہے تھے کہ اُنھوں نے واقعۂ بالاکوٹ کے بعد سیّد صاحب کو زندہ دیکھا ہے، مثلاً بھٹکول کے اخوند محمد ارم، جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، مولوی خیرالدین شیرکوٹی اور مولوی محمد قاسم پانی پتی چند افراد کے ہمراہ اِسی بناء پر بھٹکول میں ٹھہر گئے کہ اُنھیں سیّد صاحب کے زندہ ہونے کا یقین تھا۔"[2]

اب سیّد صاحب کے اُن خلفاء کا نظریہ ملاحظہ فرمائیے جو صادق پوری تھے اور جنھوں نے سیّد صاحب کی اِس نام نہاد تحریکِ جہاد کو پیٹ پرستی کا جھوٹے پروپیگنڈے کے بل بوتے پر کاروبار بنا لیا تھا۔ جناب غلام رسول مہر نے آپ کے خلفاء کی کتاب رسائل تسعہ کے صفحہ ۶۶،

---

[1] غلام رسول مہر: سیّد احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۸۱۰۔

[2] ایضاً: ۸۱۱

۶۷ کے حوالے سے مولوی ولایت علی خلیفۂ سید احمد صاحب کا بیان بھی نقل کیا ہے۔ چنانچہ مہر صاحب نے بڑے تعجب کے ساتھ لکھا ہے:

"حد درجہ تعجب اِس پر ہے کہ ارادت مندوں کے حلقۂ خاص میں سے اہلِ صادق پور نے عقیدۂ غیبوبت کو پورے کاروبارِ جہاد کا مدار و محور بنایا۔ مولانا ولایت علی مرحوم نے دعوت کے نام سے ایک رسالہ مرتب کیا تھا۔ اُس میں لکھتے ہیں کہ بالاکوٹ میں شکست اس لیے ہُوئی کہ ایمان والوں کے دل میں غرور کا مَیل جمنے نہ پائے۔ شکست کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت کو چلّہ گزاری اور دُعا و زاری کے لیے پہاڑوں پر بلا لیا۔ سچ ہے خلوت بھی انبیاء علیہم السلام کی سنّت ہے۔ حضرت یونس مچھلی کے پیٹ میں رہے، حضرت مُوسیٰ کوہِ طور پر، حضرت عیسیٰ کو آسمانوں پر اٹھایا۔ ہمارے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو کئی روز غارِ ثور میں چھپایا۔ سیّد صاحب کی شہادت کی خبر شیطان نے جھُوٹی مشہور کی۔ کیوں نہ ہو؟ یہ (سیّد صاحب) بھی تو اُن لوگوں (انبیائے کرام) کے پیرو ہیں۔ اُن کی سُنّتوں سے کیونکر محروم رہیں.... اور ہمارے حضرت (سیّد صاحب) کی خلوت کوئی عیسیٰ علیہ السلام کی سی نہ سمجھیے کہ کسی سے ملاقات نہیں ہوتی یا ظہور میں اُن کے عرصہ بعید گزرے گا۔ یہاں تو اکثر لوگ جب چاہتے ہیں تھوڑی سی کوشش سے حضرت کی زیارت سے مشرف ہو جاتے ہیں اور انشاء اللہ عرصۂ قریب میں مثل خورشیدِ درخشاں کے ظاہر ہو کر عالم کو اپنے انوارِ ہدایت سے منور فرمائیں گے۔"[1]

جناب غلام رسول مہر کی زبانی اس کذب و افتراء کی کہانی کے بارے میں مزید سُنیے۔ وُہ لکھتے ہیں:

"سید صاحب کی جماعت کو امداد دینے والوں کے خلاف ایک مقدمہ ۱۸۶۴ء میں انبالہ میں چلا تھا، جسے انگریزوں کی اصطلاح میں وہابیوں کا بڑا مقدمہ کہا جاتا ہے اِس میں مولانا یحییٰ علی صادق پوری، مولانا عبدالرحیم صادق پوری، مولوی جعفر

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، ص ۴۱۳

تھانیسری اور بعض دُوسرے اصحاب ماخوذ تھے۔ اِس مقدمے میں کئی اصحاب نے گواہیاں دی تھیں کہ صادق پور کے مرکز میں جتنے لوگ پہنچتے تھے، اُنھیں باقاعدہ تلقین کی جاتی تھی کہ سیّد صاحب کا ظہور قریب ہے، وہ امامِ وقت ہیں، ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اُن کے ظہور سے پہلے مقامِ ظہور (یعنی سرحد) پر پہنچ جائے۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری صاحبِ تواریخ عجیبہ بھی سیّد صاحب کو زندہ مانتے تھے اور اُن کا دعویٰ تھا کہ دُو مرتبہ زیارت جسمانی کا شرف حاصل ہو چکا ہے اور حضرت کے زندہ ہونے کا مجھے ایسا یقین ہے جیسا کہ اپنی موت کا۔ مولانا مظفر حسین کاندھلوی فرمایا کرتے تھے کہ سیّد صاحب سے دسؔ باتیں سُنی تھیں، نو پوری ہو چکی ہیں، ایک باقی ہے یعنی غیبت کے بعد ظہور۔"[1]

مولوی محمد جعفر تھانیسری، غلام رسول مہر اور غیبوبیت کے دُوسرے قائلین، جن کے بیانات پیش کیے گئے ہیں، اِن میں سے کوئی بھی نامور عالمِ دین نہیں، ہاں بعض حضرات کو اُن کے حلقوں میں اُونچے پائے کا تاریخ دان شمار کیا جاتا ہے اب ہم وہابی علماء کے بیانات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مشہور غیر مقلد عالم مولوی عنایت اللہ اثری وزیرآبادی اور اُن کے اُستاد مولوی فضل الٰہی صاحب کے بیانات گزر چکے۔ مولوی رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) کے سوانح نگار اور نامور دیوبندی عالم مولوی عاشق الٰہی میرٹھی لکھتے ہیں:

"جب لاشیں سنبھالی گئیں تو سیّد صاحب اور اُن کے ساتھیوں کا پتہ نہ لگا۔ لوگ تلاش میں نکلے اور اِدھر اُدھر جستجو کرنے لگے۔ چند چند آدمی مختلف دیہات اور پہاڑوں میں جا کر ڈھونڈا کرتے تھے اور کسی کو نہ ملتے تھے۔ گاؤں میں برابر پتہ چلتا جاتا تھا کہ یہاں تھے، وہاں تھے۔ ایک شخص نے بیان کیا کہ مجھے سخت بخار تھا۔ اِسی حالت میں مَیں نے تینوں شخصوں کو جاتے دیکھا، جن میں ایک سیّد صاحب تھے۔ مَیں نے غُل مچایا کہ حضرت آپ ہم کو کہاں چھوڑ گئے اور کیوں ہم سے

---

[1] غلام رسول مہر: سیّد احمد شہید، ص ۸۱۴

علیحدہ ہو گئے؟ سب لوگ آپ کے رُو براہ ہیں۔ میرے غُل مچانے پر حضرت سید صاحب نے منہ پھیر کر مجھے دیکھا، کچھ جواب نہ دیا اور چلے گئے۔ میں بوجہ سخت بیماری کے اُٹھ نہ سکا، غل مچایا کیا۔

دُوسرے شخص نے بیان کیا کہ ہم اُنھیں دنوں سید صاحب کو ایک پہاڑ میں تلاش کر رہے تھے۔ دفعتاً کچھ فاصلے پر گڑبڑاٹ سُنا۔ میں وہاں گیا تو دیکھوں کیا، سید صاحب اور اُن کے دو ہمراہی بیٹھے ہیں۔ میں نے سلام و مصافحہ کیا اور عرض کیا کہ حضرت کیوں غائب ہو گئے؟ سب لوگ بغیر آپ کے پریشان ہیں۔ مجبور ہو کر ہم نے فلاں شخص کو اپنا خلیفہ بنا لیا ہے اور اُن سے بیعت کی ہے۔ آپ نے اِس پر تحسین کی اور فرمایا: ہم کو اب غائب رہنے کا حکم ہُوا ہے، اِس لیے ہم نہیں آ سکتے۔ اِتنا فرما کر قافلہ والوں کی خیریت اور حالات پُوچھے اور پھر روانہ ہو گئے۔ میں نے بھی ہمراہ ہونے کے لیے عرض کیا تو منع فرمایا اور پھر کوشش کر کے جو میں نے پیچھے چلنا چاہا تو میرے ہاتھ پاؤں وزنی ہو گئے۔ میں تو کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ حیران اور مایوس تھا کہ یا اللہ! کیسے چلوں؟ اور حضرت سید صاحب معہ ہمراہیوں کے نظر سے غائب ہو گئے۔

تیسرے ایک اور شخص نے بیان کیا کہ سید صاحب کو ڈھونڈتے ہم ایک گاؤں میں ایک جگہ اُترے، وہاں دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ قبر جو ڈھئی ہوئی تازہ پڑی ہے، اس کو سید صاحب ابھی ڈھا کر گئے ہیں، کیوں کہ اُونچی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو کہیں پتہ نہ لگا۔

منشی محمد ابراہیم صاحب نے کہا کہ سید صاحب تیرھویں صدی کے آغاز میں پیدا ہُوئے تھے اور اب ۱۳۱۸ھ میں ممکن ہے کہ حیات ہوں۔ اُنھوں نے جب لفظ ممکن کہا تو حضرت امام ربانی (یعنی مولوی رشید احمد گنگوہی) نے ارشاد فرمایا: بلکہ امکن اور فرمایا کہ سید صاحب انبٹھہ میں بھی تشریف لائے۔[1]

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی، مولوی: تذکرۃ الرشید، حصہ دوم، ص ۲۷۰، ۲۷۱

پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر تاریخ اور سید احمد صاحب کے عاشقِ زار جناب ڈاکٹر قیام الدین احمد نے مسئلہ غیبوبیت پر عجیب فلسفیانہ رنگ میں اپنے تاثرات پیش کر کے صورتِ حال کو غتربود کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے لیکن اِتنے عظیم فراڈ کے باعث وہابیانِ ہند کے ماتھے پر جو کلنگ کا ٹیکہ لگا ہوا ہے اُسے صحیح ثابت کرنے کے راستے مسدود پا کر اظہارِ برأت کی توفیق بھی نہیں پائی۔ چنانچہ موصوف نے لکھا ہے:

> "سب سے آخر میں اُن (سیّد صاحب) کو ایک گھمسان دست بدست معرکہ میں لڑتے دیکھا گیا۔ اِس کے بعد وُہ غائب ہو گئے۔ کسی نے اُن کو گرتے ہُوئے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ اِس لیے وہابیوں کے ایک طبقے میں یہ خیال چکّر لگاتا رہا کہ سید احمد شہید نہیں غائب ہو گئے ہیں اور آئندہ کسی وقت پھر ظاہر ہوں گے۔ منطق اور عقل کی روشنی میں سیّد احمد قطعاً اِسی جنگ میں شہید ہو گئے مگر بالاکوٹ کے باقی ماندہ لوگوں اور اُن کے بہت سے رفقاء و متبعین کے لیے یہ ناگہانی شدید ضرب ناقابلِ برداشت تھی۔ اِنھوں نے ایک مقصد عالی کے حصول کے لیے اپنی تمام مادّی املاک قربان کر دی تھی اور سیّد احمدؒ کے ساتھ ناقابلِ قیاس دُکھ جھیلے تھے، لیکن اب قسمت کی ہوشربا ناگہانی سرگشتگی سے سب مِٹ رہا تھا۔ غیبوبت کے نظریے کا پس منظر یہی ہے۔ دراصل یہ ایک ہیجانی ردِّ عمل تھا۔ اُن کے مادّی حرکات و سکنات کے منظر سے اُن کے محبوب سردار و رہنما کے یک بیک اُٹھ جانے اور مر جانے پر یقین کرنا اُن کے لیے دُشوار تھا۔ یہ نظریہ اُن کے اِس راسخ عقیدے کا ایک مقدس سایہ بھی تھا کہ سیّد احمد جسمانی طور پر فنا ہو گئے ہوں تو ہو گئے ہوں مگر ان کا مشن فنا نہیں ہو سکتا۔"[1]

ڈاکٹر قیام الدین احمد صاحب کو کم از کم اب تو یقین ہو چکا ہو گا کہ سید احمد صاحب کا مشن اب مکمل طور پر فنا ہو چکا اور اُس کا شائبہ تک باقی نہیں رہا۔ رہا یہ کہ نظریۂ غیبوبت کون سے راسخ

---

[1] محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر: ہندوستان میں وہابی تحریک، مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء، ص ۱۱۰

عقیدے کا سایہ ہے، اِس حقیقت کے چہرے پر وہابی علماء و مورخین نے جتنے بھی تہہ بر تہہ پردے ڈالے ہوئے ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ اِسی عنوان کے تحت آئندہ سطور میں ہم نے اُن تمام پردوں کو ہٹا کر حقیقت کو بے نقاب کرنا ہے۔ اب ڈاکٹر صاحب کا دوسرا فلسفہ ملاحظہ ہو:

> "ہٹلر اور سبھاش چندر بوس کی موتیں ہمارے عصر کے واقعات ہیں۔ اِن کی موتیں بھی پردۂ راز میں مخفی تھیں۔ اوّل الذکر کی موت کے متعلق حکومتِ ہند کی مسلسل تحقیقات کے باوجود اِن دونوں لیڈروں کے ہم وطنوں کے ایک طبقے میں اُن کی زندگی کا عقیدہ اب تک موجود ہے۔ اگر محض سیاسی لیڈروں کے لیے ایسی محکم وفاداری و جاں نثاری ہو سکتی ہے تو ایسے شخص کے لیے جو صرف سیاسی لیڈر نہیں بلکہ حسنات و خیرات کا کامل نمونہ تھا، اُس کے متبعین میں جو گرمجوشی اور سرشاری محبّت و عقیدت پیدا ہوئی ہو گی، قیاس کی جاسکتی ہے۔"[1]

ڈاکٹر صاحب کے حکم سے قیاس تو ضرور کرنا پڑے گا لیکن سیّد صاحب کی پیشگوئیاں کدھر جائیں گی؟ غیبوبت کے بعد جو سیّد صاحب کے خلفاء اور متبعین اُن سے ملاقات و گفتگو کرنے کے دعوے فرماتے رہے کیا ایسے بیانات کو محبت و عقیدت ہی پر قیاس کیا جائے یا ایسی باتوں کا دروغگوئی اور جعلسازی سے بھی کوئی رشتہ ناطہ ہے؟ شیعہ حضرات کا اپنے امام مہدی کو غائب ماننا اور وہابی حضرات کا سید احمد صاحب کو مہدی بتانا اور غائب ماننا، کیا دونوں جماعتوں کا یہ نظریہ درست ہے؟ اگر ایک جماعت کا بوجہ محبّت و عقیدت ہے تو کیا دوسری جماعت کا بوجہ بغض و عداوت ہے؟ اگر دونوں جگہ ایک ہی جذبہ کار فرما ہے تو دونوں کا حکم مختلف کیوں؟ موصوف نے مزید لکھا ہے:

> "صادق پور کے ارکانِ خاندان خصوصاً ولایت علی پر انگریز اور ہندوستانی مصنفین نے سیّد احمد کے ظہورِ ثانی عقیدہ کی اشاعت پر بہت نکتہ چینی کی ہے۔ اُن پر اِس عقیدے کی اشاعت میں دانستہ بے ایمانی کا الزام عاید کیا گیا ہے کہ ولایت علی نے اِس مقصد سے یہ قدم اٹھایا ہے کہ تحریک کی ڈوبی ہوئی ناؤ کو پھر اُبھارا

---

[1] محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر: ہندوستان میں وہابی تحریک، مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء، ص ۱۱۰، ۱۱۱

جا سکے اور اِس جدّ و جہد میں اپنی سرداری بحال رکھی جائے۔

جیسا کہ اُوپر بیان ہُوا یہ عقیدہ ایک وقتی ہیجانی ردِ عمل تھا۔ اِس پر سختی سے نظر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اِس تحریک کی خدمت جو ولایت علی اور اُن کے بھائی عنایت علی نے انجام دیں وہ اتنی ٹھوس تھیں کہ اِتنے سے موہوم فائدہ کے کمزور سہارے کی محتاج نہ تھیں۔"[1]

چلیے وہابی حضرات کے اِس عقیدے پر ہم بھی سختی سے نظر نہیں کرتے اور یہی باور کر لیتے ہیں کہ تحریک کو اِس عقیدے کا فائدہ کمزور اور موہوم تھا، لیکن وہابی حضرات ٹھنڈے دل و دماغ سے کبھی یہ بتانے کی زحمت بھی گوارا فرما لیں گے کہ رسائل تسعہ میں جو مولوی ولایت علی صاحب کا رسالہ بنام دعوت شامل ہے، اُس رسالے میں مولوی ولایت علی صاحب نے سیّد صاحب کی مہدیت، غیبوبت اور ظہور ثانی وغیرہ کے متعلق جو دو حدیثیں اپنے دماغ سے گھڑ کر شاملِ رسالہ کی ہوئی ہیں، آخر اِس جعلسازی کا سہارا لینے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟ اگر یہ وضاحت بھی فرما دی جائے کہ حدیثیں گھڑنے والے کو شریعتِ مطہرہ کس نظر سے دیکھتی ہے، تو معاملے کی تہہ تک پہنچنا ہر کسی کے لیے انتہائی آسان ہو جائے۔ کیا وہابی علماء ہماری درخواست پر اِتنی سی تکلیف اُٹھا لیں گے؟

؎ مولوی دین میں کہہ بھاگ خدا لگتی کچھ
مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

آئیے ہم بتاتے ہیں کہ سیّد احمد صاحب کے خلفاء اور متبعین کو اُن کی غیبوبت اور ظہور ثانی کا عقیدہ کیوں اختیار کرنا پڑا؟ اس سلسلے میں ہم اپنی جانب سے کچھ کہیں، اِس سے پہلے سیّد احمد صاحب کے چند ذاتی بیانات پیش کرنے مناسب ہیں تاکہ فیصلہ قارئین خود کر سکیں۔ چنانچہ سیّد صاحب نے عازمِ سرحد ہوتے وقت ایک پیشگوئی فرمائی تھی۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اُسے اِن لفظوں میں بیان کیا ہے:

---

[1] محمد مسلم عظیم آبادی: ہندوستان میں وہابی تحریک، ص ۱۱۱

سید محمد یعقوب آپ کے بھانجے سے روایت ہے کہ بروقتِ روانگیِ خراسان آپ اپنی ہمشیر یعنی والدۂ سید محمد یعقوب سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ اے میری بہن میں نے تم کو خدا کے سپرد کیا اور یہ بات یاد رکھنا کہ جب تک ہند کا شرک اور ایران کا رفض اور چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق میرے ہاتھ سے محو ہو کر ہر مُردہ سنّت زندہ نہ ہو جائے گی، اللہ رب العزت مجھ کو نہیں اٹھائے گا۔ اگر قبل از ظہور اِن واقعات کے کوئی شخص میری موت کی خبر تم کو دے اور تصدیق پر حلف بھی کرے کہ سید احمد میرے رُوبرُو مر گیا یا مارا گیا، تو تم اُس کے قول پہ ہرگز اعتبار نہ کرنا کیونکہ میرے رب نے مجھ سے وعدۂ واثق کیا ہے کہ اِن چیزوں کو میرے ہاتھ پر پُورا کر کے مارے گا۔ آپ کے سفرِ جہاد سے پہلے (غالباً سفرِ حج میں) آپ کو یہ الہام ربّانی ہُوا تھا کہ ملک پنجاب آپ کے ہاتھوں پر فتح ہو کر پشاور سے دریائے ستلج تک مثل ملک ہندوستان کے رشک افزائے چمن ہو جائے گا، چنانچہ اِن متواتر وعدہ ہائے فتح سے آپ کا ہر ایک مرید واقف تھا۔[1]

جملہ وہابی حضرات اور قارئین حضرات سے گزارش ہے کہ خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا کو سامنے رکھ کر، وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْنَ کے جگر لرزا دینے والے منظر کو سامنے رکھ کر غور فرمائیں کہ سید صاحب نے ہند کا شرک، ایران کا رفض، چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق اپنی زندگی میں مٹا دیا تھا؟ کیا ہر مُردہ سنّت اُن کے ہاتھوں زندہ ہو گئی تھی؟ کیا واقعی انھوں نے اپنے نشر کردہ الہام کے مطابق پشاور سے ستلج تک پنجاب کو فتح کر لیا تھا؟ اگر اِن میں سے جیسا کہ ظاہر ہے، سید صاحب کوئی ایک کام بھی نہ کر سکے تو خود فیصلہ فرمائیے کہ موصوف کے یہ جملہ دعاوی اور الہامات ربّانی تھے یا مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح یہ جملہ الہامات محض شیطانی تھے؟ کیا برٹش گورنمنٹ کی ہدایات پر کمال راز داری سے الہام کا لیبل تو نہیں لگایا جاتا تھا؟ ذرا اور نظرِ غائر سے کام لیتے ہُوئے یہ فیصلہ بھی فرما لینا کہ سید صاحب کا پشاور سے ستلج

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، ص ۱۷۱، ۱۷۲

تک پنجاب کو فتح کرنے کا مقصد اِس علاقے کو بھی اُسی قسم کا رشک افزائے چمن بنانا تھا، جیسا کہ ہندوستان برٹش گورنمنٹ کی غلامی سے بن چکا تھا۔ اس بیان کی روشنی میں ذرا یہ سمجھنے اور سمجھانے کی سعی فرمائی جائے کہ سید صاحب اسلام اور مسلمانوں کی کوئی خدمت کرنا چاہتے تھے یا اُن کی ساری تگ و دَو انگریزی راج کی حدود کو وسیع کرنا تھا؟ اِس امر کا فیصلہ کرتے وقت اگر محمد جعفر تھانیسری کے درجِ ذیل بیان کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے تو معاملے کی تہہ تک پہنچنا بڑی حد تک آسان ہو جائے گا۔ موصوف نے اِن الہامات کی تاویل کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

”بملاحظہ مکتوبات احمدی، جن میں سید صاحبؒ کا اصل ما فی الضمیر بڑی صراحت کے ساتھ بیسیوں مختلف واقعات پر ظاہر کیا گیا ہے اور اکثر موثّقوں کی تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ وعدۂ فتحِ پنجاب کے الہام کا آپ کو ایسا وثوق تھا کہ آپ اِس کو سراسر صادق اور ہونے والی بات سمجھ کر بارہا فرمایا کرتے تھے اور اکثر مکتوبات میں لکھا کرتے تھے کہ اِس الہام میں وسوسۂ شیطانی اور شائبۂ نفسانی کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ ملک پنجاب ضرور میرے ہاتھ پر فتح ہوگا اور اِس فتح سے پہلے مجھ کو موت نہ آئے گی۔

لیکن واقعۂ بالاکوٹ خواہ شہادت ہو خواہ غیبوبیت، بظاہر اِس یقینی الہام کے سراسر خلاف ہُوا۔ اب اِس کا جواب یہی ہے کہ از روئے اصولِ شریعتِ محمدی کے الہام ایک ظنّی چیز ہے اور اِس کی تاویلوں وغیرہ میں سو طرح کی غلطیوں کا گمان ہوتا ہے۔ یہ تو ضرور ہُوا کہ اِس وقوعہ کے پندرہ برس بعد سلطنتِ پنجاب متعصب اور ظالم سکھوں کے ہاتھ سے نکل کر ایک ایسی عادل اور آزاد اور لامذہب قوم کے ہاتھ میں آگئی کہ جس کو ہم مسلمان اپنے ہاتھ پر فتح ہونا تصور کر سکتے ہیں اور غالباً سید صاحب کے الہام کی صحیح تاویل یہی ہوگی، جو ظہور میں آئی۔“[1]

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیاتِ سید احمد شہید، ص ۲۹۱

قارئینِ کرام نے تھانیسری صاحب کی تاویل تو ملاحظہ فرمائی، اب فیصلہ کرنا باقی ہے کہ سیّد صاحب کا مقصد اِس تحریکِ جہاد سے برٹش گورنمنٹ کی حدود کو وسیع کرنا ہی تھا یا کچھ اَور؟ نیز اُن کے الہامات ربّانی تھے یا شیطانی؟ یہ فیصلے ہم قارئین کی صوابدید پر چھوڑ کر اِس امر کا ذکر کرتے ہیں کہ جعفر تھانیسری صاحب نے بتایا ہے کہ فتح پنجاب کے الہام کا تذکرہ سیّد صاحب نے اپنے مکتوبات میں بیس سے زاید مقامات پر تصریحاً کیا ہے۔ ہم اِتنے تو نہیں ہاں چند مقامات کی نشان دہی کر دیتے ہیں تاکہ کوئی صاحب اِسے تھانیسری صاحب کا افترا بنا کر غلام رسول مہر صاحب کی طرح گلو خلاصی کرانے کی کوشش نہ کرتے پھریں۔ چنانچہ سیّد صاحب نے یار محمد خاں حاکمِ یاغستان کے نام خط لکھتے ہوئے تصریح فرمائی جس کا ترجمہ پیشِ خدمت ہے:

> ”یہ فقیر اِس خصوص میں غیبی اشارہ کی بناء پر مامور ہے اور اُس مبشّر کی اس بشارت میں شک و شبہ کی گنجایش نہیں۔ ہرگز ہرگز کسی شیطانی وسوسہ اور نفسانی خواہش کا شائبہ اِس الہامِ ربّانی میں نہیں ہے۔“ [1]

فقیر محمد خاں لکھنوی کے نام خط لکھتے ہوئے سکّھوں کے استیصال کرنے یعنی پنجاب پر قابض ہونے کے الہام کا ذکر جن لفظوں میں کیا، اُن کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

> ”اب رہا الہام، وہ یہ ہے کہ اِس فقیر کو پردۂ غیب سے کفار یعنی لانبے بال والے سکّھوں کے استیصال کے لیے مامور کیا گیا ہے اور ایسے مقام سے جس میں شک و شُبہ کی گنجایش نہیں۔ رحمانی بشارتوں کے ذریعے نیک کردار مجاہدین کو اُن پر غلبہ پانے کی بشارت دینے والا مقرر کیا گیا ہے۔“ [2]

رئیسِ قلات خان خاناں خلجائی کے نام جو مکتوب بھیجا گیا، اُس میں سیّد احمد صاحب نے فتحِ پنجاب کے الہام کا جن لفظوں میں تذکرہ کیا اُن کا ترجمہ بغرضِ سہولت پیشِ خدمت ہے:

> ”اِس کے علاوہ عرض یہ ہے کہ اِس فقیر کو بارہا پردۂ غیب سے وارد ہونے والی

---

[1] سخاوت مرزا: مکتوبات سیّد احمد شہید، ص ۴۱

[2] ایضاً: ص ۴۳، ۴۴

روحانی باتوں اور ربّانی الہام کے ذریعے جہاد کے نافذ کرنے اور کفر و فساد کے دفعیہ کے لیے صاف اور صریح اشاروں کے ساتھ مامور کیا گیا ہے اور فتح و کامیابی کی سچّی بشارتوں کی خبر دی گئی ہے۔"[1]

مکتوب بنام شاہِ بخارا میں سیّد صاحب نے اِسی بات کو یُوں دُہرایا ہے:

"قیامِ جہاد کے معاملے اور کفر و فساد کے رفع دفع کرنے کے لیے الہام اور روحانی مکالمہ کے ذریعے غیبی امامت سے اِس فقیر کو مشرف فرمایا اور ہم کو فتح و نصرت کے متعلق ایسی بشارتوں کا مخبر اور اُس پروردگارِ عالم کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے، موثّر کارروائی کے لیے اور سیّد المرسلین کی سنّت کے احیاء، اور سرکش کافروں کی بیخ کنی اور بنیاد کو اُکھاڑ پھینکنے کے لیے مامور فرمایا ہے اور اپنے سچّے وعدوں کے بموجب مظفر و منصور کے لقب سے ملقّب فرمایا ہے۔"[2]

اپنے درجۂ امامت سے ہر خاص و عام وہابی اور نام نہاد مجاہدین کے ہر فرد کو مطلع کرنے کی غرض سے سیّد صاحب نے ایک سرکلر یا اشتہار عام مشتہر کروایا، جس میں یہ تصریح بھی فرمائی گئی:

"اللہ کا شکر اور احسان ہے کہ اُس مالک حقیقی اور بادشاہ تحقیقی نے اِس گوشہ نشین فقیر عاجز اور خاکسار کو پہلے تو غیبی اشاروں اور اپنے الہامات کے ذریعے، جن میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے، خلافت کا اہل ہونے کی بشارت دی۔ دُوسرے یہ کہ مسلمانوں کی بڑی جماعت اور خاص و عام کی تالیفِ قلوب کے لیے مرتبہ امامت سے مجھ کو مشرف فرمایا۔ چنانچہ بتاریخ ۱۲ جُمادی الثانی روز پنجشنبہ ۱۲۴۲ھ سادات کرام، علماء، مشاہیر اور بڑے بڑے مشایخ اور باحشمت صاحبزادوں اور بلند مرتبت خوانین نے معہ تمام

---

[1] سخاوت مرزا: مکتوبات سیّد احمد شہید، ص ۵۰

[2] ایضاً: ص ۸۸

خاص و عام مسلمانوں کے میرے ہاتھ پر بیعت کر کے، مجھ کو اپنا امام قرار دیا اور میری امامت اور حکومت کو تسلیم کر کے میری اطاعت پر سرِ تسلیم خم کر دیا اور اُس روز سے اب تک یہ بیعت اِس فقیر کے ہاتھ پر جاری ہے اور تمام مسلمانوں میں اِس کا چرچا ہے۔" [1]

سلطان محمد خاں والیِ پشاور کے مشیر و دبیر جناب فیض اللہ خاں مہمند کے نام خط لکھتے ہوئے سید احمد صاحب نے اِنھیں اِسی الہام کا قائل بنانے اور اپنی حمایت پر آمادہ کرنے کی خاطر یوں سیاست لڑائی تھی:

> "آپ کے ذہن و دماغ پر اِس خاکسار کا معاملہ آفتاب نصف النہار کی طرح ظاہر و باہر ہے کہ میں قوم سکھ جیسے دشمنوں کے ساتھ جہاد کے لیے مامور ہوں اور فتح و نصرت کا مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اُس بادشاہِ منّان کے وعدوں کے خلاف یہ سب وہم و گمان، کافروں اور گمراہوں کے وسوسے ہیں نہ کہ دینداروں اور اور ایمان والوں کی سمجھ بوجھ ہے۔" [2]

سید صاحب کا اِس الہام کی بار بار تشہیر کرنا کہ پنجاب میرے ہاتھ پر ضرور فتح ہوگا نیز یہ پیشگوئی کرنا کہ میرے ہاتھوں جب تک ہندوستان کا شرک، چین کا کفر، ایران کا رفض اور افغانستان کا نفاق نہ مٹ جائے گا، اُس وقت تک اللہ تعالیٰ مجھے موت نہیں دے گا اور اگر میری موت کی کوئی حلفیہ شہادت بھی دے پھر بھی اُسے سچا نہ جاننا۔ یہ ایسی باتیں ہیں جنھوں نے موصوف کے خلفاء اور متبعین کو مجبور کیا کہ سید صاحب کی موت کا انکار کر کے غیبوبیت کا مسئلہ کھڑا کر دیں تاکہ لوگ اُن کے الہامات کو محض ایک فراڈ نہ سمجھنے لگیں اور اُنھیں حقیقت نفس الامری کا پتہ نہ لگ جائے۔ اگر وہابی حضرات سید صاحب کی غیبوبیت کا افسانہ نہ گھڑتے تو وہابی صاحبوں کو سید صاحب کو بزرگ بتانے کی قطعاً گنجائش باقی نہ رہی تھی بلکہ اُنھیں

---

[1] سخاوت مرزا: مکتوبات سید احمد شہید، ص ۱۱۹

[2] ایضاً: ص ۳۷۳

شروع سے مسلمان مرزا غلام احمد قادیانی کا پیشرو اور قائد جاننے لگ جاتے، اُن کے الہاموں کی حقیقت سے واقف ہو جاتے اور ہندوستان سے جو اِن نام نہاد مجاہدین کے لیے امداد پہنچ رہی تھی اُس کا سلسلہ قطعاً بند ہو جاتا۔ یہ تین ضرورتیں تھیں جنھوں نے اُن کے خلفاء کو مجبور کیا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا یہ پُراسرار ڈرامہ پیش کر دیں جو تاریخ کا المناک سانحہ اور وہابیہ کی افسوسناک شرارت کے سوا اور کچھ نہیں۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا۔

دشمنِ مصطفیٰ کی نسل منقطع

سرزمینِ پاک و ہند میں ہزاروں اولیائے کرام آرام فرما ہیں، جنھوں نے اپنی زندگیاں اعلائے کلمۃ الحق کے لیے وقف کر رکھی تھیں اور اُن میں سے ہر ایک نے بے شمار غیر مسلموں کو حلقہ بگوشِ اسلام کیا، جس کے باعث آج بھی وُہ مرجعِ خلائق ہیں اور مسلمانوں کے دلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے خود کو پیکرِ تسلیم و رضا بنا کر رکھا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دل اُن کی جانب جُھکا دئے۔ مزاراتِ بزرگانِ دین اُن حضرات کی مقبولیت اور مرجعِ خلائق ہونے کے زندہ ثبوت ہیں لیکن اِس کے باوجود وہابی حضرات کی خواہش ہے کہ اولیاء اللہ کی جانب سے مسلمانوں کی توجہ پھیر کر اپنے اَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ کی جانب مبذول کرائیں، اِسی مقصد کی خاطر مشہور وہابی عالم مولوی محمد جعفر تھانیسری نے لکھا تھا:

> "مولوی عبد اللہ صاحب معرفت جنڈوڈے سے (جو ایک اولیاء کامل صاحب کشف ملتان میں تھے) کسی نے پُوچھا کہ ہند کے اولیاء اللہ میں سے سب سے برتر مقبولِ خدا ولی کون سا بزرگ ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ عالمِ ارواح کی سیر میں، مَیں نے دیکھا ہے کہ سب سے بڑا درجہ اولیائے ہند میں مولوی محمد اسمٰعیل شہیدؒ کا ہے، کیونکہ مَیں نے مولانا شہید کو جنّت میں ایک چھپر کھٹ پر لیٹے ہُوئے اور کتاب صراط المستقیم کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔"[1]

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیاتِ سیّد احمد شہید، ص ۳۰۱، ۳۰۲

قطعِ نظر[۱] اس کے کہ مولوی اسمٰعیل دہلوی کے نزدیک کشف کا دعویٰ کرنے والے جھوٹے اور مکار ہیں، جیسا کہ تقویۃ الایمان میں لکھا ہے اور قطعِ نظر[۲] اس کے کہ چھپر کھٹ پر لیٹنے والا اولیاء اللہ سے برتر کس طرح ہو گیا اور قطعِ نظر[۳] اس کے کہ قرآن و حدیث کی جگہ صراط المستقیم نامی کتاب کا پڑھنے والا کیونکر سرتاجِ اولیاء ہو گیا؟ کیا داتا گنج بخش علی ہجویری، خواجہ معین الدین اجمیری، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت فرید الدین شکر گنج، حضرت نظام الدین اولیاؒ اور حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہم جیسی ہستیاں مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی سے کمتر تھیں؟ خدا کے بندو! اگر جھوٹ بولتے ہوئے مخلوق سے شرم نہیں آتی تو کم از کم خالق سے تو ڈرنا چاہیے۔ اور نہ سہی تو دہلوی صاحب کی قبر کہاں تک مرجعِ خلائق ہے، اُسی کی جانب توجہ کر کے کوئی عقل کی بات کہہ دیا کیجیے۔ موصوف کی قبر کے بارے میں تھانیسری صاحب رقمطراز ہیں:

> ”افسوس ہے کہ ایسے شخص کفر و شرک کے قاطع کی قبر پر اب وہاں کے لوگ نسوار چڑھا کر منتیں اور مرادیں آپ سے مانگتے ہیں۔“[۱]

تھانیسری صاحب شکوہ تو کرنے بیٹھ گئے لیکن اس میں رونے کی کون سی بات ہے؟ جنابِ والا! جیسے وہ بزرگ تھے ویسے ہی اُن پر چڑھاوے چڑھ رہے ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ مہلت اور توفیق دے تو کبھی اولیاء اللہ کے مزارات پر جا کر بھی دیکھ لیجیے کہ مخلوقِ خدا کیسے والہانہ انداز میں اُن کی جانب دوڑتی چلی جاتی ہے۔ ہر وقت بھیڑ لگی رہتی ہے۔ فیض کے دریا رواں ہیں اور پیاسے جھوم جھوم کر اُن کی جانب دوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ سعادت مند اُن حضرات کی بدولت فیوض و برکات سے خوب سیراب ہوتے اور عنایات سے مالا مال ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن دہلوی صاحب کی قبر پر اگر نسوار نہ چڑھائی جاتی تو اور کیا چیز چڑھانی چاہیے تھی۔ کاش! موصوف کے متبعین و معتقدین کبھی اس جانب بھی توجہ فرمائیں کہ نسل منقطع تو دشمنانِ رسول کی ہوتی ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝ اور جس کی

---

[۱] محمد جعفر تھانیسری، حیات سید احمد شہید، ص ۳۱۶

زندہ مثال یہ بھی ہے کہ یزید جیسے دشمنِ اہلِ بیت کی اولاد سے آج ایک فرد بھی دنیا میں موجود نہیں لیکن ساداتِ کرام کا کوئی شمار نہیں۔ اِسی طرح توہین و تنقیصِ شانِ رسالت کے باعث موصوف اپنے سارے خاندان ہی کو لے ڈوبے، جیسا کہ تھانیسری صاحب نے بھی لکھا ہے؛

> "مولوی محمد عمر صاحب آپ کے صاحبزادے تھے۔ ۱۲۶۸ھ میں وُہ بھی لاولد اِس جہان سے رخصت ہوگئے اور اِس دنیائے ناپائیدار کی حقیقت پر بڑا افسوس ہے کہ اِس خاندانِ عالی، شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ میں، جس میں بیسیوں عالم فاضل موجود تھے، اب ایک شخص بھی نہیں رہا۔ بالکل خاندان بھر کا خاتمہ ہوگیا۔"[1]

اگر اپنے مولویوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے والے حضرات کبھی حقیقت کو بھی سامنے رکھ لیا کریں، کھرے کو کھرا اور کھوٹے کو کھوٹا کہہ دیا کریں تو اِس میں قباحت ہرگز نہیں بلکہ جو حضرات اِس غلط پروپیگنڈے کے باعث گمراہ ہوتے چلے جاتے ہیں، وہ گمراہی سے بچ جائیں اور غتر بود کرنے والوں کے سروں پر کم از کم دوسروں کو گمراہ کرنے کا وبال تو نہ پڑے۔

ع اے کاش ترے دل میں اُتر جائے مری بات

کتاب التوحید و تقویۃ الایمان کی مماثلت

وہابی علماء و مورخ ایک عرصہ سے یہی شور مچاتے آرہے ہیں کہ ہمارے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب دہلوی جب اپنے قافلے سمیت ۱۲۳۸ھ میں حجِ بیت اللہ کی غرض سے گئے تھے تو اُن کی اصحابِ محمد بن عبدالوہاب نجدی سے قطعاً ملاقات نہیں ہُوئی تھی اور محمد بن عبدالوہاب نجدی کا ۱۲۰۶ھ میں انتقال ہوگیا تھا۔ اِس سے وہ حضرات بھولے بھالے مسلمانوں کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ مولوی اسمٰعیل دہلوی پر وہابیت کا لیبل لگانا انصاف سے بعید اور برطانوی سازش ہے۔ وہابیت کی نسبت سے وہ حضرات فوراً سیخ پا ہو جاتے ہیں اور تحریر و تقریر میں اِس نسبت کو برٹش گورنمنٹ کی شرارت قرار دینا ہی کافی و شافی جواب گردانتے ہیں:

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، ص ۳۱۶

ہمیں سرِدست اِس بات سے کوئی واسطہ نہیں کہ دہلوی صاحب اینڈ کمپنی کی قاضی شوکانی سے ملاقات ہُوئی تھی یا نہیں؟ اس بات سے بھی کوئی واسطہ نہیں کہ لفظ وہابیت کے استعمال میں برٹش گورنمنٹ کی منشاء کو دخل ہے یا نہیں؟ ہمیں صرف یہ دیکھنا اور دکھانا ہے کہ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے عقاید و نظریات میں کوئی مماثلت پائی جاتی ہے یا نہیں؟ اِس امر کا جائزہ لینے کی خاطر ہم نجدی امام الوہابیہ کی کتاب التوحید صغیر کی بعض عبارتیں حضرت مولانا فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) کی تصنیفِ لطیف سیف الجبّار کے حوالے سے پیش کرتے ہیں اور اُن کے بالمقابل مولوی اسمٰعیل دہلوی کی تقویۃ الایمان سے عبارتیں پیش کرتے جائیں گے۔ ایسا کرنے سے ہماری غرض صرف یہی ہے کہ قارئین کرام خود فیصلہ فرمالیں کہ نجدی و ہندی وہابیہ کے مذہبی خیالات اور کتاب التوحید و تقویۃ الایمان میں کوئی تضاد پایا جاتا ہے یا پوری پوری مطابقت ہے؟

خیال رہے کہ کتاب التوحید صغیر وہی تصنیف ہے جسے نجدی امام الوہابیہ نے علمائے حرمین کی خدمت میں بھیجا تھا اور اُن بزرگوں نے اِس خرافات کے پلندے کا وہی جواب دیا تھا جو دین کے خادموں اور علمِ پیمبر کے وارثوں کو دینا چاہیے تھا۔ اب قارئین کرام دونوں کتابوں کی عبارتیں اور اُن کے تیور ملاحظہ فرمائیں:

(۱)

کتاب التوحید صغیر	تقویۃ الایمان
اعلموا ان الشرك قد شاع فی هذا الزمان وذاع والامر قد ال الی ما وعد الله وقال وما یومن اکثرهم بالله الا وهم مشرکون۔	سننا چاہیے کہ شرک لوگوں میں بہت پھیل رہا ہے اور اصل توحید نایاب لیکن اکثر لوگ شرک اور توحید کے معنی نہیں سمجھتے...... سچ فرمایا اللہ صاحب نے سورۂ یوسف میں وما یومن اکثرھم باللہ

الا وھم مشرکون۔ ؎

(۲)

وظهر ما قال رسول الله لا تقوم الساعة حتى تلتحق قبائل من أمتي بالمشركين وحتى تعبد قبائل من امتی الاوثان رواه الترمذی وعن عائشه قالت سمعت رسول الله يقول لا يذهب الليل والنهار حتى تعبد اللات والعزّٰى فقلت يا رسول الله انی كنت لاظن حين انزل الله هو الذی ارسل رسوله بالهدٰی و دين الحق يظهره علی الدين كله ولو كره المشركون ان ذٰلك سيكون باتًا قال انه سيكون ما شاء الله ثم يبعث الله ريحًا طيبة فتوفی من كان فی قلبه حبة من خردل من ايمان فيبقى من لا خير فيه فيرجعون الٰی دين ابائهم رواه مسلم

اللہ صاحب نے سورۂ براۃ میں فرمایا ہے کہ اللہ صاحب نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا ہے ہدایت اور سچا دین دے کر کہ اس کو غالب کرے سب دینوں پر، اگرچہ مشرک لوگ بہتیرا ہی بُرا مانیں۔ سو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس آیت سے سمجھا کہ اس سچے دین کا زور قیامت تک رہے گا سو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا زور تو مقرر ہو گا جب تک اللہ چاہے گا، پھر اللہ آپ ایسی ایک باؤ (ہوا) بھیجے گا کہ سب اچھے بندے جن کے دل میں تھوڑا سا بھی ایمان ہو گا، مر جائیں گے اور وہی لوگ رہ جائیں گے جن میں کچھ بھلائی نہیں۔ یعنی نہ اللہ کی تعظیم، نہ رسول کی راہ پر چلنے کا شوق، بلکہ باپ دادوں کی رسموں کی سند پکڑنے لگیں گے۔ سو اس طرح شرک ہیں

؎ اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ص ۲۹، ۳۰

فانا نری عامة مومنی هذا الزمان مشرکا۔

پڑجائیں گے، کیونکہ اکثر پرانے باپ دادے جاہل مشرک گزرے ہیں۔ جو کوئی اُن کی راہ ورسم کی سند پکڑے، آپ بھی مشرک ہوجاوے۔[1]

(۳)

فقد ثبت بالنصوص القرآنیه ان من اعتقد النبی وغیره ولیه فهو وابوجهل فی الشرك سواء۔[2]

اس آیت سے معلوم ہُوا کہ اللہ صاحب نے کسی کو عالم میں تصرف کرنے کی قدرت نہیں دی۔۔۔۔ مگر یہی پکارنا، منتیں ماننی، نذر ونیاز کرنی، اُن کو اپنا وکیل اور سفارشی سمجھنا، یہی اُن کا کفر وشرک تھا۔ سو جو کوئی کسی سے یہ معاملہ کرے، گو اس کو اللہ کا بندہ اور مخلوق ہی سمجھے، سو ابوجہل اور وہ شرک میں برابر ہیں۔[2]

(۴)

والشرك الاکبر هو الاشراك فیما خصصه الله تعالیٰ لنفسه وهو کثیر لکنا نذکر شیئا منه لیقاس علیه غیره فنقول هو اربعة اقسام۔ الاول الاشراك فی العلم اعنی اثبات مثل علم الله لغیره بکونه حاضراً

اب یہ بات تحقیق کی چاہیے کہ اللہ صاحب نے کون کونسی چیزیں اپنے واسطے خاص کر رکھی ہیں کہ اُن میں کسی کو شریک نہ کیا چاہیے۔ سو وہ باتیں بہت ساری ہیں مگر کئی باتوں کا ذکر کر دینا اور اُن کو قرآن وحدیث سے ثابت کرنا ضرور ہے تا اور باقی باتیں اُن سے لوگ سمجھ لیں۔

---

[1] اسمٰعیل دہلوی، مولوی؛ تقویۃ الایمان، ص ۸۷

[2] ایضاً: ص ۳۲، ۳۳

وناظراً فی کل مکان ومطلعاً علیٰ کل شیئ وفی کل اٰن بعیداً کان او قریباً خفیاً کان او جلیاً فمن اعتقد انه اذا ذکر اسم نبی فیطلع هو علیه لصار مشرکاً وهذا الاعتقاد شرك سواء کان مع نبیؔ او ولی او ملك او جنیؔ او صنم ووثن وسواء کان یعتقد حصوله بذاته او باعلام الله تعالیٰ بای طریق کان یصیر مشرکاً۔

سو اول بات یہ ہے کہ ہر جگہ حاضر و ناظر رہنا اور ہر چیز کی خبر برابر ہر وقت رکھنی، دُور ہو یا نزدیک، چھپی ہو یا کُھلی، اندھیرے میں ہو یا اجالے میں.... یہ اللہ ہی کی شان ہے اور کسی کی یہ شان نہیں۔ سو جو کوئی کسی کا نام اُٹھتے بیٹھتے لیا کرے، دور و نزدیک سے پکارا کرے..... اور یوں سمجھے کہ جب میں اُس کا نام لیتا ہُوں، زبان سے یا دل سے.... تو وہیں اُس کو خبر ہو جاتی ہے، اُس سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی.... سو ان باتوں سے مشرک ہو جاتا ہے.... خواہ یہ عقیدہ انبیاء و اولیاء سے رکھے، خواہ پیر و شہید سے، خواہ امام اور امام زادے سے، خواہ بھوت اور پری سے۔ پھر خواہ یُوں سمجھے کہ یہ بات اُن کو اپنی ذات سے ہے، خواہ اللہ کے دینے سے، غرض اس عقیدے سے ہر طرح شرک ثابت ہوتا ہے۔[1]

(۵)

والثانی الاشراك فی التصرف اعنی اثبات مثل تصرف الله

دوسری بات یہ ہے کہ عالم میں ارادے سے تصرف کرنا اور اپنا حکم جاری کرنا...

---

[1] اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۵، ۳۶

لغیره سواء اعتقد ان قدره التصرف له بذاته تعالٰی او باعطاء اللّٰه تعالٰی۔

کا سا تصرف ثابت کرنا محض شرک ہے پھر خواہ یُوں سمجھے کہ اِن کاموں کی طاقت اِن کو خود بخود ہے خواہ یُوں سمجھے کہ اللّٰہ نے اُن کو ایسی طاقت بخشی ہے، ہر طرح شرک ثابت ہوتا ہے۔[1]

(٦)

والثالث الاشراك فی العبادة ای تعظیم غیر اللّٰه کتعظیمه اعنی الاعمال التی خصها اللّٰه تعالٰی لتعظیمه مثل السجود و الرکوع والتمثل قائما یقف عند احد کما یقف فی الصلٰوة له والصوم له و شد الرحل الیٰ بیته والتشکل الخاص بالاحرام والطواف والدعاء من اللّٰه ھٰهنا والتقبیل وایقاد السرج والمجاورة والتبرك بالمآء والرجعة القهقریٰ وتعظیم حرمه وامثال ذٰلك فمن فعل بنبیّ او ولیّ او قبره واثاره او مشاهده وما

تیسری بات یہ ہے کہ بعضے کام تعظیم کے اللّٰہ نے اپنے لیے خاص کیے ہیں کہ اُن کو عبادت کہتے ہیں۔ جیسے سجدہ اور رکوع اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، اُس کے نام پر مال خرچ کرنا، اُس کے نام کا روزہ رکھنا، اُس کے گھر کی طرف دُور دُور سے قصد کر کے سفر کرنا...... اور رستے میں اُس مالک کا نام پکارنا، نامعقول باتیں کرنے اور شکار سے بچنا اور اِسی قید سے جا کر طواف کرنا، اُس گھر کی طرف سجدہ کرنا، اُس کی طرف جانور لے جانے، وہاں منتیں ماننی، اُس پر غلاف ڈالنا، اُس کی چوکھٹ کے آگے کھڑے ہو کر دُعا مانگنی.... اُس کے گرد روشنی کرنی، اُس کا مجاور بن کر اُس کی خدمت میں مشغول رہنا.....

---

[1] اسمٰعیل دہلوی، تقویۃ الایمان، ص ۳۶

يتعلق به شيئًا من السجود والركوع وبذل المال له والصلوٰة له والصوم له والتمثل قائمًا وقصدًا لسفر اليه والتقبيل والرجعة القهقرٰى وقت التوديع وضرب الخباء وارخاء الستارة والستر بالثوب والدعا من الله هٰهنا والمجاورة والتعظيم حواليه واعتقاد كون ذكر غيره الله عبادةً وتذكره فى الشدائد ودعاءه بنحو يا محمّد يا عبد القادر يا حداد يا سمان فقد صار مشركًا كافرًا بنفس هٰذه الاعمال سواء اعتقد استحقاقه لهٰذا التعظيم بذاته اولا۔

اس کے کنویں کے پانی کو تبرک سمجھ کر پینا، بدن پر ڈالنا، آپس میں بانٹنا، غائبوں کے واسطے لے جانا، رخصت ہوتے وقت اُلٹے پاؤں چلنا..... پھر جو کوئی کسی پیر پیغمبر کو یا بھوت پری کو یا کسی کی سچی یا جھوٹی قبر کو یا کسی کے نھان کو..... سجدہ کرے یا رکوع کرے یا اُس کے نام کا روزہ رکھے یا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو یا جانور چڑھائے یا ایسے مکان میں دُور دُور سے قصد کرکے جائے..... چوکھٹ کو بوسہ دے، ہاتھ باندھ کر التجا کرے، مراد مانگے، مجاور بن کر بیٹھ رہے رخصت ہوتے وقت اُلٹے پاؤں چلے، وہاں کے گرد وپیش کے جنگل کا ادب کرے اور اِسی قسم کی باتیں کرے، سو اُس پر شرک ثابت ہوتا ہے۔ اِس کو اشراک فی العبادہ کہتے ہیں، یعنی اللہ کی سی کسی کی تعظیم کرنی۔ پھر خواہ یوں سمجھے کہ یہ آپ ہی اِس تعظیم کے لائق ہیں یا یُوں سمجھے کہ اِن کی اِس طرح کی تعظیم کرنے سے اللہ خوش ہوتا ہے اور اِس تعظیم کی برکت سے اللہ مشکلیں کھول دیتا ہے۔ ہر طرح شرک ثابت ہوتا ہے۔[1]

---

[1] اسمٰعیل دہلوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۶ تا ۳۸

(۷)

الرابع الاشراک فی العادة اعنی تعظیم الغیر فی افعال عادة بما یجب للہ تعالیٰ مثل الحلف باسم اللہ تعالیٰ والتسمیة بعبد اللہ واخلاص النذور والصدقات للہ وامثال ذٰلک فمن حلف بغیر اللہ اوسمی ولدہ عبد الرسول او عبد النبی او نذر لغیر اللہ او تصدق لغیر اللہ او قال نذر اللہ ورسولہ و صدقة الی اللہ ورسولہ فقد صار مشرکاً کافراً وھا انا اذکر الاقسام الاربعة واثبت ما ذکرت کلھا بالآیات والاحادیث فی الفصول الآتیة۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اللہ صاحب نے اپنے بندوں کو سکھایا ہے کہ اپنے دنیا کے کاموں میں اللہ کو یاد رکھیں اور اُسی کی تعظیم کرتے رہیں تاکہ ایمان بھی درست ہو اور اُن کاموں میں بھی برکت ہو جیسے آڑے کام پر اللہ کی نذر ماننی، مشکل کے وقت اُسے پکارنا، ہر کام کا شروع اُس کے نام سے کرنا.... پھر جو کوئی کہ انبیاء و اولیاء کی، اماموں، شہیدوں کی، بھوت پری کی اِس قسم کی تعظیم کرے جیسے آڑے وقت پر اُن کی نذر مانے، مشکل کے وقت اُن کو پکارے.... اپنی اولاد کا نام عبد النبی، امام بخش، پیر بخش رکھے..... سو اِن سب باتوں سے شرک ثابت ہوتا ہے اور اِس کو الشرک فی العادۃ کہتے ہیں۔ یعنی اپنی عادت کے کاموں میں جو اللہ کی تعظیم کرنی چاہیے، سو غیر کی کرے۔[1]

(۸)

الفصل الثانی فی ردّ الاشراک فی العلم۔

اِس فصل میں اُن آیتوں اور حدیثوں کا ذکر ہے جن سے اشراک فی العلم کی برائی ثابت ہوتی ہے۔[2]

---

[1] اسمٰعیل دہلوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۸، ۳۹

[2] ایضاً: ص ۵۳

(۹)

فمن اثبته لغیره نبیًا کان او ولیًا صنمًا او وثنًا ملکًا او جنیًا فقد اشرك باللّٰه۔

اور جو کوئی کسی نبی اور ولی کو یا جن اور فرشتہ کو یا امام اور امام زادہ کو یا پیر اور شہید کو یا نجومی اور رمّال کو...... یا بھوت اور پری کو ایسا جانے اور اُس کے حق میں یہ عقیدہ رکھے سو وہ مشرک ہو جاتا ہے۔[1]

(۱۰)

وعن عائشة قالت من اخبر لشان محمدًا یعلم الخمس التی قال تعالٰی ان اللّٰه عنده علم الساعة الاٰیة فقد اعظم الفریه۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: جو کوئی خبر دے تجھ کو کہ حضرت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے وہ پانچ باتیں کہ اللہ نے مذکور کی ہیں اِنّ اللّٰہ عندہٗ علم الساعۃ (الاٰیۃ) سو بے شک اُس نے بڑا طوفان باندھا۔[2]

(۱۱)

الفصل الثالث فی ردّ الاشراك فی التصرف۔

اس فصل میں اُن آیتوں اور حدیثوں کا ذکر ہے جن سے اشراک فی التصرف کی برائی ثابت ہوتی ہے۔[3]

(۱۲)

والانبیاء اذا یأمرهم اللّٰه بشئ یخافون ولا یستطیعون

اُس کے دربار میں اِن کا تو یہ حال ہے کہ جب وہ حکم فرماتا ہے، یہ سب رعب میں

---

[1] اسمٰعیل دہلوی : تقویۃ الایمان ، ص ۵۴

[2] ایضاً : ص ۶۱

[3] ایضاً : ص ۶۳

التفتیش فی حکم السوال عنہ ثانیًا۔

اُگر بے حواس ہو جاتے ہیں۔ ادب اور دہشت کے مارے دُوسری بار اُس بات کی تحقیق اُس سے نہیں کر سکتے۔ [1]

(۱۳)

فانما لا تکون الا بان یکون الشفیع وجیہا فیخاف المشفوع الیہ من عدم قبول شفاعتہ فوات مطالب مہمۃ برجوھا من الشفیع لکونہ ظہیراً ومعاونًا۔

مگر اُس امیر سے دب کر اُس کی سفارش مان لیتا اور چور کی تقصیر معاف کر دیتا ہے کیونکہ وہ امیر اُس کی سلطنت کا بڑا رکن ہے اور اُس کی بادشاہت کو بڑی رونق دے رہا ہے۔ سو بادشاہ یہ سمجھ رہا ہے کہ ایک جگہ اپنے غصّہ کو تھام لینا اور ایک چور سے درگزر کر جانا بہتر ہے اس سے کہ اتنے بڑے امیر کو ناخوش کر دیجئے کہ بڑے بڑے کام خراب ہو جاویں اور سلطنت کی رونق گھٹ جاوے۔ [2]

(۱۴)

واما ان یکون الشفیع محبوبًا فیتألم من عدم رضاہ وھذان یستحیلان فی شانہ تعالیٰ عمّا یصفون۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی بادشاہزادوں میں سے یا بیگمات میں سے یا کوئی بادشاہ کا معشوق اُس چور کا سفارشی ہو کر کھڑا ہو جائے اور چوری کی سزا نہ دینے دے۔ بادشاہ اس کی محبت سے

---

[1] اسمٰعیل دہلوی: تقویۃ الایمان: ص ۶۶

[2] ایضًا: ص ۶۷

لاچار ہو کر اُس چور کی تقصیر معاف کر دے، تو اس کو شفاعتِ محبت کہتے ہیں۔ یعنی بادشاہ نے محبت کے سبب سے سفارش قبول کر لی اور وہ یہ بات سمجھا کہ ایک بار غصّہ پی جانا اور ایک چور کو معاف کر دینا بہتر ہے اُس رنج سے کہ جو اُس محبوب کے رُوٹھ جانے سے مجھ کو ہوگا۔ [1]

(۱۵)

واما الشفاعة بالاذن التی كلا شفاعة وهو المذكور فی القرآن والحديث فحالها انها لا تكون لاهل الكبائر الذين ماتوا بلا توبة ولا للمصرّين..... وكيفية الشفاعة ان الحكيم العدل لما يرىٰ من عبده توبة و ندامة وانابة اليه لا الیٰ غيره يرحم عليه ولكن حكمه وفعله كله عدل لا يشوبه جور وظلم فلا يستطيع العفو بلا سبب وان عفا عنه

تیسری صورت یہ ہے کہ چور پر چوری تو ثابت ہو گئی مگر وہ ہمیشہ کا چور نہیں..... مگر نفس کی شامت سے قصور ہو گیا۔ سو اُس پر شرمندہ ہے۔ رات دن ڈرتا ہے..... بادشاہ سے بھاگ کر کسی امیر وزیر کی پناہ نہیں ڈھونڈتا..... رات دن اُس کا مُنہ دیکھ رہا ہے کہ دیکھیے میرے حق میں کیا حکم فرمائے۔ سو اُس کا یہ حال دیکھ کر بادشاہ کے دل میں اُس پر ترس آتا ہے، مگر آئین بادشاہت کا خیال کر کے بے سبب درگزر نہیں کرتا کہ کہیں لوگوں کے دلوں میں اُس کے آئین کی قدر گھٹ نہ جائے۔ سو کوئی امیر وزیر

---

[1] اسمٰعیل دہلوی؛ تقویۃ الایمان، ص ۶۸، ۶۹

وغفرله بلا سبب اختلّ قاعدة العدل وانتقص شان حكمه فى اعين الناظرين ويحاجّونه فيأذن لمن يشاء ان يشفع له فيشفع فيعفوا فى الحقيقة برحمته وفى الظاهر باسم شفاعة الشفيع حفظاً لقاعدة۔

اُس کی مرضی پا کر اس تقصیروار کی سفارش کرتا ہے اور بادشاہ اُس امیر کی عزت بڑھانے کو ظاہر میں اُس کی سفارش کا نام کر کے اُس چور کی تقصیر معاف کر دیتا ہے ..... سو اللہ کی جناب میں اِس قسم کی شفاعت ہو سکتی ہے اور جس نبی و ولی کی شفاعت کا قرآن و حدیث میں مذکور ہے سو اُس کے معنی یہی ہیں۔ [1]

(۱۶)

الى ان قال يا فاطمة انقذى نفسك من النار سلينى من مالى ماشئت فانى لا اغنى عنك من الله شيئا انظروا قنط النبى قرابته حتّى ابنته من نفعه لهم عند الله فمال هٰؤلاء المجانين يرجون شفاعته لهم عند الله۔

سو اُنھوں نے سب کو، اپنی بیٹی تک کو کھول کر سُنا دیا کہ قرابت کا حق ادا کرنا اُسی چیز میں ہو سکتا ہے کہ اپنے اختیار میں ہو، سو یہ میرا مال موجود ہے، اِس میں مجھ سے کچھ بخل نہیں۔ اللہ کے ہاں کا معاملہ میرے اختیار سے باہر ہے۔ وہاں میں کسی کی حمایت نہیں کر سکتا اور کسی کا وکیل نہیں بن سکتا۔ سو وہاں کا معاملہ ہر کوئی اپنا درست کرے اور دوزخ سے بچنے کی ہر کوئی تدبیر کرے۔ [2]

(۱۷)

الفصل الرابع فى ردّ الاشراك

سو اِس فصل میں مذکور ہے کہ قرآن و

---

[1] اسمٰعیل دہلوی: تقویۃ الایمان، ص ۶۹، ۷۰۔

[2] ایضاً: ص ۷۶

فی العبادة۔

حدیث میں اللہ کی تعظیم کے لوگوں کو کون کون سے کام بتائے ہیں تا کہ اور کسی کے لیے وہ کام نہ کیجیے کہ شرک لازم آئے۔[1]

(۱۸)

ولا یغتر سجدة الملٰئکة لاٰدم ویعقوب لیوسف کما یقوله الجاهل فانه صار منسوخاً کالنکاح مع الاخت۔

جو کوئی یہ بات کہے کہ اگلے دینوں میں کسی کسی مخلوق کو بھی سجدہ کرتے تھے جیسے فرشتوں نے حضرت آدم کو کیا اور حضرت یعقوب نے حضرت یوسف کو تو ہم بھی اگر کسی بزرگ کو کر لیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ سو یہ بات غلط ہے۔ آدم کے وقت کے لوگ اپنی بہنوں سے نکاح کر لیتے تھے چاہیے یہ لوگ ایسی ایسی حجتیں لانے والے اپنی بہنوں سے نکاح کر لیں۔[2]

(۱۹)

فثبت بهذه الاٰیة ان السفر الی قبر محمد ومشاهده ومساجده واٰثاره وقبر نبی وولی وسائر الاوثان وکذا طوافه وتعظیم حرمه وترک الصید والتحرز عن

سو اِس قسم کے کام کسی اور کی تعظیم کیلئے نہ کیا چاہئیں۔ کسی کی قبر پر یا چلّے پر یا کسی کے تھان پر دُور دُور سے قصد کرنا سفر کی رنج و تکلیف اُٹھا کر، مَیلے کچیلے ہو کر وہاں پہنچنا، وہاں جا کر جانور چڑھانے، منّتیں پوری کرنی، کسی قبر یا مکان کا طواف کرنا،

---

[1] اسمٰعیل دہلوی: تقویۃ الایمان، ص ۷۷

[2] ایضاً: ص ۷۸

قطع الشجر وغیرها شرك اکبر فان الله تعالیٰ خصص هٰذه الامور لذاته وانزل هٰذه الاٰیة لبیانه ۔

اُس کے گرد وپیش کے جنگل کا ادب کرنا یعنی وہاں شکار نہ کرنا، درخت نہ کاٹنا، گھاس نہ اُکھاڑنا اور اِسی قسم کے کام کرنے اور اُن سے کچھ دین و دنیا کے فائدہ کی توقع رکھنا، یہ سب شرک کی باتیں ہیں، اِن سے بچنا چاہیے ۔[1]

(۲۰)

الفصل الخامس فی رد الاشراك فی العادة ۔

اِس فصل میں اُن آیتوں اور حدیثوں کا ذکر ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدمی اپنے دنیا کے کاموں میں جیسا معاملہ اللہ سے رکھتا ہے اُس کی تعظیم طرح طرح سے کرتا ہے ویسا ہی معاملہ اور کسی سے نہ کرے ۔[2]

(۲۱)

عن قیس ابن سعد قال اتیت الحیرة فراُیتهم یسجدون لمرزبان لهم فقلت یا رسول الله انت احق ان یسجد لك قال أرأیت لو مررت بقبری أکنت تسجد له فقلت لا فقال

ابوداؤد نے ذکر کیا کہ قیس بن سعد نے نقل کیا کہ گیا میں ایک شہر میں جس کا نام حیرہ ہے ۔ سو دیکھا میں نے وہاں کے لوگوں کو کہ سجدہ کرتے تھے اپنے راجہ کو۔ سو کہا میں نے البتہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ لایق ہیں کہ سجدہ کیجیے اُن کو۔

---

[1] اسمٰعیل دہلوی: تقویۃ الایمان، ص ۸۰

[2] ایضاً: ص ۹۱

لا تفعلوا اخرجه ابوداؤد انظروا اعتذر النبی صلی اللہ تعالیٰ علیه وآله وسلم بمنع السجود لکونه رمة فی قبره۔	پھر آیا میں پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس۔ پھر کہا میں نے، گیا تھا میں حیرہ کو، سو دیکھا میں نے اُن لوگوں کو کہ سجدہ کرتے تھے اپنے راجہ کو، سو بہت لایق ہو کہ سجدہ کریں ہم آپ کو۔ تو فرمایا مجھ کو، بھلا خیال تو کر جو تو گزرے میری قبر پر کیا تو سجدہ کرے اُس کو؟ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا تو مت کر ایسا۔ یعنی میں بھی ایک دن مر کر مٹی میں ملنے والا ہوں تو کب سجدہ کے لایق ہوں۔[1]

یہ چند عبارتیں بطور نمونہ بالمقابل پیش کر دی ہیں، اِن سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان کے نقطۂ نظر میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ ہندی امام الوہابیہ نے نجدی امام الوہابیہ کے عقاید و نظریات ہی کو پیش کیا ہے اور تقویۃ الایمان حقیقت میں کتاب التوحید صغیر ہی کا ترجمہ اور شرح ہے جیسا کہ مذکورہ عبارتوں سے واضح ہے۔ علاوہ بریں تقویۃ الایمان کے باب فصل اور جملہ آیات و احادیث وہی ہیں جو کتاب التوحید صغیر میں ہیں۔ اِن حالات میں مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کو مذہب اہلسنّت وجماعت کا پیروکار اور اپنے خاندانی بزرگوں مثل شاہ عبدالرحیم محدّث دہلوی (المتوفی ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۸ء)، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (المتوفی ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء)، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء)، شاہ عبدالقادر دہلوی (المتوفی ۱۲۴۲ھ/ ۱۸۲۷ء) اور شاہ رفیع الدین دہلوی (المتوفی ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۷ء) رحمۃ اللہ علیہم کا متبع سمجھا جائے یا محمد بن عبدالوہاب نجدی کی خارجیت و وہابیت کا مبلّغ مانا جائے؟ حقیقت یہ ہے کہ مولوی محمد اسمٰعیل

---

[1] اسمٰعیل دہلوی: تقویۃ الایمان، ص ۱۱۱، ۱۱۲

دہلوی کا مذہب اہلسنت وجماعت کو ترک کرنا ایک اٹل حقیقت ہے جسے چیلنج نہیں کیا جا سکتا اور اُن کا مبلغِ خارجیت و وہابیت ہونا ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اِن حالات میں قاضی فضل احمد صاحب نقشبندی لدھیانوی نے فریاد المسلمین کے صفحہ ۹۰ سے فخرِ خاندانِ دہلی شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا جو بیان متعلقہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے نقل فرمایا ہے وہ مبنی بر حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ قاضی صاحب موصوف نقل کرتے ہیں:

"میری طرف سے کہو اُس لڑکے نامراد کو کہ جو کتاب (کتاب التوحید) بمبئی سے آتی ہے، میں نے بھی اُس کو دیکھا ہے، اُس کے عقائد صحیح نہیں ہیں بلکہ وہ بے ادبی، بے نصیبی سے بھری پڑی ہے۔ میں آجکل بیمار ہوں۔ اگر صحت ہوگئی تو میں کتاب التوحید کی تردید لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تم (مولوی محمد اسمٰعیل) ابھی نوجوان بچے ہو، ناحق شور و شر برپا نہ کرو۔"[1]

چونکہ کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان ایک ہی چیز یا ایک ہی مضمون کے دو نام ہیں، لہٰذا جو کچھ شاہ عبد العزیز علیہ الرحمہ نے کتاب التوحید کے بارے میں فرمایا یہی آپ کا نظریہ تقویۃ الایمان کے بارے میں ہونا چاہیے، یعنی:

۱۔ تقویۃ الایمان کے عقاید بھی صحیح نہیں ہیں۔

۲۔ تقویۃ الایمان بے ادبی اور بے نصیبی سے بھری پڑی ہے۔

۳۔ اگر آپ صحت مند ہو جاتے تو کتاب التوحید کی طرح تقویۃ الایمان کے ردّ کا ارادہ ظاہر فرماتے۔

۴۔ تقویۃ الایمانی عقاید و نظریات کی نشر و اشاعت کرنا حقیقت میں ناحق شور و شر برپا کرنا ہے۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

امام الوہابیہ کا اقراری کفر

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے مشکوٰۃ شریف کے باب لا تقوم الساعۃ الا علیٰ اشرار الناس سے ایک

---

[1] قاضی فضل احمد: انوار آفتابِ صداقت، جلد اوّل، ص ۵۱۶

حدیث نقل کی، جس کا ترجمہ موصوف کے لفظوں میں یہ ہے:

”مسلم نے ذکر کیا کہ نقل کیا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہ: سُنا میں نے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے، فرماتے تھے: نہیں تمام ہونے کے رات اور دن یعنی قیامت نہ آئے گی یہاں تک کہ پُوجیں لات اور عزّیٰ کو۔ سو کہا میں نے اے پیغمبرِ خدا! بیشک میں جانتی تھی کہ جب اتاری اللہ نے یہ آیت هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی الخ کہ بیشک یوں ہی رہے گا آخر تک۔ فرمایا: بے شک ہوگا اسی طرح جب تک چاہے گا اللہ، پھر بھیجے گا اللہ ایک باؤ اچھی، جان نکال لے گی جس کے دل میں ہوگا ایک رائی کے دانہ بھر ایمان، سو رہ جائیں گے وہی لوگ کہ جن میں کچھ بھلائی نہیں۔ سو پھر جاویں گے اپنے باپ دادوں کے دین پر۔“[1]

اِس حدیث پر موصوف نے جو فائدہ جڑا ہے اُس کا درجِ ذیل حصّہ قارئین بغور ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ اِس کی تہہ میں کون سا جذبہ کارفرما ہے۔ موصوف نے لکھا ہے:

”سو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اِس کا زور تو مقرر ہوگا، جب تک اللہ چاہے گا، پھر اللہ آپ ایسی ایک باؤ (ہوا) بھیجے گا کہ سب اچھے بندے جن کے دل میں تھوڑا سا بھی ایمان ہوگا، مر جاویں گے اور وہی لوگ رہ جائیں گے کہ جن میں کچھ بھلائی نہیں۔ یعنی نہ اللہ کی تعظیم، نہ رسول کی راہ پر چلنے کا شوق، بلکہ باپ دادوں کی رسموں کی سند پکڑنے لگیں گے۔ سو اِس طرح شرک میں پڑ جائیں گے۔ کیونکہ اکثر پرانے باپ دادے جاہل مشرک گزرے ہیں۔ جو کوئی اُن کی راہ و رسم کی سند پکڑے، آپ بھی مشرک ہو جاوے۔ اِس حدیث سے معلوم ہُوا کہ آخر زمانہ میں قدیم شرک بھی رائج ہوگا۔ سو پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کے مطابق ہُوا۔“[2]

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی: تقویۃ الایمان، ص ۸۶، ۸۷

[2] ایضاً: ص ۸۷، ۸۸

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی مذکورہ بالا تشریح کی روشنی میں مندرجہ ذیل امور خاص طور پر سامنے آتے ہیں:

۱۔ پیغمبرِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق مذکورہ ہوا چل چکی ہے۔

۲۔ جن کے دل میں تھوڑا سا ایمان بھی تھا وہ سارے مر چکے ہیں۔

۳۔ اب صرف وہی لوگ باقی رہ گئے ہیں جن میں بھلائی کا نشان بھی نہیں۔

۴۔ اب مسلمان کہلانے والے بھی شرک میں پڑ چکے ہیں۔

۵۔ باپ دادوں کی رسموں کی سند پکڑنے کے باعث مسلمانوں میں قدیم شرک بھی رائج ہو گیا ہے۔

موصوف کی اِس تصریح و تشریح کو اگر درست تسلیم کر لیا جائے تو خود مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور اُن کے سارے متبعین کو بھی مشرک ماننا ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ اُن کی تحقیق یہی ہے کہ جن کے دِل میں رائی کے برابر بھی ایمان تھا وُہ مر گئے اور مشرک ہی مشرک باقی رہ گئے ہیں۔ دریں حالات یہ دہلوی صاحب کا اقراری کفر قرار پاتا ہے۔ پس مولوی اسمٰعیل صاحب کو سچّا ماننے کی صورت میں سارے وہابیوں کو امام الوہابیہ سمیت مشرک ماننا ضروری ہو جاتا ہے اور اگر انھیں مشرک نہ کہا جائے تو مصنّفِ تقویۃ الایمان کو جھوٹا، دروغ گو اور مکفّر المسلمین ماننا لازم آئے گا۔ یہ وہابی حضرات کی اپنی پسند ہے کہ دونوں میں سے وہ کس راستے کو پسند کرتے ہیں؛

•

کاش! دہلوی صاحب کے متبعین کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا فرما لیں کہ وُہ اور اُن کے امام صاحب اِس زمین کے پردے کے علاوہ تحت الثّریٰ میں تو بستے نہیں تھے نہ اب اور کہیں رہتے ہیں کہ شرک کے اِس عالمگیر فتوے کی زد سے بچ جائیں۔ لامحالہ یہ خود اپنے مشرک ہونے کا اقرار ہے۔ مسلمانوں کو بات بات پر بلا وجہ مشرک ٹھہرانے کی قدرت نے دنیا میں یہ سزا دی کہ موصوف نے خود اپنا اور اپنے متبعین کا مشرک ہونا تسلیم کیا، جو آج تک برابر مشتہر ہوتا آرہا ہے۔ کذٰلک العذاب ولعذاب الاٰخرۃ اکبر لو کانوا یعلمون ۝

۲- فرقۂ اہلحدیث کی تخریب کاری

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے محمدی گروہ نے جب حالات کے تحت تین قسم کی ٹولیاں بنالیں تو موصوف کی اصل جماعت کچھ عرصہ موحّد کہلاتی رہی لیکن بعد میں اہلحدیث کے نام سے مشہور ہونا شروع کر دیا۔ وہابیوں کی تینوں میں سے اِس اوّلین جماعت کی باقاعدہ سرپرستی اور گروہی تنظیم میاں نذیر حسین دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ء) نے کی۔ مولوی محمد حسین بٹالوی (المتوفی ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء) اُن کے سیاسی اور مذہبی دستِ راست تھے۔ اِس جماعت کے افراد کا انگلیوں پر گنا جانا وہابیت کے پاک وہند میں غیر مقبول ہونے کی ایک بہت بڑی شہادت ہے، جس کے باعث دیگر پُراسرار وہابی جماعتیں کھڑی کی گئیں۔

جماعت کا اہلحدیث نام

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی بانی وہابیت نے اپنی جماعت کا نام محمدی گروہ رکھا تھا۔ مسلمانوں نے کہنا شروع کر دیا کہ واقعی یہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیروکار ہونے کے باعث محمدی ہی تو ہیں۔ وہابی حضرات نے اِس نسبت کو چھپانے کی غرض سے خود کو موحّدین کہنا شروع کر دیا۔ مسلمانانِ اہلسنت و جماعت کہتے کہ واقعی یہ منکرینِ شانِ رسالت ہونے کے باعث سکھوں کی طرح بڑے موحّد ہی تو ہیں۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو میاں نذیر حسین دہلوی کی سرکردگی میں مولوی محمد حسین بٹالوی نے اپنی مہربان سرکار سے درخواست کی کہ مسلمانانِ ہند آپ کے اِس خودکاشتہ نجدی پودے کو وہابی کہتے ہیں۔ اِنھیں قانونی طور پر اِس نام سے روکا جائے اور ہماری جماعت کا نام سرکاری طور پر اہلِ حدیث رکھ دیا جائے۔ گورنمنٹ نے جو جواب دیا وہ پروفیسر محمد ایوب قادری کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

> ”اِنھوں (مولوی محمد حسین بٹالوی) نے ارکانِ جماعتِ اہلحدیث کی ایک دستخطی درخواست لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کے ذریعے سے وائسرائے ہند کی خدمت میں روانہ کی۔ اس درخواست پر سرِ فہرست شمس العلماء میاں نذیر حسین کے دستخط تھے۔ گورنر پنجاب نے وہ درخواست اپنی تائیدی

تحریر کے ساتھ گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیج دی۔ وہاں سے حسبِ ضابطہ منظوری آگئی کہ آئندہ وہابی کے بجائے اہلحدیث کا لفظ استعمال کیا جائے۔ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے اِس کی باقاعدہ اطلاع مولوی محمد حسین کو دی۔ اِسی طرح گورنمنٹ مدراس کی طرف سے ۱۵ر اگست ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۱۲۷ گورنمنٹ بنگال کی طرف سے ۴ر مارچ ۱۸۹۰ء کو بذریعہ خط نمبر ۱۵۶ اور گورنمنٹ یو۔ پی کی طرف سے ۲۰ جولائی ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۳۸۶، گورنمنٹ سی۔ پی۔ کی طرف سے ۱۴ر جولائی ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۴۰۷، اور گورنمنٹ بمبئی کی طرف سے ۱۴ر اگست ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۷۳۲، اِس امر کی اطلاع مولوی محمد حسین کو ملی۔"[۱]

یہ ہے اِن حضرات کے اہل حدیث ہونے کی کل کائنات۔ یہ چور دروازہ مسلمانوں کو دو طرح دھوکا دینے کی خاطر ایجاد فرمایا گیا تھا۔ اوّلاً اِس لیے کہ مسلمانوں کو یہ تاثر دیا جائے کہ یہ لوگ حدیث سے بہت ہی لگاؤ رکھنے کے باعث خود کو اہلحدیث کہتے ہیں۔ ثانیاً اس غرض سے کہ محدثین حضرات کے لیے تصانیفِ علمائے کرام میں لفظِ اہلحدیث بھی عام استعمال ہوتا رہا ہے، لہٰذا اُس سے مسلمانوں کو دھوکا دینا آسان ہو جائے گا کہ صاحبو! ہماری جماعت کوئی نوزائیدہ فرقہ یا انگریز کا خود کاشتہ پودا تو نہیں بلکہ ہمارے گروہ کا نام تو بڑے بڑے علمائے اعلام کی تصانیفِ عالیہ میں بھی اوائلِ زمانہ ہی سے مذکور ہوتا آ رہا ہے۔ یہ ہے اِن حضرات کے چھل میں بل رہے

دیکھو تو دلفریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کتر گئی

امتیازی نشانات

یہ جماعت چونکہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے متبعین و معتقدین کی پہلی جماعت ہے اِس لیے موصوف کے تمام عقاید و نظریات

---

[۱] محمد ایوب قادری، مقدمہ حیات سید احمد شہید، ص ۲۶

اور مخصوص افعال پر بڑی شدت سے کاربند ہے۔ اپنے پیشوا کے فیصلے کو قرآن وحدیث کے صریح خلاف دیکھتے ہوئے بھی ہرگز اُسے غلط یا قابلِ ترمیم تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے بلکہ آیات واحادیث کے مفہوم ومطالب میں ہزار کھینچا تانی کر کے اُس کے موافق دکھانے کی کوشش کریں گے۔ اِن کے مذہب کا اصل ماخذ تقویۃ الایمان ہے۔ قرآن وحدیث کو دوسرا اور تیسرا درجہ حاصل ہے، جنھیں تقویۃ الایمانی نظریات کی تائید میں پیش کر کے مسلمانوں سے اپنی حقانیت کا اعتراف کروانے میں شب وروز کوشاں رہتے ہیں۔ اِن حضرات کے نزدیک مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے اپنی تقویۃ الایمان میں جو کچھ لکھا ہے، اُس میں سے کسی بات کا غلط تسلیم کرنا تو ہزاروں منزل دور کی بات ہے، کسی بات کو قابلِ ترمیم اور کمزور مان لینا بھی گوارا نہیں، خواہ قرآن وحدیث کے کتنے ہی واضح نصوص اُس کے خلاف کیوں نہ پیش کر دیئے جائیں۔ بعینہٖ یہود کے اندر شخصیت پرستی کی یہی مثالیں موجود تھیں، جن کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ — انھوں نے اپنے پادریوں اور جوگیوں
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ [۱] — کو اللہ کے سوا رب بنالیا۔

موصوف کو رب کا درجہ دینے کے شرک میں مبتلا ہونے کے باعث اِن حضرات کو جملہ مسلمان مشرک ہی نظر آتے ہیں جیسے ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔ جس طرح [illegible]مری کے بچھڑے کی محبت سے بعض یہود کے قلوب لبریز ہوگئے تھے، اسی طرح دہلوی صاحب [illegible]وف کی عقیدت کا سمندر ہر وہابی صاحب کے سینے میں ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے۔ اِس انتہائی وابستگی کا اندازہ یُوں کیا جا سکتا ہے کہ موصوف کے کسی نظریے کے خلاف پچاس آیتیں یا سو حدیثیں پیش کر کے کسی وہابی عالم کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جائے تو آیات واحادیث کے مفہوم ومعانی میں وہ تاویلیں کرنے اور تقویۃ الایمانی نظریہ کے مطابق دکھانے پر تو ایڑی چوٹی تک کا زور لگا دے گا لیکن امام الوہابیہ کے اُس نظریہ کے قابلِ ترمیم

---

[۱] پ ۱۰ ، سورہ التوبہ ، آیت ۳۱

ہونے کا تصور اُس کے دماغ کے کسی بھی گوشے میں پیدا نہیں ہوگا۔ دہلوی صاحب کے نظریات کے اٹل ہونے پر ان کے نزدیک نہ آیات و احادیث اثر انداز ہو سکتی ہیں نہ کوئی اور چیز۔ یہ ہے ان حضرات کے دِلوں کا وہ مرضِ بے علاج جو انھیں مسلمانانِ اہلسنت و جماعت سے مفاہمت کرنے اور اختلاف کو مٹانے پر کسی بھی وقت آمادہ نہیں ہونے دیتا۔

وہابی توحید یہ حضرات اپنے امام علی الاطلاق یعنی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی بتائی ہوئی اُسی خارجی توحید کو طرۂ امتیاز بنائے ہُوئے ہیں، جس کی مخالفت کے باعث خوارج نے امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کافر و مشرک ٹھہرایا تھا۔ زمانۂ حال کے خارجیت زدہ حضرات کو سچے مسلمان بھی اُسی طرح کافر و مشرک نظر آتے ہیں۔ امام الوہابیہ نے تو ایضاح الحق وغیرہ میں ایک دو جگہ تجسیم کا نظریہ پیش کیا تھا لیکن اہل حدیث کہلانے والے حضرات نے اُس سبوح و قدوس کو مجسّم منوانا ڈنکے کی چوٹ جاری رکھا ہوا ہے۔ چنانچہ وہابیہ کے مسلّمہ عالِم مولوی وحید الزمان خاں حیدر آبادی نے اپنے ترجمۂ قرآن میں آیہ کریمہ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے حاشیے پر ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں لکھا ہے:

> "جب کُرسی پر بیٹھتا ہے تو چار اُنگل بھی بڑی نہیں رہتی ہے اور اُس کے بوجھ سے چرچر کرتی ہے۔"[1]

یہی مولوی وحید الزمان خاں صاحب بعض آیاتِ قرآنیہ کا ترجمہ یُوں کرتے ہیں:

ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ۔[2]	پھر آسمان کی طرف چڑھ گیا اور سات آسمان ہموار کیے۔[3]

---

[1] وحید الزمان خاں، مولوی: محشی و مترجم قرآنِ مجید، ص ۶۰

[2] پ ۱، سورہ البقرہ، آیت ۳۹

[3] وحید الزمان خاں، مولوی: تبویب القرآن، ص ۴

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى[1] وہ بڑے رحم والا تخت پر چڑھا۔[2]

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ۔[3] پھر تخت پر جا بیٹھا۔[4]

یہ کرسی پر بیٹھنا اور کرسی کا اُس کے بوجھ سے چرچر کرنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ یہ حضرات اللہ رب العزت کو مجسم مانتے ہیں جس کا وزن ہے اور اُس کے بوجھ کو کرسی اٹھا لیتی ہے، بلکہ چرچر کرنے لگتی ہے۔ وُہ اِن حضرات کے نزدیک عرش پر چڑھتا اور بیٹھتا ہے۔ کاش یہ حضرات کبھی اِتنا سوچنے کی زحمت گوارا کر لیتے کہ ہر مجسم حادث ہوتا ہے اور حادث خدا نہیں ہو سکتا۔ اِس طرح یہ حضرات توحید کے ٹھیکیدار بنتے ہوئے بھی شرعاً منکرِ الوہیت قرار پاتے ہیں۔ اگر یہ بھی غور فرما لیں کہ جو ذات کرسی و عرش میں سما جاتی ہے اُس کا وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْط ہونا کس طرح مانتے ہیں؟

عقیدۂ رسالت

یہ حقیقت ہے کہ خارجیت و وہابیت عقیدۂ رسالت کے خلاف ایک کھلا ہُوا چیلنج ہے۔ اِن حضرات کے نزدیک بدقسمتی سے توہینِ رسالت کا نام توحید ہے۔ وہابیہ کا مخصوص میدان تنقیصِ شانِ رسالت ہے۔ اِن حالات میں دیگر انبیائے کرام اور اولیائے عظام کی توہین کرنا ضمنی معاملہ ہے کیونکہ جو صفات سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات والا صفات میں تسلیم نہیں کرتے تو اُن کا حصول باقی مقربینِ بارگاہِ الٰہیہ کے لیے کس طرح مان لیں؟ یہ حقیقت ہے کہ وہابی حضرات نے فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان میں ایسے ایسے گندے الفاظ استعمال کیے ہیں جن کی دیگر مذاہب والے غیر مسلموں کو بھی کبھی جرأت نہ ہُوئی۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے تقویۃ الایمان میں شانِ رسالت کے خلاف جن انتہائی گستاخانہ نظریات کی تبلیغ کی ہے، اِن حضرات کے دین کا رُکنِ اعظم یہی توہینِ مصطفیٰ ہے، جس پہ ڈیڑھ سو سال سے ڈٹے ہُوئے ہیں اور

---

[1] پ ۱۶، سورہ طٰہٰ، آیت ۵

[2] وحید الزمان خاں؛ تبویب القرآن، ص ۴۷

[3] پ ۱۸، سورہ الفرقان، آیت ۵۹

[4] وحید الزمان خاں؛ تبویب القرآن، ص ۵۰

فہمائش کا فریضہ ادا کرنے والے علمائے کرام سے آج تک برسرِ پیکار چلے آ رہے ہیں۔ دہلوی صاحب نے حدیث لاتشدوا الرحال سے اشاروں کنایوں میں روضۂ اطہر کی زیارت کو ناجائز قرار دیا تھا لیکن غیر مقلدین حضرات نے کھل کر مسلمانوں کو اس ایمانی و روحانی سعادت سے محروم رکھنے کی مہم چلائی ہوئی ہے چنانچہ حافظ عبداللہ غیر مقلد نے لکھا ہے:

"طلبِ علم اور دیگر ضروریات کے لیے سفر کا کوئی ہرج نہیں، صرف کسی جگہ کی طرف جس میں قبرِ نبوی بھی داخل ہے ثواب کی نیت سے سفر کرنا جائز نہیں۔" [1]

جناب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی کا اس سلسلے میں نوابی فیصلہ یہ ہے:

والسفر لمجرّد الزیارة فیه	صرف زیارت کے واسطے سفر کرنے (کے
نزاع ومن سافر ممجدد قبر	حکم) میں اختلاف ہے اور جس نے محض
فلم یذره زیارة شرعیة بل	کسی قبر کی جانب سفر کیا تو یہ شرعی زیارت
بدعة۔ [2]	نہیں بلکہ بدعت ہے۔

مولوی محمد بن اسمٰعیل عینی نے روضۂ انور کے بارے میں یہ ایمان سوز فیصلہ صادر کیا تھا:

(فان قلت) هٰذا قبر رسول الله	اگر تو کہے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
صلی الله علیه وسلم قد عمرت	کی قبر ہے، اس پر بہت سا مال خرچ
علیه قبة عظیمة انفقت فیها	کیا ہوا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ درحقیقت
الاموال (قلت) هذا جهل	یہ بہت بڑی جہالت ہے۔
عظیم بحقیقة الحال۔ [3]	

مولوی اسمٰعیل غزنوی نے اس سلسلے میں خارجیت کے نشے سے بدمست ہو کر یوں لکھا ہے:

"آجکل صالحین کی قبور پر جو گنبد اور قبے بنائے گئے ہیں وہ بھی بطور ایک بت کے ہیں۔" [4]

---

[1] حافظ عبداللہ، مولوی: مسئلہ سماع موتٰی، ص ۱۱۹

[2] صدیق حسن خاں، مولوی: رحلۃ الصدیق، ص ۷۹

[3] محمد بن اسمٰعیل عینی، مولوی: تطہیر الاعتقاد، ص ۲۶

[4] اسمٰعیل غزنوی، مولوی: تحفہ وہابیہ، ص ۵۹

مسالک سے کسی مسلک کے ساتھ کُلّی وابستگی نہیں رکھنی چاہیے۔ خُذ ما صفا دع
ما کدر پر عمل ہونا چاہیے"۔ [1]

اِس عبارت سے یہ تاثر بھی سامنے آتا ہے کہ احناف یا دُوسرے مسالک میں ام
موصوف کے پائے کا ایک بھی عالم پیدا نہیں ہُوا کہ موصوف کو سیکڑوں جزئیاتِ فقہ کا
ہونا نظر آگیا لیکن وُہ حضرات اُنھیں دیکھنے سے قاصر رہے۔ اگر غیر مقلّدین حضرات بُرا نہ منا
ہم یہ عرض کیے دیتے ہیں کہ اُن حضرات کی تو خاکِ پا بھی آپ کے اِن خانہ ساز محققین س
عالم تھی، ہاں بعض مسائل میں آپ کو کجی یا کوتاہی جو نظر آتی ہے، اِس کے لیے ذرا غور
دیکھ لیجیے کہ یہ آپ حضرات کا اپنا ہی بھینگا پن تو نہیں ہے؛ علاوہ بریں غیر مقلد حضرات
ایک بھی مسلّمہ محقق عالمِ دین کی نشان دہی نہ کر سکیں جس نے یہ کہا ہو کہ مروّجہ مسالک میں س
ایک کے ساتھ کُلّی وابستگی نہیں رکھنی چاہیے خُذْ مَا صَفَا دَعْ مَا کَدِرْ پر عمل ہونا چا
ہم صرف اتنی سی گزارش کریں گے کہ فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجار
اپنی جانوں پر ترس کھاؤ اور اُس آگ سے خود کو بچالو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔

اب نمونے کے طور پر سرگروہِ غیر مقلدین یعنی میاں نذیر حسین دہلوی کے شاگرد مولو
محمدی رحیم آبادی (المتوفی ۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۹ء) کا دلخراش تبصرہ اور چاند کی طرف تھوکنا ملا

"بات یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ سے چونکہ حدیث کی روایت ندارد ہے اِلّا ما شاء اللہ
اور یہ فنِ حدیث میں بے مائیگی اور نقصانِ اجتہاد کی دلیل تھی، لہٰذا النعمانی لوگ اِس ک
یُوں مٹانا چاہتے ہیں کہ امام صاحب کو شروطِ روایت میں شدّت واحتیاط تھی۔
بھلا امام صاحب کو روایت میں تو یہ احتیاط تھی اور قیاس میں احتیاط نہ ہُوئی
کہ شریعتِ محمدی میں بلا تامّل اپنی عقل پر اعتماد کر کے حکمِ شرع لگا دیا اور علیٰ ہٰذا
یہ کہنا کہ امام صاحب نے یہ اصول قائم کیے، یہ سب بے سروپا باتیں ہیں، جن
کا کوئی ثبوت نہیں اور علمائے مقبولین کی تصریحات اِس کے خلاف موجود ہیں۔

---

[1] محمد اسمٰعیل، مولوی: مقدمہ حسن البیان، ص ۱۷

[2] عبدالعزیز رحیم آبادی، مولوی: حسن البیان مطبوعہ لاہور، بار سوم، ص ۸۲، ۸۳

اگر موصوف کی اِس زہر افشانی میں ذرا بھی صداقت تسلیم کر لی جائے تو اِس کا مطلب یہ ہُوا کہ اُمتِ محمدیہ کے اکثر اکابر جو حضرت امام المسلمین قدس سرہٗ کی شان میں رطب اللسان رہے ہیں اور ہمیشہ اُن کی علمیت کو خراجِ عقیدت پیش کرتے آئے ہیں، اُن میں سے ایک بھی زیورِ علم اور تقویٰ و طہارت سے آراستہ نہیں تھا کہ علمِ حدیث سے ناواقف اور قرآن وحدیث کی تعلیمات کو مسخ کرنے والے کی امامت پر متفق رہے۔ کاش! یہ مبتدعین حضرات اِس طرح اُمتِ مرحومہ کو اُمتِ ملعونہ ٹھہراتے وقت کبھی گریبانوں میں جھانک کر بھی دیکھ لیا کریں اور اُن بزرگوں کے حضور اپنی لیاقت کا اندازہ کر کے کچھ تو خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا کو ملحوظ رکھا کریں۔ موصوف نے امام المسلمین قدس سرہٗ سے کدورت رکھنے کا یُوں بھی اظہار کیا ہے:

> "اُن (محدثین) کا استناد تو کتاب وسنّت و آثارِ صحابہ ہی پر ہے البتہ جن لوگوں کے پاس قیاس کا ہتھکنڈہ موجود تھا اُنھوں نے طلبِ حدیث میں زحمتِ سفر و مشقت اُٹھانے کی نہ ضرورت دیکھی نہ کی۔ جو مسئلہ پیش آیا اُسی ہتھکنڈے (قیاس) سے فوراً جواب دے دیا۔ ایسے لوگ اُس وقت قیّاس کہلاتے تھے، جیسا کہ صاحبِ سیرۃ النعمان نے حصہ اوّل میں خود اقرار کیا ہے۔ علاوہ امام ابوحنیفہ کے مناظرے جو آپ نے نقل کیے ہیں، وُہ بھی اِسی کے شاہد ہیں کہ امام ابوحنیفہ نے قیاس ہی سے جواب دئے ادلۂ شرعیہ کا وہاں نام بھی نہ تھا۔"[1]

یہ ہے مبتدعینِ زمانہ کا چاند کی طرف تھوکنا اور ساری اُمتِ محمدیہ کو شریعتِ محمدیہ کا مخالف ٹھہرانا کہ جو شخص ادلۂ شرعیہ سے واقف ہی نہیں تھا، اُسے امام الائمہ اور سراجِ اُمتِ محمدیہ مانتے چلے آرہے ہیں۔ بہرحال وہ اکابر جو اپنے اپنے دور میں سرمایۂ روزگار تھے اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے آئے، اُن کے مقابلے پر چند مبتدعینِ زمانہ کی غوغہ آرائی کہاں قابلِ التفات ہے؟ علاوہ بریں جب ان حضرات نے توہین وتنقیصِ شانِ رسالت کو اپنا محبوب مشغلہ اور اپنے دین کا رُکنِ اعظم بنایا ہُوا ہے، تو امام المسلمین قدس سرہٗ

---

[1] عبدالعزیز رحیم آبادی، مولوی: حسن البیان، ص ۹۱

کی ایسے لوگوں کی زبان و قلم سے تنقیص ہونا کون سا محلِ تعجب یا نرالی بات ہے؟ اِن حضرات کی ایسی زہر افشانیوں کا جائزہ ہم نے ایک مقالے میں لیا ہے جو انشاء اللہ تعالیٰ دوبارہ نئی آب و تاب سے منظرِ عام پر جلوہ گر ہونے والا ہے۔

غلاظت پسندی

چونکہ وہابی حضرات تقلید سے آزاد اور محقق بن کر شُترِ بے مہار کی طرح من مانی کرتے ہیں اِس لیے شریعتِ محمدیہ کو ایک کھلونا یا بازیچۂ اطفال بنا لیا ہے۔ منی کے بارے میں ان کے شیخ الکل یعنی میاں نذیر حسین دہلوی کا فیصلہ ملاحظہ ہو:

"بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ منی پاک ہے۔" [۱]

یہ بڑے میاں کی تحقیق تھی اب ایک چھوٹے میاں کی زبانی سُنیے اور اِن کی طہارت پسندی کی داد دیجئے۔ اُنھوں نے بھی بڑی دھوم دھام سے اپنی تحقیق انیق کے وہابیہ کی خاطر یُوں انمول موتی بکھیرے ہیں:

"لیکن صحیح قول یہی ہے کہ منی پاک ہے۔" [۲]

"صواب یہ ہے کہ دونوں (مرد و عورت) کی منی پاک ہے۔" [۳]

اِن حضرات کی طہارت پسندی کا اس سے بھی بڑا تمغہ ملاحظہ فرمائیے۔ موصوف لکھتے ہیں:

"جب بچّہ عورت کی فرج سے باہر نکلے اور اُس پر فرج کی رطوبت ہو، تو وُہ بھی پاک ہے۔" [۴]

"زیادہ تر صحیح قول یہ ہے کہ کُتّے اور خنزیر کے سوا اور سب جانوروں کی منی پاک ہے۔" [۵]

وہابیہ کی طہارت کا پانی

وہابی حضرات اپنی یا کسی اور کی یا کُتّے اور خنزیر کے سوا کسی بھی جانور کی منی میں لتھڑے ہُوئے ہوں تو اُن کی پاکی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اب وہ نماز کی تیاری کریں گے۔ وضو کے لیے کیسا پانی درکار ہے؛ چنانچہ کنویں کے

---

[۱] نذیر حسین دہلوی، مولوی؛ فتاویٰ نذیریہ، جلد اول، ص ۱۹۷

[۲] ابوالحسن، مولوی: فقہ محمدیہ کلاں، ص ۴۱

[۳] ایضاً: ص ۴۱

[۴] ایضاً: ص ۲۳

[۵] ایضاً: ص ۴۱

پانی کی پاکی ناپاکی کے سلسلے میں میاں نذیر حسین صاحب سے سوال ہوتا ہے جو مع جواب ملاحظہ ہو:

سوال: چہ فرمایند علمائے دین دریں مسئلہ کہ اگر سگ در چاہ افتاد چہ حکم است بیّنوا۔

جواب: حکم چاہ مذکور آنست کہ اگر آب آں چاہ از افتادن سگ متغیر نہ شدہ است بلکہ برحالِ خود است آں چاہ طاہر است۔"[1]

اب مولوی عبدالستار دہلوی کی سُن لیجیے کہ اس بارے میں وُہ کیا فرماتے ہیں:

"کنوئیں میں چُوہا وغیرہ گر جائے تو کنواں ناپاک نہ ہوگا کیونکہ آنحضور صلعم کے زمانہ میں مدینہ کے نواح میں بئر بضاعہ تھا، جس میں حیض کے کپڑے، مردار کے گوشت کی ہڈیاں گرتی تھیں، لوگ اُس سے پانی پیتے تھے۔ آپ کو بھی اُس سے پانی دیا جاتا تھا۔ آپ سے اِس مسئلہ پُوچھا گیا تو فرمایا: ان الماء طھور لا ینجسہ شیٔ۔ کہ پانی پاک ہے، اُس کو کوئی چیز پلید نہیں کرتی۔"[2]

اپنی غلاظت پسندی کی عادت کو پُورا کرنے کی خاطر سیّد المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر بھی افتراء کر دیا۔ سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کیسی کیسی نجاستوں، غلاظتوں کے پلا دینے کا دعویٰ کر دیا، پھر پانی کے کسی صورت میں ناپاک نہ ہونے کا حکم بھی اُس سرکار کی جانب زبان زوری سے منسوب کر دیا۔ مزید ملاحظہ ہو:

سوال (۵۰۱): ایک لڑکی جس کی عمر تقریبًا دس بارہ سال تھی، کنوئیں میں گر کر مر گئی اور مردہ حالت میں باہر نکالی گئی، جس کا سر بالکل پھٹا ہُوا تھا۔ کنوئیں کی گہرائی تقریبًا ۳۵ گز سے ۴۰ گز ہے۔ اِس میں تقریبًا پانی آٹھ نو فٹ موجود رہتا ہے۔ اس کی صفائی کا حکم کس طرح ہے؟ تقریبًا اُس لڑکی کی لاش کنوئیں میں دو گھنٹہ رہی۔

جواب: صورتِ مسئولہ میں واضح ہو کہ پانی کا مزہ[1] یا بُو[2] یا رنگ[3] بدل گیا ہے

---

[1] نذیر حسین دہلوی، مولوی: فتاویٰ نذیریہ، ج ۱، ص ۲۰۰

[2] عبدالستار دہلوی، مولوی: فتاویٰ ستاریہ، ج ۴، ص ۱۶۷

توتمام پانی نکالا جائے گا ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔ لقوله عليه السلام الماء طهور لا ينجسه شئ الا ما غلب ريحه او طعمه او لونه ينجسه تحدث فيه۔ نیز نبی علیہ السلام کا فرمان ہے: اذا كان الماء قلتين لم يحمل الخبث۔ یعنی جبکہ دو قلّے پانی ہو تو وہ ناپاک نہیں ہوتا۔ اب خواہ اس کو کوئی استعمال کرے یا نہیں کرے لیکن شرعًا وہ ناپاک نہیں۔"[1]

غیر مقلدین حضرات کے نزدیک قلتین یعنی دو بڑی مشکوں کے برابر پانی کسی جگہ موجود ہو تو وہ جاری پانی کا حکم رکھتا ہے اور جب تک اُس کا رنگ، مزہ یا بُو نہ بدلے کسی نجاست کے باعث اُس پر ناپاکی کا حکم جاری نہیں ہوتا۔ وہ پاک ہی قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ میاں نذیر حسین دہلوی نے لکھا ہے:

"مراد پانی سے یہاں پانی قلیل (دو بڑی مشکوں سے کم) ہے، اگر کثیر (دو بڑی مشکوں کے برابر) ہو، حکم جاری کا رکھتا ہے اور نجس نہیں ہوتا پیشاب وغیرہ سے۔"[2]

یہ ہے غیر مقلدین حضرات کی شانِ تحقیق اور یہ ہے اِن کی حدیث سے وابستگی جس کے بل بوتے پر ائمہ دین کے مُنہ آتے اور بزرگانِ دین کو قرآن و حدیث سے ناواقف ٹھہراتے ہیں لیکن خود یہ عالم ہے کہ ابوسفیان ظریف بن شہاب جیسے ضعیف و متروک راوی کی حدیث کے سہارے سارے جہان کی پلیدی اپنے لیے پاک ٹھہرا لی، حالانکہ محدثین نے حدیثِ قلتین کو مضطرب اور بعض حضرات نے موضوع قرار دیا ہے۔ خود یہ حدیث پر عمل کہ صحیح احادیث کو چھوڑ کر مضطرب و موضوع کو دین و مذہب بنائیں اور اسی بل بوتے پر ائمہ دین کی تحقیقاتِ جلیلہ میں کیڑے بتائیں۔ اللہ تعالیٰ عقل و دانش عطا فرمائے، آمین۔

کاش! غیر مقلدین حضرات کبھی یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا فرمالیں کہ اگر اُن کے ایسے مسائل سے غیر مسلم آگاہ ہو جائیں تو مسلمانوں، اِسلام اور پیغمبرِ اسلام کے بارے میں وُہ

---

[1] عبدالستار دہلوی: فتاویٰ ستاریہ، جلد چہارم، ص ۵۳، ۵۴

[2] نذیر حسین دہلوی: معیار الحق، ص ۱۳۲

کیا نظریہ قایم کریں گے؟ اگر اُنھیں معلوم ہو جائے کہ اِن لوگوں کے نزدیک دو بڑی مشکوں کے برابر پانی کسی جوہڑ میں ہو اور اِتنے سے پانی میں پیشاب، پاخانہ، یا مرا ہوا کتا، بلّی، چوہا یا کوئی اور نجس چیز پڑی ہوئی ہو، تو یہ پانی غلاظتوں کا مجموعہ ہونے کے باوجود یہ لوگ پاک سمجھتے ہیں۔ اِس سے وضو و غسل کر کے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اِسے بے دھڑک پی سکتے ہیں۔ پیغمبرِ اسلام نے مسلمانوں کی ایسی تربیت کی تھی کہ جس کنویں سے پانی پیتے تھے، اُسی میں حیض کے لتھڑے کپڑے ڈالے جاتے، اُسی میں مُردہ جانوروں کا گوشت اور ہڈیاں پھینک دیتے تھے اور بے دھڑک اسی پانی کو نہ صرف خود پیتے رہتے بلکہ اپنے نبی کو پلاتے اور مسلمانوں کا نبی اُنھیں اس حرکت سے روکنے کے بجائے ایسی حرکتوں پر اور اُبھارتا کہ خود اُس پانی کو پی لیتا اور اُس کے پاک صاف ہونے کا حکم صادر فرما دیتا تھا۔ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّہِّرِیْنَ۔ اللہ پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے لیکن غیر مسلم کہہ سکتے ہیں کہ اگر اسلام میں پاکی ناپاکی کا معیار یہی ہے جو غیر مقلدین پیش کرتے ہیں تو اِس طرح اسلام میں پاکیزگی کا تصوّر تک نہیں پایا جاتا اور غلاظت پسندی کے باعث بہ ہرگز خدا کے پسندیدہ بندے نہیں ہو سکتے۔ اُمید ہے کہ یہ نرالے محققین ٹھنڈے دِل سے غور فرمائیں گے۔

غیر مقلدین کی شانِ عبادت گزاری

وہابی حضرات اگرچہ قطعاً پلید جوہڑ کے پانی سے وضو و غسل کر کے بے تکلف عبادات ادا کر سکتے ہیں، لیکن اُنھیں اِس سے بڑھ کر بھی سہولت حاصل ہے۔ ملاحظہ ہو کہ جنبی و محدّث کا اذان پڑھنا صاف جائز قرار دیا ہُوا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:

> "وجائز است تاذینِ محدث اگرچہ باطہارت افضل است۔"[1]

اب سجدۂ تلاوت کے بارے میں اِن حضرات کے سرگروہ کی تحقیق ملاحظہ ہو۔ موصوف نے لکھا ہے:

> "پس اس حدیث سے جواز سجدۂ تلاوت بے وضو نیز ثابت ہوتا ہے۔"[2]

---

[1] نور الحسن خاں: عرف الجادی، ص ۲۴

[2] محمد ابو الحسن، مولوی: فقہ محمدیہ کلاں، ص ۹۷

اب ذرا اِن حضرات کے غسل کی مزید کیفیت ملاحظہ فرمائی جائے۔ مولوی محمد ابوالحسن صاحب لکھتے ہیں:

"اگر سارا حشفہ غائب نہ ہو بلکہ بعض غائب ہو اور بعض باہر رہے تو اُس کے ساتھ کوئی حکم متعلق نہیں ہوتا۔ نہ اُس پر غسل واجب ہوتا ہے نہ کوئی اور حکم اُس کے ساتھ متعلق ہوتا ہے۔"[1]

اب میاں نذیر حسین دہلوی کے شاگرد مولوی محمد سعید صاحب کی عجیب و غریب تحقیق ملاحظہ ہو، جس سے غیر مقلد حضرات روزانہ فائدہ اٹھاتے اور مزے لُوٹتے ہوں گے۔ اُنھوں نے لکھا ہے:

"جو اپنی بیوی سے جماع کرے اور انزال نہ ہو تو اُس کی نماز بغیر غسل کے درست ہے۔"[2]

اب وہابی صاحب وضو کی جانب رجوع فرماتے ہیں۔ اِس میں بھی جدّت ملاحظہ ہو:

"کافی ہے مسح کرنا پگڑی پر۔"[3]

دُوسرے غیر مقلد صاحب کا جوشِ تحقیق اور شانِ محققانہ بھی قابلِ دیدنی ہے۔ اُنھوں نے لکھا ہے:

"وضو میں بجائے پاؤں دھونے کے مسح فرض ہے۔"[4]

وہابی مرد و زن اکٹھے نماز پڑھیں تو کوئی مضایقہ نہیں۔ چنانچہ لکھا ہے:

"اِسی طرح اگر عورت مردوں کے ساتھ کھڑی ہو جاوے تو جمہور علماء کے نزدیک اُس کی نماز بھی نہیں ٹوٹتی اور حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر عورت مرد کے برابر کھڑی ہو جائے تو مرد کی نماز ٹوٹ جاتی ہے اور عورت کی نہیں ٹوٹتی، لیکن یہ قیاس مع الفارق ہے۔"[5]

بلکہ غیر مقلدین حضرات کے شیرِ پنجاب نے تو اِس سے بھی جرأت مندانہ فیصلہ صادر فرمایا ہوا ہے۔

---

[1] محمد ابوالحسن، مولوی: فقہ محمدیہ کلاں، ص ۶۵

[2] محمد سعید، مولوی: ہدایت قلوب قاسیہ، ص ۳۶

[3] صدیق حسن خاں، مولوی: فتح المغیث، ص ۶

[4] محمد ابراہیم، مولوی: فتاویٰ ابراہیمیہ، مطبوعہ اللہ آباد، ص ۲

[5] محمد ابوالحسن، مولوی: فقہ محمدی کلاں، ص ۱۵۰

ملاحظہ ہو:

سوال: کوئی شخص عورتوں کو عیدگاہ میں لے جانے کی کوشش کرے تو اُس کی مخالفت کرنی جائز ہے یا نہیں؟

جواب: ہرگز مخالفت جائز نہیں۔"[1]

خیر سے غیر مقلد حضرات اپنی عورتوں کو ساتھ لے کر نماز میں مشغول ہو گئے اب مردوں اور عورتوں کی منی خارج ہونے لگتی ہے تو اُس صورت کے بارے میں انھیں یہ تلقین فرمائی گئی ہے:

> "اسی طرح اگر منی اُتر کر ذکر کے درمیان آوے اور وہ شخص نماز کے اندر ہو، وہ اپنے ذکر کو کپڑے کے اُوپر سے پکڑ رکھے اور منی باہر نہ نکلے، یہاں تک کہ سلام پھیرے تو اُس کی نماز درست ہو جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ پاک ہے یہاں تک کہ منی باہر نکلے اور عورت کا حکم بھی مانند مرد کی ہے۔"[2]

مندرجہ بالا حوالہ جات سے وہابی حضرات کی نماز کا نقشہ اُن کی محققانہ شان کے باعث یُوں سامنے آتا ہے کہ غیر مقلد صاحب اپنی اہلیہ محترمہ سے صحبت کر رہے تھے کہ کسی مسجد سے اذان کی آواز سُنی، انزال ابھی نہیں ہُوا تھا کہ دونوں اُسی طرح لتھڑے ہُوئے نماز کی جانب دوڑے، دونوں نے اُس کنوئیں کے پانی سے وضو کیا جس میں کُتا گر گیا تھا یا کوئی لڑکی گر گئی تھی اور اس کا سر بھی پھُوٹ گیا تھا یا گاؤں کے جوہڑ پر جا پہنچے جس میں گاؤں کی بھینسیں روزانہ پیشاب گوبر کرتی ہیں لیکن اُس میں پانچ دس بڑی مشکوں کے برابر پانی ہے۔ وضو کرتے ہُوئے وہابی صاحب نے پگڑی پر مسح کیا حالانکہ اللہ جل مجدہ نے وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ فرمایا ہے لیکن نرالے محققوں نے وَامْسَحُوْا بِعِمَامَتِكُمْ بنا لیا ہے اور وہابن صاحبہ نے دوپٹے پر مسح کر لیا ہوگا۔ اتنی دیر میں ایک صاحب نے حالتِ جنابت میں آ کر اذان پڑھ دی۔ مولوی صاحب حشفہ والا مذکورہ تماشا کر ہی رہے تھے کہ اذان کی آواز سُن کر سابقہ وضو سے نماز پڑھانے

---

[1] ثناء اللہ امرت سری، مولوی: فتاویٰ ثنائیہ، جلد اول، ص ۳۴۷

[2] محمد ابوالحسن: فقہ محمدی کلاں، ص ۶۹

مصلّے پر کھڑے ہو گئے۔ انزال سے پہلے نماز کی جانب دوڑ آنے والا جوڑا، مولوی صاحب کی اہلیہ محترمہ اور موذّن صاحب پیچھے کھڑے ہو گئے۔ سابقہ کرتوت کا خیال آتے ہی مذکورہ جوڑے اور مولوی صاحب و مولون صاحبہ کی منی خارج ہونے لگی۔ فوراً چاروں حضرات کے دائیں ہاتھ اپنے اپنے اُن مقاموں پر ہی پہنچ گئے جہاں پہنچانے کی اُن کے بڑوں نے تلقین فرمائی ہے۔ موذن صاحب نے جب راجہ اِندر کے اکھاڑے کا یہ تماشا دیکھا تو اُن کے جذبات بھی بے قابو ہو گئے۔ مجبوراً اُنھیں بھی اپنا دایاں ہاتھ مقامِ خاص پر پہنچانا پڑا۔ پانچوں حضرات کا ایک ایک ہاتھ قیام ہو یا قعدہ، رکوع ہو یا سجدہ ہر حالت میں اُسی مقام پہ ڈٹا ہوا ہے جہاں اُس کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور جہاں پانچوں کی توجہ مرکوز ہو کر رہ گئی ہے۔ رفعِ یدین کا مسئلہ بھی بگڑ کر رفعِ ید ہو کر رہ گیا ہے۔ سلام پھیرتے ہی پانچوں بغیر دُعا مانگے اُسی طرح ہاتھوں سے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے جلد از جلد باہر دوڑ گئے۔ اگر دُعا مانگتے تو ہاتھ ہٹانے پڑتے، جس سے مضحکہ خیز سیلِ رواں آجاتا۔ یہ تھی وہ محققانہ نماز جس سے پانچوں نے فراغت پائی۔ بجز غیر مقلد حضرات کے ایسی عبادت گزاری کس کے حصے میں آئی۔ اللہ تعالیٰ جملہ مدعیانِ اسلام کو سچی ہدایت نصیب فرمائے۔ آمین۔

غیر مقلدین کے دیگر محبوب مشغلے

وہابی و نجدی حضرات قبہ شکنی میں شہرۂ آفاق ہیں مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی تو اس مرحلے تک پہنچنے سے پہلے ہی پٹھانوں کے ہاتھوں ذبح ہو چکے تھے۔ غیر مقلد حضرات کے ہاتھوں میں ہزار جتن کے باوجود صرف قلم ہے، جس سے وہ اکابر دشمنی کی بھڑاس نکال لیا کرتے ہیں۔ چنانچہ مولوی محمد اسمٰعیل غزنوی نے لکھا ہے:

> ”آج کل صالحین کی قبور پر جو گنبد اور قبّے بنائے گئے ہیں، وہ بھی بطور ایک بُت کے ہیں۔“[1]

اب غیر مقلد حضرات کا دوسرا مشغلہ ملاحظہ فرمایئے۔ مولوی عبدالستار دہلوی جواب دیتے ہیں:

سوال (۷۰)، زید کہتا ہے کہ مسجد میں محراب بنانا ناجائز ہے اور عمرو

---

[1] محمد اسمٰعیل غزنوی، مولوی، تحفہ وہابیہ، ص ۵۹

کہتا ہے کہ جائز ہے۔ جواب طلب امر یہ ہے کہ قولین میں سے کون سا قول صحیح اور قابلِ قبول ہے؟ (عبدالودود۔ قصبہ جھالو)

جواب: بے شک مساجد میں محراب مروّجہ کا بنانا ناجائز اور بدعت ہے۔"[1]

تیسرا مشغلہ کہ نوافل کی کثرت اور شب بیداری بھی ان حضرات کے نزدیک ممنوع و بدعت ہے۔

مولوی عبدالستار صاحب سے اس کے متعلق سوال ہُوا جو مع جواب ملاحظہ فرمائیے:

سوال (۸۱) شب برات یعنی ۱۴ تاریخ شعبان کو اکثر عورتیں مرد نفلیات رات بھر پڑھتے ہیں، اس کا ثبوت شریعتِ محمدیہ میں ہے یا نہیں؟

جواب: شب برات کو رات بھر نفلیات وغیرہ پڑھنا بدعت ہے اور اپنی جانب سے دینِ اکمل کے اندر زیادتی کرنی ہے جو کہ شرعاً ممنوع ہے۔"[2]

چوتھا مشغلہ سالانہ ہے، جس پر یہ حضرات عید الاضحیٰ کو عمل پیرا ہوتے ہوں گے:

سوال (۲۹۰) معروض آنکہ زمانۂ حال میں چیزوں کی گرانی حد سے بڑھ گئی ہے۔ اس وجہ سے امسال قربانی کا جانور پندرہ بیس روپے سے کم ملنا دشوار ہے۔ بندہ نے سُنا تھا کہ پہلے کسی صحیفہ میں یہ مضمون نکل چکا ہے کہ مرغ کی قربانی بھی جائز ہے۔ فرمانِ نبوی "اَلدِّیْنُ یُسْرٌ" اور فرمانِ الٰہی مَاجَعَلَ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ کے عموم کے ماتحت اگر آپ مرغ کی قربانی جائز سمجھتے ہوں تو بندہ کی تحقیق کرا دیں۔" (از مولوی محمد ضلع فیروزپور)

جواب: "شرعاً مرغ کی قربانی جائز ہے۔"[3]

پانچواں مشغلہ مسلمانانِ اہلسنت وجماعت کو مشرک و بدعتی سمجھنا اور اُن سے مقاطعہ کرنا بھی ملاحظہ ہو:

---

[1] عبدالستار، مولوی: فتاویٰ ستاریہ، جلد اوّل، ص ۶۳

[2] ایضاً: ص ۶۷

[3] فتاویٰ ستاریہ، جلد دوم، ص ۲۷

"**سوال** : نام کا مسلمان، شرکیہ افعال کرنے والے کا نکاح موحدہ عورت سے جائز ہے یا ناجائز؟

جواب : حرام ہے۔"[1]

سوال (۱۱۱) : عنداللہ وعندالرسول نکاح کس بات سے ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب : عورت موحّدہ مسلمہ صوم وصلوٰۃ کی پابند ہو اور خاوند مشرک، بدعتی، مولود پرست، گیارھویں پرست، تعزیہ پرست وغیرہ وغیرہ یا تارکِ صوم وصلوٰۃ ہو وغیرہ وغیرہ یا اِس کے برعکس، بس نکاح ٹوٹ گیا۔ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ۔"[2]

اگر غیر مقلد حضرات کے ایسے فتووں کو شرعی حکم کے مظہر سمجھ لیا جائے تو کتنے فیصد نکاح آج درست قرار پا سکتے ہیں؟ غیر مقلد حضرات غور تو فرمائیں کہ اُن کے فتووں کی رُو سے کتنے مدعیانِ اسلام بلکہ اُن کے ہم مشرب بھی ولد الزنا قرار پاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جملہ مدعیانِ اسلام کو عقلِ سلیم عطا فرمائے۔ آمین۔ اِسی تصویر کا یہی افسوسناک رُخ قارئین حضرات مزید ملاحظہ فرمائیں۔ چنانچہ مرقوم ہے:

"**سوال** (۳۵۴) : اگر نام کا حنفی باپ ہو یا ماں ہی کیوں نہ ہو، اُن کی دنیاوی خدمت بجالانی کیسی ہے اور اُن کا جنازہ پڑھنا چاہیے یا نہیں؟ مخالفِ اسلام ہونے کی وجہ سے دِل تو اُن کی خدمت کو بھی نہیں چاہتا۔

جواب : والدین کی دنیاوی امور میں اطاعت خدمت کرنی چاہیے لقولہ تعالیٰ وصاحبھما فی الدنیا معروفا (الآیہ) اور اگر بے نماز مشرک ہیں تو نماز جنازہ نہیں پڑھنی چاہیے۔"[3]

---

[1] فتاویٰ ستاریہ، جلد اوّل، ص ۴

[2] ایضاً : ص ۸۷

[3] عبدالستار، مولوی : فتاویٰ ستاریہ، جلد سوم، ص ۳۸

سوال (۲۶۸) مشرک بدعتی کو سلام کرنا یا سلام کا جواب دینا ، میل جول رکھنا جائز ہے یا نہیں ، اگرچہ وہ کلمہ گو ہو۔

جواب : مشرکین مبتدعین کو سلام کرنا یا اُن سے اسلامی تعلقات و موالات قائم رکھنا شرعاً سخت معیوب و مذموم ہے۔ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو سلام کہلا بھیجا تو عبداللہ بن عمر صحابیِ رسول نے اُس کا جواب نہیں دیا...... پس حدیث ھٰذا سے اظہر من الشمس و ابین من الامس ہو گیا کہ مشرکین مبتدعین بد دین فساق و فجار کے ساتھ نشست و برخاست کرنا ، اُن کے ساتھ سلام و کلام کرنا اُن کے سلام کا جواب دینا معیوب و مذموم ہے۔ الخ"[1]

مسلمانانِ اہلسنت و جماعت یعنی سوادِ اعظم کے ساتھ غیر مقلد حضرات کا یہ سلوک کہ اُن سے سلام و کلام تک معیوب و مذموم لیکن انگریز کی دشمنِ اسلام حکومت کی چوکھٹ پر ناصیہ فرسائی اور گاندھی جیسے کھُلے مشرک ، ٹھیٹ بُت پرست کے سامنے سجدہ ریزی۔ آج اُن غیر مسلموں کے سامنے یہ فتوے کیوں دماغوں سے نکل گئے ؟ غیر مقلد حضرات کے ایسے فتوے سُنّی مسلمانوں کے خلاف ہونے چاہییں تھے یا نصاریٰ و ہنود کے متعلق ؟

وہابی خورد و نوش

جس طرح وہابی حضرات کے لیے ہر میدان بڑا وسیع اور اُس میں من مانی کی عام اجازت ہے ، اِسی طرح کھانے پینے کی چیزوں میں اِن حضرات کے ماکولات و مشروبات کی فہرست بھی کچھ نرالی اور تعجب خیز قسم کی ہے۔ پہلا پسندیدہ مشروب ملاحظہ ہو :

"سوال : اُونٹ کا پیشاب پینا مریض کے لیے حدیث میں ہے مگر بڑی مکروہ چیز ہے۔ کیسے جائز ہُوا ؟ ہندو لوگ عورت کو نفاس کی حالت میں گئے کا پیشاب پلاتے ہیں۔ کیا باعثِ اعتراض نہیں ہے ؟"[2]

---

[1] عبدالستار ، مولوی : فتاویٰ ستاریہ ، جلد دوم ، ص ۱۴

جواب: حدیث شریف میں بطور دوائی استعمال کرنا جائز آیا ہے، جس کو نفرت ہو وہ نہ پیئے، لیکن حلّت کا اعتقاد رکھے۔ ایسا ہی گائے بکری کے بول کے متعلق بھی آیا ہے: "لا بأس ببول ما یؤکل لحمہ"۔[1]

اب غیر مقلدین کے دوسرے مشروب مرغوب کا ذکر ہو جانا چاہیے جس کی نہریں تقریباً ہر گھر میں رواں ہیں۔ کسی صاحب کے سوال پر ان حضرات کے شیخ الکل میاں نذیر حسین دہلوی کا جواب ملاحظہ ہو:

سوال: ایک شخص زوجہ اپنی سے ہم خلوت تھا اور غلیان شہوت بوقت مجامعت کے زوجہ اپنی سے مساس کرتے ہوئے پستان منہ میں لے گیا اور زوجہ اس کی طفل یکسالہ کو دُودھ پلاتی تھی، اُس شخص کے حلق کے اندر ایک بار یا کہ دو بار دُودھ چلا گیا۔ آیا وہ شخص زوجہ اپنی کا فرزند رضاعی ہو گیا یا کہ شوہر رہا اور اِس فعل کے باعث سے زوجہ اُس کے نکاح میں داخل رہی یا کہ نہ رہی؟

سوال دیگر: یہ کہ مدت رضاعت کی آیا خورد سالی میں ہے یا کہ جوانی میں رہے گی اور عورت کا دودھ اگر کسی زخم میں یا کہ ذکر کے سوراخ میں یا کان میں بجہت کہنے طبیب کے ڈالا جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجرو۔

الجواب: وہ شخص اپنی زوجہ کے دودھ پینے کی وجہ سے اپنی زوجہ کا فرزند رضاعی نہیں ہو گیا بلکہ وہ علیٰ حالہٖ شوہر رہا اور اُس کی زوجہ اُس کے نکاح میں داخل رہی۔ اِس وجہ سے کہ مدت رضاعت میں دُودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت ہوتی ہے اور بعد مدت کے ثابت نہیں ہوتی اور مدت رضاعت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ڈھائی برس ہے صاحبین اور علما جمہور کے نزدیک دو برس ہے اور کسی زخم یا سوراخِ ذکر یا کان میں عورت کا دودھ ڈالنے سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ حررہ سید شریف حسین عفی عنہ۔ سید محمد نذیر حسین[2]

---

[1] ثناء اللہ امرت سری، مولوی: فتاویٰ ثنائیہ، جلد اول، ص ۵۵۵

[2] نذیر حسین دہلوی، مولوی: فتاویٰ نذیریہ، جلد دوم، ص ۳۹۶

غیر مقلد حضرات نے اِس مرحلے پر اپنی شانِ تحقیق سے ایک عجیب وغریب مسئلہ گھڑا اور عیاشی و نفس پرستی کی کتاب میں ایک نئے باب کا اضافہ کر کے بے راہ رو اور عیاش طبقے سے خراجِ تحسین حاصل کر لیا ہے۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ کوئی عورت کسی مرد کو دُودھ (اپنی پستان سے) پلا دے تو اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ اُس مرد کا دُودھ پلانے والی عورت کو اور اُس عورت کا دودھ پینے والے مرد کو دیکھنا جائز ہو جائے گا۔ ناشرِ غیر مقلدیت، نواب آف بھوپال جناب مولوی صدیق حسن خاں قنوجی صاحب رقمطراز ہیں:

"وَیَجُوْزُ اِرْضَاعُ الْکَبِیْرِ وَلَوْ کَانَ ذَا لِحْیَةٍ لِتَجْوِیْزِ النَّظَرِ۔" [1]

دوسرے ناشرِ غیر مقلدیت مولوی وحید الزمان خاں حیدر آبادی یوں لکھتے ہیں:

"وَیَجُوْزُ اِرْضَاعُ الْکَبِیْرِ وَلَوْ کَانَ ذَا لِحْیَةٍ لِتَجْوِیْزِ النَّظَرِ خِلَافاً لِلْجُمْهُوْرِ۔" [2]

یعنی بڑے آدمی کو دُودھ پلانا جائز ہے خواہ وہ داڑھی والا ہی کیوں نہ ہو اور یہ اس لیے ہے کہ اُس عورت کو دیکھنا جائز ہو جائے اگرچہ یہ نظریہ جمہور کے خلاف ہے۔

اب غیر مقلد حضرات کے خصوصی اور ناپسندیدہ ماکولات کا ذکر ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ مولوی عبدالستار دہلوی نے گوہ کی حِلّت کے بارے میں تحریر فرمایا ہے:

"ضب یعنی گوہ حلال ہے۔" [3]

موصوف نے اِسی تفسیر کی کتاب کے اِسی صفحے پر اپنی اس تحقیق سے بھی نوازا ہے:

"کچھوا حلال ہے۔" [4]

پسر نواب صاحب پر کسی گھوڑے نے دولتی جھاڑ دی ہو گی، لہٰذا یوں فتویٰ داغ دیا جاتا ہے:

---

[1] صدیق حسن خاں بھوپالی، مولوی: روضۃ الندیہ، ص ۲۳۶

[2] وحید الزماں خاں، مولوی: نزل الابرار، جلد دوم، ص ۷۷

[3] عبدالستار: تفسیر ستاری ضمیمہ د، ص ۴۲۶

[4] ایضاً: ص ۴۲۶

"گوشتِ اسپ حلال است۔"[۱]

مولوی عبدالستار صاحب سے بجّو کی حِلّت وحرمت کے بارے میں سوال ہُوا۔ موصوف نے متبعِ حدیث بن کر جو جواب مرحمت فرمایا وہ قارئین کے پیشِ خدمت ہے:

سوال (۲۷۷): ایک شخص بنام منشی کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بجّو کے متعلق فرمایا ہے کہ بجّو حلال ہے۔ جو شخص بجّو کا کھانا حلال نہ جانے، وُہ منافق بے دین ہے۔ اُس کی امامت ہرگز جائز نہیں۔ دوسرا شخص بنام محمّد کہتا ہے کہ بجّو کا کھانا حلال نہیں، ہاں شکار جائز ہے اور بجّو کے حلال نہ جاننے والے کو منافق و بے دین کہنا جائز نہیں بلکہ تشدد ہے۔ دونوں میں سے کس کا قول صحیح ہے؟ (سائل حاجی محمد صاحب بہاولپوری)

جواب: منشی کا قول صحیح ہے اور موافق حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ بجُّو گو طبعاً مکروہ ممنوع ہے مگر شرعاً ممنوع نہیں۔"[۲]

یہاں تک تو اُن حضرات کا ذکر ہے جن سے صرف ایک آدھ جانور ہی حلال ٹھہرایا جا سکا لیکن جب غیرمقلدین کے بقیۃ السلف وعمدۃ الخلف مولوی ثناء اللہ امرت سری کی باری آئی تو اُنھوں نے شیرِ پنجاب بن کر وُہ دلیری دکھائی کہ سانسی، گگرے، سپیرے اور چینی بھی ہاتھ ملتے رہ گئے۔ اُن کے جملہ ماکولات غیرمقلدین نے اپنے لیے حلال ٹھہرا لیے۔ اب موصوف کا وہ فتاویٰ ملاحظہ فرمائیے:

سوال: کچھوا، کوکرا اور گھونگا حرام ہیں یا حلال؟ از روئے قرآن و حدیث جواب ہو۔

جواب: قرآن وحدیث میں جو چیزیں حرام ہیں اُن میں یہ تینوں نہیں اور حدیث شریف میں آیا ہے ذرونی ماترکتم۔ جب تک شرع بند نہ کرے، تم سوال نہ کیا کرو۔

---

[۱] نورالحسن خاں: عرف الجادی، ص ۱۰

[۲] عبدالستار: فتاویٰ ستاریہ، جلد دوم، ص ۲۱

اِن تینوں سے شرعِ شریف نے بند نہیں کیا، لہٰذا حلال ہیں۔"[ل]

وہابی حضرات ذرا اُن اشیاء کی فہرست تو پیش کریں جن کو قرآن و حدیث نے حرام قرار دیا ہے۔ تاکہ ہم اُن کے حلال جانوروں کی فہرست میں بیش بہا اضافہ کر دیں۔ فہرست پیش کرنے پر غیر مقلد حضرات کو کتنی ہی اُن چیزوں کو حلال ماننا پڑے گا جو حلال ہرگز نہیں ہیں یا اُنھیں برملا اعتراف کرنا پڑے گا کہ قرآن و حدیث نے حلال و حرام کے بارے میں کچھ اور ہی ضابطہ مقرر فرمایا ہے جسے یہ نام نہاد محققین عوام الناس سے چھپاتے ہیں تاکہ شریعتِ محمدیہ کا ہر طرف سے اپریشن کرتے رہیں۔

غیر مقلدین کی ازدواجی بے ضابطگی

کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینا پروردگارِ عالم کا کام ہے یا اُس کی عطا سے حبیبِ خدا، خاتم الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کو حاصل تھا۔ اہلِ علم کا کام حلال کو حرام قرار دینا نہیں بلکہ اللہ و رسول (جل جلالہٗ و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کے احکامات کو بیان کرنا ہے۔ غیر مقلدین حضرات نہ صرف محقق بن کر ائمہ مجتہدین کے مقام پر سینہ زوری سے فائز ہونا چاہتے ہیں بلکہ اندرونِ خانہ اللہ اور رسول کا کام بھی خود ہی سنبھال کر حلال و حرام قرار دینے بیٹھ جاتے ہیں۔ مٹھوٹ کاریگر کی طرح اِس میدان میں بھی اِن حضرات نے اپنی تحقیق کے خوب ہی گُل کھلائے اور مضحکہ خیز فتوے داغے ہیں، چنانچہ نواب آف بھوپال، مولوی صدیق حسن خاں قنوجی کے فرزند مولوی نور الحسن خاں نے اپنے ہی نطفے کی لڑکی سے نکاح جائز قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

ونیست وجہ از برائے منع نکاح	اُس بیٹی سے ممانعتِ نکاح کی کوئی وجہ
بادختریکہ ایں کس با مادرش زنا	نہیں جس کی ماں سے اُس شخص نے زنا
کردہ زیرا کہ تحریم محارم محرمات	کیا ہو، کیونکہ محرمات کا ذی محرم کے لیے
بشرع است و شرع بتحریم بنت	حرام ہونا شرع سے ہے اور شریعت میں
شرعی آمدہ و ایں دختر بنت شرعی	شرعی بیٹی کی حرمت آئی ہے جبکہ مذکورہ لڑکی
نیست تا داخل باشد زیر قولہ	شرعی بیٹی نہیں ہے کہ حکمِ ربانی بیٹیاں تمھارے

[ل] ثناء اللہ امرتسری، مولوی؛ فتاویٰ ثنائیہ، جلد اوّل، ص ۵۵

تعالیٰ وَبَنَاتُکُمْ نتواں گفت کہ اسم بنت لاحق مخلوقہ بماءِ اوست زیراکہ ایں طوق اگر بشرع است پس باطل است واگر مراد آنست کہ غیر شرعی است پس مضر ما نیست چہ اگرچہ مخلوق از آب اوست لیکن ایں آب نہ آبے است کہ بداں طوق نسب ثابت شدہ بلکہ آبے است کہ صاحب اورا جز حجر حاصل دیگر نیست۔"[1]

لیے حرام ہیں کے حکم میں داخل ٹھہرے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ بیٹی کا نام اُس کے مخلوقہ پانی کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ (بیٹی کہنا) اگر اسے شرعی قرار دیں تو باطل ہے اور اگر اس سے مراد یہ ہے کہ (بیٹی ہونا) غیر شرعی ہے، تو یہ بات ہمارے لیے مضر نہیں ہے کیونکہ اگرچہ یہ لڑکی اُس کے نطفے سے پیدا ہُوئی ہے، لیکن یہ نطفہ وہ نطفہ نہیں ہے جس سے نسب ثابت ہو جائے بلکہ ایسا نطفہ ہے جس سے پتھر کے سوا اور کچھ حاصل نہیں۔

اب عالی جناب مولوی وحید الزمان خاں صاحب حیدر آبادی کی تحقیقِ انیق ملاحظہ ہو:

وَلَوْ زَنَا بِامْرَأَةٍ تَحِلُّ لَهُ اُمُّهَا وَبِنْتُهَا۔[2]

اور اگر کسی عورت سے زنا کیا تو اُس آدمی کے لیے مذکورہ عورت کی ماں اور بیٹی جائز ہے۔

یہی حیدر آبادی صاحب غیر مقلدین کے لیے مزید گنجایش یُوں پیدا فرماتے ہیں:

ولو جامع احد زوجة ابیه سواء کان بالغا او غیر بالغ صغیرًا او مراهقا لم تحرم علی ابیه لما قدمنا ان حرمة المصاهرة لا تثبت بالزنا[3]

اگر کسی نے اپنے باپ کی زوجہ سے مجامعت کی، خواہ وہ بالغ ہو یا نابالغ، چھوٹا ہو یا ہیجڑا۔ اُس کے باپ پر وہ عورت حرام نہیں ہوگی، جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں کہ زنا سے حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں ہوتی۔

---

[1] نور الحسن خاں، مولوی، عرف الجادی، ص ۱۰۹

[2] وحید الزمان خاں: نزل الابرار، ج ۲، ص ۲۱

[3] ایضاً: ص ۲۸

اب ذرا اسی تصویر کا رُخ ملاحظہ فرما کر اِن حضرات کی جرأت وجسارت کا اندازہ کیجیے کہ شریعتِ محمدیہ کو انگریز بہادر کے وظیفوں کی خاطر کس طرح بچے کے ہاتھ کا کھلونا بنایا ہوا تھا، چنانچہ لکھا ہے:

"وکذالک لو جامع زوجۃ ابنہ لا تحرم علی ابنہ"۔

اِسی طرح اگر کسی نے اپنے بیٹے کی زوجہ سے جماع کیا تو وہ عورت اُس کے بیٹے پر حرام نہیں ہوگی۔ [1]

وہابی مذہب کیا ہوا، عیاشی کے مفت پرمٹ تقسیم کرنے والوں کی منڈلی ہوگئی۔ اپنے نطفے کی لڑکی سے نکاح جائز، بہو سے زنا کیا تو وہ لڑکے پر حرام نہ ہُوئی، لڑکے نے باپ سے بدلہ لیا اور سوتیلی ماں سے زنا کیا تو وہ باپ پر حرام نہیں ہوئی، جس سے زنا کیا اُس کی ماں اور بیٹی سے نکاح حلال۔ سارے مزے وہابیوں کے گھر میں جمع ہوگئے۔ خیر یہ چھوٹے میاؤں کے فتوے تھے اِن پر بڑے میاں اور اُن کے شیخ الکل، مولوی نذیر حسین دہلوی کی مُہرِ تصدیق دکھا دی جائے تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔ سوال وجواب ملاحظہ فرمائیں:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اِس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے باغوائے نفسِ امّارہ ایک عورت سے زنا کیا۔ بعد اِس کے مزنیہ کی لڑکی سے نکاح کیا اور بعد نکاح کے بھی دونوں سے وطی کی، تو نکاح درست ہوا یا نہیں؟ برتقدیر عدم جواز صورت نباہ کی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: نکاح مذکور درست ہُوا، اِس لیے کہ یہ عورت اُن عورتوں میں سے نہیں جن سے نکاح حرام ہے۔" [2]

عیاشی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر چودھویں صدی کے محققین نے متعہ کی اباحت کا حکم بھی صادر فرمایا ہوا ہے تاکہ ضرورت مند حضرات مزے اڑائیں اور نرالے محققین کا شکریہ ادا کریں۔ چنانچہ لکھا ہے:

---

[1] وحید الزماں خاں: نزل الابرار، ج ۲، ص ۲۸

[2] نذیر حسین دہلوی: فتاویٰ نذیریہ، جلد دوم، ص ۱۷۶

وکذلک بعض اصحابنا فی نکاح المتعة فجوزوها لانه کان ثابتا جائزا فی الشریعة کما ذکره فی کتابه فما استمتعتم به منهن فاتوهن اجورهن قرأۃ ابی بن کعب و ابن مسعود فما استمتعتم به منهن الی اجل مسمی یدل صراحة علی اباحة المتعة فالاباحة قطعیة لکونه قد وقع الاجماع علیه والتحریم ظنی۔"[1]

اور اسی طرح ہمارے بعض اصحاب (وہابی علماء) نے نکاحِ متعہ کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ شریعت سے اس کا جائز ہونا ثابت ہے جیسا کہ قرآنِ کریم میں مذکور ہے فما استمتعتم بہٖ مِنهُنَّ فاتوهن اجورهن ابن ابی کعب اور عبداللہ بن مسعود کی قرأۃ فما استمتعتم به منهن الی اجل مسمی متعہ کی اباحت پر صراحۃً دلالت کرتی ہے۔ پس (متعہ کی) اباحت قطعی ہے کیونکہ اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے اور اس کی تحریم ظنی ہے۔

اِن محققین نے گھر کے اندر اور باہر عیاشی کے پرمٹ تقسیم فرما دیے۔ خالص زنا پر اباحت و جواز کی شرعی مُہریں لگا دیں۔ بعدہٗ خیال آیا ہوگا کہ بعض آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جو نہ گھر میں کسی سے زنا کر سکیں نہ متعہ کی استطاعت رکھتے ہوں، اُن کی سہولت کے پیشِ نظر مُشت زنی کو مباح بلکہ واجب تک قرار دے دیا گیا، تاکہ وہابی شریعت کی بہتی گنگا میں وہ بھی ہاتھ دھو لیں اور محروم نہ رہیں۔ چنانچہ سبق پڑھایا ہے:

بالجملہ استنزال منی بکف و بچیزے از جمادات نزد دعائے حاجت مباح است ولاسیما چوں فاعل خاشی از وقوع در فتنہ یا معصیت کہ اقل احوالش نظر بازیست

الغرض منی کا ہاتھ سے یا جمادات کی قسم سے کسی چیز کے ساتھ خارج کر دینا بوقتِ ضرورت مباح ہے، خاص طور پر جب فاعل کو فتنہ یا معصیت میں پڑنے کا خطرہ ہو، کہ اُس کی نگاہ نے اُسے مجبور کر دیا ہو

---

[1] وحید الزمان خاں: نزل الابرار، جلد دوم، ص ۳

باشد کہ دریں حین مندوب است	تو ایسے موقع پر (مشت زنی) مباح ہے
بلکہ گاہے واجب گردد۔ [1]	بلکہ کسی وقت واجب بھی ہو جاتی ہے۔

ع کیا خبر تھی کہ لے کر چراغِ مصطفوی
جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بُولہبی

موصوف نے اِسی کتاب میں دوسرے مقام پر اِس کارِ بد و لائقِ صد نفریں حرکت کو خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا سے عاری ہو کر صحابۂ کرام علیہم الرضوان کی جانب منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے:

بعض اہلِ علم نقل ایں استمناء	بعض اہلِ علم نے مشت زنی کو صحابہ سے
از صحابہ نزد غیبت از اہل خود	نقل کیا ہے کہ جب کوئی اپنے اہل و عیال سے
کردہ اند و در مثل ایں کار حرجے	دُور ہو تو اُس وقت اِس کام کے کرنے
نیست بلکہ ہمچو استخراج دیگر	میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ جسم کے دُوسرے
فضلات موذیہ بدن است۔ [2]	نقصان پہنچانے والے فضلات کی طرح
	خارج کرنا ضروری ہے۔

اگر غیر مسلم اِن حضرات کی تعلیمات کو دیکھیں تو جائے غور ہے کہ وُہ دینِ برحق کے بارے میں کیا رائے قایم کریں گے؟ کیا یہی ہیں وہ اسلامی تعلیمات جن کے متعلق اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ فرمایا گیا؟ کیا یہی ہیں وُہ اخلاقِ حسنہ جن کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے سرورِ کون و مکاں صلی اللہ علیہ وسلم کو صاحبِ خُلقِ عظیم بنا کر مبعوث فرمایا تھا؟ ہائے افسوس! اپنے ہاتھوں اپنے دین کی بیخ کنی۔ شاہین بچوں کو خاکبازی سکھانا اور عنادِل کو زاغ و بوم بنانا کس کا غمزۂ خونریز ہے؟ والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

غیر مقلدین کی الہام بازی

سیّد احمد بریلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) نے تو الہامات کے ڈھیر لگائے ہی تھے اور وحی و عصمت کے

---

[1] نور الحسن خاں: عرف الجادی، ج ۲، ص ۲۰

[2] ایضاً، ص ۲۰۷

دعوے کرتے ہوئے مہدیت کے دعوے تک ہی پہنچے تھے کہ یہ فتنہ ہمیشہ کے لیے بالاکوٹ میں دفن ہو کر رہ گیا۔ پٹھانوں کے خنجر نے مسلمانوں کی بروقت دستگیری کی اور برٹش گورنمنٹ کے ایسے خودکاشتہ پودے بیخ و بُن سے اُکھاڑ کر پھینک دیے گئے۔ جو بات سیّد احمد صاحب سے شروع ہو کر مرزا غلام احمد قادیانی کے ہاتھوں پُوری ہُوئی اُسی کی درمیانی کڑیاں مولوی محمد قاسم نانوتوی بانیِ مدرسہ دیوبند اور مولوی عبداللہ غزنوی غیر مقلد وغیرہ بھی ہیں۔ جب نبوّت کا دعویٰ کرنے کی غزنوی مولوی صاحب تیاریاں کر رہے تھے تو اُن کی جانب سے شب و روز الہامات کی بارش برسائی جا رہی تھی کہ مسلمان اُن کی رُوحانیت اور مقام و منصب کے قائل ہو کر معتقد بن جائیں، تاکہ بوقتِ دعویٰ کچھ تو اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا کہنے والے مل جائیں۔ اب الہامات سُنیے:

—— (۱) ——

جب میں الہام کو سمجھتا نہ تھا اور توحید سے بخوبی واقف نہ تھا، ایک بار اپنے دادا محمد شریف کی قبر کے پاس جو اُس دیار میں مرجع اور مقبولِ انام ہے، گیا تو القاء ہوا: لَآ اِلٰہَ غَیْرُکَ، لیکن اُس وقت میں نے غلطی کی اور میں نے خیال کیا کہ یہ وِرد مجھ کو وظیفہ کرنے کے لیے سکھایا گیا ہے۔ اب میں نے جان لیا کہ وہ اللہ کی طرف سے الہام تھا کہ میرے سوا دُوسروں کی طرف رجوع کرنا عبادات اور استعانت میں شرک ہے۔ اکیلے اللہ کی طرف پوری توجہ چاہیے۔ قبروں پر اِس نیت سے جانا کہ میرا فلاں مطلب حاصل ہو جائے توحید میں رخنہ ڈالنا ہے اور کلمۂ شہادت یعنی اشھد ان لا الٰہ الّا اللہ محمدٌ رسول اللہ کے معنی کے مخالف ہے۔"[1]

—— (۲) ——

بارہا مجھ کو الہام[2] ہوا ہے: یا عبدی ھٰذا کتابی وھٰذا عبادی فاقرء کتابی علی عبادی۔ یعنی اے میرے بندے! یہ میری کتاب ہے اور یہ میرے بندے ہیں، پس پڑھ میری کتاب میرے بندوں پر۔ اور یہ بھی الہام[3] ہوتا ہے: ولئن اتبعت اھواءھم بعد الذی جاءك من العلم مالك من اللہ من ولی ولا نصیر۔"[2]

---

[1] عبدالجبار غزنوی، مولوی: سوانح عمری عبداللہ غزنوی، ص ۳

[2] ایضاً: ص ۱۵

(۳)

سکندرپور کے باغ میں، جو ہزارہ کے علاقے میں ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے فجر کی نماز کے بعد یہ القاء[۴] ہوا: ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار۔ اور ظالم کی تعریف ان لفظوں سے معلوم کراتی[۵]: والظالمون ھم الذین یخالفون عن امر ربھم ثم لا یتوبون۔ یعنی ظالم وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارشادوں کی مخالفت کرتے ہیں اور باز نہیں آتے۔ اور جن لوگوں کی صحبت اختیار کرنی چاہیے اُن کو اِس مضمون کے ساتھ آگاہ کیا[۶]: واصبر نفسك مع الذین یدعون ربھم بالغداوۃ والعشی یریدون وجھہ۔ اور فرماتے تھے کہ الہام[۷] ہُوا: فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ ثم ان علینا بیانہ۔ یعنی جو کچھ الہام ہوتا ہے اُس کے لفظ یاد رکھ اور اُس کا بیان کرنا اور تفسیر ہمارا ذمہ ہے۔ اور فرماتے تھے الہام[۸] ہُوا: واما من خاف مقام ربہ (الآیۃ) یعنی وہ شخص کہ ڈرا اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے۔ اور یہ الہام[۹] ہوا کہ "ہمیشہ بدل خود مطالعہ کردہ باشش مبادہ کدورتے از ما سوا بنشیند"۔ یعنی ہمیشہ اپنے دل میں جھانکتے رہو، ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کدورت بیٹھ جاوے۔

اور شہر دہلی میں یہ الہام[۱۰] ہوا: ولا تمدن عینیك الی ما متعنا بہ ازواجا منھم زھرۃ الحیوۃ الدنیا۔ اور مت پھیلا اپنی آنکھیں طرف اُن کی کہ فائدہ دیا ہم نے ساتھ اُس کے بھانت بھانت لوگوں کو زندگانی دنیا کی تازگی سے۔ اور باغ سکندریہ میں یہ الہام[۱۱] ہُوا: قل لازواجك واولادك واتباعك قوموا للہ قانتین۔ یعنی کہہ دے اپنی بیبیوں اور اولاد اور تابعداروں کو کہ کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لیے تابعدار ہو کر۔ اور اِس کے اخیر میں یہ الہام[۱۲] ہوا: اناجیبك وانیسك فلا تحزن۔ یعنی میں تیرا مددگار ہوں! تو غم نہ کھا اور یہ بھی الہام[۱۳] ہوا: ما اودعت فی قلبك فان رؤیا المؤمن جزء من ستۃ اربعین جزاء من النبوۃ۔ یعنی جو تدبر اور تفکر قرآن کا تیرے دل میں ہم نے ڈال دیا ہے اُس کو مت بھول کیونکہ مومن کا خواب ایک حصہ ہے نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے۔

اور فرماتے تھے دہلی میں یہ الہام[۱۴] ہوا: ولا تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا

واتبع هواه وکان امره فرطا۔ اور فرمانبرداری نہ کر اُس شخص کی جو غافل کیا ہم نے اُس کے دل کو اپنی یاد سے اور پیچھے پڑا اپنی خواہش کے اور ہے کام اُس کا حد سے بڑھا ہوا۔ یعنی غافلوں کی غفلت میں پیروی نہ کر۔ اور یہ بھی القاء[۱۵] ہوا: کن فی الناس کاحد من الناس۔ یعنی ہو تو لوگوں میں جیسے دوسرے لوگ ہیں۔ اور القاء[۱۶] ہوا: اگر وقتے غفلت شد تدارک آں وقت دیگر لازم است۔ یعنی کسی وقت غفلت ہو جاوے تو دُوسرے وقت میں اُس کا تدارک لازم ہے۔"[۱]

(۴)

فرماتے تھے، تین بار الہام[۱۷] ہوا: وللّٰہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا۔ اور واسطے اللّٰہ کے ہے اوپر لوگوں کے حج کرنا بیت اللّٰہ کا جو طاقت رکھے طرف اُس کی راہ کی۔ اور فرماتے تھے، الہام[۱۸] ہوا: ولسوف یعطیك ربّك فترضٰی۔ یعنی اور البتّہ جلدی دے گا تجھ کو رب تیرا پھر تُو خوش ہو جاوے گا۔ اور فرماتے تھے، الہام[۱۹] ہوا: الم نشرح لك صدرك۔ یعنی کیا نہیں کھولا ہم نے سینہ تیرا؟۔[۲]

(۵)

جنگل کی کسی غار میں اکیلے جا کر چھُپ: گئے اور کچھ مدّت پوشیدہ رہے۔ اُن دنوں میں یہ الہام[۲۰] ہُوا: فقطع دابر القوم الذین ظلموا فالحمد للّٰہ رب العٰلمین۔"[۳]

(۶)

مولوی عبدالرحمٰن بن شیخ محمد بارک اللّٰہ (لکھوی) کہ وقت کے عالموں سے مشہور عالم ہیں اور زہد اور تقوٰی اور صلاحیت میں اپنے زمانے کے امام، آپ (مولوی عبداللّٰہ غزنوی) کی صحبت بابرکت سے فیض حاصل کرنے کے لیے ملک پنجاب سے سفر کر کے ملک غزنی تک، جو دو ماہ کی مسافت ہے گئے، راستے میں جو اُنھوں نے مخالفوں سے کچھ کلمات آنجناب

---

[۱] عبدالجبار غزنوی، مولوی: سوانح عمری عبداللّٰہ غزنوی، ص ۳۵، ۳۶

[۲] ایضاً: ص ۳۶

[۳] ایضاً: ص ۱۴

(غزنوی صاحب) کی نسبت سُننے تو حیران ہوئے۔ اُسی رات اُن کو یہ الہام[۲۰] ہوا: فورب السماء والارض انه لحق مثل ما انکم تنطقون۔ دوسری بار یہ الہام[۲۱] ہوا: وانه لمن المصطفین الاخیار۔ تیسری بار یہ الہام[۲۲] ہُوا: ان ھو الا عبد انعمنا علیه۔" [۱]

قارئین کرام! یہ ہم نے غیر مقلدوں کے مولوی عبداللہ غزنوی کے چھ عنوانات کے تحت صرف بائیس[۲۲] الہام پیش کیے ہیں جن میں سے تین الہام مولوی عبدالرحمٰن لکھوی کے بھی ہیں۔ مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور اُن کے دین وایمان پر دن دہاڑے ڈاکہ ڈالنے کی خاطر جو یہ پُراسرار جال بچھایا تھا اُس کا شیطانی ہونا خود واضح ہے جس کے لیے کسی خارجی دلیل کی چنداں ضرورت نہیں۔ اللہ جل مجدہٗ پر اہتمام کے ساتھ افتراء پردازی، کلامِ الٰہی کے ساتھ قدم قدم پر مذاق، نبی آخرالزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے برابری کہ وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی اور اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کو اپنے اُوپر چسپاں کرنا، حالانکہ پوری کائناتِ ارضی وسماوی میں ایسی ذات صرف فخرِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہے جس کی رضا پروردگارِ عالم کو مطلوب ہے ورنہ اور سب رضائے الٰہی کے طالب ہیں۔ یہ کس درجہ ستم ظریفی ہے کہ سرورِ کون ومکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مدِ مقابل کسی مولوی مُلّاں کو تسلیم کر لیا جائے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ دین وایمان سے اِس درجہ بغاوت کرنے والے حضرات کو بزرگ اور صاحبِ کشف وکرامت تسلیم کر کے بزرگ منوانے کی مہم چلائی جاتی ہے۔

غیر مقلد حضرات کی قرآن وحدیث میں تحریفات، ائمۂ دین پر بہتانات اور سہل پسندی کے تحت مسائل کی خانہ ساز ایجادات کے بارے میں مشعلِ راہ جلد دوم کا انتظار فرمایئے۔ وہاں بفضلہٖ تعالیٰ مبرہن کر دکھایا ہے کہ مجدد مائتہ حاضرہ امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہٗ نے ان حضرات کی تخریب کاری کا کس طرح محاسبہ کر کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دکھایا تھا۔ تفصیل سے بچنے کی خاطر ہم نے یہاں اُن مسائل کا ذکر نہیں کیا جو غیر مقلدین حضرات نے شریعت سازی کے تحت اختلافی بنا کر رکھ دیے ہیں۔ ہاں مشعلِ راہ جلد دوم میں ایسے بعض مسائل کا تفصیلی ذکر آئے گا، انشاء اللہ تعالیٰ۔ بات مولوی عبداللہ غزنوی

---

[۱] عبدالجبار: سوانحِ عمری عبداللہ غزنوی، ص ۹

کے الہامات کی ہو رہی تھی۔ ذرا موصوف کے سوانح نگار مولوی عبدالجبار غزنوی کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

> ”جو الہام اور خوابیں آپ کو کتاب و سنّت پر ثابت رہنے اور خلق اللہ کو کتاب و سنت کی طرف بلانے اور تقویٰ اور توکّل اور صبر اور خشیت اور زہد و قناعت و ترک ماسوی اللہ اور انابت اور آپ کے مقامِ امانت میں پہنچنے اور آپ کی حفظ اور نصرت اور مغفرت کے وعدہ پر ہوتے ہیں، وہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں تک پہنچتے ہیں۔ اُن کے جمع کے لیے ایک بڑی کتاب چاہیے۔“ [1]

یہ صرف ایک مولوی صاحب کی بات ہے۔ اسے صرف نمونہ سمجھنا چاہیے کیونکہ اگر ہم دوسرے غیر مقلد مولویوں کے الہامات اور کشف و کرامت پر مبنی بیانات لکھنے شروع کر دیں تو یقیناً ہمیں بھی یہی کہنا پڑے گا کہ اُنھیں بیان کرنے کے لیے علیحدہ ایک بڑی سی کتاب چاہیے۔ بہرحال ماقل و کفٰی خیر مما کثر و الھٰی۔ اللہ تعالیٰ ابنائے زمانہ کو سچی ہدایت نصیب فرمائے۔ آمین

۳۔ دیوبندی جماعت کی تخریب کاری

جب وہابیہ کی اوّلین جماعت، جس نے محمدی گروہ سے اہلحدیث تک کے اپنے اُوپر لیبل لگائے وہ مسلمانوں میں ذرا بھی مقبولیت حاصل نہ کر سکی اور برٹش گورنمنٹ کا خوابِ افتراق بین المسلمین شرمندۂ تعبیر ہونے سے مجبور ہو کر رہ گیا تو حکومت نے کتابِ وہابیت کا دوسرا ایڈیشن شایع کیا، جو آج دیوبندیت کے نام سے متعارف اور اہلِ حق کے لیے مکمل دردِ سر کا باعث ہو کر رہ گیا ہے۔

غیر مقلد حضرات چونکہ اپنے بعض مخصوص افعال یعنی آمین بالجہر، سینے پر ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنا، رفعِ یدین کرنا اور آٹھ تراویح ایک وتر وغیرہ کے باعث پہچان لیے جاتے تھے اور ایک جاہل مسلمان بھی اِن کے پھندے میں نہیں پھنستا تھا۔ نہ مسلمانوں نے اِس

---

[1] عبدالجبار، مولوی: سوانح عمری عبداللہ غزنوی، ص ۲۰

نام کی کوئی جماعت دیکھی یا سُنی تھی اور نہ یہ افعال اِس طرح اُن کے مشاہدے یا علم میں آئے تھے اِس لیے وہ چند سرپھرے مبتدعین کی کوئی بات سُننا گوارا ہی نہیں کرتے تھے۔ اِس رکاوٹ کو دور کرنے کی خاطر وہابیوں کی دوسری جماعت ایسی تیار کی جو پُراسرار طریقے پر وہابیت کی نشر واشاعت کرے۔ دیوبندی حضرات نے منافقت اور عیاری کی انتہا کرتے ہوئے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ یہ حضرات دعویٰ سُنّی حنفی ہونے کا کرتے ہیں، پیری مریدی تک کا ڈھونگ رچاتے ہیں لیکن کام سارا وہابیت کا کرتے ہیں۔ یہ خوشنما لیبل محض اس غرض سے لگاتے ہیں کہ مسلمانانِ اہلسنت وجماعت انھیں وہابی شمار نہ کریں بلکہ سُنّی حنفی جان کر برضا ورغبت اِن کے جال میں پھنستے چلے جائیں۔ جال بھی اِن حضرات کے پاس ایسے خوشنما ہیں جو تالیفِ قلوب کے سازوسامان سے پوری طرح آراستہ وپیراستہ ہیں۔ اب اِن حضرات کی چند خصوصیات پیش کی جاتی ہیں، وباللہ التوفیق۔

اسمٰعیل پرستی

یہ جماعت بھی اہلحدیث اور دیگر وہابی حضرات کی طرح مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کو منصبِ الوہیت پر فائز کیے ہوئے ہے، جو قرآنِ کریم کی اصطلاح میں اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ بنانا کہلاتا ہے۔ دیوبندی حضرات بھی قرآن وحدیث کے مفہوم ومطالب میں تبدیلی کر لیں گے لیکن مولوی اسمٰعیل دہلوی کی کسی گندی سے گندی بات کو غلط تسلیم کر لیں، یہ اِن حضرات سے بہت بعید ہے۔ عملاً اِن حضرات کے نزدیک دین کا اولین ماخذ رسوائے زمانہ تصنیف یعنی تقویۃ الایمان ہے۔ اِس کتاب کے پیش کردہ غیر اسلامی عقاید، غلط مسائل اور مقربینِ بارگاہِ الٰہیہ کی شان میں جاری کیے ہوئے بیہودہ کلمات ومغلظات کو غلط مان لینا دیگر وہابیہ کی طرح اِن حضرات کے بس سے باہر ہے۔ دیوبندی حضرات بھی قرآن وحدیث کی کسوٹی پہ تقویۃ الایمان کو پرکھنے کی ہرگز اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے، ہاں تقویۃ الایمانی مندرجات کی صحت ثابت کرنے کی غرض سے آیات واحادیث کو کھینچ تان کر اِس کی تائید وحمایت میں پیش کرنے کی جسارت ضرور کرتے رہتے ہیں۔

تقویۃ الایمان کو اسلام کا نچوڑ ثابت کرنے کی خاطر آیات واحادیث میں معنوی تحریف کرنا دیوبندیوں کے نزدیک قطعاً جُرم نہیں، گناہ نہیں، ہاں اِس بات کو ضرور اپنے ساختہ دین و

کو ہدایت کرنے والے تھے اور تمام عمر اِسی حالت میں رہے آخر کار فی سبیل اللہ جہاد میں کفار کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔ پس جس کا ظاہر حال ایسا ہو وہ ولی اللہ اور شہید ہے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے: ان اولیاءہ الا المتقون اور کتاب تقویۃ الایمان نہایت عمدہ کتاب ہے اور ردِ شرک و بدعت میں لاجواب ہے۔ استدلال اِس کے بالکل کتاب اللہ اور احادیث سے ہیں۔ اُس کا رکھنا اور پڑھنا اور عمل کرنا عین اسلام ہے اور موجب اجر کا ہے۔ اِس کے رکھنے کو جو بُرا کہتا ہے وہ فاسق اور بدعتی ہے۔ اگر اپنے جہل سے کوئی اِس کتاب کی خوبی نہ سمجھے تو اُس کا قصور فہم ہے کتاب اور مؤلفِ کتاب کی کیا تقصیر؛ بڑے بڑے عالمِ اہلِ حق اِس کو پسند کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر کسی گمراہ نے اُس کو بُرا کہا تو وہ خود ضال و مضل ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ الراجی رحمۃ ربہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ [1]

(۵)

جواب: بندہ کے نزدیک سب مسائل اُس (تقویۃ الایمان) کے صحیح ہیں اگرچہ بعض مسائل میں بظاہر تشدد ہے اور توبہ کرنا اُن کا بعض مسائل سے محض افتراء اہلِ بدعت کا ہے اور اگر اُن کو بزرگ نہ جانے، جھوٹے حالات اُن کے سُن کر، تو معذور ہے اور اگر کتاب کے خلاف عقیدہ رکھتا ہے تو وہ مبتدع فاسق ہے اور وہ فرماتے تھے کہ جب تک حدیث صحیح غیر منسوخ ملے، اُس پر عامل ہوں ورنہ ابُوحنیفہ کی رائے کا مقلد ہوں اور سید صاحب کا بھی یہی مشرب تھا اور محمد بن عبدالوہاب کے عقاید کا مجھ کو مفصل حال معلوم نہیں اور نہ خلفاء سید صاحب کا۔ اور مولوی اسمٰعیل صاحب وعظ و ردِ بدعت میں مصروف رہے پھر جہاد میں جا کر شہید ہو گئے۔ سلسلہ بیعت کا کہاں جاری کرتے اور تمام تقویۃ الایمان پر عمل کرے۔ فقط

رشید احمد گنگوہی عفی عنہ [2]

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور تقویۃ الایمان کے بارے میں دیوبندی جماعت کے

---

[1] رشید احمد گنگوہی، مولوی: فتاویٰ رشیدیہ مبوب، ص ۴۱

[2] ایضاً: ص ۴۴

سرخیل وسنگِ بنیاد رکھنے والے مولوی رشید احمد گنگوہی کے خیالات فتاویٰ رشیدیہ سے بغیر کسی تنقید وتبصرہ کے پیش کر دیے ہیں۔ طوالت کے خوف سے دیگر اکابر دیوبند کے اِس بارے میں خیالات پیش کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ لہٰذا اِن پر ہی اکتفا کرتا ہُوں۔

امکانِ کذب

یہ خبیث عقیدہ جو کبھی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے گھڑا اور اپنے رسالہ یکروزی کے ذریعے مشتہر کیا تھا اور جو پُوری شریعتِ مطہرہ کو باطل ٹھہرانے کے لیے کافی ہے، ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے اندر دفن ہو گیا تھا۔ غیر مقلد حضرات نے اِس باطل نظریہ سے دامن چھڑانے کی کوشش کی اور اپنی تصانیف میں اس کی جانب سے خاموشی برتی۔ اٹھاون سال بعد مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب نے اِس مُردے کو دوبارہ زندہ کیا اور ہزار ردّ و تردید کے باوجود جیتے جی اِسے مرنے نہ دیا۔ شاید مولوی محمود حسن دیوبندی کے اِس شعر: ؎

مُردوں کو زندہ کیا، زندوں کو مرنے نہ دیا
اِس مسیحائی کو دیکھیں ذری ابنِ مریم

کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ ۱۳۰۴ھ میں براہینِ قاطعہ کے اندر دوبارہ یہ مسئلہ چہل قدمی کرتا ہوا نظر آیا، جسے اپنے شاگرد مولوی خلیل احمد انبیٹھوی کے نام سے شائع کروایا تھا۔ چنانچہ اُس میں لکھا ہے:

”امکانِ کذب کا مسئلہ تو اب جدید کسی نے نہیں نکالا بلکہ قدما میں اختلاف ہوا ہے کہ خلفِ وعید آیا جائز ہے کہ نہیں۔“[1]

اگلے صفحے پر موصوف نے اِسی بات کو یُوں دُہرایا ہے:

”امکانِ کذب کہ خلفِ وعید کی فرع ہے جو قدماء میں مختلف فیہ ہو چکا ہے۔“[2]

مشعلِ راہ کی جلد دوم میں اِن شاء اللہ تعالیٰ اِس مسئلے پر مفصل بحث ہوگی، اِس لیے ہم یہاں کسی قسم کی تنقید و تبصرہ کرنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ وہاں واضح کیا جائے گا کہ دیوبندی

---

[1] خلیل احمد انبیٹھوی، مولوی: براہینِ قاطعہ، مطبوعہ دیوبند، ص ۶

[2] ایضاً: ص ۷

حضرات وقوعِ کذب تک کے قائل ہیں۔

انکارِ ختمِ نبوت

سید احمد صاحب دعوائے نبوت کی تیاریاں کر رہے تھے لیکن مہدیت کے دعوے تک ہی پہنچے تھے کہ پٹھانوں کے خنجروں نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ اُن کے بعد دار العلوم دیوبند کے بانی مولوی محمد قاسم نانوتوی کو تیار کیا گیا۔ موصوف نے تحذیر الناس کتاب لکھ کر عقیدۂ ختمِ نبوت پر تیشہ زنی کی اور خاتمیت مرتبی کے نام سے تقریباً تیرہ صدیوں کے بعد ایک خاتمیت گھڑی جس کے سننے سے مسلمانوں کے کان نا آشنا رہے تھے۔ یہ تھا دعوائے نبوت کے لیے چور دروازہ تیار کرنا، لیکن عمر نے وفا نہ کی اور کتاب کے منظرِ عام پر آنے کے چند سال بعد راہیِ ملکِ عدم ہو گئے اور موصوف کا کھولا ہوا دروازہ مرزا غلام احمد قادیانی کے کام آیا۔ اب ملاحظہ ہو کہ نانوتوی صاحب نے اُس عقیدۂ ختمِ نبوت کو، جس کی تشریح خود نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ کے لفظوں میں فرمائی تھی، اِسی خاتمیت کو موصوف نے بے وقوفوں کا خیال اور خلافِ قرآن بتایا ہے، چنانچہ لکھا ہے:

"عوام کے خیال میں تو رسول اللہ کا خاتم ہونا بایں معنی ہے کہ آپ کا زمانہ انبیائے سابق کے زمانہ کے بعد اور آپ سب میں آخری نبی ہیں، مگر اہلِ فہم پر روشن ہوگا کہ تقدم یا تاخر زمانے میں بالذات کچھ فضیلت نہیں۔ پھر مقامِ مدح میں وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ فرمانا اِس صورت میں کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر اِس وصف کو اوصافِ مدح میں سے نہ کہیے اور اِس مقام کو مقامِ مدح نہ قرار دیجیے تو البتہ خاتمیت باعتبار تاخرِ زمانی صحیح ہو سکتی ہے، مگر میں جانتا ہوں کہ اہلِ اسلام میں سے کسی کو یہ بات گوارا نہ ہوگی کہ اِس[۱] میں ایک تو خدا کی جانب نعوذ باللہ زیادہ گوئی کا وہم ہے۔ آخر اِس وصف میں اور قد و قامت و شکل و رنگ و حسب و نسب و سکونت وغیرہ اوصاف میں جن کو نبوت یا اور فضائل میں کچھ دخل نہیں، کیا فرق ہے، جو اِس کو ذکر کیا اوروں کو ذکر نہ کیا؟ دوسرے[۲] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب نقصانِ قدر کا احتمال، کیونکہ اہلِ کمال کے کمالات ذکر کیا کرتے ہیں اور ایسے ویسے لوگوں کے اِس قسم کے احوال

بیان کیا کرتے ہیں۔ اعتبار نہ ہو تو تاریخوں کو دیکھ لیجیے۔ باقی یہ احتمال کہ یہ دین آخری دین تھا، اس لیے سدِ باب اتباع مدعیانِ نبوت کیا ہے جو کل جھوٹے دعوی کر کے خلایق کو گمراہ کریں گے، البتہ فی حدِ ذاتہٖ قابلِ لحاظ ہے پر جملہ ما کان محمد ابا احد من رجالکم اور جملہ ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین میں کیا تناسب تھا جو ایک کو دوسرے پر عطف کیا اور ایک مستدرک منہ اور دوسرے کو استدراک قرار دیا اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی بے ربطی اور بے ارتباطی خدا کے کلام معجز نظام میں متصور نہیں۔ اگر سدِ باب مذکور ہی منظور تھا تو اس کے لیے اور بیسیوں موقعے تھے۔"[1]

اب اس سے آگے موصوف یوں اپنے اظہارِ مدعا کی جانب پیش قدمی کرتے ہیں:

"تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ موصوف بالعرض کا قصہ موصوف بالذات پر ختم ہو جاتا ہے۔"[2]

اسی بات کو نانوتوی صاحب نے ذرا یوں کھل کر بیان کر دیا ہے:

"آپ موصوف بوصفِ نبوت بالذات ہیں اور سوا آپ کے اور نبی موصوف بوصفِ نبوت بالعرض۔ اوروں کی نبوت آپ کا فیض ہے پر آپ کی نبوت کسی اور کا فیض نہیں۔ آپ پر سلسلۂ نبوت مختتم ہو جاتا ہے۔"[3]

اب اس بات کو بالذات و بالعرض سے علیحدہ ہو کر خاتمیت مرتبی و خاتمیت زمانی کی اصطلاحوں میں دیکھیے اور نانوتوی صاحب کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ موصوف نے لکھا ہے:

"ہاں اگر بطور اطلاق یا عموم مجاز اس خاتمیت کو زمانی اور مرتبی سے عام لے لیجیے تو پھر دونوں طرح کا ختم مراد ہو گا پر ایک مراد ہو تو شایانِ شانِ محمدی صلعم خاتمیت مرتبی ہے نہ زمانی۔"[4]

---

[1] محمد قاسم نانوتوی، مولوی: تحذیر الناس، مطبوعہ لاہور، ص ۳

[2] ایضاً: ص ۴

[3] ایضاً: ص ۴

[4] ایضاً: ص ۹

اور موصوف کی زبانی اُن کی گھڑی ہوئی خاتمیت مرتبی کا فائدہ بھی سُن لیجئے۔ اُنھوں نے لکھا ہے:

”غرض اختتام اگر بایں معنی تجویز کیا جاتے جو میں نے عرض کیا تو آپ کا خاتم ہونا انبیاء گزشتہ ہی کی نسبت خاص نہ ہوگا بلکہ اگر بالفرض آپ کے زمانے میں بھی کہیں اور کوئی نبی ہو جب بھی آپ کا خاتم ہونا بدستور باقی رہتا ہے۔“[1]

خاتمیت مرتبی کا نانوتوی صاحب نے دوسرا فائدہ یہ بتایا ہے:

”ہاں اگر خاتمیت بمعنی اتصاف ذاتی بوصفِ نبوت لیجیے جیسا کہ اِس ہیچمدان نے عرض کیا ہے تو پھر سواء رسول اللہ صلعم اور کسی کو افراد مقصود بالخلق میں سے مماثل نبوی صلعم نہیں کہہ سکتے بلکہ اِس صورت میں فقط انبیاء کی افرادِ خارجی ہی پر آپ کی افضلیت ثابت نہ ہوگی افرادِ مقدرہ پر بھی آپ کی افضلیت ثابت ہو جائے گی، بلکہ اگر بالفرض بعد زمانہ نبوی صلعم بھی کوئی نبی پیدا ہو تو پھر بھی خاتمیت محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا، چہ جائیکہ آپ کے معاصر کسی اور زمین میں یا فرض کیجیے اِسی زمین میں کوئی اور نبی تجویز کیا جائے۔“[2]

اگر کوئی کہے کہ اللہ و رسول نے تو خاتمیت سے مراد خاتمیت زمانی بتائی تھی، اُمتِ محمدیہ نے یہی سمجھی اور آنے والوں کو تیرہ سو سال تک سمجھائی تھی۔ نانوتوی صاحب! آپ اُس خاتمیت زمانی کا تو انکار بلکہ بیخ کنی کر رہے ہیں اور اُس کی جگہ ایک خانہ ساز خاتمیت پیش کر رہے ہیں، جس کو خاتمیت مرتبی کا نام دیا ہے۔ کیا یہ بزرگوں کی توہین نہیں کہ اُنھیں ایسے ضروری عقیدہ سے جاہل ٹھہرایا جا رہا ہے ورنہ بصورتِ دیگر آپ دین میں ایک نیا عقیدہ پوری اُمتِ محمدیہ کے خلاف داخل کر کے مداخلت فی الدین کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اِس سلسلے میں نانوتوی صاحب کا جواب ملاحظہ ہو:

”باقی رہی یہ بات کہ بڑوں کی تاویل کو نہ مانیے تو اُن کی تحقیر نعوذ باللہ لازم آئیگی،

---

[1] محمد قاسم نانوتوی، مولوی: تحذیر الناس، ص ۱۵

[2] ایضاً: ص ۳۲

یہ انھیں لوگوں کے خیال میں آسکتی ہے جو بڑوں کی بات فقط از راہِ بے ادبی نہیں مانا کرتے۔ ایسے لوگ اگر ایسا سمجھیں تو بجا ہے۔ المرء یقیس علیٰ نفسہ۔ اپنا یہ وطیرہ نہیں۔ نقصانِ شان اور چیز ہے اور خطا و نسیان اور چیز۔ اگر بوجہ کم التفاتی بڑوں کا فہم کسی مضمون تک نہ پہنچا تو اُن کی شان میں کیا نقصان آگیا؟ اور کسی طفلِ ناداں نے کوئی ٹھکانے کی بات کہہ دی تو کیا اتنی بات سے وہ عظیم الشان ہو گیا؟ ؎

گاہ باشد کہ کودکِ ناداں
بغلط بر ہدف زند تیرے“ [1]

ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ بانیِ دارالعلوم دیوبند ہی نے عقیدۂ ختمِ نبوت پر تیشہ زنی کی لیکن دیوبندی حضرات کے نزدیک اِس سے نانوتوی صاحب کی بزرگی میں بال برابر فرق نہ آیا۔ اِس کرتُوت پر پردہ ڈالنے بلکہ بے خبر مسلمانوں کو دھوکے میں رکھنے کی خاطر عقیدۂ ختمِ نبوت کے تحفظ میں علمائے دیوبند شروع ہی سے علمائے اہلسنّت سے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، حالانکہ حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھایا جائے تو صاف نظر آنے لگے کہ: ع

قائدِ مرزا انھیں کا صاحبِ تحذیر ہے

تنقیصِ رسالت کی ناقابلِ فہم جسارت

مولوی خلیل احمد انبیٹھوی نے اپنی رسوائے زمانہ کتاب براہین قاطعہ میں فخرِ دو عالم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے محیط زمین کے حصولِ علم سے انکار کرتے ہُوئے صاف لکھ دیا:

”الحاصل غور کرنا چاہیے کہ شیطان و ملک الموت کا حال دیکھ کر علم محیط زمین کا فخرِ عالم کو خلافِ نصوص قطعیہ کے بلا دلیل محض قیاس فاسدہ سے ثابت کرنا شرک نہیں تو کون سا ایمان کا حصہ ہے۔ شیطان و ملک الموت کو یہ وسعت

---

[1] محمد قاسم نانوتوی، مولوی: تحذیر الناس، ص ۳۴

نص سے ثابت ہوئی، فخرِ عالم کی وُسعتِ علم کی کون سی نص قطعی ہے کہ تمام نصوص کو رد کر کے ایک شرک ثابت کرتا ہے"۔[1]

انبٹھوی صاحب نے جب علم محیط زمین مخلوق میں سے شیطان و ملک الموت کے لیے تسلیم کر لیا اور وُہ بھی نصوص سے، تو ثابت ہُوا کہ یہ ایسا علم ہے جو مخلوق کو حاصل ہو سکتا ہے اور باری تعالیٰ کے ساتھ خاص نہیں۔ اِس حقیقت کے پیشِ نظر مذکورہ عبارت کے بارے میں چند سوال ذہن میں اُبھرتے ہیں:

۱۔ فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے محیط زمین کے علم کا حصول شرک ٹھہرانا جو خاصۂ باری تعالیٰ بھی نہیں، ایسی جسارت کا باعث شانِ رسالت سے بغض و عداوت کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

۲۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وسعتِ علم پر تو قرآن و حدیث کی سیکڑوں نصوص شاہد لیکن گنگوہی و انبٹھوی صاحبان پُوچھتے ہیں کہ: کون سی نص قطعی ہے۔ کہیں یہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ والا معاملہ ہی تو نہیں ہے۔

۳۔ جب اِس علم کا حصول فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک کے لیے ثابت کرنا شرک ہے تو شیطان و ملک الموت کے لیے ثابت ماننا کیوں شرک نہ ہُوا؟ کیا اِن دونوں کو خدا کا شریک بنانا جائز ہے؟

۴۔ جس علم کا مخلوق کے لیے اثبات شرک ہے، وُہ قرآن و حدیث نے شیطان و ملک الموت کے لیے ثابت کر کے خود شرک کی تعلیم دی یا نہیں؟

عداوت و محبت کا رنگ اپنی اپنی جگہ نرالا ہوتا ہے۔ جس طرح محبت کبھی محبوب کی خرابی سامنے نہیں آنے دیتی اِسی طرح عداوت خوبیوں کو نگاہوں سے اوجھل رکھتی ہے۔ گنگوہی و انبٹھوی صاحبان حقیقت میں سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عداوت میں اِتنے

---

[1] خلیل احمد انبٹھوی، مولوی: براہینِ قاطعہ، ص ۵۵

پختہ کار ہو چکے تھے کہ اوّلین و آخرین کے علوم کی جامع ہستی کا علم اِن صاحبان کو نہ شیطان کے برابر نظر آتا تھا، نہ ملک الموت کے برابر، بلکہ ایک اُمتی کے برابر بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ موصوف کے اُسی زہر آلود و ایمان سوز قلم نے یہ بھی لکھا ہوا ہے:

”اِن اولیاء کو حق تعالیٰ نے کشف کر دیا کہ اُن کو یہ حضورِ علم حاصل ہو گیا۔ اگر اپنے فخرِ عالم علیہ السلام کو بھی لاکھ گونہ اِس سے زیادہ عطا فرماوے ممکن ہے، مگر ثبوت فعلی اِس کا کہ عطا کیا ہے، کس نص سے ہے کہ اِس پر عقیدہ کیا جائے؟“[1]

بھلا عقل کی اس نارسائی، بخت کی تیرگی اور نورِ ایمان سے محرومی کا رونا کہاں تک رویا جائے کہ جس سرکار کے غلاموں کے لیے بذریعہ کشف اِس علم کا حصول خود تسلیم کر لیا، اُسی آقائے کائنات کے بارے میں اندر اور باہر کی سب آنکھیں بند ہو گئیں، قلم کی روشنائی اور زبان کی قوتِ گویائی وہی غلاموں خادموں جیسا علم تسلیم کرنے سے جواب دے گئی اور اِس پر عقیدہ قایم کرنے کے لیے ایک نص بھی نظر نہ آئی یا بینائی نے ساتھ نہ دیا بلکہ ثبوت فعلی کا انکار کر کے کائناتِ ارضی و سماوی کی اُس سب سے بڑی بارگاہ کے عقیدت مندوں، خادموں اور غلاموں کے قلب و جگر پر خنجر چلاتے ہوئے اسے ایسا شرک لکھ دیا جس میں ایمان کا کوئی حصّہ نہیں ہے۔ ؎

وہی انصاف سے کہہ دیں کہ ہے کس کی جگہ اچھی
بغل میں اِن کی ہم، پہلو میں وہ دشمن کے بیٹھے ہیں

اُدھر مولوی اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء) سے ایک طویل سوال ہُوا۔ جس کے آخر میں سائل نے لکھا ہے: زید کا یہ استدلال اور عقیدہ و عمل کیسا ہے؟ تھانوی صاحب نے جواب میں یہ بھی لکھا:

”آپ کی ذاتِ مقدسہ پر علمِ غیب کا حکم کیا جانا اگر بقول زید صحیح ہو تو دریافت طلب یہ امر ہے کہ اِس غیب سے مراد بعض[1] غیب ہے یا کُل[2] غیب؟ اگر بعض علومِ غیبیہ مراد ہیں تو اِس میں حضور کی ہی کیا تخصیص ہے، ایسا علمِ غیب تو زید و عمرو بلکہ ہر صبی

---

[1] خلیل احمد انبیٹھوی، مولوی: براہین قاطعہ، ص ۵۶

ومجنون بلکہ جمیع حیوانات وبہائم کے لیے بھی حاصل ہے کیونکہ ہر شخص کو کسی نہ کسی ایسی بات کا علم ہوتا ہے جو دوسرے شخص سے مخفی ہے۔ تو چاہیے کہ سب کو عالم الغیب کہا جائے۔ پھر اگر زید اِس کا التزام کرلے کہ ہاں میں سب کو عالم الغیب کہوں گا تو پھر علمِ غیب کو منجملہ کمالاتِ نبویہ شمار کیوں کیا جاتا ہے۔ جس امر میں مومن بلکہ انسان کی بھی خصوصیت نہ ہو وہ کمالاتِ نبوت سے کب ہو سکتا ہے اور التزام نہ کیا جاوے تو نبی وغیر نبی میں وجہِ فرق بیان کرنا ضرور ہے اور اگر تمام علومِ غیبیہ مراد ہیں، اِس طرح کہ اُس کی ایک فرد بھی خارج نہ رہے تو اِس کا بطلان دلیل نقلی وعقلی سے ثابت ہے۔"[1]

اِس عبارت میں تھانوی صاحب نے علمِ غیب کی دو قسمیں کی ہیں (۱) بعض غیب (۲) کل غیب۔ موخر الذکر کے بارے میں موصوف نے صاف لکھ دیا کہ "اگر تمام علومِ غیبیہ مراد ہیں، اِس طرح کہ اُس کی ایک فرد بھی خارج نہ رہے تو اِس کا بُطلان دلیل نقلی وعقلی سے ثابت ہے۔" اب باقی رہ گئی پہلی قسم یعنی بعض غیب۔ اِس کے بارے میں موصوف نے بغیر کسی ہیر پھیر کے صاف لکھ دیا کہ "اگر بعض علومِ غیبیہ مراد ہیں تو اِس میں حضور کی ہی کیا تخصیص ہے، ایسا علمِ غیب تو زید وعمرو بلکہ ہر صبی ومجنون بلکہ جمیع حیوانات وبہائم کے لیے بھی حاصل ہے۔" اِس ناپاک عبارت میں تھانوی صاحب نے علی الاعلان کہہ دیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جیسا علمِ غیب تو زید وعمرو بلکہ بچوں، پاگلوں اور جانوروں کو بھی حاصل ہے (نعوذ باللہ من ذالک)۔ موصوف سے اِس عبارت کو بدلنے اور اسلامی بنانے یا میدانِ مناظرہ میں آکر اسلامی ثابت کر دکھانے کا ہمیشہ مطالبہ رہا لیکن وُہ اپنے کفریہ الفاظ کو بدلنے پر عمر بھر تیار نہ ہوئے نہ تقریر و تحریر کے میدان میں اِسے اسلامی ثابت کر سکے، نہ موصوف کا کوئی حمایتی اِس کفریہ عبارت کو ہرگز اسلامی ثابت کر سکتا ہے کیونکہ اِس میں کسی اسلامی و ایمانی پہلو کی تاویل کے لیے گنجایش ہی نہیں ہے۔ موجودہ دیوبندی حضرات کو اللہ تعالیٰ راہِ ہدایت وچشمِ بصیرت عطا فرمائے۔ آمین

---

[1] اشرف علی تھانوی، مولوی: حفظ الایمان، مطبوعہ نامی پریس لاہور، ص ۱۶

دیوبندیوں کی پیر پرستی

اہلسنّت کو اپنے بزرگوں سے عقیدت ہے اور ہونی چاہیے۔ یہ رشتہ اُن کی ظاہری زندگی میں جس طرح قائم رہتا ہے بعد وصال بھی اُس میں کوئی فرق نہیں آتا۔ عقیدت مندوں کی جانب سے مزارات پر حاضری اور بزرگوں کی جانب سے نوازشات کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک جاری رہے گا۔ مبتدعینِ زمانہ کے نزدیک اظہارِ عقیدت کے جملہ طریقے شرک قرار پاتے ہیں اور اپنی اِسی خانہ ساز منطق کے تحت وہابی حضرات کو مسلمانانِ اہلسنّت وجماعت مشرک اور پیر پرست نظر آتے ہیں، حالانکہ سُنّیوں کے نزدیک بزرگانِ دین نہ خدا ہیں نہ خدائی میں حصہ دار۔ ہاں وہ خدا کے بندے ہیں لیکن اُس کے تابعدار اور مقربِ بارگاہ ہیں۔ اب ہم قارئین کو دکھاتے ہیں کہ اہلسنت وجماعت کو پیر پرست بتانے والے دیوبندی حضرات خود اپنے پیروں کو کیا سمجھتے ہیں۔ مولوی رشید احمد گنگوہی کی وفات پر اُن کے مرید وخلیفہ مولوی محمود الحسن صاحب (المتوفی ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) نے مرثیہ لکھا، جس کا ایک شعر یہ ہے: ؎

جنید و شبلی و ثانی ابو مسعود انصاری
رشیدِ ملّت و دیں، غوثِ اعظم، قطبِ ربّانی[1]

اِس شعر میں مولوی محمود الحسن صاحب نے اپنے پیر مولوی رشید احمد گنگوہی کو غوثِ اعظم بھی بتایا ہے۔ مسلمان اگر حضور سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غوثِ اعظم کہتے ہیں تو وہابی حضرات کے نزدیک یہ صریح شرک قرار پاتا ہے کیونکہ اُن حضرات کے نزدیک صرف اللہ ربّ العزّت ہی غوثِ اعظم ہے بلکہ دیوبندیوں کے مولوی غلام اللہ خاں صاحب (راولپنڈی) تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے غوثِ اعظم لکھ کر آگے جلّ جلالہٗ بھی رقم فرماتے ہیں۔ معلوم نہیں اب وُہ اپنے گھریلو غوثِ اعظم کو جلّ جلالہٗ سے یاد کریں گے یا نہیں؟ اگلا مرتبہ ملاحظہ ہو: ؎

وہ تھے صدیق اور فاروق پھر کہیے عجب کیا ہے[2]
شہادت نے تہجد میں قدم بوسی کی گر ٹھانی

---

[1] محمود الحسن، مولوی: مرثیہ گنگوہی، ص ۴

[2] ایضاً: ص ۱۱

یہاں سیدنا صدیق اکبر و فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی بڑھا کر دکھا دیا۔ اسی پر بس نہیں، آگے چلیے۔ اگر کوئی پوچھے کہ گنگوہی صاحب کس منصب پر فائز تھے تو جواب دیا گیا ہے: ؎

مسیحائے زماں پہنچا فلک پہ، چھوڑ کر سب کو
چھپا چاہِ لحد میں وائے قسمت ماہِ کنعانی[1]

یعنی دیوبندی حضرات کے نزدیک گنگوہی صاحب مسیحائے زماں اور ماہِ کنعانی یعنی حضرت یوسف علیہ السلام تھے۔ اگر کوئی پوچھے کہ گنگوہی صاحب کیا اعجاز میں عیسیٰ علیہ السلام کے ہی برابر تھے تو اُسے جواب دیا جا رہا ہے: ؎

مُردوں کو زندہ کیا، زندوں کو مرنے نہ دیا
اِس مسیحائی کو دیکھیں ذری ابنِ مریم[2]

یہاں بتا دیا کہ گنگوہی صاحب کا مرتبہ عیسیٰ علیہ السلام سے اعجاز میں بڑھ کر ہے کیوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو صرف مُردے ہی زندہ کر سکتے تھے لیکن گنگوہی صاحب مُردوں کو زندہ کر دینے کے ساتھ ہی زندوں کو مرنے نہیں دیا کرتے تھے۔ اِسی لیے کہہ دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اگر حقیقی مسیحائی دیکھنا چاہتے ہیں تو گنگوہی صاحب کی مسیحائی کو آکر دیکھیں۔ جب گنگوہی صاحب کو عیسیٰ علیہ السلام سے بھی بڑھ کر صاحبِ اعجاز بنا دیا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان کا مرتبہ کون سے نبی کے برابر تھا۔ اِس کا یہ جواب دیا ہے: ؎

زباں پر اہلِ اہوا کی ہے کیوں اُعل و ہُبل شاید
اُٹھا عالم سے کوئی بانیِ اسلام کا ثانی[3]

یعنی ہوا پرست لوگ جو بتوں کی باتیں کرنے لگ گئے ہیں تو شاید یہ اِسی وجہ سے ہے کہ بانیِ اسلام یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے ہمارے گنگوہی صاحب دنیا سے اُٹھ گئے ہیں۔ علاوہ بریں دیوبندی حضرات کے نزدیک مولوی رشید احمد گنگوہی بعض کمالات میں فخرِ دو عالم

---

[1] محمود الحسن، مولوی: مرثیہ گنگوہی، ص ۶ [2] ایضاً: ص ۲۲

[3] ایضاً: ص ۴

سیدِ عرب و عجم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھی بڑھ کر تھے۔ مثلاً نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے استمداد کرنا، حاجت روائی چاہنا دیوبندیوں کے نزدیک شرک ہے لیکن گنگوہی صاحب کو خدا کا شریک ٹھہرا لینے میں اُن کے نزدیک کوئی حرج نہیں کیونکہ وُہ اِن کے قبلۂ حاجات تھے۔ چنانچہ اپنے اِس ایٹمی شرک کو یُوں شیرِ مادر سمجھ کر بغیر ڈکار ہضم کیا ہُوا ہے: ؎

حوائج دین و دنیا کے کہاں لے جائیں ہم یارب
گیا وہ قبلۂ حاجاتِ روحانی و جسمانی[1]

اِس ستم ظریفی کی بھلا کوئی حد ہے کہ خدا سے ہی سوال کیا ہے کہ اب ہم اپنی دین و دنیا کی حاجتیں کس سے پُوری کروایا کریں گے کیونکہ ہمارا قبلۂ حاجاتِ جسمانی و روحانی چلا گیا ہے؛ اب نہ اُنھیں مخلوق میں کوئی اور قبلۂ حاجات نظر آتا ہے نہ خالق ہی سے ایسی توقع۔ لہٰذا اسی حیرانی میں چیخ پکار مچائی جا رہی ہے۔ علاوہ بریں فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اِن کے نزدیک گنگوہی صاحب کو دوسری فوقیت یہ حاصل تھی کہ: ؎

قبولیت اِسے کہتے ہیں مقبول ایسے ہوتے ہیں
عبیدِ سُود کا اِن کے لقب ہے یوسفِ ثانی[2]

یعنی کسی کو عبدالنبی، عبدالرسول کہو تو دیوبندی حضرات کے نزدیک شرک ہو گیا۔ سیدالانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا عبد ہونا ان کے نزدیک یقینی شرک ہے لیکن گنگوہی صاحب کا عبد ہونا قطعاً شرک نہیں کیونکہ گنگوہی صاحب کے عبیدِ سُود یعنی کالے عبد بھی یوسف علیہ السلام کی طرح حسین و جمیل تھے۔ تیسری خصوصیت جو دیوبندی حضرات کے نزدیک گنگوہی صاحب کو سیدالمرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ممتاز کرتی ہے، یہ ہے: ؎

خدا اُن کا مربّی، وہ مربّی تھے خلائق کے
مِرے مولیٰ، مِرے ہادی تھے بیشک شیخِ ربّانی[3]

---

[1] محمود الحسن، مولوی: مرثیۂ گنگوہی، ص ۷

[2] ایضاً: ص ۸

[3] ایضاً: ص ۸

مسلمانوں کا تو یہی عقیدہ ہے کہ اللہ جلّ شانہ، ہی خلائق کا مربّی ہے یعنی رب العٰلمین اُسی کی ذات ہے لیکن دیوبندی حضرات بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ رب العالمین نہیں ہے بلکہ صرف گنگوہی صاحب کا مربّی ہے اور جناب گنگوہی صاحب باقی ساری کائنات کے مربّی ہیں۔

چوتھی خصوصیت یہ بتائی ہے: ؎

پھریں تھے کعبہ میں بھی پُوچھتے گنگوہ کا رستہ
جو رکھتے اپنے سینوں میں تھے ذوق و شوقِ عرفانی[1]

یعنی دیوبندی حضرات کو کعبے میں پہنچ کر بھی کوئی سرور نہیں ملتا بلکہ وہاں ایسے رہتے ہیں جیسے جیل خانے میں قیدی اور وہاں سے گنگوہ جانے کا راستہ پُوچھتے رہتے ہیں۔ اگر گنگوہی صاحب کو سرورِ کون ومکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ممتاز نہ سمجھا گیا ہوتا تو گنگوہ کے بجائے مدینہ منورہ کا راستہ پُوچھتے۔

پانچویں خصوصیت یہ بتائی ہے: ؎

چھپائے جامۂ فانوس کیونکر شمعِ روشن کو
تھی اُس نورِ مجسّم کے کفن میں وہ ہی عریانی[2]

دیوبندی حضرات کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جسمانی لحاظ سے ہرگز نور نہیں ہیں لیکن گنگوہی صاحب نورِ مجسّم یعنی سراپا نور تھے، جن کی شعاعیں کفن سے باہر بھی نکل رہی تھیں۔ یہاں آکر ایک سیدھے سادے مسلمان کی حیرت کا پیمانہ بھی چھلک اُٹھتا ہے کہ جو باتیں فخرِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیئے ثابت ماننا اِن حضرات کے نزدیک کفر و شرک ہیں وہی باتیں گنگوہی صاحب سے منسوب ہونے پر کس طرح عین ایمان ہو گئیں، مسلمانوں کی اِس حیرانی کو دُور کرنے کی خاطر دیوبندیوں کے شیخ الہند صاحب نے صاف لکھ دیا ہے: ؎

تمھاری تربتِ انور کو دے کر طور سے تشبیہ
کہوں ہُوں بار بار اَرِنی مِری دیکھی بھی نادانی[3]

---

[1] محمود الحسن مولوی: مرثیہ گنگوہی، ص ۹

[2] ایضاً، ص ۱۱

[3] ایضاً، ص ۱۲

گنگوہی صاحب کی قبر کو طور سے، خود کو موسیٰ علیہ السلام سے اور گنگوہی صاحب کو رب العالمین سے تشبیہ دے کر شیخ الہند صاحب بار بار کہہ رہے ہیں رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ۔ یعنی اے میرے رب! تو مجھے اپنی ذات دکھا تاکہ مَیں تیرا دیدار کروں۔ معلوم ہُوا کہ فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے گنگوہی صاحب کو بایں وجہ فوقیت دی جا رہی تھی کہ مولوی محمود الحسن صاحب اُنھیں منصب الوہیت پر فائز کر چکے تھے۔ اب ایک دلخراش خواب ملاحظہ ہو:

"حضرت گنگوہی کے بیعت ہونے سے پیشتر حضرت حاجی صاحب نے خواب دیکھا تھا، جس کی تعبیر حضرت گنگوہی کا مرید ہونا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ آپ کی بھاوج آپ کے مہمانوں کا کھانا پکا رہی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ کی بھاوج سے فرمایا: اُٹھ تو اِس قابل نہیں ہے کہ امداد اللہ کے مہمانوں کا کھانا پکائے۔ اِس کے مہمان علماء ہیں، اِس کے مہمانوں کا کھانا مَیں پکاؤں گا۔"[1]

کیا گنگوہی صاحب کے لیے فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اِس لیے کھانا پکانے تشریف لائے تھے کہ گنگوہی صاحب نے سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علم کو علمِ شیطان سے کم بتانا تھا اور اُمتی کہلاتے ہُوئے اُس سرکار کے خلاف دیوبندی فرقے کے نام سے ایک مستقل محاذ قایم کرنا تھا، دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دیوبندی حضرات اپنے گنگوہی پیر کا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو باورچی اِس لیے دکھا رہے ہیں کہ کائنات میں گنگوہی صاحب کے مرتبے کی کوئی اور ہستی نظر ہی نہ آئی۔ یہی مفتی صاحب اب گنگوہیت کا ڈنکا یُوں بجاتے ہیں:

"حضرت قدس سرہٗ کے کمالات اور اوصاف کہاں تک بیان کیے جائیں۔ بس اِس شعر پہ آپ کا تذکرہ ختم کرتا ہُوں:

حُسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری
آنچہ خُوباں ہمہ دارند تو تنہا داری"[2]

---

[1] عزیز الرحمٰن نہٹوروی، مفتی: تذکرہ مشایخِ دیوبند، ص ۱۱۲

[2] ایضاً: ص ۱۳۹

یعنی جو کمالات انفرادی طور پر انبیائے کرام کو ملے تھے اُن سارے کمالات کی جامع سرکار گنگوہیت مآب مولوی رشید احمد صاحب کی ذات ہے۔ اب مولوی محمد یعقوب صاحب کا مقام ملاحظہ فرمالیجیے:

”جس زمانہ میں ملکہ کی تاجپوشی کا جلسہ ہُوا، اُس زمانہ میں مولانا محمد یعقوب صاحب دِلّی میں تھے اور اکثر غائب رہا کرتے تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ حضرت! آپ کہاں غائب رہتے ہیں؟ فرمایا: مجھے حکم ہُوا ہے کہ دِلّی میں جس جس جگہ تمھارا قدم جائے گا اُس جگہ کو آباد کر دیں گے۔ اِس لیے شہر اور حوالیِ شہر میں گشت کیا کرتا ہُوں تاکہ ویران مقامات آباد ہو جائیں۔“ [1]

اب مولوی رفیع الدین صاحب دیوبندی اور اُن کے بھائیوں کا مقام ملاحظہ ہو۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

”مشہور ہے کہ رات کو اکثر لوگوں نے آپ (شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندی) کی قبر سے قرآن شریف پڑھنے کی آواز سُنی ہے۔ آپ کے چار بھائی اور تھے، محمد صابر، بلند بخت، مقصود علی، سید احمد۔ تینوں مؤخر الذکر حضرات معرکہ بالاکوٹ میں شہید ہُوئے۔ اِن تینوں حضرات کے بارے میں مشہور ہے کہ مولانا فرید الدین صاحب (اپنے والد) کے انتقال کے وقت اُن کے جنازہ میں شریک تھے اور بعد تدفین کے غائب ہو گئے۔“ [2]

مصنفِ تذکرہ مشایخِ دیوبند کے اُستاد اور مدرسہ دیوبند کے مدرس کی زبانی مولوی محمود الحسن دیوبندی کے بارے میں یہ عجیب و غریب افسانہ تراشا گیا اور ٹانڈوی صاحب اُس کے مُصدِّق بن گئے۔ الفاظ ملاحظہ ہوں:

”جب میں بچہ تھا اور حضرت (مولوی محمود حسن صاحب) کے زنان خانے میں آتا جاتا تھا تو ایک دِن مَیں نے حضرت کے کمرہ کے کواڑوں کے جھروکوں سے

---

[1] عزیز الرحمٰن بجنوری، مفتی: تذکرہ مشایخ دیوبند، ص ۱۷۵ [2] ایضاً: ص ۱۹۳

جھانک کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت کے جسم کے تمام اعضاء، سر دھڑ علیحدہ علیحدہ پڑے ہوئے ہیں۔ میں یہ دیکھ کر گھبرا گیا اور بھاگ آیا اور باہر آ کر حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے بیان کیا تو مولانا نے فرمایا: خاموش! کسی سے نہ کہنا، کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔" [1]

اب براہینِ قاطعہ جیسی رُسوائے زمانہ اور ایمان سوز کتاب کے مصنف مولوی خلیل احمد انبیٹھوی (المتوفی ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۶ء) کی شان اُن کے تذکرہ نگار، مولوی عاشق الٰہی میرٹھی کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

"حضرت (انبیٹھوی صاحب) کے کمالات کا بیان کرنا میری طاقت سے باہر ہے کہ اُن کا ادراک مجھ جیسے ناکارہ کی تو کیا حقیقت، بڑوں کو بھی مشکل تھا۔" [2]

اب اُسی ادراک سے باہر کمال کی حقیقت تذکرہ نگار موصوف کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

"حج پنجم میں جس وقت حضرت مسجد الحرام میں طوافِ قدوم کے لیے تشریف لائے تو احقر مولانا محب الدین صاحب کے پاس (جو کہ اعلحضرت حاجی کے خلفاء میں تھے اور صاحبِ کشف مشہور تھے) بیٹھا تھا۔ مولانا اُس وقت درود شریف کی کتاب کھولے اپنا ورد پڑھ رہے تھے کہ دفعۃً میری طرف مخاطب ہو کر فرمانے لگے: اِس وقت حرم میں کون آ گیا کہ دفعۃً سارا حرم انوار سے بھر گیا۔ میں خاموش رہا کہ اِتنے میں حضرات طواف سے فارغ ہو کر باب الصفا کی طرف سعی کے لیے چلے تو مولانا محب الدین صاحب کے پاس کو آئے کہ وہی جگہ مولانا کی نشست کی تھی۔ مولانا کھڑے ہو گئے اور ہنس کر فرمایا: میں بھی تو کہوں آج حرم میں کون آ گیا۔ یہ کہہ کر مصافحہ و معانقہ ہوا اور حضرت سعی کے لیے آگے بڑھ گئے۔ مولانا محب الدین صاحب اپنی جگہ بیٹھ گئے اور مجھ سے فرمایا: میاں ظفر!

---

[1] عزیز الرحمٰن نہٹوروی، مفتی: تذکرہ مشایخ دیوبند، ص ۲۳۴

[2] عاشق الٰہی میرٹھی، مولوی: تذکرۃ الخلیل، ص ۳۵۸

مولانا خلیل احمد تو نور ہی نور ہیں ۔ اِن میں نور کے سوا کچھ نہیں ۔ پھر فرمایا کہ میں نے مولانا رشید احمد صاحب کو نہیں دیکھا اور مجھ سے کہا گیا ہے کہ وُہ قطب الارشاد تھے ، مگر مَیں نے مولانا کے خلفاء کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ واقعی وہ قطب الارشاد تھے جو ایسے ایسے کامل بنا گئے ۔ "[1]

جس شخص نے حبیبِ پروردگار اور عالمِ علومِ اوّلین و آخرین کا شیطان سے کم علم بتایا اور جس کے کفر وارتداد پر علمائے عرب وعجم کا اتفاق ہے ، اُسے کامل بتانا ، نور ہی نور ٹھہرانا ، حرم کو اُس سراپائے ظلمت سے چمکانا اور مولوی رشید احمد گنگوہی جیسے اللہ ورسول کے کھلے دشمن کو قطب الارشاد قرار دینا معلوم نہیں کیسی دینداری اور کہاں کی دیانت داری ہے ؟ اب گنگوہی صاحب کے دُوسرے خلیفہ مولوی حسین علی بھچرانوی کا ایک واقعہ خود اُن کی زبانی سُنیے ، اُنھوں نے لکھا ہے :

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ مجھے بصورتِ معانقہ دوزخ کے پلصراط پر لے گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ورأیت انه یسقط فامسکته واعتصمته عن السقوط اور میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھا کہ آپ گِر رہے ہیں تو میں نے آپ کو تھام کر گرنے سے بچایا ۔ "[2]

مولوی محمد قاسم نانوتوی صاحب بھی دیوبندیوں کے نزدیک چھوٹے موٹے ولی نہیں ۔ اُن کی جانب بھی بے شمار کرامتیں منسوب کی جاتی ہیں ۔ موصوف کی ایک عدیم النظیر کرامت ملاحظہ ہو :

"مولانا (نانوتوی صاحب) بچّوں سے ہنستے بولتے اور جلال الدین صاحبزادہ محمد یعقوب سے جو اُس وقت بچّے تھے ، بڑی ہنسی کیا کرتے تھے ۔ کبھی ٹوپی اُتارتے ، کبھی کمر بند کھولتے تھے ۔ "[3]

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی ، مولوی ؛ تذکرۃ الخلیل ، ص ۳۵۹ [2] حسین علی ، مولوی ؛ مبشرات بلغۃ الحیران ، ص ۸

[3] اشرف علی تھانوی ، مولوی ؛ حکایاتِ اولیاء ، ص ۳۱۷

دیوبندی حضرات کے نزدیک نانوتوی صاحب کا مقام انسانیت سے برتر تھا۔ چنانچہ خود لکھا ہے:

"مولانا رفیع الدین صاحب فرماتے تھے کہ میں پچیس برس حضرت مولانا نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اور کبھی بلا وضو نہیں گیا۔ میں نے انسانیت سے بالا درجہ اُن کا دیکھا ہے۔ وہ شخص ایک فرشتہ مقرب تھا، جو انسانوں میں ظاہر کیا گیا"۔ [1]

کیا دیوبندی حضرات دوسروں کو بھی یہ وجہ بتا سکتے ہیں کہ بارگاہِ نانوتوی صاحب میں یہ متواتر پچیس سال تک باوضو حاضر ہونے کی پابندی اُن کی شریعت کے مطابق کیسی ہے؟ نیز یہ بھی کہ فرشتے کا مقام کیا انسانیت سے بالاتر ہے؟ افسوس!

؎ راہزن خضرِ راہ کی قبا چھین کر
رہنما بن گئے دیکھتے دیکھتے

اب دار العلوم دیوبند کے سابق صدر یعنی مولوی حسین احمد گاندھوی صاحب کا وُہ منصب ملاحظہ فرمائیے جس پر وُہ دیوبندی حضرات کے نزدیک فائز ہیں جبکہ موصوف کا مقصدِ حیات اور ان کے کارناموں کا مرکزی نقطہ صرف گاندھی جیسے مشرک کی پیروی اور اُس کے ارشادات کو قرآن وحدیث کے مطابق قرار دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ چنانچہ اُن کے بارے میں ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا گیا تھا:

"ایک خاص نعمت جو اللہ تعالیٰ نے آپ (مولوی حسین احمد گاندھوی صاحب) کو عطا فرمائی تھی، وہ تھی رؤیا، اِس پیکرِ عصمت کی زندگی نے سیّدنا یُوسف علیٰ نبیّنا وعلیہ الصّلوٰۃ والسلام سے جہاں تقدس واستقامت علی الحق، باطل کے مقابلے میں سینہ تان کر السجن احبّ الیّ ممّا یدعوننی کا نعرہ بلند کرنے کا ترکہ پایا تھا، وہیں تاویلِ احادیث کے تمام شعبے بالخصوص تعبیرِ رؤیا

---

[1] اشرف علی تھانوی، مولوی؛ حکایاتِ اولیاء، ص ۲۸۶

کا کمال بھی حاصل فرمایا تھا۔"[1]

حضرت یوسف علیہ السلام جیسے کمالات ایک گاندھی جیسے مشرک و بُت پرست کے پیروکار میں ثابت کرنے کی جرأت وُہ حضرات تو کر سکتے ہیں جن کے نزدیک کفر و ایمان میں کوئی فرق نہ ہو یا آخرت کی باز پرس جن کے نزدیک ایک فرضی قصّے کہانی سے زیادہ اور کوئی حیثیت نہ رکھتی ہو اور اِس پر ستم ظریفی یہ گاندھوی موصوف کو معصوم قرار دیتے ہُوئے اُن کے لیے پیکرِ عصمت کا لفظ لکھ دیا حالانکہ عصمت گروہِ انبیاء و ملائکہ کا خاصہ ہے۔ اب قارئین کرام ذرا دیوبندی حضرات کی مُلّا پرستی کا ایک المناک ڈرامہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ چنانچہ لکھا ہے:

"حضرت سیّدنا ابراہیم علیہ السلام گویا کسی شہر میں جامع مسجد کے قریب ایک حجرہ میں تشریف فرما ہیں اور متصل ایک دُوسرے کمرے میں کتب خانہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کتب خانے سے ایک مجلد کتاب اُٹھائی، جس میں دو کتابیں تھیں، ایک کتاب کے ساتھ دوسری کتاب تھی، وُہ خطباتِ جمعہ کا مجموعہ تھا۔ اِس مجموعہ خطب میں وہ خطبہ نظرِ انور سے گزرا جو مولانا حسین احمد مدنی خطبۂ جمعہ پڑھا کرتے ہیں۔ جامع مسجد میں بوجہ جمعہ مصلّیوں کا مجمع بڑا ہے۔ مصلّیوں نے فقیر سے فرمائش کی کہ تم حضرت خلیل اللہ سے سفارش کرو کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام، مولانا مدنی کو جمعہ پڑھانے کا ارشاد فرمائیں۔ فقیر نے جرأت کر کے عرض کیا تو حضرت خلیل علیہ السلام نے مولانا مدنی کو جمعہ پڑھانے کا حکم فرمایا۔ مولانا مدنی نے خطبہ پڑھا اور نمازِ جمعہ پڑھائی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مولانا مدنی کی اقتداء میں نمازِ جمعہ ادا فرمائی۔ فقیر بھی مقتدیوں میں شامل تھا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک حمداً کثیراً۔ حضرت سیّدنا ابراہیم علیہ السلام ضعیف العمر تھے۔ ریش مبارک سفید تھی۔"[2]

یہ بات تو اپنے عرفانی ذوق، ایمانی حرارت اور عقلِ سلیم سے تعلق رکھتی ہے کہ ایک نبی اور وہ بھی خلیل جیسی جلیل القدر ہستی کی اقتداء کے لیے کس کے دل میں تمنّائیں مچلتی ہیں اور خلیل اللہ کو نظر انداز کر کے اپنے مُلّاؤں کو امام بنانے بلکہ ایک جلیل القدر پیغمبر کو اُن کی اقتداء پر مجبور کرنے کی

---

[1] شیخ الاسلام نمبر: ص ۸۰

[2] ایضاً: ص ۱۶۴

جسارت کون لوگ کیا کرتے ہیں؟ کیا انبیائے کرام سے اِس طرح اپنے علماء کو بڑھا کر دکھانا اُتخِذُوْا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ بنانے کی ایک کڑی تو نہیں ہے؟ خواب تو گھڑ لیا، ٹانڈوی صاحب کو عرش پہ بٹھا کر تو دکھا دیا لیکن اِتنا خیال نہ آیا کہ اِس طرح تمام نمازیوں کے ساتھ گاندھوی صاحب کو بھی انبیائے کرام کا گستاخ مان لیا کہ لوگوں کی یہ غلط اور غیر اسلامی خواہش دیکھ کر بھی اُنھوں نے یہ نہیں فرمایا کہ خلیلِ خدا کا مجھے امام بنا کر کیوں اپنے ساتھ میرے بھی دین و ایمان کا بیڑہ غرق کرتے ہو؟ نہ سہی تو اِتنا ہی کہہ دیتے کہ ہماری سعادت اِسی میں ہے کہ ہم انبیائے کرام کی اقتداء کریں۔ لیکن:

؎ رہِ منزل میں سب گُم ہیں مگر افسوس تو یہ ہے
امیرِ کارواں بھی ہیں اُنھیں گُم کردہ راہوں میں

اب مولوی حسین احمد گاندھوی صاحب کا یہ منصب و مقام بھی تو ملاحظہ فرمایئے:

"اب یہ دیکھتے ہیں کہ وہ (مولوی حسین احمد صاحب) عالمِ نور میں رہتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں بھی نور ہے، اُن کے داہنے نور ہے، اُن کے بائیں نور ہے، اُن کے چاروں طرف نور ہی نور ہے، وہ خود نور ہو گئے ہیں۔"[1]

جب یہی الفاظ مسلمانانِ اہلسنت وجماعت کی زبان سے سرورِ کون و مکان صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے استعمال ہوتے ہیں تو دیوبندی حضرات کفر و شرک کی توپوں سے دھواں دار گولہ باری شروع کر دیتے ہیں اور اِس عقیدے کو قرآن وحدیث کی تعلیمات سے سراسر بغاوت قرار دیتے ہیں لیکن وہی عقیدہ اگر سیّد المرسلین صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بجائے گاندھوی صاحب سے متعلق کر دیا جائے تو عین ایمان ہو جاتا ہے۔ اب نہ کفر و شرک رہا، نہ قرآن وحدیث کی تعلیمات سے بغاوت رہی۔ اِس ستم ظریفی کا جواب کیا؟ اِسلام کو اِس طرح بازیچۂ اطفال بنانے والوں کو اللّٰہ تعالیٰ ہی راہِ ہدایت دکھائے۔ آمین

جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک کے مدرس مولوی سمیع الحق صاحب نے ٹانڈوی صاحب کے بارے میں اُن کے گاندھوی منصب کے پیشِ نظر اپنے "تاثرات" یوں "قلمبند" فرمائے ہیں:

"میں کہا کرتا ہوں، حضرت مدنی کی نظیر نہیں ہے۔ اُن جیسا جامع الصفات

---

[1] شیخ الاسلام نمبر، ص ۱۲

تمام عالمِ اسلام میں نہیں تھا۔"[1]

نجم المدارس کلاچی ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے مہتمم مولوی عبد الکریم دیو بندی نے ٹانڈوی صاحب کے بارے میں اسی بات کو یُوں اپنا مشاہدہ بنا کر سپردِ قلم کیا ہُوا ہے:

"میں بار ہا مکّہ معظمہ گیا ہُوں، اہل اللہ کے جھنڈ کے جھنڈ ہوتے ہیں، مگر میں نے حضرت مدنی کے مرتبہ کا کوئی ولی نہیں دیکھا۔"[2]

جس کوچے سے روحانیت و ولایت کا گزر بھی نہیں ہو سکتا، وہاں کے رہنے والوں کو نہ صرف زبان زوری سے ولی بتایا جاتا ہے بلکہ اولیاء اللہ سے بڑھا چڑھا کر دکھاتے ہیں۔ کاش ایسے قلم چور حضرات کبھی اتنا ہی غور فرما لیا کرتے کہ اللہ و رسول (جلّ جلالہٗ و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کے دشمنوں اور گاندھی کے پجاریوں کا بھلا ولایت سے رشتہ ناطہ کیا؟ ابھی مولوی سمیع الحق صاحب کا ایک بیان اور ملاحظہ فرما لیا جائے:

"حضرت رائے پوری مدظلہٗ (مولوی عبد القادر صاحب) سے کہا گیا کہ حضرت مدنی کانگرس میں اکیلے ہیں۔ فرمایا ہم اُس اکیلے کے ساتھ ہیں۔ میں تیرہ مرتبہ حجاز گیا۔ حرمین الشریفین میں پوری دنیا کے اولیاء اللہ جمع ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے کہیں بھی حضرت مدنی کی نظیر نہیں دیکھی۔"[3]

اب ٹانڈوی صاحب کے بارے میں دیو بندی حضرات کا یہ فیصلہ بھی مدِ نظر رکھا جائے:

"مگر اب آہ میرے مسیحا! دُنیا میں تو اِس وقت قیامت برپا ہے۔ اُمتِ مرحومہ کا تُو ہی ایک سہارا تھا سو قیامت میں ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔"[4]

اگر اولیائے کرام بلکہ خود سیّد الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنا سہارا کہا جائے تو دیو بندی حضرات کے نزدیک یہ کفر و شرک ہے، قرآن و حدیث کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ فوراً تقویۃ الایمان کے ساختہ قوانین سنانے شروع کر دیے جاتے ہیں کہ کوئی کسی کا دکیل اور

---

[1] ہفت روزہ خدام الدین لاہور، ۱۳ اپریل ۱۹۶۲ء، ص ۱۷ [2] ایضاً، ۲۲ فروری ۶۳ء، ص ۲۲

[3] ایضاً، ۱۳ اپریل ۱۹۶۳ء، ص ۱۷ [4] الجمعیۃ، شیخ الاسلام نمبر، ص ۹۷

سفارشی نہیں ہے۔ کوئی نفع نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ نہ بالفعل اُن کو کسی کام میں دخل ہے نہ اللہ کے دینے سے۔ جو اُنھیں خدا کے دینے سے بھی اختیار مانے وہ اور ابوجہل شرک میں برابر ہیں۔ لیکن اختیارات کی نسبت اگر دیوبندی حضرات کے دشمنوں یعنی انبیائے کرام و اولیائے عظام کے بجائے دیوبندیوں کے اپنے مولویوں ملّاؤں کی طرف ہو جائے تو چاہے ہزاروں گنا زیادہ اختیار ماننے چلے جائیں، اب نہ کفر و شرک، نہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کے خلاف، بلکہ وہی عقیدہ اب عین دین و ایمان ہو جائے گا۔ کیا اب بھی کوئی شک و شبہ باقی رہتا ہے اور اِس یقین کو پوری تقویت نہیں پہنچتی کہ وہابیت حقیقت میں انبیائے کرام اور اولیائے عظام سے بغاوت کا نام ہے اور وہابی وہی ہے جس کے دل میں انبیاء و اولیاء کی عداوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہو گی اگرچہ بظاہر کتنی ہی عقیدت کا اظہار کریں یا منافقانہ طور پر عشقِ رسول کا بلند بانگ دعوٰی بھی کرتے پھریں۔ اِس زندہ حقیقت کا اگر خود معائنہ کرنا ہو تو بڑی آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ سوال کیجیے کہ فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ ظاہر ہے کہ دیوبندی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والا مفتیِ اعظم و قطب الارشاد کہلانے والے سے لے کر ایک جاہل مطلق تک ہر وہابی یہی جواب دے گا کہ وہ ہماری ہی طرح کے بشر تھے۔ اِس سوال کا جواب دینے میں اُنھیں قطعاً کوئی دقّت نہیں اُٹھانی پڑے گی، نہ کوئی جھجک یا ندامت محسوس ہو گی، نہ اِس میں کسی قسم کی پیچیدگی یا اُلجھن کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن حبیبِ کردگار کی جگہ اگر بات اُن لوگوں کی آجائے جن کی وہ غیر محسوس طریقے پر رات دن پرستش میں مصروف رہتے ہیں، جن کی بارگاہوں میں عقیدت کے سجدے لٹاتے رہتے ہیں، جن کی بندگی سے وہ کسی وقت تائب ہونے کے لیے تیار نہیں یعنی اُن کے مولویوں کے بارے میں پُوچھا جائے تو یُوں بُھول بھلیاں کی سیر کرنے لگ جاتے ہیں:

"آپ (ٹانڈوی صاحب) کے فضائل علمیہ اور کمالاتِ باطنیہ کی صحیح اطلاع یا تو خداوندِ قدوس ہی کو ہو سکتی ہے (یعنی صرف امکان تسلیم کیا ہے) یا اُن اولیائے کرام اور علمائے ربّانین کو ہو سکتی ہے جن کو مبداءِ فیاض نے چشمِ بصیرت عطا فرمائی ہے، ہم جیسے کور چشم آپ کی ذات قدسی صفات کو

کیا پہچان سکتے ہیں؟" [۱]

دیوبندیوں سے ٹانڈوی صاحب کا منصب و مقام کیوں نہیں پہچانا جاتا تھا؟ آخر گاندھی کی آندھی میں تنکے کی طرح اُڑنے والے اور کانگرس کی دریوزہ گری کرنے والے مولوی صاحب کا مرتبہ جاننے میں کون سا پہاڑ حائل تھا؟ بات در اصل یہ ہے کہ دیوبندی حضرات اپنے کھدّر پوش ٹانڈوی صاحب کو منصبِ الوہیت پر فائز کر چکے تھے، جیسا کہ خود لکھا ہے:

> "تم نے کبھی خدا کو بھی اپنے گلی کوچوں میں چلتے پھرتے دیکھا ہے؟ کبھی خدا کو بھی اُس کے عرشِ عظمت و جلال کے نیچے فانی انسانوں سے فروتنی کرتے دیکھا ہے؟ تم کبھی تصوّر بھی کر سکے کہ ربّ العالمین اپنی کبریائیوں پر پردہ ڈال کے تمہارے گھروں میں بھی آ کر رہے گا؟" [۲]

اِسی کبریائی کے باعث ٹانڈوی صاحب کو بڑے ذوق و شوق سے عَلِیمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ بنا کر تشہیر کی ہے۔ مسلمان اگر دیوار کے پرے والی چیز سے سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خبردار مانیں تو مشرک اور دیوبندی حضرات اپنے کھدّر پوش کبریا یعنی عالی جناب ٹانڈوی صاحب کو دِلوں کے خطرات سے بھی واقف بتائیں تو عین ایمان اور ٹانڈوی صاحب کے کامل ہونے کی دلیل۔ چنانچہ جامعہ مدنیہ لاہور کے امیر، حامد میاں صاحب جو ٹانڈوی صاحب کے خلیفۂ مجاز بھی ہیں۔ وُہ لکھتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد مولوی احمد علی لاہوری صاحب نے ٹانڈوی صاحب کی خدمت میں ایک خط بھیجا۔ اُدھر سے جو جواب آیا اُسے لاہوری صاحب اپنے لیے ذریعہ نجات قرار دے کر محفوظ رکھے ہُوئے تھے۔ اُنھوں نے ایسا کیوں کیا؟ وجہ سُنیئے:

> "حضرت شیخ التفسیر (مولوی احمد علی لاہوری) رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے اپنے خط میں ایسا تاثر ظاہر نہیں کیا تھا لیکن حضرت مدنی قدس سرہٗ کامل تھے اس لیے میری قلبی کیفیت اُن پر منعکس ہُوئی کہ میں نے اگرچہ الفاظ ایسے نہیں

---

[۱] شیخ الاسلام نمبر، ص ۶۷

[۲] ایضاً، ص ۵۹

لکھے تھے لیکن لکھتے وقت مجھ پر رقّت کا عالم تھا۔ حضرت مدنی نے جواب میں میری قلبی کیفیت کا خیال فرمایا اور یہی شیخ کا کمال ہے۔''[1]

مجھے کہنے دیجیے کہ قلوب پر مطلع ہونا اگر کامل ہونے کی دلیل ہے تو فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی علمیّت پر دیوبندی حضرات پہرہ بٹھانے کی کوشش کیوں کرتے ہیں ؟ جتنا علم اپنے ٹانڈوی صاحب کے لیے تسلیم و مشتہر کیا ہے کوئی دیوبندی مرتے دم تک بھی اِتنا علم اُس ہستی کے لیے تسلیم نہیں کرتا جو اوّلین و آخرین کے علوم کی جامع ہے۔ کیا یہ حبیبِ پروردگار کو ناقص ٹھہرانے، فضل و کمال سے خالی بتانے اور غلامی کے پردے میں دل کی لگی بجھانے کا پُراسرار کاروبار نہیں ہے ؟ ورنہ ٹانڈوی صاحب تو دِلوں پر بھی مطلع اور سیّد الانبیاء، دیوار کے پرے والی چیزوں سے ناواقف۔ کیا اس فیصلے میں محبت اور نفرت کے جذبات کی کارفرمائی نہیں ہے ؟ نہ اِن حضرات کے پاس ایک بھی دلیل کہ ٹانڈوی صاحب قلوب پر مطلع ہیں نہ ایسا کوئی ثبوت کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پسِ دیوار کی چیزوں سے ناواقف تھے۔ بات بس اِتنی ہے کہ ٹانڈوی صاحب سے عقیدت ہے تو بغیر دلیل بھی عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ مان لیے گئے اور سرورِ کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عداوت ہے تو دنیا و مافیہا سے واقف ہونے کے باوجود پسِ دیوار سے ناواقف ٹھہرا دیے گئے۔ قلب کی اِس بیماری کا علاج سوائے اللہ رب العزت کے اور کسی کے پاس نہیں۔ توہُّب اِسی مرض کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو دین و ایمان کی اس ٹی۔ بی سے محفوظ و مامون رکھے۔ آمین۔ ٹانڈوی صاحب کی شان میں کہے گئے اِس شعر کے تیور بھی ذرا قارئین کرام بغور ملاحظہ فرمائیں : ؎

آج اُس مشفق، مربّی، شیخ کامل کا ہے ساتھ
جس کی نظروں سے گداؤں کو شہنشاہی ملے

دیوبندی حضرات کے نزدیک فخرِ دو عالم، سیّدِ عرب و عجم تک تو کسی کو نفع نقصان پہنچا نہیں

---

[1] ہفت روزہ خدام الدین لاہور، ۲۲ فروری ۱۹۶۳ء : ص ۱۳

سکتے تھے بلکہ اپنی صاحبزادی کے کام آنے تک سے مجبور و معذور تھے لیکن ٹانڈوی صاحب کو یہ کمال اِن کے نزدیک ضرور حاصل تھا کہ بہ پلک جھپکنے میں خاک نشینوں کو تخت نشین اور بھکاریوں کو بادشاہ بنا دیا کرتے تھے۔ کیا یہ ایک شرمناک جسارت اور دیانت و انصاف کا سرِ بازار خُون نہیں کیا جا رہا ہے؟ اب مولوی حسین احمد گاندھوی کے عاشقِ زار اور لاہور میں دیوبندیت کے سابق علمبردار مولوی احمد علی لاہوری (المتوفی ۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۱ء) کے بارے میں مولوی سعید احمد جالندھری لکھتے ہیں:

"میں اپنے علم و ایقان اور مطالعہ کی کسوٹی پر جب کبھی حضرت شیخ التفسیر علیہ الرحمۃ کو کس کر دیکھتا ہُوں، بے ساختہ زبان سے یہ کلمہ ادا ہو جاتا ہے، حضرت مولانا احمد علی یقیناً اِس دَور کے حسن بصری ہیں۔"[1]

نوشہرہ چھاؤنی کے جناب احمد عبدالرحمٰن صدیقی نے اپنے پیر مولوی احمد علی لاہوری کو صدیقِ اکبر کے مقام پر فائز بتاتے ہُوئے تصریحاً لکھا اور دیوبندی حضرات نے اُسے یُوں مشتہر کیا ہے:

"۵ر دسمبر ۱۹۵۷ء سوموار کے دن بیعت کی اور واپس نوشہرہ گیا تو چند ایّام کے بعد خواب میں دیکھا کہ ایک جگہ ہے اور لوگ بتلا رہے ہیں، یہ حضرت صدیق اکبر اور یہ بقیہ صحابہ کے مکانات ہیں۔ حضرت صدیق اکبر کے مکانات کے دروازے سبز تھے۔ میں نے دستک دی۔ اندر سے ایک بچّہ نکلا۔ مَیں نے اُس سے پُوچھا کہ حضرت صدیق اکبر کہاں ہیں؟ تو اُس نے سامنے چوبارے کی طرف اشارہ کیا کہ وُہ سامنے درسِ قرآن دے رہے ہیں۔ مَیں نے جب دیکھا تو وہ حضرت لاہوری تھے۔ اِس کے بعد مَیں جاگ اُٹھا اور اِس معمّہ کو نہ سمجھ سکا۔ تب سمجھ میں آیا جب حضرت کے انتقال پر علّامہ انور صابری صاحب ہندوستان سے بسلسلۂ تعزیت تشریف لائے تو اُنھوں نے کہا کہ حضرت لاہوری مقامِ صدیقیت

---

[1] خدام الدین، ۱۳ر اپریل ۱۹۶۲ء، ص ۱۲

پر فائز تھے۔ تب مجھے اپنے خواب کی تعبیر معلوم ہوئی۔"[1]

دیوبندی حضرات جب اپنے مولویوں کے لیے کوئی مقام ثابت کرنا چاہتے ہیں تو اُس کے لیے عموماً خواب گھڑتے اور گھڑے گھڑائے خوابوں کے سہارے اپنا خیالی شیش محل تعمیر کر لیا کرتے ہیں۔

ہمارا ارادہ تھا کہ اِسی باب کے اندر ہم دیوبندی حضرات کے ایسے خوابوں اور اِن کے متضاد فتووں اور متضاد عقاید و بیانات کو دو مستقل عنوانات کے تحت ضبطِ تحریر میں لاتے لیکن اِن دونوں عنوانات کی وسعت کے تحت بخوافِ طوالت یہاں اُنھیں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ احقر کا ارادہ ہے کہ جلد از جلد اِن عنوانات پر مستقل کتابیں پیش کی جائیں گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

ہاں تو ذکر ہے مولوی احمد علی لاہوری کا۔ مولوی مناظر حسین نظر لکھتے ہیں کہ ختمِ نبوت کی تحریک کے سلسلے میں جب احمد علی صاحب اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی ملتان جیل میں تھے تو قاضی صاحب نے مولوی احمد علی صاحب لاہوری کو کس رنگ رُوپ میں دیکھا یہ مولوی مناظر صاحب کے قلم سے پُوچھیے:

> "قاضی صاحب کہتے ہیں کہ مَیں اُن (لاہوری صاحب) کی کوٹھری کے پاس سے گزرتا تو یہ معلوم ہوتا کہ اللہ کا نور، اللہ کی بارگاہ میں سربسجدہ ہے۔"[2]

کیا اب بھی اِس حقیقت میں کسی شک و شُبہ کی گنجائش ہے کہ وہابیت اصل میں انبیاءِ کرام و اولیاءِ عظام سے بغض و عناد ہی کا نام ہے۔ اگر کائناتِ ارضی و سماوی کی سب سے ممتاز ہستی اور بعد از خدا بزرگ توئی کے منصب پر فائز ہونے والے محبوبِ پروردگار کے لیے اللہ کا نور کہیے تو وہابیوں کا مفتیِ اعظم سے جاہل مطلق تک بہ پکا یقین رکھتا ہے کہ ایسا کہنے والے نے کفر کیا، حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو خدائے وحدہٗ لاشریک کا شریک ٹھہرا دیا۔ لیکن اِس بات پر کفر و شرک کا فتویٰ جڑنے والے قلم کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہونے پاتی کہ اپنے مولویوں اور مُلّاؤں کے لیے اللہ کا نور لکھ دیا جاتا ہے۔ آخر یہ دھاندلی ایک روز رنگ لائے گی۔ اِنَّ مَوْعِدُکُمُ الصُّبْحُ ط اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ۔

---

[1] خدام الدین، ۲۲ فروری ۱۹۶۳ء، ص ۳۶، ۴۶

[2] خدام الدین، ۱۳ اپریل ۱۹۶۲ء، ص ۱۸

دیوبندی حضرات کے نزدیک مولوی عبدالقادر رائے پوری (المتوفی ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء) بڑے ولیِ کامل اور صاحبِ کشف و کرامت بزرگ ہو گزرے ہیں۔ موصوف کے خلیفۂ مجاز مولوی جمیل احمد میواتی نے اپنے پیر کے عَلِیمٌ "بِذَاتِ الصُّدُوْرِ" ہونے کے بارے میں تحریر کیا ہے:

"شام کا وقت تھا۔ مہمان چونکہ ابھی تھوڑے ہی تھے لہٰذا بڑے کمرے میں حضرت اقدس کے ساتھ ہی کھانا کھانے کی سعادت ملی۔ درمیان میں حضرت اقدس تکیہ سے ٹیک لگائے چار زانو بیٹھے ہوئے کھانا نوش فرما رہے تھے۔ دائیں بائیں دو قطاروں میں مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ بائیں قطار کے سب سے آخر میں، مَیں بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت کو چار زانوں بیٹھے ہوئے دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا کہ بھائی! ہم نے تو سُنا تھا کہ یہ بہت بڑے بزرگ ہیں، مگر کھانا تو اُن تین طریقوں کے خلاف کھا رہے ہیں جو ہم کو جماعت میں بتائے گئے ہیں۔ حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ، ساری دنیا جن کے کمالات و بزرگی کی قائل ہے اور اُن کا لوہا مانتی ہے اور جن کی کرامتوں میں سے سب سے بڑی کرامت یہی سمجھی جاتی ہے کہ ساری عمر حضرت نے اپنی کسی حرکت و سکون سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ مجھ میں بھی کوئی کمال ہے، وہیں سے بیٹھے بیٹھے میرے دل میں سے گزرنے والے خطرہ کو اپنے کشفِ عالیہ کے ذریعے سے معلوم کرتے ہوئے میری اصلاح کی غرض سے فرمایا: بھائی! جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ ویسے ہی کھاؤں لیکن میں بوڑھا ہوں اور بیماری کے سبب معذور بھی ہو چکا ہوں۔"[1]

جب بات انبیائے کرام اور اولیائے عظام کی ہو تو وہابی حضرات کا ہر قلم دین و ایمان کے سینے پر نشتر زنی کا کام کرتا چلا جاتا ہے لیکن جب اُن میں سے کسی قلم کا رُخ اپنے مُلاؤں کی

---

[1] خدام الدین، ۲۲ فروری ۱۹۶۳ء، ص ۱۵، ۱۶

جانب ہوا، تو ابھی ابھی جب باتوں کو کفر و شرک قرار دیا تھا وہ عین ایمان اور قرآن و حدیث کی تعلیم کے بالکل مطابق قرار پا جائیں گی۔ باطل کا ہمیشہ سے یہی خاصہ رہا ہے اور دیوبندی حضرات کے ایسے دوغلے پن کے پیشِ نظر بے ساختہ کہنا پڑ جاتا ہے: ع

اللہ رے خود ساختہ قانون کا نیرنگ

علمائے دیوبند کا تصوّف

حدیث کی اصطلاح میں جسے احسان کہتے ہیں، اُسی کا نام تصوّف ہے۔ غیر مقلد اور مودودی نما وہابیوں کے نزدیک تصوّف کا سارا شعبہ ہی بدعت اور شجرِ ممنوعہ ہے جبکہ دیوبندی حضرات اِس کے قائل ہی نہیں بلکہ اپنی فرضی پیری مریدی کا جال بچھا کر عوام الناس کو اپنے دامِ تزویر میں پھنساتے رہتے ہیں۔ گزشتہ عنوان کے تحت قارئینِ کرام نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ دیوبندی حضرات نے شاید ہی اپنے کسی مولوی کو چھوڑا ہو جسے منصبِ اُلوہیت پر فائز نہ کر سکے ہوں ورنہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے فضائل و کمالات میں بڑھ چڑھ کر دکھانا تو اِن حضرات کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اِن حضرات کی تصانیف کے مطالعے سے ایک بے خبر آدمی کو یہی محسوس ہوگا کہ دنیا میں اگر کہیں صاحبِ کمال پیدا ہوئے تو وہ علمائے دیوبند ہیں جبکہ اہلِ نظر پر واضح ہے کہ حقیقت اِس کے سراسر برعکس ہے۔ یہ بزرگی کے دعوے، یہ کرامتوں کے چرچے، یہ کشف و الہام کے صیغے محض دنیاوی کاروبار کو چمکانے اور خود کو اہلسنّت وجماعت باور کروانے کی خاطر اختیار کر رکھے ہیں۔ آئیے دیوبندی حضرات نے جو تصوّف و رُوحانیت کا فلک بوس شیش محل تعمیر کیا ہُوا ہے، اُس کے اندر تو جھانک کر دیکھیں۔ چنانچہ حافظ ضامن صاحب کے بارے میں مولوی عاشق الٰہی میرٹھی نے بروایت مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب لکھا ہے:

> ”حضرت حافظ صاحب کے مزاج اور خوش مزاجی کے بہت قصے بیان فرمایا کرتے تھے۔ ایک بار فرمایا: حافظ صاحب کو مچھلی کے شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک بار ندی پر شکار کھیل رہے تھے، کسی نے کہا: حضرت! ہمیں۔ آپ نے فرمایا: اب کے ماروں تیری۔“ [1]

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی، مولوی: تذکرۃ الرشید، حصہ دوم، ص ۲۷۰

یہ واقعہ حکایاتِ اولیا، مرتّبہ مولوی اشرف علی تھانوی، مطبوعہ کراچی کے صفحہ ۲۴ پر بھی موجود ہے۔

اب مولوی رشید احمد گنگوہی کا ایک خواب مولوی عاشق الٰہی میرٹھی کی زبانی سُنیے:

”آپ (گنگوہی صاحب) ایک مرتبہ خواب بیان فرمانے لگے کہ مولوی محمد قاسم کو مَیں نے دیکھا کہ دُلہن بنے ہُوئے ہیں اور میرا نکاح اُن کے ساتھ ہُوا۔ پھر خود ہی تعبیر فرمائی کہ آخر اُن کے بچّوں کی کفالت کرتا ہی ہوں۔“ [1]

اب دیکھنا یہ ہے کہ جو خواب مولوی محمد قاسم نانوتوی کی وفات کے بعد دیکھا گیا کیا وہ نانوتوی صاحب کی زندگی میں کبھی اپنے اصلی رنگ رُوپ میں بھی دیکھا جاتا تھا یا نہیں؟ اِس کا جواب ملاحظہ ہو:

”حضرت والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب وعمِّ محترم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا کہ ایک دفعہ گنگوہ کی خانقاہ میں مجمع تھا۔ حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی کے مرید و شاگرد سب جمع تھے اور یہ دونوں حضرات بھی وہیں مجمع میں تشریف فرما تھے کہ حضرت گنگوہی نے حضرت نانوتوی سے محبت آمیز لہجہ میں فرمایا کہ یہاں ذرا لیٹ جاؤ۔ حضرت نانوتوی کچھ شرما سے گئے مگر حضرت نے پھر فرمایا تو بہت ادب کے ساتھ چت لیٹ گئے۔ حضرت (گنگوہی صاحب) بھی اُسی چارپائی پر لیٹ گئے اور مولانا کی طرف کو کروٹ لے کر اپنا ہاتھ اُن کے سینے پر رکھ دیا جیسے کوئی عاشقِ صادق اپنے قلب کو تسکین دیا کرتا ہے۔ مولانا ہر چند فرماتے ہیں کہ میاں کیا کر رہے ہو، یہ لوگ کیا کہیں گے؟ حضرت نے فرمایا: لوگ کہیں گے کہنے دو۔“ [2]

دیوبندیوں کے نزدیک مولوی محمد قاسم نانوتوی بہت بڑے بزرگ اور حجۃ الاسلام تھے۔ موصوف کے بزرگانہ ارشادات کی ایک جھلک دیوبندی حضرات ہی کی زبانی ملاحظہ ہو:

---

[1] تذکرۃ الرشید، حصہ اوّل، ص ۲۴۵

[2] اشرف علی تھانوی، مولوی: حکایاتِ اولیاء، ص ۲۲۹

"والد صاحب نے فرمایا کہ ایک دفعہ چھتے کی مسجد میں مولانا فیض الحسن صاحب استنجے کے لیے لوٹا تلاش کر رہے تھے اور اتفاق سے سب لوٹوں کی ٹوٹیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ فرمانے لگے کہ توبہ، سارے لوٹے مختون ہی ہیں۔ حضرت (نانوتوی صاحب) نے ہنس کر فرمایا، پھر آپ کو تو بڑا استنجا نہیں کرنا ہے (گویا مختون سے کیا ڈر رہے)۔ [1]

مولوی اشرف علی تھانوی دیوبندی حضرات کے نزدیک بہت بڑے بزرگ، بلکہ مجدّد بلکہ جامع المجدّدین تھے۔ موصوف نے اپنے بچپن کے واقعات بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ مریدوں کو بتایا:

"ایک روز ایسا ہوا کہ بھائی پیشاب کر رہے تھے، میں نے اُن کے سر پر پیشاب کرنا شروع کر دیا۔" [2]

اب حکیم الامت صاحب کی مہمان نوازی کا ایک بے نظیر واقعہ ملاحظہ فرمایا جائے:

"ایک صاحب تھے سیکری کے، ہماری سوتیلی والدہ کے بھائی، بہت ہی نیک اور سادہ تھے۔ والد صاحب نے اُن کو ٹھیکے کے کام پر رکھ چھوڑا تھا۔ ایک مرتبہ مجسٹریٹ سے گرمی میں بھوکے پیاسے گھر آئے اور کھانا نکال کر کھانے میں مشغول ہوئے۔ گھر کے سامنے بازار ہے۔ میں نے سڑک پر سے ایک کُتے کا پلا چھوٹا سا پکڑ کر، گھر لا کر، اُن کی دال کی رکابی میں رکھ دیا۔ بیچارے روٹی چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔" [3]

موصوف گھر میں اور کس قسم کی کرامتیں دکھایا کرتے تھے۔ خود اُن کی زبانی ایک واقعہ سُنیے اور اندازہ کیجیے:

---

[1] اشرف علی تھانوی، مولوی: حکایاتِ اولیاء، ص ۲۸۷

[2] الافاضات الیومیہ، جلد چہارم، ص ۲۷۴

[3] ایضاً: ص ۲۷۳

"ہم لوگ والد صاحب کے پاس رہتے تھے۔ تین چارپائیاں برابر بچھی ہوتی تھیں، والد صاحب اور ہم دونوں بھائیوں کی۔ میں نے رسّی لے کر سب کے پائے ملا کر خوب کس کر باندھ دیے اور لیٹ کر سو گئے۔ پھر والد صاحب بھی آکر لیٹ گئے۔ اتفاق سے بارش آئی تو والد صاحب اُٹھے اور ..... اپنی چارپائی گھسیٹی۔ اب وہاں تینوں چارپائیاں ایک ساتھ چلی آرہی ہیں۔ بیحد غصّے ہُوئے اور فرمایا کہ ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔"[1]

اب ذرا یہ ملاحظہ ہو کہ تھانوی صاحب مسجدوں میں کیسی حرکتیں کیا کرتے تھے۔ موصوف نے اپنی ایک ایسی کرامت اپنے مریدوں کے سامنے یُوں فخریہ بیان فرمائی اور اُس کی اشاعت کروائی گئی:

"ایک مرتبہ میرٹھ میں میاں الٰہی بخش صاحب مرحوم کی کوٹھی میں جو مسجد ہے (میں نے) سب نمازیوں کے جُوتے جمع کر کے اُس کے شامیانے پر پھینک دیے۔ نمازیوں میں غُل ہُوا کہ جُوتے کیا ہُوئے۔"[2]

موصوف حکیمانہ مسجدیں بناتے اور اُن میں نماز باجماعت کا اہتمام بھی کر دیا کرتے تھے۔ اب دیوبندیوں کے حکیم الامت صاحب کی زبانی سُنیئے کہ وُہ مسجد اور امامت کیسی ہوتی تھی:

"ایک روز سب لڑکے اور لڑکیوں کے جُوتے جمع کر کے اُن کو برابر رکھا اور ایک جُوتے کو سب کے آگے رکھا، وہ گویا کہ امام تھا اور پلنگ کھڑے کر کے، اُس پر کپڑے کی چھت بنائی، وہ مسجد قرار دی۔"[3]

تھانوی صاحب اپنی ایسی حرکتوں کے باعث اپنے خاندان اور والدِ محترم کے لیے باعثِ ننگِ عار مشہور ہو چکے تھے۔ چنانچہ اِس امر کا اُنھوں نے اپنے مریدوں کے سامنے خود یُوں اعتراف کیا تھا:

"جہاں اِس قسم کی کوئی بات شوخی کی ہوتی تھی۔ لوگ والد صاحب کا نام لے کر

---

[1] الافاضات الیومیہ، جلد چہارم، ص ۲۷۳ [2] ایضاً: ص ۲۷۳

[3] ایضاً: ۲۷۲

کہتے کہ اُن کے لڑکوں کی حرکت معلوم ہوتی ہے۔"[1]

دیوبندی حضرات یہ کہہ سکتے ہیں تھانوی صاحب کی یہ نازیبا حرکات اُس وقت کی ہیں جب وُہ سنِ شعور کو نہیں پہنچے تھا۔ چلیے ایسا ہی ہوگا کہ جناب مولوی صاحب کو اُس وقت اپنے مریدوں اور معتقدوں میں ایسی بیہودہ باتوں کے تذکرے اور اُنھیں شایع کروانے کی کیا ضرورت پیش آتی تھی، جب کہ اُن کی علامگی اور دیوبندی فرقے میں اُن کے حکیم الامت اور مجددِ دین و ملت ہونے کے ڈھول بجائے جا رہے تھے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وُہ مریدوں کے سامنے ایسی نازیبا حرکتوں کا سرے سے تذکرہ ہی نہ کرتے۔ بہرحال اب تھانوی صاحب کی اُس دور کی تہذیب و شرافت ملاحظہ فرمائیے، جب اُن کی علامگی اور خانہ ساز بزرگی کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ قارئینِ کرام! ذرا دیوبندیوں کے حکیم الامت اور مجددِ دین و ملت کہلانے والے کی طرزِ گفتگو، معیارِ شرافت اور مریدوں کی تربیت کا اندازہ ملاحظہ فرمائیں۔ تھانوی صاحب فرماتے ہیں:

"ایک شخص نے مجھ سے شکایت کی کہ ذکر میں جو پہلے مزہ آتا تھا، اب نہیں آتا۔ مَیں نے کہا کہ میاں مزہ تو مذی میں ہوتا ہے، یہاں کیا مزہ ڈھونڈتے پھرتے ہو؟"[2]

دیوبندیوں کی تہذیب و شرافت کا ایک نادر شہکار اور ملاحظہ ہو۔ مولوی لطف اللہ دیوبندی نے لکھا ہے:

"مکتب کے لڑکوں نے حافظ جی کو نکاح کی ترغیب دی کہ حافظ جی نکاح کر لو، بڑا مزہ ہے۔ حافظ جی نے کوشش کر کے نکاح کیا اور رات بھر روٹی لگا لگا کر کھائی۔ مزہ کیا خاک آتا، صبح کو لڑکوں پر خفا ہوتے ہوئے آئے کہ سُسرے۔ کہتے تھے کہ بڑا مزہ ہے، ہم نے روٹی لگا کر کھائی ہمیں تو نہ نمکین معلوم ہوئی، نہ میٹھی، نہ کڑوی۔ لڑکوں نے کہا کہ حافظ جی! مارا کرتے ہیں۔ آئی شب، حافظ جی نے بیچاری کو خوب زدوکوب کیا۔ دے

---

[1] الافاضات الیومیہ، جلد چہارم، ص ۲۷۳

[2] الافاضات الیومیہ، جلد اول، ص ۳۰۷

جُوتا، دے جوتا، تمام محلہ جاگ اُٹھا اور جمع ہو گیا اور حافظ جی کو بُرا بھلا کہا۔ پھر صبح آئے اور کہنے لگے کہ سسروں نے دِق کر دیا۔ رات ہم نے مارا بھی کچھ مزہ نہ آیا اور رُسوائی بھی ہُوئی۔ تب لڑکوں نے کھول کر حقیقت بیان کی کہ مارنے سے یہ مراد ہے۔ اب جو شب آئی تب حافظ جی کو حقیقت منکشف ہُوئی۔ صبح کو جو آئے تو مونچھوں کا ایک ایک بال کِھل رہا تھا اور خوشی میں بھرے ہُوئے تھے۔" [1]

مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کی حکیمانہ تعلیمات ملاحظہ ہوں جن کی مریدوں کو تلقین کرتے رہا کرتے تھے چنانچہ موصوف نے بغیر شرمائے ایک واقعہ اپنے مریدوں کے سامنے یُوں بیان کیا جو ملفوظات کا حصہ قرار پایا؛

"عوام کے عقیدہ کی بالکل ایسی حالت ہے جیسے گدھے کا عضوِ مخصوص، بڑھے تو بڑھتا ہی چلا جائے اور جب غائب ہو تو بالکل پتہ ہی نہیں۔ واقعی عجیب مثال ہے۔" [2]

یہ عجیب مثال ہے تو تھانوی صاحب کی زبانی ذہانت کا کمال ملاحظہ ہو۔ اُنھوں نے فرمایا تھا؛

"ایک شخص کسی مکان میں اندر سے کنڈی لگا کر کسی عورت سے زنا کر رہا تھا۔ لوگوں نے دستک دی تو اب اندر سے کہتا ہے کہ میاں! یہاں جگہ کہاں ؟ یہاں خود ہی آدمی پر آدمی پڑا ہے۔ دیکھ لیجیے کیسا سچا آدمی تھا۔ جھوٹ نہیں بولا۔ کیسی ذہانت کا جواب ہے۔" [3]

خیر یہ تو تھانوی صاحب نے اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں جھوٹ نہ بولنے کی تلقین فرمائی ہے اب بزرگی کے اظہار اور حقایق و معارف بیان کرنے کا طریقہ بھی جامع المجدّدین صاحب ہی سے معلوم کرنا چاہیے کیونکہ اُن کے سوا اِس شرافت سے بسے ہُوئے کوچہ کا شناسا اَور

---

[1] لطف اللہ، مولوی: علمائے حق، ص ۱۲

[2] الافاضات الیومیہ، جلد چہارم، ص ۷

[3] الافاضات الیومیہ، جلد چہارم، ص ۵۰

کون ہوسکتا ہے۔ موصوف نے ایک مرتبہ فرمایا تھا:

"ماموں صاحب بولے کہ میں بالکل ننگا ہوکر بازار میں ہوکر نکلوں۔ اِس طرح ایک شخص تو آگے سے میرے عضوِ تناسل کو پکڑ کر کھینچے، ساتھ میں لڑکوں کی فوج ہو اور وُہ یہ شور مچاتے جاویں، بھڑوا ہے، بھڑوا ہے اور اُس وقت مَیں حقائق اور معارف بیان کروں۔"[۱]

تھانوی صاحب کا یہ حکیمانہ ملفوظِ گرامی بھی دیوبندیوں کی تربیت کے لیے مشتہر کیا گیا ہوگا۔

چنانچہ لکھا ہے:

"قصبہ رامپور میں حضرت مولانا گنگوہی نے ایک واقعہ میں طلاق کے متعلق کوئی فتویٰ دیا تھا۔ کسی عورت نے قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ کر اُس کے خلاف یہ فتویٰ دے دیا کہ قرآن میں یہ لکھا ہے۔ حکیم ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے بیان کیا۔ فرمایا وہ کیا جانے چُدّو کہیں کی۔"[۲]

میرا خیال ہے کہ دیوبندی حضرات کے بقیۃ السلف وعمدۃ الخلف عالیجناب تھانوی صاحب کے ملفوظاتِ مذکورہ بالا ہی اِس جماعت کی تہذیب و شرافت اور بزرگی کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔ مَاقَلَّ وَکَفٰی کے تحت، طوالت سے بچنا اور اِن پر ہی اکتفا کرنا مناسب ہے۔ قارئینِ کرام نے اِن سے ہی بخوبی محسوس کر لیا ہوگا کہ:

ہیں ستارے کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کُھلا

۴۔ بانیِ جماعتِ اسلامی کے کارنامے

یوں تو عالیجناب مودودی صاحب نے اپنی بلند قامت ہستی اور بین الاقوامی شہرت کی مالک شخصیت ہونے کے باعث ملّتِ اسلامیہ پر کتنے ہی مخصوص احسانات فرمائے ہیں

---

[۱] الافاضات الیومیہ، جلد ہفتم، ص ۸۳

[۲] ایضاً: ص ۷۵

جو تاریخ کا ایک پُراسرار اور المناک باب بن چکے ہیں، لیکن یہ احسان اپنی جگہ پر نرالی ہی شان رکھتا ہے کہ جو ملت پہلے ہی متعدد فرقوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے اُس پر ایک تازہ فرقے کا بوجھ اور لاد دیا۔ اللہ اور رسول نے فرقہ بازی سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے اور ایسا کرنے والوں کے بارے میں سخت وعیدیں سُنائی گئی ہیں لیکن بین الاقوامی شخصیت ہونے کے باعث جناب مودودی صاحب نے اُن کی ذرا پروا نہ کی۔ وہابیت کا تیسرا ایڈیشن مرتب کرکے شایع فرمادیا اور جماعتِ اسلامی کے خوشنما نام سے مسلمانوں کی فہرست میں ایک فرقہ اور شامل کردیا۔ کاش! وہ ایسا وبال اپنے سر نہ لیتے اور اپنا زورِ قلم بکھرے ہوئے مدعیانِ اسلام کو جوڑنے اور بہک جانے والوں کو راہِ راست پر لانے میں صرف کرتے۔ اگر راہِ راست سے اُنھیں چڑ تھی اور وہابیت پر جان چھڑکنا اور اسی کی تبلیغ و اشاعت کرنا وہ ضروری خیال کرتے اور باعثِ نجات گردانتے تھے تو غیر مقلدوں یا دیوبندیوں میں شامل رہتے لیکن نیا فرقہ کھڑا کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی سے پہلے پاک و ہند میں وہابیت کا نام و نشان بھی نہیں تھا اور محمد بن عبدالوہاب نجدی سے پہلے رُوئے زمین پر اس جماعت کا کہیں وجود نظر نہیں آتا تھا۔ اِسی طرح مولوی رشید احمد گنگوہی سے پہلے دیوبندی عقاید و نظریات کی اِس نام سے کوئی جماعت نہ تھی۔ سر سید احمد خاں علی گڑھی سے پہلے کوئی نہیں جانتا تھا کہ نیچریت کون سے درخت کا نام ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی سے پہلے مرزائی فرقہ، خواہ وہ قادیانی ہوں یا لاہوری، ہرگز نہ تھا۔ غلام احمد پرویز سے پہلے خود کو اہلِ قرآن بتانے والا پرویزی ٹولہ دنیا کے طبقے پر ناپید تھا اور مودودی صاحب دی گریٹ سے پہلے کوئی فرقہ جماعتِ اسلامی کے نام سے انسانوں میں متعارف نہیں تھا۔ موخرالذکر دونوں فرقوں کے بانی تاحال بقیدِ حیات ہیں۔ کاش! اللہ تعالیٰ اِن دونوں حضرات کو ہدایت بخشے کہ فرقے بنانے کا جو وبال اپنے سر لیا ہے، اُس سے تائب ہوکر، راہِ ہدایت اختیار کرلیں۔ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہونے سے پہلے وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ پر عمل کرلیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہماری ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا تھا

سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی ہادیِ کُل اور ہدایت کا چشمہ ہیں۔ قیامت تک آنے والوں مدعیانِ اسلام میں سے راہِ ہدایت پر وہی شمار ہوگا جو اُس آقائے کائنات کے لائے ہُوئے دین پر ثابت قدم رہے اور اُس میں کسی قسم کی کاٹ چھانٹ نہ کرے۔

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اسلام صحابۂ کرام نے سیکھا، اُن سے تابعین نے، اُن سے تبع تابعین نے، غرضیکہ اِسی طرح ہر نئی نسل اپنے بزرگوں سے دین حاصل کرتی اور اُسے اگلی نسل تک پہنچاتی رہی۔ قیامت تک اِسی طرح دین جاری رہے گا۔ اِس حقیقت کی روشنی میں قارئین کرام غور تو فرمائیں کہ جو جماعتیں اور فرقے کل یا پرسوں کی پیداوار ہیں اگر اُن میں سے کسی کی حقانیت کا ڈھول پیٹا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حقانیت اُنھیں بطور میراث ملی ہے یا اُن پر نازل ہوئی ہے؛ دونوں میں سے ہر شق محتاجِ ثبوت ہے۔ جن کی جماعتوں کا ماضی میں وجود ہی نہیں اُنھیں کس کی میراث ملتی؛ رہا نزول کا معاملہ تو سیدالمرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دین کا منسوخ ہونا اور کسی دُوسرے پر برحق دین کے نازل ہونے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دریں حالات دینِ مصطفیٰ کے دشمنوں اور ملّتِ اسلامیہ کے بدخواہوں نے یہ راستہ اختیار کیا کہ سیدالانبیاء سے دین کی میراث پانے والوں کو غلط اور اہلِ باطل قرار دیا، اُن کی بعض کوتاہیوں اور کمزوریوں کو سامنے رکھ کر اصلاح کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے، جب بعض بھولے بھالے مسلمان اُن کی اصلاحی سرگرمی سے متاثر ہو کر ہمنوا بنے تو اپنا رنگ یُوں دکھانا شروع کیا کہ مقدس شجرِ اسلام میں بعض خود ساختہ عقاید و نظریات کے پیوند لگا کر نیا اور تازہ بتازہ دین پیش کرنے لگ گئے۔ علمائے ملّت جب اُن خود ساختہ ایجادات پر گرفت کرتے تو اپنا اصلاحی رنگ سامنے کر کے مسلمانوں کو ورغلاتے کہ دیکھیے یہی لوگ ہیں جو فلاں فلاں غلطیوں اور کوتاہیوں کے مروّج ہیں اور اصلاح سے کس درجہ کانپتے اور دشمنی رکھتے ہیں۔ گمراہ گروں کا یہی دوغلہ پن ہے جس کے باعث ہر تخریب کار اور فرقہ ساز اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرتا رہا ہے۔ اِس حقیقت کو خود جناب مودودی صاحب نے یُوں بیان کیا ہے:

"یہ بھی انسان کی عین فطرت ہے کہ وہ برائی کی کھُلی دعوت کو کم ہی قبول کرتا ہے۔ عموماً اُسے جال میں پھانسنے کے لیے ہر داعیِ شر کو خیر خواہ کے بھیس ہی

ہیں آنا پڑتا ہے۔"[1]

مودودی صاحب کا خدا

خالقِ کائنات جلّ جلالہٗ تو ہر عیب و نقص سے پاک ہے لیکن مودودی صاحب کا خدا شاید ایسے امور و صفات کو تکلفات گردانتا ہے کہ اِن سے بچنا چنداں ضروری نہیں سمجھتا۔ چنانچہ عالی جناب مودودی صاحب نے سورۂ بقرہ کے الفاظ اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ کا بقلمِ خود ترجمہ یوں کیا ہے:

"اللہ اُن سے مذاق کر رہا ہے۔"[2]

سورۃ التوبہ کی آیت ۹، کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"اللہ اُن مذاق اُڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے۔"[3]

ہنسی مذاق عام طور پر جھگڑے فساد کی بنیاد ہو کر رہ جاتا ہے۔ اچھا ہوتا اگر مودودی صاحب یہ بھی بتا دیتے کہ جب اُن کا پروردگار اکثر اوقات منافقینِ مدینہ سے مذاق کرتا رہتا تھا تو کبھی ہاتھا پائی یا جوتم پیزار تک بھی نوبت پہنچ جاتی تھی یا نہیں؟ ہو سکتا ہے کہ اگر معمول میں فرق نہ آیا ہو تو عدالتی چارہ جوئی تک نوبت بھی پہنچی ہو۔ بہر حال اچھا ہوتا کہ بین الاقوامی محقق صاحب مذکورہ بالا امور پر بھی روشنی ڈال دیتے۔ جناب مودودی صاحب نے اپنے خدا کی شان، خود اُس کی زبانی یوں بھی بیان کی ہے:

"کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں۔"[4]

"میری چال کا کوئی توڑ نہیں۔"[5]

"اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔"[6]

"یہ چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی اُنھیں خبر نہ تھی۔"[7]

---

[1] مودودی صاحب، مولوی: تفہیم القرآن، جلد دوم، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۶

[2] ایضاً: جلد اول، ص ۵۴

[3] ایضاً: جلد دوم، ص ۲۱۹

[4] ایضاً: جلد دوم، ص ۶۱

[5] ایضاً: جلد دوم، ص ۱۰۴

[6] ایضاً: جلد دوم، ص ۱۴۱

[7] ایضاً: جلد سوم، ص ۵۸۴

لفظ چال ذو معنی ہے۔ اِس میں نا قابلِ اعتراض مفہوم بھی موجود ہے اور قابلِ اعتراض اُس سے بدرجہا زیادہ ہے۔ مودودی صاحب جیسی بین الاقوامی شخصیت کو اپنے پروردگار کے بارے میں ایسا لفظ استعمال کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے تھا جو زیادہ تر قابلِ اعتراض معنیٰ ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ یقیناً وہ اِس بات سے بے خبر نہیں ہیں کہ لفظ رَاعِنَا ہرگز ذو معنی نہیں۔ اِس میں کوئی قابلِ اعتراض مفہوم شامل نہیں، لیکن یہودی اپنے بغض و عناد کی آگ میں جلتے ہُوئے دلوں کو کسی قدر ٹھنڈک پہنچانے کی خاطر اِس لفظ سے ناجائز فائدہ اُٹھا لیا کرتے تھے یعنی بظاہر یُوں معلوم ہوتا کہ وہ رَاعِنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہ کہہ رہے ہیں لیکن حقیقت میں رَاعِیْنَا اور رَاعُوْنَا وغیرہ الفاظ ادا کیا کرتے تھے۔ اللہ جل مجدہٗ نے یہود کی شرارت کے پیشِ نظر صحابۂ کرام جیسی قدسی جماعت اور عشقِ مصطفیٰ کی اُن مُنہ بولتی تصویروں کو بھی لفظ رَاعِنَا کے استعمال سے روک دیا۔ پروردگارِ عالم نے اپنے حبیب اور برگزیدہ ترین بندے کی شان میں وہ لفظ استعمال کرنے سے روک دیا جس میں کوئی قابلِ اعتراض معنی نہیں لیکن معاندین اُس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر توہین و تنقیص کا پہلو پیدا کر دیتے تھے۔ کیا وُہ خدائے ذوالجلال اپنے متعلق ایسا لفظ پسند فرمائے گا، جو زیادہ تر قابلِ اعتراض معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ ناراض ہونے کی نسبت غور کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ وقار کا مسئلہ بنا کر اکڑ جانا فضول ہے کیونکہ ایمان جیسی متاعِ عزیز کا حاصل کرنا اور سنبھال کر رکھنا حاصلِ زندگی ہے۔

انبیائے کرام پر تیر اندازی

مودودی صاحب کا قلم جب اپنے پروردگار کو نظر انداز نہیں کر سکتا تو حضرات انبیائے کرام کو اپنی تیر افگنی کا ہدف بنائے بغیر کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب نے سیدنا ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت کو داغدار کرتے ہُوئے یُوں اپنا تحقیقی رنگ دکھایا ہے؛

> ‘بعض لوگوں نے اُس میں عزم نہ پایا کا مطلب یہ لیا ہے کہ ہم نے اُس میں نافرمانی کا عزم نہ پایا یعنی اُس نے جو کچھ کیا، نافرمانی کے عزم کی بناء پر نہیں کیا، لیکن یہ خواہ مخواہ کا تکلف ہے۔ یہ بات اگر کہنی ہوتی تو لَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا

عَلَی الْعِصْیَانِ کہا جاتا نہ کہ محض لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ فقدانِ عزم سے مراد اطاعتِ حکم کا فقدان ہے نہ کہ نافرمانی کے عزم کا فقدان۔"[1]

انبیائے کرام کا معصوم ہونا ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس پر تمام مسلمانوں کا ہمیشہ اتفاق رہا ہے لیکن جن حضرات کو شیطان اپنی نیابت میں اِس مقدس گروہ کے خلاف کھڑا کرتا ہے وہ اپنے ملعون قائد کی طرح علمی ساز و سامان سے لیس ہو کر محسوس یا غیر محسوس طریقے پر حفاظتِ توحید یا زورِ تحقیق کا بہانہ لے کر انبیائے کرام جیسی پاکیزہ ہستیوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنائے بغیر نہیں چھوڑتے۔ کاش! مودودی صاحب اِتنا غور فرما لیتے کہ وہ اِس آیت میں لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا سے نافرمانی کے عزم کا فقدان اِس مجبوری کے تحت مراد نہیں لے سکے کہ اِس آیت کے الفاظ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا عَلَی الْعِصْیَانِ نہیں ہیں تو اسی فقدانِ عزم سے اطاعتِ حکم کا فقدان مُراد لینے کیلئے کیا اُنھیں اِس آیت میں عَلَی الطَّاعَةِ بھی لکھا ہوا نظر آ گیا ہے؟ مودودی صاحب! اگر اِس آیت میں علی العصیان نہیں تو علی الطاعۃ بھی نہیں ہے، اِس صورت میں غور طلب یہ امر ہے کہ انبیائے کرام کی عصمت پر یقین رکھنے والا آخر لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا سے نافرمانی کے عزم کا فقدان ہی مراد لے سکتا ہے اور ایک مسلمان کی رُوح بھی اِس بات کے تصوّر تک سے کانپنے لگے گی کہ وہ انبیائے کرام جیسی مقدس ترین ہستیوں میں اطاعتِ حکم کا فقدان بتائے اور ایسی بات کی تشہیر سے تو اُس کا ہر بُن مُو ابا کرے گا۔ آگے ملاحظہ ہو کہ بین الاقوامی مفکّر صاحب نے اپنی تحقیق کے دریا بہاتے ہُوئے سیّدنا ابراہیم خلیل اللّٰہ علیہ السلام کی عظمت کو کس طرح داغدار کرنے اور مسلمانوں کے دلوں سے عصمتِ انبیاء کے عقیدے کو نکال دینے کی کوشش کی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

"اِس سلسلے میں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے، وُہ یہ کہ جب حضرت ابراہیم

---

[1] مودودی صاحب، مولوی: تفہیم القرآن، جلد سوم، طبع سوم ۱۹۶۹ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۳۰

نے تارے کو دیکھ کر کہا، یہ میرا رب ہے، اور جب چاند اور سورج کو دیکھ کر اُنھیں اپنا رب کہا، تو کیا اُس وقت عارضی طور پہ ہی سہی، وُہ شرک میں مبتلا نہ ہو گئے تھے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ ایک طالبِ حق اپنی جستجو کی راہ میں سفر کرتے ہُوئے بیچ کی جن منزلوں پر غور و فکر کے لیے ٹھہرتا ہے، اصل اعتبار اُن منزلوں کا نہیں ہوتا، بلکہ اصل اعتبار اُس سمت کا ہوتا ہے جس پر وہ پیش قدمی کر رہا ہے اور اُس آخری مقام کا ہوتا ہے جہاں پہنچ کر وہ قیام کرتا ہے۔ بیچ کی منزلیں ہر جویائے حق کے لیے ناگزیر ہیں۔ اِن پر ٹھیرنا بسلسلۂ طلب و جستجو ہوتا ہے نہ کہ بصورتِ فیصلہ۔ اصلاً یہ ٹھیراؤ سوالی و استفہامی ہوا کرتا ہے نہ کہ حکمی۔ طالب جب اِن میں سے کسی منزل پر رُک کر کہتا ہے کہ ایسا ہے۔ اور تحقیق سے اُس کا جواب نفی میں پا کر وُہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ اِس لیے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ اثنائے راہ میں جہاں جہاں وُہ ٹھیرتا رہا، وہاں وُہ عارضی طور پر کفر یا شرک میں مُبتلا رہا۔"[1]

مودودی صاحب نے کتنے پیچ در پیچ حیلوں بہانوں سے یہ زہریلی دوائی مسلمانوں کے حلق سے، اُن کا خیر خواہ بن کر، اُتارنے کی کوشش کی ہے کہ واقعی ابراہیم علیہ السلام تارے، چاند اور سورج کو اپنا رب کہتے رہے اور واقعی وہ کفر و شرک میں مبتلا ہوتے رہے، عصمت اُن کے نزدیک تک پھٹکنے سے گریز کرتی رہی، فضلِ خداوندی اُن کی دستگیری سے قاصر ہوتا رہا لیکن اُنھیں کفر و شرک میں مبتلا شمار نہ کیجیے کیونکہ یہ وقتی اور عارضی بات تھی۔ وہ تجربہ کرتے ہُوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ جدھر وہ جا رہے ہیں اُس سمت پر اعتبار کیجیے۔ درمیان میں سو کفر یا پانچسو شرک بھی کر لیں تو اُس کا کوئی اعتبار نہ کرنا، درمیانی کفریات و شرکیات کو کفر و شرک شمار نہ کرنا۔ مودودی صاحب کو تیر افگنی میں حیرت انگیز مہارت حاصل ہے کہ ایک ہی تیر میں بے شمار شکار کر لیتے ہیں۔ اِدھر حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر

---

[1] مودودی صاحب، مولوی: تفہیم القرآن، جلد اوّل، طبع ہفتم ۱۹۶۸ء، مطبوعہ لاہور، ص ۵۵۸، ۵۵۹

پیغمبر اور اللہ جل شانہ، کے خلیل کی عظمت و عصمت کو اس درجہ داغدار کرنے کی کوشش کی کہ اُنھیں کافر و مشرک تک بنا کر رکھ دیا، دُوسری جانب ہزاروں کافروں، مشرکوں اور گمراہوں بدمذہبوں کو برأت کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔ جب اُن پر گرفت کی جائے تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہماری رسائی منزلیں ہیں اِن کا کیوں اعتبار کرتے ہو، اعتبار ہماری اُس سمت کا کرو جدھر ہمارا مُنہ ہے یا ہماری آخری منزل کا اعتبار کرنا۔ معلوم نہیں مودودی صاحب نے پُورے دین اور اُس کے جُملہ احکامات کو یکسر معطّل اور حرفِ غلط کی طرح بیکار ٹھہرانے کی یہ جسارت کس خوشی میں فرمائی ہے، ستم بالائے ستم تو یہ کہ حبیب پروردگار، خلاصۂ کائنات، سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں یہاں تک لکھ دیا:

> ”نبوّت پر سرفراز ہونے سے پہلے کبھی حضور کے ذہن میں یہ تصوّر تک نہ آیا تھا کہ آپ کو کوئی کتاب ملنے والی ہے یا ملنی چاہیے، بلکہ آپ سرے سے کُتب آسمانی اور اُن کے مضامین کے متعلق کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ اِسی طرح آپ کو اللہ پر ایمان تو ضرور حاصل تھا، مگر آپ نہ شعوری طور پر اِس تفصیل سے واقف تھے کہ انسان کو اللہ کے متعلق کیا کیا باتیں ماننی چاہئیں اور نہ آپ کو یہ معلوم تھا کہ اِس کے ساتھ ملائکہ اور نبوت اور کتب الٰہی اور آخرت کے متعلق بھی بہت سی باتوں کا ماننا ضروری ہے۔ یہ دونوں باتیں ایسی تھیں جو خود کفارِ مکہ سے بھی چھپی ہُوئی نہ تھیں۔ مکہ معظمہ کا کوئی شخص یہ شہادت نہ دے سکتا تھا کہ اُس نے نبوّت کے اچانک اعلان سے پہلے کبھی حضور کی زبان سے کتابِ الٰہی کا کوئی ذکر سُنا ہو یا آپ سے اِس طرح کی کوئی بات سُنی ہو کہ لوگوں کو فلاں فلاں چیزوں پر ایمان لانا چاہیے۔“ [1]

جہاں تک کفارِ مکہ کا ایسی بات کے سُننے سے محروم رہنے کا تعلق ہے تو یہ بات درست ہے لیکن فخرِ دوعالم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اعلانِ نبوّت سے پہلے جاہل محض ہونے کا حکم صادر کرنے

---

[1] مودودی صاحب، مولوی: تفہیم القرآن، جلد چہارم، طبع سوم، ۱۹۷۰ء، مطبوعہ لاہور، ص ۵۱۸

سے پہلے کاش! مودودی صاحب کا بیباک قلم ٹوٹ گیا ہوتا۔ کاش! مودودی صاحب اپنے اس سراسر غیر اسلامی عقیدے پر نظرِ ثانی کر کے حیاتِ مستعار کے اِن آخری لمحات میں ایمان جیسی متاعِ عزیز کو حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کر لیں۔ جُملہ انبیائے کرام کے بارے میں مودودی صاحب کے قلم نے یُوں اپنا زورِ تحقیق دکھایا ہے:

"عصمت دراصل انبیاء کے لوازمِ ذات سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصبِ نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لیے مصلحتاً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے ورنہ اگر اللہ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لیے بھی اُن سے منفک ہو جائے تو جس طرح عام انسانوں سے بھول چُوک اور غلطی ہوتی ہے اِسی طرح انبیاءؑ سے بھی ہو سکتی ہے اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اُٹھا کر ایک دو لغزشیں سرزد ہو جانے دی ہیں تاکہ لوگ انبیاء کو خدا نہ سمجھ لیں اور جان لیں کہ یہ بشر ہیں، خدا نہیں۔"[1]

معلوم نہیں جناب مودودیت مآب کو عصمتِ انبیاء سے کیا چڑ ہے؟ کیا منصبِ نبوّت سے اُنھیں کوئی خاص پرخاش ہے یا خود اس کے طلبگار تھے اور محروم رہنے کے باعث بیائے کرام کی عصمت سے مکرنے اور اُن ہستیوں پر کیچڑ بازی کی مشق فرمانے لگے ہیں؟ اظت تسلیم کر کے گویا انبیائے کرام کو منصبِ ولایت پر تو فائز سمجھ لیا لیکن فوراً ہی موصوف کا بیباک قلم جو شوخی پہ آیا تو طرارے بھرتا ہوا سارے انبیائے کرام کو عام گنہگاروں کی صف میں کھڑا کر گیا۔ لاحول ولا قوۃ الّا باللہ العلی العظیم۔

یہ چند عبارتیں محض اس لیے پیش کر دی ہیں کہ مودودی صاحب جیسے دین سازوں کو اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ بنا کر جن حضرات نے اپنے دلوں اور دماغوں پر مسلّط کر رکھا ہے وہ شاید غور و فکر کو کچھ کام میں لا سکیں اور یہ سوچنے کی توفیق پا سکیں کہ شریعتِ مطہرہ تو محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر نازل ہُوئی تھی اور صحابۂ کرام کو اُس کی عملی تصویریں بنا کر اللہ کے آخری

---

[1] مودودی صاحب، مولوی: تفہیمات جلد دوم، ص ۴۳

پیغمبر نے تیار کیا تھا، اُن سے تابعین نے، اُن سے تبع تابعین نے، غرضیکہ اِسی طرح آج تک دین پہنچا لیکن یہ کیا ستم ہے کہ پچھلوں کا سمجھا ہُوا دین بیکار ہو کر رہ گیا، چودہ سو سالہ دین فہمی حرفِ غلط قرار دے دی گئی اور دین صرف مودودی صاحب کے قلم ناحق رقم کی رطب و یابس نگارشات کا نام ہوگیا، کاش! اُن کے معتقد لوگ یہ یقین کرلیں کہ مودودی صاحب ہرگز نبی نہیں ہیں کہ اُن کی تشریح حرفِ آخر قرار پائے۔ تصریحات وہی قابلِ تسلیم ہیں جو سیّد المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے غلاموں یعنی ہمارے آقاؤں سے منقول ہیں، اُن کے خلاف ہر بات محض دھوکا، اصلاح کے نام پر فساد اور مقدس اسلام کی جگہ خانہ ساز اسلام پیش کرنے کی شرمناک سازش ہے۔ (نعوذ باللہ من شرورِ انفسنا)

صحابۂ کرام پر نرالی کرم نوازی

جب مودودی صاحب نے انبیائے کرام تک کو اپنی مشقِ ستم کا نشانہ بنائے بغیر نہ چھوڑا تو صحابۂ کرام کو بھلا کیسے نظر انداز کر سکتے تھے؟ صحابۂ کرام جیسے مقدس گروہ جس کو اللہ تعالیٰ نے فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فرما کر معیارِ حق قرار دیا۔ جن کو فخرِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمْ اِقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ کی سند کے ذریعے معیارِ حق منوانے کی منادی کروائی، انبیائے کرام کے سِوا انسانوں کے باقی ہر گروہ سے اِس نرالی جماعت کو ممتاز قرار دیا، اُسی کے بارے میں بین الاقوامی مفکّر صاحب یُوں اپنے تفکرات پیش کرتے ہیں:

> "رسولِ خدا کے سِوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے۔ کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے۔ کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو۔ ہر ایک کو خدا کے بنائے ہُوئے اُسی معیارِ کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اُس معیار کے لحاظ سے جس درجے میں ہو اُس کو اُسی درجے میں رکھے۔"[1]

اب اِسی مقدس گروہ یعنی حضراتِ صحابۂ کرام کے بارے میں عالی جناب مودودی صاحب کا

---

[1] مودودی صاحب: دستورِ جماعتِ اسلامی، دفعہ ۶، ص ۲۴

دُوسرا ایٹمی حکم ملاحظہ فرما لیا جائے:

”معیاری مسلمان تو دراصل اُس زمانے میں بھی وہی تھے اور اب بھی وہی ہیں جو قرآن اور حدیث کے علوم پر نظر رکھتے ہوں اور جن کے رگ و پے میں قرآن کا علم اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا نمونہ سرایت کر گیا ہو۔“ [1]

مودودی صاحب کے نزدیک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے دورِ خلافت میں ایک اندیشہ تھا۔ وُہ اپنے متوقع جانشینوں کو اُس کے بارے میں سمجھاتے بھی رہے۔ نتیجہ کیا برآمد ہُوا! یہ مودودی صاحب کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

”حضرت عمرؓ کو اپنے آخر زمانے میں اِس بات کا خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں اُن کے بعد عرب کی قبائلی عصبیّتیں (جو اسلامی تحریک کے زبردست انقلابی اثر کے باوجود ابھی بالکل ختم نہیں ہوگئی تھیں) پھر نہ جاگ اٹھیں اور اُن کے نتیجے میں اسلام کے اندر فتنے برپا ہوں۔ چنانچہ ایک مرتبہ اپنے امکانی جانشینوں کے متعلق گفتگو کرتے ہُوئے اُنھوں نے حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ سے حضرت عثمانؓ کے متعلق کہا: ”اگر میں اِن کو اپنا جانشین مقرر کروں تو وُہ بنی ابن مُعیط (بنی امیہ) کو لوگوں کی گردنوں پر مسلّط کر دیں گے اور وہ لوگوں میں اللہ کی نافرمانیاں کریں گے۔ خدا کی قسم اگر میں نے ایسا کیا تو عثمانؓ یہی کریں گے اور اگر عثمانؓ نے یہ کیا تو وہ لوگ ضرور معصیّتوں کا ارتکاب کریں گے اور عوام شورش برپا کر کے عثمانؓ کو قتل کر دیں گے۔“ [2]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد واقعی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی مقرر ہُوئے۔ مبتدعین کے بین الاقوامی محقق صاحب نے حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں عمّال کے سلسلے میں یُوں زہر افشانی کرتے ہُوئے دین و دیانت کا سرِ بازار خون کیا ہے:

---

[1] مودودی صاحب: تفہیمات، ج ۱، ص ۳۱۹

[2] مودودی صاحب: خلافت و ملوکیت، طبع پنجم ۱۹۷۰ء، ص ۹۸، ۹۹

”اُن کے بعد جب حضرت عثمانؓ جانشین ہوئے تو رفتہ رفتہ وہ اِس پالیسی سے ہٹتے چلے گئے۔ اُنھوں نے پَے در پَے اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے اہم عہدے عطا کیے اور اُن کے ساتھ دوسری ایسی رعایات کیں جو عام طور پر لوگوں میں ہدفِ اعتراض بن کر رہیں۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقّاص کو معزول کر کے اُنھوں نے کُوفے کی گورنری اپنے ماں جائے بھائی ولید بن عقبہ بن ابی مُعَیط کو مقرر فرمایا اور اُس کے بعد یہ منصب اپنے ایک اور عزیز سعید بن عاص کو دیا۔ حضرت ابو مُوسیٰ اشعریؓ کو بصرے کی گورنری سے معزول کر کے اپنے ماموں زاد بھائی عبد اللہ بن عامرؓ کو اُن کی جگہ مامور کیا۔ حضرت عمروؓ بن العاص کو مصر کی گورنری سے ہٹا کر اپنے رضاعی بھائی عبد اللہ بن سعد بن ابی سَرح کو مقرر کیا۔ حضرت معاویہؓ سیدنا عمر فاروقؓ کے زمانے میں صرف دمشق کی ولایت پر تھے۔ حضرت عثمانؓ نے اُن کی گورنری میں دمشق، حمص، فلسطین، اُردن اور لبنان کا پورا علاقہ جمع کر دیا۔ پھر اپنے ماموں زاد بھائی مروان بن الحکم کو اُنھوں نے اپنا سیکرٹری بنا لیا، جس کی وجہ سے سلطنت کے پورے در و بست پر اُس کا اثر و نفوذ قایم ہوگیا۔ اِس طرح عملاً ایک ہی خاندان کے ہاتھ میں سارے اختیارات جمع ہوگئے۔“ [1]

اِس مزعومہ طرزِ عمل پر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں یہ فیصلہ صادر ہوتا ہے:

”فطری طور پر یہ بات کسی کو پسند نہ آسکتی تھی کہ سابقین اوّلین، جنھوں نے اسلام کو سر بلند کرنے کے لیے جانیں لڑائی تھیں اور جن کی قربانیوں ہی سے دین کو فروغ نصیب ہُوا تھا، پیچھے ہٹا دیے جائیں اور اُن کی جگہ یہ لوگ اُمت کے سرخیل ہو جائیں۔“ [2]

اب مروان بن الحکم کے باعث خلیفۂ ثالث کی دُوسری جرم فرد یُوں سُنائی جاتی ہے:

---

[1] مودودی صاحب، خلافت و ملوکیت، طبع پنجم، ۱۹۷۰ء، ص ۱۰۶ تا ۱۰۸

[2] ایضاً، ص ۱۰۹

"مروان کے اِس پس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اُس کا سیکرٹری کے منصب پر مقرر کیا جانا لوگوں کو کسی طرح گوارا نہ ہو سکتا تھا۔ لوگ حضرت عثمانؓ کے اعتماد پر یہ تو مان سکتے تھے کہ حضورؐ نے اِن کی سفارش قبول کر کے حَکَم کو واپسی کی اجازت دینے کا وعدہ فرما لیا تھا، اِس لیے اُسے واپس بُلا لینا قابلِ اعتراض نہیں ہے، لیکن یہ مان لینا لوگوں کے لیے سخت مشکل تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسی معتوب شخص کا بیٹا اِس بات کا بھی اہل ہے کہ تمام اکابر صحابہ کو چھوڑ کر اُسے خلیفہ کا سیکرٹری بنا دیا جائے خصوصاً جبکہ اُس کا وہ معتوب باپ زندہ موجود تھا اور اپنے بیٹے کے ذریعے حکومت کے کاموں پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔"[1]

مذکورہ دونوں امور کے بارے میں عالی جناب مودودی صاحب کی عدالت سے خلیفۂ رسول کے بارے میں یہ فیصلہ سنایا گیا:

"حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسی کا یہ پہلو بلاشبہ غلط تھا اور غلط کام بہرحال غلط ہے، خواہ وہ کسی نے کیا ہو۔ اُس کو خواہ مخواہ کی سخن سازیوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا نہ عقل و انصاف کا تقاضا ہے اور نہ دین ہی کا یہ مطالبہ ہے کہ کسی صحابی کی غلطی کو غلطی نہ مانا جائے۔"[2]

اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو خارجیت کا بیباک قلم کس طرح مجرم ٹھہراتا اور اُن کے جرائم کی فہرست مرتب کرتے ہوئے اُنھیں باغی بتاتا، اسلام سے انحراف کرنے والے باور کراتا ہوا یوں زہر افشانی کرتا ہے:

"حضرت عثمانؓ کے خون کا مطالبہ، جسے لے کر دو طرف سے دو فریق اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک طرف حضرت عائشہؓ اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ اور دوسری طرف حضرت

---

[1] مودودی صاحب: خلافت و ملوکیت، ص ۱۱۰، ۱۱۱

[2] ایضاً: ص ۱۱۶

معاویہؓ۔ ان دونوں فریقوں کے مرتبہ و مقام اور جلالتِ قدر کا احترام ملحوظ رکھتے ہُوئے بھی یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ دونوں کی پوزیشن آئینی حیثیت سے کسی طرح درست نہیں مانی جاسکتی۔ ظاہر ہے کہ یہ جاہلیت کے دور کا قبائلی نظام تو نہ تھا کہ کسی مقتول کے خون کا مطالبہ لے کر جو چاہے اور جس طرح چاہے اُٹھ کھڑا ہو اور جو طریقہ چاہے اُس کو پُورا کرانے کے لیے استعمال کرے۔ یہ ایک باقاعدہ حکومت تھی جس میں ہر دعوے کے لیے ایک ضابطہ اور قانون موجود تھا۔ خون کا مطالبہ لے کر اُٹھنے کا حق مقتول کے وارثوں کو تھا، جو زندہ تھے اور وہیں موجود تھے۔ حکومت اگر مجرموں کو پکڑنے اور اُن پر مقدمہ چلانے میں واقعی دانستہ ہی تساہل کر رہی تھی تو بلا شبہ دُوسرے لوگ اُس سے انصاف کا مطالبہ کر سکتے تھے، لیکن کسی حکومت سے انصاف کے مطالبے کا یہ کون سا طریقہ ہے اور شریعت میں کہاں اِس کی نشان دہی کی جاسکتی ہے کہ آپ سرے سے اُس حکومت کو جائز حکومت ہی اُس وقت تک نہ مانیں جب تک وہ آپ کے اِس مطالبے کے مطابق عمل درآمد نہ کر دے۔ حضرت علیؓ اگر جائز خلیفہ تھے ہی نہیں تو پھر اُن سے اِس مطالبے کے آخر معنی کیا تھے کہ وُہ مُجرموں کو پکڑیں اور سزا دیں؟ کیا وُہ کوئی قبائلی سردار تھے جو کسی قانون اختیار کے بغیر جسے چاہیں پکڑ لیں اور سزا دے ڈالیں؟

اِس سے بھی زیادہ غیر آئینی طریقۂ کار یہ تھا کہ پہلے فریق نے بجائے اِس کے کہ وُہ مدینے جا کر اپنا مطالبہ پیش کرتا، جہاں اور مجرمین اور مقتول کے ورثاء سب موجود تھے اور عدالتی کارروائی کی جاسکتی تھی، بصرے کا رُخ کیا اور فوج جمع کر کے خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کی کوشش کی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ ایک خون کے بجائے دس ہزار مزید خون ہوں اور مملکت کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ شریعتِ الٰہی تو درکنار، دنیا کے کسی آئین و قانون کی رُو سے بھی اِسے ایک جائز کارروائی نہیں مانا جاسکتا۔"[1]

---

[1] مودودی صاحب: خلافت و ملوکیت، ص ۱۲۴، ۱۲۵

یہ ہے محبوبۂ سیّد المرسلین اور مقتدر صحابۂ کرام کے بارے میں مودودی صاحب کے قلمِ ناحق رقم کی وہ ستم ظریفی جس پر ہم کوئی تبصرہ نہیں کرتے بلکہ قارئینِ کرام کے دین و دیانت پر اِن کا فیصلہ چھوڑتے ہوئے محض ایسی چند عبارتوں کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں۔ اب سیّدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں موصوف کی تحقیق ملاحظہ ہو:

"اِس سے بدرجہا زیادہ غیر آئینی طرزِ عمل دُوسرے فریق، یعنی حضرت معاویہؓ کا تھا جو معاویہ بن ابی سفیان کی حیثیت سے نہیں بلکہ شام کے گورنر کی حیثیت سے خونِ عثمان کا بدلہ لینے کے لیے اُٹھے، مرکزی حکومت کی اطاعت سے انکار کیا، گورنری کی طاقت اپنے اِس مقصد کے لیے استعمال کی اور مطالبہ بھی یہ نہیں کیا کہ حضرت علیؓ قاتلینِ عثمانؓ پر مقدمہ چلا کر اُنھیں سزا دیں، بلکہ یہ کیا کہ وہ قاتلینِ عثمانؓ کو اُن کے حوالہ کر دیں تاکہ وُہ خود اُنھیں قتل کریں۔ یہ سب کچھ دورِ اسلام کی نظامی حکومت کے بجائے زمانۂ قبلِ اسلام کی قبائلی بدنظمی سے اشبہ ہے۔ خونِ عثمانؓ کے مطالبے کا حق اوّل تو حضرت معاویہؓ کے بجائے حضرت عثمانؓ کے شرعی وارثوں کو پہنچتا تھا۔ تاہم اگر رشتہ داری کی بنا پر حضرت معاویہؓ اِس مطالبہ کے مجاز ہو بھی سکتے تھے تو اپنی ذاتی حیثیت میں نہ کہ شام کے گورنر کی حیثیت میں۔ حضرت عثمانؓ کا رشتہ جو کچھ بھی تھا، معاویہ بن ابی سفیان سے تھا، شام کی گورنری اُن کی رشتہ دار نہ تھی۔ اپنی ذاتی حیثیت میں وہ خلیفہ کے پاس مستغیث بن کر جا سکتے تھے اور مجرمین کو گرفتار کرنے اور اُن پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ گورنر کی حیثیت سے اُنھیں کوئی حق نہ تھا کہ جس خلیفہ کے ہاتھ پر باقاعدہ آئینی طریقے سے بیعت ہو چکی تھی، جس کی خلافت کو اُن کے زیرِ انتظام صوبے کے سوا باقی پوری مملکت تسلیم کر چکی تھی، اُس کی اطاعت سے انکار کر دیتے اور اپنے زیرِ انتظام علاقے کی فوجی طاقت کو مرکزی حکومت کے مقابلے میں استعمال کرتے اور ٹھیٹھ جاہلیتِ قدیمہ کے طریقے پر یہ مطالبہ کرتے کہ قتل کے ملزموں کو عدالتی کارروائی کے بجائے مدّعیِ قصاص کے حوالہ کر دیا جائے

تاکہ وہ خود اُن سے بدلہ لے۔" [1]

مودودی صاحب کا قلب صحابۂ کرام کی دشمنی سے اِتنا لبریز ہے کہ اُنھوں نے روافض کی تخصیص بھی ختم کر دی۔ برگزیدہ صحابی، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اُنھوں نے تاریخ کے جھوٹے اور بے سر وپا واقعات کا سہارا لے کر وُہ جھُوٹے الزامات عاید کیے ہیں جن کی کوئی صاحبِ عقل و دانش مسلمان ہرگز ہرگز جسارت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ سبائی رافضی ٹولے کو تقویت پہنچانے کی غرض سے اُنھوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر یہ الزام بھی عائد کیا ہے:

"ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہُوئی کہ وُہ خود اور اُن کے حکم سے اُن کے تمام گورنر، خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، حتّٰی کہ مسجد نبوی میں منبرِ رسولؐ پر عین روضۂ نبوی کے سامنے حضور کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علیؓ کی اولاد اور اُن کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سُنتے تھے۔ کسی کے مرنے کے بعد اُس کو گالیاں دینا، شریعت تو درکنار، انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا اور خاص طور پر جمعہ کے خطبے کو اِس گندگی سے آلُودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے آکر اپنے خاندان کی دوسری غلط روایات کی طرح اِس روایت کو بھی بدلا اور خطبۂ جمعہ میں سبِّ علیؓ کی جگہ یہ آیت پڑھنی شروع کر دی: اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔ (النحل۔ ۹۰)" [2]

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر مودودی صاحب نے دین و دیانت سے عاری ہو کر یہ گھناؤنا الزام بھی عائد کیا ہے:

---

[1] مودودی صاحب: خلافت و ملوکیت، ص ۱۲۵، ۱۲۶

[2] ایضاً: ص ۱۷۴

"مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ و سنّتِ رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔ کتاب و سنّت کی رُو سے پُورے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہیے اور باقی چار حصے اُس فوج میں تقسیم ہونے چاہییں جو لڑائی میں شریک ہوئی ہو لیکن حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں سے چاندی سونا اُن کے لیے الگ نکال لیا جائے، پھر باقی مال شرعی قاعدے کے مطابق تقسیم کیا جائے"۔[1]

مودودی صاحب کا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک سنگین الزام اور پیش کیا جاتا ہے، جسے اُنھوں نے مختلف کمزور تاریخی روایات کے سہارے عائد کیا ہے، چنانچہ موصوف لکھتے ہیں:

"حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دیا اور اُن کی زیادتیوں پر شرعی احکام کے مطابق کارروائی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اُن کا گورنر عبداللہ بن عَمرو بن غیلان ایک مرتبہ بصرے میں منبر پر خطبہ دے رہا تھا۔ ایک شخص نے دورانِ خطبہ میں اُس کو کنکر مار دیا۔ اِس پر عبداللہ نے اُس شخص کو گرفتار کرایا اور اُس کا ہاتھ کٹوا دیا۔ حالانکہ شرعی قانون کی رُو سے یہ ایسا جُرم نہ تھا جس پر کسی کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ حضرت معاویہؓ کے پاس استغاثہ کیا گیا تو اُنھوں نے فرمایا کہ میں ہاتھ کی دِیَت تو بیت المال سے ادا کر دُوں گا، مگر میرے عُمّال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں۔ زیاد کو جب حضرت معاویہؓ نے بصرے کے ساتھ کُوفے کا بھی گورنر مقرر کیا اور وُہ پہلی مرتبہ خطبہ دینے کے لیے کوفے کی جامع مسجد کے منبر پر کھڑا ہُوا تو کچھ لوگوں نے اُس پر کنکر پھینکے۔ اُس نے فوراً مسجد کے دروازے بند کرا دیے اور کنکر پھینکنے والے تمام لوگوں کو (جن کی تعداد ۳۰ سے ۸۰ تک بیان کی جاتی ہے) گرفتار کرا کے اُسی وقت اُن کے ہاتھ کٹوا دیے۔ کوئی مقدمہ اُن پر نہ چلایا گیا۔ کسی عدالت میں وہ پیش نہ کیے گئے۔ کوئی باقاعدہ

---

[1] مودودی صاحب: خلافت و ملوکیت، ص ۱۷۴

قانونی شہادت اُن کے خلاف پیش نہ ہوئی۔ گورنر نے محض اپنے انتظامی حکم سے اتنے لوگوں کو قطعِ ید کی سزا دے ڈالی جس کے لیے قطعاً کوئی شرعی جواز نہ تھا۔ مگر دربارِ خلافت سے اس کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا گیا۔ اِس سے بڑھ کر ظالمانہ افعال بُسر بن ابی ارطاۃ نے کیے جسے حضرت معاویہؓ نے پہلے حجاز و یمن کو حضرت علیؓ کے قبضے سے نکالنے کے لیے بھیجا تھا اور پھر ہمدان پر قبضہ کرنے کے لیے مامور کیا تھا۔ اُس شخص نے یمن میں حضرت علیؓ کے گورنر عبید اللہ بن عباسؓ کے دو چھوٹے چھوٹے بچّوں کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ اِن بچّوں کی ماں اِس صدمے سے دیوانی ہو گئی۔ بنی کنانہ کی ایک عورت جو یہ ظلم دیکھ رہی تھی، چیخ اُٹھی کہ "مردوں کو تو تم نے قتل کر دیا، اب اِن بچّوں کو کس لیے قتل کر رہے ہو؟ بچّے تو جاہلیت میں بھی نہیں مارے جاتے تھے۔ اے ابنِ ارطاۃ! جو حکومت بچّوں اور بوڑھوں کے قتل اور بے رحمی و برادر کشی کے بغیر قائم نہ ہو سکتی ہو اُس سے بُری کوئی حکومت نہیں۔" اِس کے بعد اِسی ظالم شخص کو حضرت معاویہؓ نے ہمدان پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا جو اُس وقت حضرت علیؓ کے قبضے میں تھا۔ وہاں اُس نے دوسری زیادتیوں کے ساتھ ایک ظلمِ عظیم یہ کیا کہ جنگ میں جو مسلمان عورتیں پکڑی گئی تھیں، اُنھیں لونڈیاں بنا لیا۔ حالانکہ شریعت میں اِس کا قطعاً کوئی جواز نہیں۔ یہ ساری کارروائی گویا اِس بات کا عملاً اعلان تھی کہ اب گورنروں اور سپہ سالاروں کو ظلم کی کھلی چھوٹ ہے اور سیاسی معاملات میں وہ شریعت کی کسی حد کے پابند نہیں ہیں۔"[1]

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک اور الزام بڑے معصومانہ انداز میں خیر خواہِ اسلام و مسلمین بن کر عاید کیا ہے:

"سر کاٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے اور انتقام کے جوش میں لاشوں کی بے حرمتی کرنے کا وحشیانہ طریقہ بھی، جو جاہلیت میں رائج تھا اور جسے اسلام نے مٹا دیا تھا،

---

[1] مودودی صاحب: خلافت و ملوکیت، ص ١٧٥ تا ١٧٧

اِسی دَور میں مسلمانوں کے اندر شروع ہُوا۔"[1]

اب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مجموعی دورِ حکومت کے بارے میں سرکار مودودیت مآب کا فیصلہ ملاحظہ ہو:

> "حضرت معاویہ کے عہد میں سیاست کو دین پر بالا رکھنے اور سیاسی اغراض کے لیے شریعت کی حدیں توڑنے کی جو ابتداء ہُوئی تھی، اُن کے اپنے نامزد کردہ جانشین یزید کے عہد میں وہ بدترین نتائج تک پہنچ گئی۔"[2]

صحابۂ کرام کے بارے میں جناب مودودی صاحب کا نظریہ دکھانے کی خاطر یہ چند عبارتیں بغیر کسی تبصرے کے پیش کر دی ہیں۔ اہلِ علم اور اہلِ دین و ایمان اُن کی ایسی دل آزار عبارتوں اور موصوف کے مخصوص نظریات سے پہلے ہی نالاں ہیں جس کے باعث ہمیں تبصرہ کرنے یا کسی تفصیل میں جانے کی چنداں حاجت نہیں۔

قرآن وحدیث پر مہربانیاں

مودودی صاحب کے اسلام اور مسلمانوں پر احسانات مخصوصہ کی فہرست تو بہت طویل ہے، سرِ دست چند نوازشات کا تذکرہ ہی مَا قَلَّ وَکَفٰی کے تحت کیا جا رہا ہے۔ دین کا اوّلین ماخذ چونکہ قرآنِ کریم ہے اور اِس کے مفہوم و مطالب سے روشناس ہونے میں ہم اکابر کی تصریحات کے محتاج ہیں کیوں کہ صاحبِ قرآن سے صحابۂ کرام نے، اُن سے تابعینِ عظام نے، غرضیکہ اِسی طرح اگلی نسل کے اہلِ علم پچھلی نسل کے بزرگوں سے سیکھتے اور آنے والوں کو سکھاتے آئے ہیں۔ لیکن جس نے اللہ تعالیٰ کے کلامِ معجز نظام میں معنوی تحریف کا دروازہ کھولنا ہو اُسے قرآن سیکھنے والوں کا رابطہ اکابر سے توڑنا ضروری ہو جاتا ہے ورنہ وہ اپنے مقصد میں ہرگز کامیابی حاصل نہیں کر سکتا اور ہرگز اپنی ذات کو فخرِ اکابر نہیں منوا سکتا اور نہ مرجعِ خلائق بن سکتا ہے۔ مودودی صاحب کا فہم ہمیشہ دُور کی کوڑی لاتا ہے اور زیرک اِتنے ہیں کہ زہر بھی ایسی میٹھی گولیوں کی شکل میں کھلاتے ہیں:

---

[1] مودودی صاحب : خلافت و ملوکیت ، ص ۱۷۷

[2] ایضاً : ص ۱۷۹

ع کہ ہو نخچیر کے دل میں بھی پیدا ذوقِ نخچیری

اندرونی زہر سے بے خبر حضرات بیرونی چاشنی پر ایسے مست ہوتے ہیں کہ اُن کی زہریلی اور مہلک گولیاں کھانے کے لیے دیوانہ وار پھرنے لگتے ہیں۔ بزرگانِ دین جنھوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اسلامی تعلیمات حاصل کیں اُن سے مسلمانوں کا رابطہ توڑنے کی مودودی صاحب یُوں تلقین فرماتے ہیں:

”قرآن اور سنّت کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر تفسیر و حدیث کے پُرانے ذخیروں سے نہیں، اُن کے پڑھانے والے ایسے ہونے چاہییں جو قرآن و سنّت کے مغز کو پا چکے ہوں۔“ [1]

دُوسرے مقام پر اِسی بات کو بیان کرتے ہُوئے یُوں اکابر سے بغاوت کی تلقین فرمائی ہے:

”جب تک مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ قرآن اور سنّت تک بلا واسطہ دسترس حاصل نہ کرے گا اسلام کی رُوح کو نہ پا سکے گا، نہ اسلام میں بصیرت حاصل کر سکے گا، وہ ہمیشہ مترجموں اور شارحوں کا محتاج رہے گا۔“ [2]

موصوف کِس طرح مسلمانوں کو قرآن سکھانا چاہتے ہیں؟ اس امر کی وضاحت میں یُوں خامہ فرسائی کی ہے:

”قرآن کے لیے کسی تفسیر کی حاجت نہیں، ایک اعلیٰ درجے کا پروفیسر کافی ہے جس نے قرآن کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہو اور جو طرزِ جدید پر قرآن پڑھانے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو۔“ [3]

کچھ سمجھے کہ سرکار مودودیت مآب کے دربار سے کیا حکم ملا؟ یہی کہ تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے، مترجموں اور شارحوں کا محتاج نہیں رہنا چاہیے، بزرگوں نے قرآن و حدیث کے مغز کو پایا ہی نہیں تھا، وُہ قرآن و حدیث کے مفہوم و مطالب کو سمجھے بغیر ہی بزرگ

---

[1] مودودی صاحب: تنقیحات، ص ۲۰۵

[2] ایضاً: ص ۳۳۰، ۳۳۱

[3] ایضاً: ص ۳۴۲، ۳۴۳

بن بیٹھے تھے، قرآن کریم کو آج حقیقت میں وہی سمجھ سکتا ہے جو اس کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرے اور وہ ایک اعلیٰ درجے کا پروفیسر ہی ہو سکتا ہے۔

اگر کوئی مسلمان مودودی صاحب کی اِس تلقین پر عمل کرنے کے لیے کمربستہ ہو جائے، پچھلے تمام بزرگوں کو مودودی صاحب کی ہدایت کے مطابق ناقابلِ اعتماد گردان کر تفسیر و حدیث کے کسی پرانے ذخیرے کو ہاتھ بھی نہ لگائے۔ حدیث تو سرے سے اُس کے ہاتھ سے گئی کہ نیا ذخیرہ ایک بھی دنیا میں موجود نہیں، اگر کوئی ہو بھی تو مواد سارا پُرانے ذخیروں کا، لہٰذا وُہ بھی ناقابلِ اعتماد، اب صرف کلامِ الٰہی باقی رہ گیا، جو بغیر کسی ترجمے اور تفسیر کی مدد کے سمجھنا ہے، مطلب اپنے ذہن سے کشید کرنا ہے، جو بھی عرق یا جُوس کی صورت میں زید و عمرو کے دماغوں سے برآمد ہو یہ مودودی صاحب کے نزدیک قابلِ اعتماد اور جو بزرگانِ دین نے صاحبِ قرآن سے مفہوم و مطالب سیکھے وہ ناقابلِ یقین۔

کیا مودودی صاحب کی شریعتِ محمدیہ کے علمبرداروں سے بغاوت کرنے اور مسلمانوں کو بغاوت پر ڈنکے کی چوٹ اُبھارنے کا کوئی جواب ہے؟

چلیے مودودی صاحب کی تلقین کو علمی جامہ پہنانے والے کے ہاتھ میں ایک معرّیٰ قرآن کریم رہ گیا، لیکن یہ بھی تو اُن ناقابلِ اعتماد ہستیوں کی وساطت ہی سے ملا ہے، اِس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی گئی۔ دریں حالات اِس امر کا کیا ثبوت ہوگا؟ اگر آیۂ کریمہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ ..... پڑھ کر سُنائی جائے تو یہ آیت بھی تو اُسی مجموعۂ کلامِ الٰہی کی ہے جو ناقابلِ اعتماد حضرات کی معرفت مِلا ہے، لہٰذا اِس سے استناد تو اُسی صورت میں ہو سکے گا جب اِس مجموعہ (قرآن کریم) کی صحت کا اُن ناقابلِ یقین ہستیوں کے علاوہ کوئی دُوسرا یقینی ثبوت فراہم کر دیا جائے، جو اِس کی صحت پر آفتابِ نیم روز کی طرح دلالت کر رہا ہو۔ مودودی صاحب اگر ہماری جسارت کو معاف فرمائیں تو ہم یہ عرض کرنے میں قطعاً کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے کہ موصوف نے جن ہستیوں پر بے اعتمادی کا اظہار فرمایا ہے وہ اُن بزرگوں کو نظر انداز کر کے قرآن و حدیث کی صحت کا کوئی ایک ثبوت قبر کی کوٹھری میں جانے تک بھی پیش نہ کر سکیں گے۔

ثانیاً: مودودی صاحب نے تفہیم القرآن کیوں لکھی؟ اِس پر قوم کا لاکھوں روپیہ کیوں ضائع کیا جا رہا ہے؟ تلقین تو یہ فرمائی تھی کہ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ براہِ راست قرآن و

سنّت کا علم حاصل کرے، کسی مترجم یا شارح کا محتاج نہ بنے، اپنے ترجمہ اور تفسیر کو پڑھنے سے مودودی صاحب مذکورہ تلقین کی روشنی میں منع کیوں نہیں فرماتے؟ منع نہ فرمانے سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ موصوف صرف یہ چاہتے ہیں کہ اُمّتِ محمدیہ اپنے جلیل القدر اکابر سے رابطہ ختم کرکے، یہ سمجھتے ہُوئے مودودی صاحب کے قدموں سے لگ جائے کہ اگر چودہ سو سالہ دَور میں کسی نے حقیقت میں قرآن وحدیث کے مفہوم ومطالب کو سمجھا ہے تو وُہ ہستی صرف عالیجناب مودودیت مآب کی ہے۔

ثالثاً: کیا ہم مودودی صاحب سے یہ پُوچھ سکتے ہیں کہ موصوف نے جن ذخیروں سے دُور رہنے کی مسلمانوں کو تلقین فرمائی ہے، خود زمانۂ حال کے جانباز فرقہ ساز صاحب نے اُنھیں کیوں اکٹھا کیا ہُوا ہے؟ ہر تصنیف کے اندر اُن سے استناد کس خوشی میں کیا جاتا ہے؟ یہ 'من نکردم شما حذر بکنید' والا معاملہ کہاں تک لائقِ تحسین وقابلِ ستائش ہے؟

رابعاً: تفسیر وحدیث کے تمام ذخائر کو ایک طرف رکھتے ہُوئے مودودی صاحب کیا مسلمانوں کو بتا سکتے ہیں کہ کسی آیت کا حقیقی مفہوم متعین کرنے کی اُن کے پاس کسوٹی کیا ہے؟ کیا اِس طرح ہر شخص آیاتِ قرآنیہ کے مفہوم ومطالب وہی نہ بتاتا پھرے گا جسے اُس کے دماغ نے درست قرار دے لیا ہے جبکہ ایسے ہی دوسرے محقق کے نزدیک وہ بالکل غلط بھی ہوسکتا ہے، اِس حالت میں یہ فیصلہ کرنا کہ دونوں میں سے کس کی بات درست ہے؟ آخر اِس کا فیصلہ کس طرح ہوگا؟ کیا اِس طرح ایسا ہر شخص ایک فرقہ نہ بن جائے گا اور یہ اُمتِ محمدیہ میں ایک زبردست فتنے کا دروازہ تو نہیں کھولا جا رہا؟ کیا اِس صورت میں ایسے تمام محققین آپس میں دست وگریباں نہ ہوتے رہیں گے؟ کیا وُہ رات دن مسلمانوں میں سر پھٹول نہ کراتے رہیں گے؟ کاش! مودودی صاحب اپنے اِن نظریات کی مضرت کو محسوس کرکے آئندہ ملّتِ اسلامیہ کے افراد کو فتنہ باز وفتنہ ساز بننے کی دعوت نہ دیں بلکہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کی تلقین فرمایا کریں، جس کا تعیّن اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے ذریعے فرمایا گیا ہے۔

؎ کہنے کو اُن سے کہہ رہا ہُوں حالِ دِل مگر
ڈر ہے کہ شانِ ناز پہ شکوہ گراں نہ ہو

فرقہ سازی

ملتِ اسلامیہ جو پہلے ہی متعدد فرقوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ ہر فرقہ اہلِ حق سے برسرِ پیکار تھا، اِس حالت میں موصوف نے اُمتِ محمدیہ پر کرم بالائے کرم کرتے ہوئے اُمتِ محمدیہ کو جماعتِ اسلامی کے نام سے ایک تازہ فرقہ اور مرحمت فرما دیا۔ اِس فرقے کی معجون مرکب کے سارے اجزاء وہابیت ہی کے جراثیم پر مشتمل ہیں لیکن اُسے مودودی صاحب نے اپنے انا کے قوام میں گوندھ کر تیار کیا ہے۔ سیاسی جماعت کے طور پر یہ فرقہ منظرِ عام پر آیا تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ایک مذہبی فرقے کی شکل اختیار کر گیا۔ مودودیت زدہ حضرات کی نظر میں اپنے پیشوا عالیجناب مودودی صاحب کا انا اتنا بلند و بالا ہے کہ ایسے حضرات ہر بزرگ پر اعتراض کر سکتے ہیں۔ صحابۂ کرام کو ہدفِ تنقید بنتا ہوا خندہ پیشانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ مودودی صاحب کا قلم انبیائے کرام کی عصمت اور سید الانبیاء علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کی عظمت کو داغدار کرتا چلا جائے تو ان کی پیشانی پر بَل یا زبان پر ایک حرفِ شکایت تک نہیں آتا بلکہ مرحبا اور زندہ باد کے نعرے بلند ہونے شروع ہو جاتے ہیں لیکن مودودی صاحب پر اگر کوئی تنقید کرے یا کسی طرح موصوف کا نام الف کے تلے آئے تو یہ حرکت مودودی صاحب اینڈ کمپنی کے لیے قطعاً ناقابلِ برداشت ہے کیونکہ مودودی صاحب کو تو انبیائے کرام جیسے مقربینِ بارگاہِ الٰہیہ پر تنقید کرنے کا پرمٹ ملا ہوا ہے، وہ اِس حرکتِ قبیحہ کا پیدائشی حق رکھتے ہیں لیکن کسی دوسرے کو بانیِ جماعتِ اسلامی کی کسی کوہِ ہمالیہ سے بھی وزنی غلطی کو غلطی کہنے کا حق دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ یہی تو وہ افسوسناک صورت ہے جسے قرآنِ کریم میں اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ٹھہرایا گیا ہے۔ یہی ہے جماعتِ اسلامی کے سومنات کا وہ سب سے بڑا بُت جس کی پورے اہتمام سے پوجا پاٹ کا انتظام کیا ہوا ہے۔ اِس جماعت کا ہر فرد اپنے اُس چلتے پھرتے بُت کے آگے جھکنا ہی ذریعۂ نجات جانتے اور مسلمانوں کو بھی اِس راستے پر گامزن ہونے کی دعوت دینے میں شبانہ روز مصروف رہتے ہیں۔

وہابیہ کے سابق دونوں فرقے (اہلحدیث و دیو بندی) یہی سلوک مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اُن کے نزدیک راہِ ہدایت اور ذریعۂ نجات یہی ہے، جس پر

گامزن ہونے کا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا اور اُس صراطِ مستقیم کا تعین فرماتے ہوئے کثرت سے یوں دُعا مانگنے کے لیے ارشاد فرمایا تھا: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ٥ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۔ یعنی انعام یافتہ حضرات کا راستہ صراطِ مستقیم ہے، جو انبیاء، صدیق، شہداء اور صالحین ہیں، لیکن وہابیہ کی دونوں اوّلین جماعتوں نے تو اِس فرمانِ الٰہی کو یُوں بدلا ہوا ہے کہ صِرَاطَ الَّذِیْ کَانَ عَلَیْهِ اِسْمٰعِیْلَ الدَّهْلَوِیْ اور جماعتِ اسلامی کے قبیلے میں اِس آیت کریمہ کو عملاً بہ صورت دی ہوئی ہے کہ صِرَاطَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْمَوْدُوْدِیْ ۔ اللہ تعالیٰ جملہ مدعیانِ اسلام کو سچی ہدایت نصیب فرمائے۔ آمین)

وہابیہ کی اوّلین جماعت کی عبرتناک ناکامی کے بعد برٹش گورنمنٹ نے کتابِ وہابیت کا دُوسرا ایڈیشن دیوبندی جماعت کی صورت میں شائع کیا۔ یہ مسلمانانِ اہلسنّت وجماعت کو گمراہ کرنے کی خاطر سُنّی حنفی بن کر سامنے آئے۔ بعض غیر ضروری مسائل میں عوام الناس کو اصلاحی رنگ دکھایا اور اِس طرح اپنی جانب مائل کرنے کی کوشش میں مصروف رہے۔ خاطر خواہ کامیابی یُوں بھی حاصل نہ ہُوئی۔ ایک مرحلے پر انگریزی حکومت نے مولوی محمد الیاس کاندھلوی دیوبندی سے علاقہ میوات میں پانچسو روپیہ ماہوار تنخواہ پر تبلیغ کروائی۔ رفتہ رفتہ تبلیغی سسٹم دیوبندیت کا حصّہ بن گیا۔ اب یہ جال پُورے عالمِ اسلام میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ حضرات سروں پر بستر اٹھائے یا مسجدوں میں ڈیرے جمائے ہوئے عام مِل جاتے ہیں۔ یہ مسلمانانِ اہلسنّت وجماعت کو اپنے جال میں گرفتار کرنے، اپنا ساتھی بنانے محمد رسول اللہ کی اُمت کے زمرے سے نکال کر محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیروکاروں میں شامل کرنے کی خاطر تالیفِ قلوب کے ہر ساز و سامان سے لیس ہو کر آتے ہیں۔ دراز رِیش، ٹخنے ننگے، ہاتھ میں تسبیح، خاموشی کے مجسمے، زبانوں پر ذکرِ الٰہی، نگاہیں نیچی، ایک امیر کے تابع، کوئی سخت کلامی سے پیش آئے تب بھی غصّہ نزدیک نہیں آنے دیتے، عقیدہ پُوچھو تو ہرگز نہیں بتاتے، کسی اختلافی مسئلے پر بولنا اُن کے مشن سے خارج، ابتدائی مرحلہ کلمہ اور نماز کی تلقین ہے، اگلی بات مسجد میں اہلسنّت کو بلا کر اُنھیں مولوی محمد زکریا کاندھلوی دیوبندی کا تبلیغی نصاب سُنانا اور اِس کے بعد اپنے جال میں پھنسنے والوں سے چلّت پھرت کے لیے تین، سات، دس یا اکتالیس دن وقف کرنے کی خاطر ایڑی چوٹی کا زور لگانا اور خوشامد تک کرنا۔ اِس عیاری کے باعث دیوبندی جماعت

گمراہ گری میں اِتنی کامیابی ہُوئی ہے جتنی اُن کے علماء صدیوں میں بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

تبلیغی سسٹم کی کامیابی کو دیکھ کر مودودی صاحب نے سیاست کا جال بچھایا، اسلامی نعرے لگائے، مسلمان لیڈروں کی بعض غلط حرکات اور کوتاہیوں سے خوب فائدہ اٹھایا۔ سیاسی موضوعات کے ساتھ دینی عقائد و مسائل میں کتابیں لکھ کر اپنے جال میں پھنسنے والوں کے سامنے مقابلۃً اپنا لٹریچر رکھا، ہر بڑی سے بڑی ہستی میں کیڑے دکھا کر اپنی پاکبازی کا لوہا منوایا۔ اپنوں کے ذہنوں میں بٹھادیا کہ ہر بڑی سے بڑی ہستی کم و بیش گناہ میں ضرور ملوث ہوئی، غلطی کر گئی، لہٰذا اُس پر تنقید کرنا بھی عیب نہیں بلکہ حقیقتِ نفس الامری کا اظہار رہے۔ اپنی ذات کو ہر غلطی سے مبرّا اور تنقید سے بالاتر دکھایا، لہٰذا جماعتِ اسلامی کا کوئی فرد مودودی صاحب پر تنقید قطعاً برداشت نہیں کر سکتا۔

غرضیکہ وہابی جس رنگ میں بھی مسلمانوں کے سامنے آئے ملّتِ اسلامیہ کی بدخواہی اُن کی منزلِ مقصود رہی۔ رہنمائی کے بھیس میں رہزنی ہی کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔ ہر وہابی جماعت کا مشن مسلمانوں کے ہاتھوں سے اللہ کی رسّی کو چھڑانا اور انبیائے کرام اور اولیائے عظام کا گستاخ بنا کر اُن کی متاعِ ایمانی کو لوٹنا ہے۔ اِن کی غایت درجہ کوشش یہی رہی ہے کہ مسلمانوں کا رُخ حرم سے پھیر کر لندن، سومنات، نجد اور واشنگٹن کی جانب پھیر دیا جائے۔ مسلمانانِ عالم کے زوال کے اسباب میں سب سے بڑا سبب وہابیت کا ظہور رہا ہے۔ خلافت سے لے کر ہر ملک کی اسلامی حکومت تک، جسے بھی غیر مسلم طاقتوں نے تاراج کیا، اُس کی تہہ میں وہابیوں کی فتنہ سامانی اور اسلام دشمنی کارفرما ضرور رہی ہے۔ اِنھوں نے ہمیشہ غیر مسلموں کے دستِ بازو بن کر مسلمانوں کے مفادات پر کاری ضربیں لگائیں اور ملّتِ اسلامیہ کے لیے مارِ آستین ثابت ہُوئے۔ مسلمانوں کو اقتدار سے محروم کروانے کے بعد اُن کے خرمنِ اتحاد میں آگ لگانے میں مصروف رہے اور کبھی مسلمانوں کو متحد نہیں ہونے دیا۔ خود فتنوں کا دروازہ کھولنا اور خود اُسے بند کرنے کے لیے، مجاہد و مصلح کہلانے کی خاطر مہم چلانا اِن کی تکنیک رہی ہے تاکہ بھولے بھالے مسلمان اِنھیں مصلح، ریفارمر اور ملّتِ اسلامیہ کے ہمدرد جان کر اِن کے پیچھے لگ جائیں اور اِس طرح ملّی وحدت کا جنازہ نکل جائے۔ دوسرے گمراہ فرقے جلد مٹ جایا کرتے تھے لیکن یہ وہابیت کا فتنہ غیر مسلم طاقتوں کی بدولت دو سو سال سے پھلتا پھُولتا اور اپنی جڑیں وسیع کرتا ہی جا رہا ہے۔

مُخبرِ صادق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خوارج کا یہ بھی خاصہ بتایا تھا کہ یَقْتُلُوْنَ اَهْلَ الْاِسْلَامِ وَیَدْعُوْنَ اَهْلَ الْاَوْثَانِ۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اِن کی شرپسندی اور فتنہ انگیزی سے محفوظ و مامون رکھے۔ (آمین)

۵- بانیِ نیچریت کے کارنامے

گاندھی نے ایک جانب انڈین نیشنل کانگرس بنا کر برٹش گورنمنٹ کے ہندوؤں کے بارے میں جو شکوک و شبہات تھے اُنھیں دور کرنا شروع کیا اور حکومت کی حمایت کا دم بھرنا کانگرسی لیڈروں کا شعار بنا دیا اور دوسری طرف ہندو قوم کے سامنے ایسے اصول رکھے کہ چند ہی سالوں میں دولت، تعلیم، خوشحالی اور ظاہری عزّت ہندوؤں کے پاس جمع ہونی شروع ہوگئی۔ ہندو قوم ہر لحاظ سے اِتنی مضبوط و مستحکم ہوگئی کہ وُہ جب چاہتے تو حکومتِ وقت کی چُولیں ہلا کر رکھ دیتے اور انگریز کی حکومت نہ ہوتی تو مسلمانوں کو علی الاعلان کچّا چبا جاتے، کیونکہ حکومت کی مشینری کے بیشتر کل پُرزے ہندو تھے۔

اِس صورتِ حال کے ابتدائی تیور دیکھتے ہی برٹش گورنمنٹ کی نظرِ انتخاب نے مسلمانوں سے سر سیّد احمد خاں صاحب کو چُن لیا۔ مسلمان قوم کو انگریزوں کے قریب لانے کی تلقین کی، تاکہ سابقہ اور موجودہ حاکم قوموں کے درمیان جو منافرت پیدا ہو چکی تھی وُہ دُور ہو جائے۔ یہ اُسی صورت میں ممکن تھا کہ ملّتِ اسلامیہ کو غیرتِ ملّی سے عاری کر کے اینگلو انڈین مسلمان بنا دیا جائے، اُن کا رُخ حرم سے لندن کی جانب پھیر دیا جائے نیز انگریزوں اور مسلمانوں میں "من تُو شدم تُو من شدی" والا معاملہ ہو۔ ایک انگریز اور مسلمان میں ماسوائے اِس کے اور کوئی فرق نہ ہو کہ وہ خود کو عیسائی اور یہ مسلمان کہتا رہے۔ سر سیّد احمد خاں صاحب اِس بات پر آمادہ ہوگئے اور اُنھوں نے ایک جانب مسلمانوں کو انگریزوں کے قریب لانے کی کوشش شروع کر دی تو دوسری طرف اسلام اور عیسائیت کا فرق مٹانے کی مہم کا آغاز کر دیا۔

اِسلام ہی ایک سچّا دین ہے اور اِس کے علاوہ جتنے بھی مذاہب ہیں سب جھُوٹے اور باطل ہیں۔ اسلام ایسا کامل اور مکمل دین ہے جس میں کسی غیر اسلامی نظریئے کو شامل کرنے کی

قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ جھوٹے مذاہب میں سے ایک مذہب والا اگر دوسرا مذہب اختیار کر لے یا دوسرے مذہب کے قریب ہو جائے تو اُس کا اُسی طرح کچھ نہیں بگڑتا جس طرح ایک نجاست میں دُوسری ملا دینے سے پلیدی میں کوئی فرق نہیں آتا لیکن اسلام میں باطل مذاہب کا ایک نظریہ شامل کر لینے سے وہی نتیجہ سامنے آتا ہے جو دودھ کے کسی بھرے ہوئے ٹب میں پیشاب کا ایک قطرہ ڈالنے سے برآمد ہوتا ہے کہ سارا دودھ پلید اور ناقابلِ استعمال۔ اسی طرح کسی مسلمان کہلانے والے کا ایک غیر اسلامی نظریہ اختیار کر لینا اُس کے اِسلامی دعوے کو غلط بنا دیتا ہے اور شریعتِ مطہرہ ایسے کسی بھی شخص کو مسلمان تسلیم کرنے کی روادار نہیں ہے۔

گاندھی اگر اپنی قوم کو انگریزوں اور عیسائیت کے قریب لے گیا تو اس سے ہندوؤں کی بدمذہبی میں کیا فرق آیا؟ لیکن عیسائیت کے نزدیک جانے والے مسلمانوں کے پلّے کیا رہ گیا؟ دین و ایمان سے ہاتھ دھونے کے بعد اگر دولت و وجاہت ہاتھ بھی آئی تو یہ دنیاوی زینت آخرت میں کس کام آئے گی جبکہ ایمان جیسی متاعِ عزیز ہی گنوا دی جس پر اُخروی نجات کا دارومدار ہے۔

سرسیّد احمد خاں صاحب نے مسلمانوں کو برٹش گورنمنٹ کے قدموں میں جھکانے کی جو کوشش کی اُس کے بارے میں موصوف اور اُن کے حامیوں کے چند بیانات بابِ چہارم میں پیش کیے جائیں گے، انشاءاللہ تعالیٰ۔ یہاں صرف یہ پہلو اجاگر کرنا ہے کہ اُنھوں نے مسلمانوں کو عیسائیت کے نزدیک لے جانے نیز اسلام اور عیسائیت کا فرق مٹانے کی کہاں تک کوشش کی؟ ہمارے مذکورہ بالا خیالات کو سرسیّد احمد خاں صاحب کے دستِ راست یعنی خواجہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی کے مندرجہ ذیل بیان کی روشنی میں پرکھا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے لکھا ہے:

> ”سرسیّد نے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جن دو باتوں کو مسلمانوں کی آئندہ بہبودی کے لیے ضروری سمجھا تھا، اُن کے لیے انگلستان کا سفر کرنا ضروری تھا۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ جب تک مسلمانوں میں مغربی تعلیم نہ پھیلے گی اور جب تک مسلمانوں اور انگریزوں میں موانست اور میل جول پیدا نہ ہوگا اُس وقت تک مسلمانوں کا پنپنا اور ہندوستان میں عزت سے رہنا دشوار ہے۔ گو وہ اب تک اِن دو تدبیروں میں

برابر سرگرم رہے مگر جس حد تک وُہ اپنا منصوبہ پُورا کرنا چاہتے تھے اُس کے لحاظ سے اِن کو ولایت کا سفر کرنا ضروری معلوم ہوا۔"[1]

ہوسکتا ہے کہ یہاں کوئی صاحب یہ فرمانے لگیں کہ مذکورہ بیان سے مغربی تعلیم کا حصول اور انگریزوں سے میل وجول کی کوشش تو ضرور ثابت ہوتی ہے لیکن اسے عیسائیت کے قریب لے جانا قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ایسے حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ سرسیّد احمد خاں صاحب نے قرآن کریم کی ایک تفسیر بھی لکھی تھی، جس میں آیاتِ قرآنیہ کے مفہوم و مطالب ساری اُمتِ محمدیہ کے برعکس اور ہی کچھ بتائے ہیں۔ حالی صاحب اِس تفسیر کی توصیف میں یُوں رقمطراز ہیں:

> "الحمدللہ اِس حق گو تفسیر کی بدولت روحانی مہلک بیماریوں کو آج غسلِ صحت مِلا۔ مسلمانوں کے پاک دلوں میں وُہ گندی گندی باتیں جمی ہوئی تھیں جیسے کعبے میں بُتان۔ اب اُن کا یک بیک دُور ہونا خدا کے مقدس کلام کی سچّی تفسیر کا نتیجہ ہے۔ ہم اِس اِحسان کے بدلے اپنی کھال کی جُوتیاں بنا دیں تو حضرت کی تفسیر کے ایک فقرے کا معاوضہ نہ ہوگا۔"[2]

سرسیّد احمد خاں صاحب نے بائبل کی تفسیر بھی لکھی اور عیسائی حضرات کو اطمینان دلاتے ہوئے اپنا مطمحِ نظر یُوں بیان کیا:

> "یقیناً میں بھی بائبل کا اُتنا ہی طرف دار اور مؤیّد ہوں جس قدر کہ آپ ہیں۔ میرا مقصد ہے کہ میں ڈاکٹر کلنزو کے اعتراضات کا اپنی تفسیر کے مناسب حصّوں میں، جب اُن کا موقع آئے، جواب دوں۔"[3]

مذکورہ تفسیر کے بارے میں خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنے تاثرات یُوں سپردِ قلم کیے تھے:

> "یہ تفسیر جو انجیل کو بجائے لغو سمجھنے کے، جیسا کہ اب تک خیال تھا، واجب التعظیم بیان کرتی ہے، اور اِس کا ثبوت خود قرآن سے دیتی ہے، اِس قابل ہے کہ

---

[1] الطاف حسین حالی: حیاتِ جاوید، ص ۲۰۱ [2] ایضاً: س ۷۰۰

[3] ایضاً: ص ۱۷۲

اِس کا ترجمہ مسلمانوں کی ہر زبان میں اور بالخصوص عربی میں ہو کیونکہ مسلمانوں کے واسطے سے اِس سے مفید بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ انجیل کو اُسی عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگ جائیں جس نگاہ سے وُہ قرآن کو دیکھتے ہیں۔“ [1]

جناب حالی صاحب کے آخری الفاظ بار بار پڑھنے کے قابل ہیں۔ کیا اب بھی کوئی شک و شبہ باقی رہ گیا کہ مسلمانوں کو ایمان سے محروم کر کے نیم عیسائی بنانے کی یہ ایک پُراسرار سازش تھی جس کا جال برٹش گورنمنٹ نے پھیلایا اور سر سیّد احمد خاں صاحب نے حکومت کے اِس منصوبے کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ موصوف نے اِسی منصوبے کے تحت پُورے دین میں ترمیم کی اور حکومت کے اشارے پر ایسا اسلام مرتب کیا، جس کے پیروکار اور ایک کھلے غیر مسلم میں ماسوائے مسلم اور غیر مسلم کہلانے کے اور کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ سر سیّد احمد خاں صاحب نے مقدس اسلام میں جو کتر بیونت کی اُس کا خلاصہ جناب حالی پانی پتی نے یُوں پیش کیا ہے:

۱۔ اجماع حجت شرعی نہیں ہے۔

۲۔ قیاس حجت شرعی نہیں ہے۔

۳۔ تقلید واجب نہیں ہے۔

۴۔ قرآن کا کوئی حکم جو ایک آیت میں بیان ہُوا تھا کسی دُوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوا اور نہ قرآن کی کسی آیت کی تلاوت منسوخ ہُوئی اور سورۂ بقر کی اِس آیت سے کہ ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا۔ قرآن کی کسی آیت کا ناسخ اور کسی کا منسوخ ہونا مراد نہیں ہے بلکہ اُس کا بعض آیتوں سے شرائع سابقہ کے بعض احکام کا منسوخ ہونا مراد ہے۔

۵۔ قرآن میں کسی طرح کی زیادتی یا کمی یا تغیر و تبدل واقع نہیں ہُوا۔ وُہ جس طرح اور جس قدر نازل ہُوا تھا اُسی قدر زمانۂ نزول سے آج تک محفوظ ہے اور جن روایتوں سے زیادتی یا کمی یا تغیر و تبدل کا ہونا یا بعض صحابہ کے اقوال سے قرآن کا توارد ہونا پایا جاتا ہے وہ سب موضوع، وہ مفتریٰ ہیں۔

---

[1] حالی پانی پتی: حیاتِ جاوید، ص ۱۷۲

۶۔ صحاح ستہ بلکہ صحیحین کی بھی تمام حدیثوں کو، جب تک اصولِ علمِ حدیث کے موافق اُن کی جانچ نہ کی جائے، قابلِ وثوق نہیں سمجھنا چاہیے۔

۷۔ شیطان یا ابلیس کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا ہے اُس سے کوئی وجود خارج عن الانسان مراد نہیں ہے، بلکہ خود انسان میں جو نفسِ امارہ یا قوتِ بہیمیہ ہے، وہ مراد ہے۔

۸۔ طیورِ منخنقہ جن کو نصاریٰ نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہو، مسلمانوں کو اُن کا کھانا حلال ہے۔

۹۔ چونکہ خبرِ واحد میں احتمالِ صدق و کذب باقی رہتا ہے، اِس لیے جو اعتراض اخبارِ احاد کی بنا پر اسلام کی نسبت کیے جاتے ہیں، اِسلام اُن کا جواب دِہ نہیں ہے۔

۱۰۔ سوا اُن کفار و مشرکین کے جن کا قرآن کی اِس آیت میں ذکر کیا گیا ہے یا جو اِس آیت کے مصداق ہوں کہ: انما ینھٰکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علیٰ اخراجکم ان تولّوھم۔ تمام کفار و مشرکین سے دوستی و موالات کرنا جائز ہے۔

۱۱۔ عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کی کتابوں میں تحریف لفظی واقع نہیں ہوئی بلکہ صرف تحریف معنوی ہوئی ہے مگر اِسی کے ساتھ اُن کا اوّل سے آخر تک الہامی ہونا اور غلطی سے پاک ہونا غیر مسلم ہے۔

۱۲۔ ہر شخص اُن مسائل میں جو قرآن یا حدیث صحیح میں منصوص نہیں ہیں، آپ اپنا مجتہد ہے۔

۱۳۔ حضرت ہاجرہ جو اسمٰعیلؑ کی ماں ہیں وہ جیسا کہ بعض روایتوں میں مذکور ہے، درحقیقت لونڈی نہ تھیں بلکہ رقیون بادشاہِ مصر کی بیٹی تھیں۔ رقیون نے اُن کو صرف تربیت کے لیے حضرت سارہ کے ساتھ کر دیا تھا۔

۱۴۔ وضع و لباس وغیرہ میں کفّار کے ساتھ تشبہ شرعاً ممنوع نہیں ہے۔

۱۵۔ قرآن کی کسی آیت سے جبر پر اور کسی سے قدر پر استدلال کرنا، جیسا کہ متکلمین نے اپنے اپنے مذہب کی تائید کے لیے کیا ہے، مقصدِ شارع کے برخلاف ہے، کیونکہ جن آیتوں سے اِس مسئلہ کو استنباط کیا جاتا ہے، اُن آیتوں سے بندوں کے مجبور یا مختار ہونے کا تصفیہ کرنا مقصود نہیں ہے ورنہ آنحضرت مسئلہ مذکور کے متعلق بحث کرنے والوں پر غضب ناک ہو کر یہ نہ فرماتے کہ: أَبِھٰذَا اُمِرْتُمْ اَمْ بِھٰذَا

اُمُّہ سِلتُ۔

۱۶۔ معراج اور شقِ صدر دونوں رُؤیا میں واقع ہُوئے ہیں نہ کہ بیداری میں، کیا مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک اور کیا مسجدِ اقصیٰ سے آسمانوں تک۔

۱۷۔ ممکن ہے کہ جس طرح انسان سے فروتر مخلوقات موجود ہے اِسی طرح اُس سے بالاتر مخلوقات، جس کا ہم کو علم نہیں، موجود ہو، لیکن ملائک یا ملائکہ کے الفاظ جو قرآن میں وارد ہُوئے ہیں اُن سے یہ مراد نہیں ہے کہ وُہ جدا مخلوق انسان سے بالاتر ہے بلکہ خدا تعالیٰ نے مختلف قویٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے مادّے میں ودیعت کیے ہیں جیسے پہاڑوں کی صلابت، پانی کا سیلان، درختوں کا نمو، برق کی قوتِ جذب و دفع وامثال ذالک، اُنھیں کو ملائک یا ملائکہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۱۸۔ آدم اور ملائکہ اور ابلیس کا قصّہ جو قرآن میں بیان ہُوا ہے یہ کسی واقعے کی خبر نہیں ہے بلکہ یہ ایک تمثیل ہے جس کے پیرائے میں انسان کی فطرت اور اُس کے جذبات اور قوتِ بہیمیہ جو اُس میں ودیعت کی گئی ہے، اُس کی بُرائی یا دشمنی کو بیان کیا گیا ہے اور اِس قسم کی اور بھی متعدد تمثیلیں قرآن میں موجود ہیں۔

۱۹۔ معجزہ دلیلِ نبوّت نہیں ہو سکتا۔

۲۰۔ قرآن میں آنحضرت صلعم سے کسی معجزہ کے صادر ہونے کا ذکر نہیں ہے۔

۲۱۔ آیہ: الذین اٰتینٰھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم میں جو ضمیرِ مفعول لفظ یعرفونہ میں ہے، وہ جیسا کہ عام مفسرین لکھتے ہیں، آنحضرت کی طرف عائد نہیں ہوتی بلکہ جیسا ابن عباس، قتادہ، ربیع اور ابنِ زید سے منقول ہے تحویلِ قبلہ کے معاملے کی طرف پھرتی ہے، جس کا ذکر اِس آیت سے پہلے اور اِس کے بعد کیا گیا ہے۔

۲۲۔ آیتِ میراث سے وصیّت کا حکم، جو آیتِ وصیّت میں والدین اور دیگر ورثاء کے لیے تھا، منسوخ نہیں ہوا۔ پس جو وصیت وارث کے حق میں کی جائے وہ نافذ ہے۔

۲۳۔ جو لوگ مشکل سے روزہ رکھتے ہیں وہ آیہ: وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین کے بموجب روزوں کے بدلے فدیہ دے سکتے ہیں۔ بعض دیگر علماء فدیہ کی

اجازت کو خاص کر معمر لوگوں کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں مگر سرسیّد کے نزدیک یہ حکم عموماً اُن سب لوگوں کے لیے ہے جن کو روزہ رکھنا شاق ہو، خواہ بڈھے ہوں اور خواہ جوان۔ لیکن بہ نسبت فدیہ دینے کے اُن کو روزہ رکھنا بہتر ہے۔

۲۴۔ جس ربا یعنی سُود کی حرمت قرآن میں بیان ہُوئی ہے، اُس سے اُسی قسم کا ربا مراد ہے جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب میں جاری تھا اور جس کی مثال ہمارے ملک کے سُود خواروں اور رہٹیوں میں، جن کا پیشہ سُود خواری ہے، پائی جاتی ہے۔ مگر اِس سے اُس منافع کی حرمت جو پرامیسری نوٹوں پر لیا جاتا ہے ثابت نہیں ہوتی۔ اِس کے سِوا کسی گورنمنٹ یا کمپنی کو جو ملک کی ترقی کے لیے روپیہ قرض لے، اُس کو سُود پر روپیہ دینا یا کسی جماعت کا رفاہِ عام کے کام کے لیے چندہ جمع کرے، اُس روپیہ کا سُود میں لگانا اور اُس کے منافع سے رفاہِ عام کے کام کرنا، یہ بھی ربا میں داخل نہیں ہے۔

۲۵۔ قرآن میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے حضرت عیسیٰؑ کا زندہ آسمان پر اُٹھایا جانا ثابت ہو۔

۲۶۔ شہدا کی نسبت جو قرآن میں آیا ہے کہ اُن کو مُردہ نہ سمجھو بلکہ وُہ زندہ ہیں، اِس سے اُن کا علوِ درجات اور روحانی خوشی اور دنیا میں مثال قابلِ تقلید چھوڑنا مراد ہے، نہ یہ کہ وہ درحقیقت زندہ ہیں اور مثل زندوں کے کھاتے پیتے ہیں۔

۲۷۔ صور کا لفظ جو قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے اُس سے فی الواقع کوئی آلہ مثل نرسنگھے یا سنکھ یا تری یا قرنا کے مراد نہیں ہے بلکہ یہ محض استعارہ ہے کہ جس طرح تری کی آواز پر لشکر جمع ہو جاتے ہیں اِسی طرح خدا کی مشیّت اور ارادہ سے بعث وحشر واقع ہو گا۔

۲۸۔ خدا تعالیٰ کی ذات وصفات اور اسماء وافعال کے متعلق جو کچھ قرآن یا حدیثوں میں بیان ہوا ہے وُہ سب بطریقِ مجاز واستعارہ وتمثیل کے بیان ہُوا ہے اور اِسی طرح معاد کے متعلق جو کچھ بیان ہُوا ہے، وہ بھی سب مجاز پر محمول ہے نہ حقیقت پر۔

۲۹۔ قرآن میں جو خدا کا زمین وآسمان کو چھ دن میں پیدا کرنا بیان ہوا ہے، اِس سے کسی واقعہ کی خبر دینی مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہودیوں کے اِس اعتقاد کی تردید مقصود ہے کہ

خدا تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنے کے بعد ساتویں دن آرام لیا اور اسی لیے جو کچھ اُن کا عقیدہ خلقِ زمین و آسمان کی نسبت تھا اُس کو قرآن میں اُسی طرح بیان کر کے فرمایا کہ وَمَا مَسَّنَا مِنۡ لُّغُوۡبٍ۔ کیونکہ شارع کا مقصد حقائقِ اشیاء سے بحث کرنا یا جو باتیں حقائق کے برخلاف ہوں اُن پر ردّ و قدح کرنا نہیں ہے بلکہ جو خیالات لوگوں کے دل میں خدا کی وحدانیت اور قدرت و عظمت کے خلاف تہہ نشین ہوں اُن کا زائل کرنا ہے۔

۳۰۔ قرآن میں جابجا قدیم قوموں میں بدیاں اور بداخلاقیاں پھیل جانے کے بعد اُن پر طرح طرح کے عذاب نازل ہونا اور کسی قوم کو آندھی اور طوفان سے، کسی کو زلزلہ سے، کسی کو ٹڈیوں اور دیگر حشرات کے مسلّط کرنے سے اور کسی کو کسی اور کسی کو کسی عذاب سے برباد کرنا بیان ہوا ہے، اِس کا یہ مطلب نہیں کہ درحقیقت اُن کے گناہ اور معاصی عذاب نازل ہونے کا باعث ہوئے تھے بلکہ ابتدائے آفرینش سے یہ خیال تمام قوموں میں چلا آتا تھا کہ جو ہولناک حادثے دنیا میں واقع ہوتے ہیں وہ انسان کے گناہوں کی کثرت کے سبب ہوتے ہیں اور انبیائے کرام کا کام یہ ہے کہ جن خیالات پر لوگ مجبول ہوئے ہیں اگر وُہ خیالات مقاصدِ نبوّت کے منافی نہیں ہیں بلکہ اُن کی تائید کرنے والے ہیں تو وُہ اُن خیالات کی صحت یا غلطی سے کچھ تعرض نہیں کرتے بلکہ اُنھیں خیالات کے موافق اُن سے خطاب کرتے ہیں۔

۳۱۔ خدا کا دیدار کیا دنیا میں اور کیا عقبیٰ میں، نہ اِن ظاہری آنکھوں سے ممکن ہے اور نہ دل کی آنکھوں سے۔

۳۲۔ قرآن مجید میں جو جنگِ بدر و حنین کے بیان میں فرشتوں کی مدد کا ذکر کیا گیا ہے، اُس سے اُن لڑائیوں میں فرشتوں کا آنا ثابت نہیں ہوتا۔

۳۳۔ صفاتِ باری تعالیٰ عینِ ذات ہیں، نہ غیرِ ذات اور نہ لا عین ولا غیر، جیسا کہ اشاعرہ کا مذہب ہے۔

۳۴۔ حضرت عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا کسی بات سے ثابت نہیں ہوتا۔

۳۵۔ کوئی امر عادتِ الٰہی اور قانونِ طبیعی کے خلاف کبھی وقوع میں نہیں آتا۔

۳۶۔ قرآن میں جو کفار سے بطور معارضہ کے کہا گیا ہے کہ تم کو اِس کتاب کے مِنْ عِنْدِ اللہ ہونے میں شک ہو تو اُس کی مثل کوئی سورت یا چند آیتیں تم بنا لاؤ۔ اِس سے جیسا کہ اکثر اہلِ اسلام خیال کرتے ہیں، یہ مراد نہیں ہے کہ ایسا فصیح کلام تم نہیں بنا سکتے بلکہ یہ مراد ہے کہ ایسا کلام جو عالم اور فلسفی اور حکیم سے لے کر جاہلوں، صحرا نشین بدوؤں اور اونٹ چرانے والوں تک سب کی ہدایت کے لیے یکساں مفید اور سب کی سمجھ اور علم کے موافق ہو، بنا لینا تمھاری طاقت اور قدرت سے باہر ہے۔

۳۷۔ نبوت کا ملکہ نبی کی اصل فطرت میں ودیعت ہوتا ہے اور جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اَلنَّبِیُّ نَبِیٌّ وَلَوْ کَانَ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ۔ وہ ماں کے پیٹ سے نبی ہوتا ہے اور جس طرح تمام ملکات اور قوائے فطری بتدریج ترقی کرتے ہیں، اُسی طرح ملکۂ نبوت بتدریج ترقی پاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ کمال کے درجے کو پہنچ جاتا ہے تو اُس سے وہ ظہور میں آتا ہے جو اُس کا مقتضیٰ ہوتا ہے اور جس کو عرفِ عام میں بعثت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اِس لیے جو وحی اُس پر نازل ہوتی ہے وہ کسی ایلچی یا قاصد (یعنی فرشتہ) کی وساطت سے نازل نہیں ہوتی بلکہ خود بخود ایک چیز اُس کے دل سے اُٹھتی ہے اور اُسی پر گرتی ہے

۳۸۔ قرآن سے جنات کا ایسا وجود جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہوائی آگ کے شعلے سے پیدا ہوئے ہیں اور اُن میں مرد و عورت دونوں ہوتے ہیں، جس شکل میں چاہتے ہیں ظاہر ہو سکتے ہیں، آدمی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ، ثابت نہیں ہوتا۔

۳۹۔ انبیائے بنی اسرائیل اور قوم بنی اسرائیل کے قصے جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں، اُن میں جس قدر باتیں بظاہر قانونِ فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہیں، وہ سب در حقیقت اُس کے مطابق بیان کی گئی ہیں مگر مفسرینِ اہلِ اسلام نے یہودیوں کی پیروی سے اُن کے معانی ایسے بیان کیے ہیں جو قانونِ فطرت کے خلاف ہیں۔

۴۰۔ طوفانِ نوح جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا ہے، عام نہ تھا بلکہ اُسی قوم اور اُسی ملک میں محدود تھا، جس پر حضرت نوح مبعوث ہوئے تھے۔

۴۱۔ حضرت اسحاق کی ولادت کے وقت حضرت سارہ کی عمر اُس حد کو نہیں پہنچی تھی جبکہ عادۃً اولاد کا

ہونا غیر ممکن ہے۔ [1]

نوٹ: اس سے بھی بڑھ کر سر سید احمد خاں صاحب نے چند مسائل و نظریات کے ذریعے شریعتِ محمدیہ کو غتر بود کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ مسلمان اپنی ایمان جیسی متاعِ عزیز کو گنوا کر صرف اینگلو انڈین مسلمان بن جائیں۔ چنانچہ موصوف نے اُمتِ محمدیہ سے ایسے جتنے نظریات میں اختلاف کیا اُن کا خلاصہ حالی پانی پتی کے لفظوں میں گزشتہ ترتیب کے ساتھ پیشِ خدمت ہے۔

۴۲۔ اسلام نے غلامی کو ہمیشہ کے لیے موقوف کر دیا ہے اور آیہ من و فدا جو سورۂ محمد میں ہے وہ نہایت صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہے۔

۴۳۔ دعا ایک قسم کی عبادت ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے الدعاء ھو العبادۃ، پس دعا کے مستجاب ہونے سے اُس کا مطلب جس کے لیے دعا کی جاتی ہے، حاصل ہونا مراد نہیں ہے بلکہ جو معنی عبادت کے قبول ہونے کے ہیں، وہی معنی دُعا کے مستجاب ہونے کے ہیں۔

۴۴۔ آیت یا آیاتِ بیّنات کے الفاظ جو قرآن مجید میں جابجا آتے ہیں اُن سے وہ احکام یا مواعظ و نصائح مراد ہیں، جو خدا تعالیٰ نے بذریعہ وحی کے انبیاء پر نازل فرمائے ہیں، نہ کہ معجزات، جیسا کہ عموماً علمائے اسلام نے بیان کیا ہے۔

۴۵۔ حضرت عیسیٰ کی نسبت جو یہودی کہتے تھے کہ ہم نے اُن کو سنگسار کر کے قتل کیا اور عیسائی کہتے تھے کہ یہودیوں نے اُن کو صلیب پر قتل کیا تھا، یہ دونوں قول غلط ہیں بلکہ بلاشبہ وہ صلیب پر چڑھائے گئے مگر صلیب پر موت واقع نہیں ہوئی اور اسی لیے قرآن میں وما قتلوہ وما صلبوہ کے الفاظ واقع ہوئے ہیں، جس سے یہ مراد ہے کہ موت مصلوب کرنے سے مقصود تھی، وہ واقع نہیں ہوئی۔

۴۶۔ اگر مرد کو یہ احتمال بھی ہو کہ متعدد ازدواج میں عدالت کر سکے گا، تو اُس کو ایک سے زیادہ

---

[1] حالی پانی پتی: حیاتِ جاوید، ص ۶۰۴ تا ۶۱۰

جورو کی اجازت نہیں ہے۔

۴۷۔ سارق کے لیے قطعِ ید کی سزا جو قرآن میں بیان ہُوئی ہے لازمی نہیں ہے کیونکہ اگر لازمی ہوتی تو فقہا، اُس کو مالِ مسروقہ کی ایک خاص مقدار کے ساتھ مشروط نہ کرتے اور نیز صحابہ کے وقت میں متعدد موقعوں پر سارق کو صرف قید کی سزا نہ دی جاتی۔

۴۸۔ قرآن میں جِنّ اور اجِنّہ کے الفاظ سے چھُپے ہُوئے پہاڑی اور صحرائی لوگ مراد ہیں، نہ کہ وہ وہمی مخلوق جو دیو اور بھُوت وغیرہ کے الفاظ سے مفہوم ہوتی ہے۔

۴۹۔ سورۂ فیل میں جن الفاظ سے اصحابِ فیل پر ابابیل کا کنکریاں پھینکنا مراد دیا جاتا ہے وہ درحقیقت مرض چیچک سے استعارہ ہے، جس کی نسبت تاریخ سے ثابت ہے کہ پہلے پہل مرض چیچک عرب میں اُسی سال نمودار ہُوا جبکہ ابرہہ نے مکّہ پر چڑھائی کی تھی۔

۵۰۔ حضرت مُوسیٰ اور حضرت عیسیٰ اور تمام انبیائے سابقین کے قصّوں میں جس قدر واقعات بظاہر خلافِ قانونِ فطرت معلوم ہوتے ہیں، جیسے یدِ بیضا، عصا کا اژدہا بن جانا، فرعون اور اُس کے لشکر کا غرق ہونا، خدا کا مُوسیٰ سے کلام کرنا، پہاڑ پر تجلّی کا ہونا، گوسالہ سامری کا بولنا، ابر کا سایہ کرنا، منّ و سلویٰ کا اُترنا، عیسیٰ کا گہوارہ میں بولنا، خلقِ طیر، اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنا، مُردوں کو زندہ کرنا، مائدہ کا نزول وغیرہ وغیرہ اُن کی تفسیر میں جو کچھ سرسیّد نے لکھا ہے وُہ غالباً پہلے کسی مفسر نے نہیں لکھا۔

۵۱۔ قرآن مجید میں دو طرح کا کلام پایا جاتا ہے: ایک مقصود اور دوسرا غیر مقصود۔ پس جو کلام غیر مقصود ہے اُس سے کسی بات کے اثبات یا نفی پر استدلال نہیں ہو سکتا۔ مثلاً کفّار کے رحمتِ الٰہی سے محروم ہونے کو اِس طرح بیان کیا گیا ہے کہ: لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَآءِ، چونکہ اصل مقصود اُن کے حرمان کا بیان ہے اور اُس کو اِس پیرایے میں بیان کیا گیا ہے، اِس لیے اِس کلام کو غیر مقصود سمجھا جائے گا اور اِس سے اِس بات پر کہ آسمان میں فی الواقع دروازے موجود ہیں، استدلال نہ ہو سکے گا۔

۵۲۔ شریعتِ اسلامیہ میں تمام احکام دو قسم کے ہیں: ایک اصلی اور دُوسرے محافظِ احکامِ اصلی۔ جن احکام پر اسلام کی بنیاد قایم ہے وُہ صرف احکام اصلی ہیں، جن میں حکم ایسا نہیں کہ قانونِ

فطرت کے خلاف ہو، اور دوسری قسم کے احکام سے فقط احکام اصلی کی محافظت مقصود ہے نہ یہ کہ وہ خود مقصود بالذات ہیں۔ پس اُن کی نسبت یہ بحث بالکل بے محل ہے کہ وہ قانونِ فطرت کے مطابق ہیں یا نہیں۔ لیکن چونکہ دونوں لازم وملزوم ہیں اِس لیے عملاً دونوں کا درجہ برابر ہے۔ مثلاً نماز کے متعلق اصلی حکم صرف توجہ الی اللہ ہے، باقی جس قدر احکام اِس سے متعلق ہیں مثل وضو وقیام وقعود ورکوع وسجود اور استقبالِ قبلہ وغیرہ یہ سب اِس کے محافظ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مرض یا عذر کی حالت میں سب ساقط ہو سکتے ہیں مگر توجہ الی اللہ کسی حالت میں ساقط نہیں ہوتی۔ لیکن جب تک کوئی عذر مانع نہ ہو دونوں کا بجالانا ضروری ہے۔"[1]

شریعتِ مطہرہ کو انگریز بہادر کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر بازیچۂ اطفال بنا کر یوں بیدردی سے پامال کرنا جس شخص نے اپنا شعار بنا لیا ہو اور مسلمانوں کو علی الاعلان ایسا ہی مسلم نما عیسائی بننے کی دعوت دیتا رہا ہو، چاہیے تو یہی تھا کہ اسلام کی حقانیت پر یقین رکھنے والے اُس سے کنارہ کش رہتے اور اکثر حضرات نے ایسا ہی کیا لیکن برٹش گورنمنٹ کے پجاریوں نے اُس دشمنِ دین وایمان کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیے۔ چنانچہ خواجہ الطاف حسین حالی نے لکھا ہے:

> "سر سید احمد خاں کے جہاں ہم پر اور بہت سے احسانات ہیں، اُنھیں میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے ایک ایسی بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے ہیں، جس سے بہتر ہم اپنی موجودہ حالت کے مطابق کوئی نمونہ قوم کی تاریخ میں نہیں پاتے۔"[2]

خدا کا شکر ہے کہ سر سید احمد خاں صاحب کا جاری کردہ نیچری فرقہ کبھی کا اپنی موت مر چکا ہے لیکن اُس کے زہریلے اثرات تاحال مسلمانوں کے خرمنِ دین وایمان کو تباہ وبرباد کر رہے ہیں۔

---

[1] حالی پانی پتی: حیاتِ جاوید، ص ٦١٠ تا ٦١٢

[2] ایضاً: ص ٦٢

زیادہ تر اِس نحوست کا شکار سکولوں اور کالجوں کا تعلیم یافتہ طبقہ ہوتا ہے اور دوسری جانب پرویزیت وہی سرسید احمد خاں کی صدائے بازگشت بنی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو سچی ہدایت نصیب فرمائے۔ آمین

سرسید احمد خاں بھی وہابی تھے۔ مولوی مملوک علی صاحب کی سرکردگی میں جو دہلی کالج سے حکومت اپنے مقصد کے لوگوں کی کھیپ تیار کروا رہی تھی آنجناب بھی اُن میں سے ایک تھے۔ دیوبندی اور نیچری فرقوں کا بیک وقت دیوبند اور علی گڑھ سے ظہور ہوا تھا۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اَور دکھانے کے اور ہوتے ہیں، اِسی طرح ہر تخریب کار کی تصویر کے دونوں رُخ مختلف ہوتے ہیں۔ ایک جانب سے وہ بدصورت معلوم ہوتا ہے تو دوسری جانب سے حسین وجمیل۔ اِدھر سے دیکھیں تو تخریب کار نظر آئے گا اور دوسری طرف سے مصلح وریفارمر۔ اِس سمت سے مکمل بدخواہ نظر آتا ہے تو اُدھر سے خیرخواہ۔ یہ دوغلہ پن ہی ایسے حضرات کو منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے۔ اِن کا مقصد تخریب کاری اور اہلِ دین کی بدخواہی ہوتا ہے تاکہ کسی سے منہ مانگا انعام پاسکیں، لیکن جب اہلِ علم ودانش اُن کی حرکتوں سے آگاہ ہوکر بازپرس کرتے اور عوام الناس کو اُن کے شر سے محفوظ رہنے کی ہدایت کرتے ہیں، تو ایسے حضرات اپنی دوغلی تصویر کا دُوسرا رُخ سامنے کر دیتے ہیں کہ دیکھیے صاحب اِنَّ مَعَکُمْ ط اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ہ لیکن علمائے کرام اُن کے دھوکے میں آنے والے کہاں ؟ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ نئے لباس میں وہی پُرانے بہروپیے آرہے ہیں جن کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ ہمیشہ علمائے اہلسنّت وجماعت سے وابستہ رہیں اور اِسی دین ومذہب کو اپنا مقصدِ حیات بنائے رکھیں جس پر اللہ تعالیٰ کے جملہ مقبول بندے چل کر دونوں جہانوں کی کامیابی حاصل کر گئے اور جن کا نام آج تک مخلوقِ خدا کی زبانوں پر بصد عزت واحترام آتا ہے اور ہر صاحبِ عقل ودانش اُن کی عقیدت کا دم بھرنے پر مجبور ہے۔ اُن حضرات کے راستے کے علاوہ جو کسی اور راستے پر چلنے کی تلقین کرے یا اہلسنّت وجماعت کے مذہب کو یا اُس کے بعض عقاید ونظریات کو اپنی تحقیق کے سانچے میں ڈھالے اور اپنے عقلی ڈھکوسلوں کو قرآن وحدیث کا ماحصل اور شریعتِ مطہرہ کا منشا بتائے وہ رہبر کے بھیس میں رہزن ہے۔ ایسے

جملہ حضرات سے مسلمانوں کو ہر وقت خبردار رہنا چاہیے ۔ یعنی: ؎

بخوبی جانچ کر لے جنس کی بازارِ ہستی میں
فریبِ ان جَو فروشوں سے نہ کھا گندم نمائی کا

۶ ۔ بانیِ خاکسار پارٹی کے کارنامے

جناب عنایت اللہ مشرقی (المتوفی ۱۳۸۳ھ/۱۹۶۳ء) اس تحریک کے بانی تھے ۔ شروع میں خاکسار پارٹی ایک سیاسی جماعت کے بطور نمودار ہوئی ۔ بیلچہ اُن کا علامتی نشان تھا ۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہندی مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ان کا نصب العین ہے لیکن حقیقت میں یہ بھی برٹش گورنمنٹ کی ایک پُراسرار اور خوشنما چال تھی ۔ مشرقی صاحب کے بارے میں پیرزادہ بہاء الحق قاسمی امرت سری نے مؤتمر خلافتِ قاہرہ کے پیشِ نظر لکھا تھا:

"نام نہاد مؤتمرِ خلافتِ قاہرہ مصر منعقدہ ۱۳ مئی ۱۹۲۶ء میں جب ملحد عنایت اللہ مشرقی ہندی مسلمانوں کا خودساختہ نمائندہ بن کر شریک ہُوا تو ہندوستان اور ترکی و مصری اخبارات نے مشرقی کو برطانوی جاسوس قرار دیا ۔ چنانچہ روزنامہ 'زمیندار' لاہور نے، جو آجکل اپنی مخصوص مصلحتوں کے ماتحت اسی جاسوس کی تحریک خاکساری کا بہت بڑا حامی ہے، ۴؍ جولائی ۱۹۲۶ء کی اشاعت کے صفحہ ۱ پر اخبار البلاغ مصر مجریہ ۵؍ جون ۱۹۲۶ء کے ایک مقالہ کا ترجمہ شایع کیا، جس میں ترکی کے مشہور اخبار 'وقت' کے حوالہ سے مشرقی کو برطانوی جاسوس کہا گیا تھا ۔ اس پر خود مدیر زمیندار نے جولائی ۱۹۲۶ء کی اشاعت کے ص۲ پر لکھا ہے:

"ہم نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ بعض حلقوں میں یہ شُبہ کیا جا رہا ہے کہ مشرقی صاحب کی حیثیت طوطیِ پسِ آئینہ کی ہے اور اُن کی یہ نقل و حرکت اپنے استاذِ ازل کے ایماء و اشارہ کا نتیجہ ہے ۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے لکھا تھا کہ اگر یہ شبہ غلط اور بے بنیاد ہے تو حکومت کو چاہیے کہ وہ بے تعلقی کا اعلان

اور شیطان سے مراد وہ حیوانی طاقت ہے (جو انسان میں کھانے پینے کے لیے موجود ہے۔ اِس کے بعد) اُس نے (اپنی خرافات کو جاری رکھتے ہُوئے) وہ خیالات پیش کیے ہیں جن کو کوئی ایمان دار بلکہ عقلمند بھی زبان پر نہیں لاسکتا۔ پھر تعجب ہے (کہ اِن خرافات کے متعلق زور سے لکھتا ہے) کہ یہی حق اور اصل اسلام ہیں اور اُس کا دعوٰی ہے کہ میرے سِوا قرآن مجید کو (کسی نے آج تک نہیں سمجھا) اور اُسے یہ بھی دعوٰی ہے کہ اِس وقت (مسلمانوں کا) امیر (اور خلیفۃ المؤمنین) میں ہی ہُوں۔ پھر حکم دیتا ہے کہ زکوٰۃ مجھے دیا کرو (اور یہ بھی کہتا ہے کہ) میرا بیت المال ہی صدقات کا صحیح مصرف ہے۔

(علاوہ بریں) اپنے ہفتہ وار اخبار الاصلاح میں اور اپنے رسالہ مولوی کا غلط مذہب میں اور اپنی اردو تفسیر میں اور اپنی کتاب اشارات میں وہ خیالات پیش کیے ہیں جو اُمتِ محمدیہ کے عقاید کو پاش پاش اور اجماعِ امت کی بوٹی بوٹی کرتے ہیں اور قرآنِ مجید کی قطعی آیات اور متواتر احادیثِ نبویہ کے صریح خلاف ہیں، دیکھو مقدمہ عربیہ صفحات مندرجہ ذیل ..... (تاکہ) اُس کی خرافات کا آئینہ (آپ کے سامنے آجائے)، غرضیکہ اُس کے یہ چند خیالات مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ علاوہ بریں ایک اور عجیب خرافات یہ بھی ہے اور بڑے دعوے سے کہتا ہے کہ علمائے ازہر نے مجھے علاّمہ کا خطاب دیا ہے اور میری تفسیر کی نہایت تعریف کی ہے۔ اب اِن خرافات کے متعلق جناب کی رائے کیا ہے؟ اور اُس تفسیر کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ جو اِن امور پہ مشتمل ہے اور اِس شخص کے متعلق اور اِس کے فہمِ قرآن کے متعلق کیا فتوٰی ہے؟ (اور یہ بھی بتایا جائے کہ) کیا واقعی علمائے ازہر نے اِس کتاب کو دیکھ کر اِسے علاّمہ کا خطاب دیا ہے؟

المستفتی: عبداللہ شاہ مبلّغِ اسلام پشاور۔ ہندوستان"[1]

---

[1] بہاء الحق قاسمی، مولوی: ضربِ کاری بر مذہبِ خاکساری، ص ۳ تا ۶

اِس اِستفتاء کا جامعہ ازہر کے بزرگ ترین عالم علّامہ یوسف الدجوی المالکی نے عربی میں طویل جواب لکھا اور اُن کے فتوے پر چھ علمائے کرام کی تصادیق مع مُہر و دستخط ہیں، جن کے اسمائے گرامی حسبِ ذیل ہیں:

١۔ شیخ مصطفیٰ حمامی، شاہی خطیب، مسجد زینبی، قاہرہ، مصر۔
٢۔ علّامہ محمد حبیب اللہ الشنقیطی، نائب پرنسپل، جامعہ ازہر، مصر۔
٣۔ شیخ عبدالرحمٰن الجزیری الشافعی، استاد جامعہ ازہر، مصر۔
۴۔ علّامہ محمد زاہد الکوثری مشیخۃ الاسلام، وکیل دولتِ عثمانیہ، ترکیہ۔
۵۔ شیخ مصطفیٰ صبری، سابق شیخ الاسلام، ترکی۔
٦۔ شیخ خلیل خالدی حنفی، خطیب بیت المقدس۔

مذکورہ فتوے کے بارے میں ابو الضیا جناب پیرزادہ محمد بہاء الحق قاسمی نے مشرقی صاحب کے خیالات پر تبصرہ کرتے ہُوئے بعض ضروری امور کی وضاحت بھی فرمائی ہے۔ موصوف کا وہ بیان قارئین کرام کی معلومات میں اضافہ کرنے کی خاطر پیشِ خدمت ہے:

> ’عنایت اللہ مشرقی کے پیشِ نظر کوئی تعمیری پروگرام قطعاً نہیں۔ اُس کا مقصدِ وحید تخریب اور صرف تخریب ہے۔ علمائے کرام کا وجود باجود اُس کے تخریبی پروگرام کی تکمیل میں چونکہ سب سے بڑی رُکاوٹ ہے، اِس لیے وُہ ان حضرات کے خلاف مرزا غلام احمد قادیانی اور دُوسرے اعدائے اسلام کی طرح منافرت پھیلا کر اپنے ملحدانہ مقاصد کی اشاعت کے لیے راستہ صاف کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے ہندوستان کے علمائے کرام کو گالیاں دِیں کیونکہ یہی حضرات اُس کے فریب سے آگاہ تھے اور انھیں سے اُس کو واسطہ پڑتا تھا۔ لیکن مصر کے علماء کی نسبت اُس نے یہ بے بنیاد اور سراسر جھُوٹا پروپیگنڈا کیا کہ وُہ تذکرہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور کہ وُہ صاحبِ تذکرہ کو علّامہ کا خطاب دے چکے ہیں ......

مجلسِ علمی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت کی طرف سے جامعہ کے

> فاضل مدرس مولانا سیّد محمّد یوسف شاہ بنوری پشاوری بعض ضخیم کتبِ فقہ کی طباعت اور علمائے ممالکِ اسلامیہ کے ساتھ روابط پیدا کرنے کے سلسلے میں مصر، بیت المقدس، ٹرکی اور حجاز مقدس کو تشریف لے گئے اور آپ نے وہاں کے علماؑ کے سامنے مشرقی کی کتاب تذکرہ کو پیش کر کے اُن سے اِس کی نسبت فتویٰ طلب کیا۔ چنانچہ مصر کے جلیل القدر عالم علاّمہ یوسف دجوی مالکی نے فتویٰ لکھا، جس کی تائید و تصدیق مصر کے دُوسرے علماؑ کے علاوہ ٹرکی، بیت المقدس اور مکہ معظمہ کے علمائے کرام نے فرمائی۔ یہ فتویٰ حکومتِ مصر کے سرکاری رسالہ الاسلام مجریہ ۱۷ر شوال ۱۳۵۷ھ مطابق ۹ر دسمبر ۱۹۳۸ء میں چھپ چکا ہے، اِس لیے کسی اَلَدُّ الخِصَامِ کے لیے یہ کہنے کی گنجایش نہیں کہ یہ فتویٰ جعلی ہے۔ یہ فتویٰ اِس امر کا واضح ثبوت ہے کہ مشرقی کی تکفیر اور اُس کے عقائد کی تغلیط و تکذیب میں علمائے ہند متفرد نہیں ہیں بلکہ ممالکِ اسلامیہ کے علماء بھی اِس باب میں علمائے ہند کے ہمنوا ہیں۔ اب اِس کے بعد مشرقی کے لیے اِس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے کہ یا تو اِس فتوے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہُوئے اپنے عقاید کفریہ سے توبہ کرے یا حسبِ عادت پوری دلیری سے علمائے ہند کی طرح علمائے مصر وغیرہ کو بھی بے نقط گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکالے۔“ [1]

دُوسرا استفتاء علمائے مکہ مکرمہ کی خدمت میں پیش کیا گیا، جس کا امام مسجدِ حرام، جناب ابوالسمح نے ۱۱ر محرم ۱۳۵۸ھ کو جواب تحریر فرمایا اور اپنے فتوے میں مشرقی صاحب کے متعلق لکھا کہ: لا شك فی كفره و جهله۔ اِس فتوے کی مسجدِ حرام کے ایک مدرس محمد سلطان المحصوی نے تصدیق کی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ انگریز بہادر کے چلے جانے کے بعد یہ فرقہ پاکستان کے اندر ایک عُضوِ معطّل بن گیا اور عالیجناب مشرقی صاحب کی وفات کے ساتھ

---

[1] بہاء الحق قاسمی: ضرب کاری برمذہب خاکساری، ص ۲

ہی خاکساری فتنہ بھی زندہ درگور ہوگیا تھا۔ اب چند خاکساروں کا وجود اگر کہیں نظر آجاتا ہے تو ایسے حضرات اُس آندھی کے تنکے یا فتنے کی اُس گرم بازاری کے آثارِ قدیمہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہر فتنہ باز و فرقہ ساز کے شر سے بچائے۔ آمین۔ برٹش گورنمنٹ نے اپنے دورِ اقتدار میں اسلام دشمنی سے سرشار ہوکر، مسلمانوں کے خرمنِ دین و ایمان میں آگ لگانے کی خاطر، مصلحین کے رُوپ میں کیسے کیسے تخریب کار کھڑے کیے، جو قوم کے سامنے بڑے خوشنما رنگوں میں آئے اور رہبری کے بھیس میں رہزنی کرتے رہے۔ اتنے لصوصِ دین کھڑے کر دینے پر بھی انگریزی حکومت کی اسلام دشمنی کا جذبہ سرد ہونے میں نہ آیا۔ مسلمانوں کے خلاف اُس کی بھڑکی ہوئی آتشِ غیظ و غضب بجھنے کا نام نہ لیتی تھی، جسے دیکھ کر ہر صاحبِ نظر بے ساختہ کہہ اُٹھتا تھا: ؎

بسمل تو ہوتے سیکڑوں ہی سرد تڑپ کر
ٹھنڈا مِرے قاتل کا مگر دِل نہیں ہوتا

۷۔ بانیِ پرویزیت مسٹر غلام احمد پرویز کی تخریب کاریاں

یہ فرقہ سرسیّد احمد خاں صاحب کی نیچریت کے سہارے معرضِ وجود میں آیا ہے۔ اِس کے اکثر اجزا نیچریت کے ہیں، کچھ کمیونزم اور سوشلزم کا مواد ہے اور باقی مسٹر غلام احمد پرویز صاحب کی اپنی ایجادات۔ مذکورہ تینوں قسم کے اجزاء سے پرویزیت کی معجون مرکب تیار کی گئی ہے۔

پرویزی حضرات خود کو اہلِ قرآن کہتے، قرآن فہمی کے ٹھیکیدار بتاتے ہیں اور پرویز صاحب کے متعلق اُن کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ رسولِ خدا کے بعد اگر اسلام کے اِس چودہ سو سالہ دَور میں کسی نے قرآنِ کریم کی آیات کے حقیقی مفہوم و مطالب کو سمجھا ہے تو وہ صرف اور صرف مسٹر غلام احمد پرویز کی ذات ہے۔ مسلمانوں میں یہ فرقہ پرویزی، منکرینِ حدیث اور منکرینِ سنّت کے ناموں سے متعارف ہے۔ پرویز صاحب اور پرویزی حضرات کو اپنے اہلِ قرآن ہونے کا دعویٰ ہے اور وہ مسلمانوں سے قرآنِ مجید کی تعلیمات سے دُور اور نفور رہنے کا ڈھول بجاتے رہتے ہیں لیکن حقیقت میں اسلام کا دعویٰ کرتے ہوئے پرویز صاحب سے بڑا شاید ہی قرآنِ کریم کا کوئی مخالف پیدا ہُوا ہو۔ موصوف نے قرآنی تعلیمات اور اُس کے مفہوم و مطالب میں تحریف کا وہ

دروازہ کھولا ہے کہ احکامِ خداوندی کی حقیقی صورت کو مسخ کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہوا ہے۔ اگر یہ قرآن فہمی ہے تو قرآن دشمنی کس درخت کا نام ہوگا؟ جو کسی کی لُولی لنگڑی عقل آیاتِ قرآنیہ کا مطلب بتاتی جائے اگر آیات کا حقیقی مفہوم وہی ہوگا تو اِس طرح ہزاروں افراد، ہزاروں قسم کے مفہوم و مطالب نہ بتاتے پھریں گے؟ کیا وہ سب تعبیریں حقیقی اور درست ہوں گی؟ اگر نہیں اور ہرگز درست شمار نہیں ہوں گی تو مسٹر پرویز صاحب کی عقل کو قرآنِ کریم کی کون سی آیت نے حقانیت کا سرٹیفکیٹ دے دیا ہے کہ موصوف جو مفہوم بتاتے جائیں آیاتِ قرآنیہ کا حقیقی مفہوم وہی ہوگا؟ آخر قرآنِ کریم نے یہ کس جگہ تصریح کی ہے کہ کلامِ الٰہی کا حقیقی ترجمان مسٹر غلام احمد پرویز ہے؟ جو کچھ پرویز صاحب قرآنِ کریم کے بارے میں فرمائیں وہ درست اور دوسرے جو چاہیں کہتے پھریں وہ سب کچھ غلط۔ کیا پرویزی حضرات مسلمانوں کو یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں گے کہ کلامِ الٰہی میں یہ تصریح کس جگہ فرمائی گئی ہے؟ پرویز صاحب مسلمانوں کو سب سے پہلے یہ باور کرانے پر مُصر ہیں کہ:

> "دین کے ساتھ برادران! جو کچھ اقوامِ سابقہ کے ہاتھوں ہُوا تھا وہی کچھ اسلام کے ساتھ بھی ہُوا۔ اللہ تعالیٰ نے اِس دین کو قرآنِ کریم میں مکمل کیا اور حضور نے اس قرآن کو اُمت کو دے دیا، لیکن حضور کی تشریف براری کے تھوڑے عرصے بعد مفاد پرست قوموں نے اُبھرنا شروع کر دیا۔ اِس دفعہ پہلے ملوکیت آئی، اِس کے ساتھ سرمایہ داری اور اِن دونوں نے اپنے تحفظ کے لیے دین کو مذہب میں بدلنا شروع کر دیا۔ چنانچہ یہ دین بھی آہستہ آہستہ اُسی طرح مذہب میں تبدیل ہو گیا، جس طرح سابقہ انبیائے کرام کا لایا ہُوا دین تبدیل ہُوا تھا۔"[1]

اگر بقول مسٹر پرویز صاحب سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وصال کے تھوڑے ہی عرصہ بعد دین کو اُن کے اصطلاحی مذہب میں بدل دیا گیا تو اِس کا صاف مطلب یہی ہُوا کہ اُس وقت سے لے کر اب تک جتنے مسلمان کہلانے والے ہُوئے ہیں وہ سب بے دین اور

---

[1] غلام احمد پرویز، مسٹر: بہارِ نو، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ۱۹۶۵ء، ۳۶۹

اِسلام کے دشمن تھے۔ اِن حالات میں کئی سوالات پردۂ ذہن پر اُبھرتے ہیں، لیکن دو سوال پیشِ خدمت ہیں

۱۔ جب اِس تقریباً تیرہ سو سال کے درمیانی عرصے میں سارے مسلمان دین کے بدخواہ اور اِسے تبدیل کرنے والے ہی پیدا ہوتے رہے اور اُنھیں روکنے ٹوکنے والی کوئی طاقت نہ تھی تو اُنھوں نے قرآنِ کریم کے اندر معنوی تحریف کے ساتھ لفظی تحریف کرنے میں کون سی کسر اُٹھا رکھی ہوگی؟ دریں حالات پرویز صاحب موجودہ قرآن کی صحت لفظی کس طرح ثابت کریں گے؟ اگر وہ آیۂ کریمہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ...... سے استدلال کریں تو بالکل بے معنی بات ہوگی کہ اُمتِ مرحومہ کو اُمتِ ملعونہ ٹھہرا دینے کے سبب تو قرآنِ کریم کی صحت مشکوک ہوئی کہ جو کتاب دشمنوں بدخواہوں کے ہاتھوں ملی، اُس کی صحت اور کمی بیشی سے محفوظ رہنے پر کس طرح یقین کیا جائے؟ ایسی حالت میں قرآن مجید کی کسی آیت یا آیات سے کس طرح استدلال صحیح ہو سکے گا کیونکہ یہ شک اپنی جگہ قایم رہے گا کہ ممکن ہے اِس آیت یا اِن آیات کو اُن بدخواہوں نے گھڑ کر اپنی جانب سے شامل کر دیا ہو۔ لہٰذا اِن حالات میں صداقت اُس وقت ثابت ہو سکے گی جب کوئی خارجی دلیل قایم کر دی جائے۔ لیکن پرویز صاحب مرتے دم تک ایسی دلیل قایم نہیں کر سکیں گے۔ ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔

۲۔ جب دین کو مٹے اور مذہب کو اُس کی جگہ سنبھالے اتنی صدیاں گزر گئیں۔ دین کو جاننے والا، اُس پر چلنے والا کوئی نہ رہا تو اِتنا عرصہ گزرنے کے بعد پرویز صاحب کو کس ذریعے سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دین کی یہ شکل وصورت بتائی تھی اور قرآنی آیات کے مفہوم ومطالب یہی بتائے تھے جو مسٹر پرویز بتا رہے ہیں؟ اگر پرویز صاحب اِس کا کوئی تسلی بخش جواب مرحمت فرما دیں تو اُن کا مسلمان قوم پر بڑا کرم ہوگا۔

پرویز صاحب نے قرآنی تعلیمات کو اِس بیدردی سے بدلا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اِس آخری پیغام کو بچوں کا کھلونا یا مداری کا تماشا بنا کر رکھ دیا ہے۔ بغیر کسی دلیل وحجت کے جو منہ میں آتا ہے آیات کا مطلب بتاتے چلے جاتے ہیں۔ اسلام کی غربت! کا اِس سے

المناک دَور اور کب آیا ہوگا کہ قرآنِ کریم کے ایسے اشد ترین مخالف اور کلامِ الٰہی کے بے باک مُحرِّف سے کوئی بازپُرس کرنے والا نہیں کہ یہ کیا خبط بے ربط پھیلایا جا رہا ہے؟ کیوں رہنمائی کا دعوٰی کرکے رہزنی کی خوشیاں رچا رہے ہو؟ ہائے غربتِ اسلام! وائے قرآنِ کریم تیری کس مپرسی!! موصوف نے اپنی مخصوص ترنگ میں اللہ ربّ العزّت کے اسمِ ذات اللہ کا مطلب یہ بتایا ہے:

"اِس اہم نکتہ کو اگر تم سمجھ لو تو قرآن فہمی میں تمہاری بہت سی مشکلات کا حل خود بخود نکل آئے گا، یعنی اِن مقامات میں اللہ کی جگہ اللہ کا قانون کہہ دیا کرو، تو بات بالکل واضح ہو جائے گی، مثلاً اَللّٰہُ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ..... اللہ کا قانون مارتا ہے اور وہی زندہ رکھتا ہے۔"[1]

اب حکمِ خداوندی اَطِیْعُوا اللّٰہَ یعنی احکاماتِ الٰہیہ کی اطاعت کا پرویزی مفہوم ملاحظہ ہو:

"چونکہ خدا عبارت ہے اُن صفاتِ عالیہ سے جسے انسان اپنے اندر منعکس کرنا چاہتا ہے۔ اِس لیے قوانینِ خداوندی کی اطاعت درحقیقت انسان کی اپنی..... اطاعت ہے کسی غیر کی نہیں۔"[2]

لیجیے پرویز صاحب کے لفظوں میں ایمان بالغیب کا جدید مفہوم بھی ملاحظہ فرمائیے:

"مستقبل کے مفاد کے لیے وہی کوشش کرے گا جسے اَن دیکھے نتائج پر پورا پُورا یقین ہو۔ قرآن اِسے ایمان بالغیب کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔"[3]

موصوف نے قرآنِ کریم کو کھلونا بناتے ہُوئے شرک کا مطلب یہ گھڑا ہے:

"شرک کے معنی ہیں کہ انسان زندگی کے ایک دائرے میں کوئی اور قانون سامنے رکھے اور دُوسرے دائرے میں کوئی اور۔"[4]

اب اِسی انداز پر رئیس المحرّفین صاحب نے کفر کا مفہوم یہ بتایا ہے:

---

[1] مسٹر پرویز: سلیم کے نام خطوط، ص ۱۵۶

[2] مسٹر پرویز: معراجِ انسانیت، ص ۲۴۰

[3] مسٹر پرویز: اسبابِ زوالِ اُمت، ص ۳۰

[4] ایضاً: ص ۵۳

"وہ لوگ جو اپنے حال ہی کی زندگی کو زندگی سمجھتے ہیں ۔۔۔۔ اُنھیں ۔۔۔۔ کفار کا گروہ کہہ لیجیے یعنی مستقبل سے یکسر منکر۔"[1]

قیامت یعنی روزِ جزا و سزا موصوف جیسے مادیت پرست کی نگاہوں میں کیا ہے؟ ملاحظہ ہو:

"ظہورِ نتائج کے وقت میں اختلاف ہوتا ہے، اِس لیے قرآن نے واضح کر دیا کہ یوم الدّین ۔۔۔۔ اِس وقت بھی موجود ہے۔ یہ تو مُلّا کی قیامت ہے جس کا اِس زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔"[2]

حیات بعد الممات کو مسٹر پرویز صاحب نے کس چابک دستی سے اِسی زندگی میں سمویا ہے، موصوف کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

"حیات بعد الممات ایک ایسی حقیقت ہے جس پر ہمارے ایمان کی بنیاد ہے۔ زندگی ایک جُوئے رواں ہے ۔۔۔ اِس میں انقطاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"[3]

زندگی میں انقطاع کا سوال پیدا ہوتا ہے یا نہیں؛ اِس کا موصوف کو مرتے دم بخوبی علم ہو جائے گا، اگرچہ آج گمراہ گری کا بازار گرم رکھتے ہُوئے وُہ جو چاہیں کہہ سکتے ہیں، کون زبان پکڑ سکتا ہے؛ میزان پر اعمال تُلنے کی تصریح موصوف نے یُوں کی ہے:

"قرآنی تصوّر کی رُو سے ہماری زندگی کی ایک ایک سانس میں حساب اور کتاب پوشیدہ ہے۔ کارگاہِ حیات میں ایک ایک قدم پر میزان قایم ہے، جس میں ہمارے اعمال تُلتے ہیں اور ہمیں موت اور زندگی کے پروانے ملتے ہیں۔"[4]

متاعِ دُنیا اور متاعِ آخرت کا مفہوم جو پرویز صاحب نے گھڑا ہے، اُسے موصوف کی زبانی ہی سماعت فرمایا جائے:

"قرآن ۔۔۔ کے نزدیک متاعِ دنیا سے مفہوم ہوتا ہے وُہ مفاد جو انسان صرف اپنی ذات کے لیے تلاش کرتا ہے اور سامانِ آخرت سے مقصود ہوتا ہے

---

[1] مسٹر پرویز: اسبابِ زوالِ اُمت، ص ۲۴

[2] مسٹر پرویز: اسبابِ زوالِ اُمت، ص ۲۹

[3] مسٹر پرویز: فردوسِ گم گشتہ، ص ۳۲۱

[4] مسٹر پرویز: فردوس گم گشتہ، ص ۳۳۶

وہ متاع جسے وہ آنے والی نسلوں کے لیے جمع کرتا ہے۔" [1]

اب تقویٰ اور پرہیزگاری کا مطلب، جو پرویز صاحب کا خانہ ساز ہے، ملاحظہ فرمایا جائے:

"قانونِ فطرت ..... سے ہم آہنگی کو تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وقی کے معنی ہیں گھوڑے کے سموں کو اِس طرح گھسنا کہ وہ ہموار ہو جائیں۔" [2]

زمین و آسمان یعنی ارض و سماء کا پرویز صاحب نے کیا معنی گھڑا ہے، یہ بھی موصوف کی زبانی ملاحظہ فرمالیجیے:

"قرآن نے معاشی زندگی کے لیے ارض کی جامع اصطلاح استعمال کی ہے اور آفاقی قوانین کو جو کائنات میں جاری و ساری ہیں سماء کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔" [3]

اقامتِ صلوٰۃ یعنی نماز قایم کرنے کے بارے میں موصوف کیا تحقیق جھاڑتے ہیں، اُن کے ہی لفظوں میں ملاحظہ ہو:

"مجوسیوں کے ہاں پرستش کی تشکل کو نماز کہا جاتا تھا۔ یہ لفظ اُنہی کا ہے.....
لہٰذا صلوٰۃ کی جگہ نماز نے لے لی۔" [4]

"اب اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کا صحیح مفہوم سامنے آسکتا ہے، یعنی معاشرے میں ایسی فضا پیدا کر دی جائے جس سے ہر فردِ معاشرہ اُن مستقل اقدار کو اپنے اندر سموتے ہوئے جن کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے، اپنے دل کی مرضی اور رُوح کی خوشنودی سے دوسروں کے لیے سامانِ نشوونما بہم پہنچانے کی فکر میں لگ جائے۔ قرآن نے اِقَامَۃِ الصَّلٰوۃ کا لازمی نتیجہ یہی بتایا ہے۔" [5]

"جہنم والوں سے پُوچھا جائے گا کہ تم نے کیا جُرم کیا تھا، جس کی وجہ سے تمھاری

---

[1] مسٹر پرویز: اسبابِ زوالِ اُمت، ص ۲۹

[2] ایضاً: ص ۳۳

[3] ایضاً: ص ۳۵

[4] مسٹر پرویز: قرآنی فیصلے، ص ۲۶

[5] مسٹر پرویز: نظامِ ربوبیت، ص ۱۶۲، ۱۶۱

یہ حالت ہوگئی؟ وہ کہیں گے ہم مصلّی نہیں بنے تھے (قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ٥ ۷۴/۴۳) یعنی ہماری کیفیت یہ تھی کہ ہم اُن لوگوں کے لیے سامانِ پرورش نہیں فراہم کرتے تھے جو حرکت سے محروم ہوگئے تھے۔“ [1]

زکوٰۃ کا مفہوم بتاتے ہُوئے موصوف نے ایک عجیب سوال بھی کر دیا ہے۔ دونوں باتیں خود اُن کے لفظوں میں ملاحظہ ہوں:

”یہ حکم کہ زکوٰۃ دو، قرآن میں اور یہ حکم کہ زکوٰۃ بشرح اڑھائی فیصدی دو، قرآن سے باہر۔ کیا ...... اِس سے قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا؟“ [2]

واقعی زکوٰۃ کی شرح قرآن سے باہر ہے اور اِس کے بیان کر دینے سے قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ بھی نہیں تھا لیکن مسٹر پرویز نے ایمان اور توحید سے لے کر چھوٹے مسائل تک قرآن کریم کی تمام اصطلاحوں کو جو من مانے مفہوم و مطالب کا جامہ پہنا دیا ہے، کیا اِن کے متعلق قرآن کریم کے اندر ذرا بھی کوئی اشارہ پایا جاتا ہے کہ واقعی فلاں اصطلاح کا یہی مفہوم ہے جو پرویز صاحب بیان کر رہے ہیں۔ ہم پُوری ذمّہ داری کے ساتھ کہتے ہیں کہ وُہ اپنے بیان کردہ مطالب کی تائید قرآنِ مجید سے ہرگز پیش نہ کر سکیں گے۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ٥ یہ کیا قیامت ہے کہ کائنات کی سب سے بزرگ ترین ہستی، جس پر کلامِ الٰہی نازل ہُوا وُہ قرآنِ کریم کی کسی اصطلاح کا مفہوم بتائیں تو پرویز صاحب کے نزدیک ناقابلِ قبول اور ناقابلِ یقین لیکن خود جو بھی انٹ شنٹ معانی گھڑ کر پیش کریں اُن کی صحت و صداقت کو ایسے وثوق کے ساتھ منوانے کی مہم چلاتے ہیں جیسے اللہ رب العزّت نے اُنھیں بتایا ہو کہ واقعی میری نازل کردہ آیات کے حقیقی معانی یہی ہیں۔ موصوف نے کتنے دھڑتے اور بیباکی کے ساتھ مسلمانوں سے یہ سوال کیا ہے کہ:

”رسول اللہ سے بہتر کوئی شخص قرآن کو نہیں سمجھتا لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن

---

[1] مسٹر پرویز: نظامِ ربوبیت، ص ۱۶۲

[2] مسٹر پرویز: سلیم کے نام خطوط، ص ۷۷۰

کی جو تفسیر رسول اللہ نے فرمائی وہ آج ہے کہاں ؟" [1]

جو سوال پرویز صاحب مسلمانوں سے کر رہے ہیں اگر یہی کچھ مسلمان اُن سے مطالبہ کریں کہ کیا آپ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ قرآنی تفسیر ہے ؟ یقیناً پرویز صاحب کا جواب نفی میں ہوگا۔ اِس صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ موصوف آیاتِ قرآنیہ کے جو مفہوم و مطالب بتا رہے ہیں اُن کے بارے میں کیا ثبوت ہے کہ وہ رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بیان فرمودہ تفسیری بیانات کے بالکل مطابق ہیں اور اُن کے مخالف یا من گھڑت نہیں ہیں ؟ موصوف نے بعض قرآنی الفاظ کے مفہوم و مطالب کے بارے میں لکھا ہے کہ :

"قیامت کے قرآنی مفہوم کے لیے مشعلِ راہ کی آخری جلد کا انتظار فرمائیے۔" [2]

"قصۂ آدم کے صحیح مفہوم کے لیے جلد دوم، باب آدم دیکھیے۔" [3]

"ثواب کے قرآنی مفہوم کے لیے دیکھو میرا مضمون نجات حہ ۱۔" [4]

"جنّت اور جہنّم کے قرآنی مفہوم کے متعلق ...... دیکھیے میرے مقالات نجات حہ ۱۔" [5]

"قرآن کے نظامِ صلوٰۃ کی تفصیل کے لیے مشعلِ راہ کی آئندہ جلد کا انتظار فرمائیے۔" [6]

پرویز صاحب نے مسلمانوں پر تو یہ حجت قایم کرنے کی کوشش فرمائی تھی کہ زکوٰۃ کی شرح بیان کر دینے سے کیا قرآن کا حجم بڑھ جاتا ؟ مسلمان بھی اُن سے یہی سوال کرتے ہیں کہ پرویز صاحب! بتائیے تو سہی کہ قیامت، ثواب، جنّت و دوزخ اور نظامِ صلوٰۃ وغیرہ قرآنی اصطلاحوں کا مفہوم اگر اللہ تعالیٰ اپنے آخری پیغام میں وہی کچھ بیان کر دیتا جو آپ بیان کر رہے ہیں تو کونسا حجم بڑھ جاتا ؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کے بیان کردہ مفہوم و مطالب قطعاً قرآن کریم میں بیان نہیں فرمائے تو آنجناب کس خوشی یا خوش فہمی میں کلامِ الٰہی کے اندر معنوی تحریف کر کے اُدھر

---

[1] مسٹر پرویز: مقامِ حدیث، ص ۸

[2] مسٹر پرویز: اسبابِ زوالِ اُمت، ص ۴۴

[3] ایضاً: ص ۴۸

[4] ایضاً: ص ۱۷

[5] ایضاً: ص ۱۷

[6] ایضاً: ص ۱۱۰

غضبِ الٰہی خرید رہے ہیں اور اِدھر بھولے بھالے مسلمانوں کی بے خبری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اُنھیں گمراہ کر رہے ہیں؟

اگر مسٹر پرویز کی طرح کسی سیاستدان کو تحقیق کا شوق چرّائے اور وہ قرآن دانی کا مدعی بن کر کہنے لگے کہ ایمان سے وزارت کا حصول، اقام الصلوٰۃ سے پارٹی کا استحکام، ثواب سے دولت کا ملنا، جنّت و دوزخ سے ہار جیت اور قیامت سے مراد وزارت سے معزول ہونا ہے۔

اِسی طرح ایک امیر بنکار نے لگے کہ ایمان سے کارخانے ہونا، اقامتِ صلوٰۃ سے کوٹھیوں کا حصول، ثواب سے قارونی دولت، جنّت و دوزخ سے مزدوروں کا خوش رہنا یا ہڑتال کر دینا اور قیامت کا مطلب کارخانوں کا قومی ملکیت میں چلے جانا ہے۔ یا کوئی مزدور کہے کہ ایمان سے نوکری ملنا، اقامتِ صلوٰۃ سے مالک کا کام سے خوش ہونا، ثواب سے مزدوری کا بروقت مل جانا، جنّت و دوزخ سے نوکری میں کمی بیشی اور قیامت سے مراد نوکری سے جواب مل جانا ہے تو ایسے حضرات کی زٹلوں، تُک بندیوں اور مسٹر پرویز کے سراسر عقلی ڈھکوسلوں میں آخر فرق کیا ہوگا؟

قرآنِ کریم کے مفہوم و مطالب میں مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے ساتھ ساتھ پرویز صاحب نے دُوسرا میدان حدیث کی مخالفت کو بنایا، جس کے جواب میں علمائے کرام بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ تیسرا میدان تحریکِ پاکستان کا منتخب کیا ہوا ہے، جس کو لے کر پاکستانی باشندوں کو مغالطے میں مبتلا کرنا بھی موصوف کا محبوب مشغلہ ہے۔ اِن کے ایک پیروکار چودھری حبیب احمد صاحب نے بھی اپنی تصنیف تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء میں یہی تاثر پیش کیا ہے۔ دیندار طبقے سے اہلِ دین کو متنفر کرنے کی خاطر پرویز صاحب نے لکھا ہے کہ:

> ”غیروں کی حکومت میں مذہب تو باقی رہ سکتا ہے، دین نہیں رہ سکتا۔ آپ احباب کو معلوم ہے کہ تحریکِ پاکستان کی سب سے زیادہ مخالفت ہمارے مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہُوئی تھی۔ یہ درحقیقت دین اور مذہب کی وہی کشمکش تھی جو ازل سے تا امروز باہمد گر ستیزہ کار چل رہی ہے۔“[1]

---

[1] مسٹر پرویز: بہارِ نو، ص ۲۷۰

آگے موصوف نے مسلمانوں کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کی کوشش کرتے ہُوئے لکھا ہے:

"آپ نے غور فرمایا کہ تحریکِ پاکستان کی کش مکش کس طرح درحقیقت دین و مذہب کی وہی کش مکش تھی جو ازل سے تا امروز ستیزہ کار چلی آرہی ہے۔ مذہبی طبقہ کی اِس قدر مخالفت کے باوجود پاکستان وجود میں آگیا اور اِس کے ساتھ ہی مخالفین کا یہ لشکر بھی اِدھر اُمنڈ آیا۔ اب وہی کش مکش پندرہ سولہ برس سے یہاں بھی جاری ہے۔ اِس طبقہ کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ یہاں قرآن کی حکمرانی نہ ہونے پاتے۔ اِس کی بجائے یہ چاہتے ہیں کہ اوّلاً یہاں مذہبی تھیاکریسی قایم ہو جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر اِس انداز کی سیکولر حکومت قایم ہو جائے جس میں پبلک لاز حکومت کے ہاتھ میں رہیں اور پرسنل لاز مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں۔"[1]

اِن عبارتوں میں پرویز صاحب نے دل کھول کر دھاندلی کی ہے۔ چند ایک کی نشان دہی کرتا ہوں:

اوّلاً: دین اور مذہب کی من مانی تعبیریں کر کے خود کو دین کا پیروکار اور مسلمانوں کو دین سے متنفر اور مذہب کے پرستار قرار دے دیا۔ حالانکہ نہ دین و مذہب میں کوئی تفریق، نہ پرویز صاحب کو دین سے کوئی سروکار، نہ مسلمانوں میں کوئی دین سے بیزار اور کسی دُوسرے مذہب کا پیروکار۔

ثانیاً: سب مسلمانوں کو تحریکِ پاکستان کا مخالف قرار دے دیا، یہ ہمالیہ پہاڑ سے بھی بڑا مغالطہ ہے۔ تحریکِ پاکستان کی مخالفت صرف اُن علماء نے کی تھی جو گاندھی کے پرستار تھے یعنی نیشنلسٹ علماء، جن میں جمعیۃ العلمائے ہند اور احراری وغیرہ حضرات شامل تھے۔ یہ ملّتِ اسلامیہ کے لیے مسٹر پرویز کی طرح ہمیشہ مارِ آستین ہی رہے تھے۔ مسلمانوں کے سوادِ اعظم یعنی اہلسنت وجماعت نے تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصّہ لیا۔ یہی حضرات اِس تحریک کا علَم بلند کرنے والے اور یہی اِسے ساحلِ مراد تک پہنچانے والے تھے، جنھیں گمراہ گروں نے بریلوی فرقہ کے نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے حالانکہ یہ وہی قدیم جماعت ہے جسے اللہ تعالیٰ

---

[1] مسٹر پرویز: بہارِ نو، ص ۲۷۱

نے اپنے آخری پیغام میں حزبُ اللہ اور اُمّتِ وسطیٰ کہا ہے اور فخرِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جس کی مَا اَنَا عَلَیْہِ وَ اَصْحَابِیْ کے لفظوں سے تخصیص فرمائی اور اِتَّبِعُوا السَّوَادُ الْاَعْظَمَ سے جس کی پہچان بتائی ہے۔ جس کے علمی وعملی اور تبلیغی ومجاہدانہ کارناموں سے دنیا جگمگا رہی ہے اور خدا کا آخری پیغام دنیا کے ہر گوشے میں پہنچا اور جو ہمیشہ کفر کا غرور توڑتے آئے اور طاغوتی طاقتوں کے مقابلے پر ایسی مضبوط چٹان ثابت ہوتے رہے کہ ان کے سائے میں مارِ آستین ثابت ہونے والے گمراہ گروں کو بھی آرام سے بیٹھنا نصیب ہوتا رہا ورنہ دنیائے کفر کے مقابلے پر اہلحدیث، دیوبندی، نیچری، پرویزی اور شیعہ وغیرہ حضرات نے اپنی پوری تاریخ میں کون کون سے ملکوں میں اسلام پھیلایا؟ کفر کی طاقتوں سے کتنی دفعہ ٹکر لی؟ جواب صفر۔ اہلسنّت وجماعت کو ایک جانب رکھ دینے کے بعد باقی سارے فرقے دیکھیں کہ کافروں، غیر مسلموں کے مقابلے پر اُن کی جمعیت وطاقت کیا ہے؟ کیا کافروں کے حصّے میں اُن کی ایک ایک بوٹی بھی آتی ہے؟ اہلسنّت کا سایہ ہٹتے ہی کیا کچے نہ چبا لیے جائیں گے؟

پرویز صاحب! اِسی اہلسنّت وجماعت کے پانچ ہزار مشایخ وعلماءِ سُنّی کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ۲۷ تا ۳۰ اپریل میں بنارس کے مقام پر اکٹھے ہوئے اور ڈیڑھ لاکھ سے زائد سُنّی مسلمانوں کی موجودگی میں تحریکِ پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کا تاریخی اعلان فرمایا۔ علی الاعلان کہہ دیا کہ برطانیہ کے سارے خود کاشتہ پودے یعنی تمام فرقے پاکستان کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے تو مذکورہ کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں متفقہ اعلان کیا گیا کہ سُنّی مسلمان پاکستان بنا کر رہیں گے اور اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک پاکستان معرضِ وجود میں نہ آجائے۔ حتیٰ کہ پیر مانکی شریف نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر مسلمانانِ اہلسنّت وجماعت پاکستان بنانے پر کمربستہ نہ ہوتے تو مسٹر جناح کے ساتھ تھا کون؟ کون مسلم لیگ کا جھنڈا اٹھاتا اور کہاں اس کا دفتر قائم ہوتا؟ بلکہ حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ مسٹر جناح بھی اگر مطالبۂ پاکستان سے دست بردار ہونا چاہیں تو ہو سکتے ہیں لیکن سُنّی مسلمان پاکستان بنا کر ہی دم لیں گے۔ غرضیکہ تمام علماء اور مشایخ نے تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ پیرانِ عظام نے اپنے ہزاروں اور لاکھوں مریدوں کو

مطالبۂ پاکستان کا منہ بولتا اشتہار بنا دیا۔ اکیلے حضرت امیرِ ملّت، پیر حافظ جماعت علی شاہ علی پوری رحمۃ اللہ علیہ اپنے چالیس لاکھ مریدوں سمیت حمایت پر کمربستہ تھے اور تحریکِ پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی خاطر دن رات ایک کر دیئے۔ کیا مسٹر پرویز اینڈ کمپنی ان بزرگوں میں سے کسی ایک بزرگ کے برابر پاکستان کی تحریک میں اپنا حصّہ ثابت کر سکتے ہیں؟ جانے دیجئے، پاکستان کی بنیاد پر جو الیکشن ہُوا اور مسلم لیگ نے سو فیصد کامیابی حاصل کی، کیا مسٹر پرویز ثابت کر سکتے ہیں کہ اُن میں سے ایک ممبر بھی ایسا ہے جو پرویزی حضرات کے ووٹوں سے کامیاب ہُوا ہو؟ مسٹر پرویز اور پرویزی حضرات ہمیں بتا سکتے ہیں کہ اہلسنّت وجماعت کے مقابلے پر پاکستان کے لیے اُن کی قربانیوں کا تناسب کیا ہے؟ سوائے اِس کے وُہ اور کیا کارنامہ دکھائیں گے کہ نیشنلسٹ علماء کے خلاف لکھے ہُوئے چند بیانات دکھا دیں گے، حالانکہ وُہ علماء بھی اُمتِ محمدیہ کے لیے ہمیشہ اپنی تاریخ میں پرویز صاحب کی طرح مارِ آستین ہی بن کر رہے ہیں۔ اپنے چند صفحات لکھنے کی یہ قدر وقیمت اور ملّتِ اسلامیہ کے اِتنے عظیم الشان کارنامے، بے شمار جانی اور مالی قربانیوں سے یُوں آنکھیں بند بلکہ دشمنِ دین وملّت قرار دینے کے پابند،

ع شرم تم کو مگر نہیں آتی

ثالثاً: پرویزی حضرات نے کس روز انگریزوں یا ہندوؤں سے مقابلہ کیا۔ اگر آپ حضرات کی جانب سے ایسا ایک لفظ بھی منہ سے نکلتا تو اِس پُورے ٹولے کو برٹش گورنمنٹ یا ہندو اکثریت ایک پرِ کاہ یا کسی مکھّی اور مچھّر کے برابر بھی تو اہمیت نہ دیتی۔ لیکن یہ ٹولہ پاکستان کی تحریک اور دین کا علم بردار بنتا ہے جو دین کے ابجد سے بھی واقف نہیں اور مسلمانوں کے سوادِ اعظم کو دین ودیانت سے پیچھا چھڑا کر، آنکھیں بند کر کے تحریکِ پاکستان کا مخالف بتا رہا ہے کیا پرویز صاحب یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں گے کہ اُن سے تحریکِ پاکستان یا مملکتِ پاکستان کو کیا فائدہ پہنچا ہے؟ دین سے بغاوت کرنے والے چند سر پھرے ملک وملّت کا کیا بھلا کر سکتے ہیں؟

رابعاً: موصوف کا لکھنا کہ: "اِس طبقہ کی انتہائی کوشش ہے کہ یہاں قرآن کی حکمرانی نہ ہونے پائے۔" ایسے عالمِ آشکار میں قطعاً سفید جھوٹ اور نِری گپ ہے۔ مسلمان تو دل وجان سے

چاہتے ہیں کہ یہاں قرآن کریم کی حکومت ہو جائے، قرآن و سنّت کا آئین رائج ہو جائے، نظامِ مصطفیٰ رائج ہو جائے، خلافتِ راشدہ کے قوانین نافذ ہو جائیں۔ اگر قرآن کی حکمرانی سے پرویز صاحب کی مراد اپنے ذاتی خیالات ہیں، تو ہم ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ پرویز صاحب جیسے دشمنِ قرآنِ کریم کے خیالات ملّتِ اسلامیہ پر لاگو ہوں، اِس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ :

ع این خیال است و محال است و جنوں

پرویز صاحب نے علّامہ اقبال کو اپنے خیالات کا داعیِ اوّل، اپنی غیر اسلامی تحریک کا علمبردار وغیرہ ٹھہرا کر، اُن کی عقیدت کا دامن سنبھالا ہُوا ہے۔ یہ پرویز صاحب کی دھوکے بازی کا چوتھا میدان ہے کیونکہ شاعرِ مشرق علّامہ سر محمد اقبال، سُنّی مسلمان اور ایک عظیم مفکّر تھے۔ پرویزیت سے موصوف کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ کفر زارِ ہند کے قلب میں بیٹھ کر اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کرنے والے سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں شاعرِ مشرق نے کہا تھا :

ع چشتی نے جس چمن میں پیغامِ حق سُنایا

حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار یُوں کیا تھا :

ے وُہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار

مولانا جلال الدین رومی صاحبِ مثنوی کو علّامہ اقبال نے اپنا پیر قرار دے کر پیرِ رومی اور اپنے لیے مریدِ ہندی کہا اور مولانا روم سے ڈاکٹر اقبال اِتنے متاثر تھے کہ بصد حسرت و یاس کہا کرتے تھے :

ے نہ اُٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وُہی آب و گِلِ ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

علّامہ اقبال تو بزرگانِ دین کو پیغامِ حق سنانے والے اور سرمایۂ ملّت کے نگہبان قرار دے رہے ہیں اُن جیسے اور پیدا ہونے کی دُعائیں کرتے تھے لیکن پرویز صاحب ایسے علّامہ اقبال کے عاشق ہیں کہ علّامہ کے ممدوحین کو دین کے دشمن اور مذہب کے پرستار بتا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ دین و دیانت نصیب فرمائے۔ (آمین)

۸۔ شیعہ حضرات

شیعہ فرقے کا ظہور ایک یہودی سازش ہے۔ عبداللہ بن سبا یہودی نے ۲۵ھ میں اسلام کی عداوت سے سرشار ہو کر از راہِ منافقت مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا اور امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں سے دھتکارے جانے کے بعد حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وافر عقیدت کا دم بھرنے لگا۔ اِس لحاظ سے شیعانِ علی نے سر آنکھوں پر جگہ دی۔ اپنے مخصوص حلقے میں پہلے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی افضلیت کا شوشہ چھوڑا اور اِس کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سب وشتم کا دروازہ کھولا۔ جب اِن دونوں قسم کے خیالات بعض حضرات نے قبول کر لیے اور اُس کا ایک حلقہ قایم ہو گیا تو اصحابِ ثلاثہ اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر زبانِ طعن دراز کرنی شروع کر دی اور یہ دعویٰ کر دیا کہ خلافت بلافصل درحقیقت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حق تھا، جن لوگوں نے اُنھیں اِس حق سے محروم کیا وُہ غاصب، اہلِ بیت کے دشمن اور مسلمانوں کے بدخواہ ہیں۔

اُس بدبخت عبداللہ بن سبا کے اِس پروپیگنڈے سے بعض لوگ ایسے متاثر ہُوئے کہ اُن ظالموں نے خلیفۂ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خونِ ناحق اپنے سر لے کر دارین کی رُوسیاہی خریدی۔ اِس حادثۂ فاجعہ سے خلافت کی آب وتاب جاتی رہی اور ملّتِ اسلامیہ کا شیرازہ کچھ اِس طرح منتشر ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے زیرک ترین اور قابلِ فخر وعدیم المثال مدبّر کے سنبھالے بھی نہ سنبھل سکا، حتّٰی کہ ایسے ہی حالات میں ایک بدبخت سبائی ابنِ ملجم کے قاتلانہ حملے سے زخموں کی تاب نہ لاتے ہُوئے جنت الفردوس میں تشریف فرما ہوئے۔

عبداللہ بن سبا کے پروپیگنڈے نے شیعانِ علی کو عجیب موڑ پر کھڑا کر دیا تھا۔ جہاں تک حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں زبان کھولنے کا تعلق ہے تو اِس کی مقتدر صحابۂ کرام کیلئے اُس وقت گنجائش موجود تھی لیکن اصحابِ ثلاثہ اور ازواجِ مطہرات سے بدظنی اور سب وشتم بھلا کوئی مسلمان کس طرح برداشت کر سکتا ہے؟ اکثر مسلمان حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت وحمایت پر متفق ہیں لیکن شیعانِ علی کی مذکورہ کرتوت سے نالاں تھے۔ یُوں خلیفۂ چہارم حضرت علی المرتضیٰ

شیرِ خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حامیوں کو اُس مکار یہودی کی سازشوں نے ایک مرکز پر جمع نہ ہونے دیا، جس کے باعث وہ اپنے مخالفین پر، جنھیں اِسی سازش نے خلیفۂ وقت کے مقابلے پر کھڑا کر دیا تھا، کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ شیعانِ علی کی اِسی سازش سے تنگ آ کر حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسئلہ خلافت پر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سمجھوتا کر لیا۔ اِسی صورتِ حال کی بدولت شاہِ گلگوں قبا، سیّدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اُن کے خانوادے پر شیعانِ علی کے ہاتھوں میدانِ کربلا میں قیامت گزر گئی۔ یہ ہیں اِس ٹولے کی اہل بیت وائمۂ اطہار سے عقیدت کے عدیم النظیر کارنامے۔ اِس بارے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشادات اُس نہج البلاغت کتاب سے پیش کیے جاتے ہیں جو شیعہ حضرات کے نزدیک اصح الکتاب بعد کتاب اللہ ہے۔ ایک مکتوبِ گرامی میں امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، جس کا قارئین کی سہولت کے پیشِ نظر صرف ترجمہ پیش کرتا ہوں، عربی کے شائق اصل کتاب کی جانب رجوع کریں؛

> ”میں خدا سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے اِس گروہ سے جلدی دُور کر دے۔ خدا کی قسم اگر دشمن سے مقابلے کے وقت مجھے شہادت کی جانب رغبت نہ ہوتی اور اپنی جان کو جانِ آفریں کے سپرد کر دینے کے لیے ہمہ وقت تیار نہ رہتا، تو میری آرزو یہ ہے کہ ایک روز بھی اِس گروہ کے ساتھ نہ رہوں اور نہ کبھی اِن لوگوں سے ملوں۔“[1]

اپنے ایک خطبے میں حضرت امیر المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے شیعہ گروہ کے بارے میں یُوں اظہارِ خیال کیا؛

> ”خدا کی قسم جو دِلوں کو مردہ کر دیتا ہے اور عقل و فہم کو کھینچ لیتا ہے، میں اُن کا باطل پر اجتماع اور تمھاری حق پر پراگندگی دیکھتا ہُوں۔ خدا تمھیں ذلیل و رُسوا کرے کہ تم از خود تیروں کا نشانہ بن گئے۔ لوگ تمھیں غارت کرتے ہیں اور تم سے کچھ نہیں بن پڑتا، لوگ تم پر جہاد کرتے ہیں لیکن تم جہاد سے عاری ہو گئے اور خدا کی نافرمانی تمھیں خوش کرتی ہے۔ جب مَیں اُن پر یلغار کرنے کے لیے تم سے گرمی میں کہتا ہُوں تو گرمی کی شدت کا عذر پیش کر دیتے ہو اور موسمِ گرما نکلنے تک

---

[1] حضرت علی، خلیفۂ چہارم؛ نہج البلاغت بحوالہ تحفہ اثنا عشریہ، ص ۱۸۲

مہلت مانگتے ہو۔ جب سردی میں تم سے جہاد کرنے کو کہتا ہوں تو سردی کی شدت کا بہانہ بنا کر سردیاں گزرنے تک کی مہلت طلب کرتے ہو۔ یہ تمھارا سردی گرمی سے بھاگنا ہے تو خدا کی راہ میں تلوار اٹھانے سے تو امکان بھر بھاگو گے۔ تم مردوں کی شکل میں نامرد، بچّوں جیسی عقل والے اور زیور پہننے والی عورتوں کی مانند ہو۔ میری انتہائی کوشش یہی ہے کہ تمھاری شکل بھی نہ دیکھوں اور تم میرے لیے انجانوں کی طرح ہو جاؤ۔“ [1]

اِسی خطبے میں مولا مشکل کشا، شیرِ خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے تاثرات کا یُوں بھی اظہار فرمایا:

”تمھیں خدا ہلاک کرے بے شک تم نے میرے دل کو پیپ سے اور میرے سینے کو غصّے سے بھر دیا ہے۔ تم نے مجھے پے در پے رنج و غم کے جام پلائے۔ تم نے ترکِ رفاقت اور حکم عدولی کے ذریعے میری تمام تدبیروں کو خاک میں ملا دیا، یہاں تک کہ قریش یہ کہنے لگے کہ بیشک ابُوطالب کا بیٹا جری اور جانباز ضرور ہے لیکن فوجوں کو لڑانے کے قواعد سے نابلد ہے کہ مخالفین پر قابُو پائے۔ مَیں پُوچھتا ہُوں کہ اِس وقت میدانِ جنگ کا مجھ سے بڑھ کر آزمودہ کار کون ہے؛ جب میں نے عمر کی بیس منزلیں بھی طے نہیں کی تھیں اُس وقت سے میدانِ ضرب و حرب میں قدم رکھا ہے حالانکہ اب میری عمر ساٹھ سال سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔ لیکن جس امیر کا حکم نہ چلے اُس کی تدابیر کیا رنگ دکھائیں؟ [2]

دُوسرے خطبے میں صاحبِ ذوالفقار، شہِ دلدل سوار نے اپنے ساتھیوں کی جوانمردیوں کا تذکرہ یُوں فرمایا:

”میں کہاں تک تمھاری حفاظت اِس طرح کروں جیسے نازک بدن، ناکتخدا عورتوں کی حفاظت کی جاتی ہے۔ کہاں تک تمھیں پُرانے کپڑے کی طرح سنبھالوں

---

[1] حضرت علی، خلیفۂ چہارم: نہج البلاغت بحوالہ تحفہ اثنا عشریہ، ص ۱۸۳

[2] ایضاً: ص ۱۸۳، ۱۸۴

جسے ایک طرف سے سیا جاتا ہے تو دوسری جانب سے پھٹ جاتا ہے ۔ جب سردارانِ شام سے کوئی سردار تم پر یلغار کرتا ہے تو تم اپنے گھروں کے دروازے بند کرلیتے ہو اور اپنے گھروں میں اِس طرح گھس جاتے ہو جیسے گوہ اپنے سوراخ میں گھُس جاتی ہے یا بجّو اپنے بھٹ میں داخل ہو جاتا ہے۔"[1]

یہ ہے اِن حضرات کی ائمۂ اطہار سے عقیدت کہ زندگی میں تو سیّدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رفاقت کا دم نہ بھرا، جھوٹے دعوے کرکے عقیدت کا ڈھول بجاتے رہے، وقت آنے پر انجان بن جاتے، شیعہ حضرات کی اِس منافقت نے شیرِ خدا کو ایک دن بھی آرام سے کارِ خلافت انجام دینے کی مہلت نہ دی اور اِن جھوٹے عقیدت مندوں کی دھوکے بازی سے اسلام کا وہ بطلِ جلیل اور خدا کا عدیم النظیر شیر، خلیفۂ وقت ہونے کے باوجود اپنے ہی ایک صوبے پر تا زیست قابو نہ پا سکا۔ لیکن اُن کی وفات سے لے کر آج تک اُنھیں بلا فصل خلافت دلانے اور وصیِ رسول بنانے کی مہم چلائے ہُوئے ہیں، جیسے سب کو پیچھے دھکیل کر آج اُنھیں تختِ خلافت پر بٹھا کر ہی دم لیں گے۔ وقت گزرنے پر حمایت کی ہانڈی میں ایسا اُبال اور دورِ خلافت میں حمایت وغیرت کا اِس درجہ کال، جب حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حمایت کرنے، جانبازی دکھانے کا وقت تھا تو رُوپوشی میں کاہل ہوگئے۔ شیرِ خدا کا وصال ہوا تو یہی حضرات اُنگلی کٹا کر حمایتی شہیدوں میں آ شامل ہُوئے۔ بعدہٗ امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حمایت کا یقین دلا کر خلافت پر آمادہ کرلیا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مقابلہ کرنے ایک لشکرِ جرّار نکل کھڑا ہُوا، امام عالی مقام کے سامنے اِن حمایتیوں کا دوغلہ پن اپنے اصلی رنگ رُوپ میں موجود تھا۔ اپنے والدِ محترم کے ساتھ اِن کا سلوک دیکھ چکے تھے، لہٰذا اِن کی حمایت پر امیر معاویہ سے صلح کرنے اور خلافت اُن کے سپرد کر دینے کو ترجیح دی۔ گویا امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اِن کی جھوٹی حمایت کے دعووں کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ اِس کے بعد سیّدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تھوڑی دیر کے لیے اِن لوگوں کی حمایت کے بلند بانگ دعاوی کو ذرا سی اہمیت

---

[1] حضرت علی، خلیفۂ چہارم: نہج البلاغت بحوالہ تحفہ اثنا عشریہ، ص ۱۸۵، ۱۸۶

دے دی، امام مسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر اپنی بیعت کرنے والوں کو اپنا حمایتی سمجھ لیا، تو ان حمایتی حضرات کے ہاتھوں گلستانِ مرتضیٰ کے ہر گل بُوٹے اور چمنستانِ زہرا کی بے کھلی کلیوں پر بھی میدانِ کربلا میں جو قیامت گزر گئی وہ شیعانِ علی کے ماتھے پر ایسا انمِٹ داغ ہے جو قیامت تک ان کے ماتم کرنے، ٹسوے بہانے اور حمایتِ اہلِ بیت کے فرضی ڈھول پیٹنے سے مٹ نہیں سکتا۔ دستِ مسلم پر بیعت کرنے والوں کے گھروں میں امام مسلم اور اُن کے بچّوں کو پناہ تک نہ مل سکی، اُن بے گناہوں کے لاشے اِن حمایتیوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے لیکن حمایتی اِس درجہ سنگدل بلکہ سیاہ دل بلکہ دوستی کے پردے میں دشمنی سے بھرپور تھے کہ کسی پھوٹی آنکھ میں آنسو نہ آیا، حالانکہ اب ماتم کرتے پھرتے ہیں، کسی بدبخت کی زبان سے ہمدردی کا ایک کلمہ نہ نکلا حالانکہ وقت گزرنے کے بعد حمایت میں گلے پھاڑ پھاڑ کر چلاّتے آ رہے ہیں۔ کربلا میں قیامت گزر رہی تھی لیکن حیدرِ کرّار کا دار الخلافہ خاموش ہی نہیں تھا بلکہ شہیدانِ کربلا کے خلاف صف آراء تھا۔ وقت آنے پر شیعانِ علی نے امام عالی مقام سیّدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اُن کے بچّوں کو تہہِ تیغ کرنا، یزید، ابنِ زیاد اور شمر کا ساتھ دے کر کشتِ زہرا کو پامال کرنا ہی اہلِ بیت کی محبّت کا تقاضا سمجھا۔

؎ بھلانے پہ بھی قصّۂ عہدِ ماضی
بھلایا نہ جائے گا تم سے، نہ ہم سے

انکارِ قرآن مجید شیعہ حضرات کے متقدمین و متاخرین قرآن کریم کی صحت کے منکر اور اسے تحریف شدہ نسخہ بتاتے نیز بیاضِ عثمانی ٹھہراتے ہیں۔ چنانچہ ان حضرات کی مشہور و معروف کتاب اصولِ کافی، جو صحاح اربعہ میں شمار کی جاتی ہے، اُس کی یہ روایت ملاحظہ ہو؛

عن جابر قال سمعت اباجعفر	جابر سے روایت ہے کہ میں نے امام محمد باقر سے سنا کہ
یقول ما ادعیٰ احد من الناس	لوگوں میں سے کذّاب کے سوا کوئی یہ دعوٰی نہیں کریگا کہ جتنا قرآن
انه جمع القراٰن كله كما انزل الا	نازل ہوا تھا وہ سب جمع کر لیا گیا ہے۔ قرآن کو علی بن ابی طالب
كذّاب وما حفظه كما نزله الله	اور ان کے بعد والے ائمہ کے سوا کسی نے اُس طرح جمع اور محفوظ
الا علی ابن طالب والائمة من بعده[1]	نہیں کیا جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُسے نازل کیا۔

---

[1] ـــ: محمد بن یعقوب کلینی: اصولِ کافی، مطبوعہ نولکشور، ۱۹۰۲ء، ص ۳۹

شیعہ حضرات کے نزدیک جو قرآن مکمل اور معتبر ہے اُس کی آیات کی تعداد کے بارے میں یہ روایت ملاحظہ ہو:

عن هشام بن سالم عن ابی عبد اللّٰہ علیہ السلام قال ان القرآن الذی جاء بہ جبرائیل علیہ السلام الی محمد صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم سبعۃ عشر الف آیۃ ۔[1]

ہشام بن سالم، امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا، جس قرآن کو جبرئیل علیہ السلام، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے کر آئے تھے، اُس کی سترہ ہزار آیتیں تھیں۔

شیعہ حضرات کے بلند پایہ مفسر، علامہ محسن کاشی نے تفسیر عیاشی کے حوالے سے تحریفِ قرآن کے متعلق لکھا ہے:

فی تفسیر العیاشی عن ابی جعفر قال لولا انہ زید فی کتاب اللّٰہ ونقص ما خفی حقنا علی ذی حجی ولو قد قام قائمنا صدقہ القرآن وفیہ عن ابی عبد اللّٰہ علیہ السلام لو قرئ القرآن کما انزل الفینا فیہ مسمینا ۔[2]

تفسیر عیاشی میں ہے کہ امام جعفر نے فرمایا کہ اگر قرآن میں کمی بیشی نہ کی ہوتی تو ہمارا حق کسی عقلمند پر پوشیدہ نہ رہتا اور اگر ہمارے امام قایم علیہ السلام ظاہر ہو کر بولیں تو قرآن اُن کی تصدیق کرے اور اُسی میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد منقول ہے کہ اگر قرآن وہ پڑھا جائے جو نازل ہوا تو اُس میں ہمارا ذکر نام بنام ملے۔

محققین شیعہ کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ موجودہ قرآن تحریف شدہ ہے۔ چنانچہ اِسی تفسیر صافی میں تصریحاً لکھا ہے:

اما اعتقاد مشائخنا رحمهم اللّٰہ

ہمارے مشایخ رحمہم اللہ کا اعتقاد اِس بارے میں

---

[1] محمد بن یعقوب کلینی: اصول کافی، کتاب فضل القرآن، ص ۶۷

[2] محسن کاشی: تفسیر صافی، ص ۱۱

في ذالك فالظاهر من ثقة الاسلام محمد بن يعقوب الكليني طاب ثراه انه كان يعتقد التحريف والنقصان في القرآن لانه روى روايات في هذا المعنى في كتابه الكافي ولم يعترض لقدح فيهما مع انه ذكر في اول الكتاب انه يثق بما رواه فيه وكذالك استاده علي بن ابراهيم القمي فان تفسيره مملو منه وله غلو فيه وكذالك الشيخ احمد بن ابي طالب الطبرسي قدس سره ايضاً نسج على منوالهما في كتاب الاحتجاج ۔ [1]

یہ ہے کہ ثقۃ الاسلام محمد بن یعقوب کلینی طاب ثراہ کی نسبت یہ واضح ہے کہ وُہ قرآن میں تحریف و نقصان کے قائل تھے کیونکہ اُنھوں نے اِس مضمون کی کتنی ہی روایتیں اپنی کتاب کافی میں نقل کی ہیں اور اُن پر کوئی اعتراض وارد نہیں کیا، بلکہ اپنی کتاب کے شروع میں لکھ دیا کہ اِس کتاب میں جو حدیثیں نقل ہوں گی ہیں اُن کی صحت پر وثوق ہے اور اِسی طرح اُن کے استاد علی بن ابراہیم قمی بھی تحریف پر یقین رکھتے تھے کیونکہ اُن کی تفسیر تو ایسی روایتوں سے پُر ہے اور اُن کو اس عقیدے میں غلو نہیں ہے اور اِسی طرح شیخ احمد بن ابوطالب طبرسی قدس سرہٗ بھی تحریف کے قائل تھے کیونکہ اپنی کتاب الاحتجاج میں وُہ بھی اِن دونوں حضرات کے نقوشِ قدم پہ چلے ہیں۔

شیعہ حضرات نے تمام مسلمانوں کو غیر مسلم ٹھہرانے کی خاطر بڑے شد و مد سے یہ دعویٰ تو کر دیا کہ موجودہ قرآن کریم تحریف شدہ ہے اور اپنے مقصد کی تائید میں حدیثیں بھی گھڑ کر اپنی کتابوں میں شامل کر لیں لیکن اِس سے شیعہ حضرات کو کون سی حقانیت کی سند مل گئی؟ اگر بقول اُن کے دُوسروں کے پاس محرّف کلامِ الٰہی ہے تو روافض کے پاس کیا ہے؟ اُن کے پاس تو سرے سے کچھ بھی نہیں۔ اِس صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُن کے مسلمان کہنے کی بنیاد کس چیز پہ ہے؟ اُن کے دین کا ماخذ کیا ہے؟ اِس سوال کے جواب میں روافض کا مضحکہ خیز موقف ملاحظہ ہو:

---

[1] محسن کاشی: تفسیر صافی، ص ۱۴

قال یا ابا محمد فان عندنا الجامعة وما یدریهم ما الجامعة قال قلت جعلت فداك وما الجامعة قال صحیفة طولها سبعون ذراعا۔ [1]

فرمایا (امام جعفر صادق نے)، اے ابو محمد! بیشک ہمارے پاس ایک جامعہ ہے اور وہ کیا جانیں کہ جامعہ کیا ہے۔ میں نے کہا، میں آپ پر قربان، ارشاد فرمائیں کہ وہ جامعہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا وہ ستر گز لمبا قرآن ہے۔

معلوم نہیں شیعہ حضرات نے اتنا لمبا چوڑا قرآن رکھا ہوا کہاں ہے؟ اُسے اٹھاتا اور پڑھتا کون ہے؟ کیا یہ ایسے عالم آشکارا میں سفید جھوٹ اور نری گپ نہیں؟ اِسے علمی دنیا کی آنکھوں میں دُھول جھونکنا کہنا چاہیے یا اور کچھ؟ اگر شیعہ حضرات ایسا قرآن نہ دکھا سکیں تو اُن کے دعوئ اسلام کا ثبوت اور مسلمان کہلانے کی دلیل کیا؟ اِسی طرح کا حضرات شیعہ نے ایک قرآن اور گھڑا ہوا ہے۔ اُس کے بارے میں یہ روایت ملاحظہ ہو:

وانا عندنا لمصحف فاطمة علیها السلام وما یدریهم ما مصحف فاطمة قال مصحف فیه مثل قرآنكم هذا ثلاث مرّات واللہ ما فیه من قرآنكم هذا حرف واحد۔ [2]

(امام نے فرمایا) اور ہمارے پاس مصحفِ فاطمہ علیہا السلام ہے اور لوگ کیا جانیں کہ مصحفِ فاطمہ کیا ہے؟ فرمایا وہ ایسا مصحف (قرآن) ہے جو تمہارے قرآن سے تین گنا ہے۔ خدا کی قسم، تمہارے قرآن کا اُس میں ایک لفظ بھی نہیں ہے۔

قرآن کریم عربی زبان میں ہے اور عربی کے اٹھائیس حروفِ تہجی ہیں جبکہ مصحفِ فاطمہ کے اندر ان میں سے کوئی حرفِ تہجی حسبِ روایتِ بالا استعمال نہیں ہوا، تو اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ مصحفِ فاطمہ یقیناً عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں ہے۔ شیعہ علماء کو چاہیے کہ وہ اپنے مذکورہ قرآنوں کی تلاوت کیا کریں اور شیعہ عوام کو اپنے علماء سے اُن قرآنوں کی زیارت کا ضرور مطالبہ کرنا چاہیے کیونکہ دین کا ماخذ قرآن ہے، جب قرآن سے عمر بھر محروم رہے تو دین و

---

[1] محمد بن یعقوب کلینی: اصولِ کافی، ص ۴٦

[2] ایضاً: ص ١۴٦

ایمان کیسا؟

تحریفِ قرآن کے بارے میں شیعہ حضرات کا تفصیلی عقیدہ مندرجہ ذیل عبارت سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے:

المستفاد من مجموع هٰذه الاخبار وغيرها من الروايات من طريق اهل البيت عليهم السلام ان القران الذى بين اظهرنا ليس بتمامه كما انزل على محمد صلى الله عليه واله وسلم بل منه ماهو خلاف ما انزل الله ومنه ماهو مغير محرف وانه قد حذف عنه اشياء كثيرة منها اسم على عليه السلام فى كثير من المواضع ومنها لفظة آل محمد غير مرة ومنها اسماء المنافقين فى مواضعها ومنها غير ذالك وانه ليس ايضاً على الترتيب المرضى عند الله وعند رسوله وبه قال على بن ابراهيم ۔[1]

اِن تمام حدیثوں اور اِن کے علاوہ جس قدر روایات اہلِ بیت علیہم السلام سے مروی ہیں، اُن سے مستفاد ہے کہ جو قرآن ہمارے سامنے موجود ہے، وُہ سارا اُس طرح نہیں ہے جیسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا تھا، بلکہ اِس میں بعض باتیں ما انزل اللہ کے خلاف ہیں اور بعض میں تغیر و تبدّل کر دیا گیا ہے اور بے شک کتنی ہی باتیں اس سے حذف کر دی گئی ہیں جیسے کتنے ہی مقامات سے حضرت علی علیہ السلام کا نام اور کئی جگہ سے آلِ محمد کا لفظ اور متعدد جگہ سے منافقین کے نام اور اِن کے علاوہ کئی چیزیں، علاوہ بریں اِس کی ترتیب اللہ اور رسول کی پسندیدہ ترتیب کے مطابق نہیں ۔ یہی خیالات علی بن ابراہیم کے ہیں۔

یہ ہے شیعہ حضرات کا قرآن کریم کے بارے میں واضح عقیدہ ۔ ان حضرات کے معتمد زمرۂ اکابر سے

---

[1] محسن کاشی، علامہ : تفسیر صافی، ص ۱۴

صرف چار حضرات ایسے ہیں جنہوں نے اپنے اکابر اور اپنی جماعت کے برخلاف عقیدۂ تحریف پر عدمِ اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ اُن کے نام یہ ہیں:

۱۔ ابی جعفر محمد بن علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ قمی الملقب بالصدوق (المتوفی ۳۸۱ھ)

۲۔ شیخ مفید، سید مرتضیٰ، علم الہدیٰ (المتوفی ۴۳۶ھ)

۳۔ شیخ الطائفہ، ابوجعفر محمد بن حسن طوسی (المتوفی ۴۶۰ھ)

۴۔ ابو علی طبرسی (المتوفی ۵۴۸ھ)

گویا چھ صدیوں میں شیعہ حضرات کے اندر ان چار کے علاوہ کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوا، جس کا قرآن کریم کے محرف ہونے پر عقیدہ نہ ہو۔ حالانکہ ان چاروں حضرات کی سارے شیعہ اکابر کے روبرو حیثیت کیا اور دیگر اکابر شیعہ نے جو تحریف قرآن کے بارے میں احادیث اپنی اُن مایۂ ناز صانیف میں شامل کی ہوئی ہیں جن پر ان کے مذہب کا دار و مدار ہے نیز اکابر اہلِ بیت و ائمۂ دین کے تحریف قرآن کے متعلق بیانات نقل کیے ہوئے ہیں، اُن کے بالمقابل ان چاروں حضرات کے، بغیر کسی دلیل کے، ذاتی اقوال و نظریات کی وقعت اور قدر و قیمت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ راہِ ہدایت نصیب فرمائے۔ آمین

علاوہ بریں یہ چاروں حضرات بھی ہرگز اس بات کے قائل نہیں کہ موجودہ قرآنِ کریم وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) پر نازل فرمایا تھا، بلکہ اب کا عقیدہ بھی یہ ہے کہ اصلی قرآن تو واقعی سترہ ہزار آیات کا یا ستر گز لمبا ہی تھا، اُس میں سے کتنی ہی سورتیں، آیتیں اور بعض آیتوں کے الفاظ صحابۂ کرام نے حذف کر دیے تھے، اس طرح موجودہ قرآن ہے تو اُسی قرآنِ منزل من اللہ کا حصہ لیکن یہ پورا اور مکمل نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ چاروں حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ موجودہ قرآنِ کریم کے الفاظ وہی ہیں جو اصلی قرآن کے تھے، اس میں اضافہ قطعاً نہیں ہوا ہے، ہاں کمی بہت کچھ کر دی گئی ہے۔ اسی لیے ان چاروں نے شیعہ حضرات کو یہ تلقین بھی کی کہ وہ بے کھٹکے اپنی نمازوں میں اس قرآنِ مجید کی تلاوت کر سکتے ہیں کیونکہ اس میں کسی بشر کا کلام شامل نہیں ہے۔

ان چاروں حضرات نے اپنی مزعومہ احادیث، ائمہ کی جانب گھڑتے ہوئے نظریات اور

اپنے اکابر کی تصریحات کے خلاف اِس قرآنِ کریم کی صحت پر کیوں زور دیا؟ بات اصل میں یہ ہے کہ شیعہ حضرات اپنے مخالفین کے رُوبرو حدیث ثقلین کو بڑی شدومد سے پیش کرتے آئے ہیں تاکہ اہلبیت اظہار کی عقیدت کے خود کو علمبردار منوا سکیں، لیکن اہلبیت تو ثقل دوم ہیں جبکہ ثقل اوّل قرآنِ مجید ہے۔ یہ حدیث پیش کرتے ہُوئے رافضی مناظرین کو یہ دقت پیش آتی تھی کہ موجودہ قرآن کریم کو تحریف شدہ ماننے کے بعد شیعہ حضرات کو مسلمان ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا، کیونکہ دین کا اوّلین ماخذ تو یہی کلامِ الٰہی ہے، جن کے مذہب کا مدار قرآنِ مجید پر نہیں اُس کے پاس دین کہاں؟

صحابہ کرام سے دشمنی

قرآن کریم کو محرّف ثابت کرنے کی غرض سے شیعہ حضرات کو عبداللہ بن سبا کے اتباع میں بُغضِ صحابہ سے سرشار ہونا پڑا اور صحابہ کرام تک کے خلاف حدیثیں گھڑ کر، فرضی الزامات قائم کر لیے اور اُن پاکباز ہستیوں کو داغدار دکھانے پر ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا۔ چنانچہ اصولِ کافی میں ہے:

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام فی قول اللہ عز وجل ان الذین اٰمنوا ثم کفروا ثم اٰمنوا ثم کفروا..... قال نزلت فی فلان وفلان وفلان اٰمنوا بالنبی صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم فی اول الامر وکفروا حیث عرضت علیہم الولایت حین قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من کنت مولاہ فعلی مولاہ ثم اٰمنوا بالبیعۃ لامیر المؤمنین علیہ السلام ثم کفروا حیث مضی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ واٰلہ وسلم فلم یقروا بالبیعۃ ثم ازدادوا	ارشادِ باری تعالیٰ: ان الذین اٰمنوا ثم کفروا ثم اٰمنوا ثم کفروا ----- کی تفسیر میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہ آیت فلاں، فلاں اور فلاں کے حق میں نازل ہُوئی، جو پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے اور جب اُن پر ولایت (ولایتِ علی) پیش کی گئی تو کافر ہو گئے جبکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جس کا آقا مَیں ہُوں پس علی بھی اُس کا آقا ہے۔ پھر امیر المؤمنین علیہ السلام کی بیعت پر ایمان لائے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد کافر ہو گئے۔

كفراً باخذهم من بايعه بالبيعة لهم فهؤلاء لم يبق فيهم من الايمان شيئ ۔ [1]

انھوں نے بیعت کا اقرار نہ کیا ، پھر امیر المؤمنین کی بیعت کا اقرار کرنے والوں سے اپنی بیعت لے کر کفر میں اور بڑھ گئے یہ وہ ہیں جن میں ایمان کا کوئی ذرہ باقی نہ رہا۔

اُصولِ کافی کی تفسیرِ صافی میں ہے کہ فلاں اور فلاں سے مراد حضرت ابو بکر ، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں ۔ اسی اصولِ کافی میں متصلاً یہ حدیث بھی ہے :

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام فی قول اللہ تعالیٰ ان الذین ارتدوا علی ادبارهم من بعد ما تبین لهم الهدیٰ فلان وفلان وفلان ارتدوا عن الایمان وترک ولایة امیر المومنین علیہ السلام ۔ [2]

ارشادِ باری تعالیٰ : ان الذین ارتدوا علی ادبارھم من بعد ما تبیّن لھم الھدیٰ کی تفسیر میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ مراد فلاں وفلاں وفلاں ہیں جو امیر المومنین علیہ السلام کی ولایت کو ترک کرنے کے باعث ایمان سے پھر گئے (مرتد ہو گئے) تھے۔

تفسیرِ صافی والے نے فلاں وفلاں کی نشان دہی کرتے اور باقی جملہ صحابۂ کرام کو منافق ٹھہراتے ہوئے لکھا ہے کہ : " مراد عثمان وابوسفیان ومعاویہ است ۔ برگشتند از ایمان در مجلسِ منافقاں بسبب ترکِ ولایت امیر المومنین " ۔ اِن حضرات نے سرورِ کون ومکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ افراد یعنی صحابہ کرام جیسی عدیم النظیر جماعت کو اپنی مشقِ ستم کا نشانہ بناتے ہوئے مسلمانوں کی دلآزاری کا یہاں تک اہتمام روا رکھا :

عن حمران بن اعین قال قلت

حمران بن اعین کہتے ہیں کہ میں نے امام

---

[1] محمد بن یعقوب کلینی ؛ اصولِ کافی ، کتاب الحجہ ، ص ۲۶۵ [2] ایضاً ؛ ص ۲۶۵

لابی جعفر علیہ السلام جعلت فداك ما اقلّنا لو اجتمعنا علیٰ شاۃ ما افنیناھا فقال الّا احدثك باعجب من ذالك المھاجرون و الانصار ذھبوا الّا واشار بیدہ ثلاثۃ۔ ۱؎	محمد باقر علیہ السلام سے عرض کی، میں آپ پر قربان ہو جاؤں، ہم تعداد میں کتنے کم ہیں کہ اگر کسی دستر خوان پر ایک بکری کھانے کے لیے جمع ہوں، تو ساری بکری نہیں کھا سکتے۔ آپ نے فرمایا، کیا میں تجھے اِس سے بھی عجیب بات نہ بتاؤں۔ مہاجرین و انصار سے (حضور کے بعد) سب مرتد ہو گئے ما سوائے تین کے جو ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

مذکورہ تین حضرات کی نشان دہی فروع کافی میں یُوں کی گئی ہے:

عن ابی جعفر قال کان الناس اھل ردۃ بعد النبی الا ثلاثۃ فقلت و من الثلاثۃ فقال المقداد ابن الاسود و ابو ذر غفاری و سلمان الفارسی۔ ۲؎	امام محمد باقر سے روایت ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ نبیِ مکرّم کی وفات کے بعد تین کے علاوہ باقی سب مرتد ہو گئے تھے۔ میں نے پُوچھا، وُہ تین کون ہیں؟ فرمایا، مقداد بن الاسود، ابوذر غفاری اور سلمان فارسی۔

ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ یہاں سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد جن تین حضرات کا اسلام پر قایم رہنا بیان ہوا ہے اُس کی رُو سے سارے اہلبیت بلکہ سیّدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی اسلام سے پھر جانے والوں میں شامل کر دیا۔ ان حالات میں ناطقہ سر بگریباں ہے اور پڑھنے والے سرگرداں رہ جاتے ہیں کہ یا الٰہی! یہ لوگ جو اہلبیت کی محبت کا ڈھول پوری طاقت سے بجاتے پھر رہے ہیں، اِن کے اِس خوشنما نعرے

۱؎ محمد بن یعقوب کلینی: اصولِ کافی، کتاب الحجہ، ص ۴۹۷ ۲؎ فروع کافی، جلد سوم، بحوالہ آفتاب ہدایت: ص ۳۵۶

کی حقیقت کیا ہے؟ دوسری جانب قرآنِ کریم کو مُحرّف اور اہلِ بیت کو مظلوم دکھانے کی غرض سے صحابۂ کرام کو منافق و مرتد دکھانے اور باور کرانے کا وبال اپنے سر لیا۔ مخالفتِ صحابہ پر اپنے متبعین کو آمادہ کر لینا حقیقت میں عبداللہ بن سبا جیسے مسلم نما یہودی کی بہت بڑی کامیابی ہے کہ اُس نے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی اُمت کے درمیان سے اُس مضبوط ترین واسطے کو نکال دیا جو گروہِ صحابہ کے نام سے چار دانگ عالم میں مشہور و معروف ہے۔ جن حضرات نے اس عظیم الشان واسطے کو ناقابلِ یقین تسلیم کر لیا، اُن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین حاصل کرنے کا آخر ذریعہ کیا ہے؟ کاش! یہ حضرات اب بھی عقل و دانش کو کام میں لاتے ہوئے اگر اِس سراسر غیر اسلامی روش کو ترک کر دیں، اُن مقدس ہستیوں پر تبرا بازی کر کے اُس شمعِ رسالت کی دلآزاری نہ کریں جس کی وہ کرنیں تھے اور ملتِ اسلامیہ کو روحانی اذیت نہ پہنچایا کریں تو اِس میں خود اُن کا بھی بھلا ہے۔ وقت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایسے افکار و مسائل جو مختلف جماعتوں کے درمیان بُعد اور منافرت کا سبب ہیں، اُن پر ٹھنڈے دل و دماغ سے نظرِ ثانی کر کے اتفاق و اتحاد کی جانب قدم اٹھایا جائے ورنہ وہ دن دُور نہیں کہ غیر اسلامی نظریات اور دین سے بغاوت کا جو سیلاب پوری دنیائے اسلام کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے وہ اتنی شدت اختیار کر جائے گا کہ کسی بھی تنہا جماعت کو سنبھلنے کا موقع نہیں دے گا۔ ہمیں امید واثق ہے کہ یہ حضرات غصے میں آنے اور جھنجلانے کے بجائے عقل سے کام لیتے ہوئے بہتری کا راستہ اختیار کریں گے وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْز۔

تقیہ

یہ حقیقت ہے کہ اصحابِ ثلاثہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں انتہائی محبت اور عقیدت و احترام کے رشتے پوری طرح استوار تھے۔ اُن میں سے ہر بزرگ ایک دُوسرے کو اپنی جان سے عزیز سمجھتا تھا اور خصوصاً اہلِ بیتِ اطہار سے تو جمیع صحابہ کرام کو جو آقائے کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قُرب کی بدولت محبت و عقیدت تھی وہ محتاجِ بیان نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ہاتھوں پر برضا و رغبت بیعت کی۔ ہمیشہ اُن کے مشیرِ خاص اور دست و بازو بن کر رہے۔ یہ چاروں بزرگ فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد اُمتِ محمدیہ کے سرپرست تھے اور اِن حضرات کی تمام تر توانائیاں اسلام اور مسلمانوں کی بہتری کے لیے وقف تھیں۔ ذاتی غرض یا

دنیاوی منفعت کا سایہ تک اِن میں سے کسی بزرگ کے نزدیک سے نہ گزر سکا۔ سارے ہی الفقر فخری کا نمونہ اور ہادیِ دوجہاں کے نقوشِ قدم کو مشعلِ راہ بنائے ہُوئے تھا۔

بُرا ہو نفسانیت کا کہ ایک یہودی عبداللہ بن سبا کی سازش سے بعض مدعیانِ اسلام نے اُن حضرات کے رشتۂ محبت و اخوت کو بغض و عداوت بتانا شروع کر دیا۔ یہ دیرینہ سازش آج تک اپنے قدم جمائے ہُوئے ہے اور مسلمان کہلانے والوں میں آئے دن سر پھٹول کا سبب بن جاتی ہے۔ جب اِن حضرات سے کہا جاتا ہے کہ جن بزرگوں میں آپ عداوت و نفرت بتاتے ہیں، اُن کے بارے میں تو فریقین کی تصانیف یہ بتا رہی ہیں کہ کمال محبت تھی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُن بزرگوں کے ہاتھوں پر بخوشی بیعت کی اور تینوں کے ساتھ تازیست محبت و الفت رہی۔ اِس کے جواب میں شیعہ حضرات یہ شگوفہ چھوڑتے ہیں کہ حقیقت میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرات خلفائے ثلاثہ کے مابین انتہائی عداوت اور نفرت تھی لیکن شیرِ خدا نے جو اُن کے ہاتھوں پر بیعت کی، تازیست اُن کے دست و بازو بنے رہے اور اُن حضرات کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہے تو یہ سب کچھ بر بنائے تقیہ تھا۔ چنانچہ اِس بنائے فاسد کو مضبوط و مستحکم کرنے کی خاطر یہ حضرات حسبِ منشا احادیث و آثار گھڑنے اور اپنی تصانیف میں شامل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ چنانچہ امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب یہ منسوب کیا:

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ تقیہ	قال ابو جعفر علیہ السلام التقیة
میرا اور میرے آباؤ اجداد کا دین ہے۔ جو	من دینی و دین ابائی ولا ایمان
تقیہ نہ کرے اُس کا ایمان ہی نہیں۔	لمن لا تقیة له۔[1]

امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب تقیہ جیسے صریح کذب، منافقت اور ٹھیٹ خباثت کو درست ثابت کرنے کی خاطر، کمال جسارت سے یہ الفاظ منسوب کر دیے:

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ	قال ابو عبد اللہ علیہ السلام
اے ابوعمران! دین کے نو حصے تقیہ میں ہیں	یا اباعمران تسعة اعشار الدین

---

[1] محمد بن یعقوب کلینی: اصولِ کافی، ص ۴۸۴

فی التقیۃ و لا دین لمن لا تقیۃ لہ۔ [1]	اور جو تقیہ نہ کرے اُس کا کوئی دین نہیں ہے۔

نیز امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے اسلام کے بطلِ جلیل کی جانب یہ قول بھی منسوب کیا ہوا ہے:

یا سلیمان انکم علیٰ دین من کتمہ اعز اللہ و من اذاعہ اذلہ اللہ۔ [2]	اے سلیمان! تم ایسے دین پر ہو کر جو اسے چھپائے اللہ تعالیٰ اُس کو عزت دے گا اور جو اِسے ظاہر کرے خدا اُسے ذلیل کرے گا۔

بلکہ امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب گھڑا ہُوا یہ حکم بھی نشر کرتے رہتے ہیں:

من اذاع علینا شیئا من امرنا کمن قتلنا عمداً ولم یقتلنا خطاءً۔ [3]	جس نے ہمارے دین میں سے کسی چیز کو ظاہر کیا، وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے غلطی سے نہیں بلکہ جان بُوجھ کر ہمیں قتل کیا۔

شیعہ حضرات کی خدمت میں ہماری عاجزانہ التماس ہے کہ امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مذکورہ ارشاد پر وہ حضرات عمل فرمائیں اور خلفائے اربعہ کے مابین جو انھوں نے بُغض و عداوت کی کہانیاں گھڑی ہُوئی ہیں، اُنھیں ازراہِ تقیہ ہی سہی، نشر کرنے سے باز رہا کریں۔ آخر جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اِس فرضی عداوت کا کسی مرحلے پہ تا زلیست اظہار نہ کیا، حضرت امامینِ عالی مقام رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کبھی یہ نہ کہا کہ ہمارے گھرانے اور حضرات خلفائے ثلاثہ میں کسی قسم کی شکر رنجی تھی، اگر شیعہ حضرات کے نزدیک یہ سب کچھ تقیہ کے باعث تھا، تو یہ حضرات بھی ایسا ہی تقیہ اختیار کر لیں اور ان بزرگوں کی طرح عداوت و نفرت کے شگوفے نہ چھوڑا کریں اور بقول حضرت امام جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بے دین بننے اور خود کو اہلِ بیت اطہار کا

---

[1] محمد یعقوب کلینی: اصول کافی، ص ۴۸۲ ۔ [2] ایضاً: ص ۴۸۵

[3] ایضاً: ص ۵۵۲

قاتل دکھانے سے اجتناب کریں۔ اگر واقعی اِس باب میں اکابر اہلبیت تقیہ فرماتے رہے تو شیعہ حضرات کیوں اُس تقیہ پر عمل پیرا نہیں ہوتے؟

نے فروعت محکم و نے از اصول
شرم بادت از خدا و از رسول

متعہ

شیعہ حضرات نے ایک جانب دین کو حرفِ غلط ٹھہرانے کی مہم چلائی کہ قرآن کریم کو تحریف شدہ اور صحابہ کرام کو اسلام سے پھر جانے والے باور کروانے پر ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہُوا ہے تو دوسری جانب مسلمانوں کے اخلاق و کردار کا جنازہ نکال دینے کی خاطر متعہ کو قیامت تک کے لیے جاری بتایا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد کرامت مہد میں ایک مدت تک یہ مباح رہا اور اُس کے بعد قیامت تک کے لیے اسے حرام قرار دے دیا گیا۔ شیعہ حضرات نے نہ صرف حرام کو حلال ٹھہرانا اپنا منشور بنا لیا بلکہ جو امر کسی وقت مباح تھا اُسے اپنے دین کا ایسا ضروری جزو اور لازمی رکن قرار دے لیا کہ عقل انسانی انگشت بدندان رہ جاتی ہے۔ اِس حرکتِ قبیحہ کے احادیث و آثار گھڑ کر وہ فضائل بیان کیے ہیں کہ اُن کی صداقت پر یقین رکھنے والے خواہ نماز روزے کے نزدیک نہ جائیں لیکن متعہ کے ذریعے جنت الفردوس کا ٹکٹ ضرور حاصل کریں گے۔ چنانچہ علّامہ علی حائری لاہوری کے والد سیّد ابو القاسم نے لکھا ہے:

قال ابو عبد اللہ علیہ السلام	امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا، کوئی
ما من رجل تمتع ثم اغتسل	شخص ایسا نہیں کہ وہ متعہ کرنے کے
الا خلق اللہ من کل	بعد غسل کرے مگر اللہ تعالیٰ ہر اُس
قطرۃ تقطر منہ	قطرے کے بدلے جو اُس سے گرتا ہے
سبعین ملکا یستغفرون الی	ستّر فرشتے پیدا کرتا ہے جو قیامت تک
یوم القیامۃ۔ [1]	استغفار کرتے رہتے ہیں۔

اِسی سلسلے کی ایک اور روایت شیعہ حضرات کی معتبر تفسیر منہج الصادقین سے ملاحظہ ہو:

---

[1] سید ابو القاسم: برہان المتعہ، مطبوعہ نیو امپیریل پریس لاہور، ص ۵۰

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من تمتّع مرّۃً امن سخط اللہ الجبار و من تمتّع مرّتین حشر مع الابرار و من تمتّع ثلاث مرّاتٍ صاحبنی فی الجنان ۔[1]

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا، جو ایک مرتبہ متعہ کرے وہ خدائے جبار کے قہر سے نجات پا گیا اور جو دو مرتبہ کرے اُس کا حشر نیک لوگوں کے ساتھ ہوگا اور جو تین دفعہ متعہ کرے تو جنت میں میرا ساتھی ہوگا۔

اِس سے بھی اعلیٰ فضائل بتانے والی، شیعہ حضرات کی گھڑی ہُوئی یہ حدیث بھی قابلِ غور ہے:

قال النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم من تمتّع مرّۃً درجتہ کدرجۃ الحسن و من تمتّع مرّتین درجتہ کدرجۃ الحسین و من تمتع ثلاث مرّاتٍ درجتہ کدرجۃ علیٍ و من تمتع اربع مرّاتٍ درجتہ کدرجتی ۔[2]

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا، جو ایک دفعہ متعہ کرے اُس کا مرتبہ حسن جیسا ہے اور جو ۲دو مرتبہ متعہ کرے تو حسین کا درجہ پائے اور جس نے تین دفعہ متعہ کیا اس کا درجہ علی جیسا ہے اور جو چار مرتبہ متعہ کرے تو اُس کا مقام میرے جیسا ہے۔

اِن احادیث کی صحت پر یقین رکھنے والوں کو کیا پڑی ہے کہ نیکیاں کرنے اور برائیوں سے بچنے کی مصیبت میں پھنسنے پھریں۔ کیوں نہ مزے سے متعہ کرتے جائیں اور ایسے درجے حاصل کرتے جائیں جن کا کوئی نیکوکار تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ اِس مسئلے سے انسانی اخلاق و کردار پر کیا اثر پڑ رہا ہے، کاش! مجوّزینِ متعہ کبھی اِس پر بھی ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے کی زحمت گوارا فرمالیں۔ شیعہ حضرات نے مسائل سے قطع نظر کتنے ہی ایسے نظریات کو اسلامی عقاید منوانے کی مہم چلائی ہوئی ہے جو قرآن و حدیث کے سراسر خلاف ہیں۔ مثلاً:

۱۔ شیعہ حضرات بارہ ۱۲ اماموں کو انبیائے کرام کی طرح معصوم قرار دیتے ہیں۔

---

[1] ملّا فتح اللہ کاشانی، تفسیر منہج الصادقین، ص ۳۵٦

[2] ایضاً: ص ۳۵٦

۲۔ ائمہ کا مرتبہ انبیائے کرام کے برابر بلکہ اُن سے بھی زیادہ بتاتے ہیں۔

۳۔ ائمہ کو خدائی میں دخیل اور بالکل مالک و مختار ٹھہراتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ مرتے بھی اپنے اختیار سے ہیں۔

۴۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مرتبہ جملہ انبیائے کرام سے بھی بلند ٹھہراتے ہیں۔

۵۔ روافض کے بعض فرقے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اُلوہیت کا حامل بتاتے ہیں۔

۶۔ حضرت امام مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غار سر من رائے میں چھپا ہُوا بتاتے ہیں۔

۷۔ دعویٰ کرتے ہیں کہ پُورا اور اصلی قرآن امام مہدی کے پاس ہے جو بوقتِ ظہور لے کر آئیں گے۔

۸۔ حدیثیں گھڑنے میں انتہائی جری ہیں اور اپنے مذہب کی بنیاد اِسی گھڑنت پر رکھی ہوئی ہے۔

۹۔ باغِ فدک کو چھیننے اور یارِ غارِ رسول کو ناحق بدنام کرنا اپنا مشن بنائے ہُوئے ہیں۔

۱۰۔ حدیثِ قرطاس کو ناحق بہانہ بنا کر فاروقِ اعظم جیسی جلیل القدر ہستی کو خواہ مخواہ مطعون کرتے رہتے ہیں۔

۱۱۔ خمِ غدیر کے واقعے کو بغیر کسی ادنیٰ قرینے کے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت بلا فصل کی دلیل بناتے ہیں۔

۱۲۔ اسلامی کلمہ پر محض سینہ زوری سے اضافہ کر کے اپنا مسلمانوں سے علیحدہ کلمہ گھڑا ہوا ہے۔

حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو بانیِ رفض یعنی عبد اللہ بن سبا کو ملک بدر کر دیا تھا لیکن شیعہ حضرات اُس مسلم نما یہودی کے خیالات کو اپنے دِلوں سے نکالنے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے۔ چنانچہ اِسی عبد اللہ بن سبا کے بارے میں رجال کشی کے حوالے سے شیعہ حضرات کے ایک نامور مجتہد استر آبادی نے لکھا ہے؛

فانظروا الی عبارۃ الکشی ذکر	عبارتِ کشی ملاحظہ ہو، بعض اہلِ علم نے
بعض اھل العلم ان عبد اللہ	ذکر کیا ہے کہ عبد اللہ بن سبا حقیقت
ابن سبا کان یھودیًا واسلم	میں یہودی تھا۔ وہ مسلمان (بظاہر) ہوا
ووالی علیًا وکان یقول وھو	اور حضرت علی کی محبت کا عَلم بلند کرنے لگا

على يهوديته فى يوشع وصى
بالغلو فقال بعد اسلامه بعد
وفات رسول الله صلى الله عليه
وسلم فى على مثل ذالك فكان
من اشهر بالقول بغرض
امامة على عليه السلام
البرأة من اعدائه وكاشف
مخالفيه واكفرهم فمن هٰهنا قال من
خالف الشيعة اهل التشيع والرفض
من اليهوديت ۔ [1]

جب وُہ یہودی تھا تو حضرت یوشع کے
وصی ہونے میں غلو کرتا تھا اور مسلمان ہونے
پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال
کے بعد اُسی طرح حضرت علی کے بارے
میں کہنے لگا۔ یہی ہے جس نے امامتِ علی
کی فرضیت کا ڈھول بجایا، اُن کے
مخالفین پر تبرّا کیا، فرضی مخالفین گھڑے
اور اُن کی تکفیر کی۔ بایں وجہ مخالفینِ شیعہ
کہتے ہیں کہ اہلِ تشیع اور رفض کی اصل
یہودیت ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشادات کو اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو جس طرح خارجیت ایک شجرِ ممنوعہ ثابت ہوتی ہے اُسی طرح رفض بھی ایسی نادان دوستی کا مظاہرہ ہے جو دشمنی سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ شرف صرف اور صرف اہلسنت وجماعت ہی کو حاصل ہے کہ ہر قابلِ احترام ہستی کا احترام ملحوظ رکھتے اور حفظِ مراتب کا لحاظ کرتے ہیں۔ یہاں نہ افراط ہے نہ تفریط۔ اپنے محبین ومخالفین کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

سيهلك فى صنفان محب مفرط
تذهب به الحب الى
غير الحق ومبغض مفرط
تذهب به البغض الى
غير الحق وخير
الناس فى حالاً

عنقریب میرے بارے میں دو فریق ہلاک
ہوں گے۔ محب دوستی میں افراط کرنے
کے باعث کہ دوستی کو حق سے دُور لے
جائے گا اور دشمن کہ دشمنی میں افراط سے
دشمنی کو حق سے دُور لے جائے گا بہترین
انسان میرے بارے میں وُہ ہے جو

---

[1] رجال کشی: ص ۷۱

النمط الاوسط فالزموا السواد الاعظم فان يد الله على الجماعة وايّاكم والفرقة فانّ الشاذ من الناس للشيطان كما ان الشاذ من الغنم للذئب الا من دعا الى هذا الشعار فاقتلوه ولو كان تحت عمامتی۔ [1]

میانہ روی اختیار کرے۔ تم سب سے بڑی جماعت کے اتباع کو لازم جانو، کیونکہ اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ فرقہ بازی سے بچ کر رہنا کیونکہ جماعت سے علیحدہ رہنے والا انسان شیطان کا شکار ہے جیسے ریوڑ سے جُدا ہونے والی بکری بھیڑیئے کا شکار ہوتی ہے۔ خبردار جو تمھیں جماعت سے علیحدگی کی دعوت دے اُسے قتل کردو خواہ وُہ میری اِس دستار کے نیچے ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشادِ گرامی سنہری حروف میں لکھنے کے قابل اور مسلمانوں کے لیے بہترین لائحہ عمل ہے۔ محبت کے افراط کی شیعہ حضرات اور عداوت کے افراط کی خارجی حضرات مُنہ بولتی تصویریں ہیں۔ بفضلہٖ تعالیٰ اہلسنت وجماعت ہی میانہ روی اختیار کیے ہُوئے اور مسلمانوں کا سوادِ اعظم (سب سے بڑی جماعت) ہیں، جن کے ساتھ رہنے کی حضرت مولا مشکل کشا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تاکید فرمائی اور جس سے جُدا ہونے والے کو قتل کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

مُسلمانوں سے بُغض وعداوت

مسلمانوں سے شیعہ حضرات کی دشمنی اظہر من الشمس ہے۔ زندوں سے دوستی یا دشمنی پھر اور بات ہے لیکن ملتِ اسلامیہ سے اِن کی عداوت کسی مسلمان کے فوت ہوجانے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتی۔ اِن کے نزدیک مسلمانانِ اہلسنت وجماعت ہر حالت میں غیر مسلم اور قابلِ لعنت ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ کسی سُنّی کا جنازہ نہیں پڑھنا چاہیے اور اگر کسی غیر شیعہ کی نمازِ جنازہ پڑھنی پڑجاتے تو چوتھی تکبیر سے پہلے یوں بددعا کرے:

---

[1] نہج البلاغت، مطبوعہ تہران: ص ۱۷۸

اللھم اخز عبدک فی عبادک	اے اللہ اِس بندے کو اپنے بندوں
اللھم اصلہ حرّ نارک	اور شہروں میں ذلیل کر، اے اللہ اسے
اللھم اذقہ اشد	نارِ جہنم میں ڈال۔ اے اللہ اسے سخت
عذابک۔[1]	عذاب چکھا۔

؎ بسمل تو ہوئے سیکڑوں ہی سرد تڑپ کر
ٹھنڈا مِرا قاتل کا مگر دل نہیں ہوتا

مسلمانوں کو شیعہ حضرات کی اِس حرکتِ قبیحہ کا کہاں تک افسوس ہو جبکہ اِن حضرات نے اپنی فرضی محبت کے مرکز و محور یعنی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات والاصفات کو اپنی مشقِ ستم سے نہ بخشنے دیا۔ چنانچہ خود اُن کی جانب یہ فرضی قول منسوب کیا ہوا ہے:

اِنّ علیا علیہ السلام قال علی	بے شک حضرت علی علیہ السلام نے
منبر کوفہ یا ایھا الناس	کُوفے کے منبر پر جلوہ افروز ہو کر فرمایا،
ستدعون الی شیئ	اے لوگو! تمھیں ایک چیز (میری سبّ و
فستبّونی۔[2]	شتم) کی جانب بُلایا جائے گا، تو مجھے
	گالیاں دے لینا۔

لاحول ولا قوۃ الّا باللہ العلی العظیم۔

۹۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے کارنامے

مرزا غلام احمد قادیانی کی حتمی تاریخ پیدائش تو کسی کو معلوم نہیں، ہاں مرزا صاحب نے کتاب البریہ میں ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۰ء بتائی ہے لیکن تریاق القلوب میں ۱۸۴۵ء لکھی ہے۔ اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ عربی اور انگریزی میں ابجد خواں تھے۔ سیالکوٹ کچہری میں

---

[1] تحفۃ العوام، جلد اول، ص ۱۳۸

[2] محمد بن یعقوب کلینی: اصولِ کافی، ص ۴۸۴

بمشاہرہ پندرہ روپے ماہوار چار سال تک محرر بھی رہے۔ آبائی پیشہ زمینداری تھا۔ آباؤ اجداد سکھوں اور انگریزوں کے وفادار اور ملازم رہتے آئے تھے۔ والد کا نام مرزا غلام مرتضیٰ تھا۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے قانونی مختار کاری کا امتحان بھی دیا لیکن فیل ہونے پر تعلیم سے دل اُچاٹ ہو گیا۔ ضعفِ دل و دماغ تمام عمر جولانی پر رہا۔ قوتِ مردمی سے اکثر اوقات محروم رہے۔ تشنجِ قلب، اسہال، دردِ سر، دورانِ سر، مالیخولیا اور ذیابیطس وغیرہ امراض موصوف کی زندگی کے ساتھی تھے۔ ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو لاہور میں موصوف کا شدتِ اسہال یا ہیضہ سے انتقال ہُوا تھا۔ بعد وفات اُن کے منہ سے پاخانہ نکلتے ہُوئے دیکھا گیا جو حاضرین کی عبرت کا باعث ہُوا۔ مرزا صاحب کے خلفاء اِس صورتِ حال کی تردید کرتے رہے۔ والعلم عنداللہ۔

۱۸۸۶ء سے مرزا صاحب نے اپنی نبوت کی بنیاد رکھنی شروع کی، لیکن ایسے گول مول لفظوں میں جو صرف کشف والہام وغیرہ پر مبنی تھے اور براہین احمدیہ میں اہلے گہلے پھر رہے ہیں۔ قادیان سے براہین احمدیہ اور مدرسہ دیوبند سے تحذیر الناس بیک وقت لکھی گئیں۔ علی گڑھ کالج کا اجراء، مدرسہ دیوبند کی تاسیس اور براہین احمدیہ کی تصنیف کا زمانہ ایک ہے، گویا برٹش گورنمنٹ نے ملت اسلامیہ کے خلاف بیک وقت چار فتنے دہلی، علی گڑھ، دیوبند اور قادیان سے کھڑے کر دیئے۔ چاروں فتنے اپنے اپنے رنگ میں نرالے، انتہائی پُراسرار اور مسلمانوں کے خرمنِ دین و ایمان میں آگ لگانے والے تھے۔ افسوس! اِن فتنوں کی کماحقہ، مضرت سے مسلمانوں کی اکثریت تا حال باخبر نہیں ہو سکی ہے۔ اگر حقیقت کی تہہ میں جھانک کر دیکھا جائے تو صاف نظر آنے لگتا ہے کہ انگریزی حکومت اپنے اسلام دشمن مقاصد میں انتہائی کامیاب رہی تھی۔ کاش! ہم اب بھی اِن فتنوں کی مضرت کو سمجھنے لگ جائیں۔ دہلی سے شش مثل کی آواز، علی گڑھ سے نیچریت کا ظہور، دیوبند سے براہین قاطعہ اور فتاوٰی گنگوہی متعلقہ وقوعِ کذبِ باری اور قادیان سے فتح اسلام، توضیح مرام اور ازالۂ اوہام کی اشاعت اِن فتنوں کی دُوسری کڑیاں ہیں۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے جملہ تخریب کاروں سے بڑھ کر وبال اپنے سر لیا کہ نبوت کا دعویٰ کر کے دجالوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ اپنی دنیا سنبھالنے کی خاطر کروڑوں مسلمانوں کی عاقبت برباد کر گئے۔ اب موصوف کے چند مخصوص کارنامے ہم بڑے اختصار کے ساتھ

ود مرزا غلام احمد قادیانی کی تصانیف سے پیش کرتے ہیں۔ موصوف برٹش گورنمنٹ کی مخالفت کو حت بدذاتی اور گناہ سمجھتے تھے۔ اب باقی کارگزاری کی جھلک ملاحظہ ہو۔

خالفتِ جہاد

تخریب کاری کے چاروں مراکز یعنی دہلی، علی گڑھ، مدرسہ دیوبند اور قادیان میں دو باتیں قدرِ مشترک تھیں:

۱۔ حکومت کی تائید وحمایت

۲۔ جہاد کی مخالفت

کن قادیانی مرکز ان میدانوں میں اپنے حلیفوں سے گوئے سبقت لے گیا۔ چنانچہ مرزا صاحب نے س بارے میں فرمایا ہے:

> "دوسرا امر قابلِ گزارش یہ ہے کہ میں ابتدائی عمر سے اس وقت تک جو قریباً ساٹھ برس کی عمر تک پہنچا ہوں، اپنی زبان اور قلم سے اہم کام میں مشغول ہوں تا کہ مسلمانوں کے دلوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی سچی محبت اور خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیروں اور اُن کے بعض کم فہموں کے دلوں سے غلط خیال جہاد وغیرہ کے دُور کروں، جو دلی صفائی اور مخلصانہ تعلقات سے روکتے ہیں۔"[2]

ا صاحب نے ممانعتِ جہاد کے سلسلے میں جو کارنامہ دکھایا اُس کا یوں فخریہ ذکر کیا ہے:

> "میں نے ممانعتِ جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں اُن سے بھر سکتی ہیں۔"[3]

؎ طوقِ استعمارِ مغرب خود کیا زیبِ گلو
اور گواہ اِس پہ ہیں مرزا کی پچاس الماریاں

ی بروزی نبوّت کا دعویٰ

[1] ۱۸۸۶ء میں کشف والہام کے دعاوی کرنے کے بعد ۱۸۹۰ء میں مرزا صاحب نے کہنا شروع کر دیا کہ

غلام احمد قادیانی: تریاق القلوب، ص ۲۶ [2] ایضاً، تبلیغِ رسالت، ج ۷، ص ۱۰

ایضاً: تریاق القلوب، ص ۲۵

میں مسیح موعود اور عیسیٰ بن مریم ہُوں۔ چنانچہ موصوف نے خود لکھا ہے:

”مریم کی طرح عیسیٰ کی رُوح مجھ میں نفخ کی گئی اور استعارہ کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھہرا دیا گیا اور آخر کئی مہینے کے بعد، جو دس مہینے سے زیادہ نہیں، بذریعہ اِس الہام کے مجھے مریم سے عیسیٰ بنایا گیا۔ پس اِس طور سے میں ابنِ مریم ٹھہرا۔“ [1]

اپنے مسیح موعود ہونے کے دعوے کو مرزا صاحب نے اِن لفظوں میں بھی بیان کیا ہے:

”میرا دعویٰ یہ ہے کہ میں وُہ مسیح موعود ہُوں، جس کے بارے میں خدا تعالیٰ کی تمام پاک کتابوں میں پیش گوئیاں ہیں کہ وُہ آخری زمانے میں ظاہر ہوگا۔“ [2]

دُوسری جگہ موصوف نے اپنے اِسی دعویٰ کو اِن لفظوں میں دُہرایا ہے:

”جس آنے والے مسیح موعود کا حدیثوں سے پتہ لگتا ہے، اُس کا اُن ہی حدیثوں سے یہ نشان دیا گیا ہے کہ وُہ نبی ہوگا اور اُمتی بھی۔“ [3]

اِس سے آگے موصوف نے خود کو عیسیٰ علیہ السلام سے افضل بنانے کی مہم شروع کر دی، چنانچہ لکھا ہے:

”خدا نے اِس اُمت میں سے مسیح موعود بھیجا جو اُس پہلے مسیح سے اپنی تمام شان میں بہت بڑھ کر ہے۔ مجھے قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر مسیح ابن مریم میرے زمانے میں ہوتا تو وُہ کام جو میں کر سکتا ہُوں وہ ہرگز نہ کر سکتا اور وُہ نشان جو مجھ سے ظاہر ہو رہے ہیں، وہ ہرگز نہ دکھلا سکتا۔“ [4]

مرزا صاحب نے اپنے اِس شیطانی دعوے کی دلیل ان مضحکہ خیز لفظوں میں پیش کی ہے:

”جب خدا نے اور اُس کے رسول نے اور تمام نبیوں نے زمانہ کے مسیح کو اُس کے کارناموں کی وجہ سے افضل قرار دیا ہے پھر تو یہ شیطانی وسوسہ ہے کہ یہ کہا جاتے کہ کیوں تم مسیح ابنِ مریم سے اپنے تئیں افضل قرار

---

[1] غلام احمد قادیانی: کشتیِ نوح، ص ۴۷ [2] غلام احمد قادیانی: تحفہ گولڑویہ، ص ۱۹۵

[3] ایضاً: حقیقۃ الوحی، ص ۲۶ [4] ایضاً: ص ۱۴۰

دیتے ہوئے"[۱]

مرزا صاحب نے مسیح موعود کے ساتھ آدم ہونے اور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا بروز ہونے کو منطقی انداز میں، اِن لفظوں کے ساتھ بیان کیا ہے:

"لاجرم خدا نے مجھ کو آدم بنایا اور مجھ کو وہ سب چیزیں بخشیں اور مجھ کو خاتم النبیین اور سید المرسلین کا بروز بنایا اور بھید اس میں یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ابتداء سے ارادہ فرمایا تھا کہ اُس آدم کو پیدا کرے گا جو آخری زمانہ میں خاتم الخلفاء ہوگا جیسا کہ زمانہ کے شروع میں آدم کو پیدا کیا جو اُس کا پہلا خلیفہ تھا اور یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ فطرت کا دائرہ گول ہو جائے۔"[۲]

مرزا صاحب نے بروزی ظلی کے معاملے کو بڑھاتے ہوئے خود کو تمام انبیائے بنی اسرائیل کا ظل اِن لفظوں میں بتایا ہے:

"یہ خدا تعالیٰ پر بدظنی ہے کہ اُس نے مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی بدی کا تو حصہ دار ٹھہرا دیا ہے، یہاں تک کہ اِن کا نام یہود بھی رکھ دیا مگر اُن کے رسولوں اور نبیوں کے مراتب میں سے اس اُمت کو کوئی حصہ نہ دیا۔ پھر یہ اُمت خیر الامم کس وجہ سے ہوئی؟ بلکہ شر الامم ہوئی کہ ہر ایک نمونہ شر کا اِن کو ملا مگر نیکی کا نمونہ نہ ملا۔ کیا ضرور نہیں کہ اِس اُمت میں بھی کوئی نبیوں اور رسولوں کے رنگ میں نظر آوے جو بنی اسرائیل کے تمام نبیوں کا وارث اور اُن کا ظل ہو۔"[۳]

موصوف نے سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بروز ہونے کا خطبہ الہامیہ میں جو دعویٰ کیا تھا، اُسے اور آگے بڑھاتے ہوئے صاف لکھ دیا کہ میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فیوض کا کامل نمونہ ہوں، مرزا صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

"خدا تعالیٰ نے ابتداء سے ارادہ کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات معتدبہ کے اظہار و اثبات کے لیے کسی شخص کو آنجناب کی پیروی اور متابعت

---

[۱] غلام احمد قادیانی: حقیقۃ الوحی، ص ۱۵۵ [۲] ایضاً: خطبہ الہامیہ، ص ۱۶۷

[۳] ایضاً: کشتیِ نوح، ص ۴۴

کی وجہ سے وہ مرتبہ کثرتِ مکالمات اور مخاطباتِ الٰہیہ بخشے کہ جو اُس کے وجود میں عکسی طور پر نبوّت کا رنگ پیدا کر دے۔ سو اِس طرح سے خدا نے میرا نام نبی رکھا یعنی نبوتِ محمدیہ میرے آئینۂ نفس میں منعکس ہو گئی اور ظلّی طور پر نہ اصلی طور پر مجھے یہ نام دیا گیا، تا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض کا کامل نمونہ ٹھہروں۔"[1]

موصوف نے اپنی بروزی منطق کا ہیر پھیر لفظوں کی چکّر بازی میں یُوں بھی دکھایا ہے:

"چونکہ مَیں اُس کا رسول یعنی فرستادہ ہُوں مگر بغیر کسی نئی شریعت اور نئے دعوے اور نئے نام کے بلکہ اُسی نبیِ کریم، خاتم الانبیاء کا نام پا کر اور اُسی میں ہو کر اور اُسی کا مظہر بن کر آیا ہُوں۔"[2]

اِسی بات کو موصوف نے اگلے صفحے پر اِن لفظوں میں بیان کیا ہے:

"اِس نکتہ کو یاد رکھو کہ مَیں رسول اور نبی نہیں ہُوں یعنی باعتبار نئی شریعت اور نئے دعوے اور نئے نام کے اور میں رسول اور نبی ہُوں۔ یعنی باعتبار ظلّیت کاملہ کے۔ میں وُہ آئینہ ہُوں جس میں محمدی شکل اور محمدی نبوت کا کامل انعکاس ہے اور میں کوئی علیحدہ شخص نبوت کا دعویٰ کرنے والا ہوتا تو خدا تعالیٰ میرا نام محمد اور احمد اور مصطفیٰ اور مجتبیٰ نہ رکھتا۔"[3]

حقیقی نبوّت کا دعویٰ

ابتداء میں مرزا صاحب نے اپنے دعویٔ نبوت کو ظلّی بروزی وغیرہ پردوں میں ملفوف رکھا لیکن اُن کا قدم وقت کے ساتھ ساتھ آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ اُدھر انیسویں صدی عیسوی ختم ہُوئی اور اِدھر مرزا صاحب نے اپنے پچھلے دعاوی کو چھوڑتے ہُوئے ۱۹۰۱ء میں حقیقی نبوّت کا دعویٰ کر دیا یعنی کمال شعبدہ بازی دکھاتے رہے اور لفظوں کا ہیر پھیر آخری دم تک سلامت رکھا۔ مثلاً لکھتے ہیں:

"ہلاک ہو گئے وہ جنھوں نے ایک برگزیدہ رسول (یعنی مرزا صاحب) کو قبول

---

[1] غلام احمد قادیانی: حاشیہ چشمۂ معرفت، ص ۳۲۴ [2] ایضاً: نزول المسیح، ص ۲
[3] ایضاً: ص ۴

نہ کیا۔ مبارک وہ جس نے مجھ کو پہچانا۔ میں خدا کی سب راہوں میں سے آخری راہ ہوں اور اُس کے سب نوروں میں سے آخری نور ہوں۔ بدقسمت ہے وہ جو مجھے چھوڑتا ہے کیونکہ میرے بغیر سب تاریکی ہے۔"[1]

مرزا صاحب کی جیسی شیطانی نبوت تھی اُسی کے مطابق وحی بھی نقدی کی صورت میں ہوتی تھی، جس کی خاطر موصوف نے یہ سارا شیطانی ڈرامہ سٹیج کیا تھا۔ چنانچہ ٹیچی ٹیچی فرشتے کی ایک آمد کا موصوف نے یُوں تذکرہ کیا ہے:

"ایک دفعہ مارچ ۱۹۰۵ء کے مہینے میں بوقتِ قلّتِ آمدنی لنگرخانہ کے مصارف میں بہت دقّت ہُوئی کیونکہ کثرت سے مہمانوں کی آمد تھی اور اُس کے مقابل پر روپیہ کی آمدنی کم، اس لیے دُعا کی گئی۔ ۵؍مارچ ۱۹۰۵ء کو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص جو فرشتہ معلوم ہوتا تھا میرے سامنے آیا اور اُس نے بہت سا روپیہ میرے دامن میں ڈال دیا۔ میں نے اُس کا نام پُوچھا۔ اُس نے کہا، نام کچھ نہیں۔ میں نے کہا، آخر کچھ تو نام ہوگا؟ اُس نے کہا، میرا نام ہے ٹیچی ٹیچی۔ پنجابی زبان میں وقت مقررہ کو کہتے ہیں یعنی عین ضرورت کے وقت آنے والا تب میری آنکھ کُھل گئی۔ بعد اس کے خدا تعالیٰ کی طرف سے کیا ڈاک کے ذریعے سے اور کیا براہِ راست لوگوں کے ہاتھوں سے اِس قدر مالی فتوحات ہُوئیں جن کا وہم و گمان نہ تھا اور کئی ہزار روپیہ آگیا۔ چنانچہ جو شخص اِس کی تصدیق کے لیے طرف ڈاکخانے کے رجسٹری ۵ مارچ ۱۹۰۵ء سے آخر سال تک دیکھے اُس کو معلوم ہوگا کہ کس قدر روپیہ آیا تھا۔"[2]

جو طاقت اِس خوشحال ملک کی دولت کو لوٹ رہی تھی وہ اگر اپنے کسی خودکاشتہ پودے پر دس بیس ہزار روپیہ سالانہ خرچ کرتی رہے تو کون سا اُسے اپنے کنگال ملک سے لانا پڑتا تھا۔ آخر وہ وقت مقررہ پر پہنچنے والے ٹیچی ٹیچی جو ہُوئے۔ ضرورت خود معلوم کرتے رہتے تھے اور ادھر سے

---

[1] غلام احمد قادیانی: کشتی نوح، ص ۵٦

[2] ایضاً: حقیقۃ الوحی، ص ۳۳۲

مطالبے بھی پہنچتے ہوں گے، جنھیں الہام کا نام دے کر مرزا صاحب رقمطراز ہیں:

"یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی مجھ سے یہ عادت ہے کہ اکثر جو نقد روپیہ آنے والا ہو یا اور چیزیں تحائف کے طور پر ہوں اُن کی خبر قبل از وقت بذریعہ الہام یا خواب کے مجھ کو دے دیتا ہے اور اِس قسم کے نشان پچاس ہزار سے کچھ زیادہ ہوں گے۔"[1]

بہر حال یہ تو دعوئِ نبوت کے سلسلے میں مرزا صاحب اور اُن کی مربّی حکومت کا معاملہ تھا۔ یہاں دعوئِ نبوت کے سلسلے میں موصوف کی چند عبارتیں پیش کرنا مدِّ نظر ہے۔ چنانچہ مرزا صاحب نے بڑے طمطراق سے تحریر کیا ہے:

"خدا کا کلام اِس قدر مجھ پر نازل ہُوا ہے کہ اگر وُہ تمام لکھا جاتے تو بیس جزو سے کم نہیں ہو گا۔"[2]

موصوف نے اپنے تئیں حضرت نوح علیہ السلام پر فضیلت دیتے ہُوئے صاف لکھا ہے:

"خدا تعالیٰ میرے لیے اس کثرت سے نشان دکھلا رہا ہے کہ اگر نُوح کے زمانہ میں وہ نشان دکھلائے جاتے تو وہ لوگ غرق نہ ہوتے۔ مگر میں اُن کو کس سے مثال دُوں، وہ اُس خیرہ طبع انسان کی طرح ہیں جو روزِ روشن کو دیکھ کر پھر بھی اِس بات پر ضد کرتا ہے کہ رات ہے دن نہیں۔"[3]

حضرت یوسف علیہ السلام سے خود کو افضل بتاتے ہُوئے موصوف نے تحریر کیا ہے:

"اِس اُمت کا یوسف یعنی یہ عاجز اسرائیلی یوسف سے بڑھ کر ہے کیونکہ یہ عاجز قید کی دُعا کر کے بھی قید سے بچایا گیا مگر یُوسف بن یعقوب قید میں ڈالا گیا اور اِس اُمّت کے یُوسف کی بریّت کے لیے پچیس برس پہلے ہی خدا نے آپ گواہی دے دی اور بھی نشان دکھلائے مگر یوسف بن یعقوب اپنی بریت کے لیے انسانی گواہی کا محتاج ہُوا۔"[4]

---

[1] غلام احمد قادیانی: حقیقۃ الوحی ص ۳۴۳

[2] ایضاً: ص ۳۹۱

[3] ایضاً: ص ۳۹۱

[4] ایضاً: براہین احمدیہ، حصہ پنجم، ص ۷۱

مرزا صاحب نے اپنی ذات کو تمام انبیائے کرام کے کمالات کی جامع بتاتے ہُوئے صاف لکھا ہے:

> "دنیا میں کوئی نبی نہیں گزرا جس کا نام مجھے نہیں دیا گیا۔ سو جیسا کہ براہین احمدیہ میں خدا نے فرمایا ہے کہ مَیں آدم ہُوں، میں نوح ہوں، میں ابراہیم ہُوں، میں اسحاق ہُوں، میں یعقوب ہوں، میں اسمٰعیل ہُوں، میں موسیٰ ہوں، میں داؤد ہوں، میں عیسیٰ ابن مریم ہوں، میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں یعنی بروزی طور پر، جیسا کہ خدا نے اُسی کتاب میں یہ سب نام مجھے دیئے اور میری نسبت جری اللہ فی حلل الانبیاء فرمایا، یعنی خدا کا رسول، نبیوں کا پیر ہوں۔ سو ضرور ہے کہ ہر ایک نبی کی شان مجھ میں پائی جائے۔"[۱]

مرزا صاحب اپنے متعلق بشارتوں کا تذکرہ کرتے ہُوئے کتنے فخریہ انداز میں انبیائے کرام کی تمنّاؤں اور آرزوؤں کا مرکز بن بیٹھے۔ چنانچہ اِن امور کا ذکر کرتے ہُوئے لکھا ہے:

> "اے عزیزو! تم نے وہ وقت پایا ہے جس کی بشارت تمام نبیوں نے دی ہے اور اُس شخص کو تم نے دیکھ لیا، جس کے دیکھنے کے لیے بہت سے پیغمبروں نے بھی خواہش کی تھی۔ اِس لیے اب اپنے ایمانوں کو خوب مضبوط کرو اور اپنی راہیں درست کرو۔"[۲]

موصوف نے اپنے فرضی معجزات کی کثرت کے پیشِ نظر انبیائے کرام کی توہین کا یہ اہتمام بھی کیا تھا:

> "اُس (خدا) نے میرا دعویٰ ثابت کرنے کے لیے اِس قدر معجزات دکھائے ہیں کہ بہت ہی کم نبی ایسے آئے ہیں جنھوں نے اِس قدر معجزات دکھائے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اُس نے اِس قدر معجزات کا دریا رواں کر دیا ہے کہ باستثناء ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے باقی تمام انبیاء علیہم السلام میں اُن کا ثبوت اِس کثرت

---

[۱] غلام احمد قادیانی: تتمہ حقیقۃ الوحی، ص ۸۴

[۲] ایضاً: اربعین ۴، ص ۱۴

کے ساتھ قطعی اور یقینی طور پر محال ہے اور خدا نے اپنی حجت پوری کر دی ہے، اب چاہے کوئی قبول کرے یا نہ کرے۔"[1]

مرزا صاحب نے اپنے فرضی معجزات کی تعداد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"میری تائید میں اُس نے وُہ نشان ظاہر فرمائے ہیں کہ...... اگر مَیں اُن کو فرداً فرداً شمار کروں تو میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہُوں کہ وُہ تین لاکھ سے بھی زیادہ ہیں۔"[2]

لیکن اپنے اسی قلم ناحق رقم سے سرورِ کون ومکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے معجزات کی تعداد بتاتے ہُوئے لکھا ہے:

"تین ہزار معجزات ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہور میں آئے۔"[3]

بہر حال موصوف کو اپنے معجزات وغیرہ کا پُورا مزہ مل رہا ہوگا۔ برطانوی نبوت خوب رنگ دکھا رہی ہوگی۔ موصوف نے اپنی اسی مخصوص ترنگ میں اپنے معجزات کی کثرت کا یہ فرضی افسانہ اور شیطانی قصہ بھی سنایا تھا:

"خدا تعالیٰ نے اِس بات کے ثابت کرنے کے لیے کہ مَیں اُس کی طرف سے ہُوں، اِس قدر نشان دکھلائے ہیں کہ اگر وہ ہزار نبی پر تقسیم کیے جائیں تو اُن کی بھی اِن سے نبوت ثابت ہو سکتی ہے، لیکن چونکہ یہ آخری زمانہ تھا اور شیطان کا مع اپنی تمام ذریت کے آخری حملہ تھا، اِس لیے خدا نے شیطان کو شکست دینے کے لیے ہزارہا نشان ایک جگہ جمع کر دیے لیکن پھر بھی جو لوگ انسانوں میں سے شیطان ہیں، وہ نہیں مانتے۔"[4]

مرزا صاحب نے جملہ انبیائے کرام پر اپنی افضلیت بتاتے ہُوئے فارسی میں یہ تین شعر بھی الاپے تھے:

انبیاء گرچہ بودند بسے   من بعرفاں نہ کمترم ز کسے

---

[1] غلام احمد قادیانی: حقیقۃ الوحی، ص ۱۳۶

[2] ایضاً: ص ۶۷

[3] ایضاً: تحفہ گولڑویہ، ص ۶۳

[4] ایضاً، چشمۂ معرفت، ص ۳۱۷

آنچہ داد است ہر نبی را جام   داد آں جام را مرا بہ تمام
کم نیم زاں ہمہ بروئے یقین   ہر کہ گوید دروغ ہست لعین[1]

مقدس بارگاہوں میں دریدہ دہنی

مرزا صاحب نے یوں تو کتنے ہی بزرگوں کی توہین وتنقیص کی ہے لیکن حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان میں تو ایسے ایسے بیہودہ کلمات لکھے اور شایع کیے ہیں جن کی ایک مسلمان ہرگز جسارت نہیں کرسکتا۔ موصوف نے لکھا ہے:

"غرض حسین کو نبیوں پر فضیلت دینا بیہودہ خیال ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ وُہ بھی خدا کے راستباز بندوں میں سے تھے، لیکن ایسے بندے تو کروڑہا دنیا میں گزر چکے ہیں اور خدا جانے آگے کس قدر ہوں گے۔ پس بلا وجہ اُن کو تمام انبیاء کا سردار بنادیا خدا کے پاک رسولوں کی سخت ہتک کرنا ہے۔ ایسا ہی خدا نے اور اُس کے پاک رسول نے بھی مسیح موعود کا نام نبی اور رسول رکھا ہے اور تمام خدا تعالیٰ کے نبیوں نے اُس کی تعریف کی ہے اور اُس کو تمام انبیاء کے صفاتِ کاملہ کا مظہر ٹھہرایا ہے۔ اب سوچنے کے لایق ہے کہ امام حسین کو اُس سے کیا نسبت ہے؟...... کیا یہ سچ نہیں ہے کہ قرآن اور احادیث اور تمام نبیوں کی شہادت سے مسیح موعود حسین سے افضل ہے اور جامع کمالاتِ متفرقہ ہے۔ پھر اگر درحقیقت میں ہی مسیح موعود ہوں تو خود سوچ لو کہ حسین کے مقابل مجھے کیا درجہ دینا چاہیے اور اگر میں وُہ نہیں ہوں تو خدا نے صدہا نشان کیوں دکھلائے اور کیوں وُہ ہر دم میری تائید میں ہے۔"[2]

دوسرے مقام پر مرزا صاحب شیعہ حضرات کو مخاطب کرکے امام عالی مقام سیدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یوں کسرِشان کر رہے ہیں:

"اے قومِ شیعہ! اُس پر اصرار مت کرو کہ حسین تمہارا منجی ہے کیونکہ میں سچ سچ

---

[1] غلام احمد قادیانی: درثمین، ص ۲۸۷، ۲۸۸
[2] ایضاً: نزول المسیح، ص ۲۵

کہتا ہُوں کہ آج تم میں ایک ہے کہ اُس حسین سے بڑھ کر ہے۔

؎ کربلائیست سیر ہر آنم
صد حسین است در گریبانم[1]

کنواری بتول حضرت مریم علیہا السلام پر نکاح کرنے کی تہمت لگا کر اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تنقیص کرتے ہُوئے مرزا صاحب نے یُوں اپنے کذّاب ہونے کا ثبوت دیا ہے:

"مریم کی وُہ شان ہے جس نے ایک مدت تک اپنے تئیں نکاح سے روکا، پھر بزرگانِ قوم کے نہایت اصرار سے بوجہ حمل کے نکاح کر لیا۔ گو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ برخلافِ تعلیمِ توریت عین حمل میں کیوں کیا گیا اور بتول ہونے کے عہد کو کیوں ناحق توڑا گیا اور تعدادِ ازواج کی کیوں بنیاد ڈالی گئی یعنی باوجود یوسف نجار کی پہلی بیوی کے ہونے کے مریم کیوں راضی ہُوئی کہ یوسف نجار کے نکاح میں آوے، مگر میں کہتا ہُوں کہ یہ سب مجبوریاں تھیں جو پیش آگئیں۔"[2]

فرضی یوسف نجار کو مرزا صاحب نے اپنی خصلت سے مجبور ہو کر عیسٰی علیہ السلام کا والد بھی لکھا ہے۔ مثلاً:

"حضرت مسیح ابنِ مریم اپنے باپ یوسف کے ساتھ بائیس ۲۲ برس تک نجاری کا کام بھی کرتے رہے ہیں۔"[3]

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ظاہر و باہر معجزات کے بارے میں مرزا صاحب یُوں آنکھوں میں دُھول جھونکتے ہیں:

"عیسائیوں نے بہت سے آپ کے معجزات لکھے ہیں مگر حق بات یہ ہے کہ آپ سے کوئی معجزہ ظاہر نہیں ہُوا اور اُس دن سے کہ آپ نے معجزہ مانگنے والوں کو گندی گالیاں دیں اور اُن کو حرام کار اور حرام کی اولاد ٹھہرایا، اُسی روز سے شریفوں نے

---

[1] غلام احمد قادیانی: درثمین، ص ۲۸۷

[2] غلام احمد قادیانی: کشتی نوح، ص ۱۶

[3] غلام احمد قادیانی: ازالۂ اوہام، ص ۳۰۳

آپ سے کنارہ کیا۔"[1]

دوسرے مقام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا انکار اور پیشگوئیوں کے بارے میں ہرزہ سرائی کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اگر مسیح کے اصلی کاموں کو اُن حواشی سے الگ کر کے دیکھا جائے جو محض افتراء کے طور پر یا غلط فہمی کی وجہ سے گھڑے گئے ہوں، تو کوئی عجوبہ نظر نہیں آتا۔ بلکہ مسیح کے معجزات اور پیشگوئیوں پر جس قدر اعتراض اور شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی اور نبی کے خوارق یا پیش خبریوں میں کبھی ایسے شبہات پیدا ہوئے ہوں۔ کیا تالاب کا قصہ مسیحی معجزات کی رونق دُور نہیں کرتا اور پیشگوئیوں کا حال اِس سے بھی زیادہ تر ابتر ہے۔ کیا یہ بھی کچھ پیش گوئیاں ہیں کہ زلزلے آئیں گے، مری پڑے گی، لڑائیاں ہوں گی، قحط پڑیں گے۔"[2]

فرضی تالاب کا بہانہ بنا کر مرزا صاحب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزۂ خلقِ طیر کے بارے میں تحریر کیا ہے:

"یہ اعتقاد بالکل غلط اور فاسد اور مشرکانہ خیال ہے کہ مسیح مٹی کے پرندے بنا کر اور اُن میں پھونک کر اُنھیں سچ مچ کے جانور بنا دیتا تھا۔ نہیں بلکہ صرف عملِ ترب (مسمریزم) تھا جو رُوح کی قوت سے ترقی پذیر ہو گیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مسیح ایسے کام کے لیے اُس تالاب کی مٹی لاتا تھا، جس میں رُوح القدس کی تاثیر رکھی گئی تھی۔ بہرحال یہ معجزہ صرف کھیل کی قسم میں سے تھا اور مٹی درحقیقت ایک مٹی ہی رہتی تھی جیسے سامری کا گوسالہ۔"[3]

اسی معجزے کے بارے میں مرزا صاحب نے اپنے خیالات کا اِس طرح بھی اظہار کیا ہے:

"حضرت مسیح کا معجزہ پرندے بنا کر اُن میں پھونک مار کر اُڑانا، حضرت سلیمان کے معجزہ کی طرح صرف عقلی تھا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اُن دنوں ایسے امور کی طرف

---

[1] غلام احمد قادیانی: ازالۂ اوہام، ص ۳۰۳ [2] ایضاً: ص ۷
[3] ایضاً: ص ۳۲۲

لوگوں کے خیالات جُھکے ہُوئے تھے کہ جو شعبدہ بازی کی قسم میں سے در اصل بے سُود اور عوام کو فریفتہ کرنے والے تھے۔" [1]

مرزا صاحب نے مذکورہ تالاب کو سراہتے ہُوئے اعجازِ عیسوی کے بارے میں اپنی فطرت سے مجبور ہو کر یُوں دریدہ دہنی کی ہے:

"اگر آپ سے کوئی معجزہ بھی ظاہر ہُوا ہو، تو وُہ آپ کا نہیں بلکہ اُسی تالاب کا معجزہ ہے اور آپ کے ہاتھ میں سوائے مکر و فریب کے اور کچھ نہ تھا۔" [2]

معجزات کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر مرزا صاحب کا براہِ راست جارحانہ حملہ ملاحظہ ہو:

"یہود عیسیٰ کے بارے میں ایسے قوی اعتراض رکھتے ہیں کہ ہم بھی جواب میں حیران ہیں، بغیر اس کے کہ یہ کہہ دیں کہ ضرور عیسیٰ نبی ہے کیونکہ قرآن نے اُس کو نبی قرار دیا ہے اور کوئی دلیل اُن کی نبوت پر قایم نہیں ہو سکتی بلکہ ابطالِ نبوت پر کئی دلائل قایم ہیں۔" [3]

اب عیسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر پر زمانۂ حال کے اِس دجّال کے ظالمانہ اور جارحانہ حملے ملاحظہ ہوں:

"مسیح کی راست بازی اپنے زمانے میں دوسرے راست بازوں سے بڑھ کر ثابت نہیں ہوتی بلکہ یحییٰ کو اُس پر ایک فضیلت ہے کیونکہ وہ شراب نہ پیتا تھا اور کبھی نہ سُنا کہ کسی فاحشہ عورت نے اپنی کمائی کے مال سے اُس کے سر پر عطر ملا تھا یا ہاتھوں اور اپنے سر کے بالوں سے اُس کے بدن کو چھُوا تھا یا کوئی بے تعلق جوان عورت اُس کی خدمت کرتی تھی۔ اِسی وجہ سے خُدا نے قرآن میں یحییٰ کا نام حصور رکھا مگر مسیح کا نہ رکھا کیونکہ ایسے قصّے اِس نام کے رکھنے سے مانع تھے۔" [4]

اِسی روش کو جاری رکھتے ہُوئے مرزا صاحب نے یہ بھی لکھا ہے:

---

[1] غلام احمد قادیانی: ازالۂ اوہام، ص ۳۰۲

[2] ایضاً: حاشیہ ضمیمہ انجام آتھم، ص ۷

[3] ایضاً: اعجاز احمدی، ص ۱۳

[4] ایضاً: دافع البلاء، ٹائٹل پیج، ص ۴

"آپ کا کنجریوں سے میلان اور صحبت بھی شاید اسی وجہ سے ہو کہ جدّی مناسبت درمیان ہے ورنہ کوئی پرہیزگار انسان ایک جوان کنجری کو یہ موقع نہیں دے سکتا کہ وہ اُس کے سر پر اپنے ناپاک ہاتھ لگاوے اور زناکاری کی کمائی کا پلید عطر اُس کے سر پر ملے اور اپنے بالوں کو اُس کے پیروں پر ملے۔ سمجھنے والے انسان سمجھ لیں کہ ایسا انسان کس چلن کا آدمی ہو سکتا ہے۔" [1]

موصوف نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر افترا کیا کہ اُن کے چار بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ چنانچہ لکھا ہے:

"مسیح تو مسیح، میں اُس کے چاروں بھائیوں کی بھی عزت کرتا ہوں۔ مسیح کی دونوں ہمشیروں کو بھی مقدس سمجھتا ہوں۔" [2]

عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ تشریف آوری کے بارے میں مرزا صاحب کے تاثرات یہ ہیں:

"خدا ایسے شخص کو کسی طرح دوبارہ دنیا میں نہیں لا سکتا جس کے پہلے فتنے نے ہی دنیا کو تباہ کر دیا ہے۔" [3]

مرزا صاحب اپنی دریدہ دہنی اور فتنہ پردازی کی خود سزا بھگت رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سارے یانِ اسلام کو ایسے دجالوں کے شر سے محفوظ و مامون رکھے اور ہمیں انبیائے کرام و اولیائے عظام کا سچا غلام اور وارث بنائے۔ آمین

ابن اللہ ہونے کا دعویٰ

مرزا صاحب نے جب تمام انبیائے کرام سے افضل اور باکمال ہونے کے دعوے کو خوب مشتہر کر لیا۔ انبیائے کرام کی دل کھول کر توہین و تنقیص کر چکے تو ابن اللہ ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا۔ چنانچہ لکھا ہے:

"میں نے تجھ سے ایک خرید و فروخت کی ہے یعنی ایک چیز میری تھی جس کا تو مالک بنایا گیا اور ایک چیز تیری تھی جس کا میں مالک بن گیا۔ تُو بھی اِس خرید و فروخت کا

---

[1] غلام احمد قادیانی: ضمیمہ انجام آتھم، ص ۷

[2] ایضاً: کشتی نوح، ص ۱۶

[3] ایضاً: دافع البلاء، ص ۱۵

اقرار کر اور کہہ دے کہ خدا نے مجھ سے خرید و فروخت کی۔ تو مجھے ایسا ہے جیسا کہ اولاد۔ تُو مجھ سے ہے اور مَیں تجھ سے ہوں۔“ [1]

دوسرے مقام پر لکھا ہے:

انت منی بمنزلۃ ولدی۔ [2] یعنی تو مجھ سے بمنزلہ میرے فرزند کے ہے۔

دعوائے اُلوہیت

نبوت سے ابن اللہ اور ابن اللہ سے خود اللہ ہونے کا مرزا صاحب نے بقلم خود اعلان مشہور و مشتہر کیا تھا۔ چنانچہ موصوف نے عربی زبان میں تحریر فرمایا ہے:

رأیتنی فی المنام عین اللہ	میں نے نیند میں اپنے آپ کو ہو بہو اللہ
وتیقنت اننی ہو فخلقت	دیکھا اور میں نے یقین کر لیا کہ میں وہی
السمٰوٰت والارض و قلت	(اللہ) ہوں۔ پھر میں نے آسمان اور
انا زینا السماء الدنیا	زمین بنائے اور کہا کہ ہم نے آسمان کو
بمصابیح۔ [3]	ستاروں کے ساتھ سجایا ہے۔

اقبالی ڈگری

مرزا صاحب نے ایک طرف تو نبوت کا دعویٰ ڈنکے کی چوٹ کیا ہے لیکن دوسری جانب اُسے ظلی بروزی یا غیر تشریعی وغیرہ کے پردوں میں چھپانے اور آسانی سے یہ زہر مسلمانوں کے حلق سے نیچے اتارنے کی کوشش کی ہے لیکن خدا کی قدرت کہ موصوف نے ادعائے نبوت کو کفر بھی قرار دیا ہے، مثلاً جامع مسجد دہلی میں مرزا صاحب نے یہ اعلان کیا:

”ان تمام امور میں میرا وہی مذہب ہے جو دیگر اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے۔ اب میں مفصلہ ذیل امور کا مسلمانوں کے سامنے صاف صاف اقرار اِس خانۂ خدا (جامع مسجد دہلی) میں کرتا ہوں کہ میں جناب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کا قائل ہوں اور جو شخص ختمِ نبوت کا منکر ہو اُس کو بے دین اور

---

[1] غلام احمد قادیانی: دافع البلاء، ص ۸

[2] غلام احمد قادیانی: حقیقۃ الوحی، ص ۸۶

[3] ایضاً: آئینہ کمالات اسلام، ص ۵۶۴، ۵۶۵

دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں"۔ [1]

دُوسرے مقام پر مرزا صاحب نے مدعیانِ نبوت کے بارے میں یُوں حکمِ شرع بیان کیا ہے:

"سیّدنا و مولانا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ختم المرسلین کے بعد کسی دوسرے مدعیِ نبوت اور رسالت کو کاذب اور کافر جانتا ہوں"۔ [2]

حکومتِ پاکستان نے بھی ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو یہی فیصلہ سنایا تھا کہ جو مدعیِ نبوت مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت و رسالت کا قائل ہے یا کم از کم ایسے دجّال و کذّاب کو مسلمان شمار کرتا ہے وہ کافر و مرتد اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ کذالك العذاب ولعذاب الاٰخرة اکبر، لو کانوا یعلمون ○

مسلمانوں سے علیحدگی

مرزا صاحب کے نزدیک غیر احمدی ہرگز مسلمان نہیں تھے۔ چنانچہ موصوف نے لکھا ہے:

"جو شخص تیری پیروی نہیں کرے گا اور تیری بیعت میں داخل نہیں ہوگا اور تیرا مخالف رہے گا وہ خدا اور رسول کی نافرمانی کرنے والا جہنمی ہے"۔ [3]

موصوف کے خلیفہ مرزا محمود قادیانی نے اِس دائرے کو اور بھی وسیع کرتے ہُوئے صاف لکھ دیا:

"کُل جو مسلمان حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہُوئے، خواہ اُنھوں نے حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سُنا وہ کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں"۔ [4]

خود مرزا غلام احمد قادیانی نے اِس معاملے کو اِن دوٹوک لفظوں میں صاف کرتے ہُوئے لکھا ہے:

"جو مجھے نہیں مانتا وُہ خدا اور رسول کو بھی نہیں مانتا"۔ [5]

احمدی حضرات کسی غیر احمدی کے جنازے کی نماز پڑھنا جائز شمار نہیں کرتے۔ مثلاً:

"حضرت مرزا صاحب نے اپنے مرحوم (فضل احمد صاحب) کا جنازہ محض اس لیے

---

[1] غلام احمد قادیانی: تبلیغِ رسالت، جلد دوم، ص ۴۴ [2] ایضاً: ص ۲۲

[3] ایضاً: جلد نہم، ص ۲۷ [4] مرزا محمود احمد خلیفہ: آئینۂ صداقت، ص ۳۵

[5] غلام احمد قادیانی: حقیقۃ الوحی، ص ۱۶۳

نہیں پڑھا کہ وہ غیر احمدی تھا۔" [1]

احمدی حضرات کے نزدیک غیر احمدی کو لڑکی دینا قطعاً ممنوع اور ناقابلِ معافی جرم ہے۔ مثلاً:

"حضرت مسیح موعود نے اُس احمدی پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے جو اپنی لڑکی غیر احمدی کو دے۔ آپ سے ایک شخص نے بار بار پُوچھا اور کئی قسم کی مجبوریوں کو پیش کیا لیکن آپ نے اُس کو یہی فرمایا کہ لڑکی کو بٹھائے رکھو لیکن غیر احمدیوں میں نہ دو۔ آپ کی وفات کے بعد اُس نے غیر احمدیوں کو لڑکی دے دی تو حضرت خلیفۂ اوّل حکیم نورالدین نے اُس کو احمدیوں کی امامت سے ہٹا دیا اور جماعت سے خارج کر دیا اور اپنی خلافت کے چھ سالوں میں اس کی توبہ قبول نہ کی، باوجودیکہ وہ بار بار توبہ کرتا رہا۔" [2]

مرزا صاحب نے اپنے پیروکاروں کو غیر احمدی حضرات کے پیچھے نماز پڑھنے سے قطعی طور پر منع کر دیا تھا۔ چنانچہ موصوف نے غیر احمدیوں کی تین قسمیں بنا کر تینوں کے بارے میں یُوں خدا کی طرف منسوب کر کے حکم سنایا تھا:

"پس یاد رکھو کہ جیسا کہ خدا نے مجھے اطلاع دی ہے تمہارے پر حرام ہے اور قطعی حرام ہے کہ کسی مکفّر اور مکذّب یا متردّد کے پیچھے نماز پڑھو۔ بلکہ چاہیے کہ تمہارا وہی امام ہو جو تم میں سے ہو۔ اِسی کی طرح حدیثِ بخاری کے ایک پہلو میں اشارہ ہے کہ اما مکم منکم یعنی جب مسیح نازل ہوگا تو تمہیں دُوسرے فرقوں کو جو دعوٰیِ اسلام کرتے ہیں، بکلّی ترک کرنا پڑے گا اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا۔ پس تم ایسا ہی کرو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ خدا کا الزام تمہارے سر پر ہو اور تمہارے عمل حبط ہو جائیں اور تمہیں خبر نہ ہو۔" [3]

خلیفۂ قادیان، میاں محمود احمد صاحب نے احمدی اور غیر احمدی کے مسئلے کا فیصلہ یُوں سُنایا

---

[1] اخبار الفضل قادیان، ۱۵ر دسمبر ۱۹۳۱ء

[2] خلیفہ مرزا محمود احمد، انوارِ خلافت، ص ۹۳

[3] غلام احمد قادیانی: اربعین ع۳، ص ۳۴

ہُوا ہے:

"ہمارا یہ فرض ہے کہ غیر احمدیوں کو مسلمان نہ سمجھیں اور اُن کے پیچھے نماز نہ پڑھیں کیونکہ ہمارے نزدیک وہ خدا تعالیٰ کے ایک نبی کے منکر ہیں۔ یہ دین کا معاملہ ہے۔ اِس میں کسی کا اپنا اختیار نہیں کہ کچھ کر سکے۔" [1]

رزا صاحب نے اپنے مریدوں کو سبق پڑھایا تھا کہ احمدیوں کو غیر احمدی حضرات سے تعلقات منقطع رکھنے چاہییں، موصوف کے نزدیک مرزائی کارآمد اور مسلمان بیکار شے تھے۔ چنانچہ اُن کا ایک فیصلہ یُوں منقول ہے:

"یہ جو ہم نے دوسرے مدعیانِ اسلام سے قطع تعلق کیا ہے اوّل تو یہ خدا تعالیٰ کے حکم سے تھا، نہ اپنی طرف سے اور دوسرے وہ لوگ ریا پرستی اور طرح طرح کی خرابیوں میں حد سے بڑھ گئے ہیں اور اُن لوگوں کو اُن کی ایسی حالت کے ساتھ اپنی جماعت کے ساتھ ملانا یا اُن سے تعلق رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ عُمدہ اور تازہ دُودھ میں بگڑا ہُوا دُودھ ڈال دیں، جو سڑ گیا ہے اور اُس میں کیڑے پڑ گئے ہیں۔ اِس وجہ سے ہماری جماعت کسی طرح اُن سے تعلق نہیں رکھ سکتی اور نہ ہمیں ایسے تعلق کی حاجت ہے۔" [2]

ال احقر نے بڑے اختصار کے ساتھ مرزا غلام احمد قادیانی کے مخصوص نظریات اور ادی چند عنوانات کے تحت بغیر کسی خاص تبصرہ اور تہدید کے پیش کر دیے ہیں تاکہ مسلمانوں کو حضرات کی مضرت، اسلام دشمنی اور خارج عن الاسلام ہونے کا کسی قدر اندازہ ہو جائے۔ طرح گزشتہ سطور میں احقر نے رئیس المبتدعین مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی سے لے کر ودی صاحب اور پرویز صاحب تک کے مخصوص نظریات اختصار کے ساتھ پیش کر دیے ہیں۔ تا ہر ہے کہ میرا مقصد اُن کے متبعین کی خیر خواہی اور مسلمانوں کو اُن کے سراسر غیر اسلامی

---

[1] یان محمود احمد خلیفہ: انوارِ خلافت، ص ۹۰

[2] غلام احمد قادیانی: رسالہ تشحیذ الاذہان، جلد ۶، نمبر ۸، ص ۳۶

اور منافقانہ اندازِ فکر سے مطلع کرنا ہے۔ خدا کرے کہ یہ پراگندہ سطور کتنے ہی حضرات کی ہدایت کا باعث بن جائیں اور جو سُنّی مسلمان صلح کلیت کا لبادہ اوڑھے ہُوئے ہیں اور فرضی اتحاد و رواداری کا جنھیں ہیضہ ہو گیا ہے، ممکن ہے یہ سُرمہ اُن کی چشمِ بصیرت کے لیے مفید ثابت ہو جائے۔ ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ ط علیہ توکلت والیہ اُنیب ط وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہٖ سیّدنا و مولانا محمد و اٰلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔

خاکپائے علماء: محمد عبد الحکیم خاں مجددی مظہری
المعروف بہ اختر شاہجہانپوری
دار المصنفین لاہور

باب چہارم

شیاطینِ ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو
کہ ہو نخچیر کے دل میں بھی پیدا ذوقِ نخچیری

(اقبالؔ)

انگریز دوستی کی کہانی، انگریز دوستوں کی زبانی

قارئین کرام! گزشتہ صفحات میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ انگریزوں نے بعض علماء کو کس طرح خرید کر اپنے تخریبی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اسلام کا حلیہ بدلنے اور مسلمانوں کی مختلف ٹولیاں بنانے میں کس طرح اُن حضرات نے اسلام دشمن حکومت کا ہاتھ بٹایا۔ انگریزوں کے ساتھ اِس تخریب کاری میں متفق الرائے ہونے والے بعض علماء کی گزشتہ صفحات میں نشان دہی کی جا چکی ہے۔

بعض مبتدعین کے علماء و مورّخین بغض معاویہ ہیں یا اپنے اکابر کی انگریز دوستی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے علمائے اہلسنت کے بارے میں عوام کو چھلنے اور جہلاء میں اپنا بھرم بنائے رکھنے کی غرض سے مفروضات کا سہارا لے کر لکھ مارتے ہیں کہ اگر فلاں عالِم انگریزوں کا ایجنٹ نہیں تھا تو اُس نے ہمارے فلاں فلاں بزرگ کی تکفیر کیوں کی؟ یا چونکہ فلاں عالِم نے تحریکِ خلافت یا فلاں گاندھوی منصوبے کی حمایت نہیں کی تھی لہٰذا ثابت ہُوا کہ وہ مولوی انگریزوں کا ایجنٹ تھا۔ ایسے انصاف دشمن اور اسلامی تعلیمات سے نا آشنا حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ اِس طرح خلافِ دیانت لکھنا اور غلط تاثرات پھیلانا حقیقت کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ آخر خدا کے ولیوں اور مقبول بندوں سے بغض و عداوت رکھ کر، اللہ تعالیٰ سے لڑائی مول لینے میں دارین کی کون سی بھلائی کا راز پنہاں ہے؟

ایسے حاسدین اور انصاف کا خُون کرنے والے محققین کو معلوم ہونا چاہیے کہ حقیقت اور اصلیت کے میدان میں یہ اگر، مگر اور چونکہ، چنانچہ کے سہارے بے معنی اور فضول ہُوا کرتے ہیں۔ کیا کسی پر اتنا بڑا الزام صرف مفروضات کی بنا پر عائد کیا جا سکتا ہے؟ کیا فرضی مغالطوں میں بھی عقلاء کے نزدیک کوئی وزن ہُوا کرتا ہے؟ اگر مخالفین اہلسنّت اور مبتدعینِ زمانہ کے پاس علمائے اہلسنت کی انگریز دوستی کا ایک بھی ٹھوس اور یقینی ثبوت ہے تو بڑے شوق سے اُسے پیش کریں۔ لیکن یہ مدِّ نظر رہے کہ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُھَا

النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ ط اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ ۵ اگر ایک ثبوت بھی نہ لاسکو اور ہم کہے دیتے ہیں کہ ہرگز نہ لاسکو گے تو اُس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، وہ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ (نعوذ باللّٰہ من ذٰلک)

برٹش گورنمنٹ کے پروردہ علماء نے شریعتِ اسلامیہ کو غتربود کرنے کی جو کوششیں کی تھیں، قارئین گزشتہ باب میں ملاحظہ فرما چکے۔ اِن حضرات کی انگریز دوستی کے اگرچہ سیکڑوں بیانات پیشِ نظر ہیں لیکن بخوفِ طوالت مَا قَلَّ وَکَفٰی کے تحت چند حوالے پیشِ خدمت ہیں۔ وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْقِ۔

۱۔ سیّد احمد صاحب بریلوی

سید احمد صاحب (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) کا جب مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی سے معاملہ طے ہُوا تو آپ نواب امیر خاں پنڈاری کے ہاں جاکر ملازم ہو گئے۔ وہاں ۱۸۱۰ء سے ۱۸۱۶ء تک تقریباً سات سال رہے۔ اُن ایّام میں نواب امیر خاں کی پوزیشن کیا تھی؟ اِس بارے میں غلام رسول مہر یُوں لکھتے ہیں:

> "غرض امیر خاں آخری دور کے آزاد ہندوستانی امیروں میں سب سے بڑھ کر طاقتور تھا۔ ایک موقع پر اُس کے پاس چالیس ہزار جانباز جمع ہو گئے تھے اور ایک سو پندرہ توپیں تھیں۔ اتنی عظیم الشان قوت کو انگریز قلبِ ہند میں آزاد چھوڑنے کے روادار نہ ہو سکتے تھے، لیکن اُنھیں یہ حوصلہ بھی نہ تھا کہ امیر خاں سے کھلے میدان میں ٹکرائیں، اِس لیے کہ جانتے تھے، مَنچلا آدمی ہے، مقابلے پر ڈٹ جائے گا تو ممکن ہے دُوسری ملکی قوتیں بھی جو بظاہر دب گئی تھیں، اُبھر آئیں اور ہمیں بستر بوریا سنبھال کر ہندوستان سے نکل جانا پڑے۔ وُہ امیر خاں سے ٹکراتے نہیں، لیکن جو عناصر اُس کے لیے کُمک دیا وری کا سرچشمہ بن سکتے تھے اُنھیں ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ توڑتے رہے یہاں تک کہ اُس کی فوج میں بھی انگریزی ریشہ دوانیاں خاصی پھیل گئیں۔"[1]

---

[1] غلام رسول مہر: سیّد احمد شہید، بار سوم، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء، ص ۹۱، ۹۲

جب نواب امیر خاں انگریزوں کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا تو دِلوں کو دِلوں سے راہ ہوتی ہے، اُن دنوں سیّد صاحب کو بھی مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح الہام ہو رہا تھا۔ کس بات کا الہام ہو رہا تھا؟ مہر صاحب بتاتے ہیں :

> "خود سیّد صاحب کا بیان ہے کہ غیبی اشاروں کی بِنا پر وُہ نواب صاحب کے لشکر میں گئے تھے۔ وقائع میں ہے کہ جب وہ لشکر میں تھے تو ایک روز فرمایا:
>
> "قصبہ رائے بریلی میں مجھ کو جنابِ الٰہی سے الہام ہُوا کہ یہاں سے نواب نامدار امیر الدولہ بہادر کے لشکر میں جا اور وہاں کی خدمت ہم نے تجھ کو دی، وہاں ہم کو تجھ سے کچھ اور کام بھی لینے ہیں۔ یہ مژدہ غیبی سُن کر مَیں وہاں سے روانہ ہُوا۔ چند روز میں آ کر ملازمت نواب صاحب ممدوح کی حاصل کی۔" [1]

نیز منظورہ صفحہ ۲۳ کے حوالے سے موصوف یُوں رقمطراز ہیں :

> "از زمانیکہ حضرت امیر المومنین —— بنا بر الہامیکہ درباب اقامتِ جہاد می شد، راہگرائے لشکر ظفر اثر —— امیر الدولہ نواب امیر خاں بہادر مرحوم شدند۔" جس زمانے میں حضرت امیر المؤمنین اقامتِ جہاد کے متعلق غیبی اشاروں کی بنا پر امیر الدولہ نواب امیر خاں مرحوم کے لشکر ظفر اثر کی جانب روانہ ہُوئے۔" [2]

شاید کسی کے دِل میں یہ خیال گزرے کہ شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے سیّد صاحب نے نواب موصوف کی فوج میں بھرتی ہونے کا ارادہ کیا تھا، کیونکہ وہ پیر و مرشد تھے، جناب غلام رسول مہر اِس خیال کے حق میں نہیں ہیں۔ اِن کی تحقیق یہی ہے کہ شاہ صاحب کا اِس معاملہ میں کوئی دخل نہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

> "جو کچھ اُوپر بیان ہُوا ہے اُس سے صاف آشکارا ہے کہ سیّد صاحب نے بطور خود یہ فیصلہ فرمایا، شاہ صاحب کے امر و حکم کو اِس اقدام سے کوئی تعلق

---

[1] غلام رسول مہر: سیّد احمد شہید، بار سوم، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء، ص ۸۷

[2] ایضاً : ص ۸۷

نہ تھا۔ انھیں رائے بریلی ہی میں غیبی اشارہ ہُوا کہ نواب کے پاس جاؤ، چنانچہ وُہ نکل پڑے اور دہلی ہوتے ہُوئے راجپوتانہ پہنچ گئے۔“ [1]

نواب کی فوج میں بھرتی ہونے کے بارے میں مرزا حیرت دہلوی یُوں رقمطراز ہیں:

> ”جب سیّد صاحب نے سواروں میں نام لکھوایا ہے تو آپ امیر خاں کے آگے پیش کیے گئے۔ وُہ دیکھ کے بہت خوش ہُوا اور اُس نے یہ کہا، اگر اپنی جان کھپا کے محنت کی اور اپنی جوانمردی کے جوہر دکھائے تو میں آپ کو ایک ہزار فوج کا افسر بنا دُوں گا۔“ [2]

سید صاحب نے الہام کی ہدایات کے مطابق خُوب اپنی جوانمردی کے جوہر دکھائے تاکہ نواب کا اعتماد حاصل کر لیا جائے۔ ساتھ ہی نواب موصوف کی خیر خواہی کا پوری طرح دم بھرتے رہے۔ آخر کار منزلِ مقصود ہاتھ آ گئی۔ یعنی:

> ”جب پے درپے یہ باتیں سیّد احمد صاحب سے ظہور پذیر ہُوئیں، پھر تو امیر خاں نے اپنا مشیر مقرر کر لیا اور کوئی کام بغیر آپ کے مشورہ نہ کرتا تھا۔ ساتھ ہی اِن کامیابیوں کے جو سیّد صاحب کو حاصل ہُوئیں، یہ خوشی سے دیکھا جاتا ہے کہ آپ نے اِس ترقی پر بھی اپنے فرائض کے انجام دینے سے (جو الہام کے ذریعے تفویض ہُوئے تھے) پہلو تہی نہ کی۔“ [3]

سیّد صاحب نے نواب کے پاس کِس قسم کے اکلِ حلال سے ولایتِ انبیاء کی منازل طے کی تھیں۔ اِس حقیقت کے چہرے سے مرزا حیرت دہلوی نے یُوں نقاب اٹھا کر حقیقت کو واضح کیا ہُوا ہے:

> ”امیر خاں کے لشکر کی کوئی باقاعدہ تنخواہ نہ تھی۔ کسی ریاست پر چھاپہ مارا،

---

[1] غلام رسول مہر: سیّد احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم، ۱۹۶۸ء، ص ۹۳

[2] مرزا حیرت دہلوی: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۵۹

[3] ایضاً: ص ۳۵۹

اگر وہاں سے کچھ ہاتھ لگ گیا تو باہم تقسیم ہو گیا نہ ہاتھ لگا لشکر میں فاقہ کشی ہو رہی ہے، لٹیروں کی سی کیفیت تھی۔ کبھی جے پور پر حملہ کر کے یہاں زلزلہ ڈال دیا اور کبھی جودھ پور پر جا دوڑا وہاں ایک ہلکم مچادی۔۔۔۔۔ امیر خاں کے سپاہیوں کی زندگی جس قدر خطرناک تھی اُسی قدر چاق وچست اور شمشیر زنی میں بسر ہوتی تھی، جو سپاہیانہ قالب کی سچی رُوح ہے۔'' [1]

"سید احمد صاحب تقریباً سات برس تک امیر خاں کی ملازمت میں رہے۔ اس عرصہ میں آپ کو بارہا مختلف جنگوں میں جانے اور توپ و بندوق و تلوار سے کام لینے کا موقع پڑا ہوگا۔ کہیں کسی کے ساتھ آپ نے حملہ کیا ہوگا تو کہیں سرکش گاؤں کو لوٹا کھسوٹا ہوگا۔ غرض ساری ہی باتیں جن سے جنگ و غارت تعبیر ہو سکتی ہے عمل میں آئی ہوں گی۔'' [2]

سید احمد صاحب کو نواب امیر خاں کے پاس جانے اور اُس کی فوج میں بھرتی ہونے کا الہام کیوں ہوا تھا اور کس کی طرف سے ہوا تھا؟ اِس سوال کا جواب موصوف کی کارگزاری میں ہی مل سکتا ہے کہ اُن کا مشن کیا تھا، اور کب انھوں نے اپنے فرضِ منصبی کو پُورا کر کے نواب کو خیرباد کہا۔ مولوی محمد جعفر اِس سلسلے میں یُوں لکھتے ہیں:

"ایک روز کا ذکر ہے کہ لشکرِ نواب امیر خاں مرحوم انگریزوں کے لشکر سے لڑ رہا تھا۔ دونوں طرف سے توپ اور بندوقیں چل رہی تھیں۔ اُس وقت سید صاحب اپنے خیمے میں تشریف رکھتے تھے۔ آپ نے اپنا گھوڑا تیار کروایا اور اُس پر سوار ہو کر مثل ہوا کے دونوں لشکروں کو چیرتے ہوئے اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں انگریزی فوج کا سپہ سالار مع اپنے مصاحبوں کے کھڑا تھا۔ پس وہاں سے اُس سپہ سالار کو ساتھ لے کر پھر دونوں لشکروں کو چیرتے ہوئے

---

[1] حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۰۲ء، ص ۳۵۸، ۳۵۹

[2] ایضاً: ص ۳۶۲

> اپنے خیمے تک چلے آئے۔ یہاں آکر تھوڑی سی بات چیت کے بعد سپہ سالار مذکور نے عہد کر لیا کہ میں اِسی دم اپنے لشکر کو مقابلۂ نواب امیر خاں سے واپس لے جاؤں گا اور پھر مقابلہ کو نہ آؤں گا، بلکہ جہاں تک ممکن ہوگا اپنی سرکار کو اِس بات پر مجبور کروں گا کہ نواب امیرخاں سے صلح کرلے۔ اِس واقعہ کے بعد پھر سرکار انگریزی اور نواب امیر خاں میں جنگ نہیں ہُوئی بلکہ صلح کی بات چیت اور رُسل و رسائل شروع ہوگئے اور لارڈ ہیسٹنگ صاحب بہادر وائسرائے ہند کے عہد میں ٹونک کا ملک نواب صاحب کو دے کر صلح کی گئی۔"[1]

یہ تھا سیّد احمد صاحب کا مشن کہ نواب امیرخاں کا اعتماد پورے طور پر حاصل کر کے انگریزوں کے حق میں فضا ہموار کرتے اور نواب کی جڑیں کاٹتے رہے۔ عین مقابلہ کے وقت ظاہر ہُوئے کہ انگریزی فوج میں بھی صحنِ خانہ کی طرح دندناتے پھر رہے تھے اور کسی نے روکنے ٹوکنے کی ضرورت تک نہ سمجھی۔ امیرخاں کی آنکھیں کُھلیں لیکن اُس وقت جب چڑیاں کھیت چُگ گئی تھیں۔ مجبوراً صُلح پر آمادہ ہونا پڑا۔ تھانیسری صاحب آگے یُوں تصریح کرتے ہیں:

> "ابھی صُلح کی بات چیت طے نہیں ہُوئی تھی کہ سیّد صاحبؒ سات برس کے قیام کے بعد پھر لشکر نواب امیرخاں سے جُدا ہو کر دوبارہ ۱۸۱۶ء میں دہلی تشریف لے گئے...... اپنے چلنے کے وقت آپ نے یہ پیشین گوئی کی تھی، جس کو نواب وزیرالدولہ مرحوم (ابنِ نواب امیرخاں) اپنے وصایا وزیری میں اِس طرح لکھتے ہیں کہ سیّد صاحبؒ نے مولوی نذر محمد صاحب سے کہ وُہ بھی اِس لشکر میں موجود تھے اپنے رخصت ہونے کے وقت فرمایا تھا کہ "اب جلد صلح ہو جائے گی اور فلاں فلاں شہر اور فلاں فلاں علاقہ سرکار انگریزی نواب صاحب کو دے دے گی اور ایک زمانۂ دراز گزرنے کے بعد انشاءاللہ تعالیٰ میں بھی ایک لشکر مجاہدین کا ساتھ لے کر نشانوں کے پھریرے اڑاتا ہُوا نواب

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیات سیداحمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۱۷

امیر خاں صاحب کے ملک سے گزروں گا۔“ اِس پیشین گوئی کے ذکر کرنے کے بعد نواب وزیر الدولہ مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ ”موافق اِس پیشین گوئی کے جو جو شہر اور ممالک آپ نے بتلائے تھے، ٹھیک وہی سرکار انگریزی نے ہم کو دئے اور صلح ہوگئی۔“ [1]

موصوف کا بیان چونکہ نواب وزیر الدولہ ابن نواب امیر خاں کی کتاب ”وصایا وزیری“ کے حوالے سے ماخوذ اور مدلل ہے لہٰذا قابلِ تقسیم ہونے میں کیا شک و شبہ رہا؟ مذکورہ اقتباس کی روشنی میں یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ سید احمد صاحب جو پیشگوئیاں کر رہے تھے اور موصوف پر جو الہامات کی بارش ہو رہی تھی اس کا معدن و مصدر برٹش گورنمنٹ ہی معلوم ہوتی ہے جیساکہ مذکورہ حوالوں کی روشنی میں ہر منصف مزاج نتیجہ اخذ کر سکتا ہے۔ مزید تسلی کے لیے مرزا حیرت دہلوی کی تصدیق بھی قابلِ غور ہے موصوف لکھتے ہیں:

> ”آخر کار ایک بڑے مشورہ کے بعد سید احمد صاحب کی کارگزاری سے ہر ریاست میں سے کچھ کچھ حصہ دے کر امیر خاں سے معاہدہ کر لیا، جیسے جے پور سے ٹونک دلوایا اور بھوپال سے سرونج، اِسی طرح مختلف پرگنے مختلف ریاستوں سے بڑی قیل و قال کے بعد انگریزوں نے دِلوا کے بپھرے ہوئے شیر کو اِس حکمت سے پنجرہ میں بند کر دیا۔“ [2]

اِس سلسلے میں مرزا حیرت دہلوی نے بھی لگی لپٹی رکھے بغیر صورتِ حال بیان کی۔ مذکورہ حوالہ میں بعض جگہ چونکہ اجمال سے کام لیا گیا ہے لہٰذا ان باتوں کی تفصیل کے لیے موصوف کا مندرجہ ذیل بیان کافی ہوگا:

> ”۱۲۳۱ھ تک سید احمد صاحب امیر خاں کی ملازمت میں رہے، مگر ایک ناموری کا کام آپ نے یہ کیا کہ انگریزوں اور امیر خاں کی صُلح کرا دی اور آپ ہی کے ذریعہ سے جو شہر بعد ازاں دئے گئے اور جن پر آج تک امیر خاں کی اولاد حکمرانی کرتی ہے دینے طے پائے تھے۔ لارڈ ہیسٹنگ سر سید احمد صاحب کی بے نظیر کارگزاری سے

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۷۱، ۷۲

[2] حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۶۱، ۳۶۲

> بہت خوش تھا۔ دونوں لشکروں کے بیچ میں ایک خیمہ کھڑا کیا گیا اور اُس میں تین آدمیوں کا باہم معاہدہ ہُوا، امیر خاں، لارڈ ہیسٹنگز اور سیّد احمد صاحب۔ سید احمد صاحب نے امیر خاں کو بڑی مشکل سے شیشہ میں اُتارا تھا۔ آپ نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ انگریزوں سے مقابلہ کرنا اور لڑنا بھڑنا اگر تمھارے لیے بُرا نہیں ہے تو تمھاری اولاد کے لیے سمِ قاتل کا اثر رکھتا ہے۔ انگریزوں کی قوت دن بدن ترقی پذیر ہے اور تمام قومیں پے درپے تنزل کرتی جاتی ہیں۔ تمھارے بعد فوج کو کون سنبھالے گا اور عظیم الشان لشکر انگلشیہ کے مقابلے میں کون میدانِ جنگ میں لا کے جمائے گا۔ یہ باتیں امیر خاں کی سمجھ میں آ گئی تھیں اور اب وہ اِس بات پر رضامند تھا کہ گزارہ کے لیے کچھ ملک مجھے دے دیا جائے تو میں بآرام بیٹھوں۔"[1]

سید صاحب کو جو نواب امیر خاں کے پاس جانے اور وہاں اپنی کارگزاری دکھانے کا الہام ہوا تھا۔ موصوف نے اُس پر عمل کرنے کی غرض سے لوٹ مار، قتل و قتال اور فساد و دہشت انگیزی وغیرہ کسی چیز کو بھی وہاں قابلِ نفرت نہ سمجھا اور نیز لوٹ مار اور جبر و استبداد سے حاصل کیے ہوئے مال کو اکلِ حلال کے درجے سے ذرا بھی گِرا ہُوا نہ گردانا کیونکہ اُن دنوں سیّد صاحب اُن کے معتقدوں اور سوانح نگاروں کے مقدّر سے ولایتِ انبیاء کی منازل کو سُبک رفتاری سے طے کر رہے تھے۔ جب سات سالہ محنتِ شاقہ اور سعیِ پیہم کے باعث سید صاحب منزلِ مقصود پر پہنچ گئے، نواب امیر خاں کو شیشہ میں اُتار لیا، اُس بھپرے ہُوئے شیر کو انگریزوں کے پنجرے میں بند کروا دیا اور اِس طرح اپنے مُلہِم (لارڈ ہیسٹنگ) کو اپنی اِس بے نظیر کارگزاری سے خُوب خوش کر لیا تو موصوف انتہائی احترام کے مستحق قرار پا گئے۔ چنانچہ خاندانِ سید صاحب کے چشم و چراغ، مولوی سیّد ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں کہ:

> "قلعۂ الٰہ آباد میں جو مسلمان سپاہی مختلف خدمات پر متعین تھے اور تین سَو کی تعداد میں تھے اُنھوں نے انگریز قلعہ دار کی اجازت سے حضرت (سیّد صاحب) کو

---

[1] حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۶۱

قلعہ میں تشریف لانے کی زحمت دی۔ شہ نشین پر جو سلاطینِ سابق کی تخت گاہ تھی، آپ کو بٹھایا اور بڑے خلوص و اعتقاد کے ساتھ بیعت کی۔"[1]

چونکہ سید صاحب سکھوں سے لڑنے کی تیاریاں کرنے والے تھے۔ اِس لیے بطورِ شکریہ انگریزوں نے بھی موصوف کے راستوں میں دیدہ و دِل فرشِ راہ کیے ہوئے تھے۔ سید صاحب بھی انگریزوں کی اس عقیدت کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے اور حتی الامکان کسی عام انگریز کو بھی مایوس نہیں کرتے تھے مثلاً:

> "جہاں آباد سے آگے ایک مقام اوجھنی میں ہوا۔ وہاں کے زمیندار شیخ لعل محمد نے دعوت کی اور سیکڑوں آدمی مرید ہوئے۔ آگے بڑھے تو راستے میں ایک انگریز کی مسلمان بیوی نے دعوت کی غرض سے روکا۔ سید صاحب نے اُس کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر انگریز خود آیا اور عرض کی کہ اُس کی دعوت نہ مانیے لیکن میری دعوت قبول کر لینے میں تو تکلف نہ ہونا چاہیے۔ آپ نے انگریز کی دعوت قبول کر لی۔"[2]

گریزوں کے اِسی ہدیۂ تشکر کی کہانی جناب غلام رسول مہر کی زبانی مزید پیشِ خدمت ہے:

> "صبح کو ڈگڈگی سے روانہ ہوئے۔ شام ہو گئی تو ملاحوں نے ایسی جگہ کشتیاں باندھیں، جہاں آس پاس کوئی بستی نظر نہیں آتی تھی۔ دریا کے کنارے کی زمین دُور دُور تک اِس درجہ خراب تھی کہ کھانا پکانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اِس اثنا میں کالی گھٹا اُٹھی، تیز ہوا چلنے لگی اور قطرہ افشانی شروع ہو گئی۔ سب نے سمجھ لیا کہ رات کھائے بغیر گزارنی ہو گی۔ اچانک دُور مشعلیں نظر آئیں۔ سمجھا گیا کہ کچھ لوگ کشتیوں کی طرف آ رہے ہیں۔ پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ نیل کے انگریز تاجر نے اپنے مسلمان کارکنوں کے پاسِ خاطر سے پلاؤ کی دیگیں پکوا کر بھیجی ہیں اور خود گھوڑے پر ساتھ آیا ہے۔"[3]

---

[1] ابوالحسن علی ندوی: سیرت سید احمد شہید، جلد اول، ص ۱۹۶

[2] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۱۹۰

[3] ایضاً: ۱۸۹

جب دعوتوں کا تذکرہ ہی شروع ہو گیا تو مولوی محمد جعفر تھانیسری کی زبانی بھی ایک عقیدت مندی کی اِس سے بھی عظیم الشان دعوت کا بیان سُن لیا جائے۔ چنانچہ موصوف یُوں وضاحت فرماتے ہیں:

"جب وہ مشعلیں کنارے کے نزدیک پہنچیں تو دیکھا کہ ایک انگریز گھوڑے پر سوار مختلف قسم کا بہت سا کھانا ساتھ لیے چلا آتا ہے۔ اُس نے کشتی کے نزدیک آکر پُوچھا: پادری صاحب کہاں ہیں؟ جب حضرت نے کشتی میں سے جواب دیا تو وُہ گھوڑے سے اُتر کر اور اپنی ٹوپی سر سے اتار کر بہت ادب سے حضرت کے سامنے کشتی میں آیا۔ بعد سلام و مزاج پُرسی کے عرض کیا کہ تین روز سے میں نے حضور کی تشریف آوری کی خبر لانے کے لیے نوکر اس طرف متعین کر رکھے تھے، سو آج اُنھوں نے مجھ کو خبر دی، لہٰذا یہ ماحضر، حضور اور کل قافلے کے لیے تیار کر کے لایا ہُوں، براہِ بندہ نوازی اِس کو قبول فرمائیں۔ حضرت نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ فوراً وُہ کھانا اپنے برتنوں میں لے کر قافلے میں تقسیم کر دو۔ تقریباً دو گھڑی تک وُہ انگریز حضور میں حاضر رہا، پھر رخصت لے کر مع اپنے آدمیوں کے واپس چلا گیا۔"[1]

دعوتوں کے یہ واقعات بتا رہے ہیں کہ سیّد احمد صاحب اِس تیاریٔ جنگ کے سلسلے میں جب تک ہندوستان میں رہے تو انگریز وقتاً فوقتاً اِس قسم کی ناز برداری کرتے رہے اور جب اپنی جمعیت کو لے کر منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہُوئے تو راستے میں خبر گیری کا بھی حکومت نے انتظام کیا ہُوا تھا۔ اِس قافلے کی مذکورہ ضیافت کے واقعے کو سیّد ابوالحسن علی ندوی نے اِن لفظوں میں بیان کیا ہے:

"اِتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ انگریز گھوڑے پر سوار چند پالکیوں میں کھانا رکھے کشتی کے قریب آیا اور پُوچھا کہ پادری صاحب کہاں ہیں؟ حضرت نے کشتی پر سے جواب دیا کہ میں یہاں موجود ہُوں۔ انگریز گھوڑے پر سے اُترا اور ٹوپی ہاتھ میں

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیات سیّد احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۱

لیے کشتی پر پہنچا اور مزاج پُرسی کے بعد کہا کہ تین روز سے مَیں نے اپنے ملازم یہاں کھڑے کر دیئے تھے کہ آپ کی اطلاع کریں۔ آج اُنھوں نے اطلاع کی کہ اغلب یہ ہے کہ حضرت قافلہ کے ساتھ تمھارے مکان کے سامنے پہنچیں۔ یہ اطلاع پاکر غروب آفتاب تک میں کھانے کی تیاری میں مشغول رہا۔ تیار کرانے کے بعد لایا ہُوں۔ سیّد صاحب نے حکم دیا کہ کھانا اپنے برتنوں میں منتقل کر لیا جائے، کھانا لے کر قافلے میں تقسیم کر دیا گیا اور انگریز دو تین گھنٹہ ٹھیر کر چلا گیا۔"[1]

جب انفرادی دعوت سے کھانے کی بھری ہُوئی چند پالکیوں اور پلاؤ زردے تک بات آگئی تو اب پُورے قافلے کی اُن عظیم الشان دعوتوں کا تذکرہ بھی کیوں نہ کر ہی دیا جائے جن کی نظیر چشمِ فلکِ کُہن نے اُس وقت سے پہلے یا اُس وقت سے لے کر اب تک، برِّصغیر پاک و ہند کی زمین پر نہ دیکھی ہوگی۔ ضیافت اور دعوت پر ہی کیا منحصر؛ معلوم یہی ہوتا ہے کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اَور دکھانے کے اَور بظاہر تو منتظم فلاں ابن فلاں نظر آرہے تھے لیکن اندرونِ خانہ حکومت ہی سب کچھ کر رہی تھی۔ خُوب کھِلا پلا کر، ہر طرح آراستہ و پیراستہ کر کے، قُربانی کے بکرے بنا کر، اپنے اقتدار کی بلائیں اتارنے کے لیے بالاکوٹ میں بھینٹ چڑھانے کے لیے بھیجا جا رہا تھا۔ یہ حضرات اِن نازبرداریوں میں ایسے مست ہُوئے کہ جاموں میں پھُولے نہ سماتے۔ ؎

مچھلی نے ڈِھیل پائی ہے لقمے پہ شاد ہے
صیّاد مطمئن ہے کہ کانٹا نِگل گئی

سیّد صاحب کے اِس قافلے کی الٰہ آباد میں کس طرح ضیافتیں ہُوئیں، کس قدر سامان امداد کے طور پر دیا گیا، یہ موصوف کے نامور سوانح نگار جناب غلام رسول مہرؔ کی زبانی پیشِ خدمت ہے:

"شیخ غلام علی نے ہر ایک سے کہہ دیا تھا کہ دورانِ قیامِ الٰہ آباد میں کوئی صاحب سیّد صاحب کو کھانے کی تکلیف نہ دیں۔ یہ احسان صرف میرے ذمّے رہنے دیا جائے۔

---

[1] ابوالحسن علی ندوی: سیرت سید احمد شہید، جلد اوّل، ص ۱۹۰

ہاں اپنے مکان پر لے جا کر پان کھلائیں، عطر لگائیں، نذریں پیش کریں، کھانا نہ کھلائیں۔ چنانچہ سید صاحب جب تک الٰہ آباد میں ٹھہرے رہے پورے قافلے کی مہمان داری شیخ غلام علی نے فرمائی اور کس شان و اہتمام کے ساتھ، آج اُس کی تفصیلات سُن کر شاید اکثر لوگ سمجھیں گے کہ خیالی افسانہ بیان ہو رہا ہے حالانکہ شیخ صاحب نے تواضع اور مدارات کا جو نمونہ پیش کیا اُس کی محض سرسری کیفیت ہم تک پہنچ سکی ہے۔

شیخ صاحب مہاراجہ اودت نرائن والیِ بنارس کے مختار تھے۔ اُنھوں نے سید صاحب کو ایک کوٹھی میں ٹھہرایا۔ باقی قافلے کے لیے مہاراجہ کی بارہ دری خالی کرائی۔ پورے قافلے کے لیے دونوں وقت کا کھانا قیام گاہوں پر پہنچ جاتا تھا اور کیسا کھانا؟ ایک ایک وقت میں کئی کئی چیزیں تیار ہو کر آتیں مثلاً قورمہ، پلاؤ، زردہ، شیرمال، تازہ مٹھائی، خمیری روٹیاں۔ اُس وقت تک ساتھیوں کی تعداد ساڑھے سات سو ہو چکی تھی لیکن شیخ صاحب کے تکلّف میں کوئی کمی نہ آئی۔ اندازہ کیا گیا کہ کم از کم ایک ہزار روپے روزانہ کھانے پر صرف ہوتے تھے اور یہ اُس زمانے کا خرچ ہے جب جنسیں بیحد ارزاں تھیں۔

شیخ صاحب دن میں دو مرتبہ سید صاحب سے ملنے کے لیے آتے۔ ایک مرتبہ بعد نماز ظہر، دوسری مرتبہ بعد نماز مغرب۔ دونوں مرتبہ بیش بہا نذریں ساتھ لاتے مثلاً نہایت قیمتی پارچے، عمدہ بندوقیں، پستول اور تلواریں، بعض اوقات نقد روپیہ لے آتے۔ واقف کار اصحاب کا اندازہ ہے کہ بارہ پندرہ روز کے قیام میں شیخ صاحب نے اِس طریق پر جو نذریں پیش کیں، وہ بحیثیت مجموعی بیس ہزار سے کم نہ ہوں گی......

اِسی دوران میں شیخ صاحب نے ایک بڑا خیمہ اور بارہ چھوٹے خیمے نئے تیار کرا کے پیش کیے کہ سفر میں کام آئیں گے۔ قافلے کے ہر فرد کو ایک ایک

جوڑی نئے جوتے، مردوں کو دو دو پاجامے، دو دو انگرکھے، دو دو ٹوپیاں اور ایک ایک چادر۔ مستورات کو دو دو پاجامے، دو دو کُرتے اور دو دو دوپٹے دیئے۔ سب کو سرِ عام ایک ایک روپیہ دیا۔ سید صاحب کے اقربا کی خدمت میں دس دس روپے فی کس پیش کیے۔ علماء کی خدمت میں اُن کی حیثیت و مرتبہ کے مطابق نذریں گزرانیں۔

سید صاحب کے لیے روزانہ پانچ سو روپے یا کسی وقت کم یا زیادہ لے کر آتے۔ دونوں وقت کھانے کے ساتھ ایک سو چالیس روپے بھجواتے۔ ایک روز سید صاحب کی دونوں بیبیوں کو اسّی اسّی روپے دیئے گئے۔ لُطف یہ کہ جب نذریں پیش کرتے تو بڑے ہی انکسار سے تہی دستی کا اظہار فرماتے۔

رخصت کے وقت سید صاحب کی خدمت میں جو سامان لائے وہ بیس پچیس کشتیوں میں لگا ہُوا تھا۔ اُس میں مشروع، کمخواب، پشمینے، نینو، ڈھاکے کی ململ، محمودی، بنارسی اطلس وغیرہ کے تھان بھی تھے اور کشمیری شال بھی۔ اِن کے علاوہ ساڑھے چار ہزار روپے نقد تھے۔ دو نہایت خوبصورت مُطلّا اور مُذہّب قرآنِ مجید نذر کیے۔ ایک مکہ معظمہ کے لیے اور دوسرا مدینہ منورہ کے لیے۔ تمام اہلِ قافلہ کے لیے نو نو دس دس ہاتھ لمبے جامہ ہائے احرام تھے، جن میں ایک سو بیس تھان صرف ہُوئے۔ دو سو چالیس تھان گاڑھے کے اِن کے علاوہ تھے، تاکہ متفرق ضروریات میں کام آئیں۔" [1]

اس کے بعد قیامِ کلکتہ کے دوران منشی امین الدین نے اِس قافلے کی جو خاطر و مدارات کی یا اُن کے ریعے کسی نے کروائی اُس کا تذکرہ پہلے مولوی محمد جعفر تھانیسری کے لفظوں میں ملاحظہ فرما لیا جائے، لکھتے ہیں:

---

[1] لام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۱۹۰ - ۱۹۲

"اُس وقت منشی امین الدین صاحب وکیلِ سرکار جو کلکتہ کے مسلم رؤسا میں تھے مع بہت سے عمائد ساکنانِ کلکتہ کے خدمت شریف میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کلکتہ میں قیام تک اِس خاکسار کے غریب خانہ میں مقیم رہیں اور جو نان و نمک میسّر ہوں قبول فرمائیں۔ حضرت نے اُن کی درخواست کو قبول کر لیا۔ اِس کے تھوڑی دیر بعد اور بہت سے شریف و نجیب کلکتہ کے وہاں پہنچے اور حضرت کو اپنے اپنے مکانات کو لے جانا چاہا۔ مگر چونکہ حضرت نے منشی امین الدین سے وعدہ کر لیا تھا، اِس واسطے اُن کی درخواست کو منظور نہ فرمایا۔ نماز مغرب کے بعد اوّل حضرت بہ سواری پالکی منشی امین الدین کے مکان کو تشریف لے گئے اور پھر منشی صاحب نے ہر قسم کی سواریاں بھیج کر آدھی رات تک سارے قافلے کو اپنے مکان میں پہنچا دیا۔

ایک عمدہ باغ میں قافلے کا ڈیرہ کرایا گیا۔ رات کو نہایت عمدہ اور پُر تکلف کھانا منشی صاحب کے یہاں سے آیا اور بافراغت سارے قافلے نے سیر ہو کر کھایا۔ صبح کو منشی صاحب نے سارے قافلے کے واسطے جُوتے خرید کر ہر ایک کو تقسیم کر دئے۔ جس کے پاس کپڑا نہ رہا تھا اُس کو کپڑا بنوا دیا۔ لیکن اِس تاریخ سے سید صاحب کو اِس مکان میں اُتار کر جو منشی امین الدین صاحب رخصت ہُوئے پھر آ کر اُنھوں نے کبھی مُنہ نہ دکھلایا، اگرچہ دونوں وقت اُن کے یہاں سے سارے قافلے کو کھانا آتا تھا اور اُن کے آدمی ہر وقت خدمت کے واسطے موجود رہتے تھے، مگر وُہ خود کبھی نہ آئے۔ اِسی طرح تقریباً ایک ماہ گزر گیا۔"[1]

برٹش گورنمنٹ کے اِس سرکاری وکیل یعنی منشی امین الدین نے سیّد احمد صاحب اور اُن کے قافلے کی جس طرح خاطر مدارات کی اُس کا نقشہ جناب غلام رسول مہر نے اپنی مؤرخانہ شان

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیات سیّد احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۶

کے ساتھ یوں کھینچا ہے :

"منشی صاحب نے دریا کے کنارے بہت بڑی دری بچھوا دی تھی اور ہر قسم کی سواریاں بکثرت منگا لی تھیں مثلاً پینس ، ڈولیاں ، بگھیاں ، کرانچیاں ، ہوادار وغیرہ ۔ بار برداری کے لیے چھکڑے موجود تھے ۔ مزدور بھی خاصی تعداد میں جمع تھے ۔ پہلے مستورات کو پردہ کر کے اتارا گیا اور قیام گاہ پر بھیج دیا ۔ پھر مرد سوار ہوئے ۔ سواریاں اتنی زیادہ تھیں کہ بہت سی خالی واپس کرنی پڑیں ۔ منشی صاحب سیّد صاحب کو پینس میں سوار کرا کے پہلے اپنے مکان پر لے گئے ، پھر قیامگاہ پر پہنچایا ، جہاں تمام کمرے فرش سے آراستہ تھے اور ہر کمرے میں ضرورت کے مطابق پلنگ بچھے ہوئے تھے ۔ متعدد اکابر نے بھی اپنے اپنے ہاں ٹھیرنے کی درخواست کی ، لیکن سیّد صاحب نے فرمایا کہ منشی امین الدین احمد کے ساتھ اقرار ہو چکا ہے اِس لیے معذور ہوں ، البتہ دعوت قبول کرُوں گا ۔

تین روز تک منشی صاحب کے ہاں سے نہایت پُر تکلف کھانے آتے رہے ، مثلاً قورمہ ، شیرمال ، باقرخانیاں ، ماہی پلاؤ ، بکرے کا پلاؤ ، کئی قسم کے مربّے اور اچار ، کئی قسم کے میٹھے ، سیّد صاحب کے لیے جو کھانا آتا اُس میں اور بھی کئی قسمیں ہوتیں ۔ تیسرے روز آپ نے فرمایا کہ ہمارے لیے صرف ایک قسم کا کھانا آتے ، انواع و اقسام کے کھانے کو اہلِ قافلہ میں تقسیم کرنا بھی مشکل ہے اور ہم لوگ تکلفات کو اچھا بھی نہیں سمجھتے ۔ منشی صاحب نے سمجھا کہ شاید کھانا اچھا نہیں ہوتا اِس لیے تکلفات میں مزید اہتمام و اضافہ کر دیا ۔"[1]

موصوف نے منشی امین الدین صاحب کی فیاضی یا اُن کے حاکموں کی ذرّہ نوازی کو مزید یوں بیان کیا ہے :

---

[1] غلام رسول مہر : سید احمد شہید ، مطبوعہ لاہور ، بار سوم ، ۱۹۶۸ء ، ۲۰۷

"منشی صاحب نے پورا باغ سید صاحب کی نذر کر دیا تھا۔ اُس میں نارنگی ، چکوترے ، سنگترے ، کیلے ، انجیر ، انار ، امرود ، ناریل ، آم وغیرہ کے درخت تھے۔ انگور کی بیلیں بھی تھیں ، اناناس بھی تھے۔ سید صاحب کے رفیقوں کی تقویٰ شعاری کا یہ عالم تھا کہ خود پھل توڑنا ایک طرف ، جو پھل درختوں سے خود بخود گر جاتے اُنھیں بھی کوئی نہ اُٹھاتا۔ ایسے تمام پھل سید صاحب کے پاس جمع ہو جاتے ، آپ پورے قافلے میں تقسیم فرما دیتے۔ قافلے کے بعض افراد کے جوتے ٹوٹ گئے تھے" "مخزن احمدی" سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی امین الدین احمد نے پہلے ہی دن ضرورت مندوں کو تین سو روپے کے جوتے اور ایک ہزار سے زیادہ کے کپڑے خرید دیے۔"[1]

یہ منشی امین الدین کون تھے اور اِن کا کاروبار کیا تھا؟ اِن کا انگریزوں سے کوئی تعلق دُور یا نزدیک کا تھا یا نہیں ؟ اِن جملہ امور کی وضاحت سید احمد صاحب کے عاشقِ زار اور وہابی بڑے کے مورخ نامدار عالی جناب غلام رسول مہر نے یوں دادِ تحقیق دیتے ہوئے ، فرمائی ہے:

> "اُس مقام پر کلکتہ سے ایک تیز رفتار کشتی میں جسے پنیش کہتے تھے ایک صاحب آئے اور سید صاحب سے ملے۔ نام پوچھا تو بتایا ، امین الدین۔ یہ منشی امین الدین احمد تھے جو بنگال کے اُونچے گھرانے کے فرد تھے اور کلکتہ کے ممتاز امیروں میں گنے جاتے تھے۔ انگریزی کمپنی میں اِنھیں وکالت کا عہدہ حاصل تھا اور کمپنی کے پورے ہندوستانی علاقوں میں سے جتنے مقدمات کلکتہ کی مرکزی حکومت کے پاس پیش ہوتے تھے ، سب منشی صاحب ہی کی وساطت سے پیش ہوتے تھے۔ اِن کی ماہانہ تنخواہ مقرر نہ تھی ، لیکن حقِ وکالت کی رقم اتنی بن جاتی تھی کہ صاحبِ "مخزنِ احمدی" کے بیان کے مطابق ہر مہینے کے اختتام پر تیس چالیس ہزار روپے کی تھیلیاں ہاتھی پر

---

[1] غلام رسول مہر : سید احمد شہید ، مطبوعہ لاہور ، بار سوم ۱۹۶۸ء ، ص ۲۰۸

لد کر اِن کے گھر پہنچتی تھیں۔"[1]

کیا یہ امر جائے غور ہے یا نہیں کہ سید احمد صاحب کی صحبت سے منشی امین الدین احمد ابھی فیضیاب بھی نہیں ہُوئے بلکہ زیارت کا شرف تک نصیب نہیں ہوا۔ اِس کے باوجود سید صاحب جو ابھی کلکتہ پہنچے بھی نہیں کہ اُنھیں پنیس میں لے جانے کے لیے منشی امین الدین کس طرح اور کیوں آئے؟ کیا اُنھیں الہام ہو گیا تھا کہ فلاں صاحب آ رہے ہیں اُنھیں اپنے پاس لے آؤ۔ بغیر کچھ دیکھے بھالے، اُنھیں سیّد صاحب سے عقیدت کس طرح ہو گئی؟ کیا یہ راز داری کے ساتھ "ایسٹ انڈیا کمپنی" کا کارنامہ تو نہ تھا؟ شاید پُورے ہندوستان میں سید صاحب کی اتنی آؤبھگت اور عقیدت کا اہتمام نہ ہوا ہو جیسا انگریزوں کی راجدھانی یعنی شہر کلکتہ میں ہوا، حالانکہ کلکتہ اُن دنوں انگریزوں کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ آخر اُن لوگوں کو انگریزوں کے علاوہ اِس ڈرامے کے پارٹ ادا کرنے پر اور کس نے مائل کیا تھا؟ قبل ازیں خود منشی امین الدین احمد بھی ایسی عقیدت سے ناآشنا اور بقول غلام رسول مہر، ہدایت سے محروم تھے۔ موصوف نے وضاحت کی ہے:

> "جن لوگوں نے سیّد صاحب کی وجہ سے ہدایت پائی اُن میں خود منشی امین الدین احمد کا ذکر بھی ضروری ہے۔"[2]

اگر منشی امین الدین احمد نے سیّد صاحب سے ہدایت پائی تھی تو جب سید صاحب کے قدم بھی کلکتہ میں نہیں پہنچے تھے اور وُہ ابھی راستے میں ہی تھے اُس وقت قبل از ہدایت یہی منشی امین الدین احمد کیوں سیّد صاحب کو لینے کے لیے پہنچ گئے تھے؟ کیا یہ اس قافلے کے لیے راز داری کے ساتھ خود برٹش گورنمنٹ کا انتظام نہیں تھا؟ انگریزوں کی راس بستی میں، انگریزوں کی حوصلہ افزائی کے سہارے اِتنی اُونچی پرواز اُڑنے لگے کہ پیشگوئی کے مژدے دیتے رہے اور انگریزوں کے خفیہ انتظامات کو اپنی کرامت سمجھتے تھے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "سید صاحب نے کلکتہ پہنچ کر مولانا عبدالحی سے فرمایا تھا کہ اگرچہ ہم حج کی نیت سے آتے ہیں لیکن خدا کے فضل سے اُمید ہے (کمپنی کی مہربانی سے)" کہنا

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۲۰۵

[2] ایضاً، ص ۲۰۹

زیادہ موزوں ہوتا)، اِس شہر میں بابِ ہدایت اِس طرح مفتوح ہوگا کہ دیکھنے والے حیران رہ جائیں گے۔ یہ پیشگوئی حرف بحرف پُوری ہُوئی اور اُس کی تصدیق بعض انگریزوں کے بیانات سے بھی ہوتی ہے کہ ۱۸۲۲ء میں سیّد صاحب کلکتہ آئے اور مسلم آبادی بہت بڑی تعداد میں اُن کی پیرو بن گئی۔ شاہ اسحاق نے بیان فرمایا کہ سیّد صاحب کلکتہ پہنچے تو بہت سے مسلمانوں نے آپ کی ہدایت سے فائدہ اٹھایا اور آپ کے ارشادات کی برکت سے اُس سرزمین میں خاص دینی رونق پیدا ہوگئی۔

حاجی حمزہ علی خاں کہتے ہیں، آدمیوں کا اِتنا ہجوم رہتا تھا کہ سیّد صاحب کو آرام کے لیے بہت کم وقت ملتا تھا۔ سب لوگ شیرینی لاتے اور زیادہ تر بتاشے ہوتے۔ لوگوں کے پاسِ خاطر سے سیّد صاحب کم از کم ایک دانہ ضرور چکھتے، اِس طرح زبان مبارک پر آبلے پڑ گئے تھے۔ بیعت کا سلسلہ دو اڑھائی پہر دن چڑھے سے شروع ہو جاتا اور رات تک جاری رہتا۔ عورتیں بھی بکثرت آتیں اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کمرہ بھر جاتا۔ بہت سے غیر مسلم سیّد صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہُوئے۔ کلکتہ اصلاً انگریزی بستی تھی، وہاں کی زندگی انگریزی رنگ میں رنگی جا چکی تھی۔ عورتیں بے پردہ ہوتیں، شراب بکثرت پی جاتی۔ سیّد صاحب کی وجہ سے مسلمانوں میں پردے کا رواج ہُوا اور شراب کی دُکانیں بے رونق ہوگئیں۔"[1]

انگریزوں کی اِس آبادی یعنی کلکتہ میں سیّد صاحب کو جتنی آمدنی ہُوئی اُس کے بارے میں مہر صاحب یُوں لکھتے ہیں:

"کلکتے والوں کے تحائف و ہدایا کے بارے میں جو کچھ معلوم ہو سکا اُس کی سرسری کیفیت یہ ہے:

---

[1] غلام رسول مہر: سیّد احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۲۰۹

۱۔ منشی امین الدین احمد: پانچ ہزار نقد، تین سو جوڑے جوتے، چار گٹھڑی کپڑے، ایک میں سفید تھان یعنی لٹھا، ململ وغیرہ۔ دوسری میں سوسی اور چھینٹ کے تھان، باقی گٹھڑیوں میں موٹا کپڑا۔ [2]دو نہایت خوبصورت گھڑیاں۔ پانچ ہزار روپے اِس غرض سے (مزید) پیش کیے کہ ممکن ہے بعض اوقات سید صاحب کے رفقاء کو مزاج کے مطابق کھانا نہ مِلا ہو اور اُنھوں نے پیسے خرچ کر کے بازار سے کھایا ہو۔ پانچ سو احرام دیے۔

۲۔ امام بخش سوداگر: تین سو روپے، بیس اشرفیاں، پندرہ تھان سفید اور چھینٹ کے۔ دو شیشیاں عطر کی، جن میں پانچ پانچ تولے عطر تھا۔ ایک بنگلہ جسے سید صاحب نے باصرار واپس کر دیا۔

۳۔ غلام حسین تاجر: چار جہاز پورے نذر کیے اور اُن کے ساتھ کھانے پینے کا سامان بھی مہیا کر دیا۔ چونکہ انتظام ہو چکا تھا، اِس لیے سید صاحب نے یہ نذر بشکریہ واپس کر دی۔ غلام حسین نے اپنے لڑکے کو ساتھ کر دیا۔ یقین ہے بڑی رقم بھی دی ہوگی، اُس کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ ایک کوٹھی نذر کی جو سید صاحب نے اُسے واپس دے دی۔ مراجعت پر سید صاحب اُسی کے ہاں ٹھہرے تھے۔

۴۔ شیخ رمضانی: سعد الدین ناخدا، منشی حسن علی اور امام بخش تاجر نے چار سو احرام پیش کیے اور عرض کیا کہ جو احرام پہلے پیش ہو چکے ہیں عمرہ کے لیے باندھے جائیں، ہمارے احرام حج کے لیے استعمال کیے جائیں۔

۵۔ جس پیرزادے نے بیرونی دروازے سے مکان کے اندر تک سید صاحب کے لیے پگڑیاں بچھائی تھیں، اُس نے سو روپے پیش کیے۔ اِس درجے کی دوسری نذروں کا حساب پیش کرنا مشکل ہے۔

> سیدصاحب نے سوار ہونے سے پیشتر حکم دے دیا تھا کہ ساتھیوں میں سے جس جس کے پاس ایک جوڑا ہو، اُسے تین جوڑے نئے بنوا دیے جائیں۔ باقی لوگوں کے لیے کم از کم دو دو نئے جوڑوں کا انتظام کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک سو کے لیے دو دو جوڑے سلوا دیے گئے۔“ [1]

سیدصاحب نے اِس دورۂ حج کے سلسلے میں کتنے ہی شہروں کا دورہ کیا، اُن کے ساتھ تقریبًا ساڑھے سات سو آدمی جمع ہو گئے تھے جنھیں حج کے لیے ساتھ لے جانا منظور ہو گیا تھا۔ خود تو وہ بیچارے خالی ہاتھ تھے لیکن اِس دَورے میں کمپنی بہادر کی نظرِ عنایت سے مسلمان رئیسوں کا نام رکھ کر نوازشوں کی وُہ بارش ہُوئی کہ جس کا اندازہ بھی کرنا مشکل ہے۔ مثال کے طور پر ہم نے الٰہ آباد اور کلکتہ کے دُو رئیسوں یعنی شیخ غلام علی اور منشی امین الدین احمد کی امداد کا ذکر کر دیا ہے۔ اِن کے علاوہ دُوسرے شہروں اور قصبوں میں بھی آپ کے ساتھ یہی سلوک رہا۔ بھولے بھالے مسلمان تو اپنے پاس سے نذریں پیش کرتے کیونکہ حج کے لیے ایسا جلوس اُنھوں نے نہ کبھی دیکھا ہوگا اور نہ کانوں سے سُنا ہوگا۔ لیکن بڑے بڑے رئیسوں نے جو بعض مقامات پر امداد کی اُس میں برٹش گورنمنٹ کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ جن وجوہات کی بنا پر ہم یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہیں اُن کا ذکر ہر واقعے کے ساتھ کر دیا گیا ہے۔ حاشا وکلّا ہمیں کسی سے خواہ مخواہ کی عداوت نہیں اور نہ ہم کسی پر الزام تراشی ہی کرنا چاہتے ہیں۔ مدعا صرف یہ ہے کہ حقیقت کو اُس کے اصلی رنگ میں پیش کیا جائے۔

سیدصاحب جب اِس قافلے سمیت حج سے فارغ ہو کر ہندوستان وارد ہُوئے تو غلام رسول مہر صاحب کی تحقیق کے مطابق ۶ صفر ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۲ اکتوبر ۱۸۲۳ء کو کلکتہ پہنچ گئے۔ مختلف شہروں میں آپ کو مدعو کیا گیا، کافی کافی عرصہ وہاں قیام رہا۔ باقی ماندہ قافلے کے ساتھ ضیافتیں ہوتی رہیں۔ تحفے تحائف اور نذرانے وصول کرتے ہُوئے بریلی پہنچ گئے۔ یہ ۱۲۳۸-۳۹ھ/ ۱۸۲۲-۲۳ء کی فتوحات کا ذکر ہے۔

اب قارئین کی توجہ سید احمد صاحب کی تحریکِ جہاد کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہُوں معتقدین کا موقف یہ ہے کہ سکھوں کے مظالم کی بنا پر سید صاحب نے اُن سے جنگ کرنے کی ٹھانی تھی۔

---

[1] غلام رسول مہر، سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۲۱۵

ہندوستان کے مختلف شہروں میں آپ نے گشت کی۔ آپ کے رفقاء یعنی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور مولوی عبدالحی (المتوفی ۱۲۴۳ھ) کے جگہ جگہ ترغیب جہاد پر وعظ ہوئے۔ کتنے ہی مسلمان جان اور مال سے آپ کے ساتھی بن گئے۔ یہ ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۷ء میں دورہ کیا گیا۔ جب سید صاحب پوری طرح لیس ہوگئے، ساتھیوں کی بِھیڑ لگ گئی تو عازمِ پنجاب ہوئے لیکن اِس روانگی سے پہلے اور دورے کے شروع سے ہی اُس الہام کا سُنا دینا ضروری خیال کیا جاتا تھا، جو برٹش گورنمنٹ کی طرف سے دوسرا اہم الہام بار بار کیا جا رہا تھا۔ وُہ الہام یہ تھا:

> "آپ کے سفرِ جہاد سے پہلے، بارہا آپ کو یہ الہامِ ربانی ہُوا تھا کہ ملک پنجاب آپ کے ہاتھوں پر فتح ہو کر پشاور سے تا دریائے ستلج (یعنی سکھوں کا علاقہ) مثل ہندوستان کے رشک افزائے چمن ہو جائے گا۔ چنانچہ اِن متواتر وعدہ ہائے فتح سے آپ کا ہر مرید واقف تھا۔"[1]

سید صاحب کی نظر میں جتنے ہندوستان پر انگریزی تسلط تھا، وُہ رشک افزائے چمن تھا اور ستلج سے پشاور تک کے علاقے کو بھی، جو سکھوں کے قبضے میں تھا، آپ انگریزی عملداری میں شامل کر کے، رشک افزائے چمن بنانے کی خاطر تن من دھن کی بازی لگانے پر تُل گئے تھے، کیونکہ دوسری طرف سے بار بار الہام ہو رہا تھا۔ موصوف نے اِس الہام اور متواتر وعدہ ہائے فتح کے نام سے خوب جمعیت اکٹھی کی۔ بے شمار امداد ہُوئی حتّٰی کہ ۱۲۴۳ھ سے ۱۲۴۶ھ تک کے خطوط میں بھی آپ اِس الہام اَور اِن وعدہ ہائے فتح کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ کاش! اُن کا ضمیر بیدار ہو جاتا اور قوم کو ایسے عجیب چکّر میں پھنسا کر نہ جاتے، کیونکہ: ؎

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہَیں تیرے گدا، دارا و جم

سید احمد صاحب نے یار محمد خاں حاکمِ یاغستان کو خط لکھتے ہُوئے اپنے دُوسرے الہام کا خود یُوں اظہار فرمایا:

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۱۷۲

”فقیر دریں باب باشاراتِ غیبی مامور است و بہ بشاراتِ لاریبی مبشر، ہرگز ہرگز شبہۂ وسوسۂ شیطانی و شائبۂ ہوائے نفسانی باین الہامِ رحمانی ممتزج نیست، بالجملہ فقیر امتثالِ حکمِ الٰہی از تہِ دل مقصود است و اعتماد بوعدہ الٰہیہ بکلی حاصل، و امّا ایں کہ بوعدۂ الٰہیہ بچہ طریق ظاہر گردد، پس بندۂ عبودیت شعار راچہ یارا کہ از مالک خود بپرسد کہ وعدۂ خود را بچہ طور ایفا خواہی کرد، کہ ایں سوال خارج از قانونِ آداب عبودیت است، بالجملہ از گفتگو و چون و چرا بیزارم و از مائدۂ اطاعتِ محض ذلّہ بردار“ [1]

فقیر اس خصوص میں غیبی اشارہ کی بنا پہ مامور ہے اور اُس مبشّر کی اِس بشارت میں شک و شُبہ کی گنجائش نہیں۔ ہرگز ہرگز کسی شیطانی وسوسہ اور نفسانی خواہش کا شائبہ اِس الہامِ رحمانی میں شامل نہیں ہے حاصل کلام یہ کہ فقیر کو حکمِ الٰہی کی تعمیل تہِ دِل سے منظور ہے اور مجھے اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر کامل اعتماد ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ اللہ کا وعدہ کس طرح ظہور پذیر ہو گا؟ اِس بندے کو جس کا شعار بندگی ہے کیا طاقت ہے کہ وُہ اپنے مالک سے یہ پُوچھے کہ تُو اپنا وعدہ کس طرح پُورا کرے گا؟ ایسا سوال آداب اور قانونِ عبودیت کے خلاف ہے۔ غرض مَیں ایسی چنان وچنین کی باتوں سے بیزار ہُوں اور محض اُس کی بندگی کے دسترخوان کا ریزہ چین ہُوں۔

فقیر محمد خاں کے نام خط لکھتے ہُوئے سید احمد صاحب نے یہ مژدہ اُنھیں اِن لفظوں میں سنایا تھا

”امّا بیانِ الہام، پس فقیر از پردۂ غیب بہ بشاراتِ ربّانی باستیصالِ کفّار دراز مویاں (یعنی قوم سکھ) مامور است و از مکمن لاریب بہ بشاراتِ

اب رہا الہام، وُہ یہ ہے کہ اِس فقیر کو پردۂ غیب سے کفّار یعنی لانبے بال والے سکھوں کے استیصال کے لیے مامور کیا گیا ہے اور ایسے مقام سے جس میں شک وشبہ کی گنجائش

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: مکتوبات سیّد احمد شہید، مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ۳۹، ۴۰

رحمانی بغلبۂ مجاہدینِ ابرار مبشّر"[1]	نہیں۔ رحمانی بشارتوں کے ذریعے نیک کردار مجاہدین کو اُن پر غلبہ پانے کی بشارت دینے والا مقرر کیا گیا ہے۔[2]

شاہِ بخارا کے نام سید احمد صاحب نے جو طویل خط لکھا اُس کی دوٗ عبارتیں متعلقہ الہام حسبِ ذیل ہیں:

درمقدمۂ اقامتِ جہاد وازالۂ کفر وفساد بطریقِ الہامِ ربّانی وکلامِ روحانی بہ اشاراتِ غیبی دربابِ امامت مشرف ساختند وبہ بشاراتِ لاریبی دربابِ فتح وظفر مبشّر۔۔۔۔ ہرگز ہرگز شعبۂ وسوسۂ شیطانی وشائبۂ ہوائے نفسانی بایں داعیہ رحمانی والہامِ ربّانی مخلوط نہ گردید۔ وَاللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی مَا نَقُوْلُ وَکِیْلٌ۔[3]	قیامِ جہاد کے معاملے اور کفر وفساد کے رفع دفع کرنے کے لیے الہام اور روحانی مکالمہ کے ذریعہ غیبی امامت سے اِس فقیر کو مشرف فرمایا۔ اور ہم کو فتح ونصرت کے متعلق ایسی بشارتوں کا مخبر۔۔۔ مامور فرمایا ہے ہرگز ہرگز کوئی شیطانی وسوسہ اور نفسانی خواہشات کا کوئی شائبہ بھی اِس للّٰہی دعوت اور الہامِ ربّانی میں داخل نہیں ہے وَاللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی مَا نَقُوْلُ وَکِیْلٌ۔

سیّد صاحب کے مذکورہ بالا بیانات سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں:

١۔ سیّد صاحب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہُوا، بار بار الہام ہوا کہ پنجاب تمہارے ہاتھ پر فتح ہوگا۔

٢۔ سیّد صاحب کو بذریعہ الہام بتایا گیا کہ تمھیں سکھّوں کے استیصال کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

٣۔ پنجاب کی فتح ونصرت کا مژدہ سنانے پر سیّد صاحب کو من جانب اللہ مامور کیا گیا تھا۔

٤۔ موصوف کو نہ صرف بذریعہ الہام بلکہ روحانی مکالمے کے ذریعے درجۂ امامت پر فائز کیا گیا تھا۔

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: مکتوباتِ سیّد احمد شہید، مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی، ١٩٦٩ء، ص ٤٢

[2] مکتوبات کی عبارتوں کا ترجمہ اِسی کتاب سے نقل کیا جا رہا ہے جو سخاوت مرزا نے کیا تھا۔

[3] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: مکتوبات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ١٩٦٩ء، ص ٨٠، ٨١

۵۔ پنجاب کی فتح اور سکھوں کے استیصال کا جو سہرا بذریعہ الہام سید احمد صاحب کے سر پر باندھا گیا تھا۔ اِس الہام کی صداقت میں موصوف کے نزدیک شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

۶۔ اِن دونوں مژدوں کو بشارتِ رحمانی اور الہامِ ربّانی کے ذریعے پہنچایا گیا تھا۔

۷۔ اِس ربّانی الہام اور رحمانی بشارت کا ہرگز ہرگز خلاف نہیں ہوگا کیونکہ اِن میں شیطانی وسوسہ یا نفسانی خواہشات کا شائبہ تھوڑا ہی تھا، جو اِن کا خلاف واقع ہوجائے۔

۸۔ سیّد صاحب اپنے الہام کی صداقت پر خدا کو گواہ رکھتے تھے۔

۹۔ موصوف خدا سے یہ پُوچھ تو سکتے تھے کہ پنجاب کیسے فتح ہوگا اَور سکھوں کا استیصال کن طریقوں اور کتنی تیاری سے کیا جا سکتا ہے لیکن یہ سوال اُن کے نزدیک شعارِ بندگی اور قانونِ عبودیت کے خلاف تھا۔

۱۰۔ موصوف کو قیامِ جہاد اور دفعِ فساد پر بذریعہ الہام مامور کیا گیا تھا۔ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔

اِس موضوع پر ہمیں کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ سیّد صاحب کے بیانات کی روشنی میں اُن کے معتقدین سوچیں اور فیصلہ کریں کہ یہ الہام رحمانی تھا یا شیطانی؟ بشارت رحمانی تھی یا خواہشِ نفسانی؟ کیا سید صاحب نے واقعی الہام کے مطابق پنجاب کو فتح کر لیا تھا اور سکھوں کا استیصال کر دیا تھا؟ اگر اِس سوال کا جواب نفی میں ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ اِس کے علاوہ چارۂ کار بھی کوئی نہیں، تو فیصلہ کرنے میں دشواری کیا باقی رہ گئی؟ خدا کرے کسی کی اندھی عقیدت راستے میں حائل نہ ہوجائے ورنہ معاملہ تو صاف ہے۔ اگر آج فیصلہ نہیں کرتے تو نہ سہی، کل خود ہی فیصلہ ہوجائے گا۔ آخر دنیائے دنی کا یہ اندھیرا چھٹے گا، صبحِ قیامت نمودار ہوگی۔ أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ ۝ کیا صبحِ قیامت قریب نہیں ہے؟ کہو گے تو سہی :؎

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نِکل آیا
میں الزام اُن کو دیتا تھا، قصور اپنا نکل آیا

اگر اب بھی کوئی کسر باقی رہ گئی ہے تو سیّد صاحب کا اِس سے بھی کئی گنا الہامی مژدہ سماعت فرمائیے اور اِس کی روشنی میں ہی فیصلہ کر کے خار کو خار اور گُل کو گُل کا مقام دے لینا۔ ہمارا

کام بلفضلہٖ تعالیٰ سمجھا دینا ہے، دِلوں کا پھیرنا اور ہدایت دینا باری تعالیٰ شانہ کے قبضہ وقدرت میں ہے۔ وُہ الہامی بیان پیشِ خدمت ہے:

> "سید محمد یعقوب آپ کے بھانجے سے روایت ہے کہ بروقت روانگی خراسان آپ اپنی ہمشیر والدہ سید محمد یعقوب سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ" اے میری بہن! میں نے تم کو خدا کے سپرد کیا اور یہ بات یاد رکھنا کہ جب تک ہند کا شرک اور ایران کا رفض اور چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق میرے ہاتھ سے محو ہو کر ہر مردہ سنّت زندہ نہ ہو جائے گی، اللہ رب العزت مجھ کو نہیں اٹھائے گا۔ اگر قبل از ظہور اِن واقعات کے کوئی میری موت کی خبر تم کو دے اور تصدیق پر حلف بھی کرے کہ سید احمد میرے رُوبرو مر گیا یا مارا گیا تو تم اُس کے قول پر ہرگز اعتبار نہ کرنا کیونکہ میرے رب نے مجھ سے وعدہ واثق کیا ہے کہ اِن چیزوں کو میرے ہاتھ پر پُورا کر کے مارے گا۔" [۱]

اچھا ہوتا کہ سید صاحب اتنی سی وضاحت اَور فرما دیتے کہ اُن کے رب یا ارباب نے یہ وعدہ اُن سے کہاں بیٹھ کر کیا تھا؛ بہر حال سید صاحب کے اِس بیان کی روشنی میں کہ جب تک مذکورہ چاروں ملکوں کو میں پاک صاف نہ کر دُوں اُس سے پہلے اگر کوئی حلفیہ بھی میری موت کی خبر دے تو وُہ جھوٹا ہے۔ ہم خیر اتنا تو کہہ سکتے ہیں کہ موصوف سے ہند کا شرک، ایران کا رفض، چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق آج تک نہیں مٹایا جا سکا، لہٰذا موصوف اپنے بیان کی روشنی میں کہیں جیتے جاگتے ہی پھر رہے ہوں گے۔ اُن کے رب نے تو ان کاموں سے پہلے نہ اُٹھانے کا وعدہ کر ہی لیا تھا، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ موصوف پہلے اِن چاروں ملکوں میں مُردہ سُنّتوں کو زندہ کرتے پھر رہے ہوں گے۔ ویسے اِس کا فیصلہ تو سید صاحب کے معتقدین ہی کر سکتے ہیں کہ سید صاحب اب زندہ ہیں یا نہیں؟ اگر وُہ آنجہانی ہو چکے تو اپنے اِس بیان کی روشنی میں اُنھیں سچا سمجھا جائے گا یا جھُوٹا؟ کوئی کچھ بھی فیصلہ کرے یہ اُس کی اپنی مرضی ہے۔

---

[۱] محمد جعفر تھانیسری، مولوی؛ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء، ص ۱۷۲

ہاں قارئین کی معلومات کے لیے اِس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہُوں کہ خود سید صاحب کے اوّلین سوانح نگار یعنی مولوی محمد جعفر تھانیسری نے بھی تسلیم کیا ہے کہ وعدۂ فتحِ پنجاب کے الہام کا خلاف واقع ہُوا۔ موصوف کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

> "وعدۂ فتحِ پنجاب کا آپ (سید صاحب) کو ایسا وثوق تھا کہ آپ اُس کو سراسر صادق اور ہونہار سمجھ کر بارہا فرماتے اور اکثر مکتوبات میں لکھا کرتے تھے کہ اِس الہام میں وسوسۂ شیطانی اور شائبۂ نفسانی کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ ملک پنجاب ضرور میرے ہاتھ پر فتح ہوگا اور اِس فتح سے پہلے مجھ کو موت نہ ہوگی۔ لیکن معاملۂ بالاکوٹ، خواہ شہادت ہو یا غیبوبت بظاہر سراسر اُس یقینی الہام کے خلاف ہُوا۔" [1]

تھانیسری صاحب نے یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ سید صاحب کے الہام کے خلاف ہُوا، انصاف کے دامن کو جھٹک دیا کیونکہ آگے صاف کہنا پڑ جاتا کہ اگر الہام کے خلاف واقع ہُوا تو وہ رحمانی نہیں بلکہ شیطانی الہام تھا جسے وسوسۂ شیطانی کہتے ہیں، اِس صورت میں سید صاحب اور مرزا غلام احمد قادیانی کے الہاموں میں شرعی لحاظ سے فرق بتانا مشکل ہو جاتا، لہٰذا اُنھوں نے فیصلے کی اِس شاہراہ کو چھوڑ کر یُوں تاویل کی پگڈنڈی پر چلنا شروع کر دیا:

> "اِس وقوعہ (معرکۂ بالاکوٹ) کے پندرہ برس کے بعد سلطنتِ پنجاب متعصب اور ظالم سکھوں کے ہاتھ سے نکل کر ایک ایسی عادل اور آزاد اور لامذہب قوم کے ہاتھ میں آ گئی جس کو ہم مسلمان (وہابی صاحبان) اپنے ہاتھ پر فتح ہونا تصور کر سکتے ہیں اور غالباً سید صاحب کے الہام کی صحیح تاویل یہی ہوگی جو ظہور میں آئی۔" [2]

تھانیسری صاحب تو خیر اب اِس دنیا میں نہیں ہیں۔ ایں جہانی مورّخین ہی بتا دیں کہ سید صاحب کا

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۹۱

[2] ایضاً: ص ۲۹۱

مذکورہ الہام ربانی تھا یا شیطانی؟ اگر وُہ بھی اِس فیصلے سے کترا کر تھانیسری صاحب والی تاویل کا دامن تھامتے ہیں تو ہم اُن کی خدمت میں یہ مودبانہ التماس پیش کرنا چاہتے ہیں کہ اے انصاف کا خون کرنے والو! اِس تاویل کا مفاد یہی تو ہے کہ برٹش گورنمنٹ یا سیّد احمد صاحب، ایک ہی تصویر کے دو رُخ تھے "من تو شدم تو من شدی" والا معاملہ تھا۔ سیّد صاحب فتح کر لیتے یا انگریزوں نے پنجاب فتح کر لیا۔ انگریز خود سکھوں سے لڑتے یا سیّد صاحب کو بھڑا دیا، ایک ہی بات ہے۔ مانا کہ قالب دو تھے لیکن جان تو دونوں طرف ایک تھی۔ بظاہر دونوں کے راستے الگ الگ نظر آتے تھے لیکن منزلِ مقصود دونوں کی ایک تھی۔ یعنی انگریزی عملداری کی حدود کو اَور وسیع کرنا، جسے سیّد صاحب اپنی ہی عملداری سمجھا کرتے تھے، نیز اِس عملداری کے راستوں کی رکاوٹوں کو دُور کر کے اِسے مضبوط و مستحکم کرتے تھے۔ یہی تھی اُن کی منزلِ مقصود اَور یہی ہے اُن کے جہاد کی غرض و غایت۔ لہٰذا: ؎

ہیں ستارے کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

بہرحال سیّد احمد صاحب اپنے جہاد کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے، جمعیت کو لے کر گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ اور شہر شہر پھرے، جہاد کے نام سے بھولے بھالے مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملایا، کتنے ہی مسلمانوں نے جہاد کے نام سے دھوکا کھا کر ہر قسم کی جانی اور مالی قربانی پیش کی۔ انگریز اِس تیاری پر مانع نہیں ہوئے اور مانع کیوں ہوتے جبکہ یہ سارا منصوبہ ہی انگریزوں کا اپنا تھا۔ سکھوں سے نہ لڑنے کا انگریز معاہدہ کر چکے تھے، دریائے ستلج کو سرحد قرار دیا جا چکا تھا۔ لیکن انگریزوں نے جب قلبِ ہند کے اپنے طاقتور دشمن کو بڑی حکمتِ عملی سے پنجرے میں بند کر لیا تو اب سکھ جیسی جنگ آزما قوم کو زیر کرنے کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اِس مقصد کے لیے برٹش گورنمنٹ کو سیّد احمد صاحب سے موزوں اور کون مِل سکتا تھا، جنھوں نے جعفرِ بنگال اور صادق دکن کی سنّتِ ملعونہ کو تازہ کرنے کی غرض سے ایک مسلمان فرمانروا یعنی نواب امیر خاں مرحوم کو انگریزوں کے پنجرے میں پھنسا کر بے دست و پا کروا دیا تھا۔ سکھوں اور سرحد کے مسلمانوں کو زیر کرنے کا کام بھی سیّد احمد صاحب کے ہی سپرد کیا گیا۔ اندرونِ خانہ انگریز ہر طرح امدادی تھے، فریقین میں

مکمل اتحاد و اتفاق تھا، لیکن پردہ رکھنے کی غرض سے جہاد کرنے کی برٹش گورنمنٹ سے یوں اجازت حاصل کی جاتی ہے:

> ”اُس وقت ہر شہر، قصبہ و گاؤں، برٹش انڈیا میں علانیہ سکھوں پر جہاد کرنے کا وعظ ہوتا تھا مگر براہِ دُور اندیشی معرفت شیخ غلام علی صاحب رئیس اعظم الٰہ آباد کے نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر اضلاع شمالی و مغربی کو بھی سکھوں کے خلاف جہاد کی تیاری کی اطلاع دی گئی تھی۔ جس کے جواب میں صاحب ممدوح نے یہ تحریر فرمایا کہ جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو ہم ایسی تیاری کے مانع نہیں۔“ [1]

اِسی اجازت کے واقعے کو مرزا حیرت دہلوی نے ذرا اَور کُھل کر یُوں بیان کیا ہے:

> ”سید احمد صاحب نے مولانا شہید (مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی) کے مشورہ سے شیخ غلام علی رئیس الٰہ آباد کی معرفت لیفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی شمالی کی خدمت میں اطلاع دی کہ ہم لوگ سکھوں پر جہاد کی تیاری کرتے ہیں، سرکار کو تو اِس میں کچھ اعتراض نہیں ہے؟ لیفٹیننٹ گورنر نے صاف لکھ دیا کہ ہماری عملداری کے امن میں خلل نہ پڑے، ہمیں کچھ سروکار نہیں، نہ ہم ایسی تیاری کے مانع ہیں۔ یہ تمام بیّن بیّن ثبوت صاف صاف اِس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ جہاد صرف سکھوں ہی کے لیے مخصوص تھا، سرکار انگریزی سے مسلمانوں کو ہرگز ہرگز مخاصمت نہ تھی۔“ [2]

اعلیٰ حکّام نے اُس وقت اپنے ماتحت افسروں کو مطلع کر دیا تھا کہ سیّد صاحب اینڈ کمپنی سے ہرگز مزاحمت نہ کرنا، یہ ہمارے مخالف نہیں ہیں۔ اِس امر کی واضح تصریح مرزا حیرت دہلوی کے واشگاف لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیات سیّد احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۹ء، ص ۱۶۸

[2] حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۷۰

جب مہیب تحریک پھیلی تو ضلع کے حکام اِس سے چوکنّے ہُوئے اور اُنھیں خوف معلوم ہُوا، کہیں ہماری سلطنت میں تو رخنہ نہ پڑے گا اور موجودہ امن میں تو کسی قسم کا خلل واقع نہ ہوگا۔ اِس نظر سے ضلع کے حکام نے حکّامِ اعلیٰ کو لکھا۔ وہاں سے صاف جواب آگیا۔ اِن سے ہرگز مزاحمت نہ کرو، اِن مسلمانوں کو ہم سے کوئی لڑائی نہیں ہے، یہ سکھوں سے انتقام لینا چاہتے ہیں۔ اور حقیقت میں بات بھی یہی تھی۔ بھلا مسلمانوں کو گورنمنٹ انگلش سے کیوں سروکا ہونے لگا تھا؟ جہاں وہ اپنے دین کے ارکان بخوبی ادا کر سکتے تھے اور کرتے تھے۔ اُنہیں تو لبرٹیشن (مذہبی آزادی) بخوبی حاصل تھی۔ وُہ صرف دشمنِ دین و ایمان سکھوں سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے اور ان کا ارادہ صرف سکھوں ہی سے اپنے مظلوم بھائیوں کا انتقام لینا تھا، جن کے قابلِ رحم مظالم کا بیان ہم مولانا شہید کی سوانح عمری میں بیان کر چکے ہیں۔“[1]

بات اصل میں یہ ہے کہ حکّامِ اعلیٰ سیّد احمد صاحب کی طرف سے پوری طرح مطمئن تھے کیونکہ وُہ بیچارے انگریزوں کی مخالفت کیا کرتے جبکہ ساری زندگی ہی صرف انگریزی مفادات کے حصول و تحفظ میں گزار دی تھی۔ جن حضرات کو موصوف کی برٹش نوازی بلکہ ایجنٹ ہونے کا پتہ نہیں تھا انھوں نے اِس تیاری اور چہل پہل کے وقت عظیم آباد اور کلکتہ میں حکّامِ اعلیٰ سے اِس تیاری کی شکایت کی، نقضِ امن کا خطرہ سمجھایا، لیکن حکّام کے سامنے چونکہ اصل حقیقت موجود تھی وُہ شکایتوں پر کیے کان دھرتے اور بے خبر ہمدردوں کو کیوں منہ لگاتے؟ مہر صاحب یُوں رقمطراز ہیں:

> ”بعض شیعہ حضرات نے (قیامِ عظیم آباد کے دوران) انگریز حاکم کے پاس شکایت کی کہ سیّد صاحب انگریزوں کے خلاف جہاد کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں اور ہم لوگ از رُوئے خیر خواہی یہ حقیقت آپ تک پہنچاتے ہیں۔ لیکن حاکم نے اِس شکایت کو فرقہ وارانہ رقابت کا نتیجہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔“[2]

---

[1] حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۶۹، ۳۷۰

[2] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۲۰۲

”بعض حاسدوں نے (قیامِ کلکتہ کے دوران) انگریزوں کے پاس شکایت کی کہ سیّد احمد پہلے نواب امیر خاں کے لشکر میں نشان بردار تھا، نواب کمپنی سے مل گیا تو سید احمد نے پیری مریدی کا ڈول ڈالا اور اب انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہے۔ یہ محض بے علم ہے۔ اِس شکایت پر کسی نے توجہ نہ کی۔“[1]

نواب امیر خاں کو انگریزوں کے پنجرے میں بند کروانا اور سکھوں سے لڑ کر پنجاب کو انگریزی مقبوضات میں شامل کرنے کی کوشش کرنا، یہ سیّد احمد صاحب کے وُہ کارنامے ہیں جو بڑی رازداری سے پایۂ تکمیل کو پہنچانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ اپنے منہ سے آج تک کون سے غدار نے اعتراف کیا ہے کہ میں اپنے دین اور اپنی ملّت کے فلاں بدخواہ کا آلۂ کار ہُوں؟ اِس طرح تو میر جعفر اور میر صادق وغیرہ نے بھی تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ وُہ بھی اپنے اِن سیاہ کارناموں پر پردہ ڈال کر نازاں تھے۔ غداروں کا اندازہ بعض حالات و قرائن سے ہی لگایا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسا بیان مل جائے کہ کسی ایجنٹ نے دشمن سے اپنی دوستی کا دم بھرا ہو یا اُس کی تعریف کی ہو، تو میرا خیال ہے کہ اِس سے زیادہ قابلِ اعتماد ثبوت کسی کی ایجنٹی کا آج تک تحریری طور پر نہ مل سکا ہوگا۔ آئیے اب ہم سیّد احمد صاحب کے بارے میں اُن کی گھریلو تصانیف سے ایسے بیانات تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

”یہ بھی ایک صحیح روایت ہے کہ جب آپ سکھوں سے جہاد کرنے کے لیے تشریف لے جا رہے تھے تو کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ آپ اتنی دُور سکھوں سے جہاد کرنے کو کیوں جاتے ہیں؟ انگریز جو اِس ملک پر حاکم اور دینِ اسلام سے کیا منکر نہیں ہیں؟ گھر کے گھر میں اِن سے جہاد کر کے ملک ہندوستان لے لو، یہاں لاکھوں آدمی آپ کے شریک و مددگار ہو جائیں گے، کیونکہ سیکڑوں کوس سفر کر کے، سکھوں کے ملک سے پار ہو کر افغانستان میں جانا اور وہاں برسوں رہ کر سکھوں سے لڑنا، یہ ایک ایسا امرِ محال ہے جس کو ہم لوگ نہیں کر سکتے۔

---

[1] غلام رسول مہر: سیّد احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم، ١٩٦٨ء، ص ٢١١

سید صاحب نے جواب دیا کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی انگریزوں اور سکھوں کا ملک لینا ہی ہمارا مقصد ہے، بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وُہ ہمارے برادرانِ اسلام پر ظلم کرتے اور اذان وغیرہ فرائض مذہبی ادا کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں۔ اگر سکھ اب یا ہمارے غلبہ کے بعد اِن حرکاتِ مستوجبِ جہاد سے باز آ جائیں تو ہم کو اُن سے لڑنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

اور انگریزی سرکار گو منکرِ اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کوئی ظلم و تعدّی نہیں کرتی اور نہ اُن کو فرائض مذہبی اور عباداتِ لازمی سے روکتی ہے۔ ہم اُن کے ملک میں اعلانیہ وعظ کہتے اور ترویجِ مذہب کرتے ہیں، وہ کبھی مانع و مزاحم نہیں ہوتی، بلکہ اگر ہم پر کوئی زیادتی کرتا ہے تو اُس کو سزا دینے کو تیار ہیں۔ ہمارا اصل کام اشاعتِ توحیدِ الٰہی اور احیائے سنن سید المرسلین ہے، سو ہم بلا روک ٹوک اِس ملک میں کرتے ہیں۔ پھر ہم سرکارِ انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں اور اصولِ مذہب کے خلاف بلا وجہ طرفین کا خون گرا دیں۔"[1]

یہی تھانیسری صاحب اِس بارے میں سید احمد صاحب کے مکتوبات اور حالاتِ زندگی کو مدِنظر رکھ کر سب کی روشنی میں اپنے امیر المومنین کی انگریز دوستی کو واضح کرنے کی غرض سے یوں رقمطراز ہیں:

"اِس سوانح اور مکتوبات کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب کا انگریزی سرکار سے جہاد کرنے کا ہرگز ارادہ نہ تھا، وُہ اِس آزاد عملداری کو اپنی ہی عملداری سمجھتے تھے اور اِس میں شک نہیں کہ اگر انگریزی سرکار اُس وقت سید صاحب کے خلاف ہوتی تو ہندوستان سے سید صاحب کو کچھ مدد نہ پہنچتی مگر سرکار انگریزی اس وقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔"[2]

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ١٩٦٨ء، ص ١٧١

[2] ایضاً: ص ٢٩٣

دیوبندیوں کے نام نہاد مناظر مولوی محمد منظور نعمانی بھی سید صاحب کی انگریز دوستی کو غلط ثابت کرنے سے عاجز ہو کر اُن کی اصلی پوزیشن کو تسلیم کرتے ہیں مگر کس طرح پہلو بدل کر۔ چنانچہ اُن کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> "مشہور یہ ہے کہ آپ (سید صاحب اینڈ کمپنی) نے انگریزوں سے مخالفت کا کوئی اعلان نہیں کیا بلکہ کلکتہ یا پٹنہ میں اُن کے ساتھ تعاون کا اظہار کیا اور یہ بھی مشہور ہے کہ انگریزوں نے بعض بعض موقعوں پر آپ کی امداد بھی کی۔"[1]

چونکہ مولوی محمد منظور دیوبندی نے اِس بات کا اعتراف کر لیا ہے کہ انگریزوں نے بعض مواقع پر سید احمد صاحب کی امداد بھی کی تھی، لہٰذا ہم اِس امداد کے واقعات کو مدلل طور پر تھوڑی سی وضاحت سے پیش کرنا چاہتے۔ جب سید احمد صاحب لڑائیوں میں مصروف تھے۔ معتقدین کی نظر میں جہاد کر رہے تھے اور حقیقت میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے۔ تو انگریزوں نے موصوف کے لیے باقاعدہ وہاں بھی امداد بھیجنا جاری رکھا۔ دہلی اور دُوسرے مراکز کی معرفت بھیجتے رہے اور بعض نوابوں کو بھی ترغیب دی۔ مثلاً:

> "نواب ٹونک نے بھی دس بیس ہزار روپے شاہ اسحاق کی معرفت بھیجے۔"[2] ملخصاً

مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ) کی معرفت بھی رقم جایا کرتی تھی اور حکومت اُس کی نگران و محافظ تھی۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ مولوی محمد جعفر تھانیسری کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

> "اِس (لیفٹیننٹ گورنر سے اجازت) کے بعد سید صاحبؒ ملک یاغستان میں پہنچ کر سکھوں سے جہاد میں مصروف تھے۔ اُس وقت ایک ہنڈی سات ہزار روپے کی بذریعہ ساہوکارانِ دہلی مرسلہ مولوی محمد اسحاق صاحبؒ بنام سید صاحبؒ روانہ ہوئی تھی۔ ملک پنجاب میں وصول نہ ہونے پر اس سات ہزار روپے کی واپسی کا دعویٰ عدالت دیوانی میں دائر ہو کر ڈگری ہوئی اور پھر ہنگام اپیل عدالتِ

---

[1] ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ، شہید نمبر، ۱۳۵۵ھ، ص ۷۶

[2] حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۷۷

عالیہ دیوانی (ہائی کورٹ) آگرہ میں بھی حکم ڈگری بحقِ مدعی بحال رہا۔"[1]

مرزا حیرت دہلوی نے اس واقعے کو اپنے لفظوں میں یُوں بیان کیا ہے:

"جب سیّد صاحب یاغستان میں تھے تو مولانا محمد اسحاق صاحب محدث دہلوی نے کچھ اُوپر سات ہزار روپیہ سیّد احمد صاحب کو بذریعہ ہنڈی روانہ کیا تھا۔ وہ کسی باعث سے نہیں پہنچا تھا۔ اُس پر نالش کی گئی تھی اور پھر روپیہ وصول کر کے دوبارہ سیّد صاحب کی خدمت میں روانہ کیا گیا تھا۔"[2]

قارئین کرام! یہ تھے سیّد احمد صاحب کے بارے میں اُن کے سوانح نگاروں اور معتقدوں کے بیانات جن کے پیشِ نظر ہم نے اِن سوانح نگاروں، سیّد صاحب کے اکثر معتقدوں اور دیگر غیر جانب دار مورخوں کے ساتھ ہمنوائی کی اور سیّد صاحب کو اِن جملہ حضرات کی طرح برٹش نواز کہا اور لکھا۔ ہمارے علمائے اہلسنت موصوف کی اِس روش پر گرفت بھی کرتے آئے ہیں۔ مبتدعین حضرات کے پاس کوئی دلیل حقیقت میں ایسی نہیں تھی جس سے وُہ ذرا بھی صفائی پیش کر سکیں۔ دُوسری مشکل اُنھیں یہ تھی کہ جملہ وہابی مورخ ہمارے دعویٰ کی اپنی اپنی تصانیف میں تائید کر گئے تھے اور اُنھوں نے سیّد صاحب کو خود فخریہ طور پر برٹش گورنمنٹ کا خیر خواہ بتایا ہے۔ اِن جملہ حالات کے برخلاف جناب غلام رسول مہرؔ اور پروفیسر محمد ایوبؔ قادری نے اپنا مورخانہ زور صرف کیا اور بڑی شد و مد سے سیّد صاحب کو انگریزوں کا دشمن منوانے کی کوششیں کرتے رہے ہیں۔ اور اپنے اکابر یعنی سیّد صاحب کے سابقہ سوانح نگاروں پر بھی الزام تراشی میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔

مہر صاحب مولوی محمد جعفر تھانیسری کے بارے میں یُوں رقمطراز ہیں:

"اس کتاب[3] (تواریخ عجیبہ) نے سیّد صاحب کے متعلق دو نہایت افسوسناک

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیات سیّد احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۱۶۸

[2] حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۳۷۲

[3] تواریخ عجیبہ مصنفہ محمد جعفر تھانیسری کے دُوسرے ایڈیشن کا نام "سوانح احمدی" رکھا گیا۔ موجودہ ایڈیشن جو کراچی سے "نفیس اکیڈمی" والوں نے شائع کیا ہے اُنھوں نے پہلے حصّے کا نام "حیات سید احمد شہید" اور دُوسرے کا "مکتوبات سیّد احمد شہید" رکھا ہے۔

غلط بیانیوں کو عام کیا۔ اوّل یہ کہ سیّد صاحب انگریزوں سے نہیں لڑنا چاہتے تھے، صرف سکھوں سے لڑائی پر آمادہ ہوئے تھے۔ اِس غلط بیانی کو مستند بنانے کے لیے سید صاحب کے مکاتیب کی عبارتوں میں تحریف کی گئی۔“ [1]

اِس سلسلے میں دادِ تحقیق دیتے ہوئے موصوف اپنے دعوے کو یُوں موکّد کرتے ہیں:

”جہاں تک میں تحقیق کر سکا ہُوں، سب سے پہلے سر سیّد احمد خاں مرحوم نے سیّد صاحب کے جہاد کا رُخ انگریزوں سے ہٹا کر سکھوں کی طرف پھیرا۔ ولیم ہنٹر کی کتاب ”ہمارے ہندوستانی مسلمان“ چھپی تھی تو سر سید نے اُس کی تہمت طرازیوں کے جواب میں ایک سلسلۂ مضامین ”پایونیر“ میں چھپوا دیا تھا۔ جو بعد میں الگ بھی چھپ گیا تھا۔ اُن جوابی مضامین میں یہ بھی کہا گیا کہ سیّد صاحب صرف سکّھوں سے لڑنا چاہتے تھے اور انگریزوں کے ساتھ جنگ سے اظہارِ برأت کر دیا تھا۔ سر سید کا یہ بیان بہت کم لوگوں کی نظر سے گزرا ہوگا۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری مرحوم نے اُسے پھیلا کر پیش کیا۔“ [2]

یہی غلام رسول مہر اپنے موقف کو مضبوط کرنے کی غرض سے یُوں انتہائی اقدام کرکے حقائق پر پردہ ڈالنے کی بھرپور کوشش کرتے اور سیّد صاحب کو انگریزوں کا مخالف دکھانے کے لیے راستہ صاف کرتے ہیں:

”سیّد صاحب کے متعلق قلمی ذخیروں تک چند افراد کے سوا کسی کو دسترس حاصل نہ تھی۔ ”تواریخ عجیبہ“ (سوانح احمدی) چھپی تو اُس میں سید صاحب کے مقاصدِ جہاد کا حلیہ بالکل بگاڑ کر پیش کیا گیا تھا۔ عام اصحاب نے اُسے مستند شے سمجھ کر قبول کر لیا۔ اِس طرح اُس پاک نفس مجاہدِ کبیر کے مقاصد ایک نہایت افسوسناک غلط فہمی کا ہدف بنے۔ میں مانتا ہُوں کہ جس زمانے میں ”تواریخ عجیبہ“

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم، ۱۹۶۸ء، ص ۲۷

[2] ایضاً: ص ۲۴۱

> لکھی گئی، سید صاحب کی تحریک انگریزوں کے عتاب کا مورد بنی ہوئی تھی۔ لیکن مولوی محمد جعفر صاحب مکاتیب کو چھوڑ سکتے تھے، انھیں تحریف شدہ شکل میں شائع کرنے کی کون سی مجبوری پیش آگئی تھی؟ اور یہ حرکت اُن لوگوں سے سرزد ہوئی جو سیّد صاحب کے عقیدت مند تھے۔" [1]

جناب غلام رسول مہرؔ کی اِس بارے میں "ہاں میں ہاں ملانے" کا شرف اگر کسی صاحب کو علمی انداز میں آج کل حاصل ہے تو وُہ پروفیسر محمد ایوب قادری ایم۔ اے ہیں۔ مورّخانہ انداز میں موصوف نے اِس میدان میں کافی کام کیا ہے۔ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی کی حمایت اَور اُن کے مخالفین کو غلط ثابت کرنے میں آپ نے اپنی صلاحیتیں وقف کی ہُوئی ہیں۔ اپنے محبوب ہیرو، جناب سید احمد صاحب کی تحریکِ جہاد کے بارے میں یُوں لکھتے ہیں:

> "واقعہ یہ ہے کہ یہ شوشہ بھی خود اپنوں ہی کی طرف سے حکومتِ برطانیہ کی وفاداری کی غرض سے چھوڑا گیا۔ سب سے پہلے سر سیّد احمد خاں (ف ۱۸۹۰ء) نے "اَوَر اِنڈین مسلمانس" پر تبصرہ کیا اَور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ جہاد سکھّوں کے خلاف تھا۔ پھر اِس تحریک کے خاص رُکن مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اصل مواد میں ترمیم کر کے انگریزوں کی بجائے سکھوں کا لفظ لکھا اور اِس کو مشتہر کیا۔ بعض کوتاہ فہم یا پست ذہنیت رکھنے والے اشخاص تحریکِ مجاہدین کی اہمیت کم کرنے کے لیے اِس قسم کے غیر معیاری رسالے کبھی کبھی چھاپتے رہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اِس کُوچے ہی سے نابلد ہیں، وُہ تحریکِ مجاہدین کو کیا سمجھیں؟" [2]

پروفیسر صاحب موصوف نے بھی جناب غلام رسول مہر کی تقلید میں مولوی محمد جعفر تھانیسری کو موردِ الزام ٹھہرانے اَور اُسی تحریکِ جہاد کے رازدار و سرگرم کارکن کو بدنام کرنے میں کسی قسم کی

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۰

[2] محمد ایوب قادری، پروفیسر: مقدمہ حیات سید احمد، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۲۹

جھجک محسوس نہیں کی۔ اِن کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ اِس خانوادے کا کوئی بڑے سے بڑا، خواہ دین و دیانت سے کورا ماننا پڑے تو مان لیں گے لیکن سید احمد صاحب کی بگڑی کو بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں گے۔ چنانچہ موصوف مزید لکھتے ہیں:

> ”اِس کتاب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہُوئی کہ مؤلف (محمد جعفر تھانیسری) نے اِس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جہاد کی تحریک از اوّل تا آخر سکھوں کے خلاف تھی۔ انگریزوں سے اِس کا کوئی واسطہ نہ تھا اور سید احمد شہید کی جماعتِ مجاہدین کے سرگرم کارکن انگریزوں سے کوئی دشمنی یا پرخاش نہ رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولوی محمد جعفر تھانیسری جماعت کے خاص رازدار تھے۔ جس کے نتیجہ میں اُنھوں نے خوفناک تکلیفیں اُٹھائیں، گھر بار لٹایا، ہزاروں کی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد سے محروم ہُوئے، بیوی بچّے چھوٹے، عزّت و دولت سے محروم ہُوتے، زندگی کے بہترین اٹھارہ سال جنگلوں اور پہاڑوں (جزائر انڈمان) میں قیدی کی حیثیت سے گزارے۔ جب کالے پانی سے رہا ہو کر آئے تو پولیس کی پابندیوں اور نگرانیوں سے بھی واسطہ پڑا۔ اِن حالات و مصائب و آلام کا یہ ردِّ عمل ہُوا کہ اُنھوں نے اِس مرقع میں مصلحت کے قلم سے نقش و نگار کرنے کی کوشش کی ہے، ورنہ حقیقت اپنی جگہ عیاں ہے۔“[1]

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں موصوف نے اپنا تاریخی بھرم رکھنے کی غرض سے غلام رسول مہر صاحب کی ”ہاں میں ہاں“ ملانے کا فرض ہی ادا کیا ہے۔ چنانچہ اِس امر کا ثبوت پیش کرنے کی غرض سے پروفیسر صاحب یُوں رقمطراز ہیں:

> ”حیرت کی بات یہ ہے کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے سید احمد شہیدؒ کے بعض مکاتیب کی عبارتیں تک بدل دی ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف ”سید احمد شہید“ میں اس کا انکشاف کیا ہے۔ (ص ۱۶۲ تا ۱۸۹۔

---

[1] محمد ایوب قادری: تعارفِ مصنفِ حیاتِ سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۸ء، ص ۴۵

لاہور ۱۹۵۲ء)"۔[1]

سیّد احمد صاحب کو انگریزوں کا مخالف منوانے کی خاطر وہابیوں کے نامور مورّخ یعنی غلام رسول مہر اور اُن کے اتباع میں پروفیسر محمد ایوب قادری کا اپنی سَوا سو سالہ تاریخ کو بدلنے کی جرأت وجسارت کرنا، ہوسکتا ہے کہ اِن حضرات کے نزدیک دین وملّت کی کوئی اہم خدمت یا سعادتِ دارین کا ذریعہ ہو، لیکن انصاف پسند اہلِ علم حضرات کے نزدیک، اِس طرح تحقیق کے پردے میں تحریف کرنا دیانت داری سے بعید ہی شمار ہوتا ہے، کیونکہ یہ ملّت پر ظلم اور تاریخ سے مذاق ہے۔

جب مصنّفِ "تواریخ عجیبہ" مولوی محمد جعفر تھانیسری کو سید احمد صاحب کی تحریک کا سرگرم کارکن اور رازدار مان لیا، نیز یہ تسلیم کر لیا کہ اُنھوں نے اعانتِ تحریک کی پاداش میں کالے پانی کی سزا پائی، اٹھارہ سال جزیرہ انڈیمان میں مقید رہے، جائداد ضبط ہُوئی اور خوفناک تکلیفیں اٹھائیں دریں حالات، سیّد صاحب کے ایسے صبر آزما پیروکار پر خود سیّد صاحب ہی کی تاریخ کو بدلنے اور اُن کے مکتوبات میں تحریف کرنے کا الزام لگانا کیسی خوفناک جسارت ہے۔

جناب غلام رسول مہر تو ۱۹۷۱ء میں آنجہانی ہوچکے، حقیقتِ حال اُن کی نگاہوں کے سامنے آگئی ہوگی۔ علاوہ بریں اُن کا معاملہ چونکہ خود ہی سپردِ خدا ہے، اِس لیے اُن کی طرف روئے سخن کرنا مناسب ہی نہیں۔ راقم الحروف بصد ادب، جناب پروفیسر محمد ایوب قادری ایم۔ اے اور پروفیسر فیروز الدین رُوحی سے مخاطب ہوکر مندرجہ ذیل امور کی وضاحت کا طلبگار ہے:

۱۔ کیا نواب امیر خاں کے پاس جانے کے وقت (۱۸۱۰ء) سے معرکۂ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) تک سید صاحب نے اکیس سال کے اندر کوئی ایسا بیان بنفسِ نفیس دیا، جس میں صاف صریح طور پر فرمایا ہو کہ ہم انگریزوں سے بھی جہاد کریں گے؟ ایسا بیان مطبوعہ ہونا چاہیے۔

۲۔ اگر سیّد احمد صاحب کا کوئی ایسا بیان نہ ہو تو کم از کم اُن کے دستِ راست مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی ہی کا کوئی ایسا مطبوعہ بیان آنجناب کے پیشِ نظر ہے؟

---

[1] محمد ایوب قادری: تعارفِ مصنفِ حیاتِ سیّد احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۴۵

۳- یہ بھی نہ سہی، وہ کون کون سے مورّخ ہیں جنھوں نے سیّد احمد صاحب کے بعد یعنی ۱۸۳۱ء سے ۱۹۴۷ء تک کے ایک سو۱۱۶ سولہ سالہ عرصے میں یہ وضاحت کی ہو کہ سیّد صاحب کا ارادہ انگریزوں سے لڑنے کا تھا؟

۴- آپ حضرات ماشاءاللہ تاریخ دان بلکہ اسکالر کہلاتے ہیں، ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء کے بعد سیّد صاحب کے بعض خلفاء جو انگریزوں سے لڑے تھے اُن واقعات کو اصل تحریک کے نظریات کا جزو قرار نہ دے لینا۔ ۱۸۴۵ء میں سکھ نہیں بلکہ انگریز پنجاب کے حکمران بن گئے تھے۔ اُس وقت انگریزوں نے اپنے اِن خانہ زادوں کی گوشمالی ضروری سمجھی ہوگی کیونکہ اب سرحد میں اُن کا وجود انگریزی مفادات کے خلاف ہو کر رہ گیا تھا۔ سکھوں کے عہدِ حکومت میں تو برٹش گورنمنٹ نے دِلی خواہش کے ساتھ سکھوں اور مسلمانوں کو کچلنے کے لیے اپنے اِن جانثاروں کو بھیجا تھا۔ اب انگریزوں کا مقصد پُورا ہو چکا تھا، لہٰذا جو سلوک جعفر و صادق کے ساتھ کیا تھا وُہ بھلا اِن کے ساتھ کیوں نہ کرتے؟

راقم الحروف نے یہاں جو کچھ لکھا ہے کہ سکھوں اور مسلمانوں کو کچلنے کے لیے اِنھیں بھیجا تھا، اِس جملے میں مسلمانوں کا لفظ شاید آپ حضرات کے جذبۂ عقیدت کو ٹھیس پہنچاتا ہو اور اِس وجہ سے طبعِ نازک پر گراں گزر رہا ہو تو گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ میرا مقصد کسی کا دل دکھانا نہیں۔ ہاں مجبوراً ایسا لکھنا پڑا ہے کیونکہ سیّد احمد صاحب کے جملہ سوانح نگاروں نے اِن بانکے مجاہدوں کا سب سے بڑا کارنامہ جو رنگ برنگی تاویلوں کے سہارے فخریہ انداز میں پیش کیا ہے، وُہ مُسلم کُشی کے سِوا اور کچھ بھی نہیں۔

۵- ہوسکتا ہے کہ انگریزوں سے خوفناک اذیتیں اُٹھانے کے بعد مولوی محمد جعفر تھانیسری سہم گئے ہوں، اُنھوں نے قلم پر احتیاط کے پہرے بٹھا لیے ہوں۔ اِن حالات میں یہی ہوتا کہ وُہ مُنہ سے کُچھ نہ کہتے، ڈر کے مارے خاموش رہتے، قلم کو بھی حرکت میں نہ لاتے اور باقی زندگی خاموشی میں گزار کر راہیِ مُلکِ عدم ہو جاتے۔ لیکن موجودہ مورّخین حضرات جس مصلحت کا تھانیسری صاحب پر بھوت سوار کر رہے ہیں، اُنھوں نے اِس کے برعکس اُسی تحریک کے بانی کی سوانح حیات لکھ ڈالی، جس کے سرگرم کارکن ہونے کی

بنا پر وُہ برٹش گورنمنٹ کے زیرِ عتاب رہے تھے۔ ایسا کیوں کیا؟

۶۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ سیّد احمد صاحب کی سوانح حیات لکھنے کے سلسلے میں اُنھیں انگریزوں سے کسی قسم کے خطرے یا نقصان کا اندیشہ نہیں تھا، اِسی لیے اِس موضوع پر قلم اٹھایا تھا۔ اگر سیّد صاحب انگریزوں کے مخالف ہوتے تو ہو سکتا ہے کہ تھانیسری صاحب اُن کی سوانح حیات لکھنے کا خیال تک بھی نہ لاتے۔ بصورتِ دیگر اگر پھر بھی لکھنے پر آمادہ ہوتے تو سیّد صاحب کو ۱۲۹۵ھ میں انگریزوں کا مخالف لکھ دینے سے اُنھیں اندیشہ کس بات کا تھا، جبکہ ۱۲۴۶ھ میں وُہ معاملہ ہی ختم ہو گیا تھا۔ دریں حالات مولوی محمد جعفر تھانیسری کو تحریکِ جہاد کا رُخ موڑنے اور مکتوبات میں تحریف کرنے کی کیا ضرورت پڑی تھی؟

۷۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری کو اگر خطرہ لاحق ہو سکتا تھا تو صرف اِسی صورت میں کہ وُہ خود کو انگریزوں کا دشمن لکھتے یا ظاہر کرتے۔ کسی پچاس سال پیشتر کی ہستی یا تحریک کو انگریز دشمن لکھنے سے مصنف پر کون سی دفعہ عائد ہو سکتی تھی؟ دریں حالات اپنے بزرگ سیّد صاحب کے اوّلین سوانح نگار کی قبر پر حُبِّ علی میں نہیں بلکہ بُغضِ معاویہ میں، دُعائے خیر کے پھولوں کے بجائے بُہتانات کے کانٹوں کی چادر کِس جُرم کی پاداش میں چڑھائی جا رہی ہے؟

۸۔ آپ حضرات کو یہ شکایت ہے کہ جہاد کا رُخ انگریزوں کی طرف نہ پھیر کر تھانیسری صاحب نے تحریک کا حلیہ بگاڑ دیا۔ گویا "تواریخ عجیبہ" کی ایک یہ حرکت اور دُوسرا مسئلۂ غیبوبت آپ کو کھٹکتا ہے اَور اِن کے علاوہ باقی سب خیریت ہے۔ حالانکہ اِسی "تواریخ عجیبہ" نے سیّد صاحب کے معجزات، کرامات کا ڈھیر اور الہاموں کا اندھیرا اپنے اندر اِس طرح محفوظ کیا ہے کہ سیّد صاحب اور مرزا غلام احمد قادیانی کے مراتب میں ماسوائے اِس کے اَور کوئی فرق نظر نہیں آتا کہ اُنھیں اپنے لیے نبی کہنے اور کہلوانے کی قدرت نے مہلت ہی نہیں دی اَور اُن کے اِس خلاء کو مرزا صاحب کے ذریعے پورا کیا گیا تھا۔ موجودہ مورخین حضرات نے اِس جانب سے کیوں منہ پھیرا ہُوا ہے؟ آخر اِس کی وضاحت بھی تو کرنی چاہیے تھی؟

۹۔ سر سیّد احمد خان اور محمد جعفر تھانیسری نے جس وقت علی الاعلان اِس تحریکِ جہاد کو

صرف سکھوں کے ساتھ مخصوص کرنا شروع کیا تھا تو سیّد احمد صاحب کے معتقدین جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلے پڑے تھے، اُن میں سے کتنے حضرات نے اِس اِدّعا کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی؟

۱۰۔ صدائے احتجاج بلند کرنا یا اِس دعوے کو افترٰی ٹھہرانا تو دُور کی بات ہے، ہم تو یہی دیکھتے ہیں، کہ اُن کے اکثر معتقدین نے سر سید احمد خاں اور محمد جعفر تھانیسری کے اُن بیانات پر مُہرِ تصدیق ہی ثبت کی تھی۔ یہ درست ہے یا نہیں؟

۱۱۔ اگر ان دونوں حضرات نے تحریک کا حلیہ بگاڑا تھا تو اُن اہلِ علم اور صورتِ حال سے واقف حضرات نے اِس بداندیشی کا سدِّ باب کیوں نہ کیا جو اِس تحریک سے خود منسلک تھے اور مولوی محمد جعفر تھانیسری کی طرح اِس کے سرگرم کارکُن اور راز دار تھے؟

۱۲۔ سیّد صاحب کے اُن معتقدین کے ناموں کی فہرست پیش کرنے کے لیے ہم تیار ہیں جنھوں نے موصوف کا انگریز دشمن ہونا ہرگز تسلیم نہیں کیا۔ کیا ایسے جملہ حضرات کو آپ سیّد صاحب کے بدخواہ اور تحریف پسند لکھنے اور ماننے کے لیے تیار ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟

۱۳۔ اگر بقول مہر صاحب، مولوی محمد جعفر تھانیسری نے سیّد صاحب کے مکتوبات تک میں تحریف کر دی تھی تو ۱۹۴۷ء سے پہلے وہابیوں کے علماء اور مورّخ کہاں سوئے پڑے تھے؟ اُنھوں نے اصل اور نقل کے فرق کو واضح کر کے، اِس تحریف کے سلسلے میں اپنا فرض کیوں ادا نہیں کیا تھا؟

۱۴۔ نہ سہی، جن حضرات کے قبضے میں وُہ مکتوبات تھے کم از کم اُنھیں تو اپنے وحی و عصمت والے اور خدا سے مصافحہ و ملاقات کرنے والے، بلکہ باری تعالیٰ شانہٗ سے ہمکلامی کے شرف سے مشرف ہونے والے دادا پیر کی حمایت میں اغماض سے کام لے کر بدخواہوں کی فہرست میں اپنا نام نہیں لکھوانا چاہیے تھا، آخر وُہ سب کے سب کیوں چُپ سادھے پڑے رہے؟

۱۵۔ غلام رسول مہر کی تازہ تحقیق پر تو جناب قادری صاحب ایمان لے آئے کہ مکتوبات کی

اصل عبارتیں یُوں نہیں بلکہ یُوں ہیں۔ لیکن موصوف نے اِس طائفہ کی تاریخ کو شاید وہابیت کی عینک اُتار کر دیکھنے کا شرف کبھی حاصل ہی نہیں کیا ورنہ اُنھیں صاف نظر آجاتا کہ اِس جماعت کے اُونچی چوٹی کے علماء بھی اِتنے جری اور بیباک ہیں کہ خود باری تعالیٰ شانہٗ اور اُس کے سب سے برگزیدہ رسول پر بہتانات باندھتے ہُوئے بھی کبھی نہیں ڈرے، عظمتِ خداوندی اور شانِ مصطفوی کی ناپ تول کرتے رہنا اِن حضرات کا دائمی مشغلہ ہے، قرآنِ کریم کی کتنی ہی آیات کے چودہ سو سالہ متوارث معانی و مطالب سے انحراف کرکے اُنھیں اپنے پسندیدہ اور خود ساختہ معانی کا لباس پہناتے رہنا، احادیث میں جہاں چاہا متن یا شرح میں ہاتھ کی صفائی دکھانا ورنہ فنِ رجال کی بحث چھیڑ کر شعبدہ بازی کا کمال پیش کرنا، ایمان اور کفر، توحید اور شرک کی حدود میں ایسی دھاندلی مچانا کہ عوام الناس کو عجیب پریشانی میں مبتلا کر دینا اور ایک ایسے چکر میں پھنسا دینا جس سے نکلنے کا اُنھیں بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔

تصانیفِ اکابر سے وکُتبِ ائمہ سے عبارتیں نقل کرتے وقت من مانی عبارتیں بنالینا، اوّل یا آخر کا جُملہ اُڑا دینا، عبارت کے درمیان سے اپنے خلاف الفاظ کو ایسے انداز سے ہضم کر جانا گویا یہاں کوئی لفظ تھا ہی نہیں، اپنی طرف سے الفاظ گھڑ کر کسی بزرگ کی عبارت سے ملا کر سب کچھ اُن کے سر تھوپ دینا، طرّہ یہ کہ اپنے ذہن سے کتابیں گھڑ لینا، اُن کے مطابع، صفحے اور عبارتیں تک اپنے ہی ذہن کی مشین سے ایجاد کرکے علمائے اہلسنت کو چیلنج کرتے رہنا کہ دیکھو جناب! تم ایسا کہتے ہو حالانکہ تمھارے فلاں فلاں بزرگ نے اپنی فلاں فلاں تصنیف کے فلاں فلاں صفحے پر تمھارے خلاف یُوں لکھا ہوا ہے۔ حالانکہ اُن کتابوں کا دنیا کے پردے پر کہیں نام و نشان نہیں ہوتا، کسی کتاب میں اُن کا ذکر تک نہیں، ذکر کہاں سے ہو جبکہ یہ مصنوعات ہی گھڑنت ساز فیکٹری کی ہیں۔ اِن حضرات نے اپنی انتہائی ہنرمندی اور کرشمہ سازی سے روافض کے کان بھی کاٹ رکھے ہیں۔

اُسی طائفہ سے ایک ایسی آواز اُٹھے جو اُس کی پُوری تاریخ کے علماء و مؤرخین کی تصریحات کے خلاف ہو، کیا ایسی آواز انصاف کی رُو سے قابلِ سماعت ہے؟

"میٹھی میٹھی ہپ، کڑوی کڑوی تھو" والی بات دوسری ہے ورنہ اِس طرح کس فرد یا جماعت کی تاریخ کو نہیں بدلا جا سکتا؟ کون سے ولی کو شیطان اور کون سے شیطان کو ولی ثابت کرنے کی جسارت نہیں ہو سکتی؟ لیکن سوال تو یہی ہے کہ ایسا کرنے سے کیا حقیقت بھی بدل جایا کرتی ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو قریباً ڈیڑھ سو سال کے بعد اِتنی تکلیف اٹھانے، اپنوں کو مطعون کرنے اور اپنی ہی تاریخ کو بدلنے کا آخر فائدہ کیا؟ افسوس!

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

۱۶- جامع مسجد دہلی والا تاریخی مباحثہ تو پیشِ نظر ہوگا جو ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ میں ہُوا تھا۔ کیا غور نہیں کیا کہ ایک طرف ولی اللّٰہی خاندان، تیرھویں صدی کے مجدِّد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خوشہ چین علمائے کرام اور اکثر علمائے دہلی ہیں تو دوسری طرف مذہب اہلسنت وجماعت سے بغاوت کرنے والے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور مولوی عبدالحی صاحب ہیں۔ اوّل الذکر جو متحدہ ہندوستان میں خارجیت و وہابیت کے بانی قرار پائے تھے، اُن سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ اپنا مسلمان ہونا ثابت کر دیجیے، اگر جناب کا ساختہ مذہب ہی اسلام کی صحیح تصویر ہے تو اپنے خاندانی اکابر مثل شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالعزیز، شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالرحیم کو کس طرح بزرگ بلکہ مسلمان بھی مانا جا سکتا ہے؟ کیونکہ آپ کے نزدیک اُن کا مذہب کفر و شرک بلکہ بُت پرستی تک کو اپنے اندر سموئے ہُوئے ہے۔ موصوف نے جواب کی گنجائش نہ پا کر راہِ فرار اختیار کرنے میں ہی خیریت سمجھی تھی۔ مولوی عبدالحی صاحب نے مجبور ہو کر گفتگو تو کی لیکن ہر مسئلے میں معمولی سی قیل وقال کے بعد اہلسنت کا موقف تسلیم کرتے چلے گئے حتّٰی کہ دستخط و مہر سے بھی گریز نہ کیا۔ یہ محض دفع الوقتی تھی ورنہ خارجیت سے اِن حضرات نے سرِ مُو کنارا نہیں کیا تھا۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے مسلکِ اہلسنّت اور اپنے خاندانی مذہب سے رُو گردانی کرنے کے باعث اپنے خاندانی علماء یعنی شاہ مخصوص اللہ و شاہ محمد موسٰی پسران شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہم کو بھی مُنہ دکھانا بند کر دیا، اِس طرح

دینی حلقوں کے اِس مرکز (خاندان عزیزی) سے موصوف کا رشتہ منقطع ہوگیا۔ یہ سب کچھ منظور لیکن مذہب اہلسنت اختیار کرنا ساری عمر نامنظور ہی رہا۔ معلوم نہیں سید صاحب کے اِس نامدار مرید نے جو اندرونِ خانہ سید صاحب کے رہبر اور اِس سارے ڈرامے کو سٹیج کرنے والے تھے، اُنھوں نے یہ ساری کارگزاری انگریز دشمنی میں ہی دکھائی تھی؟

۱۷۔ اگر سید صاحب انگریزوں کے خلاف ہوتے تو اُنھیں مسلمانوں سے کٹ کر، اپنے اکابر کے مسلک کو چھوڑ کر، مذہب اہلسنت و جماعت سے مُنہ موڑ کر، علیحدہ اپنا محمدی گروہ بنانے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟ اگر یہ اقدام حکومت کی شہ پر نہیں تھا تو اور کس ضرورت کے تحت تھا؟ اِس طرح شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مرکز سے رشتہ ٹوٹا، مسلمانانِ اہلسنت و جماعت کا ساتھ چھوٹا، جامع مسجد دہلی کے سب سے پہلے حنفی وہابی مباحثہ و مناظرہ کے ذریعے بھی راہِ راست پر نہ آئے، پنجتار میں صدہا علماء و مشائخ نے اِنھیں بدمذہب ثابت کر کے مذہب اہلسنت قبول کرنے کی دعوت دی لیکن نامنظور ہُوئی، جس کے باعث سرحد و پنجاب کے اکثر مسلمانوں نے جو حُسنِ ظن کے تحت ساتھی بن گئے تھے، اِن سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اِنھوں نے سرحدی مسلمانوں کو کلاب النار اور ملعونین اشرار ٹھہرا کر مستحل الدم قرار دے کر اُن کے خون سے ہولی کھیلنی شروع کی، اُن کے اموال کو غنیمت سمجھ کر ہضم کرنا شروع کیا، اُن کے ننگ و ناموس پر ڈاکے ڈالے تو اُن غیور مسلمانوں کے ہاتھوں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہونا قبول کر لیا لیکن اپنی سیاہ کاریوں اور بدمذہبی سے باز آنا کسی بھی مرحلے پر قبول نہ کیا۔ کیا سید صاحب اینڈ کمپنی کی یہ البیلی ادائیں، بانکی جفائیں، انگریز دشمنی کا کرشمہ تھیں؟

؎ کرم کوشیاں ہیں، ستم کاریاں ہیں
بس اِک دل کی خاطر یہ تیاریاں ہیں

۱۸۔ سید احمد صاحب کے مذہبی رہنما یعنی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے کمال اطاعت شعاری سے انگریزی منصوبے کے مطابق پیارے مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین میں تحریف کرنے اور شجرِ اسلام میں توحید کی آڑ لے کر غیر اسلامی عقائد و نظریات

کی قلمیں لگاتے وقت خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا کا قطعاً خیال نہیں رکھا تھا۔ کیا اُسی برٹش گورنمنٹ کی مخالفت کا خیال تک بھی سیّد صاحب اینڈ کمپنی کے قریب پھٹک سکتا تھا؟

۱۹۔ انصاف پسند حضرات سے التجا ہے کہ وہ سیّد صاحب کے ملفوظات، جنھیں مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور مولوی عبدالحی دہلوی نے "صراطِ مستقیم" کے نام سے کتابی صورت میں مرتب کیا تھا، اُس کی روشنی میں سیّد صاحب کی تصویر دیکھیں۔ بھلا جب تک مرزا غلام احمد قادیانی نے صریحاً دعویٰ نبوّت نہیں کیا تھا بلکہ وُہ اپنے متعلق مجدّد، مصلح، مہدی اور مسیح موعود وغیرہ ہونے کے دعوے کر رہا تھا اور پے در پے الہامات سنا رہا تھا، مرزائے قادیان کے اُس دَور اور سید احمد صاحب کے سارے کراماتی وطلسماتی دَور میں فرق کیا ہے؟ دعویٰ نبوّت کی مہلت ہی نہیں ملی تھی ورنہ وحی وعصمت تک کونسی صفتِ نبوّت ہے جو سیّد صاحب نے اپنی ذات میں نہیں بتائی یا اِس متن پر حاشیہ چڑھانے والوں نے اُن کے گلے میں نہ لٹکائی؟ باری تعالیٰ شانہٗ تک صعود، دیدارِ الٰہی، مصافحہ، مکالمہ، لین دین، عہد معاہدے، کلامِ حقیقی وغیرہ تک کے دعاوی سب موجود، چونکہ اِن میں سے بعض چیزیں کتنے ہی انبیاء کو بھی حاصل نہیں تھیں لہٰذا دعویٰ کر دیا کہ سیّد صاحب سرورِ کون ومکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مشابہت پر پیدا ہُوئے ہیں۔ اے انصاف کے شیدائیو! اے کلمہ طیبہ کے ہمراہیو! کیا یہ سارے مراحل انگریز دشمنی میں طے کیے جا رہے تھے؟

؎ بھلا دیتی ہیں سب رنج والم حیرانیاں میری
تری تمکینِ بے حد کی قسم، ایسا بھی ہوتا ہے

۲۰۔ پروفیسر صاحبانو! خدا کو حاضر وناظر جان کر ایک صاحب صراطِ مستقیم کتاب پکڑ لیں اور دُوسرے صاحب تقویۃ الایمان کو سنبھال کر بالمقابل بیٹھ جائیں۔ مضامین کا موازنہ کر کے دیکھ لیں، جو بات ایک میں جزوِ ایمان دُوسری میں وہی بات کفر وشرک کا سامان، جو شخص اِس کے نزدیک ولی دُوسری کے نزدیک شیطان، اِسی طرح اگر ایک کتاب دُوسری کا رد نہ کر دے تو ہمارا ذمہ۔ کہیے! اِس سے زیادہ وضوحِ حق اور اتمامِ حجت

اور کیا ہو سکتی ہے؟ حقیقت تو واقعی عیاں ہے لیکن اُن نازک مزاج مہربانوں کا کیا علاج، جو حقیقت کو مان لینے سے پہلے ہی نہ ماننے کی قسم کھائے بیٹھے ہوں۔ سوچیے تو سہی یہ کفر و ایمان کو شیر و شکر کرنے کی کارگزاری کیا انگریزوں سے ٹکرانے کی خاطر سرانجام دی جا رہی تھی؟ کہیں حکومت ہی کی شہ پر اپنا اور مسلمانوں کا دین و ایمان تباہ و برباد کرنے کے لیے تو ایسا نہیں کیا جا رہا تھا؟

ع قادری دین میں کہہ بھاگ خدا لگتی کچھ
مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

۲۱- اچھا جانے دیجیے ہر قسم کے بیانات کو، جائے غور ہے کہ انگریز جیسی دُور اندیش، باریک بیں اور عیار قوم جس نے اپنے روزِ اوّل سے ہی مسلمانانِ ہند کو خاص طور پر اپنے شکنجے میں کس رکھا تھا اور گرفت کو روز بروز مضبوط سے مضبوط تر کیا جاتا تھا، اگر اُسے سیّد صاحب اینڈ کمپنی سے ایک فیصد بھی اپنی مخالفت یا اپنے نقصان کا اندیشہ ہوتا تو انگریز اپنی مملکت میں انھیں کھلے بندوں ہر قسم کی قوت جمع کرنے کی کیا ایک منٹ کے لیے بھی مُہلت یا اجازت دینے کے روادار ہو سکتے تھے؟ کیا انگریز اِتنے بیوقوف تھے کہ خود اپنی آستین میں بصد شوق سانپ پال لیتے یا سیّد صاحب کے پاس اِتنی طاقت کہیں سے اچانک آ گئی تھی کہ انگریزوں میں اُنھیں روکنے ٹوکنے کی طاقت و جُرأت ہی نہ تھی؟

۲۲- زیادہ لکھنا، لمبے چوڑے دلائل پیش کرنا باعثِ طوالت ہوگا۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ خود اِن حضرات کے نزدیک، اِن کے جملہ مورّخوں کے نزدیک، یہ سارا خانوادہ، اِس کی تمام ذیلی شاخیں، سب کا وجود تک انگریز کی ہنرمندی کا مرہونِ منت ہے۔ اِس لیے سیّد صاحب ہوں یا اُن کا سارا محمدی گروہ، بعد میں اِسی ڈگر پر چلائے جانے والے شمس العلماء قسم کے حضرات ہوں یا مصلح و ریفارمر وغیرہ، یہ سب اور اِن کی ساری جماعتیں، سب کے سب برٹش گورنمنٹ کے وفادار، اطاعت شعار بلکہ آلۂ کار بن کر رہے اور اِس روش پر نازاں تھے، فخریہ اِس کا چرچا کرتے اور گورنمنٹ کی مزید عنایات

کے حقدار بنتے رہتے، مخالفین پر زبانِ طعن دراز کرتے، اُن کی زبان بندی کرواتے اَور "سیّاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا" کے مصداق خُوب مزے لُوٹتے تھے۔ ماسوائے اُن حضرات کے جو تحریکِ خلافت کے زمانہ سے گاندھی کو اپنا امام اور پیشوا بنا بیٹھے تھے، باقی حضرات کی ۱۹۴۷ء تک یہی کیفیت رہی۔ اُس وقت اِس دوستی کا ظاہر کرنا باعثِ عنایات تھا لیکن جب انگریز دوڑ گئے، وُہ چشمِ کرم ہی نہ رہی جس سے عنایتوں کی بارش ہُوا کرتی تھی، بلکہ اب انگریز دوستی کے اظہار میں محض رُسوائی کے سِوا اَور کچھ نہ تھا، اِسی لیے یار لوگوں نے انگریزوں کے دوڑ جانے کے بعد اُلٹی گنگا بہانی شروع کر دی کہ صاحبو! کیسی دوستی اور کہاں کی دوستی؟ انگریز سے ہمیں محبت نہیں تھی، ہمارے بعض بزرگوں کا جو انگریزوں کی بارگاہ میں آنا جانا اور فیضیاب ہوتے رہنا تھا وُہ کوئی آلۂ کار بننے کے لیے تھوڑا ہی تھا بلکہ صرف تفریحِ طبع کے لیے ایسا کیا جاتا تھا۔ رہا یہ کہ ڈیڑھ سو سال سے ہمارے علماء اَور مورّخین لکھتے آرہے ہیں کہ ہماری اَور ہمارے چھوٹے بڑوں کی انگریز دوستی ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے تو اِس قسم کی باتوں کا وہی لوگ یقین کرتے ہیں جنھیں انگریزوں سے کچھ بھی سیکھنے کا موقع نہیں ملا، ورنہ جب انگریز نہ رہے تو ہماری انگریز دوستی ہی کہاں رہ گئی؟ دریں حالات جب ہم انگریزوں کے دوست نہ رہے تو اپنے بزرگوں کے ماتھے پر یہ کلنگ کا ٹیکہ کیوں باقی رہنے دیں۔ یقین جانیے اگر ہمارے وُہ علماء اَور مورّخین زندہ ہوتے جو انگریز دوستی کے بیانات دیتے آرہے تھے تو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو یعنی پاکستان کی تاریخ کے پہلے ہی روز وُہ حضرات بھی یہی کچھ کہہ اُٹھتے جو آج ہم کہہ رہے ہیں اور فوراً اپنی اپنی تصانیف کے شروع میں "اعتذار" کی ایک ایک چِٹ شامل کر دیتے، جس میں لکھا ہُوا ہوتا کہ "اِس کتاب کے فلاں فلاں صفحے پر کاتب کی غلطی سے جو انگریز دوستی لکھا گیا ہے، قارئینِ کرام اُسے انگریز دشمنی پڑھیں، ہم اپنی کوتاہی پر معذرت خواہ ہیں، اگلے ایڈیشن میں اصلاح کر دی جائے گی انشاءاللہ۔ لیکن: ؎

بھلانے پہ بھی قصّۂ ربطِ ماضی
بھلایا نہ جائے گا، ہم سے نہ تم سے

۲۳- اِس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ اپنی ساری تاریخ کو بدلنے کا ٹھیکہ لینے والے جناب غلام رسول مہر کی مندرجہ ذیل شہادت، خود اُن کے اپنے لفظوں میں کافی رہے گی:

> ”اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ سیّد صاحب کس کے خلاف جہاد کی دعوت دے رہے تھے؟ آیا وُہ صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے، جیسا کہ سوا سو سال سے سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے اور وُہ بھی محض اِس بناء پر کہ پنجاب کی سکھ حکومت مسلمانوں پر بے پناہ ظلم کر رہی تھی۔“[1]

موصوف اپنی سوا سو سالہ تاریخ کو بدلنے کی سعادت حاصل کرنے والے ہیں کیونکہ یہ حقیقت موصوف کے جذبۂ عقیدت پر گراں گزرتی تھی۔ ثبوت میں اُس خط کے دو اقتباس پیش کیے ہیں جو سیّد احمد صاحب نے شاہِ بخارا کو بھیجا تھا نیز والیِ ہرات کے نام لکھے گئے خط کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ ان میں سیّد صاحب نے ہندوستان پر انگریزی تسلط کا ذکر بھی کیا ہے۔ ہماری نظر میں یہ موصوف کے کھلے مغالطے ہیں کیونکہ صوبہ سرحد میں سیّد صاحب اینڈ کمپنی کو بدمذہب اور انگریزوں کا ایجنٹ کہا جاتا تھا۔ وہ اگر دو چار لفظ انگریزوں کے خلاف نہ کہتے تو اور کیا یُوں لکھ دیتے کہ ”واقعی ما بدولت برٹش گورنمنٹ کے آلۂ کار ہیں“۔ بدنامی کا داغ مٹانے اور مسلمانوں کو ساتھ ملانے کی غرض سے انگریزوں کے خلاف دو لفظ مصلحتاً کہنے کا تکلف فرمایا گیا تھا ورنہ حقیقت اپنی جگہ عیاں ہے۔

۲- مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) اور سیّد احمد صاحب ایک ہی گاڑی کے دو پہیے، ایک جان اور دو قالب یا بمنزلۂ روح اور جسم تھے، اِسی لیے ایک کو دُوسرے سے جُدا کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ دریں حالات گزشتہ سطور میں جو کچھ سیّد صاحب کے بارے میں لکھا گیا ہے اُسے اِن دونوں حضرات کے بارے میں سمجھا جائے کیونکہ اگرچہ بظاہر سید صاحب ہی مرشد یا امیر المومنین کی پوزیشن میں جماعت کے سرگروہ نظر آتے ہیں، لیکن اندرونِ خانہ

---

[1] غلام رسول مہر: سیّد احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم، ۱۹۶۸ء، ص ۲۳۹

اِس سارے ڈرامے کو ترتیب دے کر پیش کرنے والے اَور اِس نوزائیدہ محمدی گروہ کے قافلہ سالار اور رُوحِ رواں، یہی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی تھے۔

موصوف نے جب جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر وعظ کہنا شروع کیا اور اپنے بعض غیر اسلامی اور خلافِ مذہب عقائد و نظریات کی تبلیغ شروع کی تو دہلی کے عوام و خواص میں اور خصوصاً شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے معتقدین میں غیظ و غضب کی ایک لہر دوڑ گئی کہ دن دہاڑے یہ کیا ہونے لگا، جس گلشن کی آبیاری یہ خاندان بڑھ چڑھ کر کرتا آیا ہے اُسی خاندان کا ایک عالِم اپنے آباء و اجداد کے مذہب کو، عالمِ اسلام کے مذہب کو، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی آنکھیں بند ہوتے ہی، قربانی کا بکرا بنا کر خارجیت کے بُت کی نذر کر رہا ہے۔ عوام و خواص نے دنگا فساد کی بجائے قانونی راستہ اختیار کیا۔ پندرہ سو مسلمانوں کے دستخطوں کے ساتھ ریذیڈنٹ کی خدمت میں اِس وعظ کے خلاف درخواست پیش کی گئی۔ ہوسکتا ہے کہ ریذیڈنٹ کو حکّامِ اعلیٰ نے اُس وقت تک موصوف کے بارے میں کوئی خصوصی ہدایت نہ بھیجی ہو، یہی وجہ ہے کہ لاعلمی میں پندرہ سو مسلمانوں کا پاس لحاظ کرتے ہُوئے نیز امن و امان بحال رکھنے کی خاطر موصوف کا وعظ ممنوع قرار دے دیا اور بذریعہ کوتوال تحریری حکم بھیج دیا گیا۔

موصوف نے اعلیٰ حکّام کو اِس پابندی سے مطّلع کیا ہوگا، اعلیٰ حکّام نے ریذیڈنٹ کو صورتِ حال بتائی ہوگی اور خصوصی ہدایات سے نوازا ہوگا، جس کی اطلاع موصوف کو مِل گئی ہوگی، لہٰذا انھوں نے اپنے معاونین یعنی برادرانِ دینی و یقینی کو ساتھ لے کر ریذیڈنٹ سے ملاقات کی۔ ملاقات کے تیور ملاحظہ ہوں:

”آپ نے خارجی طور پر دریافت کر کے کہ فلاں وقت ملنے ملانے اور فرصت کا ہوتا ہے، سیدھے کوٹھی پر پہنچے، ساتھ میں صرف مولوی عبدالصمد بنگالی اور مولوی عبدالرحیم محدّث تھے اور ایک آپ کا منشی ہیرالال تھا اور ایک خدمتگار تھا پہلے آپ نے جا کر اطلاع کرائی، جوُں ہی ریذیڈنٹ نے سُنا کہ شاہ اسمٰعیل آئے ہیں فوراً باہر نکل آیا اور باہر برانڈے سے آکر لے گیا۔ حد سے زیادہ عزّت کی اور بار بار یہ کہا کہ آپ نے بڑا ہی سرفراز کیا (یہ عقیدت!) معمولی مزاج پرسی

کے بعد ریذیڈنٹ نے خود یہ الفاظ کہے، "مولوی صاحب، ہمارے سررشتہ دار (علامہ فضل حق خیرآبادی) کی غلطی سے آپ کے وعظ بند کرنے کا میں نے حکم جاری کر دیا تھا، لیکن جب آپ نے واجبی اور معقول وجہیں لکھیں تو میں نے اُسی وقت حکمِ ثانی لکھوا دیا تھا کہ وعظ قدیمی طور پر جاری کیا جائے اور کوئی مزاحم نہ ہو۔"[1] جائے غور ہے، جہاں عوام کا احتجاج بے کار ہو کر رہ جائے، سررشتہ دار کی رپورٹ بیکار ثابت ہو جائے جس ریذیڈنٹ نے حکماً وعظ بند کیا تھا وہ اُلٹا مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی تعظیم و تکریم پر مجبور ہو جائے اور فوراً وعظ جاری کرنے کا حکم نافذ کرے کیا مسلمانوں نے صورتِ حال کو سمجھ نہ لیا ہوگا؟ کیا کمپنی کی اِس سازش کو سمجھنے سے وہ قاصر رہ گئے ہوں گے؟ لیکن جہاں مغل بادشاہ (اکبر شاہ) بھی بے دست و پا ہو کر بیٹھ رہا ہو وہاں عوام الناس کیا کر سکتے تھے؟ بیچارے صرف خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتے اور بامرِ مجبوری دین کی بیخ کنی کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اِس صورتِ حال کے پیشِ نظر بصد حسرت و یاس جو ریمارک دیا وہ پورے حالات کو سمجھنے کے لیے کافی ہے:

> "جب یہ لوگ (مسلمانانِ دہلی) مولوی منطقی صاحب (علامہ فضل حق خیرآبادی) کے پاس پہنچے اور ساری کیفیت عرض کی تو وہ آبدیدہ ہو کر کہنے لگے کہ "اسمٰعیل دین محمدی کی بیخ کنی کیے بغیر نہیں رہنے کا۔" یہ مولوی منطقی صاحب کا پہلا جملہ تھا جو اُنھوں نے پیارے شہید کی نسبت استعمال کیا۔"[2]

موصوف کے بارے میں اِس سلسلے کی ضروری معلومات کا تذکرہ ہم گزشتہ ابواب میں تفصیل سے پیش کر چکے ہیں، اعادے کی ضرورت نہیں۔ اب اُن کے بیانات اپنی تحریکِ جہاد کے متعلق ملاحظہ ہوں:

> "یہ بھی صحیح روایت ہے کہ اثنائے قیامِ کلکتہ میں جب ایک روز مولانا محمد اسمٰعیل صاحب

---

[1] حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۰۲ء، ص ۹۳

[2] ایضاً: ص ۹۰

وعظ فرما رہے تھے، ایک شخص نے مولانا سے یہ فتویٰ پُوچھا کہ سرکارِ انگریزی پر جہاد کرنا درست ہے یا نہیں؟ اِس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ ایسی بے رُو ریا اور غیر متعصب سرکار پر کسی طرح بھی جہاد کرنا درست نہیں ہے۔"[1]

مرزا حیرت دہلوی نے اِس واقعے کو اپنے لفظوں میں یُوں بیان کیا ہے:

"کلکتہ میں جب مولانا اسمٰعیل صاحب نے جہاد کا وعظ فرمانا شروع کیا ہے اور سکھوں کے مظالم کی کیفیت پیش کی ہے تو ایک شخص نے دریافت کیا، آپ انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے؟ آپ نے جواب دیا، اُن پر جہاد کسی طرح واجب نہیں ہے، ایک تو اُن کی رعیّت ہیں، دُوسرے ہمارے مذہبی ارکان کے ادا کرنے میں وُہ ذرا بھی دست اندازی نہیں کرتے، ہمیں اُن کی حکومت میں ہر طرح آزادی ہے، بلکہ اگر اُن پر کوئی (مسلم یا غیر مسلم) حملہ آور ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وُہ اُس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں۔"[2]

نیچری فرقے کے بانی جناب سرسیّد احمد خاں نے اپنے لفظوں میں یہ قصّہ یُوں سپردِ قلم کیا تھا:

"ایک مرتبہ وہ (مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی) کلکتہ میں سکھّوں پر جہاد کا وعظ فرما رہے تھے۔ اثنائے وعظ میں کسی شخص نے اُن سے دریافت کیا کہ تم انگریزوں پر جہاد کرنے کا وعظ کیوں نہیں کہتے، وُہ بھی تو کافر ہیں۔ اِس کے جواب میں مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے فرمایا کہ انگریزوں کے عہد میں مسلمانوں کو کچھ اذیت نہیں ہوتی اور چونکہ ہم انگریزوں کی رعایا ہیں اِس لیے ہم پر اپنے مذہب کی رُو سے یہ بات فرض ہے کہ انگریزوں پر جہاد کرنے میں ہم کبھی شریک نہ ہوں۔"[3]

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: سوانح احمدی، ص ۷۳

[2] حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۶۴

[3] سر سید احمد خاں: ہنٹر پر ہنٹر، مطبوعہ لاہور، ۱۹۴۹ء، ص ۲۹

اپنے اکابر کی انگریز دوستی کا داغ مٹانے سے اپنے کو مجبور دیکھ کر اپنے امام مذہب مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے عاشقِ زار یعنی مولوی محمد منظور نعمانی سنبھلی کو اِن الفاظ میں اعتراف کیے بغیر کوئی راستہ نظر نہ آیا:

”مشہور یہ ہے کہ آپ نے انگریزوں سے مخالفت کا کوئی اعلان نہیں کیا، بلکہ کلکتہ یا پٹنہ میں اُن کے ساتھ تعاون کا اظہار کیا اور یہ بھی مشہور ہے کہ انگریزوں نے بعض بعض موقعوں پر آپ کی امداد بھی کی ہے۔“ [1]

مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی نے اِس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یہ فیصلہ کن بیان دیا ہے:

”سر سیّد نے اِس مضمون میں یہ بات بار بار لکھی ہے کہ حضرت سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید، انگریزی حکومت کے ہرگز ہرگز مخالف نہ تھے اور نہ ہی اُنھوں نے کبھی اِن کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ سر سیّد کے اِس بیان کی تائید بعد کے متعدد مورّخوں نے بھی کی ہے، چنانچہ نواب صدیق حسن نے ترجمانِ وہابیہ مطبوعہ امرتسر کے صفحہ ۲۱، ۸۰ پر، نیز سوانح احمدی مولفہ محمد جعفر تھانیسری میں بیس مقامات پر، اِسی طرح حضرت شاہ اسمٰعیل کی سوانح موسوم حیات طیبہ کے صفحہ ۱۸۹، ۲۹۲، ۲۹۴ پر اِس خیال کو پیش کیا گیا ہے۔ مگر حال میں بعض اصحاب نے اِن حقائق کے برخلاف یہ لکھنا شروع کر دیا ہے کہ حضرت سیّد احمد راتے بریلوی اور حضرت شاہ اسمٰعیل کا اصل مقصد انگریزوں کے خلاف جہاد تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسے حضرات کا یہ بیان واقعات کے مطابق نہیں اور نہ اِس دعوے کا کوئی واضح ثبوت موجود ہے۔“ [2]

---

[1] ماہنامہ ”الفرقان“ لکھنؤ، شہید نمبر، ۱۹۵۵ء، ص ۶۷

[2] محمد اسمٰعیل پانی پتی، مولوی: مقالاتِ سر سیّد، حصّہ نہم، مطبوعہ لاہور، ص ۲۰۷

۳۔ مولوی محمد اسحاق دہلوی

آپ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے اور جانشین تھے۔ چونکہ مولوی محمد اسمٰعیل جو حضرت کے بھتیجے اور مولوی عبدالحی بڈھانوی (المتوفی ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ء) جو شاہ صاحب کے داماد تھے یہ خاندان عزیزی کے مسلک سے بغاوت کر چکے تھے، اِس لیے آپ نے اپنے وصال سے قبل ہی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء میں شاہ محمد اسحاق دہلوی کو اپنا خلیفہ نامزد کر دیا تھا۔ یہ کیوں بدلے؟ پس منظر ملاحظہ ہو۔

حالات کے بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی سید احمد صاحب کے نامور خلیفہ اور اُن کی تحریکِ جہاد کے سرگرم کارکن مولوی محبوب علی صاحب کسی زمانے میں مسلمانانِ سرحد کے بارے میں یہ فتویٰ صادر فرما رہے تھے:

"سکھوں سے زیادہ اِن کلمہ گو کافروں پر جہاد فرض ہے۔"[1]

جب اِنھوں نے دیکھا کہ ہمارے مجاہدین سکھوں کا نام لے کر مسلمانوں کو تہِ تیغ کر رہے ہیں۔ اُن کی جانوں اور اموال کو اپنے لیے حلال ٹھہرایا ہُوا ہے اور اُن کے ننگ و ناموس سے کھیل رہے ہیں۔ تو ان کا ضمیر کچھ بیدار ہوا یا اِسلامی غیرت نے کچھ رنگ دکھایا یا کلمہ گوئی کا کچھ پاس لحاظ سامنے آیا، کہ برملا اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے:

"تمھارے اُوپر زوجہ، بچّوں اور والدین کے حقوق ہیں، تم اُن سب حقداروں کے حقوق تلف کر کے یہاں بیٹھے ہو۔ جب لوگوں نے کہا، جہاد کے واسطے بیٹھے ہیں، تو مولوی صاحب نے کہا کہ جہاد کہاں ہے اور کس دِن تم نے کون سے کافر کو قتل کیا ہے اور کون سے ملک میں تمھارا عمل دخل ہے؟ صبح سے شام تک کھانے پکانے کی فکر میں رہتے ہو، جہاد کا نام لینا ایک دیوانہ پن ہے۔ بعض لوگ اِس حیلے سے یہاں عیش کرتے ہیں اور تمھاری دنیا و آخرت دونوں خراب ہیں۔"[2]

---

[1] حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۲۳

[2] محمد جعفر تھانیسری، منشی: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۳۵

مولوی محبوب علی نے جب ساتھیوں کو یوں لاجواب کیا حتّٰی کہ سیّد صاحب پر بھی اعتراضات کیے اور وطن واپس لوٹ آئے تو اِس تحریک کو بہت نقصان پہنچا، کیونکہ چندے کی فراہمی اور دہلی وغیرہ مراکز سے چندہ پہنچانے میں آپ نمایاں سرگرمی دکھا رہے تھے۔ مولوی محمد اسحاق دہلوی اِس موقع پر ظاہر ہوگئے کہ اِس تحریک سے موصوف بھی کسی قدر وابستہ ہو چکے ہیں۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اِس امر کی یوں تصریح کی ہے:

> "مولوی محبوب علی کے اغوا سے جو کاروبارِ جہاد کو صدمہ پہنچا، ویسا صدمہ اُس لشکر کو آج تک کسی سکھ یا درّانی کے ہاتھ سے نہ پہنچا تھا۔ مولوی محبوب علی کے فتنہ کے بعد مدّت تک ہندوستان سے قافلوں کا آنا بند ہوگیا، اکثر معاونینِ جہاد سُست ہوگئے۔ جب بہت سے خطوط مولوی محبوب علی کی تکذیب میں لشکرِ مجاہدین سے ہندوستان میں آئے تب مدتوں کے بعد مولوی محمد اسحاق صاحب اور مولوی محمد یعقوب صاحب معاونینِ جہاد کی سعی سے یہ فتنۂ محبوبی رفع ہو کر خرچ اور قافلوں کی روانگی دوبارہ شروع ہوئی۔"[1]

موصوف اِس دوران میں چونکہ تقویۃ الایمانی خیالات کے زیرِ اثر آ چکے تھے اور دوسری اِن تیرھویں صدی کے مجدّد شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی جانشینی کا شرف بھی حاصل تھا، اِن حالات میں فریقین کو خوش رکھنے کے لیے گول مول فتوے دیا کرتے تھے۔ جو باتیں تقویۃ الایمان میں کفر و شرک بتائی گئی ہیں، اُن میں سے بعض کو ناجائز، بعض کو مکروہ وغیرہ لکھ دیا کرتے تھے۔ لیکن موصوف اپنی اِس روش سے کسی فریق کو بھی خوش نہ کر سکے۔ مبتدعین نے تو اُن کی اِس روش کو بھی غنیمت سمجھا لیکن اہلسنت کے زمرے میں جب موصوف کی ساکھ زیادہ گرنے لگی، اکثر اہلِ علم اُن کی اِس روش سے آگاہ ہونے لگے تو آپ نے اپنی پوزیشن کو مزید خراب ہونے سے بچانے کی غرض سے ہجرت کو مناسب سمجھا، چنانچہ موصوف معرکۂ بالاکوٹ کے دس سال بعد یعنی، ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں مقدس سرزمینِ حجاز کو ہجرت کر گئے اور باقی وقت وہیں

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، منشی: حیات سیّد احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۳۸

گزارا۔ چونکہ اِس اہلسنّت سے علیحدہ ہونے والوں کے گروہ کی قیادت آپ کے سپرد تھی لہٰذا جاتے وقت مختلف حضرات پر مشتمل ایک بورڈ کی تشکیل کر گئے، جو اِس نوزائیدہ محمدی گروہ کا سرپرست بنایا گیا۔

۴۔ مولوی محبوب علی

یہ سیّد احمد صاحب کے مرید و خلیفہ اور اُن کی تحریکِ جہاد کے سرگرم کارکن تھے۔ آخر میں اپنے پیر کے جہاد کو فراڈ یا فساد سمجھ کر اُس سے کنارہ کش ہو گئے تھے، جیسا کہ پیچھے مذکور ہوا۔ انگریز دوستی کے سلسلے میں اپنے مرشد اور اپنی جماعت کی طرح ثابت قدم رہے۔ موصوف کے بارے میں سرسید احمد خاں نے یُوں لکھا ہے:

> "شاید اِس مضمون کے پڑھنے والے اِس عجیب بات کے سننے سے بھی خوش ہوں کہ مولوی محبوب علی صاحب وہی شخص تھے جن کو ۱۸۵۷ء میں باغیوں کے سرغنہ بخت خاں نے عین ہنگامۂ غدر میں طلب کیا اور اُن سے یہ درخواست کی کہ آپ اِس زمانے میں انگریزوں پر جہاد کرنے کی نسبت ایک فتویٰ پر اپنے دستخط کریں۔ مگر مولوی محبوب علی نے صاف انکار کیا اور بخت خاں سے کہا کہ ہم مسلمان گورنمنٹ انگریزی کی رعایا ہیں، ہم اپنے مذہب کی رُو سے اپنے حاکموں سے مقابلہ نہیں کر سکتے اور طُرّہ بریں یہ ہُوا کہ جو ایذا بخت خاں اور اُس کے رفیقوں نے انگریزوں کی میموں اور بچّوں کو دی تھی اُس کی بابت بخت خاں کو سخت لعنت ملامت کی۔"[1]

۵۔ مولوی کرامت علی جون پوری

تذکرہ علمائے ہند کے مرتّب پروفیسر محمد ایّوب قادری نے موصوف کے بارے میں یُوں

---

[1] سرسید احمد خاں: ہنٹر پر ہنٹر، مطبوعہ لاہور، بار اوّل ۱۹۴۹ء، ص ۳۲

تصریح کی ہے:

"جون پور میں پیدا ہوئے۔ شیخ احمد علی چڑیا کوٹی، مولانا احمد اللہ انامی اور مولانا قدرت اللہ رودولوی سے تحصیلِ علم کی۔ علمِ قرأت و تجوید سید ابراہیم مدنی سے حاصل کیا۔ سید احمد شہید کے مرید ہوئے۔ بنگال میں اسلام کی اشاعت کی۔ مولوی شریعت اللہ کی تحریک کا شدّت سے ردّ کیا۔ انگریزی حکومت کی موافقت میں جہاد کے خلاف فتویٰ دیا۔"[1]

انگریز مورّخ مسٹر ولیم ہنٹر نے اِن کی انگریز نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

"یہ بڑا ہی مبارک واقعہ ہے کہ جس ضلع (جون پور) سے ہندوستان کے سب سے بڑے مسلمان بادشاہ (اکبر) کے خلاف بغاوت کا فتویٰ شائع ہوا تھا، اُسی نے ایک ایسا عالم بھی پیدا کر دیا جس کا فتویٰ انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کو سختی سے منع کرتا ہے۔"[2]

مولوی کرامت علی جون پوری (المتوفی ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء) کی انگریز دوستی کے بارے میں مولوی مسعود عالم ندوی یوں تصریح کرتے ہیں:

"مجاہدین اور اتباعِ سیّد احمد شہید کے سب سے بڑے واقف کار، مسٹر جمیس اوکنلی نے شہادت دی ہے کہ مولوی کرامت علی صاحب برطانوی حکومت کے مؤید اور وہابیوں کے پکّے مخالف تھے۔ یہ تصدیق نامہ راج محل (بہار) میں ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو دیا گیا، جسے خود اُن کے پوتوں نے فخریہ ۱۹۱۴ء میں درج کرایا تھا۔ (وہ خوب صورت اور نظر زیب پمفلٹ راقم کی نظر سے گزر چکا ہے) اِس میں اُن کے صاحبزادے، مشہور ادیب، مولوی عبدالاوّل صاحب جون پوری اور حافظ احمد صاحب کی وفاداری کی بھی تصدیق ہے۔ اِس کے علاوہ راقم

---

[1] محمد ایوب قادری، پروفیسر: حاشیہ تذکرہ علمائے ہند اردو، مطبوعہ کراچی، بار اوّل ۱۹۶۱ء، ص ۳۹۶

[2] ولیم ہنٹر: ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۱۷۳

بھی یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ عقائد و اعمال میں وُہ سید صاحب کے اصحابِ خاص کی روش سے بالکل الگ تھے"۔ [1]

۶۔ مولوی مملوک العلی نانوتوی اینڈ کمپنی

مولوی مملوک العلی نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۱ء) ہی کو مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۵ء) نے سرزمینِ حجاز کی طرف ہجرت کرتے وقت تشکیل کردہ بورڈ کا سرپرست بنایا تھا۔ موصوف نے انتہائی خاموشی سے انگریزی مقاصد و مفادات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہُوئے دہلی کالج سے اینگلو انڈین علماء کی ایک ایسی کھیپ پیدا کی، کہ اُن کے ذریعے مسلمانوں کا تعلیمی نظام کچھ سے کچھ ہو کر رہ گیا اور دُوسری طرف اِن تیار کردہ علماءؒ نے انگریز کی موافقت میں فضا کو ہموار کرنے کا کام بڑی رازداری سے جاری رکھا۔ مولوی مملوک العلی کے بارے میں انگریزوں کی رائے کیا تھی، ملاحظہ فرمائیے:

> "دہلی کالج کے تمام انگریز پرنسپلوں کے وُہ معتمد تھے۔ کالج کی رپورٹوں سے واضح ہوتا ہے کہ انگریز پرنسپل مولانا مملوک العلی پر بہت اعتماد کرتے تھے اور ہر سالانہ رپورٹ میں اُن کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ ایک موقع پر گورنر جنرل بہادر نے مولانا مملوک العلی کو انعام سے بھی نوازا۔ صورت یہ ہُوئی کہ ۱۵ ر ۱۷ نومبر ۱۸۴۵ء کو گورنر جنرل بہادر نے دہلی میں دربار کیا۔ ۱۷ ر نومبر کے دربار میں ۲۷ حضرات کو انعام و اکرام سے نوازا۔ مولانا مملوک العلی مدرس اوّل کو خلعت سہ پارچہ مرحمت ہُوا۔" [2]

مولوی مملوک العلی کے شاگردوں میں وُہ حضرات بھی شامل ہیں جو مدرسہ دیوبند کے بانیوں اور چلانیوالوں میں تھے، جیسے مولوی محمود الحسن دیوبندی کے والد مولوی ذوالفقار علی صاحب اور مولوی شبیر احمد

---

[1] مسعود عالم ندوی، مولوی: ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، مطبوعہ راولپنڈی، ۱۳۶۸ھ، ص ۴۷

[2] محمد ایوب قادری پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، بار اول ۱۹۶۶ء، ص ۱۰۶

عثمانی کے والد فضل الرحمٰن دیوبندی وغیرہ اِس کھیپ کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری نے یُوں وضاحت کی ہے:

"مولانا مملوک العلی کے صدر مدرس ہونے کی وجہ سے دہلی کالج کی تعلیمی سرگرمیاں یقیناً آگے بڑھیں اور مسلمانوں کی ایک ایسی کھیپ تیار ہوئی جس نے نئے نظامِ تعلیم میں منسلک ہو کر خاطر خواہ خدمات انجام دیں۔ مولانا محمد مظہر (مدرس آگرہ کالج)، مولانا محمد منیر (مدرس بریلی کالج)، مولانا محمد احسن (مدرس بنارس و بریلی کالج)، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (مدرس بریلی کالج و ڈپٹی انسپکٹر مدارس)، مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی (ڈپٹی انسپکٹر مدارس)، تو خاص اِن (مولوی مملوک العلی) کے اعزّہ و اقارب ہیں۔

اِن کے علاوہ شمس العلماء ڈپٹی شیخ ضیاءُ الدین ایل۔ ایل۔ ڈی شمس العلماء مولوی ذکاءُ اللہ، شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد (ف ۱۹۱۲ء)، شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد (ف ۱۹۱۰ء)، پیرزادہ محمد حسین (سیشن جج)، خواجہ محمد شفیع (جج)، خان بہادر میر ناصر علی (ف ۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۳ء)، مولوی کریم الدین پانی پتی (ف ۱۸۷۹ء)، مولوی جعفر علی (ف ۱۳۱۴ھ) وغیرہ بہت سے ایسے حضرات ہیں جو اِسی دہلی کالج کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ ہیں اور کم و بیش ان تمام حضرات نے نئے تعلیمی نظام میں منسلک ہو کر نمایاں خدمات انجام دیں اور گورنمنٹ نے بھی اِن کی خدمات کو سراہا اور حُسنِ صلہ سے نوازا۔" ۱؎

۷۔ مولوی سمیع اللہ دہلوی

مولوی سمیع اللہ دہلوی کے بارے میں مولوی عبد الخالق قدوسی نے یُوں تصریح کی ہے:

"آپ (مولوی مملوک العلی نانوتوی) کے تلامذہ میں سے مولوی سمیع اللہ (دہلوی)

۱؎ محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، بار اول ۱۹۶۶ء، ص ۱۷۷

بڑی شہرت کے مالک اور گورنمنٹ کے معتمد علیہ آدمی تھے۔"[1]

مولوی مملوک العلی صاحب کے دُوسرے شاگرد مولوی ذکاءُ اللہ دہلوی نے موصوف کی سوانح عمری لکھی اور ۱۹۰۹ء میں مطبع انوار الاسلام حیدرآباد دکن سے شائع کروائی۔ اُس کا ایک اقتباس پروفیسر محمد ایوب قادری نے نقل کر کے نہ صرف موصوف کی انگریز دوستی کا، بلکہ برٹش گورنمنٹ کے آلۂ کار ہونے کا راز یُوں فاش کیا ہے:

"۱۶ دسمبر ۱۸۸۴ء کو مولوی سمیع اللہ مصر میں انگریزوں کے ساتھ استعمار کو مضبوط کرنے کی غرض سے پولٹیکل مشن پر مصر گئے اور وہاں اُنھوں نے جمال الدین افغانی کی تحریک (جو برطانوی استعمار کے خلاف تھی) کو نقصان پہنچایا۔ اِن خدمات کے صِلہ میں اُن کو سی۔ ایم۔ جی کا خطاب ملا۔"[2]

۸۔ مولوی ڈپٹی نذیر احمد دہلوی

موصوف بھی دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور مولوی مملوک العلی نانوتوی کے شاگرد تھے۔ برٹش گورنمنٹ نے اِن کے کارناموں کے پیشِ نظر شمس العلماء کا خطاب مرحمت فرمایا تھا۔ برٹش گورنمنٹ کے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی غرض سے ساری عمر قلم سے کام لیتے رہے اور مرنے سے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ انگریزی عنایات سے خوب فیضیاب ہوتے۔ قرآن کریم کا ترجمہ بھی کیا، مقصد یہی تھا کہ کلامِ الٰہی کی تعلیمات کو اپنے مخصوص نظریات کے مطابق ثابت کر کے دکھائیں، جیسا کہ سر سیّد احمد خاں، مرزا حیرت دہلوی اور کئی دُوسرے حضرات نے بھی اُس دَور میں کیا۔ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ اور انگریزوں کا حکمران ہو کر ہندوستان کے باشندوں کو جبراً غلام بنا لینا موصوف کی نظر میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی مہربانی تھی اور اِس انعامِ خداوندی کا شکریہ اِن لفظوں میں ادا کرتے ہیں:

---

[1] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، ۱۲ اکتوبر، ۱۹۷۰ء، ص ۶

[2] محمد ایوب قادری پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، ص ۱۸۴

"خدا کی بے انتہا مہربانی اِس کی مقتضی ہُوئی کہ انگریز بادشاہ ہُوئے۔"[1]

"ہم نے خدا کے فضل سے انگریزی عملداری میں آنکھ کھولی ہے، خدا اِس کو ابدالآباد تک سلامت رکھے۔"[2]

موصوف کو مسلمانوں کے حکمران رہنے سے بھی وُہ آرام نہیں پہنچ سکتا تھا جتنا انگریزوں نے پہنچایا۔ ڈپٹی صاحب کا یہ بیان اُن کے سوانح نگار نے اِن لفظوں میں نقل کیا ہے:

"شکر ہے کہ ہم رعایا بھی بنے تو ایسوں کی کہ جن کی عملداری میں ہم کو اپنی (مسلمانوں کی) سلطنت سے زیادہ آرام و آسائش ہے۔"[3]

۹۔ مولوی محمد احسن نانوتوی

مولوی محمد احسن نانوتوی (المتوفی ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء)، مولوی محمد مظہر نانوتوی اور مولوی محمد منیر نانوتوی کے حقیقی بھائی تھے۔ یہ جملہ حضرات دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور مولوی مملوک العلی کے شاگرد اور قریبی عزیز تھے۔ ۱۸۵۷ء میں موصوف بریلی کالج میں مدرس تھے۔ جنگِ آزادی کے وقت یُوں اپنا رنگ دکھایا:

"۲۲ رمئی ۱۸۵۷ء کو نمازِ جمعہ کے بعد مولانا محمد احسن صاحب نے بریلی کی مسجد نومحلہ میں مسلمانوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اُس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلافِ قانون ہے۔ نواب بہادر خاں کمشنر بریلی مسٹر الیگزینڈر کے بظاہر مددگار تھے اور نواب صاحب پر کمشنر بریلی کو پُورا اعتماد تھا۔ اِس سلسلہ میں ایک انگریز مورّخ رقمطراز ہے "پچھلی صدی کے...... محافظ (حافظ رحمت خاں) کے پوتے خان بہادر نے کمشنر (بریلی) کی کوششوں کی پُوری پُوری تائید کی اور کالج (بریلی کالج) سے منسلک ایک مولوی (محمد احسن نانوتوی) نے

---

[1] افتخار عالم بلگرامی: حیاتِ نذیر، مطبوعہ شمسی پریس دہلی، ص ۱۳۷

[2] ایضاً، ص ۱۳۷

[3] ایضاً، ص ۱۳۷

مسجد میں تقریر کی اور اُس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلافِ شرع ہے۔[1] موصوف نے انگریزوں کا حقِ نمک ادا کرتے ہُوئے جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو خلافِ شرع بتایا تھا، اُن کی یہ تقریر گویا مسلمانانِ بریلی کی ایمانی غیرت اور جذبۂ حریت کے لیے ایک چیلنج تھی۔ جب سارے شہر میں اِن کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور جان کا خطرہ تک پیدا ہو گیا، تو موصوف نے بریلی کو چھوڑنا گوارا کر لیا لیکن انگریز دوستی کو اپنے اکابر کی طرح چھوڑنا منظور نہ ہُوا۔ قارئین کرام درج ذیل اقتباس پر غور فرمائیں:

"اِس تقریر نے بریلی میں ایک آگ لگا دی اور تمام مسلمان مولانا محمد احسن نانوتوی کے خلاف ہو گئے۔ اگر کوتوالِ شہر شیخ بدرالدین کی فہمائش پر مولانا بریلی نہ چھوڑتے تو اُن کی جان کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔"[2]

۱۰۔ مولوی عبدالاحد

موصوف کون تھے؟ اِس کا جواب پروفیسر محمد ایوب قادری کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

"مولانا محمد احسن (نانوتوی) کے دو بیویاں تھیں ... دُوسری بیوی بنارس والی تھیں، اِن کو والدۂ عبدالاحد کہتے تھے ...... مولانا محمد احسن اپنی سوتیلی اولاد مولوی عبدالاحد اور زینب بی کی ضروریات کا بہت خیال رکھا کرتے تھے۔"[3]

اب موصوف کے لفظوں میں ہی مولوی عبدالاحد کا تفصیلی تعارف کروایا جاتا ہے:

"مولوی صاحب مرحوم، مولانا محمد احسن نانوتوی کے ربیب تھے اور وہ ۱۸۵۰ء میں بنارس میں پیدا ہُوئے۔ مولوی عبدالاحد کی تمام تر تعلیم و تربیت مولانا محمد احسن

---

[1] محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۶ء، ص ۵۰

[2] ایضاً: ص ۵۱

[3] ایضاً: ۱۱۸، ۱۱۹

نے کی۔۔۔۔۔ مولوی عبدالاحد چودہ سال کی عمر میں حفظِ قرآنِ کریم سے فارغ ہوئے۔ مولانا محمد احسن سے درسِ نظامی کی تکمیل کی اور ۱۸۶۹ء میں بریلی کالج سے انٹرنس پاس کیا۔ ۱۸۷۰ء میں گورنمنٹ اسکول بدایوں میں تھرڈ ماسٹر مقرر ہوگئے۔۔۔ ۱۸۷۵ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے وکالت کا امتحان درجہ اوّل میں پاس کیا، اُسی سال انبالہ میں "رسالہ نمبر ۱۵ بنگال" کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۴ء میں ملازمت کا سلسلہ منقطع کر دیا اور میرٹھ میں وکالت کرنے لگے۔

۱۸۸۶ء میں مولوی عبدالاحد نے منشی ممتاز علی بن شیخ امجد علی سے مطبع مجتبائی دہلی پانچسو روپے میں خریدا کیونکہ منشی ممتاز علی حجاز مقدس کو ہجرت کر گئے۔ مولوی عبدالاحد مرحوم نے مطبع مجتبائی کو بہت ترقی دی اور دراصل یہی مطبع اِن کی شہرت و نیک نامی اور دولت و امارت کا سبب بنا۔ پہلے یہ ایک معمولی سا مطبع تھا، مولوی صاحب مرحوم نے اِس کو بہت ترقی دی اور جلد ہی یہ مطبع برّ صغیر پاک و ہند کے مشہور مطابع میں شمار ہونے لگا اور ایسا شہرت پذیر ہُوا کہ آج تک اُس کی ساکھ قائم ہے۔"[1]

موصوف نے مولوی بشیرالدین احمد (المتوفی ۱۹۲۷ء) کی تصنیف "واقعاتِ دارالحکومت لی" جلد دوم، مطبوعہ شمسی پریس آگرہ ۱۹۱۹ء کے صفحہ ۱۹۱ سے مولوی عبدالاحد کے بارے ں ایک اقتباس یُوں نقل کیا ہے:

"دِلّی کے نہایت سربرآوردہ اشخاص میں آپ کا شمار ہے۔ قومی کاموں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی ہیں۔ آنریری مجسٹریٹ ہیں۔ اسی سال (۱۹۱۸ء) میں آپ کو خان بہادر کا خطاب ملا ہے۔ دہلی میں ایسا کوئی قومی جلسہ یا اہم کام نہ ہوگا جس میں آپ سب سے آگے نہ ہوں۔ دل کھول کر قومی کاموں میں جان و مال سے شرکت کرتے ہیں۔ جامع مسجد، مسجد فتحپوری، عرب اسکول،

محمد ایوب قادری پروفیسر؛ مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۱۶۰، ۱۶۲

یتیم خانوں وغیرہ کے ممبر ہیں۔"[1]

موصوف کی اِسی دریادلی کے بارے میں یوسف بخاری کی کتاب "یہ دِلّی ہے" کے صفحہ ۱۱۳ سے جامع مسجد دہلی کے امام شمس العلماء سید احمد صاحب کا ایک بیان پروفیسر محمد ایوب قادری نے نقل کیا ہے جو موصوف نے ۳ر ربیع الثانی ۱۳۶۶ھ/ ۹ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو دیا تھا۔ اُس بیان کا آخری حصہ ہدیۂ قارئین ہے:

"قوم کے کاموں اور تعلیمی اداروں میں اُنھوں نے بڑی فراخدلی سے چندے دیے۔ علی گڑھ کالج، عربک دہلی کالج اور انجمن مؤیدالاسلام کے بے حد دلدادہ تھے اور ہمیشہ اِن کی مالی امداد کرتے رہے۔ حکیم اجمل خاں کے طبیہ کالج میں شاندار خدمات اِن سے انجام پائیں۔ حکیم صاحب اُن کا عمر بھر اعتراف کرتے رہے۔"[2]

اِن جملہ مشاغل کے ساتھ موصوف کا برٹش گورنمنٹ کے ساتھ کیا رویّہ تھا؟ انگریزی حکومت اور عام مسلمانوں نے آپ کو کس نظر سے دیکھا؟ اِن تینوں سوالوں کا جواب مندرجہ ذیل عبارت میں تلاش کیجیے:

"پہلی جنگِ عظیم ۱۵-۱۹۱۴ء میں مولوی عبدالاحد نے حکومتِ برطانیہ کی بے مثال خدمت انجام دی۔ اِنھوں نے وار فنڈ میں دِل کھول کر چندہ دیا اور تقریباً تین لاکھ روپیہ قرضہ جنگ میں دیا۔ اِنھوں نے سِٹی ریکروٹنگ کمیٹی اور پبلسٹی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ اِن خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ برطانیہ نے مولوی عبدالاحد مرحوم کو خلعت، سند اور خان بہادر کے خطاب سے نوازا۔

۲ر دسمبر ۱۹۲۰ء کو مولوی عبدالاحد کا انتقال ہُوا۔ اُس زمانے میں

---

[1] محمد ایوب قادری پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، ص ۱۶۳، ۱۶۴

[2] ایضاً: ص ۱۶۴، ۱۶۵

خلافت کی تحریک زوروں پر تھی۔ حکام رس اور خطاب یافتہ حضرات کو لوگ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے، لہٰذا بعض لوگوں نے مولوی عبدالاحد مرحوم کی تدفین میں سخت رکاوٹیں ڈالیں۔" [1]

۱۱۔ میاں نذیر حسین دہلوی

میاں نذیر حسین دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء) موضع بلتھوا مضافات سُورج گڑھ ضلع مونگیر (بہار) میں بقول مصنفِ "الحیاۃ بعد المماۃ" ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء میں پیدا ہُوئے۔ موضع بلتھوا سیّدوں کی بستی تھی لیکن جس طرح مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی متحدہ ہندوستان کے شہرہ آفاق علمی و روحانی خاندان یعنی خاندان عزیزی کو لے ڈوبے اور ایک بھی قابلِ ذکر زد کا نشان باقی نہ رہا۔ اسی طرح میاں صاحب کی بستی میں سیّدوں کا ایک بھی گھر باقی نہ رہا بلکہ موصوف کے سوانح نگار کی تصریح کے مطابق وہاں صرف جولاہے آباد ہیں۔ موصوف کا ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء میں انتقال ہُوا۔ شاہ اسحاق دہلوی سے حدیث کی سند حاصل کی، جس کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری یُوں رقمطراز ہیں:

"مولوی نذیر حسین ولد جوّاد علی سُورج گڑھ ضلع مونگیر (بہار) میں ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء میں پیدا ہُوئے۔ ۱۶ سال کے بعد علم کی طرف میلان ہُوا۔ ۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۱ء میں وطن سے پوشیدہ طور پر صادق پور پہنچے وہاں کچھ درسی کتابیں پڑھیں۔ ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۹ء میں دہلی میں پہنچے۔ پنجابی کٹڑے کی مسجد اورنگ آبادی میں ٹھہرے۔ مولوی عبدالخالق دہلوی، اخوند شیر محمد قندھاری، مولوی جلال الدین ہروی، مولوی کرامت علی بنی اسرائیلی، مولوی محمد بخش، مولوی عبدالقادر رامپوری (المتوفی ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء) تلمیذ مفتی شرف الدین رامپوری سے جملہ علوم حاصل کیے۔ حدیث کی اجازت شاہ محمد اسحاق

---

[1] محمد ایوب قادری پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، ص ۱۶۵

دہلوی (ف ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵-۴۶ء) سے حاصل کی۔ نواب مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی، عبدالرحمٰن محدث پانی پتی کا بیان لکھتے ہیں کہ: ۔ جس روز شاہ محمد اسحاق صاحب ہجرت کر کے حجاز روانہ ہوئے تو اُس روز نذیر حسین اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند کتابوں کی اوّلیت کی ایک ایک حدیث پڑھی اور کُل کتابوں کی اجازت حاصل کی۔ شاہ صاحب نے ایک چھوٹے کاغذ پر یہی واقعہ لکھ دیا۔ اِس سے پہلے مدرسہ میں کبھی پڑھنے کو نہیں آئے۔[1]

سند حاصل کرنے کے اِس واقعے کو میاں صاحب کے سوانح نگار، مولوی فضل حسین بہاری نے تفصیل سے بیان کیا ہے اور واقعے کو خلط ملط کرتے ہوئے اصلیت کا صرف اتنا اعتراف کیا ہے:

> "مولانا محمد اسحاقؒ نے ۱۲۵۸ ہجری میں ہجرت کی اور اُسی سنہ میں بہ وقت رخصت میاں صاحب کو اُن سے سند و اجازت تحریری حاصل ہوئی۔"[2]

موصوف کی سند پر اکثر علماء معترض ہوا کرتے تھے کہ پلّے تو ہلدی کی ذراسی گانٹھ ہے لیکن پنساری بنے بیٹھے ہیں۔ کہاں باقاعدہ سند و تدریس سے محروم اور کہاں شیخ الکل ہونے کا پروپیگنڈا۔ چنانچہ ایسے ہی ایک واقعے کا تذکرہ میاں صاحب کے سوانح نگار نے یوں کیا ہے:

> "ایک روز مولوی احمد علی صاحب مرحوم سہارن پوری کو میاں صاحب نے خفا کر کے فرمایا: میں چپڑاس نہیں دکھاتا ہوں۔ تم بیٹھو میں صحاح پڑھاتا ہوں، دیکھو روش محدثانہ رکھتا ہوں یا نہیں؟ اکثر ایسے موقع پر شوخیِ طبع سے سند کو چپڑاس کے لفظ سے تعبیر کرتے۔"[3]

---

[1] محمد ایوب قادری: تذکرہ رجال حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۳۸۳

[2] فضل حسین بہاری، مولوی: الحیات بعد الممات، مطبوعہ ضیا پریس کراچی، ۱۹۵۹ء، ص ۵۹

[3] ایضاً: ص ۶۸

میاں صاحب نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وقت ایک انگریز عورت کی جان بچائی تھی۔ ساڑھے تین مہینے اُسے اپنے مکان پر رکھنے کے بعد انگریزوں کے کیمپ میں پہنچا دیا تھا۔ خصوصاً اِس واقعے کے بعد اُن کی نگاہوں میں برٹش گورنمنٹ اور حکومت کی نظر میں میاں صاحب کیا تھے؟

یہ پروفیسر محمد ایوب قادری کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

"۱۸۵۷ء میں ایک انگریز خاتون کو پناہ دی۔ ساڑھے تین مہینے تک رکھا، جس کے بدلے میں ایک ہزار تین سو روپیہ انعام اور خوشنودیِ سرکار کا سرٹیفکیٹ ملا جس زمانہ میں (۱۸۶۴ء - ۶۵) وہابیوں (غیر مقلد وہابیوں) پر مقدمے چل رہے تھے میاں نذیر حسین کو بھی بحیثیت سرگروہِ وہابیاں احتیاطاً ایک برس تک راولپنڈی کی جیل میں نظر بند رکھا گیا تھا مگر بقولِ مولفِ الحیٰوۃ بعد المماۃ وفادارِ گورنمنٹ ثابت ہوئے اور کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا جب میاں نذیر حسین حج کو گئے تو کمشنر دہلی کا خط ساتھ لے گئے۔ گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ۲۲ جون ۱۸۹۷ء کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔"[1]

خطاب ملنے کے واقعے کو موصوف کے سوانح نگار نے بھی بیان کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ۲۲ جون ۱۸۹۷ء مطابق ۲۱ محرم ۱۳۱۵ھ روز سہ شنبہ کو ملا۔ جن لوگوں کو شیخ کے دیکھنے اور کچھ دنوں بھی ساتھ رہنے کا شرف حاصل ہے وہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ عموماً خطاب پانے والے خطاب کے لیے جو کچھ کرتے ہیں آپ کی طبیعت میں بالفطرۃ اُس کا مادّہ ہی نہ تھا۔ وہ تدیّن، زہد و تقویٰ اور درویشی میں جس طرح ثابت قدم اور مستقیم الحال تھے ویسے ہی اِن امور کی جانب سے نہایت ہی لااُبالی اور بے پروا تھے۔ معلوم ہوا کہ جس وقت کمشنر دہلی نے بحکم لیفٹننٹ گورنر پنجاب، گورنمنٹ کی طرف سے اِس خطاب کی خبر آپ کو دی، اِس سے ایک منٹ آگے میاں صاحب کے وہم و گمان میں بھی کبھی یہ

---

[1] محمد ایوب قادری: تکملہ تذکرہ علماء ہند اُردو، مطبوعہ کراچی، ص ۵۹۵

بات نہیں آتی تھی کہ میں اِس عام لقب سے ملقب ہوں گا اور جب لوگ خلعت و خطاب کے ساتھ میاں صاحب سے ملے اور آپ کو اُس سے آگاہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ ہم غریب آدمی خلعت و خطاب لے کر کیا کریں گے؟ خلعت خطاب تو بڑے آدمیوں کو ملنا چاہیے۔ ہم کو دنیا لاحل ہے۔ بعد اِس گفت و شنود کے آپ نے اِسی قدر فرمایا: "اچھا آپ حاکم ہو، جو چاہو کہو"۔ [1]

جب میاں نذیر حسین صاحب کے وفادارِ حکومت ثابت ہونے کی بات چل نکلی ہے تو کیوں نہ اِس سلسلے میں موصوف کے سوانح نگار ہی سے پوچھا جائے؟ چنانچہ وُہ لکھتے ہیں:

"اِسی کے ساتھ یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ میاں صاحب بھی گورنمنٹ انگلشیہ کے کیسے وفادار تھے۔ زمانہ غدر ۱۸۵۷ء میں جب کہ دہلی کے بعض مقتدر اور بیشتر معمولی مولویوں نے انگریز پر جہاد کا فتوٰی دیا تو میاں صاحب نے نہ اُس پر دستخط کیا نہ مُہر۔ وُہ خود فرماتے تھے کہ: میاں وُہ ہلڑ تھا، بہادر شاہی نہ تھی۔ وہ بیچارہ بوڑھا بادشاہ کیا کرتا؟ حشرات الارض خانہ بر اندازوں نے تمام دہلی کو خراب، ویران، تباہ اور برباد کر دیا۔ شرائطِ امارت و جہاد بالکل مفقود تھے۔ ہم نے تو اُس فتوے پر دستخط نہیں کیا، مہر کیا کرتے اور کیا لکھتے؟ مفتی صدرالدین خاں صاحب چکر میں آ گئے۔ بہادر شاہ کو بھی سمجھایا کہ انگریزوں سے لڑنا مناسب نہیں ہے مگر وُہ باغیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہو رہے تھے، کرتے تو کیا کرتے؟" [2]

مولوی محمد اسمٰعیل نے جس داؤد ظاہری والے فتنے کا سنگِ بنیاد رکھا تھا، اُسی ترکِ تقلید کی میاں نذیر حسین دہلوی نے موصوف کے بعد کُھل کر سرپرستی کی اور اِس طرح غیر مقلدین کا ایک علیحدہ فرقہ معرضِ وجود میں آ گیا۔ علمائے اسلام نے سمجھانے بجھانے اور ردّ و تردید کے

---

[1] فضل حسین بہاری، مولوی: الحیات بعد الممات، ص ۱۸۰، ۱۸۱

[2] ایضاً: ص ۱۲۵

ذریعے خوب اپنا فریضہ ادا کیا لیکن موصوف پر کوئی اثر نہ ہُوا اور حکومت کی سرپرستی میں بے مُہار ہی دوڑتے بھاگتے رہے۔ ۱۳۰۰ھ میں میاں صاحب نے حجِ بیت اللہ کا ارادہ کیا۔ جانے سے پہلے موصوف نے اپنے خداوندِ نعمت، کمشنر دہلی سے چِٹھی حاصل کی جو الحیات بعد الممات کے صفحہ ۱۳۹ پر انگریزی میں درج ہے۔ وہاں اُس کا ترجمہ یُوں کیا ہے:

"مولوی نذیر حسین دہلی کے ایک بڑے مقتدر عالم ہیں، جنھوں نے نازک وقتوں میں اپنی وفاداری گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ ثابت کی ہے۔ وہ اپنے فرضِ زیارتِ کعبہ کے ادا کرنے کو مکّہ جاتے ہیں۔ مَیں اُمید کرتا ہُوں کہ جس کسی برٹش گورنمنٹ افسر کی وُہ مدد چاہیں گے وُہ اُن کو مدد دے گا کیونکہ وُہ کامل طور سے اِس مدد کے مستحق ہیں۔

دستخط جے۔ ڈی۔ ٹریملٹ بنگال
سروس کمشنر دہلی و سپرنٹنڈنٹ
۱۰ر اگست ۱۸۸۳ء" [1]

موصوف نے دوسری چِٹھی اُس انگریز افسر سے حاصل کی تھی، جس کی بیوی کو میاں صاحب نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ساڑھے تین ماہ اپنے گھر میں رکھا اور اُس کی جان بچائی تھی۔ چنانچہ سوانح نگار نے لکھا ہے:

"دوسری چِٹھی مسٹر لیسنس نے بنام کونسل مقیم جدّہ کے دی، جس میں آپ کی خیر خواہیِ زمانۂ غدر کا مفصل بیان تھا۔ اُنھوں نے یہ بھی جتا دیا تھا کہ اُن کے مخالفین بھی بہت ہیں اور اُن میں سے بعض مکہ معظمہ میں یہاں سے بھاگ کر مقیم ہو گئے ہیں۔ مسٹر لیسنس نے یہ بھی استدعا کی تھی کہ برٹش گورنمنٹ کانسل کا فرض ہے کہ اِن کو اِن کے مخالفین کے شر و فساد سے بچاتے۔ یہ چِٹھی برٹش کانسل مقیم جدّہ (مکتوب الیہ) نے اپنے پاس رکھ لی۔" [2]

---

[1] فضل حسین بہاری، مولوی: الحیات بعد الممات، ص ۱۴۰

[2] ایضاً: ص ۱۴۰، ۱۴۱

میاں صاحب سے مکہ مکرمہ میں بازپرس ہُوئی، تو حاکمِ مکہ معظمہ کے سامنے موصوف نے یہ بیان دیا:

> "ہندوستان میں اس وقت انگریزی حکومت ہے۔ وہاں ہر مذہب والا آزادی کے ساتھ اپنے شعارِ مذہب کے ادا کرنے کا مجاز ہے۔ کوئی مسلمان نہ جمعہ سے روکا جاتا ہے نہ جماعت سے اور یہاں اسلامی سرزمین اور مسلمانوں کی حکومت میں ہم لوگ طوافِ کعبہ اور جمعہ وجماعت سے مجبور ہیں۔ اِس کے بعد ہم یہ کہنے سے معذور سمجھے جائیں کہ انگریزی گورنمنٹ ہندوستان میں ہم مسلمانوں (وہابیوں) کے لیے خدا کی رحمت ہے۔"[1]

میاں صاحب اپنے غیر مقلد گروہ کے سرپرست اور شیخ الکل تھے۔ موصوف کے دستِ راست اور فعّال کارکن مولوی محمد حسین بٹالوی تھے۔ اِس سلسلے میں پروفیسر محمد ایّوب قادری نے یُوں لکھا ہے:

> "مولوی محمد حسین بٹالوی کی پُوری پالیسی میں شمس العلماء، شیخ الکل میاں نذیر حسین مدد ومعاون بلکہ سرپرست وسرخیل رہے اور صادق پور کے بجائے مرکزِ قیادت دہلی اور لاہور منتقل ہوگیا۔ پھر بیسویں صدی کے آغاز پر دسمبر ۱۹۰۶ء میں بمقام آرہ (بہار) آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس وجود میں آئی، جس کے سب سے فُعّال کارکن مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری تھے۔ اہلحدیث کانفرنس کی پالیسی بھی کم وبیش مولوی محمد حسین بٹالوی کے انداز پر رہی۔"[2]

ضروری ہُوا کہ مولوی محمد حسین بٹالوی کا انداز معلوم کیا جائے تاکہ اِس جماعت کے سرپرست میاں نذیر حسین دہلوی کا حکومت کے بارے میں اور بھی واضح نظریہ سامنے آجائے۔

---

[1] فضل حسین بہاری، مولوی: الحیات بعد الممات، ص ۱۶۱، ۱۶۲

[2] محمد ایّوب قادری: مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۸

۱۲۔ مولوی محمد حسین بٹالوی

مولوی محمد حسین بٹالوی (المتوفی ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء) حقیقت میں اُس جماعت کی پالیسی کے علمبردار ہیں جس کا سنگِ بنیاد مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے رکھا تھا۔ وہابیت کی اپنے روزِ اوّل سے ۱۹۲۰ء تک وہی پالیسی رہی جو مولوی محمد حسین بٹالوی نے اختیار کی۔ چنانچہ غیر مقلد حضرات کے سرگروہ، نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی نے اِس سلسلے میں لکھا ہے:

"۱۸۷۵ء میں مولوی محمد حسین سرگروہِ موحدین لاہور، بجواب وسوال ومسئلہ اَور اُس فتوے کے کہ آیا بمقابلہ گورنمنٹ ہند، مسلمانانِ ہند کو جہاد کرنا اور اپنی مذہبی تقلید میں ہتھیار اٹھانا چاہیے یا نہیں؟ یہ جواب دیا ہے اور بیان کیا ہے کہ جہاد جنگ مذہبی بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند یا بمقابلہ اُس حاکم کے کہ جس نے آزادی مذہبی دے رکھی ہے اور از روئے شریعتِ اسلام عموماً خلاف وممنوع ہے اَور وُہ لوگ جو بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند یا کسی اُس بادشاہ کے کہ جس نے آزادیِ مذہب دی ہے، ہتھیار اُٹھاتے ہیں اور مذہبی جہاد کرنا چاہتے ہیں، کُل ایسے لوگ باغی ہیں اور مستحق سزا کے مثل باغیوں کے شمار ہوتے ہیں۔

پھر مولوی محمد حسین نے اپنے اِس دعویٰ اور جواب کی تصدیق میں کُل علماء ملک پنجاب واطرافِ ہند کے پاس اپنے فتویٰ جوابی کو بھیج دیا اور اچھی طرح سے مشتہر کیا اور کُل علماءِ ہند و ملک پنجاب سے اِس بات کی تصدیق میں اقرار مُہری اور دستخطی کرالیا کہ عموماً مسلمانانِ ہند کو ہتھیار اٹھانا اور جہاد بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند کرنا خلافِ مسئلہ سنت وایمانِ موحدین ہے۔

اور نیز کل علمائے ملک پنجاب وہند نے تائید قول مولوی محمد حسین کی، کی ہے اور اپنے اپنے دستخط ومہر کر کے مولوی محمد حسین کو اِس فتویٰ میں بہت سچا اور پکا کہا ہے اور سب نے اپنی اپنی رائے اسلامی وایمانی سے اِس فتوے کو قبول کیا ہے اور جانا اور مانا ہے کہ بمقابلہ گورنمنٹ ہند فرقہ موحدین کو ہتھیار اٹھانا"

خلاف اسلام و ایمان کے ہے۔

پھر مولوی محمد حسین نے اِس بات کی استدعا کی تھی کہ وہابیانِ ملکِ ہزارہ کے نزدیک ایک عام ایلچی بذریعہ مسلمانانِ ہند کے بھیجا جائے اور وہ مع اِس فتویٰ کے جاکر اُس ناسمجھ کو مطلع کردے کہ جہاد بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند کے ممنوع ہے اور نیز اُن کو آگاہ کردے کہ اُن کی اِس نافہمی کے خونریزی و قتال وجہاد پر سخت گناہ ثابت ہے اور سب کا گناہ اُن کے سر پر وارد شرعی ہے اور چونکہ ازروئے شریعتِ اسلام، برٹش گورنمنٹ ہند سے جہاد کرنا، خلافِ طریقۂ اسلام و شریعتِ حقۂ کے ہے، اِس لیے اُن کو خیر خواہیٔ گورنمنٹ ہند میں برابر مستعد رہنا چاہیے۔”[۱]

مولوی محمد حسین بٹالوی نے اپنے فتوے میں انگریز کے خلاف جہاد کرنے کو ایمان اور اسلام کے خلاف قرار دیا ہے اور ایسا کرنے والے نہ صرف موصوف کے نزدیک بلکہ مولوی محمد حسین بٹالوی اور میاں نذیر حسین دہلوی کی تصدیق و تائید کرنے والے علمائے اہلحدیث کے نزدیک باغی اور مستوجب سزا ہیں۔ برسبیلِ تذکرہ یہاں جناب غلام رسول مہر کی تحقیق پر ایمان لانے والوں کی خدمت میں ایک گزارش بھی پیش کر دی جائے۔ وہ گزارش یہ ہے کہ تمام غیر مقلدین علماء کے اِس متفقہ فتویٰ کی روشنی میں سوچیے تو سہی! اگر آپ مہر صاحب کی پیروی میں سیّد احمد صاحب اینڈ کمپنی کے جہاد کا رُخ انگریزوں کی طرف بھی کرنا چاہتے ہیں تو بخوشی کیجیے لیکن اِس صورت میں جملہ وہابی علماء کے نزدیک وہ حضرات باغی اور مستحقِ سزا بنتے ہیں اور اُن کا یہ اقدام اسلام اور ایمان کے خلاف قرار پاتا ہے۔ اگر اِس فتوے کو ناقابلِ اعتبار سمجھا جائے تو ایسا کرنا غیر مقلد حضرات کی ساری کوشش کو ساقط الاعتبار ٹھہرانے کے مترادف ہوگا۔

اب قارئین[۱] کرام، مہر[۲] صاحب کی تحقیق پر ایمان لاکر سیّد احمد صاحب کے جہاد کا رُخ انگریزوں کی طرف کرنے والے حضرات اور علمائے[۳] اہلحدیث، یہ سارے حضرات اِس امر کا

---

[۱] صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی، نواب: ترجمانِ وہابیہ، مطبوعہ امرت سر، ص ۱۲۰

فیصلہ فرمائیں کہ:

۱- غلام رسول مہر فرماتے ہیں کہ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی کے جہاد کا رُخ حقیقتاً انگریزوں کی طرف تھا۔

۲- علمائے اہلحدیث فرماتے ہیں کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا اسلام اور ایمان کے خلاف ہے اور ایسا کرنے والا سزا کا حقدار اور باغی ہے۔

تینوں قسم کے حضرات خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ اِن فریقین میں سے کون سا فریق قابلِ اعتبار نظر آتا ہے اور کون سا ناقابلِ اعتماد؟ ہماری اِس سلسلے میں عاجزانہ التماس بس اتنی سی ہے کہ جس فریق کو بھی ناقابلِ اعتبار ٹھہرایا جائے اُس سے از راہِ کرم ہمیں بھی مطلع کر دینا، تاکہ ہم اُن سے محتاط رہیں۔

مولوی محمد حسین بٹالوی کے مذکورہ فتوے کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری کی تحقیق یہ ہے:

> ”مولوی محمد حسین بٹالوی نے سرکار برطانیہ کی وفاداری میں جہاد کی منسوخی پر ایک مستقل رسالہ ”الاقتصاد فی مسائل الجہاد“ ۱۲۹۲ھ میں لکھا۔ انگریزی اور عربی زبانوں میں اُس کے ترجمے ہُوئے۔ یہ رسالہ سر چارلس ایچی سن اور سر جیمس لائل گورنرانِ پنجاب کے نام معنون کیا گیا۔ مولوی محمد حسین نے اپنی جماعت کے علماء سے رائے لینے کے بعد ۱۲۹۶ھ میں رسالہ اشاعۃ السنہ کی جلد دوم شمارہ گیارہ میں بطور ضمیمہ شائع کیا، پھر مزید مشورہ اور تحقیق کے بعد ۱۳۰۶ھ میں باضابطہ کتاب کی صورت میں شائع ہوا۔“ [1]

موصوف کے مذکورہ فتوے کے متعلق جناب مسعود عالم ندوی کی رائے کچھ اِس طرح ہے:

> ”معتبر اور ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ اِس کے معاوضے میں سرکارِ انگریزی سے اِنھیں جاگیر بھی ملی تھی۔ اِس رسالے کا پہلا حصہ پیشِ نظر ہے۔ پُوری کتاب تحریف و

---

[1] محمد ایوب قادری: مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۵

تدلیس کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔"[1]

مولوی محمد حسین بٹالوی اپنے اِس فتوے پر بے حد نازاں تھے اور اِس کے ذریعے وہ اپنی ذات کو اور اپنی جماعت کو برٹش گورنمنٹ کے خیر خواہوں میں سب سے ممتاز دکھانے اور ثابت کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ موصوف کے رسالہ "اشاعۃ السنہ" لاہور، جلد ۸ کے صفحہ ۲۶۱، ۲۶۲ سے پروفیسر محمد ایوب قادری نے اُن کا اِسی فتوے کے سلسلے میں ایک بیان یُوں نقل کیا ہے:

> "اگرچہ اِس مضمون (منسوخی جہاد) کے رسائل گورنمنٹ اور ملک کے خیر خواہوں نے بھی لکھے ہیں لیکن جو ایک خصوصیت اِس رسالے میں ہے وُہ آج تک کسی تالیف میں پائی نہیں جاتی۔ وُہ یہ ہے کہ یہ رسالہ صرف مؤلف کا خیال نہیں رہا، اِس گروہ کے عوام و خواص نے . . . . اِس کو پسند کیا اور اِس سے اپنے آراء کا توافق ظاہر کیا۔ اِس توافقِ رائے کو حاصل کرنے کے لیے مؤلف (محمد حسین بٹالوی) نے عظیم آباد پٹنہ تک ایک سفر کیا تھا، جس میں لوگوں کو یہ رسالہ سُنا کر اتفاق حاصل کیا اور جہاں خود نہیں پہنچا وہاں اِس رسالے کی متعدد کاپیاں ارسال کر کے توافق حاصل کیا۔"[2]

یُوں تو کتنے ہی علماء برٹش گورنمنٹ کے آلۂ کار بن کر خفیہ یا اعلانیہ حمایت کا دم بھرتے اور انگریزوں کے تخریبی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اپنی پوری پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہے تھے لیکن انگریز کی علی الاعلان، ڈنکے کی چوٹ موافقت کرنے، جہاد کو منسوخ قرار دینے، انگریز کے مخالفوں سے ٹکر لینے میں مولوی محمد حسین بٹالوی[1]، مرزا غلام احمد قادیانی[2] اور سر سیّد احمد خاں[3] علی گڑھی سب سے ممتاز ہیں۔ یہ تینوں حضرات آپس میں تو ایک دُوسرے کے خلاف ہیں لیکن کسی بھی چوتھی ہستی کو، اِس میدان میں، اِن حضرات کا مدِّمقابل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ثبوت کے طور پر موصوف کا ایک بیان ملاحظہ ہو، جسے پروفیسر محمد ایوب قادری نے "اشاعۃ السنہ" لاہور

---

[1] مسعود عالم ندوی: ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، مطبوعہ راولپنڈی، ۱۳۶۸ھ، ص ۲۹

[2] محمد ایوب قادری: مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۵

جلد ۸، شمارہ ۹ کے صفحہ ۲۶۲ سے نقل کیا ہے:

"اِس گروہِ اہلحدیث کے خیرِ خواہ و وفادار رعایا برٹش گورنمنٹ ہونے پر ایک بڑی روشن اور قوی دلیل یہ ہے کہ یہ لوگ برٹش گورنمنٹ کے زیرِ حمایت رہنے کو اسلامی سلطنتوں کے ماتحت رہنے سے بہتر سمجھتے ہیں اور اِس امر کو اپنے قومی وکیل، اشاعۃ السنہ کے ذریعہ سے جس کے نمبر ۱۰، جلد ۶ میں اِس امر کا بیان ہُوا ہے (اور وُہ نمبر ہر ایک لوکل گورنمنٹ اور گورنمنٹ آف انڈیا میں پہنچ چکا ہے) گورنمنٹ پر بخوبی ظاہر اور مدلل کر چکے ہیں، جو آج تک کسی اسلامی فرقہ رعایا گورنمنٹ نے ظاہر نہیں کیا اور نہ آئندہ کسی سے اِس کے ظاہر ہونے کی اُمید ہو سکتی ہے۔"[1]

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی پیدا کردہ جماعت (غیر مقلد وہابی) اپنے روزِ اوّل ہی سے برٹش گورنمنٹ کی خیر خواہ اور وفادار تھی لیکن انگریزوں کے پنجاب پر قابض ہو جانے کے بعد سید صاحب کے بعض کاروباری قسم کے مجاہد خلفاء کا انگریزوں سے ٹکراؤ ہُوا، اُن کی تحریک کو مٹایا گیا، مقدمے چلے، سزائیں دیں۔ اِن حالات میں حکومت سے ناراضگی قدرتی امر تھا لیکن ایک طرف ورنمنٹ کا آہنی پنجہ تھا تو دُوسری طرف مولوی محمد حسین بٹالوی کی فہمائش۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پُوری ماعت برٹش گورنمنٹ کی وفادار و خیر خواہ بن کر اُس کے استحکام و قیام کو اپنے لیے نعمتِ غیر مترقبہ گرداننے لگے۔ اِس سلسلے میں مرزا حیرت دہلوی یُوں نغمہ سنج ہیں:

"گورنمنٹ خود جانتی ہے کہ اُس کی سلطنت کی برکتوں کو فرقہ اہلِ حدیث نے کس قدر تسلیم کیا ہے اور اُس کے کیسے فرمانبردار، مطیع اِس گروہ کے لوگ ہیں۔ اِن پر کیا، ہندوستان کے کل مسلمان اپنی گورنمنٹ کا ساتھ دیتے ہیں اور کبھی اُن کارروائیوں میں شریک نہیں ہوتے جو گورنمنٹ کے خلاف سمجھی جاتی ہیں۔"[2]

---

[1] محمد ایوب قادری: مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۷

[2] حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۶۷

مولوی محمد حسین بٹالوی نے ملکہ وکٹوریہ کے جشنِ جوبلی پر برٹش گورنمنٹ کی بارگاہ میں اپنا نذرانۂ عقیدت نچھاور کرنے کی غرض سے جو ایڈریس پیش کیا تھا اُس کا ایک اقتباس "اشاعۃ السنۃ" لاہور، جلد ۹، شمارہ ، کے صفحہ ۲۰۵، ۲۰۶ سے پروفیسر محمد ایوب قادری نے یُوں نقل کیا ہے،

"یہ مذہبی آزادی اِس گروہ کو خاص کر اِس سلطنت میں حاصل ہے بخلاف دوسرے اسلامی فرقوں کے کہ اُن کو اَور اسلامی سلطنتوں میں بھی یہ آزادی حاصل ہے، اِس خصوصیت سے یقین ہو سکتا ہے کہ اِس گروہ کو اِس سلطنت کے قیام و استحکام سے زیادہ مسرّت ہے اور اِن کے دل سے بارک باد کی صدائیں زیادہ زور کے ساتھ نعرہ زن ہیں۔"[1]

اِسی سلسلے میں پروفیسر محمد ایوب قادری کا یہ بیان بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے:

"اِسی طرح لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کی سبکدوشی پر جماعت اہل حدیث نے ایک خوشامدانہ ایڈریس دیا، جس پر سب سے پہلے شمس العلماء میاں نذیر حسین کے دستخط ہیں۔ اِس کے بعد ابو سعید محمد حسین وکیل اہلِ حدیث، مولوی احمد اللہ واعظ میونسپل کمشنر امرت سر، مولوی قطب الدین پیشوائے اہلِ حدیث روپڑ، مولوی حافظ عبد اللہ غازی پوری، مولوی محمد سعید بنارسی، مولوی محمد ابراہیم آرہ اور مولوی نظام الدین پیشوائے اہلحدیث مدراس کے دستخط ہیں۔"[2]

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد صاحب نے اپنی اِس نوزائیدہ جماعت کا نام "محمدی گروہ" رکھا تھا۔ خلفاء کا دَور آیا تو اپنے لیے "موحدین" اور مسلمانوں کو مشرکین بتانے لگے لیکن محمد بن عبد الوہاب کے نقشِ قدم پر چلنے کی بنا پر متحدہ ہندوستان کے مسلمان بھی انھیں اہلِ عرب کی طرح "وہابی" ہی کہا کرتے تھے۔ جب مقدمۂ انبالہ کے تحت انگریزوں نے اپنے خانہ زادوں کی گوشمالی شروع کی، جو اب انگریزوں کو بھی آنکھیں دکھانے لگے تھے۔ اِس پکڑ دھکڑ سے وہابی

---

[1] محمد ایوب قادری: مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۷

[2] ایضاً: ص ۲۷

حضرات گھبرا اُٹھے۔ اِس موقع پر مولوی محمد حسین بٹالوی کام آئے۔ ایک طرف اُنھوں نے حکومت کے غصّے کی آگ اپنی خوشامدانہ روش اور کاسہ لیسی کے پانی سے سر سید احمد خاں کی طرح بُجھانی شروع کی اور دُوسری طرف اپنی پُوری جماعت کو حکومت کا وفادار بنا دیا۔ اِس جماعت کے ماتھے پر جو مسلمانوں نے وہابیت کی چِٹ لگا رکھی تھی، اُسے اہلِ حدیث حضرات کے وکیل مولوی محمد حسین بٹالوی نے اپنے سرپرستوں کے ذریعے قانونی طور پر ہٹانے کی کوشش کی اور اپنی جماعت کا نام جس طرح منکرین حدیث نے "اہلِ قرآن" تجویز کیا ہے، اِسی طرح اِن منکرین فقہ و تقلیدِ ائمہ نے اپنی جماعت کو "اہلِ حدیث" کا نام دیا۔ مثلاً:

> "اِنھوں نے ارکانِ جماعتِ اہلِ حدیث کی ایک دستخطی درخواست لیفٹننٹ گورنر پنجاب کے ذریعہ سے وائسرائے ہند کی خدمت میں روانہ کی، اُس درخواست پر سرِ فہرست شمس العلماء میاں نذیر حسین کے دستخط تھے۔ گورنر پنجاب نے وُہ درخواست اپنی تائیدی تحریر کے ساتھ گورنمنٹ آف اِنڈیا کو بھیج دی۔ وہاں سے حسبِ ضابطہ منظوری آ گئی کہ آئندہ وہابی کے بجائے "اہلِ حدیث" کا لفظ استعمال کیا جائے۔ لیفٹننٹ گورنر پنجاب نے اِس کی باقاعدہ اطلاع مولوی محمد حسین کو دی۔ اِسی طرح گورنمنٹ مدراس کی طرف سے ۱۵ اگست ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۱۲۷، گورنمنٹ بنگال کی طرف سے ۴ مارچ ۱۸۹۰ء کو بذریعہ خط نمبر ۱۵۶، اور گورنمنٹ یُو۔ پی کی طرف سے ۲۰ جولائی ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۳۸۶ گورنمنٹ سی۔ پی کی طرف ۱۴ جولائی ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۴۰۷، اور گورنمنٹ بمبئی کی طرف سے ۱۴ اگست ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۷۳۲، اِس امر کی اطلاع مولوی محمد حسین بٹالوی کو ملی۔"[1]

موصوف کے مذکورہ بالا بیان کا ماخذ رسالہ "اشاعۃ السنہ" لاہور ہے۔ اِس کی تائید میں سیرتِ ثنائی مطبوعہ گوجرانوالہ ۱۹۵۲ء کے صفحہ ۳۷۲ سے مولوی عبدالمجید خادمؔ سوہدری کا ایک بیان یُوں نقل کیا ہے:

---

[1] محمد ایوب قادری: مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۶

"(مولوی محمد حسین بٹالوی) نے اشاعۃ السنہ کے ذریعہ اہلِ حدیث کی بہت خدمت کی۔ لفظ "وہابی" آپ ہی کی کوشش سے سرکاری دفاتر اور کاغذات سے منسوخ ہوا اور جماعت کو اہلِ حدیث کے نام سے موسوم کیا گیا۔۔۔۔۔ (آپ نے) حکومت کی خدمت بھی کی اور انعام میں جاگیر پائی۔"[1]

۱۳۔ مولوی نواب صدیق حسن خاں قنوجی

آپ ۱۹؍ جمادی الاول ۱۲۴۸ھ / ۱۴؍ اکتوبر ۱۸۳۲ء کو اپنی ننہال بانس بریلی میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد ان کی والدۂ محترمہ قنوج چلی گئیں جو موصوف کا آبائی وطن تھا۔ درسی علوم مفتی صدر الدین دہلوی سے حاصل کیے، تفسیر و حدیث وغیرہ علوم قاضی حسین انصاری، شیخ عبد الحق ہندی اور مولوی محمد یعقوب دہلوی سے حاصل کیے۔ پہلے بھوپال میں ملازمت کی بعدہٗ ۱۲۸۸ھ / ۲-۷-۱۸۷۱ء میں رئیسۂ بھوپال کی شوہری و نیابت کا شرف بھی مل گیا۔ نوابی اور خان بہادری کے خطاب سے بھی سرفراز ہوئے۔ میاں نذیر حسین دہلوی اور مولوی محمد حسین بٹالوی کے ہم مسلک و ہم مشرب تھے۔ تصنیف و تالیف کے ذریعے اور شانِ نوابیت کے بل بوتے پر اپنی جماعت کی جڑیں مضبوط کرتے رہے۔ انگریز دوستی میں بڑھ چڑھ کر حصہ دار رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو نواب صاحب شرعی نقطۂ نظر سے کیا درجہ دیتے تھے، خود موصوف کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمائیے:

> "چنانچہ غدر (یعنی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء) میں جو چند لوگ نادان، عوام الناس، فتنہ و فساد پر آمادہ ہو کر جہاد کا جھوٹ موٹ نام لینے لگے اور عورتوں اور بچوں کو ظلم و تعدّی سے مارنے لگے اور لوٹ مار پر ہاتھ دراز کیا اور ہوالِ رعایا اور پرایا پر غصباً قابض و متصرف ہوئے انھوں نے خطائے فاحش کی اور قصور ظاہر، اس لیے کہ قرآن و حدیث کے موافق کہیں شرطیں جہاد کی موجود نہ تھیں، سوائے

---

[1] محمد ایوب قادری: مقدمہ حیات سیّد احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۶

سودائے خام اور خیالی پلاؤ حکومت رانی اور ملک ستانی کے اُن کے دِلوں میں اور مغزوں میں سمائے ہُوئے تھے۔ ہم نہیں جانتے کہ اُن میں سے کسی جماعت اَور لشکر میں خلوصِ نیت اور پاکی طینت اور انصاف واجبی اور تبعیتِ مذہبِ اسلام ہو۔"[1]

موصوف کی نظر میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سراسر ایک فتنہ وفساد تھا۔ چنانچہ تصریح کرتے ہیں کہ:

"آج کل عام مسلمان جن کو علم وفہم سے بہرہ نہیں بلکہ اکثر اربابِ دُول وحکومت جنھیں اسلام کی خوبیوں سے اَور ایمان کی باتوں سے بالکل واقفیت نہیں، جس کو جہاد سمجھ رہے ہیں، وُہ حقیقت میں فتنہ کے سوا اَور کچھ نہیں تھا۔"[2]

اِسی سلسلے میں موصوف یُوں اپنا عندیہ ظاہر کرتے ہیں:

"جس کا جی چاہا اور اُس کو وسوسۂ سرداری نے گھیرا، وُہی سرکار سے باغی ہو کر لڑنے کو کھڑا ہو گیا اَور اِس لڑائی کو جہاد ٹھہرایا، حالانکہ وُہ جہاد نہ تھا، سراسر فتنہ تھا۔"[3]

اِسی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بارے میں موصوف نے یُوں نوابی فیصلہ صادر فرمایا ہے:

"بغاوت جو ہندوستان میں بزمانہ "غدر" ہُوئی، اُس کا نام جہاد رکھنا اُن لوگوں کا کام ہے جو اصل دینِ اسلام سے آگاہ نہیں اور ملک میں فساد ڈالنا اور امن اٹھانا چاہتے ہیں۔"[4]

جن مسلمانوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصّہ لیا، جو انگریز کی غلامی کا جُوا اپنے کندھوں سے اُتار کر پھینک دینا چاہتے تھے اور جو اپنے ملک کو غاصب انگریزوں کے پنجے سے چھڑا کر آزاد فضا میں سانس لینا چاہتے تھے، وُہ تھے کون؟ اِس سوال کا جواب نواب صدیق حسن خاں

---

[1] صدیق حسن خاں قنوجی، نواب: ترجمانِ وہابیہ، مطبوعہ امرتسر، ص ۲۴

[2] ایضاً: ص ۲۸

[3] ایضاً: ص ۳۰

[4] ایضاً: ص ۱۰۷

صاحب نے یُوں دیا ہے:

> ”جتنے لوگوں نے غدر میں شرِ و فساد کیا اور حکّامِ انگلشیہ سے برسرِ عناد ہُوئے وُہ سب کے سب مقلّدانِ مذہبِ حنفی تھے، نہ متبعانِ حدیثِ نبوی۔ مگر مکر اور زُور کی راہ سے فتنہ پردازی کی تہمت دُوسروں پر باندھ دی اور اہلِ غدر کو وہابی ٹھہرا دیا۔“ [1]

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصّہ لینے والے مسلمانوں کا نواب صاحب کی نظر میں جُرم کیا تھا، اُن پر کونسی دفعہ عائد ہوتی تھی؟ اِس سلسلے میں شریعتِ محمدی کے ٹھیکیدار بننے والے نواب صاحب کا فیصلہ ملاحظہ ہو:

> ”وہ لوگ جو بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند یا کسی اُس بادشاہ کے کہ جس نے آزادگیِ مذہب دی ہے ہتھیار اُٹھاتے ہیں اور مذہبی جہاد کرنا چاہتے ہیں، کُل ایسے لوگ باغی ہیں اور مستحقِ سزا کے مثل باغیوں کے شمار ہوتے ہیں۔“ [2]

اب آخر میں ملاحظہ ہو کہ غیر مقلدانِ ہند کی نظر میں انگریز جیسی عیار، ظالم اور اسلام دشمن قوم کیسی تھی؟ پہلے باب کے اندر جس کے عیارانہ قبضے، ظالمانہ رویّے اور اسلام دشمن منصوبے کا اجمالی ذکر کیا گیا ہے اُس کی روشنی میں نواب صاحب کی قصیدہ خوانی ہو سکتا ہے نمک حلالی کا ثبوت ہو لیکن مسلمانوں کی ایمانی غیرت کے لیے چیلنج ہے۔

> ”غرض اِن (قاضی شوکانی) کی گواہی سے بخوبی معلوم ہُوا کہ درستیِ ملک اور صفائیِ راہ اور رفاہِ عوام اور امنِ خلائق اور امانِ مخلوق اور راحت رسانیِ رعیت اور آرام دہیِ بریت میں حکّامِ فرنگ کا مثل اور نظیر اِس وقت میں بلکہ اکثر اوقات میں ہرگز نہیں۔ اگرچہ ہر وقت کے مُلّا اور مفتی خوشامد کی راہ سے باتیں بناتے ہیں اور ہر کسی کو اچھا بتاتے ہیں مگر میری نظر میں جو راجح اور صحیح

---

[1] صدیق حسن خاں قنوجی، نواب: ترجمان وہابیہ، مطبوعہ امرتسر، ص ۴۷

[2] ایضاً: ص ۱۲۰

معلوم ہوا، وُہ لکھ دیا۔ قبول و ہدایت اللہ کے ہاتھ ہے۔"[1]

۵ گرچہ ہے دِلکشا بہت حُسنِ فرنگ کی بہار
طائرکِ بلند بال، دانہ و دام سے گزر

۱۴۔ سرسیّد احمد خاں

سرسیّد احمد خاں ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم حاصل کی لیکن بے توجہی سے اور بہت کم۔ ابتدائی زندگی رنگا رنگ قسم کی ہے۔ حالی پانی پتی نے اُس کی یُوں تصویر کشی کی ہے:

"سرسیّد کا عنفوانِ شباب نہایت زندہ دل اور رنگین صحبتوں میں گزرا تھا۔ وُہ راگ رنگ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ باغوں کی سیر کو دوستوں کے ساتھ جاتے تھے۔ پھول والوں کی سیر میں خواجہ صاحب پہنچتے تھے اور وہاں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ دِلّی میں بسنت کے میلے جو موسمِ بہار کے آغاز میں درگاہوں میں ہوتے تھے، وہاں جاتے تھے۔ خود اُن کے نانا فرید کی قبر پر چونسٹھ کھمبے میں جو بسنت کا میلہ ہوتا تھا اُس میں وُہ اپنے اَور بھائیوں کے ساتھ منتظم و مہتم ہوتے تھے۔"[2]

سرسیّد احمد خاں اپنی سوانح حیات خود یُوں بیان کرتے تھے:

"اوّل اوّل تو جب کبھی سرسیّد کے سامنے اَور اُن کی لائف لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا جاتا تھا، تو وُہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ: "میری لائف میں سوا اِس کے کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں، کنکوّے اُڑائے، کبوتر پالے، ناچ مُجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری، کافر اور بے دین کہلوائے اور رکھا

---

[1] صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی: ترجمان وہابیہ، مطبوعہ امرتسر، ص ۴۴

[2] الطاف حسین حالی: حیاتِ جاوید، ص ۱۰۴

ہی کیا ہے؟" [1]

مولوی عبدالحق حقانی دہلوی نے سرسیّد احمد خاں کا تعارف یُوں کروایا ہے:

"اِس گنبے میں ایک شخص سیّد احمد خاں صاحب بہادر بھی پیدا ہُوئے۔ یہ شخص ابتداء میں مولوی مخصوص اللہ صاحب نبیرۂ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی خدمت میں آکر کسی قدر صرف ونحو سے آشنا ہُوئے اور تعویذ گنڈے بھی سیکھے، لیکن جب یہ نسخہ نہ چلا تو گورنمنٹ برٹش کی طرف رجوع کیا اور اپنی لیاقتِ خداداد سے کوئی اچھا عہدہ بھی پایا، پھر تو پکّے وہابی متبع مولوی اسمٰعیل صاحب ہو گئے ..... اِس عرصہ میں غدر ہو گیا اور سیّد صاحب اپنی خیر خواہی اور حکام رسی سے بڑی ترقی کر گئے اور اپنی خوش بیانی اور عالی دماغی سے انگریزوں میں بڑے فاضل یا فلاسفر با وقار مانے گئے اور سی۔ ایس۔ آئی کا لقب حاصل کیا اور کچھ عجب نہیں کہ گورنمنٹ برٹش ۱۸۵۷ء کے فساد سے پُر حذر ہو اور سیّد صاحب نے مسلمانوں کی طرف سے گورنمنٹ کو نہ صرف اطمینان دلایا بلکہ خیالاتِ مذہبیہ کے گرانے کا بھی بیڑہ اٹھایا ہو۔" [2]

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں سرسیّد احمد خاں صاحب نے اپنی قوم کے خلاف اور اپنے ملکی مفادات کے خلاف دِل کھول کر انگریزوں کی مدد کی۔ موصوف کے اِس کارنامے کو انگریزوں نے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور اُنھیں خوب مالا مال کیا۔ سرسیّد احمد خاں صاحب کی ان کارگزاریوں کے لیے دفتر چاہییں۔ تفصیلی حالات کے لیے اُن کی تصنیف "تاریخ سرکشیِ بجنور" بھی کافی ہے یہاں محض ایک جھلک دکھانے کی غرض سے اُن کے سوانح نگار یعنی خواجہ الطاف حسین حالی کا ایک بیان ہدیۂ انظارِ ناظرین ہے:

"جو شخص سرسیّد کی طبیعت اور جبلّت سے واقف ہو گا، وہ اِس بات کو

---

[1] الطاف حسین حالی: حیاتِ جاوید، ص ۱۷،

[2] عبدالحق حقانی، مولوی: تفسیر حقانی، جلد اوّل، ص ۱۱۲

> بآسانی باور کرے گا کہ جو کچھ غدر کے زمانہ میں گورنمنٹ کی خیر خواہی اور وفاداری اُن سے ظہور میں آئی وُہ کسی خلعت یا انعام وغیرہ کی توقع پر مبنی نہ تھی۔ وُہ بڑا انعام اپنی خدمت کا یہی سمجھتے تھے کہ اُس نازک وقت میں اِن سے کوئی امر اخلاق اور شرافت اور اسلام کی ہدایت کے خلاف سرزد نہیں ہوا۔ مگر گورنمنٹ نے خود انکی خدمات کی قدر کی اور اُن کے صلے میں ایک خلعت قیمتی ایک ہزار روپے کا اور دو سو روپے ماہوار کی پولٹیکل پنشن دو نسلوں تک مقرر کی۔“ [1]

موصوف کی نظر میں برٹش گورنمنٹ کیا اور کیسی تھی؛ خواجہ الطاف حسین حالی نے اُن کا ایک بیان یُوں نقل کیا ہے:

> ”الٰہی تیرا بہت بڑا احسان اپنے بندوں پر یہ ہے کہ اپنے بندوں کو عادل اور منصف حاکموں کے سپرد کرے۔ سَو برس تک تُو نے اپنے اِن بندوں کو، جن کو تُو نے خطۂ ہندوستان میں جگہ دی ہے۔ اِسی طرح عادل اور منصف حاکموں کے ہاتھ میں ڈالا۔ پچھلے کم بخت برسوں میں جو بسبب نہ ہونے اِن حاکموں کے ہماری شامتِ اعمال ہمارے پیش آئی، اب تُو نے اُس کا عوض کیا اور پھر وہی عادل اور منصف حاکم ہم پر مسلّط کیے۔ تیرے اِس احسان کا ہم دِل سے شکر ادا کرتے ہیں، تُو اپنے فضل سے اِس کو قبول کر۔“ [2]

سیّد احمد خاں آخر برٹش گورنمنٹ کے اِتنے خیر خواہ کیوں بنتے تھے؛ اِس کی وجہ خود موصوف کی زبانی سُنیے:

> ”اُنھوں (سر سیّد احمد) نے کئی موقعوں پر یہ ظاہر کیا کہ مَیں ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ کا استحکام کچھ انگریزوں کی محبت اور اُن کی ہوا خواہی کی نظر سے

---

[1] الطاف حسین حالی: حیاتِ جاوید، ص ۱۳۸

[2] ایضاً: ص ۱۵۱

> نہیں چاہتا بلکہ صرف اِس لیے چاہتا ہُوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خیر اِس کے استحکام میں سمجھتا ہُوں اور میرے نزدیک اگر وُہ (مسلمان) اپنی حالت سے نکل سکتے ہیں تو انگلش گورنمنٹ ہی کی بدولت نکل سکتے ہیں۔“ [1]

موصوف کے نزدیک انگریز مسلمانوں کے ہمدرد اور بہی خواہ تھے۔ اِس خوش فہمی میں وُہ دانستہ مبتلا ہونے پر مجبور تھے اور پُوری قوم کو بھی اِس خوش فہمی کا شکار کرنا چاہتے تھے۔ اِس دعوے کی دلیل سرسیّد کے پاس وُہ چند قوم فروش بلکہ دین فروش تھے جنھیں حکومت نے فکرِ دنیا سے آزاد کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کو موصوف جس قسم کی تلقین کیا کرتے تھے وُہ خود سرسیّد احمد خاں صاحب کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمائیے:

> ”ہم (سرسیّد احمد خاں) جو یہ لکھتے ہیں کہ ہماری منصف گورنمنٹ مسلمانوں کے ساتھ ہے، اِس کی بہت روشن دلیل یہ ہے کہ ہماری قدردان گورنمنٹ نے خیر خواہ مسلمانوں کی کیسی قدر و منزلت اور عزّت و آبرو کی، انعام و اکرام اور پنشن و جاگیر سے نہال کر دیا ہے۔ ترقیِ عہدہ اور افزونیِ مراتب سے سرفراز کیا ہے۔
> پھر کیا یہ ایسی بات نہیں ہے کہ مسلمان نازاں ہوں اور اپنی گورنمنٹ کے شکر گزار اور ثناخواں رہیں۔“ [2]

؎ مچھلی نے ڈھیل پائی ہے، لقمے پہ شاد ہے
صیّاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

کاسہ لیسی کا اوّلین ریکارڈ دیکھنا ہو تو انگلش گورنمنٹ کی قصیدہ خوانی سرسیّد احمد خاں صاحب کی زبانی سُنیے اور مسٹر غلام احمد پرویز کو بھی سُنائیے کیونکہ موصوف کی نظروں میں پاکستان کا حقیقی بانی سرسیّد تھا۔ انگریز کی چمچہ گیری پر مسلمانوں کو مجبور کرنے والا، مسلمانوں کا دینی وجود ختم کر کے اُنھیں زبانی مسلمان اور انگریزوں کا سائیس، کلرک اور دربان بنا رہا تھا یا پاکستان؟

---

[1] الطاف حسین حالیؔ: حیاتِ جاوید، ص ۶۸۳

[2] ایضاً: ص ۱۵۷

خراب منطقی قصیدہ ملاحظہ ہو:

"اُن (سرسید) کی نہایت پختہ رائے تھی کہ ہندوستان کے لیے انگلش گورنمنٹ سے بہتر، گوکہ اُس میں کچھ نقص بھی ہوں، کوئی گورنمنٹ نہیں ہوسکتی اور اگر امن و امان کے ساتھ ہندوستان کچھ ترقی کر سکتا ہے تو انگلش گورنمنٹ ہی کے ماتحت رہ کر کر سکتا ہے۔ وُہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گو ہندوستان کی حکومت کرنے میں انگریزوں کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر درحقیقت نہ اُنھوں نے یہاں کی حکومت بہ زور حاصل کی اور نہ مکر و فریب سے، بلکہ درحقیقت ہندوستان کو کسی حاکم کی اصلی معنوں میں ضرورت تھی، سو اُسی ضرورت نے ہندوستان کو اُن کا محکوم بنا دیا۔"[1]

؎ کشتیِ دل کی الٰہی بحرِ ہستی میں ہو خیر
ناخدا ملتے ہیں لیکن باخدا ملتا نہیں

میں حیران ہوں کہ برٹش گورنمنٹ کی چاپلوسی اور ملت فروشی میں سرسید احمد خاں کو اوّل نمبر قرار دوں یا مولوی محمد حسین بٹالوی کو؟ لیکن میں فیصلہ کرنے والا کون؟ اِس امر کا فیصلہ تو خود قارئینِ کرام نے کرنا ہے۔ اِس سلسلے میں کیوں نہ موصوف کا ایک سنتی فتویٰ بھی پیش کر دیا جائے:

"مسلمان انگریزی گورنمنٹ کی رعایا اور مستامن ہیں اور اپنے فرائض مذہبی بلا مزاحمت ادا کرتے ہیں۔ وُہ شریعتِ اسلامیہ کی رُو سے بمقابلہ انگریزوں کے نہ جہاد کر سکتے ہیں، نہ بغاوت، نہ کسی قسم کا فساد۔"[2]

چونکہ متحدہ ہندوستان میں وہابیت کو نجد سے درآمد کرنا، خود انگریزی حکومت کا کارنامہ تھا اور وہی اِس کی سرپرست تھی۔ سرسید احمد خاں صاحب اِس نوازش کا شکریہ یوں ادا کرتے ہیں:

---

[1] الطاف حسین حالی: حیاتِ جاوید، ص ۶۸۲

[2] ایضاً: ص ۲۳۳

"وہابی جس آزادیِ مذہب سے انگلش گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں رہتے ہیں، دُوسری جگہ اِن کو میسر نہیں ہے۔ ہندوستان اِن وہابیوں کے لیے دار الامن ہے۔"[1]

اِسی سلسلے میں موصوف کا اِس سے بھی واضح ایک بیان اور ملاحظہ فرمایا جائے:

"انگلش گورنمنٹ ہندوستان میں خود اُس فرقہ کے لیے جو وہابی کہلاتا ہے، ایک رحمت ہے (جو ۱۹۴۷ء میں وہابیوں کو روتا ہُوا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اختر) جس طرح ہندوستان میں کُل مذہب کے لوگوں کو کامل آزادی ہے، جو سلطنتیں اسلامی کہلاتی ہیں، اُن میں بھی وہابیوں کو ایسی آزادیِ مذہب ملنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ سلطان کی عملداری میں وہابی کا رہنا مشکل ہے۔"[2]

کیوں صاحبو! اب چودہ طبق روشن ہُوئے یا نہیں؛ مسلمان بادشاہ کی حکومت میں آخر وہابی کا رہنا مشکل کیوں ہے اور یہ حضرات انگریزی عملداری کو اپنے لیے رحمت اور دار الامن سمجھنے اَور لکھنے پر کیوں مجبور رہیں؟ کہیں یہ سب کچھ برٹش گورنمنٹ ہی کے دم قدم کی بہار تو نہیں ہے؟ اِس کے باوجود اسلام کے ٹھیکیدار بننا، اپنے لیے موحّد ہونے کا دعویٰ کرنا اور سچّے مسلمانوں کو مشرک، بدعتی اور بریلوی فرقہ گننا، یہ کیا ستم ہے؟

؎ وہ شیفتہ کہ دُھوم تھی حضرت کے زُہد کی
میں کیا بتاؤں رات مجھے کس کے گھر ملے

موصوف نے وہابیانِ ہند کا برٹش گورنمنٹ کے متعلق نظریہ اَور اُن کی انگریز دوستی کو واضح لفظوں میں بیان کرتے ہُوئے اِس امر کی کوشش کی ہے کہ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں حصّہ لینے کی وہابیوں پر جو تہمت لگائی گئی ہے وہ نِری الزام تراشی ہے۔ موصوف کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں:

---

[1] محمد اسمٰعیل پانی پتی: مقالاتِ سرسیّد، حصّہ نہم، مطبوعہ لاہور، ص ۲۱۲

[2] ایضاً: ص ۲۱۲

”وہابی وُہ ہے جو خالصاً خدا کی عبادت کرتا ہو اور اُس کا اسلام ہوائے نفسانی اور بدعت کی آمیزش سے پاک ہو۔ اُس کو یہ کہنا کہ درپردہ تخریب سلطنت کی فکر میں چپکے چپکے منصوبے باندھا کرتا ہے اور غدر اور بغاوت کی تحریک کرتا ہے ، محض تہمت ہے اور ہم اِس وقت بہت سے ایسے آدمی نشان دے سکتے ہیں ، جو سرکار کے ایسے ملازم ہیں کہ اُن سے زیادہ سرکار کا خیر خواہ اور معتمد کوئی نہیں ، بایں ہمہ وُہ اپنے تئیں علی الاعلان اور بے تامل فخریہ طور پر وہابی کہتے ہیں۔ سرکار نے بے سوچے سمجھے اُن کو معتمد نہیں گردانا۔ بلکہ غدر کے زمانے میں جبکہ فتنہ کی آگ ہر طرف مشتعل تھی ، اُن کی وفاداری کا سونا اچھی طرح تایا گیا اور وُہ خیر خواہیِ سرکار میں ثابت قدم رہے۔ اگر وُہ جہاد کا وعظ کہتے ہوتے اور بغاوت وہابیت کی اصل ہوتی تو جو کچھ اُن سے ظہور میں آیا ، یہ کیونکر ظہور میں آتا ؟“ [1]

شاید اکبر الٰہ آبادی نے اِسی روش کو دیکھ کر یہ شعر فٹ کیا تھا :

؎ مٹاتے ہیں جو وُہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں
مجھے حیرت تو اُن پر ہے ، جو اِس مٹنے پہ مرتے ہیں

سر سید احمد خاں صاحب پر حکومت کو بڑا اعتماد تھا ، بڑے سے بڑا انگریز اُنھیں قدر کی نگاہوں سے دیکھتا تھا ، کسی وقت بھی اُن کی جعفرِ بنگال اور صادقِ دکن سے کم عزت نہیں کی جاتی تھی۔ اِس کامیابی اور اثر و رسوخ کو کس طرح حاصل کیا گیا تھا ؟ موصوف کے سوانح نگار خواجہ الطاف حسین حالی کی زبانی سُنیے :

”لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ سر سید کی تمام کامیابیوں کا مدار اسی رسوخ اور اعتبار پر تھا ، تو بھی اصل سبب اُن کی راست بازی اور سچائی ٹھیرے گی ، کیونکہ برٹش گورنمنٹ میں ایک نیٹو (NATIVE) کا اِس قدر رسوخ و اعتبار پیدا کرنا ، جب تک اُس کی وفاداری اور خلوص کا سونا سخت امتحان کی آگ پر

---

[1] الطاف حسین حالی : حیاتِ جاوید ، ص ۲۳۳

تا یا نہ گیا ہو، ہرگز ممکن نہیں۔"[1]

سر سید احمد خاں صاحب لندن گئے۔ کس کس سے ملے اور کون کون سی ہستیاں اُن سے آکر ملیں، ملاحظہ فرمائیے:

"الغرض سر سیّد بمبئی سے چوبیس دن میں لندن پہنچے اور میکلن برگ اسکوائر میں ایک مکان کرایے پر لے کر ٹھہرے اور اپنے دوستوں اور آشناؤں سے ملے۔ لارڈ لارنس سب سے زیادہ مہربانی، مروّت اور خُلق سے اُن کے ساتھ پیش آئے۔ وُہ ہندوستان میں سر سیّد اور اُن کے خاندان کو اچھی طرح جانتے تھے اور اُن کی خدمات سے آگاہ تھے۔ لندن میں وُہ (لارڈ لارنس) اکثر اُن (سر سید) کو اپنے گھر ڈِنر پر بُلاتے تھے اور مہینے میں ایک بار ہمیشہ اُن سے ملنے کو آتے تھے۔ اُنھوں نے ہی سر سید کو لندن کے اکثر امرأ و مشاہیر سے ملوایا تھا۔ لارڈ اسٹینلی آف ایلڈرلی جو قسطنطنیہ میں بطور سفیر انگریزی کے رہتے تھے وُہ بھی جب لندن میں آتے تھے تو سر سیّد سے ملتے رہتے تھے۔ سر جان ولیم کے انڈر سیکرٹری وزیرِ ہند کے ساتھ بھی سر سید کو خصوصیّت ہوگئی تھی ملکہ معظمہ کے سمدھی ڈیوک آف آرگائل جو اُس وقت وزیرِ ہند تھے اور سائنٹی فِک سوسائٹی علی گڑھ کے پیٹرن بھی تھے، وُہ بھی سر سیّد سے بڑے اخلاق اور تپاک سے ملتے رہتے اور اپنے بیٹے مارکوئس آف لارن سے بھی، جو ملکہ معظمہ کے داماد ہیں، اُن کو مِلایا۔"[2]

اِسی دورۂ لندن کے مزید حالات و کمالات ملاحظہ ہوں:

"سر سیّد نے پُورے سترہ مہینے لندن میں قیام کیا اور شب و روز اُن کاموں میں، جن کے لیے یہ سفر اختیار کیا تھا، مصروف رہے۔ بایں ہمہ اِن کو اکثر خاص خاص تقریبوں میں بُلایا جاتا تھا اور اِن کی عزّت افزائی کی جاتی تھی۔ ۲۳ جون ۱۸۶۹ء کو

---

[1] الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، ص ۶۶۳ [2] ایضاً، ص ۲۰۶

وہ لارڈ لارنس کے ہاں ایک بہت بڑے ڈِنر پر بُلائے گئے اور ۱۳ جولائی کو سمٹونین سوسائٹی آف سِول انجنیئرس کے ایک عظیم الشان جلسے میں اور اِس کے بعد جو اُسی کے متعلق گریبنچ میں ڈنر ہُوا، اُس میں شریک ہُوئے۔

اِس جلسے کی کیفیت ڈیلی نیوز (DAILY NEWS) مورخہ ۲۱ جولائی میں مفصّل درج ہوئی تھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسٹر پن نے جو سوسائٹی مذکور کے پریسیڈنٹ تھے سر سیّد کو اُس جلسے میں شریک ہونے کے لیے مدعو کیا تھا اور لکھا تھا کہ آپ وقتِ معین پر میرے اسٹیمر میں، جو پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے موجود ہوگا، آئیں، مگر خود لارڈ لارنس سر سیّد کے مکان پر آئے اور اُن کو اپنے ساتھ سوار کرا کے لے گئے۔ سیّد حامد اور سیّد محمود بھی ساتھ تھے۔ اسٹیمر میں جا کر حاضری کھائی اور اسٹیمر کے کنارے پر جو بڑے بڑے کارخانے تھے دیکھے، پھر خاص اجازت سے ایک جنگی جہاز اور اُس میں توپیں بھرنے اور چلانے کا تماشا دیکھا۔ وہاں سے گریبنچ میں جا کر ڈِنر کھایا۔ اِس ڈنر میں کئی ڈیوک اور بہت سے لارڈ اور بڑے بڑے انجنیئر شریک ہُوئے۔ کھانے میں طرفہ بات کہ ڈِنر مذکور کی مینیو میں مندرج ہے، یہ تھی کہ تینتیس طرح کے کھانے صرف دریائی پیداوار اور دریائی جانوروں سے تیار کیے ہُوئے تھے (وہ دریائی جانور حلال ہیں یا حرام؟) خشکی کی پیداوار سے کوئی چیز میز پر نہ تھی۔ تمام انجنیئروں نے جو اِس جلسے میں شریک تھے، کھانے کے بعد اسپیچیں دیں، اور سالِ گزشتہ کی مختلف ترقیات کا جو انجنیئرنگ میں ہُوئیں ذکر کیا۔ سب کے بعد پریسیڈنٹ نے اسپیچ دی اور آخر میں لارڈ لارنس اور سر سیّد کا ذکر کر کے اُن کے شامل ہونے پر فخر ظاہر کیا۔"[1]

؎ گردن ریفارمر کی ہر اک سمت تن گئی
بگڑی ہے قوم و ملک کی، اِن کی تو بن گئی

---

[1] الطاف حسین حالی؛ حیات جاوید، ص ۲۰۷

سر سیّد انگریزوں کی نظر میں کیا تھے۔ یہ قارئین نے ملاحظہ فرما لیا کہ صرف برٹش گورنمنٹ ہند کے اراکین و عمائد ہی اِنھیں قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے بلکہ حکومتِ برطانیہ کی عظیم ہستیاں بھی اِنھیں سر آنکھوں پر بٹھاتی تھیں، آخر کیوں؟ اِس سوال کا جواب خود تلاش کریں۔

اِس ضمن میں احقر اتنا عرض ضرور کرے گا کہ غلام ہزار دفعہ یہ کہے کہ میں اپنے آقا کا دل وجان سے خیر خواہ اور وفادار ہُوں اور اپنے قول کی عملاً ساری عمر تصدیق بھی کرتا رہے، یہ اُس کی انتہائی فرماں برداری اور نمک حلال غلام ہونے کی دلیل ضرور ہے لیکن اگر آقا اپنے غلام کی اطاعت شعاری، فرماں برداری و جاں نثاری کا اعتراف کرے، خود اُس غلام کی ثناخوانی کرنے لگ جائے تو یہ اُس کی سب سے بڑی اطاعت شعاری کی دلیل ہی نہیں بلکہ فرمانبرداری کے نام پر پرستش کی حدود تک یہ جذبۂ عقیدت و وابستگی، اُسے لے گیا ہوتا ہے۔ موصوف کے بارے میں ایک بیان ایسا بھی پیش کرنا چاہتا ہُوں۔ چنانچہ سپیشل کمشنر اور جج، مسٹر ڈکری کرافٹ ولسن نے سر سیّد احمد خاں صاحب کے کارناموں کے پیشِ نظر شہر میرٹھ (یو۔پی) میں موصوف کو مخاطب کرکے واشگاف الفاظ میں علیٰ رؤس الاشہاد کہا تھا:

> "تم (سر سیّد) ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ ایسے نازک وقت (۱۸۵۷ء) میں تم نے سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا...... سرکار نے بھی تم کو اپنا خیر خواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال اعتماد کے ساتھ ضلع بجنور کی حکومت تم کو سپرد کی اور تم اُسی طرح نمک حلال اور وفادار سرکار کے رہے۔ اِس کے صلے میں اگر تمھاری ایک تصویر بنا کر پشت ہا پشت کی یادگاری اور تمھاری اولاد کی عزت اور فخر کے لیے رکھی جائے تو بھی کم ہے۔"[1]

؎ بوزنہ کو رقص پر کس بات کی مَیں داد دُوں
ہاں یہ جائز ہے مداری کو مبارک باد دُوں

---

[1] حالیؔ پانی پتی، حیاتِ جاوید، ص ۱۳۳

۱۵۔ علامہ شبلی نعمانی

شبلی نعمانی (المتوفی ۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۴ء) سولہ سال علی گڑھ کالج میں رہے۔ ندوۃ العلماء کے بانیوں میں سے تھے۔ ۱۸۹۴ء میں موصوف کو برٹش گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ اِن کے متعلق شیخ محمد اکرام کی یہ تصریح موصوف کو سمجھنے میں کافی حد تک مددگار ثابت ہوگی:

> "شبلی قریبًا سولہ سال علی گڑھ میں ملازم رہے۔ یہیں اُنھوں نے آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی اور مستشرقین کی کتابوں تک رسائی حاصل کی اور یہیں سر سیّد کی با اثر شخصیت نے اُن کی قلبِ ماہیت کی۔ بقول مولانا مہدی حسن، شبلی نے مولویت علی گڑھ میں پہنچ کر چھوڑی۔ اُن کے خیالات کی کایا پلٹ، مذاقِ تصنیف اور وسیع النظری، غرض یہ جو کچھ ہوتے سر سیّد کے دامنِ تربیت کا اثر تھا۔ شبلی نے المامون کا دُوسرا ایڈیشن جب شائع کیا ہے تو سر سیّد نے جس خلوص کے ساتھ اُس پر دیباچہ لکھا، وُہ آج بھی اُن کی ادبی شرافت کا پتہ دیتا ہے۔"[1]

برٹش گورنمنٹ کے بارے میں شبلی نعمانی کے نظریات کیا تھے، موصوف کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمائیے:

> "میں (شبلی) مدّت العمر کبھی انگریز گورنمنٹ کا بدخواہ نہیں رہا ہُوں۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان یگانگت بڑھے اور ایک دُوسرے کی طرف سے (یعنی ہندوستان کے رہنے والوں اور انگریزوں کی طرف سے) جو غلط فہمیاں مدّتِ دراز سے چلی آتی ہیں، دُور ہوں۔ اِس سے بڑھ کر یہ کہ ۱۹۰۸ء میں، مَیں نے "الندوہ" میں ایک مستقل مضمون کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی اطاعت و وفاداری مذہبًا

---

[1] محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، مطبوعہ لاہور، بار ہشتم ۱۹۶۸ء، ص ۲۲۱، ۲۲۲

فرض ہے۔" [1]

شبلی نعمانی نے اپنی وفات سے پہلے ایک طویل عرضداشت، عبدالماجد دریابادی سے لکھوا کر حکومت صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ (یُو۔پی) کے چیف سیکرٹری کی خدمت میں پیش کی تھی، مذکورہ بالا عبارت اُسی عرضداشت کا ایک اقتباس ہے۔ شیخ محمد اکرام صاحب نے شبلی نامہ کے علاوہ اپنی مشہور و معروف تصنیف "موجِ کوثر" میں بھی یہ اقتباس نقل کیا ہے، لیکن موجِ کوثر میں اِس عبارت کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں:

> "اور اُسی سال (۱۹۰۸ء) ندوہ کے سالانہ جلسے میں وفاداری کا (برٹش گورنمنٹ کے وفادار رہنے کا) ایک ریزولیشن بھی پاس کروایا، پھر معاملۂ مولوی عبدالکریم میں، محض اِس جرم پر کہ میں نے اپنے ضمیر کے مطابق ایک باغیانہ (برٹش گورنمنٹ کے خلاف) مضمون کی اشاعت بند کی، اخبارات میں گالیاں سُننا پڑیں۔" [2]

۱۶۔ الطاف حسین حالیؒ

موصوف ۱۸۳۷ء میں پانی پت کے محلہ انصاریاں میں پیدا ہُوئے۔ ۱۸۵۶ء میں حصار کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ملازمت مل گئی لیکن ۱۸۵۷ء میں ملازمت چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ ۱۸۶۳ء سے ۱۸۷۰ء تک نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بچّوں کو پڑھانے پر مامور ہُوئے۔ اِس کے بعد پنجاب کے لیفٹننٹ گورنر کے میر منشی یعنی پیارے لال آشوب کی سفارش پر "گورنمنٹ پنجاب بک ڈپو" لاہور میں مترجمہ کتابوں کی اُردو عبارت درست کرنے کے لیے ملازم رکھ لیے گئے۔ اِس کے بعد کچھ عرصہ "اینگلو عربک سکول دہلی" میں بھی ملازمت کی۔ ۱۸۸۸ء سے سر سیّد احمد خاں کی سفارش پر پچھتر روپے ماہوار وظیفہ ملنا شروع ہو گیا، جو بعد میں سو روپے ماہوار کر دیا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں

---

[1] محمد اکرام شیخ: شبلی نامہ، ص ۲۴۵

[2] محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، ص ۲۲۴

گورنمنٹ نے شمس العلماء کا خطاب بخش دیا۔ ۱۹۱۴ء میں موصوف کا انتقال ہُوا۔

موصوف بھی نیچریت کے حامی اور سر سیّد احمد خاں کی برطانوی گاڑی کو ہانکنے میں مددگار تھے۔ اپنی شاعری کے ذریعے نیچری مذہب کو پھیلانے، مسلمانانِ ہند کو گورنمنٹ برطانیہ کا وفادار اور بندۂ بے دام و ثناخواں بنانے میں پُورا زور لگاتے رہے۔ انگریز قوم اور مغربی تعلیم و تہذیب کی صفت و ثنا بیان کرتے ہُوئے موصوف کی عمرِ دراز بھی انتہائی مختصر ثابت ہُوئی ورنہ شاید معاملہ کہاں سے کہاں جا پہنچتا۔ سر سیّد احمد خاں کے حکم سے آپ نے ایک معرکے کی نظم لکھی جو "مسدس حالی" کے نام سے مشہور اور اِن کے مرشد جسے سرمایۂ افتخار شمار کیا کرتے تھے۔

خواجہ الطاف حسین حالی نے اِس مسدس میں انگریزوں کو نوعِ انسان سے نرالی مخلوق، دیوتا، معجز نما ہستیاں، مالکِ خزائن، غیب دان اور بہت کچھ مانا اور دوسروں کو ایسا ہی ماننے کی یُوں ترغیب دی ہے:

جنھوں نے بنایا اِسے اپنا یاور   ہر اِک راہ میں اِس کو ٹھہرایا رہبر
یہ قول آجکل صادق آتا ہے اُن پر   کہ اِک نوع ہے نوعِ انساں سے بہتر
الگ سب سے کام اُن کے اَور طور ہَیں کُچھ
اگر سب ہیں انساں، تو وُہ اَور ہَیں کُچھ

بہت اُن کو معجز نما جانتے ہیں   بہت دیوتا اُن کو گردانتے ہیں
یہ جو ٹھیک ٹھیک اُن کو پہچانتے ہیں   وُہ اتنا مقرّر نہیں مانتے ہیں
کہ دنیا نے جو کی تھی اب تک کمائی
وُہ سب جزو و کُل اُن کے حصّہ میں آئی

کِیا علم نے اُن کو ہر فن میں یکتا   نہ ہمسر رہا کوئی اُن کا نہ ہمتا
ہر اِک چیز اُن کی، ہر اِک کام اُن کا   سمجھ بُوجھ سے ہے زمانہ کی بالا
صنائع کو سب اُن کی تکتے ہیں ایسے
عجائب میں قدرت کے حیراں ہوں جیسے

دِئے علم نے کھول اُن پر خزانے   چھُپے اور ظاہر، نئے اَور پُرانے

دکھائے اُنھیں غیب کے کُل خزانے   بتائے فتوحات کے سب ٹھکانے
ہَوا جیسے چھائی ہے سب بحر و بر پر
وُہ یُوں چھا گئے خیبر و باختر پر[1]

انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی، اُن کے دین میں تخریب کاری کی، اُن کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا، دولت و عزّت سب کچھ اُن سے چھین لیا اور ہزار مکر و زور اور جبر و استبداد سے اُنھیں اپنا غلام بنا لیا۔ وُہ ہر وقت اِس موقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ کسی طرح اِن غیر مُلکی ڈاکوؤں کی غلامی کا جُوا اتار کر پھینک دیں، آزادی کی فضا میں سانس لیں اور جلد از جلد غلامی کی لعنت سے نجات حاصل کر لیں۔ لیکن انگریزوں کے زرخرید حضرات مسلمانوں کو یہی تبلیغ کیا کرتے تھے کہ یہ عملداری تو ہماری اپنی عملداری ہے، ہم غلام کہاں ہیں؟ ہمیں تو ہر قسم کی آزادی ملی ہوئی ہے، ہمیں ہر طرح کا آرام نصیب ہے اور ہمیں ترقی کرنے کے حکومت نے پُورے پُورے مواقع فراہم کیے ہُوئے ہیں، لہٰذا خاموشی اور شکر گزاری کے ساتھ اُن مراعات سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور گورنمنٹ کی بدخواہی کا دل میں خیال بھی نہیں لانا چاہیے۔ حالی نے بھی یُوں تلقین کی ہے:

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں   ترقی کی راہیں سراسر کھُلی ہیں
صدائیں یہ ہر سمت سے آ رہی ہیں   کہ راجا سے پرجا تلک سب سُکھی ہیں
تسلط ہے ملکوں میں امن و اماں کا
نہیں بند رستہ کسی کارواں کا
نہ بدخواہ ہے دین و ایماں کا کوئی   نہ دشمن حدیث اور قرآں کا کوئی
نہ ناقص ہے ملّت کے ارکاں کا کوئی   نہ مانع شریعت کے فرماں کا کوئی
نمازیں پڑھو بے خطر معبدوں میں
اذانیں دھڑاکے سے دو مسجدوں میں

---

[1] الطاف حسین حالی، مسدس حالی، مطبوعہ لاہور، ص ۸۹، ۹۰

کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں   نہیں بند صنعت کی، حرفت کی راہیں
جو روشن ہیں تحصیلِ حکمت کی راہیں   تو ہموار ہیں کسبِ دولت کی راہیں
نہ گھر میں غنیم اور نہ دشمن کا کھٹکا
نہ باہر ہے قزّاق و رہزن کا کھٹکا
مہینوں کے کٹتے ہیں رستے پلوں میں   گھروں سے سوا چین ہے منزلوں میں
ہر اِک گوشہ گلزار ہے جنگلوں میں   شب و روز ہے ایمنی قافلوں میں
سفر جو کبھی تھا نمونہ سقر کا
وسیلہ ہے وُہ اب سراسر ظفر کا
پہنچتی ہیں ملکوں میں دَم دَم کی خبریں   چلی آتی ہیں شادی و غم کی خبریں
عیاں ہیں ہر اِک برِّ اعظم کی خبریں   کُھلی ہیں زمانہ پہ عالَم کی خبریں
نہیں واقعہ کوئی پنہاں کہیں کا
ہے آئینہ احوال روئے زمیں کا
کرو قدر اِس امن و آزادگی کی   کہ ہے صاف ہر سمت راہِ ترقی
ہر اِک راہ رَو کا زمانہ ہے ساتھی   یہ ہر سُو سے آواز پیہم ہے آتی
کہ دشمن کا کھٹکا نہ رہزن کا ڈر ہے
نکل جاؤ رستہ ابھی بے خبر ہے[1]

مسلمانوں کو از روئے احادیث کفّار کے تشبہ سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ اسلامی غیرت کا تقاضا یہی ہے کہ وُہ اپنے روش پر پکے رہیں اور خدا کے دشمنوں کے کسی طرح بھی مشابہ ہونے کی کوشش نہ کریں۔ انگریز دوستی میں اِس ممانعت کا شاعرِ نیچریت اَور قوم کی غمخواری کا دم بھرنے والے نے یُوں مذاق اڑایا ہے:

ہمیں واعظوں نے یہ تعلیم دی ہے   کہ جو کام دینی ہے یا دنیوی ہے

---

[1] الطاف حسین حالی: مسدس، مطبوعہ لاہور، ص ۶۶، ۶۷

مخالف کی رِیس اُس میں کرنی بُری ہے   نشاں غیرتِ دینِ حق کا یہی ہے
نہ ٹھیک اُن کی ہرگز کوئی بات سمجھو
وُہ دن کو کہے دن تو تم رات سمجھو

قدم گر رہِ راست پر اُن کا پاؤ   تو تم سیدھے رستہ سے کترا کے جاؤ
پڑیں اُس میں جو دِقّتیں وُہ اُٹھاؤ   لگیں ٹھوکریں جس قدر اُس میں کھاؤ
جو نکلے جہاز اُن کا بچ کر بھنور سے
تو تم ڈال دو ناؤ اندر بھنور کے

اگر مسخ ہو جائے صورت تمھاری   بہائم میں مِل جائے سیرت تمھاری
بدل جائے بالکل طبیعت تمھاری   سراسر بگڑ جائے حالت تمھاری
تو سمجھو کہ ہے حق کی اِک شان یہ بھی
ہے اِک جلوۂ نورِ ایمان یہ بھی

نہ اوضاع میں تم سے نسبت کسی کو   نہ اخلاق میں تم سے سبقت کسی کو
نہ حاصل یہ کھانوں میں لذت کسی کو   نہ پیدا یہ پوشش نہ زینت کسی کو
تُمھیں فضل ہر علم میں برملا ہے
تمھاری جہالت میں بھی اِک ادا ہے

کوئی چیز سمجھو نہ اپنی بُری تُم   رہو بات کو اپنی کرتے بڑی تم
حمایت میں ہو جبکہ اسلام کی تُم   تو ہو ہر بدی اور گنہ سے بَری تم
بدی سے نہیں مومنوں کو مضرّت
تمھارے گناہ اَور اَوروں کی طاعت

مخالف کا اپنے اگر نام لیجے   تو ذکر اُس کا ذلت سے خواری سے کیجے
کبھی بھول کر طرح اُس کو نہ دیجے   قیامت کو دیکھو گے اِس کے نتیجے
گناہوں سے ہوتے ہو گویا مُبرّا
مخالف پہ کرتے ہو جب تم تبرّا[1]

---

[1] الطاف حسین حالیؔ: مسدّس، مطبوعہ لاہور، ص ۵۱، ۵۲

سائنس کی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن حقیقی علم اِسی کو ٹھہرانا اور اِسے سرمایۂ فخرِ انسان بتانا، اُن حضرات کا کام تو ہو سکتا ہے جنھیں آخرت پر یقین ہی نہ ہو یا جو آخرت کی حقیقی زندگی پر اِس چند روزہ دنیاوی زندگی کو ترجیح دینا ہی بہتر سمجھتے ہوں۔ سائنس کے بارے میں موصوف کے نظریات ملاحظہ ہوں :

ہمیشہ سے جو کہتے آئے ہیں سب یاں   کہ ہے علم سرمایۂ فخرِ انساں
عرب اور عجم، ہند اور مصر و یوناں   رہا اتفاق اِس پہ قوموں کا یکساں
یہ دعویٰ تھا اِک جس پہ حجت نہ تھی کچھ
کھُلی اِس پہ اب تک شہادت نہ تھی کچھ
جواہر تھے اِک سب کی نظروں میں بھاری   پرکھنے کی جس کے نہ آئی تھی باری
فضائل تھے سب علم کے اعتباری   نہ تھیں طاقتیں اِس کی معلوم ساری
یہ اب بحر و بر دے رہے ہیں گواہی
کہ تھا علم میں زورِ دستِ الٰہی
کیا کوہساروں کو مسمار اِس نے   بنایا سمندر کو بازار اِس نے
زمینوں کو منوایا دوّار اِس نے   ثوابت کو ٹھہرایا سیّار اِس نے
لیا بھاپ سے کام لشکر کشی کا
دیا پتلیوں کو سکت آدمی کا
یہ پتھّر کا ایندھن ہے جلوانے والا   جہازوں کو خشکی میں چلوانے والا
صداؤں کو سانچے میں ڈھلوانے والا   زمیں کے خزانے اگلوانے والا
یہی برق کو نامہ بر ہے بناتا
یہی آدمی کو ہے بے پر اُڑاتا
تمدّن کے ایواں کا معمار ہے یہ   ترقی کے لشکر کا سالار ہے یہ
کہیں دستکاروں کا اوزار ہے یہ   کہیں جنگجویوں کا ہتھیار ہے یہ
دکھایا ہے نیچا دلیروں کو اِس نے
بنایا ہے روباہ شیروں کو اِس نے

اسی کی ہے اب چار سُو حکمرانی کیے اس نے زیر ارمنی اور یمانی
ہُوئے رام دیوان ماژندرانی گئے زابلی بھول سب پہلوانی
ہُوا اِس کی طاقت سے تسخیر عالم
پڑے سامنے اِس کے چرکس نہ ویلم [1]

حالی صاحب انگریزوں پر ایسے ایمان لائے تھے کہ اُن کی ہر چیز سے پیار اور والہانہ لگا ہو گیا تھا۔ موصوف کے نزدیک مغربی علوم و فنون ہی حق کا جلوہ ہیں، گویا دُوسرے باطل کا اندھیرا ہُوئے، چنانچہ فرماتے ہیں:

نتائج ہیں جو مغربی علم و فن کے وُہ ہیں ہند میں جلوہ گر سو برس سے
تعصب نے لیکن یہ ڈالے ہیں پردے کہ ہم حق کا جلوہ نہیں دیکھ سکتے
جمی ہیں دِلوں میں ارسطو کی رائیں
جو اب وحی اُترے تو ایماں نہ لائیں [2]

۱۷۔ مولوی رشید احمد گنگوہی

آپ ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء میں پیدا ہُوئے۔ آپ مدرسہ دیوبند کے سرپرستوں اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں سے تھے۔ وہابیوں کی جماعت میں سے جب شاہ محمد اسحاق دہلوی خلیفۂ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے گول مول اور مخصوص خیالات سے اتفاق رکھنے والوں کی جماعت بنی اور دیوبندی مکتبِ فکر کے نام سے روشناس ہُوئی، تو اُس قافلے کے مولوی رشید احمد گنگوہی ہی قافلہ سالار قرار پائے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے دیگر نامور خلفاء نے گنگوہی صاحب اور اُن کے ہم خیال علمائے دیوبند کا تعاقب کیا کہ یہ حضرات اپنے اکابر اور پیر و مرشد کے طریقے کے خلاف جا رہے تھے۔

---

[1] الطاف حسین حالی، مسدس، مطبوعہ لاہور، ص ۸۸، ۸۹

[2] ایضاً، ص ۵۷

جب اِس قضیہ کی خبر حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کو ملی تو اپنے متعلقین کو سمجھانے کی غرض سے، جن مسائل میں اِن حضرات کا نزاع تھا، اُن کے بارے میں اپنے نظریات و معمولات لکھ کر "فیصلہ ہفت مسئلہ" کے نام سے موصوف کے پاس اُس کی کاپیاں بھیج دیں۔ گنگوہی صاحب نے اپنے پیر کے فیصلے کی یہ قدر کی کہ اپنے ایک شاگرد (خواجہ حسن نظامی دہلوی) کو اُن تمام کاپیوں کو جلانے کا حکم صادر فرمایا۔

فقہ حنفی کے پیروکار ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود موصوف نے اپنے تحکم سے اِس میں ایسی تراش خراش فرمائی اور خوارجِ زمانہ کے نظریات داخل کیے کہ ابنائے زمانہ کو ایک پریشان کن مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ اِس کے ساتھ ہی تقدیسِ باری تعالیٰ شانہٗ کو داغدار ٹھہرانے کی غرض سے امکانِ کذب کے ناپاک عقیدے کو وقوعِ کذب تک بڑھا دیا۔ شیطان لعین کو فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھی اعلم و اوسع علماً ٹھہرا دیا اور علمبردارِ خارجیت، امام الوہابیہ مولوی اسمٰعیل دہلوی کے تمام غیر اسلامی عقائد و نظریات کی کھُل کر تصدیق و تائید کرتے رہے۔ اِن کا وصال ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں ہُوا۔

موصوف نے اپنے اکابر سے رشتہ توڑا، اپنے پیر و مرشد سے تعلق چھوڑا، آخر ایسا کیوں کیا؟ کہیں یہ حکومت کی شہ پر توڑ ڈرامہ نہ کھیلا گیا ہو، جس کی تخریب کاری کی مشین اندرونِ خانہ بڑی عیّاری اور رازداری سے چل رہی تھی، کہیں مولوی ہدایت احمد گنگوہی کے فرزند اور حاجی امداد اللہ تھانوی علیہ الرحمہ کے مرید، مولوی رشید احمد گنگوہی ساحرینِ برطانیہ کے جادو کا شکار تو نہیں ہو گئے تھے۔ آئیے واقعات کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی شروع ہو چکی ہے۔ موصوف کے ہم خیال علماء نے اپنا ایک جتھا منظّم کر لیا ہے۔ ہتھیار لگا کر باہر پھرتے ہیں۔ کسی سے لڑنے کے لیے پھرتے تھے؟ ہمیں کیا معلوم جبکہ قریباً سوا سو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ آئیے موصوف کے سوانح نگار، اُن کے عاشقِ زار، مولوی عاشق الٰہی میرٹھی سے پوچھتے ہیں:

> "ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہُوا کہ حضرت امام ربّانی (مولوی رشید احمد گنگوہی) اپنے رفیقِ جانی مولانا قاسم العلوم (مولوی محمد قاسم نانوتوی) اور طبیبِ روحانی

اعلیٰحضرت حاجی صاحب و نیز حافظ ضامن صاحب کے ہمراہ تھے اور بندوقچیوں سے مقابلہ ہوگیا۔ یہ نبرد آزما جتھا اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے والا یا ہٹ جانے والا نہ تھا، اِس لیے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جاں نثاری کے لیے تیار ہوگیا۔ اللہ رے شجاعت و جوانمردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتّہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہوجائے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جمِ غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ چنانچہ آپ (گنگوہی صاحب) پر فیریں ہُوئیں اور حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ زیرِ ناف گولی کھا کر شہید بھی ہُوئے۔[1]

اب معلوم ہوگیا۔ مولوی عاشق الٰہی میرٹھی نے راز بتا دیا کہ گنگوہی صاحب نے اپنے اکابر اُور اپنے پیر سے قلبی رشتہ کیوں توڑ لیا تھا؟ اِس لیے کہ برٹش گورنمنٹ سے جاں نثاری و وفاداری کا عہد و پیمان جوڑا گیا تھا۔ یہ بات بالکل صاف اور سیدھی سادی ہے، جس پر کسی حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں، ادھوری عبارت یا سیاق و سباق سے توڑنے مروڑنے کی تہمت نہیں، خود گنگوہی صاحب کے سوانح نگار اور نامور دیوبندی عالم کی شہادت ہے، مخالفانہ بیان بھی اِسے نہیں ٹھہرایا جاسکتا کیونکہ یہ بیان دینے والا عالِم اہلسنّت نہیں۔ یہ ناچیز اِس امر کے فیصلے کا حق قارئین کے سپرد کرتا ہے کہ مذکورہ حوالے کی روشنی میں مولوی رشید احمد گنگوہی انگریزوں کے مخالف ثابت ہوتے ہیں یا برٹش گورنمنٹ کے دِل و جان سے وفادار بلکہ جاں نثار نظر آرہے ہیں؟

پروفیسر محمد ایّوب قادری نے تذکرہ علمائے ہند اُردو مطبوعہ کراچی کے صفحہ ۵۰۰ پر بلکہ متعدد کتب و رسائل میں اَور اُن کی دیکھا دیکھی موجودہ علمائے دیوبند نے یہ ڈھنڈورا پیٹنا شروع کردیا ہے کہ مولوی رشید احمد گنگوہی اور مولوی محمد قاسم نانوتوی وغیرہ نے ۱۸۵۷ء میں شاملی کے مقام پر انگریزوں سے لڑائی لڑی تھی، لہٰذا اکابرِ علمائے دیوبند مجاہدینِ جنگِ آزادی

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی: تذکرۃ الرشید، جلد اول، مطبوعہ میرٹھ، ۱۹۰۵ء، ص ۷۴،

اور انگریزوں کے مخالف ہیں۔ یعنی ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک تو علمائے دیوبند ماسوائے گاندھوی علماء کے باقی سب انگریزوں کے نہ صرف خیر خواہ و وفادار بن کر رہے بلکہ برٹش گورنمنٹ کے آلۂ کار بن کر ملّتِ اسلامیہ سے کٹ کر ایک نئے فرقے کا اضافہ اُور کر بیٹھے نیز اسلامی عقائد میں غیر اسلامی عقائد و نظریات کی پیوندکاری کرتے رہے۔ اگر یہ حضرات انگریزوں کے آلۂ کار نہ بن گئے ہوتے تو یہ سوادِ اعظم اہلسنّت و جماعت سے کٹ کر اپنا فرقہ الگ کیوں بناتے نیز اہلسنت وجماعت کے متوارث مذہب کا اپریشن کیوں کرتے؟ لیکن اُدھر انگریز بستر گول کر کے راہیِ برطانیہ ہُوئے اِدھر نوّے سال بعد اِن حضرات نے اپنے اکابر کی تاریخ کو بدلتے ہُوئے کہنا شروع کر دیا کہ ہمارے رشید احمد گنگوہی اور محمد قاسم نانوتوی وغیرہ بزرگ تو انگریزوں کے مخالف اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ہیرو تھے۔ تاریخ کا اِس طرح مذاق اڑا کر اُسے بازیچۂ اطفال بناتے اور حقیقت کا مُنہ چڑاتے وقت اگر دیوبندی علماء و مورّخین کو خوفِ خدا یاد نہیں رہتا تو ایسا کرتے وقت کیا اِن حضرات کو بندگانِ خدا سے بھی کوئی شرم و عار محسوس نہیں ہوتی؟ کیا اِن حضرات کی غلط بیانی سے حقیقت بدل جائے گی؟ کیا اِس قسم کی حرکتیں ہی اِن حضرات کا طرّۂ امتیاز ہیں؟

تذکرۃ الرشید کے محولہ بالا حوالے کو موجودہ دیوبندی عالم، مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری نے یُوں بیان کیا ہے:

> "جب پلٹن (انگریزی فوج) مع توپ خانہ باغ کے سامنے سے گزری تو سب نے یک دم فیر کیا۔ پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی ہوں، جو یہاں چھُپے ہُوئے ہیں، توپ خانہ چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔ حضرت گنگوہی نے توپ خانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحب کے سامنے لا کر ڈال دیا۔ اِس سے اِن حضرات کی..... ہر قسم کی قابلیت کا سکّہ بیٹھ گیا۔ شاملی اُس زمانہ میں مرکزی مقام تھا' ضلع سہارن پور سے متعلق تھا۔ وہاں تحصیل بھی تھی اور فوجی طاقت بھی وہاں رہتی تھی۔ قرار پایا کہ اِس پر حملہ کیا جائے، چنانچہ چڑھائی ہُوئی اور قبضہ کر لیا گیا۔ جو طاقت پولیس اور فوج کی وہاں تھی، مغلوب ہو گئی۔ حضرت حافظ ضامن صاحب اِسی معرکہ میں شہید ہو گئے۔ حضرت حافظ ضامن صاحب کا

شہید ہونا تھا کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔" [1]

گویا واقعہ سب کے نزدیک وہی ہے۔ فرق صرف اِتنا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک نوّے سال تک یہ لڑائی حکومت کے مخالفین یعنی حرّیت پسندوں کے ساتھ بتائی جاتی رہی اور انگریز چلے گئے تو یہی لڑائی انگریزوں کے خلاف بتانی شروع کر دی۔ اگر ہم موجودہ حضرات کے موقف کو درست تسلیم کر بھی لیں تو پھر بھی یہ فیصلہ غلط ہی رہے گا، کیونکہ بعد کے واقعات اِس موقف کی تائید کرنے سے یکسر مجبور ہیں۔ جب لڑائی کی آگ ٹھنڈی ہُوئی، انگریز دوبارہ قابض و مسلط ہو گئے تو دارو گیر کا دَور شروع ہو گیا۔

اِس دَور میں، خصوصاً مسلمانوں پر کیا قیامت ڈھائی گئی، اُس کا تصوّر بھی لرزہ خیز ہے۔ اِسی کتاب کے پہلے باب میں اُس قیامت خیز منظر کی جھلک قارئین کرام دیکھ چکے ہیں۔ ذرا سا شبہ سُولی پر لٹکانے کے لیے کافی تھا، کسی انگریز کی اگر مدد نہ کرنے کا الزام عائد ہُوا تب بھی دار پر کھینچ دینے سے کم سزا نہ تھی، کسی انگریز کی تعظیم نہ بجا لائے یا کھڑے ہو کر عاجزانہ سلام نہ کیا تو گولی کا نشانہ بناتے گئے۔ جن بستیوں کے چند افراد نے بھی انگریزوں سے لڑائی کی، اِس انتقامی دَور میں اُن بستیوں کو سِرے سے صاف ہی کر دیا گیا۔ اگر واقعی یہ علمائے دیوبند انگریزوں سے لڑے تھے تو سولی یا سزائے موت سے کم کے بغیر تو نہیں رَہ سکتے تھے، لیکن بعد کے واقعات تو یہی بتاتے ہیں کہ اِن حضرات میں سے کسی ایک کے پیر میں کانٹا تک بھی نہیں چبھویا گیا۔ اگر انگریزوں سے لڑے تھے تو اِنھیں کیوں چھوڑ دیا گیا تھا؟ آئیے موصوف کے سوانح نگار مولوی عاشق الٰہی میرٹھی سے مزید معلومات حاصل کرتے ہیں:

> "شروع ۱۲۷۶ھ نبوی/۱۸۷۹ء وہ سال تھا جس میں حضرت امام ربّانی (مولوی رشید احمد گنگوہی) قدس سرّہٗ پر اپنی سرکار (برٹش گورنمنٹ) سے باغی ہونے کا الزام لگایا گیا۔" [2]

---

[1] عزیز الرحمٰن بجنوری: تذکرہ مشائخ دیوبند، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۸۰

[2] عاشق الٰہی میرٹھی، مولوی: تذکرۃ الرشید، جلد اول، مطبوعہ میرٹھ، ۱۹۰۵ء، ص ۷۳

اِسی بات کو دُوسری جگہ ذرا تفصیل سے موصوف نے یُوں بیان کیا ہے:

"جب بغاوت و فساد کا قصّہ فرو ہُوا اور رحم دل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پاکر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اِس کے اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی سچّی تہمتوں اور مخبری کے پیشہ سے سرکاری خیر خواہ اپنے کو ظاہر کریں، اُنھوں نے اپنا رنگ جمایا اور اِن گوشہ نشین حضرات (گنگوہی و نانوتوی صاحبان) پر بغاوت کا الزام لگایا۔" [1]

مولوی رشید احمد گنگوہی کے رفیقِ جانی اور مدرسہ دیوبند کے بانی مولوی محمد قاسم نانوتوی کے بارے میں مندرجہ ذیل پُر لطف حکایت کا پیش کرنا، شاید دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ ہر عقلمند کو دعوتِ غور و فکر دے رہی ہے:

"جب مجاہد علماء کی پکڑ دھکڑ شروع ہُوئی تو آپ (مولوی محمد قاسم نانوتوی) کی گرفتاری کے بھی وارنٹ جاری ہُوئے۔ خدام اور متوسلین کے بہت زیادہ اصرار پر آپ ایک مکان میں رُوپوش ہُوئے اور تین دن کے بعد پھر کُھلے بندوں چلنے پھرنے لگے۔ لوگوں نے پھر رُوپوشی کے لیے بمنّت عرض کیا تو آپ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ تین دن سے زیادہ روپوش ہونا سنّت سے ثابت نہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غارِ ثور میں تین دِن ہی روپوش رہے ہیں۔" [2]

اتباعِ سنّت کی حقیقت تو خانقاہِ گنگوہ سے لے کر انکارِ خاتمیت زمانی تک معلوم ہے۔ اُمتِ محمدیہ کے مسلّمہ عقیدۂ ختمِ نبوت کا انکار کر کے ایک ایسی خاتمیت گھڑنے والے بھی تو یہی نانوتوی صاحب ہیں، جس کا نام سُننے سے بھی تیرہ سو سال کے مسلمانوں کے کان نا آشنا رہے۔ کیا یہ کارنامہ بھی اتباعِ سنّت میں دکھایا تھا؟ بہر حال اِس سے قطع نظر، مولوی محمد قاسم

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی، مولوی: تذکرۃ الرشید، جلد اوّل، مطبوعہ میرٹھ، ۱۹۰۵ء، ص ۷۶

[2] مناظر احسن گیلانی، مولوی: سوانح قاسمی، جلد دوم، ص ۱۷۳

نانوتوی کی جوانمردی و دلیری ہے کہ تین دن روپوش رہنے کے بعد دندناتے پھرنے لگے اور اس سے بھی بڑھ کر حیرت انگیز یہ ادا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں مولوی رشید احمد گنگوہی پر اپنی رحمدل سرکار سے باغی ہونے کا الزام لگایا گیا۔ دیوبندی علماء و مورخین تو ان حضرات کو مجاہد بنا کر، الزام کا رونا رو کر، پھر قید و بند سے چھڑا کر مطمئن ہو گئے ہوں گے اور ان بانکے مجاہدوں کے معرکوں پر ڈینگیں مارنے لگے ہوں گے لیکن ہم ان حضرات سے اتنا ضرور دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جناب والا! آپ کے ان مجاہدوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف شاملی کی لڑائی لڑی، انگریزی پلٹن سے توپ خانہ بھی چھین لیا، چلیے یونہی سہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان حضرات پر بدخواہوں نے، ۱۸۵۷ء میں بغاوت کی تہمت لگا کر گرفتار کروا دیا، بھلا اب مجاہد ہونے اور انگریز دشمن کہلانے میں، کون ہے جو ان حضرات کے متعلق شک کر سکے گا؟ لیکن اتنا تو ازراہِ کرم بتا دیجیے کہ آپ کے یہ ۱۸۵۷ء کے مجاہد، حریت پسند، جنگِ آزادی کے ہیرو، ۱۸۵۷ء سے آخر وقت تک انگریزوں کی نگاہوں میں کیا بن کر رہے تھے؟ دوست سمجھے گئے یا دشمن، مخالف گردانا گیا یا آلۂ کار، سالہا سال تک انگریزوں نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ اے شاملی کے مقام پر ہم سے لڑنے والو! اے ہمارا توپ خانہ تک چھین لینے والو! ہم سے لڑے کیوں تھے؟ ہمارا توپ خانہ کیوں چھینا تھا؟ کیا برٹش گورنمنٹ ان چند علمائے دیوبند سے اتنی خائف و ہراساں اور لرزاں و ترساں تھی کہ سزا دینا تو بہت بڑی بات ہے، ان سے اپنا توپ خانہ واپس لینے کی اپیل یا عرض بھی ان کی خدمت میں نہ کر سکی؟ آخر رکاوٹ کیا تھی؟

؎ اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ ادا سے ہم

ہزار چک پھیریوں سے اپنے اکابر کو مجاہد اور انگریز دشمن ثابت کرنے کی کوششیں کرتے ہیں لیکن تیلی کے بیل کی طرح جہاں سے چلتے ہیں پھر وہیں آ پہنچتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی بات ایسی لکھ بیٹھتے ہیں کہ ساری کاوشوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ مولوی عزیز الرحمٰن بجنوری کی تحقیق ملاحظہ فرمائیے:

"حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت امام ربانی (مولوی رشید احمد گنگوہی) اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے....."

آپ (گنگوہی صاحب) اپنی دادھیال رام پور تشریف لے گئے لیکن مخبر کی خبر رسانی سے آپ وہاں حکیم ضیاء الدین کے مکان سے گرفتار کر لیے گئے۔ یہ زمانہ ۱۲۷۵ھ یا ۱۲۷۶ھ کا تھا۔ گرفتار کرنے کے بعد آپ کو سہارن پور جیل کی کال کوٹھری میں رکھا گیا اور حالات اور واقعات کی تفتیش ہوتی رہی، مقدمہ چلتا رہا۔ حاکم نے آپ سے سوال کیا کہ آپ کے پاس ہتھیار ہیں؟ آپ نے تسبیح دکھلا کر فرمایا، ”ہمارے پاس یہ ہتھیار ہے“۔ سہارن پور جیل سے آپ کو مظفر نگر جیل میں منتقل کیا گیا۔ بالآخر جب گورنمنٹ کو ثبوت نہ مل سکا رہا کر دیا۔“ [1]

باقی باتوں سے قطع نظر جب برٹش گورنمنٹ کو سعیِ بسیار کے باوجود اِس امر کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا ثبوت بھی نہ مل سکا کہ مولوی رشید احمد گنگوہی حکومت کے بدخواہ ہیں یا ۱۸۵۷ء میں اِنھوں نے انگریزوں کے مفادات کے خلاف کوئی ادنیٰ سی حرکت بھی کی تھی، تو موجودہ حضرات کو کون سے دلائل یا حقائق و شواہد کا کھوج مل گیا ہے جن کی بنا پر بلند بانگ دعاوی کر کے اپنی سابقہ تاریخ کو بدلنے کی جسارت کرتے اور اِسی کو حقیقت منوانے پر تُلے ہُوئے ہیں۔ کم از کم اِن حضرات کو اپنے بزرگوں کا ادب کرنا چاہیے اور اپنے اکابر کو اپنی رحم دل گورنمنٹ کے باغیوں اور مفسدوں کی فہرست میں تو شامل نہ کرنا چاہیے۔ ملاحظہ ہو برٹش گورنمنٹ کیا تھی:

> ”جن کے سروں پر موت کھیل رہی تھی اُنھوں نے کمپنی کے امن و عافیت کا زمانہ قدر کی نظر سے نہ دیکھا اور اپنی رحم دل گورنمنٹ کے سامنے بغاوت کا عَلَم قائم کیا۔“ [2]

اپنے اکابر مولوی رشید احمد گنگوہی اور مولوی محمد قاسم نانوتوی وغیرہ کی موصوف نے یُوں صفائی پیش کی ہے:

> ”جیسا کہ آپ حضرات اپنی مہربان سرکار کے دِلی خیر خواہ تھے۔ تا زیست خیر خواہ ہی ثابت رہے۔“ [3]

---

[1] عزیز الرحمٰن بجنوری، مولوی: تذکرہ مشائخ دیوبند، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۱۱۷

[2] عاشق الٰہی میرٹھی، مولوی: تذکرۃ الرشید، جلد اوّل، ص ۷۳

[3] ایضاً: ص ۷۹

موصوف برٹش گورنمنٹ کے وفادار اور خیر خواہ تھے یا مفسدوں اور باغیوں میں شریک رہے تھے، اِس امر کا فیصلہ تو قارئین کرام خود کریں گے۔ راقم الحروف تو اِس سے آگے صرف یہی کر سکتا ہے کہ جملہ متبعین کے بیانات سے قطع نظر کر کے، خود عالیجناب، معلّٰی القاب، مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) کا ایک ذاتی بیان نقل کر دیتا ہے کہ موصوف کا خود اپنے بارے میں اپنا فیصلہ کیا ہے؟:

> "میں جب (مولوی رشید احمد گنگوہی) حقیقت میں سرکار کا فرماں بردار ہُوں تو جھُوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکا نہ ہو گا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے، اُسے اختیار ہے، جو چاہے کرے۔" [1]

ع مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

ہو سکتا ہے کسی صاحب کو یہ شبہ لاحق ہو جائے کہ "تذکرۃ الرشید" کتاب تاریخی لحاظ سے ناقابلِ اعتبار ہو یعنی دیوبندی حضرات کے نزدیک اُس کے مندرجات مسلّمہ نہ ہوں یا اُسے تاریخی لحاظ سے کوئی اہمیت حاصل نہ ہو، لہٰذا ہم اِس کتاب پر اِن حضرات کے مایۂ ناز مورخوں کی مُہرِ تصدیق ثبت کروا دیتے ہیں، عبد الرشید ارشد فرماتے ہیں:

> "میرے کانوں میں مولانا غلام رسول مہرؔ کے بار بار کہے ہُوئے یہ الفاظ گونج رہے ہیں کہ "تذکرۃ الرشید بہت عمدہ کتاب ہے۔ اِس کو پڑھ کر بڑا دل خوش ہوتا ہے۔ میں (غلام رسول مہرؔ) نے سالکؔ صاحب (عبد المجید سالکؔ) اور اپنے کئی دوسرے احباب کو یہ کتاب پڑھائی ہے۔ اِس کتاب کو پڑھ کر مولانا رشید احمد گنگوہی کی عظمت دِلوں میں پیدا ہوتی ہے۔" [2]

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی، مولوی: تذکرۃ الرشید، جلد اوّل، ص ۸۰

[2] عبد الرشید ارشد: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، بار دوم، ۱۹۷۰ء، ص ۱۹۲ (حاشیہ)

۱۸۔ مولوی اشرف علی تھانوی

موصوف کی پیدائش ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء کو تھانہ بھون میں ہوئی۔ مولوی محمود الحسن دیوبندی کے خاص الخاص تلامذہ میں سے ہیں۔ مدرسہ دیوبند کی سرپرستی بھی کرتے رہے۔ اپنی جماعت کی گاندھیوت میں ہمنوائی کرنے سے الگ رہے۔ دیوبندی حضرات اِنھیں حکیم الامت اور مجددِ ملّت کے القاب سے یاد کرتے ہیں۔ موصوف نے اپنی مشہور تصنیف "بہشتی زیور" کے پہلے حصے میں اُن امور کی ایک فہرست پیش کی ہے جو اُن کے نزدیک کفر و شرک ہیں۔ اگر موصوف کی اِس فہرست کو سامنے رکھا جائے تو کسی متنفس کو بھی مسلمان ثابت نہ کیا جا سکے گا۔ اِس کے علاوہ تھانوی صاحب نے اپنی بعض تصانیف میں چند عبارتیں ایسی بھی درج کی ہیں جن کی ایک مسلمان کہلانے والا ہرگز جرأت اور جسارت نہیں کر سکتا۔ سرورِ کون و مکاں، فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ایسے گندے الفاظ لکھنے کی تو اُس سرکار کے بدترین دشمنوں اور کُھلے کافروں کو بھی جُرأت نہ ہوئی تھی۔ اِس کتاب میں اُن عبارتوں کا تفصیلی ذکر اپنے موقع و محل پر آئے گا (انشاء اللہ تعالیٰ)۔

موصوف نے ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء میں وفات پائی۔

یکم محرم ۱۳۶۵ھ مطابق ۷؍دسمبر ۱۹۴۵ء کو علامہ شبیر احمد عثمانی کے مکان پر سیاسی اختلاف کو رفع کرنے موصوف کو اپنا ہم خیال بنانے کی غرض سے سات گاندھوی علماء تشریف فرما ہوئے:

۱۔ مولوی حسین احمد ٹانڈوی صدر جمعیۃ العلمائے ہند
۲۔ مفتی کفایت اللہ دہلوی سابق صدر جمعیۃ العلمائے ہند
۳۔ مولوی احمد حسین سابق ناظمِ اعلیٰ جمعیۃ العلمائے ہند
۴۔ مولوی حفظ الرحمٰن سیوہاروی ناظمِ اعلیٰ جمعیۃ العلمائے ہند
۵۔ مولوی عبد الحلیم صدیقی
۶۔ مولوی عبد الحنان
۷۔ مفتی عتیق الرحمٰن

سوا تین گھنٹے تک اِن حضرات کی حالاتِ حاضرہ پر گفتگو رہی۔ اپنا اپنا موقف واضح کیا۔ بعض خفیہ

گوشے بھی سامنے آئے، جو مولوی طاہر احمد قاسمی کے قلم سے مولوی شبیر احمد عثمانی کی تصدیق کے ساتھ پیشِ خدمت ہیں۔ عثمانی صاحب نے فرمایا:

> "دیکھیے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے اور آپ کے مسلّم بزرگ و پیشوا تھے، اُن کے متعلق بعض لوگوں کو یہ کہتے ہُوئے سُنا گیا کہ اُن کو چھ سو روپیہ ماہوار حکومت کی جانب سے دیے جاتے تھے۔ اِسی کے ساتھ وُہ یہ بھی کہتے تھے کہ گو مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اِس کا علم نہ تھا کہ روپیہ حکومت دیتی ہے۔ مگر حکومت ایسے عنوان سے دیتی تھی کہ اُن کو اِس کا شُبہ بھی نہ گزرتا تھا۔ اب اِسی طرح اگر حکومت مجھے یا کسی شخص کو استعمال کرے مگر اُس کو یہ علم نہ ہو کہ اُسے استعمال کیا جارہا ہے تو ظاہر ہے کہ وُہ شرعاً اِس میں ماخوذ نہیں ہو سکتا۔"[1]

ظاہر ہے کہ مولوی اشرف علی تھانوی کے متعلق یہ بیان دینے والے مشہور دیوبندی عالِم ہیں اور دُوسری طرف سُننے والے ایسے ساٹھ دیوبندی علماء ہیں، جنھیں اُس جماعت کا خلاصہ کہا جاسکتا ہے لیکن وُہ اِس بیان کی تردید میں ایک لفظ بھی اپنی زبانوں پر نہ لاسکے۔

مولوی حسین احمد ٹانڈوی ایک دفعہ حکومت کے زیرِ عتاب آئے، جیل خانے میں رہے، بعض لوگوں نے اِس واقعے میں تھانوی صاحب کا ہاتھ بتانے کی کوشش کی اور مسلسل کان بھرتے رہے تھے۔ مدّتوں بعد موصوف نے اپنے ایک خط میں لکھا:

> "مولانا مرحوم (مولوی اشرف علی تھانوی) کے بھائی محکمہ سی۔ آئی۔ ڈی میں بڑے عہدیدار اخیر تک رہے۔ اُن کا نام مظہر علی ہے۔ اُنھوں نے جو کچھ کیا ہو مستبعد نہیں۔"[2]

یہ بیانات اگرچہ اپنی جگہ پر بالکل واضح ہیں لیکن ہم یہاں مولوی اشرف علی تھانوی کا ذاتی بیان، خود اُن کے اپنوں کی مرتّبہ کتاب سے پیش کرکے اِس سلسلے میں اتمامِ حجت کرنا چاہتے ہیں،

---

[1] طاہر احمد قاسمی، مولوی: مکالمۃ الصدرین، مطبوعہ لاہور، ص ۱۶

[2] حسین احمد ٹانڈوی، مولوی: مکتوباتِ شیخ، جلد دوم، ص، ۲۹

بیان ملاحظہ ہو:

> "ایک شخص نے مجھ (مولوی اشرف علی تھانوی) سے دریافت کیا تھا کہ اگر تمھاری حکومت ہو جائے تو انگریزوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرو گے؛ میں نے کہا محکوم بنا کر رکھیں گے کیونکہ جب خدا نے حکومت دی تو محکوم بنا کر ہی رکھیں گے، مگر ساتھ ہی اس کے نہایت راحت و آرام سے رکھا جائے گا، اس لیے کہ اُنھوں نے ہمیں آرام پہنچایا ہے۔"[1]

ع مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

۱۹۔ مولوی شبیر احمد عثمانی و مولوی آزاد سبحانی

مولوی شبیر احمد عثمانی دیوبندی بن مولوی فضل الرحمٰن دیوبندی ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ موصوف کے والد ڈپٹی انسپکٹر مدارس اور دہلی کالج کے تربیت یافتہ تھے۔ خود موصوف نے مدرسہ دیوبند میں تعلیم پائی اور کچھ عرصہ اِس کے صدر بھی رہے۔ جمعیۃ العلمائے ہند کے آپ بھی ایک رُکن تھے لیکن کسی وجہ سے آپ اپنے اکابر اور رفقائے کار کی گاندھوی روش کو برداشت نہ کر سکے، اِس لیے جمعیۃ العلمائے اسلام کے نام سے اپنی علیحدہ جماعت بنالی، جو دیوبندی طبقے میں بھی نسبتاً اقلیت میں ہی رہی۔ اکثریت میں وہی حضرات تھے جنھوں نے گاندھی کو اپنا بے تاج بادشاہ اور امام و پیشوا بنایا ہوا تھا۔ ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء میں آپ نے وفات پائی۔

چونکہ آپ مطالبۂ پاکستان کے حامی اور مسلم لیگ کے ہمنوا تھے، اِس لیے جملہ علمائے دیوبند ماسوائے چند کے، آپ سے ناخوش تھے۔ مولوی اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) کے گزشتہ بیان میں علمائے دیوبند کے جس مذاکرے کا ابھی ذکر کیا تھا، اُس میں جمعیۃ العلمائے ہند کے ناظمِ اعلیٰ، مولوی حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے اپنے وفد کی طرف سے علامہ عثمانی کی جمعیۃ العلمائے

---

[1] اشرف علی تھانوی، مولوی: الافاضات الیومیہ، جلد چہارم، ص ۶۹۷

اسلام کے قیام اور اغراض و مقاصد کا ذکر کرتے ہُوئے فرمایا :

مُولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ کلکتہ میں جمعیۃ العلمائے اسلام حکومت کی مالی امداد اور اُس کے ایماء سے قائم ہُوئی ہے۔ مولانا آزاد سبحانی جمعیتہ العلمائے اسلام کے سلسلہ میں دہلی آئے اور حکیم دلبر حسن صاحب کے یہاں قیام کیا، جن کی نسبت عام طور پر لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ سرکاری آدمی ہیں۔ مولانا آزاد سبحانی صاحب اِسی قیام کے دوران میں پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک مسلمان اعلیٰ عہدیدار سے ملے، جن کا نام بھی قدرے شبہ کے ساتھ بتلایا گیا اور مولانا آزاد نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہم جمعیتہ العلمائے ہند کے اقتدار کو توڑنے کے لیے ایک علماء کی جمعیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ گفتگو کے بعد طے ہوا کہ گورنمنٹ اِن کو کافی امداد اِس مقصد کے لیے دے گی۔ چنانچہ ایک بیش قرار رقم اِس کے لیے منظور کر لی گئی اور اُس کی ایک قسط مولانا آزاد سبحانی صاحب کے حوالہ بھی کر دی گئی۔ اِس روپیہ سے کلکتہ میں کام شروع کیا گیا۔ مولوی حفظ الرحمٰن صاحب نے کہا کہ یہ اِس قدر یقینی روایت ہے کہ اگر آپ اطمینان فرمانا چاہیں تو ہم اطمینان کرا سکتے ہیں۔"[1]

مولوی حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی اِس تقریر کے جواب میں مولوی شبیر احمد عثمانی کا بیان بھی قابلِ غور و فکر ہے :

"پہلے میں (شبیر احمد عثمانی) اُس معاملہ کی نسبت گفتگو شروع کرتا ہُوں، جو آپ نے مولانا آزاد سبحانی کے متعلق بیان فرمایا ہے۔ جو روایت آپ نے بیان کی، مَیں نہ اُس کی تصدیق کرتا ہُوں نہ تکذیب۔ ممکن ہے کہ آپ صحیح کہتے ہوں۔ مجھے اِس سے پہلے ہی بذریعہ ایک گمنام خط کے (جو دہلی سے ڈالا گیا تھا) یہی بتلایا گیا تھا اور مجھے بھی اُس خط میں دھمکی دی گئی تھی۔ یہ روایت صحیح ہو یا غلط،

---

[1] طاہر احمد قاسمی، مولوی: مکالمۃ الصدرین، مطبوعہ لاہور، ص ١١-١٣

بہرحال میرے علم میں آچکی ہے۔ لیکن اِس روایت سے مجھ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اور میری رائے کیا متاثر ہوسکتی ہے؟

میں نے جو رائے پاکستان وغیرہ کے متعلق قائم کی ہے، وُہ بالکل خلوص پر مبنی ہے۔ جمعیۃ العلمائے اسلام میں آزاد سبحانی رہیں یا نہ رہیں، جمعیۃ العلمائے اسلام خود قائم رہے یا نہ رہے، میری رائے جب بھی یہی رہے گی کہ مسلمانوں کے لیے پاکستان مفید ہے۔

اگر مَیں تھوڑی دیر کے لیے اِس روایت کو تسلیم بھی کر لُوں کہ جمعیۃ العلمائے اسلام گورنمنٹ کے ایماء سے قائم ہُوئی ہے، تو آپ سے پُوچھتا ہُوں کہ کانگرس کی ابتدا کس نے کی تھی اور کس طرح ہُوئی تھی؟ آپ کو معلوم ہے کہ ابتداءً اس کا قیام ایک وائسرائے کے اشارے پر ہُوا تھا۔"[1]

حقیقت کا حال تو اللہ تبارک و تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے لیکن اُن کے جواب کی روشنی میں اگر موصوف کو انگریز دوستی سے براءت کا سرٹیفکیٹ نہ بھی مل سکے، لیکن برٹش گورنمنٹ کا آلۂ کار ثابت کرنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ رہا مولوی آزاد سبحانی، رُکنِ جمعیۃ العلمائے اسلام کا معاملہ تو فریقین (عمائد و علمائے دیوبند) کے بیانات کی روشنی میں صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ موصوف کی انگریز دوستی بلکہ ایجنٹی و آلہ کاری شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۲۰۔ مولوی محمد الیاس کاندھلوی

موصوف ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء میں پیدا ہُوئے۔ دسؔ سال کی عمر میں مولوی رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۳۲ھ/۱۹۰۵ء) کی خدمت میں تحصیلِ علم و فیض کے لیے حاضر ہو کر آپ کے ہاتھ پر بیعت ہُوئے اور اُن کی وفات تک اپنے پیر گنگوہی صاحب کی خدمت میں حاضر رہے، اُس وقت آپ عمر کی بیسؔ منزلیں طے کر چکے تھے۔ دیوبندی حضرات کی تبلیغی جماعتیں

---

[1] طاہر احمد قاسمی، مولوی: مکالمۃ الصدرین، مطبوعہ لاہور، ص ۱۴، ۱۵

جو آجکل بھی چلتی پھرتی نظر آتی ہیں، اِس تحریک کے بانی یہی مولوی محمد الیاس صاحب ہیں۔ یہ تبلیغی نظام کب اور کیوں قائم ہوا، اِس کا تاریخی تذکرہ باب دوم میں اپنی جگہ پر ہو چکا ہے۔ علمائے دیوبند کی جس میٹنگ کا گزشتہ سطور میں تین دفعہ ذکر آچکا ہے، اُسی میں مولوی حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے یہ بھی کہا تھا:

> "اِسی ضمن میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے کہا کہ مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی تحریک کو بھی ابتداءً حکومت کی طرف سے بذریعہ حاجی رشید احمد صاحب کچھ روپیہ ملتا تھا پھر بند ہو گیا۔"[1]

حکومت نے اِمداد دینے کا وعدہ کر کے شردھانند کے مقابلے پر تبلیغ شروع کروا تو دی لیکن جیسا کہ مذکور ہوا، کچھ عرصہ گزرنے پر وظیفہ دینا بند کر دیا۔ کاندھلوی صاحب (المتوفی ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۴ء) اُس وقت شاید یہ شعر پڑھا کرتے ہوں گے: ؎

صبر اُس پہ اِس ہماری حسرتِ دیدار کا
بند جس نے کر دیا روزن تری دیوار کا

۱۲۔ مرزا غلام احمد قادیانی

دورِ حاضر کا مسیلمہ، اُمت کے تیس دجالوں میں سے ایک دجال، مرزا غلام احمد قادیانی بھی ہے۔ موصوف نے مجدد اور مصلح کے دعاوی سے سلسلہ شروع کیا۔ دعوئ نبوت کرنا تو عام مشہور ہے لیکن اِس خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا کو فراموش کر دینے والے اِس شخص نے اپنے متعلق خدا ہونے تک کے متعدد دعاوی کیے ہوئے ہیں۔ موت سے پیشتر اپنے کئی مخالفوں کو چیلنج کیا تھا کہ فریقین سے جو جھوٹا اور کذاب ہے اُسے خدائے بزرگ و برتر دُوسرے کی زندگی میں ہیضہ یا طاعون وغیرہ متعدی مرض کے ساتھ ذلیل کر کے مارے۔ مخالفین تو سارے ہی زندہ رہے لیکن اُن کی زندگی میں مرزا صاحب ہی بعارضۂ ہیضہ ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء بروز منگل ساڑھے دس بجے

---

[1] طاہر احمد قاسمی، مولوی: مکالمۃ الصدرین، مطبوعہ لاہور، ص ۱۳

دن کے راہیِ ملکِ عدم ہو گئے اور اپنے جھوٹا ہونے کا سب کے سامنے بیّن ثبوت پیش کر گئے۔

برٹش گورنمنٹ کے آلہ کاروں میں مرزا غلام احمد قادیانی کا مدِّمقابل سرزمینِ پاک و ہند میں تو کوئی نہیں ہُوا۔ مرزا غلام احمد کو یہ صفت ورثے میں ملی تھی۔ چنانچہ اپنے والد کے بارے میں خود یُوں تصریح کی ہے:

> ”میرے والد مرحوم کی سوانح میں سے وُہ خدمات کسی طرح الگ ہو نہیں سکتیں جو وُہ خلوصِ دل سے اِس گورنمنٹ کی خیرخواہی میں بجالائے۔ اُنھوں نے اپنی حیثیت اور مقدرت کے موافق ہمیشہ گورنمنٹ کی خدمت گزاری میں اُس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے وقت وُہ صدق اور وفاداری دکھلائی کہ جب تک انسان سچے دل اور نیز دل سے کسی کا خیرخواہ نہ ہو ہرگز دکھلا نہیں سکتا۔“[1]

اپنے والد کے بارے میں دُوسری کتاب کے اندر یُوں لکھا ہے:

> ”والد صاحب مرحوم اِس ملک کے ممبز زمینداروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ گورنری دربار میں اُن کو کُرسی ملتی تھی اور گورنمنٹ برطانیہ کے سچے شکرگزار اور خیرخواہ تھے۔“[2]

اُن کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہُوئے فخریہ انداز میں ایک جگہ یُوں بھی رقمطراز ہیں:

> ”سن ستاون (یعنی، ۱۸۵۷ء) کے مفسدہ میں جبکہ بے تمیز لوگوں نے اپنی محسن گورنمنٹ کا مقابلہ کر کے ملک میں شور ڈال دیا، تب میرے والد بزرگوار نے پچاس گھوڑے اپنی گرہ سے خرید کر کے اور پچاس سوار بہم پہنچا کر گورنمنٹ کی خدمت میں پیش کیے اور پھر ایک دفعہ سو سوار سے خدمت گزاری کی اور انہی مخلصانہ خدمات کی وجہ سے وہ اِس گورنمنٹ میں ہر دلعزیز ہو گئے۔ چنانچہ جناب گورنر جنرل کے دربار میں عزّت کے ساتھ اُن کو کُرسی ملتی تھی اور ہر ایک درجہ کے حکام انگریزی

---

[1] غلام احمد قادیانی، مرزا: شہادت القرآن، ص ۴۴

[2] غلام احمد قادیانی، مرزا: ازالۂ اوہام، ص ۵۰

> بڑی عزّت اور دلجوئی سے پیش آتے تھے۔“ [۱]

اپنے بڑے بھائی، مرزا غلام قادر کی انگریز دوستی کے بارے میں موصوف نے یُوں تصریح کی ہے:

> ”اِس عاجز کا بڑا بھائی، مرزا غلام قادر، جس قدر مدت تک زندہ رہا، اُس نے بھی اپنے والد مرحوم کے قدم پر قدم مارا اور گورنمنٹ کی مخلصانہ خدمت میں بہ دل و جان مصروف رہا۔“ [۲]

خود مرزا غلام احمد قادیانی (المتوفی ۱۹۰۸ء) جہاد کے سخت مخالف اَور برٹش گورنمنٹ کے نمبر ایک آلۂ کار تھے۔ اِس امر کا اعتراف موصوف نے اپنے لفظوں میں یُوں کیا ہے:

> ”میں ابتدائی عمر سے اِس وقت تک جو قریباً ساٹھ برس کی عمر تک پہنچا ہُوں، اپنی زبان اور قلم سے اہم کام میں مشغول ہُوں تاکہ مسلمانوں کے دِلوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی سچّی محبت اور خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیروں اَور اُن کے بعض کم فہموں کے دِلوں سے غلط خیال، جہاد وغیرہ کے دُور کروں جو دِلی صفائی اور مخلصانہ تعلقات سے روکتے ہیں۔“ [۳]

دُوسری جگہ انگریزوں کی حمایت میں جہاد کی مخالفت کرتے ہُوئے یُوں لکھتے ہیں:

> ”میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اِس سلطنت (برٹش گورنمنٹ) کے سچے خیر خواہ ہو جائیں اور مہدی خونی (امام مہدی علیہ السلام) اور مسیح خونی (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی بے اصل روایتیں (جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں) اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل (جو حکمِ خدا اور عمل و ارشادِ مصطفیٰ ہے) جو احمقوں کے دِلوں کو خراب کرتے ہیں، اُن کے دِلوں سے معدوم ہو جائیں۔“ [۴]

---

[۱] غلام احمد قادیانی، مرزا: شہادت القرآن، ص ۸۴

[۲] ایضاً: ص ۸۴

[۳] غلام احمد قادیانی مرزا: تبلیغِ رسالت، جلد ۷، ص ۱۰

[۴] غلام احمد قادیانی، مرزا: تریاق القلوب، ص ۲۵

موصوف نے انگریزی حکومت کے استحکام کی خاطر اُس کی حمایت میں جہاد کے خلاف بے شمار کتابیں لکھیں اور اشتہار شائع کرائے اور اپنے اِس اسلام دشمنی کے کارنامے پر آپ یُوں فخر کیا کرتے ہیں:

> "میں نے ممانعتِ جہاد اَور انگریزی اطاعت کے بارے میں اِس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وُہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں اُن سے بھر سکتی ہیں۔" [1]

شاید پنجاب کے مشہور شاعر ظفر علی خاں نے یہ شعر اِسی لیے کہا تھا: ؎

طوقِ استعمارِ مغرب خود کیا زیبِ گلُو
اَور گواہ اِس پہ ہیں مرزا کی پچاس الماریاں

انگریزی حکومت کی اطاعت و فرماں برداری کی ترغیب دینے اور مسلمانوں کے جذبۂ جہاد کو برٹش گورنمنٹ کے مفاد کی خاطر ٹھنڈا کرنے کی غرض سے مرزا غلام احمد قادیانی نے تحریری طور پر جو کچھ کیا، اُس کی تفصیل یُوں بیان کی:

> "مجھ سے سرکار انگریزی کے حق میں جو خدمت ہُوئی وُہ یہ تھی کہ مَیں نے پچاس ہزار کے قریب کتابیں اور رسائل اَور اشتہارات چھپوا کر اِس ملک اور نیز دُوسرے بلادِ اسلام میں اِس مضمون کے شائع کیے کہ گورنمنٹ انگریزی ہم مسلمانوں کی مُحسن ہے، لہٰذا ہر ایک مسلمان کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ اِس گورنمنٹ کی سچی اطاعت کرے اَور دِل سے اِس دولت کا شکر گزار اور دعاگو رہے اَور یہ کتابیں مَیں نے مختلف زبانوں یعنی اردو، فارسی، عربی میں تالیف کر کے اسلام کے تمام ملکوں میں پھیلا دیں اور یہاں تک کہ اسلام کے دُو مقدس شہروں، مکّہ اور مدینہ میں بھی بخوبی شائع کر دیں اور روم کے پایۂ تخت قسطنطنیہ اور بلادِ شام اور مصر اور کابل اور افغانستان کے متفرق شہروں میں جہاں تک ممکن تھا

---

[1] غلام احمد قادیانی، مرزا: تریاق القلوب، ص ۲۵

> اشاعت کر دی، جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ لاکھوں انسانوں نے جہاد کے وُہ غلیظ خیالات چھوڑ دیئے جو نافہم مُلاّؤں کی تعلیم سے اُن کے دِلوں میں تھے۔ یہ ایک ایسی خدمت مُجھ سے ظہور میں آئی ہے کہ مجھے اِس بات پر فخر ہے کہ برٹش انڈیا کے تمام مسلمانوں میں سے اِس کی نظیر کوئی مسلمان دِکھلا نہیں سکا۔"[1]

جس طرح اپنے دَور میں جعفرِ بنگال اور صادقِ دکن ممتاز تھے اور اپنے سیاہ کارناموں کو سرمایۂ افتخار سمجھا کرتے تھے اُس طرح اپنے پیش رو حضرات سے مرزا صاحب ملّت فروشی یا دین فروشی میں کم تھوڑے ہی رہ گئے تھے جو یہ فخر نہ کرتے بلکہ معلوم تو یُوں ہوتا ہے کہ موصوف اپنے میدان کے سارے کھلاڑیوں کو مات دے کر، سب سے ممتاز ہو گئے تھے۔ اِسی اسلام دشمنی اور ملّت فروشی کے باعث اُنھیں خود احساس تھا کہ کسی بھی اسلامی ملک میں، کوئی مسلمان حکمران، اِن کے وجود کو برداشت نہ کر سکے گا اور برٹش گورنمنٹ کے ماتحت اَور اُس کی سرپرستی میں جو یہ عظیم فتنہ پرورش پا رہا ہے، اِسلامی حکومت اِسے جڑ سے اُکھاڑے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اِس حقیقت کا سر سیّد احمد خاں علی گڑھی اور مولوی محمد حسین بٹالوی کی طرح خود مرزا صاحب نے علی الاعلان اور بغیر کسی ہیر پھیر کے یُوں اعتراف کیا ہے:

> "خدا تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے میری اور میری جماعت کی پناہ اِس سلطنت (برٹش گورنمنٹ) کو بنا دیا ہے۔ یہ امن جو اِس سلطنت کے زیرِ سایہ ہمیں حاصل ہے، نہ یہ امن مکّہ معظّمہ میں مِل سکتا ہے اور نہ مدینہ میں اَور نہ سلطانِ روم کے پایۂ تخت قسطنطنیہ میں۔"[2]

دُوسری جگہ موصوف نے اور وضاحت سے اِسی امر کا واشگاف اعتراف یُوں کیا ہے:

> "اگرچہ اِس محسن گورنمنٹ کا ہر ایک پر رعایا میں سے شکر واجب ہے، مگر مَیں خیال کرتا ہُوں کہ مجھ پر سب سے زیادہ واجب ہے، کیونکہ یہ میرے اعلیٰ

---

[1] غلام احمد قادیانی مرزا: ستارۂ قیصرہ، ص ۷

[2] غلام احمد قادیانی مرزا: تریاق القلوب، ص ۲۶

مقاصد جو جناب قیصرۂ ہند کی حکومت کے سایہ کے نیچے انجام پذیر ہو رہے ہیں، ہرگز ممکن نہ تھا کہ وُہ کسی اَور گورنمنٹ کے زیرِ سایہ انجام پذیر ہو سکتے ، اگرچہ وُہ اسلامی گورنمنٹ ہی ہوتی۔" [1]

مرزا صاحب اِس امر کے بھی معترف ہیں کہ اُنھیں ملکہ وکٹوریہ کے حکم سے نبی بنایا گیا تھا۔ نبی بنانے والے گورنر جنرل یا وائسرائے کا نام چونکہ اُنھوں نے تحریر نہیں کیا، لہٰذا اس کے ذکر کو چھوڑ کر ملکۂ برطانیہ کے متعلق بیان ملاحظہ ہو:

> "اے بابرکت قیصرۂ ہند! تجھے یہ تیری عظمت اور نیک نامی مبارک ہو۔ خدا کی نگاہیں اِس ملک پر ہیں۔ خدا کی رحمت کا سایہ اُس رعایا پر ہے جس پر تیرا ہاتھ ہے۔ تیری ہی پاک نیّتوں کی تحریک سے خدا نے مجھے بھیجا ہے۔" [2]

مرزا غلام احمد قادیانی کو ملکہ وکٹوریہ کے جس ماتحت حاکم نے نبی بنایا تھا ، اِس سے اُس کا مقصود کیا تھا اور مرزا صاحب کو کس ڈیوٹی پر مامور کیا گیا تھا؛ موصوف نے اِس سوال کا جواب خود یُوں دیا ہے:

> "اُس نے اپنے قدیم وعدہ کے موافق، جو مسیح موعود کے آنے کی نسبت تھا، آسمان سے مجھے بھیجا، "تا میں اُس مردِ خدا کے رنگ میں ہو کر جو بیت اللحم میں پیدا ہُوا اور ناصرہ میں پرورش پائی ، حضور ملکہ معظّمہ کے نیک اور بابرکت مقاصد کی اعانت میں مشغول رہُوں۔" [3]

موصوف کو اعتراف تھا کہ وُہ انگریزی حکومت کا خود کاشتہ پودا ہیں، اِسی لیے اپنے نبی بنانے والوں کی خدمت میں اپنی خدمات یاد دِلا کر، یُوں دست بستہ عرض پرداز ہوئے تھے:

> "التماس ہے کہ سرکار دولت مدار، ایسے خاندان کی نسبت ، جس کو پچاس سال کے متواتر تجربے سے ایک وفادار، جانثار خاندان ثابت کر چکی ہے اور جس کی

---

[1] غلام احمد قادیانی مرزا: تحفۂ قیصریہ، ص ۷، ۴

[2] غلام احمد قادیانی مرزا: ستارۂ قیصرہ ، ص ۱۵

[3] ایضاً: ص ۱۰

نسبت گورنمنٹ عالیہ کے معزز حکّام نے ہمیشہ مستحکم رائے سے اپنی چٹھیات میں یہ گواہی دی ہے کہ وُہ قدیم سے سرکار انگریزی کا خیرخواہ اور خدمت گزار ہے۔ اِس خود کاشتہ پودے کی نسبت نہایت حزم و احتیاط سے اور تحقیق و توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حُکّام کو اشارہ فرمائے کہ وُہ بھی اِس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو عنایت و مہربانی کی نظر سے دیکھیں۔“ [1]

اپنی منقاروں سے حلقہ کَس رہے ہیں جال کا
طائروں پر سحر ہے صیّاد کے اقبال کا

شیعہ حضرات

متحدہ ہندوستان کی سرزمین میں بسنے والے مسلمانوں کا مذہب، اہلسنت وجماعت تھا، جن کو آجکل بریلوی مکتبِ فکر کے نام سے موسوم کیا جانے لگا ہے اور جملہ جماعتیں جو آج کل نظر آ رہی ہیں وُہ انگریزی دَورِ حکومت میں اِسی جماعت سے، برٹش گورنمنٹ کے تخریبی منصوبے کے تحت، جُدا ہو کر بنی تھیں، ماسوائے شیعہ حضرات کے جو سرزمینِ پاک و ہند میں مغلوں کے دَور سے موجود تو تھے لیکن انتہائی اقلیت میں، یعنی آٹے میں نمک کے برابر۔ اِن حضرات نے اپنے لیے یہی بہتر سمجھا کہ برٹش گورنمنٹ کے وفادار اور خیرخواہ بن کر رہیں، اِسی لیے انگریزوں کے خلاف اِنھوں نے کبھی کسی تحریک میں حصّہ نہیں لیا۔ شیعہ صاحبان کی اِس وفاداری کا ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے یُوں اعتراف کیا ہے:

”بغاوت کے غیرضروری ہونے پر اِن کا اعلان بغیر کسی دباؤ کے واقع ہُوا اور یہ بات نہایت ہی خوب ہے کہ ایسا اعلان باضابطہ طور پر تحریر میں آ گیا۔ اِس دستاویز پر مستند اور قابلِ اعتماد شیعہ علماء کی مُہریں ثبت ہیں اور یہ پُورا فرقہ

---

[1] غلام احمد قادیانی مرزا: تبلیغِ رسالت، جلد ۷، ص ۱۹

اِس پر ہمیشہ عمل کرنے کے لیے مجبور ہے ۔ اِس قسم کے باقاعدہ وعدوں کے بغیر بھی وُہ قدرتاً وفادار ہیں "۔ [1]

ڈاکٹر ولیم ہنٹر کے بیان کے متعلق سر سیّد احمد خاں صاحب کے اپنے تاثرات یہ ہیں :

"اِس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے شیعہ لوگوں کا کچھ ذکر لکھا ہے اور جو تعریف اُن لوگوں کی کی ہے گو وُہ بھی مشروط بہ شرائط ہیں، لیکن مَیں اس طرح سے بھی خوش ہُوں، کیونکہ میری دانست میں یہی غنیمت ہے کہ اِس عالِم ڈاکٹر نے مسلمانوں کے ایک فرقہ کی تو تعریف کی ۔ چنانچہ مَیں اُن کی اِس قدر مہربانی اور رحم کا شکرگزار ہُوں "۔ [2]

قارئینِ کرام ! جن حضرات کو برٹش گورنمنٹ نے سرزمینِ پاک و ہند سے اپنا آلۂ کار بنا کر، اُن سے تخریبِ دین کا کام لیا، اُن سے مسلمانوں کی ملّی وحدت کو پارہ پارہ کروایا، ایک اسلام کے متعدد جعلی اسلام بنوائے اور اِس طرح یہاں کے مسلمانوں کو ایک پریشان کُن مصیبت میں مبتلا کر کے اُن کی طاقت کو منتشر اور دین و ایمان کو تباہ و برباد کروایا، ایسی سیکڑوں ہستیوں میں سے چند نامور حضرات کی اِس باب میں نشان دہی کی گئی ہے اور اُن کے بارے میں جو بیانات پیش کیے ہیں، وہاں بھی مقصود ایسے جملہ بیانات کا حصر ہرگز نہیں تھا، بلکہ نمونے کے طور پر چند واضح اور غیر مبہم عبارتیں پیش کرنے پر ہی اکتفا کیا ہے کیونکہ پرکھنے والے تو اِن کی روشنی میں بھی کھرے اور کھوٹے سکّوں کو پہچان سکیں گے پھر طوالت کی کیا ضرورت ؟

غیر مسلموں سے دوستی کا شرعی حکم کیا ہے ؟ اِس بارے میں آگے مستقل عنوان کے تحت بقدرِ کفایت جواب موجود ہے ۔ لیکن یہ تو نرالا ہی ستم ہے کہ یہاں معاملہ دوستی پر بھی ختم نہ ہُوا بلکہ ایجنٹ اور آلۂ کار تک بن گئے ۔ اگر کلامِ الٰہی کو سامنے رکھتے، اُس پر یقین ہوتا، اپنے پیدا کرنے والے کی بات سُنتے تو ہرگز بھی اُن دشمنانِ دین کے پھندے میں نہ پھنستے جبکہ یہود و نصارٰی کے بارے میں بھی کلامِ الٰہی یُوں خبردار کر رہا تھا :

---

[1] ولیم ہنٹر ڈاکٹر : ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۱۰۹

[2] سر سیّد احمد خاں : ہنٹر پر ہنٹر، مطبوعہ لاہور، ص ۸۷

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ	وُہ جو کافر ہیں، کتابی یا مشرک، وُہ نہیں
الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ	چاہتے کہ تم پر کوئی بھلائی اُترے تمھارے
عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ط [1]	رب کے پاس سے۔

کیا اُن حضرات نے اِس حقیقت کو مدِّ نظر رکھا؟ باری تعالیٰ شانہٗ فرماتے کہ اہلِ کتاب کبھی تمھاری بھلائی نہیں چاہتے، لیکن اُن حضرات نے باری تعالیٰ شانہٗ کی نعمتوں کے خزانوں کی کنجیاں ہی شاید برٹش گورنمنٹ کے ہاتھوں میں سمجھ رکھی تھیں کہ خدا سے مُنہ موڑ لیا اور حکومت سے رشتہ جوڑ لیا۔ کاش! وُہ قرآن کریم سے یہ پُوچھ لیتے کہ اہلِ کتاب بھی اگر ہماری بھلائی میں خوش نہیں تو اور کِس بات میں خوش ہیں؟ اگر وُہ اِتنا پُوچھنے کی زحمت برداشت کرتے تو اللہ تعالیٰ کا کلام معجز نظام اُنھیں واضح طور پر یہ بتاتا کہ:

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ	بہت کتابیوں نے چاہا، کاش! تمھیں
مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ	ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں، اپنے
عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ	دلوں کی جلن سے، بعد اِس کے کہ حق اُن
الْحَقُّ ۚ ط [2]	پر خوب ظاہر ہو چکا ہے۔

مسلمانو! کلامِ الٰہی کی سُنو کہ اکثر اہلِ کتاب کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جلن اُٹھتی رہتی ہے اور اُسے بُجھانے کی خاطر وُہ یہی حربہ استعمال کرتے ہیں کہ مسلمان سے کافر بنا دیں۔ جائے غور ہے کہ جو حضرات اُن حاسدوں کی جھولی میں جا گرے تھے کیا انگریزی ڈھنڈورچیوں کے مطابق واقعی امیر المومنین، مصلح، ریفارمر، نبی اور شمس العلماء بنایا تھا؟ قرآن کو سچّا جانو کہ جہاں اُن کا بس چلے وُہ مسلمان کو کفر کی طرف پھیرتے ہیں۔ اگر خدانہ کرے اب بھی کوئی شک باقی رہ گیا ہے اور ارشادِ ربانی اور سُن لو کہ اہلِ کتاب کِسی مسلمان سے کِس صورت میں اور کب راضی ہو سکتے ہیں؟ یہ کسی مولوی کا فتویٰ نہیں کلامِ الٰہی کی ایک روشن آیت کا حصّہ ہے:

---

[1] البقرہ: آیت ۱۰۵

[2] البقرہ: آیت ۱۰۹

وَلَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی
حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ [۱]

اور ہرگز تم سے یہود اور نصاریٰ راضی نہ
ہوں گے جب تک تُم اُن کے دین کی پیروی
نہ کرو۔

اب تو واضح ہوگیا کہ مسلمان کو مسلمان ہی دیکھتے ہُوئے یہود اور نصاریٰ کبھی راضی نہیں ہو سکتے۔ وُہ اگر خوش ہوں گے تو اسلام سے ہٹا کر اور اپنی ملّت کا تابع بنا کر خوش ہوں گے۔ سوچیے ذرا، جن حضرات نے برٹش گورنمنٹ کو راضی کرنا ہی اپنی زندگیوں کا مقصد اور اپنا اوّلین نصب العین بنا رکھا تھا، قرآنِ کریم کے آئینے میں دیکھیے کہ انگریزوں نے اُنھیں کیا بنایا ہوگا اور اُن سے کب جاکر راضی ہُوئے ہوں گے؟ اور دیکھیے کلامِ الٰہی یُوں بھی خبردار کر رہا تھا:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا
مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یَرُدُّوْكُمْ
بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ كٰفِرِیْنَ ○ [۲]

اے ایمان والو! اگر تم کچھ کتابیوں کے کہے
پر چلے تو وُہ تمھارے ایمان کے بعد تمھیں
کافر کر چھوڑیں گے۔

یہاں بھی صاف لفظوں میں بتادیا ہے کہ اہلِ کتاب تمھیں مصلح یا ریفارمر وغیرہ کچھ بھی نہیں بنائیں گے اگرچہ دھوکے میں رکھنے کے لیے لیبل تمھاری پیشانیوں پر ایسے ہی لگائیں گے، ورنہ حقیقت میں وُہ تمھیں مسلمان نما کافر بنائیں گے۔ مصلح وغیرہ تو جب بنائیں کہ اُنھیں اسلام کی خیرخواہی منظور ہو، ابھی ارشادِ ربّانی سُنا کہ اُن کے دِلوں میں تو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف حسد کی آگ بھڑکتی رہتی ہے اور یہ بھی بتا دیا کہ اُس آگ کو اِسی طرح بجھاتے ہیں کہ مسلمانوں کو کافر بناتے ہیں کہ اسلام سے پھر جائیں یا اُن کی ملّت کا ایک جزو بن جائیں، اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا مِنْھُمْ۔

قارئینِ کرام! آپ نے انگریز دوستوں کے اپنے یا اُن کے متعلق ایک دُوسرے کے بیانات ملاحظہ فرمائیے اور اب آخر میں ارشاداتِ خداوندی سُنئے۔ اِن کی روشنی میں مذکورہ حضرات دین کے خیرخواہ تھے یا بدخواہ، خداترس تھے یا خوفِ خدا سے عاری، ملّت کے غمخوار تھے یا زرپرست،

---

[۱] البقرہ، آیت ۱۲۰

[۲] آلِ عمران، آیت ۱۰۰

مصلح اور ریفارمر تھے یا افتراق بین المسلمین کے ٹھیکیدار؟ اِس امر کا فیصلہ کرنا اور اُس فیصلے کو عملی جامہ پہنانا یہ آپ حضرات کی ذمہ داری ہے۔

مذکورہ صورتِ حال کے برعکس، راقم الحروف کو تو علی الاعلان یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ مسلمانوں کی حقیقی اور قدیمی جماعت، سوادِ اعظم اہلسنّت وجماعت کے کسی ذمہ دار عالِم کے متعلق اِس قسم کا ایک بیان بھی نہیں دکھایا جا سکتا کہ اُنھوں نے برٹش گورنمنٹ کی حمایت کی ہو، یا انگریزوں کے اشارے پر یا کسی بھی وجہ سے اسلامی عقائد ونظریات میں، اپنی طرف سے معمولی ردّ و بدل بھی کی ہو۔ ذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔ احقر یہ بھی پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہے کہ ہماری جماعت (جسے مبتدعین نے بریلوی فرقہ کہنا شروع کیا ہوا ہے) وہی چودہ سو سال سے چلی آنے والی قدیمی جماعت ہے اور ہمارے عقاید ونظریات وہی ہیں جو شروع سے لے کر اب تک متوارث چلے آرہے ہیں۔ باری تعالیٰ شانہٗ ہمیں اِسی جماعت میں رکھے، جملہ مدعیانِ اسلام کو سچی ہدایت نصیب فرمائے اور ہمارا خاتمہ ایمان پر ہو۔ آمین یا اللہ العٰلمین بحق سید المرسلین۔ ربّنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هديتنا وهب لنا من لدنك رحمة ط انك انت الوهاب ٥ وصلى الله تعالىٰ على حبيبه محمد وعلىٰ اٰله وصحبه اجمعين۔

باب پنجم

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ   ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن ست   چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی ست
بمصطفٰی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست   اگر باُو نرسیدی تمام بولہبی ست
(اقبال)

وہابیہ کی زُنّار دوستی

قارئین کرام ! یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ مسلمان اپنی مرضی کا مالک اور مطلق العنان نہیں بلکہ احکامِ الٰہی کا پابند ہے۔ اِس کے تعلقات رضائے الٰہی اور منشائے خداوندی کے تابع ہوتے ہیں۔ مسلمان کسی سے محبّت کرے تو خدا کے لیے کرتا ہے اور کسی سے عداوت رکھے تو خدا کے لیے رکھتا ہے۔ اپنی مرضی سے یہ کسی سے بنانے اور بگاڑنے کا مجاز نہیں۔ باری تعالیٰ شانہٗ نے اِس بارے میں جو حد بندی فرمائی ہے اُس سے تجاوز کرنا، گویا عملاً اسلام سے منحرف ہونا ہے۔

حالات کی ستم ظریفی تو ملاحظہ فرمائیے کہ ان حضرات نے سرزمینِ پاک و ہند میں تیرھویں صدی کے اوائل سے سچّے اور پکّے مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے کا ناپاک مشغلہ اپنے ساختہ دین کا اوّلین رکن، اپنے ضابطۂ حیات کا اہم ترین باب اور بہترین توشۂ آخرت و زادِ راہ قرار دے کر اپنا اوڑھنا بچھونا یا دائمی وظیفہ یا تکیۂ کلام بنایا ہوا ہے اور سیکڑوں کتابیں بھی اِسی منصوبے کے تحت بڑی آب و تاب سے شائع کروا چکے ہیں، جن میں آیاتِ الٰہیہ و فرامین مصطفویہ کے معانی و مطالب میں تحریف کرتے وقت قطعاً خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا کو مدّنظر نہیں رکھا گیا اور اِس طرح متواتر اُمتِ محمدیہ کو شرک کے سمندر میں دھکیل رہے ہیں گویا یہ اُمتِ مرحومہ اِن کے نزدیک ٹھیٹ اُمتِ ملعونہ ہے۔ ان حضرات کی تصانیف کے مطالعہ سے یُوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ گیارہ سو سال سے یہ امت توحید جیسے بنیادی اور اہم ترین عقیدے سے دست بردار ہو کر اسلام سے ناآشنا ہو گئی تھی اور گیارہ سو سال تک مسلمانانِ عالم اُس عقیدۂ توحید سے تہی دست رہے تھے، جس پر اہلِ اسلام کو بجا طور پر ناز ہے۔

گویا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو توحید کا جو درس دیا تھا اور اُس سرکار کے جانثار یعنی حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، جس توحید کے علمبردار اور مبلّغ بنائے گئے تھے، اِن کرم فرماؤں کے نزدیک اُسی مایۂ ناز عقیدۂ توحید کو اہلسنت وجماعت کے علمائے کرام اور اولیائے عظام نے گیارہ سو سال سے شرک کی گھانی میں ملائے رکھا اور

اِن مبتدعینِ زمانہ کے نزدیک اصلی عقیدۂ توحید اب وہی ہے جو محمد بن عبدالوہاب نجدی نے خارجیت کے مردہ جسم میں جان ڈال کر، بارھویں صدی کے آخر میں پیش کیا اور "کتاب التوحید" کے ذریعے پُوری دنیا میں اُس کی تبلیغ و اشاعت کا انتظام کیا گیا۔

پاک و ہند میں موصوف کی "کتاب التوحید" کے اسباق کو اُردو کا لباس پہنا کر مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے "تقویۃ الایمان" کے نام سے پیش کر کے مسلمانوں پر شرک و کفر کی گولہ باری کا فریضہ انجام دیا۔

عقیدہ توحید کو غتر بود کرنے کی جسارت اور مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے کا مآل تو ملاحظہ ہو کہ قدرت نے ان لوگوں کو اقوامِ عالم کے سامنے کس انداز میں سزا دی؛ کیا مسلمان جیسی غیور قوم کے لیے یہ باعثِ ننگ و عار نہیں کہ وُہ کافروں اور مشرکوں کا آلۂ کار یا نعلین بردار بنے؛ مسلمانوں کو مشرک بتانے والوں کو قدرت نے یہ سزا دی کہ وہ برضا و رغبت مشرکینِ ہند کے نہ صرف غلام بنے بلکہ بُت پرستوں کے بندۂ بے دام بنے۔ باری تعالیٰ شانہٗ سمجھ اور ہدایت نصیب فرمائے۔ آمین۔

اب میں اِن حضرات کی زنّار دوستی کے چند واقعات و بیانات پیش کرتا ہوں۔ آئیے سب سے پہلے بڑی دکان پر چلتے ہیں۔ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے سیکرٹری کون صاحب تھے؟:

> "ہمیں افسوس ہے کہ ہم شاہ صاحب (مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی) کا خط بلفظہٖ نقل نہیں کر سکتے، اِس لیے کہ جو کاغذات منشی ہیرا لال کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہمیں ملے ہیں، وہ علاوہ پارہ پارہ ہونے کے ایسے بدخط لکھے ہوئے ہیں کہ ہم بلفظہٖ نقل کرنے کا فخر حاصل نہ کر سکے۔"[1]

سیّد احمد صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے ساتھیوں نے صوبۂ سرحد میں جو جنگیں لڑیں، جنھیں جہاد کا نام دیا جاتا ہے۔ اُن بانکے مجاہدین میں سے ایک نامور مجاہد سے ہم

---

[1] مرزا حیرت دہلوی: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء، ص ۴۸

قارئینِ کرام کو مطلع کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

"اِدھر اپنے مورچے سے بوقتِ شب سیّد صاحب نے اپنی فوج براہِ جلالہ واپس کرنی شروع کر دی۔ ایک راجپوت ہندو، جو مولوی احمد اللہ کے ساتھ بیسواڑہ سے جا کر شریکِ لشکرِ اسلام تھا مورچے میں باقی رہ گیا، جو صبح تک تنہا دونوں توپوں کو چلاتا رہا۔ بوقتِ صبح راجہ رام بھی بمقابلہ جلالہ اپنے لشکر سے آملا۔ اُدھر دُرّانی مارے خوفِ شبخون کے اپنے مورچے چھوڑ کر رات کو بھاگ گئے اور دوپہر تک واپس نہ آئے۔"[1]

جب سیّد احمد صاحب کی فوج دُرّانیوں کے خُون سے ہولی کھیل رہی تھی تو سیّد صاحب کے محبوب مجاہد اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے چہیتے اور منظورِ نظر توپچی یعنی راجہ رام صاحب کس بے جگری سے خدا کی راہ میں جہاد کر رہے تھے:

"مولانا نے تلوار کا پُھرتی سے وار کر کے اُس کی گردن اڑا دی۔ دوسرا توپچی بھی یُوں مارا گیا۔ مولانا شہید نے فوراً وہ دونوں توپیں دُرّانیوں کی طرف پھیر کے فَیر کرنے شروع کیے۔ ایک وفادار ہندو جو مولانا شہید پر فریفتہ تھا (راجہ رام قوم راجپوت باشندۂ بیسواڑہ) گولہ اندازی پر مقرر ہُوا۔ اُس نے اِس قدر پُھرتی سے گولہ اندازی کی کہ دُرّانیوں کے پَیر اُکھڑ گئے۔"[2]

جناب غلام رسول مہر کی زبانی بھی راجہ رام کے اِس جہاد کی مختصر سی کہانی ہدیۂ قارئین ہے:

"یہ آٹھ دس آدمی تھے، جن میں سے شیخ امجد علی غازی پوری، حافظ رحیم بخش الہ آبادی، اور حافظ عبداللطیف نیوتنوی (برادر مولوی عبدالحق)، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اِن کے ساتھ ایک ہندو راجا رام نامی بھی تھا، جو بیسواڑہ (نزد سلون) کا باشندہ تھا۔ اُس نے اپنا قصّہ یُوں بیان کیا کہ میں مورچے

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیات سیّد احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۲۴۰

[2] مرزا حیرت دہلوی: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۰۲ء، ص ۲۲۷

> میں سو گیا۔ آنکھ کھلی تو کسی کو نہ پایا۔ بستی میں جا کر پوچھا تو معلوم ہُوا کہ تمام غازی اُس فوج پر شبخون مارنے کے لیے گئے ہیں، جو دو آبہ کی طرف سے کمک کے طور پر آ رہی تھی۔ میں یہ سُن کر توپوں کے پاس پہنچا۔ اندیشہ پیدا ہُوا کہ مبادا دشمن (دُرّانی)، توپیں لے جائیں، اُن میں گولے بھر بھر کر چلانے لگا۔“ [1]

راجہ رام کے ایسے ہی کارناموں پر سیّد صاحب نے اُسے قبولیت کی سند جن لفظوں میں عطا فرمائی وہ بھی ملاحظہ ہوں، "تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے:

> ”سیّد صاحب نے راجہ رام کی بہادری اور حُسنِ تدبیر کی ستائش فرمائی۔“ [2]

حادثۂ بالاکوٹ کے بعد شیر سنگھ نے سیّد احمد صاحب کی لاش کے ساتھ کیا سلوک کیا ملاحظہ ہو:

> ”یہ بھی ایک روایت ہے کہ آپ کی شہادت کے بعد راجہ شیر سنگھ خلف مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جو سکھوں کی فوج کا جرنیل تھا، آپ کی لاش پر دو شالا ڈال کر، بہت عزّت سے، آپ کو دفن کرا دیا۔“ [3]

بعض لوگوں نے اس روایت کو مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی پر چسپاں کیا ہے (واللہ اعلم) اور مولوی محمد جعفر تھانیسری کا خیال بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن دیگر وہابی مورّخین اِس اعزاز کو سید صاحب کے ساتھ ہی مخصوص کرتے ہیں، جناب غلام رسول مہر کی وضاحت ملاحظہ فرما لی جائے، وُہ یُوں رقمطراز ہیں:

> ”شیر سنگھ نے اُن گرفتاروں سے کہا کہ لاشوں میں سے ہم کو بتاؤ، خلیفہ صاحب (یعنی سیّد احمد صاحب) کی لاش کون سی ہے؟ اگر تم سچ سچ بتا دو گے تو تم کو چھوڑ دیں گے۔ پھر اُنھوں نے کھیت میں جا بجا پھر کر لاشوں کو دیکھا،

---

[1] غلام رسول مہر: سیّد احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۴۵۵، ۴۵۶

[2] ایضاً: ص ۴۵۶

[3] محمد جعفر تھانیسری: حیات سیّد احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۳۱۶

ایک لاش بے سر کی تھی، اُنھوں نے کہا کہ یہ لاش خلیفہ صاحب کی معلوم ہوتی ہے مگر اِس کا سر بھی ہو تو ہم بتا دیں، پھر شیر سنگھ نے اُس کا سر تلاش کروا کر منگایا اور اُس لاش میں ملوایا، تب اُنھوں نے کہا: ہاں خلیفہ صاحب کی لاش یہی ہے۔ پھر شیر سنگھ نے ایک دوشالا اُس لاش پر ڈلوایا، دُو تھان خاصے کے اور پچیس روپے نقد دیے اور کہا: جس طرح تم مسلمانوں کا دستور ہے کفن دے کر اِس کو دفن کر دو۔ پھر اِدھر اُدھر سے مُلکی مسلمان بھی آ کر جمع ہُوئے اور کفن دے کر اُس لاش کو دفن کیا اور وُہ روپے نقد خیرات کیے گئے۔"[1]

مہر صاحب نے دیوان امرناتھ کے ظفر نامے سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ شیر سنگھ نے سیّد صاحب کی تصویر بھی بنوائی تھی، یہ تو ہمیں معلوم نہیں کہ کیوں بنوائی، بہر حال بنوائی گئی۔ چنانچہ موصوف یُوں لکھتے ہیں:

"شیر سنگھ سید صاحب کی نعش کی طرف متوجہ ہُوا اور ایک سحر کار مصوّر کو مقرر کیا تاکہ اُن کی تصویر ہُو بہُو کھینچے۔ جب اُس علاقے کے نظم و نسق سے فارغ ہو کر دربار میں پہنچا، رنجیت سنگھ بہت خوش ہُوا۔ شیر سنگھ کو کلغی اور خلعت کے علاوہ بہت انعام دیے اور زیادہ سے زیادہ مہربانیاں کیں۔ خلیفہ صاحب کی تصویر سے جوانمردی کی بُو سُونگھ کر کہا: "آفرین"۔ اور منصفانہ تعریف کی۔ میں نے بھی وہ تصویر دیکھی، لیکن اِس بات پر حیران ہُوا کہ صورت کے درویش ہونے کے باوجود سلطانی و حکمرانی کی خواہش نفسانیت نے پیدا کی اور اگر مذہبی اختلاف کی بنا پر یہ سب کچھ عمل میں آیا تو سمجھنا چاہیے کہ خلیفہ صاحب صفوت و صفا سے بے خبر تھے۔"[2]

سیّد احمد صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی اِن جملہ جنگی سرگرمیوں کے بارے میں خود وہابی

---

[1] غلام رسول مہر: سیّد احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۸۰۳، ۸۰۴

[2] ایضاً: ص ۸۰۸، ۸۰۹

حضرات کی زبانی یہ اقرار ملاحظہ فرمائیے کہ ان میں بھی ہندو مسلم اتحاد کارفرما تھا، چنانچہ لکھتے ہیں:

"ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ حضرت سید احمد شہید کی تحریک ۱۸۲۴ء اور جہادِ حریت ۱۸۵۷ء میں بھی ہندو مسلم اتحاد کام کر رہا تھا۔"[1]

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام الوہابیہ کی اس تحریکِ جہاد کے بارے میں دیوبندی نقطۂ نظر کی پوری طرح وضاحت کر دی جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر مولوی حسین احمد ٹانڈوی نے یوں تصریح کی ہے:

"ہندوستان کی بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ سید صاحب کو مسلمانانِ پنجاب کی حد درجہ پامالی و زبوں حالی کے باعث مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بالمقابل صف آرا ہونا اور آخر معرکۂ بالاکوٹ میں جامِ شہادت نوش کرنا پڑا، ورنہ اصل یہ ہے کہ سید صاحب کا مقصد ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط و اقتدار سے نجات دلانا تھا۔ انگریز خود اسے محسوس کرتے تھے اور اس تحریک سے بڑے خوف زدہ تھے، اسی بنا پر جب سید صاحب کا ارادہ سکھوں سے جنگ کرنے کا ہوا تو انگریزوں نے اطمینان کا سانس لیا اور جنگی ضرورتوں کے مہیا کرنے میں سید صاحب کی مدد کی۔"[2]

ٹانڈوی صاحب کا نظریہ معلوم ہو گیا کہ اُن کے نزدیک سید صاحب نے انگریزوں سے وطن آزاد کرانا تھا۔ سکھوں سے معرکہ آرائی مقصود نہ تھی، یہ ضمناً ہوئی جس سے انگریز خوش تھے اور کسی قسم کی مزاحمت نہیں کر رہے تھے بلکہ ٹانڈوی صاحب نے یہ کھل کر اعتراف کر لیا کہ برٹش گورنمنٹ نے جنگی ضروریات کے سلسلے میں سید صاحب کی مدد کی تھی۔ اب یہ ملاحظہ فرمایا جائے کہ سکھوں سے سید صاحب کو کیوں لڑنا پڑا تھا:

"اُس زمانہ میں مغربی پنجاب میں سکھوں کی حکومت تھی جو کہ انگریزوں کے

---

[1] عبدالرشید ارشد: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، بار دوم ۱۹۷۰ء، ص ۲۷۸

[2] حسین احمد ٹانڈوی، مولوی: نقشِ حیات، جلد دوم، مطبوعہ دہلی، ص ۱۲

حلیف تھے اور آپس میں (انگریزوں اور راجہ رنجیت سنگھ میں) زوردار معاہدے کیے ہوئے تھے مگر حقیقت میں سکھوں سے لڑنے کا مقصد اصلی اِن بدیشیوں (انگریز) اور اُن کے معاونین سے لڑ کر ملک کو اس مصیبت سے بچانا تھا اور رعایا پر سے اُن کے وحشیانہ مظالم کو اُٹھا دینا اور بس“۔ [1]

سید صاحب سکھوں سے کیوں لڑے؟ اِس کی ٹانڈوی صاحب نے وضاحت کر دی۔ اب رہی یہ بات کہ انگریزوں کو متحدہ ہندوستان سے کیوں نکالنا چاہتے تھے؟ اِس کا موصوف نے یُوں جواب دیا ہے:

”سید صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلّط و اقتدار کا قلع قمع کرنا تھا، جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے۔ اِس بنا پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی اور اُس میں صاف صاف اُنھیں بتا دیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے پردیسی لوگوں کا اقتدار ختم کر دینا ہے۔ اِس کے بعد حکومت کس کی ہوگی؟ اِس سے آپ کو غرض نہیں ہے۔ جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے، ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں وُہ حکومت کریں گے۔ چنانچہ اِس سلسلے میں سرحد سے گوالیار کے مدار المہام اور مہاراجہ دولت رائے سیندھیا کے وزیر و برادر نسبتی راجہ ہندو راؤ کو آپ نے جو خط تحریر فرمایا ہے، وُہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ اِس سے آپ کے اصلی عزائم اور ملکی حکومت کے متعلق آپ کے نقطۂ نظر پر روشنی پڑتی ہے“۔ [2]

ٹانڈوی صاحب نے اپنے اِسی بیان کو آگے چل کر یُوں مزید وضاحت کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

”کامیاب ہونے کے بعد ہندوستان میں ملکی حکومت کا نقشہ کیا ہوگا؟ اِس کا

---

[1] حسین احمد ٹانڈوی، مولوی: نقشِ حیات، جلد دوم، مطبوعہ دہلی، ص ۵

[2] ایضاً: ص ۱۳

فیصلہ آپ طالبینِ مناصبِ ریاست و سیاست پر چھوڑتے ہیں، مگر ہندوؤں کو یہ اطمینان ضرور دلاتے ہیں کہ وہ سیّد صاحب کی کوششوں کو اپنی ریاست کی بنیاد کے مستحکم ہونے کا باعث سمجھیں اور پھر سیّد صاحب کا ہندو ریاستوں کو مدد اور شرکتِ جنگ کی دعوت دینا اور اپنے توپ خانہ کا افسر راجہ رام راجپوت کو مقرر کرنا خود اِس کی دلیل ہے کہ آپ ہندوؤں کو اپنا محکوم نہیں بلکہ شریکِ حکومت بنانا چاہتے تھے۔ بیشک سیّد صاحب جگہ جگہ اعلاء کلمۃ اللہ اور دینِ رب العالمین کی خدمت کا ذکر کرتے اور اِسی کو اپنی مساعی کا محرک بتاتے ہیں لیکن آپ یہ خوب سمجھتے تھے کہ اعلاءِ کلمۃ اللہ کا ذریعہ صرف یہ ہی نہیں ہے کہ ایک فرقہ وار گورنمنٹ قائم کی جائے اور خود حاکم بن کر دوسرے برادرانِ وطن کو اپنا محکوم بنایا جائے بلکہ اِس کا سب سے زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ برادرانِ وطن کو سیاسی اقتدار میں اپنا شریک کر کے اسلامی فضائلِ اخلاق سے اُن کے دلوں کو فتح کیا جائے۔ اقلیت اور اکثریت کے مسئلہ کی کوئی پیچیدگی آپ کے ذہن میں نہیں تھی۔ کیونکہ آپ کے نزدیک یہ دونوں بے حقیقت چیزیں تھیں۔ جو اپنے عمل میں سب سے زیادہ پُرجوش، فداکار، سرگرم اور مخلص و دیانت دار ہوگا، امامت اور لیڈرشپ اُسی کے ہاتھ میں رہے گی، خواہ اقلیت کے فرقہ سے تعلق رکھے یا اکثریت کے فرقہ سے۔"[1]

سیّد احمد اینڈ کمپنی کی تحریکِ جہاد کے بارے میں دارالعلوم دیوبند کے سابق صدرِ محترم اور دیوبندی حضرات کے عالیجناب شیخ الاسلام صاحب کا نظریہ قارئینِ کرام نے ملاحظہ فرما لیا۔ اگر موصوف کو سچا مان لیا جائے تو یقیناً ہر ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِن حالات میں سیّد احمد صاحب اور اُن کے ساتھیوں کو شہید کس بنا پر کہا جاتا ہے؟ اِس طرح یہ ایک ملک گیری کی جنگ تو کہلا سکتی ہے لیکن جہاد کیسا؟ ملکی جنگ بھی ایسی کہ اگر کامیابی

---

[1] حسین احمد ٹانڈوی، مولوی: نقشِ حیات، جلد دوم، ص ۱۵، ۱۶

نصیب ہو جاتے تو انگریزوں کے ساتھ ہنود کی حکمرانی بھی بسر و چشم قبول ۔ مشرکینِ ہند کو برابر کا شریک رکھا، اُن سے وعدے کر لیے ۔ خود وہابی حضرات وہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتے جو ہم مذکورہ سطور میں عرض کر چکے، چنانچہ مولوی عامر عثمانی (المتوفی ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء) ٹانڈوی صاحب کی اِن تصریحات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”کوئی شک نہیں، اگر استادِ محترم حضرت مدنی کے ارشادِ گرامی کو درست مان لیا جائے تو حضرت اسمٰعیل کی شہادت محض فسانہ بن جاتی ہے ۔ مادّی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے غیر ملکی حکومت کے خاتمے کی کوشش کرنا ذرا بھی مقدس نصب العین نہیں ۔ اِس نصب العین میں کافر و مومن سب یکساں ہیں ۔ اِس طرح کی کوشش کے دوران مارا جانا اُس شہادت سے بھلا کیا تعلق رکھے گا جو اسلام کی ایک معزّز ترین اور مخصوص اصطلاح ہے اور اِس طرح کی کوششوں کے نتیجہ میں قید و بند کی مصیبتیں اٹھانا اجرِ آخرت کا مُوجب کیوں ہو گا؟“ [1]

خیر اِس بات کا فیصلہ تو وہابی حضرات خود کریں گے کیونکہ ٹانڈوی صاحب کو اگر سچا سمجھا جائے گا تو مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور سیّد احمد صاحب وغیرہ کو شہید کہنے والوں کو جھوٹا ماننا لازم آئے گا اور سیّد احمد صاحب وغیرہ کو اگر شہید ہی قرار دینا ہے تو صدرِ دیوبند مولوی حسین احمد صاحب کو جھوٹا ماننا پڑے گا ۔

ہمیں اب اِس موضوع پر روشنی ڈالنی ہے کہ انگریزی حکومت میں کانگرس اور مسلم لیگ دو ایسی سیاسی جماعتیں ملک کے اندر موجود تھیں جو متحدہ ہندوستان کے باشندوں کی رہنمائی کا دم بھرتی تھیں ۔ کانگرس کو ہندو اور مسلمان وغیرہ جملہ اقوام کی رہنمائی اور اُن کے مفادات کے تحفظ کا دعویٰ تھا لیکن حقیقت میں وہ صرف ہنود کے مفادات کا تحفظ کر رہی تھی اور خصوصاً مسلمانوں کو جھانسا دیا ہوا تھا ۔ ہندو لیڈروں نے اپنی قوم کو ہر لحاظ سے ترقی کی

---

[1] ماہنامہ تجلّی، دیوبند، ڈاک نمبر، بابت مئی ۱۹۷۳ء

راہ پر گامزن کر دیا تھا۔ جب ہندو ہر لحاظ سے مضبوط اور حکومت کی مشینری کے مکمل پُرزے بن گئے تو اُنھوں نے انگریزوں کو ملک سے نکالنے اور مسلمانوں کو کچلنے کی تدابیر پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ کانگرس مسلمانوں کو ہندو مسلم اتحاد پر آمادہ کرتی اور آزادیِ ہند کی خاطر اِس کی اہمیت کو ذہن نشین کراتی۔ مہا سبھا اور جن سنگھ پارٹیوں کے ذریعے مسلم کشی کی مہم جاری رکھواتی اور اپنے زرخرید مسلمان لیڈروں اور علماء کے باعث مسلمانوں کو کانگرس سے دُور بھی نہ ہونے دیتی۔ ہندو مسلم اتحاد کا آزادی کی خاطر واسطہ دے کر راضی رکھ لیتے بلکہ وُہ تجوریوں کی جھنکار پر خود ہی مسحور و مسرور رہا کرتے تھے۔

اُن دنوں مسلمانوں کی سیاسی جماعت یعنی مسلم لیگ کے صدر حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب دہلوی تھے۔ مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرنا اِس جماعت کا دعوٰی تھا لیکن اُن دنوں موصوف بھی گاندھی کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسلامیانِ ہند کی قسمت کا سودا کر چکے تھے۔ دوسری جانب مولانا محمد علی جوہر نے تحریکِ خلافت شروع کی۔ مسلمانوں نے اس میں خوب بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ خلافت اور مقاماتِ مقدسہ کے تحفّظ کی خاطر مسلمانوں نے اپنی بساط سے بھی زیادہ چندہ دیا، حتّٰی کہ عورتوں نے زیور تک اتار کر دے دیے۔ موصوف کے ساتھ مسلمانوں کا ایک سیلاب تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریزوں کی حکومت کے ہندوستان میں دِن گِنے گئے ہیں اور انگریزی اقتدار اب چند روز کا مہمان ہے۔ مسلمان بے حد خوش تھے اور ہنود حیران و ششدر۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد جب حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹا تو صاف نظر آگیا کہ خلافت سے مراد گاندھی کی امامتِ مطلقہ تھی اور مقاماتِ مقدسہ کی بازیابی کا مقصد سوراج یا رام راج (اکھنڈ بھارت) کا حصول تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تیسری جماعت بعض انگریز کے پروردہ علماء نے بنائی اور اس کا نام جمعیۃ العلمائے ہند رکھا۔ اِن دین فروش علماء کا کام صرف یہی تھا کہ گاندھی کی اسلام دشمن تجاویز پر شریعتِ مطہرہ کی مُہر لگاتے رہا کریں اور بس۔ بدقسمتی سے یہ رہنمائی کے وعیدار قوم کا سب سے گمراہ ترین طبقہ نکلا کیونکہ مسلمان اِن کے جُبّہ و دستار پر اعتماد کر کے، اِن کے فتووں کو شریعت کے مطابق گردانتے ہُوئے گاندھویت کے چکّر میں پھنس جاتے تھے۔ اِن کے ساتھ ہی احرار پارٹی

بھی پنجاب میں یہی کردار ادا کر رہی تھی۔ فریقین کی اور بھی کئی جماعتیں تھیں لیکن وہ مذکورہ جماعتوں کی ذیلی شاخ ہی تھیں لہٰذا ان کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں۔ اب مسلم لیگ، خلافت کمیٹی، جمعیۃ العلماء اور احرار پارٹی کی گاندھویت کے بارے میں کچھ عرض کیا جاتا ہے کہ اُنھوں نے کس طرح ہندو مفادات کا تحفّظ کیا اور رہنمائی کے بھیس میں کس طرح مسلمانوں کے مفادات پر کاری ضربیں لگائی گئیں۔

گاتے کی قربانی اور گاندھوی ٹولہ

ایک وقت تھا کہ متحدہ ہندوستان کے باشندوں کی نمائندگی کانگرس کر رہی تھی۔ مسلم لیگ کا وجود اُن دنوں قومی مفادات کے لحاظ سے برائے نام تھا۔ کانگرس میں ہندو لیڈروں کی اکثریت تھی۔ اِس میں بھی جتنے مسلمان لیڈر شامل تھے وہ بھی کسی مرحلے پر اپنی قوم کو بحیثیت ایک رہنما کے فائدہ پہنچانے سے مجبور ہی بنے رہے یا ایسی صلاحیت ہی سے عاری تھے۔ غلامی کے اِس دَور میں ہندو لیڈروں نے اپنے بیدار مغز ہونے کا واضح ثبوت دیا اور اپنی قوم کو مادّی لحاظ سے اُبھارنے کا جامع منصوبہ تیار کر کے اُسے عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہو گئے۔ مولانا سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء) نے اِس حقیقت کا تجزیہ یُوں کیا ہے:

> "ہندوؤں نے جب مسلمانوں کی نہ صرف کنارہ کشی بلکہ کانگرس کے مقاصد و طرزِ عمل سے مخالفت و بیزاری دیکھی اور اُن کی جانب سے اُنھیں مایُوسی ہُوئی تو اُنھوں نے نہایت ہی عزم و استقلال سے حکیمانہ انداز پر اپنی قوی رفتار کی حرکت تین سمتوں میں منقسم کر دی۔
>
> **ایک جماعت** نے اقتصادیات کو اپنا نصب العین قرار دیا اور اکتسابِ دولت کے جس قدر ذرائع اور وسائل تھے اُنھیں اپنے ہاتھوں میں لے لینے میں ساعی و کوشاں ہُوئے، خصوصیت کے ساتھ ساہوکاری کو اِس سلیقہ سے انجام دیا کہ پچاس برس کے عرصہ میں مسلمانوں کی تقریبًا ساری دولت سمٹ کر ہندوؤں

کی ملکیت ہو گئی الّا ماشاء اللہ۔

دوسری جماعت نے تعلیم اور اس کے ثمرات کی طرف قدم بڑھایا اور اِس راہ میں بھی اُنھیں بے انتہا کامیابی حاصل ہُوئی۔ خاص ہندوؤں کی تعلیم گاہوں کا شمار جو کیا گیا ہے اور پھر اُس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی درس گاہیں رکھی گئیں تو اِن کا وہی نقشہ سامنے آگیا ہے جو سماں دولت کا مقابلہ کرتے ہُوئے پیشِ نظر ہو چکا ہے۔ تعلیم کے بعد ملازمت اور علمی پیشہ کا میدان سامنے آتا ہے۔ یہاں بھی ہندوؤں کا مقابلہ مسلمانوں سے وہی نتیجہ دیتا ہے جو سابق کے دو مقابلوں میں حاصل ہو چکا ہے۔

تیسری جماعت نے عملاً سیاسیات کی طرف اپنا قدم بڑھایا اور نہایت عزم و استقلال سے اِس حوصلہ شکن، صبر آزما راہ پر چلنے لگے۔ اِس میں شک نہیں کہ سیاست کی راہ بہت ہی پُرخطر تھی۔ اِس کی سنگلاخ زمین قدم قدم پر پُرخار وادی سامنے لاتی تھی، جس پر چلنا اپنے تلووں کو زخموں سے چُور چُور اور پاؤں کو گھائل بنانا تھا۔ لیکن ہندوؤں کے عزم اور ہمتِ مردانہ کی داد دینی چاہیے جنھوں نے نہایت ذوق و شوق سے اِس پیچ در پیچ خارزار سے نہ صرف گزر جانے کا بلکہ اِس راہ کو صاف کر دینے کا عزم کر لیا تھا۔ اُن کے لیے ہر نوکِ خار لذّت افزا اور ولولہ انگیز تھی۔ ہر ٹھوکر سنگِ راہ کی اُن کے سمندِ شوق کے لیے مہمیز تھی، قیدخانہ کی تنگ و تاریک کوٹھریاں قصر و ایوان کے راحت و فضا سے ہمسری کرتی تھیں۔ طوق و سلاسل کی جھنکار اور آہنی زنجیروں کی سیاہی مرصّع زیوروں کی چمک دمک اور اُن کی آواز سے زیادہ گوش نواز اور نظر افروز تھی۔[1]

جب ہندو لیڈروں نے ہر لحاظ سے اپنی قوم کو مضبوط اور منظم کر لیا حتیٰ کہ وہ ایسے مقام پر پہنچ گئے کہ برٹش گورنمنٹ سے ٹکرا کر اُس کی چولیں ہلا دیں اور آزادی کی منزلِ مقصود تک پہنچ

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، مطبوعہ علی گڑھ، ص ۳۱، ۳۲

جائیں۔ ٹکرانے ہیں جانی قربانیاں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ وقت تھا لیڈروں کے امتحان کا کہ ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کو اپنے قومی مفاد کی خاطر قربانی کا بکرا بننے پر رضامند کر لیا لیکن مسلمانوں کے لیڈر اتنے نااہل اور پھسڈّی ثابت ہوتے کہ وہ مسلمانوں کو اپنے ہاتھوں اِس قربان گاہ پر سوراج کی خاطر بھینٹ چڑھانے کے لیے تحفظِ خلافت اور حصولِ آزادی وغیرہ کا جھانسہ دے کر لے جاتے تھے۔ یہ واقعات ہمارے ایک دیدہ ور اور مردِ حق آگاہ کی زبانی سُنیے اور فراستِ مومن کی داد دیجیے:

> "یہ سب کچھ تھا لیکن حکومت کی ہمکناری جس چڑھاوے اور قربانی کی خواہاں تھی اب تک ہندوؤں کے ہاتھوں نے وُہ نذرانہ پیش نہیں کیا تھا، اِسی لیے سلف گورنمنٹ اور ہوم رول کا خوشنما منظر قریب تو ہو گیا تھا لیکن حجابات کے پردے ہنوز اُس پر پڑے ہُوئے تھے۔ ضرورت تھی کہ بہت سی جانیں حکومت کی دیبی پر بھینٹ چڑھا دی جائیں۔ سیاست کے سارے منازل میں یہ منزل سخت ترین تھی۔ قُربِ شوق کی آگ بھڑکا رہا تھا اور جان کی اضاعت دامن پکڑتی تھی۔ نکمّی اور رائگاں جانوں کی تلاش تھی۔ بالآخر امعانِ نظر اور تعمقِ فکر کے بعد یہ رائے قرار پائی کہ تینوں جماعتیں اپنے سی سالہ کمائے ہُوئے سرمایہ کی اِس طرزِ خاص سے ایک جھلک مسلمانوں کو دکھلائیں کہ اُن کی نگاہیں خیرہ اور عقول حیرت زدہ ہو جائیں۔ کُچھ اپنا خیر و شر اُنھیں نہ سُجھائی دے نہ سمجھ میں آئے، ہاں اِس پراگندگیٔ حواس میں اپنی رہی سہی ہستی کھو بیٹھیں۔ اِس عمل سے قربانی کی ضرورت بھی پُوری ہو جائے گی اور یہ پہلو کا کانٹا (وجودِ مسلم) بھی نکل جائے گا۔"[1]

جب ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کے اُن ناخداؤں کو اپنی کمائی کی جھلک دکھائی تو ہمارے لیڈر بننے والے بِک گئے، زنّار داروں پر ہزار جان سے قربان ہو گئے، جس کی وجوہات یہ ہیں:

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۳۲، ۳۳

“اِس سحرِ سامری کو مسلمانوں کی آنکھوں نے جب دیکھا تو اُنھیں صاف نظر آیا کہ ہندوستان کی دولت اور سرمایۂ دولت ایک جماعت کے ہاتھوں میں ہے، ماہرینِ علومِ مغربیہ جوق در جوق ایک دُوسری جماعت کے ساتھ ساتھ ہیں۔ تیسری جماعت ایک سلف گورنمنٹ کی طرف ہاتھ بڑھا رہی ہے اور اشارۂ قریب کر رہی ہے۔ وُہ ساعت دُور نہیں جبکہ یہ جماعتیں متحد ہو جائیں تو دولت، علم اور حکومت تینوں کا اجتماع قومِ ہنود میں ہُوا جاتا ہے۔

مسلمانوں نے للچائی ہُوئی نظر سے اِس جماعت کو دیکھا اور تڑپ کر رہ گئے، اِس لیے کہ اِس دَورِ فرصت میں جبکہ ہندو اپنی قوم میں زندگی کی رُوح پھونک رہے تھے اور حکیمانہ طرز پر اُن اسباب کی فراہمی میں مصروف تھے، جن کے اجتماع کا نتیجہ قوم کا زندہ ہو جانا ہے۔ مسلمان نہایت اطمینان و سکون سے اُس راہ پر برابر قدم بڑھائے جا رہے تھے، جس کا نتیجہ نیستی اور مُردہ قوم بن کر رہنا ہے۔

یہ دولت بگاڑتے تھے وُہ ثروت بنا رہے تھے، یہ بیچتے تھے وہ خریدتے تھے، یہ قرض سُودی لیتے تھے وُہ سُود در سُود کے بیچ میں اِن کی جائدادیں وصول کرتے تھے، وُہ پڑھ رہے تھے پڑھا رہے تھے یہ تعلیم کے نام سے کانپ کانپ اُٹھتے تھے، وُہ محنت کرتے تھے، جفاکشی اُٹھاتے تھے یہ کاہلی اور تن آسانی کی لذتیں لے رہے تھے، وُہ معاشرت میں کفایت شعاری ملحوظ رکھتے تھے یہ اپنی حیثیت سے کہیں بڑھ کر معاشرت میں رنگینی پیدا کرتے تھے، وُہ باہمی مخالفت مذہبی کے پھر بھی ایک زبردست مرکزِ اتحاد رکھتے تھے یہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اختلاف کرتے تھے اور عداوت کی حد تک اُسے پہنچا کر چھوڑتے تھے۔

آخر اِس کا نتیجہ یہی تھا کہ دنیا میں باقی تو رہیں لیکن مفلس، جاہل اور بداخلاق ہو کر نمونۂ عبرت و بصارت ہوں۔ نہ اِن میں حمیت ہو نہ غیرت، نہ صدق و صفا پایا جائے نہ عہد و وفا۔ ایسی حالت میں حریصانہ نظر سے ہندوؤں کی طرف

دیکھنا بجز اِس کے اور کیا ثمرہ دیتا کہ حسرت و ارمان دل میں خون ہو کر رہ جائیں۔ موجودہ حالت میں یہ کس مرض کی دوا رہ گئے تھے جو اِنھیں ہنود اپنے میں شامل کر لیتے؟"[1]

یہ تھی اُس وقت صورتِ حالات۔ مُسلم لیگ جو خالص مسلمانوں کی جماعت تھی اور مسلمانِ ہند کی خصوصیت سے واحد نمائندہ تھی اِس موقع پر اُس نے بھی ۱۹۱۶ء سے کانگرس کی ہمنوائی بلکہ زنّار دوستی اور بُت پرست نوازی کا المناک ثبوت دینا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کی خلافت تو یورپ کے نرغے میں تھی اور مسلمانانِ ہند کو ہنود نے ختم کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا، جس پر گاندھوی لیڈروں اور علمائے سوء کے ذریعے عمل کیا جا رہا تھا۔ اِسی دوران ۱۹۱۷ء میں ہنود نے گائے کی قربانی کے بہانے مسلمانانِ کٹار پور کے ساتھ کیا سلوک کیا اور اُس موقع پر مسلمانوں اور ہندؤوں کے لیڈر حضرات کا طرزِ عمل کس صورت میں سامنے آیا، یہ علّامہ مرحوم کی زبانی سُنیے:

"انتہائے برادر نوازی اور حقِ ہمسائیگی کی تازہ ترین مثال واقعۂ کٹار پور ہے۔ ہندؤوں نے تو مسلمانوں کو بند مکان میں آگ لگا کر جلایا اور اُن کی جان و مال اور آبرو کو نہایت بے دریغی و بے رحمی سے تباہ کیا لیکن جب مقدمہ حکومت کے ہاتھوں میں پہنچا تو باوجود اِس کے کہ عمائدینِ ہنود اُن خونریز ہندوؤں کی حمایت میں ہر طرف سے ہر طرح کی امداد پر آمادہ ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کے لیڈروں نے بجائے معاونت اور حقیقی غمگساری کے یہ تلقین شروع کی کہ مسلمانانِ کٹار پور یہ درخواستیں دیں، عرضداشتیں بھیجیں کہ ہم اپنا دعویٰ واپس لیتے ہیں۔ گورنمنٹ ان مجرموں کو رہا کر دے۔ پھر جبکہ فیصلہ پھانسی کا سُنا گیا، اُس وقت بھی مسلمانانِ کٹار پور کو دبا کر عفو کی خواستگاری میں انتہائی کوشش عمل میں لائی گئی اور آخر کار گورنمنٹ میں درخواست بھجوا ہی دی گئی۔ اِس بذل و کرم کے اسباب رموز و اسرار ہیں۔ بجز لیڈروں کے اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۳۳، ۳۴

> مسلمانانِ کٹارپور کا خون رائیگاں کیوں قرار دیا گیا؟ اُن کے ورثا کو اِس سنگدلی کے فیصلہ پر راضی ہو جانے کے لیے کیوں مجبور کیا گیا، ہندوؤں نے کیا عوض اِس احسان کا پیش کیا؟ اِن سوالوں کا جواب حضرات لیڈر ہی دے سکتے ہیں بشرطیکہ اِن سوالوں کا قابلِ جواب ہونا خیال بھی فرمائیں۔"[1]

مسلمانوں کے لیڈر بننے والوں نے مسلمانانِ کٹارپور کے ساتھ کیسی ہمدردی کا سلوک کیا، یہ بھی مولانا سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی ملاحظہ فرمائیے جو تاریخ کا ایک المناک واقعہ ہے:

> "ہندو نوازی میں مبالغہ و غلو اِس سے سمجھنا چاہیے کہ دورانِ مقدمہ میں مسلمانانِ کٹارپور کے پاس لیڈروں کے صحائف پہنچنے لگے کہ گائے کی قربانی موقوف کرو۔ اِن صحائف میں مستغنی عن الالقاب حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب رئیسِ دہلی کے صحیفہ کو امتیاز خصوصی حاصل ہے۔ بعض حضرات خود تشریف لے گئے تاکہ مسلمانانِ کٹارپور کو گائے کی قربانی سے باز رکھا جائے۔"[2]

دوستی اور محبت کا ثبوت دینا طرفین کے لیے ضروری ہے لیکن اُس وقت مسلمانوں کے لیڈر کہلانے والے ہنود کے دوست نہیں بلکہ غلام اور بندۂ بے دام تھے اور وہ ملتِ اسلامیہ کو گاندھی کے قدموں پر جھکا کر اِس ملت فروشی کے صلے کی سوراج کے وقت قیمت وصول کرنے کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ چونکہ وہ دوستی کا دم بھرتے تھے جس کے باعث ہر ذی ہوش کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ:

> اگر قوم ہنود اور اُس کے فدائیانِ مسلم سے سوال کیا جائے کہ کوئی واقعہ ایسا ہی مثل کٹارپور کے پیش کریں جس میں مسلمانوں نے ہندوؤں پر اِس طرح وحشیانہ ظلم کیا ہو، پھر ہندو لیڈروں نے اپنے عوام کو اِس طرح درگزر کرنے پر مجبور کیا ہو اور اِن سب مراحل کے بعد اپنی قوم سے اُسی مذہبی عمل کے ترک

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۵، ۶

[2] ایضاً: ص ۶

> کرنے کی اپیل بھی کی ہو؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر اس پُر پیچ لیڈری اور ژولیدہ خیر خواہیِ ملّت و مذہب کے سمجھنے میں اگر کچھ اُلجھن پیدا ہوجائے تو اِس پر عتاب و خفگی کیوں نازل کی جائے؟"[1]

اُس وقت صورتِ حال کیا تھی؛ عالمی حالات کس صورت میں رُونما ہو رہے تھے اور دولتِ عثمانیہ کے خلاف اسلام دشمن طاقتیں کیا کچھ کر چکی تھیں اور اُس کی تباہی کے لیے کیا کر رہی تھیں؟ یہ ہر پڑھے لکھے فرد پر واضح ہے، لیکن مسلمانوں کو اُس پریشان کن موڑ پر ہنود کی بے وفا قوم نے کس طرح اسلامیانِ ہند کو محبّت کے جال میں پھنسا کر صفحۂ ہستی سے مٹانے کا پروگرام بنایا ہُوا تھا، اُس کی ایک ابتدائی کڑی ملاحظہ ہو:

> "۱۹۱۶ء میں کانگرس اور مسلم لیگ نے بعد مفاہمہ اتحاد کا آوازہ بلند کیا۔ اُس وقت مسلمانوں کی خلافتِ مقدسہ، دولِ یورپ کے نرغہ میں پھنسی ہُوئی تھی۔ اِس لیے مناسب یہی تھا کہ مسلمانانِ ہند مقامی اور وطنی نزاعات کو صلح اور آشتی کے ساتھ طے کرلیں اور یورپی توجہ سے خلافت اور مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت پر تدابیر سوچ کر عمل آرا ہوں۔ لیکن ہندو مسلمانوں کے اِس عالمِ پریشانی سے بغیر فائدہ حاصل کیے کیونکر رہ سکتے تھے۔ ایک دو بڑے ہندو لیڈروں نے تو سحر آمیز افسوں خوانی لیڈرانِ مسلم کے کانوں میں بصیغۂ راز شروع کی اور مابقیہ نے مل کر ایک قیامت آرہ اور شاہ آباد میں بپا کی۔ دُوسرے سال کٹار پور میں اپنی عداوت کا نہ مٹنے والا ثبوت پیش کیا۔"[2]

ہندوؤں نے آرہ، شاہ آباد اور کٹارپور میں اپنی بہیمیت کا اظہار محض اسلام دشمنی سے بدمست ہو کر کیا تھا۔ چوٹی کے ہندو لیڈر تو ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ لگاتے، مسلمان لیڈروں کو اِس اتحاد کی تبلیغ کرنے پر آمادہ کرتے رہتے اور باقی لیڈر مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۷

[2] ایضاً: ص ۴

لگن میں اسلامیانِ ہند کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ہندو لیڈر مسلمانوں پر قیامت کرواتے اور مسلمانوں کے لیڈر کہلانے والے ہندوؤں کے آگے سجدہ ریز ہونے میں کوشاں رہتے اور مسلمانوں کو ہندوؤں کی نازبرداری پر آمادہ کرنے میں اپنی پوری صلاحیتیں صرف کیے ہوئے تھے۔ اس وقت اسلام کا حقیقی درد رکھنے والے اور مسلمانوں کے خیر خواہ یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ:

”مذہب و ملت کے سچے ہمدرد اُسی وقت کھٹک گئے تھے کہ یہ عنایت اور یہ باہمی آمیزش مسلمانوں کے کسی وطنی و مذہبی حق کو سلب کیے بغیر نہ رہے گی۔ چنانچہ یہ نتیجہ آج اُسی عنایت اور قِران کا ہے جو گائے کی قربانی مسلمانوں سے چھڑائی جاتی ہے۔ موحّدین کی پیشانی پر قشقہ جو شعارِ شرک ہے کھینچا جاتا ہے۔ مساجد اہلِ ہنود کی تغریح گاہیں، مندر مسلمانوں کا ایک مقدس معبد ہے۔ ہولی شعارِ اسلام ہے جس میں رنگ پاشی اور وُہ بھی خاص اہلِ ہنود کے ہاتھوں سے جبکہ وہ نشۂ شراب میں بدمست ہوں عجب دلکش عبادت ہے۔ بُتوں پر ریوڑیاں چڑھانا، ہار پھولوں سے اُنھیں آراستہ کرنا، پھولوں کا تاج اصنام کے سروں پر رکھنا، خالص توحید ہے یہ سارے مسائل اِن صورتوں میں اِس لیے ڈھل گئے کہ ہندوؤں کی دلنوازی اور استرضا سے زیادہ اہم نہ توحید ہے نہ رسالت معاذاللہ، نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ۔“ [1]

اب مسلمانوں کی ایک نمائندہ جماعت یعنی مسلم لیگ کی کارگزاری ملاحظہ ہو کہ مسٹر گاندھی اور لیڈرانِ ہنود جو کچھ چاہتے تھے، مسلمانوں کے لیڈر کہلانے والے کس طرح اپنی بدنصیب قوم کو فریب میں مبتلا کر کے بُت پرست نواز بنانے اور گاندھی کے قدموں میں جھکانے کے لیے کیسے کیسے جتن کرتے ہیں؟ بنیاد ملاحظہ ہو:

”۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ کا جلسہ بھی دہلی میں ہی منعقد ہوا تھا۔ مجلسِ استقبالیہ کے

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ،

> صدر نے جو اپنا خطبہ اس وقت پڑھا ہے اُس میں مسئلۂ خلافت کے مختلف پہلوؤں سے بحث کرتے ہوئے ترکوں کی حمایت میں صدائے احتجاج بلند کی ہے ۔ برسوں کا بھولا ہوا سبق جو آج یاد آیا ہے، یہی عامۂ مسلمین کے تالیفِ قلوب کا پہلا سنگِ بنیاد ہے، جسے ڈاکٹر انصاری صاحب نے بحیثیتِ صدرِ مجلسِ استقبالیہ مسلم لیگ اپنے ہاتھوں سے رکھا۔ اُس سال کی قومی و ملکی مجالس میں صرف اس قدر کارروائی ہوئی کہ مدن موہن مالویہ صاحب نے مسلمانوں کو دل آزاریٔ ہنود سے منع فرمایا اور ڈاکٹر انصاری صاحب نے حمایتِ خلافت کا علم بلند فرمایا۔ علمائے سیاسی نے بھی وقت شناسی سے کام لے کر اِس موقع پر اپنے فتوے کا اعلان ضروری سمجھا۔“ [۱]

اس بنیاد پر جو عمارت تعمیر کی جانے والی تھی اُس کے مختلف اجزا کیا تھے؟ وہ کیا اغراض و مقاصد تھے جن کو حاصل کرنے کی خاطر یہ ہندو مسلم اتحاد کا ڈھونگ رچایا جا رہا تھا؟ چنانچہ اس سلسلے کا ابتدائی کام ملاحظہ ہو:

> ”اِنھیں ایّام میں مسٹر گاندھی اپنے دورانِ سفر میں بعض ایسے لیڈروں سے ملاقات کرتے ہیں جو قومی اور ملکی مجالس میں اپنی معذوریوں سے شریک نہیں ہو سکے تھے۔ پھر اسی کے ساتھ ستیہ گرہ اور ہڑتال عام اور رفیعِ امتیازِ مسجد و مندر، جس کے محرک گاندھی ہیں، اِسے بھی منضم کر لیجیے۔ جب یہ متفرق اعمال جن میں بظاہر کوئی سلسلہ معلوم نہیں ہوتا، اپنے اپنے موقع و محل پر انجام پا چکے، تو اب ۱۹۱۹ء میں بتاریخ ۱۷۔ نومبر بمقام دہلی خلافت کمیٹی کا سنگِ بنیاد پڑتا ہے۔ اُس موقع پر ہندو بھی ایک کافی تعداد میں بحیثیت نمائندہ شریک ہوئے، جن میں خصوصیت کے ساتھ مسٹر گاندھی کا نام قابلِ ذکر ہے، جنھوں نے اس خالص مذہبی جلسہ کے ایک اجلاس میں صدارت بھی فرمائی تھی اور علمائے سیاسی نے آپ کے تشکر و

سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۱۰، ۱۱

امتنان میں وہ سب کچھ ارشاد فرمایا جس کا جذبۂ عقیدت اور جوشِ اتباع و تقلید مقتضی تھا۔

اظہارِ تشکر کے ذیل میں مولانا صاحب (مولانا عبدالباری فرنگی محلی) نے اِس کا بیان کرنا بھی ضروری سمجھا کہ مسٹر گاندھی صاحب کے اخلاق اور گفتگو سے میں یہاں تک متاثر ہو چکا ہوں کہ گائے کی قربانی میں نے ترک کر دی۔ جلسۂ خلافت کے مقاصد اور اصول عملِ اسلامی و دینی سے ترک قربانی گاؤ کا تعلق کچھ ہو یا نہ ہو لیکن یہی جملہ جو بطور حکایت بیان ہوا اور جو الفاظ سرسری طور پر اثنائے تشکر و امتنان میں آ گئے فی الحقیقت یہ ایک زبردست دیباچہ اور مقدمہ تھا اُس کتاب کا جو آئندہ ماہ دسمبر میں اُسی سال عامۂ مسلمین کے لیے تصنیف ہونے والی تھی۔ اِسی کے ساتھ خلافت کے نام سے جو ایک ہڑتال ہوئی اُسے تمہیدِ کتاب سمجھ لیجیے۔"[1]

جب دسمبر کا مہینہ آیا تو امرتسر میں تحریکِ خلافت کا جلسہ ہوتا ہے۔ مسلم لیگ کے صدرِ محترم یعنی عالیجناب حکیم حافظ محمد اجمل خاں دہلوی صدارت فرماتے ہیں۔ اپنے خطبۂ صدارت میں اظہار فرما گئے کہ ہندوؤں کی محبت کا دم کیوں بھرا جا رہا ہے؟ تحفظِ خلافت کا ڈھونگ کس مقصد کی خاطر رچایا تھا؟ گاندھوی علماء اور مسلمانوں کے لیڈر کہلانے والوں نے گائے کی قربانی پر کس طرح ہاتھ صاف کیا؟ خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کیونکر شریعتِ مطہرہ پر ظلم ڈھایا اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی مذموم جسارت کی؟

اُب دسمبر کا مہینہ آتا ہے اور قومی مجالس کا انعقاد امرتسر میں ہو رہا ہے۔ مسلم لیگ کے صدر مستغنی عن الالقاب حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب رئیس دہلی اپنا خطبۂ صدارت پڑھتے ہیں جس کی بے شمار کاپیاں ملک میں تقسیم ہو چکی ہیں۔ تقریباً چار صفحوں میں صدرِ مسلم لیگ نے مسئلۂ قربانی سے بحث فرمائی ہے۔ ابتدائی جملہ یہ ہے: "گاؤکشی کا ذکر ہم لوگ ایک عرصہ سے اشاروں اور استعاروں میں کرتے رہے ہیں

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۱۱ تا ۱۲

لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اِس مسئلہ کے متعلق زیادہ صفائی اور زیادہ وضاحت کے ساتھ ذکر کیا جائے۔"

ص۳۳ میں نہایت سوز و گداز کے ساتھ ہندوؤں کی عنایت و کرم کا ذکر فرمایا گیا ہے اور ص۳۴ پر مذہبی نقطۂ نظر سے اِس مسئلہ سے بحث کرتے ہوئے یوں ارشاد ہوتا ہے ——— "ہندوستان کو چھوڑ کر تمام عرب، شام، مصر، طرابلس اور ایشیائے ترکی وغیرہ کے مسلمانوں کو دیکھیے جن میں سے کروڑوں کی تعداد نے زندگی بھر اِس سنت کو بغیر گائے کی قربانی کے ادا کیا ہے۔" ——— عوام بیچارے اِس پُر پیچ تاریخی جُملہ سے یہ سمجھے کہ گائے کو قربانی کے لیے تمام بلادِ اسلامیہ کے مسلمان چھُوتے بھی نہیں، لیکن خفیف سا یہ شبہ عوام کو رہ جاتا تھا کہ شاید اِس دور سے پیشتر عہدِ رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یا صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں گائے قربانی ہوتی ہو۔ اِس شبہ کو مٹا دینے کے لیے حکیم صاحب نہایت شد و مد سے ایک حدیث میں کچھ اپنی طرف سے اضافہ فرماتے ہوئے یوں ارشاد فرماتے ہیں:——— "اِس حدیث سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں علی العموم بکری کی قربانی کا رواج تھا۔"

مسلم لیگ میں جب یہ ریزولیشن پیش ہونے لگے تو ڈاکٹر انصاری صاحب نے ترک قربانی گاؤ کا ریزولیشن پیش فرمایا، جو تھوڑی خوش بیانیوں کے بعد منظور ہو گیا۔ مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محل نے قومی و ملکی مجالس سے مراجعت فرماتے ہوئے سہارن پور میں ایک تقریر فرمائی جس میں مسئلہ قربانی کے متعلق، جو کارروائی مسلم لیگ نے انجام دی تھی اُس کی تائید و تحسین میں کافی زوردار الفاظ ارشاد فرمائے۔

مستغنی عن الالقاب حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب رئیس دہلی کا مسلمانانِ کٹارپور کے پاس صحیفہ متعلقہ ترک قربانی گاؤ بھیجنا، ڈاکٹر انصاری صاحب کا خلافت کی حمایت میں ایک سال قبل صدائے احتجاج بلند فرمانا، پھر نومبر

> میں جلسۂ خلافت کا انعقاد اور گاندھی صاحب کی ایک جلسہ میں صدارت اور مولانا عبدالباری صاحب کا اثنائے تشکر و امتنان میں ترک قربانی گاؤ کا سرسری تذکرہ، پھر دوسرے ہی مہینے میں چند ہفتوں بعد مسلم لیگ کا جلسہ اور اُس میں انھیں ارکانِ ثلاثہ کا یکے بعد دیگرے اِس مسئلہ کو اِس طرح طے کرڈالنا کہ مستغنیٰ عن الالقاب عالیجناب حکیم صاحب خطبۂ صدارت میں ملکی، سیاسی اور مذہبی پہلو سے ترک قربانی گاؤ پر زور دیتے ہیں۔ ڈاکٹر انصاری صاحب ریزولیشن کی شکل میں پیش فرماتے ہیں، جو منظور ہو جاتا ہے۔ مولانا عبدالباری صاحب سہارن پور پہنچ کر تحسین و تائید فرماتے ہیں۔ اب وُہ نذرانہ اور گراں بہا تحفہ جو سرکار ہنود میں پیش ہونے والا تھا، جس کے لیے سارے اہلِ دربار ہمہ تن چشم براہ تھے، جس کا ذکر مسٹر مانٹیگو کے سامنے پیش ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے وفد نے اپنے ایڈریس میں کیا تھا، نیز جس کے متعلق عرصہ سے اشاروں اور استعاروں میں ذکر ہوا تھا، اب وہ اِس قابل ہو گیا کہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا ہاتھ اِس نذر و ہدیہ میں شامل ہو۔"[1]

علّامہ سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ نے گاندھوی علماء اور لیڈروں کی شرمناک روش، اسلام دشمنی اور بُت پرست نوازی پر تاسف کا اظہار فرماتے ہُوئے اِس حقیقت کے چہرے سے نقاب کشائی کی ہے کہ مسلمان کہلاتے ہُوئے اِن حضرات نے ایسی گندی روش کیوں اختیار کی؟ وہ فرماتے ہیں:

> "یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ ہنود ترک قربانی گاؤ کی تحریک کرتے تو عامۂ مسلمین ہرگز اُس کو تسلیم نہ کرتے۔ لیڈر صاحبان بھی اگر اِس کی اپیل سیاسی اور ملکی پہلو سے پیش فرماتے تو ناکامیاب رہنے کا ظن غالب تھا۔ اِس جیسے

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۱۲ تا ۱۴

> مسئلہ کے لیے اِسی کی ضرورت تھی کہ شرعی اور مذہبی لباس میں اِسے مسلمانوں کے سامنے لایا جائے ۔ یہ نپولین کی پالیسی تھی کہ وُہ مذہب کا نام نہایت گرم جوشی سے لیتا اور مذہبی بننے میں کمال مبالغہ سے کام لیتا تھا۔ یہانتک کہ بعضوں کو اُس کے اسلام و مسلمان ہونے کا دھوکا ہے۔ وُہ جانتا تھا کہ "تالیفِ قلوب کا یہی ایسا وحید ذریعہ ہے جسے ہمہ گیری کا حق حاصل ہے ۔ نپولین کی اُسی پالیسی کو مدّنظر رکھ کر اس وقت لیڈروں نے بھی مقاصدِ کانگریس کی تکمیل کے لیے جو مجلس منعقد فرمائی ہے اُسے دلکش و دلگیر بنانے کے لیے خلافت کمیٹی کا لقب دیا ہے تاکہ نہایت سہولت سے مسلمانانِ ہندوستان کی گردنیں ہندوؤں کی غلامی و اطاعت میں سربسجود ہو جائیں۔ بر عکس نہند نام زنگی کافور"۔ [1]

اب دیکھنا یہ ہے کہ اِس خلافت کمیٹی نے جو تحفظِ خلافت و مقاماتِ مقدسہ کی خاطر وجود میں آئی تھی آیا اُس نے خلافت کی بازیابی اور حفاظت کے لیے ایک قدم بھی بڑھایا ؟ مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کا دم بھرنے والوں کے پاؤں میں یہ فریضہ ادا کرتے ہوئے کیا ایک کانٹا بھی لگا، اگرچہ خواب میں ہی سہی ؟ مسلمانوں کو کیا خبر تھی کہ یہ حضرات سوراج یا رام راج کو خلافت قرار دے رہے ہیں۔ مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت سے اِن بانکے لیڈروں کی مراد یہ ہے کہ بُتوں کا مسلمانوں سے احترام کروائیں گے اور اپنی زنّار دوستی کا زندہ ثبوت پیش کرنے کی خاطر سب سے پہلے گائے کی قربانی مسلمانوں سے چھڑانے پر ایڑی چوٹی کا زور لگا کر دکھائیں گے۔ تحریکِ خلافت کا کارنامہ ملاحظہ ہو:

> خاص دہلی میں عشرہ ذی الحجہ کے موقع پر اُونٹوں کا گشت ، جن پر جلی قلموں میں اِس طرح کے فقرات تختوں پر چسپاں ، جن سے ہر مومن کا دل کانپ کانپ اُٹھتا تھا، لکھ کر خوب خُوب مشتہر ہُوئے ۔ پھر نہایت سختی سے بعض مجبور کرنیوالی

---

[1] سلیمان اشرف ، مولانا : النور ، ص ۱۴، ۱۵

تدابیر سے بھی انسداد کافی کیا گیا۔ بمبئی کے مسلمانوں پر بھی خلافت کمیٹی نے قربانی گاؤ پر ستم کرنے میں کچھ کمی نہیں کی۔ خلافت کمیٹیاں کیا ہوئیں کہ گائے کی قربانی کرنے والوں پر ایک آفت و بلا ہوئی۔

اب سے قبل جو حصہ ظلم کا ہندوؤں سے باقی رہ گیا تھا اُسے فدائیانِ ہنود نے اِسلام کا نام لے کر مسلمانوں پر تمام کر دینے کا عزم بالجزم کر لیا ہے یا ارحم الراحمین! ہم مسلمانوں پر رحم فرما اور اِس آتے ہوئے فتنہ کو ہمارے سروں سے دُور کر بحرمۃ النبی وآلہ الامجاد۔ طرفگی یہ کہ اگر کوئی بر سبیلِ خیر خواہی و نصیحت دینی اِن لیڈروں کے طرز میں کچھ اصلاح پیش کرے یا ترمیم کا خواستگار ہو تو اُسے کافر، بے دین، قوم فروش، غدّار وغیرہ کہہ کر مجمع و محفل میں فضیحت کر ڈالیں۔ عوام کی فوج اِن کے ہاتھوں میں ہے۔ اُنھیں جس پر چاہا بھڑکا دیا، بھکا دیا۔ اہلِ حق اپنے گھروں میں خاموش بیٹھے ہیں اور اپنی مظلومیت کی مولیٰ تبارک و تعالیٰ سے فریادیں کرتے ہیں۔ نجات کی دعائیں مانگتے ہیں۔ یہ ظلمہ اپنے نشۂ ظلم میں سرشار و غافل اُمت کی تباہی میں سرگرم ہیں۔ وہ ساعت دُور نہیں جبکہ رحمتِ الٰہی مظلوموں کی فریاد پر لبیک عبدی فرمائے۔“[1]

خلافت کمیٹیاں تو مسلمانوں پر یوں ظلم و ستم ڈھا رہی تھیں۔ بُت پرستوں کی محبت بلکہ نشۂ غلامی میں سرشار ہو کر مداخلت فی الدین اور تخریبِ دینِ متین کی مرتکب ہو رہی تھیں۔ اِس موقع پر مسلم لیگ اور اُس کے صدرِ محترم یعنی عالیجناب حکیم محمد اجمل خاں صاحب دہلوی خلافت کمیٹی سے بھی سبقت لے جانا چاہتے تھے تاکہ سوراج کی صورت میں اپنے گاندھی مہاراج سے دوسروں کی نسبت زیادہ انعام و اکرام کے مستحق قرار پائیں۔ موصوف کی ایک ہولناک اور لرزہ خیز جسارت ملاحظہ ہو:

”جلسۂ خلافت کی بنیاد ۱۹۱۹ء کی ۱۷؍ نومبر کو بمقام دہلی جبکہ ہندو اور مسلمانوں

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۱۷

نے مل کر رکھی اور پھر اِس کی کارروائیاں اخبار و جرائد میں مطبوع ہوئیں۔ حیرت ہوتی تھی کہ الٰہی! یہ مسلمانوں کی عقل کو ہو کیا گیا ہے، جو اب عالم الغیب، قادرِ مطلق، سمیع و بصیر سے بھی پالیسی کرنے لگے؟ اِسی حیرت میں تھا کہ لیگ کا جلسہ ہوا اور حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب کا خطبۂ صدارت دیکھنے میں آیا۔ وہاں بھی وہی رنگ مغالطہ سرتاسر پایا گیا، بلکہ حکیم صاحب نے ایک قدم بڑھ کر یہ جُرأت بھی فرمائی کہ حدیث شریف کا ایک جملہ نقل کرتے ہوئے ایک لفظ بڑھا دیا اور الخ لکھ کر ترجمہ اور نتیجہ بیان فرمایا۔ وہی لفظ جس کا اضافہ فرمایا گیا دار و مدارِ دلیل، اُسی کی وجہ سے چند سطور کی تحریر الخ لکھ کر نا تمام چھوڑنے سے یہ فائدہ کہ ناظرین کا ذہن اِس بے ربط اضافہ سے متوحش نہ ہونے پائے۔ چند روز تک سمجھ میں نہ آیا کہ اِس طرح جعل اور تحریف سے کیا مدّعا و مقصود ہے؟

آخر ایک خط لکھا، جس میں نہایت نیازمندانہ طور پہ یہ سوال تھا کہ حضرت ام سلمہ سے مروی روایت کس کتاب سے آنجناب نے نقل فرمائی؟ جواب میں سکوت رہا۔ شاید خط ضائع ہوا۔ فقیر خود دہلی گیا۔ یہ رجب کی اوائل تاریخوں کا ذکر ہے۔ مسلم یونیورسٹی کا وفد اُس وقت دہلی گیا ہوا تھا۔ درِ دولت پر جا کر معلوم ہوا کہ طبیعت ناساز ہے، پاؤں میں کچھ شکایت ہو گئی ہے۔ دوسرے دن پھر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ مدن موہن مالویہ صاحب سے کچھ مشورہ ہو رہا ہے۔ بعض حضرات اہلِ علم جن کی آمد و رفت جناب حکیم صاحب کے یہاں جاری ہے اُن کی خدمت میں پیام بھیجا کہ حدیث شریف میں جو غلطی ہو گئی ہے اُس کی تصحیح کی طرف حکیم صاحب کو توجہ دلائیے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ کوشش بھی بے اثر ثابت ہوئی۔

چوتھی رجب کو سرکار اجمیر آستانہ غریب نواز پر حاضر ہوا۔ ایک دِن بعض علماء سیاسی سے ملاقات ہوئی۔ عرض کیا کہ یہ فتنہ عظیم ہے۔ ہنود کی خاطر مسلمانوں کا گلا نہ گھونٹیے۔ دیکھیے حدیث میں جعل و تحریف تک کی نوبت

> آگئی۔ تین مہینے گزر گئے اور کوئی اعلان نہیں کرتا ہے کہ اصل حدیث میں لفظ شاۃ نہیں ہے، غلطی سے لکھ گیا ہے۔
>
> ہر ایک شخص جس کے پاس خطبۂ صدارتِ مسلم لیگ ہو اِس مقامِ خاص کی تصحیح کرے نیز علماء موسسینِ اتحادِ ہندو مسلم کا یہ فرض ہے کہ اتحاد کے حدود متعین فرمائیں۔ عوام کو قشقہ لگانے اور مندروں میں جا کر ریوڑیاں بتوں پر چڑھانے سے منع کریں اور اِن الفاظ کی شناعت کھلے لفظوں میں بیان فرمائیں ورنہ ایمان کی بربادی کا خطرہ ہے۔ افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ فقیر کی اِس التماس کی علمائے سیاسی کی خدمت میں ذرہ برابر بھی شنوائی نہ ہوئی۔ آج تک وہی سکوت ہے، وہی اعراض ہے، وہی چشم پوشی ہے۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ رہے سہے اعمالِ قبیحہ مسلمانوں نے تلک آنجہانی کی مصنوعی لاش کے موقع پر ادا کیے اور علمائے سیاسی نے پھر اپنے سکوت سے اِن امور کے جواز و استحسان پر تازہ مُہر ثبت فرما دی۔"[1]

اِس سلسلے میں اظہارِ حق کی خاطر اِن حضرات کو خوب سمجھایا گیا۔ خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا یاد دلایا گیا لیکن جس طرح بنی اسرائیل کسی وقت بچھڑے کی محبت میں سرشار ہو گئے تھے کچھ اِسی طرح اِس بدنصیب قوم کے وُہ گمراہ لیڈر اور گمراہ گر علمائے سُو گاندھی جیسے پُراسرار دشمنِ اسلام و مسلمین کی محبت میں ایسے بدمست ہو چکے تھے کہ کسی فہمائش کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اِسی سلسلے کی مزید کارگزاری ملاحظہ ہو:

> "کان پور میں بماہ رجب ایک بڑے پیمانے پر علماء کا جلسہ ہوتا ہے۔ وہاں کے بعض کارکن علما سے یہ استدعا پیش کی گئی کہ مسلمانوں کو اعمالِ شرک و کفر میں شریک ہونے سے باز رکھیے اور قربانی گاؤ کے متعلق غلطی تسلیم کر لیجئے۔ لیکن جواب وہاں سے بھی سکوت ہی میں ملا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۱۹-۲۰

انتہائی بے قراری میں فقیر نے رسالہ الرشاد لکھا اور مسلمانوں کو امرِ حق سے آگاہ کیا۔ اِس رسالے کی اشاعت اول عشرۂ رمضان المبارک میں ہُوئی۔ لیڈرانِ قوم کے پاس ٹکٹ چسپاں کر کے نسخے بھیجے گئے۔ تین ماہ کے عرصہ میں تقریباً تین ہزار نسخے مختلف امصار و قصبات میں تقسیم ہُوتے۔ اب آکر جبکہ خطبۂ صدارت مسلم لیگ کو آٹھ مہینے اور الرشاد کی اشاعت کو کامل تین مہینے گزر چکے، حکیم صاحب اپنی غلطی کا اعتراف پیچ در پیچ اعتراض و سوال و اپیل کے لپیٹ میں تحریر فرماتے ہیں۔ حالانکہ مذہبی نقطۂ نظر سے یہ ایسی خطائے فاحش تھی جس کا اعلان بلا جواز توقف حکیم صاحب کو بذریعہ تار مختلف و متعدد اخبار و جرائد میں اب سے بہت قبل کرنا تھا۔ ساتویں ذی الحجہ کا اخبار البشیر جو بیرون جات میں عین بقرعید کے روز پہنچا ہوگا، اُس میں اِس طرح اعتراف کرنے سے مقصد و مطلب ہے کہ مسلمانوں کو اقرار کا علم بھی اُس وقت ہو جبکہ سب مراحل قربانی کے طے پا جائیں۔ اِسی کے ساتھ حق پسندی کی داد مل جائے گی۔ خیر یہ تو اپنا اپنا ذوق مذہبی ہے۔

جس کے دل میں حدیثِ مصطفوی کی عظمت ہے وہی یہ بھی جان سکتا ہے کہ اِس طرح کی خطا کا کفارہ کیونکر ادا ہوتا ہے، مجھے تو حکیم صاحب کے ایک سوال کا جواب دینا ہے جسے موصوف نے اپنی غلطی کا اعتراف فرماتے ہوئے آخر میں پیش فرمایا ہے۔ حکیم صاحب تحریر فرماتے ہیں: ——— "میرے اُوپر ایک یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ حدیث اذا اراد احدکم ان یضحی بالشاۃ میں آخری لفظ شاۃ کا کسی کتاب میں نہیں ہے۔ میں اِس اعتراض کو قبول کرتا ہُوں اور یہ بات ظاہر کرنی ضروری خیال کرتا ہُوں کہ یہ لفظ محض غلطی کی وجہ سے لکھا گیا، دراصل یہ کسی حدیث کا جزو نہیں ہے لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ اعتراض کرنے والے بزرگ اِس سے کیا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں؟"

فقیر نے حکیم صاحب پر اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ ایک حقیقی اور واقعی امر کا اظہار کیا تھا۔ رہا فائدہ، وہ حکیم صاحب ہی بیان فرمائیں کہ کون سا مقصد حاصل کرنا تھا جس کے لیے حدیث میں اضافہ کی حاجت ہُوئی اور اب کہ غلطی کا اعتراف ہے، اُن پانچ سطروں کا خطبۂ صدارت میں کیا فائدہ ہے؟ فقیر کا اِس کشفِ حقیقت سے صرف یہی مدّعا تھا کہ عالیجناب حکیم صاحب اپنی غلطی پر متنبہ ہو جائیں اور مسلمانوں کو بھی یہ معلوم ہو جائے کہ ایک لفظ اپنی طرف سے بڑھانا اور اُسی اضافہ کو مقامِ استشہاد میں لانا، اُس خطبۂ صدارت میں صرف اُسی ایک جگہ ہُوا ہے جہاں حدیثِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم منقول ہے۔ بقیہ سارے حوالے اعیان و وزرائے انگلستان کے صحیح ہیں، کسی طرح کے شک و شبہ کو اُن میں دخل نہ دینا چاہیے۔ اِس کے سوا نہ کوئی مدّعا نہ کچھ اور فائدہ۔ اربابِ بصیرت جن کی آنکھیں نورِ ایمان سے منوّر ہیں اُنھوں نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ آیا اسلام اور اسلامی خلافت کی حمایت کی جا رہی ہے یا کفر و شرک کا طغیان ہے جو مسلمانانِ ہند پر لایا جا رہا ہے۔" [1]

خواجہ حسن نظامی دہلوی کی روش زمانے بھر سے نرالی تھی۔ موصوف کبھی گنگا رام تھے تو کہیں جمنا داس۔ کسی معاملے میں اہلسنت وجماعت کے ساتھ تو کسی میں بدمذہبوں کی ہمنوائی۔ قربانی گاؤ ہی کا تذکرہ ہے تو خواجہ صاحب بھی بُت پرست نواز ثابت ہوئے۔ موصوف کے بارے میں مفتی محمد عمر نعیمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا:

"خواجہ حسن نظامی صاحب کا ایک مضمون ۱۹ راگست (۱۹۲۹ء) کے اخبار حق لکھنؤ میں چھپا ہے، جس میں آپ نے مجالسِ عید میلاد کی تائید کرتے ہُوئے مسلمانوں سے تحریک کی ہے کہ وہ ۱۲ ربیع الاوّل کو

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۲۱، ۲۲

ہندوؤں کی دلجوئی کے لیے گائے کا ذبح ترک کریں۔ خواجہ صاحب کی یہ پہلی ہی ہندو نوازی نہیں ہے بلکہ اِس سے قبل وہ ترکِ گاؤکشی نام کا ایک رسالہ بھی لکھ چکے ہیں اور اکثر اوقات اُن کے خامۂ ناحق رقم سے اِس قسم کے مضامین نکلتے ہی رہتے ہیں۔ یہ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوؤں کے سیلابِ تعصب و طوفانِ عناد کی شدت و تیزی کو دیکھتے ہوئے بھی کوئی بہی خواہِ اسلام مسلمانوں کو خوشامدی بن جانے کی اجازت دے۔

نہ ہم خواجہ صاحب کو اتنا نادان سمجھتے ہیں کہ وہ اِس حقیقت سے بھی واقف نہ ہوں کہ خوشامدی ہمیشہ ذلیل و خوار رہا کرتے ہیں اور ظالموں کی جرأت اور دلیری خوشامد سے اور بڑھتی ہے۔ نہ خواجہ صاحب اِتنے بے خبر ہیں کہ ہندوؤں نے جو مسلمانوں پر وحشیانہ مظالم کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے اُس کی اُن کو خبر نہ ہو۔ یہ بھی خواجہ صاحب کو ضرور معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی پاسداری اور دلجوئی کا تصور بھی کبھی ہندو دماغوں میں نہیں ہوتا، تو وہ کس طرح مستحق ہیں کہ اُن کی دلجوئی کے لیے مسلمان اپنے خورد و نوش میں پابندیاں لازم کر لیں اور ایسی غذا جو اُنھیں مرغوب بھی ہے اور اُن کی معاشرت و اقتصادی حالت کے مناسب بھی ہے، اُس کو ترک کر دیں۔ یہ بھی خواجہ صاحب کو خوب معلوم ہوگا کہ ہندو منت شناس اور سپاس گزار قوم نہیں ہے کہ وہ کسی کا احسان مانے یا کسی کے بہتر سلوک کو یاد رکھے بلکہ وہ احسان کا لفظ بھی اپنی طرف آنے دینا گوارا نہیں کرتے۔

ہلاکت کمیٹی (خلافت کمیٹی) کے عہد میں جب قربانی گاؤ ترک کرنے پر خواجہ صاحب جیسے لیڈر بہت زور دے رہے تھے، اُس وقت بھی ہندو لیڈروں نے صاف کہہ دیا تھا کہ مسلمان اگر قربانی گائے چھوڑیں گے تو اُس کا ہندوؤں پر کچھ احسان نہ ہوگا۔ اِن حالات میں ہم نہیں سمجھتے کہ ذبیحہ گاؤ کو روکنے کی تحریک خواجہ صاحب کے دل میں کس سبب سے پیدا ہوتی ہے؟

> اِس کا سبب و محرک کیا ہے؟ اور وُہ اِس میں اپنا کیا نفع مدِ نظر رکھتے ہیں؟ ہمیں اُن کی ذاتیات سے کچھ بحث نہیں لیکن مسلمانوں کو اِس خطرناک مشورہ کی نامعقولیت سے مطلع کرنا ضرور تھا۔"[1]

ہندو مسلم اتحاد کی خاطر دہلی اور شملہ میں کانفرنسیں ہُوئیں۔ مسلمانوں کی جانب سے وہی لیڈر اور عُلماء اُن مواقع پر بُلائے گئے جو ہندوؤں کے ہاتھوں بِک چکے تھے۔ مسلمانوں کی قیادت اور نمائندگی کا دم بھرتے لیکن تگ و دَو ہندو مفادات کے تحفظ میں کرتے اور ملّت اسلامیہ کو خلافت کا نعرہ سُنا کر گاندھی کے قدموں میں ڈالتے تھے۔ ایسے حضرات کے بارے میں قاضی احسان الحق نعیمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا:

> "دہلی و شملہ میں جو مجلسیں ہُوئیں اُن میں بیشتر وہ اصحاب شامل تھے جنھیں مسلمان ہندوؤں کا نفسِ ناطقہ سمجھتے اور جو مسلمانوں کے دینی و مذہبی حقِ قربانی اور ذبیحہ گاؤ کو رد کرنے کے لیے ماضی قریب میں ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے ہیں، ہر امر میں ہندوؤں کی خوشنودی اُن کا مطمحِ نظر اور نصب العین رہا ہے۔ ایسے اصحاب مسلمانوں کے حقوق کی کیا حفاظت کر سکیں گے؟ شملہ کی مجلس میں جھٹکے کے طریقے سے قتلِ حیوان اور اُس کے گوشت کے عام فروخت کو ناقابلِ اعتراض تسلیم کر لیا۔ اِن صاحبوں کو یہ خبر نہیں کہ ہندوؤں کی گوشت خور قومیں مسلمانوں کے ذبیحہ کو بے تکلف کھا سکتی ہیں اور اُنھیں اُن کا مذہب اِس سے نہیں روکتا اور مسلمانوں کے مذہب میں جھٹکا حرام ہے۔ جب بازاروں میں جھٹکے کی دکانیں عام طور پر کُھل جائیں گی تو جاہل ناخواندہ دیہاتی مسلمان اُس سے دھوکا کھائیں گے اور ایک مصیبت عام میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اِس کے ساتھ ہندوؤں کی تجویزوں میں سؤر کے گوشت کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے لیکن اِس پر اِن صلح کے علمبرداروں کو کوئی اعتراض نہ ہُوا۔

---

[1] محمد عمر نعیمی، مولانا: ماہنامہ السواد الاعظم، بابت ربیع الاول ۱۳۴۸ھ، ص ۴

ہندو تو یہ کہتے ہیں کہ کسی ایسے رقبہ (علاقے) میں گائے ذبح نہ ہو سکے گی جہاں کافی مدت سے اُس کے ذبح کا رواج نہیں ہے۔ اِس پر بھی اِن خود ساختہ مصالحین سے یہ نہ کہا گیا کہ جب رواج کی یہ پابندی ہے تو سؤر کے گوشت اور جھٹکے کا کیوں نام لیا جاتا ہے، جس کا ذکر میں آنا بھی مسلمانوں کے لیے تکلیف کا باعث ہے۔ اگرچہ اِن مصالحتی مجلسوں کا کچھ انجام نہ ہوا لیکن اِن مصالحین کی کمزور روش نے ہندوؤں کو اور زیادہ جرأت دلا کر معاملہ کو پیچیدہ تر بنا دیا۔ مسلمان کسی ایسی قرارداد پر راضی نہیں ہو سکتے جو علمائے دین، پیشوایانِ اسلام اور ہمدردانِ ملّت کے مشورہ کے بغیر تجویز کی گئی ہو۔ یہ حضرات جو قوم میں مطعون ہیں اور جنھیں مسلمان ہندو پرست جانتے ہیں، کرم کریں اور بے فائدہ تکلیف نہ اُٹھائیں۔"[۱]

کاش! یہ گاندھوی ٹولہ یعنی مسلمانوں کے لیڈر بننے والے اور وُہ علماء جن کے فتوے گاندھی کی جنبشِ لب کے ساتھ گردش کرتے رہتے تھے، کبھی خوفِ خدا کو مدِ نظر رکھ کر اُس مردِ حق آگاہ کی بات ہی سُن لیتے جو دہلی کی مسجد فتحپوری میں بیٹھا ہُوا مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ اُس مردِ مومن سے میری مُراد حضرت مفتیِ اعظم دہلی شاہ محمد مظہر اللہ نقشبندی مجددی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء) ہیں۔ ذیل میں ہم ایک استفتاء پیش کر کے حضرت سیّدی و مرشدی علیہ الرحمہ کا جواب نقل کرتے ہیں:

سوال نمبر ۲۳۵

۱۔ اسلامی اعتبار سے گائے کی قربانی شریعتِ غرّا میں کیا حیثیت رکھتی ہے؟

۲۔ اگر حکومت اپنی طاقت سے گائے کی قربانی پر پابندی لگائے تو مسلمانوں پر کیا فرض عائد ہوتا ہے؟

۳۔ کیا مسلمان اسلامی اخلاقی اعتبار سے دیگر اقوام کی خوشنودی کے لیے گائے

کی قربانی ترک کرسکتے ہیں؟ اگر نہیں تو جو مسلمان اِس فعل کے مرتکب ہیں یا آئندہ ہوں اُن کے لیے شریعت میں کیا حکم ہے؟

مستفتی: فضل احمد دہلی

الجواب

۱۔ گائے کی قربانی دینِ الٰہی کی نشانیوں میں سے ہے لقولہ تعالیٰ:

والبدن جعلناها لكم من شعائر الله لكم فيها خير۔	یعنی اونٹ اور گائے کی قربانی کو تمہارے لیے دینِ الٰہی کی نشانیوں میں سے ایک نشانی بنایا ہے، جس میں تمہارے لیے بھلائی ہے۔

درِ مختار میں ہے:

بدنة هي الابل والبقر سميت بها لضخامتها۔	بدنہ اُونٹ اور گائے ہے۔ اِن کے ڈیل دار ہونے کے سبب اِن کا یہ نام ہُوا۔

۲۔ ایسی صورت میں مسلمانوں پر واجب ہوگا کہ ہر ممکن کوشش سے اِس اسلامی نشان کی محافظت کریں ——— کہ اِس سے غفلت جبکہ عقابِ الٰہی کا موجب اور عتابِ الٰہی کا خوف اِس کی محافظت کا سبب ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

ومن يعظم شعائر الله فانها من تقوى القلوب۔	اور جو اللہ کے دین کی محترم نشانیوں کی محافظت کرے گا، تو یہ محافظت کرنا دلوں کے خوف کا مقتضیٰ ہے۔

۳۔ اِس کا جواب تو بہت ظاہر ہے کہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ دینِ الٰہی کی نشانیوں کو مٹانا اور اُس کی بجائے کفری نشان قائم کرنا کس طرح غضبِ الٰہی کا موجب ہوگا؟

جس طرح گائے کا ذبیحہ اسلامی نشان ہے یونہی اِس کا بند کرنا کفری نشان ہے۔ پس اِس کی بندش کا اقدام تو بڑی شے ہے، اس کی جانب قلب کا میلان بھی عذابِ نار کا موجب ہے۔ یہ خیال کہ اِس سے ہمیں حکومتِ ہند کی حمایت وخوشنودی میسر آجائیگی محض ایک شیطانی دھوکا ہے۔ ایسی حالت میں حمایت درکنار اِن لوگوں کا کوئی رفیق بھی نہیں ہوسکتا لقولہ تعالیٰ: ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار وما لکم من دون اللہ من اولیاء ثم لا تنصرون ۝

اِس مقام پر حضرت عبد اللہ بن سلام اور اُن کے اصحاب کے واقعہ پر غور کیجیے کہ جب وہ یہودیت سے تائب ہو کر مشرف باسلام ہوئے تو اُنھیں خیال آیا کہ اُونٹ کا گوشت شریعتِ موسوی میں حرام ہے اور اسلام میں محض مباح، تو کیا حرج ہے کہ ہم اونٹ کا گوشت نہ کھائیں۔ اِس پر نہایت عتاب آمیز انداز میں ممانعت فرمائی گئی۔ چنانچہ ارشاد ہوا: یایھا الذین اٰمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوٰت الشیطٰن انہ لکم عدو مبین ۝ یعنی ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو (اور ایسے خیالات میں پڑ کر) شیطان کے قدم بقدم نہ چلو، یقیناً وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ پھر اِس کے بعد بھی کہ تمھیں واضح دلیلیں پہنچ چکیں اگر لغزش کرنے لگو تو یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے (اُس کے عذاب کا کوئی روکنے والا نہیں) حکمت والا ہے (کہ بمقتضائے حکمت جب اور جس قدر چاہے سزا دیتا ہے)

اِس واقعہ میں اور متنازعہ فیہ واقعہ میں اصلاً فرق نہیں۔ جس طرح عبد اللہ بن سلام نے اُونٹ کے گوشت کو مباح سمجھا اور اجتہادی غلطی یہ کی کہ شعائرِ اسلام نہ سمجھتے ہوئے ترک کا ارادہ کر لیا، وہی قصد یہاں ہے۔ پس جس طرح وہ موردِ عتاب ہوئے جو لوگ اِس کو ترک کریں گے وہ بھی یقیناً موردِ عتاب ہوں گے بلکہ مستحقِ عذاب کہ یہاں اُس سے بڑی ایک شے اور بھی موجود ہے اور وہ ہنود کے عقائدِ باطلہ کی ترویج ہے جو اشد معاصی ہے اور عصیاں میں کسی کا بھی حکم کیوں نہ ہو، اُس کی پیروی موجب واستحقاقِ عذاب ہے کہ اِنِ الحکم الا للہ حکم تو صرف اللہ ہی کا ہے اور تمام مخلوق اُسی کی محکوم۔ مشرکینِ مکہ نے بعض جانوروں کو اپنی طرف سے حرام کیا ہوا تھا، اللہ تعالیٰ اُن کی اِس تحریم کی بھی تردید فرماتا ہے،

چنانچہ ارشاد ہے: یایہا الناس کلوا مما فی الارض حلالاً طیبًا (الآیۃ) یعنی لوگو! جو چیزیں زمین میں حلال و پاکیزہ موجود ہیں اُن سے کھاؤ (اور اُن کی تحریم کا ارتکاب کر کے) شیطان کی پیروی نہ کرو یقیناً وہ تو تمھارا صریح دشمن ہے (کہ ایسے واہیات خیالات سے تم کو ہر طرح کا نقصان دے رہا ہے)، وُہ تمھیں اُن ہی باتوں کی تعلیم کرے گا جو (میرے نزدیک) بُری اور بے حیائی کی ہیں اور یہ (کریگا) کہ اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاؤ جس کی تم سند ہی نہیں رکھتے۔ (جیسے گائے کی حرمت کہ من جانب اللہ تمھارے پاس اِس کی کوئی سند نہیں)۔

اِس آیۂ کریمہ میں جس طرح مشرکینِ مکّہ کو حکم ہے کہ تم حلال جانوروں کو حرام ٹھہرا کر شیطان کی پیروی نہ کرو اور اللہ پہ بہتان نہ باندھو۔ یونہی ہندوؤں کو بھی حکم ہے کہ گائے کے باب میں ایسا معاملہ نہ کرو۔ پس جب خود ہنود کو یہ حکم ہے تو مسلمانوں کے لیے کب جائز ہو سکتا ہے کہ وُہ اپنے عمل سے اُن کے اِس عقیدے کو قوت پہنچائیں اور شیطان کے اتباع اور خدا پہ بہتان بندی میں اُن کا ساتھ دیں۔ مانا کہ مسلمان اِس کو حرام جان کر ترک نہ کریں گے لیکن اِس ترک میں قرآنی حکم کے خلاف غیر قرآنی حکم کی تقویت تو ہے اور سُن چکے کہ آسمانی کتاب کے حکم منسوخ پر بھی عمل حرام کر دیا گیا ہے تو پھر کسی انسان کا حُکم اُس کے آگے کیا حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام کے واقعہ پر پھر غور کی نظر ڈالیے کہ باوجودیکہ اُونٹ کی حرمت ایک آسمانی کتاب میں موجود تھی لیکن چُونکہ اُس کی حرمت منسوخ ہو چکی تھی اِس لیے یہ اصحاب اسلامی حکم سے اِس کو حلال ہی سمجھتے تھے۔ غلطی ہو گئی کہ اِس کو شعارِ اسلام نہ سمجھا اور ترک کا ارادہ کر لیا جس کو تہدیداً شیطان کا اتباع قرار دیا گیا اور اپنے غضب کا اظہار فرمایا گیا۔ اُونٹ کچھ یہودوں کے معبودوں سے نہ تھا۔ پس یہاں عتاب تو صرف اِس پر ہے کہ حکم منسوخ پر عمل کا کیوں ارادہ کیا گیا اور گائے کا تو معاملہ ہی جداگانہ ہے کہ اِس کی حِلّت تعلیم توحید اور ایک شرکِ جلی کے ابطال پر ہے تو اب مسلمان خود ہی غور کرے کہ اِس کا ترک کیا معنیٰ رکھتا ہے، یہی کہ اِس میں توحید کا ابطال اور شرک کا اعلان ہے۔

یہ حکم تو صرف مطلقاً ذبیحہ گاؤ کے ترک کا ہے لیکن اِس پر قربانی کا ترک حکم میں اِس سے بھی اشد ہے کہ وُہ عبادتِ الٰہی ہے۔ پس اِس کے ترک میں ایک مخصوص عبادت کا ترک ہے۔ تو مسلمان کو یہ پُوچھتے ہُوئے شرم نہیں آتی کہ اِس کو مَیں ترک کر سکتا ہوں یا نہیں؟ یقیناً اپنی خوشی سے جو اِس کو ترک کریں گے یا اِس میں اعانت کریں گے وُہ سخت گنہگار رہوں گے۔

اور یہ خیال کہ محض ہنود کی خوشی حاصل کرنے کے لیے اِس کی قربانی کا ترک مقصود ہے اور کسی کی خوشی حاصل کرنا تو کوئی جُرم نہیں۔ تو اوّل تو حق تعالیٰ کی ناراضگی کے مقابلہ میں کسی کی رضا کی طلب خود ہی حرام ہے۔ دُوسرے وُہ محض اتنی بات سے کہ آپ ذبیحہ گاؤ کو ترک کر دیں پُوری طرح خوش بھی نہیں ہو سکتے کہ حقیقت میں اُن کو صرف گائے کی قربانی کا ترک مطلوب نہیں بلکہ ایک بہت بڑی مہتم بالشان قربانی مطلوب ہے یعنی ایمان کی قربانی بقولہ تعالیٰ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ یعنی اُن کی خوشی تو اِس میں ہے کہ تم کسی طرح کافر ہو جاؤ۔ چنانچہ آج مسلمان اِس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں تو کیا مسلمان اِس کو برداشت کر کے جہنم میں اپنا ٹھکانا بنا سکتے ہیں؟

میرے دوستو! امورِ دنیوی میں آپ کو اُن سے مدارات سے کوئی نہیں روکتا، کیجیے اور ضرور کیجیے، لیکن ایسی مدارات جس سے کوئی شعارِ اسلامی چھوٹے اور امورِ مذہبی پامال ہوں، ہرگز جائز نہیں۔ آپ کو اُن کی خوشی اِسی لیے تو درکار ہے کہ اتفاق میسر آ جائے جس کی آج سخت ضرورت ہے، لیکن کیا وُہ حاصل ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں کہ یہ شئے تو اور اختلاف کی بنیاد مضبوط کرنے والی ہے۔ اتفاق حاصل کرنے کی تو صرف ایک ہی صورت ہے اور وُہ یہ کہ جس طرح تم اُن کے مسلّمات میں کوئی مداخلت نہیں کرتے اِسی طرح اُن کو بھی چاہیے کہ اِسلامی احکام کے بجا لانے میں ہم سے کچھ تعرض نہ کریں۔

اُن کو بتلائیے کہ فروعات ایک طرف رہے، اصول پر نظر ڈالیے کہ شرک کیسی بدترین شئے ہے، جس میں معبودِ برحق کے مقابلے کا اعلان ہے، لیکن جب مشرکین ہمسایہ ہو جاتے ہیں تو کیا کوئی مسلمان اُن سے تعرض کرتا ہے کہ اپنے بُت خانے توڑو، شرک چھوڑو، ہم سے معبودِ برحق کا مقابلہ نہیں دیکھا جا سکتا۔ پس جب مسلمانوں کی طرف سے اِس قدر وہ آزاد ہیں

تو اُن کے لیے کیا گنجائش کہ ہم سے مطالبہ کریں کہ گائے کی قربانی ترک کرو، حالانکہ اُسی کے نام پر قربانی کی جاتی ہے جس کو وُہ بھی معبود جانتے ہیں اور خود اُن کے اکابر سے بھی یہ فعل ثابت ہے جو اپنے مقام پر بدلائل واضح ہو چکا ہے۔

الحاصل مسلمانوں کو ہرگز جائز نہیں کہ وُہ اپنی رضا سے گائے کی قربانی ترک کریں بلکہ ہنود کو سمجھائیں کہ وُہ اِس کے ترک پر اصرار کر کے ایک نیا فتنہ نہ کھڑا کریں کہ یہ ہمارے مذہب میں مداخلت ہے جو قانوناً بھی ممنوع ہے فقط۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

محمد مظہر اللہ دہلوی غفر اللہ لہٗ
امام مسجد جامع فتح پوری
دہلی [1]

گاندھوی شیخ الہند کے کارنامے

جن سکھوں سے سیّد احمد صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی برسرِ پیکار رہے اور پیش خویش تین چار سال تک جہاد فرماتے رہے، سیّد صاحب کے خلفاء بھی اُن کی سنّت پر غیبوبت کا شاخسانہ کھڑا کر کے دُنیا کماتے رہے، جن میں علمائے صادق پور سرِ فہرست ہیں اور جن سکھوں نے ۱۸۵۷ء کی لڑائیوں میں انگریزوں سے بھی بڑھ چڑھ کر مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ ڈھائے، جن کے تذکرے سے کلیجہ منہ کو آتے، مسجدوں میں گھوڑے باندھے، قرآن کریم پھاڑے، جلاتے اور مسلمانوں کو زندہ نذرِ آتش کرنے اور اذیت ناک سزائیں دینے میں قطعاً کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی تھی۔ اُن کے اِن تمام کارناموں کو گھریلو رنجش اور معمولی چپقلش قرار دیتے ہُوئے زمانۂ قریب کے شیخ الہند کہلانے والے جناب مولوی محمود الحسن دیوبندی اُن سکھوں اور اپنے ہندو بھائیوں کے بارے میں یُوں فہمائش کرتے ہیں؛

---

[1] محمد مسعود احمد، پروفیسر؛ فتاویٰ مظہری، مطبوعہ کراچی، ص ۳۲۱ تا ۳۲۴

"اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر تعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے مقاصد کے حصول میں مؤید بنا دیا ہے اور مَیں اِن دونوں قوموں (ہندو مسلم) کے اتفاق و اتحاد کو بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز سمجھتا ہُوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اِس کے لیے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں اُس کے لیے میرے دل میں بہت قدر ہے کیونکہ میں جانتا ہُوں کہ صورتِ حالات اگر اِس کے مخالف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لیے ناممکن بنا دے گی۔ اِدھر دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقشہ باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی ہماری بداعمالیوں سے حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔ اِس لیے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو مِلا کر تینوں عنصر اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وُہ کتنی ہی بڑی طاقتور ہو، اِن اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے دبا سکے گی۔"[1]

اِسی پر بس نہیں، موصوف نے بڑے ناصحانہ اور درد بھرے لہجے میں دونوں اقوام کے خواص و عوام کی خدمت میں فہمائش کے پہلو بہ پہلو اپیل بھی اِن غیرت مندانہ الفاظ میں کی ہے:

"اگر فرض کرو، ہندو مسلمان کے برتن سے پانی نہ پیتے یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھا نہ دے تو یہ اِن دونوں کے لیے مہلک نہیں، البتہ دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائی اور ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے اور نیچا دکھانے کی وُہ کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں،

---

[1] محمود الحسن، مولوی: خطبۂ صدارت، مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند، ص ۱۸

″ عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۲۹۱

اتفاق کے حق میں سمِ قاتل ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورہ کو سرسری نہ سمجھ کر اِن باتوں کا عملی انسداد کریں گے۔"[1]

موصوف انگریزوں کی غلامی سے تو واقعی چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے پوری طرح بیتاب تھے لیکن جتنے اس مقصد کی خاطر جدوجہد کرتے اُتنے ہی ہنود اور گاندھی کے قدموں سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ یہ نہ سمجھ پاتے کہ اِن تمام کاوشوں کا ثمرہ صرف اور صرف ہندوؤں کو ملے گا۔ انگریز واقعی دشمنِ اسلام تھا اور ہے لیکن کیا ہنود حلقہ بگوشِ اسلام ہیں؟ کیا یہ اسلام اور مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں؟ دریں حالات یہ کہاں کی دانشمندی ہُوئی کہ ایک دشمنِ اسلام قوم کی غلامی کا پھندا اپنے گلے سے ہٹانے کی خواہش میں دُوسری اُس سے بھی بڑھ کر دشمنِ اسلام قوم کی غلامی کا طوق برضا و رغبت زیبِ گلو کر لیا جاتے۔ موصوف نے ترکِ موالات کے سلسلے میں جو فتویٰ جاری کیا تھا وہ بھی شرعی فتویٰ ہونے کی بجائے اُن کی انگریز دشمنی اور ہندو نوازی کا آئینہ دار ہے جبکہ شرعی فتویٰ تو خدا اور رسول کے احکام کی ترجمانی کا فریضہ ادا کرنا ہے، لیکن آنجناب کے فتوے میں یُوں ہے:

> "(۲) تحفظِ ملت اور تحفظِ خلافت کے خالص اسلامی مطالبہ میں اگر برادرانِ وطن ہمدردی اور اعانت کریں تو جائز اور مستحقِ تشکر یہ ہیں۔ (۳) استخلاصِ وطن کیلئے برادرانِ وطن سے اشتراکِ عمل جائز ہے، مگر اِس طرح کہ مذہبی حقوق میں رخنہ واقع نہ ہو۔"[2]

ہندو لیڈر اتنے کم عقل کہاں تھے کہ اِن صاحبان کے مذہبی معاملات میں دخل دینے یا ظاہری ہمدردی کا دم نہ بھرتے۔ کیا کوئی ہندو نواز بتا سکتا ہے کہ ہندوؤں کو ملتِ اسلامیہ اور خلافت کے تحفظ سے ایک رائی کے برابر بھی دلچسپی تھی یا ہے؟ وہی اُن کے یار اور مددگار اب تو اُن الفاظ کو جھوٹ مُوٹ بھی زبانوں پر نہیں لاتے۔ آخر کیوں؟ اب تو یقین آ گیا

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ص ۲۹۱

[2] حسین احمد ٹانڈوی، مولوی: نقشِ حیات، جلد دوم، ص ۲۵۹

یا نہیں کہ ہندو لیڈر مسلمانوں کو جھوٹی ہمدردی کے جال میں پھنسا کر محض اپنا مقصد حاصل کرنے کی غرض سے استعمال کر رہے تھے۔ باری تعالیٰ شانہٗ نے تو فرمایا تھا کہ لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا ۔ کہ کافر تمھیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑیں گے لیکن مسلمانوں کے اِن محسن اور لیڈر بننے والوں نے معلوم نہیں فرمانِ الٰہی کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا یا اپنے ہندو بھائیوں کو کافروں میں شمار کرنا برداشت نہ کیا۔ چنانچہ مولوی محمود الحسن صاحب کا مذکورہ فتوٰی بھی شرعی ذمہ داری پوری کرنے کی بجائے اپنے برادرانِ یقینی کی رضا جوئی اور کانگرس کی تائید و حمایت میں جاری ہوا تھا۔ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو :

> ”یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ناگپور میں اجلاسِ کانگرس ہوا تھا اور اُس میں نان کواپریشن کی تحریک پاس ہو چکی تھی۔ اِس کے خلاف مسٹر جناح اور اُن کے موافقین کی آواز بہت کمزور پڑ گئی تھی اور یہ پارٹی حد درجہ اقلیت میں آ گئی تھی۔ ملک کے تمام اہل الرائے ہندو اور مسلمان، برطانیہ سے نہایت برگشتہ ہو رہے تھے۔ مسٹر گاندھی کی رائے قبولیتِ عامہ حاصل کر چکی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ترکِ موالات کے متعلق طلبۂ یونیورسٹی نے فتوٰی حاصل کر لیا تھا، جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ترکِ موالات کی تمام دفعات میں کانگرس کی موافقت کی تھی اور تمام مسلمانوں اور طلبۂ مسلم یونیورسٹی کو زوردار مشورہ دیا تھا کہ وُہ اِس پر عمل کریں۔“[1]

دار العلوم دیوبند اور جمعیۃ العلمائے ہند کے صدر ہونے کی حیثیت میں مولوی محمود الحسن صاحب کا یہی فتوٰی تمام گاندھوی علماء کی طرف سے کفایت کرتا تھا کیونکہ ”ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں“ لیکن کانگرس کی موافقت میں دو چار لفظ لکھ کر اِن شہسواروں کی فہرست میں اپنا نام درج کروانے کو پروانۂ نجاتِ اُخروی یا سعادتِ دارین کا ذریعہ سمجھتے ہُوئے مزید پانچ سَو علماء کے قلم بھی حرکت میں آ کر ہی رہے :

---

[1] عبدالرشید ارشدؔ، مولوی : بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۲۸۵

"اِس کے بعد یہی فتویٰ جمعیۃ علمائے ہند کے متفقہ فیصلے کی صورت میں تقریباً پانچ سو علماء کے دستخط سے شائع کیا گیا۔"[۱]

موصوف کی ریشمی رومال والی تحریک کا اُن کے حواریوں میں بڑا شہرہ ہے کہ اُنھوں نے انگریزوں کی غلامی کا جُوا اُتار پھینکنے کے لیے یہ بڑی پُراسرار اور منظم جدوجہد کی تھی۔ جہاں تک اُن کی انگریز دشمنی کا تعلق ہے وُہ تسلیم لیکن کیا یہ تحریک صرف مسلمانوں کے مفاد میں اور ہنود کی دوستی بلکہ غلامی سے آزاد ہو کر چلائی گئی تھی؟ تفصیلات کے چہرے سے نقاب اٹھا کر دیکھا تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ منصوبہ ہنود کا تھا اور یہ گاندھوی علماء یا لیڈر محض شطرنج کے مہرے تھے جنھیں مسلم ممالک اور مسلمانانِ ہند کا تعاون حاصل کرنے کی غرض سے گانٹھا گیا تھا۔ اِس بارے میں رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کے پیراگراف نمبر ۱۶۴ کا ایک اقتباس، اِن حضرات کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمائیے:

"مولوی عبیداللہ (سندھی) اور اُس کے رفیق ساتھیوں نے برطانوی حکومت کے خاتمہ پر موقتہ حکومت کے لیے ایک تجویز تیار کی تھی۔ اِس تجویز کے مطابق مہندر پرتاپ نامی ایک شخص کو صدر ہونا تھا۔ یہ شخص ایک معزز خاندان کا جوشیلا ہندو ہے۔ ۱۹۱۴ء کے آخر میں اِسے اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور فرانس جانے کا پاسپورٹ دیا گیا۔ یہ سیدھا جنیوا گیا اور وہاں بدنامِ زمانہ ہردیال سے ملا۔ ہردیال نے اُسے جرمن قونصل سے ملایا اور وہاں سے یہ برلن آیا۔ بظاہر اِس نے وہاں جرمنوں کو اپنی اہمیت کے مبالغہ آمیز تصور سے متاثر کیا اور اُسے ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا۔ خود مولانا کو وزیرِ ہند اور مولانا برکت اللہ کو وزیرِ اعظم بننا تھا۔ مولانا برکت اللہ کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر تھا اور برلن کے راستہ کابل پہنچا تھا۔ وہ ریاست بھوپال کے ایک ملازم کا لڑکا تھا اور انگلستان، امریکہ اور جاپان کی سیاحت کر چکا تھا۔

---

[۱] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰، ص ۲۸۷

ٹوکیو میں وہ ہندوستانی زبان کا پروفیسر مقرر ہُوا تھا۔ وہاں اس نے برطانیہ کے خلاف سخت لب و لہجہ کا ایک اخبار جاری کیا جس کا نام اسلامک فریٹرنٹی (اسلامی برادری) تھا۔ حکومتِ جاپان نے اِس کو بند کر کے اُسے پروفیسری سے معزول کیا اور وہ جاپان کو چھوڑ کر امریکہ میں اپنی غدر پارٹی سے جا مِلا۔

۱۹۱۶ء کی ابتدا میں مشن کے جرمنی ممبر اپنے مقصد میں ناکام ہو کر افغانستان سے چلے گئے۔ ہندوستانی ممبر وہیں رہے اور حکومتِ موقتہ پروِیژنل گورنمنٹ نے روسی ترکستان کے گورنر اور زارِ روس کو خطوط بھیجے، جن میں اُس سے برطانیہ کا ساتھ چھوڑنے اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لیے امداد کی دعوت دی گئی تھی۔ ان خطوط پر راجہ مہندر پرتاپ کے دستخط تھے اور یہ خطوط بعد میں برطانیہ کے ہاتھ آ گئے۔

زار کو جو خط لکھا گیا تھا وُہ سونے کی تختی پر تھا...... حکومتِ موقتہ کی ایک تجویز یہ تھی کہ ترکی حکومت سے روابط قایم کیے جائیں۔ اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مولانا عبید اللہ نے اپنے پرانے دوست مولانا محمود حسن کے نام ایک خط لکھا۔ اس خط کو ایک دُوسرے خط کے ساتھ جو ۸؍ رمضان (۹؍ جولائی ۱۹۱۶ء) کو محمد میاں انصاری نے لکھا تھا، ملا کر ایک لفافہ میں شیخ عبد الرحیم کے پاس حیدر آباد سندھ بھیج دیا گیا۔ شیخ عبد الرحیم تب سے غائب ہے۔ لفافہ پر ایک تحریر تھی جس میں شیخ عبد الرحیم سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ خطوط کسی قابلِ اعتماد حاجی کے ذریعے مولانا محمود حسن صاحب کے پاس مکہ معظمہ پہنچائے جائیں اور اگر کوئی دوسرا قابلِ اعتماد حاجی نہ مل سکے تو شیخ صاحب خود ہی یہ خدمت سرانجام دیں۔

مولانا محمود حسن کے نام کے خطوط جو حکومتِ برطانیہ کے ہاتھ آئے ہیں، ہم نے خود دیکھے ہیں۔ یہ خطوط زرد ریشم پر صاف اور واضح لکھے گئے ہیں۔ محمد میاں کے خط میں جرمن اور ترک مشن کی سابقہ آمد، جرمنوں کی واپسی اور ترکوں کے معطل قیام، بھاگے ہُوئے طالب علموں کے واقعات، غالب نامہ کی اشاعت کا

ذکر تھا اور حکومتِ موقتہ اور ایک حزب اللہ کے قیام کی تجویز درج تھی۔ اِس فوج کی بھرتی ہندوستان سے کرنے کی تجویز ہُوئی تھی اور اِس کا کام، اسلامی حکومتوں کے درمیان سلسلۂ اتحاد قائم کرنا تھا۔ مولانا محمود الحسن سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ سارے واقعات سلطنتِ عثمانیہ تک پہنچا دیں۔ مولانا عبید اللہ کے خط میں حزب اللہ کا مرتب و مکمل نقشہ تھا۔ اس فوج کا مرکز مدینہ میں قائم ہونا تھا۔ خود مولانا محمود الحسن صاحب کو اِس کا سالار بننا تھا۔ ثانوی مراکز مقامی سالاروں کے ماتحت قسطنطنیہ، طہران اور کابل میں قائم ہونے تھے اور کابل کا سالار عبید اللہ کو بننا تھا۔ اِس فہرست میں تین سرپرستوں، بارہ جرنیلوں اور کئی اور اعلیٰ فوجی عہدہ داروں کے نام درج ہیں۔"[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے صاف صریح طور پر واضح ہے کہ یہ برطانیہ کے خلاف جرمن حکومت کا ایک منصوبہ تھا۔ بعض منچلے، جہاں دیدہ اور ہر فن مولا ہندو اِس تحریک کے سرغنہ بنائے گئے تھے۔ ہندو نواز چند علماء کو اِس لیے شامل کر لیا گیا تھا کہ اُن کے باعث اسلامی ملکوں کا تعاون حاصل کرنا آسان ہو جائے، جبکہ سلطنتِ عثمانیہ خاص طور پر برطانیہ سے تازہ زخم کھائے ہُوئے تھی اور عام طور پر مسلمانوں کے اکثر ملک حکومتِ برطانیہ سے متنفر ہو چکے تھے۔

حالات و واقعات سے ظاہر تو یہی ہوتا تھا کہ اِس جرمنی منصوبے میں ہنود کی اوّلین اور مسلمانوں کی حیثیت ثانوی تھی، لیکن رولٹ کمیٹی نے بھی اپنی اسی رپورٹ میں ہندوؤں کو خوش کرنے اور اپنی اسلام دشمنی کا مظاہرہ کرتے ہُوئے اِس تحریک کو پان اسلامک قرار دے دیا۔ کمیٹی کا یہ فیصلہ کسی طرح بھی حقیقت پر مبنی نہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ جن علماء نے اِس تحریک میں حصّہ لیا وہ خود اِسے پان اسلامک تحریک تسلیم نہیں کرتے مثلاً؛

”اگر فقط یہ مسلمانوں کے لیے منصوبہ ہوتا تو راجہ مہندر پرتاپ کو صدارت کیوں دی جاتی اور حکومت موقتہ میں غیر مسلموں کے لیے ایسی جگہ کیوں تجویز کی جاتی،

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۲۷۸

جیسا کہ آگے آئے گا۔ (۲) اگر صرف مسلمانوں کے لیے یہ منصوبہ تھا تو ہر دیال کی کوششیں اور مولانا برکت اللہ کی اعانتیں کیا گواہی دیتی ہیں؟ دیکھو رولٹ رپورٹ، فصل پنجاب۔ (۳) جبکہ مولانا برکت اللہ کو وزیرِ اعظم بننا تھا، جیسا کہ آگے آئے گا اور وہ کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر تھا، جس میں رام چندر جیسا مشہور و معروف بھی ممبر تھا، تو اِس (رولٹ رپورٹ) میں فقط مسلمانوں کی شورش کیوں ذکر کی گئی، بلکہ یہ ایک ہندوستانیوں کی آزادی کی تحریک تھی، جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شریک تھے البتہ مسلم عنصر غالب تھا، جیسا کہ ہم نے ممبروں کے شمارے میں دکھلایا ہے اور یہی امر مولانا عبید اللہ صاحب ذاتی ڈائری میں لکھ رہے ہیں۔[1]

اِس تحریک کے بارے میں مزید اِس سے بھی واضح تبصرہ ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بڑے مسلمانوں کے بڑے کاموں پر خود اُن کا بڑا واضح تبصرہ اِن الفاظ میں موجود ہے:

"مولانا عبید اللہ اِس تحریک سے بہت پہلے ہی اعتقاد جمائے ہُوئے تھے کہ ہندوستان کی آزادی اور بہتری اسی میں ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ہو۔ وہ اپنی ڈائری کے صفحہ ۷۰ میں لکھتے ہیں "میری طالب علمی کا پہلا زمانہ تو ایسا ہے کہ اُس وقت سوائے اسلام اور مسلمانوں کے اور کسی چیز کی ہستی نہیں مانتا تھا لیکن مطالعہ پختہ ہُوا تو مجھے ہندوستانیت اور ہندو مسلم اتحاد کا خیال اور اِس کی ضرورت زور سے محسوس ہونے لگی" ــــ خیال فرمائیے کہ رولٹ کمیٹی اِس تحریک کو پان اسلامک تحریک کہتی ہے اور تحریک چلانے والا اِس کو ہندوستانی تحریک کہتا ہے اور اسی نام کو اپنی تحریک کے لیے موثر قرار دیتا ہے۔ یہی اُس کا عقیدہ اِس سے پہلے کا ہے ۔۔۔ اور اِسی کو حضرت شیخ الہند کا مشورہ قرار دیتا ہے مگر رولٹ کمیٹی افتراق پھیلانے کے لیے اِس کو پان اسلامک کہتی ہے۔[2]

---

[1] عبد الرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۲۷۶

[2] ایضاً: ص ۲۷۷

جناب صدرِ دیوبند، مولوی محمود الحسن صاحب کی پوزیشن کو اِس سلسلے میں اگر اور واضح کر دیا جائے کہ وہ اِس تحریک کو اِسلامی تحریک سمجھتے تھے یا ہندوستانیوں کی جد وجہدِ آزادی؛ تو میرا خیال ہے کہ یہ حوالہ بارِ خاطر نہ ہوگا بلکہ انصاف پسند قارئین کے ذہنوں کی ایک اُلجھن کو سُلجھانے اور حقیقت کو اُس کی اصلی شکل وصورت میں واضح کر دکھانے کا باعث بنے گا۔ الفاظ یہ ہیں:

"ہم بارہا عرض کر چکے ہیں کہ غالب پاشا گورنر حجاز نے بھی زور دیا تھا کہ تمام ہندوستانیوں کو متحد کیا جائے یعنی ہندو، مسلمان، پارسی، سکھ وغیرہ ہندوستانیوں کے اتحاد سے آزادی کی سکیم چلائی جائے۔ پان اسلامک میں یہ کہاں ہو سکتا ہے؛ حضرت شیخ الہند نے نہ صرف اِس کو قبول فرمایا تھا بلکہ پہلے سے اِس پر عامل تھے۔ اُن کے مشن میں سکھ اور انقلابی ہندو شریک تھے جن کی وجہ سے ایک مستقل مکان دیوبند میں کرائے پر لے رکھا تھا۔"[1]

تحریکِ خلافت

اب ذرا تحریکِ خلافت کو بھی دیکھ لیا جائے کہ اس تحریک کو چلانے والے کون تھے؟ قیادت کس کے ہاتھوں میں تھی؛ تحریکِ خلافت کے نام پر ہو کیا رہا تھا؛ جو کچھ اِس تحریک کے نام پر کیا گیا اُس سے سلطنتِ عثمانیہ کو کہاں تک فائدہ پہنچا؛ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ تحریکِ خلافت کی رُوحِ رواں مولانا محمد علی جوہر تھے۔ موصوف کی تحریک نے اسلامیانِ ہند میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ مسلمانوں کے سینوں میں انگریزوں سے نفرت کا سیلاب اُمنڈنے لگا تھا۔ فعال قوم کے اِس جوش وخروش کو دیکھ کر گاندھی صاحب للچائے، محبت کا ڈول ڈالا اور ہنود کے اُس بیدار مغز وعیار لیڈر نے اپنی قوم کو مولانا کی ہمنوائی پر لگا دیا۔ مولانا کوئی احسان فراموش تھوڑے ہی تھے، جب ہندو مولانا کی ہر آواز پر لبیک کہنے لگے تو شکر گزاری کے طور پر موصوف نے

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۲۷۸

گاندھی جی کی ہر بات پر لبیک کہنا شروع کر دیا بلکہ تحریکِ خلافت بھی اُن کے گھر کی لونڈی بنا دی۔

مثلاً:

> ”جن دنوں کانگرس کا اجلاس ناگپور میں منعقد ہُوا، اُنہی دنوں خلافت کانفرنس کا اجلاس بھی ہُوا اور اِس میں بھی ترکِ موالات کا ریزولیشن منظور کر کے مسلمانوں نے بھی اپنی قیادت کے لیے گاندھی جی کو منتخب کیا۔“ [1]

مولانا محمد علی جوہر کی نظر میں گاندھی جی کا کیا مقام تھا اور ایک کھلے کافر و مشرک پر تحریکِ خلافت کے بانی اور مسلمانوں کے اِس بیدار مغز لیڈر کو کہاں تک اعتماد ہو گیا تھا، حقیقت تو یہی کچھ نظر آتی ہے کہ اتحاد و دوستی کا رشتہ ذہنی غلامی پہ جا کر منتج ہو گیا تھا۔ یہ مشرک نوازی کی پاداش میں قدرت کی طرف سے سزا کے طور پر واقع ہوا ہو تو عجب نہیں۔ اب اس آگ اور پانی کے اجتماع ضدین کا ملاپ اور انتہائی افسوسناک ملاپ ملاحظہ ہو:

> ”مولانا محمد علی جوہر اُن دنوں پوری طرح مسٹر گاندھی کے ہمنوا تھے اور دونوں میں اتحاد و یکسانیت اس قدر تھی کہ دیکھ کر حیران ہوتی ہے۔ ہر ایک کو دُوسرے پر پُر خلوص اعتماد تھا۔ چونکہ تحریک کی قیادت گاندھی کے ہاتھ میں تھی، اِس لیے مولانا اپنے لیڈر پر بھرپور اعتماد رکھتے تھے۔ کراچی جیل سے مولانا بیجا پور منتقل کر دیے گئے۔ راستے میں کسی اسٹیشن پر کسی نامہ نگار نے تحریک کے متعلق اُن سے سوال کیا . . . محمد علی نے جواب میں کہا کہ تحریک کا حال تو وہ لوگ جانیں جو باہر ہیں، میں تو اتنا کہہ سکتا ہُوں کہ ”میں اپنے لیے بعد رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے گاندھی جی ہی کے احکام کی متابعت ضروری سمجھتا ہُوں۔“ [2]

مولانا جوہر کے پیر و مرشد یعنی مولوی عبدالباری فرنگی محلی جو گاندھی جیسے سامریٔ وقت کے سحر سے مسحور ہو کر اُس پر ہزار جان سے قربان ہو کر، ایک جیّد و متبحر عالمِ دین ہونے کے باوجود ڈنکے کی چوٹ یوں کہتے تھے: [3]

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، ص ۸۰۲

[2] ایضاً: ص ۸۰۷

عمرے کہ بآیات و احادیث گزشت
رفتی و نثار بُت پرستے کردی

چنانچہ موصوف کے یہی پیرو مرشد اپنے مرید کے مذکورہ بالا بیان کی تصدیق و تائید کرتے ہُوئے "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" سے بھی آگے بڑھ کر اُس پر حاشیہ آرائی کرتے ہیں؛

"لکھنؤ سے اجمیر جاتے وقت ایک بڑے اسٹیشن پر جو انگریزی اخبار میں نے خریدا اتفاق سے اُس میں یہی مکالمہ درج تھا۔ مولانا عبدالباری (مولانا جوہر کے مرشد) نے انھیں پڑھوا کر سُنا۔ اُن کے ایک رفیقِ سفر و حضر، جو اُس وقت بھی اُن کے ہمراہ تھے، بول اُٹھے کہ بعد رسول کے نام اپنے مرشد کا لینا تھا، یہ گاندھی جی کیا معنی؛ مولانا نے برجستہ جواب دیا "مرشد کوئی ذاتی ہستی تو رکھتا نہیں، وہ تو رسول ہی کا نائب ہوتا ہے، جب رسول کا نام لے دیا تو رسول کے نائب بھی اُسی میں شامل ہو گئے، گاندھی جی سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ایک الگ و مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ نام اِن ہی کا لینا مناسب تھا۔" [1]

شاید کوئی کہے کہ مولانا محمد علی جوہر تو سیاسی لیڈر تھے عالمِ دین تو نہ تھے اور اُن کے مرشد خود ہی گاندھی کے دامِ تزویر میں گرفتار تھے لہٰذا ہم ان بیانات پر دارالعلوم دیوبند سے تصدیق کی مہر لگوا دینا ضروری سمجھتے ہیں؛

"اِس اقتباس کو پڑھ لینے کے بعد ایک بات اصولی انداز میں سامنے آتی ہے کہ جب کسی کو تحریک کا قائد بنا لیا جائے (خواہ وہ شیطان ہو؟ — اختر) تو پھر اُس پر پُورا اعتماد کرنا چاہیے۔ مولانا محمد علی جوہر کے گاندھی جی کے متعلق اِس قسم کے نظریہ کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے نقد و نظر کا دروازہ کھولا ہے اور بات کو دور تک لے گئے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا جوہر کا یہ نظریہ کسی بھی نقطہ نظر سے غلط نہیں ہے۔" [2]

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۸۰۷

[2] ایضاً: ص ۸۰۷

جب تحریکِ خلافت پورے زورِ شور سے جاری تھی تو اُن دنوں ہندو مسلم اتحاد بھی اپنے نقطۂ عروج کو چھو رہا تھا۔ انگریزوں نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ اگر صورتِ حالات یہی رہی تو ہندوستان سے ہمیں بوریا بستر گول کرتے ہی بنے گی۔ انگریزوں نے شردھانند کے کان میں پھونک ماری کہ ملکانہ کے راجپوتوں کو ہندو بناؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ رہا کر دیے گئے۔ دوسری طرف مولوی محمد الیاس کاندھلوی صاحب (المتوفی سنہ ۱۳۶۳ھ/ سنہ ۱۹۴۴ء) کو پانچسو روپیہ ماہوار پر راضی کیا کہ وہ میوات کے ہندو نما مسلمانوں میں تبلیغ کر کے اُنھیں اسلام کی تعلیمات سے بہرہ ور کریں۔ حکومت کو نہ ہندومت سے عقیدت تھی نہ اسلام سے پیار۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ہندو مسلم اتحاد جو اُن کے اقتدار کے لیے مستقل خطرہ بنتا جا رہا تھا اُسے توڑ دیا جائے۔ شدھی پر مسلمان بھڑکیں گے اور اِن کی تبلیغی مساعی سے ہندو بدکیں گے اِس طرح اتحاد کے بجائے دونوں قومیں آپس میں ہی ٹکرانے لگیں گی اور ہم کرسیِ اقتدار پر بیٹھے ہوئے تماشا دیکھتے رہیں گے۔ اِس انگریزی منصوبے کی کہانی، دیوبندی حضرات کی زبانی سُنیے:

"انگریز بڑی شاطر قوم ہے۔ تحریکِ خلافت پر اُس نے ہندو مسلم اتحاد کا جو نظارہ دیکھا اُس کو دیکھ کر اُسے گمان ہوا کہ اگر یہ لوگ اِسی طرح متحد رہے تو ہم چند دنوں کے مہمان ہیں۔ لہٰذا حکومت نے سوامی شردھانند کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا، جنھوں نے باہر آ کر شدھی کی تحریک چلائی اور ملکانہ کے راجپوتوں کو "شدھ" کرنا شروع کر دیا۔ یہ بیچارے نام کے تو مسلمان تھے لیکن رسم و رواج کے لحاظ سے ہندوؤں کی طرح۔ لہٰذا شردھانند کی شُدھی تحریک کا اُن پر جلد اثر ہُوا اور وہ ہندو مذہب میں داخل ہو گئے ..... اور انہی دنوں مالابار میں ہندو مسلم فسادات ہُوئے۔ اِن سب حالات کی بنا پر ہندو مسلم جو متحد ہو کر انگریز کے خلاف تھے اب ایک دُوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئے اور دونوں قوموں کی پُوری توانائیاں ایک دُوسرے کے خلاف صرف ہونے لگیں۔"[1]

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۸۰۸

جب انگریز کا یہ منصوبہ کامیاب ہونے لگا، جگہ جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپس میں ٹھن گئی تو وہ بڑے بڑے ہندو لیڈر جنھیں تحریکِ خلافت کی گاڑی کو چلانے والے مسلمان لیڈر اور گاندھوی علماء اپنے یار و مددگار یا اعیان انصار اور اپنی کشتی کے ناخدا اور جماعت کے امام و پیشوا بنائے بیٹھے تھے، اُنھوں نے اِس موقع پر اپنا کیا رنگ دکھایا؟ اِن مسلمانوں کے لیڈر اور علماء کہلانے والوں کو اُنھوں نے واقعی بھائی سمجھ کر سینے سے چمٹایا یا اِن کے کسی بڑے سے بڑے کو بھی منہ نہ لگایا۔ صورتِ حال ملاحظہ ہو:

> ”مولانا (محمد علی جوہر) جب جیل سے رہا ہُوئے تو ملک کی حالت بدل چکی تھی۔ اتحاد و اتفاق کی جگہ افتراق و انتشار نے لے لی تھی اور اِس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ملک کے سامنے ترکِ موالات اور عدمِ تعاون کا جو پروگرام رکھا گیا تھا وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور اُس کی جگہ شدھی نے لے لی اور اِدھر مسلمانوں نے مجبور ہو کر مدافعت میں تبلیغی مہم شروع کر دی۔ تقریبًا تمام دینی جماعتیں اور علماء شدھی کے مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ علماء کا موقف یہ تھا کہ سوامی شردھا نند کی تحریک کا اگر مقابلہ یا دفاع نہ کیا گیا اور سادہ لوح مسلمانوں کو اُس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تو اِس کا بہت بڑا دینی نقصان ہو گا۔ مولانا محمد علی جوہر کے بیشتر ساتھی بھی اِسی تبلیغی مہم میں لگ گئے۔
>
> موتی لال، نہرو اور دُوسرے وکلاء پریکٹس شروع کر کے اپنی اپنی وکالت و بیرسٹری کو فروغ دینے کے سامان کر رہے تھے۔ لیکن ایک مولانا محمد علی تھے، جنھیں یہی دُھن تھی کہ اُسی پروگرام و نصب العین کو اپنایا جائے جس کے لیے نہ صرف وہ جیل گئے بلکہ ملک کے تمام بڑے بڑے لیڈروں اور چالیس پچاس ہزار افراد نے ہنسی خوشی تمام کام چھوڑ کر جیل کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ مولانا جوہر اگر چاہتے تو اِسی رَو میں بہہ کر عوامی احساسات کا ساتھ دیتے مگر اُنھوں نے بلا خوف لومۃ لائم اِن حالات میں بھی کانگرس سے پُوری وفاداری کا ثبوت دیا اور کانگرس کی پالیسیوں کو کامیاب بنانے اور اُس کی مقبولیت بحال کرنے میں دن رات

ایک کر دیا۔"[1]

شدھی کے ذریعے چونکہ ہزاروں مسلمانوں کو مرتد کیا جا چکا تھا اور کامیابی سے اُن دشمنانِ اسلام کی یہ تحریک چل رہی تھی، اسی لیے ہندو لیڈروں نے چُپ کی سادھ لی، منہ سی لیے۔ اِس کے برعکس مولانا محمد علی جوہر اپنے ساتھی ہندو لیڈروں سے اپیل کرتے پھر رہے تھے کہ وہ اپنی معنی خیز چُپ توڑیں اور حالات پر قابو پانے میں مدد دیں حالانکہ اینٹ پتھر کے اُن پجاریوں نے گرگٹ کی طرح اپنا رنگ ہی بدل لیا تھا، لیکن افسوس! یہ سب کچھ دیکھتے بھالتے ہوئے بھی مولانا کی وفاداری کس کے ساتھ رہی اور کس کی پالیسیوں کو کامیاب بنانے میں مصروف رہے، یہ قارئین نے ملاحظہ فرما ہی لیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مولانا کی کوششوں کا نتیجہ کیا نکلا:

> "مولانا محمد علی کی انتھک کوششوں اور مساعی کے باوجود ہندو مسلم اتحاد کم ہوتا گیا اور اختلافات کی خلیج وسیع ہوتی چلی گئی۔ اِس کے لیے ایک "یونٹی کانفرنس" دہلی میں اور ایک شملہ میں منعقد ہُوئی، جس میں اکثر ہندو مسلم زعماء شریک ہُوئے۔ کئی کئی دن اِس کے اجلاس ہوتے رہے۔ مولانا نے بیحد کوشش کی کہ کسی طرح وہ فضا پیدا ہو جائے جو تحریکِ خلافت میں تھی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ فسادات ہوتے رہے اور ہندو مسلم تعلقات میں تلخی و کشیدگی بڑھتی رہی۔ گاندھی جیسا آدمی بھی یہ کہہ کر کہ "اب میری بات کوئی نہیں سُنتا" اپنے آشرم میں چلے گئے۔"[2]

آئیے! اب یہ دیکھتے ہیں کہ مولانا کی اِس ہندو نوازانہ پالیسی کو مبتدعینِ زمانہ اور ہندو پریس نے کس نظر سے دیکھا؟ گاندھی کے سکوت سے کیا سبق حاصل کیا؟ سبق حاصل کرنے کے باعث کیا نتائج برآمد ہُوئے؟

> "مولانا جوہر کا یہ کردار بلاشبہ قابلِ تعریف و تحسین تھا اور حق و انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ ہندو پریس مولانا کے اِس رویّے کو بنظرِ استحسان دیکھتا اور خراجِ عقیدت ادا

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، ص ۸۰۹

[2] ایضاً: ص ۸۱۲

> کرتا، مگر ہندو زعماء اور پریس ہمیشہ مصلحت آمیز سکوت اختیار کرتا رہا اور مسلمان یہ کہتے رہے کہ مولانا جوہر پر گاندھی جی کا سحر ہے اور وہاں اِسی سُر میں سُر ملا کر ہندو پریس یہ ضرور کہہ دیا کرتا تھا کہ علی برادران نے گاندھی جی پر جادو کر دیا ہے۔ لیکن مولانا اپنے اور پرایوں کا یہ سلوک دیکھنے اور سُننے کے باوجود ہمالہ کی طرح اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور یہ اعتراف کرنے میں بھی بُخل نہیں کرنا چاہیے کہ گاندھی جی کا رویّہ بھی منصفانہ نہ رہا۔ انھوں نے تحریکِ خلافت میں جو خالص اسلامی تحریک تھی بھرپور ساتھ دیا اور مسلمانوں نے ان کی قیادت میں کام کیا..... بات مولانا جوہر کی استقامت اور اپنے موقف پر پختگی کی ہو رہی تھی، جس کی بنا پر وہ ہندو اور مسلم دونوں کی نظر میں غیر مقبول ہو رہے تھے۔"[۱]

ہندو جنھیں اپنا دینی یا یقینی بھائی سمجھا جا رہا تھا، شدھی اور تبلیغ کی تحریکوں کے سامنے آتے ہی یکسر آنکھیں بدل گئے، مولانا جوہر جنھیں اپنا قائد و امام بنائے بیٹھے تھے یا جو ہندو لیڈر یہ ظاہر کرتے ہُوئے نہیں تھکتے تھے کہ وہ مولانا کے ہی دست و بازو ہیں، انھوں نے مولانا کی التجاؤں پر کان نہ دھرے، ہندو پریس بھی مخالف ہو گیا۔ یہ سب کچھ کیوں ہُوا؟ اس لیے کہ خدائے وحدہٗ لاشریک کو سچا نہ مانا تھا، گاندھوی علماء و لیاڈر نے اس سبوح و قدوس کے اِس فرمان کا صادق ہونا نہ جانا تھا کہ لَا يَأْلُوْنَكُمْ خَبَالًا۔ غیر مسلم تمھیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑیں گے۔ کیا یہی کچھ ہو کر نہ رہا؟ مزید سُنیے:

> "شدھی کی تحریک اور اِس کے مقابلے میں مسلمانوں کی جانب سے تبلیغی مہم کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد کو خاصا نقصان پہنچ چکا تھا اور حالات ایسے ہو گئے تھے کہ گاندھی جی بھی اپنے آشرم میں معتکف ہو گئے تھے۔ مہا سبھا کے لیڈر شدھی تحریک کی تائید و حمایت کر رہے تھے۔ کانگرس کے ہندو زعماء اِن حالات میں مُہر بلب تھے لیکن ایک مولانا محمد علی اپنے مشن میں لگے ہُوئے تھے اور برابر

---

[۱] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۸۱۰

ہندو مسلم اتحاد کی دعوت دیے جا رہے تھے۔ یونٹی کانفرنسیں کیں، اپنوں کی مخالفت مول لی، ہندو لیڈروں سے اپنے درجہ سے گرے ہوئے الفاظ میں منت کی کہ ملک کی آزادی کے لیے اتحاد کی راہ اختیار کرو۔

> مولانا ابو الکلام آزاد اور دوسرے بزرگوں کی معیت میں گاندھی جی سے درخواست کی کہ وہ مہرِ سکوت کو توڑ کر مہاسبھا کے لیڈروں کو سمجھانے کی کوشش کریں، لیکن کوئی ہندو لیڈر اپنی قوم کی مخالفت کے خوف کی بنا پر یہ جرأت نہ کر سکا کہ وہ مولانا محمد علی کی راہ اختیار کرے۔ ان حالات میں مولانا محمد علی نے ہی یہ جرأت کی کہ وہ ڈاکٹر مونجے، پنڈت مدن موہن مالوی اور دوسرے ایسے لیڈروں کے نفاق کا پردہ چاک کریں۔ چنانچہ انھوں نے یہ فریضہ سر انجام دیا اور خوب انجام دیا۔ ہندو پریس جو پہلے مولانا کی اتحاد پرور کوششوں پر سکوت اختیار کیے ہوئے تھے، اب صرف اس قصور پر کہ وہ ڈاکٹر مونجے اور پنڈت مالوی کی نقاب کشائی کرنے لگے تھے، مولانا کے خلاف زہر چکانی کرنے کے لیے پورے ساز و سامان سے مسلح ہو کر میدان میں آگیا۔“ [1]

ہندو خواص و عوام کے دلوں کا کھوٹ اور افسوسناک رویہ ظاہر ہو کر عالم آشکار ہو چکا تھا، اس کے باوجود مولانا ان بت پرستوں کی ہمدردی کو تمام دکھوں کا علاج اور آزادیِ ہند کے لیے نسخۂ کیمیا بنائے بیٹھے تھے۔ حالانکہ مسلمان کی نظر میں آزادی کو نہیں بلکہ اسلام کو اوّلیت ہے۔ مسلمان آزادی پر اسلام کو قربان نہیں کیا کرتا۔ اس مسئلے کی شرعی پوزیشن اسی کتاب کی جلد دوم میں ”کفار سے دوستی“ کے تحت ملاحظہ فرمائی جائے۔ یہاں دکھانا یہ ہے کہ مولانا نے آزادیِ وطن کے ان چلتے پھرتے بتوں اور بت پرستوں کی رضاجوئی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا لیکن ’وائے آرزو کہ خاک شدہ‘۔ مثلاً:

”اس پر مجبور ہو کر مولانا نے خلافت کانفرنس کا سپیشل اجلاس بلایا جو حکیم اجمل خاں

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۸۱۵

کی تحریک اور مولانا ابوالکلام آزاد و مولانا شوکت علی کی تائید سے مولانا سلیمان ندوی کی صدارت میں شروع ہوا اور اِس میں مسلم زعمأ نے بالاتفاق، اتحاد و اتفاق کی دعوت دی اور کہا گیا کہ آزادی کی خاطر ہم ہندو دوستوں کی طرف دستِ تعاون بڑھا رہے ہیں، اب یہ اُن کی مرضی ہے کہ وہ اِس ہاتھ کو دوست کا ہاتھ سمجھیں جو مصافحہ کے لیے بڑھاتا ہے یا ایک پہلوان کا جو اکھاڑے میں اُتر کر اپنے حریف کی طرف بڑھاتا ہے۔

اِس کانفرنس کے بعد مولانا جوہر وفدِ حجاز میں شامل ہو کر دہلی سے عرب کو روانہ ہُوئے۔ اسٹیشن پر آپ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہُوئے کہا کہ "یہ ملک کے لیے سخت ترین ابتلاء و آزمایش کا زمانہ ہے، نہ آپ خود مشتعل ہوں نہ اپنے کسی لفظ سے یا عمل سے اہلِ ہنود کو مشتعل ہونے کا موقعہ دیں۔ میں درخواست کرتا ہُوں کہ اگر وُہ تمھارے اُوپر ہاتھ اٹھائیں تو سر جھکا دو، اگر وُہ چُھری اٹھائیں تو سینہ آگے کر دو، اگر ظلم کریں تو صبر سے کام لو۔"[1]

؎ پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

جس گاندھی کی امامت کو مولانا نے ناموافق سے ناموافق حالات میں بھی اپنے لیے دستارِ فضیلت یا طرۂ امتیاز بنائے رکھا، نہرو رپورٹ کے وقت اُسی گاندھی نے اور دُوسرے ہندو کانگرسی لیڈروں نے جنھیں مولانا اپنی فوج کے سپہ سالاروں اور اپنے یاروں اور پیاروں میں گنتے تھے، خود مولانا کے ساتھ کیسا سلوک کیا:

"مولانا محمد علی یورپ سے واپس آئے تو اُنھوں نے بھی اختلاف کیا اور ہندوستان پھر ایک دفعہ معرکۂ کارزار بن گیا۔ تمام ہندوؤں نے رپورٹ کی تائید کی مگر مسلمانوں میں دو پارٹیاں بن گئیں۔ اِس آل پارٹیز کانفرنس میں نہرو رپورٹ

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۸۱۶

کی حمایت میں کانگرس تھی، لبرل حضرات تھے، ہندو مہا سبھا تھی، مسلمانوں کی ایک جماعت تھی۔ گاندھی جی جواب تک خاموش تھے اِس مرحلے پر نہرو رپورٹ کے منظور ہونے پر وہ اِس کے حامی ہو گئے۔ مولانا محمد علی، شوکت علی جنھوں نے ہر مرحلے پر کانگرس کا ساتھ دیا اور اپنوں کی گالیاں سُنی تھیں، اب اُن کے اختلاف کو کانگرس نے پرِ کاہ کی حیثیت بھی نہ دی اور اُن کی بات سُننے سے بھی انکار کر دیا۔“ [1]

؎ یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

جمعیۃ العلمائے ہند

جب ہندو نواز علماءُ نے اپنی سیاسی جماعت ”جمعیۃ العلمائے ہند“ کے نام سے بنائی جو حقیقت میں کانگرس ہی کی ذیلی شاخ تھی تو مولوی محمود الحسن صاحب اُس کے صدر اور مفتی کفایت اللہ دہلوی [2] نائب صدر رہیا اپنے استاد کی جگہ عارضی صدر مقرر ہُوئے جنھوں نے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۸ء تک متواتر انیس سال تک اپنی اس سیاسی جماعت کی صدارت کے فرائض سر انجام دیے اور ہندو مسلم اختلافات بلکہ دونوں قوموں کی ہنگامہ آرائیوں اور کشت و خون کے دنوں میں بھی مفتی صاحب کی دلی ہمدردیاں کانگرس کے ساتھ وابستہ رہیں۔ مثلاً:

”حضرت مفتی صاحب نے اپنے ملک کی ہر سیاسی تحریک میں حصّہ لیا۔ ۱۹۱۹ء کے رولٹ ایکٹ بل کے خلاف جب ستیہ گرہ کی تحریک شروع ہُوئی تھی تو آپ نے اُس میں بھی بھرپور حصّہ لیا۔ آپ اِس مقصد کے لیے حکمتِ عملی کے ساتھ پوشیدہ کام کرتے رہے۔ تحریکِ خلافت کے خاتمہ کے بعد جب ۱۹۲۲ء میں سوامی شردھانند نے شُدھی کی تحریک جاری کی اور ہزاروں ملکانوں کو، جو مسلمان تھے، مرتد کر کے

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، ص ۸۱۸

[2] مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء میں پیدا ہُوئے اور ۱۳۷۲ھ/ ۱۹۵۲ء میں وفات پائی۔

ہندو بنا لیا تو حضرت مفتی صاحب کانگرس اور ہندوؤں سے بعض معاملات میں اتحاد رکھنے کے باوجود اپنے مذہبی فرائض سے غافل نہیں رہے۔"[1]

مفتی کفایت اللہ دہلوی (المتوفی ۱۳۷۲ھ) کے علاوہ باقی سارے کانگرسی علماء، ہندوؤں کو خوش کرنے اور ہندو مسلم اتحاد برقرار رکھنے کی خاطر، اپنے ہندو بھائیوں کے مطالبے پر، خود شارع بن کر، اسلام سے مرتد کی سزا اور تبلیغ کو خارج کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے دیوبندی حضرات کا اپنا بیان ہے کہ؛

"شدھی اور سنگھٹن کی تحریک کی وجہ سے تمام ملک میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے تھے، لہٰذا گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے ستمبر ۱۹۲۴ء کو اکیس دن کا برت شروع کیا اور ۲۶ ستمبر ۱۹۲۴ء کو پنڈت مدن موہن مالوی کی صدارت میں تمام فرقوں کی ایک اتحاد کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس میں صدرِ جلسہ نے ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ وہ اپنے مذہب میں سے سزائے مرتد اور تبلیغ کے احکام کو خارج کر دیں۔ اس موقع پر اکثر ہندو اور مسلمان لیڈروں نے اِس تجویز کی حمایت کی، مگر ہزاروں کے اِس مجمع میں صرف مفتی صاحب کی ذات تھی جس نے اِس متفقہ تجویز کی پُرزور مخالفت کی اور شریعت کے صحیح احکام کی حمایت میں آپ عظیم ترین شخصیتوں سے بھی مرعوب نہیں ہوئے۔"[2]

دیوبندی حضرات کے نزدیک مفتی صاحب کی زندگی کا ایک تابناک پہلو اور موصوف کے کارناموں میں سے ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے دمِ واپسیں تک اینٹ پتھروں کے پجاریوں سے دوستی کا رشتہ برقرار رکھا؛

"اُنھوں نے ایک فیصلہ کیا تھا اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ کانگرس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ زندگی کے آخری لمحات تک اُنھوں نے اِس راستہ سے قدم نہیں

---

[1] عبدالرشید آرشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، ص ۴۳۱

[2] ایضاً: ص ۴۳۲

ہٹایا۔"[1]

مولوی حسین احمد ٹانڈوی صاحب سابق صدر مدرسۂ دیوبند (المتوفی ۱۳۷۷ھ) اپنے استاد مولوی محمود الحسن صاحب (المتوفی ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء) کے خلیفہ مجاز اور جانشین تھے۔ موصوف کی سیاسی سرگرمیاں بھی اُسی ڈگر پر رہیں:

> "چنانچہ آپ نے صحیح صحیح جانشین ہونے کا پورا پورا ثبوت دیا اور ہندوستان کی تحریک آزادی کی ذمہ داریوں کو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی طرح سنبھال لیا اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی طرح خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء کی راہنمائی کے فرائض سرانجام دینے لگے اور عدم تشدد کے راستے پر چل کر حکومتِ برطانیہ کے خلاف ملک و قوم کی سیاسی تحریکات میں جوشِ عمل کی رُوح پھونکنے لگے۔"[2]

مولوی محمود الحسن صاحب کے مشن کو اُن کے جانشین مولوی حسین احمد ٹانڈوی نے جو ہندو نواز لوگوں کی نظر میں شیخ الاسلام تھے، کافی آگے دھکیلا، موصوف کانگرس کے باقاعدہ ممبر بنے اور آخری دم تک ممبر ہی رہے، چنانچہ خود رقمطراز ہیں:

> "میں اگرچہ پہلے سے کانگرس میں شامل نہ تھا، مگر مالٹا سے واپسی پر کانگرس کا ممبر باقاعدہ بن گیا اور ہمیشہ جدّوجہدِ آزادی میں شریک رہا اور قید و بند کے مصائب بھی اہلِ ملک کے ساتھ جھیلتا رہا۔"[3]

کانگرس نے جب ترکِ موالات کی تحریک چلائی تو موصوف نے بھی گاندھی کے ارشاد کو آمنا و صدقنا کہہ کر نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اُس پر عمل کرنے اور کروانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ جیل بھی گئے۔ مثلاً:

> "ترکِ موالات کے سلسلے میں آپ نے انتھک کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، ص ۴۵۴

[2] ایضاً: ص ۴۷۷

[3] حسین احمد ٹانڈوی، مولوی: نقشِ حیات، جلد دوم، ص ۲۷۳

زیرِ دفعہ ۱۲۰، ۱۳۱، ۵۰۵ آپ کو اور مولانا محمد علی صاحب مرحوم، مولانا شوکت علی صاحب، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا نثار احمد صاحب کان پوری اور جگت گرو سوامی کرشن تیر تیہ (شنکر اچاریہ) پیر غلام مجدد صاحب سندھی کو گرفتار کر لیا گیا۔"[1]

جب کانگرس نے ستیہ گرہی کی تحریک چلائی تو موصوف نے پوری وفاداری کے ساتھ اُس میں بھی بھرپور حصہ لیا، مثلاً:

"الحاصل جب ۱۹۳۲ء میں جمعیت اور کانگرس نے ستیہ گرہ کی تحریک پاس کی تو آپ اس تحریک میں بھی پیش پیش رہے۔ چنانچہ جب آپ دہلی تقریر کرنے کے لیے جا رہے تھے تو مظفر نگر اسٹیشن پر آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔"[2]

ٹانڈوی صاحب نہ صرف خود کانگرس میں شامل ہوئے اور ساری عمر بت پرستوں کے وفادار رہے بلکہ اپنے ہم مشرب لوگوں کو بھی اِسی غیر اسلامی روش پر چلنے کی ترغیب دیتے رہے اور موصوف اِسی کو اپنے خلوص و للّٰہیت کی دلیل اور اسلام و مسلمین کی خیر خواہی سمجھتے رہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے غلاموں کو گاندھی کا غلام بنا کر چودھویں صدی میں خود کو ابو الفضل اور فیضی کا حقیقی جانشین منوانے کی سر توڑ کوششیں کرتے رہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"اِس نازک وقت میں حضرت مدنی کی ذات گرامی قدر تھی جو آگے بڑھی اور تمام مسلمانوں کو خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ جو جماعت انقلاب لاتی ہے وہی برسرِ اقتدار آتی ہے۔ مسلمانوں کو اپنے ملک کے دُوسرے باشندوں سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے اور مسلمانوں کو جنگِ آزادی کے لیے کانگرس کی شرکت کا مشورہ دیا چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس امروہہ ضلع مراد آباد میں کیا گیا۔ جنگِ آزادی کی خاطر کانگرس میں شرکت کا فیصلہ کیا گیا کہ اپنا علیحدہ وجود رکھتے ہوئے کانگرس کے ساتھ اس بارے میں (حصولِ آزادی) تعاون کیا جائے۔"[3]

---

[1] عزیز الرحمٰن نہٹوروی، مفتی: تذکرہ مشایخ دیوبند، مطبع سعیدی کراچی ۱۹۶۴ء، ص ۲۷۵

[2] ایضاً: ص ۲۷۷

[3] عبد الرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۴۸۴

موصوف کے اِن نظریات کے بارے میں عالیجناب مودودی صاحب کی رائے بھی اگر ملاحظہ فرما لی جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ ہماری ذاتی رائے ہے کہ اِس بارے میں مودودی صاحب کا موقف یقیناً قابلِ توجہ ہے۔ ملاحظہ ہو:

> "آپ کو صرف (ٹانڈوی صاحب کو) برطانوی اقتدار کا زوال مطلوب ہے، عام اِس سے کہ وہ کسی صورت میں ہو، اسی لیے آپ ایسی انجمن کے معاملہ میں صرف علتِ جواز ہی ڈھونڈتے ہیں اور علتِ حرمت جو سامنے منہ کھولے کھڑی ہے آپ کو کسی طرح نظر نہیں آتی۔ لیکن ہم مجبور ہیں کہ ان دونوں پہلوؤں کو ساتھ ساتھ دیکھیں اور علتِ حرمت کو دفع کیے بغیر علتِ جواز کو قبول نہ کریں۔ اس لیے کہ ہم کو برطانوی حکومت کا زوال اور اسلام کا بقا دونوں ساتھ ساتھ مطلوب ہیں، اِس کا نام اگر برطانیہ پرستی رکھنا ہے تو رکھیے، ہمیں اس کے طعن کی ذرہ برابر پروا نہیں۔"[1]

ٹانڈوی صاحب اکبری دور کے ابوالفضل اور فیضی کی یاد تازہ کرتے ہوئے ہندوستان کے باشندوں کو، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سب کو گاندھی کے قدموں میں ڈال کر، کانگرسی اور گاندھوی بنانا چاہتے تھے، جس کا نام موصوف نے ہندوستانی رکھا تھا۔ جس طرح اکبر بھی ہندو اور مسلمان کا فرق مٹا کر سب کو ایک قوم بنانا چاہتا تھا اور دین فروش علماء میں سے ابوالفضل اور فیضی وغیرہ اُسے جواز مہیا کر رہے تھے اسی طرح دورِ حاضر میں گاندھی نے بھی اکبری منصوبہ شروع کیا، مسلمانوں کو نزدیک بلایا تا کہ ہندو مت میں مدغم کیا جائے، حتّٰی کہ اپنے قدموں میں جگہ دی، خود کہ محمد رسول اللہ کی مثل کہنے والوں کا غرور اگر مشرکوں اور بُت پرستوں کے جوتوں میں ڈال کر نہ توڑا جاتا تو کیا پروردگارِ عالم وعالمیان اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخوں کا اُن کی بدزبانیوں پر کوئی نوٹس نہ لیتا؟ گاندھی کے غلام بننے، مسلمانوں کو مشرکینِ ہند سے محبت واتحاد کا رشتہ قائم کرنے اور ہندوؤں میں مدغم ہونے کی تجویز پر مُہرِ تصدیق ثبت فرماتے ہوئے ٹانڈوی صاحب

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی: مسئلہ قومیت، ص ۶۳

اینڈ کمپنی نے مُلّا مبارک کے فرزندوں کی طرح آیات و احادیث سے جواز مہیّا کیا۔ دین میں یُوں جسارت دکھانا، قرآن و حدیث میں دن دہاڑے کھل کر تحریفیں کرنا اگر خدا کے عذاب اور رسول کی ناراضگی کا موجب ہوگا تو ہوتا پھرے، اپنے پیشوا گاندھی جی کو تو خوش کر لیا، اپنے ہندو بھائیوں کو راضی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ موصوف اپنی گاندھوی قوم کے بارے میں یوُں توہینِ رسالت کا ارتکاب کر کے غضبِ خداوندی کو جوش میں لاتے تھے:

"اِس پر ملک و وطن میں بڑی بڑی بحثیں ہُوئیں مگر وُہ اپنی جگہ مطمئن تھا اور مطمئن رہا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے یہودیوں اور مسلمانوں کو حفاظتِ وطن کے نام پر ملا کر ایک قوم بن سکتے ہیں تو ہندوستان کا مسلمان بھی آزادیِ وطن کے لیے اس قسم کا اقدام کر سکتا ہے۔"[1]

ٹانڈوی صاحب کے اِس خلافِ حقیقت بیان اور نظریہ پر مودودی صاحب یوں تبصرہ کرتے ہیں:

"مولانا (ٹانڈوی صاحب) آخر فرمائیں تو کہ جس متحدہ قومیت کو وُہ رسولِ خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں اُس میں آجکل کی متحدہ قومیت کے عناصرِ ترکیبی میں سے کون سا عنصر پایا جاتا ہے؟ اگر وُہ کسی ایک عنصر کا پتہ نہیں دے سکتے اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہُوں کہ ہرگز نہیں دے سکتے تو کیا مولانا کو خدا کی باز پُرس کا خوف نہیں؟"[2]

آگے مودودی صاحب اسی گاندھوی قومیت پر تبصرہ کرتے ہُوئے رقمطراز ہیں:

"مولانا (ٹانڈوی صاحب)، اِس متحدہ قومیت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے تشبیہہ دینے کی جرأت فرما رہے ہیں حالانکہ ان بنیادی حقوق کی حیثیت ملکہ وکٹوریہ کے مشہور اعلان سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے اور مغرب کی ڈپلومیسی کی ایسی چالوں کا رشتہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے جوڑنے

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، ص ۴۸۷

[2] ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی: مسئلہ قومیت، ص ۶۰

کی جسارت ہم جیسے گنہگاروں کے بس کی بات تو نہیں، ہاں جن کے پاس تقویٰ کا زادِ راہ اتنا زیادہ ہے کہ وہ ایسی جسارتیں کرنے پر بخشے جانے کی اُمید رکھتے ہیں اُنھیں اختیار ہے کہ وُہ جو چاہیں کہیں اور جو چاہیں لکھیں۔" [1]

موصوف نے اِسی سلسلے میں ٹانڈوی صاحب کو فہمایش کرتے ہُوئے مندرجہ ذیل الفاظ میں حقیقت پسندی کی دعوت دی اور دشمنانِ اسلام کے ہاتھ مضبوط کرنے سے روکنے کی کوشش کی ہے:

> "کم از کم اب وُہ (ٹانڈوی صاحب) اُمت پر رحم فرما کر اپنی غلطی محسوس فرمالیں ورنہ اندیشہ ہے کہ اُن کی تحریریں ایک فتنہ بن کر رہ جائیں گی اور اُس پرانی سنت کا اعادہ کریں گی کہ ظالم امراء اور فاسق اہلِ سیاست نے جو کچھ کیا اُس کو علماء کے ایک گروہ نے قرآن و حدیث سے درست ثابت کر کے ظلم و طغیان کے لیے مذہبی ڈھال فراہم کر دی۔" [2]

ٹانڈوی صاحب نے اپنی تجویز کردہ گاندھوی قومیت کو شریعتِ محمدیہ سے درست ثابت کرنے اور ابوالفضل و فیضی کا حقیقی جانشین بننے کی غرض سے "متحدہ قومیت و اسلام" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اِسی کتاب کے دلائل اور صفحہ ۵ کی ایک عبارت پر مودودی صاحب تنقید کرتے ہُوئے، اُن کے غلط موقف کو یُوں سمجھاتے ہیں:

> "عبارت کا ایک ایک لفظ شہادت دے رہا ہے کہ مولانا (ٹانڈوی صاحب) نہ تو قومیت کے اصطلاحی مفہوم کو جانتے ہیں، نہ کانگرس کے مقصد اور مدعیٰ کو سمجھتے ہیں، نہ بنیادی حقوق کے معنی پر اُنھوں نے غور کیا ہے، نہ اُن کو خبر ہے کہ جن اجتماعی مجلسوں کا وہ بار بار اِس قدر سادگی کے ساتھ ذکر فرما رہے ہیں اُن کے حدود و اختیار و عمل موجودہ دستور کے تحت کن کن راہوں سے

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی: مسئلہ قومیت، ص ۶۸

[2] ایضاً: ص ۶۹

اِس دائرے میں نفوذ کرتے ہیں، جس کو تہذیب و تمدّن اور عقاید و اخلاق کا دائرہ کہا جاتا ہے ...... اور یہ بات بھی میں سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں کہ مولانا حسین احمد باایں ہمہ علم و فضل، کلچر، تہذیب، پرسنل لا، وغیرہ الفاظ بھی جس طرح استعمال کر رہے ہیں، اِس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ ان کے معنیٰ و مفہوم سے ناآشنا ہیں۔ میری یہ صاف گوئی اُن حضرات کو یقیناً بُری معلوم ہوگی جو رجال کو حق سے پہچاننے کے بجائے حق کو رجال سے پہچاننے کے خوگر ہیں۔ اس کے جواب میں چند اور گالیاں سننے کے لیے میں نے اپنے آپ کو پہلے ہی تیار کر لیا ہے۔'' [1]

علّامہ اقبال مرحوم بھی وطنیت کے اُسی معنی و مفہوم کے قائل تھے جس کا تصور اسلام دیتا ہے۔ مثلاً: ؎

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بِنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

علّامہ نے یُوں تو اس بارے میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن اُن کے کلام سے وطنیت کے بارے میں یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں: ؎

اِس دَور میں مَے اور ہے، جام اور ہے، جم اور
ساقی نے بِنا کی روشِ لطف و کرم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی: مسئلہ قومیت، ص ۶۴، ۶۵

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اِس بُت کو ملا دے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اِسی سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اسی سے[1]

اس اسلامی تصورِ وطنیت کے خلاف ٹانڈوی صاحب نعرہ بلند کر رہے تھے کہ "ملتیں اوطان سے بنتی ہیں۔" بھلا ڈاکٹر اقبال جیسا فرد کس طرح خاموش رہ سکتا تھا۔ جواباً یہ اشعار سپردِ قلم کر دیے: ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن ست — چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی ست
بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست[2]

ڈاکٹر اقبال کے مذکورہ اشعار کا گاندھوی حضرات تک پہنچنا کیا ہُوا، گویا بھُس میں آگ لگ گئی، سارا قبیلہ بھڑک اُٹھا۔ ٹانڈوی صاحب اور اُن کے معتقدین نے موصوف کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کر دیا، طول طویل بحثوں کا ایک غیر متناہی سلسلہ جاری ہو گیا۔ اقبال مرحوم ان دنوں بسترِ علالت پر دراز تھے۔ آپ نے ٹانڈوی صاحب کی ایک دو تحریروں کا جواب تو دیا لیکن چاروں طرف سے ہنگامہ آرائی دیکھ کر اِس شعر پر بحث کا خاتمہ کر دیا: ؎

قلندر جز دو حرف لَا اِلٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

اِس موقع پر لاہور سے نکلنے والے اخبار "زمیندار"، کے ایڈیٹر جناب ظفر علی خاں بھی خاموش نہ رہ سکے۔ اُنھوں نے علامہ اقبال کی تائید اور ٹانڈوی صاحب کی تواضع میں مندرجہ ذیل اشعار سپردِ قلم کر دیے: ؎

---

[1] کلیاتِ اقبال، مطبوعہ دہلی، ص ۹۶، ۹۷

[2] محمد اقبال، ڈاکٹر: ارمغانِ حجاز، مطبوعہ لاہور، ص ۲۷۸

حسین احمد مدنی

وطن جس کی رُو سے ہے بنیادِ ملّت   میں اُس شرع کی کر رہا پیروی ہُوں
آہنسا کا فوارہ اُچھلا ہے جس سے   میں اُس زندگانی کی شانِ نوی ہوں
سکھاتا ہے جو ناچنا اور گانا   میں اُس مدرسہ کا بڑا مولوی ہُوں
کبھی میں بھی تھا عازمِ سُوئے یثرب[1]   اب اس عزم کو کر چکا مُلتوی ہُوں
کوئی قادری ہے کوئی سُہروردی   مرا فخر یہ ہے کہ میں گاندھوی ہوں
مجھے لیگ سے اِس لیے دشمنی ہے   وہ عبدالنصاریٰ، میں عبدالقوی ہُوں
برستی ہیں جس سے ترنگی بلائیں   میں اُس عرش پہ آجکل مستوی ہُوں
سمجھ لُوں میں جِنّا[2] کو کیونکر مُسلماں
کوئی میں بھی اشرف علی تھانوی ہُوں

خدا اور رسُول کے احکام بیان کرنے میں ٹانڈوی صاحب کس درجہ محتاط تھے اور فتویٰ نویسی کی شرعی ذمہ داریوں کو نبھاتے وقت خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا کو کہاں تک مدِ نظر رکھا کرتے تھے، اِس کی حقیقت مودودی صاحب کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

"میں صاف کہتا ہُوں کہ اِن کے نزدیک کونسلوں اور اسمبلیوں کی شرکت کو ایک دن حرام اور دُوسرے دن حلال کر دینا ایک کھیل بن گیا ہے، اِس لیے کہ اِن کی تحلیل و تحریم حقیقتِ نفس الامری کے ادراک پر تو مبنی نہیں محض گاندھی جی کی جنبشِ لب کے ساتھ اِن کا فتویٰ گردش کرتا ہے۔"[3]

ٹانڈوی صاحب اینڈ کمپنی کی ہندو نوازی بلکہ زنّار دوستی پر تبصرہ کرتے ہُوئے اِنھیں حضرات کے

---

[1] مدینہ منورہ کو از روئے احادیث "یثرب" کہنا منع ہے، یہاں طَیبہ لکھا جا سکتا تھا۔ (اختر)

[2] مراد مسٹر محمد علی جناح۔ چونکہ اُن کے مخالفین "جِنّا" کہا کرتے تھے، یہاں ٹانڈوی صاحب کی زبان میں جِنّا کہا ہے۔ (چمنستان ص ۱۴۴)

[3] ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی: مسئلہ قومیت، ص ۶۳

خانہ ساز حکیم الامّت بلکہ اِن کے مجدّدِ ملّت بلکہ جامع المجددین صاحب کہلانے والے مولوی اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) اِن حضرات کی گاندھویت کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

> ”جو بات گاندھی کے منہ سے نکل جائے فوراً اُس کو قرآن و حدیث پر منطبق کرنے کی کرتے ہیں۔ اِس تحریک میں کوئی چیز بھی تو ایسی نہیں جو کسی مسلمان لیڈر یا علماٗ کی ہو۔ دیکھیے ہوم رول گاندھی کی تجویز، بائیکات (ترکِ موالات) گاندھی کی تجویز، ہجرت کا مسئلہ اُس کی تجویز، غرض کہ جملہ تجویزیں اُس کی ہیں۔ اِن کا کام صرف یہ ہے کہ جو اُس نے کہا لبّیک کہہ کر ساتھ ہو گئے۔“[1]

مشہور دیوبندی عالم علّامہ شبیر احمد عثمانی (المتوفی ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۴۹ء) کے بھتیجے مولوی عامر عثمانی مدیر ماہنامہ ”تجلی“ اپنے اکابر دیوبند کی زنّار دوستی پر یُوں کُھل کر تبصرہ کرتے ہیں:

> ”پنڈت نہرو کی ہاں میں ہاں ملانے کا سعادت مندانہ فرض بڑے بڑے علماءِ ربانیین (علمائے دیوبند) کو بھی بتقاضائے ”دینی“ ادا کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر پنڈت نہرو کہہ دیں کہ دین اور سیاست کو ایک سمجھنے والے نِرے گدھے ہیں تو علماء ربّانی و حقّانی کی ایک بڑی کھیپ اس پر تصدیقی دستخط کر دے گی اور جو پُرانے خیال کے مولوی و مُلّا دستخط سے گریز کریں گے اُنھیں زندیق و کافر ٹھہرا کر جیل میں بھجوانے کی ترکیبیں کرے گی۔“ ملخصاً[2]

۱۳ر جولائی، ۱۹۵۷ء کو بھارت کے سابق صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے مدرسہ دیوبند کو اپنی تشریف آوری سے نوازا۔ جناب حسین احمد صاحب ٹانڈوی (المتوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء) اُن دنوں دار العلوم دیوبند کے صدر تھے۔ حالات کی ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ جن حضرات کے مذہب میں اہتمام و تداعی اور دن تاریخ کا تعین قطعاً ناقابلِ برداشت اور سراسر بدعت سیئہ بلکہ قابل لوم و حرام و فسق ہے، وہ اپنے اِن جملہ منہیات کو ایک مشرک کی خاطر کس قدر سعادت مندی کے ساتھ

---

[1] اشرف علی تھانوی، مولوی: الافاضات الیومیہ، جلد اوّل، ص ۸۷، ۸۸

[2] ماہنامہ تجلی، بابت فروری و مارچ ۱۹۵۷ء، ص ۳۵

نہ صرف جائز ٹھہراتے بلکہ اِن سب باتوں پر عمل کر دکھاتے ہیں۔ میلاد شریف تو اِن حضرات کی نظروں میں یُوں ناجائز ہے کہ اِس میں سیّد المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حالات و کمالات بیان کیے جاتے ہیں لیکن راجندر پرشاد کے، جو علی الاعلان بُت پرست تھا، اوصاف بیان کرنا اور تعریفی دستاویز یعنی سپاس نامہ ایک منقش صندوقچی میں رکھ کر پیش کرنا معلوم نہیں اِن حضرات کے دین کا پہلا رُکن ہے یا دوسرا؟ نیز میلاد شریف میں قیام تعظیمی تو اِس لیے اِن حضرات کے نزدیک بدعت و حرام بلکہ شرک ہے کہ آقائے دوجہاں، سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعظیم کیوں کی جاتی ہے؟ آخر یہ بیچارے نبی کی تعظیم کو بھی شرک نہ کہیں تو گاندھویت میں اور کس چیز کو شرک ٹھہرایا جائے؟ رہا مشرکوں کی تعظیم کا سوال، بُت پرستوں کے لیے تعظیمی قیام کرنا، نہ صرف خود تعظیمی قیام کرنا بلکہ اپنی ساری علمی ذرّیت سے کروانا، سادہ لباس میں نہیں بلکہ خوش پوش ہو کر، کسی مجمع میں نہیں بلکہ سڑک پر دو رویہ کھڑے ہو کر، سائے میں نہیں بلکہ دھوپ میں، خالی ہاتھ نہیں بلکہ جھنڈیاں اور ماٹو لے کر۔ بھلا اس طرح کسی بُت پرست کے لیے تعظیمی قیام کیا جائے تو اِس کے جواز میں دنیا کے کس مشرک یا زنّار دوست کو کلام ہو سکتا ہے؟ باری تعالیٰ شانہٗ اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے گستاخوں کو دنیا میں بھی کس طرح ذلیل و خوار کر دکھاتا ہے۔ كذالك العذاب ولعذاب الاٰخرة اكبرُ لو كانوا يعلمون ۝[1] اب اِس پہ بھی کوئی نہ سمجھے تو یہ اُس کی عقل کا قصور ہے۔ آیئے اب راجندر پرشاد کے اِس دورے کی کہانی خود علماءِ دیوبند کی زبانی سُنیے:

> ۱۳ جولائی ۱۹۵۷ء کی تاریخ دار العلوم دیوبند میں وُہ تاریخی دن تھا، جب دار العلوم میں عالی جناب ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب بالقابہ نے صدرِ جمہوریہ ہند کی حیثیت سے قدم رنجہ فرمایا...... پروگرام کے مطابق صبح کے آٹھ بجے جب صدرِ جمہوریہ اپنے سیلون سے برآمد ہُوئے تو حضرت مولانا مدنی اور حضرت مولانا طیب صاحب جو سیلون کے دروازے کے قریب کھڑے تھے، آگے بڑھے۔

---

[1] (ترجمہ) اسی طرح عذاب دیا جاتا ہے اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی بڑا ہے، کیا ہی اچھا ہو کہ وہ اس بات کو جانیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اِن حضرات کا تعارف کرایا۔

اوّلاً مولانا مدنی سے پھر حضرت مولانا طیب صاحب مدظلہٗ سے صدرِ محترم نے مصافحہ کیا۔ حضرت مہتمم صاحب (یعنی قاری محمد طیب صاحب) نے صدر کو ہار پہنایا..... آٹھ بجکر دس منٹ پر صدرِ محترم دارالعلوم کے لیے اپنی کار میں روانہ ہُوئے۔ اسٹیشن سے لے کر دارالعلوم تک راستہ خیر مقدم کے لیے بنائے ہُوئے خوشنما دروازوں اور رنگ برنگ کی جھنڈیوں سے آراستہ تھا.....

دیوبند اور قُرب وجوار کے ہزاروں اشخاص سڑک پر دورویہ صدر کے استقبال کے لیے کھڑے ہُوئے تھے۔ دارالعلوم سے تقریباً تین چار فرلانگ کے فاصلے تک طلبائے دارالعلوم کی دورویہ قطاریں کھڑی ہُوئی تھیں۔ ہند اور بیرونِ ہند کے طلبہ کے علیحدہ علیحدہ گروپ بنا دیے گئے تھے، جو متعدد ماٹو لیے ہوئے تھے۔

جب طلبہ کی اِن دلکش قطاروں کے درمیان سے صدرِ محترم کی کار گزرنی شروع ہُوئی تو دیوبند کی فضا استقبالیہ نعروں سے گونج اُٹھی۔ کتب خانہ کے معائنہ کے بعد صدرِ جمہوریہ ٹھیک نو بجے استقبالیہ جلسہ میں شرکت کے لیے پنڈال میں تشریف لے گئے..... عظیم الشان اور حسین پنڈال مختلف گیلریوں میں تقسیم تھا۔ ...... صدرِ محترم نے جونہی ڈائس پر قدم رکھا، پورا مجمع صدر کے احترام میں کھڑا ہوگیا۔ حضرت مولانا مدنی نے صدرِ محترم کو سنہرا ہار پہنایا۔ دارالعلوم کی جانب سے اللہ اکبر، دارالعلوم زندہ باد، صدرِ جمہوریہ ہند زندہ باد اور جمہوری ہندوستان زندہ باد کے نعروں سے صدرِ محترم کا خیر مقدم کیا گیا اور ضلع کے حکّام کی جانب سے سرکاری رسم کے مطابق قومی ترانہ پیش کیا گیا جسے انگریزی اسکول کے بچّوں نے پڑھا۔ ترانہ ختم ہوتے ہی صدرِ محترم اور پورا مجمع بیٹھ گیا اور جلسہ کی کارروائی شروع کی گئی۔

سب سے پہلے دارالعلوم کی جانب سے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے صدرِ محترم کی قدم رنجہ فرمائی کا شکریہ ادا کرتے ہُوئے فرمایا کہ ”آج دارالعلوم

کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو رہا ہے ...... صدرِ محترم ہندوستان کی صرف ایک عظیم شخصیت ہی نہیں بلکہ جنگِ آزادی کے ایک جانباز سپاہی بھی ہیں۔ آج وُہ صدرِ جمہوریہ کی حیثیت سے یہاں رونق افروز ہیں۔ آپ کی قدم رنجہ فرمائی پر ہمیں مسرت ہے اور ہم اس کے لیے شکرگزار ہیں۔

اِس کے بعد تلاوتِ قرآن سے جلسہ کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہُوا.....

نظموں کے بعد حضرت مہتمم صاحب مدظلہٗ نے سپاس نامہ پڑھ کر سنایا، جس میں دارالعلوم کی ..... باطنی روحانیت اور توکل وانابت وغیرہ پر روشنی ڈالتے ہوئے دارالعلوم کی چند ضرورتوں پر صدرِ محترم کی توجہ دلائی گئی۔ صدرِ جمہوریہ کو یہ سپاس نامہ ایک منقش صندوقچی میں رکھ کر پیش کیا گیا۔ جلسہ کے اختتام پر صدرِ جمہوریہ ریلوے اسٹیشن پر تشریف لے گئے۔ دارالعلوم کی جانب سے دوپہر کا کھانا صدرِ محترم کو اُن کے سیلون ہی میں کھلایا گیا۔ حضرت مولانا مدنی مدظلہٗ اور دُوسرے متعدد حضرات کھانے میں شریک تھے۔"[1]

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ صدرِ بھارت ڈاکٹر راجندر پرشاد کے اِس دورۂ دارالعلوم دیوبند کی کہانی ایک فاضلِ دیوبند یعنی علامہ شبیر احمد عثمانی (المتوفی ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء) کے بھتیجے عامر عثمانی صاحب کی زبانی بھی بیان کر دی جائے۔ چنانچہ موصوف اِس واقعہ یا سانحہ کو اپنے الفاظ میں یُوں بیان کرتے ہیں:

"دنیا کی مشہور دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی دعوت پر ۱۳ جولائی کو جمہوری ہند کے صدر جناب ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب تشریف لائے ..... جناب صدر کی آمد سے قبل تقریباً دس روز تک دارالعلوم کے تمام اسٹاف نے جس ذوق و شوق، تن دہی اور دلچسپی سے اپنے معزز مہمان کے استقبال کی تیاریاں کیں اُن کا تفصیلی بیان ایک دفتر چاہتا ہے۔ ہمیشہ عید قربان پر دس بارہ دن کی چھٹیاں

---

[1] ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، بابت ماہ ستمبر ۱۹۵۷ء

ہوا کرتی تھیں لیکن اِس مرتبہ انھیں بھی ختم کرنا پڑا آرڈر جاری ہُوا کہ تمام اسٹاف استقبالی انتظام کی تکمیل میں پوری طرح مصروف رہے..... میرے اپنے کئی اقرباء مدرسہ میں ملازم ہیں۔ اُن میں سے ایک کے ذوق و شوق کا عالم تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ علی الصبح مدرسہ تشریف لے جاتے اور پھر ساری رات تک اُن کا پتہ ہی نہ چلتا۔ جمعہ کے دن دوپہر کا کھانا کھانے بمشکل تین بجے گھر آ سکے۔ جی چاہا کہ پُوچھوں، کیا نمازِ جمعہ کی بھی چھٹی نہیں ملی؟ مگر چُپ ہو رہا کہ کہیں اُس کے مقدس جذبات کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ آخر جمعے تو ہر ساتویں روز آتے ہیں مگر صدرِ جمہوریہ روز روز نہیں آتے۔

جلسے کی شرکت کے لیے انگریزی زبان میں نہایت نفیس دعوت نامے چھاپے گئے تھے..... جلسہ اُس پنڈال میں ہُوا جو ہزار سے زیادہ روپے خرچ کر کے وسیع دارالطلباء میں بنوایا گیا تھا، بہت شاندار، معزز مہمان کی شان کے مطابق۔ سب سے پہلے وطنی ترانہ پڑھا گیا۔ اُس وقت صدر جمہوریہ اور تمام اساتذہ و منتظمین اور پورا مجمع کھڑا تھا۔ ترانے کے آخر تک سب کھڑے تھے اور پھر صدرِ جمہوریہ کی تقلید کرتے ہُوئے بیٹھ گئے۔

اب تلاوتِ قرآن سے جلسہ شروع کیا گیا۔ تلاوتِ قرآن کے وقت کھڑے ہونے کا رواج ہمارے یہاں نہیں ہے، اِس لیے اِس کا مقابلہ ترانے کے آداب سے نہیں کرنا چاہیے..... تلاوت کے بعد نظمیں ہُوئیں..... گلزار صاحب نے نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ بتلایا کہ اگر مولانا مدنی مدظلہٗ دینِ حجازی کے مہبط و مخزن ہیں تو صدرِ جمہوریہ دینِ غیر حجازی کے امام و شیخ۔ ایک ولی ہے تو دوسرا اودھر ماتما۔ دونوں ہی کے فیض و برکت سے جمہوری حکومت اپنے بیش بہا کام سر انجام دے رہی ہے۔

انور صابری صاحب قومی و ملکی خیالات کو جامۂ شعر پہنانے میں جس قدر مشّاق ہیں، وہ مشاعرے سننے والے حضرات سے پوشیدہ نہیں۔ گاندھی جی کی

مظلومانہ موت پر غالباً "باپو شہید" کے عنوان سے جو نظم اُنھوں نے کہی تھی اُس کا مقابلہ اِس موضوع کی شاید کوئی نظم نہیں کرسکی۔ نظموں کے بعد حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم نے سپاس نامہ پڑھا۔ سپاس نامے کے آخر میں امید ظاہر کی گئی ہے کہ "جناب صدرِ جمہوریہ کی قدم رنجہ فرمائی دارالعلوم کی تاریخ کا ایک تابناک نقش ہے، جس پر دارالعلوم کو ہمیشہ فخر رہے گا"...... سپاس نامے کے بعد جناب صدرِ جمہوریہ نے تقریر فرمائی...... اس کے بعد محترم علمأ نے رسمِ شکریہ ادا فرمائی۔ شیخ نے اپنی معروف صاف گوئی کو پُوری طرح قایم رکھا اور فرمایا، ہم غریب ہیں، فقیر ہیں، بے نوا ہیں۔ عالیجناب صدرِ جمہوریہ ...... نے اپنی تشریف آوری سے سرفراز فرماکر ہمیں نہایت درجہ ممنون فرمایا ہے۔

صدرِ محترم جلسہ ختم ہونے پر دیوبند سے روانہ ہوگئے۔ میں نے دیکھا، اُن کی فرّاٹے بھرتی ہُوئی کار کو صرف ایک نظر دیکھ لینے کے لیے سیکڑوں لوگ اِس طرح بھاگ رہے تھے جیسے قرنوں پہلے قیس ناقۂ لیلیٰ کی طرف بھاگا ہوگا۔ کیوں نہ بھاگتے؛ آخر صدرِ جمہوریہ کی کار تھی۔ دارالعلوم نے اپنے محبوب صدر کی آمد پہ ہزاروں روپیہ خرچ کیا...... جناب صدر نے اپنی جیب خاص سے نقد ایک ہزار روپیہ مدرسہ کو عنایت کیا۔ چنانچہ اگلے روز جناب مہتمم صاحب نے نہ صرف یہ کہ کامیابی کی مٹھائی تقسیم فرمائی بلکہ جلسۂ عام میں جنابِ صدر کی خوش اخلاقی، فراخ نظری، روحانیت، شفقت، جود و سخا، انسانیت پروری، حلم و رافت اور بندہ نوازی کو بڑے وزنی ...... الفاظ میں بہت مسرّت اور دلی جوش کے ساتھ سراہا۔" ملخصاً[1]

مشہور دیوبندی شاعر، اخبار نویس، ادیب، مقرر، لیڈر اور روزنامہ "زمیندار" کے ایڈیٹر جناب ظفر علی خاں نے شاید اِسی قسم کے ہندو نوازی اور زنّار دوستی کے واقعات سے متاثر ہو کر یہ شعر کہے تھے کہ: ؎

---

[1] ماہنامہ تجلی، بابت اگست ستمبر ۱۹۵۷ء

کیا پُوچھتے ہو ہند میں دینِ ہدیٰ کا حال
ویراں ہے خانقاہ تو مسجد ہے پائمال
خود عالمانِ دین بھی پھنسے اُس کے جال میں
جس کا نہیں ہے توڑ، وہ ہے کانگرس کی چال
کافر بھی مومنوں کے اولوالامر بن گئے
کل تک جو تھا حرام، ہوا آج سے حلال
لذّت تھی جن کے خوان کی عجلِ حنیذ سے
ہے آجکل پسند انھیں کیوٹی کی دال
چھوڑا جہاد کو اور اہنسا کیا قبول
جو شیر تھے پہننے لگے لومڑی کی کھال
اسلام کے چمن میں صنم ہر دوار کے
پھرتے ہیں پات پات، پھدکتے ہیں ڈال ڈال
قرآں کے ترجمان ہیں کیوں بُت کی طرح چُپ
حالانکہ ہے مدینہ کے ناموس کا سوال
کیا انقلاب ہے کہ اساطینِ شرع کو
دم مارنے کی گاندھی کے آگے نہیں مجال
کچھ جانتے بھی ہو کہ ہیں کیوں آج ہم ذلیل
ھم پر ہمارے اِن علماء کا پڑا وبال[1]

ٹانڈوی صاحب کے سیاسی نظریات کا اسلام سے کہاں تک تعلق تھا؛ ہنود کی محبت میں وُہ کس درجہ سرشار ہو چکے تھے، یہ حکیم محمود احمد برکاتی کی زبانی سُنیئے:

"مولانا حسین احمد مدنی کی قوتِ فیصلہ کے متعلق ہم اچھی رائے نہیں رکھتے۔ اُنھوں نے مدت العمر کسی بھی سیاسی مسئلے میں اصابتِ رائے کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔ اُن کا اندازِ فکر منطقی نہیں جذباتی تھا۔ انگریز کی دشمنی میں وُہ حدودِ اعتدال سے تجاوز کر گئے تھے اور استخلاصِ وطن کے لیے وُہ ہندو قوم سے غیر مشروط اتحاد کے قائل تھے اور اِس سلسلے میں اِس حد تک بڑھ گئے تھے کہ اشتراکِ وطن کی بنیاد پر مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک قوم فرمانے لگے تھے۔ وطنی قومیتِ متحدہ کی تبلیغ کو اُنھوں نے اپنے مشن کا ایک جزء بنا لیا تھا اور شہر شہر اس کی تبلیغ کرتے پھرتے تھے۔ زبان و قلم کا پورا زور اِس متحدہ قومیت کی حمایت میں صرف فرماتے تھے، یہاں تک کہ ایک بار دہلی میں اُنھوں نے یہ گمراہ کن اور نہایت

---

[1] ظفر علی خاں: چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۱۳۱

غلط بات نہایت زور کے ساتھ فرمائی کہ: "اقوام اوطان سے بنتی ہیں"۔[1]

مولانا معین الدین اجمیری (المتوفی ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء) کی آزادیِ ہند کے سلسلے میں سیاسی جدوجہد کے بارے میں علامہ سلیمان ندوی (المتوفی ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء) نے یُوں تصریح فرمائی:

> "تحریکِ خلافت میں مذہبی فتوے کے جرم میں دو سال کی قید و بند کو اِس پامردی اور عالی ہمتی سے برداشت کیا کہ علی برادران (مولانا شوکت علی و مولانا محمد علی جوہر) نے قدم چُوم لیے۔ جس زمانۂ ابتلاء میں مولانا کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلماء اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ العلماء قید و نظر بندی کی تکلیفیں اُٹھا رہے تھے، اُس وقت تحریک کی رہنمائی کے لیے آپ ہر ہفتہ دہلی تشریف لے جاتے اور جامع مسجد میں نمازِ جمعہ کے بعد مسائلِ حاضرہ پر تقریر فرماتے۔ جمعیۃ العلماء کے اجلاسِ امروہہ کی صدارت فرمائی اور مستقل نائب صدر رہے۔ صوبہ راجپوتانہ کی مجلسِ خلافت کو آپ کی صدارت کا ہمیشہ فخر حاصل رہا۔ تحریکِ کشمیر کے زمانہ میں مجلسِ احرارِ اسلام کے ڈکٹیٹر رہے۔ مسلمانوں کے سوا برادرانِ وطن (ہنود) بھی آپ کی سیاسی بصیرت کے معترف اور اِس سے متاثر تھے۔"[2]

گاندھوی علماء جس زمانے میں کُھل کر متحدہ قومیت کے مبلّغ بنے ہوئے تھے۔ اُن کے نزدیک مسلم اور کافر ایک ہی قوم کے افراد تھے اور اِس طرح اِسلامیانِ ہند کو ہندو اکثریت میں مدغم کرنے پر اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لا رہے تھے، اُن دنوں مولانا معین الدین اجمیری مسلمانوں کو یُوں تلقین فرما رہے تھے:

> "مسلمانوں کے لیے یہی راہِ عمل ہو سکتی ہے کہ وہ آزادی کے لیے متفقہ طور پر میدان میں آئیں، مگر کانگرس میں شامل ہو کر نہیں، ہندوؤں کا ضمیمہ بن کر نہیں بلکہ جمعیۃ العلمائے ہند برطانیہ کے خلاف جنگ کا جو پروگرام تیار کرے، اُس پر

---

[1] محمود احمد برکاتی، حکیم: معین المنطق، مطبوعہ کراچی، ص ۹۳

[2] سلیمان ندوی، مولوی: معین المنطق، ص ۷، ۴

عمل کریں۔ یعنی برطانیہ کے خلاف آزادی کی جدوجہد تو نصب العین ہے، اس کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے مگر یہ جدوجہد گاندھی کی قیادت میں اور کانگرس کے جھنڈے تلے نہیں بلکہ خود اپنی تنظیم اور جمعیت کی نگرانی اور رہنمائی میں۔“[1]

اور مولانا اجمیری کی بتائی ہُوئی اپنی تنظیم یعنی جمعیۃ العلماء ہند کا حال بھی حکیم محمود احمد برکاتی کی زبانی سُن لیجیے کہ یہ مسلمانوں کی کیسی رہنمائی کر رہی تھی اور کس قسم کی آزادی اس جمعیت کا مطمحِ نظر تھا۔ وہ لکھتے ہیں؛

> علمائے دیوبند میں سے مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے سیاسی کردار کو ہم نے اِس لیے موضوعِ گفت گو بنایا کہ جمعیۃ العلماء کی صدارت سب سے طویل عرصہ تک مولانا ہی نے فرمائی تھی اور ۱۹۴۰ء کے بعد سے تو وُہ اپنی وفات تک مستقلاً و بلا انقطاع صدرِ جمعیۃ رہے۔ اس لیے جمعیۃ کی پالیسی کی تبدیلی میں اُن کا سب سے زیادہ دخل تھا اور یہ مولانا مرحوم کا کارنامہ تھا کہ رفتہ رفتہ جمعیۃ علماء ہند مسلمانوں میں اِس قدر نامقبول بلکہ بالفاظِ صحیح تر مغضوب ہوگئی تھی کہ ۱۹۴۶ء کے معرکہ آراء اور فیصلہ کن انتخابات میں خاص سہارن پور کی سیٹ سے نیشنلسٹ مسلمانوں کا نمایندہ کامیاب نہ ہو سکا اور شہیدِ ملت خان لیاقت علی خاں نے اپنے قوم پرست حریف کو اُس کے مرکز میں عبرت ناک شکست دی۔ حد یہ ہے کہ تقسیم کے بعد اور مسلم لیگ کے راستے سے ہٹ جانے کے باوجود آج بھی جمعیۃ بھارت کے عوام وخواص کی قیادت کی اہل نہیں مانی جاتی۔“[2]

اب ٹانڈوی صاحب کے دستِ راست مولوی حفظ الرحمان سیوہاروی کا حال مولوی محمد میاں صاحب کی زبانی ملاحظہ فرمائیے؛

> ”مولانا حفظ الرحمٰن صاحب قیامِ پاکستان کے دیانت داری سے مخالف تھے

---

[1] محمود احمد برکاتی، حکیم: معین المنطق، ص ۸۹

[2] ایضاً: ص ۹۴، ۹۵

مگر، ۱۹۴۷ء کے بعد اُنھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی جو گرانقدر خدمات انجام دیں، وہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ اِن خدمات نے اُن کو اُمتِ مسلمہ کے اُن افراد کی صف میں لا کھڑا کر دیا ہے کہ جن کی ذات پر پوری اُمتِ مسلمہ کو فخر ہے اور وہ تاریخِ اسلام کے اکابر کی فہرست میں شامل ہو گئے ہیں۔"[1]

اگر یہاں موصوف کے ہی لفظوں میں اِس امر کا بھی اظہار کر دیا جائے کہ مولوی حفظ الرحمٰن نے جو مسلمانانِ ہند کی آبِ زر سے لکھنے کے قابل گرانقدر خدمات انجام دی تھیں، وہ کیا ہیں؛ نیز موصوف پر کونسی اُمتِ مسلمہ کو فخر ہے اور وہ کونسے اکابر کی صف میں شامل ہوئے تھے، تو میرا خیال ہے کہ قارئین کرام بھی اِس امر کے متمنّی ہوں گے۔ وضاحت ملاحظہ ہو:

"مجاہدِ ملّت (مولوی حفظ الرحمٰن صاحب) کا حُسنِ تدبر تھا کہ آپ نے اپنے پرانے تعلقات کو ازسرِ نو تازہ ہی نہیں کیا بلکہ اُن کو پختہ کر کے ایسا اعتماد حاصل کر لیا کہ گاندھی جی حکومت کے سربراہوں اور کانگرس کے بڑے ہندو لیڈروں پر بھی اتنا اعتماد نہ کرتے تھے جتنا مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور اُن کے ساتھیوں پر۔ ۹ ستمبر، ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچے تو فرقہ پرستوں نے اُن کی اِتنی مخالفت کی کہ اُنھیں اپنی پرارتھنا کی مجلسوں میں ترمیم کرنا پڑی۔ مجاہدِ ملّت جو فرقہ پرستی کے خلاف نبرد آزما تھے، گاندھی جی کے دستِ راست بن گئے۔

مجاہدِ ملّت کو سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی کی رفاقت و معیت حاصل تھی۔"[2]

یہ بات اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ گاندھوی علماء کی پوری کھیپ اسلام اور کفر کے فرق کو فرقہ پرستی کہتے تھے۔ ابو الفضل اور فیضی کی طرح اِس چودھویں صدی میں اُن حضرات کے خلاف نبرد آزما رہے جو یہ کہتے تھے کہ اسلام اسلام ہے اور کفر کفر ہے، اسلام اور کفر کا ملاپ اجتماعِ ضدین ہے۔ اِن حضرات کا پیدا کردہ وہ گاندھوی ٹولہ اکبری دینِ الٰہی ہی کا ترمیم شدہ اور جدید

---

[1] عبد الرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۹۲۱

[2] ایضاً: ص ۹۲۸

ایڈیشن تھا، جس کو کامیاب بناکر گاندھی کو خوش کرنے میں ہر گاندھوی عالم دوسرے سے سبقت لے جانے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ اِن حضرات کی ساری قابلیتیں اور توانائیاں اِسی مقصد کے لیے وقف تھیں، لیکن جس طرح اکبر کے دینِ الٰہی سے ہندو مت کو نقصان کی بجائے زبردست فائدہ پہنچا کہ مسلمانوں کو جو کفر سے نفرت ہوتی ہے اُس کی شدت میں کمی آگئی اِسی طرح گاندھویت کی نحوست نے بھی مسلمانوں کو مشرکوں اور بُت پرستوں کے قدموں میں ڈال کر، اُنھیں بُت فروش بنانے کا فرض ادا کیا جنھیں کبھی اپنے بُت شکن ہونے پر ناز ہُوا کرتا تھا۔ شاید اقبال مرحوم نے اِسی لیے فریاد کی تھی کہ: ؎

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچّوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

مولوی حفظ الرحمٰن صاحب نے ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء میں وفات پائی۔ موصوف چونکہ گاندھویت کے ایک عظیم رُکن تھے اسی لیے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے جو گاندھی جی کے فلسفہ پر خلوصِ دل سے ایمان لائے ہُوئے تھے اور اُنھیں کے اصولوں کو اپنا ضابطۂ حیات سمجھتے تھے، اُس وقت اُنھوں نے بھارت کا صدر ہونے کی حیثیت میں سیوہاروی صاحب کی وفات پر تعزیت کرتے ہُوئے موصوف کے بارے میں یُوں فرمایا تھا:

> "مولانا مرحوم کی سیاسی زندگی ۱۹۱۹ء سے شروع ہُوئی۔ اُنھوں نے خلافت اور سوراج (اکھنڈ بھارت) کی تحریکوں میں حصّہ لیا اور متحدہ قومیت (یعنی مسلمان اور ہندو ایک ہی قوم ہیں) اور حریت و آزادی کے پیغام کے ساتھ اپنی زندگی کو وابستہ کیا اور یہ وابستگی آخر دم تک برقرار رہی۔" ملخصاً[1]

ڈاکٹر راجندر پرشاد جو ڈاکٹر ذاکر حسین سے پہلے بھارت کے صدر تھے، موصوف کی وفات پر تعزیت کرتے ہُوئے اِن الفاظ میں سیوہاروی صاحب کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہیں:

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۹۵۶

"حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم، جمعیۃ العلماءِ ہند کے ایک بلند پایہ رُکن تھے۔ ہماری قومیت کی ایک چمکتی مثال تھے اور میرے اُن عزیز دوستوں میں سے تھے جن کے ساتھ بارہا کام کرنے کا مجھے اتفاق ہُوا تھا۔" ملخصاً [1]

بھارت کے وزیر اعظم، پنڈت جواہر لال نہرو نے موصوف کو اپنے تعزیتی پیغام میں یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

"مولانا کے انتقال سے مجھے بڑا دُکھ ہُوا ہے ..... ہم لوگ شروع میں دونوں یو۔ پی۔ کانگرس کمیٹی کے ممبر تھے۔ اکثر ملا کرتے تھے۔ چھوٹی کونسل کے ممبر بھی رہے۔ ..... اہم مواقع پر ملنے جلنے اور بات کرنے سے ایک دوسرے کو خوب سمجھنے لگے تھے۔ میرے دل میں اُن کی بہت قدر تھی۔ وہ بہادر سپاہی تھے۔ بہادر نیتا تھے۔ جو کہتے تھے اُس میں وزن ہوتا تھا۔ اُن کی بات غور طلب ہوتی تھی۔ ایسے آدمی تھے کہ پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں مدد کرتے تھے۔" ملخصاً [2]

مسٹر لال بہادر شاستری جو پنڈت جواہر لال نہرو کے بعد بھارت کے وزیر اعظم بنے اور ۱۹۶۲ء میں موصوف کی وفات کے وقت ہوم منسٹر تھے۔ انھوں نے ٹاؤن ہال دہلی کے تعزیتی جلسے میں تقریر کرتے ہُوئے کہا:

"ابھی ابھی کچھ لوگوں نے کہا کہ مولانا (حفظ الرحمٰن سیوہاروی صاحب) گاندھی جی کے اصولوں پر چلتے تھے۔ گاندھی جی اِس ملک میں آئے۔ اُنھوں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑی۔ اُن کے ساتھ مِل کر، اُن کے بتائے ہوئے اصولوں کو اپنا کر، اُن پر چل کر بہت سے لوگ لیڈر بن گئے۔ چھوٹے چھوٹے آدمی لیڈر بن گئے۔ اُن کا ڈھنگ، اُن کا طریقہ ایسا ہی تھا۔ لیکن میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہُوں اور وہ یہ کہ لیڈر دولت سے نہیں بنتا، بہت سا

---

[1] عبد الرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۹۵۷

[2] ایضاً: ص ۹۵۸

پڑھ لکھ جانے سے نہیں بنتا، حکومت کا وزیر بن جانے سے نہیں بنتا، لیڈر تو پیدا ہوتا ہے اور مولانا (سیوہاروی صاحب) ایسے ہی لیڈر تھے۔ ابھی آپ نے سُنا کہ مولانا شروع ہی سے لوگوں کی خدمت کے کاموں میں حصّہ لیتے تھے، تو اُن میں وہ بات شروع ہی سے تھی جو ایک پیدائشی لیڈر میں ہوتی ہے" ملخصاً[1]

گاندھوی امام الہند کے کارنامے

جناب ابوالکلام آزاد (المتوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء) اِس گاندھوی قبیلے کی ممتاز و منفرد ہستی تھے۔ موصوف کی گاندھویت کے بارے میں مولوی شریف الحسن ناظر لکھنوی نے یوں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

"ہندوستان کی سیاست کے اِس انقلابی دَور میں حضرت مولانا کی پہلی ملاقات مہاتما گاندھی سے ۱۸ر جنوری ۱۹۲۰ء کو دہلی میں ہُوئی۔ جہاں مسئلہ ترکی و خلافت کے متعلق وائسرائے سے گفتگو کرنے کے لیے تمام ممتاز ہندو مسلمان لیڈر جمع ہُوئے تھے۔ اِس موقع پر آنجہانی تِلک بھی موجود تھے اور وہی دن تھا جب مولانا اور گاندھی جی کے درمیان محبّت اور خلوص کا ایک ایسا رشتہ قائم ہوا جو گاندھی جی کے آخری دم تک قایم رہا۔

یہ پہلی ملاقات ہندوستان کی تاریخ میں اِس لیے بھی بہت بڑی اہمیت رکھتی تھی کہ لیڈروں کے اِس اجتماع میں پہلی مرتبہ مہاتما گاندھی کے اصولوں کو قبول کرلیا گیا۔ البتّہ وائسرائے سے ملاقات کرنے کی تجویز سے مولانا نے اختلاف کیا۔ وہ گفت و شنید اور عرض و معروض کے قدیم طریقوں سے بہت بیزار تھے اور اِس لیے اُس مجلس میں اُنھوں نے اپنے اِس خیال پر زور دیا کہ کسی وفد کا وائسرائے کے پاس جانا فضول ہے۔ البتّہ وُہ پہلے مسلمان لیڈر تھے جنھوں نے اِس

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۹۵۹

تاریخی اجتماع میں گاندھی جی کے پروگرام کی پُوری پُوری تائید کی۔ اُس وقت دُوسرے مسلمان لیڈر جو مولانا کے ہمخیال تھے، حکیم اجمل خاں مرحوم تھے"۔ ملخصًا[1]

گاندھویت کے علمبرداروں میں موصوف سب سے قدآور ہیں۔ موصوف نے اکبری دور کے ابوالفضل کا حقیقی جانشین بن کر مسلمانانِ ہند کو مشرکوں اور بُت پرستوں کا حقیقی بھائی بنا دینے، کفر و اسلام اور بُت پرست و بُت شکن کا فرق مٹا دینے کی غرض سے اور اِس طرح دانستہ یا نادانستہ بھولے بھالے مسلمانوں کو ہندوؤں میں مدغم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ گویا حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کی مساعیِ جمیلہ کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے اور ابوالفضل و فیضی وغیرہ کے ناپاک مشن کو از سرِ نو زندہ کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اِس نظریہ کی علمبرداری کرتے ہوئے یوں اسلامیانِ ہند کو تلقین کرتے ہیں :

> "میں مسلمانوں سے خاص طور پر دو باتیں کہوں گا، ایک یہ کہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ پُوری طرح متفق رہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک بھائی یا کسی ایک جماعت سے کوئی بات نادانی کی بھی ہو جائے تو اُسے بخش دیں اور اپنی جانب سے کوئی بات ایسی نہ کریں جس سے اِس مبارک اتحاد کو صدمہ پہنچے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مہاتما گاندھی پر پوری طرح اعتماد رکھیں اور جب تک وہ کوئی ایسی بات نہ چاہیں جو اسلام کے خلاف ہو، اُس وقت تک پُوری سچائی اور مضبوطی کے ساتھ اُن کے مشوروں پر کاربند رہیں"۔[2]

یہ الگ بات ہے کہ ابوالکلام صاحب ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء سے رجسٹرڈ گاندھوی بنے تھے لیکن ماضی قریب کے ابوالفضل اپنے زمانۂ "الہلال" ہی سے ہندو نواز اور زنار دوست تھے۔ موصوف کا یہ رجحان اُن کے دل کی کوٹھڑی میں ہی بند نہیں تھا بلکہ "الہلال" کے ذریعے بھی وہ ہندو دوستی اور متحدہ قومیت کی زور شور سے تبلیغ کر رہے تھے اور علی گڑھ کے برٹش نوازوں

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۷۲۹

[2] ایضاً: ص ۷۳۲

پر بھی وار کرتے رہتے تھے مولوی شریف الحسن ناظر لکھنوی اِس امر کی وضاحت یُوں کرتے ہیں:

"الہلال مسلمانوں کے کسی مکتبِ خیال سے متفق نہ تھا۔ وُہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہموطنوں کو دے رہا تھا۔ وہ پہلے ہی دن سے ہندوستان کی ایک متحدہ قومیت کا علمبردار تھا۔ اُس کی دعوت سے ہندوستان کا اسلامی ذہن اُس وقت تک بیگانہ تھا۔ مولانا نے قدامت پسندی کے مخالف قومیت کے قلعہ پر حملہ کیا لیکن بخطِ مستقیم نہیں بلکہ ایسے افکار کی اشاعت کر کے جنھوں نے علی گڑھ کی بنیاد کو ہلا دیا۔" [1]

موصوف کے بارے میں زمانۂ قریب کی نامور شخصیت یعنی خواجہ حسن نظامی دہلوی مرحوم کے تاثرات بھی ملاحظہ فرمائیے:

"۱۹۰۸ء میں مسٹر زاہد سہروردی کے مکان پر اُنھوں نے حسن نظامی کے ایک کاغذ پر یہ لکھا تھا "سب باتیں منظور ہیں باستثنائے شرکتِ مسلم لیگ"۔ گویا ۲۴ سال پہلے بھی وہ مسلم لیگ سے اُتنے ہی بیزار تھے جتنے آجکل ہیں . . . . . اگر مولانا ابوالکلام کو ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا جائے تو وہ اکبرِ اعظم کی طرح ہر قوم میں مقبول ہوں گے . . . . بہرحال مولانا آزاد موجودہ ہندوستان کے لیے سیاسی سورج ہیں اور سیاسی چاند ہیں۔" [2]

موصوف کے سیاسی عزائم و زنّار دوستی کے پیشِ نظر، اُن سے ظفر علی خاں یُوں گویا ہوئے تھے:

بوالکلام آزاد سے یہ پوچھتے ہیں دِل جلے — آجکل تم پیشوائے اُمتِ مرحوم ہو
کیا خطا کوئی بھی سرزد تم سے ہو سکتی نہیں — تم بھی کیا پاپائے روما کی طرح معصوم ہو
نہرو گاندھی کے دل کا حال تم جانو اگر — پھر ذرا تم کو بھی قدرِ عافیت معلوم ہو
کٹ کے اپنوں سے ملے ہو جا کے تم اغیار سے — پھر یہ کہتے ہو کہ ہم ظالم ہیں تم مظلوم ہو

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۲۴۷

[2] ایضاً: ص ۱۵۷

ہم مسلماں ہیں، جو ہیں اوجِ سعادت کے ہُما   آئیں اُس کے سایہ میں ہم کس طرح جو بُوم ہو
تم یہ کہتے ہو کہ مسلم لیگ ہے رجعت پسند   تم کہاں کے ہٹلرِ وقت اے مرے مخدوم ہو
کیا تماشا ہے کہ نہرو ہو ہمارا ترجماں   اور غلامی کفر کی اسلام کا مقسوم ہو
کیا تماشا ہے کہ ہم گاندھی کے آگے سر جھکائیں   کیا قیامت ہے کہ جو حاکم ہے وہ محکوم ہو
اے خدا راہِ ہدایت اُس مسلماں کو دکھا
غیرتِ اسلام کی دولت سے جو محروم ہو[1]

جناب ابوالکلام آزاد اِس گاندھوی قبیلے میں اِتنے قد آور، رکھ رکھاؤ کے اور قابلِ احترام تھے کہ کانگریس کے بڑے سے بڑے رُکن سے اختلاف بھی کر سکتے تھے۔ راج گوپال اچاریہ، راجندر پرشاد، پنڈت مدن موہن مالوی اور پٹیل جیسے حضرات کی کیا گنتی جب کہ وہ پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی خاطر میں نہیں لایا کرتے تھے۔ دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ بار ہا اُن کی رائے گاندھی کی رائے سے مختلف رہی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کئی دفعہ کانگریس کے بڑے بڑے ہندو لیڈروں کو گاندھی سمیت اُن کی رائے کے آگے جُھک جانا پڑا۔ اِس سے صاف واضح ہے کہ وہ گاندھوی صنم خانہ جس میں گاندھی کی پُوجا ہوتی تھی، وہاں ہندو ہوں یا مسلمان کہلانے والے سب اسی بُت کے آگے سجدہ ریز تھے اور "جی حضوری" کی منزل سے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے لیکن اِس پورے جمگھٹے میں صرف دو ہستیاں ایسی نظر آتی ہیں، جن کی اپنی رائے ہوتی تھی اور جو ہر بڑی سے بڑی ہستی سے اختلاف کرنے کی پوزیشن میں تھے اور اُن کے اختلاف کو نظر انداز کر دینے کی اُس قبیلے میں جرأت نہیں ہُوا کرتی تھی۔ اُن دو ہستیوں سے میری مراد ایک کانگریس کے سابق صدر سبھاش چندر بوس اور دوسرے سابق صدرِ کانگریس جناب ابوالکلام آزاد ہیں۔ چنانچہ موصوف کی اِسی انفرادیت کے بارے میں رئیس احمد جعفری ندوی یُوں رقم طراز ہیں:

"ہر خطیب اور انشا پرداز، مدبّر اور سیاست دان "انا" کے مرضِ میں گرفتار

---

[1] ظفر علی خاں، چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۹۲

ہوتا ہے۔ لیکن مولانا کی انانیت سب سے مختلف تھی۔ دوسروں کا "انا" زیادہ تر رکیک اور مبتذل ہوتا ہے، خواہ وہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن مولانا کے "انا" میں ہمالہ کی رفعت تھی، اتنا موٹا اور چوڑا چکلہ "انا" صرف مولانا کا حصہ تھا۔ غالب کے سوا اس باب میں اِن کا کوئی حریف نہیں اور غالب بھی اس لیے پیچھے رہ جاتے ہیں کہ اُن کی زندگی کا حلقہ محدود تھا، اُسی حلقہ میں وہ اپنے "انا" کا ڈنکا بجاتے رہے۔ لیکن مولانا ادیب بھی تھے، انشاپرداز بھی تھے، صحافی بھی تھے، خطیب بھی تھے، عالمِ دین بھی تھے، سیاست دان بھی تھے، نیشنلزم کے حلقہ میں بھی موجود تھے جہاں ایک سے ایک گھاگھ موجود تھا۔ لیکن وہ ادیبوں کی محفل ہو یا انشاپردازوں کا مجمع، صحافیوں کا جمگھٹ ہو یا خطیبوں کی مجلس، سیاست کا پلیٹ فارم ہو یا نیشنلزم کا اسٹیج، علمائے کرام کی جمعیت ہو یا صوفیائے عظام کا زاویہ۔ اِس شخص کا "انا" کہیں بھی امام الہند، رئیس التحریر اور رب الارباب سے کم پر قناعت نہیں کرتا۔

جس طرح عشق چھپائے نہیں چھپتا اور ذرا سی بے احتیاطی میں معاملہ "پابدستے دگرے دست بدستِ دگرے" تک آجاتا ہے، اسی طرح "انا" نے بھی نہ جانے کتنے یگانۂ روزگار لوگوں کے بیڑے ڈبو دیے، جن کی قابلیت، ذہانت، فراست، علم، فضل، ہر چیز شک و شبہ سے بالاتر تھی، "انا" کے کثرتِ استعمال نے اُنھیں کہیں کا نہ رکھا یا نقلِ محفل بنا دیا ورنہ پھر سامانِ تفریح۔ لیکن مولانا کے "انا" کا یہ وصف تھا کہ استعارہ اور کنایہ سے بے پروا وہ مجسم "انا" بن گئے تھے لیکن اُن کے اِس "انا" میں وہ دلکشی، وہ جاذبیت، وہ سحر ہے کہ طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ محسن الملک ہوں یا وقار الملک، حالی ہوں یا شبلی، موتی لال نہرو ہوں یا گاندھی جی، محمد علی ہوں یا شوکت علی، عمر میں سب سے چھوٹے، لیکن "انا" کے پیمانے سے ناپیے تو: ؏

طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

کانگریس جیسے ادارہ میں جہاں گاندھی جی کی پوجا ہوتی تھی، جہاں موتی لال، جواہر لال اور سردار پٹیل کا طوطی بولتا تھا، جہاں نیشنلزم کے دعوے کے باوجود مکمل طور پر کمیونلزم (فرقہ پرستی) کی کارفرمائی تھی۔ جہاں محمد علی (جوہر) کا چراغ نہ جل سکا، جس نے گاندھی کو گاندھی بنایا تھا۔ جہاں شوکت علی کا بھرم قایم نہ رہ سکا جس کی قوتِ عمل نے کانگریس کو صحیح معنی میں ہندو مسلم اتحاد کا نشان (SYMBOL) بنادیا تھا۔ جہاں سے اجمل خاں جیسے مردِ حکیم و حلیم کو دل برداشتہ ہوکر نکلنا پڑا، وہاں ابوالکلام نامی ایک شخص کا اپنے قد آور اور بلند و بالا "انا" سمیت زندگی کی آخری سانس تک موجود رہنا کانگریس کا نہیں ابوالکلام کا کمال تھا۔"[1]

جناب رئیس احمد جعفری نے یوں تو اپنے امام الہند یعنی ابوالکلام آزاد کی شخصیت کے عجیب و غریب پہلو بھی ظاہر کردیے، موصوف کی انانیت کو تفصیلاً بیان کرنے کی زحمت اٹھائی لیکن یہاں پورے طور پر بیان نہ کر پائے تھے۔ اِسی لیے اِس کمی کو کتاب کے اختتامی صفحات پر "حرفِ آخر" کے تحت یوں پورا کرتے ہیں:

"اِن کا "انا" سمندر کی طرح گہرا، ہمالیہ کی طرح اونچا اور چاند کی طرح خوبصورت تھا۔ لوگ اپنے "انا" کو سات پردوں میں چھپاتے ہیں لیکن پکڑے جاتے ہیں۔ وہ سر جھکاتے ہیں، منہ بناتے ہیں، اپنے لیے غلام، خادم، ہیچ میرز، خاکسار، ذرّۂ بے مقدار، ننگِ اسلاف، بندۂ عاصی اور اسی طرح کے بہت سے لاحقوں کے ساتھ "انا" کی پردہ پوشی کرتے ہیں، لیکن وہ ایک جرم کی طرح ظاہر ہو ہی جاتا ہے۔ کوئی پوچھے یہ کیا ہے؟ تو چھپائے نہ بنے۔ لیکن مولانا کا "انا" بے پردہ ہے، بے پروا ہے، خودسر ہے، خودبیں ہے، معزز ہے، متکبر ہے۔ لیکن نہایت دلکش۔ اُس میں جلال و جمال کی ایسی آمیزش ہے کہ اس کی "انا" کی غلطیاں اور کوتاہیاں بھی دل کا دامن اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

---

[1] رئیس احمد جعفری ندوی: آزادیِ ہند، مطبوعہ پنجاب پریس لاہور، باب چہارم، ۱۹۶۵ء، ص ۲۳۶، ۲۳۷

> جس کانگریس میں گاندھی جی اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلیٰ کا نعرہ لگاتے ہیں اور سب سربسجود ہو جاتے ہیں، جس میں جواہر لال کی زبان گاندھی جی کو "باپو" کہتے کہتے سُوکھتی ہے، جس کے سامنے راجگوپال اچاری جیسا منجھا ہوا سیاستدان سر کے بل حاضر ہوتا ہے اور پٹیل اور راجندر پرشاد جیسے لوگوں کے سامنے اگر وہ دن کو رات کہتا ہے تو یہ "اینک ماہ و پروین" کا نعرہ لگانے لگتے ہیں، جس کے سامنے کانگریس کے بڑے بڑے نیتا، مہاسبھا کے لیڈر، جن سنگھ کے رہنما، گورنر جنرل اور وائسرائے ہند، برطانیہ کابینہ کے وزراء، برطانیہ کا وزیر اعظم، جمعیۃ العلماء ہند کے علمائے کرام سرِ نیاز خم کرتے ہیں، وہاں ابوالکلام کہتا ہے، "میں" اور اِس "میں" کا بانکپن سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ اُس کا "میں" گاندھی جی کو مہاتما نہیں کہتا، جواہر لال کو پنڈت جی نہیں کہتا، راجندر پرشاد اور پٹیل کو ذرۂ بے مقدار سمجھتا ہے۔ اُس کا "انا" بڑے سے بڑا اعزاز جو گاندھی سے لے کر جواہر لال تک کو دے سکا، وہ شریکِ کار (COLLEAGUE) کا لفظ تھا۔"[1]

جعفری صاحب سمندر کی تہہ سے ہمالیہ کی چوٹی تک، جمعیۃ العلمائے ہند کے علماؤں سے کانگریسی نیتاؤں تک، نجی مجلسوں سے سیاسی اکھاڑوں تک اور ننگِ اسلاف سے گاندھویوں کے ماڈرن فرعون تک، وہ کونسی جگہ ہے جہاں نہیں گئے؛ وہ کونسا فرد ہے جس سے نہ ملے؛ وہ بھارت کی کونسی ہستی ہے جس کا وزن نہ جانچا، وہ کونسی رائے ہے جس کا بانکپن نہ دیکھا؛ وہ کونسی خوبصورتی ہے جس کی دلکشی نظر نہ آئی اور وُہ کونسی گاندھوی قبیلے کی کمزوری ہے جو اُن کے احاطۂ نظر میں نہ آسکی ہو۔ لیکن اِس سعیِ بلیغ کے باوجود جس چیز کی وسعت کا، رفعت کا، گہرائی کا، طاقت کا، جسامت کا، جعفری صاحب احاطہ نہ کر سکے۔ وُہ ہے جنابِ ابوالکلام آزاد کی "انا"۔ اِسی لیے اتنی مغز کھپائی کرنے کے باوجود آگے سراپا استفسار بن کر یُوں رقمطراز ہیں:

> "ساری کتاب (INDIA WINS FREEDOM)[2] پڑھ جائیے، معلوم ہوگا

---

[1] رئیس احمد جعفری ندوی: آزادیِ ہند، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۴۸۳، ۴۸۴

[2] مصنفہ ابوالکلام آزاد۔ آزادیِ ہند اُسی کا ترجمہ و تحشیہ ہے نیز جعفری صاحب نے تبویب بھی اپنے انداز پر کی ہے۔ اختر

کانگرس کے تمام اہم فیصلے "انا" کی طبعِ رسا کا نتیجہ ہیں۔ تمام اہم تجویزوں کا مسودہ "انا" کا لکھا ہوا یا لکھوایا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، اُس کا "انا" ایسا ڈکٹیٹر ہے جس کے سامنے کسی کو مجالِ دم زدن نہیں۔ اِس "انا" کی پشت پر اگر کوئی قوت ہوتی تو شاید اس کی دلکشی ختم ہو جاتی۔ لطف تو یہ ہے کہ صاحبِ "انا" ایک ایسا شخص ہے جو اقلیت کا ایک فرد ہے، جس کی قوم نہ صرف یہ کہ اُس کی پشت پناہ نہیں بلکہ اُس سے بیزار ہے۔ جو بہت بڑا لیڈر ہے لیکن جس کے متبعین انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ جو کوئی بات اپنی قوم سے نہیں منوا سکتا۔ جو ایک عرصۂ دراز سے اپنی قوم کے اجتماعاتِ عامہ میں نہ شرکت کرتا ہے نہ تقریر۔ جو اگر کانگرس سے الگ ہو جائے تو پرِ کاہ کے برابر اُسے نقصان نہیں پہنچا سکتا، شامل رہے تو پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ وُہ بھی اپنی اس کمزوری سے واقف ہے اور اُس کے شرکائے کار (COLLEAGUE) بھی۔ لیکن پھر بھی دم خم کا یہ عالم ہے کہ اُس کا "انا" اُن لوگوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا جو اپنی عظیم اکثریت رکھنے والی قوم کے مہاتما ہیں، شاہِ بے تاج ہیں، جن کے ایک اشارہ پر خون کی ندیاں بہہ سکتی ہیں، جن کے ایک لفظ پر انقلاب آ سکتا ہے، جن کا ایک بول بغاوت برپا کر سکتا ہے، جن کے پاس دولت بھی ہے، سرمایہ دار اور مالکانِ مِل بھی ہیں، لیکن اِس "انا" کی جیب خالی ہے۔ کسی سرمایہ دار سے اُس کا یارانہ نہیں، کسی مِل مالک سے اُسے سروکار نہیں اور اگر ہو بھی تو اُس کی خودداری اُن سے استمداد کو اپنی توہین سمجھتی ہے۔ اِن حالات میں اِس بے مثل و بے نظیر اور حسین و جمیل "انا" کی یہ جرأت، یہ ادا، یہ دھاندلی دیکھیے کہ سب سے اونچا بیٹھتا ہے، سب سے اونچا رہتا ہے۔۔۔۔ ہر طرح کے فکری اور سیاسی اختلافات کے باوجود یہ "انا" دلکش ہے یا نہیں؟"[1]

---

[1] رئیس احمد جعفری، آزادیِ ہند، مطبوعہ لاہور، بار چہارم، ۱۹۶۵ء، ص ۴۸۴، ۴۸۵

جعفری صاحب نے ابوالکلام آزاد کی بیکسی اور گاندھی کی شہنشاہی کے تحت جو موصوف کی "انا" کے بارے میں رائے قایم کی ہے، کم از کم راقم الحروف اِسے درست تسلیم کرنے سے قاصر ہے۔ اگر صورتِ حال یہی ہوتی تو مولانا محمد علی جوہر کی طرح ابوالکلام آزاد کو بھی نظر انداز کیا جا سکتا تھا جیسا کہ پیشتر بیان کیا جا چکا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب نہ صرف گاندھی نے بلکہ کانگریس کے جملہ ہندو لیڈروں نے مولانا جوہر کو پرِ کاہ کے برابر بھی حیثیت نہ دی اور اُن کی بات تک سُننے سے انکار کر دیا تھا حالانکہ اُن دنوں ہندو نہ سہی مسلمانوں کا تو اُن کے ساتھ ایک سیلاب تھا۔ علی برادران کو نظر انداز کر دینے کے بعد لیڈروں کا معاملہ تو صاف ہُوا، باقی رہ گئے گاندھوی علماء۔ اِن مسکینوں کی کانگریس کے اہم معاملات تک رسائی نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی، خواہ یہ پیشِ خویش شیخ الہند و شیخ الاسلام بنتے پھرے یا مجاہدِ ملّت و امیرِ شریعت۔ یہ صرف کانگریس کے فیصلوں پر انگوٹھا دستخط کرنے والے تھے اور گاندھی و نہرو کے ارشادات کو قرآن و حدیث کی تعلیمات کے عین مطابق ثابت کرنے والے اور بس۔ اہم مواقع پر اِن بیچاروں کو کانگریس نے کبھی بلانے اور اِن سے مشورہ تک لینے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔

اب وسعت معلوم کرنی ہے ابوالکلام آزاد کے "انا" کی۔ یہ اُس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتی جب تک یہ معلوم نہ کر لیا جائے کہ گاندھی کے عزایم کیا تھے اور ابوالکلام آزاد نے اپنی ساری اور گوناگوں قابلیتیں کس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وقف کی ہوئی تھیں۔ اِن دونوں حضرات کے مدعا و مقصود کا پتہ لگتے ہی گاندھوی امام الہند کا "انا" پورے طور پر واضح ہو جائے گا، جس سے رئیس احمد جعفری جیسے حضرات کی حیرانی خود ہی دُور ہو جائیگی۔

گاندھی کو جب مولانا محمد علی جوہر جیسوں نے گاندھی بنا کر ہندوستان کا سرکردہ لیڈر مان لیا اور تحریکِ آزادی کے ہر ٹولے نے اُسے اپنا قاید، رہنما، پیشوا اور امام بنا لیا، تو گاندھی کی منزلِ مقصود نزدیک سے نزدیک تر آتی جا رہی تھی۔ وہ منزلِ مقصود کیا تھی؟ یہی کہ ہندوستان کے مالک بلا شرکتِ غیرِ ہندو اور صرف ہندو رہیں۔ اِس مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے وہ ایسی پالیسی وضع کرتا تھا کہ جس سے اُس وقت کے حکمران یعنی انگریز ہندوستان سے بوریا بستر گول کر کے بھاگنے پر مجبور ہو جائیں۔ اِس کے بعد رہ جائیں گے سابق حکمران

(یعنی مسلمان) اور اُن کے مذہب میں شامل ہو جانے والے تو اُنھیں بہلا پُھسلا کر دوستی و ہمدردی کا جھانسا دیا جائے، نزدیک آنے پر اپنا مقصد حاصل۔ اِس قرب و اتحاد سے جن باتوں کی گاندھی کو توقع تھی اُن میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ بُت شکن اور بُت پرست کا فرق ختم ہو جائے گا۔

۲۔ توحید کے پرستار جب بُت پرستوں سے دوستی کرنے لگے تو جذبۂ توحید خود ہی اُن کے دلوں سے محو ہو جائے گا۔

۳۔ ہنود کے دوست بننے والے اگر ہندو نہ بھی بنے تو نہ سہی، لیکن مسلمان بھی نہ رہ سکیں گے۔

۴۔ انگریزوں سے ٹکراؤ کی صورت میں مسلمانی کا دعویٰ کرنے والوں کو مقابلہ پر چھوڑ کر خود اہنسا کے پجاری اور امن کے دیوتا بن جایا کریں گے۔ اِس سے حکومت کا نزلہ مسلمانوں پر گرے گا جو ہر طرح ہندو کا فائدہ کہ مسلمان انگریزی اقتدار کی دہلیز پر ٹکر ماریں گے تو دہلیز ٹوٹے یا مسلمان کا سر پھوٹے، دونوں صورتوں میں مشرکینِ ہند اور اینٹ پتھر کے پجاریوں کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔

۵۔ انگریزوں کے بیک بینی و دو گوش نکل جانے کے بعد ہندو اقتدار کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں رہے گا، کیونکہ جن مسلمانوں سے خطرہ لاحق ہو سکتا ہے وہ خود ہی زنّار دوست بلکہ ہنود کے غلام اور گاندھی کے بندۂ بے دام بنے ہوئے ہوں گے، پھر خطرہ کیسا؟

۶۔ گاندھی نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کی سردھانند کی طرح اسی لیے تو کوئی تحریک کُھلم کُھلا شروع نہیں کی تھی کہ اُس نے انقلاب ۱۸۵۷ء سے سبق سیکھ لیا تھا۔ انگریزوں نے بھی ہندوستان کے باشندوں کو عیسائی بنانے کے منصوبے پر جب عمل کرنا شروع کر دیا تھا تو نتیجہ مکمل بغاوت پر منتج ہوا، جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا۔ اِس کے بعد انگریزوں نے اِس منصوبے کو ترک کر کے ایسی تعلیم و تہذیب کو رائج کرنا شروع کر دیا، جس نے پڑھے لکھے باشندگانِ ہند اور خصوصاً اسکولوں کالجوں میں

پڑھے ہوئے مسلمانوں کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اور اِس طرح پُرانی قوم کی جگہ ایک نئی قوم نے ہی جنم لے لیا۔ گاندھی بھی اِسی طرح اتحاد اور دوستی کے چکّر میں پھنسا کر مسلم قوم کی نسل کو اپنے انداز پر بدلنا چاہتا تھا۔ حالات کی ستم ظریفی تو دیکھیے کہ ہمارے گاندھوی علماء بغیر کسی جبر و اکراہ کے، اِس شمعِ طواغیت پر، خود ہی برضا و رغبت اور اُس سامریِ وقت کے سحر سے مسحور ہو کر، یہ کہتے ہُوئے پروانہ وار نثار ہو رہے تھے: ؎

میں آپ ہی سر شوق سے مقتل میں جھُکا دُوں
لے جان اگر خنجرِ تسلیم تمھارا

اب دیکھنا یہ ہے کہ جناب ابوالکلام آزاد کیا چاہتے تھے؟ کیا وُہ بھی گاندھی کی جادوگری کا شکار ہو گئے تھے؟ احقر کا جواب (قطع نظر اِس کے کہ وہ کسی کی نظر میں صحیح ہے یا غلط) نفی میں ہے۔ ابوالکلام اور گاندھی کی پہلی ملاقات ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء کو دہلی میں ہوتی ہے لیکن آزاد صاحب اِس ملاقات سے پہلے متحدہ قومیت کے حامی اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست مبلغ تھے۔ موصوف اپنے اِس سیاسی و دینی نظریہ کی "الہلال" کے ذریعے کھُل کر تبلیغ و اشاعت کر رہے تھے۔ مسلمانوں کو دورِ حاضر کا ابوالفضل بن کر برابر راغب کر رہے تھے کہ وہ ہندوؤں کو بھی اپنا بھائی سمجھیں اور یہ خیال قطعاً دل میں نہ لائیں کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور ہندو الگ۔ نہیں، بلکہ ہندو ہوں یا مسلمان، ہندوستان کے سارے باشندے ایک ہی قوم کے افراد ہیں اور اُس قوم کا نام، ہندو یا مسلمان نہیں بلکہ "ہندوستانی" ہے۔

ابوالکلام آزاد اپنے مخصوص نظریات و عزائم کی بنا پر اپنے دَور کے ابوالفضل بن کر اکبرِ اعظم کی تلاش میں تھے اور اِدھر گاندھی جو ہندوستان کا بے تاج بادشاہ بنا ہُوا تھا، اُس نے اِس مقام پر پہنچ کر ماڈرن اکبرِ اعظم بننے کی غرض سے اُس کے "دینِ الٰہی" کو گاندھویت کی شکل میں پورے ملک پر مسلّط کرنے کی غرض سے اپنے دَور کے ابوالفضل کی راہوں میں دیدہ و دِل فرشِ راہ کیے ہُوئے تھے۔ ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء کو گاندھی اور ابوالکلام ملے، نہیں نہیں، اپنے دَور کے اکبرِ اعظم اور ابوالفضل ملے۔ دونوں بامراد ہو گئے۔ اکبرِ اعظم کو اپنا ابوالفضل مِل گیا اور ابوالفضل کو اپنا اکبرِ اعظم ہاتھ آگیا۔ نہ گاندھی ابوالکلام کا مرید تھا

نہ ابوالکلام گاندھی کا، بلکہ دونوں ایک دوسرے کی مراد تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے عزائم کی تکمیل کا سب سے بڑا سہارا تھے۔ اگر مغلِ اعظم اور ابوالفضل اکٹھے نہ ہوتے تو تاریخ کے اوراق میں "دینِ الٰہی" کا نام تک نہ آتا، اِسی طرح اگر گاندھی اور ابوالکلام مِل جُل کر ایک ہی منزل پر گامزن نہ ہوتے تو "گاندھویت" کے نام سے بھی ابنائے زمانہ کے کان ناآشنا رہتے۔ ظفر علی خاں نے اِسی لیے تو کہا تھا: ؎

کہہ دے یہ اُن سے بھول گئے کیوں حرم کو آپ
آئیں ابوالکلام جو وردھا سے گھوم کر[۱]

شاید رئیس احمد جعفری صاحب نے یہ محسوس کر ہی لیا ہوگا کہ ابوالکلام آزاد کے "انا" میں اتنی وسعت کیوں تھی اور موصوف کی جملہ کمزوریوں سے واقف ہونے کے باوجود کانگرس کا کوئی ہندو لیڈر تو کیا خود گاندھی بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا، بلکہ وہی گاندھی جس کی اس نئے صنم خانے میں مغلِ اعظم کی طرح پرستش ہو رہی تھی بعض اوقات اُسے بھی ابوالکلام آزاد کی رائے کے آگے جُھک جانا پڑا۔ ابوالکلام کو رد کر کے گاندھی کی لیڈری میں تو واقعی کوئی فرق نہ آتا لیکن جس "گاندھویت" کی خاطر وہ مہاتمائی کا ڈھونگ رچائے پھر رہا تھا اُس کا شاید کہیں نام و نشان بھی نہ ملتا۔ یہ گاندھی ابوالکلام اتحاد کی حدیں محض دوستی و تعاون پر ہی ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ دونوں میں جسم و روح اور لازم و ملزوم کا رشتہ تھا جس کے تحت دونوں ایک جان اور دو قالب ہو گئے تھے اور زبانِ حال سے ایک دوسرے کو مخاطب کر کے یُوں کہا کرتے تھے: ؎

من تُو شُدم، تُو من شدی، مَن تَن شُدم، تُو جاں شدی
تا کَس نہ گوید بعد ازاں، من دیگرم، تُو دیگری

موصوف کی وفات پر مشہور ہندو لیڈروں کی کیفیت کیا تھی، یہ شورش کاشمیری ایڈیٹر چٹان کی زبانی سُنیے:

---

[۱] ظفر علی خاں: چمنستان، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء، ص ۱۶۴

"پنڈت جواہر لال نہرو سراپا گریہ تھے۔ انھیں سنبھالنے والے ہزاروں تھے، لیکن وہ لوگوں کو سنبھالنے کے لیے دوڑے پھر رہے تھے۔ تمام کوٹھی کے وسیع باغات انسانوں سے اَٹ چکے تھے لیکن لوگ اندر آنے کے لیے دروازہ پر ہجوم کرتے رہے۔ پنڈت نہرو پورٹیکو کے باہر لوگوں کو ایک عام رضاکار کی طرح ہاتھ پھیلا کر روکتے رہے اور جب جنازہ اٹھانے کے لیے اُن کو بلایا تو اُن کی نظریں ہمرکاب سیکیورٹی آفیسر پر رُک گئیں۔ استفسار کیا، آپ کون؟ جواب ملا، سیکیورٹی آفیسر، آپ کی حفاظت کے لیے۔ پنڈت نہرو نے کہا، کیسی حفاظت، موت تو اپنے وقت پر آتی ہے، بچا سکتے تو مولانا کو بچا لیتے۔ یہ کہہ کر پنڈت نہرو بلک بلک کر رونے لگے۔

پون بجے میت اٹھائی گئی۔ پہلا کندھا عرب ملکوں کے سفیروں نے دیا جب کلمۂ شہادت کی صداؤں میں جنازہ اٹھا تو عربی سفرا کاندھا دیتے وقت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ پنڈت جواہر لال نہرو، خان محمد یونس خاں، مسٹر کرشنا مینن، مسٹر پربودھ چندر اور بخشی غلام محمد نے احاطہ سے باہر میّت کو توپ گاڑی پر رکھا۔ راجندر بابو دمہ کے مریض ہونے کے باوجود صبح ہی سے تصویرِ یاس بنے کھڑے تھے۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، "آج ۳۰ سال کی دوستی اور رفاقت کا انت ہو گیا۔ مولانا ایسے لوگ پھر کبھی پیدا نہ ہوں گے اور ہم تو کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔"

پنڈت نہرو کی ہچکی بندھ گئی۔ مولانا احمد سعید کی سفید داڑھی پر آنسوؤں کے موتی جگمگا اُٹھے۔ تمام فضا میں نالہ ہائے شیون تیرنے لگے . . . . . جنازے کی گاڑی میں سرہانے کی سمت دائیں رُخ پر پنڈت نہرو اور بائیں طرف پر صدرِ کانگرس ڈھیبر بھائی کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے جنرل شاہ نواز، ڈھیبر بھائی کے ساتھ بخشی غلام محمد اور پروفیسر ہمایوں کبیر موجود تھے۔"[1]

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ص ۷۷۶

موصوف کو کون سے مسنون طریقے کے ساتھ سپردِ خاک کیا گیا۔ اِس آخری جلوس میں زیادہ تر کون سے عقیدت مند حضرات شامل ہُوئے۔ یہ بیان بھی شورش کاشمیری کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمائیں:

"میّت پر کھدّر کا کفن تھا۔ میّت ہندوستان کے قومی جھنڈے میں لپٹی ہوئی تھی، جس پر کشمیری شال پڑا تھا۔ جنازہ کے پیچھے صدرِ جمہوریہ اور نائب صدر کار میں بیٹھے تھے۔ اُن کے پیچھے پارلیمنٹ کے ارکان، مختلف صوبوں کے وزرائے اعظم اکثر صوبائی گورنر اور غیر ملکی سفارتی نمائندے چلے آرہے تھے۔ بھارتی افواج کے چیف آف اسٹاف جنازہ کے دائیں بائیں تھے۔.... پریڈ گراؤنڈ میں محتاط سے محتاط اندازہ کے مطابق پانچ لاکھ افراد جمع تھے۔ قبر کے ایک طرف علماء و حفّاظ قرآن مجید پڑھ رہے تھے، دوسری طرف اکابر و فضلاء سر جھکائے کھڑے تھے۔ یہاں سب سے پہلے برّی فوج کے ایک ہزار سپاہیوں، ہوائی فوج کے تین سو جانبازوں اور برّی فوج کے پانچ سو نوجوانوں نے اپنے عسکری بانکپن کے ساتھ میّت کو سلام کیا۔ پھر مولانا احمد سعید نے دو بجکر پچاس منٹ پر نمازِ جنازہ پڑھائی۔

اِدھر نمازِ جنازہ پڑھائی جا رہی تھی اُدھر پنڈت نہرو قبر کے قریب فرشِ زمین پر بیٹھے ٹک ٹک دیکھ رہے تھے۔ امام نے السّلامُ علیکم ورحمۃ اللہ کہا اور میّت لحد کے قریب لائی گئی تو ہزارہا ہندو و سِکھ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ فوج نے تعزیتی بِگل بجائے۔ ستاروں کی طرح پھیلے ہُوئے مسلمانوں کی آنکھیں پھر اشکبار ہو گئیں۔ مولانا احمد سعید نے لحد میں اتارا۔ کوئی تابوت تیار نہ کیا گیا تھا۔ ایک یادگار جسم سفید کفن میں لپٹا ہوا خاک کے حوالہ کر دیا گیا۔ راجندر بابو نے آنسوؤں کی سیل میں بھگو کر پھول نچھاور کیے۔ پنڈت نہرو نے گلاب چھڑکا تو بے اختیار ہو گئے، لوگوں نے سہارا دیا اور جب مٹی دینے لگے تو بلک بلک کر رو رہے تھے۔"[1]

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، بار دوم ۱۹۷۰ء، ص ۷۷۷

گاندھی نے تو اِن حضرات کے بقول شہادت پائی تھی لیکن ہم یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ گاندھی اور ابوالکلام آزاد میں سے کس کا مرتبہ اونچا رہا کیونکہ ابوالکلام آزاد یقیناً شہادت سے محروم رہے تھے۔ بہرحال اِس تاریخ ساز ہستی کے متعلق گاندھوی حضرات کا مندرجہ ذیل تبصرہ بھی نظرانداز کرنا ظلم ہوگا:

"گاندھی جی کی شہادت کے بعد سے ملک کبھی ایسا متزلزل نہیں ہوا جیسا کہ مولانا صاحب کی حسرتناک موت سے ہوا۔ اِنھوں نے ۴۵ سال سے بھی زیادہ ملک کی خدمت کی ہے۔ ماضی قریب کے بہت سے برسوں کی ہندوستانی تاریخ مولانا مرحوم کے اِس کردار کو ایک وسیع صورت میں پیش کرے گی جو مرحوم نے اس تاریخ کی تعمیر میں ادا کیا ہے۔"[1]

موصوف کی وفات پر بھارت کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ:

"ہندوستان ایک عظیم عالم، ایک بلند پایہ مقرر، ایک تجربہ کار سیاستدان، ایک مسلّمہ قوم پرست، ایک مایۂ ناز محبِ وطن، جنگِ آزادی کے ایک سپہ سالار اور ایک عظیم رہنما کی خدمات سے محروم ہوگیا ہے۔ جس کا مشورہ مشکل اوقات میں قوم کے لیے ہمیشہ ہی مشعلِ راہ کا کام دیتا رہا ہے۔ وہ آخر وقت تک وطن کی، جس سے انھیں بے حد پیار تھا، آبیاری اور خدمت کرتے رہے۔"[2]

بھارت کے دوسرے صدر ڈاکٹر رادھا کرشن نے موصوف کی وفات پر اپنے تعزیتی پیغام میں اُن کی خدمات کا وزنی الفاظ میں اعتراف کرتے ہوئے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

"مولانا آزاد ایک بہت بڑے سیاست دان تھے، مفکّر اور اسکالر تھے، پکّے مسلمان تھے اور پُرجوش محبِ وطن۔ اُن کی سیرت کے تمام پہلوؤں سے بحث کرنا ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے محض اپنے نظریات کی خاطر بڑی مصیبتیں سہی ہیں

---

[1] عبدالرشید آرشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، بار دوم ۱۹۷۰ء، ص ۷۷۵

[2] ایضاً: ص ۷۷۴

لیکن پروانہ کی۔ مولانا مرحوم کی خدمات کا اعتراف کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ قوم اُس نصب العین کو کلیجے سے لگائے رکھے جسے مولانا نے ہمیشہ سامنے رکھا۔ ہمیں مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات، رواداری اور اتحاد کی روح کو یاد رکھنا چاہیے۔"[1]

بھارت کے وزیرِ داخلہ پنڈت گوبند ولبھ پنت نے اپنے تعزیتی پیغام میں یُوں اپنے تاثرات بیان کیے ہیں؛

"ایک زندگی جو ایک مقصد کے لیے وقف تھی ختم ہو گئی۔ ایک عظیم النسان جو ہر لحاظ سے عظیم تھا ہم سے جُدا ہو گیا۔ مولانا آزاد جیسی ہستی ہمیں پھر کبھی دیکھنے کو نہ ملے گی۔ ہندوستان کی گزشتہ برسوں کی تاریخ بتائے گی کہ اِس میں مولانا نے کتنا حصّہ لیا تھا۔ اُنھوں نے تحریکِ آزادی کے وقت برسوں تک کانگرس کی رہنمائی کی۔ مولانا مرحوم صحیح معنوں میں ایک عظیم الشان انسان تھے۔"[2]

پنڈت جواہر لال نہرو ایک بُت پرست تھے اور ابوالکلام آزاد مسلمان کہلانے والے بلکہ اپنے حلقے میں "امام الہند" تک مشہور رہتے اور اپنے موحّد ہونے پر بھی نازاں تھے۔ حالات نے یہ بتایا اور دکھایا کہ ایک توحید پرست کی موت پر ایک مشہور زمانہ بُت پرست اِس طرح بلک بلک کر روتا اور بے قابو ہو جاتا ہے جیسے کوئی عاشقِ صادق اپنے معشوق کی لاش کو دیکھ کر۔ موحّد اور بُت پرست کے عشق کی کہانی، مرنے والے کی زبانی سُنیے؛

"جواہر لال نہرو میرے (ابوالکلام آزاد کے) محبوب ترین دوست ہیں۔ ہندوستان کی قومی زندگی میں انھوں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ کسی دوسرے فرد سے کم نہیں ہیں۔ اِنھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے کام کیا تھا، مصائب برداشت کیے تھے اور آزادیِ ہند کے بعد سے تو وہ ہماری قومی زندگی اور

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، ص ۴۷۷

[2] ایضاً: ص ۴۷۷

ارتقاء کا نشان بن گئے ہیں "۔[1]

جناب ابوالکلام آزاد نے دُوسری جگہ اِسی تعلقِ خاطر اور دلی لگاؤ کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے ؛

"شروع ہی سے جب کانگرس میری سرگرمیوں کا مرکز بنی ، میں اور جواہر لال بہترین دوست تھے ۔ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ایک دوسرے کی تائید پر بھروسہ کرتے تھے ۔ ہم دونوں کے درمیان رقابت یا حسد کا سوال کبھی نہیں پیدا ہوا اور میرا خیال تھا کہ ایسا کبھی ہو بھی نہیں سکتا ۔ حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ نہرو خاندان سے میرے تعلقات کی تاریخ پنڈت موتی لال نہرو کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے ۔ پہلے بھی میں جواہر لال کو ایک بھائی کے بیٹے کی حیثیت سے دیکھتا رہا اور وُہ بھی اپنے والد کے دوست کی حیثیت سے میرا احترام کرتے رہے "۔[2]

ابوالکلام آزاد اور جواہر لال نہرو کے خیالات اور جذبات ایک ہی تھے ۔ کانگرس کی صدارت کے لیے اِسی لیے موصوف کو اپنے بعد جواہر لال سب سے موزوں نظر آئے ، چنانچہ خود فرماتے ہیں ؛

"دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ میرا جانشین کون ہو؟ میں (ابوالکلام) چاہتا تھا کہ ایسا آدمی منتخب ہو ، جو میرے خیالات و جذبات کا حامل ہو اور میری قایم کی ہُوئی پالیسی پر عمل پیرا ہو سکے ۔ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد مَیں اِس نتیجہ پر پہنچا کہ جواہر لال سے زیادہ موزوں آدمی کوئی اور نہیں ہو سکتا ۔ چنانچہ ۲۶ر اپریل کو میں نے اِس مفہوم کا ایک بیان شایع کیا اور کانگرسی اصحاب سے اپیل کی کہ وہ بالاتفاق جواہر لال کو منتخب کرلیں ۔ گاندھی جی سردار پٹیل کی طرف مائل تھے لیکن جواہر لال کا نام جب میری طرف سے پیش ہو گیا تو انھوں نے پبلک طور پر

---

[1] رئیس احمد جعفری ؛ آزادیِ ہند ، مطبوعہ لاہور ، ص ۱۴۷

[2] ایضاً : ص ۲۹۲

پھر اپنے خیالات اس سلسلہ میں ظاہر نہیں کیے۔"[1]

لیکن دوسرے ہندو زعماء، کانگرسی لیڈر اور ارکینِ سلطنت بھی اُن کی موت کو گاندھی کی موت کے بعد سب سے بڑا سانحہ شمار کر رہے تھے اُس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہندو لیڈر اپنی اکثریت کے گھمنڈ میں دوسری اقوام خصوصًا مسلمانوں کا سب کچھ چھین لینا چاہتے تھے۔ اُن کے اِس منصوبے کو جتنی مدد ابوالکلام آزاد سے ملی اُتنی پورے ایک سَو ہندو لیڈروں سے بھی نہیں مل سکتی تھی۔ مسلمانوں کے اجتماعی مفادات پر کاری ضرب لگانے سے موصوف کبھی نہیں ہچکچائے، اِسی لیے ہندو قیادت اُن کی قدر دانی کی مالا جپنے لگ جاتی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ اندرونِ خانہ وہ بھی موصوف کو جعفرِ بنگال یا صادقِ دکن ہی سمجھتے ہوں۔ لیکن ہندوؤں کو چونکہ اِن کی ذات اور اِن کے مشن سے بڑی تقویت پہنچ رہی تھی اور آج تک پہنچ رہی ہے، اِس لیے وہ لوگ ابوالکلام جیسے محسن کی تعریف میں بُخل سے کیوں کام لیتے؟

ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔ ۱۹۴۵ء کے صوبائی انتخابات میں مسلم لیگ نے ۱۷، کانگرس نے ۱۶ سیٹیں پنجاب سے حاصل کیں۔ جمعیتہ العلماء ہند نے ۲دو اور آزاد امیدوار نے ایک نشست حاصل کی، پانچ حلقے مشترک تھے۔ گویا کانگرس سے تو پنجاب میں پھر بھی مسلم لیگ ہی بازی لے گئی۔ ہندوؤں اور سکھوں کی کوئی پیش نہ گئی۔ لیکن ابوالکلام آزاد کا تاریخی کارنامہ، جو اِس موقع پر انجام دیا گیا، ایک یادگار کے طور پر محفوظ رہے گا، وہ یہ ہے:

> "میں (ابوالکلام) نے پنجاب میں جو کچھ کیا تھا، وہ یہی تو تھا کہ اِس حقیقت کے باوجود کہ گورنر مسلم لیگ کی وزارت قایم کرنے پر تُلا ہُوا تھا، کانگرس کو بھی ایوانِ وزارت میں دھکیل کر پہنچا دیا۔ یہ میرے ہی مساعی کا نتیجہ تھا کہ مسلم لیگ نظر انداز کر دی گئی اور کانگرس اقلیت میں ہونے کے باوجود پنجاب کے معاملات میں فیصلہ کن عنصر بن گئی۔"[2]

---

[1] رئیس احمد جعفری، آزادیِ ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۱۴۰

[2] ایضاً: ص ۲۹۴

موصوف اِس مسلم دشمنی کے کارنامے پر نازاں اور اپنے ہندو بھائیوں کی واہ وا کے شور میں مست ہو کر فرماتے ہیں:

"یہ پہلا موقع تھا کہ پنجاب میں کانگرس شریکِ حکومت بنی۔ یہ بات ایسی تھی جو اب تک ناممکن سمجھی جاتی رہی۔ سارے ملک کے سیاسی حلقوں نے اعتراف کیا کہ میں نے غیر معمولی صلاحیت اور تدبّر کا ثبوت دیتے ہوئے پنجاب میں وزارت سازی کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ملک کے مختلف اطراف وجوانب سے مبارکباد کے تاروں کی مجھ پر بھرمار ہو گئی۔ نیشنل ہیرالڈ نے جو یو۔ پی۔ کانگرس کا ترجمان ہے، مجھے مبارک باد دی کہ مَیں نے ایسا طرزِ کار اختیار کیا جس سے پنجاب کا پیچیدہ اور مشکل مسئلہ حل ہو گیا۔ اِس اخبار نے تو میرے بارے میں یہاں تک لکھ دیا کہ پنجاب کے حالات کو اِس طرح مٹھی میں لے لینا میری صلاحیت اور تدبّر کی ایسی شاندار مثال ہے، جس کی نظیر اب تک کسی کانگریسی لیڈر کے ہاں نظر نہیں آئی۔"[1]

موصوف کے اس عدیم المثال کارنامے پر رئیس احمد جعفری کا تبصرہ بھی پڑھنے کے قابل ہے، وہ لکھتے ہیں:

"مولانا (ابوالکلام) کے اِس کارنامے کی حقیقت یہ ہے کہ پنجاب میں تقریباً ساری مسلم نشستوں پر اگرچہ لیگ نے قبضہ کر لیا تھا اور از روئے اخلاق و آئین اُسے تشکیلِ وزارت کا حق تھا، لیکن مولانا نے سر خضر حیات خاں اور اُن کے تین چار ساتھیوں قزلباش اور برق وغیرہ کو مسلمانانِ پنجاب کا نمائندہ تسلیم کر لیا۔ کانگرس کو، سکھوں کو اور دُوسرے غیر مسلم عناصر کو، خضر حیات کا پشت پناہ بنا دیا۔ مسلمانوں کی اکثریت چونکہ عددی تھی لہٰذا مبیّنہ غدّاروں کو اپنے ساتھ ملا لینے کے بعد مولانا نے درحقیقت کانگرسی بظاہر یونینسٹ حکومت

---

[1] رئیس احمد جعفری: آزادیِ ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۳۱۸، ۳۱۹

قایم کرادی۔

مولانا ہندوؤں کے شورِ مبارک باد سے اتنے مسحور ہُوئے کہ اُنھوں نے یہ نہ سوچا، اِس طرح وُہ پاکستان کی بنیاد مستحکم کر رہے ہیں۔ مسلمانوں نے سوچا اور بجا طور پر سوچا کہ جب اس طرح ہماری اکثریت چال بازیوں کے باعث اب اقلیت بنائی جا سکتی ہے تو سارے ہندوستان کی عنانِ اقتدار ہاتھ میں لے لینے کے بعد مسلم اکثریت کے صوبے بالکل کانگریس کے رحم وکرم پر ہوں گے۔ وہاں وہی حکومت بن سکے گی جو کانگریس کی منظورِ نظر ہو۔"[1]

موصوف نے اِسی وزارت سازی پر تبصرہ کرتے ہُوئے آگے اِس طرح تجزیہ کیا ہے:

"واقعی مسلم لیگ عوامی جماعت تھی، اس سے اشتراک وتعاون کانگریس کے شایانِ شان تھا لیکن یونینسٹ جماعت، جس نے ہمیشہ کانگریس کے سر پہ ڈنڈے برسائے، جس نے کانگریس کی ہر تحریک کو پوری بہیمیت سے کچلا، جس نے کانگریسی لیڈروں کو ہتھکڑیاں پہنا کر جیل بھیجا، جس نے انگریزوں کی حمایت اور جاں نثاری میں اپنے ملک، قوم اور وطن سے غدّاری کی، جو صرف جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں پر مشتمل تھی۔ جس میں سردار، خان بہادر، رائے بہادر بھرے ہُوئے تھے۔ جس کے ارکان میں سے ایک آدمی بھی ایسا نہیں تھا جس نے کبھی بھولے سے بھی کسی عوامی تحریک میں حصّہ لیا ہو۔ جس نے ہمیشہ انگریزوں کی وفاداری پر قوم اور ملّت کی وفاداری کو ترجیح دی۔ محض مسلم لیگ کو زک دینے کے لیے ایسی جماعت سے ساز باز کرنا اور سازش سے کام لے کر اُس کی وزارت بنوا دینا، یقیناً مولانا کا ایسا کارنامہ تھا جس پر ہندوؤں کی مسرّت بجا تھی، جس پر مولانا بھی فخر کرنے میں، ممکن ہے حق بجانب ہوں لیکن ملّتِ اسلامیہ کا جہاں تک تعلق ہے، اُس نے نفرت اور حقارت کے ساتھ اِس

---

[1] رئیس احمد جعفری، آزادیِ ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۳۰۴، ۳۰۵

کارنامہ کو دیکھا تھا۔ یہ کارنامہ اُس کی نظر میں بالکل ایسا ہی تھا جیسے جعفر و صادق کا۔"[۱]

جب کانگرس نے مسلم لیگ اور مسلم اکثریت کے صوبوں کے ساتھ یہ سلوک کیا تو خوش قسمتی سے مسلم لیگ کو وزارتِ مال کا عہدہ مل گیا۔ کانگرس نے یہ عہدہ اِس غرض سے مسلم لیگ کے سپرد کرنے کی پیش کش کی تھی کہ اُن کے خیال میں اِسے سنبھالنے والا آدمی مسلم لیگ کے پاس کوئی نہیں تھا لہٰذا انکار کر دے گی اور اِس طرح مسلم لیگ اور مسلمانوں کو مرکز میں قابلِ ذکر عہدوں سے محروم کر دیا جائے گا۔ مسلم لیگ نے یہ عہدہ قبول کر لیا۔ لیگ کے جنرل سیکرٹری نواب زادہ خاں لیاقت علی خاں اِس پر فائز کیے گئے۔ لیاقت علی خاں نے اپنے رفقائے کار کی مدد سے اِس ہوشمندی سے یہ کام چلایا کہ کانگرس کی ساری مشینری کو معطل کر کے رکھ دیا۔ بڑے سے بڑے ہندو عہدیدار بھی بے بس ہو کر رہ گئے۔ اور آخر میں بجٹ وہ پیش کیا کہ ہندو لٹیروں یعنی صنعتکاروں اور مہاجنوں کے سارے پیچ و خم نکال کر رکھ دیے اور بتا دیا کہ سارے مسلمان کہلانے والے ابوالکلام آزاد اینڈ کمپنی جیسے ملّت فروش نہیں ہیں جنھیں ہندو آنکھ دکھا کر یا میٹھی گولیاں کھلا کر نگل سکتے ہیں بلکہ اِن میں اکثریت اُن غیور مسلمانوں کی ہے جنھیں نگلنا انتہائی مشکل اور بڑی ہی ٹیڑھی کھیر ہے۔ لیاقت علی خاں کی اِس کارگزاری کو ابوالکلام آزاد کی زبان سے سُن لینا چاہیے:

> "محکمہ مالیات کی باگ مسلم لیگ کے ہاتھ میں تھی، گویا نظم و انصرام کی کنجی اُس کے پاس تھی۔ محکمہ مالیات میں چند نہایت قابل اور سینئر مسلم حکام موجود تھے، انھوں نے لیاقت کو ہر ممکن امداد دی۔ اُن کے مشورے سے لیاقت علی ہر اُس تجویز کو مسترد یا مؤخر کر دیتے تھے جو ایگزیکٹو کونسل کے کانگرسی ممبران کی طرف سے پیش کی جاتی تھی۔ سردار پٹیل نے خود ہی یہ انکشاف کیا کہ اگرچہ وہ وزیرِ داخلہ ہیں لیکن لیاقت علی کی مرضی کے بغیر وہ ایک چپراسی کا تقرر بھی نہیں کر سکتے۔ کانگرسی ممبروں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا کریں۔"[۲]

---

[۱] رئیس احمد جعفری: آزادیِ ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۴۲۵

[۲] ایضاً، ص ۴۲۵

لیاقت علی خاں نے جو بجٹ پیش کیا وہ انہی اصولوں پر مبنی تھا جو کانگرسی لیڈروں کے اعلانات اور اُن کی پالیسی سے بالکل ہم آہنگ تھے۔ موصوف کے اصولوں کی کانگرسی زعماء نے بھی تائید کی۔ لیکن وہ اعلانات منافقت پر مبنی تھے اور یہ بجٹ اُن کی عملی تصویر تھی۔ مثلاً ابوالکلام آزاد یُوں وضاحت کرتے ہیں؛

"ہم خود یہ چاہتے تھے کہ تقسیمِ دولت زیادہ سے زیادہ مساوی بنیاد پر ہو اور ٹیکس سے بچنے والے لوگوں کو ہرگز معاف نہ کیا جائے، لہٰذا بنیادی طور پر ہمیں لیاقت علی کی تجویز سے کوئی اختلاف نہ تھا۔ جب انھوں نے کابینہ میں یہ مسئلہ پیش کیا تو کہا کہ اُن کی تجاویز اُن اعلانات پر مبنی ہیں جو ذمہ دار کانگرسی لیڈروں کی طرف سے ہوتے رہے تھے۔ اُنھوں نے یہ اعتراف بھی کیا کہ یہ اعلانات زیادہ تر جواہر لال کے تھے لیکن اُنھوں نے کوئی تفصیل بیان نہیں کی۔ عام احساس پر ہم نے اُن سے اصولی طور پر اتفاق کر لیا۔" [1]

رئیس احمد جعفری نے اِس بجٹ کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار یُوں کیا ہے:

"عوام کے ساتھ کانگرس کا یہ منافقانہ رویّہ اور سرمایہ داروں کے ساتھ اِس نیازمندانہ برتاؤ پر اسّی ہزار صفحے کی کتاب لکھ دی جاتی، ملک کے طول و عرض میں شعلہ نوا خطیب اور آتش نوا مفکر تہلکہ مچا دیتے تو بھی وہ اس طرح بے نقاب نہیں ہو سکتے تھے جس طرح لیاقت علی خاں کے چند ورقی کے اِس میزانیہ نے کر دیا..... گویا لیاقت علی نے بجٹ اِس لیے بنایا تھا کہ برلا، ڈالمیا، سنگھانیہ کو لوٹ کر غریب مسلمانوں کی جھولیاں بھر دیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت پٹیل اور راجگوپال اچاری کے منہ سے وہ الفاظ نہیں نکلوا سکتی تھی جو لیاقت علی کے بجٹ نے نکلوا دیے۔" [2]

---

[1] رئیس احمد جعفری: آزادیِ ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۴۲۴

[2] ایضاً: ص ۴۲۶ - ۴۲۸

یہ سطریں یہاں جملہ معترضہ کے طور پر آگئیں۔ ذکر تھا جناب ابوالکلام کی ہندو نوازی اور ہر موقع پر مسلم مفادات پر کاری ضربیں لگانے کا۔ مسلمانوں نے ہندو لیڈروں کی عیاری اور مسلم دشمنی کے تحت تقسیم ملک کی تجویز اور مطالبۂ پاکستان کو اپنے حقوق کے تحفظ کا واحد حل پاکر اپنی تمام تر مساعی اِس مقصد کو حاصل کرنے پر مرکوز کردی تھیں تاکہ علیحدہ حصّے میں مسلمان اپنی قسمت کے آپ مالک بن کر رہیں۔ اُنھیں صاف نظر آنے لگا تھا کہ انگریز کی غلامی سے نجات پانے کے بعد بھی مسلمانانِ ہند غلامی کے چکر سے نہیں نکل سکیں گے۔ آزادیِ ملک کے بعد ہندو اکثریت کی غلامی کا جوا کندھوں پر رکھا ہوا ہوگا۔ جو انگریزی اقتدار میں مسلمانوں کو پیس رہے ہیں وہ بعد میں تو کچا ہی چبانے کی کوشش کیا کریں گے۔ اِن متوقع خطرات سے بچاؤ کی صورت مطالبۂ پاکستان کے سوا اور کیا تھی، مسلمانانِ ہند کے اِس مطالبے نے جب انتہائی شدّت اختیار کرلی تو بڑے بڑے ہندو لیڈروں کو بھی تقسیمِ ہند کے علاوہ مسلمانوں کو مطمئن کرنے اور آزادی حاصل کرنے کی اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ حالات کے آگے اُنھیں بھی جھکنا اور مطالبۂ پاکستان کو درست تسلیم کرنا پڑا۔ اِس سلسلہ میں پاکستان کو "پلیدستان" یا "کنجری" بتاکر قبول کرنے والے نام نہاد علماء کا ذکر نہیں کرتا بلکہ تذکرہ ہے اُس اونچی چوٹی کی سرکار کا، جس کو گاندھوی حضرات امام الہند کا لقب دیتے ہیں کہ موصوف کا اُس وقت کیا خیال تھا؛

"اب کہ سردار پٹیل ہی نہیں جواہر لال تک تقسیمِ ہند پر راضی ہو چکے تھے، میری (ابوالکلام کی) تنہا اُمید گاہ، گاندھی جی کی ذات تھی۔ وہ ۲۱ مارچ ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملنے دہلی آئے ہیں، فوراً اُن سے ملنے روانہ ہوگیا۔ اُنھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا، تقسیمِ ہند اب ایک خطرہ بن چکی ہے۔ ولبھ بھائی (یعنی سردار پٹیل) اور صرف وہی نہیں جواہر لال تک سپر انداز ہو چکے ہیں۔ بتائیے مولانا آپ کیا کریں گے؟ آپ میرا ساتھ دیں گے یا آپ بھی بدل چکے ہیں؟

میں نے جواب دیا: میں تقسیمِ ہند کا مخالف پہلے بھی تھا، اب بھی ہوں، بلکہ اب سے زیادہ اُس تخیل کا مخالف کبھی نہیں تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ جواہر لال اور سردار پٹیل نے شکست تسلیم کرلی ہے، بلکہ

آپ کے الفاظ میں سپر انداز ہو گئے ہیں۔ میری واحد اُمیدگاہ آپ کی ذات ہے
اگر آپ تقسیم کے خلاف آمادۂ عمل ہوں تو ہم حالات کو اب بھی قابو میں لا سکتے ہیں
لیکن اگر آپ بھی خاموشی اختیار کر لیں تو مجھے شبہ ہے کہ پھر ہندوستان ہاتھ سے گیا۔

گاندھی جی نے جواب دیا کہ "یہ بھی کوئی پُوچھنے کی بات ہے، اگر کانگرس تقسیمِ ہند قبول کر لینا چاہتی ہے تو یہ کارروائی میری لاش ہی پر ہو سکے گی۔ جب تک میں زندہ ہُوں، میں کبھی بھی تقسیمِ ہند پر رضامند نہیں ہو سکتا اور نہ میں کانگرس کو ایسا کرنے دُوں گا۔"[1]

عبادت کے تیور بتا رہے ہیں کہ تقسیمِ ہند کا جھگڑا گویا ہندوؤں اور مسلمانوں یا کانگرس اور مسلم لیگ کا جھگڑا نہیں تھا بلکہ جھگڑا تھا ابوالکلام آزاد اور مسلمانوں کا۔ مسلمانانِ ہند کا مطالبہ تھا کہ ہندو ہمارے ساتھ اب بھی زیادتی کر رہے ہے اور آزادی کے بعد تو ذرا بھی کسر باقی نہیں چھوڑیں گے۔ لہٰذا ہندوستان کو تقسیم کر کے ہمارا حق ہمیں علیحدہ دے دیا جائے تاکہ ہم انگریز کی غلامی کے ساتھ ہی ہندو کی غلامی سے بھی نجات حاصل کر لیں۔ اِس کے برعکس ابوالکلام دی گریٹ کا نظریہ یہ تھا کہ خواہ سارے ہندو لیڈر اور پوری ہندو قوم بھی اِس بات پر رضامند ہو جائے کہ ہم مسلمانوں کو اپنا غلام بنانے پر بضد نہیں اور تقسیمِ ہند کا منصوبہ تسلیم کر کے مسلمانوں کو اُن کا حق دینے پر راضی ہیں لیکن مَیں پھر بھی اِس فیصلے کو تسلیم نہیں کروں گا۔ موصوف کے اُس وقت بھی تسلیم نہ کرنے کی چند وجوہات ہیں:

۱۔ جس طرح ابوالفضل علّامی (المتوفی   ) نے اکبر بادشاہ کو سمجھایا تھا کہ ہندوستان کے باشندوں کو ایک قوم بنایا جائے۔ ہندو اور مسلمان وغیرہ کی علیحدہ قومیت کا تصور ہی ختم کر دیا جائے اِسی طرح ماضی قریب میں اِس ایک قوم (متحدہ قومیت) بنانے کے منصوبے کو پروان چڑھانے والے نہ ہندو لیڈر تھے، نہ گاندھی تھا، نہ اور کوئی، وہ امام الہند کہلوانے والا ابوالکلام آزاد تھا۔

۲۔ ہندو لیڈر اِس متحدہ قومیت کے منصوبے میں ابوالکلام کے معاون و مددگار ضرور تھے لیکن اِس منصوبے کی علمبرداری اور سارے قافلے کی سپہ سالاری کے جملہ حقوق تو بحق

---

[1] رئیس احمد جعفری، آزادیٔ ہند، ص ۴۰۸، ۴۰۹

ابنِ مولانا خیر الدین محفوظ تھے۔

۴۔ تقسیمِ ہند سے ہندو بھی کترائے ضرور، وُہ اپنے لیے اِسے نقصان دِہ فیصلہ سمجھتے تھے، لیکن براہِ راست ضرب تو ابوالکلام آزاد کے منصوبے پر پڑ رہی تھی۔ وہ تڑپ کیوں نہ اُٹھتے، آنکھوں دیکھتے اُن کی پچیس تیس سالہ محنت پر پانی پھرنے لگا تھا۔ ہندو لیڈر تک دُو قومیں، دُو طاقتیں مان کر ملک کے دو حصّے بنا دینے پر رضامند ہو رہے تھے مگر یہ کیسے ہوتے؟ ہم ملک کے دُو حصّے بننا متحدہ قومیت کی ضد ہے، اِسی لیے متحدہ قومیت کا علمبردار تقسیمِ ہند کو کس طرح قبول کرتا جبکہ یہ اُس کی شانِ ابوالفضلی کے خلاف تھی۔

۵۔ ڈوبنے والا تنکے کا بھی سہارا لینے کی کوشش کرتا ہے، اِسی طرح ہندو اور مسلمان کو ایک قوم بنانے والے، توحید اور بُت پرستی کا فرق مٹانے والے اور کعبے میں بُت خانہ سجانے والے امام الہند نے اپنے منصوبے کو بگڑتے دیکھا تو ہر ہندو لیڈر کا سہارا لینے کی کوشش کی لیکن اِنھیں ناکامی و نامرادی کا منہ دیکھنا پڑا۔

ہاں تو ذکر تھا کہ ابوالکلام آزاد، تقسیمِ ہند کے خلاف گاندھی سے استمداد کر رہے تھے۔ گاندھی نے یقین دہانی کرائی، پُرزور الفاظ میں اپنی شاہانہ طاقت کا اظہار کیا۔ چند روز بعد تقسیمِ ہند کی مخالفت کرنے والا، ہندوستان کا بے تاج بادشاہ کہلانے والا گاندھی کون سی آندھی میں اُڑا! یہ ابوالکلام آزاد سے سُنیے:

"اُسی دن گاندھی جی لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملے، دُوسرے دن دونوں کی پھر ملاقات ہُوئی اور ۲ ر اپریل کو پھر، پہلی مرتبہ جب وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے مل کر واپس آئے تو فوراً ہی سردار پٹیل اُن کے پاس پہنچے اور دو گھنٹے تک بیٹھے رہے۔ اِس ملاقات میں کیا باتیں ہُوئیں؛ میں نہیں جانتا۔ لیکن جب دوبارہ مَیں گاندھی جی سے ملا، تو مَیں نے ایسا جھٹکا محسوس کیا جو میری زندگی کا اہم ترین حادثہ ہے۔ میں نے دیکھا، گاندھی جی بھی بدل گئے۔ جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ صدمہ پہنچایا اور حیران کیا وُہ یہ تھی کہ اب گاندھی جی بالکل سردار پٹیل کی زبان میں بول رہے تھے۔ دُو گھنٹے تک مَیں اُنھیں ہموار

کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اُس پر کوئی اثر نہ ڈال سکا۔ آخر کار میں نے اُن سے کہا کہ اگر آپ نے بھی یہ خیالات قبول کر لیے ہیں تو پھر مجھے کوئی آس نہیں ہے کہ ہندوستان تباہی سے بچ سکے گا۔ گاندھی جی نے مجھے بتایا کہ پوزیشن ایسی ہے کہ اب تقسیمِ ہند کو ٹالا نہیں جا سکتا۔"[1]

تقسیمِ ہند کر کے مسلمانوں کو اُن کا حق دینے اور ہندوؤں کی غلامی سے آزادی حاصل کر لینا ابوالکلام آزاد کی نظر میں کیا تھا، یہ مذکور ہُوا، اِسی سلسلے میں موصوف کی ایک وضاحت اور ملاحظہ ہو:

"۱۴ جون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا جلسہ ہُوا۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے بہت سے جلسوں میں شریک ہو چکا ہُوں، لیکن اِس عجیب جلسے میں کاش! شریک نہ ہوا ہوتا۔ کانگرس جس نے ہمیشہ ہندوستان کی آزادی اور وحدت کے لیے لڑائی جاری رکھی تھی، آج تقسیمِ ہند کے ریزولیشن پر غور کر رہی تھی۔ پنڈت گوبند بلبھ پنتھ نے ریزولیشن پیش کیا، پھر سردار پٹیل اور جواہر لال بولے، بعد میں گاندھی جی نے لب کشائی کی۔

کانگرس کی طرف سے اِتنے ذلیل طریقے پر ہتھیار ڈال دینے کا منظر برداشت کر لینا میرے بس سے باہر تھا۔ اپنی تقریر میں، میں نے صاف طور پر کہا کہ جس فیصلے پر ورکنگ کمیٹی پہنچی ہے وہ نہایت افسوسناک حالات کا نتیجہ ہے۔ تقسیمِ ہندوستان کے لیے سب سے بڑا المیہ ہے اور اِس کی تائید میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ ہم نے اپنے مقدور بھر تقسیم سے بچنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہے۔ بہر حال ہمیں نہ بھولنا چاہیے کہ قوم ایک ہے (یعنی کفر و اسلام ایک ہی بات ہے ؟) اِس کی تہذیبی زندگی ایک ہے اور ایک رہے گی، سیاسی طور پر ہم ناکام ہوئے اور اِسی لیے تقسیمِ ملک پر مجبور ہو گئے، ہمیں اپنی شکست تسلیم کر لینی چاہیے،

---

[1] رئیس احمد جعفری: آزادیِ ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۴۰۹

> لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ عہد بھی کر لینا چاہیے کہ ہماری تہذیب تقسیم نہیں ہوئی۔ اگر ہم پانی کو ایک چھڑی سے ہلائیں تو بظاہر ایسا معلوم ہوگا کہ پانی تقسیم ہوگیا، لیکن وہ تقسیم نہیں ہوتا، چھڑی جیسے ہی ہٹائی جائے گی، تقسیم کے اثرات فوراً زائل ہوجائیں گے۔" ۱؎

اِس تقریر پر کوئی تبصرہ کرنا ہمارے نزدیک لاحاصل ہے کیونکہ موصوف کے نظریات اُن کے الفاظ سے خود ہی پورے طور پر واضح ہو رہے ہیں، ہاں اِس کے متعلق سردار پٹیل کے تاثرات پیش کر کے فیصلہ قارئین کے سپرد کرتا ہوں:

> "سردار پٹیل کو میری تقریر بہت پسند آئی۔ اُن کی ساری تقریر میری تقریر کا جواب تھی اُنھوں نے کہا تقسیمِ ملک کا ریزولیشن جبر یا کمزوری کا نتیجہ نہیں، بلکہ ہندوستان کے موجودہ حالات کا بہترین حل یہی ہے۔" ۲؎

پٹیل، جواہر لال اور گاندھی تک اگرچہ تقسیمِ ہند پر رضامند ہوگئے لیکن آخری سانس تک رضامند نہ ہونے والے ابوالکلام کے نزدیک یہ ایک بدترین اندیشہ تھا جو کبھی کبھی ان کے دماغ کی کھڑکیوں کو کھڑکھڑا کر اُن کی نیندیں حرام کر دیا کرتا تھا، وہی اندیشہ اب موصوف کے سامنے حقیقت بن کر آگیا تھا، چنانچہ لکھتے ہیں:

> "لارڈ ماؤنٹ بیٹن برطانوی حکومت سے تقسیمِ ہند کی اسکیم منظور کرا کے ۳۰ مئی کو دہلی واپس آئے۔ ۲ جون کو نمائندگانِ لیگ و کانگریس سے اُنھوں نے گفتگو کی۔ ۳ جون کو تقسیمِ ہند کی تفصیلات کے ساتھ قرطاسِ ابیض شائع ہوگیا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے بدترین اندیشے واقعہ بن گئے۔ آزادیِ ہند کی قیمت دو حکومتوں میں ہندوستان کی تقسیم تھی۔" ۳؎

۱؎ رئیس احمد جعفری: آزادیِ ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۲۳۳، ۲۳۴

۲؎ ایضاً: ص ۲۳۴

۳؎ ایضاً: ص ۴۴۱، ۴۴۲

مطالبۂ پاکستان جو ہندوؤں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی آخری صورت تھی، اُس کے بارے میں موصوف نے اپنی پوری سوجھ بوجھ اور ساری صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر یوں فیصلہ صادر فرمایا تھا:

> ”ہر ممکن نقطۂ نظر سے میں نے مسلم لیگ کی تجویزِ پاکستان پر غور کیا۔ اُس کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اِس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ نہ صرف مجموعی حیثیت سے ہندوستان کے لیے بلکہ خاص طور پر مسلمانوں کے لیے بھی مضر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اِس تجویز سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ بہت سے نئے مسائل پیدا ہوجاتے ہیں۔“ [1]

اِس سلسلے میں موصوف نے ذرا صاف بیانی سے کام لیتے ہوئے پاکستان کے متعلق ارشاد فرمایا تھا:

> ”میں اِس کا اعتراف کرتا ہوں کہ پاکستان کا لفظ ہی میری طبیعت قبول نہیں کرتی۔“ [2]

گویا مسلمانانِ ہند کے مفادات سے جتنے ابوالکلام آزاد ٹکرائے وہ کسی بڑے سے بڑے ہندو لیڈر سے بھی نہ بن سکا۔ تقسیمِ ملک کے بعد موصوف کو تعلیمات کا محکمہ دیا گیا کیونکہ ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کو اردو زبان اور عثمانیہ یونیورسٹی سے محروم کرنے نیز نئی نسل کے ذہنوں کو نئے انداز میں ڈھالنے کے لیے ابوالکلام آزاد سے موزوں شخصیت اور کون تھی؟ کوئی ہندو یہ کام کرتا تو ہنگامے ہوتے، شور مچتا، مسلمانوں کا بدخواہ ٹھہرایا جاتا لیکن اس طرح سانپ بھی مرگیا اور لاٹھی بھی محفوظ رہی۔ یہ کام نہ ابوالکلام وزیرِ اعظم بن کر انجام دے سکتے تھے اور نہ بھارت کے صدر ہو کر۔ اسی لیے ہندو لیڈروں نے اُنھیں صدارت اور وزارتِ عظمیٰ کے ہر موقع پر نظر انداز کیا۔ مثلاً جعفری صاحب لکھتے ہیں:

---

[1] رئیس احمد جعفری: آزادیِ ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۱۶۳

[2] ایضاً: ص ۱۶۳

"اگر کانگریس صحیح معنی میں قومی تنظیم تھی، تو مولانا نے بتایا ہوتا کہ جس عالی ظرفی کا مظاہرہ مسلم لیگ کی ضد میں، لارڈ ویول کو اپنے نمائندوں کی فہرست پیش کرتے وقت کانگریس نے کیا، آزاد ہندوستان میں ایسا کیوں نہیں کیا؛ لارڈ ویول کو جو فہرست پیش کی گئی اُس میں پہلا نام مولانا آزاد کا تھا لیکن جب

(الف) ہندوستانی کابینہ میں نائب وزیرِ اعظم کا عہدہ پیش کیا گیا تو پہلا نام سردار پٹیل کا تھا حالانکہ مستحق مولانا آزاد تھے۔

(ب) پٹیل کے انتقال کے بعد بھی مولانا آزاد "سینئر موسٹ" ممبر تھے، لیکن یہ عہدہ ختم کر دیا گیا مگر مولانا کو مستحق نہ سمجھا گیا، حالانکہ اِن کا جرم سوا اِس کے اور کچھ نہ تھا کہ وہ مسلمان تھے۔

(ج) ماؤنٹ بیٹن کے بعد جب یہ سوال پیدا ہُوا کہ اب کوئی ہندوستانی گورنر جنرل بنایا جائے تو پہلا نام راج گوپال اچاری کا پیش ہوا اور منظور ہُوا، حالانکہ خدمات کے لحاظ سے سزاوار مولانا تھے۔

(د) پھر جب صدرِ جمہوریہ ہند کا منصب تخلیق ہُوا تو بھی مولانا نظر انداز کر دیئے گئے اور راجندر بابو کا پہلا اور آخری نام منظور کر لیا گیا، حالانکہ خدمات کے لحاظ سے پٹیل، راجہ جی، راجن بابو سب مولانا کے سامنے طفلِ مکتب تھے۔"[1]

گاندھوی مدینہ

بجنور سے نکلنے والا اخبار "مدینہ"، کانگرس اور متحدہ قومیت کا حامی تھا۔ اُس کا حال ملاحظہ ہو:

"اِنھیں جرائد میں بجنور کا اخبار "مدینہ" بھی ہے جو کبھی اسم بامسمّٰی تھا لیکن آجکل برعکس نہند نامِ زنگی کافور اچھا خاصا سومنات بنا ہوا ہے۔ کانگرس اور گاندھی جی کو خوش کرنے کی دُھن میں اِس اخبار نے اپنی تمام گزشتہ روایات کو

---

[1] رئیس احمد جعفری: آزادیِ ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۱۲۲، ۱۲۳

طاقِ نسیاں کے حوالے کر دیا ہے۔ اسلام کے سوادِ اعظم کو انگریزوں کا ٹوڈی کہنا، اُن آزاد خیال مسلمانوں کو جن کا جُرم صرف اِس قدر ہے کہ وہ کانگرس میں جذب ہونا پسند نہیں کرتے بلکہ ایک برابر کی جوڑ کی حیثیت سے اُس کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے پر آمادہ ہیں، پانی پی پی کر کوسنا، ہندوؤں سے خراجِ تحسین حاصل کرنے کے لیے مسلمان اکابر پر جھوٹے الزام لگانا "مدینہ" کا محبوب ترین شغل ہے"۔[1]

گاندھی کی پیشوائی کے بارے میں بھی ظفر علی خاں یُوں "مدینہ" کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

"جہاں تک کانگرس کے اصولوں کا تعلق ہے ہمیں ان کے ساتھ اتفاق ہے، مگر ہم اپنی داڑھی گاندھی جی کے ہاتھ میں دینا پسند نہیں کرتے۔ پرتاپ یا ملاپ بن کر "مدینہ" اگر ان باتوں پر بگڑتا ہے تو بگڑا کرے، مسلمانوں کو اس کی کوئی پروا نہیں وہ شوق سے اپنی داڑھی گاندھی جی کے ہاتھ میں تھما دے، خس کم جہاں پاک"۔[2]

موصوف نے "مدینہ"، بجنور کی گاندھویت پر اُس کی خدمت میں ایک سوغات پیش کی تھی، وہ بھی ملاحظہ ہو:

"مدینہ اب وہ مدینہ نہ رہا۔ آجکل وہ سومنات ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ اسی مناسبت سے ایک نئی سوغات اُس کی خدمت میں پیش کی جائے۔ سُنیے:

جب مدینہ کے قلمکار یہودی ہو جائیں
کیوں نہ پھر اُس کو بھی تابوتِ سکینہ کہیے
کالی ماتا کی اِسے کہیے چہیتی بیٹی
یا مہادیو کی اولادِ نرینہ کہیے
کانگرس جس سے مسلمان کو لیتی ہے خرید
اپنے سینہ کو اُسی زر کا خزینہ کہیے

---

[1] ظفر علی خاں: چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۷۶

[2] ایضاً: ص ۷۷

اُڑ رہا جس پہ نہرو کا ہو ترنگا جھنڈا
اپنے اخبار کو اُسی بام کا زینہ کہیے
وہ دعا آپ کو دے، آپ اُسے گالی دیں
آپ ہیں یا ہے "زمیندار" کمینہ کہیے[1]

جب اسلامی عقائد و معمولات کو غیر اسلامی اور غیر اسلامی باتوں کو اسلامی کہا جانے لگے تو ایسے نامساعد حالات اور فتنہ پرور دور میں اللہ تعالیٰ کا جو مقبول بندہ تائیدِ ایزدی سے دلائل و براہین کے ذریعے فتنہ پردازوں کو ساکت و مبہوت کر کے حق و باطل کو واضح کر دکھائے، دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی کر دے، اصطلاحِ شرع میں اُسے مجدِّد کہا جاتا ہے۔ آج تک کوئی مجدِّد ایسا نہیں ہوا، نہ ہو سکتا ہے کہ وہ دیوبندیوں کے مولوی اشرف علی تھانوی کی طرح نصاریٰ کے ہاتھوں چھ سو روپیہ ماہوار پہ بِک کہ خود تو ساری عمر کفر کے سمندر میں پڑا غوطے لگاتا رہے لیکن دوسروں کو سمجھانا بُجھانا بھی ضروری سمجھے۔ چنانچہ موصوف نے بھی اپنی گاندھوی برادری کو یوں سمجھایا تھا:

"مسلمانوں میں افسوس تو یہ ہے کہ دوست دشمن کی بھی پہچان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آئے دن مصائب کا شکار بنے رہتے ہیں بخصوص اُن پر زیادہ افسوس ہے کہ جو مسلمانوں کے رہبر اور مقتدا کہلاتے اور جن کے ہاتھ میں اُن کی نکیل ہے۔ جو اُن کی کشتی کے ناخدا بنے ہُوئے ہیں۔ جو ان کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں وہ اُن کے لیڈر ہیں۔ لیکن ایسے لوگ کیا خاک رہبری کریں گے جو خود گُم کردہ راہ ہیں تو دوسروں کو کیا راہ بتائیں گے"

اِنھوں نے کافروں کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر مسلمانوں کو پسوا دیا اور مسلمانوں ہی کو کیا، خود بھی اُن چیزوں کا ارتکاب کیا جو ایمان اور دین کو خراب اور برباد کرنے والی تھیں۔ جے کے نعرے لگائے، پیشانیوں پر قشقے لگائے، ہندوؤں کی ارتھیوں کو کندھا دیا، رام لیلا وغیرہ کا انتظام مسلمان والنٹیروں نے

---

[1] ظفر علی خاں، چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۸۷

کیا، بیہودہ اور کفر یہ کلمات بکے کہ اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو فلاں ہندو نبی ہوتا ، کیا خرافات واہیات ہے۔

مَیں نے اُس ہی شبابِ تحریک کے زمانہ میں کہا تھا کہ جو شخص توحید اور رسالت کا منکر ہو اور وہ اسلام اور مسلمانوں کا خیر خواہ اور ہمدرد ہو، یہ معمہ سمجھ میں نہیں آتا۔ مگر اُس وقت چڑھی ہُوئی تھی ، کون سُنتا تھا۔ اب دیکھ لی اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اُس کی خیر خواہی اور ہمدردی۔ اِدھر تو حکومت کے مقابلہ میں مسلمانوں کو آگے کر دیا ، اُدھر بعض بدفہم اور بے سمجھ مسلمانوں کے جو راہبر تھے اُن کو بہلا پھُسلا کر ہجرت کا سبق پڑھایا ، اِدھر شدھی کا مسئلہ جاری کرادیا۔ غرضیکہ ہر طرح پر مسلمانوں کے جان ، ایمان ، جائیداد ، مال ، زر ، زمین ، گھر ، سب کا مالک اپنی قوم کو بنانا چاہتا تھا۔ یہ تھی اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اُس کی خیر خواہی اور ہمدردی۔

لیکن یہ لیڈر نہ سمجھے اور نہ اُن کے ہم خیال مولوی۔ ہندوؤں کو تو قوت ہُوئی مسلمانوں کی شرکت سے اور مسلمانوں کی شرکت ہُوئی مولویوں کی شرکت سے ، ورنہ لیڈرانِ قوم تو قریب ڈیڑھ سال سے چیخ رہے تھے ، عوام مسلمانوں نے شرکت نہ کی تھی۔ جس وقت مولویوں نے شرکت کی تب بیچارے عوام مسلمان بھی پھنس گئے۔ اگر وُہ ہندو (گاندھی) ایسا ہی تھا جیسا کہ بعض بداندیش سمجھے ہُوئے تھے یا اب تک بعض سمجھے ہُوئے ہیں ، تو محمد علی تو پاس رہے ہیں ، اُن کا فیصلہ دیکھ لو کہ کس طرح الگ ہُوئے تھے۔“[1]

احرار پارٹی

پنجاب میں کانگرس کے مفادات کا تحفظ ”احرار پارٹی“ کر رہی تھی۔ احرار پارٹی حقیقت

---

[1] اشرف علی تھانوی ، مولوی : الافاضات الیومیہ ، جلد پنجم ، ص ۸۸ ، ۸۹

میں جمعیۃ العلماء ہند کی ذیلی شاخ تھی جس طرح خود جمعیۃ العلماء ہند ہی کانگرس کی شاخ ہے ۔ احراری حضرات پھر گاندھی پرستی اور زنار دوستی میں کسی دوسرے گاندھوی سے پیچھے کس طرح رہ سکتے تھے؟ کانگرس بھی ان کی دل وجان سے سرپرستی کا فریضہ ادا کر رہی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات نے مسلمانوں کا سرتاج بننے کے بجائے گاندھی، نہرو اور پٹیل کا نعلین بردار بننا برضا ورغبت قبول کیا ہوا تھا ۔ ظفر علی خاں لکھتے ہیں:

میں نے کل پوچھا یہ "صدرِ مجلسِ احرار" سے
بندہ پرور آپ کیوں ہیں خاکساروں کے خلاف
گر عقائد کی بنا پر آپ کی ہے اُن سے جنگ
کیوں نہیں ہیں آپ پھر زُنّار داروں کے خلاف
چار مشرک ہیں پٹیل و گاندھی و نہرو و بوس
کاش ہوتی آپ کی یلغار ان چاروں کے خلاف
ہنس کے فرمانے لگے ارشادِ عالی ہے بجا
ہو تو جائیں ہم بھی ان مردار خواروں کے خلاف
پل رہے ہیں اُن کے چندوں پر مگر احرارِ ہند
پھر ہوں کیوں وہ اپنے اُن پروردگاروں کے خلاف
کانگرس نے پال رکھے ہیں مدینہ کے کچھ اونٹ
عالمِ اسلام ہے اُن بے مہاروں کے خلاف[1]

احرار پارٹی کے کارنامے گناتے ہوئے مزید اُس کا تعارف کرانے کی یوں کوشش کی گئی ہے:

باوا! تھے مسلمان تو بیٹے تھے مجوسی
پوتے جو ہیں "احرار" وہ کہلائے فلوسی
مل جائے جہاں چندہ، وہی ہے وطن اِن کا
ہندی ہیں، نہ مصری ہیں، نہ چینی ہیں نہ رُوسی

---

[1] ظفر علی خاں: چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۱۴۵

جو بوند مرے خون کی مہاجن سے بچی تھی
پنجاب کے احرار ستم پیشہ نے چوسی
نہرو جو ہے دولہا تو دلھن مجلسِ احرار
ہو پیر بخاری کو مبارک یہ عروسی[1]

مجلسِ احرار کے صدر مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ موصوف ایک شعلہ بیان مقرر اور دیوبندی مکتبِ فکر سے متعلق تھے۔ مسلمانانِ ہند کی نمائندگی کرنے والی واحد جماعت مسلم لیگ سے اِن حضرات کو اُتنا ہی خار تھا جتنا مشرکینِ ہند کو اور شاید کانگرس کے کسی بڑے سے بڑے لیڈر نے بھی مسلم لیگ اور اُس کی ہمنوائی کرنے والوں کے حق میں اتنے گندے الفاظ استعمال نہ کیے ہوں گے جیسے گاندھوی علمأ نے استعمال کیے تھے۔ مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے بارے میں یُوں مرقوم ہے:

"ایک دُوسرے صاحب نے فرمایا کہ احرار کے متعلق ایک شعر ضرور ہونا چاہیے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ احرار کی شریعت کے امیر، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری[2] نے امروہہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جو مسلم لیگ کو ووٹ دیں گے وہ سؤر ہیں اور سؤر کھانے والے۔ او کما قال۔

پھر میرٹھ میں مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی صدر مجلسِ احرار اس قدر جوش میں آئے کہ دانت پیستے جاتے تھے، غصہ میں آکر ہونٹ چباتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ دس ہزار جناح[3] اور شوکت اور ظفر، جواہر لال نہرو کی جوتی کی نوک پہ قربان کیے جا سکتے ہیں۔"[4]

---

[1] ظفر علی خاں: چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۹۷

[2] مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری ۱۳۱۰ھ/ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۱ء میں وفات پائی۔

[3] مراد مسٹر محمد علی جناح، مولانا شوکت علی اور ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار اخبار ہیں۔

[4] ظفر علی خاں: چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۱۰۳

مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری اور دیگر اراکینِ مجلسِ احرار امتیازی خُوبیوں کے مالک تھے۔ دیوبندی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے مولوی ظفر علی خاں نے اِن حضرات کا تعارف یُوں کروایا ہے:

گالیاں دے، جھُوٹ بول، احرار کی ٹولی میں مِل
نکتہ یوں ہی ہو سکے گا حل سیاسیات کا
پہلے ہی دن سے ہیں جب دیدے بخاری کے پٹم
مانگتے پھرتے ہیں کیوں کاجبل سیاسیات کا
خالصہ کا سانڈھ دے جب یہ شریعت کا امیر
کیوں نہ کہیے اِس کو "باباٹل" سیاسیات کا
کیا تماشا ہے کہ زلفِ شرع کی مشّاطگی
کر رہا ہے آج دستِ شل سیاسیات کا
دیکھ لے مظہر علی آظہر کو افضل حق کے ساتھ
ایک پِدّی دوسرا جھانپل سیاسیات کا
مجلسِ احرار کے نیفے کی رونق بن گیا
ایک پِسُّو دُوسرا کھٹمل سیاسیات کا
دخل معقولات میں دیتا ہے کیوں "بڈمولوی"
عقدہ کیا کھولے گا یہ ڈھیل سیاسیات کا
ڈاکٹر کچلو زبر ہیں اور حسام الدین ہیں زیر
یہ دمن اِس عہد کی وہ نل سیاسیات کا
جل گئے مکّہ میں بُھٹّے مولوی داؤد کے
حد سے بڑھ کر گرم تھا بھوبل سیاسیات کا[1]

سُنا ہے کہ مجلسِ احرار نے شہید گنج مسجد کے بارے میں سودا بازی کی تھی۔ اندرونِ خانہ

---

[1] ظفر علی خاں: چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۵۵، ۵۶

سکھوں سے ساز باز تھی اور زبانی ہمدردی مسلمانوں کے ساتھ۔ واللہ اعلم کہ اِس بیان میں کہاں تک صداقت ہے۔ بہرحال اخبار "زمیندار" کے ایڈیٹر کی رائے قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے:

نرالی وضع کا مومن ہے طبقۂ احرار
کہ سر جھکا ہُوا مشرک کے آستاں پر ہے
اِس آرزو میں کہ نہرو کسی طرح خوش ہو
نگاہِ خشم سکندر حیات خاں پر ہے
خدا کے گھر کی تباہی میں حصہ دار ہُوئے
یہ ظلم اُنھوں نے کیا آپ اپنی جاں پر ہے
اشارہ پا کے اُدھر سے شہید گنج کا شور
کئی دنوں سے اُن اشرار کی زباں پر ہے
سُنا کیا جو کئی سال دیر کا ناقوس
لگا ہوا وہی کان آجکل اذاں پر ہے[1]

مولوی مظہر علی اظہر احراری نے کامریڈ محمد حسین ٹین ساز کو مخاطب کر کے یُوں دھمکی دی تھی:

ہم ہیں احرار نہیں ہم سے اُلجھنا اچھا
تری اوقات ہی کیا ہے ابے او ٹین فروش

کامریڈ محمد حسین نے مولوی مظہر علی اظہر احراری کی اِس دھمکی کا جواب یُوں دیا تھا:

میں نے مسجد نہیں بیچی کبھی تیری مانند
ابے او چندے کے بھوکے، ابے او دین فروش[2]

مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری کے سکھوں سے بھی اُسی طرح کے نیاز مندانہ تعلقات تھے

---

[1] ظفر علی خاں: چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۱۰۴

[2] ایضاً: ص ۶۲

جس طرح کے مشرکینِ ہند اور خصوصاً گاندھی و نہرو سے تھے، سکھوں کی طرف سے بھی موصوف پر نوازشات کا سلسلہ جاری رہتا تھا:

احرار کے بُت خانہ سے مظہر کو بُلا لا
منظور بنانا ہو جو مسجد کو شوالا
سرکارِ مدینہ سے ملا مجھ کو بھی کمبل
سکھوں نے بخاری کو جو بخشا ہے دوشالا[1]

اراکینِ مجلسِ احرار کی صفت و ثنا میں اسی سلسلے کے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں:

جاءَ نصرُ اللہ کی ہریانہ سے آئی صدا
رنگ افضل حق کا سنتے ہی جیسے فق ہو گیا
گر پڑے غش کھا کے مولانا عطاء اللہ شاہ
اور کلیجہ مولوی داؤد کا شق ہو گیا
مولوی مظہر علی اظہر کی رُسوائی کا داغ
اُن کی مجلس کے سیہ خانے کی رونق ہو گیا
اُس طرف مندر کا شور اور اِس طرف مسجد کا زور
بیچ میں مظہر علی اظہر معلق ہو گیا
جا ملے کیا سوچ کر احرار سے مُلّائے غوث[2]
سارسوں میں کس لیے شامل یہ لقلق ہو گیا
صدرِ احرار آ گئے لے کر لفنگوں کے پرے
لشکرِ اشرار سے جنگ آزما حق ہو گیا[3]

---

[1] ظفر علی خاں: چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۵۶

[2] مراد، مولوی غلام غوث ہزاروی جو آجکل پاکستان اسمبلی کے ممبر بھی ہیں۔

[3] ظفر علی خاں: چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۵۸، ۵۹

حلقۂ بجنور سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر عبدالسمیع کھڑے ہُوئے تھے اور اُن کے مقابلے پر کانگرس نے حافظ ابراہیم کو کھڑا کیا تھا۔ نام نہاد ابراہیم صاحب کی زنّار دوستی پر دو شعر مزید ملاحظہ ہوں:

کیا قیامت ہے کہ جس کا نام ہی تھا بت شکن
بُت کے آگے سر اُسی ملّت کا جُھک جانے لگے
نغمۂ توحید اب کس کی زباں پر آئے گا
جب خود ابراہیم بندے ماترم گانے لگے [1]

ہزارہ میں جب مسلم لیگ نے نمایاں کامیابی حاصل کی تو گاندھویوں میں یُوں صفِ ماتم بچھ گئی:

جب جیت لیگ کی ہُوئی اور کانگرس کی ہار
روتی تھی سر پکڑ کے گورمنٹ "خان" کی
گاندھی بھی رو رہے تھے یہ کہہ کر کہ ہائے ہائے
سرحد میں ناک کٹ گئی ہندوستان کی
میدان میں جم سکا نہ قدم سرخ پوش کا
جس وقت سر پہ آئی گھڑی امتحان کی [2]

علمائے حقانی اور دینِ متین کی مخالفت میں پوری جولانی دکھانے والے اور ابوالکلام آزاد وجمعیۃ العلماءِ ہند سے احرار پارٹی اور اُن کے جُملہ گاندھوی افراد سے عقیدت رکھنے والے جناب شورش کاشمیری نے احرار پارٹی کی دیانت داری کے بارے میں ایک انکشاف شایع کیا تھا، وہ موصوف ہی کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

”جب مولانا دھتکار کر جانے لگے تو شاہ جی نے روک لیا۔ مولوی صاحب! آپ کہاں جا رہے ہیں؟ آپ تشریف رکھیں، آپ کے خلاف باجماعت (مجلسِ احرار) کے خلاف شورش کچھ چارج لگا رہا ہے۔ مولوی صاحب رُک گئے ہیں.

---

[1] ظفر علی خاں: چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۸۵

[2] ایضاً: ص ۱۲۱

نے ترتیب وار چارج لگانے شروع کیے۔ کانگرس کا روپیہ ساتھ ہزار، دس ہزار کی ایک قسط اور پچاس ہزار کی دوسری قسط اور یونینسٹ پارٹی ...... ابھی فقرہ پورا ابھی نہ ہُوا تھا کہ مولانا غلام غوث نے ایک ایک شق پر زور دیا۔ کچھ دیر تو سنّاٹا چھایا رہا پھر سکوت ٹوٹا۔ مولانا نے تسلیم کیا کہ روپیہ لیا گیا ہے لیکن اِس وقت اُن کے ذہن میں صحیح یاد نہیں کہ یہ رقم کتنی ہے۔ بات صبح پر ملتوی ہوگئی۔

مجھے صاحبزادہ فیض الحسن شاہ، مولانا مظہر علی اظہر کے مکان پر لے گئے، رات وہیں کاٹی۔ مولانا اِس افشاء کو بُرا خیال کرتے تھے اور مضطرب بھی تھے۔ لیکن وہ اخفا کے حق میں تھے۔ میں نے عرض کیا جب تمام لوگ آپ سے روپیہ لے چکے ہیں تو پھر وہ معصوم عن الخطاء کیوں بنتے ہیں؟ رات جو گزری سو گزری، صبح وہی حیث بحث۔ صاحبزادہ صاحب نے ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں کہیں یہ کہہ دیا کہ شورش اپنے الزام واپس لیتا ہے۔ میں موجود نہ تھا، جب پہنچا تو مجھے حیرت ہُوئی۔ خیر دوبارہ وہی قصّہ چھڑ گیا۔

مولانا مظہر علی نے تسلیم کیا کہ روپیہ لیا گیا ہے۔ لیکن اُس کے سزاوار وہ تنہا نہیں بلکہ باقاعدہ مشورے سے رقم لی گئی ہے۔ پہلا دس ہزار روپیہ مولانا داؤد غزنوی نے دیا تھا اور شیخ حسام الدین اُس وقت موجود تھے۔ دوسری قسط بھی اِنہی حضرات کے مشورے سے حاصل کی گئی۔ یعنی شیخ حسام الدین نے مولانا حبیب الرحمٰن کو لدھیانہ خط لکھا کہ وہ کلکتہ میں کانگرس ہائی کمانڈ تک پہنچیں۔ یہ خط لے کر خاقان بابر مولانا مظہر علی کے صاحبزادے لدھیانہ پہنچے۔ مولانا حبیب الرحمٰن کلکتہ گئے۔ مولانا ابوالکلام ایک لاکھ روپے کے لگ بھگ رقم دینے کو تیار ہو گئے مگر سردار پٹیل جو کانگرس کے خازن تھے، اِس سے اختلاف کیا اور پچاس ہزار روپے کی رقم کا چیک لالہ بھیم سین سچر کی تحویل میں دیا گیا، جو اُن کی معرفت دفترِ احرار میں پہنچا، پھر اِس رقم کی بندر باٹ کی گئی۔

وہ رقم جو یونینسٹ پارٹی سے وصول کی گئی اور جس کو بہ اختلاف مولانا نے تسلیم کیا کہ وہ رقم جو دو چار ہزار بطور چندہ فراہم کی گئی یہ تمام مل ملا کر پچانوے یا پچاسی ہزار بنتے تھے۔ جب مولانا مظہر علی نے بتایا کہ نواب زادہ نصر اللہ کے سوا ورکنگ کمیٹی کے ہر امیدوار نے اُن سے روپیہ لیا ہے، تو سب نے تسلیم کیا۔ شیخ حسام الدین بھی مان گئے، ماسٹر تاج الدین نے بھی سر ہلا دیا، مولانا حبیب الرحمٰن نے بھی صاد کیا۔ اس مجموعی رقم میں سے لے دے کر صرف بیس ہزار بچتے تھے۔ مولانا مظہر علی نے دس ہزار اپنے الیکشن کا صرفہ بتایا اور دس ہزار روپے کے متعلق کہا کہ وہ روزنامہ آزاد نکالنے کے لیے جمع رکھا گیا ہے۔"[1]

؎ وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زُہد کی
میں کیا بتاؤں رات مجھے کس کے گھر ملے

تھانوی صاحب کے خلیفہ عبدالماجد دریابادی نے مدرسۂ دیوبند سے گاندھوی فیض حاصل کرنے والے طلبہ اور متعلقین کی تبلیغی مساعی کے ساتھ اُن کی موحدانہ شان کا ایک المناک منظر یوں پیش کیا ہے:

"آج چار دن سے اِس قصبہ (دریاباد) پر کانگرسی خیال کے مسلمانوں کا دھاوا ہے۔ دیوبند کے طلباء کا ایک دستہ آیا ہُوا ہے اور اپنے مسلک کی تبلیغ یا کوششِ تبلیغ میں مصروف ہے۔ اِس میں مضائقہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر فریق یہی کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے لیکن ایک عجیب وغریب بات یہ ہے کہ کام مسلمانوں کے اندر کرتا ہے لیکن تعلقات یہ تمام مسلمانوں سے توڑے ہوئے ہے اور قصبہ کی غیر مسلم آبادی سے جوڑے ہُوئے ہیں۔ قیام اُن کا دھرم سالہ میں ہے، حالانکہ قصبہ میں ایک نہیں دو سرائیں مسلمانوں کی موجود ہیں۔ اِن کا رہنا سہنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا تمام تر ہندوؤں کے ساتھ، اُنھیں کے درمیان اور

---

[1] شورش کاشمیری: ہفت روزہ چٹان، بابت ۱۶ اپریل ۱۹۵۱ء

> اُنھیں کا سا ہے۔ حد یہ ہے کہ اِن سطور کے راقم کو جب بھی اُنھوں نے سرفراز کیا تو ہمیشہ ہندوؤں ہی کے حلقہ میں۔ یہاں تک کہ ایک دن مسلمان صاحب تو ایک تھے اور اُن کے ہندو رفقا تین کی تعداد میں، گویا توحید تثلیث کے نرغہ میں۔ اِس سے قبل سنٹرل اسمبلی کے الیکشن کے وقت تو یہ منظر دیکھنے میں آیا تھا کہ نیشنلسٹ مسلمان امیدوار کے کارکن اور باقاعدہ پولنگ ایجنٹ تک ہندو ہم مسلک یا سیاسی نظریہ کے غلط یا صحیح ہونے کا یہاں ذکر نہیں، ذکر یہاں صرف اِس ناقابلِ حل معمّہ کا ہے، اچھوت بنائے جانتے ہوئے سنا تھا، پڑھا تھا، اچھوت بنتے ہُوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔“[1]

یہ حضرات اچھُوت کیوں نہ بنتے؟ جنھوں نے اپنے قلوب سے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت نکال ڈالی تھی اور اُن کی شان میں نازیبا الفاظ جاری کرتے اور گستاخانہ نظریات کی نشر و اشاعت کرنا اپنا محبوب مشغلہ بنا لیا تھا، اُن کے دلوں میں گاندھی جیسے دشمنِ اسلام و مسلمین اور ٹھیٹ بُت پرست کی الفت اِس طرح جاگزیں ہُوئی کہ گوسالہ، سامری کی طرح اُس کی پرستش ہونے لگی اور شب و روز اُس کی بارگاہ میں بڑے بڑے صاحبانِ جُبّہ و دستار اور امام الہند و شیخ الاسلام بھی سجودِ عقیدت کے نذرانے پیش کرنے لگے۔ مسلمانوں کو مشرک اور بدعتی ٹھہرانے والے اگر ہنود کے برادرانِ دینی و یقینی نہ بنتے تو اور کس کے بنتے؟ ملّتِ اسلامیہ سے کٹ جانے والے اگر دشمنانِ اسلام کے غلام نہ بنیں تو اَور کس کے بنیں؟ یہ اُن حضرات کا اپنا ہی فیصلہ ہے کہ مسلمانوں کا بھائی بننا ناپسند کیا اور بُت پرستوں کا غلام بننا دل و جان سے پسند کیا۔ بزرگوں سے تعلق رکھنے کے منکر اور اُن کی فاتحہ کو بدعت و حرام ٹھہرانے والے اپنے باپو شہید کی پوجا پاٹ اُس کی موت کے بعد بھی یُوں کرتے رہے:

> ”حافظ بعیت اللہ رکن جمعیۃ العلماء ہند اور حضرت بابا خضر محمد سابق سرپرست جمعیۃ العلماء ہند کان پور نے مہاتما گاندھی کی رُوح کو خراجِ عقیدت پیش کرنے

---

[1] اخبار صدق لکھنؤ، بابت ۲ر فروری ۱۹۴۶ء

کے لیے قرآن کریم کی آیتیں اُن (گاندھی) کی تصویر کے سامنے بیٹھ کر پڑھیں اور اُن کی روح کو بخش دیں۔" الخ[1]

؎ صورت تو مومنانہ ہے بیشک حضور کی
سیرت کا گوشہ گوشہ مگر ہندوانہ ہے

یہاں ایک تلخ حقیقت کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہُوں کہ چودھری حبیب احمد صاحب نے ایک ضخیم کتاب تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء کے نام سے لکھی۔ اُس میں گاندھوی علماء کی غیر اسلامی روش اور ہندو نوازی کا تذکرہ نیز تحریکِ پاکستان کے راستے میں اُن حضرات کی رکاوٹوں کا اخباری بیانات کی روشنی میں سیر حاصل ذکر کیا ہے لیکن مسٹر پرویز کے معتقد ہونے کے باعث نیشنلسٹ علماء کے مقابلے پر ہر جگہ مسٹر پرویز جیسے دشمنِ اسلام کو پیش کرتے رہے ہیں۔ موصوف کا ارشاد ہے کہ گاندھوی علماء کا جتنا مقابلہ ہمارے پرویز صاحب نے کیا اُتنا کسی اور سے کب بن پڑا، ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ علمائے اہلسنت اُن کے نزدیک کسی گنتی شمار میں نہیں۔

چودھری صاحب چونکہ تاحال بقیدِ حیات ہیں لہٰذا ہم یہ عرض کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ تحریکِ پاکستان کے وقت ہندوستان میں مدعیانِ اسلام کی تعداد دس کروڑ تھی، جن میں سے نو کروڑ سے زاید اہلسنّت وجماعت کا وُہ سوادِ اعظم تھا جسے مبتدعینِ زمانہ نے بریلوی جماعت کے نام سے متعارف کیا ہوا ہے۔ باقی جملہ فرقوں کے افراد کی مجموعی تعداد ایک کروڑ سے بھی کم تھی۔ دیوبندی، اہلحدیث، جماعت اسلامی، پرویزی، گاندھوی اور مرزائی وغیرہ سارے مل کر مسلمانانِ اہلسنت وجماعت کا عشرِ عشیر بھی نہ تھے۔ سُنّی کانفرنس بنارس میں پانچ ہزار علماء ومشائخ نے شمولیت کی۔ سُنّیوں کے بیس ہزار رہنما یعنی علماء و مشایخ سُنّی کانفرنس کے رُکن تھے۔ گویا اتنے رہنما تھے اور اتنی قوم تھی۔ کیا چودھری صاحب ہمیں یہ بتا سکتے ہیں کہ مسٹر پرویز کی قوم کتنی تھی؟ اُس قوم کے کتنے حضرات نے پاکستان کے حق میں

---

[1] اخبار سیاست کان پور، بابت یکم فروری ۱۹۵۷ء

ووٹ دیے؟ پرویزی حضرات کے ووٹوں سے آیا مسلم لیگ کا ایک بھی مرکزی یا صوبائی اسمبلی کا ممبر کامیاب ہوا؟ اگر کوئی ایک بھی ایسا ہے تو اُس کا نام بتا دیا جائے ورنہ واضح کیا جائے کہ پرویز صاحب کا قیامِ پاکستان میں حصہ ہی کیا ہے؟ اگر کوئی حصہ ہو بھی تو مسلمانوں کا ان کے بیانات سے کیا تعلق؟ اگر کوئی ہندو یا سکھ یا عیسائی بھی پاکستان کی حمایت کرتا تو کیا اِتنی بات سے وہ مسلمانوں کا رہنما بن سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اِسی طرح مسٹر پرویز کے کاغذی بیانات کچھ بھی ہوں لیکن نہ مسلمان اُن کے ساتھ ہیں نہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ جب تک وہ دائرۂ اسلام میں نہیں آتے اُس وقت تک مسلمانوں اور پرویزیوں کا معاملہ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ والا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ چودھری صاحب اور دُوسرے پرویزی حضرات پر احقر کی یہ وضاحت گراں گزرے لیکن حقیقت کو چھپانا دین وملت کی بدخواہی اور غداری ہے جسے یہ ناچیز ہرگز پسند نہیں کرتا۔

علمائے اہلسنت کی فہمائش

گاندھی علماء اور لیڈروں نے جب خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا ہی کو بُھلا دیا تھا، ہنود کی خوشنودی پر سب کچھ قربان کر چکے تھے تو کسی رہنما کی فہمائش پر کب کان دھرنے لگے تھے۔ بُت پرست نوازی کے منازل طے کرتے ہُوئے چودھویں صدی میں ایک پُراسرار اور نرالا جہاد بھی ایجاد فرمایا۔ بقائے خلافت اور تحفظِ مقاماتِ مقدسہ کے نام پر وہ جہاد جاری کیا کہ جب پردہ اُٹھا تو صاف نظر آگیا کہ یہ مشرکینِ ہند کی حمایت میں سوراج کی خاطر تحریکِ ترکِ موالات یعنی نان کوآپریشن سکیم تھی۔ مولانا سلیمان اشرف مرحوم نے اِس کے بارے میں لکھا ہے؛

> عُوام سُدیشی کا استعمال کریں یہ اُن کا جہاد ہے۔ اعزازی عہدے واپس کیے جائیں۔ یہ آنریری کام کرنے والوں کا جہاد ہے۔ کونسل کی ممبری چھوڑ دینا آنریبل ہونے والوں کا جہاد ہے۔ سب سے بڑا جہاد طلباء انگریزی خواں کے لیے ہے۔ وہ موجودہ نظامِ تعلیم کو جب تک نہ چھوڑیں گے مجاہدین میں اُن کا شمار قطعاً نہ ہوگا۔ ساری وعیدیں جو تارکینِ جہاد کے لیے ہیں ایک وعید

بھی اُن میں سے باقی نہ رہے گی جو طلباء پر صادق نہ آ جائے۔ موجودہ نظامِ تعلیم کے ترک میں تاخیر و تدبر بھی گناہِ کبیرہ ہے۔ والدین و اساتذہ کے استشارہ و استرضا کی بھی حاجت و فرصت نہیں۔

وہ جہاد جسے فرضِ عین کہا گیا تھا۔ وہ جہاد جس میں اولاد کو والدین اور زوجہ کو زوج کی اجازت کی حاجت نہ تھی۔ وہ جہاد جس کے لیے نفیرِ عام ثابت کیا گیا تھا۔ وہ جہاد جس کے معنوں کا کسی وقت شمار کیا گیا تھا۔ وُہ جہاد جس کی صورتِ خاص آج تک غیر متعین تھی۔ وُہ یہی مسئلہ نان کوآپریشن ہے۔۔۔ ہاں یہ ساری فتوے نویسی اور مجالس کی گرما گرمی صرف اسی لیے تھی کہ نوجوانوں کو والدین و اساتذہ سے سرکشی و تمرد پر اچھی طرح آمادہ کر دیا جائے تاکہ ملک میں ہنگامہ آرائی کے لیے ایک کافی تعداد پڑھے لکھے ناتجربہ کاروں کی ہاتھ آ جائے"۔[1]

اِس کے ساتھ ہی گاندھی جی کی سرکار سے اِن حضرات کو ہجرت کا الہام ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا، اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا کہہ کر عمل پیرا ہو گئے۔ ملازمتیں اور کاروبار چھوڑ دیے۔ مسلمانوں کی جائیدادیں ہندوؤں کے ہاتھوں کوڑیوں کے بھاؤ بکنے لگیں۔ مسلمانوں کو برباد کرنے کی یوں رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ مسلمانوں کی اِس خانہ بربادی میں ہندوؤں کی خانہ آبادی تھی۔ یہ اُجڑ رہے تھے وُہ بن رہے تھے۔ ہندو لیڈروں نے تو ایک تیر سے دو شکار کر لیے کہ اپنی قوم کو آباد اور مسلمانوں کو برباد کر دیا لیکن مسلمانوں کے لیڈروں کو خیر خواہِ مِلّت کہا جائے یا بدخواہ، رہنما کہا جائے یا غدارانِ قوم، جن علماء نے اِس گاندھوی جہاد (نان کوآپریشن) اور ہجرت برائے افادہ ہنود کو شرعی حکم کا لباس پہنایا، اِسے آیات و احادیث سے مزین کر کے خدا اور رسول کا حکم بنا کر دکھایا اُنھیں خدا کے بندے کہا جائے یا گاندھی کے؟ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اُمتی کہلانے کے حقدار ہیں یا دشمنِ اسلام و

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۴۱

مسلمین ، بُت پرست گاندھی کے ؟ اِس صورتِ حال پر ایک خیر خواہِ ملت کی نوحہ خوانی ملاحظہ ہو:

"جہاد اور ہجرت اِن دونوں اہم و اعظم مسئلوں کو جس طرح اس دور کے علمائے سیاسی نے تباہ کیا ہے تاریخ اسلام اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ مسلمانانِ ہند کا جو نقصان اِس مدلّس و کاذب فتوٰی نویسی سے ہُوا دیکھیے اُس کی اصلاح کیونکہ ہوتی ہے اور کتنا زمانہ چاہتی ہے ، علی الخصوص لفظ جہاد میں کچھ وہ برقی قوت تھی کہ اِس کے سننے سے غیر مسلموں کو ٹھنڈا پسینہ آتا تھا اور مسلمانوں کے مردہ افسردہ قلوب میں حیات و تازگی۔

اِس موقع سے قبل جب کبھی اور جہاں کہیں بھی یہ لفظ کہا گیا تو مثل دیگر کلمات کے اِس نے اپنے تلفظ کو وہ ہوائے مکیف ثابت ہونے نہیں دیا جو ایک مرتبہ ٹکرا کر ہوا کی موجوں میں گم ہو جائے اور اِس کرۂ ارضی پر اُس کا نام بھی غیر قارّہ اشیاء کی فہرست میں منسلک ہو جائے بلکہ جب کبھی یہ لفظ کہا گیا اور مسلمانوں کے کانوں تک پہنچایا گیا ہے تو کفر و شرک کی بنیادیں ہِل گئی ہیں۔ مخلوق پرستوں اور خدا کے دشمنوں میں زلزلہ پڑ گیا ہے۔ تاریخِ اقوام اور جغرافیہ ملکی میں ہمیشہ ایک عظیم تغیّر پیدا ہو گیا ہے۔ اِس لفظ جہاد کے کہنے اور سننے کے ایّام صفحاتِ زمین پر ہمیشہ خون کی سُرخی اور نوکِ سنان و شمشیر سے لکھے گئے ہیں۔

لیکن آج تم نے مسلمانوں کی اس سیزدہ صد سالہ عظمت کو اپنے قدموں کے نیچے روند ڈالا۔ آج تم نے سات کروڑ مسلمانوں کی دینی غیرت کو یوں ذلیل و خوار کیا۔ دیکھو غیر مسلم قومیں تم پر ہنستی ہیں۔ نہ انگریزوں میں تمھاری ہیبت رہی نہ ہندوؤں میں تمہارا خوف رہا۔

تم اور تمہارا دین ، تم اور تمہارا مذہب ، تم اور تمہاری مذہبی تعلیم ، تم اور تمہارے دینی احکام ، سب کے سب نگاہِ غیر مسلم میں ہیچ و فرومایہ ثابت ہُوئے لیکن اس کی تمھیں کیا پروا ، جبکہ تقریبًا ایک ملک کا خراج تمہارے گھروں میں پہنچ گیا۔ جبکہ ہزاروں انسان تمھیں اپنے دوشِ عقیدت پر لیے لیے پھرے۔

> جبکہ ہر روز شاہانہ دستر خوان سے کام و زبان نئی نئی لذتیں لے رہی ہیں ، تو پھر اِن نعمائے خلدِ بریں کے مقابلہ میں اسلام کیا ہے اور ایمان کیا ؟
>
> اے سرمستانِ بادۂ لیڈری ! ذرا ہوش میں آکر ہمیں بتاؤ کہ تم سوراج کے لیے اٹھائے گئے تھے یا خلافت کے لیے تم نے ہندوؤں کو آمادہ کیا تھا ، تم اسلام کی نشر و تبلیغ کا عَلم لے کر بڑھے تھے یا کفر و شرک کی حکومت قایم کرنے کی غرض سے یہ لشکر آرائی کی گئی تھی ، اسلام کی حقانیت اور ارکانِ اسلام کا غیر مسلم کو گرویدہ بنانا تمھارا نصب العین تھا یا خود کفر و شرک کے جال میں پھنس کر آزادیِ ہند کا ترانہ سنانا مقصود و مطلوب تھا ؟" [1]

موصوف نے اِس موقع پر اُس ہندو نواز اور زنّار دوست ٹولے سے ایک سوال کیا جو ہر مسلمان کے دل کی آواز ہے اور اِن کی روش کے پیشِ نظر ہر خیر خواہِ دین و ملّت کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے اُٹھتا اور اُسے مضطرب کر کے رکھ دیتا تھا ۔ وہ سوال حضرت علّامہ ہی کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے :

> "یہ سارے اعمال جو وقوع پذیر ہوئے اور ہو رہے ہیں ، اِن سے ہندوؤں کے مطالب و مقاصدِ مذہبی و ملکی کا تکملہ ہو رہا ہے یا اسلام اور اسلامی خلافت کی خدمت انجام پا رہی ہے ، چوبیس کروڑ ہندوؤں کا قدم خلافتِ اسلامی کی طرف بڑھا یا سات کروڑ مسلمانوں نے بڑھ کر سوراج اور مراسمِ کفر و شرک کو لبیک کہا ؟ مسلمان ہندوؤں کے ہو گئے یا ہندو مسلمانوں کے ہو رہے ہے ، مسلمانوں کے قلوب آہنی تھے یا مقناطیسی ، مسلمانوں نے مقناطیس بن کر ہندوؤں کو اپنی طرف کھینچا یا ہندوؤں نے اپنی مقناطیسی سے اِنھیں اپنے میں جذب کر لیا ؟ اِس کا جواب واقعات سے ہونا چاہیے نہ خطیبانہ عبارت آرائی سے ۔" [2]

موصوف نے اِن حضرات کو کلمہ گوئی کا پاس لحاظ کرتے ہوئے ، اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا

---

[1] سلیمان اشرف ، مولانا : النور ، ص ۴۵ ، ۴۶

[2] ایضاً : ص ۴۸

ثبوت دیتے ہُوئے بڑے درد بھرے انداز میں بالغ نظری سے اُن کی کرتوت کا مآل سمجھایا اور یُوں نہایش کی ہے:

"علم برداران نان کو آپریشن و سوراج! قیامت ایک دن ضرور قایم ہوگی، جہاں اوّلین و آخرین کا مجمع ہوگا اور پھر لِمَنِ المُلکُ الیَومَ۔ لِلّٰہِ الوَاحِدِ القَھَّار کی دل کپکپا دینے والی آواز کے ساتھ تختِ رب العالمین سامنے ہوگا . . . . اُس دن تمھارے سرائر و مخفیات کھُل جائیں گے . . . . اُس دن تمھیں اُس جلیل و جبّار، قادر و قہّار کے سامنے جاکر اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا . . . . تمھاری کیا حالت ہوگی اور تمھارے اِن اعمال کا ترازوئے عمل پر کیا وزن ہوگا؟ خلافت اور دین کا نام لے کر سوراج اور تلقیناتِ گاندھی میں فنا ہوجانا کیا نتیجہ لائے گا . . . . . یقین کرلو کہ اُس روز تمھاری تلبیس کی چادر پارہ پارہ ہوگی اور تدلیس کا جال ریزہ ریزہ۔ یہی لیڈری اُس دن تمھیں وبال ہوگی اور یہ ہردلعزیزی تمھیں رُسوا و خوار بنائے گی۔ آج وہ بھیڑ وانبوہ جس پر تمھیں ناز و تبختر ہے، آج وہ ہنگامہ و ہجوم جس پر تمھیں اعتماد و سہارا ہے، کل بروزِ قیامت تم سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوگا . . . . یہ گروہِ معتقدین، یہ مجمعِ ارادت منداں جو آج تمھیں اِس درجہ محبوب ہے کل بروزِ حشر تم اِس سے خفا ہوگے اور دست بردار۔ شامتِ اعمال کا وبال سامنے ہوگا اور یہ ہیکڑی خاکِ سیاہ۔"[1]

اِس گاندھی گردی کے دور میں مسلمانوں کے لیڈر کہلانے والوں اور گاندھوی علمائے سے کیسے کیسے افعال و اقوال شنیعہ و قبیحہ سرزد ہُوئے اُن کا تذکرہ کرتے ہُوئے موصوف یُوں رقمطراز ہیں:

"لا الٰہ الا اللہ۔ گاندھی نے کس حُسنِ تدبیر سے مسلمانوں کو اپنا اور اپنے مذہب کا غلام بنالیا۔ ایک برس بھی گزرنے نہ پایا جو حمایتِ خلافت سے نہ صرف ہندو دست کش ہوگئے بلکہ اس عیّارانہ چال سے خود مسلمانوں ہی کے

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۴۹، ۵۰۔

ہاتھوں نے مسئلۂ خلافت کو دھکے دے کر پسِ پشت ڈال دیا۔ خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین کی جگہ گاندھی کو دی گئی۔ اب یہ مدعیانِ اسلام اِسی کی کوشش کر رہے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے گاندھی کی محبت و عظمت سے کوئی قلبِ مومن خالی نہ رہنے پائے۔ کوئی امام مہدی علیہ السلام کا مثیل کہتا ہے۔ کوئی یہ کہتا ہے کہ اگر نبوت ختم نہ ہو گئی ہوتی تو گاندھی نبی ہوتا، یعنی نبوت کے ماتحت جو سب سے بڑا رُتبہ و منصب ہو سکتا ہے وہ گاندھی کا ہے۔ کوئی اپنے کو پس رَو گاندھی کا کہتا ہے اور اسلام کی نجات کا اُسی کے ہاتھوں سے یقین رکھتا ہے۔ مسلمان اپنے کانوں سے سُنتے ہیں، آنکھوں سے اخبارات میں یہ مضامین دیکھتے ہیں، پڑھتے ہیں، پھر بھی عالمِ وجد و تواجد میں آ کر واہ ہمارے لیڈر روا شاباش ہمارے لیڈر روا کی رٹ لگاتے جاتے ہیں۔"[1]

فخرِ اہلسنّت، خیر خواہِ دین و ملّت، علاّمہ سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ نے اِن حضرات کی گمراہ گری اور اقوالِ شنیعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے بارگاہِ مجیب الدعوات میں یوں دستِ دعا دراز کیے تھے:

"انتہائی بدنصیبی یہ ہے کہ آج اُس دینِ حنیف اور ملّتِ بیضا کے نہ صرف پیرو بلکہ اس مذہب کے عالِم و علاّمہ ہونے کے مدعی اور علم کے ساتھ کسی سلسلۂ طریقت کے شیخ ہونے کا جو ادّعا رکھتے ہیں، جن کے ہاتھوں پر سیکڑوں مسلمان بیعتِ طریقت کر کے وصول الی اللہ کی راہ پانا چاہتے ہیں، آج وہ ہیں کہ صاف لفظوں میں یہ کہہ رہے ہیں کہ: — گاندھی مذکرہ ہے — پس رَو گاندھی کا ہوں — گاندھی کو اپنا رہنما بنا لیا ہے — اسلام کی نجات گاندھی کے ہاتھوں سے ہوگی — لا الٰہ الاّ اللہ۔ اِن مدّعیانِ علم نے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ کی جو تفسیر کر اس وقت اپنے اقوال و افعال سے

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۴۶، ۴۷

کی ہے، اُس سے اسلام اور اسلام کی تعلیم بیزار ہے۔ حق سبحانہٗ انھیں ہدایت فرمائے اور اِن کا کھویا ہوا ایمان پھر انھیں مرحمت فرمائے بحرمۃ النبی والہ الامجاد"۔[1]

رت علاّمہ مولانا سلیمان اشرف بہاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دیدہ ور کی طرح اِن حضرات کی رتوت اور اقوالِ شنیعہ کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیتے ہُوئے مزید فہمائش کی اور خیر خواہی کا ادا کرتے ہُوئے مآل سمجھایا ہے۔ آپ کے یہ ایمان افروز الفاظ گاندھوی حضرات کے لیے ور اسرافیل اور منصف مزاج کے لیے لمحۂ فکریہ ہیں۔ موصوف رقمطراز ہیں:

"مدینہ اخبار بجنور ۲۱ فروری ۱۹۲۰ء میں مسٹر شوکت علی کی تقریر شایع ہوئی تھی اُس کے دو فقرے نقل کرتا ہوں: زبانی جے پکارنے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ اگر تم ہندو بھائیوں کو راضی کرو گے تو خدا کو راضی کرو گے ——— بھائیو! خدا کی رسّی کو مضبوط پکڑو۔ اگر ہم اِس رسّی کو مضبوط پکڑ لیں گے تو چاہے دین ہمارے ہاتھ سے جاتا رہے مگر دنیا ہمیں ضرور ملے گی۔"

یہ فقرات جہاں یہ بتا رہے ہیں کہ مطمحِ نظر اِن حضرات کا کیا ہے، مذہب کی حقیقت اور وقعت اِن کے نزدیک کس قدر ہے، دین و مذہب کا نام کیوں لیا جاتا ہے، وہاں یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہنود کے ساتھ اِنھیں کیسی عقیدت و ارادت ہے۔

چنانچہ جلسۂ جمعیۃ العلماء میں جس کا انعقاد بماہ نومبر دہلی میں ہُوا، مسٹر شوکت علی نے صاف الفاظ میں یہ کہا: ——— "اے اللہ! ہم سے ایک نیک کام ہوگیا ہے کہ میں اور مہاتما گاندھی یقینی بھائی ہوگئے ہیں۔" (فتح دہلی، ۲۴ نومبر ۱۹۲۰ء) پھر ایک عالم نے یہ کہا: ——— "خدا نے اُن (گاندھی) کو ہمارے واسطے مذکّر بنا کر بھیجا ہے، قدرت نے اُن کو مدبّر بنا کر بھیجا ہے۔" (فتح دہلی، ۲۴ نومبر ۱۹۲۰ء)۔

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۶۳

ایمان سے کہیے، یہ جمعیۃ العلماء ہے یا اُمتِ گاندھی کا حلقہ؟ یہ اسلام اور شارع علیہ السلام کی طرف اللہ کے بندوں کو دعوت دے رہی ہے یا گاندھی کی نبوت تسلیم کرا رہی ہے؟ یہ حضرات اسلام کی ہمدردی میں انگریزوں سے لڑنا چاہتے ہیں یا دینِ گاندھی کی حمایت ہیں؟ پھر اگر کسی نے اِن کی بات نہ سُنی تو کافر، منافق، یزیدی، ملعون اور جہنمی کیونکر ہُوا؟

لیڈرانِ قوم! آج اخبار و جرائد تمہارے ہاتھوں میں ہیں، جیسے چاہو گالیاں دو، کافر کہو، حق کو باطل اور باطل کو حق کہو اور چھاپ کر شائع کرو۔ اِس وقت تو تمہاری بات بن آئی ہے، مخلوق اندھی ہوگئی ہے لیکن ایک وقت آئیگا اور ساری حقیقت عُریاں ہو جائے گی۔

میدانِ کربلا میں یزیدیوں نے بعد شہادتِ شہزادۂ کونین سیدنا امام حسین علیہ السلام فتح کے نقّارے بجائے، دودمانِ نبوّت کو جس طرح چاہا، اسیر کیا۔ لیکن آج دنیا دیکھ رہی ہے کہ یزیدیوں پر خدا نے ایسی لعنت بھیجی کہ آج تک اُس کا سلسلہ منقطع ہوا نہ قیامت تک منقطع ہو۔ اِس وقت اہلِ حق کے مقابلہ میں تمہیں اپنے انبوہ پر ناز ہے، جیسے چاہتے ہو عوام سے فضیحت و رُسوا کراتے ہو، اہلِ حق فصبرٌ جمیلٌ کہہ کر ضبط کر جاتے ہیں۔

اہلِ حق کے مقابلہ میں مثل یزید دعویٰ اجماع پیش کرتے ہو؟ صریح نصِ قرآن اور نصِ حدیث کی مخالفت اور پھر اجماع کا دعویٰ! کیا احکامِ قرآن کا نسخ اجماع سے جائز ہے؟ اور پھر اجماع بھی ایسے علماء کا جن کے پاس خدا نے گاندھی کو مذکّر بنا کر بھیجا ہے، جو علماء پس رَو گاندھی ہیں۔ جس طرح قرآنِ مجید، توریت و انجیل کا ناسخ ہے اُسی طرح گاندھی کا فرمان آیاتِ الٰہیہ کا ناسخ اِن مدعیانِ علم و اجتہاد کے عقیدہ میں ہے۔ ایسے نجس و ناپاک عقیدے کا اظہار کرتے ہوئے کچھ تو شرمائیے الحیاء شعبۃ من الایمان۔

یزیدیوں نے جب یزید کی امامت و خلافت کا علم بلند کیا تو اہلِ حق کے

متقابل میں اُنھوں نے یہی دلیل پیش کی تھی کہ سارے ملک نے یزید کی امامت تسلیم کرلی، اجماع ہوگیا، صرف چار شخص ہیں جو اُس کی امامت تسلیم نہیں کرتے یعنی عبدالرحمٰن بن ابوبکر، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمر اور سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہم۔ دیکھتے ہو وُہ اجماع یزید کی امامت پر ہُوا تھا، کیسا خائب وخاسر ہوا؟ عبرت پکڑو اور اہلِ حق کو گالیاں دینے سے باز آؤ۔ اُن کی تکلیف اور اذیت رسانی سے اپنے ہاتھ اور زبان کو منع کرو۔ تمھارے دشنام دہی کی یہ ہمہ گیری ہے کہ جہاں تم نے ایک رُکنِ دین، حامیِ شرعِ متین، امامِ اہلسنّت، مجددِ مائۃ حاضرہ، مؤیدِ ملّتِ طاہرہ پر سب وشتم کیا وہاں اِس فقیر بے نوا کو بھی بار بار متعدد جرائد میں تم نے گالیاں سُنائیں۔ میں نے تمھارا کیا بگاڑا تھا؟ بیشک یہ قصور ہُوا کہ جس وقت ساری زبانیں گنگ تھیں مجھ گنہگار کی زبان کلمۂ حق کہہ رہی تھی، جس وقت سارے اقلام خشک تھے مجھ بے بضاعت کا قلم مصروفِ تحریر تھا، جس وقت سارے پاؤں مفلوج تھے مجھ ضعیف کا پاؤں منزل رساں راستہ پر تھا۔ انصاف کرو اِس میں میری کیا خطا ہُوئی؟

یہ تو اللہ کا فضل تھا، تم ہلالِ احمر کے نام سے چندہ وصول کرتے تھے اور دادِ عیش ونشاط دیتے تھے۔ زرکشی کے لیے جس طرح کے مضامین ضروری تھے تم اُنھیں کو لکھتے، اُنھیں کو کہتے تھے لیکن اِس فقیر کو خلافت کی لَو لگی تھی، اِس لیے ترکوں کی مختصر تاریخ پھر اُن کی خلافت، اُن کی اطاعت اور اُن کے حقوق دلیل وبُرہان کے ساتھ لکھ کر مسلمانوں کے سامنے پیش کردیے۔ دیکھو فقیر کا رسالہ البلاغ۔ تمھیں مسئلۂ خلافت کی اب آکر جو دُھن بھی بندھی تو ایک کافر کے تذکیر وتلقین سے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ خلافت کی جگہ سوراج نے خلیفۃ المسلمین سے کہیں ارفع واعلیٰ مقام گاندھی نے اور شیخ الاسلام کا لقب شیخ الہند نے لے لیا۔"[1]

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۲۲۶ تا ۲۲۹

اُسی زمانے میں گاندھوی حضرات کے غیر اسلامی نعروں سے متعلق دہلی کے مردِ حق آگاہ سے اُن کا شرعی حکم دریافت کیا گیا۔ وہ سوال اور حضرت مفتیِ اعظم دہلی رحمۃ اللہ علیہ کا ایمان افروز جواب ملاحظہ ہو:

سوال نمبر ۲۳۸

ایک شخص مسلمان جو پہلے انجمن اسلام کا ممبر تھا اب کانگریس میں شامل ہو کر نعرہ ہائے مندرجہ ذیل لگایا کرتا ہے: ——— مہاتما گاندھی کی جے ——— بھارت ماتا کی جے ——— بندے ماترم وغیرہ۔ آیا ایسے شخص سے میل جول رکھنا اور اُس کے پیچھے نماز پڑھنا اور سوشل تعلقات رکھنا درست ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

مستفتی: ——— احمد رضا خاں
ایس۔ پی۔ ڈبلیو۔ آئی ریٹائرڈ

ھو الموفق

گاندھی کو مہاتما کہنا اور اُس کی فتح کے نعرے لگانا شرعًا ناجائز وحرام ہے کہ مہاتما کے معنی ہیں رُوحِ اعظم اور رُوح کا اطلاق قرآنِ پاک میں جان پر بھی آیا ہے اور وحی پر بھی اور حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام کو بھی یہ لقب عطا ہُوا ہے اور حضرت جبرئیل علیٰ نبینا وعلیہ السلام کو بھی۔ پس اِن معانی والقاب پر نظر کرتے ہُوئے اِس کے یہ معانی ہوں گے کہ تمام جانوں میں بڑی جان یا حق تبارک وتعالیٰ کی وحیوں میں بڑی وحی یا حضرت عیسیٰ وحضرت جبرئیل علیٰ نبینا وعلیہم السلام سے بلند مرتبہ۔

اب مسلمان خود ہی غور کر لیں کہ جس لفظ کے یہ معانی ہوں اُس کو ایسے شخص کے لیے جس کو نصوص قطعیہ میں ذلیل سے ذلیل بتایا گیا ہو کیونکر استعمال کیا جا سکتا ہے؟ اسی طرح کفار کی شان میں ارشاد ہوا:

ان یثقفوکم یکونوا لکم اعداء یعنی اگر کفار تم پر قابو پا لیں گے تو تمہارے

ویبسطوا الیکم ایدیھم	دشمن ہو جائیں گے اور تم پر دست درازی
والسنتھم بالسوء ودوا	اور زبان زوری کریں گے اور وہ چاہتے
لو تکفرون ۵	ہیں کہ (ان کی مانند کسی طرح) تم بھی
	کافر ہو جاؤ۔

چنانچہ اس کا مشاہدہ کیا جا رہا ہے کہ جب کبھی بھی ان کو قوت میسر آئی مسلمانوں کا تباہ کرنا اُن کا پہلا فرض رہا۔ اِسی تحریک میں ملاحظہ کر لیجئے کہ باوجودیکہ ابھی کامیابی کی جھلک بھی نہیں دکھلائی دی ہے لیکن ابھی سے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ : گاندھی جی کی جے کے مقابل اللہ اکبر کے نعرے نہ لگاؤ۔ وہ زمانہ گزر گیا جس میں ہم خاموشی کے ساتھ یہ نعرے سُنتے رہے ، اب ایسا نہیں لگا سکتے۔" دو روز ہُوئے کہ جمعیۃ افاغنہ چوموں (ریاست جے پور) کا ایک خط موصول ہُوا جس میں انھوں نے کلمہ کمیٹیاں بنانے کی استدعا کی ہے اور تحریر کیا ہے کہ :

"یہاں کے مشرکین عام طور پر نقارہ کی چوٹ کہہ رہے ہیں کہ مسلمان اب تو کلمہ ہمارے روبرو نہیں پڑھ سکتے۔ وُہ دن دُور ہُوئے جب وہ ایسے نادان اور بودے تھے کہ اِس کلمے کے سُننے کی تاب لا سکتے تھے۔ اب اُن کو سمجھ آ گئی۔ یہ کلمہ تو ہندو دیوتاؤں کی شان میں گستاخی ہے۔ اِس کو پکارنا ہے تو مکّہ، مدینہ چلے جاؤ، ہمارے دیس میں اِس کا کیا کام ؛ (انتہیٰ بلفظہٖ)

اب شاید یہ کہا جائے کہ یہ تمام ہنود کے اقوال نہیں، ان کا کیا اعتبار ؛ تو پھر ذمہ دار کا قول لیجیے ، رسالہ شدھی سماچار مورخہ ۱۵ جون ۱۹۲۰ء میں بھارت شدھی سبھا (دہلی) کے جنرل سیکرٹری نے شدھی اور سوراج کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اُس کا ترجمہ بعض اخبارات نے چھاپا ہے ، جس کے چند الفاظ یہ ہیں ؛

"ہمیں تو جہاں حصولِ سوراجیہ کے میدان میں لڑائی کرنا منظور ہے وہاں ہم اُن کو دھوکا دے کر قتل کرنے والوں اور پڑوسی لٹیروں سے بھی اپنے گھر کی حفاظت کریں گے جو سر ڈال کر، چھپ کر ہمارے گھر میں نقب لگانے کی تاک میں بیٹھے ہیں۔"

غرض اِس حالت کو دیکھتے ہُوئے اِس تحریک کی فتح یابی (کہ وہی گاندھی کی فتح ہے)، کے لیے نعرے لگانا اپنی بربادی پر نعرے لگانے کے معنی میں ہوگا اور یہ یقیناً حرام ہے۔ بھارت ماتا کی جے اور بندے ماترم کے معنیٰ اگر صرف مادرِ ہند کی فتح ہی کے ہیں، تب بھی چونکہ یہ مشرکین کے خاص قومی نعرے ہیں اور اُن کے شعائر سے ہیں اِس لیے مسلمانوں کو اِن نعروں میں بھی شرکت کرنا شرعاً جائز نہیں لما فیہ التشبیہ الکفار وھو ممنوع۔ فقط

محمد مظہر اللہ غفر اللہ لہٗ

امام مسجد فتحپوری دہلی (١٩٣٠ء) [1]

اِس فتوے کا ہر لفظ کتنا ایمان افروز اور رہنمائی کے جذبات سے بھرپور ہے لیکن افسوس! گاندھوی حضرات مشرکینِ ہند کی محبت میں کچھ ایسے سرشار ہوگئے تھے کہ کسی کی آواز پر کان دھرنا اپنی توہین سمجھنے لگے۔ اِس کے برعکس اُن کی تمام تر لیاقتیں اور صلاحیتیں ہندو مسلم اتحاد کی خاطر وقف ہو کر رہ گئی تھیں۔ چنانچہ مسلم لیگ کے صدرِ محترم عالی جناب حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب نے ترکِ موالات پر زور دیتے ہُوئے اپنی دیانت داری کا یُوں مظاہرہ کیا:

> "حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب نہایت غیظ و غضب اور پُرجوش لہجہ میں ناتمام عبارت ابن جریر کی نقل فرما کر یہ نتیجہ استخراج فرماتے ہیں کہ: "اگر اِس کے بعد بھی یہ کہا جائے کہ نہیں مسلمانوں کو ہندوستان کی دوسری قوموں کے ساتھ بھی ترکِ موالات کرنی چاہیے تو اب کہنے والوں کو خدا ہی بہتر سمجھا سکتا ہے۔ (خطبۂ صدارت مجلس استقبالیہ جمعیۃ العلماء ص ١٥) طرفگی یہ کہ برّ و اقساط کا صحیح ترجمہ خود بالائی سطروں میں حکیم صاحب نے احسان و انصاف تحریر فرمایا ہے لیکن استخراجِ نتیجہ میں موالات کو برّ و اقساط کا مرادف قرار دے کر عوام کو نہایت شرمناک دھوکا دینے کی کوشش کی ہے۔" [2]

موصوف کی اِس کتر بیونت کا یعنی کلامِ الٰہی میں معنوی تحریف کا علامہ سلیمان اشرف بہاری

---

[1] محمد مسعود احمد پروفیسر: فتویٰ مظہری مطبوعہ کراچی، ص ٣٢٨، ٣٢٩

[2] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ٩٤، ٩٥

رحمۃ اللہ علیہ نے تعاقب کرتے ہوئے تفسیر ابن جریر کی عبارت کو مدِ نظر رکھ کر، یُوں گاندھویت کا کھوٹ سمجھایا تھا:

”جن چیزوں کو ابنِ جریر نے آیۂ کریمہ لایتخذ المومنون الکافرین اولیاء کی تفسیر میں موالات کہا تھا اُن میں سے کسی ایک کی بھی اجازت و رخصت آیت لاینھاکم اللہ الخ سے نہ سمجھی نہ نکلی، بلکہ اُن کی ممانعت کی۔ اِس مقام پر مکرّر تصریح فرما کر ہر کافر کے ساتھ ہر حال میں ترکِ موالات پر مُہر فرمادی۔ کیا اب بھی حکیم صاحب یہی ارشاد فرمائیں گے کہ برّ و اقساط مرادفِ موالات ہیں؛ اِن تصریحات کے بعد بھی اگر حکیم صاحب یا اُن کے حوارئین علمائے سیاسی اپنے اِس قول پر کہ ہندؤوں سے موالات یا وداد یا محبت منطوقِ کلامِ الٰہی اور موافقِ تعلیم نبوی ہے، متعصبانہ اصرار فرمائیں تو بجز گاندھی صاحب کے اور کوئی اُنھیں سمجھا نہیں سکتا“[1]

حضرت بہاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے حضرات کی بُت پرست نوازی اور زنّار دوستی پر افسوس کرتے ہوئے اِنھیں شاہراہِ اسلام و ایمان سمجھانے کی، ایک حقیقی خیر خواہ بن کر بڑے درد بھرے دل سے کوشش کی اور اپنے قلبی جذبات کو صفحۂ قرطاس پر سجا کر یُوں گاندھوی حضرات کے سامنے پیش کیا:

”اے پرستارانِ ہنود! کبھی ایمان کی قوت اور اسلامی اخلاق کی کشش بھی تم نے دیکھی ہے؟ کبھی تم نے کلمۂ توحید جس دل پر نقش ہو اُس کے نعرۂ تکبیر کے زور و طاقت کا خیال بھی کیا ہے؟ تمھاری مادّی آنکھیں کفّار کی جمعیت دیکھ کر پتھرا گئیں۔ تمھارے مادّی دماغ کفار کی قوتِ فکریہ سے لرزاں و ترساں ہوگئے۔ لیکن کیا تمھارے پاس بچی کھچی کچھ ایمان کی بھی پُونجی ہے؟ میری دلی دعا ہے کہ اِس کا جواب تم اثبات میں دے سکو، پھر میں تم سے یہ کہوں کہ ایمان

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۹۶

کے نور سے توحید و خدا پرستی کے زور و قوت کا نظارہ کرو تو تمھیں اصلی شاہراہِ عمل معلوم ہو جائے۔ میری درد مندانہ گزارش تعصب اور ہٹ دھرمی سے یکسو ہو کر سنو۔ اِس وقت سیاسی مفتیوں نے الہاماتِ گاندھی سے متاثر و مستفیض ہو کر موالات کی جو تعریف بیان کی ہے اور جن چیزوں کو مصداقِ موالات قرار دیا ہے وہ محض القائے گاندھی کی تعمیل ہے، اِس کا نتیجہ حقیقی اسلامی خدمت سے تغافل و بے پروائی ہے۔"[1]

ایک مقام پر آپ نے مسلمانوں کے لیڈر کہلانے والوں اور گاندھوی علماء کو زوردار لفظوں میں غیرت دلاتے ہوئے اُن کی لیڈری اور علاّمگی کی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

"اے گروہِ ناخدا ترس! اے جماعتِ علمائے سوء! یُوں کہو کہ یہ احادیث اور یہ حکمِ الٰہی تو آج تک تمھیں نَسْيًا مَّنْسِيًّا رہا ہے، اِس لیے کہ تمھارا رہبر اور تمھارا مذکِّر تو گاندھی ہے۔ آج تک اُس نے تمھیں یاد نہ دلایا تو پھر تمھیں یاد کیونکر آتے؟ اگر قرآن شریف یا کتبِ احادیث و سیر تمھارے رہبر و مذکِّر ہوتے تو تمھیں سب کچھ یاد آجاتا۔ فی الحقیقت تم معذور ہو، تمھارا مرتبہ عوام کا ہے، تمھارے دماغ علوم سے خالی، تمھارے سینے جذبات سے کورے، تمھارے قلوب دولتِ ایمانی سے مفلس، تمھاری زبانیں گنگ اور تمھارے اقلام خشک۔ تم تو ایک قالبِ بے جان ہو۔ جو تمھارے لیڈر کہتے ہیں تم اُسی کی محاکات کر دیتے ہو اور اُن لیڈروں کا منبعِ فیض سرکار گاندھی اور اُن کی ہنود پارٹی ہے۔ سلسلہ یُوں ہے کہ ایک تحریک مسٹر گاندھی پیش کرتے ہیں۔ تعلیم یافتہ مسلمان اُسے لبیک کہتے ہیں، علماء سیاسی کا جبّہ و عمامہ اُسے شرعی جامہ پہناتا ہے۔ اِن علماء کی یہ مجال نہیں کہ وہ بطور خود کوئی تحریک پیش کر سکیں یا کسی تحریک کے سامنے آمنّا و صدّقنا کے سوا کوئی آواز بلند کرنے کی جرأت

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۱۰۶، ۱۰۷

بھی کریں۔"[1]

۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء میں بنارس کے مسلمانوں پر رمضان المبارک میں جمعیۃ العلمائے ہند کے خداوندانِ نعمت یعنی مشرکینِ ہند نے ایک قیامت برپا کر دی۔ سفّاکی کے تمام مرحلے طے کر دیے گئے لیکن ہندو مسلم اتحاد کا راگ الاپنے والے گاندھوی علمأ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اُن کی ہمدردی میں ایک لفظ بھی منہ سے نکالتے۔ اپنے پروردگاروں کی بارگاہ میں تو اپیل کرتے کہ سرکار! ہم تو آپ کے بندۂ بے دام ہیں، ذرا ظلم و ستم ڈھاتے وقت ہماری مخلصانہ غلامی کا کچھ تو لحاظ فرما لیا کیجیے۔ ہندو لیڈروں حتّٰی کہ گاندھی تک نے مسلمانوں کی ہمدردی یا ہنود کے بہبود کو سمجھانے پر ایک منٹ بھی صرف کرنا تضیعِ اوقات شمار کیا، بلکہ اِس گاندھوی ٹولے کے پاسِ خاطر سے جھوٹ موٹ بھی ایک لفظ تک ہمدردی کا منہ سے نہ نکالا۔ اِن حالات میں تاج العلماء مفتی محمد عمر نعیمی رحمۃ اللہ علیہ دردبھرے دل سے جمعیۃ العلمائے ہند کے سنگدل اور ملّت فروش صاحبانِ جبّہ و دستار سے سوال کرتے ہیں:

> "ہندوؤں کا کلمہ پڑھنے والی جمعیۃ العلماء کو کچھ خبر ہے کہ رمضان المبارک ۱۳۴۹ھ میں بنارس کی سرزمین مسلمانوں کے خُون سے لالہ زار بنا ڈالی۔ ماہ مبارک اُن کے لیے محرم بن گیا۔ درندہ صفت ہندوؤں نے بے گناہ مسلمانوں کو اِس بے رحمی سے شہید کیا جس کے تصوّر سے دل کانپتا ہے۔ گھر کے گھر صاف کر دیے۔ بچے تک قتل کر ڈالے۔ مسجدیں مسمار کر دیں۔ دُکانیں لُوٹ لیں۔ ظلم و ستم کا سیلاب اُمنڈا چلا آتا ہے۔ جور و جفا کے سمندر میں طغیانی تھی۔ مسلّح ہندو گنڈاسوں اور بھالوں سے بے خبر نہتّے مسلمانوں پر بلائے ناگہانی بن کر ٹوٹ پڑتے تھے۔ دھوکے دے دے کر مسلمانوں کو ہندوؤں کے محلے میں لے جا کر شہید کرتے تھے۔ جمعۃ الوداع کی نماز تک مسلمان اِس مصیبت کی وجہ سے ادا نہ کر سکے۔

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۱۵۰، ۱۵۱

> مسلمانوں کی اِس مصیبت کا جمعیۃ العلماء کو کچھ درد ہوا؟ جمعیت کچھ حرکت میں آئی؟ ہندو پرستانہ جذبات کچھ بھی سرد ہوئے؟ ہندوؤں کے فدائی اپنی بے جا فداکاری پر کچھ بھی نادم و شرمندہ ہوئے؟ آئندہ کے لیے انھوں نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے ہوشیار رہنے اور اپنا تحفظ کرنے کا کوئی مشورہ دیا؟ یا اپنے ہندو خداوندانِ نعمت سے کوئی اپیل کی؟ جن کے قدموں پر سر جھکاتے ہیں اُن سے ہندوؤں کے اِن مظالم کی کچھ شکایت کی؟ اپنے قبلہ وکعبہ گاندھی کو لیجاکر بنارس کے مقتل کی سیر کرائی؟ ہندو لیڈروں سے جن کی غلامی کیا کرتے ہیں اِن ہولناک مظالم کو روکنے اور مصیبت زدہ مسلمانوں کے نقصانات کی تلافی کرنے کی کوئی تحریک کی؟ یا ہندو لیڈر اِس جمعیۃ العلماء کی فداکاری کی قدر کر کے مسلمانوں کی دلجوئی کرنے بنارس گئے؟ یا اُنھوں نے ہندوؤں کی اِن امن سوز خونخواریوں پر اظہارِ نفرت وملامت کیا؟ عدمِ تشدّد کا وظیفہ پڑھنے والے گاندھی نے ہندوؤں کے اِس ہولناک تشدّد پر کوئی موثر کارروائی کی؟ تمھاری ہمدردی میں ہندوؤں نے کچھ کیا ہو تو بتاؤ؟ یا اُنھوں نے تمھاری غلامانہ اطاعت شعاری کو بے التفاتی سے ٹھکرا دیا؟ مسلمانوں کے خون کی قیمت اُن کی نظر میں کچھ بھی نہ ٹھہری؟ پھر بھی تمھاری غیرت تمھیں ہندو پرستی کی اجازت دے گی؟ اب بھی تم ہندوؤں کے غلام بنے رہو گے؟ اب بھی تمھاری آنکھ نہ کھلے گی؟ اب بھی مسلمانوں کو ہندوؤں کی اطاعت وفرمانبرداری کی دعوت دیا کروگے؟ کہو اب بھی تمھارا نشہ اُترا یا ہندوستان میں ہر جگہ ایسی ہی بربادی دیکھنا چاہتے ہو؟"[1]

بنارس کے بعد ہندوؤں نے مرزاپور، آگرہ اور دیگر کتنے ہی مقامات پر مسلمانوں کا قتلِ عام کیا۔ لیکن کسی ہندو لیڈر نے افسوس کا ایک لفظ نہ کہا، نہ اپنی قوم کو سمجھانے کا کوئی وعدہ

---

[1] محمد عمر نعیمی، مولانا: السواد الاعظم، بابت شوال ١٣٤٩ھ، ص ٢

ہی کیا۔ اِس کے باوجود مسلمانوں کے لیڈر بننے والوں اور گاندھوی علماء کی زنّار دوستی اور بُت پرست نوازی میں سرِ مُو فرق نہ آیا۔ اِس صورتِ حال کے پیشِ نظر مولانا قاضی احسان الحق نعیمی رحمۃ اللہ علیہ کے قلبی جذبات لفظوں کی صورت میں یوُں صفحۂ قرطاس پر بکھر گئے:

”بنارس کے دلدوز واقعات اور مسلمانوں پر ہندوؤں کے خونخوار حملوں نے جو طوفان برپا کیا تھا ابھی وہ پورے طور پر ساکن نہ ہونے پایا تھا کہ نواحِ بنارس و مرزاپور و آگرہ سے خونی ہنگاموں کی اطلاع ملی۔ ہندوؤں کے نیزے تیر و سنان مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہیں۔ ہندوستان کی جیو ہتّیا نہ کرنے والی قوم مسلمانوں کے خون بہانے پر تُلی ہُوئی ہے اور اُس کی آتشِ غیظ کے تند و تیز شعلے بڑے زور سے بھڑک رہے ہیں۔ ہندو لیڈر اور چند ہندو پرست مسلم نما مسلمانوں کو ہندو مسلم اتحاد کا سبز باغ دکھا کر مغالطہ میں ڈال رہے ہیں مسلمانوں کی جان پر بنی ہُوئی ہے، اُن کے زن و فرزند قتل کیے جاتے ہیں، مال لُوٹے جاتے ہیں، گھر بار برباد کیے جاتے ہیں، مسجدیں مسمار ہوتی ہیں، مگر کوئی لیڈر صاحب پلیٹ فارم چھوڑ کر ہندو مسلم اتحاد کے نعرے لگاتے ہُوئے مسلمانوں کے مقتل میں نہیں پہنچتے اور ہندوؤں کو اِس درندہ وش سفاکی، جفا جوئی سے نہیں روکتے۔ اگر در حقیقت یہ قوم مسلمانوں کے ساتھ کچھ بھی ارادۂ اتفاق رکھتی تو اپنے ہم قوموں کی اِن ہنگامہ آرائیوں و جفا شعاریوں کو روکنے کے لیے میدانِ عمل میں آتی۔ گاندھی صاحب مزے مزے کی تقریروں میں مصروف ہیں اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایسی باتیں کہہ رہے ہیں جیسی باتیں بنیوں نے ہمیشہ بنا بنا کر مسلمانوں کا دیوالیہ کر دیا...... ہمیں اس وقت یہ دیکھنا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار گاندھی ہندوؤں کے اِن مظالم کو دیکھ کر کیوں نہیں گھبرا اُٹھا اور اُس نے اپنی قوم کو جا کر عدمِ تشدّد اور شانتی کا درس کیوں نہیں دیا؟ آج وُہ اپنے اِس رٹے ہُوئے سبق کو کیوں بھُول رہا ہے اور ہندو قوم کو خونخواری سے روکنے کے لیے میدانِ عمل میں پہنچنے کے واسطے اُس کا

قدم کیوں نہیں جنبش کرتا؟ کیا ایسے ہی شخص کو مسلمانوں کا ہمدرد، ملک کا خیر خواہ، امن کا حامی کہا جا سکتا ہے؟"[1]

ہنود کی بے وفائی، محسن کشی، خود غرضی اور عیاری ایک ایسی مسلّمہ حقیقت ہے جس کا ہمیشہ مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔ اِس کے باوجود جو حضرات ہندوؤں کے بندۂ بے دام اور ہاتھ جوڑ کر غلام بنے اُن کی ملّت فروشی میں کون سے انصاف پسند اور صاحبِ عقل و دانش کو شبہ ہو سکتا ہے؟ حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) نے ہنود بے بہبود اور گاندھوی علماء کی ذہنیت کا یُوں تجزیہ کیا ہے:

> "ہندؤوں کی بے وفائی کا ایک دو مرتبہ نہیں، دس مرتبہ نہیں، ہزار مرتبہ نہیں، روزمرّہ ہر کہیں تجربہ ہو رہا ہے۔ اُن کا بچہ بچہ مسلمانوں کی عداوت و ایذا رسانی کے خمار میں مست و سرشار ہے۔ سلطنتِ اسلام کے عہد میں شاہانِ اسلام کے مراحمِ خسروانہ اِس قوم کے حال پر مبذول رہے، اِنھیں تعلیم دی، علم سکھایا، شائستہ بنایا، وزارتیں دیں، عہدے اور منصب دیے، جاگیریں دیں، انعام و اکرام کیے، جن کے اثر آج تک باقی ہیں۔ لیکن اِس قوم کی محسن کشی و غدّاری اُس زمانے میں بھی نہ شرمائی اور عنایات و اکرام کے سامنے ممنونِ احسان ہو کر خمیدہ سر نہ ہُوئی۔ پروپیگنڈے، ریشہ دوانیاں، بداندیشی و بدخواہی اِن کی طرف سے ہمیشہ جاری رہی۔ اچھے سلوکوں کا انھوں نے ہمیشہ بُرا بدلہ کیا اور اُس محسنِ سلطنت کو نیست و نابود کرنے کی فکر میں ہمیشہ لگے ہی رہے مگر غلامانہ ذہنیت کے ساتھ دشمنی پر دوستی کا اور بدخواہی پر خیر خواہی کا، غداری پر وفاداری کا پردہ ڈالے رکھا۔ سلطنتِ اسلام کے بعد سے آج تک بھی ان کا یہی طریقِ عمل ہے۔
>
> وہ مسلمانوں کو نجس و ناپاک سمجھتے ہیں۔ اُن کے ہاتھ کی چھُوئی ہوئی چیز

---

[1] قاضی احسان الحق نعیمی، مولانا: السواد الاعظم، بابت شوال ۱۳۴۹ھ، ص ۴، ۵۔

پلید جانتے ہیں۔ جب نفرت کا یہ عالم ہے تو ایذا رسانی سے وُہ کس طرح صبر کر سکتے؟ آدمی جس چیز کو ناپاک سمجھتا ہے اُس کو دفع کرنے پر اُس کی طبیعت مجبور ہوتی ہے۔ اس لیے ہر قرن اور ہر زمانہ میں ہندو طرح طرح کے حیلوں اور تدبیروں سے مسلمانوں کو مٹانے میں کوشاں رہے۔ اب سے دس سال قبل جب ہندو مسلم اتحاد کے علم بلند کیے گئے اور مسلمان جاہل خود رائے لیڈروں کے اغواء سے ہندوؤں پر فدا ہو رہے تھے۔ جوشِ محبت میں بہت سی ناکردنی حرکات کے مرتکب ہُوئے، ہندوؤں کو مسجدوں میں بلایا، منبروں پر بٹھایا، پیشانیوں پر قشقے لگوائے، چہروں پر گلاب لگوائے، ہولیوں میں خاک اڑائی، ہندو مُردوں کی ٹکٹکیاں اُٹھائیں، جے کے نعرے لگائے، قربانی کی گائیں گئوشالوں میں پہنچائیں، کشتگانِ امرتسر کی ہڑتالیں کیں، انھیں شہید بنایا، سب کچھ کیا، مگر ہندوؤں نے ستم رانی کی خصلت نہ چھوڑی، اُن کی جفا کاریوں میں فرق نہ آیا۔ آرہ، شاہ پور اور کٹار پور کے مظالم سے بھی سیر نہ ہُوئے۔ ملک بھر میں مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائیں، مسجدوں کی بے حُرمتی کی، نمازوں کے وقت مسجدوں کے سامنے باجا بجا کر مسلمانوں کو تنگ اور آزردہ کیا۔ اِس حسد سے مار دھاڑ شروع کی، ہزارہا بیگناہ مسلمانوں کو قتل کر ڈالا، لوٹ لیا، گھروں کو آگ لگا دی، جلتی آگ میں مسلمانوں کو ڈال کر پھونک دیا۔

تلخ تجربے ہونے کے بعد کون مسلمان تھا جو ہندوؤں سے اُمیدِ وفا کرتا؟ امیدِ خیر خواہی رکھتا؟ تمام ملک کے مسلمان اِن کے دستِ ستم سے نالاں تھے، اِن کی حکومت پر کیسے راضی ہوتے؟ اِس لیے موجودہ زمانے کی تحریکاتِ کانگرس میں مسلمان بالکل علیحدہ رہے۔ اِن کا کوئی طبقہ شریک نہ ہُوا۔ یہ روش مسلمانوں کے لیے بہت بہتر تھی۔ اِس فرصت کو بہت غنیمت سمجھتے اور اپنی بگڑی حالت درست کرنے کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ مگر ہندوؤں نے محسوس کیا کہ یہ علیحدگی مسلمانوں کو نفع پہنچائے گی اور اِس فرصت میں وُہ کچھ نہ کچھ کمزوری رفع کرنے

ہیں کامیاب ہو جائیں گے اور گورنمنٹ کا مقابلہ تنہا ہندوؤں سے رہ جائے گا۔ اُس کا جو خمیازہ بھگتنا ہوگا وہ تنہا ہندو قومیت کے سر پڑے گا۔ اگر مسلمان شریک ہوئے ہوتے تو مرنے، پٹنے، قید ہونے کے موقعوں پر اُنھیں پیش کیا جاتا اور یار لوگ کنّی کاٹ جاتے۔ اِس خیال سے اُنھیں بہت فکر تھی کہ مسلمانوں کو اِس تحریک میں کس طرح شامل کیا جائے، مگر مسلمانوں کا کوئی طبقہ اُن کے ہاتھ نہ آیا، البتہ چند خود غرض لوگ اُن کے ہتّے چڑھ گئے جنھوں نے اپنے ذاتی مفاد کو مقدم رکھ کر قوم کے ساتھ غدّاری کی اور مسلمانوں کو شرکتِ کانگرس کی دعوت دی اور ہندوؤں کے روپیہ سے مدد لے کر اغوائے اہلِ اسلام کا کام جاری رکھا۔

اِس قلیل، طمّاع، خود غرض جماعت نے اپنا نام جمعیۃ العلماء رکھا اور مسلمانوں کو مغالطہ دیا کہ یہ ہندوستان کے تمام علماء کی جمعیت ہے باوجودیکہ تمام علمائے ہند اِس کے سخت مخالف ہیں اور اِس نام نہاد جمعیت کو جمعیۃ الہنود جانتے ہیں۔ جو چند ذی وقار علماء اِس میں پہلے کسی وجہ سے شریک ہو گئے تھے اِس وقت وُہ بھی علیحدہ ہو گئے۔ گنتی کے آٹھ دس نام کے مولوی رہ گئے جنھوں نے اپنا ضمیر ہندوؤں کے ہاتھ کھوٹے داموں کو فروخت کر دیا اور کانگرسی پروپیگنڈا کے ایجنٹ ہو گئے اور کسی نہ کسی قدر مسلمانوں کو مغالطہ دینے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ خطرناک جماعت ہندوؤں کی کٹھ پتلی ہے، اُن کے اشاروں پر رقص کیا کرتی ہے۔ مسلمان اِس سے متفق نہیں، نہ ملک کا کوئی معتمد شخص اِن کے ساتھ شریکِ عمل ہے۔ مسلمانوں کو اِس حقیقت سے آگاہ رہنا چاہیے کہ نام نہاد جمعیۃ العلماء ہندوستان کے علماء یا عام اہلِ اسلام کی نائب و ترجمان نہیں ہے بلکہ وُہ تمام مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں سے سازباز کرنے کی مجرم ہے۔ اِس نے اپنے نفع کی خاطر بہت سے مسلمانوں کو غلطی میں ڈالا اور نقصان میں مبتلا کیا۔ غلط فتوے دیتے رہنے، بے فائدہ ہندو تحریک پر مرنے والوں کو شہید بنا کر مسلمانوں کو جانیں کھونے پر آمادہ کیا۔ مسلمان

اِس غدّار، مسلم کش، ہندو پرست جماعت کے دامِ تزویر سے بچیں"۔ [1]

۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء میں حضرت مفتیِ اعظم دہلی، سیّدی و مرشدی شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ہندوستان کی جد و جہدِ آزادی میں ہنود کے ساتھ مسلمانوں کی شرکت اور مسٹر گاندھی کے احکامات کی پیروی کے بارے میں سوال کیا گیا۔ آپ کا جواب خلوص و للّٰہیت اور تقوٰی و طہارت کا آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت کی وسیع النظری اور اعلائے کلمۃ الحق میں کوشاں رہنے کا زندہ ثبوت ہے۔ دہلی جیسے شہر میں جو وہابیہ سے بھرپور اور گاندھوی حضرات کا ہیڈ کوارٹر ہو وہاں آپ کا لومۃ لائم سے بے خوف ہو کر علی الاعلان حق بات کہنا اور کسی بڑی سے بڑی طاقت کو خطرے میں نہ لانا حق پرستی کی عظیم الشان مثال ہے۔ اب وُہ فتوٰی ملاحظہ فرمائیے اور حق و صداقت کی داد دیجیے۔

سوال نمبر ۲۳۹

۱۔ آجکل قوم ہنود آزادی حاصل کرنے میں بڑی سرگرم نظر آتی ہے اور اُس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ حکومت کی قانون شکنی کر کے اُس کو مجبور کیا جائے تاکہ وہ ہم کو آزاد تسلیم کرے۔ اگر اِس مقابلہ میں حکومت کی جانب سے نقصان برداشت کرنے پڑیں تو اُن کو بھی بلا مدافعت برداشت کیا جائے، یہاں تک کہ اُن کی گولیاں اپنے سینے پر لی جائیں لیکن قدم پیچھے نہ ہٹے۔ پس اِس صورت میں ہنود کے ساتھ مسلمانوں کی شرکت جائز ہے یا نہیں اور اِس امر میں جمعیۃ العلماء کا یہ فیصلہ کہ مسلمانوں کو شریک ہونا چاہیے حق بجانب ہے یا اُس سے غلطی ہوئی؟

۲۔ اگر اِس مقابلہ میں کوئی مسلمان گولی لگنے کی وجہ سے مر جائے تو شہید ہو گا یا نہیں؟

۳۔ محض اِس لیے کھدّر پہننا کہ ہنود اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں اور شرک کا بول بالا رہے اور اُس کو اپنے لیے بمنزلہ فرض کے سمجھنا اور جو لوگ کھدّر نہ پہنتے ہوں اُن کو

---

[1] نعیم الدین، مراد آبادی، مولانا: السواد الاعظم، بابت جمادی الاُخرٰی ۱۳۴۹ھ، ص ۳ تا ۵

بہ نظرِ حقارت دیکھنا، یہاں تک کہ اِس کی وجہ سے اُن کی نمازوں میں قصور بتلانا، یہ سب امور جائز ہیں یا نہیں؟

۴۔ مشرک قانونِ نمک کے توڑنے کا حکم دیتا ہے۔ اِس پر کسی مسلمان کا یہ کہنا کہ اُس نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کی ہے، لہٰذا اُس کے حکم کی تعمیل فرض ہے۔ پس یہ کہنا جائز ہے یا نہیں؟ بیّنوا بالدلائل۔

الجواب

۱۔ مسلمانوں کا آزاد ہونا اِس امر کا مقتضی ہے کہ احکامِ کفر یک قلم نابود ہو جائیں اور اہلِ اسلام کو غلبہ حاصل ہو جائے، جو مطلوبِ شارع ہے اور ہندوؤں کی آزادی یہ ہے کہ مسلمانوں کو نیست کر دیں اور کسی مسلم کو یہ قوت نہ رہے کہ وہ شرک اور کفر کی برائی بھی کر سکے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ دونوں آزادیوں میں تضاد ہے۔ ایک ملک میں دونوں آزادیوں کا اجتماع محالاتِ عقلیہ سے ہے۔

پس صورتِ مذکورہ میں اگر آزادی ہو سکتی ہے تو ان دونوں قوموں میں سے صرف ایک قوم آزاد ہو سکتی ہے اور ایسی صورت میں غیر آزاد قوم یقیناً آزاد قوم سے مغلوب رہے گی۔ اِس حقیقت کو دیکھتے ہوئے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہنود مسلمانوں کی آزادی چاہتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اخبار بین حضرات پر اچھی طرح روشن ہے کہ ہنود کا اصلی منشاء اپنی بھی کامل آزادی نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ گورنمنٹ کے سایہ میں ہم کو وہ قوت میسر آجائے جس سے مسلمانوں کی مالی قوت تو برباد کر ہی چکے ہیں، دینی قوت بھی مٹا ڈالیں کہ آج اِس کی کوشش کی جاتی ہے تو گورنمنٹ آڑے آتی ہے، جب ہم خود مختار ہو جائیں گے تو اپنے تینتیس ممبروں میں مسلمانوں کے دس ممبروں کو جذب کر لینا کون سی بڑی بات ہوگی کہ اوّل تو وہ ممبر خود بھی ایسے ہوں گے جو ہماری آواز پر لبیک کہنے والے ہوں گے، لہٰذا اگر کبھی انھوں نے کسمسانا چاہا بھی تو پھر کثرتِ رائے کے بھاری پہاڑ سے بچ کر اُن کے لیے بھاگنے کی راہ بھی کہاں ہوگی؟ غرض پھر جس طرح نچائیں گے اُن کو

ناچنا پڑے گا۔ کیا ساردا ایکٹ کے مسئلہ سے تجربہ نہ ہوچکا جو ہندو مسلم ممبروں کی کمیٹی نے پاس کر دیا، وہ آجکل اٹل ہے۔ اِس کے منسوخ کرانے میں کیا دقیقہ اٹھا رکھا گیا؟ لیکن بایں‌ہمہ آج تک اس کو جنبش نہیں ہوئی اور گورنمنٹ کی جانب سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ ہم کیا کریں؟ یہ سب تمہارے نمائندوں کی روشنیِ دماغ کا نتیجہ ہے۔

پھر ہم نے تو احتیاطاً تمہارے بعض معتمد علیہ علمأ سے بھی دریافت کر لیا تھا۔ لیکن جب ہم کو ان سے بھی اجازت مل جائے تو پھر ہمارا کیا قصور؟ دوسرا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جب کسی ملک میں مختلف مذاہب موجود ہوں اور کوئی اصلاحی اسکیم جاری کی جائے تو اُس وقت اصلاحِ معاشرت عام ہوتی ہے، کسی خاص قوم کا اُس میں استثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اِسی قسم کے اور بھی جواب دیے جاتے ہیں جن کا صاف مطلب یہ ہے کہ اب چیختے چلاتے رہو، جو ہونا تھا ہوچکا۔ غرض یہی قصّہ آئے دن اُس وقت ہوگا جب یہ دنیا کے دلدادہ منصبِ حکومت پر فائز ہوں گے اور زہرِ کفر و عسلِ اسلام کی معجون تیار کر کے اُسی کے ساتھ قوم کا علاج شروع کریں گے۔

مسلمانو! ہوش میں آؤ۔ اپنے ہاتھوں اپنے کو برباد نہ کرو۔ اس مسئلے میں جمعیۃ العلماء ہو یا کوئی دوسری جماعت، جو بھی تم کو شرکتِ مشرکین کی رائے دے وہ سخت غلطی میں ہیں۔ ایک نہیں، دو نہیں، بیسیوں آیات میں اِس کی حرمت ظاہر و باہر ہے۔ تبرکاً صرف دو آیتوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ ارشاد ہوتا ہے، یا ایھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا بطانۃ (الآیہ) مسلمانو! غیروں کو اپنا بھیدی نہ بناؤ۔ وہ تمہاری خرابی میں کمی نہ کریں گے۔ اُنھیں تمہارا تکلیف میں پڑنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اُن کی زبانوں سے دشمنی ظاہر ہو رہی ہے اور جو امور اُن کے سینوں میں پوشیدہ ہیں وہ اور بھی زیادہ سخت ہیں۔ اگر تم کو عقل ہے تو ہم نے کھُلی نشانیاں بیان کر دیں۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے، یا ایھا الذین اٰمنوا ان تطیعوا الذین کفروا (الآیہ) مسلمانو! اگر تم نے کافروں کا کہنا مان لیا تو یاد رکھنا وہ تم کو اُلٹا پھیر دیں گے (اور تمہاری پچھلی پستی کا تم کو نظارہ پھر تم کو دکھلا دیں گے) پھر تم نقصان

میں جا پڑو گے (یہ تمہاری کیا مدد کریں گے تم اپنے پاؤں پر کھڑے تو ہو) اللہ تمہاری مدد کرے گا اور اُس کی مدد سب سے بہتر ہے۔ ہم عنقریب تمہارا رُعب کافروں کے دِلوں میں ڈالے دیتے ہیں۔

بعض مسلمانوں کو جو بات ہنود کی ہمراہی پر ابھار رہی ہے، یہ ہے کہ اب یہ اُن کے ذہن نشین ہو چکا ہے کہ جس روش پر اِس قوم کی اِس وقت جدّ و جہد ہے اگر کچھ زمانہ یونہی رہی تو ضرور بازی لے جائیں گے۔ پھر ہمیں سوائے افسوس کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا اور جب اُنھوں نے حقوق حاصل کر لیے تو یہ گورنمنٹ اور نیز دوسری سلطنتوں کی نگاہ میں معزز ہو جائیں گے اور ہم ذلّت کی نگاہوں سے دیکھے جائیں گے۔ سو اِس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو جن حقوق کا مطالبہ ہے وہ خالص ہنود کے حقوق نہیں ہیں، بلکہ مشترکہ تمام ہندوستانیوں کے لیے ہیں۔ تو اگر حاصل ہو بھی گئے تو مسلمان محروم نہ رہیں گے۔ پھر خواہ مخواہ اُن کا اِس بُری صورت کے ساتھ دخل انداز ہونا کیا معنی بخصوصًا جبکہ ہنود بھی کہتے ہیں کہ ہمیں مسلمانوں کی شرکت کی حاجت نہیں اور اگر کہتے ہیں کہ ہمارے حقوق برائے نام ہیں اصل میں وہ حقوق زیادہ تر اُنھیں کے حق میں مفید ہوں گے۔ تو اِس کا جواب یہ ہے کہ پھر اُن کے حاصل کرنے کے لیے آپ کیوں کوشاں ہیں؟ آپ کو چاہیے کہ گورنمنٹ کی خدمت میں ایسے حقوق پیش کریں جو آپ کے لیے مفید ہوں مگر قانونی حدود میں رہتے ہُوئے اور تہذیب کے ساتھ تاکہ بلا کسی نقصان کے آپ کو حقیقی کامیابی میسر آجائے، کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ درخواست کنندگان میں سے گورنمنٹ ایسے اشخاص کو محروم رکھے جو اس کے قواعد کے ساتھ درخواست کرتے ہیں اور اُن کو کامیاب بنادے جو اُس کے ساتھ بہ سرِ پیکار ہیں۔ رہا عزّت کا سوال۔ ان کے ساتھ تو شرکت ممنوع ہے لقولہ تعالیٰ:

أیبتغون عندهم العزة فان العزة لله جمیعا۔	کیا تم اُن کی شرکت میں عزّت ڈھونڈ رہے ہو؟ عزّت تو تمام کی تمام محض اللہ ہی کے لیے ہے۔

پس عزت اگر ہے تو صرف اِس میں کہ حاکم حقیقی کے حکم کے آگے کسی کے حکم کی پروا نہ کی جائے اور تمام مسلمان اتفاق کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ عامل ہو جائیں، پھر ہو نہیں سکتا کہ کامیابی ہمارے قدم نہ چوم لے۔ اگر یہی تفرلتی اور بددینی رہی تو ذلت کی شکایت بے جا ہے کہ اِس کا ارشاد ہو چکا:

واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول	اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری
ولا تنازعوا فتفشلوا وتذہب	کرو اور آپس میں تنازعہ نہ ڈالو ورنہ
ریحکم۔	تم کم ہمت اور سست پڑ جاؤ گے
	اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

سچ فرمایا باری تعالیٰ جلّ مجدہٗ نے۔ آخر نہ دیکھا، آج سے دس سال پہلے (۱۳۳۹ھ میں) اگرچہ حالت بہت تباہ ہو چکی تھی مگر پھر بھی کیسی ہوا بندھی ہوئی تھی؛ لیکن جب تم نے اُس (اللہ تعالیٰ) کے حکم کی مخالفت کی اور ہنود سے دوستی گانٹھی اور جو کچھ اسلام کے خلاف نہ کرنا تھا، وہ کیا، جس کے بیان کے لیے دفاتر بھی گنجائش نہیں رکھتے، یہاں تک کہ مخالفین کو سارے گھر کے بھید دے دیے اور اُن کی دِلی مراد پوری کر دی کہ آپس میں اچھی طرح مخالفت پیدا کر لی اور آج وہ حالت ہو گئی کہ وہ تم کو کسی شمار میں نہیں لاتے۔ لیکن تمہاری شرابِ محبت کا خمار اب بھی نہیں اُترا، اسی کوشش میں لگ رہے ہو کہ کسی طرح رہی سہی یہ اسلامی شان بھی ہندوستان سے مٹ جائے۔ ہنود کے روزمرّہ کے سلوک دیکھ رہے ہو لیکن آنکھیں ایسی پٹم ہو گئی ہیں کہ کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

مسلمانو! خدارا خوابِ غفلت سے بیدار ہو اور بہت جلد اُن وسائل سے کام لو جن سے آپس کا اتفاق نصیب ہوتا ہے کہ اجتماعی قوت سے آنے والی مشکلات کی مدافعت کر سکو کہ آج ایک قوت کے کرشموں کا رونا رو رہے ہو، کل دوسری قوت کے مظالم کا سامنا پڑنا ہے۔ لیکن تمہاری ہر کوشش اور ہر نقل و حرکت محض اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اور پابندیِ دین کے ساتھ ہو، ورنہ کامیابی کی امید نہ رکھنا۔

اِس مسئلے میں نصوص صریحہ قطعیہ کی مخالفت کی جا رہی ہے، لہٰذا ہر مسلمان پر واجب ہے کہ

(جس) جلسہ میں اُس کے سامنے اِس نام نہاد جنگِ آزادی میں شرکت کا مسئلہ پیش ہو وہ صاف بلند آواز سے کہہ دے کہ ہم شرکت سے ہرگز راضی نہیں۔ اِس میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں ورنہ یاد رکھیں کہ قیامت میں اُس سے سخت بازپُرس ہوگی۔

بعض لوگ شرکتِ مشرکین پر یہ بیان کر کے اُبھار رہے ہیں کہ غیر مسلم قوم جب مسلمانوں کے ملک پر قبضہ کرے تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ اپنے ملک کو اُس سے آزاد کرائے۔ سو یاد رہے کہ مسئلہ تو یونہی ہے مگر اوّل تو یہ ہر مسلمان پر فرض نہیں بلکہ اُن مسلمانوں پر فرض ہے کہ جو آزاد کرانے کی طاقت رکھتے ہوں۔ ہندوستان کے مسلمان اِس پر ہرگز قدرت نہیں رکھتے۔ دُوسرے جو آزادی شارع کو مطلوب ہے وُہ یہ ہے کہ خالص مسلمانوں کی قوت و شوکت کے حصُول کی امید ہو اور یہاں ایسی آزادی کی ہرگز اُمید نہیں بلکہ اور نقصان کا اندیشہ ہے۔ عالمگیری میں دشمن کے مقابلے کی اباحت کے شرائط کو ذکر کرتے ہُوئے فرمایا:

والثانی ان یرجوا الشوکۃ والقوۃ لاھل الاسلام باجتھادہ او باجتھادین من یعتقد فی اجتھادہ ورایہ وان کان لا یرجوا القوۃ والشوکۃ للمسلمین فی القتال فانہ لا یحل لہ القتال لما فیہ من القاء نفسہ فی التھلکۃ۔

دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ہم اِس حکومت کی وجہ سے طرح طرح کے نقصانات کے شکار ہو رہے ہیں۔ سو اِس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرما دیا ہے کہ:

اسمعوا و اطیعوا فانما علیھم ما حملوا و علیکم ما حملتم۔	"تم تو سُنتے جاؤ، اطاعت کرتے رہو کہ جو حقوق حکام پر ڈالے گئے ہیں وُہ اُن پر لازم ہیں اور جو تم پر ڈالے گئے ہیں وُہ تم پر لازم ہیں۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا نفسِ شرکت کے متعلق تھا کہ اِس وقت کی شرکت کا کیا حکم ہے۔ لیکن اِس کے علاوہ اِس راہ کے دُوسرے اور بھی صدہا منہیات کا ارتکاب کیا جاتا ہے جن کی وجہ سے یہ شرکت اشد حرام کا حکم پیدا کر لیتی ہے۔ چونکہ اُن تمام کا ذکر موجبِ طوالت تھا، دُوسرے اُن کے متعلق سوال میں استفسار بھی نہیں تھا، اِس لیے ان کو ترک کیا گیا۔

۲۔ اِس مقابلے میں اگر قوم کی جانب سے ایسا تشدد وقوع میں نہ آئے جس میں پولیس یا فوج کے افراد میں سے بعض کے تلف ہوجانے کا خوف ہو اور ایسی صورت میں حکومت کی جانب سے گولی چلادی جاتے اور کوئی مسلمان گولی کے صدمہ سے مرجائے تو شہید کہلائے گا اور اُس کے تلف ہونے کا سبب ایسے وقت ظلم ٹھہرے گا اور ظلماً مارا جانا شہادت ہے۔ لیکن ایسے وقت میں بھی اگر کسی مسلمان کا اِس پر گمان غالب ہو جائے کہ اگرچہ میرا کوئی ایسا سنگین گناہ نہیں ہے لیکن حکومت اس پر بھی گولی چلادے گی، تو ایسی صورت میں اُس پر فرض ہوگا کہ وُہ اُس مقام سے ہٹ جائے۔ اگر نہ ہٹے گا اور مارا جائے تو شہید نہ کہلائے گا۔

اگر قوم کی جانب سے ہی ایسے تشدّد کی ابتداء کی گئی جس میں گورنمنٹی ملازمین سے بعض افراد مارے گئے یا اُن کے مارے جانے کا قوی اندیشہ تھا کہ وُہ آلاتِ جارحہ کے استعمال کا ارتکاب کر رہے تھے اور ایسی صورت میں مجمع کے منتشر کرنے کے لیے گولی چلائی گئی اور اُس میں کوئی مسلمان بھی مارا گیا تو اُس کو بھی شہید نہ کہا جائے گا کہ اُس موقع پر وُہ یقیناً جانتا ہے کہ گولی چلنا لابدی ہے، پس ایسے وقت میں اُس کا ٹھہر جانا اپنے اُوپر موت کا پیش کرنا ہے، جو حرام ہے۔ پھر جن صورتوں میں شہادت کا حکم نہیں کیا گیا، اگر وُہ جانتا تھا کہ شرعاً مجھے یہاں ٹھہرنا ممنوع ہے، تب تو خودکشی کا مرتکب ٹھہرے گا ورنہ امید ہے کہ ماخوذ نہ ہو۔ حکومت کے خلاف جن امور پر اصرار کیا جاتا ہے وہ تو مکروہات سے بھی نہیں۔ علماُ نے حفاظتِ جان کے لیے بعض محرکات کے ارتکاب کو بھی فرض فرمایا ہے۔ عالمگیری میں ہے؛

السلطان اذا اخذ رجلاً وقال لاقتلنّك اولتشربنّ هذا الخمر كان فى غالب رايه وانه لولم يتناول يقتل فان لم يتناول حتّٰى قتل كان اٰثماً فى ظاهر الرواية عن اصحابه وذكر شيخ الاسلام انه اٰثم ماخوذ بدمه الّا ان يكون جاهلاً بالاباحة حالة الضرورة اذا كان عالماً بالاباحة كان ماخوذاً كذا قال محمد رحمه الله تعالىٰ۔

۳۔ کھدّر کا استعمال فی نفسہٖ مباح ہے لیکن اِس نیت سے پہننا جو سوال میں مذکور ہے، ممنوع ہے کہ مباح اشیاء کا استعمال اچھی نیت سے مستحسن ہے اور بُری نیت سے مکروہ۔

۴۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کی نیت سے نہ قانونِ نمک کے توڑنے کا حکم دیا گیا نہ یہ ارشاد مبارک کا مقصود ہے کہ اگر کوئی حکومت نمک پر محصول لے تو اس کی مخالفت کر کے ایسے قانون کو توڑ دیا جائے۔ غرض بہر حال مذکور محض کذب ہے۔ فقط[1]

محمد مظہر اللہ غفر اللہ لہٗ
مسجد جامع فتحپوری

اب ہم قارئین کرام کے سامنے ایک فتویٰ اور پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مستفتی نے باختلافِ الفاظ یہی چار سوال جمعیۃ العلمائے ہند کے قائمقام صدر یعنی مفتی کفایت اللہ دہلوی سے اُن کا جواب مانگا۔ ہم مفتی صاحب موصوف کے جواب کو حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ مصنفِ خزائن العرفان و الکلمۃ العلیا کی تنقید سمیت پیش کرنا چاہتے ہیں، تاکہ قارئین کے سامنے تصویر کے دونوں رُخ آجائیں اور فریقین کا موقف سمجھنے میں کسی قسم کی دقّت محسوس نہ ہو کیونکہ دونوں حضرات ہی اپنی اپنی جماعت کے معتمد علیہ اور چوٹی کے علماء میں شمار ہوتے تھے۔ لیجیے وہ استفتاء مع جواب و تنقید پیشِ خدمت ہے؛

استفتاء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم و اٰلہٖ و اصحابہٖ اجمعین۔ امّا بعد۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین امورات ذیل میں۔ جواب مع ادلّہ شرعیہ بیان فرماویں۔

اوّلاً: ایک شخص غیر مسلم و غیر معاہد حکم کرتا ہے کہ قوانین مروّجہ حکومتِ حاضرہ کی خلاف ورزی اُس کی قوم اور اُس کے ہم وطن کریں، جس سے رام راج حاصل ہوگا۔ بصورتِ قانون شکنی بغیر استطاعتِ اندفاع و بغیر کوشش اندفاع برداشت کرنے کی حتّٰی کہ گولی چلنے کے وقت گولی کو اپنے سینے پر لینے کی ہدایت کرتا ہے۔ اگر کوئی مسلمان اُس کے حکم کی تعمیل کرتا ہے

---

[1] مسعود احمد، پروفیسر: فتاویٰ مظہری، ص ۳۲۹ تا ۳۳۴

تو شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟

ثانیاً: اگر اُس غیر مسلم کے حکم کی تعمیل میں کوئی مسلمان اِس خطرہ میں یہ جانتے ہُوئے کہ گولی لگنے سے موت واقع ہوسکتی ہے، اپنے آپ کو مبتلا کرے اور گولی لگنے سے مرجائے تو اُس کی موت کیسی موت ہوگی؟ آیا اُس کو شہادت کہیں گے یا خودکشی کہہ سکتے ہیں؟

ثالثاً: ایک غیر مسلم کہتا ہے کہ کھدر پہنو۔ اُس کی تعمیل میں کوئی مسلمان کھدر پہنتا ہے اور فخر کرتا ہے کہ میں نے اُس کے حکم کی تعمیل کی اور اُس حکم کو فرض قرار دے کر دُوسرے مسلمانوں کو اُس غیر مسلم کے حکم پر آمادہ کرتا ہے اور جو شخص کھدر نہ پہنے اُس سے نفرت کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کا کھدر پہننا، حکمِ غیر مسلم کی تعمیل کو فرض سمجھنا، کھدر نہ پہننے والے مسلمان سے نفرت کرنا کیسا ہے؟

رابعاً: حکومتِ حاضرہ کی طرف سے نمک بنانے پر عرصہ سے محصول لیا جاتا ہے۔ ایک غیر مسلم کہتا ہے کہ یہ محصول دیے بغیر نمک بناؤ اور گرفتار ہوجاؤ۔ اِس پر ایک مسلمان کہتا ہے کہ اس نے باوجود غیر مسلم ہونے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کی ہے، اس لیے غیر مسلم کے حکم کی تعمیل ہر مسلم پر فرض ہے۔ مسلم کا یہ کہنا جائز ہے یا نہیں؟ اور ناجائز ہے تو کیا حکم رکھتا ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب

غالباً یہ سوالات تحریکِ حاضرہ سے متعلق ہیں۔ اگر ایسا ہے تو تحریرِ سوالات میں کس قدر تلبیس سے کام لیا گیا ہے جو مناسب نہ تھا، بلکہ چاہیے یہ تھا کہ واقعہ صاف صاف ذکر کرکے اُس کا حکم ذکر کیا جاتا۔ مثلاً سوال اوّل یُوں لکھنا چاہیے تھا کہ ہندوستان میں ایک غیر ملکی حکومت کا جبریہ قبضہ ہے، جس کو ہندوستان کے رہنے والے کسی طرح پسند نہیں کرتے۔ ہندوستانیوں کی خواہش ہے کہ پردیسی قوم جو ہزاروں میل دُور سے آکر ہمارے وطن و ملک پر جبراً قابض اور مسلط ہے اور ہمارے تمام خزائن اور منافع کو ہمارے ہاتھوں سے چھین کر لے جا رہی ہے اور جس کی بدولت اہلِ ملک بھُوکے اور محتاج ہوگئے ہیں، جلد سے جلد ہمارا ملک خالی کردے

تاکہ اہلِ ملک خود اپنی مرضی کے موافق حکومت قایم کریں اور اپنے ملکی ذخائر سے خود متمتع ہوں، لیکن وہ پردیسی حکومت کسی طرح ہندوستانیوں کی خواہش کا احترام کرنے کو تیار نہیں ہوتی اور اپنی مادّی طاقت کے بل پر جبراً حکومت کر رہی ہے۔ ہندوستانیوں کے پاس مادّی قوت اور طاقت نہیں ہے کیونکہ تمام مادّی طاقتیں اور قوتیں اُس پردیسی قوم نے اپنے قبضہ میں کر رکھی ہیں۔ حتیٰ کہ ہندوستانیوں کو اتنی بھی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنی جان و مال کی حفاظت کے لیے بھی ہتھیار رکھ سکیں۔ اِس لیے ہندوستان کی ایک ملکی مجلس نے جس میں ہندوستانی تمام اقوام کے نمائندے شریک ہیں، یہ طے کیا کہ اِس غیر ملکی حکومت متسلطِ جابرہ سے آزادی حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اِس کے جبریہ قوانین کی خلاف ورزی کی جائے اور اِس سلسلے میں جو تکالیف اور مصائب برداشت کرنے پڑیں اُن کو برداشت کیا جائے گا اور اپنی طرف سے تشدد پر ہرگز اقدام نہ کیا جائے تاکہ تحریکِ آزادی کی کامیابی کی اُمید ہو، ورنہ بصورتِ تشدد حکومت کو تشدد کا بہانہ مل جائیگا اور پھر وہ اپنی مادّی قوت سے قوم کو تباہ کر دے گی۔ خلاف ورزیِ قوانین کو عملی جامہ پہنانے کیلیے ملک میں سے ایک شخص تیار ہوا جو غیر مسلم تھا۔ اِس مجلسِ مشترک نے اُس کو اِس مظلومانہ جنگ کی انجام دہی کے لائق سمجھ کر اِس جنگ کی تکمیل کے اختیارات دے دیے۔ اب وہ غیر مسلم تمام ہندوستانیوں کو جنگ کے آداب بتا رہا ہے اور قوم کو لڑا رہا ہے، تو آیا اس کے حکم کی تعمیل جائز ہے یا نہیں اور اِس مظلومی کی جنگ میں اگر مطالبۂ حقِ آزادی کی وجہ سے کسی کی جان تلف ہو جائے تو وہ شہید ہوگا یا نہیں اور آیا بحالاتِ مذکورہ آزادی کا مطالبہ کرنا اور اپنے آپ کو ایسے خطرات میں مُبتلا کرنا، جس میں جان تلف ہو جانے کا خطرہ ہے، جائز ہے یا نہیں؟ سوال کی صحیح شکل یہ ہے۔

اب اس کا جواب یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلم اور غیر مسلم دونوں قومیں آباد ہیں۔ مسلمانوں کے مذہبی اصول سے مسلمانوں پر ایک غیر مسلم حکومت جابرہ متسلط سے اپنے ملک کو آزاد کرانا اوّلین فریضہ ہے۔ مسلمان جو اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اور لَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ طوعاً کسی وقت کسی طرح بھی غیر خداوندی احکام کی اطاعت نہیں کر سکتے اگر وہ اطاعت کرتے ہیں تو مجبوری اور اضطراری طور پر کرتے ہیں اور اگر

اِس مجبوری اور اضطرار کو دفع کرنے کی کوئی صورت بھی ممکن ہو تو اُن پر لازم ہو جاتا ہے کہ اُس جبری حکومت کے جوئے کو اپنی گردن سے اتار پھینکیں۔ یہ وجہ تو ایسی ہے کہ اِس میں غیر مسلم شریک نہیں۔

دُوسری وجہ یہ ہے (جس میں تمام ہندوستانی اقوام برابر کی شریک ہیں) کہ ایک اجنبی قوم کو جو ہزاروں میل پرے کی رہنے والی ہے کوئی حق نہیں ہے کہ وہ ہمارے ملک پر ہماری مرضی کے خلاف جبراً حکومت کرے۔ ہم اس کی حکومت کو ایک لمحہ کے لیے بھی طوعاً برداشت کرنے کو تیار نہیں اور یہ ہمارا فطری، عقلی، عرفی، بین الاقوامی حق ہے اور جس تدبیر اور جس طریقہ سے ہم اپنا یہ حق حاصل کر سکیں اختیار کرنے اور عمل میں لانے میں حق بجانب ہوں گے۔ چونکہ ہمارے پاس مادّی قوت نہیں ہے اس لیے ہم تشدد کا طریقہ اختیار کرنے سے معذور و مجبور ہیں۔ مگر عدم تشدد کے ساتھ سول نافرمانی کی مظلومانہ جنگ یقیناً لڑ سکتے ہیں اور اگر ہمارے افراد اس کے لیے تیار ہیں کہ وہ لاٹھیاں کھائیں، سنگینیں اور برچھیاں، چھُرے اور گولیاں اپنے سینوں پر لیں تو یقیناً اُن کو اپنے حقِ آزادی کے مطالبہ کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنا جائز ہے کیونکہ اُن کا فعل فی حدِ ذاتہٖ صرف یہ ہے کہ وُہ اپنا حق طلب کرتے ہیں۔ اِس کے جواب میں اگر حکومت لاٹھیاں برسائے یا سنگینیں بھونکے یا چھُرے اور گولیاں مارے تو یہ بربریت اور ظلم حکومت کا فعل ہے، اِس کی ذمہ داری حکومت پر ہے، نہ اُن مظلوموں پر جو اپنا حق مانگتے ہیں اور کسی ایسے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں جس کو وُہ پہلے سے ناپسند کرتے تھے مگر مجبوراً اس کی تعمیل کیا کرتے تھے۔

رہی یہ بات کہ یہ جانتے ہوئے کہ حکومت بسا اوقات اپنی بربریت کے مظاہرہ کے لیے لاٹھیاں چلاتی ہے، گولیاں برساتی ہے، کسی کو ایسے خطرہ میں پڑنا جائز ہے یا نہیں؟ تو اِس کا جواب یہ ہے کہ مطالبۂ حقوق ہمیشہ خطرات سے پُر ہوتا ہے۔ مذہب و وطن کی آزادی کا مقصد چونکہ اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ اِس لیے اِس کے راستہ کے خطرات بھی بہت بڑے اور ہیبت ناک ہیں مگر بغیر خطرہ کے تو کوئی مقصد بھی حاصل نہیں ہوتا۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم اپنی طرف سے کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس کا نتیجہ حکومت کی جانب سے تشدد ہو اور اگر بغیر اِس کے کہ ہماری طرف سے کوئی تشدد آمیز حرکت ہو، حکومت بلاوجہ تشدد پر اُتر آئے اور ہمیں مار مار کر زخمی یا شہید کر دے تو اِس کی

ذمہ داری حکومت پر ہوگی۔ مثلاً یہ قصد ہو کہ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کریں اور پانچسو اشخاص ایسے مہیا کیے جائیں جو جمع ہو کر جلسہ کریں اور حکّام کے اِس حکم سے کہ منتشر ہو جاؤ، منتشر نہ ہوں۔ اِس قصد سے جلسہ شروع کیا گیا اور فرض کرو کہ صرف یہی پانچسو اشخاص تھے اور یہ سب عدمِ تشدد کے پابند تھے۔ اب حُکّام آئے اور انھوں نے حکم دیا کہ منتشر ہو جاؤ۔ اُنھوں نے منتشر ہونے سے انکار کر دیا مگر کوئی حرکت نہیں کی۔ تو اِس صورت میں حکومت کا فرض یہ ہے کہ اُن سب کو آدمیت کے ساتھ گرفتار کرے اور قانونی کارروائی کرے مگر بسا اوقات حکومت آئین اور انسانیت کے ساتھ اُن لوگوں کو گرفتار کرنے کے بجائے کبھی تو لاٹھیوں سے پٹوا کر منتشر کراتی ہے اور کبھی گولیاں چلا کر بہیمیت اور بربریت کا انتہائی مظاہرہ کرتی ہے۔ اِس ظالمانہ کارروائی سے مظلوموں کا وُہ فعل ناجائز نہ ہو جائے گا جو عقل و انصاف اور مذہب کے خلاف نہ تھا اور جو لوگ اِس بہیمیت و بربریت کا شکار ہو کر شہید ہوں گے وہ یقیناً مظلومیت کی وجہ سے شہادت کا درجہ پائیں گے۔ اُن کو خودکشی کا مرتکب بتانا سخت جہالت اور ناواقفیتِ احکامِ شرعیہ کی دلیل ہے۔

سِول نافرمانی کی اِس مظلومانہ جنگ میں جو اپنے وطن اور مذہب کو ایک غیر ملکی حکومت کے جابرانہ قوانین سے آزاد کرانے کے لیے اپنی وطنی مشترک مجلس کی جانب سے جاری کی گئی ہے شرعی احکام کے دائرے میں رہتے ہُوئے غیر مسلم کے احکام کی اطاعت کرنا ناجائز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ کوئی مذہبی رہنمائی اور دینی ہدایت نہیں ہے محض جنگی رہنمائی ہے۔ جو لوگ اِسے ناجائز کہنے کی جرأت کرتے ہیں اور جنگ میں زخمی ہونے والے کو ملامت کرتے ہیں اور مر جانے والوں کو شہادت سے محروم کرتے ہیں وُہ پہلے اُن مسلمانوں کا حکم بتائیں جو کسی غیر مسلم جابر دشمنِ اسلام حکومت کی حمایت اور اُس کی حرصِ ملک گیری کی خاطر اُس کے مقرر کیے ہوئے غیر مسلم افسروں کی کمان میں رہ کر اُن غیر مسلموں کے فوجی احکام کی اطاعت کرتے ہیں اور بسا اوقات غیر مسلم حکومت کی طرف سے اپنے مسلمان بھائیوں کو نشانۂ بندوق بناتے ہیں یا خود گولی کھا کر مر جاتے ہیں، اُن مسلمانوں کا کیا حکم ہے؟ یعنی کیا مسلمانوں کو جائز ہے کہ وہ حکومت کے غیر مسلم افسروں کی ماتحتی میں کام کریں اور مسلمانوں پر گولیاں چلائیں اور کیا مسلمانوں کو جائز ہے کہ وہ غیر مسلم ججوں کے سامنے اپنے مقدمات لے جائیں اور اُن سے خلافِ شرع فیصلے صادر کرائیں اور اُن پر

عمل کریں اور کیا مسلمانوں کو جائز ہے کہ وہ شرعی معاملات نکاح، طلاق، آمین بالجہر، رفع یدین وغیرہ وغیرہ نزاعات کے مقدمات غیر مسلم حکّام کی عدالتوں میں فیصلے کے لیے لے جائیں؟

اگر اِن تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے تو اِن حضرات کا پہلا فرض یہ تھا، وہ قوتِ ایمانی کا ثبوت دینے کے لیے پہلے اِن امور کے متعلق فتوے شایع کرتے اور مسلمانوں کو اِن مہلکات سے بچانے کی کوشش کرتے، جنھوں نے اُن کے اسلام اور قومیت دونوں کو فنا کر دیا ہے۔

کھدر پہننے کا جو حکم اُس غیر مسلم نے دیا ہے، وہ اُس نے اپنے مذہب کی بنا پر نہیں دیا ہے بلکہ ملک و وطن کی بھلائی اور دشمن کو کمزور کرنے کی ایک تدبیر سمجھ کر دیا ہے اور مسلمان کے لیے کھدّر پہننا مذہبی احکام کے بموجب ناجائز نہیں ہے، اِس لیے کھدر پہننا ناجائز نہیں ہے۔ یہ حکم اُن احکام سے بدرجہا زیادہ قابلِ تعمیل ہے جو انگریزی عدالتوں کے غیر مسلم حکّام سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے کھدر ہی بہترین لباس ہے اور جبکہ پہننے والوں کی نیت اپنے بھائیوں کی فائدہ رسانی بھی ہو تو ایک پنتھ دو کاج، دوہرا ثواب ملے گا۔ اِس کو گاندھی پرست فرقہ کا شعار بتانا میری سمجھ سے باہر ہے۔ اوّل تو کھدر پہننے والے مسلمانوں کو گاندھی پرست کہنا ہی ظلمِ عظیم ہے کیونکہ وُہ مسلمان ہیں اور خدا پرستی کے سوا کسی کی پرستش اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتی۔ وہ تو رسول پرست بننے سے بھی توبہ کرتے ہیں، پھر اُن کو گاندھی پرست کہنا کتنی بڑی جرأت و جسارت ہے؟ دُوسرے یہ کہ وکیلوں کے گون اور اِسی طرح بعض اداروں کے مخصوص لباسوں کے متعلق اِن حضرات نے کبھی کوئی فتویٰ شایع کیا ہے یا نہیں؟ اور اِس کو حکومت پرستی یا ادارہ پرستی کی بنا پر ناجائز فرمایا ہے یا نہیں؟ نہیں تو کیوں نہیں؟

"قانونِ نمک کی خلاف ورزی اُس کی سہولت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے اختیار کی گئی ہوگی۔ اصل مقصود تو قانون شکنی تھی۔ ابتداءً ایسا قانون اختیار کیا گیا جس کی خلاف ورزی ہر مقام، ہر صوبہ میں ہو سکے اور ہر شخص انفرادی طور پر کر سکے۔ یہ دُوسری بات ہے کہ اِس قانون کو منتخب کرنے میں یہ فائدہ بھی ظاہر ہوا کہ شریعتِ اسلامیہ میں نمک کو اپنے فطری معادن میں آزاد رکھا گیا ہے۔ اگر کسی مسلمان نے یہ کہہ دیا کہ اِس قانون کی خلاف ورزی فی نفسہٖ بھی شریعتِ

اسلامیہ کے موافق ہے تو اُس نے کیا گناہ کیا؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے اور میرے خیال میں یہ تو کسی نے بھی نہیں کہا کہ گاندھی جی نے اِس قانون کی خلاف ورزی کا حکم شرعی احکام کی تعمیل کی نیت سے دیا ہے، کیونکہ سب جانتے ہیں کہ گاندھی جی غیر مسلم ہیں۔ وہ اسلامی حکم کی تعمیل کی نیت سے کوئی حکم دیں یہ بظاہر مستبعد ہے۔ مگر یہ ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ حکم اسلامی حکم کے خلاف نہیں ہے۔ جیسے گاندھی جی شراب چھوڑنے کا حکم دے رہے ہیں تو یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ گاندھی جی نے یہ حکم شریعتِ اسلامیہ کی تعمیل کی نیت سے دیا ہے۔ مگر ہر مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ حکم اسلام کے حکم کے موافق ہے۔ اسلام بھی شراب کو حرام قرار دیتا ہے، اِس لیے مسلمانوں کو اِس حکم کی تعمیل کرنی چاہیے اور اِس میں کوئی غلطی نہیں ہے۔

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

عرضِ مصنّف

جمعیۃ العلمائے ہند کے قائم مقام صدر یعنی جناب مفتی کفایت اللہ شاہجہانپوری ثم دہلوی کی خدمت میں مذکورہ استفتاء جناب سیّد ممتاز احمد صاحب (سجادہ نشین خانقاہ اخوند صاحب فراش خانہ دہلی) نے پیش کیا تھا۔ مفتی صاحب موصوف کا جواب قارئین کی خدمت میں بلفظہٖ پیش کر دیا گیا ہے۔ جناب محمد ظہور سوداگر چمچہ عقب لال مسجد مراد آباد نے مذکورہ فتویٰ حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کر کے اِس اقدام کی غرض و غایت یُوں بیان کی؛

"یہ فتویٰ حاضر کر کے دریافت کیا جاتا ہے کہ جواب مجیب کا صحیح ہے یا نہیں؟ اِس کی پوری حقیقت سے آگاہ فرمایا جائے۔ بیّنوا توٴجروا۔"

حضرت صدر الافاضل نے اِس فتوے پر جو تبصرہ فرمایا اُس کا ایک ایک لفظ اہلسنت وجماعت کے موقف کی ترجمانی کر رہا ہے۔ ہم موصوف کے تبصرے یا تنقید کو بلفظہٖ پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں تا کہ قارئین کے سامنے وضاحت کے ساتھ تصویر کے دونوں رُخ آجائیں؛

الجواب بعون الملک الوہّاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥ نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم۔

سیّد ممتاز احمد صاحب مستفتی کے سوالات واقعات کے نہایت مطابق تھے۔

مفتی کفایت اللہ صاحب کا انھیں تلبیس بتانا غلط اور تلبیس ہے۔ مستفتی کا کوئی جملہ ایسا نہیں ہے جس کا انکار کیا جا سکے اور خود مفتی صاحب سے ممکن نہ ہُوا کہ وہ دوچار اغلاط پیش کر کے بتا سکتے کہ مستفتی نے اُن میں یہ تلبیس کی ہے اور واقعات سے سوال کے فلاں لفظ میں یہ مطابقت نہیں ہے۔ اِس طرح تو ہر ایک کلام کو تلبیس کہا جا سکتا ہے، مگر جو چیز بے ثبوت ہو، جو بات بے سند ہو، اصحابِ عقل وخرد کے نزدیک لائقِ التفات نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سوالات نے مفتی صاحب کے چھکے چھڑا دیے اور اُنھیں اپنے طرزِ عمل کو دیکھتے ہُوئے جواب کی کوئی راہ نہ ملی، اِس لیے آپ نے اُن سوالوں کے جواب کی بجائے اپنی طرف سے اپنے حسبِ منشا طول طویل سوال بنانے کی زحمت گوارا فرمائی اور اپنے ہی سوال کا جواب تحریر فرمالیا۔ یہ طریقہ رائج ہوجائے تو ہر شخص مفتی بن سکتا ہے، جب مستفتی کے سوال کا لحاظ ہی نہ ہو تو اپنا من مانا سوال گھڑنا اور اُس کا جواب دے لینا کیا مشکل ہے۔ مفتی صاحب نے جو سوال بنایا ہے اُس میں تلبیس ہیں اور اُس کی چند قابلِ لحاظ باتیں یہ ہیں:

۱۔ ہندوستان پر ایک غیر ملکی حکومت کا جبریہ قبضہ۔

۲۔ ہندوستانیوں کی خواہش ہے کہ پردیسی قوم ہمارے خزائن ومنافع چھین کر لے جارہی ہے اور اس کی بدولت ہم محتاج ہوگئے ہیں۔ وُہ ہمارا ملک خالی کر دے۔

۳۔ اہلِ ملک اپنی مرضی کے موافق حکومت قایم کریں اور ملکی ذخائر سے خود متمتع ہوں۔

۴۔ ایک ملکی مجلس نے جس میں ہندوستانی تمام اقوام کے نمائندے شریک ہیں، طے کیا کہ آزادی حاصل کی جائے۔

۵۔ آزادی کا طریقہ جبریہ قوانین کی خلاف ورزی ہے۔

۶۔ اِس سلسلہ میں جو مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں، کی جائیں۔

۷۔ مشترک مجلس نے ایک غیر مسلم کو جنگ کے اختیارات دے دیے۔ وُہ تمام ہندوستانیوں کو جنگ کے طریقے بتا کر لڑا رہا ہے۔ اِن نمبروں میں مفتی صاحب نے جو عیّاریاں اور تلبیسات کی ہیں وہ ملاحظہ کیجیے:

مفتی جمعیۃ کے تلبیسات (۱) کی نسبت یہ دریافت طلب ہے کہ جبری قبضہ سے کیا مراد ہے؟

یہی کہ اگر اُس ملک کے بعض لوگ اس قبضہ کو پسند نہ کرتے ہوں تو بزورِ قوت اُن پر حکومت قایم رکھی جائے یا کچھ اور معنی ہوں تو مفتی صاحب بیان کریں اور اگر یہی معنی ہیں تو دنیا کی ایسی کون سی حکومت ہے اور جہاں میں ایسی کون سی سلطنت قایم ہوئی جس کا کوئی مخالف ہی نہ ہوا ہو اور جس نے اپنے قیامِ حکومت کے لیے قوت جمع نہ کی ہو؟

۲۔ ہندوستانیوں سے کون مراد ہے؟ تنہا ہندو یا ہندو اور مسلمان سب؟

دوسری صورت میں کیا مفتی صاحب کے علم میں نہیں ہے کہ ہندو مسلمانوں کو پردیسی بتاتے ہیں اور صرف اپنے آپ کو ہندوستان کے منافع کا مستحق سمجھتے ہیں۔ اِس لیے اُن کی خواہش فقط انگریزوں کو نکال دینے سے پوری نہیں ہوسکتی جب تک وہ مسلمانوں کو بھی ہندوستان سے باہر نہ کر دیں اور ایسا وہ بارہا کہہ چکے ہیں اور بہت سے ہندوؤں کے قلم سے ایسے مضامین نکل چکے ہیں اور ملک میں اِس کا غلغلہ مچایا گیا ہے۔ اِس کو چھپانا اور یہ ظاہر کرنا کہ ہندوؤں کی صرف یہ خواہش ہے کہ حکومتِ موجودہ کو نکال دیں، اِس کے بعد ہندوستان کی دولتوں میں مسلمانوں کو برابر شریک بنالیں گے، یہ سخت تلبیس ہے، محض دھوکا ہے۔ ایسے ہی دھوکے دینے کے لیے سوال دوبارہ گھڑا گیا ہے۔

۳۔ اہلِ ملک سے کیا مراد ہے؟ صرف ہندو یا مسلمان بھی؟ دلیل کے ساتھ بیان کیجیے۔ ہندوؤں نے کب مسلمانوں کو اہلِ ملک قرار دیا ہے؟ یہ بھی تلبیس ہے۔

۴۔ یہ بہت بڑی تلبیس ہے کہ ملکی مجلس جس میں ہندوستانی تمام اقوام کے نمائندے شریک ہیں۔ ایسی مجلس کونسی ہے؟ آپ کانگرس کو ایسی مجلس بتانا چاہتے ہیں مگر یہ انتہا درجے کی تلبیس اور غایت درجے کا فریب ہے۔ کانگرس میں تمام اقوام کے نمائندے کب شامل ہیں؟ کیا ہندوؤں کے زرخرید اشخاص کسی قوم کے نمائندے قرار دیے جاسکتے ہیں؟ یا آپ کی مٹھی بھر جمعیت جو جمہور اہلِ اسلام کے مخالف ہوکر کانگرس کا کلمہ پڑھنے لگی ہے اور تمام عالمِ اسلام اُس پر ملامت کر رہا ہے یہ اُن کی نمائندہ ہوسکتی ہے؟ جو قوم کسی جماعت سے ناراض ہو، اُس کو غدّار سمجھے، وہی جماعت اُس کی نمایندہ قرار دی جاسکتی ہے؟ مسلمانوں نے کب کانگرسی مدعیانِ اسلام کو اپنا نمائندہ بنایا؟ کہاں اپنا

قائم مقام مقرر کیا؟ کس مجلس میں شرکتِ کانگریس کی اجازت دی؟ خود نمائندہ بن بیٹھنے سے کوئی شخص کسی کا وکیل ہو سکتا ہے؟ ایسی وکالت آپ نے کس کتاب میں پڑھی ہے؟ اور یہ طریق نمائندگی کون سے دار الافتاء کے حکم سے جائز سمجھا ہے؟ اِسے کہیے جبری نمائندگی اور یہ ہے تلبیس۔ آپ کے مستفتی نے تو تلبیس نہیں کی مگر جناب کا جواب مجموعۂ تلبیسات ہے۔

۵- جبریہ قوانین کے معنی بھی بتائیے۔ کیا اگر باذنہٖ تعالیٰ ہندوستان میں کبھی اسلامی حکومت قایم ہو تو آپ کے اہلِ ملک اور آپ کی ملکی مجلس اُن قوانین کو برضا و رغبت قبول کرنے کے لیے تیار ہوگی اور جبریہ قوانین نہ بتائے گی؟ بتائے گی اور ضرور بتائے گی اور بتا چکے ہیں اور جبریہ سے زیادہ سخت الفاظ کہہ چکے ہیں اور شرعی قوانین کی نہایت توہین کر چکے ہیں اور اب بھی کہہ رہے ہیں۔

اگر آپ کے علم میں نہ ہو تو مجھ سے دریافت کیجیے گا۔ آپ کو بتاؤں گا اور ذخیرے کے ذخیرے آپ کو دکھاؤں گا، جو اسلامی شریعت اور اسلامی قوانین کی مخالفت و اہانت میں پُر ہیں۔ تو آپ کی ملکی مجلس اور آپ کے اہلِ ملک سوائے رام راج کے یعنی سوائے اپنے مذہبی قوانین کے دنیا کے ہر ایک قانون کو جبری قانون اور ظالمانہ قانون کہتے ہیں۔ جب اہلِ ملک کے نزدیک اسلامی قانون بھی جبری اور ظالمانہ ٹھہرا اور جبری قانون سے آزادی مطلوب، تو آپ کے اہلِ ملک کے نزدیک آزادی رام راج میں منحصر ہوئی۔ آپ نے اِس پر پردہ ڈالا، یہ ہے آپ کی تلبیس۔

۶- اہلِ ملک کی کافر عوام کی آزادی یعنی رام راج کے سلسلہ میں تمام مصائب برداشت کی جائیں۔ اِس میں لُٹنا پٹنا، مارا جانا، تباہ ہونا، سب ہی کچھ آگیا۔ آپ ہی انصاف سے کہیے کہ جو ہندوؤں کی محبت میں اس قدر فنا ہو گیا ہو کہ وہ مسلمانوں کو رام راج قایم کرنے کے لیے مرجانے اور ہلاک ہو جانے کی رائے دیتا ہو، اُس کو اگر ہندو پرست کہا جائے تو کیا بیجا ہے؟ رام راج قایم کرنے کے لیے مدعا کو آپ نے لفظ آزادی کے پردہ میں چھپایا۔ اِس کو کہتے ہیں تلبیس۔

۷- کیا آپ اپنے اعتقاد میں یہ سچ جانتے ہیں کہ بحالتِ موجودہ مسلمانانِ ہند سب کے سب

یا اُن کا سوادِ اعظم گاندھی کو جنگ کے مکمل اختیارات دینے اور اپنا سپہ سالارِ اعظم بنانے پر راضی ہیں اور یہ جائز سمجھتے ہیں اور قرآن و حدیث میں اِس کی اجازت دی گئی ہے؟ شاید ایسا آپ بھی نہ کہہ سکیں اور اتنا موٹا جھوٹ بولنے کی آپ کو جرأت نہ ہو، تو آپ ہی بتائیے کہ جس جماعتِ ذلیلہ نے عامۃ المسلمین کی مرضی اور اُن کے عقیدے کے خلاف ایک مشرک کو سپہ سالارِ اعظم بنا لیا ہو اور جنگ کے تمام اختیارات تفویض کر دیے ہوں اور اپنے آپ اُس کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بن کر رہ گئی ہو، وہ مسلمانوں کی نمائندہ ہو سکتی ہے؟ اور اُس کو مسلمانوں کا نمایندہ بتانا کیسی بڑی تلبیس ہے؟ اور مجلسِ مشترک کا لفظ اِسی تلبیس کے لیے لایا گیا ہے تاکہ لوگوں کو اِس مغالطہ میں ڈالا جائے کہ کانگرس میں ہندو مسلمان ایک حیثیت سے شامل ہیں اور جس طرح کانگرس ہندوؤں کی نمایندہ ہے اُسی طرح تمام مسلمانوں کی بھی نمایندہ ہے۔ یہ ہیں آپ کے تلبیسات۔

سوالات کی شکل

اِس تنقید کے بعد مولوی کفایت اللہ صاحب کی تقریر سے سوالات کی مسطورۂ ذیل شکل قایم ہوتی ہے۔

سوال نمبر ۱: ہندو فقط ہندوؤں کو ہندوستانی سمجھتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہی ہندوستان میں عیش و آرام کرنے، یہاں کی سرزمین سے فائدہ اٹھانے، یہاں حکومت کرنے کے مستحق ہیں اور مسلمانوں کو غیر ملکی جانتے ہیں۔ وہ آزادیِ ملک کے لیے جو جد و جہد کریں آیا وہ مسلمانوں کے لیے نافع و جائز ہے یا نہیں؟

سوال نمبر ۲: جمعیۃ العلماء نے عامۃ المسلمین کی رائے کے خلاف کانگرس کی اطاعت منظور کی۔ ایسی حالت میں جمعیۃ العلماء کو مسلمانوں کا نمایندہ کہنا اور محض اس جماعتِ قلیلہ کی شرکت سے کانگرس کو مشترک مجلس ظاہر کرنا فریب ہے یا نہیں؟ اور جو شخص ایسا کہتا ہے وہ دین و ملت کا غدّار ہے یا نہیں؟

سوال نمبر ۳: جس حالت میں عام ہندو اور بالخصوص کانگرسی اسلامی قانون کو انگریزی قانون سے سخت اور قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں، تو یہ باور کرنے کی کیا وجہ ہے کہ وہ قانونِ شریعت کی بےحرمتی نہ کریں گے؟ اور اس کو اپنے ملک کے لیے خوش دلی سے منظور

کرلیں گے۔ اگر ہندو قانونِ شریعت کو منظور نہ کریں تو کیا آپ کے نزدیک ہندو دھرم شاستر انگریزی قانون سے بہتر ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کی وجہ مع دلائل بیان کیجیے؟

سوال نمبر ۴: رام راج یعنی وہ حکومت جو ہندو دھرم شاستر کو اپنا قانون بنائے یا اور کسی غیر اسلامی قانون کو رائج کرے اور قانون اسلامی کو ناقابلِ نفاذ اور جرم جانے، ایسی حکومت قایم کرنے کے لیے ملک کے امن کو برباد کرنا، اپنے جان و مال کو خطرہ میں ڈالنا، بلکہ پٹنا، قید ہونا، مرجانا، آیا یہ شرعاً جائز ہے؟ اور یہ موت دین کے لیے ہوگی؟ اور اِس موت کو شہادت کہا جاسکے گا؟ دلائل کے ساتھ بیان کیجیے۔

سوال نمبر ۵: جو کافر رام راج قایم کرنے کے لیے اٹھا ہو اور اُس کی سعی کا انجام جو اُس کے پیشِ نظر ہے یہی ہوگا کہ ہندوستان کو انگریزوں اور مسلمانوں سے آزاد کرایا جائے اور ہندو قانون رائج کیا جائے، اُس کو جو جماعت اختیاراتِ جنگ تفویض کرے اور اُس کے اشارہ کا اتباع اپنے اوپر لازم کرے اور مسلمانوں کو اُن کی فرمانبرداری کی اجازت دے اور مسلمانوں کو یہ مغالطہ دے کہ جس طرح یہ کافر ہندوؤں کا نمایندہ ہے ایسے ہی مسلمانوں کا بھی نمایندہ ہے۔ ایسی جماعت اسلام کی دشمن اور غدار ہے یا نہیں؟ اور اِس جماعت میں شامل ہونا اور اُس کے حکموں کا ماننا درست ہے یا نہیں؟ شریعت میں ایسی جماعت کا کیا حکم ہے؟ دلائل سے بیان کیجیے۔

یہ تو مولوی کفایت اللہ صاحب کی تحریر سوالات پر تنقید کرنے سے جو شکلِ سوالات پیدا ہوتی وہ تھی اور اصل مستفتی کے سوالات بدستور لاجواب ہیں۔ مفتی صاحب پر لازم ہے کہ وہ اِن دونوں کے جواب تحریر کریں اور دیانت و انصاف کے ساتھ تحریر کریں۔ اب مولوی کفایت اللہ صاحب کے جواب پر ایک نظر کی جائے اور دیکھا جائے کہ اُن کے جواب میں کہاں تک شرع محفوظ ہے۔

مولوی کفایت اللہ کے کلام سے انگریزی حکومت جائز اور سوراجی حکومت اور اس کے لیے کوشش ناجائز ثابت ہوتی ہے

(۱) مولوی کفایت اللہ صاحب نے غیر مسلم حکومت سے ملک کو آزاد کرانا اوّلین فریضہ بتایا ہے

اور اس کی دلیل میں دو آیتیں إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ ـــ اور ـــ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا پیش کیں اور اس کے بعد فرمایا ہے کہ ان آیات پر ایمان رکھنے والے طوعاً کسی وقت کسی طرح بھی غیر خداوندی احکام کی اطاعت نہیں کر سکتے۔ اگر کرتے ہیں تو مجبوری و اضطراری طور پر کرتے ہیں اور اس مجبوری کو دفع کرنے کی کوئی صورت بھی ممکن ہو تو اُس سے آزادی حاصل کرنا اُن پر لازم ہو جاتا ہے۔ یہ مضمون ہے مفتی کفایت اللہ صاحب کے جواب کا جو اُنھوں نے وجہِ اوّل میں بیان کیا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انگریزی حکومت کا اتباع تو جائز ہے کیونکہ وہ مجبوری و اضطراراً کیا جاتا ہے اور کانگرس کی مجوزہ حکومت ناجائز ہے کیونکہ اُس میں ہندو اکثریت حکمران ہو گی اور خداوندی احکام کی اطاعت کا کچھ لحاظ نہ کیا جائے گا اور ایسی حکومت بقصدِ اختیار طلب کی جاتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اُن کے تسلّط سے مجبوراً اُن کے احکام ماننے پڑے ہوں۔ لہذا مفتی صاحب کی پیش کی ہوئی آیات کے حکم اور مولوی صاحب کی تصریح سے ثابت ہوا کہ کانگرس کی مطلوبہ حکومت ناجائز، اُس کی اطاعت مسلمانوں کو حرام۔ تو اُس ناجائز حکومت کیلیے سعی و امداد ناجائز و حرام اور حکمِ قرآنی کے خلاف ہے۔

(۲) جواب میں دوسری وجہ مفتی کفایت اللہ صاحب نے یہ لکھی ہے کہ اجنبی قوم کو حق نہیں کہ ہمارے ملک پر ہماری مرضی کے خلاف جبراً حکومت کرے، ہم اُس کی حکومت برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں، یہ ہمارا فطری عقلی عرفی بین الاقوامی حق ہے۔ ان لفظوں کے معنی مفتی صاحب بیان کر دیں تو بہت بہتر ہو کیونکہ اس سے تردّد ہو رہا ہے کہ ہمارا ملک کہنے کا حقدار کون ہے اور اس استحقاق کی بنا کس چیز پر ہے؟ اگر کہیے قبضہ پر، تو قبضہ انگریزوں کا موجود ہے۔ اور اگر کہیے پیدائش پر، تو کیا وہ ہندو یا مسلمان اجنبی سمجھے جائیں گے جو ولایت یا عرب یا اور کسی ملک میں پیدا ہوئے اور اُن کے آبا و اجداد ہندوستان میں سکونت رکھتے تھے، وہ خود بھی ہندوستان میں سکونت رکھتے ہیں۔ اور کیا وہ انگریز جو ہندوستان میں پیدا ہوئے اجنبی ہوں گے اور ہندوستان کی حکومت بقول آپ کے اُن کا فطری عقلی عرفی بین الاقوامی حق ہو گی اور آپ کے نزدیک اُنھیں جائز ہو گا کہ وہ ہندوستان کو اپنا ملک بنائیں۔ اسی طرح بہت سے افغانیوں، چینیوں، جاپانیوں کے ہندوستان میں اولاد ہوتی ہے، کیا اُن سب کو حق ہے کہ ہندوستان کو

اپنا ملک کہیں۔ یا ہمارا ملک کہنے کا حق صرف اُن لوگوں کو ہے جو ہندوستان میں قدیم سے بود و باش رکھتے ہیں۔ اِس تقدیر پر مسلمان تو مسلمان، ہندو بھی ہندوستان کو اپنا ملک نہیں کہہ سکتے کیونکہ وُہ یہاں کے قدیم باشندے نہیں ہیں۔

ذرا اپنے خداوندانِ نعمت (ہنود) سے پوچھ دیکھیے کہ وُہ ملک کا حقدار کس کو سمجھتے ہیں اور ملک والا کس کو بتاتے ہیں؟ اجنبی کس کو ٹھہراتے ہیں؟ مسلمانوں سے کتنی مرتبہ کہا گیا ہے کہ تم ہندوستان سے چلے جاؤ، تمھارا اِس ملک میں کوئی حق نہیں ہے۔ جن کے آپ ہمنوا ہیں اور جن کی محبت میں آپ نے دین تک کو خیرباد کہہ دیا ہے، وُہ ہندوستان کو خالص اپنا بتاتے ہیں اور مسلمانوں کو غیر ملکی پردیسی کہتے ہیں۔ جب کانگرس یہ مطالبہ کرے کہ ہندوستان ہمارا ہے، اجنبی چلے جائیں تو اِس کے یہ معنی ہیں کہ انگریز اور مسلمان دونوں بوریا بدھنا اٹھا کر چلتے ہوں۔ اگر جمعیۃ یا مفتیِ جمعیت کانگرس کو اِس معاملہ میں حق پر سمجھتی ہے تو وہ ہندوستان سے مسلمانوں کے اخراج کی مساعی ہے۔

مفتی کفایت اللہ صاحب نے فطری حق کے کیا معنی لیے ہیں؟ یہی کہ جہاں جو پیدا ہو جائے وہ جگہ اُسی کے لیے ہے، دُوسرے کو اس سے کچھ سروکار نہیں یا کچھ اور؟ اگر یہی معنی ہیں تو کرڑی کو دیمک سے، کتاب کو کیڑے سے، چارپائی کو کھٹمل سے اگر آپ صاف کرنا چاہیں تو یہ ظلم ہوگا کیونکہ بقول آپ کے سرجوں کا فطری حق ہے، چارپائی کھٹمل کا فطری حق ہے، کتاب کیڑے کا فطری حق ہے اور اِس کے علاوہ یہود کو جزیرۂ عرب سے نکال دینے کا حکم پیغمبرِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دیا، تو کیا آپ کے نزدیک حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فطری حق سلب کیا تھا؟ اور اِس ہندوستان میں جو مسلمان دُوسرے ممالک سے سلطنت کرنے کے لیے آئے، وُہ بھی اجنبی تھے، پردیسی تھے، ہزاروں میل دُور کے رہنے والے تھے، ہندوستانی ان کی سلطنت سے راضی نہ تھے تو کیا آپ کا یہی فتویٰ ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان پر جبری حکومت کی اور ہندوؤں کا فطری حق چھینا اور وہ سلطنت فطرۃً، عقلاً، عرفاً اور بین الاقوامی طریقہ سے ناجائز تھی؟ اور جس قدر تصرفات انھوں نے ملک میں کیے وہ سب ظلم تھے؟ کُھل کر کہیے اور اگر آپ یہ کہنے کے لیے تیار ہوں تو آپ کو اعلان کر دینا چاہیے کہ سلطنتِ

اسلام کی عطا کی ہُوئی املاک و معافیات و اوقاف پر جو مسلمان قابض ہیں ، یہ قبضہ ناجائز ہے ، یہ سب ہندوؤں کو واپس کر دینا چاہیے ۔ اور جس سلطنت کا ہندوستان میں قبضہ ہی ناجائز تھا اور اُس کو فطری ، عقلی ، عرفی ، بین الاقوامی طور پر کوئی حق ہی حاصل نہ تھا ، اُس نے جتنی مسجدیں بنائیں ، وُہ بھی سب غصب کی زمین تھیں ، اُن کے لیے کیا حکم ہے ؟ اگر ہندوؤں کو واپس دینے کا فتویٰ دے دیجیے تو آپ کا کام بن جائے اور جو مطمحِ نظر ہے وُہ پُورا ہو جائے اور آپ کے ہندو آقایانِ نعمت خوب خوش ہوں ۔ آپ ہندوؤں کی محبت میں اِس قدر محو ہیں کہ اسلام و حکومت ہائے اسلام پر در پردہ حملے کر رہے ہیں ۔ اِس کو ہندو پرستی نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے ؟ جس کے مقابل نہ شریعت کی پروا ہے نہ دین کی ، نہ مسلمانوں کے طریق و آئین کی ۔ انگریزوں کی مخالفت تو ایک بہانہ ہے ، اصل مقصود تو ہندوؤں کو راضی رکھنا اور مسلمانوں کو کٹوانا اور مروانا ہے ۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہلاک کروا دو ، پھر ہندوستان صرف تمہارے دوستوں ہی کے لیے رہ جائے گا ۔ سوراج ہی سوراج ہے ۔ حامیِ سوراج ہو تو ایسا ہو ، قوم مٹ جاتے ، مذہب برباد ہو جائے ، مگر ہندو راضی رہیں ۔ خوب حقِ نمک ادا کیا ۔ واہ مفتی ! (اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب کرے)

(۳) مفتی کفایت اللہ صاحب نے لکھا ہے :

> "چونکہ ہمارے پاس مادّی قوت نہیں ہے اس لیے ہم تشدد کا طریقہ اختیار کرنے سے مجبور ہیں ۔"

یہاں تو انگریزوں سے جنگ آزما ہونے سے انکار اور مجبوریوں کا اظہار ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فرما رہے ہیں کہ :

> "اگر ہمارے افراد اس کے لیے تیار ہیں کہ وُہ لاٹھیاں کھائیں ، سنگینیں اور برچھیاں ، چھُرے اور گولیاں اپنے سینوں پر لیں تو یقیناً اُنھیں اپنے حقِ آزادی کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنا جائز ہے ۔"

مفتی صاحب کی یہ دونوں قلمیں باہم مخالف و متضاد ہیں ۔ ایک میں مادی طاقت نہ ہونے سے جنگی مجبوری کا اظہار ہے ۔ دوسرے میں لاٹھیاں ، سنگینیں ، برچھیاں ، چھُرے ، گولیاں کھانے کے لیے مسلمانوں کو اُبھارا گیا ہے ۔

جب تمہارے پاس مادّی طاقت نہیں ہے، نہ تم دشمن کو مار سکتے ہو، نہ اُن کی مار کو روک سکتے ہو، تو چھرے، گولیاں اور سنگینیں کھانے سے کیا نتیجہ؟ مسلمان گولیاں کھا کھا کر مر گئے تو آزادی کون لے گا؟ کہو ہمارے یار ہندو، جن کے اوپر ہم مسلمانوں کو بھینٹ چڑھانا چاہتے ہیں۔ کیا ستم ہے، ہندوؤں کے لیے ملک خالی کرانے کے واسطے مسلمانوں کو مرنے اور جان کھونے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

جب آپ کا یہ فتویٰ ہے اور مسلمانوں کو نشانۂ بندوق بننے کا آپ مشورہ دیتے ہیں تو خود کیوں ایسے موقع پر آگے نہیں بڑھتے؟ جناب کی ساری بہادری اُسی وقت تک ہے جب تک بندوق کا رُخ دوسرے مسلمانوں کی طرف ہو اور جو جناب مفتی صاحب کی طرف بندوق کا رُخ ہو تو ابھی معافی مانگ لیں اور فتویٰ یاد نہ آئے۔ یہ فتویٰ اپنے گھر چھوڑ کر سارے جہان کے لیے ہے۔ اپنے گھر پہ آفت آتی دیکھیں تو ہندوؤں کی دوستی سے بھی دست بردار ہو جائیں۔ مفتی صاحب کی طرف سے بہت سے بلند آہنگیاں کرنے والے بہادر جو مسلمانوں کو بڑھاوے دے کر کنوئیں میں دھکیلا کرتے تھے، معافی مانگ بیٹھے اور تحریک کے مخالف ہو گئے۔

اب رہی یہ بات کہ جب کفار سے مقابلہ کی قوت نہ ہو، اُس وقت اُن کے مطابق ہو جانا اور اُن کی تیغ و سنان سے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالنا جو مفتی صاحب نے جائز لکھا ہے، اِس جواز سے کونسا جواز مراد ہے؟ جواز سوراجی یا فطری یا عقلی یا بین الاقوامی کون سا جواز؟ جواز فطری اگر ہوتا تو اِس پہ آپ کوئی شرعی دلیل تحریر فرماتے تو کہاں سے فرماتے؟ شریعت کے تو خلاف کہہ رہے ہیں۔ شریعت نے تو مسلمانوں کو اپنی جان کی حفاظت کا حکم دیا ہے، کسی مباح کام کے کرنے یا ترک کرنے پر اگر اُس کو جان کا اندیشہ ہو اور دشمن قتل کرنے یا کم سے کم کسی عضو کے تلف کرنے پر آمادہ ہو، تو مسلمان کو جائز نہیں کہ وہ اپنی بات پر اَڑا رہے اور یہ کہے کہ میں تو مباح کام کرتا ہوں، جائز کام کرتا ہوں، ہرگز اِس سے باز نہ آؤں گا۔ اگر اُس نے ایسا کیا اور دشمن نے اُس کو مار ڈالا، تو وہ گنہگار ہوگا اور اُس پر الزام ہوگا کہ اُس نے اپنی جان ہلاک کرنے میں دشمن کو مدد پہنچائی، بلکہ اگر کسی حرام کام پر بھی مجبور کیا جائے، تو شریعت مسلمان کی جان کی حفاظت مقدم رکھتی ہے اور یہ حکم دیتی ہے کہ جان بچانے کے لیے

حرام کا ارتکاب کرے۔ اِس ارتکاب پر اللہ تعالیٰ اُس کو نہ پکڑے گا۔

زیادہ بسط تو کیا کیا جائے، آپ کو ہدایہ کی صرف ایک عبارت دکھا دی جاتی ہے۔ متداول کتاب ہے، ملاحظہ کیجیے؛

ان اکره علی ان یاکل المیتة او یشرب الخمر فاکره علی ذٰلك بحبس او یضرب او قید لم یحل له الا ان یکره بما یخاف منه علیٰ نفسه او علیٰ خصوص اعضائه فاذا خاف علیٰ ذٰلك ان یقدم علیٰ ما اکره علیه وکذا علیٰ للذا الدم ولحم الخنزیر لان تناول هذا المحرمات انما یباح عند الضرورة کما فی حالة المخمصة لقیام المحرم فیما وراءها ولا ضرورة الا اذا خاف علی النفس او علی العضو حتی لوضیف علیٰ ذٰلك بالضرب الشدید وغلب علیٰ ظنه ذٰلك یباح له ذٰلك ولا یسعه ان یصیر علیٰ ما توجد فان صبر حتّٰی ارقعوا به ولم یاکل فهو اٰثم لانه لما ابیح کان بالامتناع معاونا لغیره علیٰ هلاك نفسه فیاثم کما فی حالة المخمصة۔

مردار کھانا اور شراب پینا شرعاً حرام ہے اور اِس سے باز رہنا مسلمان کا دینی و شرعی فرض ہے۔ جو مسلمان مردار کھانے یا شراب پینے سے انکار کرتا ہے، وہ نہ فقط امر جائز کا مرتکب ہے بلکہ اپنے فرض کو ادا کر رہا ہے، لیکن جس حالت میں کوئی شخص اُس کو اِن چیزوں کے کھانے پینے پر مجبور کرے اور قتل یا قطعِ عضو پر آمادہ ہو جائے تو مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ ان چیزوں کو نہ کھائے پئے اور قتل ہو جائے۔ اگر مسلمان نے ایسا نہ کیا اور مارا گیا تو گنہگار ہوگا اور اپنی جان ہلاک کرنے میں دشمن کی اعانت کا مجرم قرار دیا جائے گا۔ ہدایہ کی مذکورہ بالا عبارت میں یہ مضمون صاف و صریح موجود ہے۔ مفتی کفایت اللہ صاحب کی یہ طبع زاد دلیل کہ حق آزادی کا طلب کرنے والا ایک امر جائز کا مرتکب تھا، حکومت نے اگر گولیاں برسائیں تو یہ اُس کا فعل ہے اور اِس کی ذمہ داری مرنیوالے پر کچھ نہیں۔ یہ اُن کی اپنی ذاتی رائے ہے اور رائے بھی ایسی جو شریعت کے خلاف۔ شریعت اُس

شخص کو گنہگار بتاتی ہے، اپنے دشمن کی اعانت کا مجرم قرار دیتی ہے، مگر مولوی کفایت اللہ صاحب خلافِ شرع اُس کو بری اور بے گناہ کر رہے ہیں۔ آپ کی دلیل نہ قرآن سے مقتبس، نہ حدیث سے، نہ فقہ سے۔ معلوم نہیں ہندوؤں کے دھرم شاستر سے آپ فتویٰ دیتے ہیں یا کانگرسی قانون سے؟ غرض جو کچھ بھی ہو، یہ فتویٰ شریعتِ حقہ کے خلاف ہے۔

آپ نے اس کی مثال میں لکھا ہے کہ:

> "دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کریں اور پانچسو اشخاص ایسے مہیا کیے جائیں جو جمع ہو کر جلسہ کریں اور حکام کے اس حکم سے کہ منتشر ہو جاؤ، منتشر نہ ہوں۔ اِس قصد سے جلسہ شروع کیا گیا اور فرض کرو کہ صرف یہی پانچسو اشخاص تھے کہ سب عدمِ تشدّد کے پابند تھے۔ حکام آئے اور انہوں نے حکم دیا، منتشر ہو جاؤ۔ اِنھوں نے منتشر ہونے سے انکار کر دیا۔ اِس صورت میں حکومت کا فرض یہ ہے کہ اُن سب کو آدمیت کے ساتھ گرفتار کرے اور قانونی کارروائی کرے۔ مگر لبسا اوقات حکومت آئین اور انسانیت کے ساتھ اُن لوگوں کو گرفتار کرنے کے بجائے کبھی تو لاٹھیوں سے پٹوا کر منتشر کرتی ہے اور کبھی گولیاں چلوا کر بہیمیت و بربریت کا انتہائی مظاہرہ کرتی ہے اور ظالمانہ کارروائی سے مظلوموں کا وہ فعل ناجائز نہ ہو جائے گا، جو عقل و انصاف اور مذہب کے خلاف نہ تھا اور جو لوگ اِس بربریت اور بہیمیت کا شکار ہو کر شہید ہوں گے وہ یقیناً مظلومیت کی وجہ سے شہادت کا درجہ پائیں گے۔ اُن کو خودکشی کا مرتکب بتانا سخت جہالت اور ناواقفیتِ احکامِ شرعیہ کی دلیل ہے۔"

مذکورہ بالا خط کشیدہ عبارت مفتی کفایت اللہ صاحب کی ہے۔ اِس میں آپ نے خودکشی کا مرتکب بتانے والوں کو سخت جاہل اور ناواقفِ احکامِ شرعیہ تو فرمایا مگر احکامِ شرع نقل نہ فرمائے، جو دفعہ ۱۴۴ کو توڑنے پر اپنی جانیں ہلاکت میں ڈالنے والوں کو مظلوم اور شہید قرار دیتے اور آپ وہ احکام بیان کہاں سے کرتے، شریعت میں تھے کہاں، شریعت کے خلاف تو آپ نے خود فتویٰ دیا ہے، احکامِ شرعیہ کے نام پر عوام کو مغالطہ دیا ہے۔ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی شرعاً فرض نہیں، نہ اِس کی موافقت مردار اور شراب کی طرح حرام۔ غایت یہ ہو گی کہ ایک امر جائز ہو،

اُس کے لیے جان کا ہلاک کرنا کس طرح مظلومیت اور شہادت ہوگا جبکہ شریعت نے مردار اور حرام شراب جیسی چیزوں سے محترز رہنے پر جان کا ہلاکت میں ڈالنا جائز نہیں رکھا اور ایسے شخص کو اپنے قتل کا معین اور گناہگار قرار دیا، جیسا کہ ہدایہ کی مذکورہ بالا عبارت سے ظاہر ہے۔ شریعت اُس شخص کو ظالم کا معین قرار دیتی ہے اور آپ مظلوم۔ شریعت اُس کو گناہگار بتاتی ہے۔ شریعت کے حکم کی آپ صراحۃً مخالفت کر رہے ہیں اور جہالت و ناواقفیت کا الزام دوسروں پر۔

جہالت تو یہ ہے کہ آپ نے خود اپنے فتوے میں لکھا کہ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ: "ہم اپنی طرف سے کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس کا نتیجہ حکومت کی جانب سے تشدد ہو" اور خود ہی اِس کے خلاف یہ فتویٰ دیا کہ: دفعہ ۱۴۴ کی مخالفت میں اڑے رہنا اور جان دے دینا شہادت ہے —— ایک ہی صفحے میں اتنا بڑا تعارض! اُسی صفحے میں آپ نے قانون شکنی کو جائز قرار دیا اور اُسی صفحے میں حکومت سے قانونی کارروائی کرنے اور دفعہ ۱۴۴ کا خلاف کرنے والوں کو گرفتار کرنے کا مطالبہ کیا۔ جس قانون کی آپ مخالفت کرتے ہیں اُسی قانون کے برتاؤ کرنے کی گورنمنٹ سے استدعا کرتے ہیں؟ مفتی صاحب یہ فتویٰ کس خمار میں بیٹھے لکھ رہے تھے، جو اپنی ہی بات خود بار بار کاٹتے تھے اور حافظہ نباشد کا مضمون پیشِ آثار رہتا تھا۔ آپ کے اِس فتوے نے بہت سے مسلمانوں کی جانیں کھوئیں، جنھوں نے شہادت سمجھ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا اور خدا جانے اور کتنے آپ کی تیغِ ستم کے قتیل ہوں گے اور آپ کے اِس خنجرِ خونخوار کی دھار سے موت کے گھاٹ اُتریں گے؟ مسلمانوں کو تو یہ غلط فتویٰ دے کر مروا ڈالو اور ہندوؤں کے لیے ملک خالی کر دو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہدایت دے۔

مولوی کفایت اللہ نے غیر مسلم کے احکام کی اطاعت جائز کر دی

اِس فتویٰ میں بہادر مفتی نے لکھ دیا کہ شرعی احکام کے دائرے میں رہتے ہوئے غیر مسلم کے احکام کی اطاعت ناجائز نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں، اگر آپ کا یہ عقیدہ ہے تو آپ سول نافرمانی اور قانون شکنی کا حکم کس طرح دے سکتے ہیں؟ آپ کی جو بات ہے متضاد۔ اِس سے بھی درگزر کیجیے تو یہ بتائیے کہ غیر مسلم کے احکام کی اطاعت کا جواز جناب نے کس دلیل شرعی سے لکھا ہے؟

آپ کو یاد نہیں رہا کہ آپ اپنے فتوے کے اوّل میں لکھ چکے تھے: "مسلمان جو اِنِ الحُکمُ

لِلّٰهِ ——— اور ——— وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا پر ایمان رکھتے ہیں طوعاً کسی وقت کسی طرح بھی غیر خداوندی احکام کی اطاعت نہیں کر سکتے۔" یہ آپ ہی کا مقولہ تھا اور آپ ہی غیر مسلم کے احکام کی اطاعت جائز بنا رہے ہیں۔ اُس میں تو یہ تعمیم تھی کہ کسی وقت کسی طرح بھی غیر خداوندی احکام کی اطاعت جائز نہیں۔ اب کون سی طرح جواز کی نکل آئی؟ یا گاندھی جی کے احکام کو خداوندی احکام سمجھ لیا؟ معاذ اللہ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

وُہ آیتیں جو آپ نے خود نقل کی تھیں اُن پر اب عمل کیوں نہیں ہے؟ اب اُن کے خلاف کیوں گاندھی کی اطاعت جائز کی جارہی ہے؟ غرض مفتی صاحب کے فتوے کا بطلان خود اُن کے کلام سے بھی ثابت ہوا۔ گاندھی کی اطاعت اور اسے رہنما بنانا، اُس کا ماتحت اور لشکری بننا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ انگریزوں کی اطاعت کے جواز کی وجہ تو مفتی صاحب نے مجبوری بتائی تھی، یہاں تو کوئی مجبوری بھی نہیں ہے۔ پھر یجعل اللہ للکٰفرین علی المؤمنین کی مخالفت کر کے گاندھی کی اطاعت کس طرح جائز کی جاتی ہے؟ یہ چند باتیں نمونہ کے طور پر لکھ دی گئیں، فتویٰ بہت اغالیط پر مشتمل ہے۔ اگر مفتی صاحب نے قلم اٹھایا اور چاہا تو اُن کے باقی ماندہ اغالیط بھی پیش کیے جا سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو راہِ ہدایت نصیب فرمائے، کجروی و گمراہی سے بچائے۔ آمین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیّد المرسلین محمد و آلہ واصحابہ اجمعین۔

کتبہ العبد المعتصم بحبلہ المتین
محمد نعیم الدین عفا عنہ المعین[۱]

مولانا نعیم الدین مراد آبادی، مفتی اعظم دہلی شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی، مولانا سلیمان اشرف بہاری، مولانا قاضی احسان الحق نعیمی اور مولانا مفتی محمد عمر نعیمی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ حضرات جن کی گاندھوی فرقے کے خلاف چند نگارشات پیش کی ہیں، یہ اور دیگر تمام علمائے اہلسنت جو ہر قدم پر مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے تھے، یہ بریلی کے اُس مردِ حق آگاہ کی فوج کے جرنیل اور سپاہی وغیرہ تھے جس کو اللہ ربّ العزّت نے چودھویں صدی کی تجدید کا منصب مرحمت

---

[۱] نعیم الدین مراد آبادی، مولانا: السواد الاعظم (مراد آباد)، بابت جمادی الاولیٰ ۱۳۴۹ھ، ص ۲ تا ۱۸

فرمایا تھا، جو مسلمانوں کی ہر بڑے اور چھوٹے معاملے میں رہنمائی کر رہا تھا، جو ہر گمراہ اور گمراہ گر کا ناطق
بند کرنے میں پیش پیش تھا، محمدی کچھار کے جس شیرِ غرّاں کے رُوبرُو ہونے کی نہ کسی شیخ الہند
کہلانے والے کو جرأت ہُوئی نہ کسی شیخ الاسلام کو، جس کے سامنے نہ کوئی امام الہند زبان کھول س
اور نہ شیخ الکل، جس کے بالمقابل نہ کسی برطانوی قطب الاقطاب کا چراغ جل سکا نہ تخریبِ دین کے
سلسلے میں برٹش گورنمنٹ سے چھ سو روپیہ ماہوار معاوضہ لینے والے حکیم الامت کا۔ وہ امام محمد غزالی
امام فخر الدین رازی اور امام ربّانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہم جیسے سابقہ مجددین کی طرح
دین و ملّت کی تجدید کا فریضہ ادا کر رہا تھا، گمراہ گروں کے جملہ شبہات کو مٹا کر دلائل و براہین کے ذریعے
مطلع صاف کر رہا تھا۔ چنانچہ دنیائے اسلام کے اُسی فقیہہ اعظم، مرکزِ دائرۂ تحقیق اور مرجع ہر
خاص و عام کے سامنے اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر حاکم علی نقشبندی مجدّدی اور اسلامیہ
ہائی اسکول لائلپور کے سابق ہیڈ ماسٹر چودھری عزیز الرحمٰن نے یکے بعد دیگرے دو استفتاء ۱۹۲۰ء
میں اُس وقت پیش کیے جب گاندھی کی آندھی چڑھی ہوئی تھی۔ نام نہاد تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات
کے فتنے کی صدائے بازگشت سے ملک کا ہر گوشہ گونج رہا تھا۔ آپ نے دلائل و براہین سے مزیّن
ایسا جواب دیا، جس کی نظیر اِس موضوع پر لکھے ہُوئے سارے اسلامی لٹریچر میں پائی نہیں جاتی
وہ جواب المحجۃ المؤتمنہ کتاب کی شکل میں آج بھی موجود ہے اور اِس بات کا مستحق ہے کہ اُس کی
زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے، اسکولوں اور کالجوں میں اُسے رائج کیا جائے کیونکہ اِس
لحاظ سے یہ کتاب وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کہ یہی دو قومی نظریے کا وہ انمٹ سبق ہے
جو آخر کار ہنود کے چرکے کھانے کے بعد علّامہ اقبال مرحوم اور محمد علی جناح جیسے بیدار مغز لیڈروں
کو بھی اپنانا پڑا اور جو قیامِ پاکستان کا باعث ہوا۔ آپ نے دلائل و براہین سے جواب دیتے
ہُوئے ترکِ موالات کی تبلیغ کرنے والے علماء اور لیڈروں کی حالت پر اظہارِ تاسّف کیا اور
فرمایا:

> ”افسوس اور سخت افسوس یہ کہ آج آپ کو جتنے لیڈر دکھائی دیں گے، وہ اور اُن کے
> بازو اور اُن کے ہم زبان عام طور پر اُنھیں اسکولوں کالجوں کے کاسہ لیس ملیں گے۔
> اُنھیں سے بڑی بڑی ڈگریاں ایم۔ اے، بی۔ اے کی پاس ہوئے ہوں گے۔

> کیا اُس وقت اُن میں یہ خباثتیں نہ تھیں؟ ضرور تھیں مگر اِن صاحبوں کو مقبول اور منظور تھیں۔ اور اب جو آنکھ کھلی، تو صرف ایک گوشہ انگریزوں کی طرف کی اور وُہ بھی شریعت پر زیادت کے ساتھ کہ اُن سے مجرد معاملت بھی حرام قطعی بلکہ کفر اور مشرکوں کی طرف کی پہلے سے بھی زیادہ پٹ ہوگئی کہ اُن سے وداد و اتحاد واجب، بلکہ اُن کی غلامی و انقیاد فرض، اُنھیں راضی کرلیا تو خدا کو راضی کرلیا۔ تو ثابت ہُوا کہ اِسلام اِن حضرات کو نہ جب مدِّ نظر تھا، ورنہ ایسی مخرّبِ دین تعلیموں سے بھاگتے، نہ اب مدِّ نظر ہے، ورنہ مشرکوں کے اتحاد و انقیاد کے فتنے نہ جاگتے۔“[1]

قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر کفار سے ترکِ موالات کا حکم دیا ہے کہ گاندھوی علماء کی جرأت کا اندازہ بھلا کون کر سکتا ہے جنھوں نے قرآن و سنّت کے صریح احکام کو پسِ پشت ڈال کر افراط و تفریط کا اِس ایک ہی مسئلے میں وُہ المناک منظر دکھا دیا جو تاریخ کا ایک شرمناک باب ہو کر رہ گیا ہے۔ ترکِ موالات کے فتوے جاری کر کے انگریزوں سے محض معاملت بھی حرام ٹھہرانے لگے اور دوسری جانب مشرکینِ ہند سے نہ صرف موالات جائز رکھے بلکہ اُن کی غلامی کو اپنے اُوپر فرض قرار دے لیا اور اُن کی تبلیغ کا مرکزی نقطہ بھی ہو کر رہ گیا۔ اعلیٰحضرت، مجدد مأتہ حاضرہ، امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرّہٗ نے گاندھوی علماء کے اِس طرزِ عمل پر یُوں تنبیہ فرمائی تھی:

> ”ترکِ معاملت کو ترکِ موالات بنا کر قرآنِ عظیم کی آیتیں کہ ترکِ موالات میں ہیں سُوجھیں، مگر فتوائے مسٹر گاندھی سے، اُن سب میں استثنائے مشرکین کی پچر لگالی، کہ آیتیں اگرچہ عام ہیں مگر ہندوؤں کے بارے میں نہیں۔ ہندو تو ہادیانِ اسلام ہیں۔ آیتیں صرف نصارٰی کے بارے میں ہیں اور نہ کُل نصارٰی فقط انگریز اور انگریز بھی کل تک اِن کے مورد نہ تھے، حالاتِ حاضرہ سے ہُوئے۔ ایسی ترمیمِ شریعت و تغیرِ احکام و تبدیلِ اسلام کا نام خیر خواہیِ اسلام رکھا ہے۔ ترکِ موالاتِ کفار میں قرآنِ عظیم ایک دو دس بیس جگہ تاکید شدید پر اکتفا نہ

---

[1] احمد رضا خاں بریلوی، امام: المحجۃ المؤتمنہ، مطبوعہ بریلی، ص ١٦

فرمائی بلکہ بکثرت، جابجا کان کھول کر تعلیمِ حق سنائی اور اُس پر بھی تنبیہ سُنا دی کہ: قَدْ بَیَّنَّا لَکُمُ الْاٰیٰتِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ٥ ہم نے تمھارے لیے آیتیں صاف کھول دی ہیں اگر تمھیں عقل ہو۔

مگر توبہ! کہاں عقل اور کہاں کان؟ یہ سب تو ودادِ ہنود پر قربان۔ لاجرم اُن سب سے ہندوؤں کا استثناء کرنے کے لیے بڑے بڑے آزاد لیڈروں نے قرآنِ عظیم میں تحریفیں کیں۔ آیات میں پیوند جوڑے، پیشِ خویش واحد قہار کو اصلاحیں دیں۔ اِن کی تفصیل گزارش ہو تو دفتر طویل نگارش ہو۔“ [1]

گاندھوی علماء جو رام راج (سوراج) کی خاطر ہندوؤں پر نثار تھے، اُن کے بندۂ بے دام ہوکر اللہ جل شانہ، سے منہ پھیر بیٹھے، خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا سے عاری ہوکر ترکِ موالاتِ کفار کی آیتوں میں ہنود کا استثناء کرتے تھے۔ اُنھوں نے مسلمانوں کو دھوکا دینے کی خاطر سوراج کا نام آزادی اور ہنود کی غلامی کو ہندو مسلم اتحاد بنا کر ہلکا ٹھہراتے تاکہ عام مسلمان ان کی اسلام دشمنی اور ملت فروشی پر مطلع نہ ہوجائیں۔ اِس پر فاضلِ بریلوی علیہ الرحمہ نے فرمایا:

”مقصود سیلف گورنمنٹ ہے، جس کی صاف تصریح بڑے بڑے لیڈران نے کر دی، بلکہ عجز دیکھ کر مشرکوں کا دامن پکڑا، اُنھیں اپنا یار و انصار بنایا، اوروں کو چھوڑیے، مولویوں میں گنے جانے والے لیڈر فرماتے ہیں: ہم ہندوستان کی آزادی کو ایک فرض اسلامی سمجھتے ہیں، اِس کے لیے ضرورت ہے کہ عام اتحاد ہو اور پوری کوشش سے مقصد حاصل کیا جائے۔“ حالانکہ مشرکوں سے ایسی استعانت نصِ قرآنی کے خلاف اور قطعاً حرام بلکہ صراحۃً قرآنِ کریم کی تکذیب ہے۔“ [2]

قرآنِ کریم نے جملہ کفار سے ترکِ موالات کا حکم دیا ہے۔ گاندھوی علماء نے ہنود کی محبت سے سرشار ہوکر مشرکینِ ہند کا سورۂ ممتحنہ کی آیت کریمہ لَا یَنْھٰکُمُ اللہُ ..... سے استثناء نکالنا شروع

---

[1] امام احمد رضا خاں بریلوی، امام: المحجۃ المؤتمنہ، مطبوعہ بریلی، ص ١٦، ١٧

[2] ایضاً، ص ٥٦

کر دیا۔ مجدد مأتہ حاضرہ رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد کتبِ معتبرہ یعنی تفاسیر واحادیث، فقہ و فتاویٰ کے حوالوں سے اِس کی پانچ تفاسیر پیش کیں کہ،

۱۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے نزدیک بنو خزاعہ کے متعلق ہے۔

۲۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ مسلمان مراد ہیں جنھوں نے اِس آیت کے نزول تک مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی جانب ہجرت نہیں کی تھی۔

۳۔ بعض مفسرین کے نزدیک اِس سے کفار کی عورتیں اور بچے مراد ہیں۔

۴۔ اکثر مفسرین و محدثین کے نزدیک یہ حکم والدۂ اسماء بنت ابوبکر کے متعلق ہے۔

۵۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہ مطلق اُن کافروں کے بارے میں ہے جو مسلمانوں سے نہ لڑے اور اِس معنی کے لحاظ سے یہ آیت منسوخ ہے۔ حضرت امامِ اہلسنّت نے وضاحت فرمائی کہ ہمارے اکابر احناف کے نزدیک یہ آیت دربارۂ اہلِ ذمہ ہے اور اس لحاظ سے احناف کے نزدیک یہ آیہ کریمہ محکم ہے۔ اِس وضاحت کے بعد آپ نے ہنود کے بے شمار مظالم شمار کر کے ہندو نواز ٹولے کو یُوں مخاطب کیا:

> "اب کوئی ستم رسیدہ مسلمان اِن لیڈروں سے یہ کہہ سکتا ہے یا نہیں کہ اے اسٹیجوں پر مسلمان بننے والو! ہمدردیِ اسلام کا ظاہری تانا تننے والو! کچھ حیا کا نام باقی ہے تو ہندوؤں کی گنگا میں ڈوب مرو۔ اسلام و مسلمین و مساجد و قرآن پر یہ ظلم توڑنے والے، کیا یہی تمھارے بھائی، تمھارے چہیتے، تمھارے پیارے، تمھارے سردار، تمھارے پیشوا، تمھارے مددگار، تمھارے غمگسار، مشرکینِ ہند نہیں، جن کے ہاتھ آج تم بکے جاتے ہو، جن کی جے مناتے، جن کی غلامی کے گیت گاتے ہو۔"[1]

گاندھوی علماء کہتے تھے کہ تمام ہندو تو مسلمانوں سے نہیں لڑتے بلکہ وہ بعض ہیں جنھوں نے مسلمانوں پر بعض جگہ مظالم ڈھائے، لہٰذا سب کو محارب نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ حالانکہ اُن کی یہ پچر اسلام دشمنی

---

[1] احمد رضا خاں، امام: المحجۃ المؤتمنہ، ص ۲۷

اور بت پرست نوازی کی آئینہ دار ہے کیونکہ قرآنِ کریم نے محارب یا غیر محارب کی تقسیم و تفریق نہیں فرمائی بلکہ جملہ کفار و مشرکین سے موالات رکھنا حرام قرار دیا ہے۔ گاندھوی حضرات کی راہِ فرار بند کرتے ہوئے فاضلِ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> "اب جس شہر، جس قصبہ، جس گاؤں میں چاہو آزما دیکھو۔ اپنی مذہبی قربانی کے لیے گائے پچھاڑو۔ اُس وقت یہی تمہاری بائیں پسلی کے نکلے، یہی تمہارے سگے بھائی، یہی تمہارے منہ بولے بزرگ، یہی تمہارے آقا، یہی تمہارے پیشوا، تمہاری ہڈی پسلی توڑنے کو تیار ہوتے ہیں یا نہیں؛ اِن متفرقات کا جمع کرنا بھی جہنم میں ڈالیے۔ وُہ جو آج تمام ہندوؤں بلکہ تم سب ہندو پرستوں کا امام ظاہر و بادشاہ باطن ہے یعنی گاندھی، صاف نہ کہہ چکا کہ مسلمان اگر قربانیِ گاؤ نہ چھوڑیں گے تو ہم تلوار کے زور سے چھڑا دیں گے۔ اب بھی کوئی شک رہا کہ تمام مشرکینِ ہند دین میں ہم سے محارب ہیں۔ پھر انھیں لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ میں داخل کرنا نری بے حیائی ہے یا صریح بے ایمانی بھی؟"[1]

مجدّدِ مائۃ حاضرہ امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے موالات کے بارے میں انتہائی تنزل اختیار کر کے گاندھوی حضرات کی حرکاتِ شنیعہ و افعال و اقوالِ قبیحہ گنائے اور اُنھیں یُوں شرمسار کیا ہے:

> "اِن صاحبوں سے یہ پوچھ دیکھیے کہ سب جانے دو، کریمہ لَا یَنْھٰکُمُ ہر مشرک غیر محارب کو عام ہو کر محکم ہی سہی اور مشرکینِ ہند میں کوئی بھی محارب نہ سہی۔ اب دیکھو تمہارے ہاتھ میں قرآن سے کیا ہے؟ خالی ہُوا۔ افسدتہم ھوائے۔ کریمہ لَا یَنْھٰکُمُ نے کچھ نیک برتاؤ، مالی مواسات ہی کی رخصت دی یا یہ فرمایا کہ اُنھیں اپنا انصار بناؤ؟ ان کے گھرے یار ہو جاؤ؟ اُن کے طاغوت کو اپنے دین کا امام ٹھہراؤ؟ اُن کی جے پکارو، اُن کی حمد کے نعرے مارو، اُنھیں مساجدِ

---

[1] احمد رضا خاں، امام: المحجۃ المؤتمنہ، ص ۲۸

مسلمین میں بادب تعظیم پہنچا کر، منبرِ مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر لے جا کر، مسلمانوں سے اُونچا اُٹھا کر، واعظ و ہادیٔ مسلمین بناؤ، اُن کا مردار جیفہ اٹھاؤ، کندھے پر ٹکٹکی زبان پر جے یُوں مرگھٹ پر پہنچاؤ، مساجد کو اُن کا ماتم گاہ بناؤ، اُن کے لیے دعائے مغفرت و نمازِ جنازہ کے اعلان کراؤ، اُن کی موت پر بازار بند کرو، سوگ مناؤ، اُن سے اپنے ماتھے پر قشقے لگواؤ، اُن کی خوشی کو شعائرِ اسلام بند کراؤ، گائے کا گوشت کھانا گناہ ٹھہراؤ، کھانے والے کو کمینہ بتاؤ، اُسے مثل سؤر کے گناؤ، خدا کی قسم کی جگہ رام دہائی گاؤ، واحد قہار کے اسماء میں الحاد رچاؤ، اُسے معاذ اللہ رام یعنی ہر چیز میں رما ہوا، ہر چیز میں حلول کیے ہوا ٹھہراؤ، قرآنِ مجید کے ساتھ رامائن کو ایک ڈولے میں رکھ کر مندر میں لے جاؤ، دونوں کی پُوجا کراؤ،

اُن کے سرغنہ کو کہو، خدا نے اِن کو تمہارے پاس مذکِّر بنا کر بھیجا ہے، یُوں معنیٔ نبوت جماؤ، اللہ عزّ وجلّ نے سیّد الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھی تو فرمایا اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ تم تو نہیں مگر مذکّر اور خدا نے مذکّر بنا کر بھیجا ہے اِس نے معنیٔ رسالت کا پُورا نقشہ کھینچ دیا، ہاں لفظ بچایا، اُسے یُوں دکھایا: — نبوّت ختم نہ ہوتی تو گاندھی جی نبی ہوتے اور امام و پیشوا و بجائے مہدی موعود تو صاف کہہ دیا، بلکہ اُس کی حمد میں یہاں تک اُونچے اُڑے کہ خاموشی از ثنائے تو حدِّ ثنائے تست، صاف کہہ دیا کہ آج اگر تم نے ہندو بھائیوں کو راضی کر لیا تو اپنے خدا کو راضی کر لیا، صاف کہہ دیا کہ ہم ایسا مذہب بنانے کی فکر میں ہیں جو ہندو مسلم کا امتیاز اٹھا دے گا۔ صاف کہہ دیا کہ ایسا مذہب چاہتے ہیں جو سنگم و پریاگ کو مقدس علامت ٹھہرائے گا، صاف کہہ دیا کہ ہم نے قرآن و حدیث کی تمام عمر بُت پرستی پر نثار کر دی۔ کیا کریمہ لَا یَنْھٰکُمُ میں اِن ملعونات و کفریات کی اجازت دی تھی؟" [1]

---

[1] احمد رضا خاں بریلوی، امام : المحجۃ المؤتمنہ، ص ۴۴، ۴۵

حضرت امامِ اہلسنّت رحمۃ اللہ علیہ نے دادِ تحقیق دیتے ہُوئے فرمایا کہ کفّار سے مدد لینے کی تین صورتیں ہیں:

(۱) التجا (۲) اعتماد (۳) استخدام

پہلی دونوں صورتوں کی وضاحت کرنے کے بعد حکم یُوں واضح فرمایا:

"یہ دونوں صورتیں (التجا واعتماد) کفّار کے ساتھ یقیناً قطعاً نصوصِ قطعیہ قرآنیہ سے حرام قطعی ہیں، جن کی تحریم کو پہلی اور دُوسری دو ہی آیتیں کافی و وافی ہیں ہرگز کوئی مسلمان انھیں حلال نہیں کہہ سکتا۔ استخدام: وہ کہ کافر ہم سے دبا ہُوا ہے۔ اُس کی چوٹیا ہمارے ہاتھ میں ہو، کسی طرح ہمارے خلاف پر قادر نہ ہو۔ وُہ اگرچہ اپنے کفر کے باعث یقیناً ہمارا بدخواہ ہوگا مگر بے دست وپا ہے۔ ہم سے خوف وطمع رکھتا ہے۔ خوفِ شدید کے باعث اظہارِ بدخواہی نہ کر سکے یا طمع کے سبب مسلمان کے بارے میں نیک رائے ہوگا۔"[1]

حضرت امامِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۱۵۰ھ) نے اِس استعانت کی صورت کے بارے میں فرمایا ہے کہ: کَالْاِسْتِعَانَۃِ بِالْکِلَابِ۔ مجدد مأتہ حاضرہ رحمۃ اللہ علیہ نے اِس کی تشریح کرتے ہُوئے فرمایا:

"دو باتیں افادہ فرمائیں۔ ایک یہ کہ اُنھیں کُتّا بنا کر اُن سے مدد لے سکتے ہیں، جیسے شکار میں کُتّوں سے مدد لیتے ہیں۔ دُوسرے یہ کہ وُہ ہمارے ہاتھوں میں کُتّوں کی طرح مسخر ہوں کہ اُن کا فعل ہمارے ہی لیے ہو، ہمارے ہی دین کے اعزاز کے واسطے ہو۔ کُتّے سے شکار میں استعانت کب جائز ہوتی ہے، جبکہ وہ وقتِ شکار سارا کام ہمارے ہی لیے کرے، اُس میں سے اپنے واسطے کچھ نہ کرے، اگر شکار مارا اور ماشہ بھر اس کا گوشت کھا لیا، شکار حرام ہے۔ تو استخدام بتایا اور وُہ بھی سب سے ذلیل تر یعنی جیسے کُتّے سے خدمت لیتے ہیں اور شرط

---

[1] احمد رضا خاں بریلوی، امام: المحجۃ المؤتمنہ، ص ۱۷

فریادی کہ وہ خود سری سے یکسر نکل کر محض ہمارے ہی آلۂ کار بن گئے ہوں۔"[1]

مجدد مائتہ حاضرہ قدس سرہٗ نے بتایا کہ استخدام کی صورت میں بھی شرعِ مطہّر نے کفار سے استعانت کی عام اجازت نہیں دی ہے بلکہ اس کی چار صورتیں ہیں:

۱۔ اگر استخدام کی صورت میں اُسے رازدار اور دخیل بنانا پڑے تو یہ استعانت بھی حرام۔

۲۔ اگر کوئی منصب یا عہدہ دینا پڑے تو یہ مسلمان پر اُس کا استعلا ہونے کے باعث حرام ہے۔

۳۔ بغیر ضرورت بھی کفار سے استعانت جائز نہیں۔

۴۔ ضرورت ہو اور اُس میں کافر کو رازدار یا دخیل نہ بنایا جائے اور کوئی منصب نہ دینا پڑے تو استعانت جائز ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:

"اِن شروط و قیود سے مشروط استعانت نہ اُن کو رازدار و دخیل کار بنانا ہے کہ آیتِ اُولٰی کا خلاف ہو، نہ اُن سے عزّت چاہنا کہ آیت دوم کے مخالف ہو، ذلیل و قلیل سے کون عزّت چاہے گا؟ نہ اُسے کوئی ولی و نصیر بنانا کہے گا کہ باقی آیات کے خلاف ہو۔ یہ استعانت اگر ایسی نہیں جیسے کَتَبْتُ بِالْقَلَمِ میں تو ایسی ضرور ہے جیسے لوگ چماروں کو پکڑ کر بیگار لیتے ہیں بلکہ جب اُنھیں کچھ مال دیا جاتا ہے تو ایسے جیسے چمار کو پیسہ دے کر جوتا گنٹھوا لینا۔ کیا اِسے کوئی کہے گا کہ چمار کو ولی و ناصر بنایا؟ لاجرم کلماتِ علماء مخالفت آیات نہ ہوئے ...... یہ تھا حکم شرعی جس کی تحقیق و تنقیح بحمد اللہ تعالیٰ اُس وجہِ جلیل پر ہوئی کہ اِن سطور کے غیر میں نہ ملے گی۔"[2]

آپ نے خلافت کمیٹی کے سبق یعنی ترکِ موالات کے بارے میں ایک حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہوئے اس کے مبلغ لیڈروں اور گاندھوی علماٗ کے ضمیروں کو یوں جھنجھوڑا تھا:

"عقل باور نہیں کرتی کہ اِن کی چیخ پکار سے تمام ہندوستان و سندھ و بنگال و برہما و

---

[1] احمد رضا خاں بریلوی، امام: المحجۃ المؤتمنہ، ص ۷۲

[2] ایضاً: ص ۷۷

افریقہ و جاوا حتیٰ کہ عدن تک کے مسلمان سب نوکریاں، ملازمتیں، زمینداریاں، تجارتیں یک لخت چھوڑ دیں۔ یہ شورشیں تو دو دن سے ہیں۔ صدہا حرام نوکریاں پہلے ہی سے کر رہے ہیں، وہ تو چھوڑیں نہیں، مباح نوکریاں اور حلال تجارتیں، زمینداریاں کس طرح چھوڑیں گے؟

اِن جلسوں، ہنگاموں، تبلیغوں، کراموں سے اگر سو دو سو نوکریاں یا دس بیس نے تجارتیں یا دو ایک نے زمینداریاں چھوڑ بھی دیں تو اِس سے ترکوں کا کیا فائدہ یا انگریزوں کا کیا نقصان؟ غریب نادار مسلمانوں کی کمائی کا ہزار ہا روپیہ ان تبلیغوں میں برباد جا رہا ہے اور جائے گا اور محض بیکار و نامراد جا رہا ہے اور جائے گا، ہاں لیڈروں، مبلّغوں کی سیر و سیاحت کے سفر خرچ اور جلسہ و اقامت کے پلاؤ قورمے سیدھے ہو گئے اور ہوں گے۔ اگر یہ فائدہ ہے تو ضرور نقدِ وقت ہے اور سیرِ یورپ کا حساب تو روزِ حساب ہی کھلے گا۔"[1]

ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات جوشِ تعصّب میں یا اُن لیڈروں کی محبت میں محض بدگمانی قرار دیں لہٰذا ہم تحریکِ خلافت کے سرگرم حامی و کارکن اور گاندھوی بیڑے کے امیر البحر یعنی عالیجناب ابوالکلام آزاد کے اِس بارے میں تاثرات پیش کر دیتے ہیں، کیونکہ موصوف کا بیان ایک عینی شاہد کے بیان کی حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ موصوف کے تجربات و مشاہدات کو عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی نے یُوں نقل کیا ہے:

"خلافت تحریک کے سلسلے میں ہندوستان کے غریب مسلمانوں نے قابلِ فخر جذبۂ ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا تھا۔ بے شمار روپیہ خلافت فنڈ میں دیا۔ پردہ نشین خواتین نے زیور تک اُتار کے دے دیے۔ خود لیڈروں کا اعتراف تھا کہ چھپن لاکھ روپیہ جمع ہوا ہے لیکن اس مالا مال فنڈ کا حشر کیا ہوا؟ ایک قلیل رقم تو ترکوں کو پہنچی باقی روپیہ کو مُردے کا مال سمجھ لیا گیا۔ اُس زمانے میں خود میں اپنی آنکھوں سے

---

[1] احمد رضا خاں بریلوی، امام: الحجۃ المؤتمنہ، ص ۸۸

دیکھتا تھا کہ بڑے بڑے لیڈر کس بیدردی سے قومی روپیہ اپنی ذات پر اڑا رہے ہیں۔[1]

اعلیٰحضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ترکِ تعاون کی تبلیغ کرنے والے علماء اور لیڈروں سے براہِ راست بھی استفسار کیا کہ اُن میں سے کتنے حضرات نے اپنے فتووں اور ارشادات کے مطابق برٹش گورنمنٹ سے تعلق ترک کیا ہے؛ نان کوآپریشن کو اُن کی زندگیوں میں کہاں تک عمل دخل ہے؛ چنانچہ آپ نے پوچھا:

> ”کیا لیڈر صاحبان فہرست دکھائیں گے کہ اِن برسوں کی مدت اور لاکھوں روپے کی اضاعت میں اِتنا فائدہ مرتب ہُوا؛ اِتنوں نے نوکریاں چھوڑیں، اِتنوں نے تجارتیں، اِتنوں نے زمینداریاں؛ طرفہ یہ کہ اُن کے خونِ گرم حامی ہمدم محرم اخبارات اِس ترکِ تعاون پر بڑے بڑے زور لگا رہے ہیں، خود اپنے اخبارات مطابع کیوں نہیں بند کرتے؛ اِن صیغوں کو تو انگریزوں سے جو گہرے تعلقات ہیں دوسرے صیغوں کو کم ہوں گے۔ کیا اوروں کے لیے شور و فغاں اور اپنے لیے نوشِ جاں؛ اور ایک اخباری و مطابعی کیا کریں، بڑے بڑے لیڈر بننے والے اِسی مرض میں گرفتار ہیں۔ دیگراں را نصیحت و خود را فضیحت ۔ ...... ہجرت کا غُل مچایا اور اپنے آپ ایک نہ سرکا۔ جو اُبھارنے میں آگئے اُن مصیبت زدوں پر جو گزری گزری۔ یہ سب اپنے جورو بچوں میں چین سے رہے، ہرّا لگا نہ پھٹکری۔ اور ترکِ تعاون میں بھی کیا کسی لیڈر کے پاس زمینداری یا کسی قسم کی تجارت نہیں؛ نہ اُن کا کوئی انگریزی یا ریاست میں ملازم ہے؛ پھر انھیں کیوں نہیں چھوڑتے؛
>
> لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝[2]

مجدد مائتہ حاضرہ امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ترکِ تعاون کی تبلیغ کرنے والے گاندھوی علماء اور مسلمانوں کو بے دست و پا بنانے کی گاندھوی اسکیم کو کامیاب بنانے والے لیڈروں سے یہ سوال بھی کیا کہ گاندھی کے بہکانے اور ہنود کی دوستی کے نشہ سے سرشار ہو کر

---

[1] عبدالرزاق ملیح آبادی: ذکرِ آزاد، ص ۳۸۸

[2] احمد رضا خاں بریلوی، امام: المحجۃ المؤتمنہ، ص ۸۸، ۸۹

آپ ترکِ تعاون کا ڈھول تو پیٹتے پھر رہے ہیں لیکن کبھی ہندوؤں کی طرف بھی دیکھا ہے کہ خود اُنھوں نے اِس ترکِ تعاون کی تحریک پر کہاں تک عمل کیا ہے؟ اگر آپ حضرات کی آنکھیں کھلی ہوتیں تو صاف نظر آجاتا کہ یہ اسکیم صرف مسلمانوں کو بے دست وپا اور انگریزوں کا موردِ عتاب بنانے کے لیے چلائی گئی ہے۔ چنانچہ آپ نے اُن حضرات کو یُوں مخاطب کیا:

> "بفرضِ غلط و بفرضِ باطل اگر سب مسلمان زمینداریاں، تجارتیں، نوکریاں، تمام تعلقات یکسر چھوڑ دیں تو کیا تمہارے جگری خیر خواہ، جملہ ہنود بھی ایسا ہی کریں گے؟ اور تمہاری طرح بھُوکے ننگے رہ جائیں گے؟ حاشا ہرگز نہیں، زنہار نہیں اور جو دعویٰ کرے اس سے بڑھ کر کاذب نہیں، مکّار نہیں۔ اتحاد و وداد کے جھُوٹے بھرّوں پر بھُولے ہو، منافقانہ میل پر پھُولے ہو، سچّے ہو تو موازنہ دکھاؤ کہ اگر ایک مسلمان نے ترک کی ہو تو ادھر پچاس ہندوؤں نے نوکری، تجارت، زمینداری چھوڑی ہو کہ یہاں مالی نسبت یہی یا اس سے بھی کم ہے ۔۔۔۔۔ لاجرم نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ کہ تمام اموال، گُل دولتیں، دنیاوی جمیع اعزاز، جملہ وجاہتیں صرف ہندوؤں کے ہاتھ میں رہ جائیں اور مسلمان دانے دانے کو بھیک مانگیں اور نہ پائیں۔ ہندو کہ اب انھیں پکائے ڈالتے ہیں جب بے خوف و خطر کچّا ہی چبائیں۔ یہ ہے لیڈر صاحبوں کی خیر خواہی۔ یہ ہے حمایتِ اسلام میں جانکاہی۔"[1]

قرآن کریم نے مسلمانوں کو بتایا ہے لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا کافر تمھیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھیں گے۔ گاندھوی علماء اور لیڈروں نے اللہ رب العزّت کو سچا نہ جانا، اُس کے فرمان پر یقین نہ آیا۔ ایک مشرک ٹھیٹ بُت پرست گاندھی نے اپنی حمایت کا یقین دلایا تو اُسے نہ صرف اپنا خیر خواہ بلکہ پیشوا مان لیا۔ مسلم لیگ، خلافت کمیٹی، جمعیۃ العلماءِ ہند، احرار پارٹی وغیرہ تمام جماعتوں نے گاندھی جیسے دشمنِ اسلام و مسلمین کو اپنا ملجا و ماویٰ اور ہادیِ مطلق و امام علی الاطلاق بنا لیا۔ اُس کی ہر سکیم پر عمل کرنا یہ اپنی سعادت سمجھتے اور قرآن و حدیث کی نصوص کو اُس پر اِس طرح

---

[1] احمد رضا خاں بریلوی، امام: المحجۃ المؤتمنہ، ص ۹۱

منطبق کرنے میں کوشاں رہتے جیسے اصل ارشاداتِ گاندھی ہیں اور قرآن وحدیث تو محض اُس کا حاشیہ اور شرح ہیں۔ یہ حق پرستی نہیں بلکہ زنّار دوستی کی بدمستی تھی۔ حضرت امام اہلسنّت نے گاندھی کی جملہ اسکیموں کا راز فاش کرتے ہُوئے گاندھوی علماء اور لیڈروں کی بے بصری کو واضح کیا اور انتہائی وسیع النظری سے اُس ہجرت، جہاد اور ترکِ معاملت کے مضمرات کو یوں الم نشرح کیا تھا:

"آؤ تمھیں قرآن عظیم کی تصدیق دکھائیں اور اُن (ہنود) کی طرف سے میل اور مَیل کا راز بتائیں۔ دشمن اپنے دشمن کے لیے تین باتیں چاہتا ہے:

اوّل اُس کی موت کہ جھگڑا ہی ختم ہو۔

دوم یہ نہ ہو تو اُس کی جلاوطنی کہ اپنے پاس نہ رہے۔

سوم یہ بھی نہ ہو سکے تو اخیر درجہ اُس کی بے پری کہ عاجز بن کر رہے۔

مخالف نے یہ تینوں درجے اِن پر طے کر دیے اور اِن کی آنکھیں نہیں کھلتیں، خیر خواہی سمجھے جاتے ہیں۔

اوّلاً جہاد کے اشارے ہُوئے۔ اُس کا کُھلا نتیجہ ہندوستان کے مسلمانوں کا فنا ہونا تھا۔

ثانیاً جب یہ نہ بنی، ہجرت کا بھڑ ّادیا کہ کسی طرح یہ دفع ہوں۔ ملک ہماری کبڈیاں کھیلنے کو رہ جائے۔ یہ اپنی جائدادیں کوڑیوں کے مول بیچیں یا یُونہی چھوڑ جائیں۔ بہرحال ہمارے ہاتھ آئیں۔ اِن کی مساجد و مزاراتِ اولیاء ہماری پامالی کو رہ جائیں۔

ثالثاً جب یہ بھی نہ نبھے تو ترکِ موالات کا جھوٹا حیلہ کر کے ترکِ معاملت پر ابھارا ہے کہ نوکریاں چھوڑ دو، کسی کونسل کمیٹی میں داخل نہ ہو، مالگزاری ٹیکس کچھ نہ دو، خطابات واپس کر دو۔ امر اخیر تو صرف اِس لیے ہے کہ ظاہری نام کا دنیاوی اعزاز بھی کسی مسلمان کے لیے نہ رہے اور پہلے تین٣ اِس لیے کہ ہر صیغہ وہر محکمہ میں صرف ہنود رہ جائیں تو اُس وقت کا اندازہ کیا ہو سکتا ہے؟ مالگزاری وغیرہ نہ دینے پر کیا انگریز چُپ بیٹھے رہیں گے؟ ہرگز نہیں۔ قرقیاں ہونگی، تعلیقے ہوں گے، جائدادیں نیلام

ہوں گی اور ہندو خریدیں گے۔ نتیجہ یہ کہ مسلمان صرف قُلی بن کر رہ جائیں۔ یہ تیسرا درجہ ہے۔ دیکھا تم نے قرآنِ عظیم کا ارشاد کہ وہ تمھاری بدخواہی میں گٹی نہ کریں گے۔ اُن کی دلی تمنا ہے کہ تم مشقت میں پڑو، والعیاذ باللہ تعالیٰ۔"[1]

یہ تو پھر ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء کی باتیں ہیں حالانکہ اُس وقت ہمارے عظیم لیڈر اور پاکستان کے بانی مبانی یعنی ڈاکٹر سر محمد اقبال اور محمد علی جناح جیسے بھی ہندو مسلم اتحاد کے چکّر میں پھنسے ہُوئے تھے۔ اقبال مرحوم کبھی کہہ رہے تھے؛ ع

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

لیکن جب اُن کی آنکھیں کُھلیں ہنود کی اسلام دشمنی اور اسلامی تعلیمات پر گھری نظر پڑی تو مجدد الف ثانی اور احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہما والے دو قومی نظریے کو اپنانا پڑا، جس کی اِن دونوں بزرگوں نے اپنے اپنے وقت میں علمبرداری کا فریضہ ادا کیا تھا اور اِس کے پیشِ نظر علاّمہ موصوف کو یہ نظریہ قایم کرنا پڑا؛ ع

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

جناب محمد علی جناح کی آنکھیں نہرو رپورٹ کے وقت جا کر کُھلیں اور اُنھیں صاف نظر آگیا کہ حقیقت میں فردوسِ گوش بنانے کے قابل وہی بریلی کے مردِ قلندر کی آواز تھی، جس پر کوئی لیڈر اِس لیے کان دھرنا پسند نہیں کرتا تھا کہ سارے ہی گاندھی کی آندھی میں مست ہو کر تنکوں کی طرح اُڑتے پھر رہے تھے۔ گاندھوی علمأ اُن کی حرکاتِ قبیحہ واقوالِ شنیعہ پر شریعت کی مُہریں ثبت کر کے جہاں لیڈروں کو شُترِ بے مہار بنا رہے تھے، وہاں اپنے علماءِ سُوء اور ملت فروش ہونے کا زندہ ثبوت بھی پیش کر دیا تھا۔ اگر اور بھی پیچھے کی طرف دیکھیں تو اِس سے آٹھ سال پہلے ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۲ء میں پہلی جنگِ عظیم کے وقت آپ مسلمانانِ ہند کو یُوں فہمایش کر رہے تھے؛

"ہندی مسلمانوں میں یہ طاقت کہاں کہ وطن و مال و اہل وعیال چھوڑ کر ہزاروں کوس (ترکوں کے پاس) جائیں اور میدانِ جنگ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں، مگر مال تو دے سکتے ہیں۔ اِس کی حالت بھی سب آنکھوں دیکھ رہے ہیں، وہاں مسلمانوں پر یہ کچھ گزر رہی ہے یہاں وہی جلسے ہیں، وہی رنگ، وہی تھیٹر، وہی امنگ،

---

[1] احمد رضا خاں بریلوی: المحجۃ المؤتمنہ، ص ۹۲

وہی تماشے، وہی بازیاں، وہی غفلتیں، وہی فضول خرچیاں، ایک بات کی بھی کمی نہیں۔ ابھی ایک شخص نے ایک دنیاوی خوشی کے نام سے پچاس ہزار دئے۔ ایک عورت نے ایک چنیں وچناں جرگہ کو پچاس ہزار دیے۔ ایک رئیس نے ایک کالج کو ڈیڑھ لاکھ دیے اور یونیورسٹی کے لیے تو تیس لاکھ سے زاید جمع ہو گیا۔ ایک رات میں ہمارے اس مفلس شہر سے اُس کے لیے چھبیس ہزار کا چندہ ہُوا۔ بمبئی میں ایک کم درجے کے شخص نے صرف ایک کوٹھری چھبیس ہزار روپے کو خریدی۔ فقط اس لیے کہ اُس کے وسیع مکانِ سکونت سے ملحق تھی، جسے میں بھی دیکھ آیا ہُوں۔ اور مظلوم اسلام کی مدد کے لیے جو کچھ جوش دکھائے جا رہے ہیں، آسمان سے بھی اُونچے ہیں اور جو عملی کارروائی ہو رہی ہے زمین کی تہہ میں ہے۔ پھر کس بات کی اُمید کی جائے؟

بڑی ہمدردی یہ نکالی ہے کہ یورپ کے مال کا بائیکاٹ ہو۔ میں اسے پسند نہیں کرتا، نہ ہرگز مسلمانوں کے حق میں کچھ نافع پاتا ہُوں۔ اوّل تو یہ بھی کہنے ہی کے الفاظ ہیں، نہ اِس پر اتفاق کریں گے، نہ ہرگز اِس کو نباہیں گے۔ اِس عہد کے پہلے توڑنے والے جنٹلمین حضرات ہی ہوں گے، جن کی گزر بغیر یورپین اشیاء کے نہیں۔ یہ تو سارا یورپ ہے پہلے صرف اٹلی کا بائیکاٹ ہوا تھا۔ اُس پر کتنوں نے عمل کیا اور کتنے دن نباہا؟ پھر اِس سے یورپ کو ضرر بھی کتنا اور ہو بھی تو کیا فائدہ کہ وہ سو ترکیبوں سے اُس سے دُگنا ضرر پہنچا سکتے ہیں۔ لہٰذا ضرر رسانی کا ارادہ صرف وہی مثل ہے کہ کمزور اور پٹنے کی نشانی۔

بہتر ہے کہ مسلمان اپنی سلامت روی پہ قایم رہیں۔ کسی شریر قوم کی چال نہ سیکھیں۔ اپنے اُوپر مفت کی بدگمانی کا موقع نہ دیں۔ ہاں اپنی حالت سنبھالنا چاہتے ہیں تو اِن لڑائیوں ہی پر کیا موقوف تھا، ویسے ہی چاہیے تھا کہ:

اوّلاً باستثناء اُن معدود باتوں کے جن میں حکومت کی دست اندازی ہو، اپنے تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لیتے۔ اپنے سب مقدمات اپنے آپ فیصل کرتے۔ یہ کروڑوں روپے جو اسٹامپ و وکالت میں گھسے جاتے ہیں، گھر کے گھر تباہ

ہو گئے اور ہوئے جاتے ہیں محفوظ رہتے۔

ثانیاً اپنی قوم کے سوا کسی سے کچھ نہ خریدتے کہ گھر کا نفع گھر ہی میں رہتا۔ اپنی حرفت و تجارت کو ترقی دیتے کہ کسی چیز میں کسی دوسری قوم کے محتاج نہ رہتے۔ یہ نہ ہوتا کہ یورپ و امریکہ والے چھٹانک بھر تانبا کچھ صنّاعی کی گھڑنت کر کے، گھڑی وغیرہ نام رکھ کر آپ کو دے جائیں اور اُس کے بدلے پاؤ بھر چاندی آپ سے لے جائیں۔

ثالثاً بمبئی، کلکتہ، رنگون، مدراس، حیدر آباد وغیرہ کے تونگر مسلمان اپنے بھائی مسلمانوں کے لیے بنک کھولتے۔ سود شرع نے حرام قطعی فرمایا ہے مگر اور سو طریقے نفع لینے کے حلال فرمائے ہیں، جن کا بیان کتب فقہ میں مفصل ہے اور اس کا ایک نہایت آسان طریقہ کفل الفقیہ الفاہم میں چھپ چکا ہے۔ اُن جائز طریقوں پر نفع بھی لیتے کہ اُنھیں بھی فائدہ پہنچتا اور اُن کے بھائیوں کی بھی حاجت بر آتی اور آئے دن جو مسلمانوں کی جائدادیں بنیوں کی نذر ہوئی چلی جاتی ہیں اُن سے بھی محفوظ رہتے۔ اگر بنیوں کی طرح جائداد ہی لی جاتی، مسلمان ہی کے پاس رہتی، یہ تو نہ ہوتا کہ مسلمان ننگے اور بنیے چنگے۔

رابعاً سب سے زیادہ اہم، سب کی جان، سب کی اصلِ اعظم وہ دینِ متین تھا جس کی رسّی مضبوط تھامنے نے اگلوں کو اُن مدارجِ عالیہ پر پہنچایا، چار دانگ عالم میں اُن کی ہیبت کا سکّہ بٹھایا، نانِ شبینہ کے محتاجوں کو بلند تاجوں کا مالک بنایا اور اُسی کے چھوڑنے نے پچھلوں کو یُوں چاہِ ذلّت میں گرایا فانّا للہ وانّا الیہ راجعون ۝ ولا حول ولا قوّۃ الّا باللہِ العلی العظیم۔

دینِ متین، علمِ دین کے ساتھ وابستہ ہے۔ علمِ دین سیکھنا، پھر اُس پر عمل کرنا اپنی دونوں جہاں کی زندگی چاہتے، وہ اُنھیں بتا دیتا، اندھوا جسے ترقی سمجھ رہے ہو، سخت تنزّل ہے۔ جسے عزّت جانتے ہو، اشد ذلّت ہے۔ مسلمان اگر یہ چار باتیں کر لیں تو انشاءاللہ العزیز آج اُن کی حالت سنبھل جاتی ہے۔"[1]

---

[1] احمد رضا خاں بریلوی، امام: تدبیرِ فلاح، مطبوعہ لاہور، ص ۴ تا ۷

جہاد ، ہجرت اور ترکِ معاملت (نان کوآپریشن) وغیرہ امور پر گاندھی نے مسلمانوں کو کیوں ابھارا؟ اِن کی وجوہات و مضمرات آپ مجدد مائتہ حاضرہ قدس سرہٗ کے لفظوں میں ملاحظہ فرما چکے ہیں ۔ اب یہ ملاحظہ ہو کہ اُس دشمنِ اسلام و مسلمین گاندھی نے کھدّر کی تحریک کیوں شروع کی تھی ؟ ایک جانب وہ برٹش گورنمنٹ کو خوش کرنا چاہتا تھا کہ مسلمانوں کی صنعت پارچہ بافی کا مقابلہ کرنے سے برطانوی عاجز رہے اور حکمران ہونے کے باوجود اس صنعت کو مسلمانوں کے ہاتھ سے نہ چھین سکے نہ تباہ کر سکے ، گاندھی نے اپنی حکمتِ عملی سے پارچہ بافوں کو بیکار بٹھا دیا جو اہلِ ملک سے خاطر خواہ دولت کماتے تھے ۔ چونکہ اکثر روپیہ ہندو گاہکوں کے ذریعے مسلمان پارچہ بافوں کی جیب میں پہنچتا تھا ، لہٰذا ہندو سرمایہ محفوظ اور مسلمان مفلوج ہو کر رہ گئے ۔ اِس حقیقت کی قدرے تفصیل اور قربانیِ گاؤ کو روکنے کا اصلی راز حافظ امیر حسین مراد آبادی مرحوم کی زبانی ملاحظہ ہو :

> "ہندوؤں نے دیکھا کہ اگرچہ مسلمانوں کا زمیندار طبقہ تباہ ہو گیا لیکن تجارت کے ذریعے یہ دو قومیں عروج کو پہنچ گئیں ۔ اب اِنھیں تباہ کرنے کی یہ تدبیر نکالی کہ قریش (قصاب) کے لیے تو ذبیحہ گاؤ کے روکنے کی رات دن کوششیں کی جا رہی ہیں ، جس سے اِس قوم کی مالی حالت کمزور ہو اور مومن قوم (پارچہ بافوں) کے لیے کھدّر کی تحریک جاری کی گئی ، کیونکہ یہ معلوم تھا کہ مسلمان پارچہ بافوں کی نفیس صنعتوں نے ولایت کو شکست دے دی ہے ۔ ڈھاکہ کی چکن ، جالس کی جامدانی ، مئو مبارک پور کے ڈریئے ، سنگی مشروح ، غلطہٗ بھاگلپور کی سلک ، فتوحا کے عمامے ، بنارس کے دوپٹے ، ساڑھیاں ، کمخواب ، زربفت ، زری وغیرہ وہ کپڑے ہیں جن سے ولایت کے جولاہے کبھی مقابلہ نہیں کر سکے اور ولایتی پارچہ جات اِن کی قدر و قیمت کم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے ۔ کوئی شخص اِن کے مقابلہ میں ولایتی کپڑے پر نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتا ۔ شادیوں میں عام طور پر بنارسی اور مبارکپوری کپڑے کا ہزار ہا روپے کا خرچ ہوتا ہے ۔ ایک اور تکلیف دہ بات ہندوؤں کے لیے یہ تھی کہ بنارس کی نفیس اور قیمتی ساڑھیاں جو سات سات سو روپے قیمت تک کی ہوتی ہیں ، وہ بکثرت ہندو خریدتے ہیں ، یہ تجارتیں ہندوؤں سے نہ دیکھی گئیں اور اِس کام کو

برباد کرنے کے لیے اُنھوں نے کھدر کی تحریک جاری کی اور اِس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مسلمانوں کی کروڑہا روپے کی تجارتیں خراب ہوگئیں اور بڑے بڑے کارخانوں کو زبردست نقصان پہنچے۔" ۱؎

مسلمانانِ اہلسنت وجماعت اسلامی تعلیمات کے مطابق برٹش گورنمنٹ اور ہنود سے معاملت کرتے رہے۔ نہ گاندھی کی اُن تحریکوں میں شامل ہُوئے جو مسلمانوں کی بربادی کے لیے جاری کی جارہی تھیں اور نہ حکومت یا ہنود کسی کے یار و انصار اور آلۂ کار بنے۔ بفضلہٖ تعالیٰ سوادِ اعظم کا یہ کارواں سلامت روی کے ساتھ قرآنی تعلیمات کے مطابق رواں دواں رہا لیکن سیاسی تنظیم کا فقدان ہونے کے باعث دوسری منظم جماعتوں کے مقابلے میں خاطر خواہ کام نہ دکھا سکے جبکہ بدخواہانِ دین وملت اپنی تنظیم کے باعث روز بروز آگے ہی بڑھتے رہے جو ہمارے کوتاہ اندیش لیڈروں کی بے تدبیری اور یارانِ تیز گام کی عیاری کا زندہ ثبوت ہے۔

علمائے اہلسنّت کی رفتار بے شک سُست رہی اور اُنھیں کوئی راسخ العقیدہ لیڈر میسّر نہ آسکا لیکن بفضلہٖ تعالیٰ اُن کے قرآنی موقّف میں کوئی فرق نہیں آیا نہ ذرا بھر لچک پیدا ہُوئی بلکہ آج تک اُسی موقف پر قایم ہیں۔ پاکستان کی تحریک اِسی نتیجے کے طور پر اُبھری جس کی آواز حقیقت میں سب سے پہلے سُنّی کانفرنس کے بانی حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے پیش کیا تھا۔ آپ ہی کی آواز کو ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر اقبال مرحوم نے الٰہ آباد میں پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے لیڈر ہونے کے باعث یہ نظریہ موصوف ہی کی جانب منسوب ہو کر مشہور ہو گیا۔ اِدھر پاکستان کا نام مسلمانوں کی زبانوں پر آنا شروع ہُوا اور اُدھر علمائے اہلسنت نے پشاور سے لنکا تک طوفانی دورے کرنے شروع کر دیے تاکہ مسلمانوں کو اِس کے لیے آمادہ کریں۔ بحمد اللہ تعالیٰ اہلسنت وجماعت نے اپنے علمائے کرام کے پیغامات کو بغور سُنا اور حصولِ پاکستان کے لیے سربکف ہوگئے۔ اِن دنوں علمائے کرام ومشایخ عظام نے بنارس میں سُنّی کانفرنس کے اجلاس کیے۔ یہ کانفرنس ۲۴ تا ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۵ھ مطابق ۲۷ تا ۳۰ اپریل ۱۹۴۶ء

۱؎ امیر حسین مراد آبادی، مولانا: السواد الاعظم، بابت ربیع الثانی ۱۳۵۰ھ

ہوتی رہی۔ اِس میں پانچ ہزار علمائے کرام و مشایخ عظام نے شرکت کی اور حضرت محدّث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ کے خطبۂ صدارت کو تقریباً ڈیڑھ لاکھ کے عظیم الشان تاریخی اجتماع نے سُنا۔ اُسی عظیم الشان تاریخی خطبے میں آپ نے فرمایا تھا:

> ”حجازِ مقدس جو ہم سُنّیوں کے ایمانیات کا گہوارہ ہے اور جس کے ذرّہ ذرّہ سے سُنّیوں کی دینی روایات وابستہ ہیں اُس پر نجدی فتن و زلازل کو مسلط کر دیا گیا ہے۔ وہ ارضِ مقدس اب تک اُن فتنوں کی آماجگاہ ہے۔ فلسطین کے سُنّی بھائیوں پر بے رحم یہودیت ستم آرائیوں کی مشق کرنے کے لیے مسلّط کی جا رہی ہے۔ ہمارے جاوا اور انڈونیشیا کے سُنّی بھائیوں پر توپ اور بم کی بارش ہو رہی ہے اور اُن بے گناہوں کی خطا صرف اتنی ہے کہ وہ سُنّی ہیں اور اپنے مقدس دین کی آزادی کو کسی قدر پر چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں۔ ہمارے ملک میں صرف اہلسنت وجماعت کو پامال کرنے کے لیے (ہندو) اکثریت کا سانڈ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اہلِ باطل کی ٹولیوں کو سُنّیوں پر بھونکنے کے لیے پالا جا رہا ہے اور قیامت یہ ہے کہ سُنّیوں کو ختم کرنے کے لیے جن درندوں کو راشن دیا جاتا ہے اُن کا نام بھی سُنّی رکھا گیا ہے۔“[1]

اہلسنّت وجماعت کو مٹانے اور مغلوب کرنے کی خاطر برٹش گورنمنٹ نے فرقے قایم کیے اُن کی غرض و غایت اور کارگزاری پر روشنی ڈالتے ہُوئے اِسی خطبے میں آپ نے یوں ارشاد فرمایا تھا:

> آج کا وہابی کل سُنّی تھا، آج کا قادیانی کل سُنّی تھا، آج کا خارجی کل سُنّی تھا۔ اِس طرح سُنّیوں کے گھر میں آگ لگا دی گئی ہے اور ایک ایک کا شکار کھیل کر سُنّیوں کے خلاف شکاریوں نے مستقل سازش کر رکھی ہے اور انہی پالتو اور شکار کیے ہُوئے افراد کے بل بوتے پر آگ مارکہ لیڈر سُنّیوں کو آنکھیں دکھاتے ہیں، سول جنگ کی دھمکی دیتے ہیں۔ کس قدر ہوش ربا واقعہ ہے کہ ہندوستان سُنّی مسلمانوں کا ملک تھا۔ سُنّیوں نے سیکڑوں برس اس پر حکمرانی کی اور تہذیب کی بنیاد

---

[1] سید محمد کچھوچھوی، مولانا: خطبۂ صدارت، ص ۱۰،

رکھی لیکن اب ان کا وجود نہ راعی کی نظر میں ہے نہ دنیا کی نگاہ میں۔ ہم جہانگیر و عالمگیر کے وارث کچھ نہ رہے اور برطانوی پالیسی کی پیداوار تین تین نفر کی ٹولیاں سب کچھ ہو رہی ہیں۔ امام الہند بننے کی ترکیبیں نکالی جاتی ہیں۔ امیرِ شریعت اپنے کو کہلایا جاتا ہے۔ ہمارا وُہ مقدس و برگزیدہ نام جو ہمارے آقا حضور پُرنُور محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اور ہمارا ایہی مکمل پتہ بتایا تھا مَا اَنَا عَلَیْہِ وَ اَصْحَابِیْ یعنی اہلسنت و جماعت، اُس کا مجرمانہ استعمال اپنے لیے وُہ کر رہا ہے جو سُنّیوں کو ہلاک کر دینے پر حلف اُٹھا چکا ہے۔ سُنّیوں کے پیسے سے مدرسہ چلایا جاتا ہے اور اُس میں ایسے دل و دماغ تیار کیے جا رہے ہیں جو سُنّیوں کو ستائیں، جمہوریتِ اسلامیہ سے ٹکر لیں، اسلامی اتحاد میں انتشار پیدا کریں، اسلامی ہم آہنگی کو صدمہ پہنچائیں۔ ہمارے سلاطین و امراء و خواص و عوام کی بنائی ہُوئی مسجدوں پر قبضہ ہمارے دشمنوں کا، ہماری تعلیم گاہوں پر جھنڈا ہمارے محاربوں کا، ہماری خانقاہوں میں رسائی خانقاہ شکنوں کی.... غضب یہ ہے کہ یہ سارے منظّم فتنے اور تمام مہلک خطرے آپ (علماء و مشایخ) کے سامنے ہیں۔ آپ کے دیکھتے ہُوئے سُنّیوں کا جینا دشوار ہو رہا ہے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے سُنّیوں پر گھیرا ڈال دیا گیا ہے اور آپ کی موجودگی میں آپ کے رسول کی اُمّت دن دہاڑے لوٹی جاتی ہے۔"[1]

اسی خطبے میں حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ نے لفظ پاکستان کا مطلب واضح کیا جو مختلف جماعتوں کی زبانوں پر چڑھا ہُوا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں آپ نے علیٰ رؤس الاشہاد فرمایا:

"میرے دینی رہنماؤ! میں نے عرضداشت میں ابھی ابھی پاکستان کا لفظ استعمال کیا ہے اور پہلے بھی کئی جگہ پاکستان کا لفظ آچکا ہے۔ مُلک میں اِس لفظ کا استعمال روزمرہ بن گیا ہے۔ در و دیوار پہ پاکستان زندہ باد، تجاویز کی زبان میں پاکستان ہمارا حق ہے، نعروں کی گونج میں پاکستان لے کے رہیں گے، مسجدوں میں، خانقاہوں

---

[1] سید محمد کچھوچھوی، مولانا: خطبۂ صدارت، ص ١٠ تا ١٢

> ہیں، بازاروں میں، ویرانوں میں لفظ پاکستان لہرا رہا ہے۔ اِس لفظ کو پاکستان کا یونینسٹ لیڈر بھی استعمال کرتا ہے اور ملک بھر میں ہر لیگی بھی بولتا ہے اور ہم سُنّیوں کا بھی یہی محاورہ ہوگیا اور جو لفظ مختلف ذہنوں کے استعمال میں ہو اُس کے معنی مشکوک ہوجاتے ہیں، جب تک بولنے والا اُس کو واضح طور پر نہ بتا دے۔
>
> یونینسٹ کا پاکستان وہ ہوگا جس کی مشینری سردار جوگندر سنگھ کے ہاتھ میں ہوگی۔ لیگ کے پاکستان کے متعلق دوسری قومیں ہنستی ہیں کہ اب تک اس نے پاکستان کے معنی نہ بتائے اور جو بتائے وُہ اُلٹے پلٹے ایک دوسرے سے لڑتے بتائے۔ اگر یہ صحیح ہے تو لیگ کا ہائی کمانڈر اس کا ذمہ دار ہے لیکن جن سنّیوں نے لیگ کے اِس پیغام کو قبول کیا ہے اور جس یقین پر اِس مسئلے میں لیگ کی تائید کرتے پھرتے ہیں، وہ صرف اس قدر ہے کہ ہندوستان کے ایک حصہ میں اسلام کی، قرآن کی آزاد حکومت ہو۔ جس میں غیر مسلم ذمّیوں کے جان و مال، عزّت و آبرو کو حسبِ حکمِ شرع امن دی جائے۔ اُن کو، اُن کے معاملات کو، اُن کے دین پہ چھوڑ دیا جائے۔ وُہ جانیں اُن کا دھرم جانے۔ اُن کو اَتِمُّوْٓا اِلَیْہِمْ عَہْدَہُمْ سُنا دیا جائے اور بجائے جنگ و جدل کے صلح و امن کا اعلان کر دیا جائے۔ ہر انسان اپنے پُرامن ہونے پر مطمئن ہوجائے۔ اگر سُنّیوں کی اِس سمجھی ہوئی تعریف کے سوا لیگ نے کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا تو کوئی سُنّی قبول نہیں کرے گا۔“[1]

مسلم لیگ اور آل انڈیا سُنّی کانفرنس کا معاہدہ ہوچکا تھا کہ قیامِ پاکستان کے سلسلے میں سُنّی مسلمان مسلم لیگ کی بھرپور تائید و حمایت کریں گے لیکن دینی معاملات میں مسلم لیگ ہر موقع پر سنّی کانفرنس کی رہنمائی اور ہدایات کو ملحوظ رکھے گی۔ چنانچہ اِس خطبے میں اُس کا ذکر یُوں کیا گیا:

> ”ہم سے مسلم لیگ کو اِسی کی اُمید رکھنی چاہیے کہ اُس کا جو قدم سُنّیوں کے سمجھے ہوئے پاکستان کے حق میں ہوگا اور اِس کے جس پیغام میں اسلام و مسلمین کا نفع ہو گا آل انڈیا

---

[1] سیّد محمد کچھوچھوی، مولانا: خطبۂ صدارت، ص ۲۳، ۲۴

> سُنّی کانفرنس کی تائید اس کو بے دریغ حاصل ہوگی اور دینی امور میں ہاتھ لگانے سے پہلے آل انڈیا سُنّی کانفرنس کی رہنمائی اُس کو قبول کرنی پڑے گی اور ضرور کرنی پڑے گی۔
>
> اگر ہماری حق گوئی کسی کے نزدیک جرم ہے اور کسی لیگی کے نزدیک یہ لیگ کی دشمنی ہے تو ہمیں ڈیفینس میں ایک لفظ نہیں کہنا ہے اور اگر لیگ کے دشمنوں کے نزدیک یہ ہمارا لیگی ہوجانا ہے تو ہم اس خوش فہمی کو بھی قابلِ مضحکہ سمجھتے ہیں![1]

اسی طرح ۵، ۶ رجب المرجب ۱۳۶۵ھ/ جون ۱۹۴۶ء کو بنارس کانفرنس کے تقریباً سوا مہینہ بعد مسجد شاہجہانی واقع درگاہِ معلّٰی اجمیر شریف میں آل انڈیا سُنّی کانفرنس کے اسپیشل اجلاس ہوئے ایک نشست کی صدارت حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ نے کی اور اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

> "حضرات! میں نے بار بار پاکستان کا نام لیا ہے اور آخر میں صاف کہہ دیا ہے کہ پاکستان بنانا صرف سُنّیوں کا کام ہے اور پاکستان کی تعمیر آل انڈیا سُنّی کانفرنس ہی کرے گی۔ اس میں کوئی بات بھی نہ مبالغہ ہے، نہ شاعری ہے اور نہ سُنّی کانفرنس سے غلو کی بنا پر ہے۔ پاکستان کا نام بار بار لینے سے جس قدر ناپاکوں کو چڑ ہے اُسی قدر پاکوں کا وظیفہ ہے اور اپنا وظیفہ کون سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے پورا نہیں کرتا؟ اب رہا پاکستان کارِ سُنّیاں است۔ یہ ملک کی کسی سیاسی جماعت سے تصادم کے لیے نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے، جس کا اظہار بلاخوفِ لومۃ لائم کہ دیا ہے۔ اوّل تو مسلم لیگ کے سِوا کوئی ٹولی ایسی نہیں جو پاکستان کے ساتھ لفظی موافقت بھی رکھتی ہو الکفر ملة واحدة۔ سارے ناپاکوں نے اپنے اندر بے شمار اختلافات رکھتے ہوئے پاکستان کے خلاف صف آرائی کرلی ہے اور مسلم لیگ میں پاکستان کا پیغام کس سے پہنچا اور لوگوں نے مسلم لیگ کا عقیدہ اُس کو بنایا؟ اگر تاریخی طور پر دیکھا جائے تو وہ صرف سُنّی ہیں۔ پاکستان کے معنی اسلامی قرآنی آزاد حکومت ہے۔ مسلم لیگ سے ہمارے

---

[1] سید محمد کچھوچھوی، مولانا: خطبۂ صدارت بنارس، ص ۲۶، ۲۷

سُنّی کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کے رکن حضرت سید شاہ زین الحسنات صاحب سجادہ نشین
مانکی شریف (سرحد) نے کہہ دیا ہے کہ "اگر ایک دم سارے سُنّی مسلم لیگ سے
نکل جائیں تو کوئی مجھے بتا دے کہ مسلم لیگ کس کو کہا جائے گا؟ اُس کا دفتر کہاں
رہے گا؟ اور اُس کا جھنڈا سارے ملک میں کون اُٹھائے گا؟"[1]

اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہوا کہ مسلم لیگ کی وکالت اور اہلسنت وجماعت کے ووٹوں سے ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم ہوگیا۔ ہندوستان کا ایک حصہ علیحدہ ہوکر اسلامی نظریاتی مملکت کے بطور دنیا کے نقشے پر ظہور پذیر ہُوا۔ یہ موقع اور یہ شاندار کامیابی ہندوستانی مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی اور پاکستان کا قیام عالمِ اسلام کے لیے انتہائی مسرت و شادمانی کا پیغام تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقے اِسے دائم قائم رکھے، آمین۔

پاکستان قائم ہوجانے پر سُنّی کانفرنس کا نام جمعیۃ علماءِ پاکستان رکھ لیا گیا لیکن مسلمانانِ اہلسنت و جماعت کی بد قسمتی کہ آل انڈیا سنی کانفرنس کے بانی اور سُنّیوں کی فعال شخصیت حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ ۱۸ر ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ مطابق ۲۳ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کو بروز جمعۃ المبارک اپنے پروردگار کو پیارے ہوگئے (انّا للہ وانّا الیہ راجعون)۔ حضرت محدث کچھوچھوی اور مولانا سلیمان اشرف جیسی ہستیاں ہندوستان ہی میں رہ گئیں۔ اِدھر قائدِ اعظم محمد علی جناح بھی ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو اِس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کی جانب سدھار گئے۔ نہ مسلم لیگ ہی قیامِ پاکستان کے بعد اپنے اسلامی و قرآنی وعدوں کو پورا کر سکی اور نہ جمعیۃ العلماءِ پاکستان یعنی سابق سُنّی کانفرنس ہی سے کوئی ایسا مردِ میدان نکل سکا جو مسلم لیگ کو مجبور کر دیتا کہ اپنے وعدوں کو پورا کرے۔

حالات کی ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ جس طرح برٹش گورنمنٹ نے مسلمانانِ اہلسنت وجماعت کی جمعیت کو منتشر کرنے کی غرض سے مختلف فرقے کھڑے کر دیے تھے، پاکستان بن جانے کے بعد اُسی سوادِ اعظم کو جس کے ووٹوں سے یہ نظریاتی مملکت معرضِ وجود میں آئی تھی اُسی جماعت کو دبانا گرانا اور بدمذہبوں کو ابھارنا شروع کیا گیا، حتیٰ کہ پاکستان کے مخالفوں تک کی ناز برداری کو ضروری سمجھا گیا، جس کا خمیازہ پوری قوم بھگت رہی ہے کہ قیامِ پاکستان کا مقصد حاصل کرنا، اِس میں قرآن و سنّت کا آئین نافذ ہونا تو دُور کی بات، دینی اور اسلامی فضا ناگفتہ بہ

---

[1] خطبۂ صدارت: ص ۲۹

ہوتی جارہی ہے۔ خدائے ذوالمنن ہماری حالت پر کرم فرمائے اور ہمیں اپنی انفرادی و اجتماعی حالتوں کو درست کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے، آمین۔

نجدی وہابیہ کی بُت پرست نوازی

خوارج کے متعلق جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ وہ مختلف ناموں کے ساتھ قیامت تک رہیں گے اور اُن کا آخری گروہ دجّال علیہ اللعنۃ کے ساتھ ہوگا۔ اِسی کے مطابق علاّمہ ابنِ عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ نے درِمختار کے حاشیہ ردالمحتار میں تصریح فرمائی ہے کہ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور اس کے متبعین زمانۂ حال کے خوارج ہیں۔ موصوف کے اس بیان کی مولوی حسین احمد ٹانڈوی (المتوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء) نے اپنی تصنیف "الشہاب الثاقب" میں اور مولوی خلیل احمد انبٹھوی (المتوفی ۱۳۴۵ھ/ ۱۹۲۶ء) نے المہند میں تصدیق و تائید کی ہے۔ یہ دونوں کتابیں تمام علمائے دیوبند کی مسلّمہ اور موخرالذکر اکثر اکابر دیوبند کی مصدّقہ ہے۔

ہندوستان میں مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کے مذہب کی ترویج و اشاعت کی تھی۔ موصوف کے جملہ متبعین بھی خوارج ہی کی ماڈرن آفس کاپیاں ہیں۔ احادیث میں خارجیوں کی ایک پہچان یہ بھی بتائی گئی ہے کہ وہ اہلِ اسلام کو قتل کریں گے اور کافروں مشرکوں سے بنا کر رکھیں گے۔ چنانچہ نجدی مذکور نے اور اُس کے اتباع و خلفاء نے جزیرۂ عرب کے مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہانے اور اُن کے اموال کو غنیمت کا مال سمجھ کر چھیننے میں کون سا دقیقہ فروگزاشت کیا تھا، ظالموں نے حرمین کا ادب بھی قطعاً ملحوظ نہ رکھا۔ مکّہ مکرمہ اور مدینہ منوّرہ کے مسلمانوں پر وُہ قیامت ڈھائی جس کے سُننے سے مسلمانوں کا خُون کھول اُٹھتا ہے، یہاں تک کہ اصحابِ رسول (صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم ورضی اللہ تعالیٰ عنہم) کو اُن کی آخری آرام گاہوں میں تنگ کیا، مزارات شہید کروادیے اور جنت البقیع میں ہل چلوادیے نیز کتنی ہی مقدس یادگاروں کا اِس طرح سے نام و نشان مٹا دیا کہ صرف کتابوں میں تذکرے ہی رہ گئے۔

اگر نجدی خارجیوں نے یہ کچھ کیا تو ہندی خارجی کون سے پیچھے رہ گئے۔ اِنھوں نے

انگریزوں کی مدد سے سکھوں سے مقابلہ کرنے کی آڑ میں دل کھول کر پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ خادی خاں سردار ہنڈ، یار محمد خاں حاکم یاغستان اور اُس کے بھائی سلطان محمد خاں سے یکے بعد دیگرے لڑائیاں کیں۔ اوّل الذکر دونوں کو شہید کیا۔ ان لڑائیوں میں جو مال چھینا اُسے مالِ غنیمت شمار کیا۔ اسی طرح گھلابٹ، مرغز، کدا، ٹھنڈکوٹی، پنج پیر، ہنڈ، شیوہ، چارگلئی، معدم، گھڑبالی، نواکلئی، شیخ جانا، اسماعیلہ، امان زئی، کاٹ لنگ، لوندخوڑ، مردان، ہوتی، مایار، تورو وغیرہ دیہات کو بزورِ شمشیر مسلمانوں سے چھینا گیا۔ مایار کی لڑائی میں سیکڑوں مسلمانوں کو شہید کیا اور پشاور پر پیش قدمی کی لیکن سلطان محمد خاں کی دانشمندی سے جنگ کا خطرہ ٹل گیا۔ ہزاروں مسلمانوں کا خون رنگ لایا اور ظالموں کو مظلوموں کا خون نگل گیا وذٰلک جزاء الظّٰلمین۔

جب ہندی اور نجدی خارجی مسلمانوں کو قتل کرنے میں قدم سے قدم ملا کر چل رہے تھے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں پوری طرح کوشاں تھے تو یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ ہندی خارجی تو گاندھی اور نہرو کی پوجا کریں اور نجدی خارجی صرف دُور بیٹھے تماشا ہی دیکھتے رہیں۔ اِن حضرات کی مذہبی غیرت نے بھی انھیں مشرکینِ ہند اور خصوصاً گاندھی و نہرو کی تعظیم بلکہ پُوجا پاٹ کرنے پر اُبھارا۔ چنانچہ مئی ۱۹۵۵ء میں شاہ ابنِ سعود کے ہمراہ اُن کے بھائی شاہ امیر فیصل بھی ہندوستان آئے۔ موخر الذکر نے اپنا مذہبی فریضہ یُوں ادا کیا:

> "امیر فیصل نے بھارت میں قیام کے دوران میں ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر رادھا کرشن اور پنڈت نہرو سے ملاقاتیں کیں اور راج گھاٹ پر مہاتما گاندھی کی سمادھ پر پھول چڑھانے گئے نیز ایک گاؤں رتن گڑھ میں تشریف لے گئے جہاں دیہات سدھار کا کام دیکھ کر اس قدر متاثر ہُوئے کہ وہیں دس ہزار روپے کا عطیہ عنایت فرمایا۔"[1]

بہرحال یہ اُس وقت پھر بھی چھوٹے میاں تھے۔ بڑے میاں کی سُنیے جنھیں محافظِ حرم کا خطاب

---

[1] نوائے وقت لاہور، ۱۱ مئی ۱۹۵۵ء

اُن کے معتقد حضرات بڑی عقیدت سے دیتے ہیں جو بُت شکن کے بجائے قبہ شکن تھے۔ مسلمانوں کو مشرک سمجھ کر اُن سے دشمنی رکھنے پر مجبور تھے لیکن مشرکوں بُت پرستوں سے اتحاد اور دوستی کی یُوں بھیک مانگتے پھرتے تھے؛

> ”شملہ سے آٹھ میل دور آپ (شاہ ابنِ سعود نجدی) نے ہماچل پردیش کے لوگوں کا پیش کیا ہُوا لوک ناچ کا ایک پروگرام دیکھا اور جنابِ صدر، معزز وزرا، خواتین اور راجندر پرشاد کے جواب میں شاہ سعود نے تقریر فرمائی۔ مدرسۂ دیوبند کو پچیس ہزار روپیہ دیا اور یہ بھی فرمایا کہ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان اور سعودی عرب کے اتحاد اور دوستی کے رشتے ہمیشہ مضبوط رہیں گے۔“ [1]

اپنے اِس دورے کے موقع پر شاہ ابن سعود نے پنڈت جواہر لال نہرو کو ارضِ مقدس کا دورہ کرنے کی دعوت دی جسے۔ اُس بُت پرست نے قبول کر کے ستمبر ۱۹۵۶ء میں سعودی عرب کا دورہ کیا۔ اُس وقت اِن مسلمانوں کو مشرک بتانے والے لیکن حقیقت میں مشرک پرستوں نے کیسے کیسے قیامت خیز طریقوں سے پنڈت نہرو کا استقبال کیا، اُن ایمان سوز حرکتوں پر پورا عالمِ اسلام بلبلا اُٹھا اور ہر طرف سے صدائے احتجاج بلند ہُوئی کہ موحّد ہونے کے دعویدار ارضِ مقدس میں مشرک پرستی کا عالمی ریکارڈ کیوں قایم کر رہے ہیں؟ نہرو کے دورے کا حال پاکستان کے سارے اخباروں میں شایع ہُوا۔ ایک اخبار کے الفاظ ملاحظہ ہوں؛

> ”سعودی عرب میں نہرو کا ”مَرحَبا رسُولُ السّلاَم“ اور جے ہند کے نعروں سے استقبال۔ شاہ سعود نہرو کی پنج شیلا پر ایمان لے آئے۔ سعودی عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ نہرو کے استقبال کے لیے عرب عورتیں بھی موجود تھیں......
>
> ریاض پہنچنے پر شاہ سعود نے نہرو کو گلے سے لگا لیا۔
>
> سرزمینِ حجاز پر پہلی مرتبہ بھارتی ترانہ ”جانا مانا گانا“ بجایا گیا۔ پنڈت نہرو جب سعودی عرب کے دار الحکومت ریاض پہنچے تو ہزاروں افراد نے جن میں

---

[1] اخبار سیاست، کانپور، ۳ دسمبر ۱۹۵۵ء

شاہ سعود، سعودی شہزادے، وزراء اور سعودی فوج کے اعلیٰ افسر شامل تھے نہرو کا استقبال کیا اور ایک فوجی دستے نے نہرو کو گارڈ آف آنر پیش کیا۔ اِس کے بعد نہرو ایک کُھلی کار میں شاہ سعود کے محل روانہ ہو گئے۔ راستے میں سڑک پر دونوں طرف ہزاروں افراد نے نہرو کو دیکھ کر زندہ باد کے نعرے لگائے۔ چوبیس ستمبر کی رات کو شاہی محل "الحمراء" میں شاہ سعود نے نہرو کے اعزاز میں شاہی ضیافت دی۔ اُس کمرے کو رنگا رنگ روشنیوں سے سجایا گیا تھا۔ جب نہرو کمرہ میں داخل ہُوا تو شاہ سعود نے آگے بڑھ کر اُن کی شیروانی کے کاج میں سُرخ رنگ کا ایک گلاب ٹانک دیا۔"[1]

مشرک نہرو کا استقبال "یَا رَسُوْلُ السَّلَام" کے نعرے سے کرنے پر پورے عالمِ اسلام سے احتجاج کی صدائیں بلند ہوئیں۔ توحید کے پردے میں یہ مشرک پرستی کا نظارہ مسلمانانِ عالم کے لیے ناقابلِ برداشت ہو کر رہ گیا اور سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ واقعی ان نام نہاد موحدوں کی خارجیت میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے اور یہ حضرات سیاسی مصالح کی خاطر اپنی ظاہری مسلمانی کو بھی داؤ پر لگانے میں نہ کوئی باک محسوس کرتے آئے ہیں اور نہ آج کل کر رہے ہیں۔ اب پاکستانی اخبارات کا احتجاج ملاحظہ ہو:

"یہ "مرحبا نہرو رَسُوْلُ السَّلَام" کا نعرہ ضرور کھٹکتا ہے۔ کاش معزز عرب میزبان اپنے مہمان کو امن کا رسول پکارتے وقت اپنے اُن کلمہ گو بھائیوں کا بھی تصوّر کر لیتے جن پر بھارت میں اِن دنوں امن و عافیت کے سب دروازے بند کر دیے گئے ہیں اور جن کا خون محض اِس جُرم کی پاداش میں پانی سے زیادہ ارزاں کر دیا گیا ہے کہ انہوں نے رسولِ عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دلخراش توہین پر احتجاج کیوں کیا تھا؟ افسوس بھارتی مسلمانوں ...... کی قلب کی گہرائیوں سے نکلی ہُوئی آہیں بھی عربوں کو اِس وزیرِ اعظم کو "امن کا رسول" قرار دے کر

---

[1] روزنامہ جنگ کراچی، ۲۷ ستمبر ۱۹۵۶ء

مرحبا کہنے سے باز نہ رکھ سکیں، جس کی سرکاری انگلیوں سے بھارتی مسلمانوں کا گرم خون ابھی ٹپک ہی رہا تھا۔"[1]

دُوسرے اخبار نے "جے ہند" کے نعرے لگانا اور ارضِ مقدس میں مشرک کو بُلا کر اُس کا اعزاز کرنے پر شاہ سعود کو متنبہ کیا اور اِس خاندان کی قبہ شکنی کا ذکر کرتے ہُوئے یُوں سعودی حکمرانوں کی سیاسی مصلحت پر تبصرہ کیا ہے:

> آلِ سعود نے پہلے خالص سیاسی مصلحتوں کے تحت ایک بُت پرست قوم کے نمائندے کو ریاض بلایا اور اُس کے استقبال کے لیے خواتین اور بچّوں کو ساتھ لے گئے اور اُن سے "جے ہند" کے نعرے لگوائے۔ سعودی عرب کا یہ فعل سراسر بدعت ہے جس کی کوئی مسلمان بھی حمایت نہیں کر سکتا۔ عجیب بات ہے کہ جن حکمرانوں نے صحابہ کی پختہ قبریں اور قُبّے تک اس لیے ڈھا دیے ہوں کہ وُہ اُن کی نظروں میں اسلام کی تعلیمات کے منافی تھے وہی حکمران آج اپنی سیاسی مصلحتوں کے لیے ایک ایسے شخص کو حجاز میں مدعو کر کے استقبال کرتے ہیں جو بُت پرستوں کا نمائندہ ہے۔ اور اسلام کے ہر مکتبِ خیال کے علماء کا متفقہ فتویٰ ہے کہ کوئی بُت پرست اسلام کے اِس گہوارے میں قدم نہیں رکھ سکتا۔"[2]

ع لیکن یہ کیا کہ نغمۂ توحید کی بجائے
اُن کی زباں پہ برہمنوں کا ترانہ ہے

سعودی حکومت کے دعوٰیِ اسلام کے بارے میں نعرۂ "رسُولُ السّلام" کے پیشِ نظر یہ اقتباس بھی قابلِ غور ہے:

> "شاہ سعود وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اِس روایت کو توڑا اور صنم خانہ کے ایک پاسبان کو ارضِ کعبہ پر بلایا اور صرف بُلایا ہی نہیں بلکہ خلافِ روایات انداز سے

---

[1] روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۳۰ ستمبر ۱۹۵۶ء

[2] روزنامہ کوہستان لاہور، یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء

اُس برہمن بچے کا استقبال کیا۔ استقبال کے وقت جو نعرے بلند کیے گئے اُن میں سے ایک نعرہ دنیا کے اسلامی حلقوں میں خاص طور پر قابلِ اعتراض سمجھا جارہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پنڈت جی کو "رسول السلام" کہا گیا جس کے معنی پیغمبرِ اسلام کے ہیں۔ پنڈت نہرو کے حالیہ دورہ سے یہ تاثر بھی شدت اختیار کرتا جارہا ہے کہ سعودی مملکت جو اسلام کے نام پر قایم ہُوئی تھی، محض نام کی اسلامی حکومت ہے اور اس کا طرزِ عمل ازمنۂ وسطیٰ کی عیسائی تھیوکریٹک حکومتوں سے قطعاً مختلف نہیں جو مذہب کے نام پر لوگوں کا ناجائز استحصال کرتی ہیں"۔ [1]

اِس دورے کے وقت سعودی حکومت نے "گیتانجلی" پڑھوائی۔ کعبہ و بُت خانہ، کافر و مومن، موحّد و مشرک اور بُت شکن و بُت پرست کا فرق مٹانے کی جو کوشش کی اُس پر یہ تبصرہ ملاحظہ ہو:

"کعبے اور بُت خانے کو ہمدوش کرنے کے لیے شاہ سعود اور پنڈت نہرو جو کوششیں کر رہے ہیں اُس میں برہمن کا تو کچھ بھی نہیں جائے گا البتہ موخر الذکر جو بت شکنی (قبہ شکنی) میں سبکدست ہوتا ہے اُس میں مصلحت شناسی اور رُوباہی آجائیگی۔ اللہ اکبر۔ ایک دَور وُہ تھا علاّمہ (ابن) عبدالوہاب نجدی کے نام لیوا....... یہ نعرہ لگاتے تھے کہ ہمارے لیے قرآن اور حدیث کافی ہیں (فقہ کی ضرورت نہیں) اب وہ گیتانجلی پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر پنڈت نہرو کو کتنی مسرّت ہُوئی ہوگی، وُہ کیوں نہ خوش ہوں، وُہ کہتے ہوں گے، بھارت کے مسلمانوں کو ہندو ہزار سال سے اپنا مذہب پڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن وُہ پڑھ کے نہیں دیتے اور میرے سعودی عرب کے ایک دورے نے عربوں کی نئی نسل میں گیتانجلی پڑھنے کا ذوق و شوق پیدا کر دیا۔ سعودی عرب کے اس تجربہ کے بعد عجب نہیں کہ بھارت کے مسلمانوں کو حکم ہوجائے کہ تم اپنی مسجدوں میں اشوک بھی سنایا کرو"۔ [2]

---

[1] روزنامہ کوہستان. لاہور، یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء

[2] ایضاً، ۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء

دیوبندی علماء جو اپنے اکابر کے کفریہ کلمات، کفریہ عبارتیں حتیٰ کہ کفریہ عقیدے تک ایمان کا جوہر سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں، مسلمانوں کے ٹوکنے پر اُن کی دور از کار تاویلیں کر کے خود بھی اُن کفریات میں برابر کے حصّے دار بن جاتے اور اُنھیں اسلامی عقیدے اور عبارتیں ثابت کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ اگرچہ بات بنی ایک دفعہ بھی نہیں لیکن اِس طرح اپنے متبعین اور جہلاء کو مطمئن کر دیتے ہیں کہ ہم نے دندان شکن جواب دے دیا اور ثابت کر دکھایا ہے کہ ہمارے یہ عقیدے اور عبارتیں ہرگز کفریہ نہیں ہیں۔ لیکن یہ اُن حضرات کا اسلام کے ساتھ مذاق اور اپنی جانوں پر ظلم ہے۔ آخر عاقبت تو اپنی ہی خراب کرتے ہیں اور اپنے ساتھ متبعین کو بھی گھرے میں لے کر ڈوبتے ہیں اِس اِس کے باوجود نجدیوں کا نعرہ "رَسُوْلُ السَّلَام" مولوی احتشام الحق تھانوی (کراچی) کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ اِس شناعت وقباحت کو موصوف بھی برداشت نہ کر سکے۔ اُن کا ایک بیان یوں اخبارات و رسائل میں شائع ہوا:

> "مولانا احتشام الحق تھانوی نے آج رات ایک بیان میں کہا ہے کہ سرزمینِ حجاز کے دار الخلافہ ریاض میں بھارتی وزیرِ اعظم پنڈت نہرو کے استقبال پر "مرحبا نہرو رَسُوْلُ السَّلَام" سے جو ننگِ اسلام اور اسلام سوز قسم کے نعرے لگائے گئے اُن سے نہ صرف یہ کہ مسلمانانِ عالم کے دینی و ملّی جذباتِ غیرت کو ناقابلِ برداشت صدمہ پہنچا ہے بلکہ متولیِ حرمین شریفین کی اُس موحدانہ دینداری کا پول بھی کھل گیا ہے، جس کا سارے عالم میں ڈنکا پیٹا جا رہا ہے۔
>
> اِس سے قطع نظر کہ سرزمینِ توحید اور گہوارۂ اسلام میں ایک صنم پرست بلکہ منکرِ خدا اور اللہ کے باغی کو دعوتِ تکریم دینا اور جوارِ رسول میں بسنے والے موحدین مردوں اور عورتوں سے خیر مقدم و استقبال کرانا پاسبانِ حرم کے لیے کہاں تک زیب دیتا ہے یا اُس احساسِ ذمہ داری کو کہاں تک پورا کرتا ہے جو حرمین شریفین کی تولیت پر مسلمانانِ عالم کی طرف سے عاید ہوتی ہے، خود یہ بات بھی اپنی جگہ انتہائی شرمناک اور غیر اسلامی ہے کہ پنڈت نہرو کے لیے "رسول السلام" جیسے اصطلاحی الفاظ استعمال کیے جائیں۔

سعودی عرب کے سفارت خانے سے جو وضاحتی بیان دیا گیا ہے، نامہ نگار عربی کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہے کہ رسول سے قاصد کے معنی مراد ہیں، نبی کے معنے مراد نہیں میرے نزدیک یہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہے اور ممکن ہے کہ نامہ نگار عربی کی ابجد سے حقیقت میں واقف نہ ہو، لیکن سعودی عرب کے سفارتی ترجمان سے زیادہ واقفِ اسلام ضرور ہوتا ہے اور الزام کی تردید کرنے والے ترجمان ممکن ہے کہ عربی کی مہارتِ تامہ رکھتے ہوں مگر اسلام اور تعلیماتِ اسلام کی ابجد سے بھی ناآشنا معلوم ہوتے ہیں۔

مرحبا رسول السلام کے نعرہ سے ادنیٰ سے ادنیٰ عقل رکھنے والے کو یہ غلط فہمی نہیں ہوتی ہے کہ پنڈت نہرو کو نبی یا پیغمبر بنا دیا یا اس لفظ سے نبی کے معنی مراد لیے ہیں بلکہ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ رسول سے قاصد ہی کے معنی مراد لیے گئے ہیں، یہ اعتراض ہے کہ لفظ "رسول" اسلام اور قرآنِ کریم کی مخصوص اصطلاح ہے، جس کی حیثیت شعائر اللہ اور شعائرِ اسلام کی ہے۔ جیسے قرآن، مسجدِ حرام، مسجدِ اقصیٰ وغیرہ قسم کے بے شمار الفاظ اسلامی شعائر ہیں، جو اپنے لغوی معنی سے نکل کر اصطلاحی معنی کے لیے خاص ہو گئے۔ اب ان الفاظ کو لغوی معنی میں استعمال کرنا، بالخصوص اُن لوگوں کی طرف سے جن کو عربی زبان کے استعمال کرنے میں حدودِ دین کا پاس رکھنا ہے، قطعاً ناجائز و حرام ہے، بلکہ شعائر اللہ کی کھلی ہوئی بے حرمتی اور توہین ہے۔ ع

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

کیا کسی مسلمان کو یہ اجازت ہے کہ وہ اپنی تصنیف کا نام کتاب اللہ، اپنے گھر کا نام بیت اللہ اور اپنی مسجد کو مسجدِ حرام، اپنے باغ کو جنت، اپنے تالاب کا نام کوثر اور تنور کا نام جہنم اور اپنے پوسٹ مین کا نام رسول رکھ لے؟ حالانکہ لغوی اعتبار سے یہ سب صحیح ہیں۔ کیا قرآنِ کریم میں یاایہا الذین امنوا لا تقولوا راعنا وقولوا انظرنا میں الفاظ کا ادب مسلمانوں کو نہیں سکھایا

گیا ہے؟ کیا حدیث کے اندر مسلمانوں کو خبثتِ نفسی کی ممانعت سے بھی ادبِ الفاظ نہیں بتلایا گیا ہے؟

سعودی عرب کے سفارتی ترجمان کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کی عربی زبان بھی وہ زبان ہے جس میں اصطلاحاتِ قرآن کی حرمت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اگر اللہ کے باغی کے احترام میں آج ناموسِ رسول کو یہ کہہ کر بھینٹ چڑھایا گیا کہ رسول کے معنی قاصد کے ہیں تو آیندہ تمام شعائرِ اسلام کی حرمت کبھی باقی نہ رہ سکے گی۔ پھر سلامتی وامن کا استعمال بھی کس قدر حیا سوز اور عزّت کُش ہے کہ جس کے ملک میں آئے دن خونِ مسلم سے ہولی کھیلی جاتی رہی ہو وہ قاصدِ امن تو کیا ہوتا اُس میں امن وسلامتی کا ادنیٰ شائبہ بھی موجود نہیں ہے۔ خدا کی شان ہے کہ مردم خور درندوں کو قاصدِ امن کے لقب سے یاد کیا جائے۔

جنوں کا نام خرد رکھ لیا خرد کا جنوں!
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

ہم آخر میں پاسبانِ حرم سے صاف طور پر یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ حرمین شریفین مسلمانانِ عالَم کی امانت ہے اور اِن پاسبانوں کی طرف سے...... ناموسِ رسول کی بے حرمتی کبھی برداشت نہیں کی جا سکتی۔"[1]

قارئینِ کرام حیران ہوں گے کہ جب دوسرے وہابی حضرات خاموشی یا تاویلات کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے تو اِس غیر اسلامی نعرے پر دیوبندی ہونے کے باوجود مولوی احتشام الحق تھانوی نے تنقید کیوں کی تھی؟ ہم قارئینِ سطور کی واقفیت کے لیے عرض کرتے ہیں کہ موصوف کا تعلق اُس جماعت سے ہے، جس کے سرگروہ مولوی اشرف علی تھانوی صاحب (المتوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) بقول علّامہ شبیر احمد عثمانی (المتوفی ۱۳۶۸ھ) چھ سو روپیہ ماہوار انگریزی حکومت سے وظیفہ پاتے تھے، اِسی وجہ سے تھانوی صاحب اور اُن کے متبعین

---

[1] روزنامہ جنگ، کراچی، ۲۹ ستمبر ۱۹۵۶ء، صفحہ پہلا

زنّار دوست ہونے کی بجائے برٹش نواز تھے اور ہندو نواز علماء پر تنقید بھی کرتے رہتے تھے جیسا کہ اسی باب میں مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کا ایک طویل بیان پیش کیا جا چکا ہے۔ مولوی احتشام الحق صاحب کا تعلق بھی چونکہ اُسی تھانوی گروپ سے ہے لہٰذا موصوف کا اس زنّار دوستی پر تنقید کرنا چنداں محلِ تعجب نہیں۔ اب اِس بُت فروشانہ حرکت پر ماہنامہ "نقاد"، کراچی کے ایڈیٹر کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے:

"قاطع بدعت و مناہی، مقلدِ (ابن) عبدالوہاب نجدی، محافظِ حرمین الشریفین

جلالۃ الملک شاہِ سعود کے نام

فدائیانِ رسول و عالمیانِ اسلام کا پیغام

جلالۃ الملک! اللہ آپ کو محبتِ رسول دے۔ خدا معلوم آپ کو معلوم ہے یا نہیں کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں نے ۱۹۴۷ء میں "پاکستان" کے نام سے ایک الگ ملک بنا لیا تھا۔ اِس نوزائیدہ ملک کے بنتے ہی دشمنانِ اسلام و مسلمین نے مسلمانانِ ہند کو اپنے نرغے میں لے لیا تھا اور پھر اُن کا قتلِ عام شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں نے اپنے آبائی وطن اور گھروں سے بھاگ بھاگ کر، مرتے گرتے نہ جانے کیا کیا مصائب برداشت کرنے کے بعد پاکستان میں سکونت اختیار کر لی۔ لیکن اِس کے باوجود اب بھی ہندوستان میں ساڑھے چار یا پانچ کروڑ مسلمان موجود ہیں، جہاں نہ اُن کی جانیں محفوظ ہیں نہ اُن کی عورتوں کی عصمتیں۔

لیکن اے کلید بردارِ حرم! جب آپ پچھلے دنوں ہندوستان کے سرکاری دورے پر آئے تو اِن حالات کے باوجود آپ نے ہندوستانی حکومت کو یہ سندِ شاہی عطا فرما دی کہ "میں بحیثیت محافظ حرمین الشریفین اس بات سے مطمئن ہوں کہ ہندوستان میں مسلمان امن و سکون سے ہیں اور اُن کی جانیں محفوظ ہیں وغیرہ وغیرہ

یقین کیجیے شاہ! آپ کی اس سندِ شاہی کی تشہیر کے بعد ہمیں محمد شاہ

رنگیلے کے فرامین بے ساختہ یاد آ گئے تھے اور ہم یہ بھی سمجھ گئے تھے کہ ترک کی مسلمان قوم آپ اور آپ کی حکومت سے کیوں غیر مطمئن رہی ہے۔

اس واقعہ کے بعد آپ نے ایک غیر مسلم سربراہ کو سرزمینِ حجازِ مقدس کے سرکاری دورے کی دعوت دی اور ۲۴ ستمبر ۱۹۵۶ء کو بھارت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو جب آپ کے دار الخلافہ ریاض پہنچے تو آپ کی حکومت کے اکٹھے کیے ہوئے عوام نے "یَا رَسُوْلَ السَّلَامِ نَہْرُوْ" کے شرمناک نعروں سے اُن کا استقبال کیا تھا۔ اس استقبال کرنے والوں میں عرب کے وہ قبائلی بدو اور عورتیں بھی شریک کیے گئے تھے جو کسی دشمنِ اسلام فرد یا قوم کے لیے اپنے دلوں میں جذباتِ احترام نہیں رکھتے، پھر سب سے بڑا اجتہاد جو آپ جیسے قاطعِ بدعات نے کیا تھا وُہ یہ تھا کہ عرب کی خواتین کو غیر محرموں کے انبوہِ کثیر میں لا کر اُن سے ایک غیر محرم، غیر مسلم شخص کا استقبال سرزمینِ حجاز پر "رسول" جیسے متبرک و مقدس خطاب سے کرایا۔

شاہِ قبہ شکن! پنڈت جواہر لال نہرو کو "رسول" کے نام سے آپ نے یا آپ کی قوم نے یاد کر کے پاکستان کے نو کروڑ مسلمانوں کی جو دلآزاری کی وُہ ناگفتہ بہ ہے۔ آپ کو کسی نے یہ بات غلط بتا دی ہے کہ پاکستان میں ایسی قوم آباد ہے جو عربی زبان سے ناواقف ہے اور عربی زبان کے معانی و مطالب سے آگاہ نہیں ہے۔ آپ کے سفارت خانے لفظ "رسول" کے لیے جو تاویلات وضع کر رہے ہیں اُس سے اُن کی بیچارگی اور ندامتِ جُرم مترشح ہو رہی ہے۔

جلالۃ الملک! ہم مسلمانانِ عالم حیران ہیں کہ آپ اور آپ جیسے عقائد مذہبی رکھنے والے لوگ ایک ایسے شخص کو تو "یَا رَسُوْلُ" جیسے عظیم لقب سے خوش آمدید کہہ سکتے ہیں جو بطناً و نسلاً بُت پرست اور مسلکاً لامذہب ہے، لیکن کوئی مسلمان "حیات النبی، خاتم الرسل، حضور رسولِ مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو وفورِ جذبات و عقیدت، لوازمِ احترام اور واجباتِ استغاثہ میں یا رسول،

یا محمد، یا مصطفیٰ کہہ کر یاد کرے تو اُسے کافر و مشرک قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہ کونسی منطق ہے؟ یہ کون سا عقیدہ ہے؟ یہ کون سا مذہب ہے۔ استغفر اللہ ربی۔

آپ لوگوں نے جنت البقیع کے تمام آثارِ مقدسہ کو شہید کرا دیا۔ صدہا اصحابِ کبار کے قبّوں کو مسمار کرا دیا۔ گنبدِ خضریٰ، آرام گاہِ رسول، سرچشمۂ نورِ الٰہی کے معاد سے زمین بوسی کو حرام اور جُرم قرار دیا گیا اور آپ اور آپ کے ہم مسلک و عقیدہ مولویوں نے یہ حکم بھی لگا دیا کہ ختم المرسلین، نبی آخر الزمان، حیات النبی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جو شخص کھڑے ہو کر یَا رَسُوْل سَلَامٌ عَلَیْکَ پڑھے مشرک و کافر ہے اور اِس عقیدے پر اصرار کرے تو مرتد اور واجب القتل! لیکن آج یہ کیا ہُوا کہ احترامِ رسول کو بدعت و شرک و کفر کہنے والے مقلدینِ ابن عبدالوہاب نجدی ایک ایسی قوم کے سربراہ کا استقبال "یَا رَسُوْلَ السَّلَام" کے نعروں سے کرتے ہیں جو دشمنِ رسول و اسلام ہے اور لاکھوں دیوی دیوتاؤں کا پجاری ہے

اللہُ اکبر۔

اے شاہ! ہم آج سمجھے کہ بڑے بڑے جغادریوں کے عقاید و مسلک کے آہنی قلعوں کو سیاسی تقاضے ایک ہی جھٹکے میں مسمار کر ڈالتے ہیں۔ ہم پُوچھتے ہیں کہ کیا آج سعودی عرب میں کسی ڈاکیے، یا پوسٹ مین یا کسی بھی پیغام رساں کو اہلِ زبان یا دیہاتی لوگ "یَا رَسُوْل" کہہ کر پکارتے ہیں؟ ہم پُوچھتے ہیں کہ عرب کے کسی بھی گوشے میں کیا کوئی ایسا بدنصیب مسلمان ہے جو رسُول کا لفظ انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے علاوہ عام آدمیوں علی الخصوص کسی مشرک و بُت پرست یا لامذہب شخص کے لیے بولتا یا لکھتا ہو؟

ہمارے سوالات کا جواب یقیناً نفی میں ہے اور ہم نہایت وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ حضور پُر نور (روحی فداہ) کی شان میں گستاخانہ خیالات رکھنے اور بارگاہِ رسالت میں اپنے معاملات صاف نہ رکھنے کی پاداش میں عرب حاکموں سے یہ حماقت اور دیوانگی سرزد ہُوئی ہے۔ تواضع و میزبانی عربوں کا طرۂ امتیاز ہے

لیکن اے کلید بردارِ حرم! آپ نے یہ بھی غور کیا کہ سیاسی استحکام اور ذاتی حُبِّ جاہ کے لیے آج آپ کی میزبانی اپنی حدود سے بڑھ کر دشمنیِ دین اور شماتتِ رسالت کے قعرِ مذلّت اور ظہورِ ضلالت کی سرحدوں پر آ پہنچی ہے۔ آپ تمام حضرات غیر مشروط طور پر اقرارِ گناہ کر لیں۔ اِس نازک مرحلے پر تاویلات اور استدلال کے سہارے بڑے شرمناک ہیں۔ اِس راستہ میں "باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار" کا عقیدہ واجب و لازم ہے اور تاویلات، "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" کے مترادف ہیں۔ خداوندِ کریم آپ کو محبتِ رسول دے اور یہ توفیق بھی ارزاں فرمائے کہ آپ یا آپ کی حکومت مسلمانانِ عالَم کی اِس دلآزاری کے سلسلہ میں نادم ہو۔ اَلسَّلامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی"۔ [1]

؎ خدا ہی جانتا ہے حشر اُس ٹولی کا کیا ہوگا؟
حرم سے جس کی بدبختی نے رُخِ مِلّت کا پھیرا ہے

مولوی احتشام الحق تھانوی صاحب کچھ تو بولے، یہ بھی غنیمت ہے کہ وُہ ہندو نوازی سے اتفاق نہیں رکھتے ورنہ یہ کونسی نئی بات تھی یا نرالا غیر اسلامی لفظ وہابیوں کے مُنہ سے نِکل گیا تھا۔ اپنے دُوسرے ہم مسلک علماء کی طرح موصوف بھی چُپ سادھ لیتے یا تاویلات کی بھول بُھلیّاں میں پھرنے لگ جاتے مگر ہندو نوازی پر اپنے گروپ کی لاج رکھنے کے لیے بولنا پڑا لیکن اِس طرح کہ دُوسرے غیر اسلامی عقاید و نظریات اور نجدیوں کے کارناموں کو ٹھیس تک نہ لگنے دی۔ قارئینِ کرام نے ایڈیٹر ماہنامہ "نقّاد" کراچی، جناب ظفر نیازی صاحب کا تبصرہ ابھی ملاحظہ فرمایا۔ موصوف نے وہی کُچھ کہا جو ایک مسلمان کو کہنا چاہیے اور جو کچھ کہا جرأتِ رندانہ سے کہا۔

؎ آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

قارئینِ کرام! نجدیوں کی اِس غیر اسلامی روش نے غیر مسلموں کے ہاتھوں میں کیسا

---

[1] ماہنامہ "نقّاد"، کراچی، نومبر ۱۹۵۶ء، ص ۱۲، ۱۳

ہتھیار تھما دیا۔ "رسول" کے اصطلاحی اور لغوی معنوں کے بارے میں کیسی کیسی موشگافیوں کا موقع فراہم کر دیا۔ چنانچہ بھارت کا دہلی سے نکلنے والا اخبار "تیج" اپنے، ۲ ستمبر ۱۹۵۶ء کے اداریے میں نجدیوں کے اِسی نعرے پر اظہارِ خیال کرتا ہے۔ اُس اداریے کا ایک اقتباس نوائے وقت لاہور نے یُوں نقل کیا تھا:

"۱۔ پردھان منتری شری جواہر لال نہرو پیغمبرِ اسلام کی دنیا میں پہنچے تو اُن کا استقبال "پیغمبرِ امن" کے نعروں سے کیا گیا۔

۲۔ اگر ہم غلطی نہیں کرتے تو اسلام کے معنی امن کے ہیں، سلامتی کے ہیں پیغمبرِ اسلام کے معنی بھی امن و سلامتی کے پیغامبر کے ہیں۔ (گویا پیغمبرِ امن اور پیغمبرِ اسلام ایک ہی بات ہے)

۳۔ پیغمبرِ اسلام کے ملک باسیوں نے پنڈت جی کی عزت افزائی کے لیے وہی لفظ منتخب کیا جس پر اُسے ناز ہے۔ جس کی وجہ سے دنیائے اسلام میں عرب دلیش کی عزت ہے۔

۴۔ پنڈت جی کے اِس دورہ کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ——— یہ تو وقت بتائے گا، مگر اِس سے کفر اور کافر کے فلسفے میں تبدیلی ہوگئی تو یہ دورہ کی بہت بڑی فتح ہوگی۔" [1]

یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی
یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ

اِس اسلام سوز نعرے کی بنا پر مرزائی حضرات اِن نام نہاد موحّدوں کے مُنہ پر یُوں لگام لگاتے ہیں:

"ایک مذہبی سوال لفظ "رسول" کے استعمال سے متعلق ہے۔ آج تو اہلحدیثوں کو یہ تاویل سمجھ آ رہی ہے کہ رسول کے معنی قاصد کے ہوتے ہیں۔ مگر جب حضرت بانیِ سلسلۂ احمدیہ (یعنی مرزا غلام احمد قادیانی) نے رسول کے معنی

---

[1] روزنامہ نوائے وقت لاہور، یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء

مامور اور تابعِ شریعت اُمتی نبی کے پیش کیے تھے تو یہی مولوی (نذیر حسین دہلوی، ثناء اللہ امرتسری اور محمد حسین بٹالوی وغیرہ) شور مچاتے تھے کہ "رسول" شرعی اصطلاح ہے، اِس لفظ کے اطلاق کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص نئی شریعت لانے کا مدعی ہے۔ اگر اِس موقع پر اہلحدیثوں کو ہی لفظ "رسول" کے استعمال کی وسعت کا احساس ہو جائے اور وہ اپنی غلطی کو مان جائیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ اہلِ نجد کی غلطی مفید ہی ثابت ہوئی۔"[1]

قارئینِ کرام نے نجدی وہابیوں کی زنّار دوستی اور مشرک نوازی کا کرشمہ دیکھ لیا۔ یہ ہے اِن حضرات کی توحید پرستی کا عالم۔ مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے والے کس طرح کے مشرک دوست اور بُت پرست نواز نکلتے ہیں۔ نجدی اور ہندی سارے ہی وہابی قبروں اور خصوصًا مزاروں سے بہت جلتے ہیں، اِسی لیے مسلمانوں کو قبر پرست اور پیر پرست کہے بغیر تو اِن حضرات کا کھانا بھی ہضم نہیں ہوتا۔ غضب تو یہ ہے کہ روضۂ رسول پر بھی غلاموں کو نہیں جانے دیتے کہ کہیں اُس بارگاہِ بےکس پناہ میں حاضر ہو کر یہ مشرک نہ بن جائیں، کافر نہ ہو جائیں۔ مسلمانوں کو اپنے اصطلاحی کفر و شرک سے بچانے والے خود کن لوگوں کی قبروں سے اپنی ساختہ توحید کی بھیک مانگ کر لاتے ہیں، ملاحظہ ہو:

> "واشنگٹن یکم فروری۔ آج صبح شاہِ سعود پوٹو لک دریا کو عبور کر کے ارلنگٹن قبرستان گئے اور گمنام سپاہی کی قبر پر پھول چڑھائے۔ یہ قبر گزشتہ جنگ میں ہلاک ہونے والے تمام امریکی سپاہیوں کی یادگار سمجھی جاتی ہے۔ دوپہر کا کھانا شاہ سعود نے نائب صدر نکسن کے ہمراہ کھایا۔"[2]

سعودی عرب کی نجدی حکومت کے اُس وقت کے وزیرِ دفاع نے اپنے شہنشاہِ معظم کے ہمراہ امریکہ میں محافظِ حرمین اور خیر خواہِ اسلام ہونے کا البیلا مظاہرہ کرتے ہوئے یوں

---

[1] ماہنامہ "الفرقان"، ربوہ، فروری، ۱۹۵۷ء، ص ۱۵

[2] روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۲ فروری، ۱۹۵۷ء

اپنے فرضی موحّد ہونے کا بین الاقوامی ثبوت پیش کیا:

> "سعودی عرب کے وزیرِ دفاع، امیر فہد بن سعود نے جو شاہ سعود کے ہمراہ امریکہ آئے ہیں، کل امریکہ کے پہلے صدر جارج واشنگٹن کی قیام گاہ کی سیر کی۔ بارش کے باوجود انھوں نے مکان کے پائیں باغ کی بھی سیر کی اور جارج واشنگٹن کی قبر پر پھول چڑھائے۔"[ل]

مسلمان اگر اللہ جل شانہٗ، کے دوستوں یعنی حضرات اولیاء اللہ کے مزارات پر پھول چڑھائیں تو وہابی حضرات کو یہ فعل خالص مشرکانہ نظر آتا ہے لیکن یہی حضرات خدا کے دشمنوں یعنی کافروں اور مشرکوں کی قبور پر پھول چڑھائیں تو کیا مجال کہ ان کی توحید میں ذرا بھی فرق آجائے بلکہ اِس قطعاً غیر اسلامی اور سراسر ابلیسی توحید میں اور چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقے مسلمانانِ اہلسنت وجماعت کو ایسی نام نہاد توحید سے محفوظ و مامون رکھے اور اِن حضرات کو خوش فہمی کی بھول بھلیاں سے نکال کر راہِ ہدایت پر گامزن فرمائے۔ آمین

کاش! وہ خارجی حکمران کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا فرما لیا کریں کہ جس دین و مذہب کے نام پر اُنھیں مسلمانوں سے نفرت ہے وُہ مذہب اُنھیں کُھلے کافروں، ٹھیٹ مشرکوں سے محبّت کی پینگیں بڑھانے سے کیوں نہیں روکتا؟ عالمِ اسلام کی وُہ قربانیاں جو راہِ خدا میں حج کے موقع پر پیش کی جاتی ہیں، اُن کے متعلق سُنا ہے کہ نجدی وہابی ہرگز ان کا گوشت نہیں کھاتے، مشرکین کا ذبیحہ قرار دے کر اجتناب کرتے ہیں لیکن غیر ممالک کے دورے پر جائیں تو سب کچھ ضیافتوں کے بہانے ہضم کر جائیں۔ کچھ نہ سہی تو ملکی خزانے کو جس طرح اپنی ملکیت قرار دیا ہوا ہے اور بے دریغ شاہی خاندان پر لُٹایا جاتا ہے، کیا یہ حلال ہے؟ کیا مسلمانوں کی وہ قربانیاں حرام ہیں؟ کیا یہ ضروری نہیں کہ وہاں کا حکمران طبقہ مسلمانوں اور کافروں سے جس طرح کا سلوک روا رکھے ہوئے ہے اُس پر نظرِ ثانی کرے، کیونکہ اُن حکمرانوں کی اور پورے عالمِ اسلام کی بھلائی

[ل] روزنامہ کوہستان لاہور، بابت ۲ فروری ۱۹۵۷ء

اور بہتری اِسی میں ہے کہ کافروں کو کافر سمجھ کر اُن سے اسی طرح سلوک کریں جیسا کہ مسلمانوں کو اُن سے کرنا چاہیے اور مدعیانِ اسلام کے مابین جو اختلافات ہیں اُنھیں افہام وتفہیم کے ذریعے دُور کرنے کی حتیٰ الامکان کوشش کی جائے۔ حق کو قبول کرنا اور باطل سے پیچھا چھڑانا جہادِ اکبر ہے۔

بُت پرستوں کی پُختہ زُنّاری

قارئین کرام! آپ نے اِس باب میں ہندو نوازوں، زنّار دوستوں اور گاندھی پرستوں کے کارنامے تو ملاحظہ فرمالیے کہ علم وفضل کے تمام تر دعاوی کے باوجود اُن کی کوششوں کی منزلِ مقصود یہی تھی کہ ہندوستان کے سارے مسلمان گاندھی کے قدموں میں جُھکتے، اسلامی غیرت وحمیّت کو کھوتے اور ہندو مت میں مدغم ہوتے چلے جائیں۔ گویا اِن حضرات کی کوششوں کا ماحصل یہی تھا کہ اُمتِ محمدیہ کا رُخ حرم سے سومنات کی جانب پھیر دیا جائے۔ خدا پرستی کے بجائے مسلمانوں کو ایسے راستے پر گامزن کیا جائے جس سے یہ اُن لوگوں کے پرستار بن جائیں جو خود بُت پرست ہیں۔

اِن کی ملّتِ اسلامیہ سے خیر خواہی کی ابتداء انگریز کی غلامی کے نعرے سے شروع ہوتی تھی اور گاندھی کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوجانے پر سارے پروگرام کی انتہا ہوجاتی ہے، یہ تھی اِن حضرات کی ستم ظریفی، جس کا انتہائی فخریہ انداز میں آج تک ڈھول بجایا جارہا ہے کہ باعثِ رونقِ چمن اگر کوئی تھا تو ہم ہیں اور مسلمانانِ پاک وہند کے چہروں پر اگر رونق کے کوئی دُھندلے سے آثار بھی دکھائی دیتے ہیں تو وہ ہماری ہی مساعیِ جمیلہ کے مرہونِ منّت ہیں۔ اِسی غرض سے ہم نے پُورے انصاف کے ساتھ اِن حضرات کے حقیقی خدّوخال تاریخ اور حقائق کی روشنی میں سب کے سامنے اُجاگر کردیے ہیں۔ اب دُوسری جانب ذرا یہ بھی ملاحظہ فرمالیا جائے کہ جن ہنودِ بے بہبود پر یہ کرم فرما مٹے جارہے تھے اور جن کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر مسلمانوں کو اُن کے قدموں میں جُھکانے کا فریضہ پُوری ہمّت اور جانفشانی سے ادا کرتے آرہے تھے، خود اُن ہندو لیڈروں یعنی ہندو نوازوں کے مہاتما اور اَن داتا حضرات کس درجہ مسلمانوں کی جانب جُھکے؟ کیا اُن کی پُختہ زُنّاری میں کوئی فرق آیا؟ کیا اپنے پُجاریوں کے پاسِ خاطر یا تسکینِ قلوب کے پیشِ نظر اُنھوں نے اپنے دھرم میں کوئی لچک پیدا کی؟ کاش! اِنھوں نے

گوشِ ہوش سے سُنا ہوتا کہ اِن کے گاندھی مہاراج علی الاعلان یُوں فرمارہے تھے:

> "میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہُوں کیونکہ میں ویدوں، اپنشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہُوں اور اَوتاروں کا قائل ہوں اور تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہُوں۔ میں گئو رکھشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہُوں اور بُت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ میرے جسم کا رُواں رُواں ہندو ہے۔"[1]

کاش! مسلمانوں کی خیرخواہی کا دعوٰی کرنے والے اِن زُنّار دوستوں کو یہ توفیق مل جاتی کہ ہم مسلمان ہیں، کتاب و سنّت ہمارے دین کے ماخذ ہیں اور اُن کے اندر واضح لفظوں میں غیر مسلموں سے دوستی رکھنا حرام قرار دیا گیا ہے، بلکہ قرآنِ کریم میں تو یہاں تک فرمادیا گیا ہے کہ جو غیر مسلموں سے دوستی کرے گا وُہ اُن میں ہی شمار کیا جائے گا۔ لہٰذا یہ اسلامی غیرت کے سراسر خلاف ہے کہ ہم بُت پرستوں کے آلۂ کار اور مشرکینِ ہند کے نعلین بردار بن جائیں لیکن ایسا تو کوئی اُسی وقت کہہ سکتا ہے جب اسلام کی نورانیت سے اُس کے دل و دماغ منور ہوں۔ گاندھی کا یہ بیان بھی قابلِ غور ہے:

> "مختلف طبقات و مذاہب کے بچّوں میں رواداری اور دوستی کی جو رُوح پیدا ہو رہی ہے، اُس کے پیشِ نظر میں اِس بات کو سخت مہلک سمجھتا ہُوں کہ اُن کو یہ سکھایا جائے کہ اُن کا مذہب دیگر مذاہب پر برتری رکھتا ہے یا جس مذہب کے وُہ قائل ہیں، اُن کے نزدیک بس وہی سچّا مذہب ہے۔"[2]

کیا گاندھوی حضرات نے سُن کر دریں چہ شک نہ کہا ہوگا۔ اگر کچھ بھی نہیں کہا، تب بھی خاموشی نیم رضامندی ہوتی ہے۔ خیر جس گاندھی کو یہ کرم فرما مسلمانوں کا اِس دَور میں سب سے بڑا خیرخواہ منوانے پر ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے اور اعلان کرتے تھے کہ اگر نبوّت ختم نہ ہوتی تو گاندھی جی نبی ہوتے، وہی اِن حضرات کا مذہبی پیشوا، نبوّت کی اہلیت

---

[1] روزنامہ ینگ انڈیا، ۱۲؍ اکتوبر ۱۹۲۱ء

[2] روزنامہ اسٹیٹسمین، ۱۷؍ جولائی ۱۹۳۸ء

رکھنے والا اِن کا دینی رہنما کسی لگی لپٹی کے بغیر اپنوں اور بیگانوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کو ڈنکے کی چوٹ یُوں علی الاعلان سُنا رہا تھا:

> ”میری رُوح اِس بات کے تصوّر سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات کے حامل ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مترادف ہے، کیونکہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا ہے۔“[1]

کیا اِس اعلان کو سُن کر گاندھوی علماء کی پیشانیوں پر بل آئے تھے؟ اگر بل آئے ہوتے تو اس کے بعد تو کم از کم گاندھی کی آندھی میں تنکے بن کر فضا میں اڑنے سے توبہ کر لیتے۔ لیکن فضا میں اُڑنے کے لیے جو بلند مقام مل رہا تھا وہ توبہ کب کرنے دیتا تھا۔ مزید سُنیے کہ گاندھی نے متحدہ قومیت کی تلبیس کا زہر کس مزے سے شربتِ اتحاد و اتفاق کے نام سے اِن علمبردارانِ توحید اور دشمنانِ شرک و مشرکین کو پلایا اور اِنھوں نے بڑے مزے سے لے کر نوشِ جان فرمایا تھا۔ چنانچہ گاندھی صاحب نے کہا تھا:

> ”اگر مذہب کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے یعنی ایک نج کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں میں کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے، جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور اِن کی راہِ عمل بھی مشترکہ ہو۔ مذاہب انسانوں کو ایک دوسرے سے جُدا کرنے کے لیے نہیں ہیں، وہ اِنھیں ایک رشتہ میں پرونے کے لیے ہیں۔“[2]

۱۹۴۴ء میں گاندھی صاحب کا ایک بیان اخبارات میں محمد علی جناح کے نام کھلا خط کے نام سے شائع ہوا تھا۔ موصوف نے اُس میں قومیت کا جو تصوّر پیش کیا اور جملہ گاندھوی حضرات

---

[1] ہندوستان ٹائمز، ۱۴؍اپریل ۱۹۴۰ء

[2] ہندوستان ٹائمز، ۹ جون ۱۹۴۰ء

نہ صرف جس کے قائل بلکہ مبلغ تھے، وہ اسلامی غیرت کیلئے کھلا چیلنج ہے۔ اُنھوں نے کہا تھا:

> "میں تاریخ میں اِس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنھوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور اُن کی اولاد یہ دعوے کریں کہ وُہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان انگریزوں کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد اُسے ایک ہی قوم رہنا چاہیے، خواہ اُس کے سپوتوں میں سے کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔"[۱]

وہابی حضرات کے رسُولُ السّلام یعنی پنڈت جواہر لال نہرو جو مسلمانانِ پاک و ہند کے ازلی دشمن اور کھلے کافر، ٹھیٹ بُت پرست تھے، اُن کی صدارت میں آل انڈیا نیشنل کنونشن مارچ ۱۹۳۷ء میں منعقد ہوا۔ پنڈت جی نے صدارتی خطبے میں قومیت کا تصوّر یوں بکھیرا تھا:

> "ایسے لوگ بھی ابھی تک زندہ ہیں جو ہندوستان کا ذکر اِس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملکوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اِس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔"[۲]

پنڈت جواہر لال نہرو نے گاندھوی حضرات کو اسلام کا ظاہری طور پہ نام لینے اور خود کو مسلمان بنانے سے ہٹانے کی خاطر مذہب کی مخالفت جن لفظوں میں کی وہ دیدنی ہے۔ موصوف نے اپنی سوانحعمری میں لکھا ہے کہ:

> "جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اُسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمّت کی ہے اور اِسے مٹا دینے کی آرزو تک کی ہے۔"[۳]

---

[۱] عام اخبارات، ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء

[۲] رُوداد آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء

[۳] میری کہانی: ص ۶۱

مسٹر گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے لفظوں سے بھی واضح تر الفاظ ہیں ، ہندو مہاسبھا کے صدر یعنی مسٹر ساورکر سے ہندو کی تعریف سُن لیجیے ۔ موصوف نے کہا تھا :

> "لفظ ہندو سے عبارت ہے ہر وُہ شے جو ہندوستان کی ہو مثلاً کلچر ، نسل اور روایات اور ہندو کے معنی ہیں ہر وہ شخص جو ہندوستان کا رہنے والا ہو" [1]

اِسی ہندو مہا سبھا کے نائب صدر یعنی ڈاکٹر رادھا مکرجی نے آل انڈیا ہندو ویدک یُوتھ کانفرنس منعقدہ لاہور کے صدارتی خطبے میں علی الاعلان کہا تھا کہ :

> "ہندوستان کو فطری اور عملی طور پر ایک ہندو اسٹیٹ ہونا چاہیے ۔ جس کا کلچر ہندو اور جس کا مذہب ہندو ازم ہو اور جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو" [2]

دیوبندی حضرات کے شیخ الہند یعنی مولوی محمود الحسن صاحب جس شخص کی سرکردگی میں ریشمی رومال کی تحریک میں حصّہ لیا تھا اور جو اُس تحریک میں مرکزی کردار ادا کر رہا تھا ، اُسی لالہ ہردیال کا بیان ہے کہ :

> "پس اگر ہندوستان کو کبھی آزادی ملی تو یہاں ہندو راج قایم ہوگا ۔ نہ صرف ہندو راج قایم ہوگا بلکہ مسلمانوں کی شدھی ، افغانستان کی فتح وغیرہ باقی آدرش بھی پُورے ہو جائیں گے ۔" [3]

اب کون پُوچھے گاندھوی حضرات اور اُن کے علماء و مشائخ کہلانے والوں سے کہ حضرات ! آپ کے قومی رہنماؤں ، مذہبی پیشواؤں ، اخلاقی یاروں ، پیاروں ، مددگاروں اور اقتصادی پروردگاروں کے بیانات تو ایسے تھے ، لہٰذا مسلمانوں نے تو اُن بُت پرستوں ، ملّتِ اسلامیہ کے ازلی دشمنوں کو اُسی نظر سے دیکھا ، جس کے وُہ قابل تھے لیکن گاندھوی حضرات کا رشتۂ تسبیح اُن پختہ زنّاروں کے حضور میں کیوں ٹوٹ گیا ؟ دینی غیرت کیوں

---

[1] ہندوستان ٹائمز ، ۲۰ فروری ۱۹۳۹ء

[2] روئیداد آل انڈیا ویدک یُوتھ کانفرنس ، منعقدہ لاہور

[3] روزنامہ ملاپ ، ۱۳ جنوری ۱۹۲۵ء

مرگئی ہے، دِلوں اور دماغوں پر جو متحدہ قومیت اور ہندو مسلم اتحاد کا بھوت سوار ہوا تھا، اُس نے اسلامی حمیت کی رمق بھی باقی رہنے دی ہے۔ ستم ظریفی تو یہ کہ اپنے موقف کی انتہائی کمزوری کا احساس ہو جانے کے باوجود پاکستان میں بھی وُہ حضرات اہلِ حق کے خلاف ہر میدان میں صف آرا ہیں۔

حالات کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہُوئے اور مدعیانِ اسلام کی ہمدردی سے مجبور ہو کر راقم الحروف کو یہ روشن دستاویز ایک مصفّا آئینے کی صورت میں پیش کرنی پڑی ہے تاکہ انصاف پسند حضرات اور متلاشیانِ حق اِس کی روشنی میں حق و باطل کو پرکھ سکیں اور اُس راستے پر گامزن ہو سکیں جس میں دارین کی کامیابی ہے، جو ملّتِ اسلامیہ اور سوادِ اعظم کا راستہ ہے۔ صراطِ مستقیم اسی کو کہتے ہیں۔ اِس راستے کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اللہ کے سارے مقبول بندے اِسی راستے پر چلتے آئے ہیں یعنی اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ والا راستہ یہی ہے۔ اِس سے پھرنے والے کو اللہ جلّ شانہٗ نے نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا کی وعید سنائی ہے۔

اگر ان پراگندہ سطور میں کوئی خُوبی نظر آئے تو اُسے اِس سیاہ کار و عصیاں شعار کے ولیِ نعمت، مُرشدِ برحق، مفتیِ اعظم دہلی، حضرت شاہ محمد مظہر اللہ فاروقی نقشبندی مجدّدی دہلوی اور مجدّد مأتہ حاضرہ اعلیٰحضرت امام احمد رضا خاں قادری برکاتی بریلوی رحمۃ اللہ علیہما کی نظرِ کرم اور فیضان کا کرشمہ شمار کیا جائے۔ جتنی غلطیاں، فروگزاشتیں اور کوتاہیاں نظر آئیں وہ میری نا اہلی کا نتیجہ ہیں۔ قارئین کرام سے التماس ہے کہ وُہ غلطیوں اور مفید مشوروں سے مطلع فرمائیں تاکہ آیندہ ایڈیشن میں ان کا خیال رکھا جا سکے۔ خدائے ذوالمنن اپنے حقیر بندے کی اِس ناچیز کاوش کو شرفِ قبولیت بخشتے ہُوئے اِسے میرے لیے کفارۂ سیئات، باعثِ حُسنِ خاتمہ، توشۂ آخرت اور سرمایۂ نجات بنائے۔ آمین یا اِلٰہُ الْعٰلَمِيْنَ ٥ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ٥ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى حَبِيْبِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ ٥

خاکپائے علماء: محمد عبد الحکیم خاں مجدّدی مظہری
المعروف بہ اختر شاہجہانپوری
دار المصنفین۔ لاہور

۱۵۔ رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ
۲۔ اکتوبر ۱۹۷۴ء

ماخذ و مراجع

۱۔ ابوالحسن علی ندوی ، مولوی	سیرت سید احمد شہید ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۳۹ء
۲۔ سید ابوالقاسم ، شیعہ مجتہد	برہان المتعہ ، مطبوعہ نیو امپیریل پریس لاہور
۳۔ ابوالکلام آزاد ، مولوی	آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی ، مرتبہ عبدالرزاق ملیح آبادی
۴۔ احمد رضا خاں بریلوی ، امام	الکوکبۃ الشہابیہ فی کفریات ابی الوہابیہ ، مطبوعہ الامان پرنٹنگ پریس لاہور
۵۔ 〃 〃 〃	المحجۃ المؤتمنہ ، مطبوعہ بریلی شریف ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء
۶۔ 〃 〃 〃	تدبیر فلاح ونجات واصلاح ، مطبوعہ آفتاب عالم پریس لاہو
۷۔ 〃 〃 〃	تمہیدِ ایمان بآیات القرآن ، مطبوعہ تعلیمی پرنٹنگ پریس لاہور
۸۔ 〃 〃 〃	حدائق بخشش ، دونوں حصے ، مطبوعہ مشہور پریس کراچی
۹۔ 〃 〃 〃	کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن ، مطبوعہ لاہور مع نور العرفان ، ۱۳۹۵ھ
۱۰۔ احمد بن عبدالرحیم المعروف شاہ ولی اللہ دہلوی ، مولانا	القول الجمیل مترجم ، مطبوعہ عربی پریس کراچی ۱۹۵۴ء
۱۱۔ احمد شہاب الدین ابن حجر مکی ، محدث	فتاویٰ حدیثیہ
۱۲۔ احمد یار خاں ، مفتی	مرآۃ شرح مشکوٰۃ ، جلد ہشتم ، مطبوعہ لاہور
۱۳۔ ارشد القادری ، مولانا	تبلیغی جماعت ، حقائق ومعلومات کے اُجالے میں ، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۵ء
۱۴۔ 〃 〃 〃	جماعتِ اسلامی اپنے آئینے میں

۱۵۔ ارشد القادری، مولانا	زلزلہ، مطبوعہ لاہور، ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء
۱۶۔ اشرف علی تھانوی دیوبندی، مولوی	الافاضات الیومیہ، جلد اوّل
۱۷۔ 〃 〃	〃 جلد سوم
۱۸۔ 〃 〃	〃 جلد چہارم
۱۹۔ 〃 〃	〃 جلد پنجم
۲۰۔ 〃 〃	〃 جلد ہفتم
۲۱۔ 〃 〃	امداد المشتاق
۲۲۔ 〃 〃	بوادر النوادر
۲۳۔ 〃 〃	حفظ الایمان، مطبوعہ نامی پریس لاہور
۲۴۔ 〃 〃	حکایاتِ اولیاء، مطبوعہ ایجوکیشنل پریس کراچی
۲۵۔ اشرف علی عبد الفتاح گلشن آبادی، مولانا	جامع الفتاویٰ، جلد دوم
۲۶۔ افتخار عالم بلگرامی	حیاتِ نذیر، مطبوعہ شمسی پریس، دہلی
۲۷۔ الطاف حسین حالی، شاعر	حیاتِ جاوید، مطبوعہ لاہور
۲۸۔ 〃	مسدّس حالی، مطبوعہ دین محمدی الیکٹرک پریس لاہور
۲۹۔ انتظام اللہ شہابی، مفتی	مولوی فضل حق خیر آبادی اور پہلی جنگِ آزادی، مطبوعہ کراچی
۳۰۔ انور شاہ کشمیری دیوبندی، مولوی	فیض الباری، جلد اول
۳۱۔ 〃 〃	مقدمہ مشکلات القرآن
۳۲۔ مُلّا باقر مجلسی، شیعہ مجتہد	حیات القلوب، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ
۳۳۔ بدر الدین احمد، مولانا	سوانح اعلیٰحضرت امام احمد رضا، مطبوعہ کانپور
۳۴۔ بدر عالم میرٹھی دیوبندی، مولوی	ترجمان السنہ جلد اوّل، مطبوعہ دہلی، بار اوّل ۱۹۴۸ء
۳۵۔ ثناء اللہ امرتسری غیر مقلد، مولوی	تاریخ مرزا، مطبوعہ لاہور
۳۶۔ 〃 〃	فتاویٰ ثنائیہ، مطبوعہ لاہور
۳۷۔ پنڈت جواہر لال نہرو، ہندو لیڈر	میری کہانی

۳۸ - مرزا حیرت دہلوی، ادیب	حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء
۳۹ - احمد حسین ٹانڈوی دیوبندی، مولوی	الشہاب الثاقب، مطبوعہ وسیم پرنٹنگ پریس دیوبند
۴۰ - 〃 〃	مکتوباتِ شیخ، جلد دوم
۴۱ - 〃 〃	نقشِ حیات، جلد دوم، مطبوعہ دہلی
۴۲ - حسین علی بھچرانوی دیوبندی، مولوی	مبشرات بلغۃ الحیران
۴۳ - حسنین رضا خاں بریلوی، مولانا	وصایا شریف، مطبوعہ مقبول عام پریس لاہور
۴۴ - خلیل احمد انبٹھوی دیوبندی، مولوی	المہند علی المفند اردو، مطبوعہ لاہور
۴۵ - 〃	براہین قاطعہ، مطبوعہ نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند
۴۶ - ملا خلیل قزوینی، شیعہ مجتہد	صافی شرح اصول کافی، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ
۴۷ - ذکاءُ اللہ دہلوی، مولوی	عروج عہد انگلشیہ
۴۸ - رحمٰن علی، مولانا	تذکرہ علمائے ہند، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء
۴۹ - رشید احمد گنگوہی دیوبندی، مولوی	فتاویٰ رشیدیہ بہ کامل مبوّب، مطبوعہ مطبع سعیدی کراچی
۵۰ - رئیس احمد جعفری، ادیب	آزادیِ ہند، مطبوعہ پنجاب پریس لاہور ۱۹۶۵ء
۵۱ - سخاوت مرزا، ادیب	ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء
۵۲ - سلطان خاں، مولوی	تذکیر الاخوان، اردو، مطبوعہ اتحاد پریس لاہور ۱۹۵۶ء
۵۳ - سلیمان اشرف بہاری، مولانا	النور، مطبوعہ علی گڑھ ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۱۹ء
۵۴ - سید سلیمان ندوی، مولوی	حیاتِ شبلی، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء
۵۵ - 〃	تعارف، مصنف معین المنطق، مطبوعہ کراچی، بار اول ۱۹۶۷ء
۵۶ - سر سید احمد خاں	آثار الصنادید، مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۶ء
۵۷ - 〃	ہنٹر پر ہنٹر، مطبوعہ کیپیٹل کوآپریٹو پرنٹنگ پریس لاہور، بار اول ۱۹۴۹ء
۵۸ - نواب صدیق حسن خاں بھوپالی مولوی	ترجمانِ وہابیہ، مطبوعہ امرتسر

۵۹ - نواب صدیق حسن خاں بھوپالی غیر مقلد، مولوی	رحلۃ الصدیق الی البیت العتیق
۶۰ - 〃	فتح المغیث بفقہ الحدیث
۶۱ - 〃	الروضۃ الندیہ فی شرح در البہیہ
۶۲ - طاہر احمد قاسمی دیوبندی، مولوی	مکالۃ الصدرین، مطبوعہ تعلیمی پریس لاہور
۶۳ - ظفر علی خاں دیوبندی، ادیب	چمنستان، مطبوعہ اردو پریس لاہور ۱۹۶۲ء
۶۴ - ظفر الدین بہاری، مولانا	حیاتِ اعلحضرت، جلد اول، مطبوعہ کراچی، ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء
۶۵ - عاشق الٰہی میرٹھی دیوبندی، مولوی	تذکرۃ الخلیل، اعوان، اقبال پرنٹنگ پریس سیالکوٹ ۱۳۸۹ھ/۱۹۶۹ء
۶۶ - 〃	تذکرۃ الرشید، دونوں جلدیں مطبوعہ میرٹھ ۱۹۰۵ء
۶۷ - عبد الرشید ارشد دیوبندی، مولوی	بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، بار دوم ۱۹۷۰ء
۶۸ - عبد الستار دہلوی، مولوی	فتاوٰی ستاریہ، ہر چہار جلد
۶۹ - حضرت محی الدین عبد القادر جیلانی، غوث اعظم	غنیۃ الطالبین، شائع کردہ مکتبہ سعودیہ کراچی
۷۰ - عبد الغنی نابلسی، امام	حدیقہ ندیہ
۷۱ - شاہ عبد العزیز دہلوی، محدّث	تحفہ اثنا عشریہ اردو ترجمہ، مطبوعہ ایجوکیشنل وجاوید پریس کراچی ۱۹۶۳ء
۷۲ - 〃	تفسیر عزیزی سورہ البقرہ
۷۳ - عبید اللہ سندھی دیوبندی، مولوی	شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک، مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور ۱۹۴۲ء
۷۴ - عبد الشاہد خاں شروانی، مولوی	باغی ہندوستان، مطبوعہ مدینہ پریس بجنور ۱۹۴۷ء
۷۵ - حافظ عبد اللہ غیر مقلد، مولوی	مسئلہ سماعِ موتٰی
۷۶ - عبد الجبار غزنوی غیر مقلد، مولوی	سوانح عمری عبد اللہ غزنوی
۷۷ - عبد الحق حقانی، مولوی	تفسیر حقانی، جلد اول، مطبوعہ محبوب پرنٹنگ پریس دیوبند

۷۸ -	عبدالرزاق ملیح آبادی، مولوی	ذکرِ آزاد
۷۹ -	عبدالعزیز رحیم آبادی غیر مقلد، مولوی	حسن البیان، مطبوعہ لاہور، بارسوم ۱۳۸۵ھ
۸۰ -	عزیز الرحمٰن نہٹوروی دیوبندی، 〃	تذکرہ مشایخ دیوبند، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۴ء
۸۱ -	عنایت اللہ اثری غیر مقلد، مولوی	مکاثیب العجابیہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۹ء
۸۲ -	ابوالفضل قاضی عیاض مالکی، محدث	کتاب الشفا فی تعریف حقوق المصطفیٰ
۸۳ -	حضرت علی المرتضیٰ، خلیفۂ چہارم	نہج البلاغت، مطبوعہ طہران
۸۴ -	مسٹر غلام احمد پرویز، بانیِ پرویزیت	اسبابِ زوالِ امت
۸۵ -	〃 〃	بہارِ نو، مطبوعہ اشرف پریس لاہور ۱۹۶۵ء
۸۶ -	〃 〃	سلیم کے نام خطوط
۸۷ -	〃 〃	فردوسِ گم گشتہ ۔
۸۸ -	〃 〃	قرآنی فیصلے
۸۹ -	〃 〃	معراجِ انسانیت۔ مطبع ریاض ہند قادیان، باراول ۱۸۹۳ء
۹۰ -	〃 〃	مقامِ حدیث۔ مطبوعہ ضیاء الاسلام قادیان، بار اول ۱۸۹۱ء
۹۱ -	〃 〃	نظامِ ربوبیت۔ 〃 〃 〃 ، 〃 ۱۹۰۲ء
۹۲ -	مرزا غلام احمد قادیانی، کذاب و دجال	اربعین ۳
۹۳ -	〃 〃	اربعین ۴
۹۴ -	〃 〃	آئینہ کمالاتِ اسلام
۹۵ -	〃 〃	ازالۂ اوہام
۹۶ -	〃 〃	اعجاز احمدی
۹۷ -	〃 〃	براہینِ احمدیہ

۹۸ - مرزا غلام احمد قادیانی، کذاب و دجال تبلیغ رسالت جلد ہفتم

۹۹ - " " تبلیغ رسالت جلد ہشتم

۱۰۰ - " " تتمہ حقیقۃ الوحی

۱۰۱ - " " تحفہ قیصریہ

۱۰۲ - " " تریاق القلوب

۱۰۳ - " " تحفۃ العوام جلد اوّل

۱۰۴ - " " تحفہ گولڑویہ

۱۰۵ - " " حاشیہ چشمۂ معرفت۔ مطبوعہ انوار احمدیہ قادیان، بار اوّل ۱۹۰۸ء

۱۰۶ - " " حقیقۃ الوحی، مطبوعہ میگزین قادیان، بار اوّل ۱۹۰۷ء

۱۰۷ - " " حاشیہ ضمیمہ انجام آتھم

۱۰۸ - " " خطبہ الہامیہ۔ مطبع ضیاء الاسلام قادیان، بار اوّل ۱۳۱۹ھ

۱۰۹ - " " دافع البلاء ٹائٹل پیج۔ " " ، " " ۱۹۰۲ء

۱۱۰ - " " در ثمین

۱۱۱ - " " رسالہ تشحید الاذہان

۱۱۲ - " " ستارۂ قیصرہ

۱۱۳ - " " شہادت القرآن۔ مطبوعہ پنجاب پریس سیالکوٹ ۱۹۶۸ء

۱۱۴ - " " کشتی نوح، مطبوعہ خورشید عالم پریس لاہور ۱۹۰۲ء

۱۱۵ - " " نور الحق

۱۱۰ - " " نزول المسیح، مطبع ضیاء الاسلام قادیان، بار اوّل ۱۹۰۹ء

۱۱۷-	غلام احمد حریری، پروفیسر	اسلامی مذاہب، مطبوعہ لاہور، بار دوم ۱۹۷۰ء
۱۱۸-	غلام رسول مہر غیر مقلد، مسٹر	۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور
۱۱۹-	"	سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء
۱۲۰-	"	مقدمہ تقویۃ الایمان، مطبوعہ اشرف پریس لاہور
۱۲۱-	غلام مہر علی، مولانا	دیوبندی مذہب، شائع کردہ کتب خانہ مہریہ منڈی چشتیاں ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء
۱۲۲-	قاضی فضل احمد لدھیانوی، مولانا	انوار آفتاب صداقت، مطبوعہ لاہور ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۱ء
۱۲۳-	فضل حسین بہاری غیر مقلد، مولوی	الحیات بعد الممات، مطبوعہ ضیاد پریس کراچی ۱۹۵۹ء
۱۲۴-	فضل رسول بدایونی، مولانا	سیف الجبار، مطبوعہ کان پور
۱۲۵-	مُلّا فتح اللہ کاشانی، شیعہ مجتہد	تفسیر منہج الصادقین
۱۲۶-	کمال الدین حیدر، مورخ	قیصر التواریخ، جلد دوم، مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۰۷ء
۱۲۷-	لطف اللہ، مولوی	علمائے حق
۱۲۸-	محمد ابو الحسن غیر مقلد، مولوی	فقہ محمدیہ کلاں
۱۲۹-	محمد ابراہیم غیر مقلد، مولوی	فتاویٰ ابراہیمیہ، مطبوعہ الہ آباد
۱۳۰-	محمد بن عبد الوہاب نجدی، امام الوہابیہ	کتاب التوحید
۱۳۱-	ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی، شیعہ مجتہد	اصول کافی
۱۳۲-	محمد اسمٰعیل دہلوی، امام الوہابیہ ثانی	ایضاح الحق، مطبوعہ محمدی پریس دیوبند، ۱۳۵۶ھ
۱۳۳-	" "	تقویۃ الایمان، مطبوعہ اشرف پریس لاہور
۱۳۴-	" "	تنویر العینین، مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور
۱۳۵-	" "	صراط المستقیم، مطبوعہ ضیائی ۱۲۸۵ھ
۱۳۶-	" "	" اردو، مطبوعہ نامی پریس لاہور
۱۳۷-	محمد بن اسمٰعیل عینی غیر مقلد، وہابی	تطہیر الاعتقاد

۱۳۸۔ محمد اسمٰعیل غزنوی غیر مقلد، مولوی	تحفہ وہابیہ
۱۳۹۔ محمد اسمٰعیل سابق امیر اہلحدیث، "	مقدمہ حسن البیان، مطبوعہ لاہور، بار سوم
۱۴۰۔ محمد اسمٰعیل پانی پتی، مولوی	مقالات سرسید، حصہ نہم، مطبوعہ لاہور
۱۴۱۔ علامہ سر محمد اقبال، شاعرِ مشرق	ارمغانِ حجاز، مطبوعہ لاہور، طبع پنجم ۱۹۵۱ء
۱۴۲۔ " "	کلیاتِ اقبال، مطبوعہ دہلی
۱۴۳۔ محمد امین ابن عابدین شامی، فقیہ	رد المحتار، جلد سوم
۱۴۴۔ محمد ایوب قادری، پروفیسر	دیباچہ تذکرہ علمائے ہند اردو، مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۶۱ء
۱۴۵۔ " "	مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، بار اول ۱۹۶۹ء
۱۴۶۔ شیخ محمد اکرام، مسٹر	شبلی نامہ
۱۴۷۔ " "	موجِ کوثر، مطبوعہ لاہور، بار ہشتم ۱۹۵۹ء
۱۴۸۔ محمد الیاس برنی، پروفیسر	قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ، مطبوعہ اشرف پریس لاہور
۱۴۹۔ محمد جعفر تھانیسری، مولوی	حیاتِ سید احمد شہید (سوانح احمدی) مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء
۱۵۰۔ محمد سعید، مولوی	ہدایتِ قلوب قاسیہ
۱۵۱۔ محمد سرور، مولوی	افادات و ملفوظاتِ سندھی، مطبوعہ لاہور، بار اوّل ۱۹۷۲ء
۱۵۲۔ میاں محمد شفیع، ڈپٹی کمشنر	۱۸۵۷ء، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، بار اول ۹۵۷
۱۵۳۔ محمد صابر قادری نسیم بستوی، مولانا	مجددِ اسلام، مطبوعہ کان پور بھارت ۱۹۵۹ء
۱۵۴۔ محمد عمر اچھروی، مولانا	مقیاسِ حنفیت، مطبوعہ فیاض پریس لاہور، بار ہشتم ۱۹۶۶ء
۱۵۵۔ " "	مقیاسِ وہابیت

۱۵۶۔	محمد فیروز الدین روحی، پروفیسر	آئینہ صداقت، مطبوعہ مطبع سعیدی کراچی، طبع دوم ۱۹۶۹ء
۱۵۷۔	محمد قاسم نانوتوی دیوبندی، مولوی	تحذیر الناس، مطبوعہ لاہور
۱۵۸۔	سید محمد کچھوچھوی، مولانا	خطبۂ صدارت اجمیر، مطبوعہ تعلیمی پرنٹنگ پریس لاہور
۱۵۹۔	〃 〃 〃	خطبۂ صدارت بنارس، مطبوعہ 〃 〃 〃 〃
۱۶۰۔	محمد کرم الدین دبیر، مولوی	آفتاب ہدایت، مطبوعہ استقلال پریس لاہور، طبع نہم ۱۹۷۳ء
۱۶۱۔	محمد مسعود احمد، پروفیسر	فاضل بریلوی اور ترکِ موالات، مطبوعہ لاہور
۱۶۲۔	〃 〃	فتاویٰ مظہری، مطبوعہ کراچی، ۱۹۷۰ء
۱۶۳۔	〃 〃	مواعظ مظہری، مطبوعہ کراچی، باراوّل ۱۹۷۰ء
۱۶۴۔	محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر	ہندوستان میں وہابی تحریک (اردو ترجمہ) مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء
۱۶۵۔	حکیم محمود احمد برکاتی، مولوی	مقدمہ معین المنطق، مطبوعہ کراچی، باراول ۱۹۶۷ء
۱۶۶۔	مرزا محمود احمد، خلیفۂ قادیانی کذّاب	آئینۂ صداقت
۱۶۷۔	〃	انوارِ خلافت
۱۶۸۔	مسعود عالم ندوی، مولوی	محمد بن عبدالوہاب، مطبوعہ کراچی ۱۹۴۹ء
۱۶۹۔	〃 〃	ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، مطبوعہ راولپنڈی ۱۳۶۸ھ
۱۷۰۔	محمود الحسن دیوبندی، مولوی	مرثیہ گنگوہی، مطبوعہ لاہور
۱۷۱۔	مصطفیٰ رضا خاں بریلوی، مولانا	الملفوظ، چاروں حصے، مطبوعہ کراچی
۱۷۲۔	محسن کاشی، شیعہ مجتہد	تفسیر صافی
۱۷۳۔	مشتاق احمد نظامی، مولانا	خون کے آنسو، دونوں حصے، مطبوعہ پنجاب پریس لاہور
۱۷۴۔	مناظر احسن گیلانی دیوبندی، مولوی	سوانح قاسمی، جلد اوّل و دوم

۱۷۵ - منور حسین سیف الاسلام دہلوی، مولوی	تصویت الایمان، مطبوعہ لاہور، بار دوم ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء
۱۷۶ - منظور احمد، پرنسپل	انگریزی نبی، مطبوعہ پنجاب نیشنل پرنٹنگ پریس لاہور
۱۷۷ - مودودی صاحب، بانیِ جماعت اسلامی	تجدید واحیائے دین، مطبوعہ لاہور، بار ہشتم
۱۷۸ - 〃 〃	تفہیم القرآن، جلد اول، مطبوعہ لاہور، بار ہفتم ۱۹۶۸ء
۱۷۹ - 〃 〃	〃 جلد دوم 〃 ۱۹۷۰ء
۱۸۰ - 〃 〃	〃 جلد سوم 〃 بار سوم ۱۹۶۹ء
۱۸۱ - 〃 〃	〃 جلد چہارم 〃 〃 ۱۹۷۰ء
۱۸۲ - 〃 〃	تفہیمات جلد اول
۱۸۳ - 〃 〃	تفہیمات جلد دوم، مطبوعہ پاکستان پرنٹنگ ورکس، بار دوم ۱۹۵۵ء
۱۸۴ - 〃 〃	تنقیحات
۱۸۵ - 〃 〃	خلافت وملوکیت، مطبوعہ لاہور، بار پنجم ۱۹۷۰ء
۱۸۶ - 〃 〃	دستور جماعتِ اسلامی
۱۸۷ - 〃 〃	مسئلہ قومیت، مطبوعہ لاہور، بار ہفتم ۱۹۷۰ء
۱۸۸ - میاں نذیر حسین دہلوی، بانی غیر مقلد فرقہ	فتاوٰی نذیریہ جلد اول و دوم
۱۸۹ - 〃	معیار الحق، مطبوعہ چٹان پریس لاہور ۱۹۶۵ء
۱۹۰ - ابو حنیفہ نعمان بن ثابت، امام اعظم	الفقہ الاکبر، مطبوعہ اشرف پریس لاہور
۱۹۱ - نور الحسن خاں بھوپالی، غیر مقلد، مولوی	عرف الجادی، جلد اول و دوم
۱۹۲ - نور بخش توکلی، مولانا	تحفہ شیعہ، جلد اول، مطبوعہ گلزار عالم پریس لاہور ۱۹۵۸ء
۱۹۳ - وحید الزمان خاں غیر مقلد، مولوی	تبویب القرآن
۱۹۴ - 〃	نزل الابرار، جلد دوم

۱۹۵- وکیل احمد سکندر پوری، مولانا	وسیلہ جلیلہ، مطبع مصطفائی ۱۳۰۱ھ
۱۹۶- ونائک ساورکر، ہندو	ساورکر، طبع اوّل
۱۹۷- ولیم ہنٹر، انگریز	ہمارے ہندوستانی مسلمان
۱۹۸- ولی الدین احمد، محدث	مشکوٰۃ المصابیح

رسائل وجرائد

۱- ہفت روزہ، الاعتصام، لاہور	بابت ۹؍اکتوبر ۱۹۷۰ء
۲- " " " "	بابت ۱۶؍اکتوبر ۱۹۷۰ء
۳- " " " "	بابت ۲۳؍اکتوبر ۱۹۷۰ء
۴- ماہنامہ، الجمعیۃ، دہلی	شیخ الاسلام نمبر
۵- سہ ماہی، العلم، کراچی	بابت مارچ تا مئی ۱۹۵۸ء
۶- ماہ نامہ، الفرقان، لکھنؤ	شہید نمبر
۷- " " "	بابت رمضان المبارک ۱۳۶۷ھ
۸- " " ربوہ	بابت فروری ۱۹۵۷ء
۹- ماہنامہ، السواد الاعظم، مراد آباد	بابت ربیع الاوّل ۱۳۴۸ھ
۱۰- " "	بابت جمادی الاولیٰ ۱۳۴۹ھ
۱۱- " "	بابت جمادی الاخریٰ ۱۳۴۹ھ
۱۲- " "	بابت شعبان ۱۳۴۹ھ
۱۳- " "	بابت شوال ۱۳۴۹ھ
۱۴- " "	بابت ربیع الثانی ۱۳۴۹ھ
۱۵- ماہ نامہ، تجلّی	بابت فروری، مارچ ۱۹۵۷ء
۱۶- ہفت روزہ، چٹان، لاہور	بابت ۱۶؍اپریل ۱۹۵۱ء
۱۷- ہفت روزہ، خدّام الدین، لاہور	بابت ۱۳؍اپریل ۱۹۶۲ء

۱۸ - ہفت روزہ، خدام الدین، لاہور	بابت ۲۲ر فروری ۱۹۶۳ء
۱۹ - 〃 〃	بابت ۱۳ر اپریل ۱۹۶۳ء
۲۰ - ماہنامہ، دارالعلوم، دیوبند	بابت ستمبر ۱۹۵۷ء
۲۱ - ماہنامہ، نقّاد، کراچی	بابت نومبر ۱۹۵۶ء
۲۲ - اخبار، الفضل، قادیان	بابت ۱۵ر دسمبر ۱۹۳۱ء
۲۳ - روزنامہ، جنگ، کراچی	بابت ۲۷ر دسمبر ۱۹۲۶ء
۲۴ - 〃 〃 〃	بابت
۲۵ - روزنامہ، سیاست، کانپور	بابت ۳ر دسمبر ۱۹۵۵ء
۲۶ - 〃 〃 〃	بابت یکم فروری ۱۹۵۷ء
۲۷ - روزنامہ، صدق، لکھنؤ	بابت ۲ر فروری ۱۹۵۷ء
۲۸ - روزنامہ، کوہستان، لاہور	بابت یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء
۲۹ - 〃 〃 〃	بابت ۲ر اکتوبر ۱۹۵۶ء
۳۰ - 〃 〃 〃	بابت ۲ر فروری ۱۹۵۷ء
۳۱ - روزنامہ، ملاپ، لاہور	بابت ۱۳ر جنوری ۱۹۲۵ء
۳۲ - روزنامہ، نوائے وقت، لاہور	بابت ۱۱ر مئی ۱۹۵۵ء
۳۳ - 〃 〃	بابت ۲۸ر ستمبر ۱۹۵۶ء
۳۴ - 〃 〃	بابت ۲ر فروری ۱۹۵۷ء
۳۵ - ہندوستان ٹائمز	بابت ۲۰ر فروری ۱۹۳۹ء
۳۶ - 〃	بابت ۹ر جون ۱۹۴۰ء
۳۷ - روزنامہ، ینگ انڈیا	بابت ۱۲ر اکتوبر ۱۹۲۱ء
۳۸ - روزنامہ جنگ، کراچی	بابت ۲۹ر ستمبر ۱۹۵۶ء
۳۹ - روزنامہ اسٹیٹسمین	بابت ۱۷ر جولّی ۱۹۳۸ء

قطعۂ تاریخ کتابت

(از حضرت مولانا اختر الحامدی الرضوی مدظلہٗ - حیدر آباد)

زندہ ، پائندہ باد اے اختر
آئینہ ہے ، کتاب یہ کیا ہے
جس میں عریاں ہیں دیو کے بندے
بر سرِ عام ہر سراپا ہے
اُن کے مکروہ چہروں سے تُو نے
ہر نقاب آج نوچ پھینکا ہے
اُن کی اِک اِک فریب کاری کا
تار تار ہر دبیز پردہ ہے
وہ کیا ہے محاسبہ تُو نے
سرِ بازار مکر ننگا ہے
اللہ اللہ تیری نوکِ قلم
شاہ احمد رضا کا نیزہ ہے
مار جس کی ارے معاذ اللہ
قہرِ حق جس کا وار ، توبہ ہے
مظہرِ فیض ہے یہ سب لا ریب
تجھ پہ بے شک کرم رضاؔ کا ہے
پاسباں مسلکِ رضا کا تُو
رہبرِ راہِ شاہِ بطحا ہے
تیری تحریر سے یہ ہے ظاہر
عہد تُو نے رضاؔ سے باندھا ہے
سُنّت و دین کے تحفّظ کا
کام تجھ کو رضاؔ نے سونپا ہے
عہد نامہ ہے تیری ہر تحریر
چشمۂ فیض ہر رسالہ ہے
جس کا ہر حرف ساغرِ عرفاں
ہر سطر جس کی بادہ خانہ ہے
اللہ اللہ بہ فیضِ شاہِ رضاؔ
جس نے دیکھا پکار اُٹھا ہے
واہ وا عہد نامۂ اختر
آج خمخانۂ مطلّا ہے
۹۵ ھ ۱۳
۹۵ ھ ۱۳

قطعۂ تاریخِ ترتیب

(از حضرت مولانا اختر الحامدی الرضوی مدظلہ العالی حیدرآباد)

اللہ اللہ حضرتِ اختر کی کیا تصنیف ہے — دیکھ کر جس کو نظر پُر نور ہے روشن نگاہ
مل گیا ہے خاک میں نجدی کا "تاریخی غرور — سب کی ٹھوکر میں ہے مصنوعی فضیلت کی کلاہ
مکر کی اُن کے فضا میں اُڑ رہی ہیں دھجّیاں — ہر دلیل اُن کی ہوا کے ہے پروں پر مثلِ کا
اِس طرح فرمایا ہے بوجہلیوں کا احتساب — ہے ہر اِک عُریاں سرِ بازار با حالِ تبا
نوچ پھینکی رُخ سے ہر تخریب کاری کی نقاب — آج ہے پیشِ نظر اِک ایک کا رُوئے سیا
یعنی سب انگریز کی شطرنج کے مُہرے ہیں یہ — حاشیہ بردارِ گاندھی ، کانگرس کے خیرخوا
بیش قیمت ہے یہ علمی کارنامہ آپ کا — ہے یقیناً آپ پر لُطفِ رضا شام و پگا
روز و شب علم و عمل میں ہو ترقی آپ کے — ہو زمانے میں فزوں سے بھی فزوں تر عزّ و جا
مرحبا تحقیق ، یہ روزِ قلم صد آفریں — اِس کا اِک اِک حرف ہے علمی فضیلت پر گو
ایک سرمایہ ہے یہ اہلِ قلم کے واسطے — اِک مورّخ کے لیے مشعل بکف ، مینارِ

جس نے دیکھا اِس کو اختر کہہ اُٹھا بیساختہ
واہ رضوی شان ہے ، کیا یہ ، رضا کی شان واہ
۱۳ ھ ۹۴ — ۱۳ ھ ۹۴

قطعۂ تاریخِ طباعت

(از حضرت اختر الحامدی الرضوی مدظلہ العالی ۔ حیدر آباد)

اخترؔ ترے نثار ہے کیا سیرتِ رضا   عمرت دراز باد ، دُعا یہ خدا سے ہے
احمد رضا کا والا و شیدا نہ تو ہو کیوں   جب اُن کو عشق سرورِ ہر دوسرا سے ہے
تجھ پر نگاہِ لطفِ رضا کی ہے رات دن   یہ اَوجِ علم و فضل اُنھیں کی عطا سے ہے
سر پر امامِ اہلِ قلم کا سجا ہے تاج   کیا شان، فضلِ حضرتِ غوث الوریٰ سے ہے
طرزِ بیاں میں کلکِ رضا کا ہے بانکپن   ظاہر یہ حُسن، تیرے قلم کی ادا سے ہے
جنگ آزما و بر سرِ پیکار رات دن   تُو دشمنانِ ذاتِ شہِ انبیاؑ سے ہے

تاریخِ طبع میں ہے یہ اخترؔ کا فیصلہ
تُو فیضیاب چشمۂ فیضِ رضا سے ہے
۷۶ ۶ ۱۹

[illegible]
[illegible] 210 [illegible]
[illegible] 0313-4522841

شرح صحیح مسلم (۷ جلد)
تصنیف:
علّامہ غلام رسول سعیدی شیخ الحدیث دار العلوم نعیمیہ کراچی ۳۸
اس صدی کی بہترین شرح جس میں عصر حاضر کے
جدید مسائل کا محققانہ حل پیش کیا گیا ہے۔
● —— یہ شرح قارئین کو دوسری شرحوں سے
بے نیاز کردے گی۔

اشعۃ اللمعات (۷ جلد)
شرح مشکوٰۃ
تصنیف منیف:
عارف باللہ شیخ محقق حضرت مولٰینا شاہ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ
اردو ترجمہ و حواشی
حضرت علامہ مولٰینا محمد سعید احمد نقشبندی مدظلہ العالی
علامہ محمد عبد الحکیم شرف قادری نقشبندی

بخاری شریف مترجم (۳ جلد)
امام المحدثین ابو عبد اللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری رحمہ اللہ
مترجم، مولانا عبد الحکیم خاں اختر شاہجہانپوری

سُنن نسائی مترجم (۳ جلد)
امام ابو عبد الرحمٰن احمد بن شعیب بن علی بن بحر نسائی رحمہ اللہ
ترجمہ مولٰینا دوست محمد شاکر و مولٰینا حافظ محمد عبد الستار قادری

جامع ترمذی مترجم مع شمائل ترمذی (۲ جلد)
محدثِ جلیل امام ابو عیسٰی محمد بن عیسٰی ترمذی رحمہ اللہ
مترجم، مولٰینا علامہ محمد صدیق سعیدی ہزاروی

مشکوٰۃ شریف مترجم (۳ جلد)
امام ولی الدین محمد بن عبد اللہ الخطیب رحمہ اللہ تعالیٰ
مترجم: فاضلِ شہیر مولانا عبد الحکیم خاں اختر شاہجہانپوری

سُنن ابن ماجہ مترجم (۲ جلد)
امام حافظ ابو عبد اللہ محمد بن یزید ابن ماجہ الربعی القزوینی رحمہ اللہ
مترجم، مولانا عبد الحکیم خان اختر شاہجہان پوری

طحاوی شریف مترجم (عربی، اردو) مع خلاصۂ مضامین (سیٹ چار جلد پر مشتمل)
محدثِ جلیل امام ابو جعفر احمد بن محمد الطحاوی الحنفی رحمہ اللہ تعالیٰ
مترجم: علامہ محمد صدیق ہزاروی مترجم ترمذی شریف و ریاض الصالحین
تقدیم: علامہ غلام رسول سعیدی، شارح مسلم شریف

سُنن ابو داؤد شریف مترجم (۳ جلد)
امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث سجستانی رحمہ اللہ
مترجم، مولٰینا عبد الحکیم خاں اختر شاہجہانپوری

ریاض الصالحین مترجم (۲ جلد)
شیخ الاسلام ابو زکریا یحییٰ بن شرف النووی
مترجم: مولانا محمد صدیق ہزاروی مدظلہ
تقدیم: محمد عبد الحکیم شرف قادری

فرید بُک سٹال ◎ ۳۸۔ اُردو بازار ◎ لاہور۲ فون ۷۳۱۲۱۷۳
۷۲۲۴۸۹۹